اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

سورة الفاتحة و سورة البقرة ...... ۱ تا ۱۸۸

(جلد اول)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

سورة الفاتحة و سورة البقرة ...... ۱ تا ۱۸۸

(جلد اول)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

109506

نام کتاب :	تفسیر روح القرآن
مؤلف :	ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی
ناشر :	ادارہ هُدًی لِلنَّاسِ
کمپوزنگ :	زاہد حسین
پرنٹرز :	محمد ندیم پرنٹنگ پریس، لاہور
تاریخ اشاعت :	اکتوبر 2010ء
تعداد :	1000
قیمت :	700 روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ 343-مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔فون: 042-35426800

۲۔ ادارہ اسلامیات نئی انارکلی لاہور۔

۳۔ مکتبہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔

۴۔ ادارہ منشورات ملتان روڈ بالمقابل منصورہ لاہور۔

Marfat.com

صاحبِ تالیف

نام : ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی ابن مولانا فضل کریم صدیقی
(بانی دارالعلوم ربانیہ)

ولادت : 4 اپریل 1940ء

تعلیم : ا......حافظِ قرآنِ مجید
۲......تکمیل درسِ نظامی، جامعہ اشرفیہ لاہور
۳......فاضل عربی، پنجاب بورڈ لاہور
۴......بی۔اے، پنجاب یونیورسٹی لاہور
۵......ایم۔اے، گولڈ میڈلسٹ، پنجاب یونیورسٹی لاہور
۶......پی۔ایچ۔ڈی، پنجاب یونیورسٹی لاہور
۷......فاضل مدینہ یونیورسٹی (مدینہ منورہ سعودی عرب)

تدریس : ا......ادب، تفسیر اور حدیث کی تدریس، مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، لاہور
۲......وزیٹنگ پروفیسر ھیلی کالج، پنجاب یونیورسٹی
۳......وزیٹنگ پروفیسر انسٹیٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی
۴......وزیٹنگ پروفیسر شعبہ اسلامیات برائے ایم۔اے کلاسز
۵......وزیٹنگ پروفیسر اسلامک سنٹر برائے ایم فل

خطابت : ا......خطیب جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور (ایک مختصر وقت کے لیے)
۲......خطیب اسلام آباد یونیورسٹی، اسلام آباد
۳......خطیب جامع مسجد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Marfat.com

مناصب : ا ...... چیئرمین شعبہ مساجد پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۲ ...... چیئرمین ادارہ ھُدًی للناس ،لاہور

تالیفات : تفسیر روح القرآن 12 جلدوں میں

خطاتِ صدیقی (3 جلدوں میں)

معرفت حق کا سفر (الاسماء الحسنٰی کی شرح)

(ایک ضروری گزارش)

بعض احباب کے اصرار پر ادارہ ہدی اللناس نے س کتاب کا نام ''دروس القرآن'' کی بجائے ''تفسیر روح القرآن'' تجویز کیا ہے۔اس کتاب کی بیشتر جلدیں چونکہ دروس القرآن کے نام سے چھپ چکی ہیں اس لئے اپنے قارئین کرام کو کسی خلطِ مبحث یا غلط فہمی سے بچانے کیلئے یہ گزارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ مناسب سمجھیں تو اپنے پاس نسخوں میں نام کی تبدیلی کر لیں،اور اگر کہیں کتاب کے اندر سابقہ نام کا ذکر آئے تو اسے بھی نئے نام سے بدل دیں۔

Marfat.com

پیش لفظ وتقریظ

از شیخ القرآن والحدیث

حضرت مولانا عبدالمالک صاحب دامت برکاتہم

صدر اتحاد العلماء پاکستان

تفسیرِ قرآن کی فضیلت

''تفسیرِ قرآن'' کا کام سب کاموں سے افضل کام ہے۔ اللہ کا کلام اور اس کے رسول ﷺ کی سنت لوگوں کو دائرۂ اسلام میں کھینچنے اور اسلامی نظام کی اشاعت وتنفیذ کا ذریعہ ہیں۔ جس نے بھی تفسیرِ قرآن کا کام کیا اس نے بہت بڑی فضیلت اور سعادت حاصل کی۔ تفسیر ایک علم ہے اور کسی بھی علم کی فضیلت اس کے موضوع اور غرض وغایت سے متعین ہوتی ہے۔ جس قدر موضوع اور غرض وغایت کی فضیلت ہوگی اسی کے مطابق اس علم کی فضیلت ہوگی۔

تفسیرِ قرآن پاک کا موضوع قرآن پاک ہے اور غرض وغایت قرآنِ پاک کا فہم، اس پر عمل اور اس کا نفاذ ہے۔

قرآنِ پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور اس کی فضیلت تمام کلاموں پر اسی طرح ہے جس طرح خود اللہ رب العالمین کی فضیلت اپنی مخلوق پر ''وَفَضْلُ كَلَامِ اللّٰهِ عَلٰى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ'' (ترمذی شریف)۔ جب کلام اللہ تمام کلاموں سے بڑھ کر فضیلت رکھتا ہے تو علمِ تفسیر جس کا موضوع قرآنِ پاک ہے، وہ بھی تمام علوم سے افضل ہوگا۔ اسی طرح قرآنِ پاک کا فہم، اس پر عمل اور اس کی تنفیذ چونکہ تمام مقاصد سے اشرف مقصد ہے۔ اس لئے علمِ تفسیر اپنی غرض وغایت کے لحاظ سے بھی دوسرے تمام علوم سے افضل ہوگا۔ پھر کسی علم کی فضیلت کے لئے یہ بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ کونسی شخصیات اس علم سے وابستہ ہوئیں اور انہوں نے اس وابستگی سے کیا مقام پایا۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ علم وہ ہے جس کی نسبت جناب نبی اکرم ﷺ سے ہے اور نبی ﷺ کے فضائل کا محور تلاوت آیات، تعلیمِ کتاب وحکمت اور اہلِ ایمان کا تزکیہ ہے۔ سورۃ بقرہ، آیات ۱۱۹۔۱۵۱، آل عمران ۱۶۴، سورۃ جمعہ آیت نمبر۲، نیز نبی ﷺ نے قرآنِ پاک کی جو تفسیر فرمائی وہ آپ کو اللہ رب العالمین کی طرف سے حاصل ہوئی۔ اللہ ربّ العالمین نے فرمایا:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ، فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ، ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (القیمۃ، آیت نمبر: ۱۷تا۱۹)

(ہمارے اوپر ہے اسے آپ ﷺ کے کے سینہ میں جمع کرنا اور پڑھانا۔ پھر جب ہم پڑھیں تو آپ ﷺ اس کے پڑھنے کا اتباع کریں۔ پھر ہمارے ذمہ ہے اسے بیان کرنا)۔

جو کام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے، اس سے افضل کوئی اور کام نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے نبی ﷺ نے فرمایا: ''خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ'' (بخاری شریف)۔ ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآنِ پاک سیکھے اور قرآن پاک سکھلائے۔'' پھر قرآنِ پاک کی تفسیر اس لئے بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ قرآنِ پاک نبی ﷺ کا معجزہ ہے جو نبی ﷺ سے اُمتِ مسلمہ کو وراثت میں ملا ہے۔ اس لحاظ سے قرآنِ پاک ایک ایسا اسلحہ بھی ہے جس کا توڑ کفار کے پاس نہیں ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

Marfat.com

مامن الانبياء نبی الا اوتی ما مثله آمن علیه البشر و انما اتیت وحیا اوحاه الله الیّ فارجوا ان اکون اکثرهم تابعاً یوم القیامة۔ (صحیح بخاری شریف: باب فضائل القرآن)۔

(جو نبی بھی تشریف لائے انہیں ایسے معجزے دیئے گئے جنہیں دیکھ کر لوگ ان پر ایمان لے آئے اور مجھے وحی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف کی۔ اس لئے میں اُمید رکھتا ہوں کہ قیامت کے روز میرے پیروکاروں کی تعداد تمام انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں سے زیادہ ہوگی)۔

دوسرے الفاظ میں قرآنِ پاک اور اس کے بالتبع سنت رسول ﷺ لوگوں کو دائرۂ اسلام میں کھینچ کھینچ کر داخل کریں گے اور یوں دنیا اسلام اور قرآن کے ذریعے مسخر ہو جائے گی۔ پس آج دنیا کو دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کے لیے قرآنِ پاک اور اس کے فہم و ادراک کو عام کرنے کی ضرورت ہے جو اسی صورت میں میسر ہو سکتا ہے کہ ہم قرآنِ پاک کی تفسیر اور اس کے علم کو عام کر دیں۔ قرآنِ پاک کی تلاوت بھی قرآنِ پاک کا امتیاز اور اس کے کتاب اللہ ہونے کی نشانی ہے۔ آج دنیا میں صرف یہی کتاب ہے جس کی تلاوت ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب لوگوں کو دائرۂ اسلام میں آنے کی دعوت دے رہی ہے اور لوگ اس کی تلاوت سن کر بھی مسلمان ہو جاتے ہیں لیکن اس کی اصل کشش اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کے پیغام اور نظام میں ہے جو اس کتاب کے ذریعہ دیئے گئے ہیں۔ اس لئے اس کی معرفت، اس کے پیغام اور نظام کو لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے جو اس کی تفسیر کے ذریعہ ممکن ہے۔

اَلْحَمْدُلِلّٰه ! قرآن پاک کی تفسیر کا یہ سلسلہ نبی ﷺ کے دور سے شروع ہوا اور کسی انقطاع کے بغیر تسلسل کے ساتھ پندرہ صدیوں سے جاری ہے۔ اب تک مختلف زبانوں، مختلف ملکوں اور مختلف النوع اتنی تفسیریں وجود میں آ چکی ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں ہے اور لائبریریوں کے پیٹ ان کو سمیٹنے سے عاجز ہیں۔ یہ قرآنِ پاک کی شان " لا یقضی عجائبه " (الحدیث ترمذی شریف) (اس کے عجائب ختم نہ ہوں گے) کا تقاضہ ہے۔ چنانچہ ہر تفسیر میں نئے نئے نکات سامنے آتے رہتے ہیں اور کوئی تفسیر دوسری تفسیر سے مستغنی کر دینے والی نہیں ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے لے کر شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب اور دیگر جلیل القدر علماء و مفسرین عظام نے گرانقدر علمی، فقہی اور روحانی نکات پر مشتمل تفاسیر پیش کیں جو اہلِ علم کے ہاں مقبول ہوئیں اور ان سے استفادہ سے تفسیری سلسلہ کو بڑھنے اور پھیلنے میں مدد ملی لیکن دورِ حاضر میں مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر تفهیم القرآن اور شہیدِ اسلام سید قطب کی تفسیر فی ظلال القرآن کے ذریعہ قرآنِ پاک کا فہم و شعور علماء و مشائخ کے دائرہ سے نکل کر عوام تک پہنچ گیا۔ ان تفاسیر کے ذریعہ بڑی تعداد میں عوام اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں نے قرآنِ پاک سے فیض حاصل کیا۔ لیکن "لا یقضی عجائبه" کے فرمان رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے ظہور کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی صاحب بھی ان خوش قسمت ہستیوں میں شامل ہیں جنہیں تفسیرِ قرآن کی فضیلت حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور قرآنی عجائب کو پیش کرنے میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کی زندگی قرآنِ پاک میں غور و فکر، تفسیری ذخیرہ کے مطالعہ اور درسِ قرآن دینے میں گزری جو اَب کتابی شکل میں مرتب ہو کر سامنے آ گئے ہیں۔

تفسیر کیلئے شرائط

1- قرآن و سنت عربی زبان میں نازل ہوئے ہیں اس لئے مفسر کیلئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان، اس کی باریکیوں، اس کے اصناف و انواع، اس کے محاسن سے پوری طرح واقف ہو، وہ عربی زبان کی باریکیوں، خوبیوں، اشاروں، کنایوں اور استعاروں سے جس قدر زیادہ واقف ہوگا اسی قدر تفسیر کا حق ادا کر سکے گا۔

Marfat.com

2- مفسر کیلئے جہاں قواعد کی رو سے زبان کی باریکیوں کا جاننا ضروری ہے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ مفسر زبان دانی کا خصوصی ذوق رکھتا ہو۔ کلام کے بہت سے محاسن ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق ذوق سے ہوتا ہے وہ قواعد کے احاطہ میں نہیں آسکتے۔ اسی طرح مفسر کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس زبان میں تفسیر کر رہا ہے، وہ عربی زبان کی باریکیوں کو اس زبان میں اسی طرح سے منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ ساری بات جو عربی مبین میں کہی گئی ہے، اسے اس زبان میں اسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ ادا کر سکے۔

3- اسی طرح قرآنِ پاک کی ایک دعوت اور اس کا ایک مشن ہے، اس کیلئے نبی ﷺ نے ایک تحریک برپا کی۔ اس تحریک کے مختلف ادوار تھے: ہر دور میں قرآنِ پاک کا ایک حصہ نازل ہوا ہے۔ ۸۵ مکی سورتیں ہے اور ۲۹ مدنی سورتیں۔ ان سورتوں کے نزول کے وقت نبی ﷺ اور آپ ﷺ کی جماعت جس مرحلہ میں تھی اس مرحلہ کو سمجھنا قرآن فہمی کیلئے ضروری ہے۔ ان مراحل کو شانِ نزول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح بعض آیات کے خصوصی شانِ نزول بھی ہوتے ہیں۔ تفسیر کو سمجھنے کیلئے ان کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

4- قرآن و سنت ایک نظام ہے جسے نبی ﷺ نے اپنے دور میں عملاً نافذ فرمایا اور اس کے بعد کے ادوار میں نافذ رہا۔ قرآنِ پاک کو سمجھنے کیلئے اس نظام اور اس پر تعامل کو سمجھنا ضروری ہے۔ قرآنِ پاک پر عمل کو جو شکل اور صورت نبی کریم ﷺ، صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین نے دی، اسے نظر انداز کر کے محض لغت کی بنیاد پر تفسیر گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔ جن لوگوں نے ایسا کیا ہے انہوں نے تفسیر کی بجائے تحریف کا ارتکاب کیا ہے۔

5- فصیح عربی زبان کی بنیاد پر ایسی تفسیر کی جاسکتی ہے جو قرآن و سنت، اجماعِ صحابہ و سلف صالحینؒ کے تعامل سے متصادم نہ ہو۔

6- عقلِ سلیم: عقلِ سلیم کے ذریعہ بھی تفسیر کی جاسکتی ہے جبکہ وہ قرآن و سنت، اجماعِ صحابہ و تابعین و سلف صالحین سے ثابت شدہ اُمور سے متصادم نہ ہو۔

7- مفسر کیلئے ضروری ہے کہ وہ ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ اور دیگر علومِ قرآنیہ کا کافی و شافی علم رکھتا ہو۔ حدیث، اجماعِ اُمت، قیاس، اجتہاد، فقہ اسلامی، مذاہب فقہاء، علوم عقلیہ و نقلیہ، تاریخ و قصص سے واقف ہو اور صحیح اور غلط میں تمیز کی پوری صلاحیت رکھتا ہو۔ اب تک کے اہم تفسیری ذخیرہ و تفاسیر بالاثر، تفاسیر بالاجتہاد، تفاسیر لغوی، عقلی و ادبی پر اسے عبور حاصل ہو اور زمانے کے فتنوں اور اس کے احوال سے واقف ہو، ''تفاسیر بالھویٰ'' اور اہلِ ہویٰ کے نظریات و افکار کا ماہر اور ان کی تردید کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہو۔

محترم ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی صاحب عربی زبان، اردو ادب میں بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ تحریک اور دعوت کے مختلف مراحل اور تاریخ اسلام میں بھی بصیرت رکھتے ہیں۔ اسلام کو ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے انہوں نے اچھی طرح سمجھا ہوا ہے اور شریعت اسلامیہ میں گہرائی اور گیرائی کے حامل ہیں۔ تعامل امت، تفسیری اور فقہی ذخیرہ پر بھی عبور رکھتے ہیں اور ایک مفسر میں جو خوبیاں اور کمالات ہونے چاہئیں، جن کا اجمالی ذکر درج بالا سطور میں ہوا ہے، وہ ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی صاحب کے دروسِ قرآن (از سورۃ الفاتحہ تا سورۃ بنی اسرائیل) اور ان کے امتیازات

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی صاحب کے دروسِ قرآن کا یہ سلسلہ سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ الاعراف تک مرتب ہو کر شائع ہو گیا ہے۔[1] مزید دروس زیرِ ترتیب و تدوین ہیں۔ ان دروس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اسلوب عام تفاسیر سے مختلف ہے۔ عام تفاسیر مفسر کی تحریر کا نتیجہ ہوتی ہیں اور یہ دروس دراصل ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی صاحب کی املا اور Dictation کا نتیجہ ہیں۔ یہ محترم ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی صاحب کے

[1] اب تو بفضلہ تعالیٰ دروسِ قرآن کا یہ سلسلہ اختتام کو پہنچ رہا ہے۔

Marfat.com

دروس ہیں جوانہوں نے ہفتہ وار محافل میں پڑھے لکھے شائقینِ علوم قرآنیہ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ان میں علماء، پروفیسرز، دانشور، صحافی، تاجر ، وکلاء، کالجز، یونیورسٹیز اور مدارس کے طلبہ، کارکنانِ تحریکِ اسلامی اور عامۃ المسلمین ان کے مخاطب ہیں اور بڑی تعداد میں ذوق وشوق کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب انہیں اپنے علم اور ولولہ انگیز خطابت کے شہ پاروں سے فیض پہنچاتے ہیں۔ایک بلند پایہ خطیب کی خطابت، جبکہ وہ قرآنی علوم سے دلوں اور دماغوں کو منور کر رہی ہو، کی اثرانگیزی کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔قرآن پاک کی زبان خطابت کی زبان ہے۔اس کی تفسیر بھی خطیبانہ انداز میں ہو تو ظاہر ہے کہ قرآن پاک کے اثر کو اس تفسیر سے زیادہ کردے گی جو خطابت کے انداز کی بجائے تحریر کے انداز میں ہوگی۔ان دروس کا اثر پڑھنے والے پر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ایک سامع پر خطیب کے خطبہ سے ہوتا ہے۔

دوسرا امتیاز یہ ہے کہ قرآنِ پاک ایسی کتاب ہے جو معاشرہ کیلئے ایک غذا اور دوا کی حیثیت رکھتی ہے۔اگر اس کتاب کے ذریعہ مسلمان معاشرہ کو روحانی غذا نہ دی جائے اور کفار ومنافقین کا علاج نہ کیا جائے تو اس کتاب کو اس کا حقیقی اور واقعی مقام نہیں دیا جاسکتا۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی صاحب اس کتاب کو معاشرہ پر منطبق کرتے ہیں۔اس میں اہلِ ایمان کیلئے جو غذا اور کفار ومنافقین کیلئے جو دوا ہے، وہ اسے پوری طرح واضح کرتے ہیں۔مغرب اور اہلِ مغرب کیلئے اس میں جو پیغام ہے، اسے واضح کرتے ہیں۔اہلِ ایمان کو ان کے شر سے باخبر کر کے اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔تفسیری نوٹس ہر جگہ اس بات کے گواہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے دروس کو دیکھ کر بلاشبہ کہنا پڑتا ہے کہ انہیں قرآنِ پاک اور اس کے علوم فنون پر مکمل عبور حاصل ہے۔انہیں صرف ونحو، معانی وبلاغت، اصولِ فقہ، لغت عربیہ، اصول تفسیر، احادیث نبویہ، آثار صحابہ وتابعین، اقوال ائمہ مجتہدین، قدیم وجدید علم کلام، قدیم وجدید مفسرین کے تفسیری ذخیرہ، تاریخ وقصص، مستشرقین وملحدین کے لٹریچر، منکرین سنت اور قادیانیت کے شکوک وشبہات اور ان کی تردید پر مکمل عبور حاصل ہے۔

مضامینِ قرآن، التذکیر بآیات اللہ، التذکیر بایام اللہ، التذکیر بالموت وبما بعد الموت، علم المخاصمہ، علم الاحکام پر مکمل دسترس حاصل ہے۔اللہ تعالیٰ کی قدرت اور جلالی وجمالی شانوں کو جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں اس قدر شرح وبسط سے اور ایسے انداز سے پیش کرتے ہیں کہ انسان اس کی لذت سے سرشار ہو کر ان کے مطالعہ میں اس طرح مستغرق ہو جاتا ہے کہ مضمون دل ودماغ میں اُتر جاتا ہے۔ڈاکٹر صاحب عالم ہیں تو ایسے کہ تبحر علمی ان کی تقریر وتحریر سے نمایاں ہوتا ہے۔ادیب ہیں تو ایسے کہ ادب ان کی لونڈی نظر آتا ہے، خطیب ہیں تو ایسے کہ ان کی شعلہ بیانی آدمی کو مسحور کر لیتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے انہیں ذہانت وفطانت اور حافظہ کی نعمتوں سے نہایت وافر مقدار میں مالا مال کیا ہے۔حافظ العلوم مولانا معین الدین خٹک رحمۃ اللہ علیہ کا حافظ ضرب المثل بن چکا تھا، انہیں چلتا پھرتا ٹیپ ریکارڈر کہا جاتا تھا۔لیکن ڈاکٹر صاحب کے دروس سے اندازہ ہوا کہ ان کا حافظہ بھی مثالی ہے۔انہیں عربی ادب کی طرح اردو ادب پر بھی عبور حاصل ہے۔انہیں اردو زبان کے محاورے اور شعراء کے ہزاروں شعر ازبر اور مستحضر ہیں۔موقع ومحل کی مناسبت سے اشعار کے ذریعہ کلام کو مدلل اور مزین کرنا ان کا کمال ہے۔ہر مضمون کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ قاری اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔ایسے انداز سے دلیل پیش کرتے ہیں کہ بات دل میں اُتر جائے۔عقلی دلائل کی تفہیم کے ساتھ نقلی دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔قدیم وجدید تفاسیر سے نقول پیش کرتے ہیں۔منکرین سنت اور مستشرقین کو مسکت جواب دیتے ہیں۔بلاشبہ ان کے دروس علم اور معلومات کا خزانہ ہیں جو دریا کی سی روانی کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔

Marfat.com

ثلث اوّل کی تفسیر پورے قرآنِ پاک کی تفسیر کا مقام رکھتی ہے۔سورۃ فاتحہ سے لیکر سورۃ توبہ تک،ترتیب تلاوت میں پہلا ثلث ہے جس میں سورۃ فاتحہ مکی ہے اس کے بعد چار سورتیں بقرۃ،آلِ عمران، النساء اور مائدہ مدنی ہیں جن میں اسلامی نظامِ زندگی کو پوری طرح بیان کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہود و نصاریٰ اور منافقین پر سیر حاصل تنقید کی گئی ہے۔ترتیب تلاوت میں ان چاروں سورتوں کا قرآن پاک کے ابتداء میں ہونا اپنے اندر پوری معنویت رکھتا ہے۔اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ مسلمانوں میں زوال کا آغاز نظام حکمرانی کے زوال سے ہوگا۔اس لئے ان سورتوں کو شروع میں رکھا گیا ہے تا کہ قرآن پاک کی تلاوت کا آغاز کرتے ہی یہ چار سورتیں سامنے آجائیں اور قاری کے ذہن میں اسلامی نظام کا پورا خاکہ آجائے۔ان چاروں سورتوں میں نظامِ عبادات : نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نظامِ معاشرت : نکاح وطلاق : نظامِ قصاص و دیت، نظام حدود و تعزیرات، زنا،عمل قومِ لوط، ڈاکہ،شراب، جوا، نظامِ معیشت، تجارت، نظام زکوٰۃ و صدقات، حرمتِ سود، نظامِ سیاست، اسلامی حکومت کے غیر مسلم حکومتوں سے تعلقات، نظامِ وراثت، جہاد و قتال فی سبیل اللہ، امت مسلمہ کی تاریخ، امت مسلمہ کا مقام و منصب، عہدوں کو پورا کرنا۔ شعائراللہ کی تعظیم، قسموں کو پورا کرنا۔قسموں کے کفارے، وضو اور تیمم کا طریقہ، صلوٰۃ القصر ،صلوٰۃ الخوف کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔

سورۃ انعام اور اعراف میں عقیدے کو بیان کیا گیا ہے اور سورۃ انفال میں جہاد وقتال کو بیان کیا گیا ہے۔سورۃ یونس سے لے کر سورۃ مومنون تک مکی سورتیں ہیں۔ان میں عقیدے کو دہرایا گیا ہے۔اس کے بعد سورۃ النور مدنی ہے جس میں نظامِ معاشرت اور حدود کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ سورۃ بقرہ اور نساء کے مضامین کی تکمیل ہے۔اس کے بعد سورۃ الفرقان سے لے کر سورۃ لقمان تک مکی سورتیں ہیں۔ اس کے بعد سورۃ احزاب مدنی ہے اور یہ سورۃ بقرہ اور نساء کے مضامین کی تکمیل ہے۔اس کے بعد سورۃ سبا سے سورۃ احقاف تک مکی سورتیں ہیں۔اس میں عقیدے کو دہرایا گیا ہے۔اس کے بعد سورۃ محمد، سورۃ الفتح اور سورۃ حجرات مدنی ہیں، جن میں جہاد وقتال اور اسلامی معاشرے کا بیان ہے۔اس کے بعد سورۃ ق سے سورۃ واقعہ تک مکی سورتیں ہیں جن میں عقیدے کو دہرایا گیا ہے۔اس کے بعد سورۃ حدید سے سورۃ تحریم تک مدنی سورتیں ہیں جن میں منافقین پر تنقید ہے اور طلاق اور قسم کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔اس کے بعد سورۃ ملک سے لے کر اختتام تک مکی سورتیں ہیں۔بعض مدنی بھی ہیں اور مکی بھی۔سورۃ النصر اور سورۃ لھب مدنی ہیں اور معوذات مکی بھی ہیں اور مدنی بھی۔

یہ قرآنِ پاک کی ترتیب تلاوت ہے۔اس میں نظام اور عقیدے کی سورتوں کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ نظام سامنے رہے اور نظام کی اساس عقیدہ کو نظام کے بعد یا پہلے بار بار دہرایا گیا ہے تا کہ عقیدہ زندہ اور قوی ہو جائے اور اس پر نظام کو استوار کر دیا جائے۔اسی طرح عقیدہ اور نظام دونوں دل و دماغ میں راسخ ہو جائیں۔

مفسر قرآن مولانا ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی صاحب نے نصف اول کے اسی حصے، جو نظام اور عقیدے اور جہاد وقتال کی سورتوں پر مشتمل ہے، کو مکمل کر دیا ہے۔اس طرح گویا انہوں نے پہلے ثلث کو تقریباً مکمل کر لیا ہے اور باقی دو حصے تکمیلی حیثیت رکھتے ہیں۔اس میں انہی مضامین کو دہرایا گیا ہے جو پہلے نصف میں مذکور ہیں۔گویا انہوں نے قرآنِ پاک کی تفسیر ایک طرح سے مکمل کر لی ہے۔بقیہ دو حصے ان شاءاللہ تعالیٰ جلد ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ جائیں گے اور اس طرح ایک نئی اور اپنے دور کی عظیم تفسیر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جائے گی جو ہمارے محترم ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی صاحب کا عظیم اور تاریخی کارنامہ شمار ہوگا۔ان شاءاللہ!

آپ تفسیر کے جس حصہ اور اس کی جس آیت کا مطالعہ فرمائیں گے آپ اس کے انداز، دلائل اور زبان و بیان سے متاثر ہوں گے۔ قرآنِ پاک کی اثر اندازی کو آپ محسوس کریں گے۔آپ پر رقت طاری ہوگی۔رونگٹے کھڑے ہوں گے،خشیت اور خشوع و خضوع میں اضافہ ہوگا۔آپ بیدار ہو جائیں گے اور کچھ کر گزرنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہوگا۔چند مقامات بطور مثال پیشِ خدمت ہیں۔

Marfat.com

سورۃ فاتحہ جو ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی عجیب وغریب تفسیر کی گئی۔ اس کا دیباچہ ''مطالعہ قرآن کی اہمیت وافادیت'' کے نام سے ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس موضوع پر نادر، شاہکار، زرین، انوکھے اور نادر نکات پیش کئے ہیں۔ قرآن پاک کی صفت ھدی للناس و بینات من الھدیٰ کی تشریح کا مصداق قرار دیا ہے، جو ایک نادر اور انوکھا نکتہ ہے جو اس انداز سے کسی دوسری تفسیر میں میری نظر سے نہیں گزار۔ فرماتے ہیں:

یہ کتاب صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ اس میں ہدایت کے بینات بھی ہیں۔ یعنی یہ زندگی کے بارہ میں جو ہدایات دیتی اور زندگی کے جس اسلوب کا حکم دیتی ہے، اس پر دلائل بھی فراہم کرتی ہے۔ یہ صرف عمل کا سامان نہیں کرتی، بلکہ عقل ودانش کو بھی غذا فراہم کرتی اور اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے اور اس کے یہ بینات عقلی بھی ہیں اور فطری بھی، استخراجی بھی ہیں، استنتاجی بھی۔ یعنی دلائل و براہین کے تمام اسالیب ہمیں اس کتاب میں ملتے ہیں۔ لیکن بینات کی ایک خاص صورت جو اس کتاب کی خصوصیت ہے، وہ یہ کہ اس کے بینات تاریخی اور انسانی پیکر بھی ہیں۔ وہ جب یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی معرفت جو ہدایت بھیجی ہے اسے قبول کرو، اسی میں تمہاری دنیوی اور اخروی بھلائی ہے، تو پھر اس پر صرف عقلی ونقلی دلائل ہی پیش نہیں کرتا، بلکہ عملی شواہد بھی پیش کرتا ہے۔ وہ ان افراد اور قوموں کی تاریخ بیان کرتا ہے، جو اس ہدایت کو قبول کرنے کے نتیجے میں کامیاب وکامران ٹھہریں اور ان قوموں کا بھی ذکر کرتا ہے، جو اس کا انکار کر کے تباہی ونامرادی کا شکار ہوئیں۔ وہ انبیاء و رسل اور ان کی زندگی کو بطور عملی دلیل وبرہان کے پیش کرتا ہے۔ کہ دیکھو ان لوگوں نے کس طرح ناموافق وناساعد حالات میں اللہ تعالیٰ کی دعوت کو پیش کیا اور تن تنہا وقت کی قوتوں سے ٹکراتے ہوئے زندگی گزاری۔ کبھی وقت کا دھارا بدلنے میں کامیاب ہوگئے، اور کبھی اس راہ میں کام آ کر استقامت اور اپنے موقف کی حقانیت کا چراغ روشن کر گئے، بعد میں آنے والی نسلوں نے جس سے روشنی پائی۔

قرآنِ پاک سے استفادہ میں کیا رکاوٹیں ہیں، ڈاکٹر صاحب نے انہیں اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا ان کا ہاتھ ایک طرف دورِ حاضر کے مسلمانوں اور ان کی نبض پر ہے اور دوسری طرف وہ قرآنِ پاک میں اس طرح غوطہ زن ہیں کہ اس کی گہرائیوں سے موتی چن چن کر عوام و خواص کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

قرآن کریم کی متعدد خصوصیات اور خصوصی صفات میں سے چند ایک کا ہم نے ذکر کیا ہے جن سے یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی کہ قرآن کریم انسانی رہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمت ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ باقی انسانوں کو تو چھوڑیئے خود وہ امت جس کو اس نعمت کا امین بنایا گیا اور جو اس کی پیش کردہ تعلیمات کی علمبردار ٹھہرائی گئی تھی، وہ خود بھی اس سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا رہی، اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو کسی نہ کسی حد تک پڑھتے تو ضرور ہیں، لیکن ہمیں اس کی صفات کا کبھی استحضار نہیں ہوتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کتاب سے استفادہ کرنے اور فیض یاب ہونے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ قرآن کریم کا موضوع جیسا کہ آغاز کلام میں ذکر ہو چکا، انسان ہے اور قرآن کریم انسانوں کی اصلاح کا ایک نسخہ اور پروگرام ہے۔ لیکن ہمیں یہ علم ہی نہیں کہ اس کا طریق اصلاح کیا ہے؟ آپ اگر غور فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لئے قرآن کریم کا طریق اصلاح بھی یقیناً وہی ہونا چاہئے، جس کا فطری اظہار کائنات کی تعمیر واصلاح میں ہوا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں جہاں کہیں بھی تعمیر کا ظہور نظر آتا ہے۔ اس کے ظہور پذیر ہونے کیلئے دو چیزیں لازمی ہیں۔ ان کے بغیر تعمیر کا عمل مکمل نہیں ہوسکتا۔ پہلی چیز ہے تخریب اور دوسری چیز ہے صالح مادۂ تعمیر، جس میں مطلوبہ نتائج دینے کی صلاحیت موجود ہو۔ آپ کسی بھی تعمیر کا تصور کیجئے، جب تک آپ تخریب سے اس کا آغاز نہیں کریں گے۔ تعمیر کے مرحلہ میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔

Marfat.com

میں تفہیم کیلئے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔فرض کیجئے کہ آپ کوایک قطعہ زمین دیا جاتا ہے کہ آپ اس سے اپنے لئے معیشت کا سامان پیدا کیجئے اوراس قطعہ زمین کا حال یہ ہے کہ اس میں جا بجا ٹیلے سر اٹھائے کھڑے ہیں، گہری کھائیاں ہیں، قد آور درخت ہیں، بیلوں اور جھاڑیوں نے زمین کا ایک ایک انچ روک رکھا ہے،نشیب وفراز کی وجہ سے آبیاری ممکن نہیں اور جڑی بوٹیوں کی بہتات کی وجہ سے تخم ریزی کا کوئی امکان نہیں۔اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟ یقیناً آپ اپنے سفر کا آغاز تخریب سے کریں گے۔آپ کسی ہاتھ میں لے کر جڑی بوٹیوں کوتلف کریں گے۔کلہاڑا لے کر درخت اکھاڑیں گے۔کسی بلڈوزر سے ٹیلوں کو اٹھائیں گے اور کھائیوں کو پر کریں گے۔جب زمین کا سینہ جڑی بوٹیوں درختوں اور خودرو پودوں سے خالی ہوجائے گا اور زمین تخم ریزی اور آبیاری کیلئے ہموار ہوجائے گی،تو اب آپ ہل جوتیں گے اورتخم پاشی کا سامان کریں گے۔اب آپ تعمیر کے مرحلے میں داخل تو ہو گئے،مگراب آپ کیلئے نہایت نازک مرحلہ صالح بیج کا مہیا کرنا ہے۔اگر آپ نے غلط بیج کاشت کردیا یا احتیاطی تدابیر بروئے کار نہ لاسکے،تو آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی،یا آپ نے زمین کوتخم پاشی کے قابل بنا کر چھوڑ دیا۔یعنی تخریبی عمل کے بعد تعمیری عمل کیلئے محنت اور کوشش نہ کی،تو زمین کی قوت نمو کواپنا کام کرنے سے تو نہیں روکا جاسکتا،لہٰذا وہاں پھر جڑی بوٹیاں اگیں گی،خودرو پورے سراٹھائیں گے اور پھر یہ زمین جنگل کا منظر پیش کرنے لگے گی۔

بالکل یہی حال انسانی دل ودماغ کا ہے۔قرآن کریم اور حدیث پاک میں انسانی دل کوزمین سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس میں بھی ایک قوت نمو ہے۔اس میں بھی افکار کی فصل اگتی اور خواہشات کے خودرو پودے سراٹھاتے اور امیدوں اور آرزوؤں کی جڑی بوٹیاں پھیلتی ہیں۔اس میں بھی جھوٹی انا کے قدآور درخت عصبیت وحمیت جاہلیہ کے ٹیلے اور کینہ وبغض کی کھائیاں موجود ہیں۔اب اگر کوئی شخص اپنے دل ودماغ کی زمین میں صالح افکار کی کاشت کرنا چاہتا ہے،تو اسے سب سے پہلے تخریبی مرحلے سے گزرنا ہوگا۔اسے سب سے پہلے باطل افکار،غلط خیالات،جھوٹی آرزوؤں،فرسودہ تصورات،ناآسودہ تمناؤں اور جھوٹے ازموں سے وابستگی اور جھوٹے پندار اور جھوٹی انا کی گرفت اور رسم و رواج کی پابندی جیسی زنجیروں کو توڑنا ہوگا اور پھر اپنے اصلاح اور تعمیری سفر کو وہیں پر ہی ختم نہیں کردینا، بلکہ صالح افکار اور زندہ و پائندہ تصورات کے بیج کوتلاش کرکے صحیح طریق سے اپنے دل ودماغ کی زمین میں کاشت کرنا ہوگا۔اگر ان دونوں باتوں میں سے کسی میں بھی جھول آ گیا تو ساری محنت اکارت جائے گی۔یہی بات اقبال مرحوم نے اپنے انداز میں کہی:

نہادِ زندگی میں ابتداء لاَ انتہاء اِلاَّ پیامِ موت ہے جب لاَ ہوا اِلاَّ سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لاَ سے آگے بڑھ نہیں سکتی یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

لاَ سے مراد وہی تخریبی عمل ہے، جوتعمیری مرحلے کی تمہید ہے اور اِلاَّ وہ مادۂ تعمیر صالح افکار اور عملِ صالح کا بیج ہے،جس کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی فصل لہلہاتی اور بارآور ہوتی ہے۔

اسلام انسانی اصلاح کا جوطریقہ اختیار کرتا ہے،وہ یہی فطری طریقہ ہے۔وہ کہتا ہے کہ وہ انسان جواپنے اللہ سے برگشتہ ہوچکے ہیں، انہیں سب سے پہلے لاَاِلٰـــــہَ پرعمل کرنا ہوگا۔یعنی انہوں نے اپنے دل میں جتنے غیراللہ کے بت بنائے ہوئے ہیں،وہ توڑ پھینکیں جتنے آستانوں سے وابستگیاں بنا رکھی ہیں سب سے توبہ کریں، جتنے خوف غیراللہ کے بسا رکھے ہیں دل سے نکال دیں۔جتنی محبتیں اور امیدیں غیرخدا کی دل میں پال رکھی ہیں، ان سے قطع تعلق کریں۔زندگی کے سفر میں جہاں کہیں غیراللہ سے اثر پذیری، مرعوبیت ،اندیشہ ہائے دوردراز، دانش برہانی کی معصومیت کا یقین یا امیدوں کی شکست وریخت جیسے تصورات موجود ہیں،تو دل کوان سے پاک کریں اور جب یہ دل اوراس کے احساسات ایسی تمام کمزوریوں اور آلودگیوں سے پاک ہوجائیں،تو اب قرآن کریم کے حیات بخش افکار کا بیج ایمان کی شکل میں اس

Marfat.com

یقین کے ساتھ کاشت کریں کہ قرآن کریم کا دیا ہوا ضابطۂ حیات اور طرزِ زندگی ہی حیات بخش اور انسان کی فلاح کا ضامن ہے، اس کا دیا ہوا ہر نظریہ محکم اور ہر قول حرف آخر ہے۔ مخلوق کے بنائے ہوئے نظریات غلط ہوسکتے ہیں اور صحیح بھی، مخلوق کی عقل و دانش کے فیصلے رسا بھی ہوسکتے ہیں اور نارسا بھی۔ مگر خالق انسان کا علم نہ غلط ہوسکتا ہے نہ نارسا، اس لئے جب کبھی خلق اور خالق کے دیئے ہوئے افکار اور اوامر و نواہی طرزِ حیات اور حسن و قبح کے معیارات میں تصادم ہوگا تو مخلوق سے منہ پھیر کر خالق کی طرف لوٹنا ہوگا۔

یہی وہ بات ہے، جسے سورہ بقرۃ میں بہ ایں الفاظ بیان فرمایا گیا۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ لوگوں سے نہ ڈرو (پرواہ نہ کرو) اور مجھ سے ڈرو تاکہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کروں اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ (البقرہ: ۱۵۰)۔ پھر تکمیل دین کی آیت میں اپنی نعمت یعنی قرآن پاک کے اتمام کا وعدہ پورا فرمانے کا اعلان فرمایا اور اس سے پہلے کی آیت میں پھر اس ہدایت اور تنبیہ کو ان الفاظ میں دھرایا۔ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (المائدہ۔۵:۳) آج کافر تمہارے دین سے مایوس ہوگئے ہیں پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ مولانا محمد علی جوہر کا ایک واقعہ اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی راوی ہیں کہ میں ایک دفعہ مولانا سے ملنے گیا، ان کے کمرے میں قدم رکھا تو یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ قرآن کریم مولانا جوہر کے سامنے ہے اور وہ زار و قطار رو رہے ہیں۔ میں فوراً باہر آ گیا، انتظار کیا، مگر دیر تک ان کی طبیعت نہ سنبھلی تو مجبوراً اندر داخل ہوگیا، میرے پاؤں کی آہٹ سن کر مولانا نے سر اٹھایا، مجھے دیکھ کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ پرسکون ہونے پر میں نے رونے کا سبب پوچھا، تو قرآن پاک کی طرف اشارہ کیا، میں نے غور سے دیکھا، تو مذکورہ بالا آیت آپ کے سامنے کھلی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ جب بھی اس آیت کو پڑھتا ہوں، تو اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ پروردگار تکمیل دین اور اتمام نعمت کو فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (المائدہ۔۵:۳) کا ثمر قرار دے رہا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ میں کبھی اپنے آپ کو غیر اللہ کے اثرات سے آزاد نہیں پاتا۔ میری دانش، فرنگی دانش سے متاثر ہے۔ میرا ایمان ہندو اثرات سے آلودہ ہے۔ میرا دل مختلف خواہشوں اور آرزوؤں سے لبریز ہے۔ میرے دماغ پر مختلف مصلحتوں کا پہرہ ہے اور میرا ہر قدم کئی قسم کے اندیشوں سے گراں بار ہے۔ میں اس کے دین اور اس کے قرآن سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ یہ وہ احساسات ہیں جو مجھے بے چین رکھتے ہیں۔ مولانا فی الحقیقت اپنے حوالے سے پوری امت کی داستان کہہ رہے تھے۔ شاید یہی وہ تاثر تھا، جس نے مولانا سے یہ لافانی شعر کہلوایا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

درحقیقت آج مسلمانوں کی اس منبع رشد و ہدایت سے محرومی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ذہنی تحفظات، علمی آلودگیوں اور قلبی وابستگیوں کے ساتھ اس کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہمیں مغرب سے لئے ہوئے افکار کو بھی نہ چھوڑنا پڑے، اپنے معمولات کو بھی نہ بدلنا پڑے اور اپنی قلبی وابستگیوں سے بھی دستبردار نہ ہونا پڑے اور ان کے ساتھ ساتھ قرآن کی برکات سے جھولیاں بھی بھر لیں۔ ظاہر ہے یہ تو کفر اور ایمان، نور و ظلمت زمین اور آسمان اور آگ اور پانی کو اکٹھا کرنے والی بات ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہی مرحلہ ہمیشہ دشوار رہا ہے۔ بقول اقبال:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

Marfat.com

اسے مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آپ ایک ایسے شخص کے سامنے تخلیقِ آدم اور خلافتِ آدم کا قرآنی نظریہ پیش کرتے ہیں، جو ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا اسیر ہے یا ایک ایسے شخص کے سامنے قرآن کا نظام معیشت پیش کرتے ہیں، جو سوشلزم یا سرمایہ داری کو جملہ تفاصیل سمیت برحق سمجھتا ہے یا ایک ایسے آدمی سے قرآن کے بیان کردہ فلسفہ عروج وزوالِ اقوام کا ذکر کرتے ہیں جو روسو، جان لاک یا برٹرینڈ رسل جیسے دانش وروں کی دانش پر ایمان لا چکا ہے۔ ظاہر ہے ایسا آدمی قرآن کریم سے اس وقت تک کیا فائدہ اٹھائے گا، جب تک اپنے اختیار کردہ خیالات کے خول سے باہر نہیں نکلتا۔ اس لئے دل ودماغ کی اصلاح اور زندگی کے معمولات میں صحت مند تبدیلی کیلئے ضروری ہے کہ پہلے اس جھاڑ جھنکار سے دلوں اور دماغوں کو صاف کیا جائے، جو قرآن کریم کی ہدایت، فکر، تعلیم اور نظام کے خلاف ہیں اور پھر افکارِ قرآن کا صالح بیج دل ودماغ کی زمین میں بویا جائے۔ یعنی اس طریق اصلاح میں اولاً دل ودماغ کی زمین کو باطل اعتقادات، فرسودہ خیالات، غیر اسلامی رسم ورواج اور غیر اللہ سے وابستگیوں کو ختم کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان کی موجودگی میں صالح فکر کا کوئی بیج اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ پھر اس کے فوری بعد قرآنی افکار کا بیج بونا ہوگا۔ ورنہ دل کی زمین کو اگر خالی چھوڑا گیا تو وہاں پھر پہلے جیسے خود رو پودے اگ کر اسے جنگل میں تبدیل کر دیں گے اور وہی حادثہ ہوگا، جو اہل مغرب کو پیش آیا۔ انہوں نے لاَ کو تو خوب استعمال کیا بلکہ ضرورت سے زیادہ استعمال کیا لیکن اِلَّا اللّٰہ تک نہ پہنچ سکے۔ نتیجتاً ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بے خدا تہذیب، خدا بیزار تمدن اور خواہشات ومرغوبات کی پرستار معاشرت کی نذر ہو کر رہ گئی۔ اسی کی طرف اقبال اشارہ کرتے ہیں۔

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لاَ سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلاَّ

ڈاکٹر صاحب مزید کہتے ہیں کہ:

اگر ان باتوں کا ہلکا سا تأثر بھی ہمارے ذہنوں میں ہوتا تو اس کی ایک ایک بات ہمارے غور وفکر کا موضوع بنتی اس کے احکام سے ہمارے دل پگھلتے اور جسموں پر کپکپی طاری ہو جاتی اس کی بشارتیں ہماری فرحت ومسرت کا سامان اور اس کے انذار ہماری فکرمندی اور تبدیلی کے محرک ہوتے۔ ہم اس کی ایک ایک آیت کو اپنے نام اپنے مالک کا پیغام سمجھ کر فخر وانبساط سے جھومتے اور اس کی ذمہ داری کو محسوس کر کے گراں بار ہوتے۔ ہم اس کے پیغام کو اللہ کی زمین پر رہنے والوں تک پہنچانے کیلئے پریشان اور اس کے ماننے والوں پر نافذ اور قائم کرنے کیلئے فکرمند ہوتے۔ ہم اسے طاقوں میں سجانے کی بجائے دلوں میں سجاتے اور اسے تعویذ بنانے کی بجائے زندگی کا عمل بناتے۔ ہم اسے صرف حصول ثواب یا ایصال ثواب کی کتاب نہ سمجھتے بلکہ اسے کتاب زندگی اور کتاب انقلاب سمجھ کر اپنی زندگی اس کی رہنمائی میں دے دیتے اور اجتماعی زندگی میں اس کے ذریعہ انقلاب برپا کرتے۔ نتیجتاً ہماری دنیا بھی خیر وبھلائی کا گہوارہ ہوتی اور آخرت میں اللہ کی رضا وخوشنودی ہمارے انتظار میں ہوتی۔ دنیا کی قوموں میں ہمارا ایک مقام اور وزن ہوتا اور دنیا کے فیصلے ہمارے بغیر ادھورے رہتے مگر آج ہم روئے زمین پر ایک ایسی امت ہیں جن کے پاس قرآن کریم کی شکل میں ہیروں کی ایک کان موجود ہے مگر ہم اسے خزف ریزے سمجھ کر پسِ پشت پھینک چکے ہیں۔ ہمارے پاس زندگی کے ایک ایک مسئلے کا حل موجود ہے مگر ہم اسے درخورِ اعتنا سمجھنے کیلئے تیار نہیں۔ ہمارے پاس ایک بہترین نظامِ زندگی میسر ہے مگر اسے نافذ کرنے کیلئے آمادہ نہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں عصائے موسیٰ ہے لیکن ہم جادوگروں کی رسیوں سے خوف زدہ ہیں۔ ہمارے پاس ایک مشعلِ حق ہے لیکن ہم تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے پر مصر ہیں۔ قرآن ہم سے فریاد کرتا ہوا سنائی دیتا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے ہم کب اس پر کان دھریں گے۔

Marfat.com

میری ان تمام دردمندانہ گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اپنے اندر وہ حقیقی احساس پیدا کریں جو ہمارے دلوں میں قرآن کریم کی حقیقی اہمیت اور عظمت پیدا کردے اور جس کے نتیجے میں ہمارے دلوں میں دردوسوز اور فکرمندی کی ایسی آگ بھڑکے جو ہماری غفلت اور قرآن سے لاپرواہی کے تمام خس وخاشاک کو جلا کر راکھ کردے اور ہم ہر طرف سے کٹ کر اللہ کے آستانے پر اس طرح سر رکھ دیں اور اپنی عاجزی کا حوالہ دے کر اس طرح اپنے اللہ سے توفیق مانگیں جس طرح اللہ کے آخری اور سب سے پیارے رسول ﷺ نے اپنی اس دعا کے ذریعے ہمیں مانگنا سکھایا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ، اِبْنُ عَبْدِکَ، اِبْنُ اَمَتِکَ نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ، مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُ کَ اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اِسْمٍ ھُوَلَکَ، سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوْعَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِنْ خَلْقِکَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذِھَابَ ھَمِّیْ وَغَمِّیْ.

اے اللہ! میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے۔ مجھ پر تیرا حکم جاری ہے۔ میرے بارے میں تیرا فیصلہ حق ہے۔ میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطے سے جو تیرا ہے، جس سے تو نے اپنے کو پکارا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی کا علاج بنادے۔ (آمین ثم آمین)

سورۃ الفاتحہ کے اسلوب پر جو نوٹ لکھا ہے اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو علامہ زمخشری کی فصاحت و بلاغت اور کلام فہمی کے ذوق میں سے وافر حصہ ملا ہے۔ انہوں نے سورۃ فاتحہ کی تمام آیات، اس کے تمام کلمات کی کماحقہ تفسیر کی۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت، اللہ کی عبادت اور اس سے استعانت کی دلآویز تفسیر، صراطِ مستقیم پر چلانے کی دعا پر اکتفا کرنے کی بجائے منعم علیہم کے راستے پر چلانے کے اضافہ کا بلیغ نکتہ بیان کرنے کے بعد موت، عالمِ برزخ، قیامت نفخۂ اولیٰ، نفخۂ ثانیہ نامۂ اعمال، وزن اعمال وغیرہ تمام مسائل کو پورے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا۔ یہ ساری بحث انتہائی مؤثر اور دلنشین ہے۔ ملاحظہ ہو:

عربی زبان میں عبودۃ' عبادت اور عبودیت عَبَدَ سے مصدر ہے۔ اس کے اصل معانی خضوع اور تذلل کے ہیں یعنی تابع ہوجانا' رام ہو جانا۔ کسی کے سامنے اس طرح سپر انداز ہوجانا کہ اس کے مقابلہ میں کوئی مزاحمت یا انحراف وسرتابی نہ ہو اور وہ اپنی منشا کے مطابق جس طرح چاہے خدمت لے۔ اسی اعتبار سے عرب اس اونٹ کو بعیر معبد کہتے ہیں جو سواری کیلئے پوری طرح رام ہوچکا ہو اور اس راستے کو طریق معبد کہتے ہیں جو کثرت سے پامال ہو کر ہموار ہوگیا ہو پھر اسی اثر سے اس مادہ میں غلامی' اطاعت' پوجا' ملازمت اور قید کے مفہومات پیدا ہوئے۔'' (ص ۹۲)۔

اس کے بعد غلامی کے صحیح مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس غلامی کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ ہم نہایت اختصار سے عرض کریں گے کہ غلامی کے اس مفہوم میں چار تصورات داخل ہیں۔

۱۔ غلام اسے کہتے ہیں جس حق ملکیت حاصل نہ ہو۔ اس کے پاس جو کچھ ہے، چاہے وہ جسم ہے یا جان، ان تمام چیزوں کا مالک اس کا وہ آقا ہے جس کا وہ غلام ہے۔

۲۔ چونکہ وہ کسی چیز کا مالک نہیں اس لئے وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں اپنے زیر تصرف چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ یعنی مجھے آزادانہ تصرف کا حق حاصل ہے۔ جیسے چاہوں استعمال کروں۔ اس لئے کہ آزادانہ تصرف کا حق اور من مرضی کا اختیار وہاں ہوتا ہے جہاں آدمی کو حق ملکیت حاصل ہو۔ کیونکہ اسی حق سے باقی حقوق پیدا ہوتے ہیں۔

Marfat.com

۳۔ غلام وہ ہوتا ہے جو اپنی زندگی، نصب العین اور زندگی کا مقصد از خود متعین نہیں کرسکتا۔ وہ خود یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ مجھے زندگی کس طرح گزارنا ہے۔ میں ایک عالم بن کر زندگی گزاروں یا ایک استاد بن کر، مجھے انجینئر بننا ہے یا ایک تاجر بننا ہے۔ میں زندگی اپنے لئے گزاروں یا لوگوں کی خدمت کیلئے صرف کردوں۔ ان میں سے کسی بات کا حق نہیں ہوتا۔ اس کی ان باتوں کا اختیار اس کے آقا کو ہے۔ وہ جو مقصدِ زندگی متعین کردے اسے اسی مقصد کے عین مطابق زندگی گزارنا ہوگی۔

۴۔ غلام کا آقا اسے جس حال میں رکھے اسے اس بات کا حق نہیں ہوتا کہ وہ حرفِ شکایت زبان پر لائے۔ وہ ادب و احترام سے اپنی ضرورتیں اپنے آقا کی خدمت میں پیش کرسکتا ہے بلکہ شاید اس کو یہ بات اچھی لگے کہ اس سے مانگتا رہے لیکن اگر وہ اسے دینا پسند نہ کرے یا اس کی مرضی کے مطابق دینا پسند نہ کرے تو اسے یہ حق نہیں کہ وہ اس کے خلاف سوچے، زبان کھولے یا دوسروں سے شکایت کرے۔ (ص ۹۶،۹۷)"

مختلف واقعات سے بات کو ذہن نشین کرنے کے بعد مزید فرماتے ہیں:

یہ ہے غلامی کا وہ حقیقی مفہوم کہ ہر مسلمان اپنے اللہ کا غلام ہے۔ نہ اس کا جسم اپنا ہے نہ جان نہ اس کی صلاحتیں اور توانائیاں اپنی ہیں نہ جسمانی قوتیں نہ اولاد پر اسے حق ملکیت حاصل ہے نہ مال و دولت پر یہ سب کچھ اللہ کی دین ہے۔ وہی ان سب کا مالک ہے۔ مسلمانوں کے پاس یہ اس کی دی ہوئی امانت ہے۔ امانت میں ان حدود سے تجاوز کرنا جو امانت رکھنے والے نے عائد کردی ہیں یا اپنی مرضی اس طرح استعمال کرنا جو امانت کو ملکیت بنا دے تو یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہے۔ ہم اپنی ان چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کے ہرگز مجاز نہیں۔ زندگی اس نے ہمیں گذارنے کے لئے دی ہے تو گزارنے کے طریقے بھی عطا فرمائے ہیں۔ اس میں اپنی مرضی سے لکیریں کھینچنا' اپنی مرضی سے نقشے بنانا' اپنی مرضی سے اس کے اصول و ضوابط اور آداب وضع کرنا یہ بندگی اور غلامی کے آداب کے خلاف ہے۔ (فاتحہ، ص ۹۸)

التَّذْکِیْرُ بِآلَاءِ اللّٰہِ

اللہ تعالیٰ کی شانوں کی وضاحت کرتے ہوئے مسلمانوں کے موجودہ احلات پر تبصرہ کرکے انہیں تنبیہ کرتے ہیں کہ جب تمہاری پارلیمنٹ قرآن وسنت کے تابع نہ ہو تو پھر تم نے اللہ تعالیٰ کو اِلٰہ نہیں مانا۔ ملاحظہ ہو:

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ O

"اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، سب کا قائم رکھنے والا ہے، نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، کون ہے جو سفارش کرے اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے مگر جو وہ چاہے، حاوی ہے اس کا اقتدار آسمانوں پر اور زمین پر، اور نہیں تھکاتی ہے اسے ان دونوں کی حفاظت، اور وہ بلند ہے اور عظیم ہے۔" (البقرۃ:۲۵۵)

سب سے پہلی بات جو اس آیتِ کریمہ میں فرمائی گئی ہے وہ اللہ کا تعارف اور اس کی اصل حیثیت کی وضاحت ہے۔ مشرکین عرب اپنی ساری گمراہیوں کے باوجود اللہ کو تسلیم کرتے تھے اور اہلِ کتاب تو اللہ اور اس کے رسولوں پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ اس لئے اللہ کا اقرار اور اس کا ایمان دنیا کی ایک مسلمہ بات تھی۔ البتہ گمراہی کی ابتداء اس بات سے ہوتی تھی کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اور اِلٰہ ہے یا نہیں؟ یہود نے اللہ کو اِلٰہ قرار دینے کے باوجود شرک کی مختلف صورتیں پیدا کر رکھی تھیں اور نصاریٰ نے تو اس قدر غلو سے کام لیا کہ انہوں نے عیسیٰ ابن مریم علیہ

Marfat.com

السلام کواللہ بناڈالا۔ یہ اگر چہ تمام نصاریٰ کا عقیدہ نہ تھا البتہ ان میں ایک قابلِ ذکر تعداد لوگوں کی ایسی موجود تھی جن کے بارے میں قرآنِ کریم نے کہا: ''لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ'' (تحقیق ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا مسیح ابن مریم اللہ ہے)۔
لیکن مشرکین عرب اللہ کو ایک ماننے کے ساتھ ساتھ اس کی الوہیت میں نہ جانے کس کس کو شریک بناتے تھے۔ قرآنِ کریم نے مختلف جگہوں میں الوہیت کے مفہوم کی وضاحت کی ہے اور سورہ الفاتحہ کی پہلی آیت کی وضاحت کے سلسلے میں ہم اس پر معروضات پیش کر چکے ہیں۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اِلٰہ ''معبود'' کو بھی کہتے ہیں اور حاکم حقیقی کو بھی۔ اور وہ ذات بھی اِلٰہ ہے جس کی محبت عبودیت کا عنوان بن جائے اور وہ بھی اِلٰہ ہے جسے حضور وغیاب میں پکارا جائے اور استمداد کی جائے۔ لیکن قرآنِ کریم نے ان تمام حوالوں سے صرف اللہ ہی کو اِلٰہ قرار دیا کہ ''وہی تمہارا معبود ہے، وہی تمہارا حاکم حقیقی ہے، وہی ہے جس کی محبت سے دل آباد رہنا چاہئے، وہی ہے جس کا خوف اور جس کی ناراضگی کا اندیشہ سب سے مؤثر عامل ہونا چاہئے، وہی ہے جس کے سامنے دستِ سوال پھیلنا چاہئے اور وہی ہے جس سے تنہائیوں میں عجز و نیاز کی مناجات ہونی چاہئے۔ مولانا حالی نے بڑی خوبصورتی سے بعض احادیث کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی ہے:۔

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق — زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق — اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ — جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم — اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم — اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرّا ہے شرکت سے اس کی خدائی — نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

آیۃ الکرسی کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بنائے نزاع یہ بنیادی حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام عظمتوں کا حقیقی مالک کون ہے؟ کون ہے جس کے سامنے سر بھی جھکنے چاہئیں اور اسی کی غیر مشروط اطاعت بھی ہونی چاہئے؟ اسی کو غیر مشروط طور پر آئین اور قانون دینے کا حق ہے؟ وہی ہے جس کی عظمت تمام عظمتوں کا آستانہ ہے۔ اسی پر دنیا ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتی ہے۔ جو لوگ یہ تمام حقوق اللہ کیلئے سمجھتے ہیں، ان کیلئے کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ کسی بادشاہ، کسی آمر مطلق کے سامنے سر جھکا دیں۔ وہ کسی پارلیمنٹ کے بارے میں بھی یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ اس کا دیا ہوا آئین و قانون اس صورت میں بھی واجب الاطاعت ہے جبکہ وہ اللہ کے آئین کے توڑ پر تیار کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی کی الوہیت کا یہ لازمی نقطہ ہے کہ حکم صرف اسی کو زیب دیتا ہے، اسی کی بات حرفِ آخر ہوتی ہے، وہی ہے جس کی کسی بات کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں ہر اس حاکم کی حکومت قابلِ تسلیم ہوگی اور اس پارلیمنٹ کے فیصلے احترام کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے جس میں اللہ کے احکام کی اطاعت کو اولین حیثیت دی گئی ہو۔ جس کی تمام تر قانون سازی صرف اس دائرے میں ہو جہاں اللہ کی شریعت خاموش ہو اور جس کی سوچ کے تمام دھارے اسلامی شریعت کی سوچ سے ہم آہنگ ہوں۔ جب کوئی شخص، کوئی پارلیمنٹ اللہ کی عظمت کو نظر انداز کر کے اپنی عظمت منوانے لگتی ہے یا اس کے آئین کو بائی پاس کرنے کی کوشش کرتی ہے تو یہیں سے اللہ کے ماننے والوں کیلئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی ہر کوشش کو ناکام بنادیں یا کم از کم اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ کیونکہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

(البقرہ، ج۲ص ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰)

Marfat.com

آیت شہادت کی تفسیرِ دلپذیر

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

(اللہ نے شہادت دی ہے اس بات کی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور (یہی گواہی دی ہے) فرشتوں نے اور اہلِ علم نے (اور ان سب نے یہ بھی گواہی دی کہ وہ) عدل وانصاف کو قائم فرمانے والا ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے۔ وہ غالب اور حکمت والا ہے)۔

اس سورۃ کے آغاز میں یہی مضمون گزر چکا ہے۔ اب دوبارہ اسی مضمون کو ایک دوسرے پہلو سے، لیکن ایک شاندار تمہید کے ساتھ، بیان فرمایا ہے۔ پہلے صرف یہ بات بیان فرمائی تھی کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰـہ نہیں اور اس کا انداز حاکمانہ اور شاہانہ تھا۔ گویا اپنی مخلوق اور رعایا کو پروردگار اپنی اصل حیثیت کے متعلق آگاہ فرما رہے ہیں اور جب یہ حیثیت ان کے سامنے واضح ہوگئی تو اس کے بعد فرمایا کہ ہم چونکہ معبود اور حاکمِ حقیقی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ اپنی مخلوق، اپنی رعایا اور اپنے بندوں کیلئے ایسی کتاب نازل کریں جو ہمارے فرامین کا مجموعہ ہو جس میں بندوں کو زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا گیا ہو اور بندگی کے آداب واضح کئے گئے ہیں۔ لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں پروردگار نے اسی بات کو نسبتاً تفہیم کے انداز میں ایک دلیل کے ساتھ واضح فرمایا اور مزید اپنے تعارف میں ایک صفت کا اضافہ فرمایا ہے۔ جس سے بہت ساری حقیقتیں واشگاف ہو جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس آیتِ کریمہ میں پانچ باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:

۱۔ اللہ، فرشتوں اور اہلِ علم کی گواہی۔

۲۔ اس بات پر گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔

۳۔ اس بات کی گواہی کہ اللہ انصاف اور قسط کو قائم کرنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔

۴۔ اس بات کا تکرار کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔

۵۔ اللہ تعالیٰ عزیز اور حکیم بھی ہے۔

اب ہم اسی ترتیب سے ان باتوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس کے بعد آیت میں بلاغت کے نکات اور مضمون کی ایسی تشریح کی ہے کہ انسان عش عش کر اُٹھتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں تفسیرِ سورۃ آلِ عمران، آیت نمبر ۱۸، ص ۳۷، ۳۹ تا ۴۰:۔

غزوۂ احد کے معرکہ کے ضمن میں آیت قرآنی مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کو علم کا بحرِ زخار بخشا ہے۔ اس معاملے میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ لیکن اس علم کو قرآنِ کریم نے اطلاع علی الغیب کے نام سے تو یاد کیا ہے علمِ غیب کے نام سے یاد نہیں کیا۔ کیونکہ علمِ غیب کیلئے ضروری ہے کہ وہ ذاتی ہو کسی ذریعے اور واسطہ سے نہ ہو۔ کوئی اس کا عطا کرنے والا نہ ہو اور دوسری یہ بات کہ کلی ہو جزئی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ جو علم دینا چاہیں جس کی ضرورت سمجھیں وہ عطا فرما دیں لیکن اپنے طور پر علمِ غیب کے خزانوں تک رسائی یہ صرف اللہ کی شان ہے۔ شیخ سعدیؒ مرحوم نے اس حقیقت کو ایک مثال سے واضح فرمایا ہے:

Marfat.com

یکے پرسید زاں گم کردہ فرزند کہ اے روشن گہر پیر خرد مند
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی چرا در چاہِ کنعانش ندیدی
بگفت احوالِ ما برقِ جہانست دمِ پیدا و دیگر دم نہانست
گہے برطارم اعلیٰ نشینم گہے برپشتِ پائے خود نہ بینم
اگر درویش برحالے بماندے سرِ دست از دو عالم بر فشاندے

(مفہوم یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ جنابِ والا! آپ کے صاحبزادے یوسف علیہ السلام کا پیراہن مصر سے چلا تو آپ کو اپنے گھر میں اس کی خوشبو آ گئی لیکن کنعان کے کنویں میں جو چند میل کے فاصلے پر ہے، آپ کو پتہ نہ چل سکا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارا حال تو بجلی کی مانند ہے۔ ادھر چمکتی ہے اُدھر ڈوب جاتی ہے۔ کبھی تو ہمیں بلند بالا خانے پر بٹھا دیا جاتا ہے کہ ہم دنیا کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کی پشت کی خبر نہیں ہوتی۔ اگر درویش کو ایک ہی حالت پر رکھا جاتا تو وہ اس دنیا میں رہنے کے قابل نہ رہتا۔)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہے۔ ضرورت کے مطابق وہ ہر علم سے نواز ہے۔ اس لحاظ سے وہ ساری دنیا سے الگ ممتاز اور بے مثل ہوتا ہے۔ اللہ کے مقابلے میں اس کا علم اتنا بھی نہیں جتنا سمندر کے مقابلے میں قطرہ۔ لیکن باقی مخلوق کے مقابلے میں وہ بحرِ ناپیدا کنار ہوتا ہے۔ لیکن جیسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس علم کو علمِ غیب کے نام سے قرآنِ کریم نے یاد کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کی زبان سے کہلوایا گیا کہ

لَآ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ اَعْلَمُ الْغَیْبَ (میں تم سے یہ نہیں کہتا میں غیب کا علم جانتا ہو)۔"

علم غیبے کس نمی داند بجز پروردگار ہر کسے گوید کہ می داند ازو باور مدار
مصطفیٰ ہرگز نہ گفتے تانہ گفتے جبرائیل جبرائیل ہرگز نہ گفتے تانہ گفتے کردگار

(اللہ کے سوا علمِ غیب کوئی نہیں جانتا۔ جو کہے جانتا ہے، اس کا یقین نہ کرو کیونکہ مصطفیٰ ﷺ کبھی کچھ نہیں فرماتے جب تک حضرت جبرائیل وحی لے کر نہیں آتے اور جبرائیل کبھی کچھ نہیں کہتے جب تک اللہ تعالیٰ ارشاد نہیں فرماتے۔)

مختصر یہ کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو تمام وہ علوم بخشے گئے جو آپ ﷺ کی شان کے لائق تھے اور جن کی آپ ﷺ کے فریضۂ منصبی کیلئے ضرورت تھی اور اس لحاظ سے کوئی آپ ﷺ کے مثل نہیں۔ لیکن یہ آپ ﷺ کا علم جس کی وسعتوں کو ہم نہیں جانتے، علمِ غیب نہیں ہے۔ علمِ غیب صرف اللہ کی صفت ہے۔ عالم الغیب صرف اسی کو کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک اصطلاحی بحث ہے۔ جو شخص آنحضرت ﷺ کے علم کا انکار کرے وہ غلط ہے اور جو آپؐ کے علم کو علمِ غیب قرار دے وہ بھی غلط ہے۔ حق یہ ہے کہ آپؐ کا علم عطائی ہے، ذاتی نہیں۔ جزئی ہے، کلی نہیں۔ انسانوں میں آپؐ جیسا کوئی نہیں اور اللہ کی شان سب سے بالا اور بلند ہے، وہاں تک کسی کی رسائی نہیں۔ (آلِ عمران، صفحہ ۲۹۸، ۲۹۹)

یہود و نصاریٰ کے بارے میں قرآنی ہدایات کیا ہیں اور مسلمان حکمرانوں اور سیاستدانوں کا رویہ کیا ہے؟ اس پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بیسیوں جگہ اس بات کا حکم دیا:

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ O

(مسلمانو! یہود اور نصاریٰ کو کبھی اپنا ہمدرد اور خیر خواہ نہ سمجھنا اور نہ کبھی دوست نہ بنانا، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ ہیں لیکن تمہارے بدترین دشمن ہیں)۔

لیکن آج کے مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ سیاست دانوں اور حکمرانوں کی ایک بڑی تعداد بری طرح اس بصیرت سے محروم ہو چکی ہے۔ یہود و نصاریٰ کی دشمنی اپنی جگہ قائم ہے لیکن ہم ان کی دشمنی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر مرحلے پر مسلمانوں کو تباہ کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ اب تو وہ مسلمانوں کے دو ملکوں پر قبضہ بھی کر چکے ہیں۔ لیکن ہماری بے بصیرتی کا عالم یہ ہے کہ ہم ان کی دشمنی کو بھی خیر خواہی سمجھتے ہیں۔ وہ قدم قدم پر دھوکہ دیتے ہیں لیکن ہمارے اعتماد میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ہمارا حال تو یہ ہے:۔

بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی ہے
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے ہیں

آج تو انہوں نے پورے عالمِ اسلام کو لہو میں نہلا دیا ہے۔ ان کی عظمتیں خون آلود کر دی ہیں۔ ان کے ادب و احترام کے مراکز ان کی بمباری کی زد میں ہیں۔ ان کے دین، تہذیب اور ثقافت کی ایک ایک بات انہیں کھٹکتی ہے اور وہ اسے مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں لیکن ہمارے دانشور اور ہمارے سیاستدان ان سے اب بھی وفا کی اُمید رکھتے ہیں۔

تم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

قرآنِ کریم نے یہود و نصاریٰ دونوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ دونوں مسلمانوں سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ مسلمان اپنا دین چھوڑ کر ان کا دین اختیار نہ کر لیں۔ قرآن کے نزول کے وقت یقیناً یہود و نصاریٰ کا یہی حال تھا۔ لیکن ہمارے قومی شاعر اقبال نے جب آزادی سے پہلے یورپ کے مرکز میں رہ کر ان استعماری قوتوں کو دیکھا اور پہچانا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا۔

کرے قبول اگر دینِ مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

(سورۃ النساء، ص۱۸۶)

مزید ملاحظہ فرمائیں:۔

مسئلہ عصمت انبیاء بقرہ آیت نمبر ۳۶ ص ۲۳۹۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ کی عمدہ تفسیر بقرہ، جلد ۲، آیت نمبر ۱۸۴ ص ۴۷۔۴۹۔ مسئلہ خلافت کی مدلل اور عام فہم تشریح۔ تفسیر سورۃ بقرۃ، جلد ۱، آیت خلافت ۳۰ ص ۱۲۶۔۱۲۹۔ ان الذین آمنوا والذین هادوا کی تفسیر میں ملحدین کے الحاد کی مدلل تردید۔ تفسیر سورۃ بقرۃ، جلد اول، آیت ۶۲ ص ۲۰۲۔۲۰۳۔ موسیٰ علیہ السلام کا بحرِ قلزم عبور کرنا ایک معجزہ تھا۔ اس سلسلے میں سرسید احمد خان کے نظریہ پر تنقید۔ تفسیر سورۃ اعراف، آیت ۱۳۷ ص ۲۱۸۔۲۲۰۔ ایک نادر نکتہ۔ دینی جماعتوں کیلئے اجل مسمّٰی۔ تفسیر سورۃ اعراف آیت نمبر ۲ ص ۱۷، ۱۸

☆☆☆

Marfat.com

یہ دروس ان شاء اللہ تفہیم القرآن اور فی ظلال القرآن کے سلسلہ کی تکمیل شمار ہوں گے اور اسے تمام دینی حلقوں میں یکساں قبولیت حاصل ہوگی۔ دینی مدارس کے علماء و طلبہ، مساجد کے آئمہ و خطباء، کالجز اور یونیورسٹیز کے اساتذہ، پرنسپلز، اسلامی تحریکات کے قائدین و کارکنان اس سے استفادہ کریں گے اور یہ دروس اس نوع کے مزید دروس کی بنیاد ثابت ہوں گے۔ ان دروس سے استفادہ کرنے والے انشاء اللہ محافل دروس قائم کر کے قرآن پاک کی اشاعت کے سلسلہ کو وسیع اور مستحکم کریں گے۔ اللہ کرے کہ ایسا ہو۔

این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَى النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ.

خادم العلم والعلماء

عبدالمالک

Marfat.com

فہرست سورۃ الفاتحہ

مضامین	صفحہ نمبر
مطالعہ قرآن کی اہمیت اور افادیت	1
چند مخصوص صفات قرآنی	3
خود کو قرآن کی تعلیمات قبول کرنے کے قابل کیسے بنایا جائے	6
اگر ہم کلام اللہ کا کچھ بھی ادراک رکھتے ؟	10
اسلامی تہذیب اور بِسْمِ اللّٰہ	11
بِسْمِ اللّٰہ کی اس قدر تاکید کیوں؟	12
صرف شریعت کے مطابق کام سے پہلے بِسْمِ اللّٰہ پڑھنی چاہیے	14
برکت کا اصل مفہوم	14
بِسْمِ اللّٰہ کا مفہوم	15
قرآن میں بِسْمِ اللّٰہ کی اصل جگہ اور اہلِ علم کی رائے	16
بِسْمِ اللّٰہ سے متعلق چند احکام و مسائل	16
سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ	18
اُسلوب سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ	19
سورۃ کی خصوصیات اور اس کے اسماءِ مبارکہ	20
فاتحۃ الکتاب	20
ام القرآن	22
اساس القرآن	22
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	23
اللّٰہ جَلَّ جَلَالُہٗ	25
لفظ اللہ کے لفظی خواص	26
اسم ''اللہ'' کی معنوی بحث	26
معرفتِ رب کا اصل ذریعہ	29
رَبِّ الْعَالَمِیْنَ	30
قرآن میں رب کا تصور	32

Marfat.com

یہود ونصاریٰ کا تصورِ رب 34
الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ 35
رحمت کا مفہوم 36
کائنات کا حُسن اللہ کی صفتِ رحمت کا ظہور ہے 39
اللہ کی رحمت خود روزِ جزاء پر دلیل 43
مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ 45
آخرت کا تعارف 47
موت 48
برزخ 49
عالمِ برزخ میں سوال وجواب کی کیفیت 50
عالمِ برزخ میں ارواح کا مقام 53
احوالِ قیامت اور اس کے وقوع کے دلائل 53
نفخہ اولیٰ کے بعد کی کیفیت 54
نفخہ ثانیہ کے بعد کی کیفیت اور اس کے دلائل 57
نفخہ ثانیہ کے بعد کی تفصیلات 63
نامۂ اعمال کی نوعیت 65
سزا وجزا کا ہندوانہ نظریہ 67
سزا وجزا کا اسلامی نظریہ 68
اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ 70
حضور ﷺ کی بعثت سے قبل عبادت کے چار تصورات 71
اسلام میں عبادت کا تصور 73
عبادت کا مفہوم 74
اسلام میں غلامی کا مفہوم 75
مسلمانوں میں عبادت کا غلط تصور 80
نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو عبادت کہنے سے اسلام کی مراد 81
انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دو بنیادی وجوہات 82
حاصلِ کلام 83

Marfat.com

وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ 84
اللہ کے ولیوں سے دعا کروانا اور برکت حاصل کرنا 85
اعتراف سے دعا تک کا سفر 85
تکوین وجود کے چار مراتب 86
1-سامن مچھلی 87
2-ایل مچھلی 87
ہدایت کے چار مراحل 87
ہدایت الہام 87
ہدایت حواس 88
جوہر عقل 89
عقل کو ہدایت کل تسلیم کرنے کے نقصانات 90
وحی نبوت کی ہدایت 94
ہدایت کا مفہوم 96
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا مفہوم 98
أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے مراد 99
1-نبی 100
2-صدیق 101
3-شہید 102
4-صالحین 102
ضَآلِّيْنَ سے مراد 103
مَغْضُوْبِ اور ضَآلِّيْنَ کی مثال دینے سے مقصود کیا ہے؟ 104
خلاصہ سورۃ 104

☆☆☆☆☆

Marfat.com

مطالعہ قرآن کی اہمیت اور افادیت

آج ہم اللہ کی توفیق سے قرآن پاک کو سیکھنے اور سمجھنے کا آغاز کر رہے ہیں۔ میرا بھی اور یقیناً آپ کا بھی یہ ارادہ ہوگا کہ ہم اللہ کی اس کتاب کے حرف آغاز سے لے کر حرف ختم تک اس طرح استفادہ کریں کہ اس کے الفاظ ہمارے دل و دماغ کی تختیوں پر کندہ ہو جائیں، اس کا فہم ہمارے لئے آسان ہو جائے اور اس کا ایک ایک حکم اور ایک ایک ہدایت ہماری زندگی کا سرمایہ بن جائے۔ ہم ان مقاصد کے حصول کے لئے بقدر ہمت کوشش بھی کریں لیکن ساتھ ساتھ اللہ سے توفیق بھی مانگیں کیونکہ ہم اس کے عاجز بندے ہیں۔ ہمارے اندر عمل کا ارادہ، پھر اس پر استقامت اور ہمارے لئے اس کی تسہیل اللہ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی بھی اچھے سے اچھے کام کو کرنے کا ارادہ بجائے خود ایک نیکی ہے، لیکن نیکی کو نیکی سمجھنا اور پھر شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنا اور پھر مسلسل اس راستے پر چلتے رہنا، یہ اللہ کی توفیق کے بغیر سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اس لئے اگر ہم ایک طرف اپنی ہمتوں کو بروئے کار لانے کے مکلف ہیں، تو ساتھ ہی اللہ سے توفیق مانگنے کے بھی محتاج ہیں۔ لیکن یہ دونوں باتیں ہمارے لئے اس وقت آسان ہوں گی جب ہم قرآن پاک کی حقیقی عظمت، اہمیت، افادیت اور زندگی گزارنے کے لئے اس کی اصل حیثیت کو سمجھنے میں کامیاب ہوں۔ ان مقاصد کے لئے ضروری ہے کہ ہم قرآن کریم کے بارے میں اپنے تصورات اور اپنے احساسات کی اصلاح کی طرف توجہ دیں۔ اس حوالے سے جب ہم غور و فکر کرتے ہیں تو سب سے پہلے قرآن کریم کی عظمت اس طرح ہمارے سامنے واضح ہوتی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہی کتاب ہے جس کی وجہ سے یہ امت خیر الامم بنی ہے اور آنحضرت ﷺ جو وجہ تخلیق کائنات خاتم الانبیاء والرسل اور سید الاولین و الآخرین ہیں۔ آنجناب کے افضل و اشرف ہونے کے اور بہت سے اسباب ہیں، ان میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ آپ پر قرآن کریم جیسی کتاب نازل کی گئی۔ یہی وہ کتاب ہے جس کے حق امانت کی ادائیگی نے آپ کو حرا کی تنہائیوں سے باہر آنے پر مجبور کیا۔ آپ جو انتہائی کم آمیز واقع ہوئے تھے اور عزلت نشینی اور گوشہ گیری آپ کے سکون و اطمینان کا ذریعہ بن گئی تھی، اس کتاب کی گراں باریوں نے اختلاط و معاشرت ہی نہیں، ایک ایک دروازے پر آپ کو دستک دینے پر مجبور کر دیا۔ آپ جو انتہائی کم گو دیکھے جاتے تھے اور کبھی کسی نے آپ سے خطبہ و تقریر تو دور کی بات ہے، کلمۂ نصیحت بھی نہیں سنا تھا۔ اب آپ کی زبان سے حکمت و نصیحت کا چشمہ ابلنے لگا۔ اسی کتاب عزیز کی تلاوت، اسی کی تعلیم، اسی کی حکمت و دانش، اسی کی تبشیر و انذار، اسی کے عہد و مواعید اور اسی کی تبلیغ و دعوت آپ کی زندگی کا معمول بن گئی۔ پھر اس کے نتیجے میں آپ کی ذات جو ہر طرح کی تعریف و تحسین اور اعزاز و اکرام کی مستحق سمجھی جاتی تھی، تنقید ہی نہیں ہر طرح کے الزام و دشنام اور ہر طرح کی ایذا کا ہدف بن گئی اور زندگی کا ہر زخم اور ہر دکھ آپ نے اس بار امانت کی ادائیگی کے سلسلے میں نہایت صبر و سکون سے برداشت فرمایا۔ یہ ذات عزیز و گرامی، جنؐ کے پاؤں کی دھول بھی ساری کائنات سے افضل ہے، انؐ کے سر مبارک پر راکھ پھینکی گئی۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپ کی جان لینے کی تدبیریں کی گئیں۔ طائف میں آپؐ پر پتھروں کی بارش کی گئی آپؐ کو وطن سے بے وطن کیا گیا۔ جان و تن کی آزمائشوں سے گزرنے پر مجبور کیا گیا تا آنکہ اسی نسخۂ کیمیا سے آپؐ نے عرب کی مس خام کو کندن بنا دیا اور ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کے نتیجہ میں:

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

Marfat.com

المختصر قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فضیلتیں تقسیم فرمائیں۔ جس کی نشر و اشاعت، جس کے حقوق کی ادائیگی، جس کے پیغام کی تبلیغ و دعوت اور جس کے احکام کے نفاذ اور غلبے کے لئے سردار دو عالم اور حبیب رب العالمین کا انتخاب کیا گیا اور جس کی تاثیر اور ہمہ گیری نے عرب کے بادیہ نشینوں اور عجم کے مادہ گزیدوں کو انسانیت کے لئے باعثِ شرف اور اخلاق و فضائل اور تہذیب و تمدن کا رہنما بنا دیا اور جس کے پیش کردہ حقوق و فرائض، نظامِ اخلاق، آدابِ زندگی اور اصولِ جہانبانی سے دنیا آج بھی ہزار مخالفت کے باوجود دانستہ یا نادانستہ فیض پا رہی اور فائدہ اٹھا رہی ہے اور پھر یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جو زندگی کے کسی ایک گوشے یا علم کے کسی ایک شعبے کے ساتھ مخصوص نہیں جب کہ دنیا کی تمام قابل ذکر کتابوں کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک گوشے یا علم و فن کے کسی ایک شعبے سے بحث کرتی ہیں۔ یہ کتاب علم کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر گوشے سے متعلق ہدایات دیتی اور اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے۔ مگر وہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ مخصوص نہیں۔ وہ انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ اور اس کے اصول پر بحث کرتی ہے، وہ اخلاق اور تہذیبِ اخلاق کی بات کرتی ہے، وہ قوموں کے عروج و زوال کا ذکر کرتی ہے، وہ طبعیات اور حیاتیات اور نفسیات کی طرف اشارے کرتی ہے، وہ مابعد الطبعیات اور الٰہیات کے تصورات پر تنقید اور محاکمہ بھی کرتی ہے۔ بایں ہمہ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اس کا موضوع نہیں۔ اس کتاب کا موضوع خود حضرت انسان ہے۔ موضوع ہونے کا یہ معنی نہیں کہ وہ اس کی فعلی اور انفعالی قوتوں اس کے اجزائے ترکیبی اس کے موثر اور متاثر ہونے کے عوامل اور اس کی جسمانی ضرورتوں پر بحث کرے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسان اور کائنات' انسان اور انسان' انسان اور دیگر مخلوقات اور انسان اور اس کے خالق و مالک کے باہمی تعلقات اور اس کے حوالے سے حقوق و فرائض پر بحث کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ انسانیت کس طرح زندہ رہتی اور کس طرح مر جاتی ہے۔ وہ انسان کے مقصدِ حیات اور اس کو بروئے کار لانے کے طریقے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو غایت الغایات بنانے اور اس کے مطابق اعمال کو بیان کرتی ہے اور پھر دنیا کو ضرورت اور آخرت کو منزل ٹھہرا کر دونوں کا باہمی ربط واضح کرتی ہے۔ اس طرح زندگی کو ایک اکائی بنا کر اسے وحدتِ مقصد کے شیرازے میں پرو کر، تمام علوم و فنون کو اس کی چاکری میں لگا کر، انسانی قافلے کو درست سمت میں جہد و عمل کا پیغام دے کر، دنیوی اور اخروی کامیابیوں کو آسان بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے قارئین کو اس بات کا شعور دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حواس اور عقل کی صورت میں زندگی کے مسائل حل کرنے کا ذریعہ عطا کیا ہے۔ تم ان کے دائرہ کار میں ان سے کام لو، البتہ ان کے دائرہ کار اور ان کی بساط سے متعلق تمہیں غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ ان پر وہ بوجھ نہ ڈالو جن کے تحمل کی ان میں طاقت نہیں۔ ان سے محسوسات اور معقولات میں کام لو مگر الٰہیات مابعد الطبعیات اخلاقی مسلمات اجتماعی اقدار خلق اور خالق کے تعلقات اور ان پر مبنی منصوصات، عالمِ برزخ، عالمِ آخرت، بعث بعد الموت اور اعمال کے غیر مرئی نتائج وغیرہ کا محاکمہ اپنی عقل و خرد سے نہ کرو، یہ اس کے دائرہ کار سے باہر کا میدان ہے۔ ان پر صرف وہ کتاب بحث کر سکتی ہے، جس میں غیر معمولی اور متنوع خصوصیات ہوں۔ مثلاً اس کتاب کا مصنف اپنے علم و بصیرت اور اطلاع و آگہی میں ناقص اور محدود نہ ہو۔ جس کا دائرہ علم محسوسات اور معقولات پر ہی مشتمل نہ ہو، بلکہ زندگی کا ہر گوشہ اور علم کا ہر شعبہ اس کے سامنے روز روشن کی طرح آشکارا ہو۔ وہ جس طرح حال کو جانتا ہو اسی طرح ماضی سے بھی باخبر اور مستقبل سے بھی آگاہ ہو۔ اس کے سامنے جدید و قدیم کی تقسیم کوئی تقسیم نہ ہو۔ اس کے نتائج علم اس کے احکام کی افادیت اور اس کی حکمتوں کی قطعیت مرورِ ایام سے گہنا ہو سکے نہ اسے چیلنج کیا جا سکے۔ زمانے کا عروج و زوال اس کی دی ہوئی رہنمائی کو کبھی غیر مفید نا قابل عمل اور از کار رفتہ قرار نہ دے سکے۔

Marfat.com

آپ اگر خالی الذہن ہو کر اور غیر جانبدار رہ کر غور فرمائیں گے تو آپ تسلیم کریں گے کہ ایسی کتاب نازل کرنے والا بجز پروردگار کے اور کون ہوسکتا ہے اور ایسی صفات پر مشتمل کتاب صرف اسی کی ہوسکتی ہے۔ اس لحاظ سے تمام آسمانی کتابیں انہیں صفات کی حامل ہیں۔ لیکن قرآن کریم کے علاوہ باقی کتب سماویہ محفوظ نہ رہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہی تھی کہ وہ محفوظ نہ رہیں اسی لئے ان کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا وہ ایک خاص وقت کے لئے رہنمائی دینے کے لئے آئیں جب وہ وقت گزر گیا تو نئی کتاب آگئی تا آنکہ دنیا جب اپنے بلوغ کی عمر کو پہنچ گئی تو قرآن کریم جیسی کتاب آئی۔ جس کے ذریعہ تکمیل دین کا اعلان کیا گیا اور خالق کائنات نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرما کر اسے ابدیت عطا کر دی، یہی وجہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال ہونے کو آئے، اس کتاب کے احکام میں تو کیا تبدیلی آتی اس کا کوئی محاورہ، کوئی روزمرہ، کوئی ضرب المثل، کوئی تلمیح، کوئی اسلوب، حتیٰ کہ کوئی لفظ بھی آج تک متروک نہ ہوسکا۔ زبانیں چند صدیوں میں کیا سے کیا ہو جاتی ہیں۔ مگر عربی زبان صرف قرآن کریم کی وجہ سے اسی طرح آراستہ پیراستہ اور شگفتہ ہے، جیسے اس کے نزول کے وقت تھی، اس میں بیان کردہ تاریخی واقعات اور پیشگوئیاں پوری قطعیت کے ساتھ آج بھی زندہ ہیں اور اپنی صداقت اور حقانیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔ اس میں مذکورہ علمی اشارات آج کے مسلمات قرار پا چکے ہیں۔ اس کا بے مثل ہونے اور انسانی دسترس سے ماوراء ہونے کا چیلنج آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ اس کتاب کے خالق کائنات کا کلام ہونے کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب آدمی زندگی کے بعض مسائل پر لائبریریاں کھنگھال ڈالتا ہے، لیکن اسے قولِ فیصل نہیں ملتا۔ پھر وہ قرآن کریم کو دیکھتا ہے تو وہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ قرآن کریم نے کس طرح ان گتھیوں کو سلجھایا ہے اور کس قطعیت کے ساتھ اپنی ہر بات کو پیش کیا ہے۔ چنانچہ اسی قطعیت اور شک وشبہ سے بالا ہونے اور انسانی زندگی کی بھلائی بقا اور کامیابی وکامرانی کے لئے واحد راستہ اور طرز زندگی ہونے کی وجہ سے قرآن کریم بطور خاص بعض اپنی مخصوص صفات کا ذکر کرتا ہے، جن میں سے ہم چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

چند مخصوص صفات قرآنی

1- قرآن کریم کا تعارف کراتے ہوئے ہمیشہ پروردگار یہ ضرور کہتا ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا ہے۔ ظاہر ہے، جس کتاب کو خالق کائنات نازل فرمائے گا، اس کے مندرجات اور تعلیمات میں شک وارتیاب یا خطاء ونسیان کا کیا امکان ہوسکتا ہے؟ وہ کسی زمانے میں ناقابل عمل کیسے ہوسکتی ہے؟ انسانی زندگی کی مصلحتوں کی رعایت رکھنے والی اس سے بڑھ کر کوئی اور کتاب کیسے ہوسکتی ہے، کیونکہ اس کا نازل کرنے والا انسانی فطرت اور طبیعت کا خالق ہے۔ کیا خلق اور خالق کے علم میں کوئی نسبت ہوسکتی ہے؟

2- قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مواقع پر قرآن کریم کا ذکر فرما کر اپنی صفات کا ذکر فرمایا ہے اور صفات کے ذکر میں بالعموم اللہ کو سب پر مقدم رکھا ہے مثلاً هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یعنی قرآن کریم وہ کتاب ہے، جس کا نازل کرنے والا اِلٰہ ہے اور اس کے علاوہ کوئی اِلٰہ نہیں یعنی وہ معبود، مسجود، مقصود، محبوب اور حاکم حقیقی ہے تو اس کی کتاب اسی کے صراط مستقیم کا راستہ بتاتی اور اسی کے احکام کا مجموعہ ہے۔ تم اسے چھوڑ کر کسی اور کتاب کو رہنما کیسے بنا سکتے ہو؟ سورہ الحشر میں قرآن کریم کا ذکر فرما کر کہ اگر ہم اسے کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ بھی اللہ سے ڈر کر ریزہ ریزہ ہو جاتا، مسلسل اپنی صفات کا ذکر فرمایا۔ یعنی پہاڑ کے ریزہ ریزہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کا تصور مستحضر رہتا ہے۔ اس لئے پتھر اس کی ہیبت سے شق ہو جاتے اور اپنی جگہ سے لڑھک جاتے ہیں۔ لیکن انسان اپنی غفلت وجحود کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عظمت وجلال سے بیگانہ اور بے خبر رہتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم بھی اسکی طبیعت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ کیونکہ بڑی سے بڑی صداقت اور بڑے سے بڑا بول بھی اپنے عظیم وجلیل حوالے سے عظیم اور معتبر ٹھہرتا ہے۔ تخت پر فائز فرعون کی خرافات کو وزن دیا جاتا

Marfat.com

اور کٹہرے میں کھڑے بے نوا موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو خندۂ استہزا میں اڑا دیا جاتا ہے، کیونکہ ایک کے پیچھے اقتدار کی طاقت ہے اور دوسرے کے پیچھے نہیں۔ عام آدمی فائر فائر کہتا ہے، مکھی نہیں مرتی۔ مگر ایک جرنیل کے منہ سے جب یہ لفظ نکلتا ہے تو جانے کتنی زندگیاں موت کا شکار ہوتی اور کتنے جسم خاک وخون میں لوٹتے ہیں۔ جب تک قرآن پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ بات نہیں اترے گی کہ جس نے یہ کتاب اتاری ہے وہ ساری عظمتوں اور بلندیوں کا خالق و مالک ہے اور جس کے ایک اشارے سے کائنات کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور اسی کی اطاعت و بندگی ہماری دنیوی اور اخروی فلاح کی ضامن ہے۔ اس وقت تک قرآن کریم کی اطاعت و عظمت کا صحیح شعور پیدا نہیں ہوگا۔

3- پروردگار نے اپنی کتاب کا آغاز ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (البقرة ۲:۲) سے فرمایا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے ،جس کے مُنَزَّلٌ مِنَ اللهِ ہونے اور محفوظ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ نیز اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہتری کے لئے احکام دیئے گئے ہیں، اس کے زندگی کے ہر شعبے میں اور زمانے کے ہر دور میں قابل عمل بلکہ واجب العمل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دنیا کی کوئی کتاب یہ دعویٰ نہیں کرسکتی، کیونکہ کسی کتاب کا مصنف جو اپنے علم کی حدود کو جانتا ہو، بقائمی ہوش وحواس ایسا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ انسانی علم وقت گزرنے کے ساتھ تغیرات کا شکار ہوتا ہے۔ اسکا کوئی نظریہ ابدی نہیں ہوتا، کیونکہ انسانی ذرائع علم محدود ہیں، وہ اپنے دور سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن یہ کتاب چونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس لئے یہ ایسی تمام محدودات اور نارسائیوں سے پاک ہے۔

4- قرآن کریم کی ایک صفت ''الھدیٰ'' ہے۔ ہدایت کے مختلف معانی ہیں۔ 1- ''فعل ہدایت''۔ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ (البقرة ۲:۲۷۲)۔ 2- ''صراط مستقیم'' اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (الحج ۶۷) آپ یقیناً سیدھے راستے پر ہیں۔ 3- ''نشان راہ'' اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى۔ 4- ''قلبی نور وبصیرت'' وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى جو لوگ راہ پا جاتے ہیں (ہم) ان کے قلبی نور وبصیرت میں اضافہ کر دیتے ہیں (محمد ۴۷:۱۷)۔ یہ فعل ہدایت کبھی صرف اراء الطریق یعنی راستہ دکھانا ہوتا ہے اور کبھی ایصال الی المطلوب۔ یعنی منزل مقصود تک پہنچانا ہوتا ہے۔ قرآن کریم ان تمام معانی میں ہدایت ہے۔ یہ محض کتاب نہیں بلکہ یہ کتابِ نصیحت بھی ہے۔ کتابِ زندگی بھی ہے، کتابِ قانون بھی ہے اور فلسفۂ قانون بھی ہے۔ یہ کتاب اخلاق بھی ہے، یہ تاریخ اسبابِ تاریخ اور نتائج تاریخ سے بھی بحث کرتی ہے۔ یہ آدابِ زندگی اور اسلوبِ زندگی کی تعلیم بھی دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی کے جتنے شعبے ہیں، یہ کتاب ان تمام سے متعلق رہنمائی دیتی ہے اور پھر اس پر اصرار کرتی ہے کہ یہی صحیح ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں ہوسکتا۔

5- یہ کتاب صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ اس میں ہدایت کے بینات بھی ہیں۔ یعنی یہ زندگی کے بارہ میں جو ہدایات دیتی اور زندگی کے جس اسلوب کا حکم دیتی ہے، اس پر دلائل بھی فراہم کرتی ہے۔ یہ صرف عمل کا سامان نہیں کرتی، بلکہ عقل ودانش کو بھی غذا فراہم کرتی اور اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے اور اس کے یہ بینات عقلی بھی ہیں اور فطری بھی، استخراجی بھی ہیں، استنتاجی بھی۔ یعنی دلائل وبراہین کے تمام اسالیب ہمیں اس کتاب میں ملتے ہیں۔ لیکن بینات کی ایک خاص صورت جو اس کتاب کی خصوصیت ہے، وہ یہ کہ اس کے بینات تاریخی اور انسانی پیکر بھی ہیں۔ وہ جب یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی معرفت جو ہدایت بھیجی ہے اسے قبول کرو، اسی میں تمہاری دنیوی اور اخروی بھلائی ہے، تو پھر اس پر صرف عقلی ونقلی دلائل ہی پیش نہیں کرتا، بلکہ عملی شواہد بھی پیش کرتا ہے۔ وہ ان افراد اور قوموں کی تاریخ بیان کرتا ہے، جو اس ہدایت کو قبول کرنے کے نتیجے میں کامیاب وکامران ٹھہریں اور ان قوموں کا بھی ذکر کرتا ہے، جو اس کا انکار کرکے تباہی و نامرادی کا شکار ہوئیں۔ وہ انبیا ورسل اور ان کی زندگی کو بطور عملی دلیل وبرہان کے پیش کرتا ہے۔ کہ دیکھو ان لوگوں نے کس طرح ناموافق و ناساعد حالات میں اللہ تعالیٰ کی دعوت کو پیش کیا اور تن تنہا وقت کی قوتوں سے ٹکراتے ہوئے زندگی گزاری۔ کبھی وقت کا دھارا بدلنے میں

Marfat.com

کامیاب ہوگئے، اور کبھی اس راہ میں کام آ کر استقامت اور اپنے موقف کی حقانیت کا چراغ روشن کر گئے، بعد میں آنے والی نسلوں نے جس سے روشنی پائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس بیچارگی اور بے بسی کے ماحول سے اٹھے، لیکن محض اپنے موقف کی حقانیت اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت اور اپنی بے پناہ استقامت سے تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا اور فرعون اپنی تمام تر قوت وحشمت اور اقتدار وطاقت کے باوجود، محض اپنے کفر وجود اور ناشکری کے باعث، تاریخ میں عبرت کا نشان بن گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بظاہر اپنے مقصد کو نہ پا سکے، لیکن اپنے ایثار وقربانی اور جاں فروشی وجاں سپاری سے ایک ایسا منارۂ نور بن گئے کہ مہ وسال کی گردشوں کے ساتھ ساتھ، ان سے فیض پانے والوں کا سلسلہ دراز تر ہوتا گیا۔
اسی طرح قرآن کریم جب اخلاقی اقدار کو بیان کرتا ہے، تو اس کے ساتھ عملی بینات کو بھی پیش کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ صبر کی تلقین کرتا ہے، تو صبر ایوب کا بھی ذکر کرتا ہے۔ راہ حق میں استقامت اور قربانی کی ترغیب دیتا ہے، تو حضرت زکریا اور حضرت یحیٰ علیہما السلام کی قربانیوں کو بطور شواہد پیش کرتا ہے۔ اللہ کی دین کی سربلندی اور نشر واشاعت کا جب حوالہ آتا ہے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بھر اس راہ میں صحرانوردی، بادیہ پیمائی، مختلف ممالک کا سفر، اس راہ میں پیش آنے والے مصائب، گھر، وطن، اعزا واقربا کی مفارقت ومہاجرت اور پھر اس راستے میں جسم وجان کی آزمائشیں، سب کو نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ غرضیکہ حضرت نوح علیہ السلام کا جوشِ تبلیغ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہِ حق میں بے خوفی اور غیرت حق، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مسکینی وغربت اور اس راہ میں سرفروشی، حضرت ایوب علیہ السلام کا مصائب پر بے مثال صبر، حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی محض اپنے مالک وآقا سے محبت وخلت اور اس راستے میں ایثار وقربانی کی بے نظیر اور درخشاں مثالیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خود سپردگی اور تسلیم ورضا، یہ سب ہدایت کے بینات ہیں، جنہیں قرآن پیش کرتا ہے۔

6- اس کتاب کی ایک اور صفت اور خصوصیت اس کا الفرقان ہونا ہے۔ یعنی یہ کتاب حق کی علامت اور شناخت ہے۔ جس طرح نور کے آ جانے سے تاریکی کافور ہو جاتی ہے، یہ ممکن نہیں کہ طلوع آفتاب کے بعد اندھیرے کا وجود باقی رہے۔ اسی طرح قرآن حکیم ایک نور بلکہ منارۂ نور ہے۔ یہ کتاب منیر ہے، یہ روشن آفتاب ہے، اس کی ہر بات واضح، اس کا ہر حرف حرف آخر اور اس کا ہر قول قولِ فیصل ہے۔ پروردگار کا ارشاد ہے تَبَارَکَ الَّذِی نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ ''بابرکت ہے وہ ذات، جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا (الفرقان۔۲۵:۱)۔'' فرقان ہونے کا معنی کیا ہے۔ ارشاد فرمایا اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ یہ قولِ فیصل ہے، کوئی مذاق نہیں (الطارق۔۱۳۔۱۴)۔ اس کی ہر بات اپنی صحت، حفاظت، حقانیت اور قابل عمل ہونے میں ہر شک وشبہ سے بالا ہے۔ مزید یہ کہ یہی حق کی کسوٹی اور پہچان ہے، یہ نہ خود کسی ملاوٹ کو برداشت کرتی ہے اور نہ باطل اس کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس کا رویہ بالکل کھرا اور اس کی ہدایت بالکل واضح ہے۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (کافرون۔۶) اس کا مزاج ہے۔ ہوا کے رخ پر اڑنا، پانی کے بہاؤ کے سہارے بہنا، اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ کمپرومائز کرنا نہیں جانتا۔ جس طرح نور وظلمت اکٹھے نہیں ہو سکتے، آگ اور پانی باہم نہیں رہ سکتے، ندی کے دو کنارے آپس میں نہیں مل سکتے، جس طرح ہمارا پروردگار وحدہ لاشریک ہے، اسی طرح اس کے احکام اس کی شریعت اس کی ہدایت بھی لاشریک ہے۔ اس کے مقابل اور متصادم ہر چیز باطل ہے، حق وباطل میں اشتراک، مفاہمت یا اخذ ورد کا رویہ، بالکل ایسے ہی ہے جیسے توحید وشرک میں اشتراک اور مفاہمت۔ اقبال نے ٹھیک کہا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہء حق و باطل نہ کر قبول

Marfat.com

شائد اسی الفرقان ہونے کی وجہ سے ہم قرآن کریم کی یہ خصوصیت دیکھتے ہیں کہ وہ حق و باطل سچ اور جھوٹ صحیح اور غلط کامیابی اور نامرادی جیسے حقائق کو پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کرتا ہے۔ فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ قوم عاد کو اور حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ قوم ثمود اور ان کے انجام کو ضرور ذکر کرتا ہے۔ جنت اور جہنم کا ذکر آپ ساتھ ساتھ دیکھیں گے۔ رحمت اور عذاب کی آیات یکے بعد دیگرے آئیں گی۔ اہل جنت اور اہل جہنم کا رویہ بھی ایک ساتھ بیان ہوگا۔ کفر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کردار اور اسلام کے نتیجے میں تیار ہونے والے کردار آپ کو ایک ساتھ نظر آئیں گے۔ سورہ الفرقان اور المومنون اس کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ انداز قرآن کریم کے الفرقان یعنی حق و باطل میں کسوٹی اور امتیاز ہونے کا مظہر ہے۔

خود کو قرآن کی تعلیمات قبول کرنے کے قابل کیسے بنایا جائے؟

قرآن کریم کی متعدد خصوصیات اور خصوصی صفات میں سے چند ایک کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ جن سے یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی کہ قرآن کریم انسانی راہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمت ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ باقی انسانوں کو تو چھوڑیئے خود وہ امت جس کو اس نعمت کا امین بنایا گیا اور جو اس کی پیش کردہ تعلیمات کی علمبردار ٹھہرائی گئی تھی، وہ خود بھی اس سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا رہی، اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو کسی نہ کسی حد تک پڑھتے تو ضرور ہیں، لیکن ہمیں اس کی صفات کا کبھی استحضار نہیں ہوتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کتاب سے استفادہ کرنے اور فیض یاب ہونے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ قرآن کریم کا موضوع جیسا کہ آغاز کلام میں ذکر ہو چکا، انسان ہے اور قرآن کریم انسانوں کی اصلاح کا ایک نسخہ اور پروگرام ہے۔ لیکن ہمیں یہ علم ہی نہیں کہ اس کا طریق اصلاح کیا ہے؟ آپ اگر غور فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لئے قرآن کریم کا طریق اصلاح بھی یقیناً وہی ہونا چاہئے، جس کا فطری اظہار کائنات کی تعمیر و اصلاح میں ہوا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں جہاں کہیں بھی تعمیر کا ظہور نظر آتا ہے۔ اس کے ظہور پذیر ہونے کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔ ان کے بغیر تعمیر کا عمل مکمل نہیں ہوسکتا۔ پہلی چیز تخریب ہے اور دوسری چیز ہے صالح مادۂ تعمیر، جس میں مطلوبہ نتائج دینے کی صلاحیت موجود ہو۔ آپ کسی بھی تعمیر کا تصور کیجئے، جب تک آپ تخریب سے اس کا آغاز نہیں کریں گے۔ تعمیر کا مرحلہ میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔

میں تفہیم کے لئے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ آپ کو ایک قطعہ زمین دیا جاتا ہے کہ آپ اس سے اپنے لئے معیشت کا سامان پیدا کیجئے اور اس قطعہ زمین کا حال یہ ہے کہ اس میں جا بجا ٹیلے سر اٹھائے کھڑے ہیں، گہری کھائیاں ہیں، قد آور درخت ہیں، بیلوں اور جھاڑیوں نے زمین کا ایک ایک انچ روک رکھا ہے، نشیب و فراز کی وجہ سے آبیاری ممکن نہیں اور جڑی بوٹیوں کی بہتات کی وجہ سے تخم ریزی کا کوئی امکان نہیں۔ اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟ یقیناً آپ اپنے سفر کا آغاز تخریب سے کریں گے۔ آپ کسی ہاتھ میں لے کر جڑی بوٹیوں کو تلف کریں گے۔ کلہاڑا لے کر درخت اکھاڑیں گے۔ کسی بلڈوزر سے ٹیلوں کو اٹھائیں گے اور کھائیوں کو پر کریں گے۔ جب زمین کا سینہ جڑی بوٹیوں درختوں اور خود رو پودوں سے خالی ہو جائے گا اور زمین تخم ریزی اور آبیاری کے لئے ہموار ہو جائے گی، تو اب آپ ہل جوتیں گے اور تخم پاشی کا سامان کریں گے۔ اب آپ تعمیر کے مرحلے میں داخل تو ہو گئے، مگر اب آپ کے لئے نہایت نازک مرحلہ صالح بیج کا مہیا کرنا ہے۔ اگر آپ نے غلط بیج کاشت کر دیا یا احتیاطی تدابیر بروئے کار نہ لا سکے، تو آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی، یا آپ نے زمین کو تخم پاشی کے قابل بنا کر چھوڑ دیا۔ یعنی تخریبی عمل کے بعد تعمیری عمل کے لئے محنت اور کوشش نہ کی، تو زمین کی قوت نمو کو اپنا کام کرنے سے تو نہیں روکا جا سکتا، لہٰذا وہاں پھر جڑی بوٹیاں اگیں گی، خود رو پودے سر اٹھائیں گے اور پھر یہ زمین جنگل کا منظر پیش کرنے لگے گی۔

Marfat.com

بالکل یہی حال انسانی دل و دماغ کا ہے۔ قرآن کریم اور حدیث پاک میں انسانی دل کو زمین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں بھی ایک قوت نمو ہے۔ اس میں بھی افکار کی فصل اگتی اور خواہشات کے خودرو پودے سر اٹھاتے اور امیدوں اور آرزوؤں کی جڑی بوٹیاں پھیلتی ہیں۔ اس میں بھی جھوٹی انا کے قد آور درخت عصبیت وحمیت جاہلیہ کے ٹیلے اور کینہ وبغض کی کھائیاں موجود ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنے دل و دماغ کی زمین میں صالح افکار کاشت کرنا چاہتا ہے، تو اسے سب سے پہلے تخریبی مرحلے سے گزرنا ہوگا۔ اسے سب سے پہلے باطل افکار، غلط خیالات، جھوٹی آرزوؤں، فرسودہ تصورات، نا آسودہ تمناؤں اور جھوٹے ازموں سے وابستگی اور جھوٹے پندار اور جھوٹی انا کی گرفت اور رسم ورواج کی پابندی جیسی زنجیروں کو توڑنا ہوگا اور پھر اپنے اصلاح اور تعمیری سفر کو وہیں پر ہی ختم نہیں کر دینا، بلکہ صالح افکار اور زندہ و پائندہ تصورات کے بیج کو تلاش کر کے صحیح طریق سے اپنے دل و دماغ کی زمین میں کاشت کرنا ہوگا۔ اگر ان دونوں باتوں میں سے کسی میں بھی جھول آ گیا تو ساری محنت اکارت جائے گی۔ یہی بات اقبال مرحوم نے اپنے انداز میں کہی:

نہادِ زندگی میں ابتداء لَا انتہاء اِلَّا ۔۔۔ پیامِ موت ہے جب لَا ہوا اِلَّا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لَا سے آگے بڑھ نہیں سکتی ۔۔۔ یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

لَا سے مراد وہی تخریبی عمل ہے، جو تعمیری مرحلے کی تمہید ہے اور اِلَّا وہ مادۂ تعمیر اور صالح افکار اور عملِ صالح کا بیج ہے، جس کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی فصل لہلہاتی اور بار آور ہوتی ہے۔

اسلام انسانی اصلاح کا جو طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ یہی فطری طریقہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ انسان جو اپنے اللہ سے برگشتہ ہو چکے ہیں، انہیں سب سے پہلے لَا اِلٰـــہَ پر عمل کرنا ہوگا۔ یعنی انہوں نے اپنے دل میں جتنے غیر اللہ کے بت بنائے ہوئے ہیں، وہ توڑ پھینکیں جتنے آستانوں سے وابستگیاں بنا رکھی ہیں سب سے توبہ کریں، جتنے خوف غیر اللہ کے بسا رکھے ہیں دل سے نکال دیں۔ جتنی محبتیں اور امیدیں غیر خدا کی دل میں پال رکھی ہیں، ان سے قطع تعلق کریں۔ زندگی کے سفر میں جہاں کہیں غیر اللہ سے اثر پذیری، مرعوبیت، اندیشہ ہائے دور دراز، دانش برہانی کی معصومیت کا یقین یا امیدوں کی شکست وریخت جیسے تصورات اگر کہیں موجود ہیں، تو دل کو ان سے پاک کریں اور جب یہ دل اور اس کے احساسات ایسی تمام کمزوریوں اور آلودگیوں سے پاک ہو جائیں، تو اب قرآن کریم کے حیات بخش افکار کا بیج ایمان کی شکل میں اس یقین کے ساتھ کاشت کریں کہ قرآن کریم کا دیا ہوا ضابطۂ حیات اور طرزِ زندگی ہی حیات بخش اور انسان کی فلاح کا ضامن ہے، اس کا دیا ہوا ہر نظریہ محکم اور ہر قول حرفِ آخر ہے۔ مخلوق کے بنائے ہوئے نظریات غلط ہو سکتے ہیں اور صحیح بھی، مخلوق کی عقل و دانش کے فیصلے رسا بھی ہو سکتے ہیں اور نارسا بھی۔ مگر خالق انسان کا علم نہ غلط ہو سکتا ہے نہ نارسا، اس لئے جب کبھی خلق اور خالق کے دیئے ہوئے افکار، اوامر و نواہی طرزِ حیات اور حسن وقبح کے معیارات میں تصادم ہوگا تو مخلوق سے منہ پھیر کر خالق کی طرف لوٹنا ہوگا۔

یہی وہ بات ہے، جسے سورہ بقرۃ میں بہ ایں الفاظ بیان فرمایا گیا۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۚ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ لوگوں سے نہ ڈرو (پرواہ نہ کرو) اور مجھ سے ڈرو تاکہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کروں اور تاکہ تم ہدایت پاجاؤ (البقرہ: ۱۵۰)۔ پھر تکمیل دین کی آیت میں اپنی نعمت یعنی قرآن پاک کے اتمام کا وعدہ پورا فرمانے کا اعلان فرمایا اور اس سے پہلے کی آیت میں پھر اس ہدایت اور تنبیہ کو ان الفاظ میں دہرایا۔ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (المائدہ۔ ۵:۳) آج کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ مولانا محمد علی جوہر کا ایک واقعہ اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

Marfat.com

مولانا عبدالماجد دریا آبادی راوی ہیں کہ میں ایک دفعہ مولانا سے ملنے گیا، ان کے کمرے میں قدم رکھا تو یہ دیکھ کر ٹھٹھک گیا کہ قرآن کریم مولانا جوہر کے سامنے ہے اور وہ زاروقطار رو رہے ہیں۔ میں فوراً باہر آ گیا، انتظار کیا، مگر دیر تک ان کی طبیعت نہ سنبھلی تو مجبوراً اندر داخل ہو گیا، میرے پاؤں کی آہٹ سن کر مولانا نے سر اٹھایا، مجھے دیکھ کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ پرسکون ہونے پر میں نے رونے کا سبب پوچھا، تو قرآن پاک کی طرف اشارہ کیا، میں نے غور سے دیکھا، تو مذکورہ بالا آیت آپ کے سامنے کھلی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ جب بھی اس آیت کو پڑھتا ہوں، تو اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ پروردگار تکمیلِ دین اور اتمام نعمت کو فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (المائدہ۔۵:۳) کا ثمر قرار دے رہا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ میں کبھی اپنے آپ کو غیراللہ کے اثرات سے آزاد نہیں پاتا۔ میری دانش، فرنگی دانش سے متاثر ہے۔ میرا ایمان ہندو اثرات سے آلودہ ہے۔ میرا دل مختلف خواہشوں اور آرزوؤں سے لبریز ہے۔ میرے دماغ پر مختلف مصلحتوں کا پہرہ ہے اور میرا ہر قدم کئی قسم کے اندیشوں سے گراں بار ہے۔ میں اس کے دین اور اس کے قرآن سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ یہ وہ احساسات ہیں جو مجھے بے چین رکھتے ہیں۔ مولانا فی الحقیقت اپنے حوالے سے پوری امت کی داستان کہہ رہے تھے۔ شاید یہی وہ تاثر تھا، جس نے مولانا سے یہ لافانی شعر کہلوایا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

درحقیقت آج مسلمانوں کی اس منبع رشد وہدایت سے محرومی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ذہنی تحفظات، علمی آلودگیوں اور قلبی وابستگیوں کے ساتھ اس کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہمیں مغرب سے لئے ہوئے افکار کو بھی نہ چھوڑنا پڑے، اپنے معمولات کو بھی نہ بدلنا پڑے اور اپنی قلبی وابستگیوں سے بھی دستبردار نہ ہونا پڑے اور ان کے ساتھ ساتھ قرآن کی برکات سے جھولیاں بھی بھر لیں۔ ظاہر ہے یہ تو کفر اور ایمان، نور وظلمت زمین اور آسمان اور آگ اور پانی کو اکٹھا کرنے والی بات ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہی مرحلہ ہمیشہ دشوار رہا ہے۔ بقول اقبال

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اسے مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آپ ایک ایسے شخص کے سامنے تخلیقِ آدم اور خلافتِ آدم کا قرآنی نظریہ پیش کرتے ہیں، جو ڈارون کے نظریہء ارتقاء کا اسیر ہے یا ایک ایسے شخص کے سامنے قرآن کا نظام معیشت پیش کرتے ہیں، جو سوشلزم یا سرمایہ داری کو جملہ تفاصیل سمیت برحق سمجھتا ہے یا ایک ایسے آدمی سے قرآن کے بیان کردہ فلسفہء عروج وزوالِ اقوام کا ذکر کرتے ہیں جو روسو، جان لاک یا برٹرینڈ رسل جیسے دانش وروں کی دانش پر ایمان لا چکا ہے۔ ظاہر ہے ایسا آدمی قرآن کریم سے اس وقت تک کیا فائدہ اٹھائے گا، جب تک اپنے اختیار کردہ خیالات کے خول سے باہر نہیں نکلتا۔ اس لئے دل ودماغ کی اصلاح اور زندگی کے معمولات میں صحت مند تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس جھاڑ جھنکار سے دلوں اور دماغوں کو صاف کیا جائے، جو قرآن کریم کی ہدایت، فکر، تعلیم اور نظام کے خلاف ہیں اور پھر افکارِ قرآن کا صالح بیج دل ودماغ کی زمین میں بویا جائے۔ یعنی اس طریق اصلاح میں اولاً دل ودماغ کی زمین کو باطل اعتقادات، فرسودہ خیالات، غیر اسلامی رسم ورواج اور غیر خدا سے وابستگیوں کو ختم کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان کی موجودگی میں کوئی صالح فکر کا بیج اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ پھر اس کے فوری بعد قرآنی افکار کا بیج بونا ہوگا۔ ورنہ دل کی زمین کو اگر خالی چھوڑا گیا تو وہاں پھر پہلے جیسے خودرو

Marfat.com

پودے اُگ کر اسے جنگل میں تبدیل کر دیں گے اور وہی حادثہ ہوگا، جو اہل مغرب کو پیش آیا۔ انہوں نے لا کو تو خوب استعمال کیا بلکہ ضرورت سے زیادہ استعمال کیا لیکن الا تک نہ پہنچ سکے۔ نتیجتاً ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بے خدا تہذیب، خدا بیزار تمدن اور خواہشات و مرغوبات کی پرستار معاشرت کی نذر ہو کر رہ گئی۔ اسی کی طرف اقبال اشارہ کرتے ہیں۔

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا

امت مسلمہ کے ساتھ یہ سب سے بڑا حادثہ ہوا ہے اور اس امت کے افراد قرآن کے حقیقی فیض سے اس لئے محروم ہیں کہ وہ اس کتاب کو بھی باقی کتابوں کی طرح ایک کتاب سمجھتے ہیں، جو صرف بے سوچے سمجھے پڑھی جاتی ہے یا ترنم سے اسے گایا جاتا ہے یا بابت آخرت کا خیال ہوا تو اسے زندگی بھر بے سمجھے پڑھتے رہے اور زیادہ سے زیادہ یہ سمجھ لیا کہ اس کتاب کے پڑھنے سے بہت ثواب ملتا ہے۔ اس لئے بعض صورتوں میں اسے تراویح میں بھی سنا جاتا ہے اور خود بھی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے۔ مقصد کیا ہوتا ہے؟ صرف حصول ثواب اور اگر کوئی مر جائے تو ایصال ثواب کے لئے اسے پڑھا جاتا ہے اور کبھی حصول شفا کے لئے اسے پڑھ کر پھونکا جاتا ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اس کتاب کے یہ فوائد نہیں ملتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس کی تلاوت سے ایصال ثواب بھی کیا جا سکتا ہے، اس کے پھونکنے سے شفا بھی ہوتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ کتاب کیا انہی مقاصد کے لئے نازل ہوئی تھی؟ یہ تو اس کے ضمنی فوائد ہیں جو بہرصورت حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص چڑیوں اور کوؤں کے شکار کے لئے توپ فائر کرے، یقیناً جو جانور اس کی زد میں آئیں گے ضرور مریں گے۔ لیکن یہ توپیں اس لئے فائر نہیں کی جاتی ہیں، توپیں تو قلعوں کی فصیلیں توڑنے اور دمدمے اڑانے کے لئے فائر کی جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ کتاب ہدیٰ بھی محض کتاب نہیں، اسے ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے نازل نہیں کیا گیا۔ کاش! ہم نے اس حقیقت کو سمجھا ہوتا کہ یہ کتاب اس خدائے بزرگ کا کلام ہے، جس کے ایک حرفِ کن سے کائنات وجود میں آئی اور جس کے حکم سے زمین سورج چاند ستارے محوِ حرکت اور اپنے اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروفِ کار ہیں۔ جس کے حکم سے پانی بہتا، آگ بھڑکتی، سورج چمکتا، ہوائیں چلتی، بادل کڑکتے اور بجلیاں کوندتی ہیں۔ وہ اگر چاہے تو سمندر پایاب ہو جائیں، صحرا سے حباب اٹھنے لگیں، دریا دھواں اگلنے لگیں، پہاڑ پھٹ جائیں، زمین کا سینہ شق ہو جائے۔ یہ کتاب اس خداوند ذوالجلال کے فرامین کا مجموعہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے، جس کا ہر قول قولِ فیصل اور جس کا ہر حکم قطعی الثبوت اور محکم الدلالت ہے۔ کیونکہ اس کی تعریف لَا رَيْبَ فِيْهِ ہے۔ یہ اپنی پیروی کرنے والوں کو ایک مضبوط راستے کی رہنمائی کرتی اور کامیابی و کامرانی کی بشارت دیتی ہے۔ کیونکہ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (بنی اسرائیل۔۹:۱۵) اس کی شان ہے۔ یہ حق و صداقت کی منادی و مبلغ اور شناخت اور پہچان ہے۔ کیونکہ نزل الکتاب بالحق اس کا امتیاز ہے۔ باطل کبھی اس کے قریب نہیں پھٹک سکتا، کیونکہ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا اس کا طغرہ ہے۔ یہ کتاب، کتابِ انقلاب ہے۔ جس نے عرب جیسی ناقابلِ ذکر وحشی اور غیر متمدن قوم میں ایسا ہمہ گیر انقلاب برپا کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ قوم پوری دنیائے انسانیت کے لئے ہدایت اور رحمت کا پیغام بن گئی اور جس نے چند ہی سالوں میں نصف سے زیادہ زمین پر ایک عادلانہ اور منصفانہ نظام قائم کر دیا اور اللہ کے وہ بندے جو سچائی اور راستی کی ہر بات اور ہر طریقے کے دشمن تھے، وہ اخلاق کے نمونے اور حق و راستی کے گواہ بن کر کھڑے ہو گئے۔

Marfat.com

اگر ہم کلام اللہ کا کچھ بھی ادراک رکھتے؟

اگر ان باتوں کا ہلکا سا تاثر بھی ہمارے ذہنوں میں ہوتا تو اس کی ایک ایک بات ہمارے غور وفکر کا موضوع بنتی اس کے احکام سے ہمارے دل پگھلتے اور جسموں پر کپکپی طاری ہو جاتی اس کی بشارتیں ہماری فرحت ومسرت کا سامان اور اس کے انذار ہماری فکرمندی اور تبدیلی کے محرک ہوتے۔ہم اس کی ایک ایک آیت کو اپنے نام اپنے مالک کا پیغام سمجھ کر فخر وانبساط سے جھومتے اور اس کی ذمہ داری کو محسوس کر کے گراں بار ہوتے۔ہم اس کے پیغام کو اللہ کی زمین پر رہنے والوں تک پہنچانے کے لئے پریشان اور اس کے ماننے والوں پر نافذ اور قائم کرنے کے لئے فکرمند ہوتے۔ہم اسے طاقوں میں سجانے کی بجائے دلوں میں سجاتے اور اسے تعویذ بنانے کی بجائے زندگی کا عمل بناتے۔ہم اسے صرف حصول ثواب یا ایصالِ ثواب کی کتاب نہ سمجھتے بلکہ اسے کتابِ زندگی اور کتابِ انقلاب سمجھ کر اپنی زندگی اسکی رہنمائی میں دے دیتے اور اجتماعی زندگی میں اس کے ذریعہ انقلاب برپا کرتے۔نتیجتاً ہماری دنیا بھی خیر وبھلائی کا گہوارہ ہوتی اور آخرت میں اللہ کی رضا وخوشنودی ہمارے انتظار میں ہوتی۔دنیا کی قوموں میں ہمارا ایک مقام اور وزن ہوتا اور دنیا کے فیصلے ہمارے بغیر ادھورے رہتے مگر آج ہم روئے زمین پر ایک ایسی امت ہیں جن کے پاس قرآن کریم کی شکل میں ہیروں کی ایک کان موجود ہے مگر ہم اسے خزف ریزے سمجھ کر پسِ پشت پھینک چکے ہیں۔ ہمارے پاس زندگی کے ایک ایک مسئلے کا حل موجود ہے مگر ہم اسے درخورِ اعتنا سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ہمارے پاس ایک بہترین نظام زندگی میسر ہے مگر اسے نافذ کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ہمارے ہاتھوں میں عصائے موسیٰ ہے لیکن ہم جادوگروں کی رسیوں سے خوف زدہ ہیں۔ ہمارے پاس ایک مشعلِ حق ہے لیکن ہم تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے پر مصر ہیں۔قرآن ہم سے فریاد کرتا ہوا سنائی دیتا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے ہم کب اس پر کان دھریں گے۔

میری ان تمام دردمندانہ گذارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اپنے اندر وہ حقیقی احساس پیدا کریں جو ہمارے دلوں میں قرآن کریم کی حقیقی اہمیت اور عظمت پیدا کر دے اور جس کے نتیجے میں ہمارے دلوں میں درد وسوز اور فکرمندی کی ایسی آگ بھڑکے جو ہماری غفلت اور قرآن سے لاپرواہی کے تمام خس وخاشاک کو جلا کر راکھ کر دے اور ہم ہر طرف سے کٹ کر اللہ کے آستانے پر اس طرح سر رکھ دیں اور اپنی عاجزی کا حوالہ دے کر اس طرح اپنے اللہ سے توفیق مانگیں جس طرح اللہ کے آخری اور سب سے پیارے رسول ﷺ نے اپنی اس دعا کے ذریعے ہمیں مانگنا سکھایا ہے۔

اللھم انی عبدک ،ابن عبدک،ابن امتک ناصیتی بیدک ،ماض فی حکمک عدل فی قضاء ک اسئلک بکل اسم ھولک،سمیت بہ نفسک او انزلتہ فی کتابک او علمتہ احدا من خلقک ان تجعل القران ربیع قلبی و نور صدری وجلاء حزنی وذھاب ھمی و غمی۔

اے اللہ! میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے۔مجھ پر تیرا حکم جاری ہے۔میرے بارے میں تیرا فیصلہ حق ہے۔میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطے سے جو تیرا ہے، جس سے تو نے اپنے کو پکارا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا مداوا اور میرے فکر وپریشانی کا علاج بنا دے۔ (آمین ثم آمین)

Marfat.com

سورۂ تہذیب اور بسم اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[illegible]

[illegible]

Marfat.com

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ھود۔ ۱۱:۴۱)

(اوراس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اوراس کا ٹھہرنا،
بے شک میرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔)

اسی طرح سورۃ النمل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب خبر ہوئی کہ یمن میں ایک ایسی حکومت ہے جس کی ملکہ اوراس کی رعایا ابھی تک کفر پر قائم ہیں تو آپ نے یمن کی ملکہ بلقیس کو جو خط لکھا اس کا آغاز انہیں الفاظ سے کیا گیا۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (نمل۔ ۲۷:۳۰) یہ سلیمان کی جانب سے ہے اوراس کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ہوا ہے۔ ان دونوں مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروردگار نے آغاز ہی سے انسانوں کو یہ تہذیب سکھائی کہ تمہیں ہر کام کی ابتداء کرتے ہوئے اللہ کا نام لینا چاہیے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اللہ کا نام لینے کا حکم تو تمام سابقہ امتوں کو دیا گیا تھا لیکن بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ صرف قرآن کریم کی خصوصیت ہے لیکن یہ رائے صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف اس سے واقف تھے بلکہ ہر کام کی ابتداء اسی سے کرتے تھے جیسا کہ آپ نے اپنے خط کی ابتداء اسی سے کی۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے مشرکین عرب اپنے کاموں کی ابتداء بتوں کے نام سے کیا کرتے تھے کیونکہ ان کی تہذیب کی بنیاد ان کی بت پرستی کے تصورات تھے لیکن آنحضرت ﷺ پر جو پہلی وحی اتری اس میں سب سے پہلا حکم یہی دیا گیا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (۹۶:۱) پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے آپ کو پیدا کیا"۔ اس میں یہ ہدایت دی گئی کہ آئندہ آپ کو ہر کام اللہ کے نام سے کرنا چاہیے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا اس کے بعد معمول ہو گیا کہ آپ ہر کام سے پہلے باسمک اللہ پڑھتے اور لکھتے تھے اور جب بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نازل ہوگئی تو پھر آپ اور مسلمان ہر کام کے آغاز کے لئے نہ صرف کہ اسی کو پڑھنے لگے بلکہ آنحضرت ﷺ نے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے اسی کے پڑھنے کا حکم دیا اوراس کی بار بار تاکید فرمائی۔ ایک حدیث میں ہے، کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا "کہ گھر کا دروازہ بند کرو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، چراغ گل کرو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، برتن ڈھکو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اترنے کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنے کی ہدایات قرآن وحدیث میں بار بار آئی ہیں۔"

بِسْمِ اللّٰهِ کی اس قدر تاکید کیوں؟

سوال یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنے کی اس قدر تاکید کیوں کی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چھوٹی سی ہدایت نے انسانی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا آغاز کر دیا ہے کوئی بھی شخص جب کسی کام کا آغاز کرتا ہے اگر اس کے ذہن میں یہ تصورات نہیں ہیں جو اس ہدایت سے پیدا کرنا مقصود ہیں تو یقیناً وہ ہر کام کرتے ہوئے یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ سراسر میری ہمتوں، صلاحیتوں اور توانائیوں کا مرہون منت ہے میرے پاس جو ذہنی صلاحیتیں ہیں اور جسمانی توانائیاں ہیں اور میرے پاس جو وسائل میسر ہیں میں ان سے کام لے کر ایسا کوئی سا بھی کام کرنا چاہوں تو میرے لئے کوئی مشکل نہیں ایسے آدمی کا تمام تر بھروسہ اپنے وسائل اور اپنی قوتوں پر ہوتا ہے پھر اسی سے اس کے ذہن میں یہ تصور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ میں چونکہ اپنی صلاحیتوں اور اپنے وسائل سے

Marfat.com

تمام کام انجام دیتا ہوں تو مجھے اپنے کاموں کے سلسلے میں کسی کے سامنے جواب نہیں دینا میں کام اچھا کروں گا تو اس کی جزا مجھے ملے گی اور اگر کام برا کروں گا تو یہیں اس کے نتائج خود دیکھ لوں گا اور ممکن ہے کہ میں ان کاموں کو نتیجہ خیز ہونے سے پہلے بدل دوں یا اس کے اثرات زائل کر دوں اسی طرح وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ میرا رشتہ کسی ایسی ذات سے نہیں جو ہر وقت میری نگرانی کرتی ہو، میری تنہائیاں جس کے سامنے واضح ہوں، جو میری نیتوں تک سے واقف ہو، جس نے میرے لئے زندگی کے کچھ اصول یا کوئی تہذیب عطا کی ہو اور کبھی ایسا دن آئے گا جب وہ ذات میرے ان کاموں سے متعلق مجھ سے سوال کرے گی وہ ایسی ہر سوچ اور ہر تصور سے بالا ہو کر اپنی ذات کے گنبد میں بند رہ کر اپنے مفادات کے حوالے سے ہر کام کو سرانجام دیتا ہے اگر وہ امیر ہے تو اس کی امارت اس کی خواہشات کی تکمیل میں صرف ہوتی ہے اگر وہ حاکم ہے تو اس کی حکومت دوسروں کے لئے ظلم بن جاتی ہے اگر وہ پڑھا لکھا آدمی ہے تو اس کا علم برائی کا خادم بن جاتا ہے اور اگر وہ غریب آدمی ہے تو اس کی غربت صاحب امارت لوگوں کی دشمن بن جاتی ہے اس کے اندر کا جوار بھاٹا بعض دفعہ نئے نئے جرائم کو جنم دیتا ہے اور اس کی محرومیاں اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑکاتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی سوچ کے لوگ کسی بھی حیثیت کے مالک ہوں وہ اپنے ان بگڑے ہوئے تصورات کے باعث انسانیت کے لئے مہلک ثابت ہوتے ہیں ایسے تمام خطرات سے بچانے کے لئے نہایت حکیمانہ طریقے سے یہ مختصر سا حکم دے کر ایک ایسی تہذیب کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی ہے جس کے نتیجے میں ایک ایسی عمارت وجود میں آتی ہے جس کے سائے میں انسانیت میٹھی نیند سوتی اور اقدار انسانیت پھلتے پھولتے ہیں جب ایک شخص بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر ہر کام کا آغاز کرتا ہے تو فوراً اس کے ذہن میں یہ تصورات تازہ ہوتے ہیں کہ تم جن قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لے کر یہ کام کرنے لگے ہو وہ تمہاری ذاتی نہیں اس ذات نے تمہیں عطا کی ہیں جس نے تمہیں پیدا کیا وہ تمہیں ہر کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تم ہر وقت اس کی نگرانی میں ہو تمہارے ہر کام اور ہر عمل کا ایک نوشتہ تیار ہو رہا ہے ایک دن ایسا آئے گا جب تمہیں اپنے ہر عمل کا جواب دینا پڑے گا تم سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد تو پیدا نہیں کیا تھا تمہیں ہر کام اپنے مقصد زندگی کے مطابق کرنا چاہیے تھا آج اسی مقصد کے حوالے سے تمہارے ہر کام کا حساب لیا جائے گا یہ تصورات جیسے جیسے اس کے دل و دماغ میں پختہ ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے اس کی نیت، اس کے اعمال اور اس کے اعمال کے نتائج صالح ہوتے جاتے ہیں وہ اپنی ذات میں ایک خیر کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ جس سے ہر وقت لوگوں کے لئے بھلائی ابلتی ہے اور نیکی کی قوتوں کو فروغ ملتا ہے یہ ان تہذیبی تصورات کا اجمالی خاکہ ہے جو اس مختصر سی ہدایت سے وجود میں آتے اور آہستہ آہستہ پروان چڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ان تصورات کے ساتھ ساتھ کچھ حقائق بھی ہیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنے سے جن کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ پہلی وحی میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا تھا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (1:96) ہم جب قرآن پاک کی تلاوت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے شروع کرتے ہیں تو ہم اللہ کے اس حکم پر عمل کرتے ہیں اسی طرح یہ آیہ مبارکہ ہمیں اللہ کے ایک عظیم احسان کی یاد دلاتی ہے۔ اللہ کا وہ عظیم احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کو نطق اور گویائی کی نعمت عطا فرمائی اگر ہمیں یہ نعمت میسر نہ آتی تو قرآن جیسی دولت بھی ہمیں نہ ملتی کیونکہ قرآن کریم کا تعلق زیادہ تر اسی صلاحیت سے ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود سورہ الرحمٰن کے آغاز میں اس کا ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵: ۱۔۴) ''خدائے رحمان نے قرآن سکھایا اور اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو گویائی کی تعلیم دی''۔ مزید برآں یہ کہ اس مبارک کلمہ کی تلاوت سے موسیٰ علیہ السلام کی ایک خاص پیش گوئی کی

Marfat.com

تصدیق بھی ہوتی ہے جس کی سند گزشتہ آسمانی صحیفوں میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ آپ خلق خدا کو جو تعلیم دیں گے وہ اللہ کا نام لے کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچویں کتاب باب اٹھارہ (۱۸۔۱۹) میں یہ الفاظ وارد ہیں۔ ''میں ان کے لئے انہیں کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب ان سے لوں گا۔''

صرف شریعت کے مطابق کام سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنی چاہئے

ایک اور پہلو سے بھی ہر کام کو اس مبارک کلمہ کے ساتھ کرنے کی اس طرح آنحضرت ﷺ نے تاکید فرمائی ہے جس سے اس کی افادیت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کل امر ذی بال لم یبدا بباسم الله فهو اقطع او ابتر ''ہر جائز کام جسے بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت اور بے نتیجہ ہوتا ہے۔'' اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر جائز کام کرنے سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی کام ناجائز ہو یعنی جسے اسلامی شریعت نے کرنے کی اجازت نہ دی ہو اس کا ارتکاب کسی مسلمان کے لئے ویسے ہی شرم کی بات ہے لیکن اس سے بڑھ کر بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ آدمی کسی ناجائز کام کو اللہ کے نام سے شروع کرے یعنی اللہ کا حکم اللہ ہی کے نام سے توڑا جائے یہ نہ صرف کہ گناہ ہے بلکہ ایک طرح سے اللہ کے حکم کے خلاف بغاوت ہے گناہ تو اللہ کی رحمت سے معاف ہو جاتا ہے بغاوت کا معاملہ تو بہت شدید ہے لیکن ہماری جسارتوں کی کیا انتہاء ہے کہ ہمارے امراء اللہ کی شریعت کا مذاق اڑاتے ہوئے سینما ہاؤس تک بنائیں گے اور پھر اپنے ضمیر کو یا لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اس کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جائے گا۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں آپ کو دیکھنے کو ملیں گی اس لئے اس حدیث میں یہ قید لگائی گئی ہے کہ ہر جائز کام کو کرو اور اللہ کے نام سے کرو۔

برکت کا اصل مفہوم

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ کوئی بھی جائز کام اللہ کے نام سے کیا جائے تو اللہ اس میں برکت دیتا ہے اور اگر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو بے برکتی ہوتی ہے ضروری ہے کہ برکت کا مفہوم سمجھ لیا جائے ورنہ اس سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ برکت کا لفظی معنی تو بڑھنا اور ترقی کرنا ہوتا ہے لیکن ہر بڑھنے کو برکت نہیں کہتے ایک آدمی کا جسم موٹا ہو جائے یا پھول جائے لیکن ہمت نہ ہو تو ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ اس کا جسم متورم ہو گیا ہے یا اس کے جسم میں پانی پڑ گیا ہے دونوں باتیں خطرناک بیماریوں کی خبر دیتی ہیں کوئی بھی شخص اسے صحت قرار دینے کی حماقت نہیں کرے گا حالانکہ بظاہر اس کے جسم میں برکت معلوم ہوتی ہے اس لئے میں نے عرض کیا کہ ہر اضافہ اور ہر ترقی برکت نہیں ہوتی بلکہ وہ اضافہ اور ترقی برکت ہے جو صحت کے اصولوں کے مطابق ہے اسی طرح یہاں جس بات کو برکت کہا گیا ہے وہ بھی وہ برکت ہے جو شریعت کے اصولوں اور مقاصد کے مطابق ہو اس کو میں ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں آدمی جب غذا لیتا ہے تو اس کے کچھ تو طبی اصول ہیں اور کچھ اس کے مقاصد ہیں طبی اصول میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غذا مضر صحت نہ ہو بلکہ حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق ہو اور مقاصد میں سے پہلی بات یہ ہے کہ غذا جزو بدن بنے اور دوسری بات یہ کہ اس سے خون تیار ہو اور تیسری یہ بات کہ خون جسم میں قوت کا باعث بنے یہ تینوں چیزیں وجود میں آجاتی ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ صحیح غذا نے اپنے مقاصد پورے کر دیئے ہیں لیکن اسلامی نقطہ نگاہ سے ایک مقصد ابھی باقی ہے وہ اگر پورا

Marfat.com

اسلامی تہذیب اور بِسْمِ اللّٰہِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہر ذی روح اپنی ضروریات کے حصول کے لئے اپنے معمولات کو انجام دینے کا پابند ہے کیونکہ کسی عمل کے بغیر اسے اپنی ضروریات میسر نہیں آسکتیں جب کہ ضروریات کے میسر آنے پر ہی اس کی زندگی کا دارومدار ہے جسے بھی اللہ نے جسم و جان سے نوازا ہے وہ اپنی جسمانی بقا کے لئے معمولات کا ایک طریقہ بنانے، اسے سرانجام دینے اور اس کے لئے محنت کرنے کا محتاج ہے اس میں کسی مخلوق کی خصوصیت نہیں بلکہ حشرات الارض سے لے کر انسان تک یہی ایک قدر مشترک ہے جو ساری مخلوقات میں نظر آتی ہے لیکن جہاں سے انسانی زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے وہیں ہم ایک اور چیز بھی جنم لیتی ہوئی دیکھتے ہیں وہ یہ کہ ہر ذی روح مخلوق اپنی ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لئے محنت کرتی اور دکھ اٹھاتی ہے اور اس کے پیش نظر سوائے جسمانی زندگی کی ضرورتیں پورا کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا لیکن انسان میں انہیں معمولات کو انجام دیتے ہوئے ایک تقسیم شروع ہو جاتی ہے جسے ہم تہذیب کے نام سے جانتے ہیں جو مہذب انسان ہیں وہ ضروریات زندگی کے حصول کے ساتھ ساتھ ہر کام کرنے سے پہلے کچھ اور تصورات بھی رکھتے ہیں جو انہیں ان کی تہذیب سکھاتی ہے اور جو غیر مہذب لوگ ہیں وہ انسان ہوتے ہوئے بھی حیوانیت کے ان تصورات سے آگے نہیں بڑھتے جن کا ذکر ہم نے ہر ذی روح کے حوالے سے کیا ہے البتہ انسانوں میں مزید ایک یہ فرق بھی رہتا ہے کہ جن کی تہذیب اعلیٰ درجے کی ہے ان کے تصورات بھی اعلیٰ اور برتر قسم کے ہوں گے اور جن کی تہذیب پست اور حقیقی انسانی مقاصد تک نہیں پہنچی ان کے تصورات تہذیب کے نمائندہ ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ اقدار کے نمائندہ نہیں ہوتے۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جو تہذیب دی ہے مسلمانوں کی پوری زندگی اسی تہذیب میں ڈھل کر نکلتی ہے ان کا ہر کام اسی تہذیب کا غماز ہوتا ہے چنانچہ اسی تہذیب کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ جب مسلمان کسی کام کو آغاز کرنا چاہیں تو کیا وہ صرف یہ سوچ کر آغاز کریں کہ ہمیں اس کام کے نتیجے میں جسمانی ضرورتوں کے حصول میں مدد ملے گی یا ہماری خواہشات اور ہماری بیہمانہ ضروریات کو پورا کرنے میں آسانی ہو جائے گی یا اس کے علاوہ بھی ان کے کچھ تصورات ہونے چاہئیں چنانچہ ان کی تہذیب نے ان کو یہ سکھایا ہے کہ تمہارے مذہب، تمہارے دین اور اس سے پیدا ہونے والی تمہاری تہذیب کی بنیاد اللہ سے متعلق تمہارے صحیح تصور پر ہے اس لئے تمہارے ہر کام میں اسی تصور کو نمایاں مقام ملنا چاہیے چنانچہ نسل انسانی کے آغاز سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور دیا گیا ہوگا پوری نسل انسانی کی تاریخ جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے چونکہ پوری طرح محفوظ نہیں رہی اس لئے نوح علیہ السلام سے پہلے اس بات کا تو یقین ہے کہ انہیں بھی اسی طرح کی ہدایت ملی ہوگی لیکن اس کی کوئی حتمی گواہی انسانی تاریخ میں موجود نہیں البتہ نوح علیہ السلام کے زمانے سے ہم جانتے ہیں کہ اس وقت کے مسلمانوں کو بھی یہ تہذیب سکھائی گئی تھی کہ تمہیں ہر کام کرنے سے پہلے اپنے ذہن میں اللہ کے تصور کو تازہ کرنا ہے اور اس کے کے بعد اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کرنا ہے چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے حالات کو بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے بتایا ہے کہ کفار کے مسلسل کفر کے باعث جب اللہ تعالیٰ کا عذاب طوفان کی شکل میں آیا تو حضرت نوح علیہ السلام جو اللہ کے حکم سے کشتی تیار کر چکے تھے انہوں نے کشتی پانی میں اتاری اور اپنے تمام ماننے والوں کو حکم دیا کہ اس کشتی پر سوار ہو جاؤ یہی کشتی تمہارے ایمان کی وجہ سے تمہارے لئے نجات کا باعث بنائی گئی ہے چنانچہ انہیں کشتی میں سوار کرتے ہوئے آپ نے جو الفاظ کہے قرآن کریم نے اس کو نقل کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (ھود۔ ۱۱:۴۱)

(اور اس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا، بے شک میرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔)

اسی طرح سورۃ النمل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب خبر ہوئی کہ یمن میں ایک ایسی حکومت ہے جس کی ملکہ اور اس کی رعایا ابھی تک کفر پر قائم ہیں تو آپ نے یمن کی ملکہ بلقیس کو جو خط لکھا اس کا آغاز انہیں الفاظ سے کیا گیا۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (نمل۔ ۲۷:۳۰) یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ہوا ہے۔ ان دونوں مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروردگار نے آغاز ہی سے انسانوں کو یہ تہذیب سکھائی کہ تمہیں ہر کام کی ابتداء کرتے ہوئے اللہ کا نام لینا چاہیے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اللہ کا نام لینے کا حکم تو تمام سابقہ امتوں کو دیا گیا تھا لیکن بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ صرف قرآن کریم کی خصوصیت ہے لیکن یہ رائے صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف اس سے واقف تھے بلکہ ہر کام کی ابتداء اسی سے کرتے تھے جیسا کہ آپ نے اپنے خط کی ابتداء اسی سے کی۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے مشرکین عرب اپنے کاموں کی ابتداء بتوں کے نام سے کیا کرتے تھے کیونکہ ان کی تہذیب کی بنیاد ان کی بت پرستی کے تصورات تھے لیکن آنحضرت ﷺ پر جو پہلی وحی اتری اس میں سب سے پہلا حکم یہی دیا گیا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۹۶:۱) پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے آپ کو پیدا کیا" ۔ اس میں یہ ہدایت دی گئی کہ آئندہ آپ کو ہر کام اللہ کے نام سے کرنا چاہیے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا اس کے بعد معمول ہو گیا کہ آپ ہر کام سے پہلے باسمک اللہ پڑھتے اور لکھتے تھے اور جب بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نازل ہوگئی تو پھر آپ اور مسلمان ہر کام کے آغاز کے لئے نہ صرف کہ اسی کو پڑھنے لگے بلکہ آنحضرت ﷺ نے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے اسی کے پڑھنے کا حکم دیا اور اس کی بار بار تاکید فرمائی۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا "کہ گھر کا دروازہ بند کرو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، چراغ گل کرو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، برتن ڈھکو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اترنے کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنے کی ہدایات قرآن وحدیث میں بار بار آئی ہیں۔"

بِسْمِ اللّٰهِ کی اس قدر تاکید کیوں؟

سوال یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنے کی اس قدر تاکید کیوں کی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چھوٹی سی ہدایت نے انسانی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا آغاز کر دیا ہے کوئی بھی شخص جب کسی کام کا آغاز کرتا ہے اگر اس کے ذہن میں یہ تصورات نہیں ہیں جو اس ہدایت سے پیدا کرنا مقصود ہیں تو یقیناً وہ ہر کام کرتے ہوئے یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ سراسر میری ہمتوں، صلاحیتوں اور توانائیوں کا مرہون منت ہے میرے پاس جو ذہنی صلاحیتیں ہیں اور جسمانی توانائیاں ہیں اور میرے پاس جو وسائل میسر ہیں میں ان سے کام لے کر ایسا کوئی سا بھی کام کرنا چاہوں تو میرے لئے کوئی مشکل نہیں ایسے آدمی کا تمام تر بھروسہ اپنے وسائل اور اپنی قوتوں پر ہوتا ہے پھر اسی سے اس کے ذہن میں یہ تصور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ میں چونکہ اپنی صلاحیتوں اور اپنے وسائل سے

Marfat.com

نہیں ہوتا تو اسے بے برکتی کہا جاتا ہے اور اگر پورا ہو جاتا ہے تو اسے برکت سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مقصد یہ ہے کہ غذا نے جسم کو جو قوت، طاقت اور ہمت عطا کی ہے اگر وہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اللہ کے بندوں کی خدمت میں صرف ہوتی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ نے اس میں برکت دی ہے لیکن اگر وہ لادینیت کی خدمت اور شیطانی مقصد کے فروغ میں استعمال ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غذا اپنے سارے مقاصد پورا کرنے کے باوجود بے برکتی کا باعث بنی ہے۔ مختصر یہ کہ جسم کی قوت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اللہ کا کلمہ بلند ہو، شرافتیں توانا ہوں، نیکیوں کو فروغ ملے، مظلوموں کی حمایت اور دستگیری کے کام آئے، غریبوں کے دکھوں کا بوجھ اٹھائے اور انسانیت کی تقویت کا باعث بنے لیکن اگر یہی قوت ظلم کا باعث بنتی، نیکی کا راستہ روکتی، شرافتوں کو رسوا کرتی اور اذیتوں کا باعث بنتی ہے تو یہ قوت نہ صرف یہ کہ حقیقی مقصد سے محروم ہو گئی ہے بلکہ یہ وہ بے برکتی ہے جس سے اس حدیث میں متنبہ کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ کا مفہوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی عظمت، اہمیت اور افادیت سمجھنے کے بعد یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس کے الفاظ کا مفہوم کیا ہے جس سے ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ جب ہم کسی کام کے آغاز میں یہ مبارک کلمہ بولتے ہیں تو اس وقت ہمارے ذہن میں اس کا مفہوم کیا ہونا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰه تین لفظوں سے مرکب ہے ایک حرف با، دوسرے اسم، تیسرے اللہ، حرف با عربی زبان میں بہت سے معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے جن میں سے وہ معنی جو اس مقام کے مناسب ہیں وہ تین ہیں۔ ان میں سے ہر ایک معنی بسم اللہ پڑھتے ہوئے لیا جاسکتا ہے۔

1- مصاحبت: یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا۔

2- استعانت: یعنی کسی چیز سے مدد چاہنا۔

3- تبرک: یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

ان تینوں معنوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بسم اللہ پڑھتے ہوئے جب ہم کسی کام کا آغاز کرتے ہیں تو گویا ہم یہ کہتے ہیں کہ میں یہ کام کرنے لگا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی مدد سے، اللہ کے نام کی برکت سے۔ لیکن اس میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ صرف اتنا کہہ دینے سے بات مکمل تو نہیں ہوتی جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کی مدد یا اس کی برکت سے کرنا مقصود ہے اس لئے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مقام کے مناسب محذوف ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی کھانا کھانے لگتا ہے اور وہ بسم اللہ پڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں اللہ کے نام سے کھانا کھانے لگا ہوں اور اگر وہ پڑھنا چاہتا ہے تو وہ یہ کہنا چاہے گا کہ میں اللہ کے نام سے پڑھنا چاہتا ہوں لیکن یہ یاد رہے کہ جو فعل بھی یہاں محذوف سمجھا جائے اسے بسم اللہ کے بعد محذوف سمجھنا چاہیے تاکہ حقیقتاً اس کام کا آغاز اللہ ہی کے نام سے ہو۔ اسم اللہ کو پہلے لانے میں صحابہ نے اس حد تک احتیاط کی ہے اور یقیناً انہوں نے یہ بات آنحضرت ﷺ سے سیکھی ہوگی کہ جب قرآن کریم لکھا گیا تو حرف با کا اسم اللہ سے پہلے آنا تو عربی زبان کے لحاظ سے لازمی ہے لیکن اس میں بھی مصحف عثمانی میں صحابہ کے اجماع سے یہ رعایت رکھی گئی کہ حرف با رسم الخط کے قاعدہ سے ہمزہ کے ساتھ ملا کر لکھنا چاہیے تھا اور لفظ اسم الگ۔ جس کی صورت ہوتی باسم اللہ لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرف ہمزہ کو حذف کر کے حرف با کو سین کے ساتھ ملا کر صورۃً اسم کا جز بنا دیا تاکہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرف ہمزہ حذف نہیں کیا جاتا، جیسے اقرا باسم ربک میں ''ب'' کو ''الف'' کے ساتھ لکھا جاتا ہے، یہ صرف بِسْمِ اللّٰهِ کی خصوصیت ہے کہ حرف ''با'' کو ''سین'' کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں اللہ اسم ذات ہے اور الرحمن الرحیم اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی نام ہیں اس کی وضاحت ہم سورہ الفاتحہ کی تفسیر میں کریں گے کیونکہ سورۃ الفاتحہ میں بھی ان تینوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

قرآن میں بِسْمِ اللّٰهِ کی اصل جگہ اور اہلِ علم کی رائے

اہل علم میں یہ بھی ایک اہم سوال رہا ہے کہ قرآن کریم میں بسم اللہ کی اصل جگہ کہاں ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ سورہ توبہ کے علاوہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہر سورۃ کے آغاز میں لکھی گئی ہے لیکن ہر جگہ اس کو کسی سورت کا جز بنانے کی بجائے مستقل آیت کی حیثیت سے لکھا گیا ہے۔ سوائے سورۃ النمل کے کسی سورۃ میں بھی سورت کے جز کے طور پر اس کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ مدینہ، بصرہ اور شام کے قراء اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ قرآن کی سورتوں میں سے کسی سورۃ کی بھی حتیٰ کہ سورۃ الفاتحہ کی بھی آیت نہیں بلکہ ہر سورۃ کے شروع میں اس کو محض تبرک اور دو سورتوں کے درمیان علامتِ فصل کے طور پر لکھا گیا ہے اس سے ایک سورت دوسری سورۃ سے ممتاز بھی ہوتی ہے اور قاری جب اس سے تلاوت کا آغاز کرتا ہے تو اس سے برکت بھی حاصل کرتا ہے یہی مذہب امام ابوحنیفہؒ کا ہے اس کے برعکس مکہ اور کوفہ کے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ سورۃ الفاتحہ کی بھی ایک آیت ہے اور دوسری سورتوں کی بھی ایک آیت ہے اور یہ مذہب امام شافعی اور ان کے اصحاب کا ہے۔ حقیقت تو اللہ جانتا ہے لیکن بظاہر قراء مدینہ کا مذہب قوی معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب تمام تر وحی الٰہی کی راہنمائی اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی اور بسم اللہ کی کتابت بھی اسی ترتیب کا ایک حصہ ہے اس ترتیب میں جہاں تک بسم اللہ کے لکھے جانے کی نوعیت کا تعلق ہے سورۃ الفاتحہ اور غیر سورۃ الفاتحہ میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا گیا بلکہ ہر سورۃ کے آغاز میں اس کو ایک ہی طرح درج کیا گیا ہے۔ جس سے اس کی حیثیت سورۃ سے الگ ایک مستقل آیت کی نظر آتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ سے متعلق چند احکام و مسائل

آخر میں ہم معارف القرآن سے بِسْمِ اللّٰهِ سے متعلق چند احکام و مسائل نقل کرتے ہیں۔

تعوذ کے معنی ہیں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھنا، قرآن کریم میں ارشاد ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (النحل ۱۶: ۹۸) ''یعنی جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو اللہ سے پناہ مانگو شیطان مردود کے شر سے''

قرأتِ قرآن سے پہلے تعوذ پڑھنا باجماعِ امت سنت ہے، خواہ تلاوت نماز کے اندر ہو یا خارج نماز (شرح منیہ)

تعوذ پڑھنا تلاوت قرآن کے ساتھ مخصوص ہے، علاوہ تلاوت کے دوسرے کاموں کے شروع میں صرف بِسْمِ اللّٰهِ پڑھی جائے، تعوذ مسنون نہیں، (عالمگیری، باب رابع، من الکراہیۃ)

Marfat.com

جب قرآن شریف کی تلاوت کی جائے اس وقت اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اور بِسْمِ اللّٰہِ دونوں پڑھی جائیں، درمیانِ تلاوت میں جب ایک سورۃ ختم ہو کر دوسری شروع ہو تو سورۃ براءت کے علاوہ ہر سورۃ کے شروع میں مکرر بِسْمِ اللّٰہِ پڑھی جائے، اَعُوْذُ بِاللّٰہِ نہیں، اور سورۃ براءت اگر درمیانِ تلاوت میں آجائے تو اس پر بِسْمِ اللّٰہِ نہ پڑھے اور اگر قرآن کی تلاوت سورۃ براءت ہی سے شروع کر رہا ہے تو اس کے شروع میں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اور بِسْمِ اللّٰہِ پڑھنا چاہیے۔ (عالمگیریہ عن المحیط)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قرآن مجید میں سورۃ النمل میں آیت کا جزء ہے اور ہر دو سورت کے درمیان مستقل آیت ہے اس لئے اس کا احترام قرآن مجید ہی کی طرح واجب ہے اس کا بے وضو ہاتھ لگانا جائز نہیں (علی مختار الکرخی وصاحب الکافی والہدایہ، شرح منیہ) اور جنابت یا حیض ونفاس کی حالت میں اس کو بطور تلاوت پڑھنا بھی پاک ہونے سے پہلے جائز نہیں، ہاں کسی کام کے شروع میں جیسے کھانے پینے سے پہلے بطور دعاء پڑھنا ہر حال میں جائز ہے۔ (شرح منیہ کبیر)

پہلی رکعت کے شروع میں اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کے بعد بِسْمِ اللّٰہِ پڑھنا باتفاق ائمہ واجب ہے اختلاف صرف اس میں ہے کہ آواز سے پڑھا جائے یا آہستہ، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے دوسرے ائمہ آہستہ پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پہلی رکعت کے بعد دوسری رکعتوں کے شروع میں بھی بِسْمِ اللّٰہِ پڑھنا چاہیے اس کے مسنون ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور بعض روایات میں ہر رکعت کے شروع میں بِسْمِ اللّٰہِ پڑھنے کو واجب کہا گیا ہے۔ (شرح منیہ)

نماز میں سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ شروع کرنے سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ نہیں پڑھنا چاہیے خواہ جہری نماز ہو یا سری، نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدینؓ سے ثابت نہیں ہے۔ (شرح منیہ)

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ۱	سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ (۱)	اٰيَاتُهَا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱﴾

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ

الدِّيْنِ ؕ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ

نَسْتَعِيْنُ ؕ﴿۴﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ

اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ

عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

Marfat.com

اُسلوب سُورَةُ الفَاتِحَةِ

سورہ فاتحہ قرآن پاک کی سب سے پہلی سورۃ ہے۔ لیکن یہ اپنے اختصار، فصاحت و بلاغت، اثر آفرینی اور مضامین کی جامعیت کے اعتبار سے ایک خاص مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔ آنحضور ﷺ نے اسے مختلف ناموں سے یاد فرمایا، جن سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز مختلف اوقات میں اس کے فضائل بیان فرماتے ہوئے فرمایا کہ اس جیسی کوئی دوسری سورۃ نازل نہیں ہوئی۔ بعض احادیث میں اسے سب سے بڑی سورۃ اور بعض میں سب سے بہتر سورۃ قرار دیا۔

جب ہم اس کے پیرایۂ بیان اور اس کی معنویت پر غور کرتے ہیں اور اس کے ناموں کو دیکھتے ہیں تو قرآن کریم سے اس کے تعلق کی مختلف نوعیتیں واشگاف ہوتی ہیں۔ اس کا پیرایۂ بیان اور طریقِ اظہار معلمانہ نہیں بلکہ دعائیہ ہے۔ جس سے اس کی تاثیر اثر آفرینی اور دل و دماغ میں اس کے نفوذ کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ انسانی دل و دماغ کی کیفیت یکسر بدل جاتی ہے۔ آدمی اس کا تصور بھی نہیں کرتا کہ مجھے کوئی بات سکھائی جا رہی ہے، بلکہ وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ میں ایک ایسی ذات کی بارگاہ میں حاضر ہوں، جس کی رحمتیں اور برکتیں اور جس کا فیضانِ ربوبیت اور جس کی نصرت و اعانت کی چارہ جوئیاں مجھ پر مسلسل سایہ ڈال رہی ہیں، جس کے سامنے میرے دل و دماغ کا ایک ایک پردہ پوری طرح نمایاں ہے۔ میرے سینے کی تنگیاں، جس کی نظرِ کرم سے وسعتوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ میں ایک ایسی آغوش میں ہوں، جس کی ٹھنڈک ماں کی آغوش سے بھی زیادہ ہے۔

ان تصورات کے ساتھ انسان جب اُس ذات عظیم کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہو کر، اس دعا کے الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کرنا شروع کرتا ہے تو بے اختیار اُس ذاتِ عظیم کی حمد و ثنا اُس کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔ وہ ان صفات سے اس کو پکارتا ہے، جس سے بڑھ کر اُس ذات بے مثال کو دل و دماغ میں قریب کرنے والے الفاظ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان مختصر الفاظ میں اللہ کی حمد و ثنا کو سمیٹنے کی کوشش میں اللہ کا عاجز بندہ، اس طرح اپنی عبدیت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے کہ بے ساختہ اُس کی زبان پر عبدیت کا اعتراف اور احتیاج و درماندگی کا اقرار جاری ہو جاتا ہے۔ پھر وہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی کے ان گنت مسائل، خواہشوں کا بے پناہ ہجوم، انسانی تعلقات کی وسیع دنیا، احساسات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا وسیع سمندر، اس میں انفعالات کے اُبھرتے ہوئے حباب نفسانی اور شیطانی قوتوں سے تصادم، اللہ کی طرف بڑھنے والے ہر بندے کے راستے کی وہ رکاوٹیں ہیں، جنہیں سر کرنا آسان نہیں اور یہ وہ تاریکیاں ہیں، جن میں راستہ دیکھنا از بس مشکل ہے۔ یہ سوچتے ہی زبان پر دعائیہ کلمات جاری ہو جاتے ہیں اور اس راستے کا مسافر، اپنی محبوب ذات سے، جس کی محبت میں ڈوب کر وہ یہ نغمہ الاپ رہا ہے صراط مستقیم کی دعا مانگتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ التجا اُس کے لبوں تک آ جاتی ہے کہ یہ صراطِ مستقیم اس قدر واضح ہونا چاہئے کہ اس کی پہچان میں مجھے ٹھوکر نہ لگے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ یہ صراطِ مستقیم کتابی علم یا دانشِ برہانی میں لپٹا ہوا نہ ہو، جس کی پرتیں کھلتے کھلتے آدمی تھک ہار کر گر جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایسی شاہراہ ہونی چاہئے، جس پر اس راستے کے مسافر کامیابی سے گزرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں۔ اور اس پر ایسی علامتیں بھی ہونی چاہئیں، جس سے معلوم ہو کہ یہاں ٹھوکر کھانے والوں نے، کن کن حوالوں سے ٹھوکر کھائی ہے تاکہ آج اس راستے پر چلنے والا ان ٹھوکروں سے بچ کر منزل مقصود پر پہنچنے میں دشواری محسوس نہ کرے۔

Marfat.com

اِس دعا میں مزید تاثیر اور لذّتِ شوق اِس چیز نے بھی پیدا کر دی ہے کہ اِس کا انداز اور اس کا اظہار اس قدر سادہ سہل اور دل نشیں ہے کہ معمولی سے معمولی انسان بھی اسے پڑھتا ہوا دشواری محسوس نہیں کرتا۔ گنتی کے سات بول ہیں، جو نہایت مختصر، دل آفرین اور دل آویز ہیں۔ نہ ان میں کوئی پیچیدگی ہے اور نہ کوئی الجھاؤ۔ نہایت جچے تلے، ایسا لگتا ہے کہ بے ساختہ از خود زبان پر جاری ہو گئے ہیں۔ جس طرح فطرت نہایت سادہ اور نہایت پاکیزہ ہے اور کسی گوشہ میں بھی الجھی ہوئی نہیں اور ہر فطری بات ہر طبیعت کو بھلی لگتی اور اُس کی قبولیت دل کی آواز بن جاتی ہے۔ یہی حال اس سورۃ کا بھی ہے۔ اس کے ایک ایک بول کو دہراتے ہوئے آدمی یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ تو میرے دل سے اٹھنے والی باتیں ہیں۔

جس طرح رات کی تاریکی کا ستایا ہوا ایک شخص صبح خنداں کو دیکھتے ہی کھل اٹھتا ہے، طوفانِ برق و باراں سے سہا ہوا آدمی قوسِ قزح کو دیکھتے ہی اس کے حسن میں ڈوب جاتا ہے، سفر کی تھکاوٹوں سے چور چور شخص اپنی منزل کی ایک جھلک دیکھ کر تازہ دم ہو جاتا ہے، چلچلاتی دھوپ میں جھلسنے والا مسافر ٹھنڈے سائے میں جس طرح آرام محسوس کرتا ہے، اِس سے بڑھ کر وہ شخص، جو علم و دانش کے پیدا کردہ الجھاؤ اور شیطانی قوتوں کے اٹھائے ہوئے فتنوں، شخصی گروہی اور مختلف وابستگیوں کے لگائے ہوئے زخموں اور جعلی شخصیتوں کے پُر فریب طریقوں سے زار و نزار ہے۔ جب کبھی اس دعا تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اِسے اس کی حقیقت، اِس کی سادگی، اِس کی تاثیر، اِس کی حقیقت بیانی اور اِس کی عقدہ کشائی، اِس سے بڑھ کر سکون اور اطمینان مہیا کرتی ہے۔ پھر جب وہ بار بار اسے ہر نماز میں دہراتا ہے اور بار باران مضامین کی تکرار کرتا ہے تو دھیرے دھیرے اُس کے اندر سے ایک ایسا انسان جنم لینے لگتا ہے، جو پہلے انسان سے یکسر مختلف اور انسانیت کا حقیقی نمونہ ہوتا ہے۔

سورۃ کی خصوصیات اور اس کے اسماءِ مبارکہ

پیرایۂ بیان کے حوالے سے چند حقائق کے ذکر کے بعد جب ہم اِس کے ناموں کو دیکھتے ہیں تو اِس سورۃ کی بعض خصوصیات خود بخود ہمارے سامنے واضح ہو جاتی ہیں۔

فاتحۃ الکتاب

اِس کا ایک نام فاتحۃ الکتاب ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عظیم سورۃ قرآن کریم کے لیے دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح دیباچہ میں اصل کتاب کے مضامین کا خلاصہ بیان کیا جاتا اور اُن کا ایک اجمالی تعارف کرایا جاتا ہے۔ تقریباً یہی حیثیت اس سورۃ کی بھی ہے۔ قرآن کریم میں جو کچھ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اس سورۃ میں نہایت اجمال کے ساتھ اُس کو ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا اصل موضوع انسان اور اس کی اصلاح ہے۔ انسان کے بگاڑ کا صرف ایک ہی سبب ہے، اور وہ اُس کی اپنے خالق و مالک اور اپنے رب سے برگشتگی ہے۔ اس لیے انسان کے اصلاح کی یہی ایک صورت ہے کہ اُسے دوبارہ اللہ کے آستانے پر جھکا دیا جائے اور اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو از سرِ نو جوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اِس سورۃ میں سب سے پہلے اِسی آستانے کی خبر دی گئی ہے۔ لیکن ایسے دل نشیں انداز میں کہ آدمی بے اختیار اس آستانے کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ خدا پرستی کی راہ میں انسانوں کو جس قدر بھی ٹھوکریں لگی ہیں، وہ صفات کے تصور میں گمراہی کے باعث لگی ہیں۔ اس لیے اس سورۃ میں اللہ کی صفات کا وہ ٹھیک ٹھیک تصور دیا گیا ہے، جس سے ایک بندہ ذاتِ خداوندی کی معرفت کے راستے پر چل سکتا ہے۔

Marfat.com

وہ چیز جس نے انسانوں کے اعمال کو خراب کیا، بلکہ نیتوں تک کو بگاڑ ڈالا، وہ اعمال کے بارے میں انسان کا غلط تصور ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس دنیا میں تو یقیناً میرے اعمال کی ایک جزا اور سزا ہے، بشرطیکہ میرے اعمال کسی کے علم اور کسی کی گرفت میں آ جائیں۔ لیکن جنہیں میں چھپانے میں کامیاب ہو جاؤں یا جن تک کسی کی نگاہ نہ پہنچ سکے، ایسے تمام اعمال کی کوئی جزا و سزا نہیں۔ چنانچہ اِس سورۃ میں اِس قانونِ مجازات کو نہ صرف بیان کیا گیا ہے، بلکہ اُس کا یقین بھی پیدا کیا گیا ہے۔

انسان کی ایک اور کمزوری اُس کا اپنی ذات کے عرفان سے محروم ہونا اور اپنی شخصیت کی وسعتوں اور ناتوانیوں سے بے خبر ہونا ہے۔ چنانچہ اس سورۃ میں اُسے اس کی ذات کی حقیقی معرفت اور اس کی احتیاجات کے لیے حقیقی سرچشمے کو واضح کر دیا گیا ہے۔

باوجود اس کے کہ انسان کو حواس، قوتِ ادراک اور جوہرِ عقل سے نوازا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ تمام مخلوقات پر ایک فوقیت اور فضیلت بھی رکھتا ہے۔ بایں ہمہ زندگی کے معاملات کو سلجھانے اپنے اہداف کے تعین اور مقصدِ زندگی کی پہچان میں اُس نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے۔ اس سورۃ میں اُسے صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ تیرے لیے فلاح و سعادت کی راہ کیا ہے اور پھر اس کی تاریخ کے آئینے میں نمایاں مثالوں کے ذریعے شناخت بھی واضح کر دی گئی ہے۔ تاکہ اسے اپنے راستے کو اختیار کرنے میں کوئی الجھن اور دشواری پیش نہ آئے۔

یہی مندرجہ بالا مضامین ہیں، جنہیں خدا پرستی اور اسلامی زندگی میں بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ پورا اسلامی نظامِ زندگی اسی سے پھوٹنے والا درخت ہے، جس کے سائے میں امت اسلامیہ زندگی گزارتی ہے۔ قرآن کریم نے انہی مضامین کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ اس سورۃ میں ہمیں ایسے دل آویز انداز میں عطا فرمایا گیا ہے کہ جس سے زیادہ دل آویزی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خود قرآن کریم نے اس کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے، جس سے اس حقیقت کی نہ صرف تائید ہوتی ہے بلکہ تقویت ملتی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۝ (الحجر ١٥: ٨٧)

(اے پیغمبر! یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات دہرائی جانی والی چیزیں عطا فرمائیں اور قرآن عظیم)

احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں سات دہرائی جانے والی چیزوں سے مقصود یہی سورۃ ہے۔ کیونکہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دہرائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ کو السبع المثانی بھی کہتے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کر دیا جائے۔ غلط فہمی یہ ہے کہ جب سورۃ فاتحہ کی آیات کو شمار کیا جاتا ہے تو وہ سات نہیں چھ بنتی ہیں۔ کیونکہ آیت کی نشانی گول دائرہ سمجھی جاتی ہے اور اس سورۃ میں آیتوں کے آخر میں جو دائرے دیئے گئے ہیں وہ چونکہ چھ ہیں اس لحاظ سے آیات کی تعداد چھ ہی ہونی چاہیے۔ اس صورت میں سورۃ فاتحہ کو السبع المثانی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کا معنی ہے سات دہرائی جانے والی آیتیں۔ کیونکہ جب سورۃ فاتحہ کی آیات کی تعداد چھ ٹھہری تو پھر کسی طرح بھی اس نام کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ یہ چھٹی آیت ہے۔ لیکن اس کے آخر میں گول دائرہ نہیں ہے، بلکہ ۵ کا نشان دیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے آیت کے خاتمے کی نشانی نہیں ہے اس لئے اس کو آیت شمار نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ قرآنی رسم الخط میں ۵ کا نشان اس بات کی علامت ہے کہ یہاں آیت تو ختم ہوگئی ہے لیکن اس کے آیت ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بسم اللہ کی بحث میں ہم علماء کے اختلاف کے متعلق عرض کر چکے ہیں کہ مدینہ، بصرہ اور شام کے قراء اور مکہ اور کوفہ کے قراء میں اس سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ ۵ کا نشان آیت کی علامت تو ہے لیکن ساتھ ہی اس اختلاف کی طرف اشارہ بھی ہے۔

Marfat.com

اُمُّ القرآن

احادیث وآثار میں سورۃ فاتحہ کے دوسرے نام بھی آئے ہیں جن سے اس کی خصوصیات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ان میں سے ایک نام اُمُّ القرآن ہے۔عربی زبان میں اُمُّ کا اطلاق ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہوں جس کے نیچے اُس کے بہت سے توابع ہوں۔ چنانچہ سر کے درمیانی حصے کو اُمُّ الراس کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے۔فوج کے جھنڈے کو اُمّ کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اس کے نیچے جمع ہوتی ہے۔مکہ کو اُمُّ القریٰ کہتے تھے۔ کیونکہ خانہ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔پس اس سورۃ کو اُمُّ القرآن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک ایسی سورۃ ہے جس میں مطالب قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے۔یا جو قرآن کی تمام سورتوں میں اپنی نمایاں اور مقدم جگہ رکھتی ہے۔

اساس القرآن

اِس سورۃ کا ایک نام اساس القرآن ہے یعنی قرآن کی بنیاد۔ایک نام الکافیہ ہے جس کے معنی ہیں ایسی چیز جو کفایت کرنے والی ہے۔ایک نام ہے الکنز جس کا معنیٰ ہے خزانہ۔یعنی یہ سورۃ قرآن کریم کے مضامین کا خزانہ ہے۔اور یہ ایسی سورۃ ہے جو قرآن کے پیش کردہ مضامین کی اجمالی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔اسی طرح اس کا نام الشفاء بھی ہے۔یعنی یہ ایک ایسی سورۃ ہے جس کو پڑھ کر پھونکنے سے بیماریوں میں شفا ملتی ہے اور جس کی پیش کردہ ہدایات کو دستور العمل بنانے سے زندگی کے روگ اور سینوں کے بغض اور کینے ختم ہوتے ہیں۔اور انسانی معاملات کی الجھنیں حل ہو جاتی ہیں

ان اسمائے مبارکہ سے جہاں اس عظیم سورۃ کی اہمیت افادیت اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کے الفاظ میں وہ تاثیر رکھی ہے کہ جسے فوراً قبولیت کا ثمر مل جاتا ہے۔بشرطیکہ آدمی حسنِ نیت سے اسے پڑھے اور اس کی دی ہوئی روشنی میں زندگی کا سفر کرنے کا تہیہ کرلے۔اور اس کے پیش کردہ دستور العمل کو زندگی کا دستور بنالے۔آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث مبارک سے اس تاثیر کی ہمیں خبر ملتی ہے۔آپ بھی اس حدیث کو ملاحظہ فرمائیے۔

عن ابی هريرة عن رسول الله صلی الله عليه وسلم يقول الله تعالٰى قَسَّمْتُ الصلوٰة بينى و بين عبدى نصفين فنصفها لى و نصفها لعبدى و لعبدى ما سأل اذا قال العبد الحمد لله رب العلمين قال اللّٰه حمدنى عبدى واذا قال الرحمن الرحيم قال الله اثنى على عبدى واذا قال ملك يوم الدين قال مجدنى عبدى واذا قال اياك نعبد و اياك نستعين قال هذا بينى و بين عبدى ولعبدى ما سأل فاذا قال اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين قال هذا لعبدى ولعبدى ما سأل.

109506

Marfat.com

(حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا نصف حصہ میرے لیے ہے اور نصف میرے بندہ کے لیے ہے اور میرے بندہ کو وہ بخشا گیا جو اس نے مانگا۔ جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میرا شکریہ ادا کیا اور جب وہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف بیان کی ہے اور جب وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی اور جب بندہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے مانگا۔ پھر جب بندہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کیلئے ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے مانگا)۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

"اَلْحَمْدُ" حمد پر الف لام استغراق کا ہے یا جنس کا' اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام تعریفیں اور ہر طرح کی تعریفیں، یعنی تعریف کے جتنے انداز ہو سکتے ہیں اور تعریف جتنے پہلوؤں سے ممکن ہے اور تعریف کی جتنی اقسام تصور کی جا سکتی ہیں اور تعریف کے لیے جتنے خوبصورت الفاظ اہلِ لغت نے وضع کیے ہیں اور تعریف کی جتنی کیفیتیں آج تک اہلِ دل نے محسوس کی ہیں۔ اہلِ لغت اہلِ درد اور اہلِ دل کا یہ سارا سرمایہ صرف اللہ کی بارگاہ کے لیے ہے۔ اس وسعت کے ساتھ کوئی اس میں شریک نہیں ہے۔

"حمد" کا معنی جس طرح تعریف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح شکر بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن شکر حمد کے مقابلے میں معنویت کے اعتبار سے محدود ہے۔ شکر کا لفظ کسی کی صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے، جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو۔ لیکن حمد ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لیے عام ہے، خواہ ان کا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو۔ مزید برآں حمد اپنی معنوی وسعتوں کے اعتبار سے ایسے کمال سے متصف ہے جس کا شکر کے لفظ میں تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے شکر اگرچہ حمد کا ایک جزو ہے، لیکن پروردگار کے ذاتی اور صفاتی کمالات کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے حمد کا استعمال ہی ایسے وسیع معنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ صرف شکر کا استعمال حمد کو محدود کر دینے کے ہم معنی ہوگا۔

ایک آدمی اگر فہم و شعور سے بالکل محروم نہ ہو تو یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی ذات، اپنے ماحول، اپنے گرد و پیش، اپنے اوپر طاری ہونے والی کیفیتوں اپنے استعمال میں آنے والی نعمتوں پر غور کرنے کی کبھی زحمت نہ کرے۔ ایک مزدور اور محنت کش، جب چلچلاتی دھوپ میں سخت محنت کے بعد درخت کے ٹھنڈے سائے کے نیچے بیٹھ کر ٹھنڈا پانی پیتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان پر حمد کے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں۔ ایک بیمار، جب بیماری سے نجات پاتا ہے اور اپنے قدموں چل کر گھر کے صحن میں چڑیوں کے چہچہوں کی آواز سنتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان پر اللہ کی تعریف کا نغمہ پھوٹنے لگتا ہے۔ ایک آدمی مسلسل سنجیدہ کام کے باعث جب اپنے ماحول سے اچاٹ ہونے لگتا ہے تو وہ کچھ وقت پہاڑوں کے ٹھنڈے موسم سے محظوظ ہونے کے لیے پہاڑوں کا رخ کرتا ہے۔ جیسے ہی اسے پہاڑوں میں ابلتے ہوئے چشمے، گرتی ہوئی آبشاریں، برف

Marfat.com

کے پگھلتے ہوئے تودے، چاندی کے ابلتے ہوئے فوارے، سیماب اگلتے ہوئے جھرنے چیڑوں کے گڑے ہوئے جھنڈے اور پربت پر چھائی ہوئی چھاؤنی اور بادلوں کے تنے ہوئے ڈیرے اور کہرے کی لگی ہوئی قناتیں دکھائی دیتی ہیں تو بے ساختہ اس کی زبان پر اللہ کی حمد کے زمزمے جاری ہو جاتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں بہتی ہوئی پانی کی جدولیں، زمین پر سبزے کا مخملی فرش، کھیتوں میں پھولی ہوئی سرسوں اور پھولوں سے لدے ہوئے تختے جب نگاہ کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں تو بے ساختہ زبان پر اللہ کی صنعت وقدرت کی تعریف جاری ہو جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انسان جب بھی اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی قدرت کی رعنائیاں دیکھتا ہے تو اگر اس کے سر میں معمولی سا دماغ بھی ہے تو وہ ان خوبصورتیوں کے خالق کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی تعریف کا جذبہ ہے، جو اسے اللہ کی بارگاہ تک جانے پر مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے اندر سے اٹھنے والی فطرت کی پکار ہے، جو الفاظ کا قالب اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے اہلِ علم نے حمد کو انسان کا جذبۂ بے اختیار قرار دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگوں نے اس فطری جذبے کو ارتقاء کا نتیجہ قرار دے کر گھٹانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سب سے قدیم اور ابتدائی جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔ اور یہ جذبہ ان ہولناک اور خوفناک حوادث کے مشاہدہ سے پیدا ہوا، جو اس دنیا میں طوفانوں، زلزلوں اور وباؤں کی صورت میں آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ اس خوف کے جذبہ نے انسان کو ان ان دیکھی طاقتوں کی پرستش پر مجبور کیا، جن کو اس نے ان حوادث کا پیدا کرنے والا خیال کیا اور اس طرح انسان نے خوف کے جذبے سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ حالانکہ اگر تدبّر سے کام لیا جائے تو یہ بات سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور لازمی چیز ہے۔ جس کے چھن جانے کے احساس کو خوف کہا جاتا ہے۔ اور جب نعمت کا شعور پایا گیا تو ایک منعم کا شعور بھی لازمی ٹھہرا اور پھر اس کی شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔ اور مزید یہ کہ منعم کے اس تصور کو مزید اجاگر اور گہرا کرنے کے لیے انسان کا وہ شب وروز کا مشاہدہ ہے، جس سے وہ صرف نظر نہیں کر سکتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس دنیا کے عام واقعات، زلزلے، طوفان اور سیلاب ہی نہیں، بلکہ اس میں بہاریں بھی آتی، چاندنی بھی پھیلتی، بارشیں بھی ہوتی، تارے بھی جھلکتے، پھول بھی کھلتے اور فصلیں بھی پکتی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک چیز اور ایک ایک مشاہدہ نہ صرف انسان کو اللہ کے آستانے پر جھکانے کے لیے کافی ہے، بلکہ اس کے جذبۂ حمد کو مہمیز کرنے کا کام بھی دیتا ہے۔ اہلِ دل تو عجیب بات کہتے ہیں کہ اللہ کی بے حدو بے شمار نعمتوں کو دیکھ کر اور خود اپنی ذات کو اس کی نعمتوں سے گرانبار پا کر تو شکر اور حمد کا جذبہ ابھرتا ہی ہے۔ لیکن خود یہ بات کہ آدمی اللہ کی تعریف کرنے لگے اور اس میں اسے ایک سکون اور اطمینان محسوس ہو، یہ نعمت تو ہر ایک کو میسر نہیں ہوتی۔ جس کسی کو یہ دولت نصیب ہو جائے، اسے اس دولت کے مل جانے پر بیش از بیش اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں، جنہیں بے شمار نعمتیں میسر ہیں۔ لیکن وہ منعمِ حقیقی کو پہچاننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے برعکس وہ خوش نصیب بھی ہیں، جو نانِ شبینہ پر گزارا کرتے اور جھونپڑے میں رہتے ہیں، لیکن اس پر بھی ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ انہیں اگرچہ دنیا کی دولت نہیں ملی لیکن اس دولت کا مل جانا ان کے لیے دنیا وعقبیٰ کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ تو جس کو اتنی بڑی دولت مل جائے، اس پر اتنا ہی بڑا شکر ادا کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ کیا خوب کہا کسی شاعر نے۔

میری طلب بھی انہی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

ایسے جذبۂ بے پناہ سے جو تعریف کی جائے گی، وہی حقیقت میں ثنائے جمیل کہلانے کی مستحق ہے۔ اور یہی وہ ثنائے جمیل ہے، جو حمد کا حقیقی معنی ہے۔ اور یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس ذات کی ثنائے جمیل کی جائے وہ خود جمیل نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ جمیل ذات سے محبت کی جاتی ہے، ڈرا نہیں جاتا۔ جن مذاہب نے اللہ کا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ ایک ایسی وحشت ناک اور ہیبت ناک ذات ہے، جس

Marfat.com

کے غضب سے ہمیشہ ڈرنا چاہئے۔انہوں نے نہ اپنے ساتھ انصاف کیا اور نہ اللہ کے ساتھ۔نہ اپنے آپ پر ہونے والے احسانات کو پہچانا، نہ اللہ کو محسن حقیقی سمجھا۔انہوں نے اللہ کو ایک بادشاہ پر قیاس کیا۔جو کبھی دعا سے ناراض ہو جاتا ہے اور کبھی دشنام پر خلعت بخشتا ہے۔وہ یہ بات نہ سمجھ سکے کہ جہاں بھی اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کوئی ڈراؤنی ذات ہے۔بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اعمال کی نگہداشت کرو۔ایسا کوئی عمل نہ کرنا، جو اللہ کے احکام کے خلاف انسانیت کا دشمن اور اس کی ناراضگی کو دعوت دینے والا ہو۔تمہیں اپنے اعمال کی پاداش سے ڈرنا چاہئے۔اللہ کی ناراضگی یا خوشنودی اس کا نتیجہ ہے، اس کی علت نہیں۔وہ ذات تو ایسی پیاری ذات ہے، جس سے پیار کرنے والے سرفراز ہوتے ہیں۔اور دنیا و عقبیٰ کی نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔

اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ

''اللہ'' پروردگار کے لیے اسمِ ذات ہے۔کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔فارسی کے خدا یا انگریزی کے God کی طرح اسم نکرہ نہیں کہ معبود واحد کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی بولا جا سکے۔اس کی نہ جمع آتی ہے' نہ یہ کسی لفظ سے مُشتق ہے اور نہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہے۔

جیسا کہ شعراء جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن سے پہلے بھی عربی میں اللہ کا لفظ خدا کے لیے اسمِ ذات کے طور پر ہی مستعمل تھا۔بلکہ نوعِ انسانی کے دینی تصورات کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے تصورِ توحید میں جب بگاڑ پیدا ہوا اور شرک کی مختلف صورتیں پیدا ہوئیں تو ان میں اہم تر مظاہرِ فطرت کی پرستش تھی۔اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ دیوتاؤں کے لیے پیدا ہو گئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی، الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا۔لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اصنام پرستی کی اس وسعت کے باوجود ایک ایسی ہستی کے تصور سے انسان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا، جو سب سے اعلیٰ اور سب کو پیدا کرنے والی ہستی ہے۔اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تمام قوموں میں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا ضرور مستعمل رہا، جس کے ذریعے سے اس اَن دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کو پکارا جاتا تھا۔بلکہ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ سامی زبانوں میں حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب موجود رہی ہے، جو اس معبودِ اعلیٰ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور تمام زبانوں میں اس کا مادہ مشترک رہا ہے۔چنانچہ کلدانی اور سریانی کا الاہیا، عبرانی کا الوہ اور عربی کا اِلٰہ اسی سے ہے اور بعض علما کے نزدیک یہی اِلٰہ ہے جو حرفِ تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہو گیا ہے۔اور تعریف نے اسے صرف خالق کائنات کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔مگر بیشتر علما الف لام کو تعریف کے لیے نہیں مانتے، بلکہ اسے اس نام کا جزو قرار دیتے ہیں۔اس لیے وہ لفظِ اللہ کو کسی سے مشتق نہیں مانتے اور نہ اس سے کسی کو مشتق مانتے ہیں۔چنانچہ یہی لفظ اللہ ہے جسے قرآن کریم نے بطور اسمِ ذات کے اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی۔ارشاد ہوا:

''وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا'' اللہ کے لیے حُسن وخوبی کے نام ہیں۔(یعنی صفتیں ہیں) پس چاہئے کہ اسے ان صفتوں کے ساتھ پکارو۔

Marfat.com

لفظ اللہ کے لفظی خواص

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر جن کلماتِ الٰہی کے ذریعے ذاتِ حق سبحانہٗ کا عرفان بخشا گیا وہ یہ ہیں۔ (اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَـا) اس میں بھی پروردگار نے لفظ اللہ کو بطور اسمِ ذات کے اختیار فرمایا۔اس لفظ کی معنوی بحث تو آگے آئے گی۔ یہاں ہم اس کے خواص لفظی کے سلسلہ میں چند باتیں عرض کرتے ہیں:

۱۔ یہ لفظ عجیب شان رکھتا ہے کہ جس کلمۂ توحید کے ذریعے اللہ نے اپنا تعارف کرایا یعنی (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) اور اسے مسلمانوں کا شعار بنایا۔اس میں غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کلمۂ توحید میں کوئی بھی زائد حرف موجود نہیں۔وہی حروف ہیں، جو اسمِ ذات کے اندر موجود ہیں۔انہی کی ترکیب سے کلمۂ توحید کو متشکل کیا گیا۔

۲۔ اللہ کا اگر حرف ''ھمزہ'' نہ لکھا جائے تو للہ پڑھا جائے گا۔جس کے معنی ہیں ہر شے اللہ ہی کی مِلک ہے۔''وَلِلّٰـہِ خَـزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' اور آسمان وزمین کے خزانے اللہ ہی کے لئے ہیں (المنافقون:۶۳۔۷)

۳۔ للہ سے ایک لام کم کر دیا جائے تو ''لہ'' اور مزید ایک لام کم کرنے سے صرف ''ہ'' رہ جائے گا۔جس کا تلفظ ''ھـو'' ہے۔یہ حرف واحد بھی اسی ذاتِ واحد اور اسی ذاتِ احد پر دلالت کرتا ہے۔جیسے ''قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ''

۴۔ یہ اسی لفظ اللہ ہی کا خاصہ ہے کہ اس پر تائے قسم وارد ہوتی ہے۔ورنہ حرف ''تا'' بمعنی قسم اور کسی اسم پر وارد نہیں ہوتا۔

۵۔ اس اسم پاک کا ایک خاصہ یہ ہے کہ الحمد کا استعمال اسی اسمِ ذات کے لیے خاص ہے اور کسی اسم کے ساتھ الحمد کو استعمال نہیں کیا جاتا۔اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہیں گے۔الحمد للرحمٰن یا الحمد للرحیم وغیرہ نہیں بولا جاتا۔وجہ یہ ہے کہ جس طرح یہ اسم پاک مسمّٰی کی ذات وصفات سب پر حاوی ہے،اسی طرح لفظ ''حمد'' بھی تمام صفاتِ کمال و جمال کا جامع ہے۔لہٰذا کامل تر اسم کیلئے کامل تر نعت کی ضرورت تھی۔

۶۔ یہ بھی اِسم اللہ ہی کا خاصہ ہے کہ اس کے آخر میں حرف ''م'' شامل کیا جاتا ہے اور وہ حرف ندا کا کام دیتا ہے اور اس کے ساتھ حرفِ ندا شامل نہیں ہوتا۔یعنی یا اللّٰھم نہیں کہتے بلکہ اللّٰھم کا معنی ہے اے اللہ۔قرآن کریم نے کئی جگہ اسے استعمال کیا ہے۔مثلاً قُلِ اللّٰـھُـمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُـعِزُّمَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِکَ الْخَیْرُ ط اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (آل عمران ۳:۲۵۔۲۶)

اسم ''اللہ'' کی معنوی بحث

یہ تو تھے اس اسم پاک کے خواص لفظی اب دیکھئے اس کی معنوی بحث۔پیچھے گزر گیا کہ بعض علماء کے نزدیک لفظ ''اللہ'' وہ عربی کا الٰہ ہے، جو حرف تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہو گیا۔اب سوال یہ ہے کہ اگر اللہ اِلٰہ سے ہے تو اِلٰہ کے معنی کیا ہیں؟ علماء لغت واشتقاق نے مختلف اقوال بیان کئے ہیں جنہیں ہم تفسیر کبیر کے حوالہ سے یہاں نقل کرتے ہیں۔

Marfat.com

۱۔ الهتُ اِلٰی فلان. سے مشتق ہے۔جس کے معنی ہیں سَکَنْتُ اِلٰی فلان. یعنی اللہ وہ ہے، جس کے نام سے دلوں کو تسکین ملتی ہے اور قلبِ مضطر کو سکون۔ جیسے قرآن کریم کہتا ہے "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (الرعد: ۱۳. ۲۸)

۲۔ اَلِهَ اِذَا تَحَيَّرَ. سے مشتق ہے۔جس کے معنی وارفتگی، تحیّر اور درماندگی کے ہیں۔

۳۔ الــہ لا ہ. سے مشتق ہے۔جس کے معنی بلند شان کے ہیں۔یعنی اللہ وہ ہے جو لوازمات مادہ سے زمان و مکان کے احاطہ سے اور عقلمندوں کے فہم و ادراک سے ارفع اور بلند ہے۔

۴۔ لاہ یلوہ لیاھا. سے مشتق ہے۔جس کے معنی پوشیدہ اور مستور ہونا ہے۔یعنی اللہ وہ ہے، جس کی ذات عقول سے محجوب ہے۔

۵۔ أَلِهَ الفصِيل سے بنا ہے۔یعنی اونٹنی کا بچہ جب بچھڑنے کے بعد ماں کو ملتا ہے تو وہ ماں سے چمٹ جاتا ہے۔اسی طرح اللہ وہ ہے کہ آفات و مصائب میں انسان اسی کی جانب لپکتا ہے اور وہیں اسے تسکین ملتی ہے۔

۶۔ اَلِهَ اله (سمع) سے بنا ہے۔محاورہ ہے۔"اله علی فلان" اس سے ڈرتا رہا۔ اَلَهُ اِلَهَ اس کی پناہ ڈھونڈی۔یعنی اللہ وہ ہے جو خوف و ہراس کے وقت بندوں کی پناہ ہے۔تمام عالم اور تمام مخلوقات اس کی حفاظت میں ہر ایک خطرہ سے محفوظ ہیں۔

۷۔ اَلَهَ يَاْلَهُ. عَبَدَ

۸۔ اله اصله وِلاۃ فاُبدِل من الواد همزه وتسمیته بذلک لکون کل مخلوق والهًا نحوه

ان تمام لفظوں کے معانی پر اگر تدبّر سے کام لیا جائے تو چند باتیں صاف معلوم ہوتی ہیں۔کہ وہ ذات عظیم جسے الہ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مندرجہ بالا خصوصیات کی حامل ہے۔یعنی وہ ہر بے کس و بے بس کی حاجت روا ہے۔جس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو اس کی پناہ دہندہ ہے۔وہ تمام ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کیلئے قاضی الحاجات ہے۔وہ تمام قوتوں سے بالاتر قوت اور تمام عظمتوں اور بڑائیوں سے سب سے بڑھ کر عظیم اور کبریائی کی مالک ہے۔ہر پریشان حال اور اجڑے دل کو سکون بخشنے والی ہے۔ہر مخلوق تکوینی اور جبلی طور پر اس کی مشتاق ہے۔پوری کائنات کا ایک ایک ذرہ اسکی قدرت کے سامنے بےبس اور لاچار ہے۔ان تمام صفات کا خلاصہ اور حاصل اگر کوئی چیز ہوسکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ الہ وہ ذات ہے جو کائنات میں اقتدار اعلیٰ کی مالک اور ہمہ مقتدر ہے۔اسکے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کیا جاسکتا۔نظام کائنات پر اسکی فرمانروائی ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے کسی طرح انکار نہیں۔

اقتدار کا یہ وہ تصور ہے جس کی بنیاد پر قرآن اپنا سارا زور غیر اللہ کی الٰہیت کے انکار اور صرف اللہ کی الٰہیت کے اثبات پر صرف کرتا ہے۔اس کا استدلال یہ ہے کہ زمین اور آسمان میں ایک ہی ہستی تمام اختیارات و اقتدارات کی مالک ہے۔خلق اسی کی ہے، نعمت اسی کی ہے، امر اسی کا ہے، قوت اور زور بالکل اسی کے ہاتھ میں ہے۔ہر چیز چار و ناچار اسی کی اطاعت کر رہی ہے، اس کے سوا نہ کسی کے پاس کوئی اقتدار ہے، نہ کسی کا حکم چلتا ہے، نہ کوئی خلق اور تدبیر اور انتظام کے رازوں سے واقف ہے اور نہ کوئی اختیارات حکومت میں ذرّہ برابر شریک و سہیم ہے۔لہٰذا اس کے سوا حقیقت میں کوئی الہ نہیں ہے، اور جب حقیقت میں کوئی دوسرا الہ نہیں ہے تو تمہارا ہر وہ فعل جو تم دوسروں کو الہ سمجھتے ہوئے کرتے ہو، اصلاً غلط ہے، خواہ وہ دُعا مانگنے یا پناہ ڈھونڈنے کا فعل ہو، یا سفارشی بنانے کا فعل ہو، یا حکم ماننے اور اطاعت کرنے کا فعل ہو۔یہ تمام تعلقات جو تم نے دوسروں سے قائم کر رکھے ہیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونے چاہئیں، کیونکہ وہی اکیلا صاحبِ اقتدار ہے۔

اس باب میں قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے وہ اسی کی زبان سے سُنئے:

Marfat.com

وَهُوَالَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ ○

(وہی ہے جو آسمان میں بھی الٰہ ہے اور زمین میں بھی الٰہ ہے اور وہی حکیم اور علیم ہے)۔ ''یعنی آسمان و زمین میں حکومت کرنے کے لیے جس علم اور حکمت کی ضرورت ہے وہ اسی کے پاس ہے۔'' (الزخرف۔۸۴)

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ...... وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ ؕ ...... اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ. (النحل. ۱۷. ۲۲)

''تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور جو پیدا نہیں کرتا دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی؟...... خدا کو چھوڑ کر یہ جن دوسروں کو پکارتے ہیں وہ تو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے، بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔

وَهُوَاللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّاهُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِضِیَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ○ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِلَیْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِیْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (قصص. ۷۰. ۷۲)

(اور وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ اسی کیلئے تعریف ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور وہی اکیلا صاحبِ حکم واقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ کہو تم نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کیلئے روزِ قیامت تک رات طاری کر دے تو اس کے سوا کون سا دوسرا الٰہ ہے جو تمہیں روشنی لا دے گا؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ کہو تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ اگر تمہارے اوپر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اس کے سوا اور کونسا الٰہ ہے جو تمہیں رات لا دے گا کہ اس میں تم سکون حاصل کرو؟ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟)

دوسری بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ہی کی ذات ہے، جہاں پریشانی اور مصیبت میں قرار اور پناہ ملتی ہے۔ وہی آغوش ہے جہاں انسان سکون پاتا ہے۔ دل اُس کی طرف لپکتے ہیں۔ محبتیں اسی کے لئے بے تاب ہوتی ہیں اور تیسری یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر اس ذات کی حقیقت کو جاننے کے لیے فہم وادراک سے کام لیا جائے اور انسان کے پاس جتنے علوم دستیاب ہیں، ان سب کو اس راستے میں استعمال کر کے دیکھ لیا جائے، اور ظن وتخمین کے تمام ہتھیار بھی استعمال کر لیے جائیں تو حقیقت یہ ہے کہ بجز اس کے کہ انسان تحیر اور درماندگی کا شکار ہو جائے اور اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ وہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کی ہستی میں غور وخوض کرے گا، اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی۔ اس لیے کہ ایک مخلوق اپنی فہم وادراک کی وسعتوں کے باوجود، مخلوق ہی ہے۔ وہ اپنے دستیاب وسائل میں ایک خالق کی وسعتوں کو نہیں سمیٹ سکتا۔ انسانی ذہن مخلوقات میں قدرت کا شاہکار ہے لیکن وہ بہر حال مخلوق اور محدود ہے۔ محدود میں غیر محدود کبھی نہیں سما سکتا۔ اکبر مرحوم نے خوب کہا:

جو ذہن میں گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

Marfat.com

البتہ انسان کو اگر اپنی ذات میں فہم وادراک کی نارسائی اور اپنی عجز و درماندگی کا اعتراف نصیب ہو جائے تو یہ وہ دولت ہے جو عبدیت کی معراج ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ عرفان وبصیرت کی راہ کے سالک ہیں ان کے ادراک کا منتہا ہمیشہ یہی رہا ''رَبِّ زِدْنِیْ فِیْکَ تَحَیُّرًا'' کہ اے اللہ ہمیں اپنے بارے میں ایسا کر کہ تیرے بارے میں ہمارا تحیر ہمیشہ بڑھتا رہے۔ اس لیے اگر اس لفظ کا کوئی مفہوم ہو سکتا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ جل جلالہٗ وہ ذات ہے، جس کو جاننے اور سمجھنے کے لیے تمام فہم وادراک کی قوتیں عاجز و درماندہ ہیں۔ البتہ انسان کے پریشان دل کو اس وقت تک قرار نصیب نہیں ہوگا اور اس کے اُلجھے ہوئے مسائل کی گرہ اس وقت تک نہ کھلے گی جب تک اللہ کے ذکر سے زبانیں زمزمہ سنج نہیں ہوں گی اور اس کی دی ہوئی تعلیمات سے انسان کی فکر روشن نہیں ہوگی۔

معرفتِ رب کا اصل ذریعہ

بلاشبہ اللہ کی ذات انسان کے حواس اور عقل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اس کا کماحقہٗ جاننا اور سمجھنا انسانی طاقت سے ماوراء ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ایک انسان اس کی محبت میں ڈوب کر جب اس کی بارگاہ تک پہنچ جاتا ہے تو اس کا جذبۂ خاموش بار بار اسے انگیخت کرتا ہے کہ جس اللہ کو تم خالق، مالک معبود اور اپنا حاکم حقیقی سمجھتے ہو اسے جاننے کی بھی تو کوئی راہ نکالو۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہمیں اس سے محروم نہیں رکھا۔ قرآن وسنت نے ہم پر یہ بات واضح کی کہ تم جس عقل کے ذریعے اللہ کی ذات کو جاننا چاہتے ہو وہ عقل اللہ کی بیش بہا نعمت ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان کو بہت سی مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عقل کا کام محسوسات اور معقولات تک محدود ہے اور پھر محسوسات اور معقولات میں بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جس کی توجیہ کرنے میں آج تک عقل کامیاب نہیں ہو سکی۔ اللہ کی ذات کو جاننا یہ درحقیقت اس کی حدود سے ماوراء چیز ہے۔ اس کا میدان چونکہ معقولات تک محدود ہے، جب ہم اسے ایسے میدان میں کھینچ لاتے ہیں جو اصلاً اس کا میدان نہیں تو اس میں عقل کا کام نہ دینا عقل کی کوتاہی یا اس کا نقص نہیں بلکہ یہ قصور عقل کو اس میدان میں استعمال کرنے والے کا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی کسی صراف کے پاس جا کر یہ کہے کہ تمہارے ترازو کا تول اگر صحیح ہے تو مجھے اس میں یہ پہاڑ تول کر دکھاؤ یا یہ دیوار تول کر دکھاؤ اور جب وہ ایسا نہ کر سکے اور یقیناً ایسا نہیں کر سکے گا تو پھر یہ شور مچانا شروع کر دے کہ تم کیسے یہ دعویٰ کرتے ہو کہ تمہارا یہ ترازو بالکل صحیح ہے۔ وہ صراف جواب میں یقیناً یہ کہے گا کہ بھائی ترازو بالکل صحیح ہے لیکن تم اس میں وہ چیز تلوانا چاہتے ہو جو اس کی حدود سے ماوراء ہے۔ تو اس میں غلطی تمہاری ہے میرے ترازو کی نہیں۔ یہی غلطی ہم اس وقت کرتے ہیں جب ہم عقل کے دائرے میں پروردگار عالم اور اس کی صفات کی معرفت کو لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہماری عقل کا دائرہ ذات خداوندی اور اس کی صفات سے یکسر مختلف اور اس کی وسعت اور بساط اللہ تعالیٰ کی لامحدود ذات کے سامنے انتہائی محدود اور کوتاہ، نتیجہ معلوم کہ عقل ہزار کوشش کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت سے عاجز رہتی ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہی عقل کا غلط استعمال ہے، جس نے ہمیشہ توحید الٰہ میں شرک کے لیے آسانیاں پیدا کی ہیں۔ کیونکہ انسان نے جب پروردگار کو عقل کے ترازو میں تولنے کی کوشش کی اور چونکہ اس عقل کا دائرہ محسوسات میں سمٹا ہوا ہے تو اس نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ پروردگار کا بھی کوئی پیکرِ محسوس ہوگا یا ہونا چاہیے، جسے دیکھ سکیں، محسوس کر سکیں، سمجھ سکیں۔ یہیں سے شرک کی تمام آلودگیوں کے لیے راستہ کھلا۔ نتیجتاً نوع انسانی کبھی اصنام پرستی کا شکار ہوئی، کبھی اوہام پرستی کا۔ کبھی اس نے مظاہر فطرت کی پوجا کی اور کبھی طاقت وقدرت کی۔ قرآن کریم نے ان گمراہیوں کی اصلاح فرماتے ہوئے قوموں کے سامنے یہ نکتہ فاش کیا کہ پروردگار کی معرفت تو ایک مشکل بات سہی مگر جن لوگوں کو تم علم و معرفت کے حوالے سے، اخلاقی بلندی کے حوالے سے، انکشاف اور اکتشاف کے حوالے سے عظمت کا مینار سمجھتے ہو غور کرو ان کو دیکھنے کا طریقہ کیا

Marfat.com

ہے؟ کیا کسی بڑے آدمی کو دیکھنے سے اس کی حقیقی عظمت نظر آ جاتی ہے؟ کیا کسی موجد کو دیکھنے سے اس کی قوت ایجاد دکھائی دے دیتی ہے؟ کیا کسی معمار کو دیکھنے سے اس کا وہ جوہر جو پتھر کو آئینے کی شکل دیتا ہے نظر آ جاتا ہے؟ کیا اگر تمہارے سامنے بقراط یا سقراط یا افلاطون کو لا کر کھڑا کر دیا جائے یا ارسطو مجسم صورت میں تمہارے سامنے آ جائے یا لقمان کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تو کیا وہ جواہر جن کی وجہ سے دنیا میں ان کا نام ہے تمہاری آنکھوں کے راستے سے تمہارے دل کا حصہ بن جائیں گے؟ ظاہر ہے یہ سارے انسانوں جیسے انسان ہی تھے۔ ان کو اگر دیکھو گے تو صرف ایک انسان کے سراپا کو دیکھو گے۔ ان کی حقیقی شخصیت اور حقیقی معرفت کو کبھی نہ پا سکو گے۔ ان کو جاننے کا صحیح راستہ ان کو دیکھنا نہیں بلکہ ان کی صفات کو جاننا ہے۔ معمار اپنی تعمیر میں، شاعر اپنے شعر میں، ناظم اپنے نظم میں، ادیب اپنے ادب میں، خطیب اپنے خطاب میں، فلسفی اپنے فلسفے میں اور مفکر اپنی فکر میں نظر آتا ہے۔ یہ معرفت کا وہ صحیح طریقہ ہے جو حقیقی معرفت کا سراغ دیتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے تم اپنے خالق و مالک کو جان سکتے ہو، وہ خالق ہے تو اس کو صفت خلق میں دیکھو، وہ مالک ہے تو اس کی ملک میں اسے جانو، وہ رازق ہے تو اس کو رزق رسانی میں تلاش کرو، وہ رحیم ہے تو رحم و کرم کے آئینے میں اسے ڈھونڈو، اس طرح ہوا کا ایک ایک جھونکا، پانی کی ایک ایک بوند، روشنی کی ایک ایک کرن، درخت کا ایک ایک پتہ، پھول کی ایک ایک پنکھڑی حتیٰ کہ خود انسان کی اپنی ذات اس کی خبر دیتی ہوئی معلوم ہوگی۔ وہ بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ:

ہر کہ بینم در جہاں غیرے تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

اس سورۃ مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طریقے سے اپنے کمزور بندوں کے لیے اپنی معرفت کا راستہ کھولا ہے۔ پہلے اپنے اسم ذات کو ذکر فرمایا اس کے بعد اس کی معرفت کے لیے تین صفات بیان فرمائیں۔ جن میں پہلی صفت ''ربوبیت'' ہے۔ لیکن اسے ایک اسم کے طور پر بیان فرمایا جا رہا ہے۔ اس لئے فرمایا اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

پروردگار کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک اسم مبارک ''رب'' بھی ہے۔ رب اللہ کی طرح سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے۔ عبرانی، سریانی اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے اس لئے اسے بھی قدیم ترین سامی تعبیر میں سے سمجھنا چاہئے۔ پھر چونکہ معلّم، استاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں اس لیے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی کا (ربی) اور (رباہ) پرورش کنندہ معلّم اور آقا تینوں معنی رکھتا تھا اور قدیم مصری اور خالدی زبان کا ایک لفظ (رابو) بھی انہیں معنوں میں مستعمل ہوا ہے اور ان ملکوں کی قدیم ترین سامی وحدت کی خبر دیتا ہے۔

ربّ دراصل مصدر ہے جو فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے معنی میں انتہا درجے کا مبالغہ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب ہم اس کی معنوی وسعت پر غور کرتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس کی وسعت کیت کے اعتبار سے بھی ہے اور کیفیت کے اعتبار سے بھی۔ جہاں تک کیت کا تعلق ہے تو وہ ذات جو رب ہے، وہ حقیقت میں رب العالمین ہے اور عالمین کا شمار کسی انسانی عقل کے بس میں نہیں۔ اس کی مخلوقات میں سے جو مخلوقات ہمارے سامنے ہیں اور جن میں سے ہر مخلوق کو ربوبیت کا فیضان پہنچ رہا ہے۔ ان میں سے صرف خشکی کی مخلوقات کو شمار کیا جائے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ چہ جائیکہ سمندر کی مخلوقات، آسمانوں کی مخلوقات، پہاڑوں کی مخلوقات اور اُن جہانوں کی

Marfat.com

مخلوقات جن کے ناموں سے تو ہم کسی حد تک واقف ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت سے واقف نہیں۔ ان کا شمار کون کرسکتا ہے اور پھر اگر ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا جائے مثلاً ایک درخت کے اندر جڑ، تنا، چھلکا، گودا، پھول، پھل، شاخ، پتوں کے اندر رنگ و روغن پھر تاثیر اور مزا اور پھر ان کی شکل وصورت۔ ان تمام کے اندر ایک جہانِ معنی موجود ہے جو ربوبیت کے فیضان کا اظہار کر رہا ہے۔ مگر اس کی حقیقت تک پہنچنا آسان نہیں۔ اسی طرح خود انسان کو اپنے جسم، جسم کے مختلف اعضاء، اعضاء کے اندر مختلف اعصاب اور پھر ہر ایک کی الگ الگ غذا۔ ان پر ہی غور کیا جائے تو حیرت واستعجاب کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اسی طرح جہاں تک اس ربوبیت کی کیفیت کا تعلق ہے وہ صرف ایسا نہیں کہ محض پرورش کا جاری و ساری عمل ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض آئمہ لغت نے اس کی تعریف میں یہ جو بات کہی ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے کہ ربوبیت کی تعریف یہ ہے ''ھو انشاء الشئ حالاً فحالاً الی حد التمام'' یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ وہ اپنی حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا کسی محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہے، جود ہے، احسان ہے، لیکن وہ بات نہیں جسے ربوبیت کہتے ہیں، ربوبیت کے لیے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل وبلوغ کے لیے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں، ان سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت وشفقت کے ساتھ ہو۔ کیونکہ جو عمل محبت وشفقت کے جذبہ سے خالی ہوگا ربوبیت نہیں ہوسکتا۔ ربوبیت کی ایک ادنیٰ مثال ہم اُس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ مثلاً جب بچے کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہیں ہوتا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا ہے۔ اور جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔ جب کھڑا ہونے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ لی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی وحفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہے۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ مجازی ربوبیت کا یہ ناقص اور محدود عملی نمونہ سامنے رکھیے اور پھر ربوبیتِ الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصور کیجیے تو اس کا رب العالمین ہونے کا معنی یہ ہوا کہ جس طرح اس کی خالقیت نے کائناتِ ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے اسی طرح اس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے اور یہ پرورش کا سامان ایک ایسے عجیب وغریب نظام کے ساتھ ہوا ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور زندگی کی بقاء کے لیے جو کچھ مطلوب تھا وہ سب کچھ مل رہا ہے اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے، ہر ضرورت کا لحاظ ہے۔ ہر تبدیلی کی نگرانی ہے اور ہر کمی بیشی ضبط میں آچکی ہے۔

پھر اسی ظاہری نظامِ ربوبیت پر بس نہیں بلکہ اس کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس نے انسان کے لیے صرف اسبابِ معیشت ہی پیدا نہیں کیے بلکہ ان سے فائدہ اُٹھانے اور انہیں بروئے کار لانے کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت تھی، وہ بھی عطا کی گئی کیونکہ خارج میں زندگی اور پرورش کا کتنا ہی سروسامان کیا جاتا وہ کچھ مفید نہ ہوتا، اگر ہر وجود کے اندر اس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد نہ ہوتی، اور اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ اس کا ساتھ نہ دیتے۔ ربوبیت کے اس پہلو پر جتنا بھی غور کیا جائے نئی نئی حقیقتیں منکشف ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن قرآن پاک کے نزول اور آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت جن لوگوں سے آپ کو واسطہ پڑا وہ اللہ تعالیٰ کے خالق ومالک ہونے، رازق اور پروردگار ہونے کے منکر ہرگز نہیں تھے۔ انہیں اللہ کی صفت ربوبیت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہماری زندگی کی تمام ضروریات حتیٰ کہ اس کے امکانات بھی اسی ذات کے ہاتھ میں ہیں، جسے رب العلمین کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کی دعوت سے انہیں شدید انکار تھا۔ انہوں نے آپ کا راستہ روکنے کے لئے کسی بھی ممکن تصادم سے گریز نہیں کیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دعوت پیغمبری کے ساتھ ان کی

Marfat.com

مخالفت کی وجہ کچھ اور تھی ۔ جب ہم قرآن حکیم میں غور کرتے ہیں تو ہمیں ان کے عقائد و اعمال میں دو بنیادی گمراہیوں کا سراغ ملتا ہے اور یہ گمراہیاں نئی نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے تمام گمراہ قوموں میں پائی جاتی رہیں ۔ ایک طرف فوق الطبیعی ربوبیت و الٰہیت میں وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہوں اور ارباب کو شریک ٹھہراتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ سلسلۂ اسباب پر جو حکومت کارفرما ہے، اس کے اختیارات و اقتدارات میں کسی نہ کسی طور پر ملائکہ اور بزرگ انسان اور اجرام فلکی وغیرہ بھی دخل رکھتے ہیں ۔ اسی بناء پر دعا اور استعانت اور مراسمِ عبودیت میں وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے، بلکہ ان بناوٹی خداؤں کی طرف بھی رجوع کیا کرتے تھے ۔

دوسری طرف تمدنی و سیاسی ربوبیت کے باب میں ان کا ذہن اس تصور سے بالکل خالی تھا کہ اللہ تعالیٰ اس معنی میں بھی رب ہے ۔ اس معنی میں وہ اپنے مذہبی پیشواؤں' اپنے سرداروں اور اپنے خاندان کے بزرگوں کو رب بنائے ہوئے تھے اور انہی سے اپنی زندگی کے قوانین لیتے تھے ۔

اسی گمراہی کو دور کرنے کے لئے ابتداء سے انبیاء علیہم السلام آتے رہے ہیں اور اسی کے لئے آخر کار محمد ﷺ کی بعثت ہوئی ۔ ان سب کی دعوت یہ تھی کہ رب کے ہر مفہوم کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ذات حقیقی رب ہے اور اس کی یہ ربوبیت نا قابل تقسیم ہے ۔ اس کا کوئی جز کسی معنی میں بھی کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے ۔ کائنات کا نظام ایک کامل مرکزی نظام ہے ۔ جس کو ایک ہی خدا نے پیدا کیا، جس پر ایک ہی خدا فرمانروائی کر رہا ہے ۔ جس کے سارے اختیارات و اقتدارات کا مالک ایک ہی خدا ہے ۔ نہ اس نظام کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا کچھ دخل ہے' نہ اس کی تدبیر و انتظام میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کی فرمانروائی میں کوئی حصہ دار ہے ۔ مرکزی اقتدار کا مالک ہونے کی حیثیت سے وہی اکیلا خدا تمہارا فوق الفطری رب بھی ہے اور اخلاقی و تمدنی اور سیاسی رب بھی ۔ وہی تمہارا معبود ہے، وہی تمہارے سجدوں اور رکوعوں کا مرجع ہے ۔ وہی تمہاری دعاؤں کا ملجاد ماوئی، وہی تمہارے توکل و اعتماد کا سہارا، وہی تمہاری ضرورتوں کا کفیل اور اسی طرح وہی بادشاہ ہے ۔ وہی مالک الملک، وہی شارع و قانون ساز اور امر و نہی کا مختار کل بھی ہے ۔ ربوبیت کی یہ دونوں حیثیتیں جن کو جاہلیت کی وجہ سے تم نے ایک دوسرے سے الگ ٹھیرالیا ہے حقیقت میں خدائی کا لازمہ اور خدا کے خدا ہونے کا خاصہ ہیں ۔ انہیں نہ ایک دوسرے سے منفک کیا جا سکتا ہے اور نہ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی مخلوقات کو خدا کا شریک ٹھیرانا درست ہے ۔

اس دعوت کو قرآن جس طریقہ سے پیش کرتا ہے وہ خود اسی کی زبان سے سنئے ۔

قرآن میں رب کا تصور

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (الاعراف: ۷. ۵۴)

(حقیقت میں تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہو گیا جو دن کو رات کا لباس اڑھاتا ہے اور پھر رات کے تعاقب میں دن تیزی کے ساتھ دوڑ آتا ہے' سورج اور چاند اور تارے سب کے سب جس کے تابع فرمان ہیں سنو! خلق اسی کی ہے اور فرمانروائی بھی اسی کی ۔ بڑا بابرکت ہے وہ کائنات کا رب) ۔

Marfat.com

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○ (یونس : ۳۲. ۳۱).

(ان سے پوچھو! کون تم کو آسمان وزمین سے رزق دیتا ہے؟ کانوں کی شنوائی اور آنکھوں کی بینائی کس کے قبضہ واختیار میں ہے؟ کون ہے جو بے جان کو جاندار میں سے اور جاندار کو بے جان میں سے نکالتا ہے؟ اور کون اس کارگاہِ عالم کا انتظام چلا رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔ کہو! پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ جب یہ سارے کام اسی کے ہیں تو تمہارا حقیقی رب اللہ ہی ہے۔ حقیقت کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے؟ آخر کہاں سے تمہیں یہ ٹھوکر لگتی ہے کہ حقیقت سے پھرے جاتے ہو؟)

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ...... ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (الزمر: ۶. ۵)

(اس نے زمین وآسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے۔ رات کو دن پر اور دن کو رات پر وہی لپیٹتا ہے۔ چاند اور سورج کو اسی نے ایسے ضابطے کا پابند بنایا ہے کہ ہر ایک اپنے مقررہ وقت تک چلے جا رہا ہے.... یہی اللہ تمہارا رب ہے بادشاہی اسی کی ہے اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ آخر یہ تم کہاں سے ٹھوکر کھا کر پھرے جاتے ہو؟)

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ .... ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ...... اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (المومن: ۶۵.۶۱)

(اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی کہ اس میں تم سکون حاصل کرو۔ اور دن کو روشن کیا..... وہی تمہارا اللہ، تمہارا رب ہے، ہر چیز کا خالق کوئی اور معبود اس کے سوا نہیں' پھر یہ کہاں سے دھوکا کھا کر تم بھٹک جاتے ہو؟.... اللہ جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا' آسمان کی چھت تم پر چھائی' تمہاری صورتیں بنائیں اور خوب ہی صورتیں بنائیں اور تمہاری غذا کے لئے پاکیزہ چیزیں مہیا کیں' وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ بڑا بابرکت ہے وہ کائنات کا رب۔ وہی زندہ ہے کوئی اور معبود اس کے سوا نہیں اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے)۔

Marfat.com

یہود ونصاریٰ کا تصورِ رب

ان تمام آیات پر غور کیجئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا سارا زور اس بات پر ہے کہ تم نے پروردگار کو صرف اپنا پالنے والا اور ضروریات مہیا کرنے والا سمجھ رکھا ہے۔ لیکن اس کے اختیارات اور اس کی صفات میں تم اسے یکتا ماننے کے لئے تیار نہیں ہو اور مزید تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کو کسی بھی حیثیت سے زبان سے یاد کر لینا یا اس سے دعائیں مانگ لینا یا اس سے مناجاتیں کر لینا اور کبھی کبھی اس کے سامنے سرِ نیاز جھکا دینا، اس کے ماننے کے لئے کافی ہے اور رہی یہ بات کہ رب کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہی امر و نہی کا مختار اقتدار اعلیٰ کا مالک ہدایت و رہنمائی کا منبع قانون کا ماخذ اور مملکت کا رئیس ہوتا ہے۔ یہ بات تمہیں قبول نہیں اور یہی تمہاری گمراہیوں کی بنیاد ہے۔

چونکہ یہود ونصاریٰ باوجود اس کے کہ اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے تھے اسی گمراہی کا شکار تھے۔ انہوں نے اپنے اہل علم اور دینی رہنماؤں کو زندگی کی مکمل راہنمائی کا حق دیدیا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں حلت وحرمت کا اختیار حاصل ہے۔ قرآن کریم نے ان پر تنقید فرماتے ہوئے فرمایا کہ تم نے اپنے دینی راہنماؤں کو یہ اختیار دے کر انہیں اپنا رب تسلیم کر لیا ہے۔ کیونکہ یہ اختیارات رب کو ہی زیب دیتے ہیں اور جس کو بھی یہ اختیارات تفویض کر دیئے جائیں وہ ربوبیت کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس لئے تم اگر اللہ کو رب مانتے ہو تو اس کی ربوبیت کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ جس کی تربیت کے فیض سے تم زندگی کا سروسامان پا رہے ہو اسی کو اپنا حاکم و مالک اور الٰہ سمجھو۔ اور زندگی میں رہنمائی کے اختیار کا مالک اور حسن وقبح کا معیار اسی کو جانو۔ اسی کے دیئے ہوئے قانون (شریعت) کو حرفِ آخر سمجھو، اسی کو حاکم حقیقی سمجھ کر اپنی حکومت اور حکمرانی کو اس کی اطاعت میں دے دو۔ اپنی ہر پالیسی اسی کی روشنی میں طے کرو۔ اسی کے رسول کو شخصیت سازی کیلئے آئیڈیل بناؤ' اسی کی زندگی کے اطوار اور اسی کے ذوق ومزاج سے تہذیب وثقافت اخذ کرو۔

یہ بھی ذہن نشین کر لو کہ وہ صرف رب نہیں بلکہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہے۔ اسی کی ربوبیت کا فیض سب کو برابر پہنچ رہا ہے۔ اسی کا سورج سب کو روشنی دے رہا ہے، اسی کا چاند سب کیلئے حلاوت بانٹ رہا ہے۔ اسی کی زمین سب کیلئے بچھونا بنائی گئی ہے، اسی کی روئیدگی کے خزانے سب کیلئے وقف ہیں۔ اس کی ہوا اور پانی صرف امیروں کیلئے نہیں، غریبوں کیلئے بھی ہیں۔ اسی کے مون سون کا فیض جس طرح جاگیرداروں کو پہنچتا ہے، اسی طرح غریب کسان اور ایک شودر کے آنگن اور کھیت کو بھی فیضیاب کر رہا ہے۔ تم نے جو انسانوں میں طبقات پیدا کر دیئے ہیں اور انسانوں کو مختلف درجات میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہ اللہ کی صفت ربوبیت کے یکسر خلاف ہے۔ اگر تم واقعی اپنے پروردگار کو رب العالمین سمجھتے ہو تو اپنی اصلاح کرو اور ایک رب سے وہ تعلق پیدا کرو، جو بندہ اور آقا کے درمیان ہوتا ہے۔

ہر غور وفکر کرنے والے کی نظر جب تمام مخلوقات پر عموماً اور نوعِ انسانی پر خصوصاً پروردگارِ عالم کے فیضانِ ربوبیت کے حوالے سے پڑتی ہے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تربیت کا یہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت فیضان جس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کرنا بھی کسی کیلئے ممکن نہیں کا آخر سبب کیا ہے؟ ہمارے جسموں کو پروان چڑھایا جا رہا ہے، ہمارے دل ودماغ کی صلاحیتوں کو جلا بخشی جا رہی ہے، ہمارے احساسات میں گہرائی اور ہمارے انفعالات میں شائستگی اور پاکیزگی ودیعت کی جا رہی ہے، ہمارے ماحول کو ہمارے لئے سازگار اور ضرورتوں اور نعمتوں سے گراں بار کیا جا رہا ہے۔ کیا پروردگار کی اپنے بندوں سے کوئی ضرورت متعلق ہے، جس کیلئے انہیں پروان چڑھایا جا رہا ہے، جس طرح ریوڑ کا مالک اپنی بھیڑوں' بکریوں کی حفاظت کرتا ہے اور انہیں غذا فراہم کرتا ہے تاکہ ان کے دودھ اور گوشت پوست سے فائدہ اٹھائے۔ باربرداری

Marfat.com

سے جو فوائد حاصل کئے جاتے ہیں تاکہ ان کا مالک ان سے باربرداری کا کام لے سکے۔ گھوڑوں کی پرورش میں جان کھپائی جاتی ہے تاکہ وہ سواری اور جنگی ضرورتوں میں کام آ سکیں۔ کسان اپنی کھیتی کی دیکھ بھال میں شب و روز محنت کرتا ہے تاکہ غذائی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ کیا ہمارے پروردگار کی بھی ہم سے کوئی ایسی ضرورت وابستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا خیال، تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جس ذات کے اشارے سے ہر چیز وجود میں آئی اور وجودی ضروریات مہیا ہوتی ہیں اسے ہم جیسے ناچیز ذروں سے کیا حاجت ہو سکتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ہمارا کوئی حق اللہ کے ذمہ ہو جس کی ادائیگی کیلئے کائنات کا ایک ایک ذرہ شب و روز مصروفِ عمل ہے۔ ظاہر ہے ایسی کوئی بات بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ ہمارا تو وجود ہی پروردگار کا مرہونِ منت ہے کسی طرح کا کوئی حق کس طرح اس کے ذمے ہو سکتا ہے۔ جب تک ہم پردۂ عدم میں تھے تو کسی استحقاق کا سوال خلافِ عقل اور خلافِ فطرت تھا اور جب عدم سے نکل کر وجود میں آئے تو وجود دینے والے کے حقوق ہمارے ذمے عائد ہو گئے کیونکہ وہ خالق ٹھہرا۔ اس کے بعد فیضانِ ربوبیت کی بارش شروع ہوئی تو ہم اس کے حقوق سے گراں بار ہوتے گئے۔ مختصر یہ کہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس بے پناہ پروردگاری کی وجہ آخر کیا ہے قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے اس کی رحمانیت کا جوش ہے کہ اس نے ہمیں وجود بخشا اور یہ اس کی رحیمیت کا فیض ہے کہ وہ ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے۔ اس لئے یہاں ربوبیت کے بعد صفتِ رحمت کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رحمٰن اور رحیم اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے دو نام ہیں۔ ان دونوں کا مادہ رحمت ہے۔ لیکن یہ رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔

رحمٰن عربی زبان میں فعلان کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے اور رحیم فعیل کے وزن پر صفت مشبہ ہے۔

فعلان میں تین باتیں نمایاں ہیں۔

1۔ فعلان کا وزن صفات عارضہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

جیسے پیاسے کیلئے عطشان، غضبناک کیلئے غضبان، سراسیمہ کیلئے حیران، مست کیلئے سکران کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

2۔ فعلان کا وزن جوش و خروش اور ہیجان پر دلیل ہوتا ہے اس طرح رحمٰن کا لفظ جو رحمت سے اسم مبالغہ ہے کے معنی ہوں گے کہ رحمٰن وہ ذات ہے جس میں صفت رحمت پائی جاتی ہے اور اس کی رحمت میں ایک جوش اور ایک ہیجان ہے۔ یہ مخلوقات کے لئے اس طرح ابلتی ہے جیسے چشمہ ابلتا ہے۔

3۔ فعلان کا وزن اپنے اندر وسعت اور ہمہ گیری رکھتا ہے اس لحاظ سے رحمٰن کے معنی ہوں گے وہ ذات جس کی رحمت سارے عالم ہستی کائنات اور جو کچھ اب تک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، سب پر حاوی اور شامل ہے۔ اسی وجہ سے اس اسم کو لفظ اللہ کے قریب قریب برابر قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد ہے: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ (بنی اسرائیل: ۱۷۔۱۱۰)
(اے پیغمبر فرما دیجئے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کے نام سے پکارو کسی طرح بھی پکارو اس کے سب نام بہتر ہیں)۔

Marfat.com

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرح لفظ رحمٰن بھی پروردگار کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی مخلوق کو رحمٰن کہنا جائز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کی رحمت سے عالم کی کوئی چیز خالی نہ رہے۔ اس لئے جس طرح لفظ اللہ کی جمع اور تثنیہ نہیں آتا رحمان کا بھی جمع و تثنیہ نہیں آتا کیونکہ وہ ایک ہی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے اور تیسرے کا وہاں احتمال ہی نہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کفار قریش اسم اللہ سے تو واقف تھے، مگر اسم رحمان سے انہیں بالکل آگاہی نہیں تھی۔ اس لیے قرآن کریم نے متعدد مواقع پر اس کا ذکر فرمایا کہ کفار مکہ سے جب پوچھا جاتا کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا ہے؟ آسمان سے پانی کون اتارتا ہے؟ زمین کو از سرنو کون زندگی دیتا ہے؟ یہاں تک کہ جب ان سے پوچھا جاتا کہ تمہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تمہیں رزق کون دیتا ہے؟ دعائیں کون سنتا ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ ''اللہ'' مگر جب ان سے کہا جاتا کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے کہ رحمان کیا ہوتا ہے؟ اسی لئے قرآن کریم نے کہا:

وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (الانبیا: ۳۶) ''کہ یہی تو وہ ہیں کہ جو رحمان کے ذکر سے انکاری ہیں''۔

اس لئے علماء نے لکھا کہ اگر کسی کا نام عبدالرحمٰن ہو تو اسے صرف رحمان کہہ کر بلانا جائز نہیں کیونکہ یہ نام ذات الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے مقابلے میں لفظ رحیم جو اللہ تعالیٰ کے پیارے ناموں میں سے ہے، وہ فعیل کے وزن پر صفت مشبہ ہے اور فعیل کا وزن دوام و استمرار، پائیداری و استواری پر دلالت کرتا ہے اور یہ وزن ایسی صفات کیلئے بولا جاتا ہے جو صفات عارضہ نہیں بلکہ صفاتِ قائمہ ہیں۔ مثلاً کریم، کرم کرنے والا۔ عظیم، بڑائی رکھنے والا۔ علیم، علم رکھنے والا۔ حکیم، حکمت رکھنے والا۔ دوسری یہ بات کہ اس میں رحمت کے کامل اور مکمل ہونے کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رحیم وہ ہوگا جس کی رحمت میں دوام اور تسلسل پایا جائے اور جس کی رحمت صفتِ کمال کے ساتھ متصف ہو۔ رحمان کے بعد رحیم کا ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پروردگار کی اپنی خلق کیلئے رحمت میں صرف جوش ہی نہیں بلکہ پائیداری اور استقلال بھی ہے۔ اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ رحمانیت کے جوش میں دنیا پیدا تو کر ڈالی لیکن پیدا کر کے پھر اس کی خبر گیری اور نگہداشت سے غافل ہو گیا ہو۔ بلکہ اس کو پیدا کرنے کے بعد وہ اپنی پوری شان رحیمیت کے ساتھ اس کی پرورش اور نگہداشت بھی فرما رہا ہے۔ بندہ جب بھی اسے پکارتا ہے۔ وہ اس کی پکار سنتا ہے اور اس کی دعاؤں اور التجاؤں کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ پھر اس کی رحمتیں اسی چند روزہ زندگی تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں گے ان پر اس کی رحمت ایک ایسی ابدی اور لازوال شان میں ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ رحیم میں دوام اور تسلسل صفت کمال کے ساتھ پایا جاتا ہے تو جس طرح اس کائنات کا ارتقاء بالآخر اسے آخرت میں داخل کر دے گا اور اس کی تمام نعمتیں جنت کی آغوش میں پہنچ کر ارتقاء کی انتہائی منزل کو پا لیں گی اسی طرح پروردگار کے رحیم ہونے کی صفت دنیا سے آخرت کی طرف اس کی رحمت کے ارتقاء کا ایک عمل ہے، جو اپنی صفتِ کمال کے ساتھ آخرت اور جنت میں رونما ہو گا۔ اسلئے جن علماء نے الرحیم کو آخرت کے ساتھ مخصوص کیا ہے ان کا شاید یہی مفہوم ہے کہ رحمت اپنی تکمیلی شان میں وہاں جلوہ گر ہوگی۔

رحمت کا مفہوم

یہ تو تھا الرحمٰن اور الرحیم کا مفہوم اور دونوں کے معنی میں فرق۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں معنوں میں ہم نے جس صفت رحمت کا ذکر کیا ہے، وہ رحمت ہے کیا؟ اگر اس رحمت کا مفہوم یہ ہے کہ اس نے کائنات کو عدم سے وجود بخشا تو یہ بات اس کی صفتِ خلق کا مظہر ہے اور اگر اس کا یہ معنی ہے کہ وہ پیدا کرنے کے بعد تربیت کا سامان کر رہا ہے اور ہر مخلوق کو اس کی ضرورت کے مطابق سامانِ تربیت میسر آ رہا ہے اور ہر ایک کی ضرورت کو پورا کیا جا رہا ہے اور ہر ایک کی نگرانی کی جا رہی ہے اور ہر ایک کو عہد بعہد آگے بڑھایا جا رہا ہے تو یہ وہ چیز ہے جس کو پرودگار کی صفت

Marfat.com

ربوبیت انجام دے رہی ہے۔ مگر یہاں تو رحمت کا ذکر ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ رحمت کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کائنات پر تدبر کی نگاہ ڈالیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کائنات کے لئے صرف پرورش اور تربیت کا سامان ہی مہیا نہیں ہو رہا بلکہ پرورش سے بھی زیادہ بنانے سنوارنے اور فائدہ پہنچانے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی فطرت میں بناؤ ہے، اس کے بناؤ میں خوبی، اس کے مزاج میں اعتدال، اس کے افعال میں خواص، اس کی صورت میں حسن، اس کی صداؤں میں نغمہ اور اس کی بو میں عطر بیزی ہے اور اس کی کوئی بات ایسی نہیں جو اس کارخانہ کی تعمیر اور درستگی کے لئے مفید نہ ہو۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اس دنیا میں مخلوقات کی اپنی زندگی اور بقاء کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے صرف ایسا نہیں کہ انہیں مہیا کر دیا گیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کارگاہِ عالم میں عناصرِ حیات میں سے ہر عنصر، اس کے مؤثرات میں سے ہر مؤثر، اس کے خواص میں ہر خاصہ، ایک بے پناہ فیضان کا جوش رکھتا ہے اور ہر کسی کے اندر یہ خواہش تڑپتی دکھائی دیتی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے فیضان سے اور اپنی خدمت سے مخلوقات کو نوازے۔ سورج، چاند، تارے، ہوا، بارش، دریا، سمندر، پہاڑ ان میں سے کون ہے جو مخلوقات کے لئے راحت رسانی اور آسائش دینے میں دوسرے سے پیچھے ہو۔

تصور کیجئے ہم رات بھر خوابِ غفلت کے مزے لوٹتے ہیں، سہانے خواب دیکھتے رات گزر جاتی ہے۔ صبح نیند کا خمار اترتے ہی اپنے آپ کو بادِ سحر کی طرح تر و تازہ اور شاداب محسوس کرتے ہیں۔ مگر ہم نے کبھی یہ غور کرنے کی زحمت نہیں کی کہ ہم نے تھکاوٹ سے چور ہو کر جیسے ہی اپنے آپ کو بستر پر گرایا تو نیند لوریاں دیتی ہوئی خود بخود آ موجود ہوئی۔ ہم آرام کرتے رہے، وہ شب بھر ہمیں تھپکتی رہی۔ ہم نے اگر گرانی محسوس کی تو نہ جانے وہ کون فرشتہ آ پہنچا جس نے وقفے وقفے سے ہمیں دنیا بھر کی سیر کرائی، ہمیں اس طرح مسرور و مخمور رکھا کہ ہمیں رات گزرنے کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ یہ جو عناصرِ رحمت مسلسل اپنا فرض انجام دینے میں مصروف رہے ہیں، ہمیں تو انہیں بلانے کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ یہ ان کا آپ سے آپ بے تابانہ ہمارے سکون اور آرام مہیا کرنے میں لگے رہنا، یہ اللہ کی رحمت کے سوا اور کیا ہے۔

صبح اٹھتے ہی زندگی کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں لیکن اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کی سرگرمیاں بروئے کار لانے اور انجام دینے کیلئے جس جس مؤثر اور عنصر کی ضرورت ہے، وہ خود بخود اس کیلئے بے تاب دکھائی دیتا ہے۔ ہم بیدار ہونے میں تاخیر کر سکتے ہیں مگر سورج طلوع ہونے اور روشنی پھیلانے میں کبھی تاخیر نہیں کرتا۔ اس کی کرنوں کو ہمیں بلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ ہمیں روشنی بھی دے رہا ہے، ہماری کھیتیوں کو پکا بھی رہا ہے، زندگی کی گاڑی کو ایک انجن کی طرح کھینچ رہا ہے۔ اگر زمین کو آبیاری کی ضرورت ہے تو سمندر سے کرنوں کے ڈول بھر بھر کر کھینچ رہا ہے، ابر کی چادریں بچھا رہا ہے، پہاڑوں سے برف کو پگھلا رہا ہے اور ندی نالوں کے ذریعے زمین کی ضرورت پورا کرنے میں لگا ہوا ہے۔

رات آتی ہے تو چاند اپنا فرض انجام دینے اور اہلِ زمین کی خدمت کرنے کیلئے آ موجود ہوتا ہے۔ وہ رات کے مسافروں کو راستہ دکھاتا، دلوں کو مسرتوں سے معمور کرتا، پھلوں میں مٹھاس اور گداز پیدا کرتا ہے۔ ستارے جھلملانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے، کلیاں کبھی چٹکنے سے نہیں رکتیں، پھول خود بخود مشامِ جاں کو معطر کرنے کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ تمہیں اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے دور جانے کی ضرورت نہیں فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ (عبس: ۸۰، ۲۴) انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے ہی کو دیکھے کہ جو غذا اس کے سامنے پڑی ہے وہ کہاں سے آئی ہے۔ یقیناً یہ گیہوں سے تیار ہوئی ہے۔ گیہوں کا ایک ایک دانہ ہتھیلی پر رکھ کر سوچو کہ یہ کیسے تیار ہوا ہے۔ کسان نے گیہوں زمین میں کاشت کیا، سہاگہ سے اسے دفن کر کے گھر چلا آیا لیکن اس کی غیر حاضری میں زمین کی قوت روئیدگی نے اپنا کام

Marfat.com

کیا' ہوا نے اپنا فرض انجام دیا' سورج نے سمندر کا شوربہ کھینچ کر ابر کی چادریں بچھائیں' موسم کے تغیرات اور ہوا کی گردش نے آبیاری کا کام کیا' سورج نے اس دانہ گندم کو پکایا' چاند نے اس میں گداز پیدا کیا، غرضیکہ تمام کارخانہ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں خود بخود بے تابانہ مصروف ہے۔ کسان یہ سمجھتا ہے کہ گندم کا یہ کھلیان میری محنت کا نتیجہ ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا کہ کس طرح عناصر قدرت اور زمین کی گیسوں نے اس سے کہیں زیادہ اپنا فرض انجام دے کر اسے روٹی کے قابل بنایا ہے۔ اسی پیرائے میں پروردگار مختلف نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم بے خبری میں جن نعمتوں سے استفادہ کرتے ہیں وہ سراسر اللہ کی رحمت کا ظہور ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمایئے جس میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْ ۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ○ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ○ ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْ ۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

(اور دیکھو یہ) چارپائے (جنہیں تم پالتے ہو) ان میں تمہارے لئے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون اور کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لئے بے غل و غش مشروب ہوتا ہے۔ (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں، جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو۔ بلاشبہ اس بات میں اربابِ عقل کیلئے (ربوبیت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے اور (پھر دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹہنیوں میں جو اس غرض سے بلند کی جاتی ہیں، اپنے لئے گھر بنائے پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے، پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرمانبرداری کے ساتھ گامزن ہو۔ (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اس کے جسم سے مختلف رنگوں کا رس نکلتا ہے، جس میں انسان کیلئے شفا ہے، بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کیلئے جو غور و فکر کرتے ہیں (ربوبیت الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی) بڑی ہی نشانی ہے۔ (النحل ۱۶: ۶۵-۶۶)۔

غرضیکہ عناصرِ قدرت میں ایک ایک عنصر اور ایک ایک خاصہ مخلوقات کو راحت رسانی اور سہولت مہیا کرنے کیلئے بے تاب ہے اور کبھی اس نے تساہل سے کام نہیں لیا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ پروردگار میں صفت ربوبیت کے ساتھ ساتھ رحمت بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ یہ سب اسی کا مظہر اور اسی کی نمود ہے۔

Marfat.com

کائنات کا حُسن اللہ کی صفتِ رحمت کا ظہور ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر تدبر کا ایک قدم مزید آگے بڑھائیں تو بے شمار ایسے مناظر ہیں، جو غور و فکر کرنے والے کو حیرت و استعجاب کی نذر کر دیتے ہیں۔ دور نہ جایئے اگر ہم زمین کو دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں کہ اس کی سطح پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ اس کی تہہ میں آب شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں' گہرائی سے سونا چاندی نکل رہا ہے۔ سائے کے لئے درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ چلنے پھرنے کے لئے سبزے کا ایک مخملیں فرش بچھا دیا گیا ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے سبزے کی چادریں بچھا دی گئی ہیں۔ پھولوں میں رنگ و حسن پیدا کر دیا گیا ہے۔ میدانوں کے اکتائے ہوئے لوگوں کے لئے سر بفلک پہاڑ اٹھا دیئے ہیں۔ ان میں آبشاریں ہیں جو سینوں کو مسرت سے بھرے دے رہی ہیں۔ اس میں قسم قسم کے درخت ہیں، جن کی حسن افروزی اپنی ایک شان رکھتی ہے۔ پھر باغ و انہار' سبزیاں' پھل ہیں' قسم قسم کی بیلیں ہیں۔ پھر زمین کے چار پائے' فضا کے پرند' پانی کی مچھلیاں' یہ سب کیا ہے؟ ظاہر ہے یہ ساری چیزیں انسان کی ضرورت کے لئے ضروری نہیں تھیں۔ انسان کے لئے لکڑی کی ضرورت تھی؟ لیکن کیا ضروری تھا کہ درختوں کو چھتریاں بنا دیا جاتا۔ انسان کو غلے کی ضرورت تھی لیکن لہلہاتی فصل کو نقرئی لباس پہنانے کی کیا ضرورت تھی پرندے گوشت کے لئے ضروری سہی لیکن ان کی خوبصورت آوازیں' کوئل کی کوک' مور کا ناچ' پپیہے کی پی' چڑیوں کے چہچہے' اور عام پرندوں کے ترانے یہ تو انسان کی ضرورت نہ تھے اور اگر آسمان کی طرف دیکھا جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہم پر ایک چھت تانی گئی ہے۔ لیکن ستاروں کا نظام اور ان کی سیر و گردش' سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی' چاند کی گردش اور اس کا اتار چڑھاؤ' فضائے آسمانی کی وسعت اور اس کی نیرنگیاں' بارش کا سماں اور اسکے تغیرات..... یہ سب کیا ہے؟ یہ چیزیں یقیناً انسان کی ضرورتوں میں شامل نہیں۔ ان چیزوں پر جب آپ غور کریں گے تو آپ محسوس فرمائیں گے کہ یہاں ربوبیت سے زیادہ ایک اور چیز کارفرما ہے یہ وہی چیز ہے، جس کو قرآن صفت رحمت سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ خالق کائنات میں رحمت ہے اور اسکی رحمت اپنا ظہور بھی رکھتی ہے اور جس میں رحمت ہو اور جس کی رحمت ظہور بھی رکھتی ہو تو جو کچھ اس سے صادر ہو گا اس میں خوبی اور بہتری' حسن و جمال، اعتدال و تناسب ہی ہو گا۔ اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور پھر یہ اس کی صفت رحمت کا ظہور صرف یہاں تک محدود نہیں کہ خارج میں آپ ہر طرف حسن و رعنائی دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ اس کی رحمت کا اصل ظہور اس بات میں ہے کہ اس نے صرف ہمیں حسن و رعنائی ہی سے نہیں نوازا بلکہ اس سے محظوظ ہونے کیلئے احساس بھی بخشا۔ اس نے روئے خوش بخشا تو نظر کو احساس حسن بھی بخشا۔ اس نے پھول میں خوشبو رکھی تو ہمیں قوت شامہ سے بھی نوازا۔ اس نے پانی کو ٹھنڈک عطا کی تو ہمیں ٹھنڈک کی قدر کا جذبہ بھی دیا۔ اس نے پھول میں رنگ رکھا تو ہمیں رنگوں کی شناخت بھی بخشی۔ یعنی ہر چیز سے اور اس کی حقیقی قدر و قیمت سے حظ اٹھانے کیلئے جس احساس کی ضرورت تھی اس احساس سے اس نے تمام مخلوقات کو بہرہ ور فرمایا۔ وہ اپنی مخلوقات کو اولاد دیتا ہے تو اولاد کی محبت بھی دیتا ہے۔ سعی و کاوش کی سرگرمیوں کیلئے جوش و جذبہ بھی عطا کرتا ہے۔ گھر دیتا ہے تو اس کے لئے حفاظت کا جوش بھی عطا فرماتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صورتوں میں ایک آدمی کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سخت گرمی میں محنت اور مزدوری کر رہا ہے۔ چہرے سے پسینہ ٹپک رہا ہے' چلچلاتی دھوپ میں بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے' دیکھنے والی نگاہ سمجھتی ہے کہ یہ شخص اپنی زندگی سے انتہائی ناخوش ہو گا مگر شام کو دن بھر کی مزدوری کا معاوضہ پا کر جب اپنے جھونپڑے میں بیوی اور بچوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر وہ مسکرا مسکرا کے باتیں کرتا ہے تو تب اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مزدوری کرنا تو ایک ضرورت تھی۔ لیکن اس خوشی کو پیدا کر دینا یہ اس پروردگار کا کمال ہے جو رحمان اور رحیم ہے۔ اسی

Marfat.com

طرح آپ دیکھتے ہیں کہ بچے کی پیدائش ماں کیلئے کیسی جانکاہی اور مصیبت ہوتی ہے۔ اس کی پرورش اور نگرانی کس طرح خودفروشانہ مشقتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ تاہم یہ سارا معاملہ کچھ ایسی خواہش اور جذبے کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کہ ہر عورت میں ماں بننے کی قدرتی طلب ہے اور ہر ماں پرورشِ اولاد کیلئے مجنونانہ خودفراموشی رکھتی ہے۔ وہ زندگی کی سب سے بڑی تکلیف سہے گی اور پھر اس تکلیف میں زندگی کی سب سے بڑی مسرت محسوس کرے گی اور جب وہ اپنی ساری راحتیں قربان کر دیتی ہے' اپنی رگوں کے خون کا ایک ایک قطرہ دودھ بنا کر پلا دیتی ہے تو اس کے دل کا ایک ایک ریشہ سب سے بڑے احساسِ مسرت سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ اس خالق کائنات کی صفتِ رحمت کا ظہور ہے اور پھر اگر دقیق نظر سے کام لیا جائے تو اس رحمٰن ورحیم کے افادہ اور فیضان اور اس کی رحمت کے ظہور کی صورت کچھ انہی مظاہر پر موقوف نہیں ہے بلکہ کارخانۂ ہستی کے تمام اعمال وقوانین کا یہی حال ہے۔ مثلاً دیکھئے کہ انسان ٹھوکریں کھاتا ہے' غلطیاں کرتا ہے تو ہونا یہ چاہئے کہ اپنی غلطیوں کا خمیازہ فوراً بھگتے اور بدعملی اس کو فوراً تباہی کی طرف لے جائے۔ لیکن ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ اس کی صفتِ رحمت کا ظہور اس طرح ہو رہا ہے کہ یہاں بڑے سے بڑے گناہ گار کو سنبھلنے کیلئے مہلت دی جا رہی ہے۔ اپنی روش کو تبدیل کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے اور اس کی جزا وسزا کا قانون فوراً حرکت میں آنے کی بجائے آہستہ آہستہ اس کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور اس کے عفو ودرگزر کا دروازہ آخر تک کھلا رہتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے کہا کہ اگر پروردگار لوگوں کو ان کی زیادتیوں پر فوراً پکڑنے لگتا تو زمین پر چلنے والا کوئی زندہ نہ رہتا۔ یہ اس کی رحمت ہے جو اچھائی کرنے والے کو بھی مہلت دیتی ہے تاکہ اس کی اچھائی نشوونما پائے اور برائی کرنے والے کو بھی مہلت دیتی ہے تاکہ وہ متنبہ اور خبردار ہو کر اصلاح وتلافی کی کوشش کرے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝ (فاطر : ۴۵.۲۵)

اس خدائے رحمٰن ورحیم کی رحمت کے مظاہر بے شمار ہیں مگر انسان کی کوتاہ فکری ہے کہ چونکہ شب وروز اس کی بے پایاں رحمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اس لئے اسے نہ اس کی پہچان ہوتی ہے، نہ اس کی قدر وقیمت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کیلئے تصور کریں کہ دنیا موجود ہے مگر حسن ورعنائی کے تمام جلووں اور احساسات سے خالی ہے۔ آسمان ہے مگر فضا کی یہ نگاہ پرور نیلگونی نہیں ہے۔ ستارے ہیں مگر ان میں درخشندگی اور جہاں تابی کی جلوہ آرائی نہیں ہے۔ غور کیجئے ایسی دنیا کے ساتھ زندگی کا تصور کتنا بھیانک اور ہولناک ہوگا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیئے۔ رات روز جلوہ گر ہوتی ہے مگر آنکھوں میں نیند نہیں آتی۔ صبح مسکراتی ہوئی طلوع ہوتی ہے لیکن نقاہت یا کوئی بیماری بستر سے اٹھنے نہیں دیتی۔ باہر پرندے چہچہا رہے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں سے کائنات کو منور کر رہا ہے، لیکن آشوبِ چشم یا پاؤں کی تکلیف باہر نکل کر محوِ نظارہ ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔ رنگا رنگ خوانِ نعمت سجا ہوا ہے لیکن طبیعت کی بے کیفی ادھر متوجہ نہیں ہونے دیتی یا آدمی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے' لیکن بھوک کا احساس مر جانے سے یہ نعمتیں مزا نہیں دے رہیں۔ گرمیوں میں ٹھنڈے پانی کی نعمت میسر ہے لیکن دانتوں کی تکلیف یا معدے کی سوزش پانی پینے کی متحمل نہیں ہو رہی، باہر آزادی سے گھومنا پھرنا ایک معمول کی نعمت ہے مگر پاؤں کی تکلیف باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے رہی۔ یہ بظاہر معمولی نعمتیں ہیں لیکن اگر یہ چھن جائیں تب آدمی کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کیسی بدمزہ ہوگئی۔ یہی اس پروردگار کی رحمت ہے جس کی قدردانی سے ہماری عقول نارسا قاصر ہیں۔

Marfat.com

مزید دیکھئے کبھی آپ نے غور کیا کہ اگر آپ ایک ہی طرح کے معمولات اور مصروفیات میں ایک عرصہ گزارتے ہیں تو حالات کی یہ یکسانی طبیعت کو اکتا دیتی ہے اور آپ کہیں سیر کا پروگرام بنانے لگتے ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر عام میدانی علاقوں والوں کیلئے پہاڑی سلسلے نہ ہوتے اور پہاڑی سلسلے والوں کیلئے ہموار میدان نہ ہوتے۔ ریگستان والوں کیلئے دریاؤں کی روانی نہ ہوتی اور دریا کے کنارے رہنے والوں کیلئے ریگستان کے ٹیلے نہ ہوتے تو آپ اس اکتاہٹ کا کیا علاج کرتے۔ اگر اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھیں تو آپ کو تعجب ہوگا کہ گھر بیٹھے قدرت نے ہمیں اس یکسانی سے بچنے کیلئے کیسی کیسی نعمتیں عطا کیں۔ مثلاً اختلاف لیل ونہار' موسموں کے تغیرات' خزاں اور بہار کا ایک دوسرے کی جگہ لینا' ٹنڈ منڈ درختوں کا سبزے کا لباس پہن لینا' بے آباد اور بے رنگ زمین پر رنگ رنگ کے پھولوں کا کھل جانا ایسے ہی بے شمار اختلافات ہیں جو پروردگارِ عالم کی صفت رحمت کا ظہور دنیا کی زیب وزینت اور ہماری تسکین وراحت کا سامان ہیں۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اسی کی طرف پروردگار توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ ''بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں عقلمندوں کیلئے نشانیاں ہیں، (آل عمران ۳:۱۹۰)''

مزید فرمایا: وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ ''کہ یہ اس کی رحمت کی کارسازی ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن ٹھہرائے گئے ہیں تاکہ رات کو راحت پاؤ اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔'' (قصص ۲۸:۷۳)

اس بحث کا ایک اور گوشہ بھی ہے جس پر توجہ دینا بے حد ضروری ہے، کہ پروردگار کی رحمتوں کے مختلف مظاہر کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ تصور کیجئے اگر یہ جابجا اس کے ظہور کی صورتیں اور اس کے صدور کی شکلیں اپنی جگہ قائم ہوتیں اور ہر انسان اس سے بقدر ہمت استفادہ کیلئے کوشاں ہوتا اور ہر ایک اپنے آپ کو ان کا حقیقی وارث اور مالک سمجھتا اور کسی کو اس بات کا علم نہ ہوتا کہ انسانوں کا انسانوں سے کیا رشتہ ہے؟ ان نعمتوں پر اگرچہ سب کا مساوی حق ہے مگر انسانی معیشت میں جو لوگ کسی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کا آگے بڑھ جانے والوں پر بھی کیا کوئی حق ہے؟ پھر ان میں باہمی انس اور محبت کا کوئی جذبہ نہ ہوتا' ایثار وخیر خواہی سے انسان ناواقف ہوتا۔ حقوق وفرائض سے بے خبر' باہمی نظم و تربیت سے عاری' حکومت اور ریاست کے تصور سے نابلد' معاشرت کے اصولوں سے تہی دامن' مکارم اخلاق سے ناآشنا ہوتا' تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان ساری نعمتوں کی موجودگی کے باوجود انسانی زندگی کس قدر ہولناک ہوتی۔ اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ ہم ایک گھر بناتے ہیں جس میں میاں بیوی اور ان کے بچے ہیں۔ جب تک میاں بیوی میں ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری رہتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے غایت درجہ محبت رکھتے ہیں۔ شوہر باہر محنت کرتا ہے اور بیوی گھر کی ذمہ داریاں ادا کرتی ہے۔ اس طرح دونوں یکجان اور دو قالب ہو کر اپنے بچوں کیلئے ٹھنڈا سا سایہ مہیا کرتے ہیں اور بچوں کی نگاہ میں ان دونوں کا وجود اللہ کی رحمت کی علامت ہوتا ہے اور بچے اگر بڑے ہو جائیں تو وہ اپنے ماں باپ کی بالکل اسی طرح عزت کرتے اور دیکھ بھال کرتے ہیں، جس طرح ماں باپ نے انہیں شفقت سے پالا اور محنت سے پروان

Marfat.com

چڑھایا تو یہ گھر فی الواقع جنت کا نمونہ ہوتا ہے۔لیکن اگر اسی گھر کی چھت کے نیچے رہنے والے میاں بیوی ایک دوسرے سے خیانت کا ارتکاب کریں بیوی شوہر کی غیر حاضری میں شوہر کی غیرت وحمیت کو تماشہ بنادے اور شوہر باہر بیوی کی محبت اور اعتماد کو رسوا کرتا پھرے آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر دور ہو جائیں کہ بجائے بچوں کیلئے نمونہ بننے کے بچوں کیلئے ڈراؤنا خواب بن جائیں گے۔ بچے انہیں اپنے کردار کیلئے نمونہ سمجھنے کی بجائے اجنبی خیال کرنے لگیں اور جب یہ بڑے ہوں تو ان کا ردعمل ان کی اجنبیت کو یاد کر کے گستاخی یا لاتعلقی کا حامل ہو جائے تو اندازہ فرمایئے کہ یہ گھر اپنی چھت اور دیواروں سمیت اور اپنی ساری آرائش کے باوصف گھر نہیں رہے گا، بلکہ جہنم کا نمونہ بن جائے گا۔اس گھر میں رہنے والا ہر فرد ایک دوسرے سے شاکی ہوگا۔نتیجتاً یہ دونسلیں تباہی کے راستے پر چل نکلیں گی۔اسی مثال سے باقی پوری انسانی زندگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔انسانی زندگی کے بے شمار ادارے ہیں جن میں سے ہر ادارہ حقوق وفرائض کی ادائیگی ہی سے باقی رہتا اور ترقی کرتا ہے۔حقوق وفرائض کا شعور کسی بھی ادارے میں کام کرنے والوں سے اگر سلب کر لیا جائے یا وہاں کام کرنے والے سرے سے اس شعور سے محروم ہوں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ادارہ کتنے دنوں چلے گا۔گھر سے لے کر ایوان ہائے حکومت تک کے ناگفتہ بہ حالات اس زندہ حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ ہر جگہ بہتری اور استواری کا دارومدار بنیادی حقائق اور اصولوں کی پاسداری سے وابستہ ہے اور ان کی تباہی و بربادی انہی اصولوں سے ناواقفیت یا ان سے انحراف کا نتیجہ ہے۔اس لئے وہ ذات بابرکات جو صرف خالق و مالک ہی نہیں رحمٰن ورحیم بھی ہے،اس کی صفت رحمت کا یہ تقاضا ٹھہرا کہ جہاں انسانوں کو ظاہری اور باطنی نعمتوں سے نوازا گیا ہے، وہاں اس کے استعمال اور اس کی حدود کا علم بھی دینا چاہئے ورنہ یہ اس صفت رحمت کی ناتمامی ہوگی۔ چنانچہ اس نے انسان کو علم سے بہرہ ور کرنے کیلئے کتابیں اتاریں اور راہنمائی کے لئے رسول بھیجے۔ اور اس راہنمائی کو اور کتابوں کے نزول کو اس نے ہدایت ورحمت سے تعبیر کیا۔

فرمایا: وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ ''یہ قرآن ہدایت اور رحمت ہے مومنوں کیلئے''۔(نمل 77)

پھر اس کی تعلیم کو دنیا بھر کے خزانوں سے بہتر و برتر فرمایا' ارشاد فرمایا: وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ''تیرے رب کی رحمت یعنی (قرآن) بہتر ہے، ان تمام خزانوں سے جن کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں''۔(زخرف 32)

پھر قیامت تک جو ذات مکمل راہنما' آئیڈیل اور منارۂ نور بن کر آئی ہے اس کے بارے میں فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیا: ۲۱.۱۰۷)

ہم نے یہاں تک اللہ کی صفت ربوبیت اور اس کی صفتِ رحمت کو کسی حد تک جاننے کی کوشش کی ہے۔ان دونوں کے مطالعہ سے علم و معرفت کا ایک اور دروازہ ہمارے سامنے واشگاف ہوتا ہے'' وہ یہ کہ ہم جب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے فیضان کو دیکھتے ہیں کہ اس نے ہمارے لئے زمین کا فرش بچھایا' آسمان کی چھت تانی' پھر زمین سے ہمارے لئے مختلف قسم کی غذائیں پیدا فرمائیں' زندگی کے امکانات ایک سے ایک بڑھ کر ہمیں عطا کئے۔دل ودماغ کی رعنائیاں عطا فرمائیں، ہماری ظاہری اور باطنی روحانی اور مادی ہر طرح کی ضروریات کو مہیا فرمایا۔ایسی ایسی نعمتیں عطا فرمائیں اور اس وسعت سے دسترخوان نعمت بچھایا کہ آدمی انہیں دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا:

دنیا تو اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

Marfat.com

اللہ کی رحمت خود روزِ جزاء پر دلیل ہے

ربوبیت کے اس اہتمام کو دیکھتے ہوئے یقیناً ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ پروردگار عالم جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، کیا اس نے اس کائنات میں انسان کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کر دیا ہے اور اس کائنات کی ایک ایک چیز اس کی خدمت میں دے کر یہ کہہ دیا ہے کہ جاؤ تم ان چیزوں سے کام لو تمہاری حیثیت ایک شتر بے مہار سے زیادہ نہیں۔ تم جدھر جی چاہے منہ اٹھائے چلتے پھرو۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے جو چاہو کرو تمہارا پیدا کرنے والا تم سے کسی بات کی باز پرس نہیں کرے گا؟ اندازہ فرمائیے کہ کیا یہ تصور کسی حکیم ذات کے بارے میں قرین عقل بھی ہے؟ دنیا میں کوئی بھی شخص کوئی ایسا کام کرے جس کا کوئی مقصد نہ ہو تو ہر شخص اس کا مذاق اڑاتا ہے کہ اس نے اپنی محنتوں اپنی کاوشوں اور اپنی ذہانت کا یہ کیا مصرف سمجھا ہے کہ ایک بے فائدہ کام میں اپنا سب کچھ ضائع کر دیا۔ بچے گھروندے بنا کر ڈھا دیتے ہیں تو ان کے بچپنے کی وجہ سے انہیں یہ سمجھ کر کچھ نہیں کہا جاتا کہ یہ بچے ابھی عقل اور شعور کی عمر کو نہیں پہنچے اس لئے یہ زندگی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر بچوں کا باپ یہ حرکت کرے تو ہر دیکھنے والا اس کی دماغی صحت کے بارے میں شبہ میں پڑ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ظاہر ہے ایسی کسی بات کا تصور کرنا بھی خلاف ادب ہے۔ اس لئے کہ اس کی ربوبیت کا یہ اہتمام خود پکار پکار کر یہ شہادت دے رہا ہے کہ یہ اہتمام کسی اہم غایت و مقصد کیلئے ہے اور یہ ان لوگوں پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عائد کرتا ہے جو بغیر کسی استحقاق کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک دن ان ذمہ داریوں کے بارے میں ایک ایک شخص سے پرسش ہوگی کہ تمہیں ہم نے زندگی کی اور زندگی کی ساری نعمتیں عطا فرمائیں اور عناصر قدرت کو تمہارے ہم رکاب کیا۔ تم نے ایک حیوان کی طرح زندگی گزارنے کی آخر کوشش کیوں کی؟ تم نے یہ بات کیوں نہ سمجھی کہ جس نے ہمیں جوہر عقل سے نوازا ہے یقیناً اس نے ہمیں کچھ ذمہ داریاں بھی سونپی ہوں گی اور وہ ضرور ایک دن ایسا لائے گا جب وہ ہم سے اس کا حساب لے گا۔ اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ۝ (مومنون: ۲۳.۱۱۵) ''کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں عبث اور بے کار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟''

اور ایک دوسری جگہ اپنی نعمتوں ہی سے استدلال کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ تم آج جن نعمتوں سے متمتع ہو رہے ہو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک دن ان کا حساب بھی دینا ہوگا۔

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ۝ وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ۝ وَّخَلَقۡنٰكُمۡ اَزۡوَاجًا ۝ وَّجَعَلۡنَا نَوۡمَكُمۡ سُبَاتًا ۝ وَّجَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِبَاسًا ۝ وَّجَعَلۡنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَّبَنَيۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا ۝ وَّجَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝ وَّاَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝ لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝ وَّجَنّٰتٍ اَلۡفَافًا ۝ اِنَّ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ كَانَ مِيۡقَاتًا ۝ (نبا ۷۸: ۶۔۱۷)

(کیا ہم نے زمین کو تمہارے لئے گہوارہ نہیں بنایا اور اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں ٹھونکیں؟ اور ہم نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا اور تمہاری نیند کو دافع کلفت بنایا۔ رات کو تمہارے لئے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصول معاش کا وقت ٹھہرایا اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بلند کئے اور روشن چراغ بنایا اور ہم نے بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی برسایا تاکہ اس سے ہم غلے اور نباتات اگائیں اور گھنے باغ پیدا کریں۔ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے)۔

Marfat.com

یعنی اوپر جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ جس نے یہ سب کچھ اہتمام انسان کیلئے کیا ہے وہ انسانوں کو یونہی شتر بے مہار کی طرح نہیں چھوڑے رکھے گا بلکہ اس کی نیکی یا بدی کے فیصلے کیلئے فیصلہ کا ایک دن بھی لائے گا۔

اسی طرح جب ہم اس کی صفت رحمت کے مناظر کو دیکھتے اور اس کی صفت رحمت کے ظہور کی صورتوں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کی رحمت کا ظہور کائنات کی ایک ایک چیز میں ہوا ہے۔ اسی طرح اس کی رحمت کا تعلق انسانی اعمال اور اس کے نتائج سے بھی ہے۔ دنیا میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو دنیا میں نیکی کے پیکر بن کر نیکی کو فروغ دیتے ہیں۔ نیکی کی کیسی بھی قیمت ادا کرنی پڑے وہ اس سے دریغ نہیں کرتے۔ اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے قربانیاں دیتے اور لوگوں کی طرف سے مصائب کو برداشت کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو خواہشات نفس کے بندے اور درہم و دینار کے پرستار ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد عیش و عشرت کے سوا کچھ نہیں۔ انہیں اگر اقتدار ملتا ہے تو کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں اور اگر اقتدار نہیں ملتا تو اپنی محرومیوں کا انتقام جرائم کی صورت میں معاشرے سے لیتے ہیں۔ اس کیلئے انہیں انسانی زندگیوں سے بھی کھیلنا پڑے تو دریغ نہیں کرتے۔

ان دونوں طرح کے لوگوں کی حالت پر غور کیجئے۔ اگر پہلی طرح کے لوگ ایک اچھی پاکیزہ لیکن کٹھن زندگی گزار کر دنیا سے چلے جاتے ہیں اور انہیں دنیا میں سوائے محرومیوں کے اور کچھ نہیں ملا اور آخرت کا بھی ان کے یہاں کوئی تصور نہ ہو تو اندازہ فرمایئے کہ انہوں نے جن مقاصد کی خاطر اپنی زندگی کی راحتیں قربان کیں اور بعض دفعہ زندگی بھی نچھاور کر ڈالی انہیں اس کا کیا صلہ ملا اور دوسری طرف وہ لوگ جنہوں نے زندگی بھر ظلم توڑے اور عیش و عشرت کو مقصد زندگی بنائے رکھا انہیں کھلی چھٹی دے دی گئی اور ان سے کوئی باز پرس کا دن مقرر نہ کیا تو کیا یہ اللہ کی صفت رحمت کے خلاف نہیں ہوگا؟ اس کی رحمت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس کی خاطر جان دینے والوں کو ایک نہ ایک دن صلہ ملے اور اس سے انحراف کرنے والوں کو ایک نہ ایک دن انحراف کی سزا ملے اور اگر دونوں کو بغیر کسی باز پرس کے کھلی چھٹی دے دی جائے اور اسی طرح زندگی کا یہ کارخانہ ختم کر دیا جائے اور جزا اور سزا اور انعام و انتقام کا کوئی دن کبھی نہ آئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ معاذ اللہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں متقی اور مجرم دونوں برابر ہیں بلکہ مجرم نسبتاً اچھے ہیں جن کو جرم کرنے اور فساد کرنے کیلئے اس نے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے اور یہ چیز ظاہر ہے کہ اللہ کی صفت رحمت کے یکسر خلاف ہے اس لئے پروردگار نے فرمایا:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ ○ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ○ ''کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟'' (قلم ۳۶)۔

کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ''اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے، وہ قیامت تک جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، تم کو ضرور جمع کر کے رہے گا'' (انعام: ۱۲)۔

حاصل کلام یہ کہ اللہ کی صفت ربوبیت اور اس کی صفت رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے جس میں ہر شخص سے اس کی گزری ہوئی زندگی کا حساب لیا جائے۔ حسن عمل کے سرمایہ داروں کو بیش از بیش صلہ ملے اور اللہ کے منکروں اور انسانیت کے دشمنوں کو ان کے کرتوتوں کی سزا ملے۔ کیونکہ جس طرح نیکی کرنے والوں کو ان کی نیکی کا صلہ ملنا رحمت کا تقاضہ ہے اسی طرح انسانیت کے دشمنوں کو ان کے کیے کی سزا ملنا بھی رحمت کا تقاضہ ہے۔ تاکہ وہ سزا کے خوف سے اپنی بداطواری سے باز آ جائیں اور اپنا انجام بہتر کر لیں اور باقی نوع انسانی ان کے شرور سے محفوظ رہ سکے۔ اسی لئے اب اس کے بعد اللہ کی صفت عدالت کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ

(جزا اور سزا کے دن کا مالک)

امام بیضاوی نے "مالک" کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا المتصرف فی اعیان المملوکة کیف شاء ''وہ ذات جو اپنی مملوکہ چیزوں میں جس طرح چاہے تصرف کرنے کی قدرت رکھتی ہو'' یعنی اسے ایسا قبضہ حاصل ہو کہ اس کے تصرف کو نہ کوئی روک سکے اور نہ اسے ناجائز کہہ سکے اس آیت کریمہ میں پروردگار نے اپنے آپ کو جزا اور سزا کے دن کا مالک قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس دنیا اور دنیا کی ہر چیز اور پھر آنے والی دنیا اور اس کی ہر چیز کا بھی اللہ ہی مالک ہے تو پھر بطور خاص اپنے آپ کو روز جزا کا مالک کہنے سے کیا مراد ہے؟ بات یہ ہے کہ یوں تو پروردگار کائنات کے ذرے ذرے کا مالک ہے ہر چیز کو اسی کے حکم سے وجود ملا ہے' اسی کی عنایت سے اس کی زندگی وابستہ ہے اور ہر چیز کی بقاء اللہ ہی کے رحم و کرم پر ہے۔ لیکن یہ اس کی حکمت ہے کہ اس نے مخلوقات کو کسی نہ کسی حد تک ملکیت کا حق دے رکھا ہے۔ جنگل کے جانور طاقت کے بل بوتے پر جس بھٹ' بل یا آشیانے پر قبضہ کر لیں وہ اس کو اپنی ملک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی بعض حوالوں سے بہت ساری چیزوں کو اپنی ملکیت خیال کرتا ہے اور شریعت نے بھی ہر جائز ملکیت کے حقوق تسلیم کئے ہیں۔ لیکن ایک تو یہ ملکیت چند روزہ ہے، زندگی کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جائے گی اور دوسری یہ بات کہ یہ ایک ناقص ملکیت ہے اگر کامل ملکیت ہوتی تو قیامت کے دن اس کے بارے میں جواب دہی نہ کرنا پڑتی۔ پروردگار نے اس ناقص ملکیت کا بھی لحاظ فرمایا اس لئے انسانی زندگی اور اس کے زیر تصرف چیزوں پر کامل ملکیت رکھنے کے باوجود بھی ملکیت کا ذکر نہیں فرمایا۔ بلکہ اپنے آپ کو یوم الدین کا مالک کہا جس سے اشارہ اس جانب ہے کہ وہ دن ایسا ہو گا جس دن اللہ کی صفت عدالت پوری طرح ظہور میں آ چکی ہو گی اور وہ ہر شخص کو عدالت کے کٹھرے میں بلا کر جواب طلبی کرے گا۔ اس دن ناقص ملکیت رکھنے والے جو اپنی محدود ملکیتوں پر ناز کرتے تھے وہ اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوں گے اور وہ بڑے بڑے حکمران جنہیں ان کے اقتدار نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا، اس کے سامنے سر جھکائے سہمے ہوئے ایستادہ ہوں گے۔ پھر وہ اس دن اعلان فرمائے گا کہ باوجود اس کے کہ دنیا میں بھی اصل ملکیت اور حکومت میری تھی اور میں فی الحقیقت مالک ہوتے ہوئے ہر چیز کا حکمران تھا۔ لیکن تم نے اپنی ناقص حکمرانی سے دھوکہ کھا کر میری حکمرانی کو نظر انداز کیا۔ آج بتاؤ وہ تمہاری حکمرانیاں کہاں گئیں اور آنکھیں کھول کے دیکھو کہ آج کس کی حکومت ہے کہ اس کے مقرب بندے بھی سر جھکائے کھڑے ہیں اور اس کے انبیاء و رسل بھی زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر پا رہے۔ اسی کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

یَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا یَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ اَلْیَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ○ ''جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے آ موجود ہوں گے (کہ) ان کی کوئی بات خدا سے (صورۃً) بھی مخفی نہ رہے گی' آج کے روز کس کی حکومت ہو گی؟ بس اللہ ہی کی ہو گی' جو یکتا اور غالب ہے۔ آج ہر شخص کو اسکے کئے کا بدلہ دیا جائے گا' آج کسی پر ظلم نہ ہو گا' اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں'' (المومن آیت ۴۰:۱۶۔۱۷)۔

Marfat.com

اس آیت کریمہ کا دوسرا لفظ ہے یوم الدین ''جزا و سزا کا دن''۔ اس لفظ پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جزا اور سزا کا دن وہ ہوگا۔ جب اس دنیا کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ہم سب اللہ کی بارگاہ میں جواب دہی کیلئے کھڑے ہوں گے اور جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، جس میں اب ہم رہ رہے ہیں، یہ جزا و سزا کا دن نہیں، یہ دار العمل ہے۔ یہاں ہمیں مہلتِ عمل میسر ہے تا کہ ہم آنے والے دن کی تیاری کر سکیں۔ یہاں جو کچھ ہم کریں گے اس کا صلہ آنے والے دن میں پائیں گے نیکی کریں گے۔ تو اس کا صلہ اچھا ملے گا اور برائی کریں گے تو اس کے نتیجے میں برائی ملے گی۔ اس لئے اس دنیا میں ہر زندہ شخص کو یہ سوچ کر زندگی گزارنی ہے کہ یہاں میں صرف اعمال کا مکلف ہوں اللہ نے مجھ پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں مجھے اپنی زندگی میں انہیں ادا کرنا ہے۔ وہ چاہے انفرادی ذمہ داریاں ہوں چاہے اجتماعی ذمہ داریاں۔ ان کی ادائیگی مجھ پر واجب ہے اور اسی حوالے سے کل کو مجھے جزا اور سزا ملے گی۔ آج کسی عمل کے بارے میں بھی مجھے یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ اسی دنیا میں مجھے اس کی جزا بھی ملے گی۔ اس بات کو سمجھ لینے سے آدمی ایک بڑی غلط فہمی سے بچ جاتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی نیکی کرنے والا شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ خود بھی اور اسے جاننے والے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے لگتے ہیں کہ نیکی کا صلہ تو اللہ بہتر اجر کی صورت میں دیتا ہے، یہ نیک شخص آخر اس مصیبت میں مبتلا کیوں ہے۔ اس سوچ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو اس نیک شخص کے بارے میں بدگمانی پیدا ہونے لگتی ہے اور یا اللہ کے بارے میں آدمی بدگمان ہو جاتا ہے کہ مذہب غلط کہتا ہے کہ نیکی کا صلہ اجر و ثواب کی صورت میں ملتا ہے اور دنیا میں ایک اچھی زندگی عطا ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نیک لوگ مصیبتوں میں مبتلا کیوں ہوتے۔

اسی طرح اگر کوئی برا آدمی دولت میں کھیلتا ہے اور آئے دن اس کے کاروبار میں ترقی ہوتی ہے یا اس کا عہدہ و منصب بڑھتا ہے تو تب بھی لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے لگتے ہیں کہ اگر برائی کا نتیجہ برا ہوتا تو اس شخص کو یہ آسانیاں اور سہولتیں تو میسر نہیں آنی چاہئیں تھیں۔ اس لئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ تم جس دنیا میں زندگی گزار رہے ہو یہ دار الجزاء نہیں، دار العمل ہے۔ تمہارا کام یہاں اچھے سے اچھا عمل کرنا ہے۔ اس کی جزا تمہیں قیامت میں ملے گی۔ اس لئے اگر آج نیکی کی جزا نہیں مل رہی تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں اور اگر کسی کو گناہ یا ظلم کی سزا نہیں مل رہی تو اس میں بھی ظالم کی خوشی کا کوئی موقع نہیں۔ البتہ ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ بعض دفعہ یہاں بھی نہ کبھی نیکی کا صلہ مل بھی جاتا ہے اور کبھی کسی مجرم کو دنیا ہی میں سزا سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں کسی نیکی کا صلہ درحقیقت جزا نہیں۔ بلکہ نیکی کرنے والے کی حوصلہ افزائی ہے۔ اس کا تعلق قانون جزا سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل و رحمت سے ہے۔ اسی طرح کسی بدعملی کی سزا کا ملنا وہ بھی حقیقت میں جزا اور سزا کے قانون کا ظہور نہیں، بلکہ محض متنبہ کرنے کیلئے ہوتا ہے جو اصل سزا اور عذاب ہوگا۔ وہ تو قیامت کے دن ہی ہوگا قرآن کریم نے اس کے بارے میں ہمیں بتایا ہے:

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ ''یعنی ہم لوگوں کو (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے (بعض اوقات) دنیا میں ایک عذاب چھوٹے عذاب قریب کا مزہ چکھا دیتے ہیں تا کہ وہ باز آ جائیں''۔ (سجدہ ۳۲: ۲۱)

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ ''ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے' کاش وہ سمجھیں''۔ (قلم ۶۸: ۳۳)

الغرض دنیا کی راحت و مصیبت بعض اوقات تو امتحان اور آزمائش ہوتی ہے اور کبھی عذاب بھی ہوتی ہے۔ مگر وہ عمل کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک نمونہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ چند روزہ اور محض عارضی ہے۔ اصل بدلہ وہ راحت و کلفت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے اور جو

Marfat.com

اس عالم سے گزرنے کے بعد عالم آخرت میں آنے والی ہے۔اسی کا نام روز جزاء ہے اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ نیک و بدعمل کا بدلہ یا پورا بدلہ اس دنیا میں نہیں ملتا اور عدل و انصاف اور عقل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد اچھا اور برُا برابر نہ رہے بلکہ ہر عمل کی مکمل جزا یا سزا ملنی چاہئے۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا عالم، ہو جس میں ہر چھوٹے بڑے اور اچھے برے عمل کا حساب اور اس کی جزا یا سزا، انصاف کے مطابق ملے۔اسی کو قرآن کی اصطلاح میں روز جزا یا قیامت یا آخرت کہا جاتا ہے۔قرآن نے خود اس مضمون کو سورۃ مومن میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ''یعنی بینا اور نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور (دوسرے) بدکردار باہم برابر نہیں ہو سکتے' تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو' قیامت تو ضرور ہی آکر رہے گی (تاکہ ہر ایک عمل کا پورا بدلہ ہر عمل کرنے والے کو مل جائے)' اس کے آنے میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں' مگر اکثر لوگ نہیں جانتے''۔(المؤمن ۴۰:۵۸۔۵۹)

سورۃ فاتحہ میں آخرت یا قیامت کو یوم الدین کے نام سے ذکر فرمایا گیا ہے۔اس میں نزول قرآن کے وقت لوگوں کی ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرنا مقصود تھا۔جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔سب سے پہلے آخرت کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

آخرت کا تعارف

اسلامی عقائد کی آخری کڑی آخرت پر ایمان لانا ہے۔قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اس کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے۔اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے۔قرآن کریم نے اسے الیوم الآخر یا آخرت کے نام سے تعبیر کیا ہے۔مراد اس سے آخرت کا گھر یا آخرت کی زندگی ہے۔

عربی میں طریقہ یہ ہے کہ اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں۔اس طریقے کے مطابق قرآن کریم نے ''الآخرت'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو ''الحیاۃ'' یا ''الدار'' کی صفت ہے۔مراد اس سے آخرت کا گھر یا آخرت کی زندگی ہے۔

قرآن پاک میں تقریباً 113 مقامات پر یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔الآخر یا آخرت کا معنی ہے پچھلی زندگی یا پچھلا گھر یا پچھلی دنیا۔اس پچھلی دنیا سے مراد موت کے بعد کی دنیا ہے، جسے قرآن کریم نے دو دوروں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے دور سے مراد موت سے لے کر قیامت تک کا دور ہے اور دوسرے دور سے مراد قیامت سے لے کر ابد تک کا دور۔جس میں پھر موت اور فنا نہیں۔پہلے دور کا نام برزخ ہے اور دوسرے دور کا نام بعث بعد الموت یا حشر و نشر اور قیامت ہے اور ان کے معنی جی اٹھنے' اکٹھے کئے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں۔ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمے کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے۔جسے قرآن کریم میں الدار الآخرہ اور عقبی الدار وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔

قرآن و سنت میں آخرت کی جو تفصیلات آئی ہیں، ان پر اگر ہم غور کریں تو چند چیزیں ہمارے سامنے واضح ہوتی ہیں جن میں سب سے پہلی چیز موت کا تصور اور حقیقت ہے۔

Marfat.com

موت

اس احساس کو دلوں میں مستحضر کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ جو زندگی انسان گزار رہا ہے، یہ زندگی ہمیشہ قائم نہیں رہے گی۔ اگرچہ علم کی حد تک ہر آدمی جانتا ہے کہ موت سے بہر حال ہمکنار ہونا ہے۔ کیونکہ ہر آدمی کے سامنے جنازے اٹھتے ہیں، موت و حیات کا سلسلہ جاری وساری رہتا ہے۔

بایں ہمہ انسان کو اپنی موت کا خیال اور یقین بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ آدمی زندگی کی ہماہمی میں اس طرح مستغرق رہتا ہے کہ اسے بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ایک دن زندگی کے ان ہنگاموں کا خاتمہ بھی ہونے والا ہے۔ اس لئے آخرت کے تصور سے اسلام اپنے ماننے والوں میں یہ تصور راسخ کرنا چاہتا ہے کہ تم زندگی اور موت کے فاصلے کو زیادہ نہ جانو۔ زندگی کی حیثیت ایک حباب کی سی ہے جو ہوا کے ایک جھونکے سے کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لئے زندگی سے فائدہ ضرور اٹھاؤ، مگر آنے والے وقت کو ہر وقت یاد رکھو۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور ﷺ رفع حاجت کیلئے نکلے۔ میں پانی کا برتن لے کر ہمراہ ہو گیا۔ حضور ﷺ آبادی سے نکل کر کھجوروں کے جھنڈ میں داخل ہوئے۔ رفع حاجت سے فارغ ہو کر باہر نکلتے ہی زمین پر بیٹھ کر آپ نے تیمم فرمایا پھر مجھ سے پانی طلب کیا اور پانی استعمال فرمایا۔ میں نے بصد ادب عرض کی حضور ﷺ میں آپ سے بہت قریب تھا اور پانی میرے پاس آپ کے استعمال کیلئے حاضر تھا۔ پھر آپ نے تیمّم کیوں فرمایا؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ''عبداللہ! کیا مجھے اس بات کا یقین ہو سکتا تھا کہ میں پانی تک پہنچنے سے پہلے یا پانی مجھ تک پہنچنے سے پہلے اللہ کو پیارا نہ ہو جاؤں گا''۔ اس سے تصور یہ دینا مقصود تھا کہ موت کو ہر وقت اپنے قریب جانو۔ اس لئے آخرت کے تصور میں پہلا تو یہ تصور ہے جو دلوں میں اتارنا مقصود ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ موت اصلاً زندگی کی فنا کا نام نہیں بلکہ تمہیں جن ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے دنیا میں بھیجا گیا تھا اور تمہیں اس زندگی کی صورت میں ایک مہلت عمل دی گئی تھی۔ موت اصلاً اس کے خاتمے کا نام ہے۔

یعنی یہ اس طرح کی فنا نہیں ہے۔ جیسی فنا دوسری غیر مکلف مخلوقات پر طاری ہوتی ہے۔ جس طرح ایک حباب ٹوٹتا ہے' پھول مرجھا کے ٹہنی سے گر جاتا ہے' پتے خزاں میں جھڑنے لگتے ہیں یا کوئی حیوان اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر سفر حیات ختم کر دیتا ہے۔ کیونکہ ایک پھول کو چند روزہ بہار کیلئے پیدا کیا گیا تھا، سو وہ پوری ہو گئی۔ پتوں کو چند دنوں تک سایہ دینا تھا، وہ دے چکے۔ ہر حیوان کو اپنی جبلی ذمہ داریاں پورا کرنا تھیں، وہ کر چکا۔ اب اس کیلئے فنا کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر انسانی موت فنا نہیں بلکہ اپنی ذمہ داریوں سے واپسی سے عبارت ہے کہ اسے ایک خاص مقصد حیات اور ذمہ داریاں دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ اب اسے اس سے واپس بلایا جا رہا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس واپسی کو اللہ کی طرف روح کی بازگشت قرار دیا ہے۔ سورۃ جمعہ میں ارشاد فرمایا: قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (جمعه ۶۲.۸) ''کہہ دیجئے بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، اس سے ملنا ہی ہے۔ پھر تم اس خدا کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب کو جاننے والا ہے اور وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا'' ہم سورۃ البقرہ کی اس آیت کو اکثر اپنی زبانوں سے دہراتے رہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ''ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے''۔ اس میں بھی اسی حقیقت کا اعادہ کیا گیا ہے۔ سورہ مائدہ میں ارشاد فرمایا: اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا (المائده ۵.۴۸) ''تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے'' اور پھر یہ اللہ کی طرف لوٹنا ہر صورت میں ہو گا چاہے آدمی اس کی خواہش رکھتا ہو یا اس سے نفرت کرتا ہو۔ یہ ایک اٹل

Marfat.com

سنت اللہ ہے جس سے کبھی مفر نہیں۔سورۃ القیامہ کی ایک آیت میں اس کے بارے میں خوب نقشہ کھینچا گیا ہے۔ارشاد فرمایا: كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۙ وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨ الْمَسَاقُ ۞ (۷۵: ۲۹۔۳۰) ''ہرگز نہیں جب روح ہنسلی تک آ پہنچے اور لوگ کہیں اب کون ہے جھاڑ پھونک کر بچانے والا اور سمجھو کہ اب جدائی کا وقت آ گیا اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ گئی اس دن تمہیں پروردگار کی طرف ہانکا جانا ہے''۔

البتہ فرق یہ ہے کہ وہ بدنصیب جنہوں نے کفر اور شرک کی زندگی گزاری اور ان کو کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا کہ اللہ کی طرف لوٹ کر بھی جانا ہے ان کی واپسی تو اسی طرح ہوگی جیسے کسی جانور کو ہانک کر لے جایا جاتا ہے جس طرح سورۃ انعام میں ارشاد فرمایا: وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۞ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ (۶:۹۳۔۹۴) ''اور اگر تم دیکھو جس وقت گنہگار موت کی بے ہوشی میں ہونگے اور فرشتے ہاتھ کھولے کہہ رہے ہوں گے کہ نکالو اپنے جسموں کے اندر سے اپنی روحوں کو آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹی باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کو ماننے سے غرور کرتے تھے اور تم ایک ایک کر کے تنہا جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے ہو اور جو سامان و اسباب تم کو دیا تھا، جس نے تم کو مغرور بنایا تھا اس کو پیچھے چھوڑ آئے ہو'' (الانعام ۹۳،۹۴) لیکن جو سعید اور نیکوکار روحیں اپنے آنے والے انجام کو یاد رکھتی ہیں، بلکہ اللہ سے ملاقات کی متمنی رہتی ہیں انہیں آخری وقت یہ صدا سنائی دیتی ہے۔

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۞ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۞ ''اے مطمئن روح تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس واپس چلی جا'' (الفجر ۸۹: ۲۷۔۲۸)۔

برزخ

اسی طرح مومن اور کافر دونوں اپنی مہلت عمل کے خاتمے پر اپنے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں ایک ایسی جگہ رکھا جاتا ہے، جسے ہم برزخ کہتے ہیں اور اسی کو احادیث مبارکہ میں اور تمام سامی قوموں کے محاورے میں قبر کا نام دیا گیا ہے۔لیکن اس قبر سے مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں، بلکہ وہ دنیا ہے جس میں مرنے والوں کی روحوں کو قیامت تک رکھا جائے گا۔کوئی مرنے والا چاہے خاک میں دفن ہو یا قعر دریا میں ڈوب جائے یا کسی درند یا پرند کے پیٹ میں اس کے جسم کو جگہ ملے، یہی اس کی قبر ہے اور یہی وہ دنیا ہے جسے برزخ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور اسی برزخ یعنی قبر سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام مرنے والوں کو اٹھائے گا۔ارشاد خداوندی ہے: وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۞ (۲۲:۷) ''بے شک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا'' (الحج۔۷)۔ظاہر ہے کہ یہ اٹھایا جانا صرف انہی مردوں کیلئے مخصوص نہیں جو تودۂ خاک کے اندر دفن ہیں، بلکہ ہر میت کیلئے ہے۔خواہ وہ کیسی حالت اور کیسے عالم میں ہو۔اب سوال یہ ہے کہ اس برزخ کا مفہوم کیا ہے؟ برزخ کا لفظ قرآن کریم میں تین جگہ استعمال ہوا ہے۔(1) سورۃ الرحمٰن (2) سورۃ الفرقان (3) سورۃ المومنون میں۔ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان پردہ حاجب اور حائل مراد ہے مثلاً سورۃ الفرقان آیت ۵۳ میں فرمایا: وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (الفرقان: ۲۵۔۵۳) ''اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کر چلایا یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بھی بنائی ہے''۔

Marfat.com

تو اس برزخ سے مراد موجود زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو حائل اور رکاوٹ ہے، اسی کو برزخ کہا گیا ہے۔ یعنی جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اب دوبارہ وہ زندہ اس وقت ہوگا جب قیامت برپا ہوگی۔ ان دونوں زندگیوں کے درمیان ایک مدت حائل ہے، جو انسان پر ایک خاص قسم کی موت کا دور ہے۔ اس کا نام برزخ ہے۔ یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ قیامت کے آنے تک یہ برزخی دور باقی رہے گا۔ لیکن یہ زندگی کا دور نہیں بلکہ یہ موت کا زمانہ ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے دو مدتوں اور دو زندگیوں کا ہمیں تصور دیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد فرمایا كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (البقرہ: ۲۸.۲) ''کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم پہلے مردہ تھے تو پھر اس نے تم کو زندہ کیا۔ (یعنی انسان بنا کر پیدا کیا)' پھر تم کو مار دے گا' پھر تم کو زندہ کرے گا' پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے'' (البقرہ۔28)۔ پہلی موت تو ہر انسان کی پیدائش سے پہلے کا وقت ہے۔ جب وہ مادہ یا عنصر کی شکل میں تھا۔ پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا۔ یہ اس کی پہلی زندگی ہے۔ پھر موت آئی روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا۔ یہ اس کی دوسری موت ہے اور اسی کو برزخی زندگی کہا گیا ہے۔ پھر اللہ خود اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا۔ یہ اس کی دوسری زندگی ہے، جس کے بعد پھر کبھی اسے موت نہیں آئے گی۔ اب رہی یہ بات کہ یہ دور قیامت تک چلے گا اس کا ثبوت بھی ہمیں قرآن کریم سے ملتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○ (المومنون: ۲۳ ـ ۱۰۰) ''اور ان کے پیچھے برزخ ہے، اس دن تک جب وہ اٹھائے جائیں گے۔'' یعنی قیامت تک۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی تین منزلیں ہیں۔ دنیا' برزخ اور قیامت۔ ان تینوں میں جو فرق ہے اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ دنیا میں جسم یعنی مادہ نمایاں اور روح پوشیدہ ہے اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے، وہ صرف اس مادی جسم کے وجود سے پہنچتی ہے، ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست لذت و راحت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں۔ دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے۔ روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا۔ وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا۔ لیکن تیسرے عالم یعنی قیامت میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و راحت کے مظاہر بالکل الگ ہوں گے۔

عالمِ برزخ میں سوال و جواب کی کیفیت

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ برزخی دنیا زندگی کا دور نہیں، بلکہ موت کا دور ہے۔ لیکن ہمیں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس میں مرنے والے کو سوال و جواب کے ایک مختصر مرحلے سے بھی گزرنا ہوگا اور اسے کسی نہ کسی حد تک عذاب و ثواب سے واسطہ بھی پڑے گا (جسکی تفصیل ہم آگے ذکر کریں گے)۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ دور زندگی کا نہیں بلکہ موت کا دور ہے تو پھر اس میں سوال و جواب اور عذاب و ثواب کا تحقق کیسے ہوگا؟ اسے سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ موت کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے۔ اسی موت کے واسطے سے مرنے والا برزخ کی وادی میں داخل ہوتا ہے۔ اس لئے برزخی زندگی کی وہی حقیقت ہوگی، جو اس موت کی حقیقت ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک میں موت کو نیند سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سورۃ زمر میں ارشاد فرمایا گیا۔

Marfat.com

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۳۹.۴۲) ''وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں ان کو نیند میں ہی وفات دے دیتا ہے۔ تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدت معینہ کیلئے چھوڑ دیتا ہے۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں، اس آیت کریمہ میں موت کو نیند سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بلکہ دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھ کر ذکر فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح برزخی زندگی کو قرآن کریم نے نیند سے تعبیر فرمایا۔ یعنی قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پا کر قبروں سے اٹھیں گے تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰس. ۵۲) ''اے ہماری خرابی کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا''۔ (یٰس۔52)

مرقد ہم قبر کیلئے بولتے ہیں حالانکہ اس کا معنی سونے کی جگہ ہے۔ اب اس کو دیکھئے قبر کو بستر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس طرح قرآن کریم میں دوسری زندگی یعنی قیامت کیلئے اکثر بعث کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت اپنی حقیقت میں نیند کے قریب واقع ہوئی ہے۔ اب ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ ایک سونے والے کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اور نیند سے اس میں کس طرح کی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک واحساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کے ادراک واحساس کی تخلیٔ تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہوتی ہے۔ اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو وہی جسم دیکھتا ہے جو آتا جاتا ہے۔ اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں نیز اس میں درد ورنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں۔ اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ چیخ اٹھتا ہے۔ اور اگر اس میں لذت ملتی ہے تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں۔ غرض عالمِ خواب کی خیالی دنیا اور اس کی خوشی اور رنج اور لذت والم اور اس مادی دنیا کی جسمانی ومادی خوشی اور رنج اور لذت والم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت وتکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی تکلیف ولذت احساس وادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بیداری والی لذت وتکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے اس طرح خواب والی لذت وتکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

برزخی زندگی کو بھی انہی احوال وکیفیات کے آئینہ میں دیکھنا چاہئے۔ یہ ایک طویل اور گہری نیند ہے جو موت کی صورت میں انسان پر طاری کر دی جاتی ہے۔ اس میں جو کچھ واردات گزرتی ہیں ان کا تعلق براہ راست روح سے ہوتا ہے۔ البتہ اس میں یہ لمبی نیند سونے والا ایک جسم کو بھی دیکھتا ہے اس کے اعمال کی رعایت سے مناسب صورت میں اسے ملتا ہے۔ اس میں اگر اسے سوال وجواب سے گزارا جاتا ہے تو وہ خواب کی طرح اس سوال وجواب کے ماحول سے گزرتا ہے اور اگر اسے لذت وراحت سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ خواب ہی کی طرح اسے محسوس کرتا ہے اور محظوظ ہوتا ہے اور اگر اسے تکلیف وعذاب سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ خواب ہی کی طرح اس کی شدت کو محسوس کرتا ہے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ ثواب وعذاب کو محسوس کرنے کا ذریعہ کیا ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا اسے ثواب وعذاب کا احساس ہوتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں طرح کے احساسات وہ عالم بیداری میں بھی رکھتا ہے اور نیند میں بھی۔ جس طرح اپنی مرغوب چیز پا کر عالم بیداری میں مسرت وشادمانی محسوس کرتا ہے اور تکلیف دہ صورتحال سے دوچار ہو کر پریشانی اور کرب کا شکار ہوتا ہے بالکل یہی کیفیت

Marfat.com

اس کی نیند کی حالت میں بھی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیند کی حالت کے تغیرات نیند کھل جانے سے ختم ہو جاتے ہیں تو آدمی انہیں جلدی بھول جاتا ہے، اور بیداری کے تغیرات دیرپا ہوتے ہیں اس لئے انہیں دیر تک یاد رکھتا ہے۔ یہ برزخی زندگی چونکہ قیامت تک طویل ہوگی اس لئے اس میں پیش آمدہ تغیرات چاہے وہ خوشی کی شکل میں ہوں یا تکلیف کی شکل میں، دیرپا ہوں گے اور گہرے تاثرات چھوڑیں گے کیونکہ اب قیامت سے پہلے یہ صورتحال بدلنے والی نہیں اور یہ نیند کھلنے والی نہیں۔

قرآن وسنت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ہر مرنے والا ایک مختصر امتحان سے گزرے گا یعنی اس سے کچھ سوال وجواب کئے جائیں گے۔ احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مُردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔ یعنی وہ اس سے اس کے دین اور رب کے بارے میں بھی پوچھتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں بھی۔ اگر اس نے زندگی ایمان وعمل کے ساتھ گزاری ہوگی تو اسے صحیح جواب دینے کی توفیق ملے گی، ورنہ ہمیشہ کی نامرادی اس کا مقدر بن جائے گی اور قرآن کریم سے ہمیں ان باتوں کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور کچھ مزید باتوں کا بھی پتہ چلتا ہے تصدیق تو اس بات کی ہوتی ہے کہ ایمان واعمل کی زندگی گزارنے والے مرنے کے بعد فرشتوں کی دعاؤں اور ان کے تہنیتی کلمات سے مستفید اور شادکام ہونگے۔ اور وہ آنے والے وقت کی بشارت بھی دیں گے اور مزید جس بات کی قرآن پاک ہمیں خبر دیتا ہے ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ مرنے والوں میں وہ بدنصیب جنہوں نے ایمان لانے کی بجائے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ فرشتے صرف ان کی جان ہی نہیں نکالیں گے بلکہ ساتھ ساتھ ماریں پیٹیں گے بھی اور جان نکالتے ہی انہیں عذاب سے دوچار کر دیا جائے گا۔ سورۃ انفال میں ہے: وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ (الانفال: ۸۔۵۰) ''اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں ان کے منہ اور پیٹھ پر اور کہتے ہیں کہ چکھ جلنے کا مزا'' اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ کافروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے۔ مگر یہ منہ اور پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے منہ پر اور پیچھے پیٹھ پر مارتے ہیں اسی طرح کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چل عذاب کا مزا چکھ۔ اسی طرح سورۃ اعراف میں ہے: حَتّٰٓی اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ ؕ (الاعراف۷: ۳۷۔۳۸) ''یہاں تک کہ جب جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے کیلئے آئیں گے اور کہیں گے کہ کہاں ہیں، وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے۔ تو اس وقت وہ مشرک کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنے اوپر خود گواہی دی کہ وہ کافر تھے تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو جو جن وانس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔ اور جو لوگ ناموافق حالات کا بہانہ بنا کر اللہ کے دین پر چلنے سے کتراتے ہیں ان کے بارے میں سورۃ النساء میں فرمایا۔ بے شک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔ فرشتے ان سے کہیں گے کہ تم کس حالت میں تھے۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم ملک میں بے یار ومددگار تھے۔ فرشتے کہیں گے کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

Marfat.com

عالمِ برزخ میں ارواح کا مقام

برزخ کے حوالے سے اب ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ برزخ میں ارواح انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیات میں ملتا ہے۔ کافروں کے بارے میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روحوں کو کائنات کی وسعتوں میں اس طرح آوارہ پھرنے کیلئے چھوڑ دیا جائے گا کہ جیسے بے خانماں اور محروم لوگ پھرا کرتے ہیں۔ لیکن وہ جہاں بھی ہوں گے وہاں سے ہروقت دوزخ کے نظارے کریں گے اور ہروقت اللہ کے عذاب کا نقشہ ان کی نگاہوں کے سامنے رہے گا اور ایک عجیب عذاب کی کیفیت ان پر طاری رہے گی۔ لیکن جہاں تک پاکباز مومنوں کا تعلق ہے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً تو ان کی موت ہی اس طرح واقع ہوگی کہ ایک طرف جان ان کے جسم سے نکالی جارہی ہوگی اور دوسری طرف رحمت الٰہی کا فرشتہ مژدۂ جانفزا ان کے کانوں میں انڈیل رہا ہوگا۔ پھر ان میں بھی ایسی پاکباز اور سعید روحیں ہیں جنہیں شہداء کہا جاتا ہے۔ انہیں خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و عشرت کی لازوال دولت عنایت کی جائے گی۔ وہ اللہ کے یہاں خاص قسم کا رزق بھی پائیں گے اور خوشی و مسرت ہردم ان کے ساتھ ہوگی اور اس مضمون کی متعدد آیات قرآن کریم میں موجود ہیں۔

احوالِ قیامت اور اس کے وقوع کے دلائل

افراد اور جماعتوں کو تو ہم ہرروز اپنی آنکھوں کے سامنے اخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ہمیں کسی حد تک یقین ہوجاتا ہے کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اس سے بھی بڑی ایک حقیقت اور بھی ہے جسے ہم قیامت کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم ہے تمام دنیا اور تمام کائنات کا چشم زدن میں ختم ہوجانا اور پھر ایک مدت معینہ کے بعد از سر نو زندہ ہونا اور پھر اللہ کے حضور حساب کتاب کیلئے پیش ہونا اور حسب اعمال جزا و سزا کے مراحل سے گزرنا۔ موت تو کبھی اچانک آتی ہے اور کبھی دھیرے دھیرے بیماری کی شکل میں اپنا احساس دلا کے آتی ہے۔ اس لئے مرنے والا بالعموم پہلے سے اس سے کسی حد تک آگاہ ہوتا ہے اور پسماندگان بھی ذہنی طور پر اس صدمے کیلئے تیار ہوتے ہیں لیکن جہاں تک قیامت کے وقوع کا تعلق ہے وہ تو اس طرح کا حادثہ ہوگا کہ جس کو قرآن کریم کہتا ہے: وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْهُوَاَقْرَبُ ؕ (النحل: ۷۷) ''اور وہ قیامت کا معاملہ آنکھ جھپکنے کی طرح ہوگا یا اس سے بھی جلدی۔'' قیامت کا آغاز صور اسرافیل سے ہوگا اور یہ اس قدر اچانک ہوگا کہ خود حضرت اسرافیل کو علم نہیں کہ کب مجھے اس کے پھونکنے کا حکم دیا جائے گا۔ وہ تعمیل حکم کیلئے ہردم مستعد کھڑے ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں مزے کی زندگی کیسے گزاروں؟ حالانکہ صور والے فرشتے نے صور منہ میں لے رکھا ہے اور اللہ کے حکم کی طرف کان لگا رکھا ہے اور پیشانی جھکا رکھی ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کب صور پھونکنے کا حکم ہوجائے اور میں فوراً صور پھونک دوں''۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی تھی تو آنحضرت ﷺ فرماتے ''اے لوگو! اللہ کو یاد کرو! اللہ کو یاد کرو۔ پہلا صور پھونکا جانے والا ہے اور اس کے بعد دوسرا پھونکا جائے گا۔ موت اپنی سختیاں لے کر آ پہنچی ہے''۔

Marfat.com

قرآن کریم میں دو دفعہ صور پھونکے جانے کا ذکر ہے۔ سورۃ زمر آیت ۶۸ تا ۶۹ میں ارشاد خداوندی ہے: وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَاهُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ○ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۳۹: ۶۸۔ ۶۹) ''صور دو دفعہ پھونکا جائے گا۔ پہلی بار ارض وسما کی تمام مخلوق بے ہوش ہو جائے گی سوائے ان کے جنہیں خدا خود بچائے۔ دوسری مرتبہ تمام لوگ اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں گے۔ اس وقت اللہ کے نور سے زمین جگمگا اٹھے گی' نامہ اعمال کھل جائے گا' انبیا اور شہداء کو حاضر کیا جائے گا' انہیں ان کی خدمات کا پورا پورا اجر ملے گا اور کسی سے ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

ان آیات سے صور اسرافیل کی کیفیات اور اس کا دو دفعہ پھونکا جانا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سید قطب شہیدؒ نے سورۃ یٰسٓ کی آیت نمبر ۴۸ تا ۵۳ سے تین دفعہ صور اسرافیل کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دین حق کی تکذیب کرنے والے پوچھتے ہیں کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (یٰسٓ: ۳۶: ۴۸) ''اگر تم سچے ہو تو یہ وعدے کا دن کب آئے گا؟'' ان کا جواب آنکھ جھپکنے میں تیزی سے گزر جانے والا یہ منظر ہے' یہ لو۔ یہ صور پھونکنے کی ایک آواز ہی تو ہے کہ دفعتہً وہ انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ نہ تو اپنے اہل وعیال کو وصیت ہی کر پاتے ہیں اور نہ ان میں واپس لوٹ کر آ سکتے ہیں۔ بلکہ ان کے سامنے ان کے ہاتھوں میں موت کا پیالہ پی لیتے ہیں۔ صور کی پہلی آواز کے بعد قیامت کا پہلا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ پھر دوسری بار صور کی آواز گونجتی ہے۔ دفعتہً وہ اپنی قبروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خوف ودہشت کے عالم میں تیزی سے قدم بڑھاتے ایک دوسرے سے پوچھتے چلے ہیں کہ ہمیں ہماری قبروں سے کس نے نکال باہر کیا۔ پھر آنکھیں ملتے ہوئے فضائے بسیط میں گونجنے والی اس حقیقت کا اعتراف اور اس کی توثیق کرتے ہیں هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ''ہاں! یہ وہ دن ہے جس کا وعدہ رحمٰن نے کیا تھا اور جس کی تصدیق اس کے رسولوں نے کی تھی''۔ آج قبروں سے نکل کر کھڑے ہونے کا سبب یہی ہے۔ پھر تیسری بار صور کی آواز گونجتی ہے۔

فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (یٰسٓ: ۳۶: ۵۳) ''ابھی فوراً وہ سب ہمارے حضور میں حاضر ہونے والے ہیں''۔ لو دیکھو آنکھ جھپکنے میں پیشی کا بندوبست ہو گیا۔ لوگوں کی قطاریں لگ گئیں۔ سب کے سب مہر بلب شہنشاہ عالم کا اعلان عام کان لگا کر سن رہے ہیں کہ آج کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔ دنیا میں جو اعمال کرتے رہے تھے' آج اس کی جزا دی جائے گی۔ یہاں کسی ناانصافی کا کوئی سوال نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے صور اسرافیل سے تمام کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ہر مخلوق موت کا شکار ہو جائے گی سوائے اس کے جس کو اللہ بچانا چاہے اور دوسری دفعہ صور اسرافیل کے بعد از سر نو زندگی وجود میں آئے گی۔ لوگ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھیں گے اور حیرانی وپریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھیں گے۔ پھر جب تیسرا صور پھونکا جائے گا تو تمام بارگاہ ایزدی میں حاضری کیلئے چل پڑیں گے اور اللہ کی عدالت قائم ہو جائے گی اور زندگی کے اعمال کا حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے تغیرات اور مختلف مراحل میں پیش آنے والی کیفیات کا قرآن کریم میں متعدد جگہ ذکر فرمایا گیا۔

نفخہ اولیٰ کے بعد کی کیفیت

سورۃ الحاقہ میں نفخہ اولیٰ کے بعد کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ؕ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (الحاقہ ۶۹: ۱۳۔ ۱۸)

Marfat.com

''جس وقت صور پھونکا جائے گا اور اللہ زمین کو پہاڑوں سمیت اٹھا کر یوں پٹخے گا کہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اس روز آسمان پھٹ کر ڈھیلا ہو جائے گا۔ فرشتے اطراف آسمان پر جمع ہو جائیں گے۔ اور اللہ کے تخت کو آٹھ فرشتے اٹھا کر لائیں گے اس وقت تم اللہ کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تم سے کوئی راز مخفی نہیں رہے گا۔

سورۃ القارعہ میں اس کی نقشہ کشی یوں کی گئی ہے کہ ''وہ متنبہ کرنے والی چیز' وہ کیا ہے متنبہ کرنے والی چیز؟ اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا ہے متنبہ کرنے والی؟ یہ وہ چیز ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔''

سورۃ ابراہیم میں فرمایا ''جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور لوگ نکلیں گے اللہ کی طرف' جو ایک ہے، قہار ہے۔'' (۱۴:۴۸)

سورۃ المعارج میں فرمایا ''جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔'' (۷۰:۸۔۹)

سورۃ قیامہ میں فرمایا گیا۔ ''روزِ قیامت کی قسم اور گناہ پر ملامت کرنے والے نفس کی قسم (یوم الحساب آ کر رہے گا)' کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ ترتیب نہ دے سکیں گے؟ کیا وہ جانتا نہیں کہ اس کے پوروں کو ترتیب دینے والے ہم ہی ہیں۔ انسان کی تمنا یہ ہے کہ وہ کچھ کرے اور اپنا مستقبل تباہ کر دے۔ اس لئے (طنزاً) پوچھتا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ اسے کہو اس دن جب آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ چاند سیاہ ہو جائے گا اور شمس وقمر اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت انسان پوچھے گا ہے کوئی راہ فرار؟ ہرگز نہیں آج کوئی جائے پناہ نہیں۔ سب اللہ کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور انہیں اگلے پچھلے اعمال کی خبر دی جائے گی۔'' (۷۵:۱۔۱۳)

سورۃ تکویر میں فرمایا ''جب آفتاب بے نور ہو جائے گا۔ ''جب ستارے تاریک ہو جائیں گے' جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔'' (۸۱:۱۔۳)

سورۃ انفطار میں فرمایا گیا ''جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کئے جائیں گے' اس وقت روح نے جو کچھ پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس کو جان لے گی۔'' (۸۲:۱۔۵)

سورۃ انشقاق میں فرمایا: ''جب آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے اور وہ فرمانبرداری کے ہی لائق ہے جب زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔'' (۸۴:۱۔۴)

سورۃ زلزال میں فرمایا گیا جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور وہ اپنا بوجھ نکال دے گی اور انسان کہے گا زمین کو کیا ہو گیا ہے؟ اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔'' (۹۹:۱۔۴)

مندرجہ بالا تفصیلات سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ نفخ اولی کے بعد کس طرح کائنات کی ہر چیز شکست وریخت کا شکار ہوگی اور کس طرح ایک ہمہ گیر تباہی جملہ مخلوقات اور ہر ذی روح کو اپنی گرفت میں لے لے گی اور یہ سب کس قدر اچانک چشم زدن میں ہوگا۔ ہر دور کی طرح آج بھی عقل کے پرستار اس تمام صورتحال کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور وہ اسے ناقابل وقوع اور خلافِ عقل گردانتے ہیں۔ حالانکہ یہ صرف ان کی عقل کا پھیر اور عدم علم کا نتیجہ ہے۔ ہم یہاں نفخ اولیٰ کے بعد کی مکمل تباہی پر چند شواہد اور بعض پیش پا افتادہ دلائل ذکر کرتے ہیں۔

Marfat.com

مثلاً قرآن کریم نے قیامت کے پہلے مرحلے کو ایک زمینی زلزلے سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ○ ''اے لوگو! اللہ سے ڈرو کہ قیامت کا زلزلہ نہایت ہولناک شے ہے''۔ وہ زلزلہ جسے خود پروردگار ہولناک فرمارہا ہے اس کی تباہ کاری اور ہمہ گیری کا انسان کیا اندازہ کرسکتا ہے؟ ہم یہاں چھوٹے موٹے زلزلوں کو وقوع پذیر ہوتے دیکھتے ہیں اور ان کی تباہ کاریوں سے چیخ اٹھتے ہیں۔ 1924ء کے زلزلہ جاپان میں 16 لاکھ نفوس ہلاک ہو گئے تھے اور 1935ء کے زلزلہ کوئٹہ میں 51000 اور ہماری قریبی تاریخ میں ایسے ہی کئی ہولناک زلزلے آ چکے ہیں۔ ہر زلزلہ ایک قیامت ہوتی ہے اس سے بلندیاں پست اور پستیاں بلند ہو جاتی ہیں۔ دریاؤں کے رخ مڑ جاتے ہیں' کئی جزیرے ڈوب جاتے ہیں اور کئی نئے نکل آتے ہیں۔ بعض زلزلوں سے پہاڑ پھٹ جاتے ہیں اور ان سے ابلتے ہوئے لاوے کا ایک دریا بہہ نکلتا ہے اور انسان ان حادثات کے مقابلے میں اس قدر بے بس ہے کہ وہ آج تک انہیں روکنے کی کوئی سبیل نہیں سوچ سکا اور اسے یقین ہے کہ زمین کا مالک زمین کو تباہ کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ علماء زمین شناس کا نظریہ' یہ ہے کہ آج سے لاکھوں سال پہلے جب زمین سورج سے الگ ہوئی تھی تو اس کا درجۂ حرارت، حرارتِ سورج کے برابر تھا۔ یہ حرارت آج بھی بطنِ زمین میں موجود ہے اور لاوے کا درجۂ حرارت وہی ہے جو آغاز میں زمین کا تھا۔ یعنی بارہ ہزار فارن ہائیٹ۔ اب اگر کسی زلزلے سے سارا لاوا باہر آ جائے تو سطح زمین ایک کھولتے ہوئے جہنم میں بدل جائے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ زمین کی تباہی کیلئے اس کو پیدا کرنے والے نے کس قدر امکانات پیدا کر رکھے ہیں اور جہاں تک فضا' خلا اور آسمانوں کا تعلق ہے اس کی تباہی کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آنے والی ہو۔ خلاء میں کروڑوں بلین ستارے حیرت انگیز رفتار سے محوِ پرواز ہیں۔ ان میں سے بعض زمین سے دس گنا اور بعض ایک کروڑ گنا بڑے ہیں۔ ان کا نظامِ پرواز اتنا مکمل ہے کہ آج تک کوئی ستارہ دوسرے سے متصادم نہیں ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ طاقت جس نے ان ستاروں کو بنایا اور پھر ان کی راہیں متعین کیں اس بات پر قادر نہیں کہ انہیں باہم ٹکرا دے اور سب کچھ تباہ کر دے؟ سائنس دان کہتے ہیں کہ نظامِ عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ گرم آفتاب ہے۔ جس کی گرمی روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ اب سائنس دانوں نے اندازہ لگانا شروع کر دیا ہے کہ اس بات کا امکان ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور یہ بات بھی سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ پورا نظام کائنات کشش ثقل کے ستون پر قائم ہے اور یہ کشش ثقل بھی روز بروز مدہم پڑتی جارہی ہے۔ چنانچہ ایک دن آئے گا کہ تمام کرّے ایک دوسرے کے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

یہ تو وہ حقائق ہیں جن کی بنیاد بہرحال مستقبل کے اندازوں پر ہے۔ لیکن یہ بات تو امر واقعہ ہے کہ خود انسان کیسے کیسے تباہ کن آلات پیدا کر چکا ہے کہ ان کی تباہی خود انسان کے ہاتھوں کوئی دور نظر نہیں آتی۔ انہی ایجادات میں جوہری بم کی ایجاد بھی شامل ہے۔ لارڈ برٹرینڈ رسل نے اسی کے اندر دنیا کی مکمل تباہی دیکھ لی تھی۔ انہوں نے 1848ء کے موسم سرما میں بی بی سی ریڈیو سے تقریر نشر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر جوہری بم زیادہ تعداد میں پھینکے گئے (اور زمین پر جنگوں کا سلسلہ جاری رہا تو ظاہر ہے کہ پھینکے جائیں گے) تو بعض ماہرین طبیعات کا خیال یہ ہے (اور ان کی رائے واجب احترام ہے) کہ یہ بم تابکار پیدا کریں گے۔ جو ہوا سے گھل مل کر اڑتے اور ادھر سے ادھر گزرتے ہوئے زندگی کی ہر صورت کو ختم کر دیں گے اور چند سال بعد ہماری زمین انسانوں' جانوروں اور پودوں سے بالکل خالی ہو جائے گی۔ انہی برٹرینڈ رسل نے (مذہب اور سائنس) میں ایک قدم آگے بڑھایا اور لکھا کہ وہ قوانین جو ترقی کا باعث ہوتے ہیں تنزل کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ ایک دن سورج سرد پڑ جائے گا۔ زمین پر حیوانی اور نباتاتی زندگی کی پوری تاریخ کچھ بہت گرم اور بہت سرد زمانوں کے بیچ کا واقعہ ہے۔ مسلسل ارتقاء کوئی کلیہ نہیں بلکہ تنزل اور ترقی کا پنڈولم ادھر ادھر حرکت کر رہا ہے۔ جس میں بلاشبہ کائناتی قوتوں کے انتشار کی وجہ سے نیچے کی طرف ایک خفیف سا رجحان پایا جاتا ہے۔

Marfat.com

نفخه ثانیه کے بعد کی کیفیت اور اس کے دلائل

دوسری مرتبہ صور اسرافیل پھونکے جانے کے بعد زندگی وجود میں آئے گی۔ لوگ اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے اور اللہ کے اذن اور حکم سے میدان حشر کی طرف چل پڑیں گے۔ وہاں ان کے ہاتھوں میں ان کا نامہ اعمال دیا جائے گا۔ عقل کے پرستاروں کو جس طرح کائنات پر ایک ہمہ گیر موت کے طاری ہونے پر اعتراض ہے اسی طرح اس کے دوبارہ زندہ ہونے پر اور پھر نامۂ اعمال میزان اور حساب کتاب پر بھی اعتراض ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ان اعتراضات کی وجہ یہ نہیں ہے کہ علمی طور پر ان کے غلط ہونے کی کوئی دلیل ان کے ہاتھ آ گئی ہے۔ بلکہ اس انکار کی وجہ سراسر بے علمی اور جہالت ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ (یونس: ۱۰۔ ۳۹) ''انہوں نے صرف اس لئے اس حقیقت کو جھٹلایا کہ ان کا علم اس کا احاطہ نہ کر سکا۔ اگر کسی چیز کا علم نہ ہونا اس چیز کے وجود پر انکار کی دلیل ہو سکتا ہے تو پھر اس انکار کی بھی کوئی علمی توجیہ ممکن ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو قرآن کریم کہتا ہے کہ اس وقت کا انتظار کرنا چاہئے، جب تمہاری آنکھوں سے حجابات اٹھا لئے جائیں گے اور ہر حقیقت تمہارے سامنے جلوہ گر ہو جائے گی اور کوئی راز، راز نہ رہے گا۔ سورۃ الکہف میں فرمایا: وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ○ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ ○ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ○ (الکہف ۱۸: ۲۰۔ ۲۲) ''وہ صور پھونک دیا گیا' وہ وعدے کا دن طلوع ہو گیا۔ ہر فرد محشر میں اس حال میں آئے گا کہ اس کے ہمراہ ہانکنے والا ہو گا اور ایک گواہ بھی۔ تم اس صورتحال سے بے خبر تھے سو آج ہم نے تمام حجابات اٹھا دیئے اور اب تمہاری نگاہ بہت تیز ہو گئی''۔ نگاہ کی اس تیزی کا انتظار کرنا چاہئے۔ تاہم اگر غیر جانبداری سے غور کیا جائے اور علمی حدود کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو آج بھی بے شمار شواہد ایسے ہیں جو قیامت کے ایک ایک مرحلہ کی دلیل ہیں۔ ہم نہایت اختصار سے چند دلائل ذکر کرتے ہیں۔

1- مثلاً جو لوگ اللہ کی ذات اور اسکی صفات کے قائل ہیں وہ اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ اللہ کی ایک صفت ہر چیز پر قادر ہونا ہے۔ یعنی وہ قدرت کاملہ کا مالک ہے۔ اب جو آدمی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا یقین رکھتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ اسی نے اس کائنات کو اور اس کی ایک ایک مخلوق کو پیدا فرمایا ہے تو اس کیلئے اس بات کو ماننے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہئے کہ جو اس کائنات کا خالق ہے آخر وہ اس کو ہلاک کرنے اور پھر زندہ کرنے پر قادر کیوں نہیں؟

سورۃ نازعات آیت ۲۷ تا ۳۳ میں فرمایا: ''کیا تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے آسمان کو پیدا کیا اور اس نے چھت کو بلند کرنے کے بعد اس کو استحکام بخشا۔ رات کو تاریک اور دن کو روشن بنایا۔ اس کے بعد زمین کو بچھایا' ان میں سے پانی نکالا' چارہ پیدا کیا اور پہاڑوں کو اس پر کھڑا کر دیا۔ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کیلئے متاع ہے۔ یعنی جو خالق و مالک ان تمام باتوں پر قدرت رکھتا ہے آخر وہ تمہاری ہمہ گیر موت اور دوبارہ زندگی پر قدرت کیوں نہیں رکھتا؟

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا: وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷: ۴۹) ''اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو پھر کیسے از سر نو زندہ کئے جائیں گے۔ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا وہ ان جیسے لوگوں کو دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔

Marfat.com

سورۃ روم میں فرمایا کہ خدا وہی ہے جو خلق کو آغاز کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا اور یہ دوبارہ خلق کرنا اس کیلئے آسان ہے۔(روم ۳۰:۲۷)

سورۃ یٰسٓ میں فرمایا: قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۝ (یٰسٓ ۳۶:۷۸۔۷۹)

(وہ بولے کون ان کھوکھلی وسڑی ہڈیوں کو زندہ کرے گا، آپ کہہ دیجئے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا)

سورۃ قیامہ میں ارشاد فرمایا: ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامه بلى قادرين على ان نسوى بنانه (۷۵:۳۔۴)

"کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو پھر جمع نہ کر سکیں گے۔ ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ چھوٹی ہڈیوں، ریشوں اور رگوں سے اس کی انگلیوں کے پورے بنا ڈالیں"۔ یعنی جس پروردگار نے چھوٹی ہڈیوں، ریشوں اور رگوں سے ایسے پوروں کو ترتیب دیا ہے کہ جو آج بھی دستاویزی ثبوت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اربوں کھربوں انسانوں کی تخلیق کے باوجود کسی ایک انسان کے انگوٹھے کا نشان دوسرے انسان سے نہیں ملتا۔ جو خالق کائنات اس بات پر قادر ہے کیا وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے؟

2- پروردگار کی صفات کو ماننے والے اس کی صفت عدل کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ عدل کا ایک معنی ہے تلافی مافات۔ یعنی نقصان کو پورا کرنا۔ اس عدل کے بے شمار مناظر ہمارے سامنے ہیں۔ جب ہم کسی درخت کی شاخوں کو کاٹ دیتے ہیں تو نئی شاخیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ جب ہم کسی جنگل کا کوئی قطعہ درختوں سے صاف کر دیتے ہیں تو وہاں نئے پودے اور بوٹیاں اگ آتی ہیں۔ جب تلوار وغیرہ سے کسی حصۂ جسم کا گوشت کٹ جاتا ہے تو قدرت نیا گوشت دے دیتی ہے۔ ہم کنویں سے کتنا ہی پانی نکالیں زمین کی رگوں سے اتنا ہی پانی اس میں آ جاتا ہے۔ یہ حقیقت عدل جو حیات کی ہر سطح میں پائی جاتی ہے اور جس پر ارض وسما کا نظام قائم ہے۔ اس عدل کا تقاضا ہے کہ جب ہم سے یہ دنیا چھن جائے تو ہمیں ایک اور ایسی دنیا ملنی چاہئے جہاں اس زندگی کی تمام ناانصافیوں کی تلافی ہو۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں جو لوگ انسانیت کے سب سے بڑے محسن رہے ہیں ان میں انبیا بھی ہیں اور مصلحین امت بھی۔ وہ سب سے زیادہ ستائے گئے۔ انہوں نے انسان کو راہ راست دکھانے اور پنجۂ استبداد سے چھڑانے کیلئے بے اندازہ مصائب اٹھائے۔ لیکن اس کے بدلے میں جن پر انہوں نے احسان کیا ان کی طرف سے انہیں کیا ملا؟ کوئی سپردِ دار ہوا اور کوئی سپردِ نار۔ کسی کو قتل کیا گیا تو کسی کو زندہ دیوار میں چن دیا گیا۔ انہیں اس زندگی میں سوائے مصیبتوں اور تکلیفوں کے کچھ نہیں ملا۔ بقول شاعر

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درس صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ جنہوں نے انسانیت کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی وہ دنیا میں ظلم واستبداد کی علامت بن کر رہے اور جنہوں نے خالق کائنات کے مقابلے میں اپنی ربوبیت کا صور پھونکا۔ وہ ہمیشہ عیش وعشرت کی زندگی گزارتے اور زندگی کی نعمتوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب چنگیز کے پوتے ہلاکو خان نے 1258ء میں بغداد پر حملہ کیا تھا تو وہاں سات دن میں 19 لاکھ شہری موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ہلاکو اور اسی نوع کے دیگر قذاقوں اور قاتلوں کو ان جرائم کی سزا کیا ملی؟ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بیوہ کا اکلوتا بیٹا جو اس کے بڑھاپے کا سہارا تھا کسی قاتل کی گولی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ باقی زندگی پولیس کے چکر کاٹتی،

Marfat.com

دربدر ٹھوکریں کھاتی اور شب و روز آنسو بہاتی گزار دیتی ہے۔ اولاً تو اسکے قاتل پکڑے نہیں جاتے اور پکڑے بھی جائیں تو انہیں سزا نہیں ملتی۔ وہ رات دن یہ کہہ کہہ کر تخت الٰہی کو ہلاتی رہتی ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مظلوم کے اوقات

اور پھر کتنے لوگ ایسے ہیں جو تخت اقتدار پر بیٹھ کر لاکھوں آدمیوں کی محرومیوں کا باعث بنتے ہیں یا ان کے قتل کا سبب ٹھہرتے ہیں اور کتنے ایسے تخریب کار ہیں جو گاڑی کی پٹڑی اکھاڑ کر یا بم پھینک کر سینکڑوں اور ہزاروں آدمیوں کو لقمہء اجل بنا دیتے ہیں۔ اولاً تو ان کو سزا نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو ان کی ایک جان سینکڑوں اور ہزاروں جانوں کا عوض تو نہیں بن سکتی۔ ایک جان تو ایک جان کا بدلہ ہو سکتی ہے، باقیوں کا بدلہ کون دے گا؟ اگر اللہ عادل ہے اور عدل اس کی صفت ہے تو اسی صفت عدل کا تقاضا ہے کہ ایسی دنیا ہونی چاہئے اور ایک ایسی عدالت قائم ہونی چاہئے جہاں انسانیت کے محسنوں اور قاتلوں کو اپنے اپنے کئے کا بدلہ ملے۔ محسن لافانی مسرتوں سے ہمکنار ہوں اور مجرم قہر و عذاب کا شکار ہوں۔

3- امریکہ کے مشہور فلسفی ولیم جیمز آغاز میں آخرت کے منکر تھے۔ لیکن بڑھاپے میں معتقد ہو گئے۔ دلیل یہ دی کہ انسان بڑھاپے میں علم و دانش کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے اور ایک نیا شعور حاصل کر لیتا ہے۔ اللہ ان باکمال لوگوں پر زندگی کا دروازہ بند نہیں کرے گا۔ ایسی اقالیم ہونی چاہئیں جہاں یہ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لا کر نئی بلندیوں کو سر کر سکیں۔ یہ بلندیاں اس خفیہ براعظم میں ہیں جو ہمارے حاشیۂ خیال سے پرے واقع ہے۔ انسان میں بقا کی آرزو فطری ہے۔ اس مقصد کیلئے کوئی کتابیں لکھتا ہے' کوئی عمارات اور تصاویر بناتا ہے کوئی عبادت کرتا ہے اور کوئی گیت تراشتا ہے۔ کائنات میں بے اندازہ معقولیت ہے۔ اسلئے یہ سمجھنا کہ موت کی ایک پھونک سے شمع حیات گل ہو جائے گی یا انسان چند جملے بول کر ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جائے گا۔ بہت نامعقول سی بات ہے۔

4- ہم ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں کہ موسم گرما یا موسم سرما میں اگر بارش برسنے میں دیر ہو جائے تو ایسے لگتا ہے کہ ہر چیز اپنی موت آپ مر گئی۔ زمین سبزے سے محروم ہو جاتی ہے جو ہڑوں میں پلنے والی مخلوق یعنی مینڈک وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں۔ زمین پر اٹھتی ہوئی دھول اس وقت موت کی غماز بن جاتی ہے۔ پھر اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ گھٹا اٹھتی ہے برستی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین سبز مخمل کی وردی پہن لیتی ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ زندگی از سر نو وجود میں آئی ہے اور مردہ زمین زندہ ہو گئی ہے۔ تو جو پروردگار مردہ زمین کو بارش کے چند چھینٹوں سے نئی زندگی عطا فرما سکتا ہے وہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا؟ یہی بات سورۃ فاطر آیت نمبر ۹ میں فرمائی گئی: وَاللّٰہُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰہُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا ؕ کَذٰلِکَ النُّشُوْرُ ○ (۹.۳۵) ''اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیج کر پہلے بادل بناتا ہے اور پھر ہانک کر کسی مردہ بستی کی طرف لے جاتا ہے پھر ہم مردہ زمین کو اس سے زندہ کرتے ہیں اور قیامت کے دن مردے بھی اسی طرح زندہ ہوں گے۔

5- کائنات کی سب سے بڑی حقیقت تغیر اور اختلاف حالات ہے۔ کوئی چیز یہاں ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ مسلسل ارتقاء یا مسلسل تنزل یہاں کی حقیقت نہیں۔ عروج اور زوال دو ایسی حقیقتیں ہیں جن کی افراد اور قوموں میں ہمیشہ رونمائی ہوتی رہتی ہے۔ موسم بدلتے ہیں، صبح و شام میں تبدیلی آتی ہے۔ یہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں قرار کسی چیز کو نہیں، بلکہ ثبات اور قرار اگر کسی کو ہے تو بقول شاعر:

ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں

Marfat.com

یہ تغیر اور عدم ثبات دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ ثابت اور قائم رہنے والی ذات صرف ایک ہے، جس کی صفت الحی اور القیوم ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اسی کی ذات کو دوام اور ثبات ہے۔ باقی ہر چیز اس کی ذات اور اس کے قانون کی گرفت میں ہے اس کا قانون یہ ہے کہ وہ ہر دم چیزوں کو افراد کو اور قوموں کو تغیر کا شکار کرتا رہتا ہے۔

اگر یہ واقعی ایک حقیقت ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کائنات کی یہ زندگی ہمیشہ کیلئے رہے اور پھر جب اس زندگی پر موت کا پردہ چھا جائے تو یہ پردہ کبھی تار تار نہ ہو، یعنی یہاں نہ تو زندگی کو ثبات ہے اور نہ موت کو ثبات ہوگا۔ جس طرح یہاں ہر صبح شام میں ڈھل جاتی ہے اسی طرح کوئی شام بھی دوام کا مقدر لے کر نہیں آئی بلکہ اللہ کے قانون کے مطابق ضرور صبح طلوع ہوتی ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب اس صبح حیات پر موت کی رات طاری کردی جائے گی تو پھر ایک ایسا وقت آئے گا جب پھر اس کی صبح طلوع ہوگی۔ کیونکہ اس زندہ اور قائم رہنے والی ذات کی اصل صفت زندگی ہے اور چونکہ روح اس کا امر ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس روح کو ہمیشہ کی زندگی نصیب نہ ہو اور یہ زندگی چونکہ قیامت کے بعد ہوگی اس لئے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ قیامت بھی ضرور برپا ہو۔ یہی بات اقبال کہتے ہیں ۔

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

6- اگر مزید غور کیا جائے تو خود انسان کا جسم اس بات کی دلیل ہے کہ قیامت ایک حقیقت ہے۔ کیونکہ قیامت صغریٰ یعنی موت و حیات کی کشمکش اور حشر ونشر خود انسان کے جسم کے اندر برپا رہتا ہے۔ میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ انسانی جسم کے ترکیبی اجزاء کو خلیہ (سیل) کہتے ہیں۔ ایک اوسط درجے کا جسم اندازاً 26 ارب ملین خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ورزش' محنت اور مطالعہ سے یہ خلیے ٹوٹتے اور ان کی جگہ نئے خلیے بنتے رہتے ہیں۔ ماہرین ابدان کا اندازہ یہ ہے کہ ہر سات سال کے بعد جسم کی مکمل تجدید ہو جاتی ہے۔ پرانے خلیے مر جاتے ہیں اور ان کی جگہ اور نئے خلیے لے لیتے ہیں۔ جو شخص یہاں عمر کے ستر سال گزارتا ہے وہ گویا دس مرتبہ مر چکا ہوتا ہے۔ لیکن موت کے ان مسلسل حملوں کے باوجود وہ زندہ رہتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ موت کے آخری حملے کے بعد بھی وہ زندہ رہے۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

7- قرآن کریم نے بعض ایسی تاریخی شہادتیں بیان فرمائی ہیں جو ''بعث بعد الموت'' یعنی دوبارہ جی اٹھنے پر مضبوط دلائل فراہم کرتی ہیں اور پھر یہ واقعات ایسے ہیں کہ تمام آسمانی مذاہب اس کی تصدیق بھی کرتے ہیں۔ حضرت عزیر علیہ السلام جو بنی اسرائیل کے ایک جلیل القدر نبی گزرے ہیں بلکہ بنی اسرائیل کی تباہی اور تورات کے جلائے جانے کے بعد انہوں نے تجدید و احیائے دین کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔ ان کے بارے میں قرآن کریم سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۵۸ میں بتاتا ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو مکمل تباہ ہو چکی تھی۔ انہوں نے اسے دیکھ کر (شاید دل میں) کہا یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے، اسے اللہ تعالیٰ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟ اس پر اللہ نے ان کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑے رہے پھر اللہ نے انہیں دوبارہ زندگی بخشی اور ان سے پوچھا کہ

Marfat.com

کتنی مدت یہاں پڑے رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ پروردگار نے فرمایا تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو (جس پر وہ سوار ہو کر آئے تھے۔ کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو گیا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کیلئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر پر ہم کس طرح گوشت پوست چڑھاتے ہیں۔ اس طرح جب حقیقت ان کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو انہوں نے کہا میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ یعنی اس طرح حضرت عزیر علیہ السلام کو زندگی اور موت کے مرحلے سے گزار کے آنے والی دنیا کیلئے ایک نشانی بنا دیا گیا اور یہ واضح کر دیا گیا کہ میری قدرت کے سامنے یہ بات کوئی مشکل نہیں کہ ایک جیتے جاگتے انسان کو اچانک موت دے دوں اور پھر سو برس کے بعد اسے زندہ کر دوں اور اس سو سال کے عرصہ میں اس کے کھانے پانی کو باسی تک نہ ہونے دوں اور اس کے گدھے کی ہڈی ہڈی الگ کر دوں اور پھر دوبارہ اس پر گوشت پوست چڑھا کر اس کو جیتا جاگتا اٹھا کھڑا کروں۔ یہ سب میری قدرت کے کرشمے ہیں۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہیں کہ تمہیں مارنے اور پھر دوبارہ زندہ کرنے پر پروردگار ہر طرح قادر ہے۔

اسی طرح البقرۃ آیت نمبر ۲۶ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ تو اس پر پروردگار نے حکم دیا کہ تم چار پرندے لے لو اور ان کو اپنے سے مانوس کر لو۔ پھر ان کے اجزاء کاٹ کر ان کا ایک ایک جز و ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر ان کو پکارو وہ تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ اور جب ایسا ہو جائے تو خوب جان لو کہ اللہ نہایت غالب اور حکمت والا ہے۔ یعنی اس دنیا میں رہتے ہوئے ہمارے لئے ممکن تو نہیں ہے کہ زندگی اور موت کا راز پا لیں۔ لیکن ان واقعات سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ ہر چیز پر غالب ہے اور وہ اپنی حکمت و دانش کے مطابق زندگی اور موت کے فیصلے کرتا ہے۔

اس طرح قرآن کریم میں سورۃ الکہف میں چند نوجوانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو تاریخ میں اصحابِ کہف کے نام سے مشہور ہیں جو کہ تقریباً تین صدیوں تک غار میں سوئے رہے۔ پھر انہیں نیند سے جگایا گیا لوگوں سے ملے پورے شہر کے لوگ اکٹھے ہو کر انہیں دیکھنے آئے۔ شہر کے حکمران نے ان سے ملاقات کی، پھر وہ اپنے غار میں جا کر سو گئے اور بعد والوں نے یادگار کے طور پر غار کے دھانے پر ایک مسجد تعمیر کر دی اور مورخین کی شہادت کے مطابق آج بھی ان کے آثار زندہ ہیں۔ نئی تحقیق کے مطابق اردن میں عمان شہر کے قریب ایک پہاڑ پر یہ غار دریافت ہو گیا ہے۔ یہ غار عمان شہر سے سات کلومیٹر جنوب میں واقع ہے اور اردن کی مرکزی شاہراہ جو عقبہ سے عمان تک گئی ہے اس سے اس کا فاصلہ تین کلومیٹر ہے۔

یہ حیرت انگیز واقعہ بجائے خود اس بات کی کتنی بڑی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اسباب کی اس دنیا میں اگر چاہے تو بغیر کسی سبب کے چند نوجوانوں کو صدیوں تک سلائے رکھ سکتا ہے اور پھر انہیں زندہ اٹھا کر لوگوں پر حجت تمام کر سکتا ہے اور یہ پورا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا جس شہر کے رہنے والے دوبارہ اٹھنے یا نہ اٹھنے یعنی قیامت کے حق و باطل ہونے میں بری طرح جھگڑ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے قیامت کے برحق ہونے کی پر ان پر ایک حجت تمام کر دی اور قرآن کریم نے اسے بیان فرما کر قیامت تک آنے والوں کے لئے قیامت کے سمجھنے کو آسان کر دیا۔ قرآن کریم کہتا ہے: وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ (الکہف: ۱۸۔۱۲) ''اس واقعہ اصحاب کہف سے ہم نے انہیں صرف اس لئے آگاہ کیا تا کہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔

Marfat.com

8- قیامت کے وقوع پر اگر ہم ایک اور حوالے سے غور کریں تو پھر قیامت کے وجود کو تسلیم کرنا نہ صرف مذہبی فریضہ ٹھہرتا ہے، بلکہ عقل اور اخلاق کا تقاضا بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں حسن عمل کا سرمایہ یا اخلاقی زندگی کا بیش بہا خزانہ صرف اس وقت تک موجود ہے اور رہے گا جب تک انسان میں ایک بات کا تصور زندہ رہے گا۔ وہ یہ کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یا جو کچھ کروں گا میرا ہر عمل اپنی مکافات بھی رکھتا ہے۔ جس طرح میں اس کائنات کا ایک حصہ ہوں، اسی طرح میرے اعمال بھی اس کائنات کے باقی حقائق کی طرح ان کا ایک حصہ ہیں۔ جس طرح اللہ کا قانون یہاں ہم کارفرما دیکھتے ہیں کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ ممکن نہیں جہاں کوئی شے اپنا وجود رکھتی ہے وہ اثرات ونتائج کے سلسلہ سے باہر ہو۔ پس جس طرح خدا نے اجسام ومواد میں خواص ونتائج رکھے ہیں۔ یعنی آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے، سنکھیا کھانے سے موت اور دودھ پینے سے طاقت آتی ہے۔ کونین سے بخار رک جاتا ہے۔ اسی طرح اعمال میں بھی خواص ونتائج ہیں اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں اسی طرح روح انسانی کے لئے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں اور معنوی موثرات میں روح متاثر ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہم اجسام ومواد کے خواص ونتائج کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں تو ہمیں ان کے خواص ونتائج پر بھی شبہ نہیں ہوتا مثلاً ہم گیہوں بوتے ہیں تو ہمارے دل میں یہ خدشہ کبھی نہیں گزرتا کہ گیہوں پیدا نہ ہوگا اور اگر ہم سے کوئی کہے کہ ممکن ہے گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے تو ہم اسے پاگل سمجھیں گے۔ اس لئے کہ فطرت کے قانون مکافات کا یقین ہماری طبیعت میں راسخ ہو چکا ہے اور ہمیں یہ کبھی وہم وگمان بھی نہیں گزرتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلے میں جوار دے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہم یہ بھی ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ اچھی قسم کا گیہوں لے کر فطرت بری قسم کا گیہوں دے سکتی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بدلہ دینے میں قطعی اور شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن اعمال کے قدرتی خواص ونتائج جنہیں سزا وجزا سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی اچھے اعمال کا نتیجہ اچھائی ہے، جس پر ثواب ملے گا اور برے اعمال کا نتیجہ برائی ہے، جس پر عذاب ملے گا اور پھر اچھے اعمال کے نتیجے میں اچھے اعمال برگ وبار لائیں گے تو انسانی معاشرت میں صحتمند توانائی بروئے کار آئے گی اور انسانی زندگی خوشحالی اور اعتدال سے ہم آہنگ ہوگی اور اگر برائی کریں گے تو اس کا نتیجہ برائی ہوگا اور اس کے ردعمل کے طور پر برائی پھیلے گی اور معاشرہ غیر صحت مند صورت حال کا شکار ہو کر تباہی اور بربادی کا راستہ اختیار کرے گا۔ یہ چیزیں چونکہ ہمیں آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں اور اس کیلئے گہرے غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے ہمیں ان باتوں کا یقین نہیں آتا۔ پروردگار ہمیں یہ بتاتا ہے کہ قیامت اصلاً ''یوم الدین'' ہے اور دین کا معنی ہے جزا اور سزا، بدلہ اور مکافات۔ یوم الدین کا معنی ہوگا ''جزا اور سزا اور بدلہ اور مکافات کا دن''۔ یعنی یہ دن ہم نے اس لئے رکھا ہے تاکہ تمہیں اس بات کا اندازہ ہو کہ تم دنیا میں اچھی زندگی گزارنے اچھائیوں کو سپورٹ کرنے، اچھائیوں کو فروغ دینے، اچھائیوں کو سربلند کرنے کیلئے بھیجے گئے ہو اور یہ تمہارے اعمال دنیا میں بھی اپنے اثرات ونتائج رکھتے ہیں۔ جس سے ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آتا ہے اور آخرت میں انہی اعمال کے حوالے سے ہم تمہیں جزا وسزا دیں گے۔

نزول قرآن سے پہلے پیروان مذہب کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ جزا وسزا محض اللہ کی خوشنودی اور اس کے قہر وعذاب کا نتیجہ ہے۔ اعمال کے نتائج کا اس میں دخل نہیں۔ الوہیت اور شہنشاہیت کے تشابہ سے تمام مذاہب دیگر تصورات کی طرح اس معاملہ میں بھی گمراہی فکر کے مرتکب ہوئے تھے۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام واکرام دینے لگتا ہے، کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے۔ اس لئے خیال کرتے تھے کہ خدا کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ وہ کبھی ہم سے خوش ہو جاتا ہے کبھی غصہ وغضب میں آجاتا ہے۔ طرح طرح کی قربانیوں اور چڑھاووں کی رسم اسی اعتقاد سے پڑی لوگ دیوتاؤں کا جوش وغضب ٹھنڈا کرنے کیلئے قربانیاں کرتے اور

Marfat.com

ان کی نظر التفات حاصل کرنے کیلئے نذریں چڑھاتے۔ لیکن قرآن کریم نے جزاء وسزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل ونوعیت کا پیش کیا ہے۔ وہ اسے خدا کا کوئی ایسا فعل قرار نہیں دیتا جو کائنات ہستی کے عام قانونی نظام سے الگ ہو۔ بلکہ اسی کا ایک قدرتی گوشہ قرار دیتا ہے۔ اب آپ اندازہ فرمایئے کہ اس حقیقت کو جو اوپر بیان کی گئی ہے اگر نظر انداز کر دیا جائے اور جس کا نتیجہ بہ ہر صورت قیامت کا وجود ہے تو کیا دنیا میں نیکی اور بدی کا تصورِ امتیاز باقی رہ سکتا ہے پھر تو اچھائی اور برائی یکساں ہو جائیں گی اور نیک اور بد برابر ٹھہریں گے۔ اس کو قرآن کریم کہتا ہے: اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ○ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ○ (الجاثیہ۴۵:۲۱-۲۲) ''جو لوگ برائیاں کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ایسے لوگوں جیسا کر دیں گے، جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں۔ دونوں برابر ہو جائیں گے۔ زندگی میں اور موت میں بھی؟ اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا یہی فیصلہ ہے تو افسوس ان کے اس فیصلے پر اور اللہ نے زمین اور آسمان کو بے کار اور عبث نہیں بنایا، بلکہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہے اور اس لئے بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ ملے اور یہ بدلہ ٹھیک ٹھیک ملے گا' کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

یہ صحیح ہے کہ اسلامی زندگی کے برپا ہونے سے کسی حد تک دنیا میں بھی ایسا ہوگا۔ لیکن حقیقی جزا وسزا کی مکمل صورت صرف قیامت کی شکل میں وجود میں آئے گی۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَکَادُ اُخْفِیْهَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی ○ (طٰہٰ ۲۰:۱۵) ''قیامت یقیناً آنے والی ہے میں نے اسے مخفی رکھا ہے تاکہ ہر نفس کو اس کی سعی وکاوش کا بدلہ دیا جائے۔''

مختصر یہ کہ جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور جب وہ یہاں پر وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اسکے خواص وآثار بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات واعمال کے بھی کچھ آثار ولوازم ہیں، جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور اور خاکساری' بخل اور فیاضی' انتقام اور عفو' شجاعت اور بزدلی' تقویٰ اور فسق' ایمان اور کفر، ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر ونتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ولوازم ہیں، جو اس سے کسی طرح الگ نہیں ہو سکتے۔ جس طرح سنکھیا سے سمیت' شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں بھی علت ومعلول کا وہی لزوم ہے، جو جسمانی' مادی اور طبیعاتی اشیا میں ہے۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم جسمانی، مادی اور طبیعاتی اشیا کے علت ومعلول کے رشتے کو جانیں اور اس پر یقین بھی کریں۔ لیکن قیامت جو اس کا منطقی نتیجہ اور عقلی تقاضا ہے اسکو سمجھنے سے انکار کر دیں اور اس پر اشتباہات وارد کریں۔

نفخ ثانیہ کے بعد کی تفصیلات

گزشتہ معروضات میں آپ نے قیامت کے احوال کی تفصیل اور اس کے واقع ہونے کے دلائل ملاحظہ فرمائے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ قیامت کے دوسرے مرحلے کے وقوع پذیر ہونے کے بعد جب از سر نو زندگی کی ہماہمی شروع ہوگی اس وقت کی کیفیت اور اس کی تفصیلات کا ذکر کروں۔ آپ نے یہ سنا ہوگا کہ انسان اپنی قبروں سے جسموں سمیت اٹھائے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان کے یہ جسم جن کے ساتھ وہ میدان حشر میں پہنچیں گے وہی ہوں گے، جو انہیں دنیا میں دیئے گئے تھے یا یہ اجسام اور ہوں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اجسام وہ

Marfat.com

نہیں ہوں گے، جو دنیا میں انہیں دیئے گئے تھے۔ بلکہ یہ اجسام ان کے اعمال کا ظل اور عکس ہوں گے۔ یعنی جیسے اعمال ہوں گے، ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے۔ چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی اور سفیدی کی صورت میں بدل جائے گا۔ قرآن کریم سورۃ عبس میں کہتا ہے: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۙ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۚ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۭ (عبس ۸۰: ۳۸۔۴۱) ”کتنے چہرے اس دن روشن، ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر کدورت ہوگی اور ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔“

سورۃ آل عمران آیت 11 میں فرمایا گیا: يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۙ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۙ (۳: ۱۰۶۔۱۰۷) ”اس دن کتنے چہرے سفید ہوں گے اور کتنے کالے۔ لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے (ان سے پوچھا جائے گا کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کے بدلے عذاب کا مزا چکھو۔) جن کے چہرے سفید ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

صحیح احادیث میں ہے کہ جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے ان کے جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا۔ دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا اور کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا۔ کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے، دل کے اندھے، آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے۔ سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے تو پھر صحیح اور سالم نئے جسم نمودار ہوں گے اور پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ جو اپنے آپ کو بڑے سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے۔

ان تمام شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔ اب انسانوں کو اُس میدان میں لے جایا جائے گا جہاں اللہ کی عدالت ہوگی اور ان کے سامنے وہ مرحلہ درپیش ہوگا جس کیلئے قیامت برپا کی گئی یعنی ان کا حساب کتاب شروع ہوگا۔ نیک لوگ اپنے اچھے اعمال کی جزا پائیں گے اور برے لوگوں کو اپنے برے اعمال کی سزا ملے گی۔ اس حساب و کتاب کے سلسلہ میں جو باتیں قرآن و سنت سے واضح ہوتی ہیں ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر آدمی کو اس کا نامہ عمل دیا جائے گا اور وہ نامہ عمل ایسا ہوگا جس میں کوئی چھوٹی بڑی بات چھوٹنے نہیں پائے گی بلکہ وہ اس کی زندگی کا روزنامچہ ہوگا جس میں ایک ایک لمحے کی تفصیل موجود ہوگی۔

قرآن کریم سورۃ کہف آیت چھ میں کہتا ہے: وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۧ (۱۸۔۴۹) ”اور نامہ اعمال رکھ دیا جائے گا پس تو گنہگاروں کو دیکھے گا کہ اس میں جو کچھ لکھا ہوگا اس سے وہ ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس اس نامہ اعمال کو کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات تک نہیں چھوڑتا۔ بلکہ اس کو شمار کرتا ہے اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو وہ سامنے پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔“

Marfat.com

نامۂ اعمال کی نوعیت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نامۂ عمل کیا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ زندگی میں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ اپنی تفصیل سمیت زندہ رہے اور قیامت کے دن ہر آدمی کے حق میں یا اس کے خلاف پیش کیا جائے۔ اس کے بارے میں چند باتیں بالکل واضح ہیں۔

1- ہمیں قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ انسان کی زبان سے جب کوئی لفظ نکلتا ہے یا جب وہ کوئی عمل کرتا ہے خواہ یہ قول یا عمل کتنا ہی تنہائی میں وقوع پذیر کیوں نہ ہوا ہو اللہ کے مقرر کردہ فرشتے ہر وقت موجود ہوتے ہیں جو اسے سن کر یا دیکھ کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ سورۃ ق میں ارشاد ہوتا ہے: اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ○ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ○ (۵۰:۱۷.۱۸) ''اس وقت کو یاد کرو کہ جب دو لینے والے دائیں اور بائیں بیٹھے محفوظ کر رہے ہوتے ہیں''۔ اور بولنے والا کوئی بات نہیں بولتا مگر نگران اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔ یعنی اس طرح دو عینی گواہ جو ہر وقت ہمارے ساتھ موجود رہتے ہیں وہ قیامت کے دن اپنا نوشتہ اللہ کے سامنے اور اللہ کے حکم سے ہر ایک کو پیش کریں گے۔ یہ بھی قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جن کو نامہ عمل دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ ان کی سعادت کی علامت ہوگا۔ اس لئے وہ اسے پا کر خوش و خرم ہوں گے۔ لیکن جن لوگوں کو یہ نامہ عمل بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ ان کی بدبختی اور شقاوت کی علامت ہوگا وہ اسے لے کر سر پیٹ لیں گے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں کہا گیا: وَکُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ کِتٰبًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ○ اِقْرَاْ کِتٰبَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا ○ (۱۷:۱۳.۱۴) ''ہم نے ہر انسان کا نتیجہ یعنی (اس کا نامۂ عمل) اس کی گردن میں چپکا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا۔ (اسے یہ کہا جائے گا) کہ اپنا یہ نامۂ عمل پڑھ لے آج تو خود ہی اپنے حساب کیلئے کافی ہے۔''

قرآن کریم کے اس بیان سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ ہمیں محفوظ حالت میں اللہ کی قدرت سے ایک نوشتہ اور نامۂ عمل دیا جائے گا اور ہم اسے خود پڑھ سکیں گے۔

لیکن ہم اگر آج کی جدید دنیا میں نئی ایجادات کے حوالے سے دیکھیں جن میں سب سے نمایاں ٹیلی ویژن کی ایجاد ہے تو کیا ہم اس میں گزرے ہوئے لوگوں کو اپنی آنکھوں سے چلتا پھرتا، بولتا چالتا نہیں دیکھتے؟ جو لوگ عرصۂ دراز سے دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور ان کی فلمیں محفوظ ہیں ہم جب چاہیں ٹیلی ویژن کی مدد سے ان کی آواز سن سکتے ہیں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اگر انسانی ایجاد یہ کارنامہ انجام دے سکتی ہے تو قدرت کیلئے اس میں کیا مشکل ہے کہ وہ پوری فضا کو پردۂ سکرین میں تبدیل کر دے اور ہماری کہی ہوئی باتیں اور کئے ہوئے اعمال کی اس محفوظ فلم کو جو اس کے پاس محفوظ ہے، پردہ سکرین پر جاری کر دے اور وہاں ہر دیکھنے والا اس پردۂ سکرین پر اپنے اعمال کو دیکھے اور اپنے اقوال کو سنے۔ بلکہ اگر ہم مزید غور کریں تو سائنس ہمیں یہ بتاتی ہے کہ یہ فضا اس قدر حساس واقع ہوئی ہے کہ اس میں ہر کہا ہوا بول محفوظ ہے اور ہر کیا ہوا کام دیکھا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ کوئی موجد اپنی نئی ایجاد سے یہ کارنامہ انجام دے دے۔ ممکن ہے یہ بات انسان کی بساط سے باہر ہو اور دنیا میں کبھی ایسا نہ ہو سکے لیکن میں محض تسہیل و توضیح مدعا کیلئے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

Marfat.com

اگر ایک پرسکون جھیل میں آپ ایک کنکر پھینکیں تو آپ دیکھیں گے کہ سطح آب پر ایک دائرہ سا بن جائے گا جو جھیل کے کنارے تک پھیلتا چلا جائے گا۔ یہ کائنات اس جھیل سے بھی زیادہ حساس ہے جہاں ہمارے ہر عمل سے ہر جنبش سے بلکہ خیال تک سے لہریں اٹھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ چونکہ کائنات کا کوئی ساحل نہیں اس لئے یہ لہریں سدا باقی رہیں گی اگر ہم کوئی ایسا ٹیلی ویژن ایجاد کرلیں جو ان لہروں کو صوت وحرکت میں بدل سکے تو ہر شخص کا پورا اعمال نامہ ایک فلم کی طرح ہمارے سامنے آ جائے گا۔

اس آیت کریمہ میں غالباً اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے:

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ○ (۶۵.۳۶)

''قیامت کے دن ہم ان کے منہ بند کردیں گے اور ان کے اعمال کی داستان ان کے ہاتھ اور پاؤں سنائیں گے۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعضاء بھی ہمارے حق میں یا ہمارے خلاف گواہی دیں گے بلکہ ہماری کھال تک ہمارے اعمال بد پر گواہی دے گی۔

قرآن کریم میں سورۃ حم السجدہ میں کہا گیا: وَیَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَی النَّارِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ○ حَتّٰٓی اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ ○ (۴۱:۱۹.۲۱) ''جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ تقسیم کردیئے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گی تو وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہم پر گواہی کیوں دی؟ تو وہ بولیں گی کہ جس اللہ نے ہر چیز کو قوت گویائی بخشی ہے آج اسی نے ہمیں بھی بولنے کا حکم دیا ہے مزید ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ہر عمل مخصوص شکل میں لایا جائے گا۔ جس کا ایک وزن ہوگا اب اس کی کمی بیشی کیلئے یا بوجھل اور ہلکے پن کو جاننے کیلئے میزان رکھا جائے گا۔ تو پھر جن کے وزن ہلکے ہوں گے وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے اور جس کا وزن بھاری ہوگا وہ جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہوگا۔

قرآن کریم سورۃ اعراف میں کہتا ہے: وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ○ (الاعراف ۷: ۹.۸) ''اور اس دن وزن کرنا حق ہے پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو یہ وہ لوگ ہیں جو فلاح کو پہنچیں گے اور جن کی تولیں ہلکی ہوئیں یہ وہ ہیں جو اپنی جانوں کا نقصان کر بیٹھے ہیں۔

سورۃ القارعہ میں فرمایا: فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَهُوَ ○ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ○ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ ○ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ ○ (القاریہ ۱۰۱: ۹.۶) ''آج جس کا تول بھاری ہو تو وہ عیش کی زندگی میں ہوگا اور جس کا تول ہلکا ہوا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

تو حساب کتاب کے اس مرحلے سے گزرنے کے بعد لوگ اپنے اپنے اعمال کے مطابق جنت یا جہنم میں داخل کردیئے جائیں گے۔ البتہ ان لوگوں میں سے جنہوں نے کفر اور شرک کا رویہ اختیار کیا ہوگا ان کو تفصیلی حساب کتاب کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ اس جرم کے بعد باقی کوئی نیکی اپنا اعتبار نہیں رکھتی اس لئے ان کو سیدھا جہنم میں بھیج دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہیں گے اور کبھی ان کو معافی نہیں ملے گی۔

قرآن کریم کہتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ (النساء:۴۔۴۸) ''بیشک اللہ تعالیٰ اس آدمی کو کبھی نہیں بخشے گا جس نے اس کے ساتھ شرک کیا اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا''۔

Marfat.com

سزاوجزا کا ہندوانہ نظریہ

لیکن یہ حساب کتاب جس میں نیکی کی جزا اور بدی کے سزا ہے اس طرح کا غیر معقول' غیر منطقی اور اللہ کی رحمت کے بالکل برعکس نہیں ہے۔ جس طرح کا تصور بعض دیگر مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت نے بھی اس میں بہت کچھ ٹھوکریں کھائی ہیں اور قدم قدم پر غلطیاں کی ہیں لیکن ہندومت نے تو اس کو نامعقولیت اور غیر منطقی انجام کی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ اس کی ہم تفصیل سید سلیمان ندوی ؒ کی سیرۃ النبی سے نقل کرتے ہیں۔

"درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اس عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے اس کے مطابق اچھا یا برا بدلہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا۔ اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے۔ ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے' ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں ان کو ہملوک میں جانا پڑتا ہے۔ جہاں نرک (دوزخ) ہیں وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے' بعد ازاں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندرلوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے' جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا' بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے' یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے۔ اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندر لوگ وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل' ہوا' اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے اور اس وقت تک آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس سے اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے کامل اور دائمی نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام صادر نہ ہو' یہی ترک عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کیلئے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پر لے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا یعنی آواگون کا چکر شروع ہوگا۔ اور پھر اس طرح چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا یہ چکر اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے لیکن اگر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان ایک دم میں خارستان بن جائے۔ ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آ جائے۔ بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی صفحہ ہستی سے مٹ جائے اور باایں ہمہ دائمی و ابدی نجات میسر نہ ہو کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔"

Marfat.com

سزا و جزا کا اسلامی نظریہ

لیکن اسلام نے اس جزا و سزا کے دن کا جو تصور دیا وہ عقل اور منطق کے انتہائی قریب اور اللہ کی رحمت کا عکاس ہے۔ اسلام نے اس بنیادی تصور کے ساتھ کہ ہر نیک عمل کی جزا اور ہر برائی کی ایک سزا ہے، رحمت کے ایسے مواقع سے بھی بہرور فرمایا ہے کہ اگر آدمی واقعی ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لے اور اللہ کا خوف اس کو دامن گیر رہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کی جنت کا مستحق نہ ٹھہرے۔ مثلاً سب سے پہلے پروردگار نے یہ کرم فرمایا کہ ایک اصول طے کر دیا کہ تم جو برائی کرو گے تو ہم ہر برائی کے بدلے میں ایک ہی برائی کی سزا دیں گے البتہ اگر تم نیکی کرو گے تو ہم نے یہ اصول بنا دیا ہے کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ (الانعام: ۶.۱۶۱) ''جو آدمی نیکی کرے گا تو ہم اس کو دس گنا بدلہ دیں گے۔''

اب جہاں ایک اور دس کا تناسب ہو تو کیا وہ آدمی جو صراط مستقیم پر چلنا چاہتا ہو اور شریعت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتا ہو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس تناسب سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

2- دوسرا کرم یہ فرمایا کہ اگر تم نیکی کا ارادہ کرو لیکن اسے کسی وجہ سے کر نہ پاؤ تو ہم تمہیں ایک نیکی کا صلہ ضرور دیں گے لیکن اگر تم برائی کا ارادہ کرو اور اسے پھر کر نہ پاؤ تو ہم تم سے کوئی مواخذہ نہیں کریں گے۔

3- پھر ہمارے لئے بعض ایسے مواقع رکھے کہ اگر ہم ان مواقع پر اور ان زمانوں میں اللہ کی بندگی بجا لائیں اور اس سے استغفار کریں تو بخشش خود آگے بڑھ کر قدم چومتی ہے۔ مثلاً رمضان کا مہینہ لیلۃ القدر، عیدین کی دونوں راتیں، یوم العرفہ، 15 شعبان کی رات، رات کا پچھلا پہر، ان میں کوئی گنہگار سے گنہگار بھی استغفار کیلئے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو کبھی اسے خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹایا جاتا۔

4- یہ صحیح ہے کہ آدمی بعض دفعہ بڑے سے بڑا گناہ بھی کر گزرتا ہے جس کی بخشش کیلئے دوسرے مذاہب نے کوئی امکان نہیں چھوڑا۔ لیکن اللہ کا بے حد کرم ہے کہ اس نے ہمارے لئے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے بلکہ قرآن کریم میں بار بار تسلیاں دی گئیں کہ اے ہمارے وہ بندو جو اپنے نفسوں پر زیادتی کر چکے ہو: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (۳۹:۵۳) ''اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوں وہ سب گناہوں کو بخش دے گا صرف ایک دفعہ توبہ کر کے دیکھو''۔

حضور ﷺ نے اس توبہ پر اس حد تک زور دیا کہ آپ کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک اسم مبارک ''رسول التوبہ'' بھی ہے۔ یہ ایک ایسا امکان ہے کہ جس کے بعد سو سال کا مجرم بھی توبہ کے ذریعہ اپنی زندگی کو پاکیزہ بنا سکتا ہے اور اللہ کی رحمت کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے اس قدر بخشش اور استغفار کے مواقع ملنے کے بعد بھی کوئی آدمی اللہ کی رحمت کا استحقاق پیدا نہ کر سکے تو اسے بدنصیب کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے لیکن قربان جائیں اللہ کی رحمتوں کے کہ اس نے مرنے کے بعد بھی اور قیامت کے دن بھی اپنے بندوں کو اپنی رحمتوں سے محروم نہیں کیا۔

5- مرنے کے بعد بھی اس نے ہمیں یہ حق دیا کہ اگر تم اپنے پیچھے کوئی صدقہ جاریہ چھوڑ جاؤ یا اپنی نیک اولاد چھوڑ جاؤ جو تمہارے لئے دعا کرتی رہے تو مرنے کے بعد بھی اس سے تمہاری برائیوں میں کمی ہو گی اور تم بخشش کے قریب ہوتے جاؤ گے۔

6- اور اگر معاملہ اس سے بھی نہ بن سکے تو پھر اللہ کی رحمتوں نے ہمارے لئے ایک اور امکان بھی پیدا فرمایا وہ یہ کہ ہمیں بتایا گیا کہ آنحضرت ﷺ ہمارے لئے شفاعت فرمائیں گے حضور کی ایک شفاعت تو شفاعت عامہ ہو گی جس کے نتیجے میں تمام امتوں کے لوگ جو

Marfat.com

حساب کتاب کے انتظار میں نہایت کرب اور اضطراب سے وقت گزار رہے ہوں گے ان کا حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ پھر آنحضرت ﷺ اپنی امت کیلئے بطور خاص سفارش فرمائیں گے حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے قیامت کی حالت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا' نہ جانے کب تک پڑا رہوں گا آخر آواز آئے گی اے محمد (ﷺ) سر اٹھا' مانگ دیا جائے گا۔ تب میں سر اٹھاؤں گا اور اس حمد سے جو اس وقت خدا مجھے سکھائے گا اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا۔ پھر لوٹ آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا اسی طرح تیسری بار پھر چوتھی بار کروں گا یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔

حضرت عمران ابن حصین سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری شفاعت سے کچھ ایسے لوگ بھی دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنم والے ہوگا۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ آنحضرت کی سفارش ہر ایک کیلئے نہیں ہوگی بلکہ اس سفارش سے وہ خوش نصیب بہرہ ور ہوں گے جو اخلاص قلب سے توحید پر ایمان رکھتے ہوں گے اور جن کے سر صرف اور صرف اللہ کے سامنے جھکتے ہوں گے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ان کے سوال پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہوگا۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلے سے فراغت پائے گا اور چاہے گا کہ ان کو جنہوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دے گا۔ فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے نکالیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدے کے نشان ہوں گے۔ خدا نے آدم علیہ السلام کے بیٹے کی پیشانی کے نشان کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے وہ ان کو جلا کر خاکستر نہیں کر سکے گی۔ فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے اور جھلسے ہوئے ہوں گے۔ پھر ان پر آب حیات چھڑکا جائے گا تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔

ایسی متعدد روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جس کا خاتمہ ایمان پر ہوا اور جس نے توحید پر جان دی اور جس نے کبھی بھی کوئی نیک عمل کیا ہوگا جہنم کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کی شفاعت سے اس کو جہنم سے آزادی دے دیں گے اور جنت میں اسے داخل کر دیا جائے گا۔ البتہ وہ بدنصیب کبھی جہنم سے چھٹکارا نہیں پا سکے گا جس نے شرک کا ارتکاب کیا ہوگا۔

یہاں تک ہم نے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا مطالعہ کیا ہے جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کے ایک بندہ جب اپنے پروردگار کی حمد و ثناء کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنے پروردگار کی صفت ربوبیت سے آگاہی ہوتی ہے وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے تو اس کا بچپن لڑکپن، جوانی اور ڈھلتی ہوئی عمر، غرضیکہ زندگی کا ایک ایک لمحہ اسے اپنے رب کی ربوبیت کے فیضان سے گراں بار معلوم ہوتا ہے اس کی پیدائش کا پورا عمل ماں کے پیٹ کی زندگی دنیا میں آنے کے بعد کی بے بسی اور اس بے بسی میں قدم قدم پر تربیت کا سامان اور ہر تبدیلی کے ساتھ تربیت کے عمل کی تبدیلی، جسمانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اندرونی اور بیرونی صلاحیتوں کا فیضان اور وقت کے ساتھ ساتھ دماغی نشوونما میں ترقی پھر ایک وقت میں پہنچ کر شعلہ عقل کی روشنی فعلی اور انفعالی جذبوں کی افزائش گردوپیش کی موافقت اور اس کے مطابق ذوق اور مزاج کی تربیت ایک طویل داستان ہے جو ہر شخص کے گردوپیش پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے پھر وہ ایک قدم آگے بڑھ کر دیکھتا ہے کے مجھے میرے پروردگار نے صرف جسمانی ضرورتوں سے ہی مالا مال نہیں کیا بلکہ میرے اندر ایسے احساسات کو بھی فروغ بخشا ہے جو میرے دماغی نفسیاتی روحانی اور جمالیاتی ذوق کی تسکین

Marfat.com

کا باعث ہیں اور پھر اس مزاج اور ذوق کی ضرورت کی بجا آوری کیلئے جا بجا ایسے مناظر اٹھا دیئے گئے ہیں جس سے اللہ کی صفت ربوبیت کے ساتھ ساتھ اس کی صفت رحمت کا بھی احساس توانا ہونے لگتا ہے پھر جب آدمی انسانی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں مختلف کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے جس کے نتیجہ میں مختلف رویے جنم لیتے ہیں کہیں رحم دلی نظر آتی ہے تو کہیں سنگدلی کہیں مروت کا اظہار ہوتا ہے تو کہیں شقاوت کا اس رویے کے نتیجہ میں خود بخود ایک احتسابی عمل کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے کیونکہ اگر زندگی میں رویوں کو کھلی چھوٹ دے دی جائے تو انسانی زندگی جنگل کا منظر پیش کرنے لگے گی جس میں صرف طاقت کی حکومت ہوگی لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت عدالت بھی ہے جو یہاں عقیدے کی صورت میں کارفرما ہے اور قیامت میں نتیجے کی صورت میں کارفرما ہوگی تو اس کی روح جھوم اٹھتی ہے اور وہ بے ساختہ حریم قدس کی طرف عبادت کے تصورات لے کر بڑھتا ہے اور اس کی زبان پر بے ساختہ یہ نغمہ جاری ہو جاتا ہے۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں

یہ نغمہ اس کے دل کا سرجوش ہے جو از خود اس کے دل سے اچھل کر زبان پر آگیا ہے کیونکہ یہ بات انسان کے خمیر میں رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے محسن کی احسان شناسی کے جذبے میں ڈوب کر اپنے محسن کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہے پھر اگر وہ محسن اس کا ہم پایہ ہے اور اس کا احسان ایک عام سطح کا ہے تو یہ اس کی خدمت کر کے ایک تسکین محسوس کرتا ہے لیکن اگر وہ محسن ایک بڑی حیثیت کا مالک ہے تو یہ اس کی حیثیت کے مطابق اس کے آداب بجالاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جو میرے بس میں ہے میں اس کی خوشنودی کے لئے کر گزروں اور اگر وہ احسان کرنے والی ذات ایسی ہے جو محبت، عقیدت اور بندگی کا مرجع ہے تو یہ احسان میں ڈوبا ہوا شخص اپنی زندگی کا سارا سرمایہ اور بندگی کا سارا خزانہ اور حمد و ثناء کی ساری پونجی اس کے قدموں میں ڈھیر کر کے خود بھی اس کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے یہ طرز عمل فطرت کا وہ رویہ ہے جو انسان کے خمیر میں گوندھ دیا گیا ہے اسی جذبے سے سرشار انسان جب اپنے رب کے احسانات کو دیکھتا ہے کہ اس کا وجود اس کے دل و دماغ کی رعنائیاں، اس کے احساسات کی سرگرمیاں، اس کے جذبوں کی فراوانیاں، اس کی ذہانت کی جولانیاں، اس کے عزائم کی بلندیاں، اس کی محبت کی گہرائیاں، اس کے جذبۂ ایجاد کی ہمہ گیریاں، اس کے انفعالی جذبوں کی خوبصورتیاں اور اس کی شخصیت کی تہ در تہ کرم فرمائیاں سب پروردگار کی عطاء اور بخشش ہے تو وہ بے ساختہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اپنی ذات کی نفی کر کے اسی کی عبادت کا اقرار و اعتراف کرنے لگتا ہے اور پھر جب عبادت کی وسعتوں اور اپنی ناتوانیوں کو دیکھتا ہے تو اسی سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ وہ اس عاجزی اور سرافگندگی کے ساتھ کرتا ہے۔ جس سے ایک طرف دعا کا آہنگ جنم لیتا ہے اور دوسری طرف بندے اور اس کے رب کے درمیان ایک عہد و پیمان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ بندہ اپنی بندگی کا سرمایہ لے کر جب حضور حق میں حاضر ہوتا ہے تو ادھر سے اسے آواز سنائی دیتی ہے کہ تم نے اپنا سب کچھ ہمارے حوالے کر دیا تو ہم نے بھی تمہیں وہ سب کچھ دے دیا جو تم نے ہم سے مانگا اور جب تک تم اپنی بندگی کے اس عہد پر قائم رہو گے تو ہماری عنایات میں کبھی کمی نہیں دیکھو گے چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمان وسائل کی کمی کے باوجود محض بندگی رب کے باعث اس سرزمین پر سرافراز رہے لیکن جب انہوں نے طاغوت کی بندگی شروع کر دی تو وہ ٹھوکروں کی نذر ہو کر رہ گئے یہی وہ عہد ہے جو آنحضرت ﷺ نے جنگ بدر شروع ہونے سے پہلے اپنے پروردگار سے کیا تھا آپؐ رات بھر اللہ کے حضور کھڑے دعائیں مانگتے رہے آخر آپ کی زبان پر یہ جملہ آیا کہ یا اللہ یہ زمین انسانوں سے معمور ہے لیکن آج کی پوری نوع انسانی میں یہ چند گنتی کے لوگ ہیں جو آپ کی توحید کے پرستار ہیں اگر اس جنگ میں یہ لوگ مارے گئے تو پھر دنیا میں تیری پوجا کرنے والا کوئی نہیں رہے گا اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا میں آپ کی عبادت کی جائے تو پھر ان چند گنتی کے لوگوں کو اپنی تائید و نصرت

Marfat.com

سے نوازدیں تاکہ یہ آپ کی زمین پر آپ کے نام اور آپ کے دین کو بلند کرسکیں پروردگار نے فرمایا کہ ہم تمہارے اس وعدے پر تمہاری مدد کے لئے فرشتے بھیج رہے ہیں اور آئندہ بھی یہی فیصلہ ہوگا کہ تم اللہ کی بندگی میں کمی نہیں آنے دوگے اور اللہ تعالیٰ کبھی تمہیں اپنی تائید و نصرت سے محروم نہیں کرے گا اسی وعدے اور عہد کا اعادہ روزانہ ایک بندہ اپنے رب کے حضور کھڑا ہو کر کرتا ہے اب اس سے پہلے کہ ہم اس عبادت اور استعانت کی لفظی اور معنوی وضاحت کریں اس کی اہمیت اور افادیت کے حوالے سے چند بنیادی باتیں عرض کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جن و انس کا مقصدِ تخلیق عبادت ٹھہرایا ہے ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ○ (الذاریات ۵۱:۵۶)

کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ نے انبیا اور رسول مبعوث فرمائے اور قرآن کریم کی صراحت کے مطابق تمام انبیا اور رسولوں کی دعوت کا عنوان صرف عبادت رہا۔ پروردگار کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ (النحل ۱۶:۳۶)

ہم نے ہر امت کی طرف رسول بھیجا (انہوں نے آکر انہیں اللہ کا پیغام پہنچایا) کہ لوگو اللہ کی عبادت کرو۔

رسول اللہ ﷺ سب پیغمبروں کے آخر میں خاتم النبیین بن کر تشریف لائے اور آپؐ کے بعد نبوت اور رسالت کا دروازہ بند ہو گیا اور آپ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ قیامت تک کے آنے والے انسانوں کو جو ہدایت دینا چاہتا تھا اسے تکمیلی انداز میں انتہائی جامعیت کے ساتھ عطا فرمادیا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس دعوت کا جب آغاز فرمایا گیا اس کا عنوان بھی یہی عبادت رکھا گیا۔ ارشاد ہوا:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (البقرۃ ۲:۲۱)

اے لوگو! عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عبادت کی کیا اہمیت ہے کیونکہ یہی جن و انس کا مقصدِ تخلیق ہے، یہی تمام انبیا کی دعوت تھی اور یہی دعوت رسول اللہ ﷺ نے انتہائی جامعیت کے ساتھ جن و انس تک پہنچائی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ جب مبعوث ہوئے تو آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے دنیا میں عبادت کے حوالے سے چار تصورات پائے جاتے تھے۔

حضور ﷺ کی بعثت سے قبل عبادت کے چار تصورات

۱۔ مشرکین مکہ کی عبادت کا تصور: ان کے نزدیک خالق کائنات کی حیثیت ایسے تھی جیسے ایک سلطنت کا بادشاہ ان کا خیال یہ تھا کہ سلطنت کا قانون صرف بادشاہ کی زبان ہوتی ہے وہ جو کہہ دے اور جس بات کا حکم دے دے وہ قانون بن جاتا ہے اور اس سلطنت میں محفوظ زندگی کی ضمانت بادشاہ کی رضامندی ہے۔ وہ جب تک رعایا سے خوش ہے تو رعایا کو انعام و کرام سے نوازتا ہے اور جب وہ ان سے ناراض ہوتا ہے تو انہیں سزائیں دیتا ہے۔ اور اس کی رضامندی کا حصول اس کی تعریف و ستائش اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اس کی چاکری کرنا اور ہر ممکن طریقے سے اس کو خوش رکھنے میں ہے۔ ظاہر ہے یہ سارے اعمال صرف بادشاہ کے سامنے کے ہیں، جب رعایا کا کوئی فرد بادشاہ کے

Marfat.com

سامنے ہوتا ہے تو یہ سارے اعمال بجالاتا ہے اور جب بادشاہ کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے تو اب وہ اپنی مرضی کا مالک ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بادشاہ اس کے حال سے واقف نہیں ہے۔ اب اس کے سامنے بادشاہ کی رضامندی کی صرف ایک صورت ہے کہ مقامی طور پر جن لوگوں کو اس نے اپنے نمائندے مقرر کر رکھا ہے انہیں خوش رکھا جائے اور انہیں کوئی شکایت کا موقع نہ دیا جائے چنانچہ انہی تصورات کے تحت وہ اللہ تعالیٰ کو بادشاہ سمجھ کر اس کے چند لگے بندھے رسم و رواج اور پوجا پاٹ کر طریقوں کو بجالاتے تھے۔ بیت اللہ کا طواف کرتے سال بہ سال حج کر لیتے، اس کے غصے کو بڑھکنے سے روکنے کے لئے قربانیاں کرتے اور ان بتوں کی پوجا کرتے تھے جن کو یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کی مرضی میں انہیں بھی دخل ہے۔

۲۔ عبادت کا دوسرا تصور ہمارے قریبی ہمسائے ہندوؤں اور انہی سے نکلنے والے بدھ مت کا تھا ان کے تصور کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو وہ ہے جو مشرکین مکہ کے یہاں پایا جاتا ہے اور ان کے نزدیک بھی اللہ تعالیٰ ایک بادشاہ ہے جسے لگی بندھی رسموں کو ادا کرنے اور بعض قربانیاں پیش کرنے سے خوش کیا جاسکتا ہے۔ زندگی کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور دوسری طرف وہ اللہ کی بندگی کو اس قدر بلند اور عظیم سمجھتے تھے کہ اس کا حق دنیا میں رہ کر، دنیا کے معاملات میں شریک ہو کر ادا ہی نہیں کیا جاسکتا اس لئے ترکِ دنیا یعنی دنیا کو چھوڑ دینا ضروری ہے دنیا ان کے نزدیک ایک آلودگی اور گندگی کا نام ہے۔ جس میں آلودہ ہو کر اللہ کو پکارا نہیں جاسکتا چنانچہ اس لئے ان کے یہاں عبادات کا عظیم تر تصور جوگی ازم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ ان کے مذہبی لوگ جب گیان حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے تو وہ تارک الدّنیا ہو کر پہاڑوں یا جنگلوں میں جا بیٹھتے، اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ جسمانی راحتوں سے دور رکھتے، شادی بیاہ کا تصور ان کے یہاں ممنوع ٹھہرتا اور کم سے کم کھانے پر اکتفا کر کے وہ اپنے نفس کی پاکیزگی کا سامان کرتے اور اس کو وہ عبادت سمجھتے تھے۔

۳۔ عبادت کا تیسرا تصور ہم عیسائیوں میں دیکھتے ہیں عیسائیت پر بھی بعض محققین کے نزدیک ہندوازم کا اثر ہے، اس لئے انہوں نے اسی جوگیانہ تصور کو رہبانیت کے نام سے اختیار کیا اور ترک دنیا کو انتہائے بندگی کی علامت سمجھ کر اختیار کر لیا بلکہ ان کے نزدیک تو ہندوازم سے زیادہ ترکِ دنیا کا رجحان پایا جاتا ہے جس کو انہوں نے رہبانیت کا نام دیا ہے اس لئے ان کے یہاں جو خدا رسیدہ لوگ سمجھے جاتے تھے ان کا تارک الدنیا ہونا یعنی راہب ہونا ضروری تھا اور ایسے ہی لوگوں کی ان کے یہاں قدر و منزلت تھی اور دوسری بات ان کے یہاں ہندوؤں کی طرح ہی یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ اللہ کو دوسرے مشرکین کی طرح انسانی دسترس سے بہت بلند سمجھتے تھے اس لئے وہ یہ ناممکن جانتے تھے کہ انسانوں کی بندگی اور ان کی دعائیں براہ راست بھی اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتی ہیں اس لئے وہ خدا اور بندے کے درمیان واسطوں کے تصور کو ضروری خیال کرتے تھے مشرکین مکہ کے یہاں کاہنوں کا تصور، ہندوؤں کے یہاں برہمنوں کا تصور اور عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں مذہبی رہنماؤں کا تصور اسی تصور کا نتیجہ ہے؟ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ جب تک درمیان کے واسطوں کو خوش نہیں رکھا جائے گا اور انہی کے حوالے سے جب تک اللہ تعالیٰ سے رابطہ نہ کیا جائے گا اس وقت تک اللہ تعالیٰ خوش ہوسکتا ہے اور نہ ہماری بندگی اس تک پہنچ سکتی ہے۔

۴۔ چوتھا تصور یہود کا ہے وہ اگرچہ نسبتاً اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی صفات کے فہم میں ان تمام اہلِ مذاہب سے بہتر تھے لیکن درمیانی رابطوں کا تصور ان کے یہاں بھی پایا جاتا ہے اور یہ بھی تابوت سکینہ اور اولادِ ہارون علیہ السلام کو واسطہ بنائے بغیر اللہ تعالیٰ کے تشریعی اور تعبدی تعلق کو ناممکن سمجھتے تھے حتیٰ کہ حلت و حرمت کا اختیار بھی انہوں نے اپنے مذہبی راہنماؤں کو دے رکھا تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اپنے احبار اور اپنے رہبان کو رب بنا رکھا ہے۔

یہ تھے عبادت کے وہ تصورات جو حضور ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا میں موجود تھے جنہیں خلاصے کے طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ عبادت ان کے یہاں مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھی۔

Marfat.com

1۔ اللہ تعالیٰ کو ایک بادشاہ تصور کر کے چند وقتی مراسم بجالانا۔

2۔ دنیوی معاملات میں اللہ تعالیٰ کو دخیل نہ سمجھنا۔

3۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے تعلق کو دونوں کے درمیان ایک پرائیویٹ معاملہ سمجھنا۔

4۔ انسان براہ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں کر سکتا اس لیے درمیانی واسطوں کو ضروری سمجھنا۔

5۔ خدارسیدہ بننے کے لئے ترک دنیا یعنی رہبانیت اختیار کرنا کیونکہ دنیا ایک آلودگی ہے۔ اس آلودگی میں مبتلا شخص اللہ تعالیٰ سے قرب کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

اسلام میں عبادت کا تصور

اسلام نے آ کر ان تمام تصورات کی اصلاح فرمائی اس نے سب سے پہلے اس بات کو واضح کیا کہ عبادت صرف بندگی کے چند مراسم بجالانے کا نام نہیں۔ بلکہ اس نے عبادات کے نام سے بندگی کے جن طریقوں کو اپنے ماننے والوں کے لئے لازم ٹھہرایا ہے اس کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ یہ اسلام کی بنیادیں ہیں یہ اسلام کی مکمل عمارت نہیں ہے۔ ان کی حیثیت یہ ہے کہ کوئی آدمی ان سے صرف نظر اور انکار کر کے مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن صرف انہی کو بجالانا مکمل عبادت نہیں ہے۔ کیونکہ صرف بنیادیں بھر دینے سے عمارت وجود میں نہیں آجاتی البتہ یہ ضرور ہے کہ جب بھی عمارت بنے گی انہی بنیادوں پر بنے گی۔ چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

بُنِیَ الاِسلَامُ عَلٰی خمسٍ

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔''

نماز کو عبادت میں سب سے اہم حیثیت حاصل ہے یہاں تک فرمایا گیا کہ نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا وہ مسلمان کہاں وہ تو مشرک ہے۔ اور یہ بھی فرمایا گیا کہ قیامت کے دن جس عمل کے بارے میں سب سے پہلا سوال ہوگا وہ نماز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ صاف طور پر فرمایا گیا:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکرِیْ (طٰہٰ ۲۰: ۱۴)

کہ نماز میری یاد کے لئے قائم کرو اس کا مطلب یہ کہ نماز اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود اصل مقصود نہیں۔ بلکہ مقصد پوری زندگی میں اللہ کی یاد ہے کہ وہ کسی کام میں بھی دل سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ مزید ارشاد فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ (عنکبوت ۲۹: ۴۵)

کہ نماز تو بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں نماز مثبت حیثیت سے اللہ کی یاد کا ذریعہ ہے وہاں اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ وہ بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نماز آدمی کو بے حیائی اور بری باتوں سے نہیں روکتی تو وہ نماز مقصد نہیں ہے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ نماز یعنی عبادت ایسی ہونی چاہیے جس کے نتیجے میں پوری زندگی کی فکری اور عملی تطہیر ہو جائے اس لئے اسلام نے سب سے

Marfat.com

پہلا کام یہ کیا کہ اس نے عبادت کو اللہ اور بندے کے درمیان پرائیویٹ معاملہ کی بجائے اس کو پوری زندگی کا دستور اور وظیفہ ٹھہرایا اور دوسرا تصور اس نے یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام عظمتوں کے باوجود انسان کے اس قدر قریب ہے کہ شہ رگ بھی انسان کے اس قدر قریب نہیں۔ یعنی شہ رگِ حیات زندگی کی بقا کی ضامن ہے اس کے کٹ جانے سے زندگی کٹ جاتی ہے ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز انسان کے قرب نہیں ہوسکتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں اور دوسرا اس نے اپنی کتاب میں بار بار فرمایا کہ میں سمیع ہوں، بصیر ہوں، علیم ہوں، تمہارا کوئی عمل حتیٰ کہ تمہاری کوئی احساس اور خیال بھی میرے علم سے باہر نہیں۔ اور تمہاری کوئی حرکت میری نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ تو جو ذات اس قدر قریب ہے اور اس قدر انسان سے آگاہ ہے اس کے اور بندے کے درمیان کسی اور واسطے کا کیا معنی۔ اس لئے اس نے بار بار ارشاد فرمایا کہ تم مجھ پر ایمان لائے ہو تو پھر مجھی کو پکارو، میں تمہاری ہر پکار کو سنتا ہوں اور اسے قبول کرتا ہوں۔ اسی طرح اس نے درمیانی واسطے کا تصور ختم کردیا مزید اس نے یہ اصلاح فرمائی کہ عبادت کا تعلق چونکہ تمہاری پوری زندگی سے ہے اور تم اپنی زندگی دنیا اور اہل دنیا میں رہ کر گذارو گے اس لئے دنیا اور اہل دنیا سے تعلقات تمہاری عبادت سے کیسے خارج ہوسکتے ہیں اور تم دنیا سے لاتعلق ہو کر عبادت کے تقاضوں کو کیسے پورا کرسکتے ہو۔ اس لئے عبادت یہ نہیں کہ تم دنیا سے ترک تعلق کر کے صرف اللہ کا نام پکارتے رہو بلکہ عبادت یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیا کو برت کر اس طرح دکھاؤ کہ نہ تمہارا دل کبھی اللہ کے تصور سے غافل ہو اور نہ تمہارا قدم کبھی اس کی عائد کردہ حدود سے باہر نکلے۔ نہ تمہارا ہاتھ کبھی اس کے حکم کو توڑے اور نہ تمہارے دل و دماغ کی قوتیں کبھی اس سے بغاوت کریں۔ جس طرح تم بھوکے رہ کر اس کی بندگی کے پابند ہو اسی طرح پیٹ بھر کر بھی دولت مند ہو کر بھی حتیٰ کہ تخت و تاج کے مالک ہو کر بھی اسی کے بندے ہو اس طرح تمام تصورات کا ابطال فرما کر اور غلط خیالات کو رد کر کے اسلام کا صحیح تصورِ عبادت پیش کیا۔ لیکن اسلام کا کامل تر تصورِ عبادت اس وقت تک سمجھ نہیں آئے گا جب تک کہ عبادت کے معنی اور اس کے مصداق کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔

عبادت کا مفہوم

عربی زبان میں عبودۃ' عبادت اور عبودیت عَبَدَ سے مصدر ہے۔ اس کے اصل معانی خضوع اور تذلل کے ہیں یعنی تابع ہو جانا' رام ہو جانا۔ کسی کے سامنے اس طرح سپر انداز ہو جانا کہ اس کے مقابلہ میں کوئی مزاحمت یا انحراف و سرتابی نہ ہو اور وہ اپنی منشا کے مطابق جس طرح چاہے خدمت لے۔ اسی اعتبار سے عرب اس اونٹ کو بعیر معبد کہتے ہیں جو سواری کیلئے پوری طرح رام ہو چکا ہو اور اس راستے کو طریق معبد کہتے ہیں جو کثرت سے پامال ہو کر ہموار ہو گیا ہو پھر اسی اثر سے اس مادہ میں غلامی' اطاعت' پوجا' ملازمت اور قید کے مفہومات پیدا ہوئے۔ چنانچہ اسی مادہ عَبَدَ سے بننے والا ایک مشہور لفظ جو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اکثر مستعمل ہے وہ عبد ہے عبد کا معنی ہے غلام اور یہ اردو اور عربی دونوں میں اسی معنی میں مستعمل ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (البقرۃ ۲:۱۷۸)

یہاں دیکھئے کہ حر کے بعد جس کا معنی آزاد ہے لفظ عبد غلام کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اسی طرح ایک جگہ غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا تو فرمایا:

Marfat.com

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ (النور ۲۴: ۳۲)

اس آیت میں دیکھئے لونڈیوں کے ساتھ عباد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو عبد کی جمع ہے اسی طرح کائنات کی تمام مخلوق کے بارے میں جن میں نمایاں خود حضرتِ انسان ہے ارشاد فرمایا گیا:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ (النور ۲۴: ۹۳)

یہاں بھی دیکھئے عبد کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال ہوا ہے اسی طرح قرآن پاک میں اور بھی کئی مواقع پر آپ کو عبد یا عباد کا لفظ غلام کے معنی میں مستعمل نظر آئے گا۔ اسی طرح عبد کو باب تفصیل میں لے جا کر غلام بنانے کے معنی میں قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بیان کیا گیا:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (الشعراء ۲۹. ۲۲)

یہاں دیکھئے عَبَّدْتَّ غلام بنانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ عبد کا معنی ہے غلام اور عبادت، عبودیت، عبد سے مصدر ہے اس کا معنی ہے غلامی۔ یعنی کسی کی بالادستی و برتری تسلیم کر کے اس کے مقابلے میں اپنی آزادی اور خودمختاری سے دستبردار ہو جانا سرتابی اور مزاحمت چھوڑ دینا اور اس کے لیے رام ہو جانا۔ یہی حقیقت بندگی اور غلامی کی ہے۔ لہٰذا اس لفظ سے اولین تصور جو ایک عرب کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ بندگی اور غلامی ہی کا تصور ہے۔ پھر چونکہ غلام کا اصلی کام اپنے آقا کی اطاعت و فرمانبرداری ہے اس لیے لازماً اس کے ساتھ ہی اطاعت کا تصور پیدا ہوتا ہے اور جب غلام اپنے آقا کی بندگی و اطاعت میں محض اپنے آپ کو سپرد ہی نہ کر چکا ہو بلکہ اعتقاداً اس کی برتری کا قائل اور اس کی بزرگی کا معترف بھی ہو اور اس کی مہربانیوں پر شکر و احسان مندی کے جذبہ سے سرشار بھی ہو تو وہ اس کی تعظیم و تکریم میں مبالغہ بھی کرتا ہے۔ مختلف طریقوں سے اعتراف نعمت کا اظہار بھی کرتا ہے اور طرح طرح سے مراسم بندگی بھی بجالاتا ہے اسی کا نام پرستش ہے۔ اور یہ تصور عبدیت کے مفہوم میں صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جبکہ غلام کا محض سر ہی آقا کے سامنے جھکا ہوا نہ ہو بلکہ اس کا دل بھی جھکا ہوا ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں ان تینوں معنوں میں عبادت کے لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن تینوں حوالوں سے اصل مقصود غلامی ہے اور یہ دونوں تصورات اس سے پھوٹنے والے اجزا ہیں۔ اس لیے اگر غلامی کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے تو خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عبادت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

اسلام میں غلامی کا مفہوم

اس غلامی کے حوالے سے قرآن و سنت اور اسلامی تاریخ میں ہمیں دو متضاد تصورات پہلو بہ پہلو سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلا تصور یہ ہے کہ غلامی اسلام کی نگاہ میں انتہائی مکروہ اور ناقابل قبول ہے بلکہ یہ ایک ایسی برائی ہے جس کے تصور کو بھی قبول کرنے سے اسلام انکار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن پاک میں ہمیں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ اگر امت غلام بنالی جائے تو پھر اسے زندگی کس طرح گزارنی چاہئے بلکہ ہم پورے قرآن کریم میں ایک آزاد قوم کے تصور حیات کو جابجا پھیلا ہوا دیکھتے ہیں بلکہ قرآن پاک میں متعدد مرتبہ اس بات کو دہرایا گیا کہ تمہاری زندگی کے مقاصد میں نمایاں ترین مقصد یہ ہے کہ تم طاغوت سے اجتناب کرو۔ چنانچہ جس آیت شریفہ میں انبیا کی دعوت کے حوالے سے عبادت کا ذکر کیا گیا ہے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا: ''واجتنبو الطاغوت''

Marfat.com

اور تاریخ اسلامی میں ایسے متعدد واقعات ہمیں ملتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جن اصولوں کی بنیاد پر حالات بدلنے کے لئے اٹھے تھے ان میں سب سے بڑی بات انسان کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ عجم سے جو پہلی بڑی جنگ لڑی گئی ہے وہ جنگ قادسیہ ہے۔ اس میں حضرت ربعی بن عامرؓ جب مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر رستم کے دربار میں گئے تو رستم نے پوچھا کہ تم کس مقصد کے لئے آئے ہو تو انہوں نے فرمایا تھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں تا کہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرائیں۔

اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ غلامی کا تصور اسلام کی نگاہ میں کس قدر ناپسندیدہ اور کس قدر نا قابل قبول ہے لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور بھی قرآن پاک اور اس کی تعلیمات میں پوری طرح سرایت کئے ہوئے ہے اور جا بجا ہمیں پھیلا ہوا ملتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کا حقیقی مقصد انسان کو اللہ کا غلام بنانا ہے اور جو لوگ اللہ کے حکم کی اطاعت اور اس کے راستے میں سرفروشی کی وجہ سے اس کے قرب کا مقام پا لیتے ہیں تو انہیں اس راستے مین جو بڑے سے بڑا اعزاز مل سکتا ہے وہ یہی لفظ عبد ہے، جس کا معنی غلام ہے۔ فرشتے اللہ کے حکم اور اس کی اطاعت سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ ان کی تعریف کرتے ہوتے پروردگار نے فرمایا: بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ ''وہ معزز غلام ہیں۔'' (الانبیآء: ۲۱.۲۶) انبیا کرام کا گروہ انسانیت کا گلِ سرسبد ہے۔ ان کی تعریف میں جا بجا یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارہ فرمایا گیا: وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ ''کہ ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرمایا تھا وہ کتنا اچھا غلام تھا۔'' (ص: ۳۸.۳۰) رسول اللہ ﷺ جو مقصود کائنات اور سید المرسلین ہیں، ان کا بھی سب سے بڑا اعزاز یہی لفظ عبد ہے۔ معراج شریف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (بنی اسرائیل: ۱۷۔۱) ''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے عبد یعنی اپنے غلام کو ایک ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک'' یہاں دیکھئے حضور ﷺ کو عبد سے یاد کیا گیا حالانکہ حسی معجزات میں سے معراج حضور کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس معجزے کے حوالے سے جب حضور کا ذکر کیا جائے گا تو یقیناً اس اعزاز کے ساتھ کیا جائے گا جو اللہ کی نگاہ میں انتہائی قدر و منزلت کا حامل ہوگا۔ مگر ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کو عبد کے لفظ سے یاد کیا جا رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عبدیت اللہ کی نگاہ میں ایک انسان کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ شائد اسی وجہ سے کلمہ شہادت میں بھی '' اشهدان محمداعبده ورسوله'' فرمایا گیا یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اس کے غلام اور اس کے رسولؐ ہیں۔

اب دیکھئے یہ متضاد تصورات کہ ایک طرف غلامی سے نفرت اور دوسری طرف غلامی ہی منزلِ مقصود ہے اس تضاد کو سمجھنے کے لئے ایک بات ذہن میں رکھنی چاہئے وہ یہ کہ انسان کو جو خصوصیات دے کر پیدا کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ غلامی اور عبدیت انسان کی فطرت ہے وہ اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ وہ ہزار یہ دعویٰ کرے کہ میں ایک آزاد زندگی اختیار کرنا چاہتا ہوں جس میں کوئی پابندی کسی اطاعت اور کسی بندگی کا شائبہ تک نہ ہو مگر عملاً اس کے لئے یہ ممکن نہیں کیونکہ وہ غذا کا محتاج ہے اس احتیاج سے بچ نہیں سکتا وہ آرام کے حصول کا خوگر ہے اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا وہ نہ جانے کتنے ماؤف لمحوں میں کبھی خوف اور کبھی امید کی گرفت میں آجاتا ہے اس سے وہ آزاد نہیں ہو سکتا۔ محبت اور نفرت اس کے ایسے لاحقے ہیں جو اس سے الگ نہیں کئے جا سکتے بڑا بن کر رہنا اور دوسروں پر برتری ظاہر کرنا یہ اس کی وہ اندرونی خواہشیں ہیں کہ جن کی زنجیروں کو وہ توڑ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ وہ بادشاہت کی غلامی سے بچ جائے وہ کسی نظام کو ماننے سے انکار کر دے۔ وہ برادری کی برتری سے بغاوت کر دے۔ لیکن سٹیٹس اور پرسٹیج کی پوجا اور خواہشات کی پیروی سے وہ کبھی آزاد نہیں رہ سکتا۔ یہ غلامی کی کہ وہ چند در چند صورتیں ہیں جس کی کسی نہ کسی صورت میں وہ ضرور مقید رہتا ہے اور یہی وہ قیود ہیں جو اس کی صلاحیتوں کے لئے سمِ قاتل ثابت ہوتی ہیں وہ جتنا جتنا ان غلامیوں سے آزاد ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی شخصیت میں قوت کے سوتے پھوٹتے جاتے ہیں اور جتنا ان غلامیوں کا شکار ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی صلاحیتیں دھیمی پڑتی جاتی ہیں۔ بقول اقبال:

Marfat.com

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

چنانچہ انسانیت کا مستقبل، انسان کی صلاحیتوں اور اس کے آزادارادوں کو بروئے کار لانے اور اس کے ولولوں ہمموں اور اس کی امنگوں کے پھلنے پھولنے میں مضمر ہے اس لئے پروردگار نے ہر قسم کی غلامی کو انسان کے لئے حرام قرار دے دیا۔ لیکن دوسری طرف چونکہ غلامی اس کی فطرت میں داخل ہے جس سے وہ کسی صورت بچ نہیں سکتا اس لئے ایک ایسی غلامی اس کی منزل مقصود بنادی گئی کہ جس غلامی کو قبول کرنے کے بعد آدمی باقی ساری غلامیوں سے نجات پاسکتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر مخلوق کی غلامیوں سے کسی غلامی کو مشروع قرار دیا جاتا تو پھر مخلوق کی غلامی سے بچنا ممکن نہ ہوتا اس لئے مخلوق کی ہر غلامی سے آزادی کا حکم دیا گیا اور صرف ایک غلامی کا جواز بخشا گیا بلکہ اس کا حکم دیا گیا وہ ہے ہمارے آقا ﷺ اور خالق کی غلامی کیونکہ خالق کی پرستش، اور خالق کی اطاعت اس کی غلامی کے بغیر ممکن نہیں اور پھر یہ وہ غلامی ہے جو باقی تمام غلامیوں سے خلاصی اور نجات کا ذریعہ ہے۔ بقول اقبال:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہی وہ غلامی ہے جس سے مخلوق کی ہر طرح کی غلامی کی جڑ کٹ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں آدمی آزادی کے اس تصور کو پا سکتا ہے جس کے سائے میں اس کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں خواہشیں صحیح حدود میں محدود رہتیں اور اس کے ولولے پوری طرح بروئے کار آتے ہیں۔ چنانچہ ہم آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب وعجم میں جس بری طرح سے انسان کو بگڑا ہوا دیکھتے ہیں اس کی اگر حقیقت کو سمجھا جائے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دور کا انسان پوری طرح اپنی خواہشوں کی گرفت میں تھا۔ وہ صرف اپنے مفادات کے لئے جیتا اور اپنے مفادات کے لئے مرتا تھا۔ خواہشات اور مفادات میں اجتماعی تصادم سے اللہ تعالیٰ کی یہ زمین فساد سے بھر گئی تھی اور انسانیت کا مستقبل تاریک ہو کر رہ گیا تھا۔ جیسے ہی اس پر اللہ کی غلامی کی سحر طلوع ہوئی اس نے رفتہ رفتہ انسان کو اس کی خود عائد کردہ زنجیروں سے آزاد کیا تو وہ انسان تیار ہوا جس کی نظیر نہ اس سے پہلے کبھی چشم فلک نے دیکھی تھی اور نہ آج پوری طرح دکھائی دیتی ہے۔ لیکن صدیوں سے وقت اس کی راہ تک رہا تھا۔ وہ بالآخر صحابہ کی شکل میں نظر آئی۔ بقول اقبال:

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہی کے جگر میں

اور پھر دعا کرتا ہے کہ:۔

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس غلامی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ ہم نہایت اختصار سے عرض کریں گے کہ غلامی کے اس مفہوم میں چار تصورات داخل ہیں۔

Marfat.com

1۔ غلام اسے کہتے ہیں جسے حق ملکیت حاصل نہ ہو اس کے پاس جو کچھ ہے چاہے وہ جسم ہے یا جان، اس کی صلاحیتیں ہیں یا اس کی امنگیں، اس کا مال و دولت ہے یا اس کے تعلقات ان میں سے وہ کسی چیز کا مالک نہیں۔ ان تمام چیزوں کا مالک اس کا وہ آقا ہے جس کا وہ غلام ہے۔

2۔ چونکہ وہ کسی چیز کا مالک نہیں اس لئے وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اپنے زیر تصرف چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ یعنی مجھے آزادانہ تصرف کا حق حاصل ہے کہ جیسے چاہوں اور جہاں چاہوں استعمال کروں۔ اس لئے کہ آزادانہ تصرف کا حق اور من مرضی کا اختیار وہاں ہوتا ہے جہاں آدمی کو حق ملکیت حاصل ہو۔ کیونکہ اسی حق سے باقی حقوق پیدا ہوتے ہیں۔

3۔ غلام وہ ہوتا ہے جو اپنی زندگی کا نصب العین اور زندگی کا مقصد از خود متعین نہیں کر سکتا، وہ خود یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ مجھے زندگی کس طرح گزارنا ہے۔ میں ایک عالم بن کر زندگی گذاروں یا ایک استاد بن کر۔ مجھے انجینئر بننا ہے یا ایک تاجر بننا ہے۔ میں زندگی اپنے لئے گزاروں یا لوگوں کی خدمت کے لئے صرف کروں۔ ان میں سے اسے کسی بات کا حق نہیں ہوتا' اس کی ان باتوں کا اختیار اس کے آقا کو ہے۔ وہ جو اس کا مقصد زندگی متعین کر دے اسے اسی مقصد کے مطابق زندگی گزارنا ہوگی۔

4۔ اس غلام کا آقا اسے جس حال میں رکھے اسے اس بات کا حق نہیں ہوتا کہ وہ حرف شکایت زبان پر لائے وہ ادب اور احترام سے اپنی ضرورتیں اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر سکتا ہے بلکہ شائد آقا کو یہ بات اچھی لگے کہ اس کا غلام اس سے مانگے بلکہ مانگتا رہے۔ لیکن اگر وہ اسے دینا پسند نہ کرے یا اس کی مرضی کے مطابق دینا پسند نہ کرے تو اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف سوچے، زبان کھولے یا دوسروں سے شکایت کرے۔

تاریخ میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مبارک ایک دن اپنے گھر میں بیٹھے تھے کھڑکیوں کے شیشوں سے انہوں نے گلی میں دیکھا کہ ایک نوجوان بار بار کسی کام کے لئے اس یخ بستہ رات میں آ جا رہا ہے۔ انہوں نے اسے غور سے دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس نے اکہرا لباس پہن رکھا ہے اور اوپر کوئی گرم چادر تک نہیں بہت حیران ہوئے۔ نہ رہ سکے اس نوجوان کو اندر طلب کیا پوچھا' صاحبزادے تمہیں سردی نہیں لگتی؟ اس نے عرض کیا' جی لگتی ہے۔ کہا تم نے گرم کپڑے کیوں نہیں پہنے؟ عرض کیا کہ گرم کپڑے میرے پاس نہیں ہیں۔ فرمایا تم کون ہو؟ عرض کیا کہ میں غلام ہوں۔ پوچھا تم نے اپنے آقا سے گرم کپڑے نہ ہونے کی شکایت نہیں کی۔ اس نے حیران ہو کر حضرت عبداللہ ابن مبارک کی طرف دیکھا اور ادب سے عرض کیا کہ حضرت میں غلام ہوں میرے آقا جانتے ہیں کہ میرے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ سردیوں کا موسم ہے۔ اور رات بہت ٹھنڈی ہے اس کے باوجود وہ باہر مجھے کام کے لئے اس حالت مین بھیج رہے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے اسی حال میں دیکھ کر خوش ہیں۔ اب میری غلامی کا یہ تقاضا ہے کہ جس حال میں میرا آقا خوش رہے میں اس کی خوشی میں خوش رہوں اور اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہ لاؤں کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا تو یہ میری غلامی کے آداب کے خلاف ہوگا۔ یہ جواب سن کر حضرت عبداللہ ابن مبارک پھڑک اٹھے۔ فرمایا نوجوان تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور آج مجھے معلوم ہوا کہ غلامی کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ حیرت ہوتی ہے کہ صحابہ کرامؓ زیادہ پڑھے لکھے لوگ نہیں تھے لیکن آنحضرت ﷺ کی صحبت نے ان میں وہ چیزیں پیدا کر دی تھیں کہ برس ہا برس کے مطالعہ کے بعد بھی آدمی بصد مشکل سمجھ پاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک صاحب کو مغرب کی نماز پڑھ کر سلام پھیرتے ہی فوراً مسجد سے نکلتے دیکھا تو آپ کو حیرت ہوئی۔ دوسرے تیسرے چوتھے روز بھی آپ نے اسی طرح اسے نکلتے دیکھا تو آپ نے آواز دے کر اسے بلایا اور پوچھا کہ بھئی تم نماز کے فوراً بعد کیوں چلے جاتے ہو؟ اس نے عرض کی کہ حضور کوئی اور پوچھتا تو میں کبھی نہ بتاتا لیکن

Marfat.com

آپ سے کیسے چھپاؤں؟ بات یہ ہے کہ یہ جو میں اپنے اوپر چادر لے کر آیا ہوں یہی میرے گھر کا کل اثاثہ ہے۔ گھر میں میری بیوی منتظر ہیں کہ میں گھر پہنچوں تا کہ وہ بھی اول وقت میں نماز ادا کرسکیں کیونکہ ان کے پاس کوئی اور چادر نہیں ہے۔ اس لیے میں جلدی چلا جاتا ہوں۔ حضور ﷺ یہ سن کر آبدیدہ ہو گئے اور آپ نے ان کے لیے فراخیِ رزق کی دعا فرمائی۔ وہ صاحب جب گھر پہنچے تو بیوی نے پوچھا کہ آج آپ کچھ تاخیر سے تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے روک لیا تھا۔ بیوی نے پریشانی سے پوچھا کہیں آپ نے بتا تو نہیں دیا۔ انہوں نے کہا کہ بتا آیا ہوں۔ بیوی نے انتہائی پریشانی کے عالم میں کہا کہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس حال میں رکھا تھا ہم اس کے بندے ہیں ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر لائیں۔ آپ نے جو آنحضرت ﷺ سے ذکر کیا کہیں اس کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اپنے اس حال پر صابر و شاکر نہیں ہیں۔

یہ ہے غلامی کا وہ حقیقی مفہوم کہ ہر مسلمان اپنے اللہ کا غلام ہے۔ نہ اس کا جسم اپنا ہے نہ جان نہ اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اپنی ہیں نہ جسمانی قوتیں، نہ اولاد پر اسے حق ملکیت حاصل ہے نہ مال و دولت پر، یہ سب کچھ اللہ کی دَین ہے۔ وہی ان سب کا مالک ہے۔ مسلمانوں کے پاس یہ اس کی دی ہوئی امانت ہے۔ امانت میں ان حدود سے تجاوز کرنا جو امانت رکھنے والے عائد کر دی ہیں یا اپنی مرضی اس طرح استعمال کرنا جو امانت کو ملکیت بنا دے تو یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہے۔ ہم اپنی ان چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کے ہرگز مجاز نہیں۔ زندگی اس نے ہمیں گذارنے کے لیے دی ہے تو گزارنے کے طریقے بھی عطا فرمائے ہیں۔ اس میں اپنی مرضی سے لکیریں کھینچنا، اپنی مرضی سے نقشے بنانا، اپنی مرضی سے اس کے اصول و ضوابط اور آداب وضع کرنا یہ بندگی اور غلامی کے آداب کے خلاف ہے اور پھر اس زندگی کے لیے ازخود نصب العین اور مقصد زندگی متعین کرنا یہ سراسر حدود سے تجاوز ہے۔ اور پھر زندگی کے ہر شعبے کے لیے جو احکام دیئے گئے ہیں انہیں کامل بندگی کے تصور کے ساتھ بجالانے کی بجائے انکے خلاف دل و دماغ کی قوتیں صرف کرنا، اس کے خلاف اپنے اعضاء و جوارح کو حرکت میں لانا بلکہ کھلم کھلا اس کے احکام کے خلاف زندگی کا فیصلہ کرنا یہ سراسر اس کی بندگی اور غلامی سے بغاوت ہے اور پھر وہ تنگی و ترشی، عسر و یسر اور امن اور خوف، جس حال میں بھی رکھے اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر لانا یا اس کے سوا کسی اور کے سامنے دست سوال دراز کرنا اور کسی اور سے امیدیں باندھنا، محبت کسی اور سے کرنا، نفرت کا حوالہ کسی اور کو بنانا، دل کی دنیا کسی اور سے آباد کرنا، زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں اس کی دی ہوئی ہدایت کے برعکس کوئی اور ہدایت قبول کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو اس بندگی اور غلامی کے خلاف ہیں۔

یہ غلامی کا وہ حقیقی مفہوم ہے جس میں کائنات کا ذرہ ذرہ جکڑا ہوا ہے۔ خالق حقیقی وہ غالب و قادر آقا ہے کہ اس کی کائنات کی ہر مخلوق اس کے سامنے سراپا تسلیم و انقیاد ہے جس مخلوق کو جس کام میں لگا دیا گیا ہے اس کی مجال نہیں کہ وہ اس سے سرتابی کر سکے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے کُرّے تک ہر مخلوق اپنی اپنی مفوضہ ذمہ داری ادا کرنے میں سرتاپا مصروف عمل ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

اَللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ (الحج: ۱۸.۲۲)

(اللہ ہی کے لیے جھکے ہوئے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چار پائے اور بہت سے لوگ (سب اسی کے سامنے سجدہ ریز ہیں)

Marfat.com

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○
يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَايُؤْمَرُوْنَ ○ السجدة

(اور اللہ ہی کے لیے سجدہ کر رہے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو کوئی زمین میں ہیں چار پایوں میں سے اور فرشتوں میں سے اور وہ تکبر نہیں کرتے وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہ کرتے رہتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے)

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل: ۱۷.۴۴)

(ہر چیز اس کی تسبیح میں لگی ہوئی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو)

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم: ۱۹.۹۳)

(آسمانوں اور زمین میں جو کوئی ہے وہ اللہ کے پاس غلام بن کے آنے والا ہے)

سورج اس کی غلامی میں چمک رہا ہے۔ چاند اس کی بندگی میں دمک رہا ہے ہر سیارہ اس کی چاکری میں محو حرکت ہے۔ پہاڑ اس کے حکم کی تعمیل میں ایستادہ ہیں۔ زمین اس کی اطاعت میں بچھی ہوئی اپنا فرض انجام دے رہی ہے۔ فرشتے اس کے احکام کی بجا آوری میں ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف عمل ہیں کائنات کی ہر مخلوق سراپا خدمت و اطاعت ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنی ڈیوٹی سے غفلت یا سرکشی کا شکار نہیں ہوتی۔

مسلمانوں میں عبادت کا غلط تصور

لمحۂ فکریہ، یہ ہے کہ یہ تمام مخلوقات جو اپنی تمام تر قوت و شوکت کے باوجود حضرت انسان کے لیے مسخر و مطیع اور تابع فرمان بنادی گئی ہیں اور انسان کو نہ صرف ان سے خدمت لینے کا حق دیا گیا ہے بلکہ کائنات کی پاکیزہ ترین مخلوق یعنی فرشتوں کا اسے مسجود بنادیا گیا ہے اور اشرف المخلوقات کا طغرہ اس کے سر پر سجایا گیا ہے۔ وہ مخلوقات تو اپنے خالق و مالک کی ہمہ وقت اور ہمہ نوع بندگی و غلامی میں مصروف ہیں اور یہ اشرف و اعلیٰ کہلانے والا بندگی و غلامی تو رہی ایک طرف بالعموم معصیت و نافرمانی بلکہ سرکشی و بغاوت پر تلا رہتا ہے۔ اس کی شرافت و فضیلت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ بندگی و اطاعت میں باقی تمام مخلوقات سے بڑھ جاتا بلکہ پروردگار کی طرف سے بھی اس پر دوسری مخلوقات سے بڑھ کر بندگی و غلامی کی ذمہ داریوں کا بار ڈالا جاتا جبکہ ہمارے یہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ صرف یہی عبادات ہیں ان پر عمل کر لینے سے عبادت کا حق ادا ہو جاتا ہے یعنی زندگی کے شب و روز میں سے نماز کے چند اوقات بارہ مہینوں میں رمضان کا ایک مہینہ پوری زندگی میں حرمین کی بقصد حج ایک دفعہ کی حاضری اور دولت کی بہتات میں بھی سال بہ سال اڑھائی فیصد زکوٰۃ کی ادائیگی یہ وہ پروردگار کے حقوق ہیں جن کے ادا کرنے سے عبادت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ یہی وہ غلط فہمی ہے جس نے ہماری اجتماعی زندگی کو عبادت کے ہمہ نوعی اثرات سے محروم کر دیا ہے حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہماری زندگی مہد سے لحد تک عبادت کی ذمہ داریاں رکھتی ہے۔ قبل از بلوغ ماں باپ کے واسطے سے یہ ذمہ داریاں ادا ہوتی ہیں اور بعد از بلوغ ہر مرد و عورت کی مکلف زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ جس میں جوانی کی جولانیاں بھی ہیں، صلاحیتوں اور توانائیوں کا امتحان بھی ہے۔ قلب و ذہن کی رعنائیوں کا نشیب و فراز بھی ہے۔

Marfat.com

محبتوں کی ہماہمی بھی ہے' تنہائیوں کا سوز وگداز بھی ہے۔ ذمہ داریوں کے بار بھی ہیں۔ اور فارغ البالیوں کی سرمستیاں بھی ہیں۔ ڈھلتی ہوئی عمر کا سوز وگداز بھی ہے اور دم توڑتی ہوئی صلاحتیوں کا خمار بھی ہے ان تمام حوالوں سے عبادت اپنا مفہوم رکھتی ہے اور ان تمام بدلتے ہوئے حالات میں پروردگار کے احکام کی اطاعت فی الحقیقت وہ عبادت ہے جس کے بارے میں کل کو سوال ہوگا آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن جب ہم میں سے ہر فرد بارگہ حق میں حاضر ہوگا تو زمین ہمارے پاؤں جکڑ لے گی اور اس وقت تک نہیں چھوڑے گی تاوقتیکہ پانچ باتوں کا جواب نہیں دے دیا جائے گا۔ پوچھا جائے گا زندگی کیسے گذار کے آئے ہو جوانی کس طرح کے کاموں میں صرف کی۔ مال کس طرح کمایا اور کہاں خرچ کیا اور علم حاصل کیا یا نہیں اگر کیا تو اس کا کیا حق ادا کیا۔ یعنی زندگی کے ایک ایک لمحے' نعمتوں میں سے ایک ایک نعمت اور توانائیوں اور صلاحیتوں سے ایک ایک توانائی اور صلاحیت اور عہدہ ومناصب میں سے ایک ایک منصب کا حساب ہوگا۔

دست درازیوں کا بھی حساب ہوگا اور کوتاہیوں کا بھی دل ودماغ کی کج اندیشیوں کے کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا اور نگاہوں کی خیانتوں کے بارے میں بھی قدموں کے حدود سے تجاوز کا بھی حساب ہوگا اور تساہل وتغافل اور لغزش قدم کا بھی مال ودولت کے حوالے سے حرام ذرائع اختیار کرنے پر بھی باز پرس ہوگی اور بخل واسراف پر گرفت بھی جھونپڑے والا اگر احتساب سے گذرے گا تو تخت وتاج کا مالک بھی اس سے بچ نہ سکے گا۔ رند ومست اگر پکڑا جائے گا تو عابد وزاہد بھی خشوع وخضوع کا حساب دیے گا۔ غرضیکہ انسان کو ہمہ وقتی اور ہمہ نوعی عبادت کا مکلّف بنایا گیا ہے جس میں زندگی کا ہر شعبہ اور ہر ذمہ داری شامل ہے۔

نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو عبادت کہنے سے اسلام کی مراد

اسلام نے اگرچہ نماز روزہ حج اور زکوٰۃ کو عبادت کا نام دیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی عبادات ہیں۔ ان کو عبادت کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ اس طرح کی عبادات ہیں کہ ان کو فہم وشعور سے ادا کرنے والا باقی زندگی کو بھی اسی ڈھب پر لے آتا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسے افعال ہیں جو از اول تا آخر خالصتاً تسلیم وانقیاد اور حضوریِ حق سے عبارت ہیں جبکہ باقی زندگی کا ہر کام اطاعت خداوندی سے عبادت بنتا ہے۔ یہی وہ غلط فہمی ہے جو بعض صحابہ کو بھی ہوئی انہوں نے صرف انہیں افعال واعمال کو دینداری اور عبادت سمجھ کر اور باقی معاملات کو دنیاداری جان کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم راتیں نماز میں گزاریں گے اور دن روزے میں۔ اور بیویوں سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے دیکھو میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں میں روزے بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں میں نکاح بھی کرتا ہوں اور بیویوں سے تعلق بھی رکھتا ہوں یہ میرا طریقہ یعنی میری سنت ہے جس نے میرے طریقے کی پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے ایسا نہ کیا اس کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں عجیب بات تو یہ ہے کہ کھانا پینا جو سراسر ایک دنیاداری ہے قرآن کریم نے اسے بھی دینداری اور عبادت قرار دیا۔ ارشاد خداوندی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَارَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ O (البقرة ۲: ۱۷۲)

(اے مومنو! کھاؤ ان پاکیزہ نعمتوں میں سے جو اللہ نے تمہیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر بجا لاؤ اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہتے ہو)

تو غور فرمایئے اس آیت میں پاکیزہ نعمتوں کے کھانے اور ان پر شکر بجالانے کو عبادت قرار دیا ہے۔

Marfat.com

مندرجہ بالا گزارشات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ہمیں جس عبادت کا حکم دیا گیا ہے اور وہی ہماری تخلیق کا مقصد بھی ہے وہ ایک ہمہ وقتی عبادت ہے جو پوری زندگی پر حاوی ہے اور جس میں زندگی کا ہر شعبہ داخل ہے۔ اس پوری زندگی کی عبادت سے انسان باقی تمام مخلوقات بالخصوص ملائکہ کا ہم پلہ ہو جاتا ہے مگر انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا تقاضہ تو اس سے کچھ سوا کا تقاضہ کرتا ہے کیونکہ:

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

اس کی شرافت وفضیلت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کی عبادت میں کوئی ایسی حقیقت کارفرمائی ہونی چاہیے جو باقی مخلوقات پر اس کا افضل ہونا مبرہن کردے۔

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دو بنیادی وجوہات

اس حوالے سے جب غور کرتے ہیں تو دو حقائق ہمارے سامنے کھلتے ہیں جو انسان کے افضل واعلیٰ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات جن وانس کے علاوہ ایسی ہیں جن کے بارہ یہ بات مسلم ہے کہ قدرت نے انہیں ارادہ و اختیار کی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا۔ ان کی اطاعت وعبارت جیسی کچھ بھی ہے اس مین ان کے اختیار کا کوئی دخل ہیں۔ انہیں انکار کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں کیا گیا بلکہ وہ اپنی فطرت اور جبلت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت اور تسلیم وانقیاد پر مجبور ہیں۔ مگر اس کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ اسے اس بات کی آزادی دی گئی ہے اور حق وباطل کے اختیار اور خیر وشر کے امتیاز میں اسے آزاد چھوڑا گیا ہے کہ دونوں میں جسے چاہو اختیار کرو۔ اسی طرح احکام کی اطاعت میں بھی کوئی اضطرار نہیں بلکہ یہ اختیار دیا گیا کہ چاہو تو اطاعت کا راستہ اختیار کرو چاہو تو معصیت کا۔ اس قوت تمیز اور اختیار کی آزادی کے صحیح استعمال پر اجر وثواب کی امید دلائی گئی اور غلط استعمال پر سزا اور عذاب کی تہدید سنائی گئی۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اس اختیار اور آزادی کے مزید امتحان کے لیے انسان کے اندر مکروہات ومنکرت اور فواحش کی خواہش اور ہوس کو بھی پیدا کیا گیا۔ اب جو آدمی خواہشات ومرغوبات اور امیدوں اور آرزوؤں کے کانٹوں سے دامن بچا کر ارادہ واختیار کے صحیح استعمال سے معصیت و نافرمانی اور سرکشی وبغاوت کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے عبادت وبندگی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کے افضل واعلیٰ ہونے میں کیا شبہ ہے؟ فرشتہ کبھی گناہ نہیں کرتا۔ اس لیے اکہ اس میں گناہ کے لیے رغبت ہی نہیں وہ کبھی انحراف اور سرکشی کا رویہ اختیار نہیں کرتا اس لیے کہ اس میں اس کی طاقت وصلاحیت ہی نہیں وہ شرم وحیا کا پیکر بن کر پاکدامنی کی علامت بن جاتا ہے اس لیے کہ اس میں خواہش نفس کا وجود ہی نہیں۔ مگر جب یہی صفات انسان اختیار کرتا ہے تو بجا طور پر یہ اس کے لیے باعث شرف ہے کیونکہ وہ خواہش نفس کا شکار ہے وہ معصیت کی طرف رغبت رکھتا ہے وہ حُبِّ دنیا اور ہوسِ زر کا اسیر ہے۔ وہ طاقت اور گھمنڈ کا رسیا ہے۔ وہ عہدہ ومنصب کا نخچیر ہے۔

دوسری حقیقت جس نے انسان کو شرافت وفضیلت کے تخت پر فائز کیا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق نے صرف عبادت کی ہے یعنی احکام کی اطاعت کی ہے۔ زندگی بھر اس سے انحراف نہیں کیا۔ سجدہ وقیام اور رکوع وقعود میں رہ کر بندگی کا حق ادا کیا ہے اور یہ بھی بلاشبہ متاع بے بہا ہے مگر انسان نے صرف بندگی نہیں کی بلکہ کچھ اور بھی کیا ہے۔ اس نے صرف اطاعت وبندگی میں میں سر ہی نہیں جھکایا بلکہ برگشتہ سروں اور تنی ہوئی گردنوں کو اپنے مالک کے سامنے جھکنے پر مجبور بھی کیا ہے۔ اس کے لیے وطن چھوڑا ہے گھر سے بے گھر ہوا ہے اولاد کی قربانی دی ہے۔ دنیا بھر سے لڑائی لڑی ہے۔ دنیا کے ہر خطے کو اپنی سرفروشی وجانفشانی سے زندگی بخشی ہے۔ اور اس شمع کو لے کر ہر اس جگہ پہنچا ہے جہاں دھرتی پانی دیتی ہے اور جہاں انسان کی اولاد بستی ہے پھر کبھی اس راستے میں مال لٹایا ہے کبھی پسینہ بہایا ہے اور کبھی خون دیا ہے بقول اقبال:

Marfat.com

مقامِ بندگی دیگر مقامِ عاشقی دیگر
زنوری سجدہ مے خواہی زخاکی بیش ازاں خواہی
ازاں خودرا نگہ داری کہ باایں بے نیازی ہا
شہادت بروجودِ خود زخونِ دوستاں خواہی

یہ عبادت کی اعلیٰ اور برترین صورت ہے جو حضرت انسان کے لئے ودیعت کی گئی اور جس کا نام عاشقی اور شہادت رکھا گیا۔ اس میں ایک طرف انسان اپنے جسم و جان قوت و صلاحیت عقل و دانش، مال و دولت اور ارادہ و اختیار سے اپنے مالک حقیقی کے لیے دستبردار ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے لیے فیصلوں کا حق انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسی کو تفویض کرتا ہے اور بندگی و عبودیت کی تصویر بن کر راضی بہ رضا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف اگر ضرورت پڑتی ہے تو بدیۂ جان لے کر اس کی بارگاہ میں پیش کر دیتا ہے اور اگر یہ بدیہ قبول کر لیا جاتا ہے تو پکار اٹھتا ہے ''فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ'' اور اس کامل تر بندگی و عبادت کو وہ حقیقی زندگی سمجھتا اور کامیابی و کامرانی کی ضمانت جانتا ہے۔ بقول اقبال:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

حاصل کلام یہ کہ عبادت اپنی بندگی و عبودیت کا نذرانہ حضورِ حق میں صرف اسی کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے پیش کرنے کا نام ہے مگر اس میں مدارج اور مراتب ہیں، جن و انس کے علاوہ باقی مخلوقات کی عبادت اضطراری عبودیت یا بے اختیار غلامی ہے اور جنوں کی عبادت اگرچہ بالاختیار عبودیت ہے یعنی وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالاتے ہیں اور اس میں انسانوں ہی کی طرح کامل فدویت امتثال امر انکساری اور فدائیت کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ مگر انسانوں کو اپنی عبادت میں ایک اختصاص اور امتیاز حاصل ہے وہ یہ کہ حضرت انسان ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا غلام بے دام غلام اور بندۂ حقیر ہے مگر دوسری طرف وہ زمین پر اپنے مالک و آقا کا خلیفہ بھی ہے۔ اس لیے اس کے اندر عبودیت و فدائیت اور عشق و سرمستی کے ساتھ ساتھ حق خلافت کی ادائیگی کے لیے ایک اولوالعزمی بھی پائی جاتی ہے۔ جس کا حق وہ نوع بہ نوع ایثار و قربانی اور بالآخر راہِ حق میں اپنے خون کا آخری قطرہ بہا کر ادا کرتا ہے اور اسی وجہ سے جنوں اور فرشتوں سمیت تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ ہونے کا شرف پاتا ہے۔

حاصلِ کلام!

ہماری اب تک کی گزارشات سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ عبادت زندگی کا ایک ایسا مجموعی اور ہمہ گیر عمل ہے جس کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے بھی ہے اور اس کی اجتماعی زندگی سے بھی۔ زندگی کا کوئی دائرہ اس سے باہر نہیں۔ اسی طرح زندگی کا کوئی شعبہ اور زندگی کا کوئی ہدف اس سے آزاد نہیں۔ افراد انسانی تمام تر تنوعات کے باوجود عبادت کے پابند ہیں۔ اور مزید یہ بات کہ جس طرح عبادت پوری انسانی زندگی پر محیط ہے اسی طرح وہ زندگی کا سب سے مشکل کام بھی ہے اس میں جسمانی صلاحیتیں بھی صرف ہوتی ہیں اور دماغی رعنائیاں بھی کام میں لانا پڑتی ہیں۔ خواہشات کی قربانی بھی دینا پڑتی ہے اور حوصلوں کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ حتیٰ کے بعض دفعہ نقد جان بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔ اور

Marfat.com

انفرادی اور اجتماعی زندگی سے گزر کر قومی اور ملی زندگی کو بھی اس میں شریک ہونا پڑتا ہے کیونکہ عبادت کا عمل جس طرح شہادت کے راستے سے گزرتا ہے اسی طرح خلافت کی گراں باریاں بھی رکھتا ہے سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس عمل کی وسعتوں کا یہ عالم ہو اور جس کی گراں باریوں اور مشکلات بے نہائت اور بے اندازہ ہوں کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اور اپنی ہمتوں پر اعتماد کرتا ہوا اس گھاٹی کو سر کر لے۔ یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا۔ لازمی بات ہے کہ اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور اس کے حقوق کی ادائگی کیلئے اسی ذات کو پکارا جائے اور اسی سے مدد مانگی جائے۔ جس کی عبادت کا جذبہ اور جس کی بندگی کی وارفتگی اس دروازے تک کھینچ لائی ہے۔ اس لیے جب ایک بندہ بندگی کے جذبے سے سرشار ہو کر ایاک نعبد کہتا ہے تو عبادت کی حقیقت اور وسعت کو محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہماری محولہ بالا گزارشات سے یہ بات بھی واضح ہوگئی ہوگی کہ عبادت فی الحقیقت اللہ کی بندگی اور غلامی کا نام ہے اور غلامی بھی ایسی جس کے بعد ہر آستانے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اور ہر چوکھٹ سے گردن آزاد ہو جاتی ہے۔ لمحہ فکریہ یہ ہے کہ جب ایک بندہ ہر غلامی سے آزاد ہو کر صرف اللہ ہی کی غلامی کا قلادہ گلے میں ڈال لیتا ہے اور وہ ہر ایک سے تعلق توڑ کر اللہ کا ہو جاتا ہے تو کیا ایسے غلام کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے آقا کے علاوہ استعانت کیلئے کسی اور دروازے پر دستک دے۔ وہ ضرورت مند ہو تو ضرورتیں کسی اور آقا کے پاس لے کر جائے۔ اسے دکھ اور غم گھیر لیں تو مدد کیلئے کسی اور کو پکارے۔ جب اس کے سب ظاہری سہارے جواب دے جائیں تو وہ کسی اور کو آواز دے۔ ایسا کرنا یقیناً اس کی غلامی کے تصور کے خلاف ہے اور اس کے آقا کی توہین ہے۔ اس لئے جب بندہ ایک اللہ کی غلامی کا اعتراف کرتا ہے تو پھر وہ اپنا کشکول بھی توڑ دیتا ہے اس کے ارادوں کی کمزوری قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی غلامی کو ایسی سربلندی ملتی ہے کہ بادشاہون کی رعونتیں بھی اس کے سامنے دم توڑنے لگتی ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی قوت سے بھی مرعوب ہونے سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میری غلامی کا رشتہ اس ذات سے ہے جو شہنشاہ کائنات اور آقائے کل ہے۔ جہاں تک اسباب کی دنیا کا تعلق ہے وہ لین دین تکافل وتعاون اور اعانت واستعانت میں بالکل دوسرے انسانوں کی طرح ہوتا ہے لیکن ماورائے اسباب کسی طاقت کے سامنے اللہ کے سوا کبھی ہاتھ نہیں پھیلاتا اگر اسباب ٹوٹنے لگیں اور ظاہری سہارے جواب دینے لگیں تو وہ پریشان ہونے کی بجائے مسبب الاسباب کو پکارتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کائنات میں سب سے بڑی ذات اللہ کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ لیکن وہ بھی جنگ بدر میں رات بھر اللہ سے مانگتے رہے اور پھر جب اس کی طرف سے مدد اور نصرت کا پیغام پہنچ گیا تو پھر اسی کی مدد سے مسلح ہو کر ریت سے مٹھی بھر کر پھینکی اور دشمن کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور قرآن کریم نے اس خیال سے کہ کہیں لوگوں کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ جس مٹھی بھر ریت نے فوج کے قدم اکھاڑے ہیں اس کے پیچھے شاید اللہ کے رسول ﷺ کی قوت کارفرما تھی ارشاد فرمایا:

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ۚ (الانفال: ۸.۱۷)

(اے پیغمبر آپ نے جو مٹھی پھینکی وہ آپ نے نہیں پھینکی وہ تو اللہ نے پھینکی)

Marfat.com

اللہ کے ولیوں سے دعا کروانا اور برکت حاصل کرنا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے معجزات اور اللہ تعالیٰ کے ولیوں کی کرامات درحقیقت انبیا اور اولیاء کے ذاتی اعمال نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے ذریعے سے اللہ کی قوت کا اظہار ہوتا ہے ان کے ہاتھ کو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کی نگاہوں میں ان کی حیثیت اور عظمت واضح ہو جائے ورنہ ہر مشکل وقت میں اللہ کے نبی اور ولی اللہ ہی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور مدد کے طلب گار ہوتے ہیں اللہ کے ولیوں سے دعا کیلئے کہنا اور ان سے برکت حاصل کرنا یہ قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ کیونکہ اس سے مقصود اللہ ہی سے مدد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس لئے کسی اللہ کے بندے کے پاس جائے کہ وہ ذاتی طور پر اللہ تعالیٰ کے اختیارات کا مالک ہے تو اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ جس طرح اِيَّاكَ نَعْبُدُ سے ہر طرح کی غلامی اور بندگی کا جواز ختم ہو گیا اسی طرح وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے ماورائے اسباب ہر طرح کی مدد طلب کرنا ناجائز ٹھہرا اور اس تصور نے جس طرح انسان کو ہر آستانے سے بے نیاز کر دیا اور اس کے اندر وہ فکری توانائی پیدا کی جو ایک مرد مومن کی علامت ٹھہری اسی طرح اس کی ہر کمزوری کا علاج کر دیا وہ تمام سہاروں سے بے نیاز ہو کر محض اللہ کے سہارے پر اس طرح زندگی گزارتا ہے کہ مشکل سے مشکل ماؤف لمحوں میں بھی کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ اسے موت بھی آئے تو وہ اسے اللہ کا پیغام سمجھ کر مسکراتا ہوا قبول کرتا ہے۔

اعتراف سے دعا تک کا سفر

سورۃ الفاتحہ کے آغاز سے وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تک پورا سفر ایک بندے کے اقرار واعتراف کا سفر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمت اور اس کے مسلسل نظام ربوبیت کے ساتھ ساتھ جب اس کی رحمت کو اپنے اندر باہر دائیں بائیں بلکہ پوری کائنات میں پھوار کی طرح برستا ہوا دیکھتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے حمد وثنا کا نغمہ جاری ہو جاتا ہے۔ پھر اسی کیفیت میں جب وہ اپنی اور مخلوقات کی زندگیوں میں قانون مکافات کو جاری وساری پاتا ہے تو اللہ کی صفت عدالت اور اس کی ہمہ گیر حاکمیت کا تصور اس کے ذہن میں ابھرنے لگتا ہے یہ دونوں تصورات جب اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں کہ ایک طرف وہ اللہ کی حمد وثنا میں ڈوبا ہوا ہے اور دوسری طرف قانون مکافات اس کی فکر مندیوں میں اضافہ کر رہا ہے تو وہ بے ساختہ اللہ کے آستانے پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اسی کی بندگی اور غلامی اور اسی سے استعانت اس کی زندگی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔ یہی اس کیلئے پناہ گاہ بھی ہے اور اس کے قلب وضمیر کیلئے فرحت بخش بھی۔ وہ بندگی کے اعتراف سے سرشار ہوتا ہے تو توکل واعتماد اس کی شخصیت میں پختگی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن جب ان احساسات کے ساتھ وہ اللہ کی بندگی کیلئے زندگی کے کٹھن راستوں پر سفر کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنی فکری شخصیت کی تعمیر کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ یہاں قیاسی فلسفوں نے اس قدر دھول اڑائی ہے کہ حقیقت نفس الامری کا سراغ لگانا بہت مشکل ہو گیا ہے پھر وہ انسانی زندگی کے دروبست کو سمجھنا چاہتا ہے تو اسے یہ دیکھ کر پریشانی ہوتی ہے کہ صحیح نظام اخلاق کی بنیادیں تلاش کرنا ہی ایک مشکل کام ہو گیا ہے چہ جائیکہ اس پورے نظام کو تلاش کیا جائے۔ پھر وہ انسانی احساسات، انفعالات، خواہشات اور مزعومات کی دنیا کو سنوارنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کیلئے اسے بے شمار پگڈنڈیوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ پریشانیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ایک طرف اس کے اندر کا بے پناہ جذبہ ہے جو اسے بندگی کے سفر پر رواں دواں رکھنا چاہتا ہے اور دوسری

Marfat.com

طرف متذکرہ بالاسفر کی دشواریاں ہیں جو اسے ایک ایک قدم اٹھانے سے روکتی ہیں۔اب تک تو اقرار واعتراف کے جذبات نے اسے یہاں تک پہنچایا تھا لیکن اب جب وہ اپنے سامنے کوئی راستہ کھلتا ہوا نہیں دیکھتا تو مجبوراً یا بے ساختہ اقرار واعتراف کے اسلوب سے ہٹ کر وہ دعا کا اسلوب اختیار کرتا ہے اور اپنے پروردگار سے وہ دولت مانگتا ہے جو اس کی زندگی کیلئے کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔اسکے دل سے آواز اٹھتی ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ (الفاتحة ۱:۶)

(یا اللہ ہمیں وہ سیدھی راہ دکھا جو ہمیں تیری رضا تک پہنچا دے)

یہاں پہنچ کر جب ہم پلٹ کر سورۃ فاتحہ میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت ربوبیت کو دیکھتے ہیں۔تو فوراً ذہن کے افق پر اس کی صفت ربوبیت کی وہ وسعتیں روشن ہو جاتی ہیں جس کا ذکر پروردگار نے کتاب پاک میں تفصیل سے کیا ہے۔ان ساری تفصیلات کو سمیٹنا تو ہم جیسے عاجز لوگوں کے بس کا کام نہیں البتہ اسے سمجھنے کیلئے مختصر گزارشات پیش خدمت ہیں۔

تکوین وجود کے چار مراتب

خالق کائنات نے اپنی آخری کتاب میں تکوین وجود کے چار مراتب بیان فرمائے ہیں۔خلق،تسویہ،تقدیر اور ہدایت۔کائنات کی ہر مخلوق کا عدم سے وجود میں آنا اس کی صفت خلق کا اظہار ہے۔مگر ہر مخلوق کا اس طرح پیدا کیا جانا جس طرح اسے ہونا چاہئے تھا اور اس کے نک سک کا درست ہونا اور اس میں انتہا درجہ کا تناسب پایا جانا اور ہر طرح سے اپنے ماحول سے اس کا مناسبت رکھنا اور ماحول کا اس کے ساتھ مناسب ہونا یہ وہ چیز ہے جو کو تسویہ کہا گیا ہے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی ہر مخلوق اپنے وجود کے اعتبار سے اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس کا جسم اور اس کا ماحول باہم دگر ایک دوسرے کیلئے معاون ومددگار بن گئے ہیں۔پرند ہوا میں اڑتے ہیں تو انہیں پر عطا کئے گئے۔مچھلیاں پانی میں پیدا ہوتی ہیں تو انہیں تیرنا سکھایا گیا۔حشرات الارض کوڑا کرکٹ میں پیدا ہوتے ہیں تو انہیں رینگنا سکھایا۔مچھلی خشکی میں پیدا نہیں کی گئی۔پرندے پانی میں پیدا نہیں کئے گئے اس لئے کہ ان کا جسمانی تناسب اس کی اجازت نہیں دیتا۔پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر مخلوق کیلئے یہ پہلے سے طے کر دیا گیا کہ اسے کس طرح کا کام انجام دینا ہے؟اس کی حدود کار کیا ہوں گی؟اس کی قوتِ عمل کس طرح کی ہوگی؟اسے کب تک کس حال میں رہنا ہے؟اور کس حد تک اپنے کام کو انجام دینا ہے؟اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟اور اس مقصد کو بروئے کار لانے کیلئے اسے کون سی صلاحیت درکار ہے؟یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کریم میں تقدیر کا نام دیا گیا ہے۔چنانچہ سورج کو پیدا کیا گیا تو اس کا مقصدِ وجود مقرر کر دیا گیا۔چاند کو پیدا کیا گیا تو اس کے عمل کا ایک دائرہ ٹھہرا دیا گیا۔ستارے بنائے گئے تو انہیں ان کی ڈیوٹیاں سمجھا دی گئیں۔نباتات سے لے کر آسمان کی ہر مخلوق تک ہر ایک کیلئے ایک تقدیر بنا دی گئی۔چنانچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ سورج اپنے دائرہ کار سے باہر نکل جائے اپنے مقصد وجود یعنی کائنات کو روشنی دینے اور گرمی پہنچانے سے رک جائے۔یہ ممکن نہیں کہ چاند اپنی حلاوت سے اہل زمین کو محروم کر دے۔یہ نہیں ہو سکتا کہ ستارے جھلملانا چھوڑ دیں۔یہ ناممکن ہے کہ پھول خوشبو دینے اور پانی پیاس بجھانے سے انکار کر دے۔ہر ایک اپنے اپنے کام پر لگا ہوا ہے اور انہیں اپنا مقصدِ وجود اور دائرہ کار اچھی طرح معلوم ہے اور اگر شعور کی آنکھ سے مزید کام لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تمام مخلوقات کو یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ تمہیں اپنے اپنے فرائض کس طرح انجام دینا ہیں۔مچھلی کو اگر پانی میں تیرنے کا حکم دیا گیا تو ایسا نہیں کہ اسے تیرنا نہ سکھایا گیا ہو۔پرند کیلئے اگر ہوا میں اڑنا مقدر کیا گیا تو ایسا نہیں ہے کہ اسے اڑنے کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔سورج،چاند اور ستاروں کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ انہیں اس کی ہدایت نہ دی گئی ہو۔قرآن کریم کہتا ہے :

Marfat.com

لَاالشَّمْسُ یَنْبَغِیْ لَھَآ اَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّھَارِ ؕ (یٰسٓ ۴۰: ۳۶)

(سورج کی مجال نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور رات کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ دن سے آگے بڑھ جائے، ہر ایک کا اپنا دائرۂ کار ہے اور اپنے دائرے میں مصروف عمل ہے)

اس کی ہدایت کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی دکھائی نہیں دیتی کہ اسے وجود ملا ہو اور وہ غایتِ وجود سے بے خبر ہو اور پھر اس کو روبعمل لانے سے وہ بے بہرہ ہو۔ اس نے کلیوں کو پیدا کیا ہے تو انہیں چٹکنا بھی سکھایا۔ اس نے پھول کو پیدا کیا تو اس کو مہکنا بھی سکھایا۔ اس نے درختوں کو پیدا کیا تو انہیں لہکنا بھی سکھایا۔ اس نے ستاروں کو پیدا کیا تو انہیں جھلملانا اور ٹمٹمانا بھی سکھایا ہے۔ اس نے بادل کو پیدا کیا تو اسے کڑکنا بھی سکھایا۔ اس نے رعد کو گرجنا اور بجلی کو کوندنا بھی سکھایا۔ اس نے پرندے کو چہکنا اور ہوا کو چلنا سکھایا۔ اس نے آگ کو جلانا اور پانی کو بہنا سکھایا۔ اس نے حسن کو مچلنا اور عشق کو پگھلنا سکھایا۔ غرضیکہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جسے اس نے تقدیر اور ہدایت سے نہ نوازا ہو۔ حتیٰ کے غور و فکر کے اگر چند اوراق الٹے جائیں تو بعض چیزیں ایسی سامنے آتی ہیں کہ آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مچھلیوں میں سے دو کا سفر بہت حیرت انگیز ہے۔

1۔ سامن مچھلی

یہ اگر کسی ندی میں پیدا ہو تو جوان ہونے کے بعد یہ پہلے دریا میں اور وہاں سے سمندر میں چلی جاتی ہے اور وہاں مدتوں رہتی ہے اور جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی موت قریب آگئی ہے تو وہ واپس چل پڑتی ہے۔ یہ سمندر اور دریا سے ہوتی ہوئی ندی کے اس مقام پر جا رکتی ہے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ اگر وہ دوران سفر کسی غلط ندی کی طرف مڑ جائے تو اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ واپس آجاتی ہے۔

2۔ ایل مچھلی

یہ کسی ندی میں ہو یا دریا میں جوان ہونے کے بعد اپنے وطن سے چل پڑتی ہے اور ہزاروں میل دور جزائر برمودہ (اوقیانوس) میں چلی جاتی ہے۔ وہاں بچے دے کر مر جاتی ہے یہ بچے وہاں سے چل کر اپنی ماں کے وطن میں آجاتے ہیں اور وہاں سے پھر جزائر برمودہ میں پہنچ کر پہلے بچے دیتے ہیں بعد ازاں مر جاتے ہیں۔

ہدایت کے چار مراحل

تکوین وجود اور تکمیل وجود کے یہ چار مراحل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو پیدا فرمایا پھر اس کا تسویہ کیا، پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کر دی اور پھر اسے اس کی تقدیر کے مطابق زندگی اور معیشت کی راہ پر چلنے کا طریقہ سکھایا۔ یعنی ہدایت عطا فرمائی۔

ہدایت الہام

1- اس ہدایت پر اگر غور کیا جائے تو اس کے چار طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ نباتات میں یہ ہدایت فطری رہنمائی کا درجہ رکھتی ہے جس کے نتیجے میں بیلیں زمین پر پھیلتی، پودے سر اٹھاتے، درخت تن کر کھڑے ہوتے ہیں پھر ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ہدایت

Marfat.com

کے مطابق برگ وبار لاتا اور پھل اور پھول دیتا ہے۔لیکن حیوانات میں ہم اس فطری ہدایت کو اندرونی الہام کی شکل میں دیکھتے ہیں کہ ہر حیوان کا بچہ ادھر پیدا ہوتا ہے ادھر کوئی الہام کرنے والا اسے یہ الہام کرتا ہے کہ تیری غذا ماں کے سینے میں یا تیرے قریب ہی رکھ دی گئی ہے وہاں سے تجھے اس طرح حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ ہم بلی کے بچے کو دیکھتے ہیں کہ ابھی اس نے آنکھیں کھولی نہیں اور خارج کے موثرات نے اسے چھوا تک نہیں مگر وہ اپنی ماں کی چھاتی کو ٹٹولتا ہے اس پر منہ مارتا ہے اور پستان کو منہ میں لے کر چوسنے لگتا ہے اور بلی فرطِ محبت سے اسے چاٹ رہی ہے۔ آپ نے بلی کو دیکھا ہوگا جسے اس سے پہلے بچے کو جننے کا کوئی تجربہ نہیں ہے مگر جیسے ہی اس کے وضع حمل کے دن قریب آتے ہیں وہ الگ تھلگ کونے کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے اور پھر کسی الگ کونے کو عافیت کی جگہ سمجھتے ہوئے بیٹھ جاتی ہے اور بچے جن دیتی ہے اور پھر وہ جس طرح اپنے بچوں کی نگہداشت کرتی ہے اور ایک موہوم خطرہ محسوس کرتے ہوئے مختلف جگہیں بدلتی ہے یہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ کوئی اندرونی الہام ہے جو اسے ہر معاملہ کی ہدایت دے رہا ہے۔خود انسان کا بچہ جو جانوروں کے بچوں سے بھی زیادہ بے بس ہوتا ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے کہ:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ (النحل ۱۶: ۷۸)

''وہ ذات ہے جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حال میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔''

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی ماں کی مامتا بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگاتی ہے اور وہ ماں کی چھاتی کے ساتھ منہ مارنے لگتا ہے اور پستان منہ میں لے کر چوسنے لگتا ہے تاکہ اپنی غذا حاصل کرسکے۔سوال یہ ہے کہ آخر اس بچے کو یہ کون سکھاتا ہے کہ تیری غذا ماں کی چھاتی میں ہے اور تجھے اس طرح اسے چوسنا ہے یہ وہ اندرونی الہام ہے جس کے ذریعے انسان کو سب سے پہلی ہدایت دی جاتی ہے۔

ہدایت حواس

2- ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرکاتِ ذہنی کی ہدایت ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اس جوہر دماغ سے محروم ہیں جسے عقل وفکر سے تعبیر کیا جاتا ہے تاہم فطرت نے انہیں ادراک واحساس کی وہ تمام قوتیں دے دی ہیں جن کی زندگی ومعیشت کیلئے ضرورت تھی اور ان کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد وتناسل اور ہدایت ونگرانی کے تمام فرائض حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔پھر حواس وادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کیلئے ایک ہی طرح کی نہیں بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی جیسی استعداد اس کے احوالِ فطرت کیلئے ضروری تھی۔چیونٹی کی قوتِ شامہ نہایت دوررس ہوتی ہے اس لئے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کرتی ہے،چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار نہ دیکھ سکیں یہی وہ ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ارشاد کیا گیا ہے فرعون نے جب پوچھا:

فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (طٰهٰ ۲۰: ۴۹)

(اے موسیٰ تمہارا پروردگار کون ہے؟) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰهٰ ۲۰: ۵۰)

(ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اسے ہدایت دی)

Marfat.com

یعنی اس پر زندگی اور معیشت کی راہ کھول دی۔ پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دوسری جگہ راہ عمل آسان کر دینے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝
ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ۝ (عبس ۸۰: ۱۸۔۲۰)

(اس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا۔ نطفہ سے پیدا کیا پھر اس کی تمام ظاہری اور باطنی قوتوں کیلئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اس پر زندگی اور عمل کی راہ آسان کر دی)

ہدایت کے یہ دو مرتبے ہوئے جسے ہم ہدایتِ الہام اور ہدایتِ حواس کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان سب کیلئے ہیں۔ الہام کی ہدایت انسان اور حیوان میں سعی وطلب کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ حواس کی ہدایت کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے۔ یہ ہمیں دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی قوتیں بخشتی ہیں اور انہی کے ذریعے ہم خارج کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ ہدایت ہمارے لئے معلومات بہم پہنچاتی ہے۔

جوہر عقل

3- حیوان کیلئے تو ہدایت کے یہ دونوں مرتبے کافی ہیں۔ کیونکہ اسے زندگی کا جو طریقہ اور جو نصب العین سکھایا گیا ہے اس کیلئے کسی تیسرے مرتبۂ ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن انسان کیلئے ایک تیسرے مرتبۂ ہدایت کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے لئے مجرد احساس کافی نہیں اور نہ صرف محسوسات کا علم اس کیلئے کفایت کرتا ہے۔ انسان کو تو استنباط اور استنتاج کی بھی ضرورت ہے۔ احکام کی بھی ضرورت ہے اور کلیات کی بھی ضرورت ہے۔ اور یہ کام صرف حواس کی ہدایت سے ممکن نہیں۔ اس لئے انسان کو ایک تیسرے مرتبۂ ہدایت سے نوازا گیا۔ یہ وہ ہے جسے جوہرِ عقل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جوہرِ عقل دراصل اسی قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے جس نے حیوانات میں الہام و وجدان اور حواس کی روشنی پیدا کر دی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم اجسام ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے اسی طرح اس کی معنوی قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا برترین جوہر ہے۔ روح حیوانی کا وہ جوہرِ ادراک جو نباتات میں مخفی اور حیوانات کے وجدان و مشاعر میں نمایاں تھا انسان کے مرتبہ میں پہنچ کر درجہء کمال تک پہنچ گیا اور جوہر عقل کے نام سے پکارا گیا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایتِ فطرت کے ان تینوں مرتبوں میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت وعمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور اگر اس مرتبہ سے ایک بلند تر مرتبہ موجود نہ ہوتا تو ہماری معنوی قوتیں اس حد تک ترقی نہ کر سکتیں جس حد تک فطرت کی رہنمائی سے ترقی کر رہی ہیں۔ الہام کی ہدایت ہم میں طلب وسعی کا جوش پیدا کرتی ہے۔ مطلوبات زندگی کی راہ پر لگاتی ہے۔ لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے اس کا ادراک حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ کام حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی راہنمائی جب درماندہ ہو جاتی ہے تو حواس کی دستگیری نمایاں ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتے ہیں، زبان چکھتی ہے، ہاتھ چھوتا ہے، ناک سونگھتی ہے۔ اور اس طرح ہم اپنے وجود کے باہر کی تمام محسوس اشیا کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آنکھ دیکھتی ہے مگر صرف اسی حالت میں جبکہ دیکھنے کی تمام شرطیں موجود ہوں اور اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے۔ مثلاً روشنی نہ ہو یا فاصلہ زیادہ ہو تو ہم آنکھ رکھتے ہوئے بھی ایک موجود چیز کو براہ راست نہیں دیکھ

Marfat.com

سکتے۔علاوہ بریں حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کرسکتی ہے کہ اشیا کا احساس پیدا کردے لیکن مجرد احساس کافی نہیں ہے ہمیں استنباط واستنتاج کی بھی ضرورت ہے۔جس کے نتیجے میں ہم کلیات وضع کرتے ہیں اور کلیات سے احکام نکالتے ہیں۔اور یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے۔

اسے مثال سے یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ حواس تعمیر کے کام میں مزدوروں کی طرح ہیں۔جن کا کام خام مواد مہیا کرنا،بکھری ہوئی چیزیں فراہم کرنا اور مسالہ بہم پہنچانا ہے اور عقل کی حیثیت ایک معمار کی ہے جس کا کام بکھرے ہوئے مواد کو جوڑ کر ایک عمارت کی تشکیل دینا ہے۔ظاہر ہے کہ اگر حواس کے بعد عقل کا جوہر عطا نہ کیا جاتا تو ہماری بکھری ہوئی معلومات،ہمارے منتشر محسوسات،ہماری زندگی کے کسی شعبہ کیلئے معاون ثابت نہ ہوتے کیونکہ ان سے کام لینا،انہیں ترتیب دینا اور ان سے کلیات وضع کرنا اور پھر ان سے احکام استنباط کرنا۔عقل کا کام ہے اور عقل کی عدم موجودگی میں ظاہر ہے یہ کام نہیں ہوسکتا تھا اور ہم زندگی کے میدان میں ناکام ہوجاتے۔پھر ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وجدان اور فطری الہام کی نگرانی کیلئے حواس کی راہنمائی کی ضرورت ہے کیونکہ وجدان اور احساس غلطیوں سے مبرا نہیں۔ان کی تصحیح ونگرانی کیلئے،ہمیں حواس کی راہنمائی کی ضروت ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حواس کی راہنمائی بھی نارسائی کا شکار ہوتی ہے اور غلطیوں سے محفوظ بھی نہیں۔مثلاً ہم دور سے ایک چیز دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں ایک سیاہ نقطے سے زیادہ حجم نہیں رکھتی۔حالانکہ وہ ایک عظیم الشان گنبد ہوتی ہے۔ہم بیماری کی حالت میں شہد جیسی میٹھی چیز چکھتے ہیں لیکن ہماری قوتِ ذائقہ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ اس کا مزا کڑوا ہے۔ہم تالاب میں لکڑی کا عکس دیکھتے ہیں لکڑی بالکل سیدھی ہوتی ہے۔لیکن عکس میں ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضے کی وجہ سے کان بجنے لگتے ہیں اور ہمیں ایسی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں اب اگر مرتبہء حواس سے ایک بلند تر مرتبہء ہدایت کا وجود نہ ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ ہم حواس کی درماندگیوں میں حقیقت کا سراغ پاسکتے لیکن ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے۔وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری راہنمائی کرتی ہے وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرہ ہے۔اگرچہ ہماری آنکھ اسے ایک سنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی ہے۔وہ ہمیں بتاتی ہے کہ شہد کا مزا ہر حال میں میٹھا ہے اور اگر ہمیں کڑوا محسوس ہوتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ ہمارے منہ کا مزا بگڑ گیا ہے۔وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ بعض اوقات خشکی بڑھ جانے سے کان بجنے لگتے ہیں۔اور ایسی حالت میں جو صدائیں سنائی دیتی ہیں۔وہ خارج کی صدائیں نہیں خود ہمارے دماغ کی گونج ہوتی ہے۔

عقل کو مکمل ہدایت تسلیم کرنے کے نقصانات

گزشتہ معروضات میں آپ نے دیکھا کہ وجدان اور الہام کی ہدایت کے بعد حواس کی ہدایت نمودار ہوئی کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے نہیں بڑھ سکتی تھی۔اور پھر حواس کے بعد عقل کی ہدایت نمودار ہوئی۔کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔اور اس کے ساتھ یہ بات بھی کہ وہ غلطیوں اور نارسائیوں سے محفوظ بھی نہیں تھی۔ٹھیک اسی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ دونوں کمزوریاں عقل کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہیں۔کیونکہ عقل زندگی کے ہر شعبہ میں نہ تو مکمل رہنما ہے اور نہ بالکل صحیح رہنما ہے۔اس کا بھی ایک محدود دائرۂ عمل ہے۔جس سے یہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔اور اس کی کارفرمائی بھی غلطیوں سے مبرا نہیں۔کیونکہ اس کا دائرۂ عمل جیسا کچھ بھی ہے وہ محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔یعنی وہ صرف اس حد تک کام دے سکتا ہے۔جس حد تک ہمارے حواس خمسہ معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے؟اس پردے کے پیچھے کیا ہے؟جس سے آگے ہماری چشمِ حواس نہیں بڑھ سکتی۔یہاں پہنچ کر عقل یک قلم درماندہ ہوجاتی ہے اور اس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی۔ بقول اقبال :

Marfat.com

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

یوں کہنا چاہئے کہ عقل ایک صحیح راہنما ہے۔لیکن مکمل نہیں۔غلطی ہماری ہے کہ ہم اسے ایک مکمل راہنما سمجھ کر زندگی کے ہر دائرہ عمل میں اس سے راہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی آدمی نے کسی صراف سے یہ پوچھا کہ صراف میاں تمہارا میزان کیسا ہے؟اس نے کہا بالکل صحیح ہے۔بالکل صحیح تولتا ہے۔ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہونے دیتا۔اس نے کہا اگر تمہاری بات صحیح ہے تو پھر اس میں اپنی دکان تول کر دکھاؤ۔اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا بھلے آدمی یہ دکانیں تولنے کیلئے تھوڑے بنایا گیا ہے۔اس میں تو سونا چاندی تولتے ہیں۔اس نے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ تمہارا میزان صحیح ہے۔اس نے کہا میں نے صحیح کہا تھا۔یہ غلطی میزان کی نہیں تمہاری ہے کہ تم اس میں وہ چیز تلوانا چاہتے ہو جو اس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ہم بھی عقل سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جو اس کے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔اس کا دائرۂ کار محسوسات تک محدود ہے۔طبیعات تک محدود ہے رہی یہ بات کہ محسوسات کے دائرہ کے پیچھے کیا ہے اور مابعد الطبعیات کیا ہے عالم لاہوت اور عالم الٰہیات کیا ہے،عالم ملکوت کا کیا حال ہے؟عالم برزخ میں کیا ہو رہا ہے؟عالمِ آخرت میں کیا ہوگا؟موت اور زندگی کی حقیقت کیا ہے؟روح کس چیز کا نام ہے کائنات کی ابتدا کیا ہے اور انتہا کیا ہے؟اللہ کی صفات کیا ہیں؟اخلاقی مسلمات کی حقیقت کیا ہے؟قوموں کے عروج وزوال کے اصل اسباب کیا ہیں؟وہ اخلاقی نقطہ کیا ہے جس سے انسانیت کا آغاز ہوتا ہے اور پھر انسانیت پروان چڑھتی ہے؟انسانیت کے مسلّمہ مسائل کا اجتماعی حل کیا ہے؟انسان کے اندر بیٹھا ہوا انسان کس چیز سے مرتا اور کس چیز سے جیتا ہے؟یہ وہ زندگی اور کائنات کے حقائق ہیں جس سے پردہ اٹھانا عقل کی بساط سے باہر ہے۔لیکن جب ہم انہی چیزوں کا جواب عقل سے مانگتے ہیں تو ہم اس پر ایک ایسا بوجھ لاد دیتے ہیں جس کا تحمل اس میں نہیں ہے۔بلکہ بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے بالکل پیش پا افتادہ حقائق بھی انسانی عقل کی گرفت سے باہر معلوم ہوتے ہیں۔مثلاً آپ غور فرمائیے کہ نفس انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں میں کچھ اس طرح گھرا ہوا ہے بلکہ اس طرح مقہور واقع ہوا ہے کہ جب بھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کی ہوتی ہے۔بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتے۔عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا دے سکتی کہ غصے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں اور بھوک کی حالت میں مضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

جذبات تو پھر بھی ایک زوردار شے ہے۔وہم تو انسانی احساسات میں سے ایک کمزور حس کا درجہ رکھتا ہے۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات وہم جیسا کمزور جذبہ بھی عقل انسانی پر غالب آجاتا ہے۔عقل جانتی ہے کہ ایک انسان کو گزرنے کیلئے ایک فٹ یا زیادہ سے زیادہ دو تین فٹ چوڑی گزرگاہ کافی ہے۔اگر کسی عقل کے پرستار سے یہ پوچھا جائے کہ دریا کے اوپر گزرگاہ بنانے کیلئے کتنا چوڑا پل ہونا چاہئے تو وہ عقل کے مطابق اتنی ہی چوڑائی تجویز کرے گا۔لیکن اگر کسی عقل کے پرستار سے کسی ایسے پل پر سے گزرنے کو کہا جائے جو تین فٹ چوڑا ہو لیکن اس کے نیچے سے گزرنے والا دریا طغیانی پر آیا ہوا ہو جس کی موجیں اچھل کر دریا کے پل کو چھو رہی ہوں تو یہی عقل کا پرستار کبھی اس پل پر سے گزرنے کی جرات نہیں کرے گا۔بلکہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو کر گزرنے سے صاف انکار کر دے گا۔غور فرمائیے کہ جس عقل کو جذبات اپنا اسیر بنا لیں اور وہم اسے شکست دے دے وہ زندگی کے معاملات حل کرنے میں کہاں تک مؤثر ہو سکتی ہے۔حقیقت تو یہ ہے جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے

Marfat.com

کہ عقل کے میزان ہونے اور مؤثر رہنما ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب اس کے دائرۂ کار سے باہر اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسے ایک مکمل رہنما سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی کمزوری کا عالم بھی آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو جذبات اور وہم کی زنجیروں سے آزاد کرنے سے بھی عاجز ہے۔ یہاں تک تو معاملہ پھر بھی عقل کے مؤثر نہ ہونے کا ہے لیکن اس وقت تو معاملہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے جب عقل نہ صرف یہ کہ موثر نہیں رہتی بلکہ بعض دفعہ اپنی رہنمائی میں وہ غلط نتائج پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ موقع وہ ہے جب عقل کو خواہشات کا غلام بنا دیا جاتا ہے انسان عجیب واقع ہوا ہے کہ وہ اصلاً ان خواہشات کی پیروی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے بروئے کار لاتے ہوئے نام عقل کا رکھتا ہے۔ حالانکہ اگر دیانت داری سے غور کیا جائے تو وہاں عمل دخل عقل کا نہیں بلکہ سراسر خواہشات کا ہوتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کریم نے ایک جگہ ارشاد فرمائی:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَلْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (المومنون: ۲۳.۷۱)

(کہ اگر حق ہوائے نفس کی پیروی کرنے لگے تو زمین وآسمان اور اس میں جو کچھ ہے وہ تباہ ہو جائے)

اور یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے کہ فلسفہ قانون میں فلاسفہ کا ایک گروہ پایا جاتا ہے جن کا نمایاں نمائندہ مشہور ماہر قانون ڈاکٹر فرائیڈ مین ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ کی وضاحت کیلئے ''دی لیگل تھیوری'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''عقل صرف انسانی جذبات وخواہشات کی غلام ہے اور اس کو انہی کا غلام ہونا بھی چاہیے۔ عقل کا اس کے سوا اور کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان جذبات کی بندگی اور ان کی اطاعت کرے۔''

پھر اس نظریئے سے جو نتیجہ نکلنا چاہیے وہ ڈاکٹر فرائیڈ مین کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

''اس کے سوا ہر چیز یہاں تک کہ اچھے برے کے تصورات اور یہ الفاظ کہ فلاں کام ہونا چاہیے اور فلاں کام ہونے کے لائق ہے کلی طور پر جذباتی باتیں ہیں اور دنیا میں اخلاق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔''

ممکن ہے کہ آپ اسے محض ایک فلسفی کی بڑ سمجھیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں عقل کی برتری کا دعویٰ کیا جاتا ہے بلکہ عقل کی غلامی کی جارہی ہے وہاں عملی زندگی میں یہی فلسفہ ہمیں حاکم دکھائی دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اخلاق کی ہر قدر رفتہ رفتہ شکست وریخت کا شکار ہے۔ رحم اتنی بڑی اخلاقی قدر ہے کہ شائد کوئی اس کا انکار نہ کر سکے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے بموں سے انسانیت پر جو ظلم ہوا انسانیت کی پیشانی آج بھی اس سے عرق آلود ہے۔ لیکن اندازہ فرمایئے کہ جب اس واقعہ کو خالصتاً عقل کی نگاہ سے دیکھا گیا تو اسے ظلم کی بجائے رحم بنا دیا گیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جیسی علمی اور عالمی کتاب میں ان تباہ کاریوں کا ذکر بعد میں کیا گیا جو ایٹم بم کی بدولت ہیروشیما اور ناگاساکی میں برپا ہوئیں لیکن ایٹم بم کے تعارف میں یہ جملہ سب سے پہلے لکھا گیا ہے:

''سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ایٹم بم نے جنگ کو مختصر کر کے دس لاکھ امریکی سپاہیوں اور اڑھائی لاکھ برطانوی سپاہیوں کی جانیں بچائیں۔''

اندازہ فرمایئے کہ اس قسم کی منطق میں کون سے ظلم وستم اور کون سی سفاکی ایسی ہے جسے عقل کے خلاف کہا جا سکے۔ اسی طرح شرم وحیا انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے لیکن خالص عقل کے پیروکاروں نے جس طرح اس کی مٹی پلید کی ہے اور اس بنیادی قدر کو جس طرح انسانی زندگی سے خارج کر دیا ہے اس کو سمجھنے کیلئے میں شرم وحیاء سے معذرت کے ساتھ آٹھ سو سالہ پرانی ایک مثال پیش کر رہا ہوں۔

Marfat.com

تاریخ اسلام میں ایک فرقہ "باطنیہ" کے نام سے گزرا ہے۔اس کا ایک مشہور لیڈر عبیداللہ القیر وانی اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے:

وما العجب من شئی کالعجب من رجل یدعی العقل ثم یکون له اخت او بنت حسناء ولیست له زوجة فی حسنها فیحرمها علی نفس وینکحها من اجنبی ولو عقل الجاهل لعلم انه احق باخته وبنته من الاجنبی وماوجه ذلک الاان صاحبهم حرم علیهما الطیبات(الفرق بین الفرق لعبدالقاهر البغدادی

اس سے زیادہ تعجب کی بات کیا ہوسکتی ہے کہ ایک شخص عقل کا دعویدار ہونے کے باوجود ایسی حماقتیں کرتا ہے کہ اس کے پاس نہایت خوبصورت بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے اور خود اس کی بیوی اتنی حسین نہیں ہوتی مگر وہ اس خوبصورت بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام قرار دے کر اسے کسی اجنبی سے بیاہ دیتا ہے حالانکہ ان جاہلوں کو اگر عقل ہوتی تو وہ یہ سمجھتے کہ ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ خود زیادہ حق دار ہیں۔اس بے عقلی کی وجہ دراصل صرف یہ ہے ان کے آقا نے ان پر عمدہ چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔

آپ ممکن ہے کہ اسے آٹھ سو سالہ پرانی غیر ترقی یافتہ حالت کی عکاس سمجھ کر نظرانداز کر دیں۔لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں جس طرح عقلِ خالص کی پیروی میں اضافہ ہوا ہے اسی طرح اس کے نتیجے میں اخلاقی اقدار کی پامالی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔آج کے دور میں بہن سے نکاح باقاعدہ ایک نعرہ بن چکا ہے اور امریکہ کی بعض ریاستوں میں باقاعدہ اس کے حق میں جلوس نکالے گئے ہیں۔کچھ عرصہ پہلے اس بداخلاقی کو روکنے کے لئے میڈیکل سائنس کے حوالے سے یہ دلیل دی جاتی رہی ہے کہ استلذ اذ بالاقارب سے طبی نقصانات ہوتے ہیں۔لیکن آج مغربی دنیا میں اس موضوع پر کتابیں آرہی ہیں انہوں نے نہ صرف ان طبی نقصانات کی توجیہ کو غلط ثابت کر دیا ہے بلکہ استلذ اذ بالاقارب کو انہوں نے انسان کی فطری خواہش یعنی ہیومن ارج (Human Urge) قرار دے کر انسان کا بنیادی حق تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے اور اس پر باقاعدہ کتابیں لکھی جارہی ہیں۔اور اسی رویہ کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ ہم جنس پرستی کے جواز کا بل تالیوں کی گونج میں منظور کر چکی ہے اور یہ اخلاقی اعتبار سے انتہائی قابل نفرت خصلت جس کیوجہ سے قوم لوط پر اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔نہ صرف کوئی برائی نہیں رہی بلکہ اسے باقاعدہ ایک علم بنادیا گیا ہے۔آپ امریکہ کی لائبریریوں میں جائیں تو وہاں آپ کو اس برائی کے حق میں لکھی ہوئی کتابوں پر مشتمل علیحدہ سیکشن ملے گا۔جس کا عنوان ہوگا۔"گے اسٹائل آف لائف" (Gay Style of life)

چند سال پیشتر امریکی رسالے ٹائم نے لکھا کہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں مں سے تقریباً ایک ہزار افراد کو صرف اسلئے فوج سے نکال دیا گیا کہ وہ ہم جنس پرست تھے۔لیکن اس اقدام کے خلاف امریکہ میں شور مچ رہا ہے۔مظاہرے ہورہے ہیں اور چاروں طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ آپ نے جن لوگوں کو ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے فوج کے عہدوں سے برخاست کیا ہے یہ آپ نے ایک خلاف عقل حرکت کی ہے۔اس لئے ان کو دوبارہ بحال ہونا چاہئے اور اس کے حق میں دلیل یہ دی جارہی ہے کہ یہ ایک ہیومن ارج ہے اور ہیومن ارج کو دبایا نہیں جاسکتا اور یہ سب کچھ عقل کی بنیاد پر ہو رہا ہے اور اب تو یہ معاملہ یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ بات صرف جنس انسانی کی نہیں رہی بلکہ اب تو جانوروں کتوں، گدھوں اور گھوڑوں تک نوبت پہنچ گئی ہے اور اس کو بھی باقاعدہ فخریہ بیان کیا جارہا ہے۔

Marfat.com

وحی نبوت کی ہدایت

اس تمام بحث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان اور حیوان کی زندگی کے تحفظ اور اس کو معیشت کی راہ پر لگانے کیلئے سب سے پہلے فطری رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ ایک خاص حد تک اپنا کام کرتی ہے۔ اس کے بعد باہر کی زندگی کی راہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ نے حواس خمسہ کی راہنمائی مہیا فرمائی۔ حواس خمسہ نے محسوسات کے دائرے میں رہ کر انسانی زندگی کو آگے بڑھایا۔ پھر جب انسان کے قدم محسوسات سے آگے بڑھے تو اسے عقل کی راہنمائی عطا فرمائی گئی۔ اب ہم نے تفصیل سے دیکھا کہ عقل انسان کی راہنمائی کیلئے بہت موثر رہنما ہونے کے باوجود اعمال کی درستگی اور انضباط کیلئے کافی نہیں۔ وہ قدم قدم پر جذبات کی اسیر ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ قوت واہمہ سے شکست کھا جاتی ہے اور اگر یہ جذبات ہوائے نفس کی لپیٹ میں آجائیں تو پھر عقل نہ صرف اس کے سامنے بے دست و پا ہو جاتی ہے بلکہ عموماً وہ ہوائے نفس کی وکالت کرنے لگتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اخلاقی قدریں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ عقلی مسلمات شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اب جس پروردگار نے قدم قدم پر حیوان اور انسان کی راہنمائی فرمائی کیا یہ ممکن ہے کہ وہ انسان کو غلطان و پیچان چھوڑ دے کہ وہ ہوائے نفس کا شکار ہو کر اپنی زندگی اور آخرت کو تباہ کر لے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس پروردگار کی رحمت سے یہ بات یقیناً بعید ہے کہ وہ عقل کے بعد انسان کو کسی اور راہنمائی سے محروم فرما دے بلکہ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جس طرح وجدان کے بعد حواس کی رہنمائی پروردگار نے عطا فرمائی اور حواس کے بعد عقل کی، اسی طرح اس نے اپنے ذمہ یہ بات لے رکھی ہے کہ عقل کے بعد زندگی کو رہنما سے محروم نہیں رکھے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے جا بجا ان مراتب ہدایت کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ○ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ○ (الدھر ۷۶: ۲۔۳)

(ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا جسے ایک کے بعد ایک مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں۔ پھر اسے ایسا بنا دیا کہ سننے والا، دیکھنے والا وجود ہو گیا۔ ہم نے اس پر راہ عقل کھول دی۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ یا تو شکر کرنے والا ہو یا ناشکرا۔ یعنی یا تو اللہ کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک ٹھیک کام میں لائے اور فلاح و سعادت کی راہ اختیار کرے یا ان سے کام نہ لے اور گمراہ ہو جائے)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ○ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ○ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ○ (البلد ۹۰: ۸۔۹)

کیا ہم نے اسے ایک چھوڑ دو دو آنکھیں نہیں دے دی ہیں (جن سے وہ دیکھتا ہے) اور زبان اور ہونٹ نہیں دیئے ہیں (جو گویائی کا ذریعہ ہیں) اور کیا اس کو ہم نے (سعادت و شقاوت کی، دونوں راہیں نہیں دکھا دیں؟)

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (السجدہ: ۳۲۔۹)

(اور اللہ نے تمہارے لئے سننے اور دیکھنے کے حواس پیدا کر دیئے اور سوچنے کیلئے دل (یعنی عقل) تاکہ تم شکر گزار رہو (یعنی اللہ کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک طریقہ پر کام میں لاؤ)

Marfat.com

ان آیات اوران کے ہم معنی آیات میں حواس اور مشاعر اور عقل وفکر کی ہدایت کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، لیکن وہ تمام مقامات جہاں انسان کی روحانی سعادت وشقاوت کا ذکر کیا گیا ہے وحی ونبوت کی ہدایت سے متعلق ہیں۔ مثلاً

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝ (الیل ۹۲: ۱۲۔۱۳)

(بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم راہنمائی کریں اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہیں)

یعنی دنیا وآخرت کی ضرورتوں کیلئے رہنمائی ہماری ذمہ داری ہے۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حم السجدہ ۴۱: ۱۷)

اور باقی رہی قوم ثمود، تو اسے بھی ہم نے راہ حق دکھلا دی تھی۔ لیکن اس نے ہدایت کی راہ چھوڑ کر اندھے پن کا شیوہ اختیار کیا)

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (العنکبوت ۲۹: ۶۹)

(اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی کی تو ضروری ہے کہ ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو نیک عمل ہیں)

انسانی زندگی کی ضرورتیں جہاں کھانا پینا، اوڑھنا پہننا، لوگوں سے میل جول رکھنا، عناصر قدرت اور عناصر فطرت سے مستفید ہونا ہیں وہاں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یہ جانے کہ باہمی میل جول کے آداب کیا ہیں، خود میری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کے کیا فرائض اور کیا حقوق ہیں؟ شائستگی اور دل بستگی کیا ہے؟ ان کے آداب کیا ہیں؟ دوسروں کے مجھ پر حقوق کیا ہیں؟ ہمسائیگی کیا ہے؟ اخوت ومحبت کسے کہتے ہیں؟ ماں باپ کا احترام کیا ہے؟ علم کس چیز کا نام ہے اور اس کی حدود کیا ہیں؟ عورت اور مرد کا رشتہ کیا ہے اور اس کی نزاکتیں کیا ہیں؟ محرم کسے کہتے ہیں اور نامحرم کون ہے؟ عبادات کی حقیقت کیا ہے؟ یہ دنیا ہمیشہ رہے گی یا ختم ہوجائیگی؟ اس کا انجام فنا ہے یا بقاء ہے؟ کیا کوئی دوسری دنیا بھی ہے؟ تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا میں مرنے کے بعد ہمیشہ کیلئے فنا ہوجاؤں گا؟ یہ عالم برزخ کیا ہے؟ اور عالم آخرت کیا ہے؟ اللہ کی صفات کیسی ہیں؟ وہ اگر ہمارا مالک ہے تو وہ کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے؟ قربانیوں کی حقیقت کیا ہے؟ آدمی ایک دوسرے کے لئے ایثار کرتا ہے تو اس کا صلہ کیا ہوگا؟ اخلاقی مسلمات کیا ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کیا ہیں؟ روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کن کاموں سے زندہ ہوتی ہے اور کن کاموں سے مرجاتی ہے؟ اور اسی طرح کے بے شمار سوالات ہیں جن کا جواب انسان کو ملنا چاہئے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ ان کا جواب نہ حواس کے پاس ہے اور نہ عقل کے پاس۔ اب اگر ہمیں اپنے محسوسات کی دنیا میں جوابات دینے کیلئے حواس وعقل کی راہنمائی دی گئی ہے تو کیا عالم ناسوت اور عالم ملکوت کی حقیقتوں کیلئے اور اپنی دنیا میں سرفرازی اور آخرت میں سرخروئی کے لیے اور اس آنکھ کے پردے کے پیچھے کے حقائق کو جاننے کیلئے ہمیں کوئی راہنمائی نہیں دی جائے گی؟ اور ہم بے خبری میں غلط سلط فیصلے کرتے رہیں گے۔

یقیناً وہ ذات جس نے چیونٹی تک کی ضرورتیں پوری کی ہیں وہ انسان کو اس سے بے خبر نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ اس نے حواس وعقل کے ذریعے کے بعد ہمیں ایک اور ذریعہ علم بھی بخشا جس کا نام وحی اور رسالت ہے اور اس وحی کے حاملین کو پیغمبر نبی یا رسول کہتے ہیں۔ اس ذریعے سے انسانوں کو وہ سب کچھ بتایا گیا جو اس کی دینوی، اخروی اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ضرورت تھی۔ بلکہ اس ذریعہ علم کے ذریعے انسانوں کی دنیا بھی اور آخرت بھی تباہ ہونے سے بچالی گئی۔ تاریخی حقائق ہمارے سامنے ہیں کتنی قومیں اس صفحہ ہستی پر قوت کا نشان بن کر

Marfat.com

انھیں لیکن اپنی اخلاقی بے راہ روی اور غلط فیصلوں کے نتیجے میں اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں۔ آسمانی کتابوں نے جابجا اس تاریخ کو بیان کیا ہے تا کہ انسان اس بات کو سمجھے کہ انسانی بقاء کا دارومدار اس کی اخلاقی زندگی اور توانائی پر ہے۔ کیونکہ اخلاقی زندگی میں گراوٹ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ انسانیت سے تہی دامن کر دیتی ہے۔ وہ شرم وحیا سے عاری ہو کر کتوں، بلیوں کی سطح پر آجاتا ہے۔ رحم و مروت سے بے بہرہ ہو کر درندوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ حرام وحلال سے بے گانہ ہو کر حشرات الارض کی جگہ نشے کی حالت میں گلی کوچوں میں پڑا دکھائی دیتا ہے۔ آخرت کی محبت سے محروم ہو کر اور حب دنیا کا اسیر بن کر بندہ درہم و دینار بن جاتا ہے۔ اس ناگفتہ بہ صورت حال سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اس ذریعۂ علم کو پہچانیں جسے وحی الٰہی کہا جاتا ہے۔

چنانچہ اسی علم کی یافت اور اسی دولت کے حصول کیلئے ہمیں یہ دعا سکھائی گئی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ ہمیں سیدھی راہ دکھا۔ کیونکہ یہ وہ ہدایت ہے جس کا سر رشتہ سراسر پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ اس ہدایت کا تعلق ان معاملات سے ہے جن کا حل کرنا فطری الہام حواس خمسہ اور عقل کے بس کا کام نہیں جس کی تفصیل ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں اور دوسری طرف انسانی زندگی کی ضرورت کا حال یہ ہے کہ وہ اس علم اور ہدایت کے بغیر چند قدم بھی سفر نہیں کر سکتی۔ دین اور دنیا دونوں میں کامیابی کی ضمانت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہی راہنمائی اور ہدایت ہے اور مزید یہ بات بھی کہ یہاں جس ہدایت کیلئے دعا کی تلقین کی گئی ہے وہ صرف ذہنی یا عملی راہنمائی کیلئے ہی نہیں بلکہ قلب وضمیر کی راہنمائی بھی ہے۔ انسانی عقل بڑے سے بڑا معجزہ بھی اگر سر کر ڈالے تو اس کا تعلق یقیناً انسانی ذہن سے ہوتا ہے لیکن جہاں تک قلبی نور و بصیرت اور انسان کے احساسات کی تطہیر کا تعلق ہے اور قوت عمل میں افزونی اور قبولیت میں آسانی کا تعلق ہے جسے توفیق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ تو سراسر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ اس کے سوا کوئی عطا نہیں کر سکتا اور یہاں جس صراط مستقیم کی ہدایت کے لئے دعا مانگی جا رہی ہے اس میں صرف صراط مستقیم کی عطا ہی شامل نہیں بلکہ اس کے لئے حالات کو ہموار کرنا توفیق عطا ہونا اور قبولیت کی امید پیدا ہونا یہ سب کچھ شامل ہے۔ ہدایت کی اس وسعت کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنی بڑی دولت ہے جو یقیناً اللہ ہی سے مانگی جا سکتی ہے اور وہی اس کا عطا کرنے والا بھی ہے۔ اس عظیم دولت کی تعبیر یہاں اس قدر سہل اور آسان بنا کے پیش کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ آسان تعبیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہدایت کا لفظ بھی جانا پہچانا ہے اور صراط مستقیم بھی ایک آسان ترکیب ہے جو نہ صرف عربی زبان میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے بلکہ اس کا مفہوم اور معنی تو ہر زبان میں بکثرت مستعمل ہے لیکن یہ دونوں لفظ چونکہ قرآن پاک کی اصطلاح بن چکے ہیں اس لئے قرآن پاک نے مختلف مقامات پر انہیں جن معنوں میں استعمال کیا ہے اس سے ایک مفہوم متعین کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ نہایت اختصار سے اس کی کسی حد تک وضاحت کر دیں۔

ہدایت کا مفہوم

ہدایت کا لفظ جس طرح راہنمائی کرنے، راہ دکھانے اور راہ پر لگا دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح یہ منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک مسافر جب کسی سے راستہ پوچھتا ہے تو راستہ بتانے والا کبھی تو اسے وہیں کھڑا کھڑا ہاتھ کے اشارے سے مختلف نشانات بتا کر راستے کو واضح کر دیتا ہے، اسے راستہ دکھانا اور عربی میں اراء الطریق کہتے ہیں اور دوسری صورت راستہ بتانے کی یہ ہوتی ہے کہ مسافر کا ہاتھ پکڑ کر اسے منزل تک پہنچا دیا جائے۔ اسے ایصال الی المطلوب کہتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے

Marfat.com

کہ راستہ چلنے والا اپنی منزل کی دوری اور راستے کی دشواریوں کے باعث گھبرا اٹھتا ہے۔ بعض دفعہ سفر کے آغاز ہی کے لئے تیار نہیں ہوتا اور بعض دفعہ راستہ کی کٹھنائیاں دیکھ کر سفر کا ارادہ چھوڑ دیتا ہے اور ناکامی کا داغ لئے اپنے گھر کو لوٹ آتا ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ اس کے دل میں سفر کی امنگ پیدا کی جائے، راستہ کی دشواریوں کو سر کرنے کے لئے حوصلے کی دولت دی جائے اور وہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ذہن میں یہ بات بٹھالے کہ راہ کی سختیاں حقیقت میں سامان سفر ہوتی ہیں جس کے بغیر سفر کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ طبیعت میں اس کیفیت کا پیدا کرنا کبھی تو قلبی نور و بصیرت کے ذریعے ہوتا ہے کہ دل میں اک روشنی پیدا ہوتی ہے جس سے تمام تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور سفر کے آغاز کی ہمت ہو جاتی ہے اور کبھی دل میں حوصلے کی ایسی ترنگ اٹھتی ہے جو راہ کی سختیوں کو سفر کی سنت سمجھ کر برداشت کرنے کا شوق پیدا کرتی ہے، اسے اللہ کی توفیق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے تینوں معنوں میں ہدایت کے لفظ کو بار بار استعمال کیا ہے جب وہ کہتا ہے کہ قرآن کریم تمام جن وانس کے لئے ہدایت بن کر آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انہیں زندگی گزارنے کا وہ راستہ بتاتا ہے جس پر چل کر وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں اور جب وہ یہ بتاتا ہے کہ اصحاب کہف چند لڑکے بالے تھے جب وہ اللہ پر ایمان لے آئے اور پھر ایمان کے مطابق زندگی گزارنا، بت پرستوں کے دیس میں ان کے لئے مشکل ہو گیا اور دل ان کے ڈولنے لگے تو ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا یعنی ان کے دلوں کو حوصلے سے باندھ دیا اور ان کے دلوں میں وہ استقامت اور اولوالعزمی پیدا کی جس کے نتیجے میں وہ آبادی چھوڑ کر غاروں کا راستہ اختیار کرنے پر تیار ہو گئے۔ یہ وہ دل کا نور اور بصیرت ہے جس نے ان کے لئے مشکلات آسان کر دیں اور کبھی قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (الروم: ۳۰۔۶۹) جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی توفیق دیتے ہیں یعنی ان کے راستے کی دشواریاں ہم ان کے لئے سہل بنا دیتے ہیں اور منزل انہیں اس حد تک محبوب ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی طرف بڑھنا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن جاتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ کو یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو جائیگی کہ سورۃ فاتحہ میں صراط مستقیم کی ہدایت کی جو دعا سکھائی گئی ہے وہ سب کیلئے ہے اس میں عوام بھی شامل ہیں اور خواص بھی حتی کہ انبیائے کرام بھی اللہ سے ہمیشہ یہی دعا مانگتے رہے۔ اور رسول اللہ ﷺ بھی ہمیشہ نماز میں یہ دعا کیا کرتے تھے۔ اگر ہدایت کا ایک ہی مفہوم ہوتا تو یقیناً سب کیلئے مناسب نہ ہوتا۔ عوام کی دعا اور ہوتی اور خواص کی اور لیکن ہدایت کے ان مختلف مفاہیم کو دیکھ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر دعا مانگنے والا اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے مطابق اللہ سے ہدایت مانگتا ہے۔ پھر دل کا نور اور بصیرت سب کیلئے یکساں نہیں ہوتی۔ ایک عامی کیلئے اس کے دل و دماغ کے مطابق فی الجملہ اطمینان کافی ہے لیکن قربت خداوندی کے مسافروں کیلئے تو ہمت کے مطابق الگ الگ مقامات ہیں۔ کوئی ایک مقام پر پہنچ کر مطمئن ہو جاتا ہے تو دوسرا سالک اپنی منزل کو بہت دور سمجھتا ہے اس لئے وہ اگلے مقام کیلئے بے قرار رہتا ہے۔ اللہ کی توفیق سب کی دستگیری کرتی ہے۔ لیکن ہر ایک کو بقدر ہمت عطا ہوتی ہے۔ دل کا اطمینان دماغ کی آسودگی اور بندگی کا سوز و گداز اس دعا کے نتیجے میں سب کو ملتا ہے لیکن ہر ایک اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے مطابق نوازا جاتا ہے صالحین صلاحیت عمل سے نوازے جاتے ہیں اولیاء ولایت کے مرتبے سے اور انبیا کرام نبوت کے مدارج اعلیٰ پر فائز کئے جاتے ہیں۔ اور پھر تمام انبیا بھی یکساں مقام نہیں رکھتے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں کبھی اپنے اللہ کے ساتھ ایسے قرب سے نوازا جاتا ہوں جہاں کسی مقرب فرشتے کا بھی گزر نہیں ہوتا۔

Marfat.com

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا مفہوم

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں ضمیر جمع کی ہے۔حالانکہ ہر مانگنے والا واحد ہوتا ہےلیکن وہ اپنی دعا میں جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرما۔اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تیرے چاہنے والوں کے قافلے کا ایک فرد ہوں۔میری عاجزی میری بے بسی میری بے بضاعتی میری کم ہمتی پر پروردگار نظر نہ فرما بلکہ جب اس قافلے کے بڑے بڑے لوگوں پر رحمت کی برکھا برسے تو میں بھی اسی بارش سے نہال کیا جاؤں۔سمندر کا قطرہ بھی سمندر میں رہ کر سمندر ہی ہوتا ہے۔میں بے قدرو بے قیمت سہی لیکن بڑے لوگوں کے ساتھ تیری رحمت یقیناً مجھے ان کے ساتھ نوازنے میں بخل نہیں کرے گی۔

اس دعا میں صراط مستقیم کا لفظ بھی قابل غور ہے۔صراط کے معنی راہ کے ہیں اور مستقیم کے معنی سیدھا ہونے کے۔پس صراط مستقیم ایسی راہ ہوئی جو سیدھی ہو کسی قسم کا پیچ وخم نہ ہو۔اللہ کے دین کیلئے اس سے بہتر تعبیر ممکن نہیں۔کیونکہ جب بھی آدمی کسی منزل پر پہنچنے کے ارادے سے نکلتا ہے تو اس کی سب سے پہلے کوشش یہ ہوتی ہے کہ مین ایسا راستہ اختیار کروں جو سیدھا منزل تک جاتا ہو۔کیونکہ سیدھی راہ ہی ہمیشہ مختصر ہوتی ہے اور بالآخر وہی شاہراہ عام کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔جتنے غلط راستے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ طویل اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔اس لئے دنیا کی ہر زبان میں ہمیشہ صحیح بات اور صحیح طرز عمل کو مستقیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔کیونکہ انسان کے فکر وعمل کا کوئی گوشہ ہو صحت و درستگی کی راہ ہمیشہ وہی ہوگی جو سیدھی راہ ہو،جہاں انحراف اور کجی پیدا ہوئی نقص وفساد ظہور میں آ گیا۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں سیدھا ہونا اور سیدھی چال چلنا فلاح وسعادت کے معنی میں عام طور پر بولا جاتا ہے گویا اچھائی کے معنی میں یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو تمام نوع انسانی کی عالم گیر تعبیر کہی جا سکتی ہے۔

حضرت مسیح کے چار سو برس پہلے دارایوش اول نے جو فرامین کندہ کرائے تھے ان میں سے بے ستون کا کتبہ آج تک موجود ہے۔اور اس کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے(اے انسان! ہورامزدکا (یعنی خدا کا) تیرے لئے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر سیدھا راستہ نہ چھوڑ گناہ سے بچ تارہ) خود پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی حقیقت کی وضاحت کیلئے یہی تعبیر اختیار فرمائی۔

عن ابن مسعود قال خط لنا رسول الله ﷺ بيده ثم قال هذا سبيل الله مستقيما ثم خط خطوطا عن يمين ذلک الخط وعن شماله ثم قال هذه السبيل ليس منها سبيل الاعليه شيطان يدعواليه ثم قرء هذه الاية (اخرجهالنسائی و احمد و البزار و ابن منذر و ابو الشيخ و الحاكم وصحه)

(عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں،رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے،بالکل سیدھا اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ دیں،اور فرمایا یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنالئے گئے ہیں،اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے کیلئے ایک شیطان موجود نہ ہو۔پھر یہ آیت پڑھی)

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ (الانعام ٦ : ١٥٣)

Marfat.com

مزید ہم دیکھتے ہیں کہ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ پر الف لام عہد کا ہے اس سے یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صراط مستقیم سے ہر سیدھا راستہ مراد نہیں بلکہ کوئی خاص راستہ ہے جس کی طرف یہاں اشارہ کیا جارہا ہے۔ چنانچہ بعد کے الفاظ میں اس اشارے کو کھول دیا ہے۔ البتہ صراط مستقیم کے لفظ میں اس راستے پر چلنے والوں کو یہ خوشخبری سنائی ہے کہ تم اس راستے پر چلنے سے پہلے گھبرانہ جانا۔ کیونکہ یہ راستہ سیدھا راستہ ہے اور سیدھے راستے کبھی دشوار نہیں ہوتے وہ تمام راستوں میں قریب تر اور سہل تر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کو واضح کرنے کیلئے فرمایا کہ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا۔ ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر غضب ہوا یا وہ گمراہ ہوئے۔ اس میں متعدد باتیں قابلِ غور ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ دعا مانگنے والا جو اس وضاحت سے صراط مستقیم کی دعا مانگ رہا ہے کیا وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اگر اس نے یہ وضاحت نہ کی تو اللہ تعالیٰ شاید اس کی دعا کو پوری طرح سمجھ نہ سکے کوئی بھی اس راستے کا مسافر ایسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ تو پھر اس وضاحت کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟ معمولی سے تدبر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دعا مانگنے والا اس وضاحت سے اپنے شوق اور وارفتگی کا اظہار کررہا ہے۔ اور اس کا بے قرار دل عبادت کے جذبے سے سرشار اس راستے کی تلاش میں بے چین ہورہا ہے جس پر چل کر وہ اپنی زندگی کو شریعت کے مطابق گزار سکتا ہے اور اللہ کی رضا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور وہ جلد از جلد ان بڑے لوگوں کے قافلے میں شریک ہونا چاہتا ہے جو اس صراط مستقیم پر چلنے میں کامیاب ہوئے اور اللہ کے انعام کے مستحق ٹھہرے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور ناتوانیوں کو دیکھتے ہوئے ان انعام یافتہ بندوں میں شامل ہونا چاہتا ہے تاکہ ان کی قربت اور ان سے نسبت اس کی کوتاہیوں کی تلافی کردے۔ اور غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّينَ ۝ (الفاتحہ:۷) کہہ کر اپنی بےزاری اور نفرت کا اظہار ان لوگوں سے کررہا ہے جنہوں نے صراط مستقیم پر چلنے سے انکار کردیا یا اس سے بھٹک گئے اور اس طرح وہ اللہ کے غضب کا شکار ہوئے۔ اس طرح وہ اپنے لئے استقامت و استواری کی دعا کرتا ہے۔ اور ان لوگوں سے بچنے کی توفیق مانگتا ہے جو اس صراط مستقیم سے بےگانہ یا افراط وتفریط کا شکار ہیں۔

اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ سے مراد

دوسری بات جو اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں صراط مستقیم کی وضاحت کیلئے کچھ ایسے لوگوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن پر اس صراط مستقیم کا حق ادا کرنے کے باعث انعام واکرام ہوا۔ حالانکہ اس کی وضاحت کیلئے یہ بات کہی جاسکتی تھی، کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا راستہ ہے تم اسے اختیار کرو۔ تو بجائے صراط اللہ یا صراط الرسول کہنے کے آخر اس تعبیر میں کیا حکمت ہے۔ حقیقت تو اللہ جانتا ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس میں انسانی فطرت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ کتابوں سے اس قدر نہیں سیکھتی جس قدر انسانی شخصیات سے متاثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انسانوں کی ہدایت کیلئے صرف کتابیں نہیں اتاریں بلکہ نبی اور رسول بھی بھیجے۔ کیونکہ کتاب کے الفاظ انسانی تربیت کے لئے کافی نہیں ہوتے۔ بلکہ انسان تربیت کیلئے انسانی شخصیات کی ضرورت پڑتی ہے۔ ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ثابت ہوتی ہے۔ اس مدرسے کے کھینچے ہوئے نقوش دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے صرف معلومات نہیں ملتیں بلکہ کردار اور صالح احساس ملتا ہے۔ کیونکہ

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

Marfat.com

اگر صرف صراط اللہ کہا جاتا تو اللہ کے راستے کی تلاش اور اس پر چلنے میں ہزاروں الجھنیں پیدا ہوتیں اسی طرح اگر صراط رسول کہہ دیا جاتا تو وہ بھی وضاحت کیلئے کافی نہ ہوتا۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ کی حیات ظاہری ہمیشہ کیلئے نہیں تھی۔ آپ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یقیناً اس راستے کے تعین میں دشواری ہوتی شاید یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ جب یہ امت پچھلی امتوں کی طرح مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی تو ان میں سے کون سی جماعت حق پر ہوگی۔ تو آپ ﷺ نے یہاں بھی محسوس انسانوں کا حوالہ دیا تا کہ راستے کے تعین میں دشواری پیش نہ آئے آپ ﷺ نے فرمایا ما انا علیه و اصحابی ''جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں'' یعنی میرے بعد تمہیں اس راستے پر چلنے میں رہنمائی میرے صحابہ سے ملے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے جن مخصوص لوگوں کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی وہ اللہ کا انعام یافتہ گروہ ہے وہ کون ہیں؟ اس کا جواب ایک دوسری آیت کریمہ میں دیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ (النساء : ۴ . ۶۹)

(وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں)

1- نبی:۔

تو یہ چار طرح کے لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوتا رہا۔ دنیا میں بھی جن کی حفاظت فرمائی اور عزت اور سرفرازی سے نوازا اور آخرت میں بھی یہی لوگ سربلند ہوں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ طوفان نوح آیا تو کشتی نجات نے ان کو اپنی آغوش میں جگہ دی جو نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے اور اس راستے کے مسافر تھے۔ اور جتنے لوگوں نے اس راستے پر چلنے سے انکار کیا وہ سب اس طوفان کی نذر ہو گئے۔ قوم عاد قوم ثمود قوم لوط قوم صالح اور بھی چند قوموں کے انجام تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں ہر جگہ ایک ہی حقیقت کارفرما نظر آتی ہے۔ کہ انبیا اور ان کے ساتھی بچ گئے اور ان کے مخالفین کو تباہ کر دیا گیا۔ اب قیامت تک کیلئے یہی اصول بتا دیا گیا کہ وہ لوگ جو راہ راست اختیار کریں گے اور نبی آخرالزمان کے طریقے پر چلیں گے وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں گے اور جو ان کے راستے پر چلنے سے انکار کر دیں گے وہ خائب و خاسر ہوں گے اسی لئے قرآن کریم نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ (الانعام: ۶ـ۱۵۳) یہ ہے میرا سیدھا راستہ اسی کی پیروی کرو۔ یعنی میں جس راستے کی دعوت دے رہا ہوں جس پر میں خود چل رہا ہوں مجھ پر جو شریعت نازل ہوئی ہے اور جو مجھ پر کتاب اتری ہے اور جسے میں نے اپنے عمل سے سنت بنا دیا ہے۔ اور جسے میں نے اپنے جذبۂ ایثار اور استقامت سے تحریک کی شکل دے دی ہے اور پھر جس طرح مخالفتوں کے ہجوم میں میں نے یقین کی قوت اور اعتماد علی اللہ سے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور اپنے اصحاب کو حوصلے کا سامان بخشا ہے اور پھر جس طرح دعوت الی اللہ کو زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور سب سے بڑی متاع کے طور پر پیش کیا ہے اور جس طرح قدم قدم پر دین کو دنیا پر ترجیح دی اور عبادات کے سوز سے حُبِّ دنیا کے بحران کو سرد کیا ہے اور جس طرح مادی دنیا میں فنا ہونے والوں کو اور دنیوی نعمتوں کے رسیا لوگوں کو آخرت کا مسافر بنایا ہے یہ وہ صراط مستقیم ہے۔ جو شخص اس کی پیروی کرے گا۔ وہی میرا پیروکار ہوگا اور وہی صراط مستقیم پر ہوگا۔ البتہ اس راستے پر چلنے والے سارے یکساں نہیں ہوں گے۔ اور نہ اس راستے پر چلنے والوں کی ضرورتیں اور صفات یکساں ہیں۔ اس لئے تم اپنی ہمت طلب اور ضرورت کے مطابق اس راستے کے رہنماؤں کو چننا۔ لیکن یہ دیکھنا کہ ان میں سے کسی کا عمل

Marfat.com

اور طرز عمل میری سنت کے خلاف نہ ہو۔یعنی تمہیں اپنی رہنمائی اور زندگی بنانے کیلئے ہر دور میں ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہوگی جو محسوس شکل میں تمہارے لئے رہنمائی فراہم کرسکیں اور تمہارے لئے نمونہ بن سکیں لیکن انہیں اختیار کرنے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لینا کہ ان کا عمل کتاب وسنت کے مطابق ہے یا نہیں وہ تین طرح کے لوگ ہوں گے صدیق، شہید اور صالح۔اب ہم ہر ایک کی اختصار سے وضاحت کرتے ہیں۔

2- صدیق:۔

صدیق صراط مستقیم پر چلنے والے قافلے میں سب سے مخلص سب سے متقی، سب سے زیادہ وفا شعار اور سب سے زیادہ ایثار پیشہ فرد کا نام ہے۔جو بھی اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اس کی معراج کو پہنچنے کی کوشش میں زندگی گزار دے گا وہ صدیق کے مرتبے پر فائز ہوسکتا ہے اس لیے عام طور پر اللہ کے ہر ولی کو صدیق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔لیکن اسلام کی تاریخ میں حضرت ابوبکر صدیق کا نام چونکہ ایک استعارہ بن گیا ہے اور قرآن کریم کی آیت نے اس لفظ کو ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔اس لئے اہل علم کا خیال ہے کہ صدیق اصل میں اس عظیم شخصیت کو کہتے ہیں جو کمالات ظاہری کے ساتھ کمالات باطنی میں بھی سب سے بڑھا ہوا ہو اس کا باطن اس قدر مصفا اور مجلّا ہو کہ ایمانیات اور احکام شریعت کا عکس اس طرح اس کے باطن پر آسانی سے ثبت ہو جائے جس طرح آئینے کے سامنے اگر شمع جلائی جائے تو شمع جلتے ہی آئینے میں اس کا عکس بھی جل اٹھتا ہے۔حضرت صدیق اکبر کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد بھی اس بات کو واضح کرتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جس کسی کے سامنے بھی اسلام پیش کیا اسے ماننے میں تھوڑا یا زیادہ تردد ضرور پیش آیا لیکن جب میں نے ابوبکر کے سامنے اسلام پیش کیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس کیلئے پہلے سے تیار تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کا ہر ارشاد اور حضور ﷺ کا ہر عمل حضور ﷺ کی ہر پسند آپ کے آئینۂ دل کے سامنے شمع کی طرح جل اٹھتی تھی۔معاہدہ حدیبیہ میں آپ کا حضرت عمر فاروق کو جواب معراج کے واقعہ میں آپ کا قریش مکہ کو جواب اور بعض آیات کے نزول کے وقت فوراً اس کی مراد کو پا جانا ایسی بہت ساری مثالیں آپ کے مقام صدیقیت کو نمایاں کرتی ہیں۔مشکل اور پرخطر حالات میں استقامت کا ثبوت دینا یوں تو ہر مرد مومن کی صفت ہے لیکن اس لحاظ سے بھی صدیق دوسرے اصحاب ایمان کیلئے نمونہ ہوتا ہے۔آنحضرت ﷺ کے انتقال پر ملال کے بعد حضرت صدیق اکبر کا طرز عمل اس کی نمایاں شہادت ہے۔مزید ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صفات صدیق میں سب سے بڑی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ عزیمت پر عمل کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس کیلئے ایسی متاع عزیز بن جاتے ہیں کہ وہ ان کے مقابلے میں جائز سہولتوں سے فائدہ اٹھانا بھی گناہ سمجھتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ نے اللہ کی راہ میں بڑھ چڑھ کر انفاق اور ایثار کیا لیکن اپنے اور اپنے اہل خانہ کیلئے کچھ نہ کچھ بچا کر بھی رکھا لیکن حضرت صدیق اکبر سے جب بھی انفاق کا مطالبہ ہوا تو آپ نے سب کچھ اٹھا کر بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا۔یہی وہ مقام صدیقیت ہے جس کیلئے بطور اصطلاح یا استعارہ یہاں قرآن کریم نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔اور یہ ایک جامہ ہے جو حضرت صدیق اکبر پر راست آتا ہے۔ٹھیک کہا اقبال نے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کیلئے ہے خدا کا رسول بس

Marfat.com

3- شہید:۔

شہید کا معنی تو گواہ ہوتا ہے لیکن یہ لفظ بھی قرآن کریم میں بطور اصطلاح استعمال ہوا ہے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ شخص جو صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر اللہ کے کلمے کو بلند کرنے یا اسلامی ملک کے تحفظ کی خاطر یا مسلمانوں کے دفاع میں جان دے دیتا ہے ،اس کو شہید کہتے ہیں۔لیکن ایک دوسرے پہلو سے اس کے لفظی معنی اور اس کے اصطلاحی معنی میں یکسانیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔وہ اس طرح کہ جو آدمی اللہ کی دین کی سربلندی کیلئے سر کٹواتا ہے۔وہ درحقیقت اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے اس دین کی سچائی اور حقانیت میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اگر اس دین کی سچائی میں کوئی شبہ ہوتا تو میں اپنی زندگی جیسی انمول متاع کو کبھی اس پر قربان نہ کرتا۔آدمی کسی چیز کی صداقت کیلئے تین طریقوں سے گواہی دیتا ہے۔کبھی اپنی زبان سے اس کے حق میں کلمہ تائید کہہ کر اور کبھی اپنے عمل سے اسے اپنی زندگی کا طرزِ عمل بنا کر اور کبھی اس کیلئے مال و متاع اور بدرجۂ آخر جان دے کر،زبان سے دی ہوئی گواہی میں شبہ کیا جاسکتا ہے۔عمل پر بھی الزام دھرا جاسکتا ہے۔لیکن جو آدمی اپنا سب کچھ حتیٰ کہ زندگی بھی کسی صداقت پر قربان کر دیتا ہے اس پر شبہ کرنا سنگدلی یا کورذوقی کے سوا کچھ نہیں۔یہاں ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے کہ وہ لوگ جو اپنا سب کچھ اللہ کے راستوں میں قربان کر دیتے ہیں وہ اللہ کے ایسے گواہ ہیں جن سے دین کو قوت ملتی ہے۔انسانیت کو جلا ملتی ہے اور تاریخ آئندہ نسلوں کے لیے اسے ایک نمونے کے طور پر پیش کرتی ہے۔کیونکہ انہوں نے اپنا خون دیکر ایک ایسی روشنی مہیا کی ہے جو تادیر تاریکیوں کو کافور کرتی رہے گی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

4- صالحین:۔

یہ صالح کی جمع ہے،اس کا معنی ہے نیکوکار۔یعنی ایسا آدمی جو اپنے طرزِ عمل سے نیکی کی علامت بن جاتا ہے۔یہ بھی شریعت کی اصطلاح ہے۔اسے قرآن کریم نے مختلف جہتوں سے استعمال کیا ہے۔لیکن ہم اس کا صرف عام معنی عرض کر رہے ہیں۔ایک ایسا شخص جو فرائض ، واجبات ، اور مستحبات کا پابند، آداب شریعت کا لحاظ رکھنے والا،حقوق العباد کا ادا کرنے والا اور دین کے تقاضوں کو بجالانے والا ہو،اسے صالح کہتے ہیں۔

ان تینوں اصطلاحات کے ذکر کرنے سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم ،اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا راستہ ہے ۔لیکن اس پر چلتے ہوئے تمہارے سامنے یہ تین طرح کے معیارات رہنے چاہئیں۔تمہیں عام زندگی میں ایک صالح آدمی کی طرح زندگی گزارنا چاہیے۔لیکن اگر کبھی اسلامی حمیت یا اسلامی ضرورت قربانی و ایثار کا تقاضا کرے تو سر کٹوانے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔لیکن تمہارا اصل ہدف اس زندگی کا حصول ہے جس میں شہادت کی تڑپ اور حسن عمل کے نور کے ساتھ ساتھ آئینہ دل ایسی آب و تاب رکھتا ہو جس میں قرآن و سنت کے احکام اور اس راستے پر چلنے والوں کے اتباع کے سوا کوئی اور جذبہ اپنی جگہ نہ بنا سکے۔یہی وہ دل ہے جس پر بالآخر اللہ کے انوار اور رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔

Marfat.com

صراطِ مستقیم کی اس مثبت وضاحت کے بعد جس میں اس راستے پر چلنے والے ان نمائندہ لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کی حیثیت اس راستے کے رہنماؤں کی بھی ہے اور سنگ ہائے میل کی بھی۔ جن سے تاریخ کے ہر دور میں اس راستے پر چلنے والے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور اٹھاتے رہیں گے۔ کیونکہ مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب یہ تینوں نمونے مسلمانوں میں موجود نہ رہے ہوں۔ البتہ اس راستے کے ہر مسافر کیلئے انہیں تلاش کرنا ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی قابل قدر نعمت کبھی تلاش کئے بغیر نہیں ملا کرتی۔

ہر مسافر کیلئے جس طرح راستے کی پہچان اور راہنماؤں کی شناخت ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ راستے کی مشکلات اور منفی قوتوں کا بھی اسے علم ہو جو راستے میں اس کے لئے مشکلات کا باعث بن سکتی ہیں یا اس کے بہکانے کی کوشش کر سکتی ہیں۔ اسی طرح ان منفی قوتوں کے نمائندوں کی شناخت بھی ہونی چاہیے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ جو لوگ صراطِ مستقیم چھوڑ کر دوسرے راستوں پر چلتے رہے ان کا انجام کیا ہوا۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ارشاد فرمایا: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ (الفاتحہ:۷) ''جو نہ مغضوب ہوئے نہ گمراہ''۔

آیت نمبر ۷ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کی نعمت نازل فرمائی لیکن انہوں نے سرکشی کے سبب نہ صرف یہ کہ اس کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کی مخالفت کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے اور جن لوگوں نے اس کو ان کے سامنے پیش کیا ان کی بیخ کنی کی اور قتل کے درپے ہوئے جن کی پاداش میں ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور وہ ہلاک کر دیئے گئے۔

دوسرے وہ لوگ جنہوں نے قبول تو کیا لیکن دل کی آمادگی کے ساتھ نہیں بلکہ مارے باندھے قبول کیا، پھر بہت جلد شہوات نفس میں پڑ کر انہوں نے اس کے کچھ حصہ کو ضائع کر دیا، کچھ حصہ میں کتر بیونت کر کے اس کو اپنی خواہشات کے مطابق بنا لیا اور جن لوگوں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی یا ان کو صحیح راستہ پر لانا چاہا انہوں نے ان میں سے بعض کو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔ پچھلی امتوں میں اس کی سب سے واضح مثال یہود ہیں۔ چنانچہ ان کے معتوب و مغضوب ہونے کا ذکر قرآن میں تصریح کے ساتھ ہوا بھی ہے۔ مثلاً:

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ (مائدہ:۵. ۶۰)

(جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور خنزیر بنائے)

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (البقرة:۲. ۶۱. بقرة)

(اور ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر پلٹے)

ضَآلِّيْنَ سے مراد

ضَآلِّيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین میں غلو کیا، جنہوں نے اپنے پیغمبر کا رتبہ اتنا بڑھایا کہ اس کو خدا بنا کر رکھ دیا، جو صرف انہی عبادتوں اور طاعتوں پر قانع نہیں ہوئے۔ جو اللہ اور اللہ کے رسول نے مقرر کی تھیں۔ بلکہ اپنے جی سے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ جنہوں نے اپنے اگلوں کی ایجاد کی ہوئی بدعتوں اور گمراہیوں کی آنکھ بند کر کے پیروی کی اور اس طرح صراطِ مستقیم سے ہٹ کر گمراہی کی پگڈنڈیوں پر نکل گئے۔ پچھلی امتوں میں سے اس کی نہایت واضح مثال نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے انہی وجوہ کی بنا پر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ان کو گمراہ اور گمراہ کرنے والے قرار دیا ہے۔ مثلاً:

Marfat.com

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ غَيۡرَ الۡحَـقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ۠ (المائدہ: ۵۔۷۷)

(کہہ دو اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں و بدعتوں کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے گمراہ چلے آرہے ہیں اور جنھوں نے بہتوں کو اللہ کے راستہ سے بھٹکایا اور جو خود بھی اس کے رستہ سے بھٹکے)

مَغۡضُوۡبِ اور ضَّآلِيۡنَ کی مثال دینے سے مقصود کیا ہے؟

یہ دو طرح کے لوگ جن کی نشاندہی ہماری دعا کے جواب میں بطور خاص اس لئے فرمائی گئی ہے کہ اے امت مسلمہ کے لوگو جس طرح تم ایک حامل دعوت امت ہو اور جس طرح تم پر آخری کتاب اتری ہے اسی طرح ان لوگوں پر بھی اللہ کی کتابیں اتری تھیں۔ انہیں حامل دعوت امتیں بنایا گیا تھا۔ انہیں رہنمائی دینے کیلئے اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے اور بالکل انہی ذمہ داریوں سے انہیں گراں بار کیا گیا تھا جو ذمہ داریاں تمہارے حوالے کی گئی ہیں ان لوگوں نے جب اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کیں وہ یا تو انبیا و رسل کی دشمنی اور اللہ کی شریعت کی نافرمانی کے باعث اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اور یا اللہ کے نبیوں کی محبت میں غلو کے باعث شرک اور بدعات وخرافات کے ارتکاب کے مجرم ٹھہرے۔ یعنی یا تو انہیں شریعت کی دشمنی لے بیٹھی اور یا اللہ کے نیک بندوں کی محبت میں حد سے بڑھ جانا ان کی تباہی کا باعث بنا۔ دیکھنا تم یہ رویہ اختیار نہ کرنا تم آخری امت ہو آخری کتاب تم پہ نازل ہو چکی آخری رسول ﷺ تمہاری طرف مبعوث ہو چکے۔ تمہاری ہدایت کیلئے اب کوئی اور آنے والا نہیں آئے گا۔ اگر تم نے اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی برتی اور اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو غالب کرنے میں کمزوری دکھائی اور تم انہی راہوں میں چلے جن راہوں میں پہلی قومیں چل کر تباہ ہوئیں تو یاد رکھنا تم اس انجام سے نہیں بچ سکو گے جس انجام سے وہ دوچار ہو چکے ہیں۔ تمہاری عافیت، سرفرازی اور بقاء کا ایک ہی راستہ ہے کہ تم ان لوگوں کے راستوں پر چلو جن پر اللہ کا انعام ہوا، تا کہ تم بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرو۔

خلاصہ سورۃ

اس دعا پر یہ سورۃ تمام ہو جاتی ہے۔ اس کی تفصیلات اپنی ناچیز صلاحیت کے مطابق میں نے پیش کی ہیں۔ اب آپ پلٹ کر ان تفصیلات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس مختصر لیکن مقتدر سورۃ کو دیکھئے کہ سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں اور ہر بول پانچ لفظوں سے زیادہ نہیں اور ہر لفظ صاف اور دلنشین معنی کا نگینہ ہے جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔ پروردگار عالم کو مخاطب کر کے ان صفتوں سے پکارا گیا ہے جن کا جلوہ شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے۔ اگرچہ اپنی جہالت اور غفلت سے انسان اس میں غور و فکر نہیں کرتا۔ اس کے بعد اس کی بندگی کا اقرار ہے، اس کی مدد اور نصرت کا اعتراف ہے اور زندگی کی لغزشوں سے بچ کر سیدھی راہ پر چلنے کی طلب گاری ہے۔ کوئی مشکل خیال نہیں، کوئی انوکھی بات نہیں، کوئی عجیب وغریب راز نہیں۔ اب کے ہم بار بار یہ سورۃ پڑھتے رہتے ہیں اور صدیوں سے اس کے مطالب نوع انسانی کے سامنے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہمارے دینی تصورات کی ایک بہت ہی معمولی سی بات ہے لیکن یہی معمولی بات جس وقت تک دنیا کے

Marfat.com

سامنے نہیں آئی تھی اس سے زیادہ کوئی غیر معلوم اور ناقابل حل بات بھی نہ تھی۔ بظاہر یہ نہایت سلیس، سادہ اور دلنشین اندازِ بیان ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کا ایک ایک لفظ دینِ حق کے کسی نہ کسی اہم مقصد کو واضح کر رہا ہے۔ جس کا اندازہ آپ کو کسی نہ کسی حد تک گزشتہ تفصیلات سے ہو چکا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سورۃ کا پیرایہ دعائیہ ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر راست باز انسان جو خدا پرستی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اس کے دل سے اٹھنے والی آواز اور اس کے انگ انگ سے اٹھنے والی امنگ اگر الفاظ کا قالب اختیار کر لے تو اس کا انداز یقیناً اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ یہ سورۃ بظاہر فصاحت و بلاغت کا نادر روزگار مرقع ہے۔ لیکن بباطن خدا پرستی کے فکر و وجدان کا ایک ایسا سر جوش ہے جو ایک طالب صادق کی زبان پر بے اختیار ابل پڑا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ سرخوشی سے جھوم اٹھنے والی بات یہ ہے کہ جیسے ہی ایک بندہ سوز و گداز میں ڈوب کر ان کلمات کے ذریعے اپنے رب سے صراطِ مستقیم کی دعا کرتا ہے تو اس کا رب اس کے جواب میں پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی جس کی دعا تو نے مجھ سے کی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب بھی آدمی سورۃ فاتحہ کی صورت میں اپنے اللہ سے دعا کرے نماز کے اندر کرے یا نماز کے باہر تو آخر میں ”آمین“ ضرور کہے۔ یہ سورۃ فاتحہ کا حصہ تو نہیں لیکن اس کا کہنا سنت ہے۔ اس کے کہنے سے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق دعا کی قبولیت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

صدق الله العظيم

Marfat.com

سورة البقرة

آیت ۱ تا ۱۸۸

Marfat.com

Marfat.com

فهرست سورة البقرة

اَلْبَقَرَۃِ کا تعارف ---------- 106

اَلْبَقَرَۃِ اس سورۃ کا نام ہے عنوان نہیں: ---------- 106

سورۃ کے مکی اور مدنی ہونے کا مفہوم: ---------- 107

مشرکین مکہ کی خصوصیات: ---------- 108

ہجرت کے وقت مدینہ کا معاشرہ: ---------- 110

مدینہ کے یہود: ---------- 110

اسلامی دعوت نئے مراحل میں: ---------- 111

ایک مزید دوررس تبدیلی اور اس کے تقاضے: ---------- 112

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ ---------- 115

الٓمّٓ

حروف مقطعات کا تعارف: ---------- 116

اسم اشارہ قریب اور بعید کا مفہوم: ---------- 121

الکتاب کا مفہوم: ---------- 122

"لاریب" کا صحیح مفہوم اور اس کا صحیح محمل: ---------- 122

ھدًی کی وضاحت اور تسہیل: ---------- 125

تقویٰ کا مفہوم اور تقویٰ کے مدارج: ---------- 127

ہدایت اور تقویٰ میں چولی دامن کا ساتھ ہے: ---------- 128

تقویٰ سے پھوٹنے والی پہلی کونپل ایمان بالغیب ہے: ---------- 130

ایمان بالغیب کا مفہوم: ---------- 130

اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم ---------- 139

اقامتِ صلوٰۃ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری: ---------- 140

نماز کی پابندی نہ کرنا نفاق کی علامت ہے: ---------- 141

نماز کا اہتمام بحالی امن کا پیش خیمہ ہے: ---------- 143

نفاق کی حقیقت: ---------- 145

Marfat.com

رَزَقْنَاھُم کامفہوم: ---------- 146
ختم نبوت کی طرف اشارہ: ---------- 150
ایمان اور ایقان میں فرق: ---------- 152
ہدایت کا تکمیلی مفہوم: ---------- 152
انسانوں میں کوئی تفریق نہیں سوائے ایمان اور کفر کے: ---------- 153
کفر کا معنی اور مفہوم: ---------- 154
اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے کون مراد ہیں: ---------- 155
انذار کا مفہوم: ---------- 156
خَتَمَ کا مفہوم: ---------- 157
ایک سوال اور اس کا جواب: ---------- 159
"الناس" سے کون لوگ مراد ہیں؟: ---------- 163
نفاق کی مختلف شکلیں: ---------- 164
خدع اور مخادعت میں فرق: ---------- 165
مرض کا مفہوم: ---------- 167
فساد فی الارض کی حقیقت ---------- 169
اس آیت میں "الناس" سے کون مراد ہیں؟: ---------- 172
مقاصد اور ضروریات میں فرق نہ کرنا فتنہ ہے: ---------- 173
شیاطین کون ہیں؟ ---------- 177
اللہ کا مذاق: ---------- 177
اشتراء کا مفہوم: ---------- 179
منافقین کی دو تمثیلیں: ---------- 180
قرآن کی دعوت تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے: ---------- 186
عبادت کا مفہوم: ---------- 188
مِنْ قَبْلِکُمْ کا مفہوم: ---------- 189
توحید اور اللہ کی بندگی پر دلائلِ آفاق سے استدلال: ---------- 190
نباتات سے استدلال: ---------- 193
دلیلِ تخالف: ---------- 194

Marfat.com

عقیدۂ رسالت پر قرآنِ کریم سے استدلال: ---- 195
قرآنِ کریم پر کفار کے اعتراضات اور ان کا جواب: ---- 196
قرآنِ کریم کا چیلنج: ---- 197
بتوں کو عذاب دینے کی وجہ: ---- 197
وجوہِ اعجاز : ---- 198
الفاظ کا اعجاز: ---- 198
ترکیب کا اعجاز: ---- 200
اسلوب کا اعجاز: ---- 201
قرآنِ کریم کی پیش گوئیاں ---- 202
قرآنِ کریم کے انکشافات: ---- 205
عذابِ جہنم سے بچنے کیلئے اعمالِ صالحہ بھی ضروری ہیں: ---- 208
متشابھًا کا مفہوم ---- 209
ازواجِ مطھرۃ کا مفہوم: ---- 211
دفع دخلِ مقدر ---- 212
ہدایت و ضلالت کا قانون: ---- 214
فسق کا معنی و مفہوم: ---- 214
فاسق کی دو نمایاں علامتیں: ---- 215
عقیدۂ آخرت پر اماتت و احیا سے استدلال: ---- 216
اذ کا محلِ استعمال: ---- 221
خلیفہ سے کیا مراد ہے؟: ---- 222
فرشتوں کے سوال کا منشاء: ---- 223
علم الاشیاء کیا ہے؟ ---- 225
علم الاشیاء کو علم الاسماء سے کیوں تعبیر کیا گیا؟: ---- 226
سبحان......کلمۂ تنزیہ: ---- 228
خلافت آدم کے حوالے سے موجود مخلوقات کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہی اور امتحان: ---- 229
سجدہ کا مفہوم: ---- 229
ابلیس کی تحقیق: ---- 230

Marfat.com

حضرت آدم علیہ السلام کا امتحان: ---------- 232
ظلم کا مفہوم: ---------- 233
حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ کی حقیقت اور معصوم ہونے کا مفہوم: ---------- 234
حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے حکم کو کیسے بھول گئے؟: ---------- 234
اهبطوا کے حکم میں کون کون شامل ہیں؟: ---------- 235
تلقی کا معنی اور مفہوم: ---------- 236
توبہ کے دو بنیادی عناصر: ---------- 237
تاب کا معنی ومفہوم: ---------- 238
توبہ اسلام کا طرۂ امتیاز......اس کی حقیقت: ---------- 238
حکم میں اعادہ کا مفہوم: ---------- 239
بنی اسرائیل کا مفہوم اور ان کی مذہبی اور منصبی تاریخ: ---------- 243
مَآ اَنْزَلْتُ سے مراد: ---------- 248
مصدقاً کا مفہوم: ---------- 248
اول کافر کا مفہوم: ---------- 249
اہلِ کتاب کی اسلام دشمنی کا حقیقی سبب: ---------- 250
فارهبون اور فاتقون کا مفہوم اور دونوں میں فرق: ---------- 252
لا تلبسوا الحق بالباطل کا مفہوم: ---------- 252
اقامت الصلوۃ اور ایتاء الزکوۃ کا حکم یہود کے لیے: ---------- 255
اَلْبِرّ کا مفہوم: ---------- 256
عہد الٰہی کی پابندی کے لیے صبر اور نماز سے استعانت: ---------- 258
ظن کا مفہوم: ---------- 260
بنی اسرائیل کی فضیلت کی حقیقت: ---------- 263
شفاعت کی حقیقت: ---------- 265
آل کا مفہوم: ---------- 268
فرعون سے مراد: ---------- 268
یسومونکم کا مفہوم اور تفصیل: ---------- 268
بچوں کے قتل کا سبب: ---------- 269

Marfat.com

بنی اسرائیل کا بحرِ قلزم کو عبور کرنا:---------- 271
دریائے گنگا کا غائب ہو جانا:---------- 271
عبرت کے لیے فرعون کی لاش کا محفوظ رہنا:---------- 272
گوسالہ پرستی کا واقعہ:---------- 273
فرقان کو مفہوم:---------- 274
فاقتلوا انفسکم کا مفہوم:---------- 276
غضب الٰہی کا سبب اور اس کی صورت:---------- 277
اللہ کے احسانات:---------- 278
من وسلوٰی کی تحقیق:---------- 278
القریۃ کا مفہوم اور اس کا مصداق:---------- 280
سجداً کا مفہوم:---------- 280
حطۃ کی تحقیق:---------- 281
پانی کے لیے موسیٰ علیہ السلام کی دعا:---------- 283
ہر قبیلے کے لیے الگ الگ گھاٹ:---------- 284
نعمت کا حق:---------- 285
چند مشکل الفاظ کی تشریح:---------- 286
ادنیٰ اور خیر سے کیا مراد ہے اور تقابل کن دو چیزوں میں ہے:---------- 286
اِھبطوا مصراً کا مفہوم:---------- 288
بنی اسرائیل عبرت کے لیے زندہ ہے:---------- 289
بنی اسرائیل کے مبتلائے عذاب ہونے کی وجوہ:---------- 290
بغیر الحق کا مفہوم:---------- 290
اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا سے مراد:---------- 295
نصاریٰ کون ہیں؟:---------- 296
صابیوں سے کون مراد ہیں؟:---------- 296
اس آیت سے بعض لوگوں کے اخذ کردہ غلط مفہوم کی تردید:---------- 298
میثاق کا مفہوم:---------- 303
رَفعِ طور کا مفہوم:---------- 303

Marfat.com

کوہِ طور:---------- 304
ایک شبہ کا جواب: ---------- 305
امتِ مسلمہ کے لیے لمحہ فکریہ:---------- 306
نقض عہد کی مثال:---------- 307
یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟:---------- 307
مسخ حقیقی تھا یا معنوی:---------- 308
اس واقعہ میں مضمر نصیحتیں: ---------- 308
نقضِ عہد کی دوسری مثال: ---------- 312
دل کب سخت ہوتا ہے: ---------- 319
انسان کا پتھر سے زیادہ سخت ہونا حقیقت ہے:---------- 319
ایک التفات:---------- 321
تحریف کا مفہوم: ---------- 322
امی سے مراد:---------- 324
جہلاء کا دین صرف آرزوئیں ہیں:---------- 325
علماء یہود کے کرتوت: ---------- 326
جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال:---------- 327
ایاماً معدودۃ سے مراد:---------- 328
نجات اور عدم نجات کا قانون:---------- 329
عہد کے عناصر: ---------- 331
۱۔بندگی رب:---------- 331
۲۔والدین سے حسن سلوک: ---------- 332
۳۔ذوی القربیٰ' یتامیٰ اور مساکین سے حسن سلوک: ---------- 335
قولوا للناس حسنا کا مفہوم اور اس کی اہمیت:---------- 336
نماز اور زکوۃ کی اصل حیثیت:---------- 337
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ کا مفہوم:---------- 337
ایک اور عہد کا حوالہ:---------- 338
عہد کے حوالے سے بنی اسرائیل کا مضحکہ خیز رویہ:---------- 339

Marfat.com

امت مسلمہ کے لیے لمحۂ فکریہ: ---------- 340
بنی اسرائیل کا اصل مرض: ---------- 341
اشتراء کا مفہوم: ---------- 342
عہد کی یاد دہانی کا انتظام: ---------- 346
روح القدس کی تائید کے ذکر کا سبب: ---------- 347
یہود کے ایمان نہ لانے کا سبب: ---------- 348
قلوبنا غلف کا مفہوم: ---------- 349
یہود کا ایمان نہ قرآن پر نہ تورات پر: ---------- 352
ایک چیلنج: ---------- 354
اعجازِ قرآن کی دلیل: ---------- 355
درازیِ عمر کی خواہش ان میں مشرکین سے بھی زیادہ ہے: ---------- 355
حضرت جبرائیل سے دشمنی کا سبب: ---------- 358
قرآن کی صفات: ---------- 359
آیات بینات کی ایک جھلک: ---------- 361
ایک خبر جو بجائے خود حقانیت کی دلیل ہے: ---------- 362
رسول سے مراد: ---------- 363
قوموں کا زوال سحر و ساحری جیسی دلچسپیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے: ---------- 364
وما کفر سلیمان کا مفہوم: ---------- 465
ما انزل علی الملکین سے کیا مراد ہے؟: ---------- 366
اشیاء اور کلمات کے روحانی خواص کا علم: ---------- 368
فرشتوں کی معصومیت اور ان کی طرف سے تعلیم سے پہلے تنبیہ: ---------- 369
سحر کی حقیقت ---------- 369
سحر کی اقسام ---------- 370
سحر اور معجزے میں فرق ---------- 372
کیا انبیاء پر بھی جادو کا اثر ہو سکتا ہے؟ ---------- 373
یہود کے خبثِ باطن کا اظہار: ---------- 375
راعنا کا مفہوم: ---------- 376

Marfat.com

الفاظ اپنا وزن رکھتے ہیں اور ان میں ایک نفسیاتی اثر بھی ہے: ---------- 377
مشتبہ الفاظ سے سبھی مسلمانوں کو بچنا چاہیے: ---------- 377
معاندین کے باطن پر روشنی: ---------- 379
یہود کی ایک شرارت کا ذکر اور جواب: ---------- 380
نسخ کا مفہوم: ---------- 381
نسخ ارتقاء کا لازمی نتیجہ ہے: ---------- 381
نسخ کے ذریعے پہلی شریعتوں کی تسہیل، تجدید اور تکمیل ہوئی: ---------- 382
اسلامی شریعت میں نسخ کے حوالے سے معتزلہ کا موقف: ---------- 382
قرونِ اولیٰ میں نسخ کا مفہوم: ---------- 384
متاخرین کا نقطۂ نگاہ: ---------- 384
نسخ پر اعتراض کی اصل وجہ: ---------- 384
دلوں اور دماغوں کے مسموم کرنے کے لیے یہود کی مزید شرارتیں اور مسلمانوں کو تنبیہ: ---------- 385
یہود کی شرارتوں پر برہمی کی بجائے عفو و صفح کی ہدایت: ---------- 387
معرکہ سر پر ہے، تیاری کرو: ---------- 388
راہِ نجات کیا ہے؟: ---------- 389
اصولِ نجات: ---------- 390
لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون جنت کی تعبیر ہے: ---------- 391
یہود و نصاریٰ کے باہمی تعلقات کی حقیقت: ---------- 394
مسلمانوں سے دشمنی نے ان کو متحد کر رکھا ہے: ---------- 395
ایک دوسرے کے معابد کی تخریب اور ان میں عبادت سے روکنا: ---------- 396
ولد کی تحقیق: ---------- 398
حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق عیسائیوں کی گمراہی: ---------- 398
اللہ کو بیٹا بنانے کی تردید: ---------- 399
بدیع کا مفہوم: ---------- 399
مشرکین کے بعض مطالبات کا جواب: ---------- 400
اہلِ کتاب کی اصل بیماری کا تجزیہ: ---------- 403
صالحین اہلِ کتاب: ---------- 405

Marfat.com

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعارف: ---------- 408

ابتلاء کا مقصد: ---------- 409

کلمات سے کیا مراد ہے؟: ---------- 410

بیٹے کی قربانی کا کٹھن امتحان: ---------- 411

کلمہ کے ایک اور پہلو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت: ---------- 413

امامت کا منصب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفات کا امین: ---------- 413

البیت کا مفہوم: ---------- 415

یہود کی تحریفات پر تنقید: ---------- 415

مثابة کا مفہوم: ---------- 416

امنا کا مفہوم اور اس کی وضاحت: ---------- 417

مقام ابراہیم سے کیا مراد ہے؟: ---------- 418

صاف رکھنے کا مفہوم: ---------- 418

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تعارف: ---------- 420

مومنین کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں (امن اور رزق عطا فرما): ---------- 421

دونوں دعائیں کس طرح قبول ہوئیں؟: ---------- 422

ایک مثال کا جواب: ---------- 423

امامت صالحہ اور رزق دنیا میں فرق ہے: ---------- 423

تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا: ---------- 424

دعا کی وضاحت: ---------- 425

دعاؤں کا انداز دعا کا شعور بخشتا ہے: ---------- 425

اراءة کا مفہوم: ---------- 427

مناسک کی تحقیق: ---------- 427

توبہ کا مفہوم: ---------- 428

ربنا سے صفت ربوبیت کی توجہ دلا کر رسالت پر دلیل قائم کی: ---------- 428

بعثت رسولؐ کے تین مقاصد: ---------- 430

تلاوت اور تعلیم کو الگ الگ بیان کرنے کی وجہ: ---------- 430

آیات قرآنی کی تحقیق: ---------- 431

Marfat.com

تلاوتِ آیات: ---------- 432
تعلیم کتاب وحکمت: ---------- 432
حکمت کیا ہے؟ ---------- 433
تزکیۂ نفوس کا مفہوم: ---------- 433
تزکیہ کے لیے صحبتِ صالح ضروری ہے: ---------- 435
کیفیت سے کیفیت پیدا ہوتی ہے: ---------- 436
ملت ابراہیم کا مفہوم: ---------- 440
اسلام کا مفہوم: ---------- 441
حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت: ---------- 443
وصیت کا نفسیاتی پہلو: ---------- 444
تورات سے قرآن کی تائید: ---------- 445
ان وصیتوں کی واضح حکمتیں: ---------- 445
بحث کو سمیٹ کر ایمان وعمل اور آخرت کی جواب دہی کی طرف متوجہ کیا گیا: ---------- 446
یہودیت اور نصرانیت کے برسر باطل ہونے پر مضبوط دلیل: ---------- 447
حنیف کا مفہوم: ---------- 449
یہود ونصاریٰ کی دعوت کے جواب میں کلمۂ جامعہ: ---------- 449
کلمۂ جامعہ پر ایمان اور ایمان کے لیے نمونہ: ---------- 451
مسلمانوں کی ذمہ داری: ---------- 453
یہود ونصاریٰ پر تعریض: ---------- 454
اللہ کا رنگ عبدیت کا رنگ ہے: ---------- 454
یہود ونصاریٰ سے اظہارِ برأت: ---------- 455
بنی اسرائیل پر تنقید سے مترشح ہونے والی حکمتیں: ---------- 456
تحویلِ قبلہ کی تمہید: ---------- 457
یہود کو بے وقوف قرار دینے کی وجہ اور متوقع ردعمل کا ذکر: ---------- 461
کَذٰلِکَ کا مفہوم: ---------- 462
امت مسلمہ کے امت وسط ہونے کا مفہوم: ---------- 463
امت وسط عقائد کے اعتبار سے: ---------- 464

Marfat.com

عبادت کے اعتبار سے:---------- 465
معاشرت اور تمدن کے حوالے سے:---------- 465
امت وسط کا فریضۂ منصبی شہادت حق:---------- 466
تحویلِ قبلہ اتباع رسول ؐ کا امتحان بھی ہے:---------- 469
ایک سوال کا جواب:---------- 470
یہ ہے تحویلِ قبلہ کا حکم:---------- 472
کعبہ کے بجائے مسجد حرام کی طرف پھرنے کے حکم سے متعدد مصالح کی طرف اشارہ:---------- 473
آنحضرت ﷺ کو تسلی:---------- 474
اہلِ کتاب کی اتباعِ حق سے محرومی:---------- 475
شریعت کے بارہ ان کا غیر سنجیدہ رویہ:---------- 475
بظاہر عتاب آپ ؐ پر حقیقت میں اہلِ کتاب پر:---------- 475
کُل کا مفہوم وِجْهَةٌ کا مفہوم:---------- 478
تحویلِ قبلہ پر واقعاتی اور نقلی دلیل:---------- 478
آپ کی جہت اور منزل معین ہوگئی اب آپ منزل کی طرف سبقت کریں:---------- 479
سفر اور حضر میں ایک ہی حکم ہے:---------- 480
اس آیت میں تاکید مزید کے ساتھ تحویل قبلہ کی تین حکمتیں:---------- 481
تشبیہ کس چیز کی؟:---------- 484
وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ کا مفہوم:---------- 484
اللہ تعالیٰ اور اس امت کے درمیان ایک معاہدہ:---------- 486
آیت کا پس منظر اور تہہ منظر:---------- 490
آیت کا پیش منظر:---------- 491
خطرات اور مشکلات کا علاج:---------- 491
نماز سے مدد:---------- 493
زندگی اور موت سے متعلق اسلامی تصور:---------- 494
آئندہ پیش آنے والی مشکلات کی طرف اجمالی اشارہ:---------- 496
مومن کی آزمائش سنت اللہ ہے:---------- 497
خوف:---------- 498

Marfat.com

معاشی مشکلات: ---------- 498
مال اور جان کی کمی: ---------- 498
ثمرات میں کمی: ---------- 499
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ: ---------- 499
اصل سلسلۂ کلام کی طرف رجوع: ---------- 501
صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں: ---------- 501
شعائر اللہ کا تعارف: ---------- 502
جمرات: ---------- 503
شعائر کے سلسلے میں چند یاد رکھنے کی باتیں: ---------- 504
یہود کے بعض جرائم: ---------- 506
لعنت کا مفہوم: ---------- 506
توبہ کے لیے شرط: ---------- 508
قرآنِ کریم میں کفر کا مفہوم: ---------- 508
توحید ہی اسلام کا مبدأ و معاد ہے: ---------- 509
مخلوق سے خالق پر استدلال: ---------- 513
کائنات کے نظم سے استدلال: ---------- 514
قولِ فیصل: ---------- 516
اَنْدَادً کا مفہوم: ---------- 517
مومن سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے: ---------- 518
قوت کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے: ---------- 519
متبوعین کی تابعین سے براءت: ---------- 520
تابعین کا ردِ عمل: ---------- 520
شرک کی ایک اور صورت سے اجتناب کا حکم: ---------- 523
سوء اور فحشاء کا مفہوم: ---------- 524
امر کا معنی و مفہوم: ---------- 525
آباؤ اجداد کی اندھی تقلید: ---------- 526
صورتِ حال کی تمثیل صورتِ حال ہے: ---------- 528

Marfat.com

تشبیہ اور تمثیل میں فرق:---------- 528
بدعات وخرافات کا ابطال دلائل سے بھی ہوتا ہے اور مستحکم کردار سے بھی:---------- 529
ملتِ ابراہیم میں حلال وحرام:---------- 531
ایک غلط فہمی کا ازالہ:---------- 531
میتۃ سے متعلق احکام کی وضاحت:---------- 533
اضطرار کا مفہوم:---------- 538
رخصت اور عزیمت میں راہِ اعتدال:---------- 538
اہل کتاب کی بعض تحریفات:---------- 539
اہلِ کتاب پر عتاب:---------- 540
عتاب کا سبب:---------- 542
البر کا مفہوم:---------- 545
وفاداری کے ایفاء کے لیے تین ناگزیر باتیں:---------- 545
حب دنیا میں بے اعتدالی بہت سی خرابیوں کا باعث ہے:---------- 548
آنحضرت ﷺ کی پریشانی کا اصل سبب:---------- 549
علیٰ حبہ کا مفہوم:---------- 550
قرابتداروں پر خرچ کرنا:---------- 552
یتیموں مسکینوں کی دیکھ بھال:---------- 553
مسافر کی مدد:---------- 553
السآئلین:---------- 553
وَفِي الرِّقَاب:---------- 554
قصاص کا معنی ومفہوم:---------- 559
ایک آدمی کا قتل، جسدِ امت کے ایک عضو کا کٹ جانا ہے:---------- 559
ایک آدمی کا قتل انسانیت کا قتل ہے:---------- 560
قتل اللہ تعالیٰ کے قانون کی پامالی ہے:---------- 560
قصاص کی روح کو زندہ کرنے والی ہدایت:---------- 561
معروف کا مفہوم:---------- 562
اعْتَدٰی کا مفہوم:---------- 563

Marfat.com

قصاص میں زندگی ہے:---------- 564

مجرمانہ ذہنیت کا علاج عقل اور حکمت سے ہونا چاہیے:---------- 564

مغرب اور امریکہ کو مظلوم سے زیادہ ظالم سے ہمدردی ہے:---------- 565

حرمتِ جان کے بعد حرمتِ مال:---------- 565

حرمتِ قانون کا عارضی قانون:---------- 566

مال خیر ہے:---------- 567

وصیت سے متعلق تفصیل:---------- 567

گواہوں کی عظیم ذمہ داری:---------- 568

وصیت کرنے والے کو بھی حق تلفی سے روکا جائے:---------- 569

روزہ ہر امت پر فرض کیا گیا ہے:---------- 572

روزہ کے تین مقاصد:---------- 573

1- تقویٰ:---------- 573

2- اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا یقین:---------- 577

3- شکر:---------- 578

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد کیا ہے؟:---------- 580

مریض اور مسافر کا مفہوم شرعی نقطہ نظر سے:---------- 581

یُطِیْقُوْنَہٗ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟:---------- 582

فدیہ کا مفہوم:---------- 584

رمضان کی فضیلت کا حقیقی سبب:---------- 585

الھدیٰ:---------- 587

بینات:---------- 587

الفرقان:---------- 588

رمضان سے متعلق چند مسائل:---------- 589

آیت کے پس منظر پر ایک نظر:---------- 591

عبادت گزار بندے کے احساسات:---------- 591

فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ:---------- 594

ایک غلط فہمی کا ازالہ:---------- 594

Marfat.com

آیت کے پس منظر سے متعلق تین باتیں:---------- 596
رات کو دن کی طرح پابندی کیوں نہیں لگائی گئی:---------- 597
لباس کا مفہوم:---------- 598
ازدواجی زندگی کا اصل مقصد:---------- 599
اعتکاف کی حقیقت:---------- 599
اعتکاف کے مسائل:---------- 600
اسلام کے نظامِ معاش کی اساس حلال و حرام کی پابندی پر ہے:---------- 602
رشوت معاشرے کے لیے تباہ کن ہے:---------- 604

☆☆☆☆☆☆

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ کے بعد سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ قرآن کریم کی پہلی سورة ہے۔احادیث اور آثار صحابہ میں اسی نام سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔حدیث میں اس کے اور نام بھی آئے ہیں، جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔اسے آنحضرت ﷺ نے ''سنام القرآن'' اور ''ذروۃ القرآن'' سے بھی یاد فرمایا ہے۔''ذروۃ'' اور ''سنام'' ہر چیز کے اعلیٰ اور افضل حصہ کو کہا جاتا ہے۔یہ سورۃ قرآن کریم کا ''سنام'' یا ''ذروۃ'' ہے۔یعنی قرآن کریم کی چوٹی، اس کا سب سے اہم حصہ اور سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والی سورتوں میں سے ایک ہے۔حضرت ابو ہریرۃ ص سے ایک حدیث مروی ہے۔جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ اس سورۃ میں ایک آیت ایسی ہے، جو تمام آیاتِ قرآن میں افضل واعلیٰ ہے۔اور وہ ''آیت الکرسی'' ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سورۃ بقرۃ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص رات میں ان کو پڑھ لے۔تو اس رات کو جن یا شیطان گھر میں داخل نہیں ہوگا اور اس کو اور اس کے اہل وعیال کو، اس رات میں کوئی آفت یا کوئی ناگوار چیز پیش نہیں آئے گی اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑھی جائیں، تو اسے افاقہ ہو جائے گا۔ان شاء اللہ۔وہ دس آیتیں یہ ہیں۔چار سورۃ کے آغاز سے، ایک آیت الکرسی، دو آیتیں اسکے بعد کی اور تین آیتیں آخر سورۃ بقرۃ کی۔(ابن کثیر)

احادیث میں اس طرح کے اور بھی فضائل کا ذکر کیا گیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اپنے فضائل کے اعتبار سے بھی بے حد اہمیت کی حامل ہے اور جہاں تک اس میں بیان کردہ تعلیمات اور اصلاحات کا تعلق ہے، اس کا تو اندازہ سورۃ کے پڑھنے والے کو بخوبی ہو جاتا ہے۔زندگی کی بیشتر ضرورتوں کو، اس سورت میں زیر بحث لایا گیا ہے اور ان سے متعلق احکام دیئے گئے ہیں۔یہ سورۃ احکام کے تنوع اور تعلیمات کی وسعت کے لحاظ سے قرآن پاک کی باقی سورتوں میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔

البقرۃ اس سورۃ کا نام ہے عنوان نہیں

جیسا کہ ہم نے گزارش کی ہے ''البقرۃ'' اس سورۃ کا باقی سورتوں کی طرح نام ہے، عنوان نہیں۔آج کا طرزِ نگارش یہ ہے کہ ہم جب کسی مضمون پہ قلم اٹھاتے ہیں، تو سب سے پہلے اس کی پیشانی پر اس کا عنوان لکھا جاتا ہے۔جس سے پڑھنے والے کو یہ اندازہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ اس مضمون میں کس حوالے سے بحث کی گئی ہے اور اس کے مندرجات کا تعلق کس مبحث سے ہے۔لیکن قرآن کریم کی سورتوں میں کسی سورت کا بھی، اس طرح کا عنوان تجویز نہیں کیا گیا بلکہ ہر سورۃ کا نام رکھا گیا ہے۔کیونکہ قرآن کریم کی اکثر سورتوں میں، اس قدر متنوع

Marfat.com

مضامین بیان ہوئے ہیں اور اس طرح انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کے بارے میں ہدایات دی گئیں ہیں کہ انہیں کسی ایک عنوان کے تحت سمیٹنا ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ لیکن قرآن کریم کلام اللہ ہونے کے باوجود، جس عربی زبان میں نازل ہوا ہے، وہ اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود بہر حال ایک انسانی زبان ہے۔ جس میں ہر لفظ کے معنی اور حدود مقرر ہیں۔ اس زبان میں بھی باقی زبانوں کی طرح الفاظ میں اتنی وسعت ہرگز نہیں، کہ قرآن کریم کی سورتوں میں بیان کردہ متنوع احکام اور مضامین کو کسی ایک لفظ کے تحت سمیٹا جا سکے۔ اس لئے قرآن پاک میں بجائے عنوان مقرر کرنے کے، سورتوں کے نام مقرر فرمائے گئے ہیں۔ کیونکہ نام میں معنی مقصود نہیں ہوتا، بلکہ صرف مسمّٰی کا تعین اور شناخت مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً اگر آپ یہ کہیں کہ برکت اللہ کو بلا کر لاؤ، تو برکت اللہ سے مراد وہ شخص ہوگا، جس کا یہ نام ہے، اس سے اللہ کی برکت مراد نہیں ہوگی۔ اسے بلانے والا اللہ کی برکت تلاش نہیں کرے گا، بلکہ اس اسم کے مسمّٰی کو تلاش کرے گا۔ اسی طرح اس سورۃ کا نام، ''البقرۃ'' رکھنے سے صرف اس کی شناخت مقصود ہے۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ اس میں البقرۃ، یعنی گائے پر کوئی مضمون لکھا گیا ہے۔ جس سورۃ میں جو بھی اہم واقعہ ذکر ہوا ہے، جو عام طور پر آسانی سے ذہنوں میں رہ جاتا ہے۔ پروردگار نے عموماً ایسے ہی کسی واقعے کو سورۃ کا نام رکھ دیا ہے۔ تاکہ اس کے یاد رکھنے اور شناخت میں آسانی رہے۔ اس سورۃ میں بھی بنی اسرائیل کے واقعات کے سلسلے میں گائے کا ایک دلچسپ واقعہ مذکور ہوا ہے، اسی کی نسبت سے اس سورۃ کا نام ''البقرۃ'' رکھ دیا گیا ہے۔

سورۃ کے مکی اور مدنی ہونے کا مفہوم

یہ سورۃ مدنی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن پاک کی سورتوں کی تقسیم یا شناخت کے سلسلے میں مکی یا مدنی ہونا بھی ایک حوالہ ہے۔ اس سے سورتوں کی شناخت میں بھی مدد ملتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اہل علم کو اس کے مضامین سمجھنے میں بھی آسانی ہو جاتی ہے کیونکہ جیسے ہی یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے یا مدنی، تو فوراً اس سورۃ کا زمانہ نزول، پس منظر، تاریخ اور واقعات سے قرائن کا تعین آسان ہو جانے کے باعث احکام کو سمجھنے اور بعض احکام کی توجیہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے سورتوں کی مدنی اور مکی تفصیل بہر حال ایک اہمیت کی حامل ہے۔ اسی اہمیت کے باعث یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ پیش نظر سورۃ مکی ہے یا مدنی۔ مکی اور مدنی کے الفاظ بظاہر یہ خبر دیتے ہیں، کہ کسی سورۃ کے مدنی ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور مکی ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے۔ یہ بات جزوی طور پر تو صحیح ہے، کلی طور پر نہیں۔ اس کا مکمل مفہوم یہ ہے کہ جو سورۃ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی، چاہے وہ مکہ میں نازل ہوئی ہو یا مکہ سے باہر یا معراج کو جاتے ہوئے فضا میں یا آسمانوں پر، وہ بہر حال مکی ہے اور مدنی ہونے کے مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہو۔ چاہے مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہو یا باہر کسی جگہ۔ حتیٰ کہ اگر وہ ہجرت کے بعد مکہ مکرمہ میں بھی نازل ہوئی ہے، تب بھی وہ مدنی کہلائے گی۔ کیونکہ ہجرت کے بعد بعض ایسی بھی آیات ہیں، جو اس وقت نازل ہوئیں، جب آپ ﷺ چھ ہجری میں عمرہ کرنے کے ارادہ سے مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تھے اور وہ آیات بھی جو عمرہ سے واپسی پر، حالت سفر میں، آپ ﷺ پر نازل ہوئیں، جیسے ''سورۃ الفتح''۔ سورۃ الفتح سفر کے دوران حدیبیہ سے واپسی پر نازل ہوئی۔ اسی طرح جب آپ ﷺ دس ہجری میں حج کیلئے تشریف لائے، تو بعض آیات حج کے دوران نازل ہوئیں، جن میں سے تکمیل دین کی آیت بہت مشہور ہے۔

Marfat.com

سورۃ البقرۃ چونکہ مدنی ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت نہ صرف یہ کہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے بلکہ ہجرت کے ابتدائی سالوں میں اس کا نزول ہوا ہے۔البتہ اس کی بعض آیات ایسی ہیں، جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں۔مثلاً ''سورۃ بقرۃ'' کی آخری آیات، وہ مکہ معظمہ میں معراج کے سفر میں نازل ہوئیں۔لیکن انہیں اللہ کے حکم سے، رسول اللہ ﷺ نے اس سورۃ کے آخر میں لکھنے کا حکم دیا۔اسی طرح بعض آیات ایسی ہیں۔جو ہجرت کے جلدی بعد نہیں، بلکہ مختلف اوقات میں نازل ہوئیں۔بالخصوص سود سے متعلقہ آیات، وہ تو آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری دنوں میں نازل ہوئیں لیکن مضمون کی مناسبت سے، آنحضرت ﷺ نے انہیں بھی اس میں شامل کرنے کا حکم فرمایا۔

یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ یہ سورۃ مدینہ طیبہ میں ابتدائی سالوں میں نازل ہوئی ہے۔تو ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہوجاتا ہے، کہ جب اس سورۃ کا نزول ہوا ہے، تو مسلمانوں کو کس طرح کے حالات سے واسطہ تھا۔اس طرح سے اس سورۃ کے مندرجات کے پس منظر کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مشرکین مکہ کی خصوصیات

مکہ معظمہ میں آنحضرت ﷺ کی دعوت کو صرف مشرکین مکہ سے واسطہ تھا۔اُن کی چند خصوصیات تھیں۔جنہیں سمجھ لینے سے اسلامی دعوت کو جو حالات درپیش تھے، انہیں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مشرکین مکہ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑتے تھے اور اپنے آپ کو ملت ابراہیم سے متعلق ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔لیکن حقیقت میں، وہ سوائے اس کے کہ اللہ کو بطور خالق و مالک تسلیم کرتے تھے اور اس کی ذات اور بعض صفات کا اعتراف کرتے تھے۔لیکن اس سے زیادہ وہ کسی چیز سے واقف نہیں تھے۔بلکہ وہ دین کی بنیادی باتوں سے بھی بے بہرہ تھے۔وہ نہیں جانتے تھے کہ توحید، رسالت اور آخرت کیا چیزیں ہیں اور انسانی زندگی کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہے۔وہ اگرچہ بعض اخلاقی خوبیوں کے معترف تو تھے، لیکن ان خوبیوں کو اللہ کے احکام کے طور پر قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ان میں بعض مکارم اخلاق ابھی تک زندہ تھے۔وہ یقیناً حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی دینی وراثت تھی، جس کا کچھ اثر ان میں باقی تھا۔لیکن وہ انہیں عرب خصوصیات کے طور پر پہچانتے تھے۔وحی الٰہی کا تصور، ان کیلئے بالکل ایک اجنبی چیز تھا۔ان بنیادی دینی تشخصات کے ساتھ ساتھ مزید مشکل یہ تھی کہ وہ علم کی ہر بات سے کورے تھے۔مکہ معظّمہ اگرچہ پورے جزیرۂ عرب میں ہر لحاظ سے ایک منفرد حیثیت کا حامل تھا۔غیر ملکی اسفار کے باعث ان کا ذہنی افق دنیوی معاملات میں دوسرے لوگوں سے زیادہ روشن تھا۔لیکن یہ اپنے دینی تصورات میں چونکہ نہایت متعصب واقع ہوئے تھے۔اس لئے کسی قسم کا بیرونی اثر قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔مزید مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کو ہدایت کی علامت سمجھتے تھے۔اس لئے ان کی دینی وراثت میں سے کسی چیز کو بھی چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے، بلکہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے مقابلے میں بھی، وہ اپنے آباؤ اجداد کو دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ہر جاہل معاشرے میں یہ خصوصیت موجود ہوتی ہے کہ جب بھی انہیں ان کے معتقدات سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو وہ شروع میں ناراض ہوتا ہے اور پھر مشتعل ہوجاتا ہے، یہی کیفیت ان کی بھی تھی۔البتہ اس طرح کے بند معاشروں میں ترجیحات واضح ہوتی ہیں کہ وہ جس چیز کو مانتے ہیں، تو اخلاص سے مانتے ہیں اور جس کا انکار کرتے ہیں، تو اس کو زندگی موت کا مسئلہ بنالیتے ہیں۔ان میں نفاق نہیں ہوتا۔غلط راستے پر چلتے ہیں، تو یکسو ہوکر اور صحیح راستے کی طرف آتے ہیں، تو ہر طرف سے کٹ کر۔مکہ والوں کا بھی یہ حال تھا۔آنحضرت ﷺ کو جب ان کی

Marfat.com

ہدایت کا حکم ملا، تو آپ ﷺ کو ان دیواروں سے سر پٹخنا پڑا۔ شدید مخالفت ہوئی، اشتعال دشمنی تک کو چھونے لگا، لیکن انہی میں سے سعید روحیں چھن چھن کر ہدایت کی طرف آنے لگیں۔ اس طرح سے اگر مخالفین نے مخالفت اور عناد کی مثالیں قائم کیں، تو اصحاب ایمان نے بھی استقامت اور قربانی کی شمعیں روشن کیں۔ لیکن اس پوری صورتحال میں ایک حقیقت ایسی بھی ہے، جس کی طرف پوری طرح توجہ دی جانی چاہیے۔ وہ یہ کہ مکہ کا معاشرہ قبیلوں پر مشتمل معاشرہ تھا۔ قبائل پر مشتمل معاشرے میں ایک عجیب بات یہ ہوتی ہے، کہ قبیلے سے وابستگی بجائے خود ایک ایسی عصبیت کا نام ہے، جو بعض دفعہ باقی عصبیتوں پر بھی غالب آجاتی ہے۔ اس کے جہاں نقصانات ہیں وہیں کچھ فوائد بھی ہیں۔ کسی قبیلے کیلئے دوسرے قبیلے کے کسی آدمی کو قتل کر دینا آسان نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ایسا واقعہ ہو جائے، تو مقتول کا پورا قبیلہ، اپنے حمائتی قبیلوں سمیت، قاتل قبیلے کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس وقت تک حالات روبہ اصلاح نہیں ہوتے، جب تک قاتل کو قصاص میں قتل نہ کر دیا جائے۔ اس لئے اس معاشرے میں آنحضرت ﷺ کو انتہائی مخالفت کے باوجود، ایک تحفظ بھی حاصل تھا۔ اللہ کی طرف سے حفاظت تو ہر پیغمبر کے ہم رکاب رہتی ہے۔ لیکن ظاہری تحفظات میں سے آنحضرت ﷺ کو یہ تحفظ میسر تھا، جس کو باقی قبائل بھی سمجھتے تھے کہ اگر آنحضرت ﷺ پر کسی ناپاک ارادے سے ہاتھ ڈالا گیا، تو بنو ہاشم اور اس کے حلیف قبیلے، باوجود اس کے کہ سارے مسلمان نہیں ہوئے، پھر بھی وہ خاموش نہیں رہیں گے اور اس طرح سے ایک ایسی آگ بھڑکے گی، جس کے نتیجے میں صرف حرم کا احترام ہی مجروح نہیں ہوگا، بلکہ قریش کی قوت بھی داؤ پر لگ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کی زندگی میں، اہل مکہ نے آپ ﷺ کی اور مسلمانوں کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ لیکن وہ آنحضرت ﷺ یا مسلمانوں کو ختم کر دینے کا ناپاک اقدام کبھی نہ کر سکے۔ وہ مسلمانوں کو اذیتیں تو دیتے تھے، لیکن ایک آدھ کسی لونڈی کے قتل کے واقعے کے سوا، کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا حالانکہ مسلمانوں کی اکثریت حبشہ یا دوسرے علاقوں میں ہجرت کر کے جا چکی تھی۔ اس طرح ان کے سامنے کوئی بڑی مدافعت بھی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی ان کی طرف سے کسی بڑے اقدام کا نہ ہونا، یہ صرف اس تحفظ کی وجہ سے تھا، جو قبائل کی زندگی میں ایک بڑے عنصر کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ ممکن ہے آپ کو یہ خیال آئے کہ قریش نے بالآخر آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ تو بنایا تھا، اگر چہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ منصوبہ اس وقت بنا جب ابو طالب اور حضرت خدیجہ ؓ انتقال فرما چکے تھے اور اب بنو ہاشم کی سرداری ابولہب کے ہاتھ میں آچکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ میں محمد ﷺ کی حفاظت کی ذمہ داری سے دست بردار ہوتا ہوں۔ چنانچہ جیسے ہی آنحضرت ﷺ قبیلے کی حفاظت سے محروم ہوئے، تو دوسرے لوگوں کو آپ ﷺ کے خلاف اس طرح کی منصوبہ بندی کرنے کا موقع ملا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اب ہم نے کوئی ایسی حرکت کی تو بنو ہاشم ہم سے اس خون کا بدلہ لینے کی کوشش نہیں کریں گے اور جب بنو ہاشم ہی اس دعویٰ سے ہی دست بردار ہو جائیں گے، تو حضرت خدیجہ ؓ کا خاندان، جو صرف حضرت خدیجہ ؓ کی وجہ سے آپ کی پشت پر تھا، وہ بھی کسی طرح کی مزاحمت کی کوشش نہیں کرے گا۔ ہماری ان گذارشات سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مکہ معظمہ میں اسلامی دعوت کو کس طرح کے حالات سے واسطہ تھا۔ وہاں اگر چہ دشمنی بے حد تھی، لیکن ایک طرح سے قبیلے کا تحفظ بھی حاصل تھا۔ وہاں جو کچھ بھی خطرہ تھا، وہ ایذا رسانی کی حد تک تھا۔ اس سے آگے بڑھنے کا امکان بہت کم تھا اور مزید یہ کہ اس جاہل معاشرے میں ایمان اور کفر کی ترجیحات واضح تھیں۔ جو وفادار تھے وہ آخر وقت تک وفادار تھے اور جو مخالف تھے وہ پوری صراحت کے ساتھ مخالف تھے۔ اس طرح اپنوں اور دشمنوں کی دو الگ الگ صفیں تھیں۔

Marfat.com

ہجرت کے وقت مدینہ کا معاشرہ

لیکن مدینہ طیبہ میں آکر آنحضرت ﷺ کو بالکل مختلف صورتحال سے واسطہ پڑا۔ یہاں کا معاشرہ ہر لحاظ سے ایک منقسم معاشرہ تھا۔ اس معاشرے میں ایک طرف اوس وخزرج کے دو قبیلے تھے۔ جو اپنی جہالت اور بے خبری میں تو قریش جیسے ہی تھے۔ لیکن دوستی اور دشمنی اور ایمان وکفر میں قریش کی طرح کی صلابت ان میں کم تھی۔ اگر چہ ان میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی، جو قریش کی طرح ایمان میں بھی راسخ اور ایمان نہ لانے کی صورت میں کفر میں راسخ تھے۔ لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی، جو حالات کے بہاؤ کے ساتھ بہتے اور ہوا کا رخ دیکھ کر اپنی سمت بدلتے انہیں دیر نہیں لگتی تھی۔ یہی وہ لوگ تھے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ اوس وخزرج کی واضح اکثریت اسلام کی آغوش میں چلی گئی ہے، تو انہوں نے نفاق کا لبادہ اوڑھ لیا۔ بظاہر اسلام کا دعویٰ کرنے لگے، تاکہ اپنے قبیلے کی اکثریت کے ساتھ ان کے لئے رہنا آسان ہو جائے۔ لیکن بباطن ان کی ہمدردیاں کفر کے ساتھ رہیں اور پھر اس میں بھی وہ سارے یکساں نہیں تھے، بلکہ ان کے ایک سے زیادہ روپ تھے۔ جسے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے۔

مدینہ کے یہود

مدینے کے معاشرے میں تیسرا عنصر یہود کا تھا اور یہ قریشِ مکہ اور اوس وخزرج سے بالکل الگ پس منظر رکھتا تھا اور الگ مزاج کا حامل تھا۔ یہ لوگ دینی اعتقادات اور دینی تشخصات سے بے بہرہ نہ تھے۔ یہ لوگ توحید، رسالت، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے اور اس ضابطہء شرعی کو تسلیم کرتے تھے، جو اللہ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ یہ درحقیقت اپنے دور کے بگڑے ہوئے مسلمان تھے۔ مسلسل انحطاط اور زوال نے انہیں اس حد تک بگاڑ دیا تھا کہ جن بداخلاقیوں اور برائیوں سے ہر دور میں اللہ کے دین نے روکا ہے، یہ من حیث القوم ان برائیوں میں مبتلا تھے۔ ان کا مذہبی طبقہ جن کے سپرد ان کی اصلاح کا کام تھا، وہ بجائے خود اس حد تک گمراہ ہو گیا تھا کہ اللہ کی کتاب میں تحریف یا ترمیم کر دینا، ان کا دینی مزاج بن گیا تھا۔ اللہ کا قانون جو کسی حد تک ان کی کتاب میں موجود تھا، عملی خصوصیات سے بالکل محروم ہو گیا تھا۔ ملکی سطح پر تو اس کے نفاذ کا کوئی تصور ہی نہ رہا تھا۔ البتہ ان کی پنچائتیں اور ان کی عدالتیں، بعض اخلاقی مفاسد پر حدود اللہ کا اجراء کرتی تھیں۔ ایک وقت تک تو امیر اور غریب کے فرق سے ان حدود کا احترام پامال ہوتا رہا، پھر رفتہ رفتہ پوری قوم ان کے مقابلے میں اپنے وضعی قوانین پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی اور اجتماعی زندگی سے اللہ کا قانون خارج ہو گیا، البتہ عبادات یا معاشرتی ضرورتوں کے حوالے سے بعض شرعی احکام اگر زندہ بھی تھے، تو وہ بھی ایک ایسا بے جان قالب بن کر رہ گئے تھے، جس میں روح نام کی کوئی چیز باقی نہ تھی۔ بدعات وخرافات اور رسوم ورواج کو دین کا نام دے کر لوگوں کو اس کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ یہ بگاڑ بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ حقیقت میں بنی اسرائیل جو درحقیقت مسلمان تھے، اپنا اصل نام بھول کر اب صرف یہودی بن کر رہ گئے تھے اور دین سے بے زاری یہاں تک پہنچی کہ جس اللہ کے بندے نے (چاہے وہ اللہ کے نبی ہی کیوں نہ ہوں) انہیں برائیوں سے روکنا چاہا، تو انہوں نے یا تو اسے قتل کر دیا اور یا اسے اپنی مخالفت سے بے اثر کر دیا۔ اپنی ان تمام گمراہیوں کے باوجود، یہود اپنے دور کے پڑھے لکھے اور اہل علم شمار ہوتے تھے۔ باقاعدہ ان کے تعلیمی ادارے تھے، جو مدارس کے نام سے قائم تھے۔ اوس وخزرج ان کے مقابلے میں چونکہ بالکل جاہل تھے، اس لئے ان کے علم سے بے حد مرعوب تھے۔ یہود نے اپنی اس حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے،

Marfat.com

صرف علمی دبدبہ ہی پیدا نہیں کیا تھا، بلکہ وہ کاروبار پر بھی چھائے ہوئے تھے۔ مدینے کا بیشتر کاروبار ان کے ہاتھ میں تھا۔ اوس وخزرج ان کے علم کی وجہ سے ان کا احترام بھی کرتے اور اپنی ہر ضرورت کے وقت ان سے رجوع بھی کرتے تھے۔ ان کی اس مرعوبیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، ان سے انہوں نے حلیفانہ تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ لیکن ان تعلقات سے اپنی قومی خصلت کے مطابق، ہمیشہ انہیں ایک دوسرے سے لڑانے میں کام لیتے تھے۔ جب وہ آمادۂ جنگ ہوتے، تو پھر انہیں سود پر قرض دیتے اور اس طرح سے ساہوکارانہ سود میں انہیں جکڑ کر ان کے باغات تک پر قبضہ کر لیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے مدینہ جانے کے بعد جب ان کا یہ طلسم ٹوٹنے لگا اور ان کا اصل چہرہ لوگوں کے سامنے آنے لگا۔ تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اپنی کتابوں کی شہادت کے مطابق، آنحضرت ﷺ کی نبوت پر ایمان لاتے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کر لیتے۔ وہ ایک قومی حسد میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے مجموعی طور پر آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی مخالفت کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے قومی پس منظر کے باعث، سازش کرنے اور چھپ کر وار کرنے میں ہمیشہ مشاق رہے ہیں۔ چنانچہ اسی خصلت سے کام لیتے ہوئے، ایک طرف انہوں نے منافقین کی پشت پناہی کرنا شروع کی۔ ہر ممکن طریقے سے ان کی حوصلہ افزائی کی اور دوسری طرف آنحضرت ﷺ کیلئے خطرات پیدا کرنا شروع کئے۔ قریش مکہ کو بار بار اکسایا کہ وہ باہر سے مدینہ پر حملہ کریں، ہم اندر سے ان کی حمایت کریں گے اور اس طرح سے یہ نوخیز تحریک اپنے انجام کو پہنچ جائے گی اور دوسری طرف مختلف حیلے بہانوں سے آنحضرت ﷺ کی جان لینے کی کوشش کی اور اس طرح کی صورتحال پیدا کر دی کہ حضور ﷺ کو اپنی حفاظت کیلئے پہرہ کا انتظام کرنا پڑا۔ حضور ﷺ آرام فرماتے تو صحابہ ؓ پہرہ دیتے اور اگر کبھی آنحضرت ﷺ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے، تو صحابہ ؓ پریشانی میں آنحضرت ﷺ کو تلاش کرنے نکل کھڑے ہوتے کیونکہ صحابہ ؓ کو ہمیشہ یہود کی طرف سے اندیشہ رہتا تھا۔ یہ تو وہ نئی صورتحال اور حالات تھے جو مدینے کی ہیئت کے باعث پیش آ رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مزید ایک حقیقت یہ تھی کہ اب اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ مکہ میں تو صرف اہل مکہ تک اسلامی دعوت کو پہنچانا اور اس کا حق ادا کرنا پیش نظر تھا اور اس کے ساتھ ساتھ جو لوگ مسلمان ہو جاتے تھے، ان کی ایمانی اور اخلاقی تربیت پیش نظر رہتی تھی۔ لیکن اب جبکہ تمام مسلمان ہر طرف سے سمٹ کر مدینہ میں جمع ہو گئے تھے۔ تو آنحضرت ﷺ نے اللہ کے حکم اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلامی ریاست میں رہنے والوں کو ایسی تعلیمات دی جائیں، جس سے ان کی انفرادی ضروریات کے ساتھ ساتھ اجتماعی ضرورتیں بھی پوری ہوں انہیں بتایا جائے کہ اسلام کی اساس پر نیا نظام زندگی کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی تمدن، اسلامی معاشرت، اسلامی معیشت، اسلامی قانون اور اسلامی سیاست کے بنیادی اصول کیا ہیں۔

اسلامی دعوت نئے مراحل میں

اسلامی ریاست قائم ہو جانے کے بعد، خود بخود حالات نے جو ایک نئی کروٹ لی وہ یہ تھی کہ مکہ میں جو کچھ بھی خطرہ تھا، اس کا تعلق انفرادی زندگی سے تھا اور ہر ایمان لانے والا اپنے جان وتن پر اسے برداشت کر رہا تھا۔ لیکن اب یہ نئی بننے والی ریاست، اجتماعی اہداف سمیت مشق ستم بن رہی تھی۔ اب ضرورت تھی کہ اس ریاست کے ایک ایک فرد میں استقامت وایثار کی ایک ایسی شمع روشن کر دی جائے، جو بڑے سے بڑے طوفان کا بھی مقابلہ کرنے کیلئے کافی ہو کیونکہ پوری دنیائے کفر اس نوزائیدہ ریاست کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ یہ اندھیروں کے باسی اس مدھم سی جلتی ہوئی شمع سے خوف زدہ ہو رہے تھے اور منصوبے باندھ رہے تھے کہ جب بھی موقع ملے اسے گل کر دیں۔ اس ریاست کے دائیں بائیں بسنے

Marfat.com

والے قبائل، قریش مکہ کے زیراثر معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جس کے نتیجے میں ریاست کے اندر معاشی دشواریاں پریشان کن صورت اختیار کرتی جارہی تھیں۔ یہود اپنی ملّی خصلت کے مطابق سازشوں کے جال بن رہے تھے۔ اور اہلِ مدینہ کو مستقبل کے موہوم اندیشوں سے ہراساں کرکے اسلام سے لاتعلقی کا سبق پڑھا رہے تھے۔ اس پراپیگنڈہ کے نتیجے میں کمزور طبیعتوں کے لوگ، اسلام کی طرف مائل ہونے کے باوجود، یکسو ہونے میں دقت محسوس کررہے تھے۔ جس کا منطقی اور طبعی نتیجہ یہ تھا کہ اوس وخزرج کے سادہ دل لوگوں میں نفاق کے جراثیم پرورش پانے لگے تھے۔ جنہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ایسے حالات میں انتہائی ضروری تھا کہ مسلمانوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور بنیادی اعتقادات سے گہری وابستگی پیدا کی جائے۔ مخالفتوں کا سامنا کرنے کیلئے تقویٰ وتوکل اور صبر کے اوصاف پیدا کیے جائیں۔ اسلام کے حلقہء اثر وسیع کرنے کیلئے تبلیغ ودعوت کے جذبے کو جنوں صفت بنایا جائے اور مدینے کا ایک ایک فرد اپنے قول وعمل سے چلتا پھرتا مبلغ بن جائے، تاکہ وہ جس ماحول میں بھی جائے وہاں اللہ کے دین کے اثرات کی بہار آجائے۔

ایک مزید دوررس تبدیلی اور اس کے تقاضے

مسلمانوں کے مدینہ طیبہ آجانے کے بعد، ایک نہایت دوررس نئی تبدیلی یہ آئی تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ تبدیل کردیا گیا۔ پہلے اہل کتاب کی طرح بیت المقدس ہی کو مسلمان اپنا قبلہ بنائے ہوئے تھے اور اسی طرف نمازوں میں رُخ کرتے تھے۔ اب جبکہ مسلمان ایک نئی امت کے طور پر متعارف ہورہے تھے، تو ان کی شیرازہ بندی کیلئے ضروری تھا کہ انہیں ایک مرکز دیا جاتا، جو ان کی ملی زندگی کا مبداو معاد بن جاتا۔ چنانچہ اب مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ آج سے تمہارا قبلہ وہ بیت اللہ ہوگا، جو آنحضرت ﷺ کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا اور جہاں آپ نے ایک امت مسلمہ کے قیام کیلئے دعائیں مانگی تھیں اور ان کی ہدایت کیلئے نبی آخرالزمان کی بعثت کیلئے التجا کی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ جیسے ہی مسلمانوں کو نئے قبلہ کی شکل میں ایک مرکز عطا ہوا، تو ایک طرف تو یہود نے آنحضرت ﷺ اور اسلام کے خلاف الزامات اور اتہامات کا ایک طوفان کھڑا کردیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آخری نبی اور آخری امت کی پہچان یہ ہے کہ بیت اللہ اس کا قبلہ بنے گا اور ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایک نئی امت کے قیام کے اعلان کا مطلب ہماری اس عظیم منصب سے معزولی ہے، جو حامل دعوت امت ہونے کے لحاظ سے ہمیں حاصل تھی۔ چنانچہ اب ضرورت تھی کہ قرآن کریم کے ذریعے حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل علیہما السلام اور بیت اللہ اور شعائر اسلام کے سلسلے میں اہل کتاب جس طرح تحریف وترمیم سے تاریخی خیانت کا ارتکاب کرچکے ہیں، ان کی خیانتوں کا پردہ چاک کیا جائے اور آخری پیغمبر اور آخری امت کی صحیح حیثیت کو صحیح تناظر میں پیش کیا جائے۔

مسلمان بیت اللہ سے پہلے سے جذباتی تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اب جب کہ بیت اللہ ان کا قبلہ بنادیا گیا اور وہ ان کیلئے ایک مرجع کی حیثیت اختیار کرگیا، تو ان کے اندر بیت اللہ سے دوری اور اس کے طواف سے محرومی کا شدید احساس پیدا ہوا۔ اب وہ بار بار سوچنے پر مجبور ہوئے کہ کس طرح ہم اللہ کے اس گھر کی زیارت کو جاسکیں اور یہ کیسے ممکن ہو کہ ہم اپنا قبلہ دشمن کے تسلط سے آزاد کراسکیں اور ویسے بھی ملی تقاضوں کے حوالے سے دیکھا جائے، تو کوئی قوم بھی اپنے مرکز پر غیروں کا قبضہ کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔ ایسے حالات میں ضروری تھا کہ قرآن کریم بیت اللہ کی آزادی کیلئے ضروری احکام دیتا اور مسلمانوں میں اس کی آزادی کا جذبہ تیز کرنے کیلئے جہادی روح پیدا کرتا اور اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مسلمان بیت اللہ کی بازیابی میں کامیاب ہوجائیں۔ تو یہ بھی لازمی تھا کہ حج وعمرہ کے مناسک کے احکام نازل کیے جائیں، تاکہ مسلمان اس عبادت کی ادائیگی میں غلطی نہ کریں۔

Marfat.com

متذکرہ بالا تاریخی حقائق اور اس سے جنم لینے والی دینی اور قومی ضرورتوں کو سامنے رکھیں اور پھر سورۃ البقرۃ کا مطالعہ کریں۔تو آپ محسوس کریں گے کہ ان حالات کے تناظر میں نہایت تشفی بخش ہدایات دی گئی ہیں اور اس نوزائیدہ ریاست اور امت کی رہنمائی اور شیرازہ بندی کیلئے تمام ضروری احکامات دیئے گئے ہیں چنانچہ ہم نہایت اختصار سے اس سورۃ کی آیات کا ایک تجزیہ پیش کرتے ہیں۔جس سے ان احکام کی تدریج، ترتیب اور حکمت سمجھنے میں مدد ملے گی۔

1۔ ''سورۃ البقرۃ'' میں سب سے پہلے ایک تمہید اٹھائی گئی ہے۔جس میں اس سورۃ کا اصل موضوع ''ایمان باللہ'' اور'' ایمان بالرسالت'' کو بنیاد بنا کر اس کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں اور اسی ضمن میں انسانوں کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔جس سے انسانوں میں حکمت دعوت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

2۔ نہایت مؤثر انداز میں بندگی رب کی دعوت پیش کرتے ہوئے، بنیادی موضوع رسالت وقرآن کی صداقت پر دلائل دیئے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ پیش کر کے مخلص مومنوں اور معاندوں کے درمیان حد فاصل بھی کھینچ دی ہے اور شناخت بھی متعین کر دی ہے۔اور اس کا مصداق یہود کو بنا کر، ان کی مخالفت کی بنیاد واضح کر دی گئی ہے۔یہ سلسلہ انتالیس آیتوں پر پھیلا ہوا ہے۔

3۔ یہود چونکہ من حیث القوم اسلام کے راستے میں سب سے بڑی دیوار بننے والے تھے اور اوس وخزرج پر ان کا مذہبی اور علمی اثر بھی تھا۔مزید یہ کہ وہ مسلمانوں کی طرح حامل دعوت امت بھی رہ چکے تھے۔اس لئے ضروری تھا کہ ہر طرح سے ان کے اس طلسم کو توڑا جائے اور ان کے اعمال کی صورت میں اور دینی خیانتوں کی شکل میں ان کی اصل صورت لوگوں کے سامنے واضح کی جائے۔تاکہ جب وہ اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائیں اور خود ہدایت کا نمونہ بن کر آنحضرت ﷺ کے بارے میں بدگمانیاں پیدا کریں،تو لوگ ان کا اصل چہرہ دیکھ کر آسانی سے اندازہ کر سکیں کہ یہ جعل سازوں کا ایسا گروہ ہے، جنہوں نے محض دین کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔لیکن اندر سے یہ بدترین دنیادار، بلکہ دین کا نام لے کر دین کے سوداگر ہیں۔یہ سلسلہ آیت نمبر 121 تک چلا گیا ہے۔

4۔ آیت نمبر 122 سے 162 تک،حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت کو بیان کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ مشرکین مکہ اور یہود دونوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کس طرح کوشش کی ہے اور یہود نے کس طرح ان کی پوری تاریخ کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور کس طرح ان کے نشانات تک مٹانے کی کوشش کی ہے۔جہاں جہاں بھی ان کا تعلق مکہ معظمہ اور بیت اللہ سے ثابت ہوتا تھا، اسے انہوں نے تحریف کی نذر کر دیا اور حرم مکی سے پوری طرح ان کا تعلق کاٹ کر اپنی تاریخ میں محدود کر لیا اور پھر اس سرگزشت میں اس حقیقت کو واشگاف کیا گیا ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی اور کس طرح آنحضرت ﷺ کی بعثت کیلئے دعائیں مانگیں، اس طرح سے خانہ کعبہ اور مروہ وغیرہ سے متعلق یہود کی وہ تمام تحریفات بے نقاب کی گئیں، جو انہوں نے اپنے صحیفوں میں اس خیال سے کی تھیں کہ خانہ کعبہ اور مروہ کی قربان گاہ کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعلق کی ہر یادگار ریکارڈ سے حذف کر دی جائے۔

5۔ اس کے بعد 123 سے 242 تک، احکام وقوانین کا باب ہے۔اس میں ملت اسلامیہ کو جو شریعت عطا ہو رہی تھی، ضرورت کے مطابق اس کے کچھ احکام اجمالی طور پر نازل کئے گئے ہیں۔جن میں معاشرتی اصلاحات کاروباری ضرورتیں، عبادات اور اخلاقیات کے متعلق احکام موجود ہیں۔مدینے میں چونکہ ایک سوسائٹی وجود میں آرہی تھی، اس لئے شخصی اور عائلی قوانین کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔چنانچہ ان کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

6۔ آیت نمبر 243 سے 282 تک، مسلمانوں پر من حیث الامت جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔ان میں سے اہم تر ذمہ داری یہ تھی کہ ان کی مرکزیت کیلئے اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے جو قبلہ مقرر کیا تھا، اسے کافروں کے قبضے سے آزاد کروائیں اور اپنی نوزائیدہ ریاست کو اپنے بے پناہ عزم اور اللہ کے اعتماد پر ناقابل تسخیر بنانے کیلئے اپنے اندر وہ ایمان کی قوت پیدا کریں، جو زندہ رہنے والی قوموں کا شعار ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں مسلمانوں میں جذبہ جہاد پیدا کرنے کیلئے آیات نازل ہوئیں اور اس جہاد کے امکانات بروئے کار لانے کیلئے انفاق کا حکم دیا گیا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں فلسطینیوں سے اپنا قبلہ آزاد کرانے کیلئے جو جنگ لڑی گئی تھی، اس کا بھی حوالہ دیا گیا تاکہ مسلمانوں میں جذبہ وجوش پیدا ہو اور بنی اسرائیل کو اپنی گراوٹ پر شرم آئے۔ اس کے بعد کی آیات سورۃ کی خاتمہ کی آیات ہیں۔ جس میں اسلام کے بنیادی عقیدے پر زور دیا گیا ہے اور اس سے بننے والے خیالات اور اعمال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جس سے اس عظیم ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے، جس سے اس امت کو گراں بار کیا گیا ہے اور جس کو ادا نہ کرنے سے بنی اسرائیل ذلت کی وادیوں میں کھو گئے۔ چنانچہ اسی ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے دعا پر اس سورۃ کا خاتمہ ہوا ہے۔

☆☆☆☆

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٢٨٦	سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ (٢)	رُكُوْعَاتُهَا ٤٠

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿١﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ

فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٢﴾ الَّذِيْنَ

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ

الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣﴾

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ

اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿٤﴾

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

Marfat.com

كَفَرُوا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٧﴾

رکوع ۱۔ (الٓمّٓ اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔(یہ کتاب) ''ہدایت ہے ڈرنے والوں کیلئے۔(یہ قرآن) ان لوگوں کیلئے (ہدایت ہے) جوغیب پر ایمان لاتے ہیں۔وہ نماز قائم کرتے ہیں۔'' اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔(یہ کتاب ہدایت ہے) ان لوگوں کیلئے جو ایمان لاتے ہیں، اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے۔اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔یہی لوگ ہیں، جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ ہیں، جو کامیاب ہیں۔جن لوگوں نے کفر کیا ان کیلئے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کیلئے عذاب عظیم ہے) (آیت ۱ تا ۷)

الٓمّٓ

حروفِ مقطعات کا تعارف

الٓمّٓ بہت ساری سورتوں کے شروع میں چند حرفوں سے مرکب کچھ کلمات لائے گئے ہیں۔جیسے الم، حم، طسم وغیرہ۔انہیں حروف مقطعات کہا جاتا ہے۔اگر یہ حروف، حروف تہجی کے طور پر استعمال ہوں تو یہ معرب ہوتے ہیں۔یعنی ان کے آخر میں اعراب ہوتا ہے۔لیکن جب یہ سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات کے طور پر آتے ہیں، تو ان کا ہر حرف آخر میں ساکن ہوتا ہے۔مثلاً الم کو الفٌ، لامٌ اور میمٌ نہیں پڑھیں گے بلکہ الف، لام اور میم پڑھیں گے۔اہل علم کی ان کے بارے میں مختلف آراء اور مختلف اقوال ہیں۔ہم سب سے پہلے چند اقوال کا ذکر کرتے ہیں۔

1۔ ایک قول یہ ہے کہ عربی زبان کے اٹھائیس حروف تہجی ہیں۔جن میں سے تقریباً چودہ حروف، حروف مقطعات کی شکل میں ۲۹ سورتوں کے آغاز میں آئے ہیں۔ان میں اشارہ اس بات کی جانب ہے کہ دیکھو انہیں حروف تہجی سے ہم نے قرآن پاک کے الفاظ کی چمن آرائی کی ہے اور ایک ایسی کتاب نازل کی ہے، جس کا ایک ایک لفظ، الفاظ کا دروبست، الفاظ کی ترکیب اور جملوں کی ساخت ایسا معجزہ ہے، جس کی مثال لانے سے جن وانس عاجز ہیں حالانکہ یہ سب کچھ انہیں حروف تہجی ہی سے آراستہ کیا گیا ہے۔تم اگر اسے اللہ کی کتاب نہیں مانتے ہو تو یہی حروف تہجی تمہارے پاس بھی ہیں، تم انہیں سے قرآن جیسی، ایک سورۃ ہی ترتیب دے کر دکھاؤ۔

Marfat.com

2۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات اشارات ہیں۔مثلاً الم میں الف سے مراد ''آلاء اللہ'' ہیں۔لام سے مراد ''لطف'' اور میم سے مراد ''ملک'' ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ملک کی تمام نعمتیں اسی کے لطف وکرم کا صدقہ ہیں۔

3۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ جیسے اب ہمارے یہاں اختصار نویسی یعنی شارٹ ہینڈ ایک فن بن گیا ہے۔نزول قرآن کے وقت بھی اختصار نویسی ایک فن کے طور پر تو نہیں، ایک ضرورت کے تحت مروج تھی۔بولنے والے حسب ضرورت بجائے فقروں کے لفظوں کی صورت میں اپنا مفہوم ادا کردیتے تھے اور سننے والے چونکہ اس کے عادی تھے، وہ بھی اسے سمجھ لیتے تھے۔آپ اسے اس دور کے code words کہہ لیجئے۔مثلاً عربی میں ایک تلمیح مشہور ہے۔ قلتُ لها قفي فقالت لي قاف کہ میں نے اس خاتون سے کہا ٹھہر جاؤ، اس نے کہا میں ٹھہر گئی۔جملے کے آخر میں جو قاف ہے یہ اصل میں قِفتُ کی طرف اشارہ کررہا ہے۔گویا یہ قاف، قِفتُ کا مخفف ہے۔یہی طریقہ حروف مقطعات کی صورت میں قرآن کریم میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔

4۔ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ یہ حروف مقطعات اصل میں حروف ابجد ہیں اور ابجد کے حساب سے اقوام وملل کی تاریخ اور ان کے عروج وزوال کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔یہود کا یہی خیال تھا۔احادیث میں یہود کے ایک وفد کا حضور ﷺ کی خدمت میں آکر اسی طرح کی گفتگو کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔لیکن حضور ﷺ نے تبسّم کے سوا ان کی باتوں کا جواب دینا پسند نہیں فرمایا۔اس طرح کے متعدد اقوال ہیں، جس کا بعض اہل علم کی طرف انتساب کیا گیا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے اقوال کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔البتہ بعض آراء ایسی ہیں جنہیں قابل لحاظ کہا جاسکتا ہے۔ہم ان میں سے تین آراء کا ذکر کرتے ہیں۔

ا۔ سب سے پہلی رائے جسے جمہور کی رائے کہنا چاہئے اور صحابہ کی تائید بھی اسے حاصل ہے۔اس رائے کا خلاصہ یہ ہے، جسے امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رموز واسرار ہوتے ہیں۔اسی طرح یہ حروف مقطعات، قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہیں۔ہمارے لئے ان میں بحث وگفتگو بھی جائز نہیں ہے۔مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں۔ اوّل تو ان پر ایمان لانا، پھر ان کا پڑھنا، ہمارے لئے ثواب عظیم ہے۔دوسرے ان کے پڑھنے کے معنوی فوائد وبرکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں، مگر غیب سے ہمیں پہنچتے ہیں۔آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ کا ان حروف کے بارے میں یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں (ہمیں ان پر ایمان لانا چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اور جس طرح سے آئے ہیں ان کی تلاوت کرنا چاہیے۔مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں۔) اسی لئے اکثر تراجم قرآن میں ان حروف کے نیچے یہی حروف لکھ دیئے جاتے ہیں اور یا تفاسیر میں ان کے نیچے لکھ دیا جاتا ہے، اللہ اعلم بمرادہ (اللہ اپنی مراد کو بہتر جانتے ہیں) اس رائے پر بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے بارے میں خود قرآن کا دعویٰ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے عربی مبین میں نازل کیا ہے۔یعنی ایک ایسی عربی زبان میں جس کا معنی اور مفہوم بالکل واضح ہے۔تو جس کتاب کا ایک ایک لفظ معنی اور مطلب کے اعتبار سے واضح ہو، اس میں سورتوں کے شروع میں ایسے مرکب حروف کا آنا، جس کی مراد کوئی نہ جانتا ہو، یہ تو قرآن کریم کے اپنے دعویٰ کی نفی ہے۔مزید یہ بات بھی کہ یہ قرآن تو سرتاپا ہدایت ہے۔اس کا ایک ایک لفظ ہدایت بن کر نازل ہوا، تو کوئی لفظ جس کی مراد واضح نہ ہو، کس طرح ہدایت کا سامان بن سکتا ہے؟ بات یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات، حقیقت میں قلت تدبر کا نتیجہ ہیں۔قرآن کریم یقیناً ہدایت کی کتاب ہے اور اس کے نزول کا یہی مقصد ہے۔لیکن اس سے یہ استدلال کرنا کہ ہدایت اسی لفظ سے ممکن ہے، جس کا معنی اور مراد واضح ہو۔یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں۔اہل علم

Marfat.com

اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ہدایت جس طرح الفاظ کی مدد سے کی جاتی ہے، اسی طرح بعض دفعہ خاموشی الفاظ سے بڑھ کر ہدایت کا سامان بنتی ہے کہ مربی اور ہادی کے اشارات چہرے کے تأثرات اور نگاہوں کے تیور وہ کچھ سمجھا دیتے ہیں، جہاں تک الفاظ کی رسائی نہیں ہوتی۔ اس لئے الفاظ کو معنی اور مفہوم پر منحصر کرنا صحیح نہیں۔ مثال کے طور پر ان الفاظ کا ایک اور محمل بھی ہے، اس پر بھی غور کر لینا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی ذات کے بارے میں ہم صرف اپنے عقیدے سے نہیں بلکہ فہم وفراست سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کی ذات تو خالقِ کل اور منتہائے علمِ کمال ہے۔ اس کی صفات میں سے ایک ایک صفت کی مراد کو پالینا اور اس کے مفہوم کی تہہ تک اتر جانا، یہ بھی انسان کی بساط سے باہر ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ لیکن اس کی قدرت کی انتہا کو کوئی نہیں جانتا۔ وہ سرتاپا جمال ہے، اس کا جمال ظاہری ہی ہمارے مشاہدے کی قوت سے ماورا نہیں بلکہ ہم تو اس کے جمال معنوی کو بھی پوری طرح سمجھنے پر قادر نہیں۔ اسی طرح کلام بھی اس کی صفت ہے۔ اس کے ہر کلام کو اور کلام کے ایک ایک لفظ کو احاطہء ادراک میں لے آنا انسانی طاقت سے بعید ہے۔ اگر اس کا ایک ایک لفظ ہماری گرفت میں اس طرح آجائے، جس طرح انسانی الفاظ آجاتے ہیں، تو پھر اسے کلام خداوندی کہنا بہت مشکل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیات کی ایک قسم متشابہات بھی ہے اور قرآن کریم میں اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان متشابہات کا مفہوم اور مراد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ حروف مقطعات متشابہات میں شامل ہیں۔ تو ان کی مراد کو جاننا انسان کیلئے کس طرح ممکن ہے۔ البتہ اس طرح کی آیات یا اس طرح کے حروف مقطعات سمجھ نہ آنے کے باوجود بھی ہمارے لئے ہدایت کا سامان ہیں۔ وہ اس طرح کہ جس طرح ہم اپنے خالق ومالک کے بارے میں یہ جانتے ہیں کہ ہم اس کو کماحقہ نہیں جان سکتے اور ہمیں اس کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف ہے اور یہ اعتراف ہماری بندگی اور عبدیت کا ایک ایسا جوہر اور ایک ایسی متاعِ بے بہا ہے کہ جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ اس متاعِ بے بہا میں اضافہ صرف اسی بات سے ہوتا ہے کہ آدمی کے دل ودماغ میں اللہ کی کبریائی اترتی چلی جائے اور اسے اپنے عجز کا اعتراف روز بروز بڑھتا چلا جائے۔ وہ جیسے جیسے بندگی میں راسخ ہوتا چلا جاتا ہے اور اس پر اپنی حقیقت روشن ہوتی چلی جاتی ہے ویسے ویسے اللہ کی کبریائی اور اس کی عظمت اس کے نہاں خانہء دل کو نہ صرف روشنی دیتی ہے۔ بلکہ ایسی قوت بھی عطا کرتی ہے کہ یہ نہایت عاجز بندہ اس قدر مضبوط اور توانا ہو جاتا ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی قوت اسے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ اقبال نے شاید اسی پر فخر کرتے ہوئے کہا تھا

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
متاعِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

قرآن کریم کا پہلا ہی حرف اگر اتنی بڑی دولت کے حصول کیلئے کلید بن جاتا ہے۔ تو یہ بھی قرآن کریم کے معجزوں میں سے ایک معجزہ ہوگا کہ اس کے جس حرف کا راز کسی پر نہ کھل سکا اور اس کی پیدا کردہ کاوش ہزاروں سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کیلئے دلیلِ راہ بنی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کیلئے سب سے بڑی رکاوٹ، جو اس کی شخصیت بننے میں مانع ہوتی ہے، وہ اس کا اپنی حقیقت سے بے بہرہ ہونا ہے۔ وہ حقیقت کے اعتبار سے بندہ ہے، لیکن اس کی ساری زندگی بندگی کی بجائے آقائی کا لبادہ اوڑھنے میں گزر جاتی ہے اور وہ اس وقت تک اپنے آپ سے محروم رہتا ہے، جب تک اسی طرح اس کے اندر اعتراف کی شمع روشن نہیں ہوتی۔ اگر قرآن کریم کے پہلے لفظ سے یہ شمع جل اٹھے اور آدمی اعتراف کی منزلیں طے کرتا ہوا اپنے اندر بندگی کے خلاف بننے والے ہر طلسم کو توڑ ڈالے، تو ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ یہ کہہ سکے:

Marfat.com

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

اور یہی وقت اس کی زندگی اور اس کی انسانیت کی معراج کا ہے۔

۲۔ بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت، عربوں میں جو اسالیب بیان مروج تھے۔ان میں اس طرح حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔خطیب اپنے خطبوں میں اور شعراء اپنے اشعار میں انہیں استعمال کرتے تھے اور چونکہ یہ اسلوب بالعموم پہچانا جاتا تھا تو سننے والے بھی اس میں اجنبیت محسوس نہیں کرتے تھے۔چنانچہ اب بھی دور جاہلیت کے جو ادبی نمونے محفوظ ہیں، ان میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔اس استعمال عام کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے، جن کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو بلکہ سامعین خوب جانتے تھے کہ ان کی مراد کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن اور نبی کریم ﷺ کے خلاف مخالفین نے ہر طرح کی باتیں کہیں، لیکن یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ سورتوں کے شروع میں یہ بے معنی حروف کیسے ہیں؟ اور صحابہ بھی چونکہ انہیں سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے بھی آنحضرت ﷺ سے ان کے بارے میں کبھی نہ پوچھا۔بعد میں یہ اسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا، تو بعد کے آنے والے اہل علم کو اس کے معنی متعین کرنے میں مشکل پیش آگئی۔لیکن اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ان حروف کا استعمال تو عربوں میں ضرور مروج تھا۔لیکن ان کی حیثیت ایسے حروف کی تھی، جو محض تحسین کلام کیلئے استعمال ہوتے ہیں اور یا محض خطابیات کا حصہ ہوتے ہیں۔کلام کے مفہوم میں انہیں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

۳۔ بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ یہ حروف مقطعات جو سورتوں کے شروع میں آئے ہیں، یہ درحقیقت سورتوں کے نام ہیں اور بعض سورتوں میں قرآن کریم نے ذٰلِکَ اور تِلْکَ کے ذریعے ان کے نام ہونے کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔اگرچہ تمام سورتیں جن کے آغاز میں یہ حروف آئے ہیں، ان ناموں سے مشہور تو نہیں ہوئیں، لیکن بعض سورتیں انہیں ناموں سے معروف بھی ہیں۔مثلاً طٰہٰ، یٰس، ق، اور ن وغیرہ۔اس رائے میں اس لحاظ سے تو ایک وزن معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی جب اہل عرب کا لٹریچر پڑھا جاتا ہے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اس طرح کے حروف سے اشیا کے نام رکھنے کے عادی تھے۔وہ اپنی مختلف اشیا، اشخاص، گھوڑوں، جھنڈوں، تلواروں حتیٰ کہ قصائد اور خطبات تک کے نام اسی سے ملتے جلتے رکھتے تھے۔نام چونکہ مسمّٰی کی شناخت کیلئے رکھا جاتا ہے، اس لئے ضروری نہیں ہے کہ اسم اور مسمی میں کوئی معنوی مناسبت بھی ہو۔چنانچہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہ لفظ یا حرف فلاں چیز کا نام ہے، تو پھر یہ بحث نہیں کی جاتی کہ اس لفظ یا حرف کا معنی کیا ہے۔حروف سے اشیا کا نام رکھنا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کے اثرات آج بھی ہم عربی زبان اور دوسری زبانوں میں محسوس کرتے ہیں۔مثلاً عین، آج بھی مختلف اشیا پر بولا جاتا ہے۔نون، آج بھی مچھلی کو کہتے ہیں۔ق، ایک پہاڑ کا نام ہے۔ہمارے ہاں بھی کوہ قاف مشہور ہے۔اس لحاظ سے تو قرآن کریم میں جہاں بھی حروف مقطعات آئے ہیں۔انہیں اگر سورتوں کا نام سمجھ لیا جائے، تو معنی کی بحث ختم ہو جاتی ہے۔لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ چونکہ قرآن پاک میں پروردگار نے یہ نام رکھے ہیں۔اس وجہ سے طبیعتوں میں یہ شوق پیدا ہونے لگتا ہے کہ ضرور یہ کسی نہ کسی مناسبت کی بناء پر رکھے گئے ہوں گے۔چنانچہ یہی شوق، شوق جستجو میں ڈھل جاتا ہے، تو اہل علم اس کے معنی کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا کہ ہر دور کے اصحاب علم نے اس جستجو میں کچھ نہ کچھ محنت کی۔چنانچہ اسی شوق جستجو کی ایک قابل قدر مثال ہمارے دور میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کی بھی ہے جسے مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں ذکر کیا ہے۔ہم وہیں سے اسے نقل کرتے ہیں۔

Marfat.com

جو لوگ عربی رسم الخط کی تاریخ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف عبرانی سے لئے گئے ہیں اور عبرانی کے یہ حروف ان حروف سے ماخوذ ہیں، جو عرب قدیم میں رائج تھے۔ عرب قدیم کے ان حروف کے متعلق استاذ امام کی تحقیق یہ ہے کہ انگریزی اور ہندی کے حروف کی طرح صرف آواز ہی نہیں بتاتے، بلکہ یہ چینی زبان کے حروف کی طرح معانی اور اشیا پر بھی دلیل ہوتے تھے۔ جن معانی یا اشیا پر وہ دلیل ہوتے تھے، عموماً انہی کی صورت و ہیئت پر لکھے بھی جاتے تھے۔ مولاناؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہی حروف ہیں جو قدیم مصریوں نے اخذ کیے اور اپنے تصورات کے مطابق ان میں ترمیم و اصلاح کر کے ان کو اس خط تمثالی کی شکل دی، جس کے آثار اہرام مصر کے کتبات میں موجود ہیں۔

ان حروف کے معانی کا علم اب اگرچہ مٹ چکا ہے تاہم بعض حروف کے معنی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں بھی ان کی قدیم شکل کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ مثلاً الف کے متعلق معلوم ہے کہ گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت ہی پر لکھا جاتا تھا۔ ب کو عبرانی میں بیت کہتے ہیں اور اس کے معنی بھی بیت (گھر) کے ہیں۔ ج کا عبرانی تلفظ جیمل ہے۔ جس کے معنی جمل (اونٹ) کے ہیں۔ ط سانپ کے معنی میں آتا تھا اور لکھا بھی کچھ سانپ ہی شکل پر جاتا تھا۔ م پانی کی لہر پر دلیل ہوتا تھا اور اس کی شکل بھی لہر سے ملتی جلتی بنائی جاتی تھی۔

مولانا اپنے نظریہ کی تائید میں سورہ ''ن'' کو پیش کرتے ہیں۔ حرف ''نون'' اب بھی اپنے قدیم معنی ہی میں بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی مچھلی کے ہیں۔ اور جو سورۃ اس نام سے موسوم ہوئی ہے اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر صاحب الحوت (مچھلی والے) کے نام سے آیا ہے۔ مولانا اس نام کو پیش کر کے فرماتے ہیں۔ کہ اس سے ذہن قدرتی طور پر اس طرف جاتا ہے کہ اس سورۃ کا نام ''ن'' اسی وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں صاحب الحوت ''یونس علیہ السلام'' کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا۔ پھر کیا عجب ہے کہ بعض دوسری سورتوں کے شروع میں جو حرف آئے ہیں وہ بھی اپنے قدیم معانی اور سورتوں کے مضامین کے درمیان کسی مناسبت ہی کی بناء پر آئے ہوں۔

قرآن مجید کی بعض اور سورتوں کے ناموں سے بھی مولانا کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حرف ''ط'' کے معنی، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، سانپ کے تھے اور اس کے لکھنے کی ہیئت بھی سانپ کی ہیئت سے ملتی جلتی ہوتی تھی۔ قرآن میں سورۃ طٰہٰ کو دیکھیے جو ''ط'' سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں ایک مختصر تمہید کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی لٹھیا کے سانپ بن جانے کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اسی طرح طسم، طس، وغیرہ بھی ''ط'' سے شروع ہوتی ہیں اور ان میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لٹھیا کے سانپ کی شکل اختیار کر لینے کا معجزہ مذکور ہے۔

''الف'' کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ گائے کے سر کی ہیئت پر لکھا بھی جاتا تھا اور گائے کے معنی بتاتا بھی تھا۔ اس کے کے دوسرے معنی اللہ واحد کے ہوتے تھے۔ اب قرآن کریم میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سورۃ بقرۃ میں جس کا نام الف سے شروع ہوتا ہے، گائے کے ذبح کا قصہ بیان ہوا ہے۔ دوسری سورتیں جن کے نام الف سے شروع ہوئے ہیں۔ توحید کے مضمون میں مشترک نظر آتی ہیں۔ یہ مضمون ان میں خاص اہتمام کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان ناموں کا یہ پہلو بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جن سورتوں کے نام ملتے جلتے ہیں ان کے مضامین بھی ملتے جلتے ہیں۔ بلکہ بعض سورتوں میں تو اسلوب بیان تک ملتا جلتا ہے۔

Marfat.com

میں نے مولانا کا یہ نظریہ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں محض اس خیال سے پیش کیا ہے کہ اس سے حروف مقطعات پر غور کرنے کیلئے ایک علمی راہ کھلتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی حیثیت ابھی تک ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جب تک تمام حروف کے معنی کی تحقیق ہو کر ہر پہلو سے ان ناموں اور ان سے موسوم سورتوں کی مناسبت واضح نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر ایک نظریہ سے زیادہ اعتماد کر لینا صحیح نہیں ہوگا۔ یہ محض علوم قرآن کے قدر دانوں کیلئے ایک اشارہ ہے۔ جو لوگ مزید تحقیق و جستجو کی ہمت رکھتے ہیں وہ اس راہ میں قسمت آزمائی کریں۔ شائد اللہ تعالیٰ اس راہ سے یہ مشکل آسان کر دے۔

ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَارَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ

(اس کتاب میں کوئی شک نہیں)

اسمِ اشارہ قریب اور بعید کا مفہوم

ذلک کے بارے میں اہل علم نے گفتگو کی ہے عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ ذلک اسم اشارہ بعید کیلئے اور ھذا اسم اشارہ قریب کیلئے ہے۔ یعنی اگر کسی فاصلہ کی چیز کی طرف یعنی دور کی کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو تو ذلک لایا جاتا ہے اور اگر قریب کی کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو تو ھذا لایا جاتا ہے۔ یہاں کتاب کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اور وہ دور نہیں قریب ہے تو یہاں قواعد کے اعتبار سے ھذا لانا چاہیے تھا ذلک کیوں لایا گیا۔ اہل علم نے اس کے مختلف جواب دیئے ہیں۔

1۔ ہم قریب اور بعید کا جو مطلب لیتے ہیں اہل نحو اس کا وہ مطلب نہیں لیتے بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز مخاطب کے علم میں ہے یا جس کا ذکر گفتگو میں ہو چکا ہے اگر اس کی طرف اشارہ کرنا ہو تو وہاں ذلک استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ تو وہاں ھذا لایا جاتا ہے۔ تو یہاں بھی جس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے وہ الکتاب نہیں بلکہ الم ہے۔ کہ وہ الم جس کا ذکر ہو چکا ہے وہ کتاب ہے یعنی وہ اس کتاب الٰہی کا حصہ ہے۔ اس قاعدے کے اعتبار سے یہاں ذلک کا استعمال صحیح ہے۔

2۔ اگر کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو جو بہت عظیم اور بے پناہ اہمیت کی حامل ہو اور وہ قریب بھی ہو تو اس کی عظمت کی وجہ سے اسم اشارہ بعید یعنی ذلک لایا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ نہایت عظمت والا ہے اس کی عظمت اور اس کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اسے سامنے لا کھڑا کیا جائے اور ھذا سے اس کی طرف اشارہ کیا جائے۔ یہاں اشارہ تو الکتاب ہی کی طرف ہے لیکن وہ چونکہ بہت شان والی اور عظمت والی ہے۔ اس لیے اس کی طرف ذلک یعنی اسم اشارہ بعید سے اشارہ کیا گیا ہے۔ تو اس کا مطلب وہ کتاب نہیں ہوگا بلکہ وہ ذیشان اور عظمت والی کتاب ہوگا۔

3۔ ذلک اشارہ بعید کیلئے آتا ہے۔ اور یہاں بھی اسے بعید ہی کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ تم نے اللہ سے جس ہدایت کی دعا مانگی تھی اور جس صراط مستقیم کیلئے اس سے التجا کی تھی وہ ہدایت اور وہ صراط مستقیم کتاب کی شکل میں تمہیں عطا کر دیا گیا۔

Marfat.com

الکتاب کامفہوم

الکتاب عربی زبان میں مختلف معنی میں استعمال ہوتا ہے اور قرآن کریم نے بھی اسے مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔لیکن قرآن کریم میں بھی اور پہلی آسمانی کتابوں میں بھی اگر کوئی قرینہ نہ ہوتو الکتاب کے لفظ کو کتاب الٰہی کے معنی میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے معنی کیلئے قرینہ موجود ہے جیسے ملکہ بلقیس نے اپنے درباریوں اور امراء سے کہا انی القی الی کتاب کریم (میرے پاس ایک گرامیِ نامہ بھجوایا گیا ہے)۔اس جملے کی ساخت بجائے خود قرینہ ہے کہ ملکہ بلقیس کے پاس خط تو بھیجا جاسکتا ہے اس پر اکتاب الٰہی نہیں اترتی۔تو اس طرح قرینہ نے کتاب کے معنی کو متعین کر دیا لیکن جب بغیر کسی قرینہ کے یا ایسے قرینہ کی موجودگی میں جو کتاب الٰہی کے معنی کو متعین کرتا ہو الکتاب کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے کتاب الٰہی ہی مراد ہوگا۔پہلی آسمانی کتابوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر صحیفہ کو سفر کہا گیا ہے، جس کی جمع اسفار ہے۔جس کا معنی کتاب ہے۔اسی طرح عیسائی مترجموں نے اسفار کے مجموعے کو بائبل کا نام دیا ہے۔بائبل کا معنی بھی یونانی زبان میں کتاب ہی ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں الکتاب کا لفظ قرآن کریم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

لاریب کا صحیح مفہوم اور اس کا صحیح محمل

لاریب فیه ریب ،راب کا مصدر ہے۔اس کا معنی ہے شک یا شبہ،تو لاریب فیہ کا معنی ہوگا اس کتاب میں کوئی شک وشبہ نہیں اب سوال یہ ہے کہ ایک کتاب کا مطالعہ ہم شروع کرنا چاہتے ہیں۔تو اس کا مصنف سب سے پہلی بات یہ کہتا ہے کہ جس کتاب کو تم پڑھنے لگے ہو اس کے بارے میں یقین رکھو کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں اس سے پہلے کہ میں اس بات کی وضاحت کروں کہ شک وشبہ کی نفی کس بات سے کی جارہی ہے۔میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کتاب پڑھنے کے بعد یہ قاری کا حق ہے کہ وہ کتاب کے بارے میں رائے قائم کرے۔مصنف کیلئے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ قاری کے رائے قائم کرنے سے پہلے اپنی رائے اس پر ٹھونسے۔بنابریں کتاب کے آغاز ہی میں یہ کہنا کہ اس کتاب میں کوئی شبہ نہیں یہ تو قاری پر اپنی رائے ٹھونسنے کے مترادف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط فہمی قلت فہم سے پیدا ہوتی ہے۔کیونکہ قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والا جب قرآن کریم کو یہ سمجھ کے ہاتھ میں لیتا ہے کہ اس کا مصنف پروردگار عالم ہے۔کوئی انسان نہیں۔تو از خود وہ اپنے ذہن میں یہ بات طے کر لیتا ہے کہ چونکہ یہ کتاب اللہ کی کتاب ہے جس کا علم ہر غلطی سے پاک ہے۔لہٰذا اس کی کتاب میں بھی یقیناً کسی غلطی یا کسی شک کا گمان نہیں ہوسکتا۔شک وشبہ یا غلط ہونا یہ انسانی علم کی کمزوریاں ہیں۔انسان کا علم انفرادی ہو یا اجتماعی وہ کلیۃً کبھی شک وشبہ یا غلطی سے پاک نہیں ہوسکتا۔قرآن کریم کے آغاز میں اس آیت کو لا کر ایک طرح سے تنبیہ کی گئی ہے کہ دیکھنا اس کتاب کو کسی انسان کی تصنیف سمجھ کر شک وشبہ میں مبتلا نہ ہو جانا اسے اللہ کی کتاب سمجھنا جس کا علم صرف یقین دیتا ہے شک وشبہ کی وہاں کوئی گنجائش نہیں۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ قرآن کریم ایسی کتاب نہیں جو محض وقت گزاری یا تفریح کیلئے پڑھی جاتی ہے۔یا اس سے مقصود کسی فن میں معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے۔بلکہ یہ کتاب زندگی اور کتاب ہدایت ہے۔اس سے زندگی گزارنے کا ڈھب آتا ہے۔اور حقیقی زندگی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔اور یہ اپنے پڑھنے والے کو ترغیب دیتی ہے کہ اگر تم ایک کامیاب زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اس کا دارومدار ایمان وعمل

Marfat.com

پر ہے۔اگر تم نے یہ سرمایہ حاصل کرلیا تو تم بامراد ہو گئے۔اور اگر تم نے اس میں ناکامی دکھائی تو یہاں بھی ناکام ٹھہرو گے اور مرنے کے بعد بھی ہولناک صورتحال سے واسطہ پڑیگا۔اندازہ کیجئے جس کتاب کی دعوت ایمان وعمل کی دعوت ہے اور جو کتاب زندگی بخش پیغام لے کر آئی ہے کیا اس کے بھیجنے والے کیلئے ضروری نہیں کہ وہ ہر شخص کو جو اس کتاب کو پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے پہلے ہی مرحلے میں آگاہ کردے کہ تم اگر اس کتاب سے زندگی کا سبق لینا چاہتے ہو تو نہایت اطمینان اور اعتماد سے اس کو پڑھنا اور ذہن میں یہ بات کبھی نہ آنے دینا کہ اس کی کوئی بات صداقت و حقانیت کے ترازو میں ناکام بھی ہوسکتی ہے۔اور اگر تم نے اسے شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا اور بے دلی سے اسے پڑھا اور اس کے نتائج کو ظن وگمان کا نتیجہ سمجھا تو تم اس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکو گے۔کیونکہ زندگی کے سفر میں سب سے خطرناک چیز جو آدمی کو آمادۂ عمل نہیں ہونے دیتی وہ صرف شک وشبہ ہے۔آدمی کو دسترخوان پر بیٹھ کر یہ شبہ ہو جائے کہ میرے سامنے جو خوان نعمت سجا ہوا ہے اس کے کسی کھانے میں زہر بھی شامل ہے وہ بقائمی ہوش وحواس کبھی کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے گا۔ایک مسافر کو راستے میں کھائی کا شبہ بھی ہو جائے تو وہ راستہ بدل لیتا ہے۔تو جو کتاب زندگی کے عمل پر اکساتی ہے اگر اس کے بارے میں یہ اطمینان نہ دلایا جائے تو کوئی شخص اس سے استفادہ کیوں کر کرے گا۔لیکن ساتھ ہی یہ بات ذہن میں رکھئے کہ لاریب فیه خبر ہے حکم نہیں یعنی یہ کتاب اپنے قاری کو بتلاتی ہے کہ تمہارے لئے اس کتاب میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اس کی ایک ایک بات یقینی اور محکم ہے۔وہ یہ خبر دے کر قاری کو آزاد چھوڑ دیتی ہے اسے ماننے کیلئے مجبور نہیں کرتی۔اب یہ قاری کا کام ہے کہ وہ دوسرے قرائن کو دیکھ کر اس بات کو قبول کرلے یا رد کردے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جو فرمایا جا رہا ہے کہ اس میں کسی قسم کا شک نہیں یہ کس بات کے بارے میں ہے۔اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو تین باتیں سمجھ میں آتی ہیں اور یہی تینوں باتیں اہل علم نے ارشاد فرمائی ہیں۔

1۔ اس کے کتاب الٰہی اور منزل من الله ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔یعنی اس بات کا یقین کرو اور یہ اس کتاب سے استفادہ کیلئے ضروری ہے کہ اس کتاب کو اللہ نے نازل کیا ہے۔اسے محمد ﷺ یا کسی اور شخص نے تصنیف نہیں کیا۔کیونکہ اگر اسی بنیادی بات میں شبہ ہو جائے تو قرآن پاک کی دعوت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔کیونکہ اس کو پیش کرنے والی ذات گرامی نے اسے یہ کہہ کر پیش کیا ہے کہ یہ کتاب مجھ پر اللہ نے نازل کی ہے۔اس کی ایک ایک بات اللہ کا حکم ہے۔تم اگر اللہ کو مانتے ہو اور اسے حاکم حقیقی سمجھتے ہو تو پھر اس کتاب کے دیئے ہوئے نظام زندگی کو قبول کرنا تم پر لازم ہوگا۔اسی سے تمہیں اس کے کئے ہوئے وعدے نصیب ہوں گے اور اگر تم اسے قبول نہیں کرو گے تو پھر اس کے عذاب سے تمہیں دوچار ہونا پڑے گا۔غور فرمایئے جس کتاب کی تعلیم اس بات پر انحصار کرتی ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے ہے تو اسے اگر منزل من اللہ نہیں مانا جائے گا تو اس کتاب کی تمام تر تعلیم کی بنیاد ختم ہو کر رہ جائے گی۔اور پیغمبر ﷺ کی دعوت اپنی بنیاد کھو دے گی۔رہی یہ بات کہ آخر اس بات کو قبول کیوں کیا جائے اور کس طرح قبول کرلیا جائے؟ بات یہ ہے کہ اس قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اس کی عبارت آرائی اس کا طرز بیان اس کی فصاحت وبلاغت، اس کے عطا کردہ نظام زندگی کا فطرت اور زندگی کے مطابق ہونا اور اس کی بیان کردہ پیش گوئیوں کا برحق ثابت ہونا ،اور اس کے بیان کردہ تاریخی واقعات اور تاریخی حقائق کا ہر ترازو میں ٹھیک ٹھیک تلنا اور ایسی ایسی باتیں بیان کرنا جس کا تعلق آنے والی دنیا سے تھا اور پھر ان کا صحیح ثابت ہونا اور ان سب باتوں کا ایک ایسے اُمی کی زبان سے ادا ہونا جس نے زندگی بھر نہ کسی استاد سے پڑھا نہ کسی مدرسے کا رخ کیا۔جو نہ لکھنا جانتا تھا نہ پڑھنا جانتا تھا۔لیکن اس کی زبان سے تئیس (۲۳) سال تک علم کا یہ چشمہ ابلتا رہا اور جس نے دنیا کے اصحاب علم و فضل کو اس وقت بھی ورطۂ حیرت میں ڈالے رکھا اور آج بھی دنیا اس کے علم کے سامنے سر اٹھا کر مخالفت کرنے سے عاجز ہے۔بتایئے اس سے بڑھ کر اس کے منزل من اللہ ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔

Marfat.com

2۔ اس کے محفوظ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔یہ بھی ایک ایسا دعویٰ ہے جو سراسر غیر انسانی ہے۔انسان ترقی کرتا ہوا کہاں تک جا پہنچا ہے کسی بھی دستاویز کی حفاظت کیلئے انسان کے پاس کیا کچھ نہیں۔لائبریریاں ہیں، مائیکروفلمیں ہیں، انٹرنیٹ ہے، کمپیوٹر ہیں، لاکرز ہیں کیسٹس اور سی ڈیز ہیں، باایں ہمہ آج کا انسان کسی دستاویز کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہم نے ہمیشہ کیلئے اسے محفوظ کردیا ہے۔اور اگر کوئی دعویٰ کرے تو علمی دنیا کبھی اس کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوگی۔لیکن آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے قرآن کریم کے نازل کرنے والے نے اسے محفوظ رکھنے کا دعویٰ کیا۔صدیاں گزر گئیں دشمنوں نے ہر چند کوششیں کیں لیکن اس کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جاسکا۔پہلی آسمانی کتابوں کے ماننے والے بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ وہ محفوظ نہیں رہیں۔لیکن اس کتاب کے دشمن بھی یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ یہ کتاب پوری طرح محفوظ ہے۔حیران کن بات یہ ہے کہ غیر مسلم دنیا نے شعوری طور اس میں تبدیلیاں کرنے کی کوششیں کیں۔غالباً 1956ء میں انہوں نے آیات اور سُوَر کی ترتیب بدل کر نیا قرآن پاک شائع کیا جس کی پہلی سورۃ ،سورۃ الزلزال تھی اور سورۃ البقرۃ انیسویں نمبر پر تھی لاکھوں کی تعداد میں اسے شائع کیا صرف نصف ڈالر اس کی قیمت رکھی۔لیکن آپ پوری دنیائے اسلام میں اللہ کے فضل وکرم سے اس کا کہیں وجود نہیں پائیں گے۔مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ قرآن پاک نہایت فصیح وبلیغ عربی زبان میں ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ زبانیں چند صدیوں میں کیا سے کیا ہوجاتی ہیں۔لیکن اس کتاب خداوندی کی وجہ سے عربی زبان اسی طرح آراستہ پیراستہ اور شگفتہ ہے، جس طرح نزول قرآن کے وقت تھی۔یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اس کتاب الٰہی کے محفوظ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

3۔ کتاب الٰہی کے محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ قرآن کریم کی ایک ایک بات بالکل صداقت پر مبنی ہے اور اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔لیکن اس دعویٰ سے قرآن کریم کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اس لئے کہ ایسا دعویٰ تو اقلیدس یا ریاضی کی کوئی کتاب لکھنے والا بھی کرسکتا ہے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ریاضی یا اقلیدس یا بعض اس طرح کے فنون کی کتابوں کے مصنف یقیناً یہ دعویٰ کرسکتے ہیں اور اس دعوے کی کوئی اہمیت بھی نہیں۔کیونکہ ہر پڑھا لکھا آدمی یہ بات سمجھتا ہے کہ یہ مضامین ہی ایسے ہیں کہ جس میں ایسی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔جس میں غلطی کا صدور بہت کم ہوتا ہے۔لیکن قرآن کریم میں جن امور کو زیر بحث لایا گیا ہے۔یوں تو وہ تمام امور ہی ایسے ہیں جس میں کسی بھی وقت غلطی ہوسکتی ہے۔لیکن وہ امور اور وہ مسائل جن کا تعلق مابعد الطبیعات اور ماورائے ادراک سے ہے۔ان کے بارے میں پروردگار کے سوا کون دعویٰ کرسکتا ہے کہ ان امور کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے اس لئے کہ جب بھی کوئی آدمی ان امور پر بحث کرتا ہے تو اس کے پاس سوائے ظن وگمان کے اور کچھ نہیں ہوتا۔وہ خود بھی اس کے بارے میں یقین کی دولت سے بہرہ ور نہیں ہوتا تو وہ اس طرح کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے لیکن اس کتاب میں زندگی کے بنیادی حقائق کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ تمام تر ایسے ہی امور پر base کرتی ہے۔اس لئے ضروری ٹھہرا کہ اس کتاب کے پڑھنے والے کو یہ یقین دلایا جائے کہ یہ کسی انسان کی تصنیف نہیں یہ پروردگار کا کلام ہے۔جس کی ایک ایک بات سراسر علم حقیقت پر مبنی ہے۔وہ اگر عالم برزخ کی بات کرتا ہے تو وہ اس کا خالق ہے وہ موت وحیات کی حقیقت کو کھولتا ہے تو وہ بھی اسی کی تخلیق ہے۔وہ ملائکہ، عالم آخرت، حشر ونشر، جنت ودوزخ اور مبداء ومعاد کے حوالے سے جو کچھ بھی ارشاد فرماتا ہے وہ اس لئے صحیح ہے کہ یہ سب کچھ اسی کی تخلیق ہے۔اور وہ زندگی اور زندگی سے پیدا ہونے والے مسائل انسانی فطرت کی ترجیحات خواہشات اور نفسانیت سے اٹھنے والے فتنے اور ان کا حل اجتماعی زندگی کے تقاضے اور اس سے صالح نتائج پیدا کرنے کے اسباب، قوموں کے عروج وزوال کے اخلاقی مسلمات، اس طرح کی ہزاروں باتیں ہیں جو انسان کی گرفت میں نہیں آتیں لیکن پروردگار عالم بتمام وکمال انہیں جانتا ہے اس لئے وہ انسانی زندگی کی ضرورتوں کے مطابق اپنی کتاب میں جو ہدایات نازل فرماتا ہے وہ یقیناً ہر شک وشبہ سے پاک ہیں۔

Marfat.com

هُدًی لِّلْمُتَّقِيْنَ ○

(یہ کتاب) "ہدایت ہے ڈرنے والوں کیلئے۔" (البقرۃ: ۲)

ھدًی کی وضاحت اور تسہیل

قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنے ظاہری حسن اور معنوی وسعت و جامعیت کے اعتبار سے اپنے اندر ایک اعجازی شان رکھتا ہے۔ بظاہر سیدھے سادے الفاظ کھائی دیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں ان کے اندر مفہوم و معنی کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ انہی دونوں لفظوں کو دیکھئے دونوں لفظ نہایت سادہ اور سہل ہیں۔ لیکن معنوی وسعت اور جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ھدًی کے بھی ایک سے زیادہ معنی ہیں اور معنی اور مفہوم میں حیرت انگیز وسعت ہے اور متقین کا بھی یہی حال ہے۔ اب ہم اس کی تھوڑی سے تفصیل عرض کرتے ہیں۔

ھدًی اور ہدایت۔ دونوں مصدر ہیں۔ اور دونوں کا معنی رہنمائی ہے۔ ہدایت کا لفظ قرآن کریم نے استعمال نہیں کیا۔ البتہ ھدًی یا الھدیٰ تقریباً دوسو جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور ہر جگہ اس کی معنوی وسعت کے اعتبار سے قرائن کی مدد سے مفہوم کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ ھدًی یا الھدی کا معنی تو رہنمائی ہے۔ لیکن رہنمائی کے مصداق بیسیوں ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے مفہوم میں تبدیلی کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ ایک راہ چلنے والا کسی واقف حال سے رستہ پوچھتا ہے یعنی اسے اپنی منزل تک پہنچنے کیلئے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس رہنمائی کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ رہنمائی دینے والا اس مسافر کو وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ یا چھڑی کے اشارے سے منزل کی سمت بتا دیتا ہے اور راستے کے کچھ نشانات واضح کر دیتا ہے۔ اسے اراء الطریق کہتے ہیں۔

۲۔ بتانے والا محسوس کرتا ہے کہ راستہ بڑا پر پیچ ہے مسافر زبانی رہنمائی سے شاید منزل تک نہ پہنچ سکے اور اس کی فکرمندی دیکھ کر وہ خود بھی فکرمند ہو جاتا ہے۔ اب وہ بجائے اسے ہاتھ کے اشارے سے بتانے کے اسے اپنے ساتھ لیتا ہے اور اسے اس کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اسے ایصال الی المطلوب کہتے ہیں۔

۳۔ کبھی رہنمائی محسوس چیزوں میں نہیں ہوتی بلکہ رہنمائی کی ضرورت معنوی، نظریاتی اور فکری ہوتی ہے۔ یعنی ایک آدمی زندگی سے متعلق تصورات میں الجھا ہوا ہے۔ وہ اس کی حقیقت اس کی ضروریات اور اسکے مسائل کو سمجھنا چاہتا ہے لیکن الجھ کر رہ گیا ہے اب ضرورت ہے کہ اسے ایسی رہنمائی دی جائے جو اس حوالے سے اسے یکسو کر سکے۔ اس فکری رہنمائی کیلئے اسے زندگی سے متعلق ایسے واضح تصورات اور اس پر کامیابی سے چلنے والے واضح نقوش قدم مہیا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ وہ اپنی فکری الجھنوں سے بھی نجات پا سکے اور عملی مثالیں اس کی فکر کو عملی توانائی بھی دے سکیں۔

۴۔ اجتماعی زندگی اپنے سفر پر رواں دواں ہے۔ اس کے اجتماعی ادارے وجود میں آچکے ہیں۔ افراد کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے۔ حکومت وریاست اور افراد ریاست کا باہمی تعلق تشکیل پا رہا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ایک ایسا آئین وجود میں آئے جو تمام اجتماعی اور اداراتی ضرورتوں کو اور فرد سے لے کر حکومت وریاست تک ہر طرح کی رہنمائی کا حق ادا کر سکے۔

Marfat.com

۵۔ سمتِ سفر اور منزل کے متعین ہو جانے یا ریاست کے ہمہ نوعی اداروں کے وجود پا جانے کے بعد اور قوم کی شیرازہ بندی ہو جانے کے بعد کبھی ایسی صورتحال بھی پیدا ہوتی ہے کہ ذمہ داریوں کی شدت کا احساس کرتے ہوئے اور راہ کی مشکلات کو محسوس کرتے ہوئے حوصلے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اور آمادۂ عمل ہونے سے پہلے ہی ہمتیں جواب دینے لگتی ہیں۔ اس صورت میں بھی رہنمائی کی ضرورت ہے، جو حوصلوں کو باندھ سکے اور ہمتوں کو توانا کر سکے۔

یہ کم سے کم رہنمائی کی ضرورتیں اور صورتیں ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہر ضرورت دوسرے سے مختلف ہے۔ ایسے تمام مواقع پر راہنمائی کی ایک ہی شکل تو ہو نہیں سکتی۔ ہر نئی ضرورت پیدا ہو جانے کے بعد رہنمائی بھی ایک نئی شکل میں متشکل ہوگی۔ شکل کچھ بھی ہو اور قالب کوئی بھی اختیار کیا جائے اسے بہر حال رہنمائی ہی کہا جائے گا۔ لیکن اس سے یہ تو اندازہ ہو رہا ہے کہ رہنمائی یا ہدایت لفظ کی صورت میں تو ایک ہے لیکن معنوی وسعت کے اعتبار سے اس کے کتنے رنگ اور کتنی صورتیں ہیں۔

متذکرہ بالا پانچوں ضرورتوں کو سامنے رکھ کر دیکھئے۔ کہ پہلی صورت میں جب کہ زندگی کا مسافر منزل تک پہنچنے کا راستہ پوچھنا چاہتا ہے اور یہ اس کے سفر کی بالکل ابتداء ہے اور ابھی وہ اس میدان میں بالکل نو وارد ہے۔ ہدایت کے احساس نے ابھی اس کے اندر جنم لیا ہے۔ قرآن اس کے لئے بھی ہدایت ہے۔ وہ صرف سمتِ سفر معلوم کرنا چاہتا ہے تو قرآن انگلی اٹھا کے اسے سمتِ سفر بتا دیتا ہے۔ اور راستے کے کچھ نشانات بھی واضح کر دیتا ہے۔ تو اس آیت کریمہ میں قرآن کریم کو اس حوالے سے بھی ہدایت کہا گیا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے ھدی للناس کہا گیا ہے۔ یعنی یہ قرآن سب لوگوں کیلئے ہدایت ہے کہ وہ سب لوگوں کو راستہ دکھاتا ہے۔

دوسری صورت میں جبکہ اس کی فکرمندی میں اضافہ ہو چکا ہے۔ اب وہ بہر صورت منزل تک پہنچنے کیلئے بے تاب ہے اور زندگی کے نشیب و فراز نے اسے پریشان کر دیا ہے۔ اب وہ خود کو رہنما کے حوالے کر کے التجا کرتا ہے کہ مجھے منزل تک پہنچنے کیلئے مدد کی جائے۔ تو قرآن اس کیلئے بھی ہدایت ہے۔ ارشاد فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہم تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کیلئے بے چین ہوتے ہیں ہم ان کیلئے اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔

نمبر ۳ میں ہم نے جس ضرورت کا ذکر کیا ہے کہ انسان فکری طور پر الجھ کر رہ جاتا ہے وہ چلنا چاہتا ہے لیکن اسے راستہ نہیں ملتا۔ قرآن کریم اس کیلئے بھی ہدایت ہے کہ وہ اسے اس طرح فکری رہنمائی دیتا ہے کہ قرآن کریم کا مطالعہ اس میں قلبی نور و بصیرت پیدا کر دیتا ہے۔ اب مشکل سے مشکل مراحل میں بھی اس کی بصیرت اسے رہنمائی دیتی ہے اور دل کا نور راستہ روشن کرتا ہے۔ اسی کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ والذین اهتدوزادهم هدی (کہ جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اللہ ان کی قلبی بصیرت میں اضافہ فرماتا ہے)۔

اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی اور اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے آئینی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کا ذکر ہم نے نمبر چار پر کیا ہے۔ قرآن کریم اس کیلئے بھی رہنما بن کر آیا ہے۔ یعنی وہ صرف کتاب نصیحت ہی نہیں بلکہ ضابطۂ حیات اور اسلامی ریاست و حکومت کا آئین بھی ہے۔ اس لئے فرمایا اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (کہ بے شک شریعت اور آئین تو اللہ ہی کا آئین ہے) (یعنی قرآن کریم)

نمبر ۵ میں ہم نے جس ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کریم یہ ضرورت بھی پوری کرتا ہے یعنی حوصلوں کو باندھتا اور توانا کرتا ہے اور اس لحاظ سے اسے ہدایت کہا گیا ہے۔ جس طرح ''اصحاب کہف'' کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ چند لڑکے کے بالے تھے۔ جب وہ ایمان لے آئے تو

Marfat.com

حالات کی طغیانی ان کے حوصلوں کو توڑنے لگی۔تو اللہ فرماتا ہے: زِدْنَاهُمْ هُدًى وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (ہم نے پھر ان کی ہدایت میں اضافہ کیا یعنی ان کے دلوں کو باندھ دیا اور حوصلوں کو توانا کر دیا)۔

ہم نے رہنمائی اور ہدایت کی چند آسان ضرورتیں آپ کے سامنے واضح کیں اور آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے رہنمائی کا حق ادا کرتا ہے۔اور اس متنوع رہنمائی کو جس کی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں صرف ایک لفظ ھدًی سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے آپ اس لفظ کی وسعتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

تقویٰ کا مفہوم اور تقویٰ کے مدارج

اسی طرح متقین کے لفظ میں بھی ایسی ہی وسعتیں رکھی گئی ہیں۔ متقین متقی کی جمع ہے۔اور متقی اسے کہتے ہیں، جسے تقویٰ کی دولت نصیب ہو۔ہدایت کی طرح تقویٰ کی بھی مختلف جہتیں اور مختلف مدارج ہیں۔کبھی تو تقویٰ کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کے نقصان سے بچنا، یعنی آدمی یہ دیکھتا ہے کہ فلاں کام کرنے سے یا فلاں جگہ جانے سے مجھے یہ نقصان پہنچ سکتا ہے تو آدمی اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔قرآن کریم میں تقویٰ اس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ:

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَ انُ شِيْبًا (مزمل: ۱۷)

(اگر تم نے کفر کیا تو اس دن سے کیسے بچ سکو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا)۔

وَاتَّقُوْ فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (انفال: ۲۵)

(اور اس آفت سے چوکنے رہو جو خاص طور پر انہی پر نہیں آئے گی جنہوں نے تم میں سے ظلم کا ارتکاب کیا ہوگا)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جن میں اتنا شعور زندہ ہے کہ وہ اپنی اور کائنات کی حقیقت پر غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کائنات کے خالق نے کوئی چیز بھی بے مقصد پیدا نہیں کی اور مزید یہ کہ اس کی پیدا کردہ ہر مخلوق اس کے احکام کے تحت اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں مشغول ہے۔اور جو مخلوق اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے اسے مٹا دیا جاتا ہے۔ درخت جب تک پھل دیتا یا سایہ دیتا ہے اور اس کی سرسبزی باقی رہتی ہے تو وہ قائم رہتا ہے۔اور جب وہ اپنی ان ذمہ داریوں سے قاصر ہو جاتا ہے تو اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔یہی حال ہر مخلوق کا ہے یہ انسان جسے اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے اور جس پر تمام مخلوقات سے زیادہ انعامات کی بارش کی گئی ہے۔اور پھر اسے جوہر عقل سے بھی نوازا گیا ہے۔یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو۔اور اگر واقعی کوئی مقصد ہے اور یقیناً ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اگر اپنے مقصد کے مطابق زندگی نہ گزارے تو اسے ہمیشہ باقی رکھا جائے اور اس سے کبھی باز پرس نہ ہو۔جو آدمی اتنا سا شعور اپنے اندر رکھتا ہے یہ قرآن اس کیلئے بھی ہدایت ہے، اور یہ تقویٰ کی پہلی منزل ہے۔

تقویٰ کا ایک معنی گناہ سے اس کے برے نتائج اور اللہ کے ڈر سے بچتے رہنا بھی ہے۔یہ ظاہر ہے کہ گزشتہ بیان کردہ معنی کی نسبت اگلی منزل کا نام ہے کہ اسے صرف مقصد کا شعور ہی برے انجام سے بچنے کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ یہ احساس اس کے اندر ایسی شدت اختیار کر گیا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرا ہر گناہ اللہ کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے۔مین جو کچھ بھی کرتا ہوں اسی پر میرے انجام کا ترتب ہوتا ہے۔جس طرح سنکھیا کھانے سے آدمی مر جاتا ہے اور مرغن غذا کھانے سے قوت آتی ہے۔اسی طرح گناہ سے برا انجام جنم لیتا ہے جس کا نتیجہ اللہ کی

Marfat.com

ناراضگی ہوتا ہے۔اور نیکی سے آخرت سنورتی ہے اور زندگی پنپتی ہے اور اس کے نتیجے میں اللہ کی خوشنودی نصیب ہوتی ہے۔اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے نیکی کا شوق اور اللہ کے غضب سے بچنے کیلئے گناہ سے نفرت یہ وہ تقویٰ ہے جس کے حاملین کیلئے یہ قرآن پاک ہدایت بن کر آیا ہے یعنی جس طرح ہدایت کے مختلف مدارج ہیں ایک ہدایت عام آدمی کی ہے اور ایک ہدایت درجہ بدرجہ ہدایت کے راستے پر چلنے والوں کی ہے جس کی آخری منزل کی کوئی انتہا نہیں۔اسی طرح تقویٰ ایک عام آدمی کا ہے اور ایک تقویٰ اس آدمی کا ہے جو گناہ سے نفرت کرتا ہے اور نیکی کی طرف لپکتا ہوا جاتا ہے۔اللہ کی ناراضی اس کیلئے زندگی کی سب سے بڑی ناکامی ہے اور اس کی خوشنودی زندگی کی حقیقی منزل ہے۔یہ پوری تفصیلات اگر ذہن میں رہیں تو پھر اس طرح کے اعتراضات کا کوئی موقع نہیں جو بعض لوگوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں کہ قرآن کریم تو سب کیلئے ہدایت بن کر آیا ہے لیکن یہاں فرمایا جارہا ہے کہ وہ صرف متقین کیلئے ہدایت ہے۔بات بالکل واضح ہے کہ جو بھی زندگی میں بداطواریوں کے انجام سے بچنے کیلئے قرآن کریم کی طرف رجوع کرتا ہے وہ بھی متقی ہے اور یہ قرآن کریم اس کیلئے بھی ہدایت ہے اور جو درجہ بدرجہ اللہ کے قرب کی طرف بڑھتا جاتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں وہ بھی متقی ہے اور قرآن کریم اس کیلئے بھی ہدایت ہے یہ تو قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ بظاہران ضرورتوں میں کس قدر تفاوت دکھائی دیتا ہے لیکن قرآن کریم کے فیضان نے سب کیلئے اپنی آغوش کھول رکھی ہے اور ہر کوئی بقدر ہمت اس سے اپنا حصہ وصول کررہا ہے۔البتہ ایک عامیانہ سا سوال باقی رہ جاتا ہے کہ چلئے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآن کریم کی ہدایت کے بھی مدارج ہیں اور تقویٰ کے بھی مدارج ہیں۔لیکن اس سے یہ بات تو ثابت ہوجاتی ہے کہ جس آدمی میں تقویٰ نام کی کوئی چیز نہیں۔اس کیلئے تو قرآن کریم ہدایت نہیں ہوسکتا اور ویسے بھی تقویٰ کا سفر تو قرآن کریم کی ہدایت کے بعد کا ہے اس سے پہلے تقویٰ کیسے نصیب ہوسکتا ہے؟ یہ خیال سراسر قلتِ فہم سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ دنیا کی کوئی بھی مؤثر قوت جو اپنی اثر اندازی میں بے مثال بھی ہو وہ اس وقت تک کسی پر اثر انداز نہیں ہوسکتی جب تک کوئی اثر پذیری کیلئے اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔سورج سب کو روشنی دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر روشنی کے سرچشمے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس روشنی سے فائدہ اٹھانے کیلئے آنکھیں کھولنا ضروری ہے۔جو شخص آنکھیں نہ کھولے یا بینائی سے محروم ہو اسے سورج کی روشنی کوئی فائدہ پہنچا نہیں سکتی۔چمن میں بلبل ہزار چہکے۔لیکن اگر ایک شخص بہرہ ہے تو وہ اس کے چہکنے سے کیا لطف اندوز ہوسکتا ہے۔یہاں بھی یہی فرمایا جارہا ہے کہ قرآن کے نور اور سرچشمۂ ہدایت ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔لیکن اس سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جس میں اثر پذیری یا متوجہ ہونے کی کم سے کم صلاحیت موجود ہو۔وہ اپنے انجام کے بارے میں فکر مند ہو زندگی میں بداطواریوں سے نالاں ہو اور انہیں بدلنے کی فکر بھی رکھتا ہو اور یہی تقویٰ کی پہلی منزل ہے اور یہی انسان کی فطری صلاحیت ہے۔اس لئے قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔"اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰى" (اس میں اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے درس عبرت ہے) (نازعات:۲۶) "اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ" (بے شک اس کے اندر یاد دہانی ہے اس کیلئے جس کے پاس بیدار دل ہو یا وہ پوری طرح متوجہ ہو کر بات سنے) (ق: ۳۷)

ہدایت اور تقویٰ میں چولی دامن کا ساتھ ہے

حاصل کلام یہ کہ قرآنِ کریم پوری نوع انسانی کیلئے ہدایت بن کے آیا اور یہ آفتاب جہاں تاب سے بڑھ کر اہل دنیا کیلئے ہدایت کا نور پھیلا رہا ہے۔لیکن لِلْمُتَّقِیْنَ میں لام انتفاع کیلئے ہے۔یعنی اس ہدایت سے فائدہ اٹھانے کیلئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر تقویٰ ہو۔تقویٰ

Marfat.com

بالکل ابتدائی درجے میں سادہ احساس کی حد تک بھی ہوگا تو قرآن تب بھی اسے ہدایت دے گا اور اگر درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا مقام قرب تک پہنچ جائے گا تو قرآن تب بھی اس کیلئے ہدایت ہے۔ لیکن اگر ایک شخص مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر اپنے انجام کی فکر نہیں پیدا کرتا وہ بس اس لئے مسلمان ہے کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا مستقبل کی فکر مندی، گناہ سے نفرت، نیکی کا شوق، اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس، یعنی تقویٰ کی کوئی رمق بھی اس کے اندر موجود نہیں وہ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا اور اگر قرآن اس کی زندگی میں نافذ کر دیا جائے تو مسلمان ہوتے ہوئے بھی اس سے بغاوت کر دے گا۔ اس کی واضح مثال آج امت مسلمہ کی اکثریت ہے۔ حکمران مسلمان ہیں لیکن قرآنی تعلیمات سے الرجک، عوام مسلمان ہیں لیکن قرآن پاک کی تعلیمات کو زندگی میں داخل کرنے کیلئے تیار نہیں۔ مجموعی طور پر ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر قرآنی افکار سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ اس سے یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کی ہدایت کیلئے متقی ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے کیونکہ تقویٰ ہی وہ اصل صفت ہے جو ایک مسلمان کو بھی اپنے انجام کے بارے میں فکر مند بناتی ہے اور یہی فکر ہدایت کے حصول کا سبب بنتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے زمانے میں بعض اسلامی احکام کے اجراء کی کوشش کی گئی لیکن خود مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے نفاذ کو ناکام بنا دیا گیا وہ ایک تکلیف دہ داستان ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر آدمی میں خدا خوفی نہ ہو تو قرآن کریم کو اللہ کی کتاب ماننے کے باوجود بھی وہ قرآن کریم کی ہدایت سے محروم رہتا ہے۔

یہ تلخ حقیقت کہ کوئی قوم خواہ وہ صاحب ایمان بھی ہو لیکن اگر اس کے اندر تقویٰ یعنی خدا خوفی نہ پائی جاتی ہو اور وہ اعمال کی مسلسل خرابیوں کے باعث اپنے دلوں کی دنیا اس حد تک اجاڑ چکے ہوں کہ ان پر کوئی نصیحت بھی اثر نہ کرے۔ تو امتوں کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ان کے بارے میں انبیاء کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں اور ان کی دعاؤں کی قبولیت کیلئے یہ شرط عائد کر دی جاتی ہے کہ جب تک یہ لوگ اپنے اندر تقویٰ پیدا نہیں کریں گے اس وقت تک یہ اللہ کی رحمت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں جب بنی اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا ہوئے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کرنے کیلئے ان کو سخت آزمائشوں سے گزارا۔ تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو آئندہ غضب الٰہی سے بچانے کیلئے پروردگار سے دعا مانگی: ''یا اللہ! آئندہ ان کو اپنے غضب سے محفوظ رکھنا اور اپنی رحمت سے کبھی محروم نہ رکھنا'' لیکن پروردگار نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے جواب میں ارشاد فرمایا: وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ (اور میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے پس میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کیلئے جو تقویٰ پر قائم رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ان لوگوں کیلئے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے)۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت انہیں لوگوں کو ملتی ہے جو تقویٰ اختیار کرنے والے، زکوٰۃ ادا کرنے والے اور اللہ کی آیتوں پر ایمان لانے والے ہوں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کٹھن امتحانوں سے گزارنے کے بعد جب قوموں کی امامت پر سرفراز فرمانے کا وعدہ فرمایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ منصب میری اولاد کو بھی حاصل رہے گا یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (کہ میرا یہ عہد تمہاری اولاد میں سے ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوگا جو ظالم ہوں گے۔) ظالم سے مراد ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہیں جو توحید و اخلاص سے عاری اور تقویٰ و خشیت سے خالی ہوں۔

Marfat.com

تقویٰ سے پھوٹنے والی پہلی کونپل ایمان بالغیب ہے

ان توضیحات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم جو اللہ کی آخری کتاب ہے اس سے استفادہ کیلئے ہر سطح پر تقویٰ کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ کیونکہ اثر پذیری کی یہ کم سے کم صلاحیت ہے جس کے بغیر قرآن کریم سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ یہ صلاحیت جیسے جیسے ترقی کرتی جاتی ہے۔ ویسے ویسے قرآن کریم کی ہدایت اور اللہ کی رحمت بندے کے شامل حال ہوتی جاتی ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ

(یہ قرآن) ان لوگوں کیلئے (ہدایت ہے) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں)

ایمان بالغیب کا مفہوم

ہماری محولہ بالا گزارشات سے یہ بات تو واضح ہوگئی ہے کہ قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کیلئے کم سے کم تقویٰ کی صفت ضروری ہے۔ یہ وہ صلاحیت ہے جو انسان کو اپنی زندگی اور اس کے انجام پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان قرآنِ کریم سے استفادہ کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ پھر جب اللہ کی اس کتاب کو وہ پڑھنا شروع کرتا ہے اور اس کی رہنمائی میں قدم قدم آگے بڑھتا ہے تو تقویٰ بھی اس کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی رہنمائی میں تقویٰ کی جو پہلی کونپل پھوٹتی ہے، وہ ایمان بالغیب ہے۔ یہ قرآنِ پاک سے تعلق کا نتیجہ بھی ہے اور یہی تقویٰ کی اگلی منزل بھی ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی صفت ہے جو تقویٰ کے اگلے مراحل کیلئے زینہ کا کام بھی دیتی ہے۔ اور یہی قرآنِ کریم کے ابتدائی مطالعہ کا حاصل بھی ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ جو شخص قرآنِ پاک سے استفادہ کیلئے اپنے آپ کو قرآنِ کریم سے وابستہ کر دے گا تو سب سے پہلے یہی صفت اس کے اندر جنم لے گی اور جو شخص تقویٰ کے اگلے مراحل پر پہنچنے کیلئے کوشش کرے گا تو یہ صفت اس کیلئے معاون و مددگار ہوگی۔ حیرانی کی بات ہے کہ یہی صفت تقویٰ کا ثمرہ بھی ہے اور تقویٰ کے آئندہ مراحل کیلئے بیج اور تخم بھی ہے۔ ان دونوں میں فرق ملحوظ رہے تو اس صفت کے دوگونہ فوائد کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ان چیزوں کو مانتا ہے جن کا تعلق محسوسات اور مادیات سے ہے اور جنہیں وہ اپنے حواس خمسہ سے محسوس کر سکتا اور عقل کے ذریعے آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ جب بھی اسے کسی ایسی چیز کو ماننے کی دعوت دی جائے جو اس کے حواس کی گرفت میں نہ آتی ہو تو وہ بالعموم اس کے وجود سے انکار کر دیتا ہے۔ اور اس کا اصرار یہ ہوتا ہے کہ میں جب تک اس چیز کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں یا اپنے حواس سے محسوس نہ کر لوں کیسے مان سکتا ہوں؟ مشرکین مکہ سے جب آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نبوت دی ہے اور فرشتہ مجھ پر وحی لے کر اترتا ہے تو ان کا اصرار بھی یہی تھا کہ جو فرشتہ آپ ﷺ پر اترتا ہے وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا اور وہ ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا؟ اور ہم اس کتاب کو جو تم پر اتر رہی ہے اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک ہم اسے مجلد شکل میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ یہ انسانی کمزوری اتنی گہری ہے کہ جس کے اثرات ہمیں دور تک تاریخ میں پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے منتخب افراد کو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ لے کر کوہ طور پر گئے اور انہوں نے پس پردہ اللہ کی آواز بھی سنی لیکن پھر بھی مطالبہ کیا '' لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً '' کہ ''ہم ہرگز اے موسیٰ! تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں''۔ اقبال نے اسی انسانی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ؎

Marfat.com

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر

اسی انسانی کمزوری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تقویٰ کے نتیجے میں جو پہلی صفت قرآن کے ماننے والے میں پیدا ہوتی ہے اور جو قرآن سے مزید فیض حاصل کرنے کیلئے ضروری بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ مادیات اور محسوسات سے جو دراصل حیوانی زندگی ہے، اپنے آپ کو بلند کر لیتا ہے اور اس کی عقل اتنی دوررس اور اتنی دوربین ہو جاتی ہے کہ وہ ان حقیقتوں کو بھی ماننے لگتا ہے جو اگرچہ آنکھوں سے نہیں دیکھی جاسکتیں لیکن عقل سلیم انہیں ماورائے عقل نہیں سمجھتی۔ اس لئے وہ ان حقیقتوں کو بڑی آسانی سے قبول کر کے ہدایت اور تقویٰ کے اگلے مراحل کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی زندگی کے اعمال بدلنا شروع ہو جاتے ہیں اور ان اعمال کا ظہور شروع ہو جاتا ہے جو تقویٰ کے فیضان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آج بھی ہم ''ان پڑھوں کو تو جانے دیجئے'' جب پڑھے لکھوں کو دیکھتے ہیں تو ان میں یہ تقسیم صاف دکھائی دیتی ہے کہ جو لوگ قرآنی ہدایت کے سائے میں پروان چڑھتے اور اسی کی رہنمائی میں زندگی گزارتے ہیں ان کیلئے ماورائے محسوسات حقائق کو دیکھ لینا اور مان لینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن جن کی طبیعتیں محسوسات اور مادیات سے آگے نہیں بڑھتیں اور وہ اپنی عقلوں کو ہمیشہ محسوسات کی خدمت میں لگائے رکھتے ہیں ان کی زندگیوں میں یہ عجیب تضاد دکھائی دیتا ہے کہ ایک طرف تو اسلام کی بیان کردہ نادیدہ حقیقتوں کو تسلیم کرنا ان کیلئے مشکل ہوتا ہے لیکن دوسری طرف ان کی ضعیف الاعتقادی مخلوقات میں عجیب و غریب قوتیں تسلیم کر لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتی یہ عقل کی نارسائی، فکر کی کوتاہی اور مادے کی غلامی کا وہ نتیجہ ہے، جو تاریخ میں بھی اور آج بھی ہم ہر اس جگہ دیکھتے ہیں جہاں قرآنی تعلیمات کے اثرات کی کمی ہے۔ چنانچہ اسی بنیادی کمزوری سے بچانے کیلئے اس حقیقت کی عقدہ کشائی کی گئی ہے کہ قرآنِ کریم کی ہدایت کو قبول کرنے والے لوگ ہمیشہ اپنی صلاحیتوں میں بھی نوازے جاتے ہیں جس کا پہلا ثمرہ یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب کی حقیقت سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔

اب ہم ایمان بالغیب کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایمان امن سے ہے، جس کا معنی ہے امن دینا، قرآن کریم میں یہ لفظ بعض مقامات پر زبانی اقرار کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس کا اصل استعمال کبھی لام کے صلہ کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی ب کے صلہ کے ساتھ آمَنَ لَہٗ کے معنی ہیں صَدَّقَہٗ وَاعْتَمَدَ عَلَیْہِ اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا اور آمَنَ بِہٖ کے معنی ہیں اَیْقَنَ بِہٖ اس پر یقین کیا۔ قرآنِ کریم جس حقیقی ایمان کی دعوت دیتا ہے اور یہاں جو معنی مراد ہے وہ یہی ہے جس میں تصدیق، اعتماد اور یقین تینوں شامل ہیں۔ اس لحاظ سے ایمان کی تعریف یہ ہوگی کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر رسول اللہ ﷺ پر، فرشتوں پر، تمام کتابوں پر، تمام نبیوں پر اور آخرت پر دل کی تصدیق اور یقین کے ساتھ صرف رسول اللہ ﷺ کے اعتماد پر ایمان لائے وہ مومن ہے۔ یعنی اس کے سامنے ماننے کی باتوں میں سے کوئی بات بھی پیش کی جائے چاہے اس کا تعلق اللہ کی ذات یا صفات سے ہو چاہے اس کا تعلق وحی یا نبی سے ہو چاہے اس کا تعلق احکام خداوندی یا احکام نبوت سے ہو اور چاہے اس کا تعلق عالم آخرت سے ہو اس کو دل کی تصدیق اور یقین سے ماننا اور کسی طرح کے شک میں مبتلا نہ ہونا اور دنیا بھر کے اہل دانش بے شک اسے ماننے سے انکار کریں اور بے شک ماننے والے کی اپنی عقل بھی اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے لیکن صرف اس لئے مان لینا کہ آنحضرت ﷺ نے اسے ماننے کا حکم دیا ہے اور یا یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کا حکم دے رہے ہیں۔ تو صرف آپ ﷺ کے اعتماد پر اسے تسلیم کر لینا یہ حقیقت میں ایمان ہے اور یہی وہ ایمان ہے جسے مندرجہ ذیل آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے۔

Marfat.com

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا (الحجرات: ۱۵)

(مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے)

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (حم السجدہ: ۳۰)

(جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے)

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (الانفال: ۲)

(مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں)

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ (البقرۃ: ۱۶۵)

(اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں)

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (النساء: ۶۵)

(پس نہیں، (اے نبی) تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کر لیں)

ان سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرارِ ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (النساء: ۱۳۶)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر)

ہر دور میں انسان کی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ اللہ، اس کے رسول اور باقی ایمانیات پر ایمان لانے کا مطلب یہ سمجھتا رہا ہے کہ زبان سے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ میں نے ان صداقتوں کو قبول کر لیا ہے تو یہی وہ ایمان ہے جو میرے لئے کافی ہے۔ یہاں پوری طرح اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے کہ کسی بھی صداقت کا زبانی اقرار کبھی قابل قبول نہیں ہوتا ہے جب تک اس اقرار کی علامات انسانی رویے میں منعکس نہیں ہوتیں اور یہ ایک حقیقت ہے کوئی بھی زبان کا اقرار انسان کے رویے پر اس وقت اثر انداز ہوتا ہے جب وہ اقرار اس کے دل کی تصدیق بن جاتا ہے یہی تصدیق اس کے رویے کو متشکل بھی کرتی ہے اور اس کے کردار میں پختگی کا باعث بھی بنتی ہے۔ ہم عام انسانی معاملات میں دیکھتے ہیں کہ باتیں مانی جاتی ہیں اور منوائی جاتی ہیں اور اگلے روز ان باتوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ بہت آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ رات گئی بات

Marfat.com

گئی۔ مفادات کے زیر اثر تسلیم کردہ باتیں مفاد کے بدلنے سے اپنا اثر کھودیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست دانوں میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ سیاسی وعدے پورا کرنے کیلئے نہیں ہوتے۔ حالانکہ وعدہ ایفاء کے تصور کے بغیر اپنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا اور ہر دور میں اس کا احترام کیا گیا ہے ۔لیکن جو وعدے بھی مفاد کے تحت زبان کا عمل بن کے رہ جاتے ہیں، وہ اپنا احترام بھی کھودیتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں زبانی اقرار کو اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں مل سکتی جب تک اس کے ساتھ دل کی تصدیق اور عمل کی قوت شامل نہ ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب دل کی تصدیق میسر آجائے تو اس کے بعد عمل کا اس سے الگ رہنا نا قابل تصور ہے۔ جب عام انسانی زندگی اور اس کے معاملات میں، عام حقائق کی یہ حالت ہے تو پھر کائنات کی سب سے بڑی حقیقت جسے ایمان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ اگر صرف زبان کے اقرار تک محدود رہے تو اس سے ایمانی زندگی کیسے پیدا ہوسکتی ہے اور اللہ کی نگاہ میں اس کی کیا قدر و عظمت ہوسکتی ہے؟ یہی وہ بات ہے جو یہاں کہی جارہی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبال نے اپنے انداز میں کہا تھا:

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا اِلٰہ اِلاّ
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ میں غیب پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے کہ متقین کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ دوسرا ترجمہ اس کا یہ کیا گیا ہے کہ وہ غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں۔ پہلی صورت میں بالغیب مفعول ہے اور دوسری صورت میں ظرف ہے۔ ہمارے نزدیک مآل کار دونوں صورتوں میں مفہوم اور مراد میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مقصود یہ ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں یعنی ہر اس چیز کو مانتے ہیں جسے ماننے کا انہیں حکم دیا جائے چاہے وہ چیز ان کیلئے غیب کا درجہ کیوں نہ رکھتی ہو اور غیب سے مراد ہر وہ چیز ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہو اور یا اسے جاننے کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔ نہ حواس اسے محسوس کر سکیں اور نہ عقل اس کا ادراک کر سکے لیکن جب قرآن کریم ایسی باتوں کو ماننے کا حکم دے تو متقی اس کے ماننے میں تأمل نہیں کرتے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ہمیں جس چیز پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، وہ ہمارے حواس یا ادراک کی گرفت میں نہیں آتی، کیونکہ وہ اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ہمارے لئے ماننے کا اصل ذریعہ اور تسکین واطمینان کا اصل حوالہ اللہ کا رسول ہے۔ ہمارے نزدیک اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ بات اللہ کے رسول نے فرمائی ہے یا اللہ کی طرف سے ہمیں پہنچائی ہے اور آپ کی ذات سے اس کا انتساب ثابت ہے تو پھر ہمارے نزدیک اور کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایمان بالغیب میں تین باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ سب سے پہلی یہ بات کہ دین اسلام جو مسلمانوں کیلئے ضابطہء حیات ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کا تعلق اللہ کی ذات سے ہے جسے ہم اپنے حواس اور اپنی عقل سے احاطۂ ادراک میں نہیں لاسکتے اور اللہ کے اس کلام کو اللہ کے رسول پر لے کر آنے والا ایک فرشتہ ہے جن کا نامِ نامی جبریل امین ہے۔ انہیں بھی ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ جب وحی لے کر سرورِ دو عالم ﷺ پر نازل ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کے قلب مبارک پر قرآن پاک اتارتے ہیں۔ تو اسے صرف رسول پاک ﷺ سنتے ہیں اور کوئی نہیں سن سکتا اور پھر اس کلام پاک میں جن باتوں کی خبر دی گئی ہے۔ مثلاً عالمِ برزخ، عالمِ آخرت، جنت، دوزخ، انسان کا دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا، اور تمام انسانوں کا ایک دن اللہ کی عدالت میں جواب دہی کیلئے پیش ہونا، تمام اعمال کا حاضر کیا جانا، اور تمام جن وانس کے اعمال کا حساب لیا جانا اور ایسی بہت ساری باتیں ہیں جو ہمارے حواس اور ہماری عقل سے ماوراء ہیں اور جنہیں ہم جاننے سے عاجز ہیں۔ غور

Marfat.com

فرمایئے! اگر قرآن پاک سے ہدایت حاصل کرنے کیلئے ایمان بالغیب کو ضروری قرار نہ دیا جاتا تو قرآن پاک کا پڑھنے والا ان میں سے ہر بات کے جاننے پر اصرار کرتا تو کیا قرآنِ پاک سے استفادہ کبھی ممکن ہوتا۔ وہ عالم غیب کی کسی بات کو حواس وعقل کے ذریعے جاننے سے عاجز ہوتا تو یقیناً ان باتوں کا انکار کر دیتا وہ یہ کہتا کہ جن صداقتوں پر پورے دین اسلام کی عمارت کھڑی ہے جب میں انہیں ماننے سے عاجز ہوں کیوں کہ وہ میرے حواس اور عقل کی گرفت میں نہیں آتیں تو پھر میں اس قرآنِ کریم کو کیسے تسلیم کرلوں۔ اس لئے صاف طور پر فرمایا گیا کہ اگر تم قرآن پاک سے ہدایت کے طلبگار ہو تو پھر ضروری ہے کہ غیب پر ایمان لاؤ۔ جس طرح ہر Subject کی تعلیم سے پہلے اس کی مبادیات اور مسلمات پر لیکچر دیا جاتا ہے کہ اگر تم اس Subject کو پڑھنا چاہتے ہو تو تمہیں یہ یہ باتیں پہلے تسلیم کرنا ہوں گی۔ فلسفہ کی مبادیات بالکل اور ہیں اور سائنس کی مبادیات بالکل اور ہیں ایک کا دارومدار Practice پر ہے اور دوسرے کا تخیلی اور فکری قوت پر۔ ان بنیادوں کو تسلیم کرنے کے بعد مطلوبہ علم حاصل کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ بالکل اسی طرح پروردگار نے قرآنِ پاک سے ہدایت حاصل کرنے کیلئے چند بنیادی مقدمات کا ذکر کر دیا ہے۔ جن پر درجہ بدرجہ ہدایت کا دارومدار ہے۔

دوسری بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ ہے ایقان ویقین۔ یہاں جس ایمان کی بات کی جارہی ہے۔ وہ اسلام اور قرآن کی بنیادی صداقتوں کو زبان سے مان لینے کا نام نہیں۔ بلکہ اس کی حقیقی روح دل کی تصدیق اور دل کا یقین ہے۔ صرف زبان سے اقرار کر لینے سے آدمی دائرہ ایمان میں داخل تو ہو جاتا ہے لیکن جب تک دل کی تصدیق اور اس کے مطابق عمل کی قوت شامل نہ ہو ایمان مکمل نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ قوت جو انسان کو آمادۂ عمل کرتی اپنے اعتقادات پر استقامت عطا کرتی اور بڑی سے بڑی مخالفت میں بھی کھڑا رہنے کا حوصلہ دیتی اور اس کیلئے ہر طرح کی قربانی اور ایثار کو ممکن بنا دیتی ہے وہ یہی یقین کی قوت ہے۔ جس آدمی کو اس بات کا یقین ہے کہ میرا اللہ مجھے ہر وقت دیکھتا ہے وہ کبھی گناہ نہیں کرسکتا۔ وہ تخت نشین ہو کر بھی اپنے آپ کو ایک عاجز بندہ سمجھتا ہے اس کے ہاتھوں میں خزانہ بھی آجائے تو وہ اس کے ایک ایک پیسے کو خرچ کرتا ہوا فکرمند ہوتا ہے۔ یعنی اس کا ہر عمل اس لئے پاکیزہ ہو جاتا ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ میں اللہ کی نگاہوں میں ہوں۔ اسی طرح اللہ کا کوئی حکم جس پر اسے یقین ہے کہ میرے اللہ کا حکم ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ اللہ کے حکم سے سرتابی دنیوی اور اخروی تباہی کا باعث ہے اور یہ بھی وہ جانتا ہے کہ علم الٰہی سے نکلا ہوا کوئی حکم کبھی اپنے قابل عمل اور نتیجہ خیز ہونے میں غلط نہیں ہوسکتا۔ تو ایسے شخص کیلئے بہت مشکل ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے انحراف کرے یا اس کے کسی حکم کو ناقابل عمل سمجھے، یا مستقبل میں اس کے نتائج کے بارے میں اسے کوئی تردد ہو۔

اسی طرح جب تک ایک مومن کو یقین ہے کہ میں جس ذات بابرکات پر ایمان لایا ہوں، وہ معصوم ہے وہ نہ دین پہنچانے میں غلطی کرسکتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی کرسکتے ہیں ان کی ہر بات ہمارے لیے حجت ہے ایسے مومن سے اس بات کی کبھی توقع نہیں ہوسکتی کہ وہ رسولِ پاک ﷺ کی کسی سنت کے بارے میں کسی طرح کے ذہنی تحفظ کا شکار ہو۔ یہ فکر اور عمل کی حیرت انگیز تبدیلی یا استقامت کی یہ تصویر جس کا ذکر میں آپ سے کررہا ہوں، یہ صرف یقین کے نتائج ہیں کیونکہ یقین ایک ایسی قوت کا نام ہے جو انسان کی کردار سازی کیلئے سب سے مؤثر عامل ہے۔

اقبال نے ٹھیک کہا تھا:

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

Marfat.com

اور اگر کسی قوم میں یہ یقین اور ایمان کی قوت کی نہ رہے تو ایسی قوم نہ صرف کہ کردار کی عظمت سے محروم ہو جاتی ہے بلکہ وہ دھرتی کا ایسا بوجھ بن جاتی ہے جس کیلئے اپنا قومی وجود اور پنی سیاسی آزادی کا تحفظ بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ انسانوں کی ایک ایسی بھیڑ ہوتی ہے جسے کوئی بھی طاقت ور قوم بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح ہانکنے لگتی ہے۔ اس کے فیصلے اپنے نہیں ہوتے بلکہ دوسرے ان کیلئے فیصلے کرتے ہیں وہ بظاہر آزاد بھی ہو تب بھی غلاموں سے بدتر ہوتی ہے۔ بقول اقبال ؎

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

تیسری چیز، جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ وہ ہے اللہ اسکی کتاب اور اس کے رسول ﷺ پر اعتماد۔ دنیا کی ریت یہ ہے کہ یہاں ہر بات کو ہر آدمی نہیں جانتا۔ ہم اپنے بیشتر معاملات اور بیشتر ضرورتوں میں دوسروں پر اعتماد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اسی اعتماد سے دنیا کا کاروبار چلتا ہے آدمی بیمار ہوتا ہے تو ڈاکٹر یا طبیب کے پاس جاتا ہے۔ وہ جو نسخہ لکھ کر دے دے، بے تردد اسے استعمال کرتا ہے۔ کبھی کوئی مریض کسی ڈاکٹر سے نہیں پوچھتا کہ آپ مجھے پہلے اپنے لکھے ہوئے نسخے اور اس کے اجزاء کے بارے میں مطمئن کریں، تب میں آپ کا نسخہ استعمال کروں گا کیونکہ مریض کو ڈاکٹر پر اعتماد ہوتا ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ مجھے جو بھی نسخہ لکھ کر دے گا میرے لئے اسی میں بھلائی ہے۔ اگر کوئی مریض ڈاکٹر کے نسخے پر اعتراض کرے تو ڈاکٹر اس کے علاج سے انکار کر دیتا ہے۔ بچہ جب تعلیم کے قابل ہوتا ہے تو اس کے اہل خانہ اسے کسی تعلیمی ادارے میں اساتذہ کے حوالے کر دیتے ہیں اور کبھی کسی استاد سے روزانہ تعلیم کی تفصیل نہیں پوچھی جاتی، بچے کو اور اس کے اہل خانہ کو اطمینان ہوتا ہے کہ بچے کو ٹھیک تعلیم مل رہی ہے اور اس اطمینان کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ انہیں اساتذہ کے علم پر اعتماد ہوتا ہے۔ غرضیکہ زندگی کے جتنے شعبے ہیں جن میں افادہ اور استفادہ کا عمل ضروری ہے ان تمام میں بنیادی چیز اعتماد ہی ہوتی ہے۔ حکومتوں پر عوام اعتماد کرتے ہیں تو چلتی ہیں، عدالتوں سے انصاف طلب کرنے کیلئے ہجوم لگا رہتا ہے، کیونکہ جج پر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ انصاف مہیا کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر اس شعبے میں جس میں دوسروں سے احتیاج ضروری ہے وہاں اعتماد کے بغیر کام نہیں چل سکتا حالانکہ یہ تمام ادارے اور شعبے ایسے ہیں جس میں کام لینے والے اور کام دینے والے دونوں صلاحیتوں کے اعتبار سے بہت متفاوت نہیں ہوتے۔ لیکن ایک تقسیم کار ہے جس نے انسانوں میں یہ تقسیم قائم کر رکھی ہے اور اسی سے انسانوں کا کام چلتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شعبہ ایسا ہو کہ جس کی احتیاج بھی سب انسانوں کو ہو اور وہاں کام دینے والی ذات ایسی ہو کہ دوسرا کوئی اس کی جگہ بھی نہ لے سکے تو یہاں اگر اعتماد میں کمی آ جائے تو اندازہ کیجئے کہ انسانی زندگی میں کیسی دراڑیں آ جائیں گی۔ انسان اپنے اللہ کا بندہ ہے۔ بندہ ہونے کے اعتبار سے وہ اپنے رب کی بندگی کا پابند ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ میرے رب نے میرے لیے بندگی کا کون سا طریقہ پسند فرمایا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ بات جاننا جس قدر ضروری ہے، اسی قدر براہِ راست اللہ سے جاننا ناممکن بھی ہے۔ انسانوں کی اس کمزوری کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مبعوث فرمائے جن پر اپنی کتابیں نازل فرمائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندوں اور ان کے رب کے درمیان جاننے اور معلوم کرنے کا جو ذریعہ ہے وہ اللہ کے نبی ہیں۔ اب اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا رب کن باتوں پر راضی ہے اور کن باتوں میں ناراض، تو ضروری ہے کہ ہم اس کے آخری رسول ﷺ پر آخری حد تک اعتماد کریں۔ اگر اس اعتماد میں کمی آ جائے گی تو ہمارا تعلق اپنے رب سے ٹوٹ جائے گا کیونکہ ہم اس علم کے حصول سے براہ راست عاجز ہیں یہ وجہ ہے جس کی وجہ سے ایمان میں اللہ کے رسول پر اعتماد کرنا لازمی ٹھہرایا گیا ہے کہ اگر ہر امتی

Marfat.com

اللہ کے رسول سے ہر حکم خداوندی یا حکم نبی کے بارے میں سوال کرنا شروع کر دے تو وہ کبھی بھی دینی احکام پر عمل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ دور نبوت اور دور صحابہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صحابہ کو صرف یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی تھی کہ کسی چیز کے بارے میں آں حضرت ﷺ نے کیا فرمایا یا کیا پسند فرمایا اتنی بات معلوم ہو جانے کے بعد اب انہیں اس پر عمل کرنے میں کوئی تردد نہیں ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے نازک موقعوں پر بھی یہی اعتماد ان کا سب سے بڑا سہارا ثابت ہوتا تھا۔ معراج شریف سے واپسی پر جب اشرار قریش نے شور مچایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی رات میں بیت المقدس اور آسمانوں تک کا سفر سمٹ جائے لیکن جب یہ بات حضرت صدیق اکبرؓ تک پہنچی تو، انہوں نے فرمایا ''کہ جب میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ روزانہ اللہ کا فرشتہ آسمانوں سے حضور ﷺ پر نازل ہوتا اور واپس چلا جاتا ہے اور اس میں مجھے کوئی استبعاد محسوس نہیں ہوتا تو اگر پروردگار حضور ﷺ کو ایک رات میں بیت المقدس اور پھر آسمانوں میں لے گیا تو اس میں ایسی کیا بات ہے کہ جس کا ماننا میرے لئے مشکل ہو۔ اگر یہ بات کوئی اور کہتا تو میں کبھی نہ مانتا لیکن یہ بات چونکہ حضور ﷺ فرما رہے ہیں ان پر اعتماد کی وجہ سے میں کبھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتا۔''

معاہدۂ حدیبیہ مسلمانوں کے جذبات کیلئے بہت بڑا امتحان تھا۔ وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ اسلام کبھی کسی سے مغلوب نہیں ہوتا اللہ کی قدرت جس کی پشت پناہ ہو اسے کوئی نہیں جھکا سکتا اور دنیا میں اللہ کی قدرت اور نصرت کا مورد اللہ کے رسول سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کا رسول صحابہ کو ساتھ لے کر عمرہ کے ارادہ سے سفر کرے اور پھر عمرہ کئے بغیر احرام کھول دے اور یہ بات کیسے باور کی جا سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ قریش مکہ کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کرلیں جو سراسر یک طرفہ ہو اور جس میں اسلام اور مسلمانوں کی مرعوبیت کا احساس نمایاں ہو۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ آں حضرت ﷺ نے اس معاہدے کو قبول کر لیا ہے اور آپ ﷺ نے احرام بھی کھول دیا ہے تو مسلمان اپنی ساری غیرت وحمیت کے باوجود اس لئے اس معاہدہ کے سامنے جھک گئے کہ انہیں اس بات پر اطمینان تھا کہ اللہ کے رسول کوئی کام اللہ کے حکم کے بغیر نہیں کرتے۔ یہ معاہدہ اگرچہ مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف دکھائی دیتا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کا اسے قبول کر لینا اس بات کا غماز ہے کہ اس کے قبول کر لینے ہی میں مسلمانوں کی بھلائی اور اسلام کی عظمت ہے۔ یہ بات بھی یاد رہنی چاہئے کہ ایمان میں جس اعتماد کو شرط قرار دیا گیا ہے وہ اعتماد اللہ پر بھی ہے، اس کے رسول پر بھی اور اس کی کتاب پر بھی یعنی اللہ کا کوئی حکم اس کی کتاب کے ذریعے نازل ہو، تو وہ اس لئے واجب الاذعان اور واجب التعمیل ہے کیونکہ ہم اللہ پر اور اس کی کتاب پر اعتماد رکھتے ہیں کہ اس کی ہر بات صحیح ہے اور اسی اعتماد پر مانی ہوئی بات ایمان کہلاتی ہے۔ اسی طرح جب آں حضرت ﷺ کوئی بات فرمائیں بے شک اللہ کی کتاب میں اس کا ذکر نہ ہو تو ہمیں اس لئے اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ ﷺ پر اعتماد ہی دراصل ہمارے لئے ایمان کا ذریعہ ہے۔ اگر ہم آپ ﷺ کی کسی بات اور کسی پسند وناپسند کے بارے میں تحفظ ذہنی کا شکار ہوں یا ہماری مصلحتیں اس پر غالب آ جائیں یا ہماری عقل ہمیں یہ سجھائے کہ آج کے دور میں یہ بات چلنے والی نہیں تو سمجھ لیجئے کہ حضور ﷺ کی ذات پر اعتماد نہ رہنے کے باعث آپ ایمان سے محروم ہو گئے ہیں۔ صحابہ اسی اعتماد سے سرشار تھے، یعنی انہیں اللہ اس کی کتاب اور اسکے رسول پر حد درجہ اعتماد تھا انہیں یقین تھا کہ یہ ممکن ہے کہ ہمارے حواس دھوکہ کھا جائیں ہماری عقل ٹھوکر کھا جائے دنیا بھر کے اہل دانش کسی بات کے سمجھنے میں ناکام رہیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کی کوئی بات غلط ہو جائے یا اللہ کے رسول ہمیں کسی ایسی بات کا حکم دیں جو ہمارے لئے دنیا اور آخرت میں مفید نہ ہو اور یا دنیا میں قابل عمل نہ ہو۔ سورۃ توبہ میں ۹ ہجری کے ایام حج میں جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ

Marfat.com

بَعْدَعَامِهِمْ هٰذَا (یقیناً مشرک پلید ہیں اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں)۔یعنی اللہ کا گھر ہر طرح کی پاکیزگی کا سرچشمہ ہے۔اب وقت آگیا ہے کہ اسے ہر طرح کی گندگی سے پاک کردیا جائے مشرکوں میں عقیدے اور اخلاق کی گندگی پائی جاتی ہے۔جس کا اظہار وہ اللہ کے گھر میں مشرکانہ اعمال کے ذریعے کرتے ہیں۔اب اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے بعد اسلام کو غلبہ عطا فرمایا ہے اس لئے حج کے موقع پر یہ اعلان کردیا جائے کہ اب شرک کی یہ پلیدی اور گندگی ناقابل برداشت ہے۔اس لئے یہ ۹ ہجری کا حج تو مشرکوں کو اپنے طریقے سے کرنے کی اجازت ہے آئندہ حج سے پہلے یا تو وہ مسلمان ہوجائیں اور یا جزیرۂ عرب سے نکل جائیں۔اب انہیں اپنی گندگیوں سمیت اللہ کے گھر کے قریب آنے کی اجازت نہیں ہے۔اس حکم کے نزول کے بعد مکہ کے رہنے والے مسلمانوں میں پریشانی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی کیونکہ ابھی تک جزیرۂ عرب میں ایک معقول تعداد مشرکین عرب کی تھی۔وہ جب حج پہ آتے تھے تو اپنے ساتھ ضروریاتِ زندگی اور سامانِ تجارت بھی لے کر آتے تھے،حج کے فوراً بعد تجارتی بازار سج جاتے تھے اس تجارت سے مسلمانوں کو سال بھر کی گزر بسر کیلئے معقول آمدنی ہوجاتی تھی۔اس آیت کریمہ کے نازل ہوجانے کے بعد اب چونکہ مشرکین عرب مکہ معظمہ نہیں آسکیں گے تو جس تجارت پر مکہ کے مسلمانوں کی گزر بسر کا انحصار تھا وہ ختم ہوجائیگی اور ادھر حجاز کا پورا علاقہ چونکہ اپنی آمدنی کا کوئی اور معقول ذریعہ نہیں رکھتا تھا۔جس پر مسلمان بھروسہ کرسکتے اس لئے مسلمانوں کا اپنی معیشت کے حوالے سے پریشان ہونا بالکل فطری تھا۔اللہ تعالیٰ نے ان کی اس پریشانی کو دور کرنے کیلئے آیتِ کریمہ کا دوسرا حصہ نازل فرمایا: وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ (اگر تمہیں اندیشہ ہے تنگدستی کا تو اللہ تعالیٰ تمہیں عنقریب غنی کردے گا،اگر اس نے چاہا)۔غور فرمائیے اس آیت کریمہ میں ایک بہت بڑی پریشانی کے ازالے کیلئے اللہ تعالیٰ نے غنی کرنے کی صرف امید دلائی ہے۔لیکن آیت کے اس ٹکڑے کے نازل ہوجانے کے بعد تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کی تشویش کے بادل چھٹ گئے۔وہ بالکل مطمئن ہوگئے کہ اب ہمیں رزق کی تنگی اور اسبابِ معیشت کی کمی کا کوئی اندیشہ نہیں۔کیونکہ ہمارے رب نے قرآن کریم کی اس آیت کے ذریعے ہم سے غنا کا وعدہ فرمالیا ہے کیونکہ اللہ کا امید دلانا بھی وعدے سے کم نہیں اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدوں میں سچا کون ہوسکتا ہے۔چنانچہ اسی اعتماد کی قوت نے ان کے سارے اندیشے دور کرڈالے اور ان کے سینوں کو حوصلوں سے بھر دیا۔اے کاش ہم اس بات پر غور کرسکیں کہ اللہ کے بیسیوں وعدے آج بھی موجود ہیں۔مثلاً اس نے سود کو حرام کیا،تو ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (اللہ سود کا مٹھ مارتا ہے اور صدقات کو پالتا اور بڑھاتا ہے)یعنی وہ نظام جس میں سود داخل ہوگا وہ کبھی انسانی فلاح کا باعث نہیں بنے گا۔اس سے سرمایہ دارانہ نظام وجود میں آئیگا۔جس کے نتیجے میں غریب،غریب تر ہوتا جائے گا اور امیر،امیر تر۔اس طرح دنیا طبقات کا شکار ہوکر ظلم کی چکی میں پستی رہے گی۔لیکن جس نظام میں انفاق وایثار کا جذبہ شامل ہوگا جسے نظامِ زکوٰۃ کہا جاتا ہے اسے اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے گا اور اسی کے نتیجے میں انسانوں کو فلاح نصیب ہوگی۔یہ آیت آج بھی قرآن مجید میں موجود ہے لیکن ہم اجتماعی طور پر اس حکم پر عمل کرنے سے اسلئے محروم ہیں کہ صحابہ کو جس طرح اللہ اور اس کے رسول پر اعتماد تھا ہم اس اعتماد سے تہی دامن ہیں۔اسی اعتماد نے ان میں قوت کے طوفان بھر دیئے تھے۔اور کردار کی عظمتیں ان کے ہم رکاب ہوگئی تھیں۔وہ وسائل کے اعتبار سے تہی دامن تھے افرادی قوت بھی زیادہ نہ تھی بایں ہمہ انہوں نے تخت الٹ ڈالے،اور دنیا کی تاریخ بدل دی اور ہم اپنے پاس سب کچھ رکھتے ہوئے ذلت کی علامت بنتے جارہے ہیں وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت موجود ہے لیکن ہمیں ان پر اعتماد نہیں ہے۔ہمارا قومی شاعر اسی بھولے ہوئے سبق کیلئے دعائیں کرتا رہا لیکن ہمیں آج تک انہیں سمجھنے کی توفیق نہ ہوئی۔وہ صحابہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

Marfat.com

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ راز اس نے پایا انہی کے جگر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یہ کتاب ہدایت ہے متقین کیلئے۔ یعنی ان لوگوں کیلئے جن میں شعور زندہ ہو، جو انسانی احساس سے بہرہ ور ہوں۔ ان کی عقل، اپنے خصائص کھو نہ چکی ہو بلکہ اس میں ابھی تک وہ نور باقی ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے اور کائنات کے خالق کے بارے میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور جس کیلئے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہ ہو کہ وہ خالق و مالک جس نے ہر چیز کو تخلیق فرمایا ہے وہ حکیم بھی ہے۔ اس کی حکمت سے یہ بات بہت بعید ہے کہ انسان جو اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے، اسے اس نے بے مقصد پیدا کیا ہو، ایک ایسی مخلوق جو حواس، عقل اور دل و دماغ کی رعنائیاں دے کر پیدا کی گئی ہو کیسے ممکن ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو، جب اس کا سوچنے والا دماغ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ یقیناً میری زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے تو مقصد کی تلاش کیلئے یہ کتاب اس کی رہنما ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی اور کتاب بہ تمام و کمال انسانی زندگی کے مقاصد کو واضح نہیں کر سکتی۔ اس فکر مندی اور سنجیدگی کے ساتھ جب وہ اس کتاب سے استفادہ کرتا ہے تو اس کے اندر جو سب سے پہلی صفت پیدا ہوتی ہے جس کے نتیجے میں اسے اپنے خالق و مالک کو سمجھنا اور اس کی طرف سے نازل کردہ احکام کی حقیقت کو جاننا آسان ہو جاتا ہے وہ ہے ایمان بالغیب، جس کی وضاحت متذکرہ گزارشات میں ہو چکی ہے۔ چنانچہ ایمان بالغیب سے جب قرآن سے استفادہ کرنے والے کا اپنے اللہ سے حقیقی تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نبوت و رسالت کی حقیقت کو بھی سمجھنے لگتا ہے اور اپنی زندگی کے مقاصد اس کے سامنے منکشف ہونے لگتے ہیں۔ تو یقیناً اس کے اندر اپنے خالق و مالک کی یاد کا ایک زوردار جذبہ سر اٹھاتا ہے۔ اب وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے اللہ کے نام کا ذکر کروں اس کے سامنے سر جھکاؤں، اپنے دل کی دنیا کو اس سے آباد کروں، میرا انگ انگ اس کی یاد سے سرشار ہو جائے، میں کبھی اس کے سامنے جھک کر اسے یاد کروں، کبھی اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤں، کبھی بیٹھ کر اس سے مناجات کروں، میں زندگی کا کوئی عمل بھی کروں لیکن اس کی یاد برابر میری رفیق رہے۔ میرے اعضائے جسم کسی بھی کام میں مصروف ہوں لیکن میرے قلبی احساسات اور فکری توانائیاں اسی کے سامنے سجدہ ریز رہیں، یہ وہ فکری احساسات ہیں جو ایمان بالغیب سے بہرہ ور ہونے والے کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ اس کے اظہار کی کسی نہ کسی صورت کا متلاشی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اسی جذبے کی کارفرمائی کیلئے نماز کی نعمت عطا فرمائی گئی ہے اور اس کو دوسری صفت کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن پاک سے ہدایت حاصل کرتے ہیں ان کے اندر کا تقویٰ جو انہیں اس آستانے تک کھینچ کر لاتا ہے وہی تقویٰ سب سے پہلے ایمان بالغیب سے متصف ہوتا ہے اور اس کے بعد عمل کی دنیا میں سب سے پہلے اقامتِ صلوٰۃ سے نوازا جاتا ہے اور اس تقویٰ کا حامل یعنی متقی ان صفات سے پہچانا جاتا ہے گویا یہ اس کی توضیحی صفات ہیں۔

وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ (وہ نماز قائم کرتے ہیں)

Marfat.com

اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ قرآن کریم کی اس اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔اقامت کا معنی ہے کسی چیز کو کھڑا کرنا یا اس طرح سیدھا کرنا کہ اس میں کوئی ٹیڑھ باقی نہ رہے۔قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے ایک سفر کا احوال بیان کیا گیا ہے۔جس میں ایک جگہ بتایا گیا ہے کہ ایک گاؤں میں انہوں نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک دیوار گرا چاہتی ہے تو انہوں نے اسے سیدھا کر دیا۔اس کیلئے قرآن کریم نے تعبیر اختیار کی فاقامہ پس اس نے اسے سیدھا کر دیا تو یہاں دیکھئے اقامۃ ٹیڑھی دیوار کے سیدھا کرنے کے معنی میں آیا ہے۔تو اس لفظ کے معنی پر غور کرتے ہوئے کئی حقیقتیں واضح ہوتی ہیں:

ا۔ نماز قائم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ نماز صرف اللہ ہی کیلئے پڑھی جائے کسی اور کو اس میں شریک نہ کیا جائے اس میں دکھاوے کی آلائش تک شامل نہ ہو۔ریاکاری کی پرچھائیں نہ پڑنے پائے۔نماز چونکہ اللہ کیلئے ہے اس لئے اسی کے گھر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جائے اور دل کا رخ صرف اللہ کی طرف رہے اور کوشش یہ کی جائے کہ نماز میں مکمل یکسوئی حاصل ہو، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْن (اور اسی کی طرف اپنا رخ کرو ہر نماز کے وقت اور اسی کو پکارو اسی کیلئے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے)۔

۲۔ نماز اس طرح پڑھی جائے جس سے محسوس ہو کہ واقعی اللہ کو یاد کیا جا رہا ہے۔یعنی آدمی نماز کا ہر رکن ادا کرتے ہوئے خشوع وخضوع میں ڈوبا ہوا ہو۔آدمی پر اللہ کی خشیت بھی طاری ہو اور اس کی محبت سے دل لبریز بھی ہو۔اور یہی وہ نماز ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی ضمانت ہے۔اسی لئے قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خَاشِعُوْنَ (ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازیں خشوع وخضوع سے ادا کرتے ہیں)۔

۳۔ نماز کو وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا، نہ تعجیل سے کام لینا نہ تاخیر سے۔کیونکہ نہ وقت سے پہلے نماز ادا ہوتی ہے، نہ وقت کے بعد۔قرآنِ کریم میں ارشاد ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا (بے شک نماز مسلمانون پر وقت کی پابندی سے فرض کی گئی ہے)

۴۔ نماز کا اس طرح ادا کرنا جس میں فرائض واجبات، سنن، اور آداب تک کا لحاظ رکھا جائے۔اگر فرض یا واجب کی پابندی نہ کی گئی تو نماز نہیں ہوگی اور اگر سنت سے لاپرواہی کی گئی تو نماز مکروہ ہوگی اور اگر آداب کا خیال نہ رکھا گیا تو نماز بے برکت ہو جائے گی۔اس لئے حقیقی نماز وہی ہے جو ان تمام پابندیوں کے ساتھ ادا کی جائے۔آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ جلدی جلدی نماز پڑھ رہا ہے۔نہ قیام درست ہے نہ قعود، نہ رکوع میں سلامتی ہے نہ سجدے میں، بس جلدی جلدی نماز نمٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔جس طرح عموماً ہم نماز پڑھتے ہیں۔تو آپ ﷺ نے اسے بلا کر فرمایا نماز دوبارہ پڑھو، تم نے جو کچھ نماز کے طور پر کیا ہے یہ نماز نہیں ہے، کیونکہ نماز میں تعدیلِ ارکان بھی ضروری ہے۔

Marfat.com

۵۔ پانچ نمازیں فرض ہیں، کوئی پڑھنا اور کوئی چھوڑ دینا، اسے نماز قائم کرنا نہیں کہتے۔ یہ تو اپنے نفس کی نماز ہوئی کہ جب جی چاہا پڑھ لی اور جب جی چاہا چھوڑ دی۔ اس لئے فرمایا حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ (نمازوں کی محافظت کرو)۔ اور نمازیوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ (وہ اپنی نمازوں پر برابر قائم رہتے ہیں)۔

۶۔ جماعت کی پابندی کرنا، قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ نے اس کی بے حد تاکید فرمائی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ (اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ) یعنی جماعت کی پابندی کرو۔ اور آنحضرت ﷺ نے رحمت للعالمین ہونے کے باوجود ارشاد فرمایا کہ "جو لوگ اذان سننے کے بعد گھروں میں بیٹھ رہتے ہیں اور جماعت میں شریک نہیں ہوتے، میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی سے نماز پڑھانے کیلئے کہوں اور خود ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ اگر مجھے بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کا خیال نہ ہوتا تو میں ایسا ضرور کر گزرتا۔"

۷۔ جماعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی شیرازہ بندی جس کا اہم ذریعہ جماعت کے اندر نمازیوں کے صفوں کا سیدھا رکھنا ہے یہ بھی اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: تَسْوِيَةُ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَةِ الصَّلٰوةِ (صفوں کا برابر کرنا بھی اقامت صلوٰۃ کا ایک جز ہے)۔ اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے یہاں تک ارشاد فرمایا کہ "جس قوم کی صفیں ٹیڑھی ہوتی ہیں اندیشہ ہے کہ ان کے دل نہ ٹیڑھے کر دیئے جائیں۔"

اقامتِ صلوٰۃ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری

۸۔ جہاں قرآنِ کریم نے اقامت صلوٰۃ کی نسبت پوری امت یا ان کے امام کی طرف کی ہے تو وہاں اس سے مراد ایک تو اجتماعی نمازوں کا قیام ہے جس میں جمعہ، جماعت اور عیدین کی نمازیں شامل ہیں اور دوسرے اس میں حکومت اسلامی کی سب سے پہلی ذمہ داری سے آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی خطہ زمین میں مسلمانوں کو حکومت دے دے تو ان کی سب سے پہلی ذمہ داری نماز کا قائم کرنا ہے۔ ارشاد فرمایا اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں معروف کا حکم دیں اور برائی سے روکیں)۔ اس آیت کو پھر پڑھئے اور اندازہ فرمائیے کہ جس طرح قرآنِ کریم اپنے استفادہ کرنے والوں میں سب سے پہلی عملی صفت اقامتِ صلوٰۃ قرار دیتا ہے۔ اسی طرح یہاں مسلمان حکومت کی پہلی ذمہ داری اقامت صلوٰۃ ٹھہرا رہا ہے۔ اگر تدبر سے کام لیں تو اس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک عظیم عمارت ہے، جو پانچ بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے اور یہی پانچوں اس کے ستون ہیں۔ جن پر یہ عمارت ایستادہ ہے۔ ان میں پہلا اور اہم تر ستون نماز ہے یہ ارکان اسلام میں سے ایسا رکن ہے جو سب سے پہلے امت مسلمہ پر فرض کیا گیا اور قیامت کے روز سب سے پہلے اسی سے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اسی کے بارہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا اَلصَّلٰوةُ فَارِقٌ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ (نماز حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے)۔ مزید فرمایا: اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ مَنْ اَقَامَهَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّيْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّيْنَ (نماز دین کا ستون ہے جس نے اسے قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اسے گرا دیا اس نے دین کو گرا دیا)۔ کسی آدمی کے اسلام کی شناخت اور علامت یہی نماز ہے

Marfat.com

کیونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد نماز کا وقت داخل ہوتے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص دعوائے ایمان میں سچا ہے یا جھوٹا۔ قرآنِ پاک میں فرمایا: فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ (اگر یہ توبہ کریں اور نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو) یعنی ان کے ایمان کو معتبر جانو۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ مسلمانوں کا لشکر اگر کسی آبادی پر گزرے اور معلوم نہ ہو کہ اہل بستی مسلمان ہیں یا غیر مسلم تو اذان کہو اگر بستی سے اذان کا جواب ملے تو اس بستی کو مسلمان جانو اور ان سے مسلمانوں جیسا سلوک کرو۔ کیونکہ نماز ہی اہل اسلام کی پہچان ہے۔ ارکان اسلام میں سے کوئی رکن بجز زکوٰۃ کے ایسا نہیں جس کی قرآن وسنت میں اس تکرار کے ساتھ تاکید آئی ہو جیسی تاکید نماز کیلئے آئی ہے۔ قرآنِ کریم میں بار بار اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (نماز قائم کرو) فرمایا گیا ہے۔ نمازوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا۔ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوَاتِ (نمازوں کی حفاظت کرو) ترک نماز پر شرک کے اندیشہ کا اظہار کیا گیا کہ نماز قائم کرو ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں مشرک نہ ہو جاؤ۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اور شرک ایسی برائی ہے جس کا تصور بھی ایک مسلمان کیلئے نا قابل قبول ہے۔ مسلمانوں کو صرف اقامتِ صلوٰۃ ہی حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسے ہر مسلمان اور مسلمان معاشرے کی پہچان اور روح قرار دیا گیا اور اسے مسلمانوں کی ایسی صفت قائمہ و مستمرہ ٹھہرایا گیا جو مسلمانوں سے کبھی منفک نہیں ہو سکتی یعنی جس طرح برف سے ٹھنڈک، آگ سے تپش، چاند سے چاندنی، سورج سے روشنی اور موتی سے آب الگ نہیں ہو سکتی اسی طرح ایک مسلمان بلکہ مسلمان معاشرہ سے نماز کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد فرمایا گیا: وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلٰوتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ (وہ مسلمان ہمیشہ اور ہر حالت میں نمازوں کی محافظت کرتے ہیں)۔ جس طرح ان کے جسموں سے ان کی روحوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ان کی دینی زندگی نمازوں کے اہتمام اور اس کے اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔

نماز کی پابندی نہ کرنا نفاق کی علامت ہے

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام جس کسی مسلمان کو مسجد سے چند نمازوں میں غائب دیکھتے، تو اس کی مزاج پرسی اور تیمار داری کیلئے اس کے گھر کا رخ کرتے، انہیں یقین ہو جاتا کہ وہ یقیناً بیمار ہے یا اسے کوئی عذر لاحق ہے۔ ان کیلئے یہ بات نا قابل تصور تھی کہ کوئی مسلمان بدوں عذر بھی کبھی نماز باجماعت یا مسجد سے بیگانہ رہ سکتا ہے اور اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ غیر حاضر شخص کوئی معقول عذر نہیں رکھتا تو انہیں اس کے منافق ہونے کا یقین ہو جاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ترک نماز نہیں بلکہ اہتمامِ نماز میں سستی کو بھی منافقین کی علامت قرار دیا۔ ارشاد فرمایا: وَاِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی (جب وہ نماز کیلئے اٹھتے ہیں تو ڈھیلے ڈھالے اور کسمسائے ہوئے اٹھتے ہیں)۔ پروردگار کی نگاہ میں یہ مسلمان کا شیوہ نہیں پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں آخر منافقین نہ چاہتے ہوئے بھی نماز کیوں پڑھتے تھے؟ اس کی دو وجوہ تھیں۔

ا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان معاشرہ میں رہنے اور خود کو انہیں میں سے ظاہر کرنے کیلئے نماز میں شرکت ضروری ہے ورنہ مسلمان انہیں کبھی مسلمانوں میں شمار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انہیں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد خوب معلوم تھا مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ (جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا)۔

Marfat.com

۲۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو جس سانچے میں ڈھالا گیا تھا اس میں نماز کا اہتمام نہ کرنے والوں کیلئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ جس طرح ایک صحت مند معدہ مکھی یا کسی ایسی ہی کسی چیز کو قبول نہیں کرتا بلکہ اگل دیتا ہے۔ اسی طرح صحت مند مسلمان معاشرہ کبھی بے نماز کو برداشت نہیں کرتا بلکہ بے نماز آدمی اکل کھرے معاشرے میں کھوٹ کی طرح الگ ہو جاتا ہے کیونکہ پروردگار نے اس مسلمان معاشرے کے معماروں یعنی انبیاء کرام کی یہ ذمہ داری ٹھہرائی تھی کہ وہ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور اپنے ماننے والون کو بھی اس کا حکم دیں اور اس کا آغاز اپنے گھر سے کریں آں حضرت ﷺ سے فرمایا جارہا ہے وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس کی پابندی کیجئے)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قرآن کریم میں قیامت تک کیلئے محفوظ فرمادی گئی۔ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي (اے رب مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا)۔ ایسے معاشرے میں ترک نماز کی کہاں گنجائش رہ سکتی ہے۔ جس میں یہ بات دل و دماغ میں اتار دی گئی ہو کہ نماز زندگی میں بجز جنون اور بے ہوشی کے کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہوسکتی۔ اگر گھر کا سکون میسر نہیں حالت سفر درپیش ہے، تو سفر کی رواروی میں بھی نماز چھوڑی نہیں جا سکتی۔ البتہ قصر پڑھو یعنی دو رکعت نماز کافی ہے اور اگر بیماری کا عذر ہے تو عذر کے مطابق نماز پڑھو۔ یعنی قیام پر قادر نہیں ہو تو بیٹھ کر پڑھو بیٹھ بھی نہیں سکتے تو لیٹ کر سر کے اشارے سے اور اگر اتنی بھی ہمت نہیں تو آنکھوں کے اشارے سے پڑھ لو، اور اگر وضو نہیں کر سکتے تو تیمّم کرلو۔ خود نہیں کر سکتے تو دوسرا کرا دے اور اگر جنگ کی حالت درپیش ہو تو صلوٰۃ الخوف یعنی ''خوف کی نماز'' پڑھو۔ اندازہ فرمایئے! جنگ کی ہولناکیوں میں غذا میسر نہیں آرام کا موقعہ نہیں جان کے لالے پڑے ہیں مگر نماز بہرحال پڑھنی ہے اگر مسلسل فائرنگ اور گولہ باری کی وجہ سے کسی طرح بھی نماز نہیں پڑھی جا سکتی، تو پھر جب موقع ملے جو نمازیں قضا ہوگئی ہیں انہیں پڑھ لو۔ جیسا کہ غزوۂ خندق میں آنحضرت ﷺ کی دو نمازیں کفار کے مسلسل حملے کی وجہ سے قضاء ہوگئی تھیں تو آپ ﷺ نے انہیں قضا پڑھا لیکن نمازوں کے قضا ہوجانے کا رنج اتنا شدید تھا کہ آپ ﷺ کی زبان سے ان کفار کیلئے بددعا نکلی۔ حالانکہ آپ ﷺ سراپا رحمت تھے اور کبھی اپنی ذات کیلئے کسی کو کبھی حرف ناملائم بھی نہیں فرمایا اور طائف کے پتھر کھا کر بھی بددعا نہیں فرمائی۔ لیکن نماز کے معاملہ میں آپ بہت حساس واقع ہوئے تھے کیونکہ نماز فی الحقیقت اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا اقرار و اعلان ہے اور اس کی مداومت اور پابندی اس عہد وفا کی پاسداری ہے اس لئے جب آپ اس عہد وفا کو شکست ہوتا دیکھتے تو اس دھرتی پر سایۂ رحمت ہونے کے باوجود غضبناک ہوجاتے۔ آنحضرت ﷺ کے نماز کے بارہ میں شدید حساس ہونے اور نماز کی اہمیت و عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مرض الوفات میں جبکہ نقاہت کے باعث آپ کی آواز جواب دے رہی تھی اور چند لمحوں بعد آپ واصل بحق ہونے والے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے لب مبارک جنبش کرتے ہوئے دیکھے تو میں نے لبوں سے کان لگادیئے۔ آپ فرمارہے تھے: اَلصَّلٰوةُ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (لوگو! نماز کی پابندی کرنا اور زیردستوں سے حسن سلوک سے پیش آنا)۔ جس تحفہ کو عالم لامکاں سے شب معراج آپ اپنے رب سے لے کر آئے تھے، دنیا سے دمِ واپسیں اسی کی یاددہانی فرمارہے تھے۔ مسلمان معاشرے میں اسی تاکید و اہتمام کا اثر تھا کہ عالم اسلام پر غیر ملکی استعمار کے مکروہ سایہ پڑنے تک مسلمانوں میں ہر طرح کا عیب تلاش کیا جاسکتا ہے مگر بے نماز ہونا یعنی ترک نماز، یہ برائی مسلمانوں میں کبھی نہ تھی کیونکہ مسلمان خوب جانتے تھے کہ اسلام اور پروردگار سے ہمارے تعلق کا یہ آخری ٹانکہ ہے اگر یہ بھی ٹوٹ گیا تو پھر رسمی تعلق تو شاید باقی رہ جائے حقیقی تعلق باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی اجتماعیت کے تحفظ کیلئے غلط کار اور بدعمل حکمرانوں کو بھی آخر حد تک زیادہ سے زیادہ برداشت کرنے کا حکم دیا مگر اس برداشت کی آخری حد یہ بیان فرمائی کہ جب تک وہ تمہیں اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتے رہیں یعنی اس کے بعد انہیں برداشت کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ قرآنِ حکیم نے گزشتہ قوموں کے حوالے سے ان کی جس آخری برائی اور گمراہی کو بیان فرمایا ہے جس کے بعد وہ ہلاکت سے نہ بچ سکے۔ وہ یہی نماز کا ضائع کردینے کی حالت ہے ارشاد پاک ہے۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کردیا اور شہوات کے پیروکار ہو گئے)۔ پھر اللہ کا قانون حرکت میں آیا اور نامرادی وخسران اور تباہی و بربادی ان کا مقدر بن گئی۔ واحسرتا! آج امت مسلمہ اپنی اس متاع بے بہا کو گم کر چکی بالخصوص اس کا طبقۂ خواص اس کی اہمیت، افادیت اور عظمت کو بالکل بھلا چکا ہے۔

متذکرہ بالا تفصیل سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلام میں نماز کا کیا مقام اور کیا اہمیت ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ جس فریضۂ الٰہی کی دین میں یہ اہمیت ہو اسے قائم کرنا اگر اسلامی حکومت کی پہلی ذمہ داری نہ ٹھہرائی جائے پھر اور کس کی ٹھہرائی جائے۔

نماز کا اہتمام بحالی امن کا پیش خیمہ ہے

اقامتِ صلوٰۃ کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری ٹھہرانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر متمدن اور مہذب حکومت کی ذمہ داریوں میں سب سے پہلی ذمہ داری یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ ملک کے نظم ونسق کو بہتر بنائے۔ لوگوں کی جان مال اور عزت محفوظ ہو۔ راستے خطرات سے پاک ہوں، لوگ رات کو آرام کی نیند سو سکیں، ملک کا ہر شہری اپنے آپ کو ہر حال میں محفوظ تصور کرے۔ اسلامی حکومت کی بھی سب سے پہلی یہی ذمہ داری ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پروردگار نے اسلامی حکومت پر اس ذمہ داری کو عائد کرنے سے پہلے ایک اور ذمہ داری عائد کی ہے۔ اگر حکومت اس ذمہ داری کی ادائیگی میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ دوسری ذمہ داری خود بخود ادا ہو جاتی ہے اور وہ پہلی ذمہ داری، دوسری ذمہ داری کی ادائیگی کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ پہلی ذمہ داری سے مراد میری یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا اپنے اللہ سے تعلق درست کردے۔ ہر مسلمان ہر وقت اس بات کا یقین رکھے کہ جس خالق و مالک نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس نے میری زندگی کے اسباب پیدا کیئے ہیں اور جس نے مجھے قوتِ احساس اور قوتِ ادراک سے نوازا ہے، وہی پروردگار ہر وقت مجھے دیکھتا ہے، میں ہر وقت اس کی نگرانی میں ہوں اس کے متعین کردہ نگران میرے ایک ایک عمل کو محفوظ کر رہے ہیں۔ مرنے کے بعد ایک دن ایسا آئے گا جب میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا اور پھر مجھے اپنے ایک ایک عمل کا اپنے پروردگار کو حساب دینا ہو گا۔ اسی طرح اسلامی حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر مسلمان کے دل میں یہ بات راسخ کردے کہ تم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں از اول تا آخر اللہ ہی کے بندے ہو۔ اسی کی بندگی اور اسی کی اطاعت تم پر لازم ہے۔ وہی ایک ذات ہے جو تمہاری زندگی کی حقیقی راہنما تمہاری کمزوریوں میں وہی تمہارا سہارا ہے اور تمہاری سرافرازیاں بھی اسی کی دین اور اسی کی امانت ہیں۔ تم ہر حال میں اللہ کے بندے ہو بندگی کا حق ادا کرنا اور اس کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرنا تمہاری معراج ہے۔ کسی بھی ملک کے رہنے والوں میں اگر یہ تصورات پختہ کردیئے جائیں تو اندازہ فرمایئے! کیا اس ملک میں جرم پرورش پا سکتا ہے؟ جو شخص ہر وقت اللہ کی ذات کو اپنے دماغ میں متحضر رکھتا ہے وہ کسی بھی ذمہ داری کی ادائیگی میں خیانت کیسے کر سکتا ہے؟ وہ کسی شخص پر ظلم کیسے کر سکتا ہے؟ وہ کسی کے مال میں دست درازی کیسے کر سکتا ہے؟ اس کے سامنے سر جھکانے والا سرکشی کا رویہ کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ اندازہ فرمایئے! اگر اس

Marfat.com

تبدیلی کے بعد واقعی انسان ہر طرح کے گناہ اور جرم سے بچ جاتا ہے اور اگر معاشرہ اس قالب میں ڈھل جائے تو پورا معاشرہ گناہوں اور جرائم سے محفوظ ہو جاتا ہے۔تو اس کے بعد نظم ونسق کی بحالی اور لاء اینڈ آرڈر کی بہتری کیلئے اور کچھ کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔اس لئے پروردگار نے سب سے پہلے مسلمانوں کو اس بنیادی ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا۔کیونکہ نماز ہی ہے جس کے ذریعے اسلامی معاشرے میں متذکرہ بالا تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ایک آدمی جب نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اللہ اکبر کہتا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنی ضروریات، اپنی خواہشات، دنیا کے تقاضوں، اور دنیا کی تمام نام نہاد عظمتوں کا انکار کرتے ہوئے صرف اللہ کی بڑائی کا اعتراف کرتا ہے اور ہاتھ اٹھاتے ہوئے ہر چیز کو پس پشت پھینکتا ہے اور اللہ کی بندگی کا اقرار کرتے ہوئے ہاتھ باندھ لیتا ہے۔اس کے بعد اسی کی ثناء کرتا ہے، اسی کی حمد بیان کرتا ہے، اسی کی بندگی کا اعتراف کرتا ہے اور صرف اسی سے مدد طلب کرتا ہے اور پھر اسی کے ضابطہء حیات کی تلاوت کرتا ہے، پھر اسی کے سامنے رکوع، سجود اور قعود سے بندگی کی تکمیل کرتا ہے۔یہ سب کچھ امت اسلامیہ کا ایک فرد بھی کرتا ہے اور پوری امت بھی کرتی ہے، اسی کا نام نماز ہے۔اگر یہ نماز شعوری طور پر پڑھی جائے اور اس کے تمام تقاضوں کو بروئے کار لایا جائے اور اس کے مقاصد میں سے کم از کم اس بات کو ذہن نشین کر لیا جائے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (کہ میری یاد کیلئے نماز کو قائم کرو)۔اور اس کے منفی پہلو کو بھی مضبوط ہاتھوں سے تھام لیا جائے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ (بے شک نماز بے حیائی کے کاموں سے اور گناہ سے روکتی ہے)۔تو تصور کیجئے! اللہ کی یاد کے ساتھ گناہوں کا وجود کیسے باقی رہ سکتا ہے اور بے حیائی اور گناہوں کے رکنے کے عزم کے ساتھ جرم کیسے جنم لے سکتا ہے؟ یہ اللہ کا دیا ہوا حیرت انگیز نظام ہے کہ اس نے ایک عبادت کے ذریعے پوری اجتماعی زندگی کو ہر طرح کی دراڑوں سے محفوظ کر دیا اور اسے ایک ایسے اہم کام کا ذریعہ بنا دیا جو حکومتوں کی پہلی ذمہ داری ہے اور جس کی ادائیگی آج بھی دنیا بھر کی حکومتوں کیلئے مشکل ہو رہی ہے میری ان گذارشات سے یہ بات سمجھنا آسان ہو گیا ہوگا کہ قرآنِ کریم نے اسلامی یا مسلمان حکومت کیلئے سب سے پہلے نماز قائم کرنا ضروری کیوں قرار دیا۔لیکن اپنی کوتاہی فکر اور بدنصیبی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ جب بھی کہیں جزوی طور پر بھی مسلمانوں نے اقتدار پا کر اقامتِ صلوٰۃ کے فریضہ کو انجام دینے کی کوشش کی ہے تو ہمارے دانشوروں کا گروہ ہاتھ جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔آپ کو سب سے پہلے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ حل کرنا چاہئے لوگوں کی محرومیوں کا علاج کرنا چاہئے اور لوگوں کے مسائل حل کرنے چاہئیں۔لیکن وہ نہیں جانتے کہ نماز صرف اولین فریضہ ہی نہیں بلکہ مسلمان معاشرے کی تبدیلی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جس کے نتیجے میں خود بخود ایک صالح انقلاب آتا ہے جو مسلمان معاشرے کیلئے خوشگوار ہوا کا جھونکا ثابت ہوتا ہے۔اس پوری تفصیل سے آپ کو اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ قرآن کے مطالعہ سے متقین میں جو صالح اعمال پیدا ہوتے ہیں، ان میں جسمانی اعمال میں سے صرف نماز کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ نماز اصلاً ایک ایسی کلید ہے جس سے انسانی سیرت و کردار کا ہر بند دروازہ کھلتا چلا جاتا ہے۔

اللہ سے تعلق کی درستی کے ساتھ ساتھ دوسری چیز جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کا تعلق دوسرے انسانوں اور دوسرے مسلمانوں سے درست ہو جائے۔یوں تو وہ ہر مخلوق سے مسلمانوں کے تعلق کی درستی کی تعلیم دیتا ہے۔لیکن انسانوں اور بطور خاص مسلمانوں سے صحیح تعلق کی استواری کا نماز ہی کی طرح تاکید کرتا ہے کیونکہ جب ایک نمازی نماز کیلئے مسجد جاتا ہے تو نماز کے دوران اور نماز کے ماحول میں جس طرح اللہ سے قرب نصیب ہوتا ہے اسی طرح مسلمانوں سے بھی قربت کا موقع ملتا ہے اپنے دینی بھائیوں کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔قرنِ اول کے مسلمان ہماری طرح بے گانوں کی طرح نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ وہ باہمی ایک دوسرے سے قربت اور حالات سے آگاہی کو بھی ضروری سمجھتے تھے اور پھر مسلمانوں کا امام نمازوں کی اور جمعہ کی جماعت کے وقت مسلمانوں کو

Marfat.com

ملک کے اندرونی اور بیرونی حالات اور ضرورتوں سے بھی آگاہ رکھتا تھا اور بعض دفعہ مسلمانوں کی ضرورتوں کی طرف متوجہ بھی کرتا تھا۔ اگر نمازوں کے اوقات کے علاوہ کبھی کوئی ایسی مالی ضرورت پیش آجاتی یا کوئی حالات کے ہاتھوں ستایا ہوا مسلمانوں کا قافلہ مسجد میں پہنچ جاتا تو الصلوۃ جــــامــــعة کی صدا گونجنے لگتی اور مسلمان کشاں کشاں مسجد میں پہنچ جاتے اور آنے والے بے نواؤں اور بے کسوں کے دکھوں کا مداویٰ کیا جاتا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو چیتھڑے پہنے ہوئے دیکھا تو باوجود اس کے کہ آپ ﷺ خطبے کیلئے منبر پر رونق افروز ہو چکے تھے آپ ﷺ نے اسے کھڑے ہو کر سنتیں پڑھنے کی تاکید فرمائی۔ تاکہ لوگ اس کی زبوں حالی اور بے کسی کو دیکھ لیں اور خود بخود اس کی مدد کیلئے آگے بڑھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز جس طرح اللہ سے تعلق کو استوار کرتی ہے اسی طرح مسلمانوں کے باہمی تعلق کو مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا گیا:

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُوْنَ ٥ (البقرة: ٣)

(اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں)

انفاق کی حقیقت

یعنی دوسری صفت جو متقین میں پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نمازی ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کے بندوں پر خرچ کرنے میں بھی بہت فیاض ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک مسلمان پر جس طرح یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے اللہ سے تعلق کو درست رکھے اور اللہ کے حقوق ادا کرے۔ اسی طرح اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اللہ کے بندوں سے محبت کرے اور ان کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرے۔ اس جملے کے الفاظ پر اگر غور کریں۔ تو کئی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں۔

۱۔ یہاں کسی چیز کا نام نہیں لیا گیا بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے جو کچھ انہیں عطا کیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یعنی ہم نے اگر انہیں مال عطا کیا ہے تو وہ مال خرچ کرتے ہیں اور اگر علم عطا کیا ہے، تو جاہلوں میں علم لٹاتے ہیں۔ اگر انہیں طلاقتِ لسانی سے نوازا ہے تو وہ تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیتے اور لوگوں کو راہ راست دکھاتے ہیں اور اگر انہیں عہدہ و منصب دیا گیا ہے تو وہ غریبوں، بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کے کام آتے ہیں۔ جسے جسمانی طاقت سے مضبوط بنایا گیا ہے وہ جسمانی طور پر کمزور لوگوں کی مدد کر کے اور ان کا سہارا بن کے اپنی اس طاقت کو صرف کر رہا ہے۔ غرضیکہ رزق کا معنی چونکہ حصہ اور نصیب ہونا ہے جو ہر نعمت پر بولا جاتا ہے اس لحاظ سے اس لفظ میں بڑی وسعت ہے۔

۲۔ یہاں ینفقون کے لفظ کو بھی عام رکھا گیا ہے۔ جو صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ دونوں کو شامل ہے۔ کہ وہ صرف صدقات واجبہ ہی ادا نہیں کرتے یعنی صرف زکوٰۃ، صدقۂ فطر یا نذر وغیرہ ادا کر کے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ وہ اللہ کی راہ میں ہر ضرورت کے وقت اپنا مال بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ کوئی بھی انفرادی ضرورت ہو یا اجتماعی ضرورت وہ صرف زکوٰۃ ادا کر کے فارغ نہیں ہو جاتے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق ہر ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں ان کی فیاضی اور سخاوت کا یہ عالم ہے کہ بعض دفعہ اپنا پیٹ کاٹ کر بھی اور خود بھوکے رہ کر بھی دوسروں پر خرچ کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اسی کی تعریف کرتے ہوئے پروردگار نے قرآنِ کریم میں فرمایا: يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں وہ خود اگرچہ بھوک سے

Marfat.com

ہوں''۔ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کے پاس دولت کی فراوانی ہو تو وہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرح سینکڑوں مجاہدین کو مسلح کر دیں بلکہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا شوق انہیں یہاں تک کھینچ لاتا ہے کہ جنگ تبوک کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چندے کی اپیل فرمائی تو مسجد میں ڈھیر لگ گیا لیکن شام کے وقت ایک صاحب آئے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چھوہاروں کی ایک پوٹلی پیش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرماتے ہوئے حکم دیا کہ ان چھوہاروں کو اس ڈھیر پر بکھیر دیا جائے کیونکہ وہ چھوہارے لانے والے کی دن بھر کی مزدوری تھی جو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی دینے والے کے اخلاص میں کمی بھی ہو گی تو ان چھوہاروں کی برکت سے اللہ تعالیٰ سب کے عطیات کو قبول فرمالیں گے۔

رَزَقْنٰهُمْ کا مفہوم

۳۔ اس جملے میں چونکہ یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی آدمی اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو وہ درحقیقت اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ میں جو کچھ دے رہا ہوں۔ یہ مال میرا نہیں بلکہ اللہ ہی نے مجھے عطا کیا تھا اور میں نے اسی مال میں سے اللہ کے بندوں پر خرچ کیا ہے۔ یہ اعتراف ایک بہت بڑی اصلاح کا ذریعہ بن جاتا ہے کیونکہ ایک متمول آدمی میں خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے اور بخل کو اس وقت اس کے دل میں جگہ بنانے کا موقع ملتا ہے جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مال میرا ہے اور میں نے اپنی صلاحیت سے کمایا ہے۔ اس لئے اب اسے خرچ کرنا جہاں چاہے خرچ کرنا اور جتنا چاہے خرچ کرنا مجھے بجا طور پر اس کا حق ہے کیونکہ میں بہر صورت اس مال کا مالک ہوں۔ ایسے شخص کو مالی بدعنوانی سے اور مال کو فسق و فجور کا ذریعہ بنانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اسے روکنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اس کے ذہن میں یہ احساس پیدا کر دیا جائے کہ یہ مال تیری ملکیت نہیں بلکہ اللہ کی دین اور اس کی امانت ہے۔ اس لئے اگر تم نے اس کے احکام سے ہٹ کر اس میں تصرف کیا تو تم خیانت کا ارتکاب کرو گے اور قیامت کے دن تم سے اس کی باز پرس ہو گی۔

۴۔ عبارت کے اس اسلوب سے انفاق کرنے والے کیلئے انفاق سہل ہو جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اللہ نے مجھے ڈھیروں دیا ہے لیکن اس میں سے کچھ خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہ اس مال کا مالک ہے وہ اگر چاہتا تو یہ بھی حکم دے سکتا تھا کہ اپنی ضرورتوں کیلئے معمولی سا رکھ کر سارا میرے راستے میں خرچ کر دو یہ اس کا کرم ہے کہ اس میں سے صرف اڑھائی روپے مجھے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور باقی میں مجھے اختیار دے دیا ہے۔ تو جب آدمی اپنے اختیار سے خرچ کرتا ہے تو ایسا خرچ اور انفاق اس کیلئے بوجھ نہیں بنتا۔ اگر وہ صحیح جذبے سے خرچ کرے تو وہ زیادہ سے زیادہ خرچ کر کے بھی شرمندگی محسوس کرتا ہے کہ مجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکا کیونکہ اگر میں سارا بھی خرچ کر ڈالتا تو تب بھی یہ اسی کا دیا ہوا تھا اسی کو لوٹا دیتا۔ یہ کون سے کمال کی بات ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قرآنِ کریم نے جس طرح اقامتِ صلوٰۃ کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری ٹھہرایا ہے اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ میں سے کم از کم زکوٰۃ کی ادائیگی کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری بنایا ہے۔ ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ نماز کی طرح زکوٰۃ بھی ارکان دین میں سے ہے۔ قرآنِ کریم میں تقریباً اسی (۸۰) جگہ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو جاتا ہے کہ خلافت راشدہ میں جب کچھ قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے بالاجماع ان کے خلاف قتال کیا حالانکہ قتال غیر مسلموں کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنے

Marfat.com

آپ کو مسلمان کہتے تھے لیکن صحابہ کرام ﷺ جو آنحضرت ﷺ کے تربیت یافتہ تھے انہوں نے زکوٰۃ سے انکار کو اسلام کے انکار کے مترادف قرار دیا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے (میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں) کہ دین کے دو ہی مقاصد ہیں ایک اللہ سے تعلق کو درست کرنا اور دوسرا بندوں کا بندوں سے تعلق درست کرنا۔ یہ دو باتیں اگر مکمل ہو جائیں تو دین مکمل ہو جاتا ہے۔ پہلا مقصد نماز سے پورا ہوتا ہے اور باقی سارے اصلاحی احکام اسی کی شاخیں ہیں اور دوسرا مقصد انفاق فی سبیل اللہ سے پورا ہوتا ہے۔ جب اس کا تعلق بندوں سے ٹھیک نہج پر قائم ہو گیا تو اب اس کیلئے بندوں کے حقوق ادا کرنا کوئی مشکل نہیں رہتا۔ یہ تعلق کی اصلاح انسانوں کے باہمی تعلقات کی اصلاح کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جائے تو اس صفت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ سے اور بندوں سے تعلق میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس کے متعدد اسباب ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک اہم تر سبب انسانوں کی باہمی اقتصادی مشکلات ہیں۔ جب ایک معاشرے میں اقتصادی استواری کی بجائے اقتصادی ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور غریب قوت لایموت کیلئے پریشان ہوتا ہے۔ بنیادی انسانی ضرورتیں بھی انسانوں کو میسر نہیں آتیں تو اخلاقی قدریں بھی ٹوٹنے لگتی ہیں اور جرائم کو بھی کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کی بنیادی ضرورتوں کی کفیل ہو۔ اس کیلئے اسلام نے جس طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے اور تمام ایسے راستوں کو بند کر دیا ہے جس سے اسراف، تبذیر، تعیش، فسق و فجور، قمار، ارتکاز زر اور سود جیسے جرائم پرورش پاتے ہیں۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے ایک ایسا مزاج تیار کرتا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرے میں کوئی شخص نہ محرومیوں کا شکار ہوتا ہے اور نہ بنیادی ضرورتوں سے تہی دامن رہتا ہے۔ وہ ہر مال دار کے ذہن میں یہ بات پیوست کر دیتا ہے کہ تمہارے پاس دولت امانت ہے اور تہی دست تمہاری دولت میں شریک اور حصہ دار ہے۔ اگر تم نے اس کی ضرورت دیکھ کر بھی اس کا حصہ ادا نہ کیا تو تم اس امانت میں خیانت کرو گے۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

اس تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ قرون اولیٰ میں ہر کھاتا پیتا شخص فجر کی نماز کے بعد گھر کی چھت پر چڑھ کر بلند آواز سے پوچھتا تھا کہ رات کو کسی گھر میں کوئی یتیم یا مسکین بھوکا تو نہیں سویا۔ اگر ایسا ہے تو فوراً اس کی خبر لو، ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں اللہ کا عذاب نہ نازل ہو جائے۔ محتاج امرا کو نہیں، بلکہ امرا محتاجوں کو ڈھونڈتے تھے اور ڈرتے تھے کہ ان کی احتیاج اللہ کی ناراضگی کا سبب نہ بن جائے۔ وہ زمانہ تو خیر و برکت کا زمانہ تھا۔ ہماری قریبی تاریخ میں پاکستان بننے سے چند سال پہلے کا واقعہ ہے۔ جس نے ایک بڑی شخصیت کو بدلنے میں مدد دی۔ معروف شخصیت علامہ اسد جو ایک یہودی نومسلم تھے۔ اصل نام ان کا لیوپولڈ تھا۔ جرمنی کے رہنے والے تھے۔ جن دنوں وہ اسلام اور مسلمانوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ دمشق کے سفر میں میں ٹرین میں سوار تھا کہ دوپہر کو جب کھانے کا وقت ہوا، تو ٹرین کے مسافروں میں حسب طاقت لوگوں نے کینٹین سے کھانا منگوایا یا اپنے اپنے توشہ دان کھولے۔ لیکن دو عرب مسافروں کو میں نے دیکھا، وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے ناآشنا تھے۔ ایک نے اپنے تھیلے سے ایک تنور کی پکی ہوئی روٹی نکالی، جس کے ساتھ کوئی سالن وغیرہ نہیں تھا۔ اس نے بغیر پوچھے اس کے دو حصے کیے، ایک حصہ اپنے پاس رکھا اور دوسرا سامنے کے مسافر کی طرف بڑھا دیا۔ اس مسافر نے لینے میں تامل کیا

Marfat.com

لیکن اس مسافر کے اصرار پر دونوں نے ایک روٹی سے اپنا پیٹ بھرلیا۔ انفاق کا یہی جذبہ تھا، جس نے مسلمانوں میں بے سروسامانی کے باوجود ، بنیادی ضرورتوں کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ ہم جیسے جیسے اس جذبے سے تہی دامن ہوتے گئے ویسے ویسے مسائل کا شکار ہوتے گئے۔ آج بھی قرآنِ کریم خود سے استفادہ کرنے والوں کو توجہ دلا رہا ہے کہ آج بھی اگر تم اپنے بنیادی مسائل حل کرنا چاہتے ہو، تو حصول معاش کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ اپنے اندر پیدا کرو کہ صاحب وسائل، اپنے وسائل میں دوسروں کو شریک کریں، تو بے وسیلہ لوگوں کو خود بخود ایک ریلیف میسر آئے گا۔ جس سے بنیادی ضرورت بھی پوری ہوگی اور باہمی محبت بھی پروان چڑھے گی۔ صرف وسائل کی فراہمی ،اندر کی تربیت کے بغیر، معاشرے میں تفاوت میں تو اضافہ کرسکتی ہے، لیکن غریب کی غربت کا علاج نہیں کرسکتی۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ج

(یہ کتاب ہدایت ہے) ان لوگوں کیلئے جو ایمان لاتے ہیں، اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے)

قرآنِ کریم کی ہدایت کے نتیجے میں متقین میں جو صفات پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے یہ چوتھی صفت ہے۔ پہلی صفت تھی ''ایمان بالغیب''، دوسری صفت تھی، ''اقامت صلوٰۃ'' یعنی عبادت اور تیسری صفت تھی ''انفاق فی سبیل اللہ''، یعنی صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کا ادا کرنا۔ اب یہ چوتھی صفت بیان ہورہی ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں، جو ہر اس چیز پر ایمان لاتے ہیں، جو آپ ﷺ کی طرف نازل کی گئی ہے اور جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہے۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے کم وبیش تین سو تیرہ یا تین سو چودہ رسول آئے۔ رسول وہ ہوتا ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نئی کتاب یا نیا صحیفہ نازل فرماتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ نئی شریعت یا حکمتِ شریعت عطا فرماتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے نزول سے پہلے تین سو تیرہ یا تین سو چودہ کتابیں یا صحیفے نازل ہو چکے تھے۔ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات کے فیض سے ایک مومن میں جو ذہن اور ذوق تیار ہوتا ہے، اس میں یہ بات پیوست ہوتی ہے کہ مجھے ہر صورت میں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کو قبول کرنا ہے اور اس پر ایمان لانا ہے۔ وہ جب بھی نازل ہو اور جہاں بھی نازل ہو چونکہ ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے وہ نکلنے والی تعلیم ہے، میں اس پر ایمان لاؤں گا۔ اس لئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ حضور پر نازل کیا گیا ہے، قرآن سے استفادہ کرنے والے اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور جو کتابیں آپ ﷺ سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، انہیں بھی وہ اللہ کی کتابیں تسلیم کرتے ہیں۔ اگر مزید تدبر سے کام لیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں چند باتوں کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے۔

ا۔ انسان اگرچہ حواس اور عقل کی دولت رکھتا ہے اور وہ عقل کی مدد سے وہ کچھ جان لیتا ہے اور وہاں تک اس کی رسائی ہوجاتی ہے، جہاں کسی اور مخلوق کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اپنے دل ودماغ کی تمام تر قوت کے باوجود وہ اس قابل نہیں ہے، کہ وہ یہ جان سکے کہ میرا خالق ومالک کن باتوں میں راضی ہوتا ہے اور کن باتوں میں ناراض۔ اسے زندگی گزارنے کیلئے ایسا نظامِ فکر اور نظامِ عمل درکار ہے جو اس کی دنیا وعقبیٰ کی کامیابی کا ضامن ہو، ظاہر ہے کہ جو عقل کے بل بوتے پر تجویز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عقل اپنی تمام تر خوبیوں اور رعنائیوں کے باوجود، زندگی کے ہر معاملے میں رہنمائی دینے کے قابل نہیں۔ اس کا دائرۂ فکر محسوسات اور معقولات کی دنیا تک محدود ہے اور انسانی زندگی کا تعلق چونکہ مابعد الطبیعات سے بھی ہے اور اس کی روحانی زندگی کے ڈانڈے چونکہ عالم الٰہیات

Marfat.com

اور عالم غیب سے بھی علاقہ رکھتے ہیں۔اس لئے صرف عقل کی مدد سے ان ضرورتوں کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔مزید براں یہ کہ زندگی کے اجتماعی معاملات میں، چونکہ انسانی عقلوں میں بہت تفاوت ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ عقل جذبات، خواہشات اور مفادات کی ہوس سے عموماً مغلوب ومقہور ہو جاتی ہے۔اس لئے اخلاقی دنیا میں اور انسان کی اجتماعی اقدار میں، عقل سے رہنمائی لینا، نہ قابل عمل ہے اور نہ خطرے سے خالی ہے۔لیکن جو آدمی یا جو معاشرہ، اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ مجھے وحیِ الٰہی کی رہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ میری رہنمائی کیلئے میری عقل کفایت کرتی ہے اور یا وہ یہ سمجھتا ہو کہ انسان از خود ترقی کر کے براہ راست اللہ سے راہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔تو اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ایسے شخص کیلئے قرآنِ کریم میں کوئی ہدایت نہیں۔

۲۔ جو آدمی وحیِ الٰہی کی راہنمائی کی ضرورت کا قائل تو ہو، لیکن قومی تعصب کا شکار ہو کر یہ سمجھے کہ میں تو اس وحیِ الٰہی کو تسلیم کروں گا، جو اس ذاتِ گرامی پر نازل ہوئی تھی، جسے میں اپنا رسول سمجھتا ہوں اور اس کے علاوہ اگر یہ وحی کسی اور پر نازل ہوتی ہے، تو میں اسے قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔جس طرح اہل کتاب آسمانی رہنمائی کو تسلیم کرتے تھے۔یہود تورات کو مانتے تھے اور عیسائی انجیل کو۔لیکن جب انہیں قرآنِ کریم پر ایمان لانے کیلئے کہا جاتا، کہ تم جانتے ہو کہ یہ بھی اللہ کی کتاب ہے اور اس کی صداقت کی گواہی تمہاری کتابوں میں موجود ہے۔تو وہ صاف کہتے کہ ہم تو صرف اس کتاب کو مانتے ہیں، جسے ہم پر نازل کیا گیا تھا۔اس لئے ہم اس کے علاوہ کسی اور رسول پر اترنے والی کتاب کو ماننے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔قرآن کریم نے ان کی اس گمراہی کو ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس پر جو اللہ نے نازل کیا ہے۔تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ نازل کیا گیا ہے، اس سے کفر کرتے ہیں)۔یعنی اصلاً وہ لوگ گروہی تعصب کا شکار ہیں۔ان کے نزدیک رہنمائی کیلئے اللہ کی طرف سے کتاب کا آنا کافی نہیں، بلکہ اس کتاب کا ان کے اپنے گروہ پر اترنا ضروری ہے۔یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اصل سرچشمہءِ ہدایت سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ صرف اپنی کتاب کو ماننے کے دعوے دار ہیں، وہ اس قرآنِ کریم کی ہدایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

۳۔ اس آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، یومنون بالقرآن نہیں کہا، بلکہ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فرمایا گیا ہے۔یعنی قرآنِ کریم سے استفادہ کرنے والے وہ لوگ ہیں، جو ہر اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں، جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی ہے۔اگر یہاں قرآن کریم کا نام لیا جاتا، تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔لیکن فرمایا یہ جا رہا ہے کہ وہ ہر اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں، جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ قرآنِ کریم پر ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ وہ آپ ﷺ پر اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔اسی طرح وہ حدیث اور سنت پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ اس کا مفہوم و معنی بھی آپ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔قرآنِ کریم کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ کی جانب سے ہیں۔لیکن حدیث کا معنی اور مفہوم اللہ کی جانب سے نازل ہوتا رہا ہے، لیکن اس کے الفاظ حضور ﷺ کے اپنے ہیں۔چنانچہ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے، کہ وہ لوگ صرف قرآن پاک پر ایمان لانے کو کافی نہیں سمجھتے، بلکہ قرآن پاک کی عملی تشریح اور اس کے مبہمات کی وضاحت اور اس کے مجملات کی تفصیل جو حدیث کی شکل میں ہے، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حدیث کو نظر انداز کر کے نہ قرآنِ پاک کو سمجھنا ممکن ہے اور نہ اس پر عمل کرنا۔اور جو شخص حدیث کا انکار کرتا ہے اور صرف قرآنِ پاک کو کافی سمجھتا ہے، وہ قرآنِ پاک کی ہدایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

Marfat.com

ختم نبوت کی طرف اشارہ

۴۔ آیت کے اس حصے میں آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں، جو ہر اس چیز پر ایمان لاتے ہیں، جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی ہے اور جو آپ ﷺ سے پہلے نازل کی گئی ہے۔ حالانکہ جو کتابیں پہلے نازل ہوئی ہیں، وہ اپنا زمانہ گزار چکی ہیں۔ تحریف اور ترمیم کا شکار ہو کر اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھی ہیں۔ ان میں بیان کردہ اللہ کی شریعت کے متعدد احکام مٹا دیئے گئے یا بدل دیئے گئے، اس لئے قرآنِ کریم کے آنے کے بعد وہ منسوخ ہو گئیں۔ اب اگر کوئی شخص ان پر ایمان نہیں لاتا تو بظاہر قرآن پر ایمان لانے کے بعد، شرعی زندگی میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا اور اللہ کی عطا کردہ رہنمائی میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی کیونکہ قرآنِ کریم کی رہنمائی اپنے وقت نزول سے لیکر قیامت تک آنے والے انسانوں کیلئے کافی و شافی ہے۔ بایں ہمہ قرآنِ کریم ان پر ایمان لانے کو لازمی قرار دیتا ہے، کیونکہ آج اگرچہ ان پر عمل کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ قابل عمل نہیں رہیں۔ لیکن ان پر ایمان لانا بہر حال ضروری ہے، کیونکہ وہ بہر صورت اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ ان پر ایمان نہ لانے کا مطلب اللہ پر ایمان نہ لانے کے مترادف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کتاب کسی دور میں بھی نازل ہو، اس پر ایمان لانا اس لئے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانے کو مستلزم ہے اور اس کو نہ ماننے کا مطلب اللہ کا انکار کرنا ہے۔ اگر یہ بات سمجھ لی جائے، تو پھر یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ اگر آنحضرت ﷺ کے بعد بھی اگر کسی رسول کو آنا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآنِ کریم اس کا ذکر نہ کرتا۔ کیونکہ جب سابقہ رسول اور کتابیں، جن پر ایمان لانا یا نہ لانا عملی طور پر برابر ہے۔ ان کا ذکر پورے اہتمام سے کیا جا رہا ہے، تو آئندہ آنے والے رسول اور اس پر اترنے والی کتاب کا تذکرہ یقیناً بے حد اہمیت کا حامل تھا کیونکہ آئندہ آنے والی نسلوں کا ایمان و عمل اسی سے وابستہ تھا اور ان کی دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا دار و مدار یقیناً اسی پر تھا۔ لیکن پورا قرآنِ کریم پڑھ جایئے، آپ کو بیسیوں جگہ قرآنِ کریم کے ساتھ ساتھ سابقہ کتب اور سابقہ پیغمبروں پر ایمان لانے کا ذکر ملے گا۔ لیکن کہیں بھی آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ کسی آنے والے پیغمبر اور اس پر نازل ہونے والی کتاب پر ایمان کا ذکر کیا گیا ہو۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس طرح سابقہ آسمانی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے آنے کی خبر دی گئی، اگر آپ ﷺ کے بعد بھی کسی کو آنا ہوتا، تو یقیناً قرآنِ کریم اس کی بھی خبر دیتا اور اس پر ایمان لانے کو لازم ٹھہراتا اور اس آیت کریمہ میں وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ کے بعد ومایُنزل بعدک کا لفظ ہوتا۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (البقرة: ۴)

(اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں)

سورۃ فاتحہ کی توضیح و تفصیل کے ضمن میں آخرت پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ اس لئے اب اسے دہرانا مناسب نہیں۔ البتہ اختصار کے ساتھ چند باتوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ غیب میں آخرت بھی شامل ہے۔ جو آدمی غیب پر ایمان رکھتا ہے، وہ یقیناً آخرت کو بھی مانتا ہے۔ لیکن اس کا مستقلاً الگ ذکر کرنا، یہ معنی رکھتا ہے کہ قرآنِ کریم جو انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے اور انسانی زندگی میں جس تبدیلی کا داعی ہے، اس کیلئے آخرت پر یقین بے حد ضروری ہے۔ اللہ، اس کے رسول ﷺ اور قرآن کو ماننا یقیناً ہدایت کی بنیاد ہے۔ لیکن جب تک آخرت کی فکر دل و دماغ میں راسخ نہیں ہوتی، اس وقت تک اللہ کی ذات و صفات کا صحیح استحضار اور قرآنِ کریم سے صحیح استفادہ اور ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے صحیح وابستگی پیدا نہیں ہوتی۔

Marfat.com

۲۔ آخرت کا معنی تو ہے دوسری زندگی۔ جو قیامت کے بعد جن وانس کو ملے گی، لیکن اس کا اطلاق چند عقائد وحقائق پر ہے۔ ان میں سے ہر ایک پر یقین آخرت کے یقین کو مکمل کرتا ہے۔

1۔ ان میں سے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں میں یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے غیر ذمہ دار نہیں بنایا۔ وہ کوئی خود کاشتہ پودا نہیں، جو یونہی مَل دَل کے ختم ہو جائے اور نہ وہ شتر بے مہار ہے جو جدھر منہ اٹھائے چلتا پھرے۔ بلکہ اس کی زندگی کا مقصد ہے اور اس مقصد کے مطابق زندگی گزارنے کا اسے پابند بنایا گیا ہے۔ قیامت کے دن جسے آخرت کہا گیا ہے، اس سے اس مقصد کے حوالے سے باز پرس ہوگی۔ مختصر یہ کہ باز پرس کا یقین رکھنا اور اس کیلئے ایک دن کے آنے کا یقین رکھنا یہ آخرت کا پہلا تصور ہے۔

2۔ دوسری بات یہ کہ دنیا کا موجودہ نظام اور دنیا کی یہ زندگی دائمی اور ابدی نہیں۔ ایک وقت ایسا آئیگا جب یہ پورا کارخانہ تباہ ہو جائے گا۔ زمین پھٹ جائے گی آسمان ٹوٹ پھوٹ جائیں گے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ ہر طرف تباہی اور موت کی حکومت ہوگی۔

3۔ تیسری بات یہ کہ جس طرح دنیا کو موت کا شکار ہونا ہے اور اس زندگی کو ہمیشہ باقی نہیں رہنا، اسی طرح یہ تباہی اور بربادی بھی ہمیشہ نہیں رہے گی اس دنیا کے خاتمے کے ایک عرصے بعد اللہ تعالیٰ ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں تمام نوع انسانی کو جو ابتداءِ آفرینش سے لے کر قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا اور پھر انہیں میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا۔ جہاں سب کے اعمال کا حساب ہوگا اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

4۔ چوتھی بات یہ کہ جو لوگ اللہ کے فیصلے کے نتیجے میں نیک قرار پائیں گے، وہ جنت میں جائیں گے اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور جو لوگ اپنی بداعمالیوں کے باعث بد ثابت ہوں گے، وہ جہنم کی نذر کر دیئے جائیں گے۔

5۔ پانچویں یہ بات کہ قیامت کے دن کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ایمان وعمل پر ہوگا۔ جس نے زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گذاری ہوگی، وہ کامیاب ٹھہرے گا۔ کیونکہ کامیابی اور ناکامی کا دارومدار موجودہ زندگی کی خوشحالی یا بدحالی پر نہیں، بلکہ حقیقی کامیاب وہ ہے، جو آخرت میں جہنم سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا۔ دنیا میں اگر کسی نے کبھی خوشی نہیں دیکھی اور ساری زندگی دکھوں میں گذاری۔ لیکن اس کی پوری زندگی پر ایمان وعمل کی حکمرانی رہی اور اس نے ہمیشہ اپنے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کی، تو اس کی دنیا کی محرومیاں آخرت میں اس کیلئے توشہ ثابت ہوں گی۔ لیکن جس نے دنیا میں عیش وعشرت میں زندگی گذاری، اس کا یہ عیش وعشرت قیامت میں اس کیلئے حسرت کا سامان بن جائے گا۔

یہ چند عقائد اور حقائق ہیں جن پر یقین رکھنے کو ایمان بالآخرت کہتے ہیں۔

یہاں غور فرمایئے کہ آخرت کے ساتھ ''ایمان'' کے لفظ کی بجائے ''ایقان'' کا لفظ آیا ہے یہ نہیں کہا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں) بلکہ فرمایا وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں)۔

Marfat.com

ایمان اور ایقان میں فرق

''ایمان'' کے معنی تصدیق کرنے اور مان لینے کے ہیں۔اس کی ضد کفر وانکار اور تکذیب ہے۔''ایقان'' کا معنی یقین کرنے کے ہیں۔ اس کی ضد گمان اور شک ہے۔جس طرح کسی شے پر یقین رکھنے کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی اس پر ایمان بھی رکھتا ہو،اسی طرح کسی چیز پر ایمان رکھنے کیلئے اس پر یقین کرنا شرط نہیں ہے۔ہوسکتا ہے کہ آدمی کا ایمان محض گمان غالب پر مبنی ہو اور وہ آہستہ آہستہ گمان کی منزل سے نکل کر یقین کی منزل تک پہنچ جائے اور اس طرح اس کے ایمان کی تکمیل ہو جائے۔دونوں کی مثالیں قرآنِ کریم اور تاریخ میں موجود ہیں۔فرعون اور آلِ فرعون کے بارے میں قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا کہ ان لوگوں نے مسلسل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر دل سے یقین کرلیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔لیکن وہ اپنی سرکشی اور ظلم کے باعث ایمان لانے سے محروم رہے۔ابوجہل کی یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ میں محمد (ﷺ) کو جھوٹا نہیں کہتا، میں جانتا ہوں اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن میں اس پر ایمان اس لئے نہیں لاسکتا کہ ایمان لانے کے بعد بنی ہاشم کا قبیلہ ہمیشہ کیلئے ہم سے بڑھ جائے گا اور مزید یہ کہ ہمیں جو عزت حاصل ہے، وہ ایمان لانے کے بعد باقی نہیں رہے گی ، کیونکہ اسلام تو ہر طرح کے تفاوت کو ختم کر دیتا ہے۔وہاں تو صرف تقویٰ سے عزت ملتی ہے، خاندانی انتساب سے کچھ نہیں ملتا۔دور نہ جایئے ، برطانیہ کا مشہور ادیب برنارڈ شا، اسلام کو سچا مذہب سمجھتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ آج کے دور میں اگر کوئی مذہب چل سکتا ہے، تو وہ صرف اسلام ہے اور اگر کوئی شخصیت آج کے دور کی رہنما ہوسکتی ہے، تو وہ صرف محمد (ﷺ) ہیں۔لیکن اس کے باوجود وہ مسلمان نہ ہوا اور ایسا تو بارہا ہوتا ہے کہ آدمی غالب گمان پر کسی چیز کو تسلیم کرلیتا ہے، لیکن پھر تجربے سے اس کا غالب گمان یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔یقیناً ایسے لوگ قرنِ اول میں بھی ہوں گے کہ جو جب ایمان لائے تو یقین کی معراج پر نہ تھے۔بالخصوص فتح مکہ کے موقع پر ایمان لانے والوں میں ایسے لوگوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے ۔لیکن رفتہ رفتہ ان کا ایمان یقین کی صورت اختیار کر گیا۔یقین بہرحال انسانی شعور اور انسانی احساسات کی سب سے اعلیٰ منزل ہے۔اس کے بعد عمل، ایثار اور شہادت کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی، تو آخرت پر ایمان لانے کو اسی یقین کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔کیونکہ آخرت کا عقیدہ ہی فرد اور قوم دونوں کی زندگیوں میں انقلاب کا سبب بنتا ہے۔جس آدمی کو یقین آجائے کہ مجھے اپنے ایک ایک عمل اور زندگی کے ایک ایک لمحے کا اللہ کو حساب دینا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ کب اللہ کی طرف سے بلاوا آجائے، ایسا شخص کبھی گناہ کے قریب بھی نہیں جاسکتا۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (البقرة: ۵)

(یہی لوگ ہیں، جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ ہیں، جو کامیاب ہیں)

ہدایت کا تکمیلی مفہوم

جن لوگوں نے پورے احساس اور شعور کے ساتھ قرآنِ پاک سے استفادہ کیا اور جس کے نتیجے میں ان کے اندر متذکرہ بالا صفات پیدا ہو گئیں یہی وہ لوگ ہیں، جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔یہاں ہدایت اپنے تکمیلی مفہوم میں ہے۔یعنی یہی وہ لوگ ہیں، جن کیلئے قرآنِ پاک کے دیئے ہوئے نظامِ زندگی پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔جنہیں قلبی نور اور بصیرت عطا ہوتی ہے، نہ ان کی فکر میں کوئی کجی ہوتی ہے اور نہ

Marfat.com

ان کے عمل میں کوئی کوتاہی۔ اللہ کے ہر حکم اور قرآنِ کریم کی ہر آیت سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن کی ہر بات انہیں اپنے دل کی آواز محسوس ہوتی ہے وہ اسلامی زندگی کے تقاضوں کی طرف لپکتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اللہ ان کو دنیا میں بھی فلاح کی دولت سے نوازتا ہے اور آخرت میں بھی فلاح ان کا نصیب ہوگی۔ اہلِ لغت کہتے ہیں کہ فلاح کا لفظ دنیا اور آخرت کی ہر طرح کی بھلائیوں کو محیط ہے۔ دنیا میں جب کسی شخص یا کسی معاشرے کے افراد کو یہ فلاح کی دولت ملتی ہے، تو وہ ہر طرح سے آسودہ ہو جاتے ہیں اور قیامت کے دن اللہ کے فضل وعنایت سے وہ اس طرح نہال ہوں گے کہ ان کے تصور کے پیمانے ان نعمتوں اور خوشیوں کو ناپنے سے قاصر رہ جائیں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ O خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ O (البقرۃ: ۶تا۷)

(جن لوگوں نے کفر کیا ان کیلئے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کیلئے عذاب عظیم ہے)

انسانوں میں کوئی تفریق نہیں سوائے ایمان اور کفر کے

اسلامی تعلیمات کے مطابق تمام انسان ایک وحدت میں شریک ہیں۔ جس کی بنیاد وحدتِ رب اور وحدتِ اب ہے یعنی ان کا رب بھی ایک ہے اور ان کا باپ (حضرت آدم علیہ السلام) بھی ایک ہے۔ اس لحاظ سے انسانوں میں کوئی تقسیم نہیں کوئی انسان کسی جغرافیائی علاقے سے تعلق رکھتا ہو، رنگ اس کا کوئی سا بھی ہو، وہ تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، دولت مند ہو یا نان شبینہ کا محتاج، انسان ہونے کے اعتبار سے وہ اسی زنجیر کی ایک کڑی ہے جسے ہم نوعِ انسانی کہتے ہیں۔ انسانی حقوق میں رنگ ونسل اور جغرافیہ کے حوالے سے کوئی فرق نہیں۔ جو حقوق ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو خالص عرب ہونے کے لحاظ سے حاصل ہیں وہی حقوق بلال حبشی، صہیب رومی، حسن بصری اور سلمان فارسی کو حاصل ہیں۔ البتہ ایک تقسیم ہے، جس کا اسلام قائل ہے اور وہ اس تقسیم پر اصرار بھی کرتا ہے اور اس کے علاوہ ہر تقسیم کو قبول کرنے سے یکسر انکار کرتا ہے۔ وہ تقسیم ہے، مومن اور کافر کی۔ چونکہ یہ کائنات اللہ کی ملکیت ہے، اس زمین اور اس پر بسنے والوں پر اللہ کی حاکمیت ہے اس حاکم کی مخلوقات میں جن وانس کو مکلف مخلوق بنایا گیا ہے۔ کسی انسان اور کسی جن کو انسان اور جن ہونے کے لحاظ سے تو کسی پر کوئی برتری نہیں، البتہ ان میں اگر کوئی فرق ہوسکتا ہے تو وہ ان کے حاکم حقیقی کے اعتبار سے ہوسکتا ہے۔ جس طرح کسی ملک میں رہنے والے شہری، اس وقت تک سب برابر ہیں۔ جب تک وہ اس ملک کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن جب ان میں سے کوئی اس ملک کی مقتدر ذات کا انکار کر دیتا ہے، تو وہ فوراً دوسروں سے الگ ہو جاتا ہے۔ ملک کا قانون حرکت میں آتا ہے اور اب انکار کرنے والے کے ساتھ بالکل مختلف سلوک ہوتا ہے۔ یہی حال اس زمین پر بسنے والوں کا بھی ہے کہ ان میں سے جو لوگ اللہ کی حاکمیت کو اور اس کے دیئے ہوئے قانون کو تسلیم کر کے مومن بن جاتے ہیں۔ تو وہ اللہ کے پسندیدہ بندے ٹھہرتے ہیں اور جو اسے ماننے یا اس کے قانون کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، تو انہیں منکر اور باغی قرار دے کر اپنے پسندیدہ اور فرماں بردار بندوں سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ پیشِ نظر آیات میں اسی بنیادی حقیقت کے اعتبار سے انسانوں کی تقسیم کی گئی ہے۔ پہلی چار آیتوں میں، ان انسانوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو اللہ کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور دنیوی اور اخروی کامیابیاں جن کا مقدر ہیں۔ اور ان آیات میں ان

Marfat.com

لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے جو اللہ کے ناپسندیدہ بندے ہیں۔وہ اپنی محنت اور صلاحیت سے دنیا میں بظاہر کیسی ہی کامیابی حاصل کرلیں، لیکن آخرکار وہ اللہ کی طرف سے عذاب عظیم کا شکار ہوں گے۔پیشِ نظر دو آیتوں میں ان نامقبول بندوں کی ایک حالت یا ایک قسم کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد مسلسل تیرہ آیات میں انہی نامقبول بندوں میں سے دوسری قسم کے لوگوں کے حالات اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔انہیں پڑھتے ہوئے ایک قاری کو مسلسل اپنی حالت پر نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ کے مقبول بندوں کی جو پانچ بنیادی صفات بیان کی گئی ہیں، کیا یہ صفات میرے اندر ہیں یا نہیں اور اگر اس اعتبار سے کوئی کمی محسوس ہو تو فوراً اس کے ازالے کیلئے فکرمند ہونا چاہئے اور پھر نامقبول بندوں کی دونوں قسموں کو، جس طرح پندرہ آیات میں بیان کیا گیا ہے، اسے پڑھتے ہوئے مسلسل اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ کیا ان میں سے کوئی خرابی میرے اندر تو موجود نہیں اور اگر کسی ایسی بری صفت کا اپنے اندر شبہ بھی ہو تو اسے دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے۔اسی طرح اپنی حالت کے ساتھ امت کی حالت کا جائزہ بھی لیتے رہنا چاہئے کہ قرآنِ کریم کے بیان کردہ اس معیار کے حوالے سے امت کہاں کھڑی ہے اور اس لحاظ سے مجھ پر کیا ذمہ داریاں ہیں، کیونکہ قیامت کے دن جس طرح آدمی ذاتی زندگی کے بارے میں مسئول اور ماخوذ ہوگا اسی طرح اپنے گرد و پیش، اپنے زیرِ اثر اور اپنے دائرۂ کار کے بارے میں بھی اسے جواب دہی کرنا پڑے گی۔

کفر کا معنی اور مفہوم

اب ہم پیشِ نظر آیات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔سب سے پہلے الفاظ کو دیکھئے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (بے شک جن لوگوں نے کفر کیا) کفر کے اصل معنی ڈھانکنے اور چھپانے کے ہیں۔قرآنِ کریم نے اسے دو طرح استعمال کیا ہے۔کبھی شکر کی ضد کی حیثیت سے اور کبھی ایمان کی ضد کی حیثیت سے۔اگر شکر کی ضد کی حیثیت سے استعمال ہو تو پھر اس کا معنی ہوتا ہے ناشکری، مثلاً: لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر کفر یعنی ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا شدید ہے)۔یہاں دیکھئے کفر ناشکری کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اگر ایمان کی ضد کی حیثیت سے استعمال ہوا تو پھر اس کا معنی ہے انکار کرنا اور کفر کرنا۔جیسے فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ (تم میں سے کافر بھی ہیں اور مومن بھی)۔یعنی ایمان لانے والے بھی اور انکار کرنے والے بھی تو یہاں کفر انکار کرنے کے معنی میں آیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کبھی یہ لفظ مطلق یعنی بغیر مفعول کے استعمال ہوا ہے اور کبھی مفعول کے ساتھ۔جہاں مفعول کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو متعین طور پر اس مفعول ہی کا کفر وانکار مراد ہوگا۔لیکن جہاں کہیں کسی مفعول کے بغیر مطلق صورت میں استعمال ہوا ہے، وہاں بالعموم ان تمام ضروریاتِ دین کے انکار کے معنی میں استعمال ہوا ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ! سَوَآءٌ۔ فَعَالٌ کے وزن پر ہے۔اس کے بنیادی معنی تو ہیں، برابری یا برابر ہونا۔پھر یہ مصدر اسم فاعل کے معنی میں یعنی برابر ہونے والا، بطور صفت یا ظرف استعمال ہوتا ہے۔اور اس طرح اس میں ''برابر، درمیان، ٹھیک درمیان، یکساں، وسط یا مثل'' کے معنی پیدا ہوتے ہیں، مثلاً ثَوْبٌ سَوَاءٌ ۔ ایسا کپڑا جس کا طول وعرض برابر ہو۔یا سَوَاءُ النَّهَارِ ۔''دن کا ٹھیک درمیان یعنی دوپہر''۔لفظ سواءٌ مصدر ہونے کی بناء پر واحد تثنیہ جمع اور مذکر مونث سب کیلئے یکساں رہتا ہے۔ سواءٌ علیهم کا معنی ہوگا، برابر ہے ان پر یا یکساں ہے ان پر یا یکساں ہے ان کے حق میں۔ ءَاَنْذَرْتَهُمْ ۔ ہمزہ استفہامیہ ہے۔اور اس کے معنی ہوتے ہیں

Marfat.com

''کیا''۔لیکن جب اس کا استعمال سواءٌ کے ساتھ ہوتا ہے،تو پھر اس ہمزہ کو همزة التسويه کہتے ہیں۔اس صورت میں ہمزہ کا معنی کیا نہیں ہوتا، بلکہ خواہ یا چاہے کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اردو میں اسی چاہے یا خواہ کی تکرار ہوتی ہے۔یا اس تکرار کی بجائے درمیان میں ایک یا استعمال کرتے ہیں۔مگر عربی میں دوسرے خواہ یا چاہے کیلئے ''اَم'' لے آتے ہیں۔جیسے آیت کے اس جملے میں ہے۔ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُم کا معنی ہوگا۔''آپ چاہے انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں''۔یعنی انہیں ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔وہ ایمان نہیں لائیں گے۔الفاظ کی اس وضاحت کے بعد ہم آیت کے مفہوم اور مراد پر غور کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے کون مراد ہیں

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے بظاہر اندازہ نہیں ہوتا کہ اس سے کون لوگ مراد ہیں۔کیونکہ یہاں کفروا کا لفظ مطلق استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس کے بعد ان لوگوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں سارے کافر مراد نہیں بلکہ اس سے کوئی خاص گروہ مراد ہے۔ان کی پہلی صفت یہ بیان ہوئی ہے۔کہ انہیں ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے وہ کسی صورت میں بھی ایمان لانے والے نہیں اور دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کردی گئی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔ان صفات کو دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حال سارے کافروں کا نہ تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت تمام لوگ کافر تھے۔لیکن آپ ﷺ کی تبلیغ ودعوت کے نتیجے میں رفتہ رفتہ ہزاروں لوگ مسلمان ہوئے۔اگر اس آیت سے سارے کافر مراد ہوتے تو پھر کسی کو بھی مسلمان نہیں ہونا چاہیے تھا اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ کافر مراد ہیں جنہوں نے اپنے دل و دماغ کے دروازے آنحضرت ﷺ کی تبلیغ ودعوت کیلئے بند کردیئے تھے۔وہ آپ ﷺ کی کسی بات کے سننے کے روادار نہ تھے۔اس کی نہایت نمایاں مثال دیکھنی ہو تو طائف کے سرداروں کا حال پڑھ لیجئے۔جن کے پاس حضور ﷺ اسلام کی دعوت لے کر گئے تھے۔انہوں نے کس طرح آپ ﷺ کی بات سننے سے انکار کیا۔اہل کتاب کا حال تو اور بھی زیادہ برا تھا، کہ وہ آپ ﷺ کی ذات، آپ ﷺ کی دعوت اور آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کو اپنی کتابوں میں بیان کردہ علامتوں کے باعث اچھی طرح پہچانتے تھے۔لیکن اس کے باوجود وہ ایمان لانے کیلئے کسی طرح تیار نہ تھے۔آنحضرت ﷺ کی ایک زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنو نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں۔وہ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو میرے والد اور چچا، آپ ﷺ سے ملنے کیلئے گئے۔آپ ﷺ سے ملاقات کے بعد جب لوٹ کے گھر آئے تو چچا نے بڑے بھائی سے پوچھا کہ آپ کا ان صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے۔اس نے کہا کہ یہ یقیناً وہی پیغمبر ہے جس کا ذکر ہماری کتابوں میں ہے۔چھوٹے بھائی نے پوچھا کہ تو پھر کیا ارادہ ہے، جواب ملا کہ جب تک جان میں جان ہے اس کی بات چلنے نہیں دوں گا۔سردارانِ قریش کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا ان میں بیشتر لوگ آپ ﷺ کی دعوت کو سچا سمجھتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ نے کبھی زندگی بھر جھوٹ نہیں بولا۔آپ ﷺ کی پاکیزہ زندگی کا ایک ایک لمحہ آپ ﷺ کی سچائی کی گواہی دیتا تھا۔بایں ہمہ وہ ایمان لانے کیلئے ہرگز تیار نہ تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب ہوں یا عمائدین قریش یا مدینہ کے منافقین کے رئیس یہ تمام لوگ اس آیت کا مصداق ہیں۔حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کا مصداق اہل کتاب کے ان ہٹ دھرم لوگوں کو ٹھہرایا ہے، جو ان تمام پیشگوئیوں کو جھٹلا چکے تھے، جو نبی کریم ﷺ کے بارہ میں ان کے صحیفوں میں موجود تھیں۔اور حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس سے ان مختلف پارٹیوں کے لیڈر مراد ہیں، جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

Marfat.com

مقصود دونوں کا ایک ہی ہے۔ البتہ حضرت ربیع بن انس کی بات زیادہ جامع معلوم ہوتی ہے اب سوال یہ ہے کہ اگر واقعی یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی صداقت کو پہچان چکے تھے اور آپ ﷺ کی حقانیت کے دل سے معترف تھے تو پھر آخر انکار میں وہ اتنے شدید کیوں تھے؟ دوسری آیت کریمہ میں (خَتَمَ) کے لفظ سے اس کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ لیکن اس کی وضاحت کرنے سے پہلے ہم ایک اور بات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں آپ نے یہ لفظ پڑھا ہے ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ کہ آپ انہیں انذار کریں یا نہ کریں، یہ انذار کیا ہے؟ کیونکہ اس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے۔

انذار کا مفہوم

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے اسلوبِ تبلیغ ودعوت میں تین باتیں نمایاں ہیں۔ کہیں تو وہ اپنا نقطہ نگاہ سمجھانے کیلئے دلائل سے کام لیتا ہے۔ کبھی آفاقی دلائل پیش کرتا ہے اور کبھی انفسی دلائل اور کبھی کبھی مخاطب کے مسلمات کو دلیل بناتا ہے اور کہیں جب اولوالالباب کو خطاب کرتا ہے۔ تو عقلی اور فطری مقدمات سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی دعوت کا زیادہ زور تبشیر اور انذار کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یعنی کبھی وہ دلوں کو مائل کرنے کیلئے یہ کہتا ہے کہ اگر تم میری دعوت کو قبول کرلو اور اس صراط مستقیم پر چلنا شروع کردو جو تمہارے لئے قرآنِ کریم نے کھولی ہے۔ تو میں تمہیں دنیوی واخروی کامیابیوں کی بشارت دیتا ہوں۔ تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی اس طرح آسودگی سے گزرے گی کہ کوئی پریشانی تمہارے عیش کو مکدر نہیں کرسکے گی۔ اس راستے پر چلنے والوں کیلئے کانٹے بھی پھول بن جاتے ہیں اور اس راہ میں آنے والی مشکلات اخروی کامیابیوں کی ضمانت بن جاتی ہیں۔ گھر سکون کی جگہ اور معاشرہ اجتماعی حصار کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ حکمران اللہ کا سایہ بن جاتے ہیں اور اگر تم اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرو تو میں تمہیں تمہارے انجام سے ڈراتا ہوں۔ میں تمہیں باخبر کرتا ہوں ان خطرات ومہالک سے جن سے تمہیں یقیناً واسطہ پڑے گا۔ دنیا تمہاری محرومیوں کا مرقع بن جائے گی اور آخرت کا ہولناک عذاب تمہارا مقدر ٹھہرے گا۔ قرآنِ کریم اور رسول اللہ ﷺ کا یہ سہ گونہ اسلوبِ تبلیغ موقع کی مناسبت سے اختیار کیا جاتا ہے۔ جو طبیعتیں تبشیر سے متاثر ہوتی ہیں انہیں بشارتیں سنائی جاتی ہیں اور جن طبیعتوں کو دلائل سے زیادہ مناسبت ہو وہاں ضرورت کے مطابق متنوع دلائل سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن جو طبیعتیں ہٹ دھرم اور اکھڑ ہوں، اور جن پر ملائم بات اثر نہ کرتی ہو۔ انہیں آنے والے خطرات ومہالک سے آگاہ کرکے انذار کیا جاتا ہے۔ یعنی انہیں ڈرایا جاتا ہے کہ اگر تم راہ راست اختیار نہیں کروگے تو پھر تمہیں ایسے ایسے خوفناک انجام سے واسطہ پڑیگا۔ اس آیت سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو اسلام کا نام سننے کے بھی روادار نہیں اور وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کیلئے دلوں میں معمولی نرم گوشہ بھی نہیں رکھتے۔ ایسے مخاطب لوگوں کیلئے نہ دلائل کام دیتے ہیں نہ بشارتیں سنانا۔ ان کیلئے تو ضروری ہے کہ دعوت کا وہ اسلوب اختیار کیا جائے، جس سے دلوں کی دنیا تہ وبالا ہوجائے اگر ان میں حق کو قبول کرنے کی معمولی صلاحیت بھی ہوگی تو وہ یقیناً اس انذار سے فکرمند ہوکر ہدایت کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اور مزید یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ یا تو ترغیب سے کسی ذمہ داری کو قبول کرنے کیلئے تیار ہوتا ہے اور یا ترہیب اس کا راستہ بدلتی ہے۔ اور پیغمبر کا ترہیب وانذار محض مفروضوں یا ذہنی مقدمات پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ وہ پورے یقین کے ساتھ لوگوں سے یہ بات کہتا ہے، کہ لوگو! جس طرح تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ سنکھیا کھانے سے موت واقع ہوجاتی ہے اور آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ جل جاتا ہے۔ میں تمہیں اس سے بڑھ کر یقین دلاتا ہوں کہ کفر اور شرک کی زندگی تمہاری دنیا اور آخرت کیلئے اس سے زیادہ

Marfat.com

تباہ کن ہے۔تم جسم کی موت کو تو آنکھوں سے دیکھتے ہو لیکن اخلاقی اور روحانی زندگی کی موت تمہیں دکھائی نہیں دیتی حالانکہ وہ موت اس سے زیادہ سنگین ہے اور پھر پیغمبر کا لفظ لفظ چونکہ اس کے دل سے نکلتا ہے اور اس کی ذاتی زندگی ان حقائق کی عکاس ہوتی ہے اس لحاظ سے یہ انذار قلوب کی حالت کو بدل دیتا ہے۔لیکن جن پر یہ بھی اثر نہ کرے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے قانونِ ختم کی زد میں آچکے ہیں۔

خَتَمَ کا مفہوم

خَتَمَ کا معنی عربی زبان میں ''موم یا مٹی یا اسی طرح کی کسی چیز پر ٹھپہ لگانے'' کے ہیں۔یہیں سے یہ لفظ خط پر مہر لگانے اور کسی چیز کے منہ کو اس طرح بند کر دینے کیلئے استعمال ہونے لگا جس کے بعد نہ اس میں کوئی چیز داخل ہو سکے اور نہ کوئی چیز اس سے نکل سکے۔اس لئے آپ اس آیت کریمہ میں دیکھتے ہیں قلوب اور سمع کیلئے تو ختم کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔لیکن ابصار کیلئے غشاوۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔سبب یہ ہے کہ کانوں اور دل میں ہر طرف سے آواز داخل ہوتی ہے اس پر مہر کرنے کی یہی صورت ہے کہ انہیں بالکل بند کر دیا جائے لیکن آنکھیں چونکہ صرف سامنے دیکھتی ہیں ،اس لئے اس لئے انہیں بند کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان پر پردہ ڈال دینا کافی ہے اس لئے آنکھوں کیلئے پردے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مزید دیکھئے کہ قلوب اور ابصار جمع ہیں۔لیکن سمع واحد ہے حالانکہ ان دونوں کی جمع ہونے کی وجہ سے اسے بھی جمع ہونا چاہئے تھا۔لیکن قرآن کریم نے اسے واحد استعمال کیا ہے اس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ سمع مصدر ہے اور مصدر واحد کی صورت میں واحد اور جمع دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے کیونکہ قریش کی زبان عرب میں معیاری زبان سمجھی جاتی تھی۔کسی لفظ کا فیصلہ کرنا ہو تو قریش کے استعمال کو دیکھا جاتا تھا۔اس لحاظ سے جب عرب کی اس معیاری زبان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمع کو ہمیشہ واحد کے طور پر استعمال کرتے تھے۔اس لئے قرآن کریم نے شاید اسی معیار کو سامنے رکھتے ہوئے بیس بائیس مقامات پر قلوب اور ابصار کے ساتھ اسے واحد ہی استعمال کیا ہے۔تو یہ کلام کا کوئی نقص نہیں بلکہ معیاری زبان کی ایک مثال ہے۔الفاظ کی اس وضاحت کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ مہر کر دینے کا مفہوم کیا ہے کیونکہ اس کے نہ جاننے کئے نتیجے میں عموماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی بندے کے دل و دماغ پر اللہ کی طرف سے مہر کر دی جاتی ہے اور وہ قبولیت حق سے بالکل محروم ہو جاتا ہے تو پھر اس کے ایمان قبول نہ کرنے کی آخر اس پر ذمہ داری کیوں کر ہوئی۔اگر ایک شخص کو کسی صلاحیت سے محروم کر دیا جائے تو پھر اس شخص کو اس بات کی سزا تو نہیں دی جا سکتی کہ تم نے اس صلاحیت سے کام کیوں نہیں لیا۔دراصل یہ سوال یا یہ اشتباہ قلت فہم کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی پیدائشی طور پر مختوم نہیں بنایا یعنی کسی کو پیدائشی طور پر صلاحیتوں سے محروم نہیں کیا۔مزید یہ بھی کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے وہ دنیا کے باقی معاملات میں کہیں بھی بند نہیں ہوتے۔ہر جگہ وہ اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہیں۔وہ تاجر ہیں تو تجارت کی ایک ایک بات کو سمجھتے ہیں یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کھلاڑی ہیں تو گیم کے رموز کو جاننا شب و روز ان کا معمول ہوتا ہے یعنی جس کام کو بھی کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں وہ کام ان کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔اللہ کا قانون یہ ہے کہ اس نے اس طرح انسان کو بنایا ہے کہ وہ جس صلاحیت سے زیادہ سے زیادہ کام لیتا ہے وہ صلاحیت پروان چڑھتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں نئی نئی مہارت پیدا ہوتی جاتی ہے۔کسی باڈی بلڈر کو دیکھ لیجئے اس کے اعصاب دوسروں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔کسی پہلوان کو دیکھ لیجئے وہ دوسروں سے زیادہ زور آور ہوتا ہے۔کھلاڑی کو دیکھ لیجئے اس کی ٹانگیں دوسروں سے زیادہ تیز

Marfat.com

رفتار ہوتی ہیں۔اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے اپنی ان صلاحیتوں کو مسلسل حرکت اور محنت سے دوسروں سے بہتر بنالیا ہے۔لیکن جولوگ کوئی بھی محنت کا کام نہیں کرتے اور مسلسل بیٹھنے کے سوا ان کی کوئی مصروفیت نہیں ہوتی۔عموماً ان کے اعضاء اوران کے اعصاب وقت سے پہلے جواب دے جاتے ہیں۔یہی حال ان لوگوں کا بھی ہے جودنیوی مصروفیات اور مرغوبات میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ دنیا ہی ان کا مقصود ان کا مطمح نظر اوران کا ہدف بن جاتی ہے۔اوراس کی ایک ایک بات کو وہ تمام وکمال سمجھنے لگتے ہیں۔لیکن آخرت اور آخرت کی تیاری کیلئے کبھی انہوں نے وقت نہیں نکالا۔اور کبھی ان کے دماغ نے اس پر سوچنے کی زحمت نہیں کی نتیجہ اس کا وہی نکلتا ہے جو نکلنا چاہئے کہ دنیوی معاملات میں وہ انتہائی چابک دست اور معاملہ فہم ثابت ہوتے ہیں اور آخرت کی بات انہیں اجنبی معلوم ہونے لگتی ہے اور مسلسل اس سے لاپرواہی اور بے اعتنائی ان کی اس صلاحیت کوختم کر کے رکھ دیتی ہے۔قرآنِ پاک ان کے بارے میں کہتا ہے: يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔(وہ حیاتِ دنیا کوخوب جانتے ہیں اور آخرت سے بالکل غافل ہیں)۔یہ آخرت سے غفلت بالآخران کی اس صلاحیت کو بالکل ختم کر کے رکھ دیتی ہے اوراسی کوختمِ قلوب کا نام دیا گیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے دل،یا کان یا آنکھوں پر مہر نہیں لگاتا بلکہ اللہ کا یہ قانون (کہ تمہارے ہر طرح کے اعمال سے نتائج جنم لیتے ہیں اچھا عمل کرو گے تو اچھا نتیجہ نکلے گا اور برا عمل کرو گے تو برے نتیجے کا ظہور ہوگا) منطقی انداز میں بروئے کار آتا ہے۔غور کیجئے! اللہ کے نبی تشریف لائے ان کی دل آویز اور زور دار شخصیت نے پوری قوت سے ان کے سامنے دعوت حق پیش کی۔اللہ کی کتاب کا زوردار بیان ان کے دلوں کو ہلاتا رہا۔ان کے ایک ایک اعتراض کا کھول کھول کے جواب دیا گیا۔انہوں نے اپنی آنکھوں سے پیغمبر کے معجزات دیکھے۔اس کے باوجود اگر وہ بات سننے کیلئے بھی تیار نہیں اور دنیوی زندگی کی مصروفیات کے سوا اور کسی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کے بھی روادار نہیں،تو اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اللہ کا قانون حرکت میں آئے اوران کو قبولیتِ حق سے محروم کر دیا جائے۔قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل کے دلوں پر مہر لگانے کا ذکر کرتے ہوئے اس کا یہی سبب بیان فرمایا ہے کہ جب ان کی بداعمالیوں نے دین کا ایک ایک رشتہ توڑ ڈالا اور عہد وپیمان کی دھجیاں اڑا دیں تو تب اللہ کی طرف سے یہ قانون حرکت میں آیا اوران کی محرومی کا فیصلہ کر دیا گیا۔ارشاد فرمایا:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا O (النساء: ۱۵۵)

(پس بوجہ اس کے کہ انہوں نے عہد کو توڑا،اللہ کی آیات کا انکار کیا،انبیاء کو ناحق قتل کیا اور کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پران کے کفر کے سبب سے مہر کردی ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذات قادرِ مطلق اور رحیم وکریم ہونے کے ساتھ ساتھ عادل بھی ہے۔جس طرح اس کے عدل کا تقاضا ہے کہ کسی کو زبردستی کافر یا نافرمان بنا کر جہنم کا سزاوار نہ بنایا جائے اسی طرح اس کے عدل کا یہ بھی تقاضا ہے کہ کسی کو زبردستی مومن اور فرمانبردار بھی نہ بنایا جائے بلکہ عدل کی فرماں روائی یہ ہے کہ جو جس راستے پر چلے اس کیلئے اسی راستے پر چلنے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔اس لئے فرمایا: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ کہ ہم اس کی بھی اوراُس کی بھی مدد کرتے ہیں۔یعنی جو ایمان کی طرف جانا چاہتا ہے اسے ایمان کی توفیق دے دیتے ہیں اور جو کفر کی طرف جانا چاہتا ہے اس کیلئے کفر کا راستہ کھول دیتے ہیں۔

Marfat.com

(فرمایا) تیرے رب کی توفیق ہر ایک کو اس کے حال کے مطابق شامل حال ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: نولہ ما تولیٰ جو جدھر جانا چاہتا ہے ہم اسے اسی طرف پھیر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ایمان دنیا و آخرت کی سب سے بڑی دولت ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارا پروردگار جو رحیم و کریم ہونے کے ساتھ ساتھ غیور بھی ہے۔ وہ یہ دولت بغیر طلب کئے کسی کو دے دے یا کوئی نہ چاہتا ہو تو زبردستی اس کا گھر اس دولت سے بھر دے۔ اس لئے فرمایا: اَنُلْزِمُکُمُوْھَا وَاَنْتُمْ لَھَا کٰرِھُوْنَ کیا ہم زبردستی تمہیں ایمان کی دولت دے دیں جب کہ تم اسے پسند بھی نہیں کرتے ہو'۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان تو اپنی کوشش اور اللہ کی توفیق سے ملتا ہے اور جو اس طرف آنے کی زحمت کرنے کیلئے بھی تیار نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے ایمان کی دولت دے دی جائے بلکہ ایمان کی طرف سے کسی کی بے نیازی اگر نفرت اور دشمنی تک پہنچ جائے تو پھر بہت امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی محرومی کے قانون کی گرفت میں نہ آجائے۔ آنحضرت ﷺ نے اسی بات کو ایک حدیث میں نہائت آسان طریقے سے واضح فرمایا:

ان المومن اذا اذنب کانت نکته سوداء فی قلبه فان تاب ونزع واستعتب صقل قلبه وان زادت حتی تعلو قلبه فذلک الران الذی قال الله تعالیٰ کلابل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون.

(مومن جب کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے سبب سے اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے اور اس گناہ سے باز آجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے، تو اس کے دل کا وہ دھبہ صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس کے گناہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی سیاہی اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے)

تو یہ وہ رَین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْ ۔ (ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی چھا گئی ہے) (ابن کثیر بحوالہ ترمذی)

سلف صالحین کے نزدیک بھی ختم قلوب کی یہی حقیقت ہے۔ ابن کثیر نے اعمش کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اعمش کہتے ہیں کہ مجاہد نے ایک مرتبہ ہمیں سمجھایا کہ (صحابہؓ) دل کو اس ہتھیلی کے مانند سمجھتے تھے۔ جب آدمی کسی گناہ میں آلودہ ہوتا ہے تو (انہوں نے اپنی انگلی سکیڑتے ہوئے سمجھایا) دل اس طرح سکڑ جاتا ہے۔ پھر جب مزید گناہ کرتا ہے تو دوسری انگلی کو سکیڑتے ہوئے بتایا۔ دل اس طرح بھینچ جاتا ہے۔ اسی طرح تیسری انگلی کو سکیڑا۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگے تمام انگلیوں کو سکیڑ لیا۔ پھر فرمایا کہ جب دل گناہوں کے غلبہ سے اس طرح بھینچ جاتا ہے تو اس پر مہر کر دی جاتی ہے۔ مجاہد نے بتایا (صحابہؓ) اسی چیز کو وہ رَین قرار دیتے تھے۔ جس کا ذکر کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ الآیہ میں آیا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس بحث کے سلسلے میں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ جو ممکن ہے آپ کے ذہنوں میں بھی کھٹکتا ہو۔ وہ یہ ہے کہ انسانوں کے بگاڑ کی اصلاح اگرچہ ہر دور میں ہوتی رہی، اور اس میں کامیابیاں بھی ہوئیں اور ناکامیاں بھی، لیکن اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کا رسول جب کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو اس کی زوردار شخصیت اور اس کا نہائت موثر کردار اور اس کا دلنشین انداز بیان اور پھر اس پر اترنے والی وحی

Marfat.com

اور اللہ کی طرف سے مسلسل رحمتوں اور انوار کی بارش ہدایت اور اصلاح کیلئے ایک ایسی فضاء پیدا کر دیتی ہے۔ جس کا تصور بھی کسی دوسرے طریقے سے نہیں کیا جاسکتا اور اگر وہ آنے والا رسول آخری رسول ہو اور اس پر اترنے والی کتاب آخری کتاب ہو اور اس طریقے سے اللہ تعالیٰ اہل زمین پر اپنی حجت تمام کر دینا چاہتا ہو تو تصور کیا جاسکتا ہے کہ دلوں کو بدلنے اور طبیعتوں کے اصلاح پذیر ہونے کے کتنے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر لوگ ہدایت قبول کرنے میں تاخیر سے کام لیتے ہیں اور اس دعوت کی مخالفت کیلئے پوری قوت صرف کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے حتی کے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو اپنی مخالفت اور دین سے بےزاری کے باعث اللہ کے اس قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں جس کے بعد وہ قبولیت حق کی ہر استعداد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ تو سوچنا پڑتا ہے کہ آخر ایسی وہ کون سی فکری کج رویاں اور عملی کوتاہیاں ہیں جو انسان کو پیغمبر کی موجودگی میں بھی ہدایت سے محروم رکھتی ہیں۔ ایک انسان گرمیوں کے موسم میں لُو کے تھپیڑے کھانے کے باعث طبیعت کی خوشگواری سے محروم رہے، یا خزاں کے موسم میں جب کہ ہر طرف اداسی چھا جاتی ہے آدمی بے کیفی محسوس کرے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ موسم کا اثر ہے۔ لیکن اگر بہار کا موسم پورے جوبن پر ہو پھول مہک رہے ہوں، خوشگوار ہوائیں چل رہی ہوں، بلبل ہر طرف نغمے بکھیر رہے ہوں، فضا کا ذرہ ذرہ رنگ و آہنگ میں ڈوب چکا ہو، اور رگِ سنگ تک میں لہو کی گردش رواں ہو گئی ہو اور بھینی بھینی فضا میں فرحت و سرور کی پھواریں پھوٹ رہی ہوں۔ ایسی پر اثر کیفیت میں بھی اگر کوئی آدمی طبیعت میں بے کیفی اور ناخوشگواری محسوس کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے کوئی ایسا روگ لگ گیا ہے، جو فرحت و مسرت کے تمام اسباب سے بھی دور نہیں کیا جاسکتا اس کا یا تو علاج ہونا چاہئے اور یا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ شخص خوشیوں سے محروم ہو گیا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا بھی ہے جو پیغمبر کی تشریف آوری اور قرآن پاک کے نزول کے بعد بھی اس کی ہدایت سے استفادہ نہ کر سکے بلکہ اس کے بدترین مخالف ثابت ہوئے یقیناً ان کے اندر کوئی ایسا روگ یا کوئی ایسی بیماری ہے جس نے انہیں ہر بھلائی سے محروم کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو چند چیزیں نمایاں ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم چیز جو اگر چہ اپنے تئیں بہت وضاحت کی محتاج ہے لیکن ہم صرف اس کی نشان دہی ہی کر سکیں گے یہ وہ چیز ہے جسے قرآنِ کریم نے مختلف جگہوں میں حیات دنیا کو حیات آخرت پر ترجیح دینے کے نام سے یاد کیا ہے ایک جگہ فرمایا کہ ان لوگوں کے دلوں پر مہر کی گئی۔ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ (اس سبب سے کہ انہوں نے حیات دنیا کو حیات آخرت پر ترجیح دی)۔ ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا: فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى (پس جس نے سرکشی اختیار کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی، یقیناً اس کا ٹھکانا جہنم ہے)۔ سورۃ الاعلیٰ کی آخری آیات میں بھی اسی حقیقت کو دھرایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں جن لوگوں پر مہر کئے جانے کا ذکر کیا جا رہا ہے ان کی سب سے بڑی بیماری یہی تھی۔ وہ اسی حیات دنیا کو سب سے بڑی حقیقت سمجھتے تھے انہیں آخرت کی زندگی کا نہ یقین تھا اور نہ اس کی فکر۔ دنیا ہی کی زندگی کو مقصد بنانے کے نتیجے میں انہیں ہدایت کی ہر بات سے ضد ہو گئی تھی۔ پھر اسی بنیادی بیماری سے اور کئی بیماریاں پھوٹتی ہیں جس کا وہ لوگ شکار تھے۔ مثلاً اہل کتاب نسلی اور قومی تعصب میں اس حد تک اندھے ہو گئے تھے کہ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ بنی اسرائیل سے باہر کسی پیغمبر کی بعثت ہو۔ اسی طرح قریش مکہ مختلف قبائل کا مجموعہ تھے اور عرب میں اس کے علاوہ بہت سارے قبائل تھے ہر قبیلے کا تعصب انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ کسی دوسرے قبیلے کے پیغمبر پر ایمان لایا جائے۔ مسیلمہ کذاب پر ایک بہت بڑی بھیڑ ایمان لے آئی اور یہ سب لوگ اس کے قبیلے کے تھے اور یا وہ لوگ تھے جو قریش سے بدترین عناد رکھتے تھے اور وہ رسول اللہ ﷺ کو قریش کا رسول سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب بعض ان کے ذمہ دار لوگوں سے کسی صحابی کی بات ہوئی کہ تم نے مسیلمہ کذاب میں آخر کیا خوبی دیکھی کہ اسے رسول مان لیا۔ تو انہوں نے کہا

Marfat.com

کہ ہمارے قبیلے کا جھوٹا نبی، قریش کے سچے نبی سے ہمارے نزدیک زیادہ قابل قبول ہے۔

ان کی فکری اور عملی کج رویوں میں سے ایک یہ بات بھی تھی کہ وہ دولت وسیادت ہی کو ہر طرح کی فضیلت اور خیر کا سرچشمہ سمجھتے تھے اور جہاں انہیں دولت کی نمود دکھائی نہیں دیتی تھی یا کسی طرح کی سیادت کا احساس نہیں ہوتا تھا، تو ایسے شخص کو وہ نبی ماننے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ نبی کریم علیہ السلام سے بھی وہ یہی کہتے تھے کہ اللہ کسی کو اگر نبی بناتا تو یقیناً وہ رؤسائے مکہ یا رؤسائے طائف میں سے کوئی ہوتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان تمام رؤسا اور امراء کو چھوڑ کر تم جیسے غریب آدمی کو نبی بنا دیا جائے یہ ہرگز ممکن نہیں۔

قوموں میں ایک شدید بیماری یہ بھی رہی ہے اور آج بھی ہے اور اس میں پڑھے لکھے اور ان پڑھ کی بھی تقسیم نہیں کہ انسان پیکر محسوس کو ماننے کا خوگر ہے۔ اس لئے اس کیلئے ان دیکھے خدا کو ماننا اور غیب کی باتوں کا یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اصرار کرتا ہے کہ میں تو ہر اس چیز کو مانوں گا جسے میں محسوس کر سکوں یا جو میری عقل کی گرفت میں آسکے۔ ایسی ہی چند در چند بیماریاں دور نبوت کے لوگوں میں تھیں وہ اللہ کے رسول کو دیکھ کر بھی ان بیماریوں کی وجہ سے نہ مان سکے اور آج بھی یہی امراض ہیں جس میں پوری دنیا اور امت مسلمہ بھی گرفتار ہے۔ جس امت مسلمہ کو اس دین کا علم بردار بنایا گیا ہے۔ اسے خود حبّ دنیا کے بحران میں مبتلا کر کے اور آخرت سے لاپرواہ اور بے نیاز کر کے اس طرح ناکارہ بنا دیا گیا ہے کہ اب وہ کہنے کو اللہ اور اس کے رسول اور آپ کے لائے ہوئے دین کی ماننے والی امت ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کا رشتہ اس عظیم دین سے بہت کمزور پڑ چکا ہے۔ وَاِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى

اگلی آیات کریمہ میں کفار ہی کی ایک قسم کو بیان کیا جا رہا ہے۔ جنہیں بالعموم منافقین کہا جاتا ہے۔ ان کی صفات کو تقریباً تیرہ آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ اب ہم ایک ایک آیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا
يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ
فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿١٠﴾
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿١١﴾
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ

Marfat.com

هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا
وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ﴿١٤﴾
اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا
مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ
مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾
صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ
فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ
مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾
يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا
فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ
بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾

رکوع ۲۔ (اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ لوگ دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے حالانکہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اس کا احساس نہیں کرتے۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا ہے، اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے، اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پیدا کرو تو ''جواب دیتے ہیں'' کہ ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا

Marfat.com

کرنے والے ہیں، لیکن یہ محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس طرح ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے، تو کہتے ہیں کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں۔ آگاہ رہو! کہ بیوقوف یہی لوگ ہیں لیکن یہ جانتے نہیں۔ اور جب وہ ملتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی مومن ہیں۔ اور جب اپنے سرداروں کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ ہیں ہم تو ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں o اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دیئے جا رہا ہے، یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت ان کیلئے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔ ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایسی تاریکیوں میں چھوڑ دیا جن میں ان کو کچھ نظر نہیں آتا o یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔ یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو اس میں تاریکیاں ہوں، کڑک ہو اور چمک ہو۔ وہ ٹھونس رہے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑکے کی وجہ سے موت سے ڈر کر حالانکہ اللہ تعالیٰ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو o قریب ہے کہ بجلی اچک لے ان کی آنکھوں کو جب بجلی ان کیلئے چمکتی ہے تو وہ اس میں چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے رک جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو سلب کر لیتا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے) (آیت ۸ تا ۲۰)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ o (البقرة: ۸)

(اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں)

الناس سے کون لوگ مراد ہیں؟

اس آیتِ کریمہ میں **الناس** کا لفظ اگرچہ عام ہے جس میں سب لوگ شامل ہیں۔ لیکن ترکیب کلام سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں پر ایسے لوگوں کا تذکرہ ہو رہا ہے جو نہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کا سب سے پہلے ذکر ہوا اور نہ ان میں سے ہیں جن کا ذکر سابقہ دو آیتوں میں ہوا۔ البتہ سابقہ دو آیتوں میں جن کافروں کا ذکر ہوا ان کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اب جن کا ذکر ہو رہا ہے ان کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے: **وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ جو شخص ایمان نہ رکھتا ہو اور پھر بھی ایمان رکھنے کا دعویٰ کرے یقیناً ایسے شخص کو منافق کہتے ہیں، اس لئے ان کے منافق ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں۔

Marfat.com

نفاق کی مختلف شکلیں

البتہ! جیسے جیسے ہم ان آیات کو پڑھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو ہر آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق کی کوئی ایک شکل نہیں۔ کہیں تو نفاق ایسا ہے جس کو علم و دانش کا نفاق کہنا چاہئے کہ علم و دانش کے زور سے اپنے نفاق پر پردہ ڈال کر اسے ایمان ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کو ایمان نہیں کہتے تو وہ دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آج کے دور میں ایمان کا یہی ماڈل ہے جو قابل قبول ہو سکتا ہے اور کبھی نفاق کی شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی سرے سے اللہ کے رسول کی دعوت کا منکر ہے۔ لیکن بظاہر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ اپنے قبیلے کے لوگوں کی اکثریت کے ایمان لانے کے باعث وہ اپنے آپ کو ایمان کے دعوے کیلئے مجبور پاتا ہے اور کبھی نفاق کی صورت یہ رہی ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی اور آپ ﷺ کی دعوت سے متاثر ہو کر آپ کی صداقت کا قائل تو ہو گیا لیکن ایمان کے نتیجے میں قربانی اور ایثار کی جن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کیلئے وہ اپنے اندر حوصلہ نہیں پاتا اس لئے کبھی اس کا قدم آگے بڑھتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹتا ہے اور کبھی نفاق کی یہ صورت بھی رہی ہے کہ ایک آدمی دل میں اسلام کی صداقت کا قائل ہے۔ لیکن غیر مسلموں سے اپنے تعلقات کی قربانی دینے کیلئے تیار نہیں۔ نفاق کی ان تمام صورتوں کو ذہن میں رکھ کر جب ان آیات کو پڑھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے ماحول میں منافقین کی جتنی قسمیں تھیں اور آئندہ بھی ہو سکتی ہیں ان آیات میں ان سب کی طرف اشارے موجود ہیں۔ اس لئے ہماری ان گذارشات کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو پھر یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ ان آیات میں منافقین ہی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ البتہ اس سے کوئی خاص گروہ مراد نہیں بلکہ اس سے وہ تمام منافقین مراد ہیں جو چاہے تو یہود میں سے ہوں اور چاہے اوس و خزرج میں سے۔

پہلی آیت کریمہ میں معلوم ہوتا ہے کہ ان منافقین کا ذکر کیا جا رہا ہے جو علم و دانش کے زور سے نہ صرف اپنے نفاق پر پردہ ڈال رہے تھے بلکہ مسلمانوں کو اس بات کیلئے قائل کرنے کی کوشش رہے تھے کہ تم جس ایمان پر اصرار کر رہے ہو اس سے مدینہ کے معاشرے میں بڑے مسائل پیدا ہوں گے مدینہ کی وحدت اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ ہماری بات کو قبول کر لیا جائے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت کے دن پر بھی ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارا ایک ہی خدا ہے، وہی ہمارا سب کچھ ہے، اور اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قیامت آئے گی اور ہم اللہ کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کریں گے۔ لیکن جہاں تک تعلق ہے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کا تو چونکہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے اور ہم موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں تو ہمیں نئے نبی اور نئی کتاب پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم حالات کو دیکھتے ہوئے ہماری دلیل کے وزن کو محسوس کرو، ہم تمہیں صاحب ایمان سمجھتے ہیں تم ہمیں صاحب ایمان گروہ کے طور پر قبول کر لو۔ نبی کی دعوت کا مقصود بندوں کو اللہ سے جوڑنا اور اللہ کے سامنے اعمال کی جواب دہی کیلئے تیار کرنا ہے۔ تو جب ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ تو گویا اس مقصود کے ساتھ ہم پہلے سے وابستہ ہیں اگر ہم درمیانی واسطے یعنی تمہارے پیغمبر کو اس لئے تسلیم نہ کریں کہ ہم پہلے ہی ایک پیغمبر کو مانتے ہیں تو اس سے آخر کیا فرق پڑتا ہے۔ قرآن نے ان کی اس دلیل کا پردہ چاک کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

Marfat.com

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْاۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○

(یہ لوگ دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے حالانکہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اس کا احساس نہیں کرتے) (البقرۃ:۹)

خدع اور مخادعت میں فرق

سب سے پہلے تو الفاظ کو دیکھئے یُخٰدِعُوْن کا مصدر مخادعت ہے۔ یہ مفاعلہ کا وزن ہے۔ مفاعلہ کے باب میں فعل جانبین سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ مستقل قاعدہ نہیں کبھی کبھی اس خاصہ سے مجرد ہو کر بھی یہ فعل استعمال ہوتا ہے اور جانبِ واحد سے اس کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ذہن میں رہے کہ اس آیت میں یُخٰدِعُوْنَ (جو مخادعت سے ہے) کا جس طرح استعمال ہوا ہے اسی طرح یَخْدَعُوْن جو خدع سے ہے، اس کا بھی استعمال ہوا ہے ان دونوں کے معنی میں فرق سمجھ لینا چاہئے۔ مخادعت، دھوکا دینے کی ایسی کوشش کو کہتے ہیں جس میں کامیابی کی کوئی امید نہیں ہوتی اور دھوکا دینے والا صرف اپنی حماقت کا ثبوت دیتا ہے اور خدع دھوکا دہی کی ایسی کوشش کو کہتے ہیں جس میں کامیابی کی امید تو ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی ناکامی بھی ہو جاتی ہے۔ تو پہلے فرمایا کہ وہ اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کیلئے مخادعت کو استعمال کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی کوشش ہے جس میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ کو دھوکا دینے میں کون کامیاب ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہو گا کہ وہ اس دھوکا دہی میں خود دھوکا کھا جائیں گے۔ پھر ان کی حماقت کو نمایاں کرنے کیلئے فرمایا وَمَا يَشْعُرُوْنَ ان کی حماقت ملاحظہ کیجئے کہ انہیں اپنی حماقت کا احساس ہی نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک مریض جو علاج سے بچنا چاہتا ہوا سے پکڑ کر اس کے ہمدرد کسی طبیب کے پاس لے جائیں اور طبیب اسے نہایت ہمدردی سے ایک نسخہ لکھ کر دے اور اس کے فوائد کو بیان کرتے ہوئے اس کی افادیت بھی اس پر واضح کرے لیکن یہ مریض چرب زبانی سے اسے یہ یقین دلائے کہ مجھے اس نسخے کے استعمال پر آپ اصرار نہ کریں کیونکہ میں اس سے پہلے ایک بہت اچھے طبیب کا ایک بہت مفید نسخہ استعمال کر رہا ہوں۔ اور باہر نکل کر جی ہی جی میں یا اپنے ملنے والوں کے سامنے خوشی کا اظہار کرے کہ دیکھو میں نے اس معالج کو کس طرح دھوکا دیا۔ غور فرمایئے! اس دھوکا کا نقصان معالج کو ہو گا یا مریض کو۔ وہ بظاہر اسے دھوکا دے رہا ہے لیکن حقیقت میں دھوکا کھا رہا ہے۔

پہلی آیت میں جن اہل دانش کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ کس طرح اپنے مومن ہونے کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں اور اس طریقے سے وہ اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ خود دھوکہ کھا رہے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے۔

ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ان کے اس دعوے کی حقیقت دیکھتے ہیں۔ وہ اللہ کو وحدہٗ لاشریک مانتے ہیں۔ ان کے پیغمبروں اور ان کی کتابوں نے انہیں یہ تعلیم دی تھی کہ اللہ تمہارا صرف خالق ہی نہیں بلکہ وہ تمہارا رب بھی ہے یعنی وہ تمہارا حاکم حقیقی بھی ہے۔ جس طرح اس نے تمہیں تخلیق فرمایا تمہیں زندگی عطا کی، زندگی کی بقاء کے اسباب فراہم کئے، اسی طرح اس نے اپنی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ زندگی گزارنے کیلئے ایک شریعت عطا فرمائی۔ اور اس شریعت کو انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نافذ کرنے کا تمہیں پابند بنایا لیکن تم نے اللہ کو اس طرح مانا کہ عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیا اور کتاب اللہ کی اطاعت کی بجائے تم نے اپنے احبار اور رہبان کو تحلیل و تحریم کے اختیارات دے دیئے۔ اللہ کی حاکمیت کو تم نے بندوں میں تقسیم کر دیا اور اس کے عطا کردہ قانون کو بجائے نافذ

Marfat.com

کرنے کے موم کی ناک بنا کے رکھ دیا۔ مزید تم یہ کہتے ہو کہ ہم آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ تم خوب جانتے ہو کہ آخرت کا دن جزا سزا کا دن ہے۔ جس دن صرف ایمان و عمل کا سکہ چلے گا۔ اللہ کے عدل کی کار فرمائی ہوگی، نیک لوگ جزا پائیں گے اور برے لوگ سزا سے بچ نہیں سکیں گے۔ اس دن یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارا نام و نسب کیا ہے؟ بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ تمہارے ایمان کا حال کیا ہے اور تمہارے اعمال کیسے ہیں ؟ لیکن تم نے آخرت کے دن پر ایمان کو اس طرح بگاڑا کہ تم نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ اپنے بیٹوں اور چہیتوں سے کوئی باز پرس نہیں کرتا اس لئے ہم سے بھی کوئی باز پرس نہیں ہوگی ہمارا اعلیٰ نسب ہمیں ہر طرح کی باز پرس سے محفوظ رکھے گا ہم بڑے سے بڑا جرم بھی کر لیں تو اولاً اللہ کی جانب سے کوئی گرفت نہیں ہوگی اور اگر ہوئی بھی تو چند روز کی سزا کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

غور فرمائیے! جو قوم اپنے نسب اور اپنے انتساب کی وجہ سے اپنے آپ کو حساب کتاب اور جزا اور سزا سے مستغنی سمجھتی ہے اس کا آخر روزِ جزا پر کیا ایمان ہے؟ اس لحاظ سے اگر آپ دیکھیں تو ان کا اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان محض ایک دعویٰ ہے جسے دھوکہ دہی کی واردات سمجھنا چاہئے۔ مزید اس آیت میں ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ کہ وہ مسلمانوں کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ایمان اصل میں اللہ اور روز جزا کو ماننے کا نام ہے اگر وقت کے پیغمبر کو نہ مانا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ہم اللہ اور روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں۔ صرف یہ ہے کہ ہم محمد ﷺ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے۔ تو آپ کو اس پر اصرار نہیں کرنا چاہئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ پر ایمان اور آخرت کے دن پر ایمان پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد ہی قابل اعتبار ٹھہرتا ہے، کیونکہ اللہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ وہ خالق و مالک ہونے کے ساتھ حاکم حقیقی بھی ہے اسے بجا طور پر یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر شریعت نازل کرے اور انہیں پابند کرے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اسے نافذ کریں۔ پھر ایک وقت آئے گا جب اس کائنات کی بساط لپیٹ دے گا اور اپنے بندوں کو اپنی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے پوچھے گا کہ بتاؤ تم نے زندگی میری شریعت کے مطابق گزاری ہے یا نہیں؟ یہ دونوں باتیں ہیں جسے ہم ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کہتے ہیں۔ معمولی غور و فکر سے ہی ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں باتوں کا تعلق پیغمبر کی ذات اور اس پر ایمان لانے سے ہے کیونکہ شریعت پیغمبر ہی پر نازل ہوتی ہے اور اسی کے واسطے سے انسانوں تک پہنچتی ہے۔ اسی کی شخصیت اور اسی کی سنت اس کے ماننے والوں میں عمل کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور آخرت میں جواب دہی کے احساس کو توانا کرتی ہے۔ اب اگر درمیان کی یہ کڑی نکال دی جائے تو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے؟ تو ان لوگوں کا یہ کہنا کہ تم ایمان بالرسول پر اصرار نہ کرو۔ یہ حقیقت میں دھوکہ دہی کی ایک کوشش ہے، جس سے مقصود یہ ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے نام سے فائدہ تو اٹھایا جائے لیکن اس کی حقیقت گم کر دی جائے۔ ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ وہ بھی اپنے پاس شریعت موسوی رکھتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام جیسے رسول کو مانتے بھی تھے تو پھر انہیں مزید رسول ماننے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہود نہ صرف شریعت موسوی یا شریعت تورات کو بگاڑ چکے تھے بلکہ اس کے ایک بڑے حصے کو گم بھی کر چکے تھے اور جو احکام ان کے پاس باقی تھے اسے بھی انہوں نے عمل سے بے گانہ کر کے رکھ دیا تھا اور جیسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کتاب کی اصل حیثیت کو قبول کرنے کی بجائے انہوں نے کتاب کے اختیارات اپنے احبار اور رُہبان کو دے دیئے تھے۔ جہاں تک موسیٰ علیہ السلام پر ایمان کا تعلق ہے ان کی ذات کو تو وہ ضرور مانتے تھے لیکن پیغمبر کو ماننے کا اصل مفہوم تو یہ ہے کہ اس کی سنت پر عمل کیا جائے لیکن موسیٰ علیہ السلام کی سنت کا وجود ہی دنیا سے اٹھ چکا تھا انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے اس حد تک اپنے آپ کو بیگانہ کر دیا تھا کہ خود تورات میں یہ آیت موجود ہے کہ

(موسیٰ اللہ کا بندہ ایک سو بیس سال کی عمر میں کوہِ مؤاب کے دامن میں مر گیا اور اب اس کو اتنا عرصہ گزر گیا ہے کہ اس کی قبر کو بھی کوئی نہیں جانتا)

Marfat.com

اندازہ فرمایئے! جس پیغمبر کے حالات اور جس کی قبر تک کو امت بھول چکی ہو اس پیغمبر پر ایمان کے حوالے سے نئے آنے والے پیغمبر پر ایمان لانے سے انکار کیا معنی رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نئی شریعت لے کر اس لئے تشریف لائے تھے کہ پہلی شریعتیں قابل عمل نہ رہیں اور ان کا زمانہ گزر گیا۔ یہود کیلئے ان باتوں کا سمجھنا کوئی مشکل نہ تھا لیکن وہ جو کہہ رہے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھا اس لئے قرآنِ کریم نے اسے خدع کا نام دیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ یہ اس طرح کی باتوں سے اللہ اور مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں لیکن یہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ان کی یہ ساری کوششیں خدع و فریب کا ایسا جال ہیں جس میں یہ خود پھنستے جا رہے ہیں۔

یہاں ایک بات نوٹ کیجئے کہ یہ بات تو یہود بھی جانتے تھے کہ ہم اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے، اس لئے وہ حقیقت میں اللہ کو نہیں بلکہ مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے تھے لیکن پروردگار نے ان کے مسلمانوں کو دھوکا دینے کو اللہ کو دھوکا دینا قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان جب تک اللہ کے فوج دار اور سپاہی بن کر اللہ کے دین کی چاکری میں لگے رہتے ہیں، اس وقت تک ان کے خلاف ہر سازش اور ہر کوشش کو اللہ تعالیٰ اپنے خلاف کوشش قرار دیتا ہے اور اپنے فضل سے اپنی یہ ذمہ داری بنا لیتا ہے کہ میں دشمن کے تمام برے ارادوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھوں گا۔ جس طرح ہر مہذب اور شریف آدمی اپنے وفادار ملازموں کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور ان کے خلاف کسی بھی کوشش کو اپنے خلاف کوشش قرار دیتا ہے۔ ایسا ہی مسلمانوں اور اللہ کا حال ہے کہ مسلمان جب تک اسی کیلئے جیتے اور مرتے ہیں تو ان کی زندگیوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ اور ان کی عزتوں اور ان کے مفادات کی پاسداری پروردگار کی جانب سے ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پرودگار نے قرآنِ کریم میں اپنے فرماں بردار مسلمانوں کو "حزب اللہ" قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ فیصلہ صادر فرمایا: الا ان حزب اللہ ھم الغالبون خبردار اللہ کی جماعت کے لوگ ہی غالب رہتے ہیں۔

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اس خلش پر بھی نگاہ ڈال لینی چاہئے جو طبیعت میں بار بار سر اٹھاتی ہے۔ کہ آخر یہ لوگ سیدھے طریقے سے ایمان قبول کیوں نہیں کر لیتے؟ اس کا جواب اگلی آیت کریمہ میں دیا گیا ہے۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝

(ان کے دلوں میں بیماری ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا ہے، اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے، اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے) (البقرة:١٠)

مرض کا مفہوم

اب ان کی دکھتی رگ کو چھیڑا جا رہا ہے کہ یہ اپنی بے ایمانی کو جس طرح ایمان کے پردے میں چھپانے کیلئے کوششیں کر رہے ہیں اور بار بار اپنے ایمان کا یقین دلا رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ سب کچھ ان کی ایک خفیہ بیماری کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ بیماری وہ ہے جسے "نفاق" کہا جاتا ہے۔ ان کے اندر حقیقت میں ایمان نہیں بلکہ نفاق ہے۔ نفاق کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ زبان سے کہہ رہے ہیں یہ وہ نہیں جو ان کے دل میں ہے۔ اپنے دل میں وہ پوری طرح عزم کر چکے ہیں کہ وہ اسلام کو قبول کریں گے اور نہ اسے پھیلنے دیں گے۔ لیکن اس کیلئے جو کوششیں کر رہے ہیں وہ ایمان کے عنوان سے کر رہے ہیں تو دل اور زبان کی دو عملی یا بیگانگی ہی کو نفاق کہتے ہیں۔ البتہ ان کا یہ نفاق ان کے اس بغض

Marfat.com

اورعناد کا نتیجہ ہے جو وہ پیغمبر اور مسلمانوں سے رکھتے ہیں۔ یہ عناد جس طرح یہود میں تھا اسی طرح اوس وخزرج کے بعض لوگوں میں بھی تھا۔ان آیات میں اگر چہ زیادہ تر یہود ہی کی طرف اشارے ہیں لیکن ضمناً اوس وخزرج کے منافقین بھی مراد ہیں۔ یہود کا عناد تو ایک تاریخی حقیقت ہے۔ وہ بنی اسمٰعیل یعنی قریش کو کسی طرح بھی اپنے برابر تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ہم اگر حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد ہیں تو قریش حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور یہ دونوں بزرگ آپس میں حقیقی بھائی اور اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن جس طرح خاندانوں میں ایک ہی سلسلہ نسب کے باوجود خاندانی رقابتیں دشمنی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، ایسی ہی کوئی صورت بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل میں ہو گئی تھی اور پھر یہ عجیب اتفاق تھا کہ عرب دنیا کے ایک ایسے جزیرے میں آباد ہونے کی وجہ سے جو دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ وہ متمدن دنیا کی بہت سی ترقیات سے پیچھے رہ گئے تھے۔اس لحاظ سے بھی یہود کو ان پر حرف زنی کا موقع ملتا تھا۔ چنانچہ اسی پشتینی دشمنی کے باعث جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اللہ کے آخری نبی، بنی اسمٰعیل میں پیدا ہوئے ہیں۔ تو انہوں نے انہیں ماننے سے انکار کر دیا اور ہر طرح کی دشمنی کیلئے تیار ہو گئے اور یہی دشمنی کہیں تو کھلے کفر کی شکل اختیار کر گئی اور کہیں دبے کفر کی، جسے نفاق کہا جا رہا ہے اور اسی دشمنی نے انہیں ہر خیر کی بات قبول کرنے سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن ایسی ہی دشمنی کے آثار جو حق سے محرومی کا باعث بن جائے، ہم مدینہ کے بعض لوگوں میں بھی دیکھتے ہیں۔

عبداللہ بن ابی اور ان کے ساتھیوں کا نفاق کسی سے ڈھکا چھپا نہیں وہ بظاہر ایمان لائے مسلمانوں کے ساتھ نمازیں پڑھیں، بعض دفعہ جہاد میں بھی شریک ہوئے لیکن جب بھی ان کو موقع ملا انہوں نے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ ہم صرف ایک واقعہ کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ایک دن سواری پر سوار عبداللہ بن ابی کی نشست گاہ کے سامنے سے گزرے۔ سواری کے قدموں سے دھول اڑی تو اس نے منہ پر کپڑا ڈال لیا۔ حضور ﷺ نے سواری سے اتر کر سلام کہا اور قرآن پاک کی کچھ آیات سنائیں۔ تو عبداللہ بن ابی نے نہائت بے زاری سے کہا کہ ارے شخص! جو آدمی تمہارے پاس جائے تم اسے اپنی بات سناؤ لیکن ہمارے پاس آ کر ہمیں تنگ نہ کرو۔ آنحضرت خاموشی سے وہاں سے چل دیئے اور خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے چہرہ مبارک پر تکدر کے آثار دیکھے تو سبب دریافت کیا۔ تو آپ نے عبداللہ بن ابی کی گفتگو کو اس کے سامنے دھرایا۔ تو حضرت سعد نے عرض کیا کہ حضور عبداللہ کے ساتھ نرمی فرمایئے، آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہم نے اسے مدینے کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کا تاج بننے کیلئے دے دیا تھا اس کی بادشاہت چند دنوں کے فاصلے پر تھی کہ آپ تشریف لے آئے اور اس کا سارا کھیل بکھیڑا ہو گیا۔ وہ ابھی اپنے اس صدمے کو نہیں بھولا اور چونکہ اس کا سبب آپ کو سمجھتا ہے اس لئے آپ سے عناد رکھتا ہے۔ آپ اس کی اس کمزوری سے درگزر فرمائیں۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح یہود دشمنی کے باعث نفاق کا شکار ہوئے اور مسلسل جھوٹ بولتے رہے کہ ہم بھی مسلمان ہیں البتہ فرق صرف نئی نبوت پر ایمان لانے کا ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی بھی ایسے ہی عناد کا شکار تھے۔ ان کا چونکہ نہ الگ خاندان تھا اور نہ الگ قلعہ بند گڑھیاں۔ اس لئے وہ منافق ہوتے ہوئے پوری طرح مسلمانوں کے ساتھ اسلامی عبادات اور معمولات میں شریک رہتے تھے۔ لیکن یہود چونکہ اپنا ایک حفاظتی حصار رکھتے تھے اس لئے اپنے نفاق کے اظہار میں نسبتاً آزاد تھے۔ لیکن جھوٹ بولنے میں اور جھوٹ کے طور پر اپنے آپ کو مومن کہنے میں دونوں شریک تھے۔ اس لئے آیت کے آخر میں فرمایا کہ ان کے جھوٹ کے باعث قیامت کے دن ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

Marfat.com

کسی بھی معاشرے کی اصلاح کیلئے قلبی افکار دماغی احساسات اور جسمانی اعمال میں یکسانی اور ہم آہنگی ضروری ہے۔ اگر ان میں بُعد یا تصادم کی کیفیت جاری رہے تو نہ ایک سوسائٹی وجود میں آتی ہے اور نہ معاملات میں یک رنگی اور استواری پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ یہ تصادم جیسے جیسے شدید ہوتا جاتا ہے۔ ویسے ویسے مفسد قوتوں کو کام کرنے کے مواقع آسانی سے ملتے ہیں۔ یہود و منافقین سے آنحضرت یا مسلمانوں کی جانب سے جب یہ کہا جاتا تھا کہ تم بظاہر اپنے آپ کو مومن کہتے ہو لیکن ساتھ ہی نبوت سے انکار کے باعث قیادت کا فقدان پیدا کر رہے ہو اور پیغمبر کی شخصیت اس کی لائی ہوئی شریعت اور اس کے پیدا کردہ تعامل سے جو ایک قومی تشخص ابھرتا ہے تم مسلسل اس کو نقصان پہنچا رہے ہو اور اوس وخزرج کے منافقین سے کہا جاتا کہ تم بظاہر ہر کام میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو لیکن تمہاری الگ نشستیں تمہارے رویوں کی سرد مہری، اور دینی کاموں میں تمہاری بے دلی، دینی احساسات کو توانا کرنے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتی جارہی ہے اور اس سے معاشرے میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ تو جواب میں یہ کہتے کہ ہم تو درحقیقت مدینے کے ماحول کو سازگار رکھنے کیلئے ایک رواداری کی فضا پیدا کر رہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں طویل مدت سے اکٹھا رہنے کے باعث جو شیرازہ بندی کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ اگر ہم نے اپنی اپنی بات پر اصرار جاری رکھا تو یہ شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو ہماری نیت اصلاح کی ہے فساد پیدا کرنے کی نہیں۔ اس کے جواب میں ان منافقین کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ جو لوگ بھی ایسا کہتے ہیں حقیقت میں وہ مفسد ہیں مصلح نہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ (البقرة: ۱۱ تا ۱۲)

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پیدا کرو تو "جواب دیتے ہیں" کہ ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں، لیکن یہ محسوس نہیں کر رہے ہیں)

فسادفی الارض کی حقیقت

کسی بھی ادارے کی کامیابی کا دارومدار صرف ایک بات پر ہے کہ اس ادارے میں حکم اس شخصیت کا چلے جو اس ادارے کی مالک اور اس ادارے کی حقیقی سربراہ ہو اور اگر ایسا نہ ہو، تو پھر اس ادارے کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ بالکل اسی طرح اس زمین کے صلاح و فساد کا انحصار صرف اس چیز پر ہے کہ اس کے اندر کس کا حکم اور کس کا قانون چلتا ہے، اس کے حقیقی خالق و مالک کا، یا کسی اور کا۔ اگر اس کے خالق و مالک کا حکم چلتا ہے، تو اس سے زمین پر امن و عدل کی بہار آئے گی اور ایک ایسا نظام قائم ہوگا، جس سے خیر و فلاح کی برکتیں ظہور میں آئیں گی اور اگر صورت اس کے برعکس ہو، تو اس کے ہر گوشہ میں فساد رونما ہوگا۔ اگرچہ اس فساد کو تہذیب و تمدن کے کتنے ہی خوشنما ناموں سے موسوم کیا جائے۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ اس زمین میں اللہ کا قانون جاری کرنا چاہتے ہیں، اس وجہ سے ان کی جدوجہد اس زمین کی اصلاح کی حقیقی جدوجہد ہوتی ہے اور اس کی مخالفت کی راہ میں ہر قدم فساد کا قدم ہے، خواہ وہ بظاہر کتنے ہی نیک ارادہ سے اٹھایا جائے۔ یہود حق و باطل کی آمیزش سے ایک نظام برپا کرنا چاہتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ آگ اور پانی کے ملاپ سے کبھی اصلاح کی امید نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ اس کی اصلاح کی واحد صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جائے۔

Marfat.com

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○ (البقرة. ۱۳)

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس طرح ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے ،تو کہتے ہیں کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں۔آگاہ رہو! کہ بے وقوف یہی لوگ ہیں لیکن یہ جانتے نہیں)

اس آیت کریمہ میں مندرجہ ذیل باتیں غور کی دعوت دیتی ہیں۔

۱۔ اس آیت میں خطاب کن لوگوں سے ہے؟

۲۔ یہاں ایمان سے کیا مراد ہے؟

۳۔ الناس کون لوگ ہیں؟

۴۔ السفهاء سے کون لوگ مراد ہیں؟

۵۔ قرآنِ کریم نے جن لوگوں کو سفہاء کہا ان کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ وہ نہیں جانتے۔سوال یہ ہے کہ وہ کیا نہیں جانتے؟

اب ہم اسی ترتیب سے ان نکات کی وضاحت کرتے ہیں۔

۱۔ میں اس سے پہلے یہ گزارش کر چکا ہوں کہ ومن الناس سے منافقین کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔یہاں بھی مخاطب منافقین ہی ہیں۔کیونکہ منافق ہی ایسا شخص ہوتا ہے۔جو ایمان لانے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن وہ اپنے دعوے میں مخلص نہیں ہوتا۔کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ دھوکہ دینے یا سازش کی نیت سے زبان سے ایمان کا اقرار کرتا ہے لیکن اس کے دل پر پوری طرح کفر کی حکمرانی ہوتی ہے۔لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک چوراہے پر کھڑا ہوتا ہے۔ایک طرف گزری ہوئی زندگی کا پورا سرمایہ ہے جو اس نے کفر کی رفاقت میں گزارا ہے اور دوسری طرف اسلام کی دعوت ہے جو اس کے دل و دماغ کو اپیل کر رہی ہے۔لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ میں کدھر جاؤں۔اسلام کی طرف جانا چاہتا ہے تو اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات اس کا راستہ روک دیتی ہیں اور پرانے علاقات کا توڑنا خطرناک معلوم ہوتا ہے،کفر سے وابستہ رہنا چاہتا ہے تو طبیعت یکسو نہیں ہوتی۔معلوم ہوتا ہے یہ دوسری طرح کے لوگ ہیں جن سے یہاں خطاب فرمایا جا رہا ہے کہ تم ایمان لانا چاہتے ہو یا تم نے ایمان کا اقرار کر لیا ہے تو پھر ایمان کو محض زبان کے اقرار تک محدود نہ رکھو بلکہ ایمان کی حقیقت بھی اپنے دل اور اپنے عمل میں پیدا کرو۔اس طرح کے لوگ ممکن ہے یہود میں بھی ہوں۔لیکن ان کی ایک بڑی تعداد اوس وخزرج میں موجود تھی،جن کا رئیس عبداللہ بن ابی تھا۔

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں خطاب یہود کو ہے کیونکہ یہ ایک مخصوص مفہوم میں (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) اپنے آپ کو مومن کہتے تھے۔لیکن جب انہیں حقیقی ایمان کی دعوت دی جاتی تو ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور وہ بھڑک اٹھتے اور مسلمانوں پر تعریض کرنے لگتے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں مسلمانوں کی طرح مومن کہلانا بھی گوارا نہ تھا اور پھر وہ یہ باتیں چھپ کر نہیں صراحۃً مسلمانوں کے منہ پر کہتے تھے۔میری عاجزانہ گزارش یہ ہے کہ وہ اگر اس طرح کی باتیں پوری صراحت سے کہتے اور اعلانیہ مسلمانوں کو ہدفِ تنقید بناتے تو قرآنِ کریم کو ان کا نام لینے میں کیوں تامل ہوتا۔غائب کے صیغے سے ان کا ذکر کرنا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ لوگ اپنے عقائد اور خیالات کا کھل کر اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنی الگ مجلسوں میں آپس میں اس طرح کی باتیں کرتے تھے اور یہ بات

Marfat.com

تاریخ کے ریکارڈ پر ہے کہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی مسلمانوں کی مجلسوں میں بالکل مسلمانوں کی طرح گھل مل کر بیٹھتے اور مجلسِ مشاورت میں بڑھ چڑھ کر اپنے اخلاص کا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ۔لیکن جب علیحدہ انہیں مجلس جمانے کا موقع ملتا تو وہاں دل کے پھپھولے پھوڑتے ۔غزوہ بنی المصطلق میں پیش آنے والا واقعہ متعدد مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔ آنحضرت ﷺ اس غزوہ سے فارغ ہو کر ابھی چشمہ مُریسیع پر قیام فرماتھے کہ کچھ لوگ پانی لینے گئے۔ان ہی میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایک مزدور بھی تھا، جس کا نام جہجاہ غفاری تھا۔ پانی پر ایک اور شخص سنان بن وبر جھنی سے اس کی دھکم دھکا ہوگئی اور دونوں لڑ پڑے۔ جُھنی نے پکارا: یامعشر الانصار (انصار کے لوگو! مدد کو پہنچو) اور جہجاہ نے آواز دی: یا معشر المهاجرین: (مہاجرین! مدد کو آؤ) رسول اللہ ﷺ (خبر پاتے ہی وہاں تشریف لے گئے اور فرمایا: ''میں تمہارے اندر موجود ہوں اور جاہلیت کی پکار پکاری جارہی ہے؟ اسے چھوڑ دو یہ بدبودار ہے''

اس واقعہ کی خبر عبداللہ بن ابی ابن سلول کو ہوئی تو غصہ سے بھڑک اٹھا اور بولا: ''کیا ان لوگوں نے ایسی حرکت کی ہے؟ یہ ہمارے علاقے میں آ کر اب ہمارے ہی حریف اور مدمقابل ہو گئے ہیں۔'' خدا کی قسم ہماری اور ان کی حالت پر تو وہی مثل صادق آتی ہے جو پہلوں نے کہی ہے کہ اپنے کتے کو پال پوس کر موٹا تازہ کرو تا کہ وہ تمہیں کو پھاڑ کھائے۔ سنو! خدا کی قسم! اگر ہم مدینہ واپس ہوئے تو ہمیں کا معزز ترین آدمی ذلیل ترین آدمی کو نکال باہر کرے گا۔'' پھر حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر بولا ''یہ مصیبت تم نے خود مول لی ہے۔ تم نے انہیں اپنے شہر میں اتارا اور اپنے اموال بانٹ کر دیئے۔ دیکھو! تمہارے ہاتھوں میں جو کچھ ہے اگر اسے دینا بند کر دو تو یہ تمہارا شہر چھوڑ کر کہیں اور چلتے بنیں گے۔''

اس وقت مجلس میں ایک نوجوان صحابی حضرت زید بن ارقم بھی موجود تھے۔ انہوں نے آ کر اپنے چچا کو پوری بات کہہ سنائی نے انہوں رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے انہوں نے آنحضرت سے عرض کی کہ آپ عباد بن بشیر کو حکم دیجئے کہ وہ عبداللہ بن ابی کو قتل کر دے۔ آپ نے فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ! یہ بات مناسب نہیں لوگ کہیں گے محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ جب عبداللہ بن ابی کو اس بات کا علم ہوا تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اللہ کی قسم کھا کر کہنے لگا کہ آپ تک جو بات پہنچی ہے نہ میں نے وہ بات کہی اور نہ میں ایسی بات زبان پر لا سکتا ہوں۔ اس وقت وہاں انصار کے کچھ لوگ موجود تھے، انہوں نے بھی کہا کہ زید بن ارقم ابھی لڑکا ہے، ممکن ہے اسے وہم ہو گیا ہو اور اس شخص نے جو کچھ کہا ہے، اسے ٹھیک ٹھیک یاد نہ رکھ سکا ہو۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن ابی کی معذرت قبول فرمالی۔ حضرت زید بن ارقم کا بیان ہے کہ اس پر مجھے ایسا غم لاحق ہوا کہ میں ایسے غم سے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ میں صدمے سے اپنے گھر میں بیٹھ رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المنافقون نازل فرمائی اور اس میں منافقین کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس سورۃ میں منافقین کے بارے میں کسی حد تک تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن ہم صرف دو آیتوں کے دو حصے نقل کرتے ہیں۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا

(یہ منافقین وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں ان پر خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ چلتے بنیں) (منافقون۔ ۷)

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ

(یہ منافقین کہتے ہیں اگر ہم مدینہ واپس ہوئے تو اس سے عزت والا ذلت والے کو نکال باہر کرے گا)۔ (منافقون:۸)

Marfat.com

حضرت زید﷜ کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلوایا اور یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ پھر فرمایا اللہ نے تمہاری تصدیق کردی۔ اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مخاطب کون لوگ ہیں۔

۲۔ ایمان کی تعریف تو ایمان بالغیب کے سلسلے میں گزر چکی ہے۔ اسے اگر آپ پیشِ نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ محض زبان سے ایمان کا اظہار کافی نہیں بلکہ اللہ کے یہاں جو ایمان قابل اعتبار ہے وہ وہ ہے جس میں دل کی تصدیق اور احکام پر عمل کا جذبہ بھی موجود ہو۔ جو ایمان حالات کے تابع نہ ہو بلکہ حالات اس کے تابع ہوں۔ جو مفادات سے متصادم ہونے کے وقت سپر انداز نہ ہو بلکہ مفادات اس کے سامنے سپر انداز ہو جائیں۔ حالات کیسے ہی منہ زور اور نا مساعد کیوں نہ ہوں ایمان میں کسی طرح کا نقص واقع نہ ہونے پائے۔ یہ منافقین چونکہ حالات کے تیور دیکھ کر ایمان میں کمی بیشی کرتے رہتے تھے۔ اس لئے انہیں فرمایا جا رہا ہے کہ تم ظاہری ایمان نہیں بلکہ حقیقی ایمان لاؤ۔ اس کی تائید قرآنِ کریم کے مختلف آیات سے ہوتی ہے۔ ہم صرف ایک آیت کا حوالہ دیتے ہیں۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ۔ اللہ، اس کے رسول اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے)

اس آیت میں بھی غور فرمائیے صاحب ایمان لوگوں کو ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تمہارا یمان صرف زبان کا جمع خرچ ہے، لیکن یہ حقیقی ایمان نہیں، جب تک تم حقیقی ایمان نہ لاؤ اس ایمان کا اعتبار نہیں: ؎

زباں سے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس آیت میں ''الناس'' سے کون مراد ہیں؟

۳۔ سوال یہ تھا کہ ہر ایمان والا یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میرا ایمان حقیقی ایمان ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے کہا کہ تم اس طرح ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں الناس یعنی لوگوں سے مراد وہی لوگ ہیں۔ جو اس وقت تک ایمان لا چکے تھے۔ جنہیں ہم مہاجرین اور انصار کہتے ہیں۔ انہی کی طرف انگلی اٹھا کر کہا جا رہا ہے کہ تم اگر یہ جاننا چاہتے ہو کہ حقیقی ایمان کے نمونے کیا ہیں۔ جس کی نقل تمہیں کرنی ہے۔ وہ یہ لوگ ہیں جو پہلے ایمان لا چکے ہیں۔ اور جن کا ایمان ہر آزمائش میں پورا اتر چکا ہے۔ مکہ میں جو لوگ ایمان لائے انہوں نے سالہا سال تک ایمان کی قیمت ادا کی۔ انہیں مارا پیٹا گیا، ادھیڑا کھدیڑا گیا، ان کے کاروبار تباہ ہو گئے، ایمان سے وابستگی کے باعث نہ جانے کتنے رشتے چھوٹ گئے۔ حتیٰ کہ اسی ایمان کی خاطر انہوں نے مال و دولت اور آرام کی زندگی چھوڑ کر غربت اور بے وطنی کو اختیار کیا۔ گھر سے بے گھر ہو گئے، مدینہ اس حال میں آئے کہ نانِ شبینہ تک کے محتاج ہو گئے، کتنے ایسے لوگ تھے جن کے بیوی بچے ان سے الگ ہو گئے۔ لیکن ایمان کا رشتہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پایا۔ دوسری مثال اس حقیقی ایمان کی انصار مدینہ ہیں اور مہاجرین کی طرح یہ بھی الناس کا مصداق ہیں۔ انہوں نے ایمان کی قیمت ادا کرتے ہوئے نصرت اور ایثار کو نئے معنی پہنائے اور قربانی اور جاں فروشی کی ایسی روشن مثالیں قائم کیں کہ جس کی مثال تاریخ کیلئے پیش کرنا آسان نہیں۔ باہر سے آنے والے مسلمانوں کیلئے انہوں نے اپنے گھر ہی نہیں کھولے بلکہ اپنے دلوں کے دروازے بھی کھول دیئے اپنی ہر چیز مہاجرین کی خدمت میں پیش کر دی اور آنحضرت ﷺ کی رفاقت اور پیروی میں ہر قربانی دینے کیلئے تیار

Marfat.com

ہو گئے۔ یہی لوگ ہیں جنہیں نمونہ اور آئیڈیل ٹھہرا کر حکم دیا جارہا ہے کہ تم اگر سچے اور کھرے مومن بننا چاہتے ہو تو تمہیں ان لوگوں کی طرح ایمان لانا چاہیئے اور ایمان کے بعد جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان لوگوں کی طرح انہیں ادا کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔

۴۔ یہی لوگ ہیں جنہیں منافقین نے سفہاء قرار دیا۔ سفہاء سفیہ کی جمع ہے۔ سفیہ کا معنی ہے ''بے وقوف'' منافقین کا کہنا یہ تھا کہ ہم ایمان تو لے آئے ہیں یعنی ہم نے اللہ اور اس کے رسول کو مان لیا ہے۔ اب ہم سے یہ توقع کرنا کہ ہم اس طرح سے ایمان لائیں جس طرح سے مہاجرین اور انصار ایمان لائے ہیں۔ یہ ہم سے نہیں ہوسکتا کیونکہ ایمان لانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم اپنی عقل کے تقاضوں کو بھول جائیں۔ عقل آدمی کو خود آگاہ بناتی ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنی ذات اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنا سکھاتی ہے۔ لیکن ہم ان لوگوں کو دیکھتے ہیں انہیں اپنے ایمان اور دین کے مقابلے میں نہ اپنی ذات کی پرواہ ہے اور نہ اپنے مفادات کی۔ اپنی ذات اور اپنے مفادات سے بے گانہ ہوجانا یہ تو سفاہت بے وقوفی اور دیوانہ پن ہے۔ یہ ہم کیسے کرسکتے ہیں؟ مسلمانوں کا سب سے بڑا آدمی ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے۔ وہ اپنا سارا مال و متاع اسلام کیلئے لٹا چکا ہے۔ اسلام لانے سے پہلے وہ امیر کبیر تھا اور اب وہ ایک فقیر آدمی ہے، اس نے اپنی چار نسلیں اسلام کے حوالے کردی ہیں۔ حق و باطل کے پہلے معرکے میں جب کہ اس کے ایک بیٹے عبدالرحمٰن ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے جنگِ بدر کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ابا جان جنگِ بدر میں آپ کئی مرتبہ میری تلوار کی زد میں آئے۔ لیکن میں نے پدری رشتے کا لحاظ کیا اور تلوار کھینچ لی۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیٹا اگر تم میری تلوار کی زد میں آتے تو کبھی بچ کر نہ جاتے کیونکہ ایمان اللہ اور رسول سے ایک ایسے رشتے کا نام ہے جس کے مقابلے میں ہر رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ منافقین کا کہنا یہ تھا کہ ان کے سب سے بڑے آدمی کی دیوانگی کا عالم یہ ہے تو کیا ہم ان پاگلوں اور دیوانوں کی طرح ایمان لے آئیں۔

مقاصد اور ضروریات میں فرق نہ کرنا فتنہ ہے

۵۔ پروردگار نے منافقین کے جواب میں فرمایا کہ ''قیامت تک آنے والے انسانو! اس بات سے خبردار ہو جاؤ کہ منافقین کا مسلمانوں کو بے وقوف قرار دینا اور خود اپنے آپ کو عقلمند سمجھنا اور اپنی روش کو مبنی بر عقل قرار دینا ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ جو ہمیشہ حق و باطل کا فیصلہ کرنے میں رکاوٹ بنے گا اور اس میں مبتلا ہونے والے لوگ ہمیشہ حق سے محروم رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں ایک بہت بڑا سوال ہے جس کے حل کرنے پر انسانی روش اور انسانی رویے کے تعین کا دار و مدار ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی کے کوئی مقاصد بھی ہیں یا حیوانوں کی طرح انسان بھی ضروریات زندگی کے حصول ہی میں زندگی گزار دینے کیلئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ جس طرح ایک حیوان ساری زندگی بنیادی ضرورتوں کے حصول اور اس سے متمتع ہونے میں گزار دیتا ہے۔ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے، پالتا ہے، موسم کی شدت سے بچنے کے لئے بھٹ بناتا ہے، اور اسی مصروفیت اور دلچسپی میں موت کا شکار ہوجاتا ہے۔ اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ مجھے کیوں زندگی ملی ہے زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ ان مقاصد کے بارے میں کبھی زندگی عطا کرنے والا باز پرس بھی کرے گا یا نہیں؟ اگر تو انسانی زندگی اسی حیوانی زندگی کا دوسرا نام ہے کہ وہ کھائے پیئے، بچے پیدا کرے، عیش و عشرت کے سامان مہیا کرے اور پھر اسی عیش میں ساری زندگی گزار کے عالمِ آخرت کو سدھار جائے۔ تو پھر تو منافقین کی بات صحیح ہے اور مسلمان واقعی دیوانے ہیں۔ لیکن اگر انسانی زندگی کے کوئی مقاصد بھی ہیں اور ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ان مقاصد کے بارے میں جواب دہی کرنا ہوگی تو پھر فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ جب ان مقاصدِ زندگی کے مطابق زندگی گزارنا مشکل بنا دیا جائے اور ایک ایسی کشمکش شروع ہوجائے جس میں مقاصد زندگی کی بقاء اور

Marfat.com

اس پر عمل کرنے کیلئے جنگ لڑنی پڑے تو پھر عقل کا تقاضا کیا ہے؟ کہ اپنے آرام وراحت کو بچانے کی فکر کی جائے ،ضروریات زندگی اور تکلفات زندگی سے متعلق ایک ایک چیز کی حفاظت کی جائے یا یہ فیصلہ کیا جائے کہ چونکہ انسانی زندگی مقاصد سے عبارت ہے اور انہیں مقاصد کے مطابق زندگی گزارنا اور ان مقاصد کا احیاء کرنا اور آئندہ نسلوں کیلئے انہیں قیمتی سرمائے کے طور پر چھوڑ جانا یہ وہ اصل ذمہ داری ہے جو مجھے بہرصورت انجام دینی ہے۔ اگر زندگی کی آسانیوں کے ساتھ یہ ذمہ داری نبھ سکے تو بہت بہتر ورنہ مسلمہ اصول کے مطابق ضروریاتِ زندگی کو قربان کیا جائے گا اور مقاصدِ زندگی کو بچانے کی کوشش کی جائے گی۔

اس مسلمہ اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اس راستے میں اگر بھوکا رہنا پڑے تو بھوکا رہا جائے ، کاروبار میں نقصان ہو تو اسے شوق سے برداشت کیا جائے ، اس کیلئے جو بھی مصیبت اٹھانی پڑے اسے خندہ پیشانی سے قبول کیا جائے ۔ اسی کو ایثار اور قربانی کہتے ہیں ۔ کبھی اس کا حق مال دے کرادا ہوتا ہے، کبھی آرام کو قربان کرکے اور کبھی جان وتن کی آزمائش سے گزر کر اور یہی وہ روش اور رویہ ہے جس پر ہمیشہ قومیں فخر کرتی رہی ہیں وطن کی حفاظت میں جان دے دینا سچائی کی خاطر کٹ مرنا ، آزادی کے حصول کیلئے سب کچھ لٹا دینا ، اور جن باتوں اور جن حقائق کو آدمی دیانت داری سے حق سمجھتا ہو اس کیلئے سب کچھ قربان کر دینا یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے ، جس پر پوری انسانی تاریخ شاہد ہے ۔ ہر قوم اپنے شہداء کو خراج تحسین پیش کرتی ہے ۔ حالانکہ موت کو زندگی پر ترجیح دینے سے بڑھ کر دیوانگی کیا ہو گی ۔ زندہ رہنا عقل کا تقاضا ہے ۔ موت قبول کر لینا یقیناً اس تقاضے کی مخالفت ہے ۔ لیکن کسی صداقت اور کسی مقصد کی خاطر موت قبول کرنا نہ صرف فرزانگی ہے بلکہ وہ ہمیشہ قابل تعریف سمجھی گئی ہے ۔ سوال یہ نہیں ہے کہ آدمی زندہ رہتا ہے یا مرتا ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ وہ زندہ ہے تو کیوں اور مرتا ہے تو کس کی خاطر؟ اگر وہ مقصد کیلئے زندہ رہتا ہے تو یہ زندگی مبارک ہے اور اگر وہ مقصد ہی کیلئے جان دے دیتا ہے تو یہ جان دے دینا درحقیقت زندگی کی حفاظت کا راستہ کھولنا ہے ۔ کیونکہ مقاصد کے زندہ رہنے سے زندگی محفوظ ہوتی ہے اور مقاصد کے مٹ جانے سے زندگی تباہ ہو جاتی ہے ۔ انسانی جان کا احترام نہ رہے تو انسانوں کے زندہ رہنے کی کوئی ضمانت نہیں ۔ انسانی مال امانت نہ سمجھا جائے تو خیانت ، چوری اور ڈاکے روکنے کی کوئی صورت نہیں ۔ عزتیں محترم نہ رہیں تو کسی کی عزت باقی رہنے کی کوئی گارنٹی نہیں ۔ شرم وحیاء اٹھ جائے تو عفتوں کے فانوس بجھنے سے کوئی نہیں روک سکتا ۔ یہی حال تمام ان صداقتوں کا ہے جو مقاصدِ زندگی سے جنم لیتی ہیں ۔ ان مقاصد کی حفاظت کیلئے ہر طرح کی قربانی دینا عقل کا تقاضا بھی ہے اور ایمان کا بھی ۔ اور یہی قربانی جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں حقیقت میں زندگی بھی ہے اور زندگی کی ضمانت بھی ۔ اقبال مرحوم نے اسی حقیقت کو آسان کرتے ہوئے کہا ۔

بر تر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشۂ و سنگِ گراں ہے زندگی

یہ وہ حقیقت ہے جو قرآنِ کریم نے اس آیت کریمہ میں نمایاں کی ہے ۔ کہ عقل والے وہ ہیں جو زندگی کو مقاصدِ زندگی سے ناپتے ہیں ۔ ان کے یہاں اصل پیمانہ امروز وفردا یا سود وزیاں نہیں بلکہ مقاصد زندگی سے وابستگی اور انہیں کو بالا بلند کرنے کی کوشش ہے ۔ اس راہ میں جو بھی مشکل پیش آئے وہ اس راستے کی سنت ہے جسے سامانِ سفر سمجھنا چاہیے ۔ اور جو یہ سمجھتا ہے کہ زندگی صرف کھانے پینے اور دادِ عیش دینے کا نام ہے وہ درحقیقت دیوانہ ہے وہ نہیں جانتا کہ عقل کے صحیح تقاضے کیا ہیں ۔ اور اس کو اندازہ نہیں کہ اگر اس تصور کو قبول کر لیا جائے تو اس زمین پر حقیقی انسانی زندگی ختم ہو جائے گی اور یہ زمین انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں بلکہ حیوانوں کا جنگل ہو گا جس میں حیوانیت کی حکومت ہو گی ۔

Marfat.com

انسانی زندگی کی یہ کمزوری ہے کہ انسان اگرچہ نصیحت سے سیکھتا ہے اور حقائق کو قبول کرتا ہے لیکن جب تک اس کے سامنے ان حقائق کا کوئی عملی نمونہ نہ آئے اسے پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا۔ پیش نظر آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کے نمونے کے طور پر الناس کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان کے حوالے سے منافقین سے فرمایا کہ تم اگر واقعی مومن بننا چاہتے ہو تو تمہیں اس طرح ایمان لانا چاہیئے جس طرح یہ لوگ ایمان لائے اور لوگوں سے ظاہر ہے صحابہ کرام مراد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام کو ایمان اور ایمانی زندگی کیلئے ایک آئیڈیل اور نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف ظاہر کو نہیں بلکہ دلوں کے بھید بھی جانتا ہے وہ ہر آدمی کے اندر پوشیدہ خیانتوں سے بھی واقف ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون دعویٔ ایمان میں سچا ہے اور کون جھوٹا۔ اس کی طرف سے صحابہ کو ایمان کا نمونہ اور آئیڈیل قرار دینا اتنا بڑا اعزاز ہے جس سے بڑے اعزاز کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ صحابہ کرام ﷺ کے بعد بھی بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں جن کے احترام میں ہماری گردنیں جھکی رہتی ہیں۔ لیکن ہم ان کے بارے میں عقیدت و محبت سے بھرپور جذبات رکھتے ہیں۔ وہ محض ہمارے حسن ظن کی وجہ سے ہیں ورنہ یقین سے کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ہم دل میں چھپی ہوئی باتوں اور شخصیت کی گہرائیوں سے ہرگز واقف نہیں ہو سکتے اس لئے پروردگار کا صحابہ کرام کے بارے میں یہ سرٹیفکیٹ ان کے لئے تو ایک بڑا اعزاز ہے ہی ہمارے لئے ایک بہت بڑے اطمینان کا باعث ہے کہ ہم جب بھی اپنے دین و شریعت کے کسی معاملے میں شک وشبہ یا اختلاف کا شکار ہوں تو ہمارے لئے کس قدر آسانی پیدا ہوگئی ہے کہ ہم صحابہ کرام کو دیکھیں کہ وہ اس بارہ میں کیا کہتے ہیں اور اس سے متعلق ان کا طرز عمل کیا ہے۔ اور یہ بات بھی یاد رہے کہ قرآن کریم نے صرف اسی جگہ صحابہ کا حوالہ نہیں دیا بلکہ اور بھی کئی جگہ وضاحت سے صحابہ کو آئیڈیل کے طور پر پیش فرمایا۔ مثلاً فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ''اگر وہ ایمان لائیں اُس ایمان کی مانند جس طرح اے صحابہ تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پا گئے''۔ اس آیت کریمہ کو دیکھ لیجئے لوگوں کے ایمان کیلئے صحابہ کرام کے ایمان کو سند کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی مختلف مواقع پر اپنے اصحاب کیلئے ایسے ہی خیالات کا اظہار فرمایا۔ خلفاء راشدین کے بارے میں فرمایا: عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّتِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْن ''تم لازم پکڑو میرے طریقے کو اور خلفاء راشدین کے طریقے کو''، یعنی خلفاء راشدین کا طریقہ بالکل میری سنت کے مطابق اور اس کا عکاس ہے۔ تمہیں جہاں میری سنت نہ ملے لیکن چاروں خلفاء میں سے کسی ایک خلیفہ کی بھی سنت مل جائے تو وہ تمہارے لئے دین ہے اس کا اتباع کرو۔ عام صحابہ کے بارے میں فرمایا: اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اِقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ ''میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کے بھی پیچھے چلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔''

صحابہ کرام اپنی ساری عظمتوں کے باوجود انسانی جذبات رکھتے تھے۔ اس لئے کہیں نہ کہیں ان سے کسی کمزوری کا صدور ممکن ہے۔ لیکن باقی لوگوں میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوری کی فوراً اصلاح کرتے ہیں۔ فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اپنی غلطی پر کبھی اصرار نہیں کرتے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے امت کو تنبیہ فرمائی کہ دیکھنا میرے صحابہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے محتاط رہنا۔ ارشاد فرمایا:

اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِیْ اَصْحَابِیْ لَاتَتَّخِذُوْهُمْ مِنْ بَعْدِیْ غَرَضاً فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ

(میں تمہیں اپنے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈراتا ہوں۔ دیکھنا میرے بعد انہیں (تنقید کا) نشانہ نہ بنانا (اور یہ ذہن میں رکھنا) کہ جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کے ارشادات کے باعث ایک مسلمان کیلئے لازم ہے کہ وہ صحابہ کے بارے میں ہمیشہ ادب کو ملحوظ رکھے ان کے بارے میں کبھی بدگمانی نہ کرے اور ذہن میں یہ بات تازہ رکھے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو حضور کے تربیت یافتہ ہیں۔قرآنِ کریم ان کے سامنے نازل ہوا یہ دینی حقائق کے اولین گواہ ہیں۔انہیں کی قربانیوں کے باعث اس دین کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور انہیں کے فیض کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے دور دراز خطوں میں مسلمان آباد ہیں۔ہماری قریبی تاریخ میں انگریز کی سازش اور بہکاوے میں آکر عربوں نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کردی اور مکہ میں شریفِ مکہ نے انگریز کا ساتھ دے کر تاریخ کا رخ بدل دیا۔اس سے مسلمانوں کو بے حد نقصان ہوا علامہ اقبال نے نہائت حزن وملال سے اس کا ذکر کیا لیکن ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کی محبت کے باعث وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ عربوں نے جو بھی کیا وہ ایک بڑا حادثہ ہے لیکن ہم بات کہتے ہوئے یہ کبھی نہیں بھولیں گے کہ رسول اللہ ﷺ بھی عرب تھے اس لئے ہم افراد پر تو تنقید کریں لیکن عربی نسبت کا احترام کم نہ ہونے پائے۔اقبال نے کہا تھا۔

متاعِ قافلۂ ما حجازیاں بُردند
ولے زباں نہ کشائی کہ یارِ ما عربی است

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○

(اور جب وہ ملتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی مومن ہیں۔اور جب اپنے سرداروں کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ ہیں ہم تو ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں ○ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دیئے جا رہا ہے، یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں) (البقرۃ:۱۴تا۱۵)

ان دو آیاتِ کریمہ میں پروردگار نے منافقین کی ایک اور قسم یا ان کی صفات میں سے ایک اور صفت کو بیان فرمایا ہے۔اس سے پہلے دو آیتوں میں جن منافقین کا ذکر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں کسی حد تک ایمان کا اثر تھا۔وہ دعوت اسلامی سے متاثر تھے لیکن اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔اگر زبانی اقرار کافی ہوتا تو انہیں اس سے انکار نہ تھا۔البتہ ایمان کے لئے قربانیوں کا تقاضا ان کیلئے نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔وہ بھی غالباً ایمان کو اللہ کے سامنے دعا اور مناجات یا پوجا پاٹ کی حد تک محدود سمجھتے تھے۔لیکن عملی زندگی کی کشمکش میں وہ کسی طرح اترنے کیلئے تیار نہ تھے۔لیکن پیش نظر آیتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ منافقین ہیں جن کا ایمان سے کوئی تعلق نہ تھا جو محض مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے یا وقت گزاری کیلئے مسلمانوں میں آبیٹھتے تھے۔اور پھر محض مسلمانوں کو بہلانے کیلئے ایمان کا اظہار کرتے تھے لیکن جب اپنے بڑوں سے ان کی ملاقات ہوتی تو وہ فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے معلوم ہوتا ہے اسلامی دعوت تم میں اثر کر گئی ہے تم ان میں اٹھنے بیٹھنے لگے ہو کہیں تم واقعی مسلمان تو نہیں ہو گئے ہو۔تو وہ انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہتے کہ ہم ہر لحاظ سے تمہارے ساتھ ہیں۔ہم تو مسلمانوں کو محض بہلا رہے تھے یعنی ہم نے ان کو مذاق بنا رکھا ہے ہم مذاق ہی مذاق میں ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور وہ اس پر یقین کر لیتے ہیں حالانکہ حقیقت میں ہمارا ایمان سے کوئی رشتہ نہیں۔ان کا اپنے سرداروں سے یہ کہنا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔

Marfat.com

ایک تو یہ کہ جس طرح تم ان کے بدترین دشمن ہو اور ہر وقت ان کی بیخ کنی کی فکر میں رہتے ہو ہمارا بھی یہی حال ہے۔ہم وہاں صرف حالات معلوم کرنے کیلئے جاتے ہیں۔تم یہ خیال نہ کرو کہ ہم ان سے متاثر ہو گئے ہیں اگر یہ مفہوم مراد لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یہود میں سے ہوں گے کیونکہ یہود سازش کے طور پر اپنے جاسوسوں کو مسلمانوں میں بھیجتے رہتے تھے۔وہ جاسوسی بھی کرتے اور سوالات کی صورت میں مسلمانوں کے ذہنوں میں اشتباہات بھی پیدا کرتے۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں نے جس طرح اسلام کی وابستگی کو ہر چیز پر ترجیح دے رکھی ہے اور اس راستے میں آنے والا ہر رشتہ انہوں نے کاٹ پھینکا ہے اور وہ اسلام کیلئے دیوانہ ہوئے پھرتے ہیں ہم اس طرح ان کے ساتھ نہیں ہیں۔بلکہ حقیقت میں ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ہم مسلمانوں کے پاس جاتے ضرور ہیں لیکن ہمیں اپنے گروہی تعصبات ان سے زیادہ عزیز ہیں اس لیے تم یہ گمان نہ کرو کہ ہم انہیں تم پر ترجیح دینے لگے ہیں اگر یہ مفہوم مراد لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ عبداللہ بن ابی کے ساتھیوں میں سے ہوں گے۔یہ لوگ کسی گروہ میں سے بھی ہوں اسلوبِ کلام بتاتا ہے کہ تھے یہ منافقین میں سے۔کیونکہ مسلمانوں کے سامنے وہ ایسی کسی بات کا اظہار نہیں کرتے تھے۔مسلمانوں کے سامنے ان کی زبان پر ایمان کا اقرار ہی رہتا تھا۔لیکن اپنے سرداروں کے پاس جا کر اپنے دل کی بات کرتے تھے اور اسی کا نام نفاق ہے۔

شیاطین کون ہیں؟

ان آیتوں میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں جن کا مفہوم سمجھ لینا چاہئے۔ایک ہے شَیٰطِیْن۔یہ شیطان کی جمع ہے۔شیطان فعلان کے وزن پر ہے۔اس کا معنی ہے سرکش، تندخو، متمرد، متکبر، ظاہر ہے کہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جو کسی بھی کافر گروہ میں اللہ اس کے رسول اور دین کے خلاف اپنے گروہ کی قیادت کر رہا ہو اور اس کی سرکشی اور اس کا تمرد اسے راہِ راست کی طرف نہ آنے دیتا ہو تو یہاں اس سے مراد ان منافقین یا کافروں کے بڑے بڑے سردار ہیں۔

اللہ کا مذاق

دوسرا لفظ اس آیت میں آیا ہے۔ مُسْتَهْزِءُوْن. مستهزء کی جمع ہے۔اس کا معنی ہے ''مذاق کرنے والا یا اڑانے والا''۔دوسری آیتِ کریمہ میں اسی مادہ سے فعل مضارع اللہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ الله يستهزء بهم ''اللہ ان کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔''سوال یہ ہے کہ مذاق کرنا یا مذاق اڑانا، یہ انسان کی فروتر عادات میں سے ہے۔اللہ کی طرف اس کی نسبت کسی بھی طرح مناسب نہیں تو یہاں اس کا استعمال اللہ کی ذات عظیم کے ساتھ کیسے ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ'' استهزء '' کا معنی جس طرح ''مذاق کرنا'' ہوتا ہے اسی طرح ''انتقام لینا'' بھی ہوتا ہے اور بعض قدیم مفسرین نے بھی یہ معنی مراد لیا ہے۔اس لحاظ سے تو اس لفظ کا استعمال اللہ جل جلالہ کیلئے بالکل صحیح ہے۔لیکن اکثر اہلِ علم کا خیال یہ ہے اور اس میں کسی کا اختلاف بھی نہیں کہ عربی زبان میں کسی فعل کے سزا کے طور پر بھی اسی فعل کو استعمال کرتے ہیں۔مثلاً جزاء سيئةٍ سيئةٌ مِثْلُهَا ''برائی کی سزا اس کی طرح برائی ہے''۔

یہاں غور فرمائیے! برائی کی سزا کو بھی برائی قرار دیا گیا ہے حالانکہ برائی کی سزا تو عدل اور انصاف ہوتی ہے۔اسی طرح: وَلَاتَكُوْنُوا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ ''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں بھلا دیا۔'' حالانکہ

Marfat.com

بھول جانا، اللہ کی صفت نہیں، اللہ ہر طرح کی بھول سے پاک ہے۔لیکن یہاں ان کے بھول جانے کی سزا کے طور پر یہ لفظ آیا ہے۔پیش نظر آیت کریمہ میں بھی یہ لفظ اسی طرح استعمال ہوا ہے۔منافقین یہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔حالانکہ اللہ ان کے ساتھ مذاق کرتا ہے یعنی اللہ انہیں ان کے مذاق کی سزا دیتا ہے۔صرف صنعت تجانس کے طور پر ایک جیسے الفاظ لائے گئے ہیں۔پھر اس کے بعد اس سزا کا وضاحت کے ساتھ ذکر بھی فرمایا ہے کہ اللہ انہیں اس طرح سزا دے رہا ہے کہ وہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی کا اظہار کر رہے ہیں اب بجائے اس کے کہ پروردگار ان پر گرفت فرمائے ان پر عذاب بھیج کر انہیں تباہ کر دے۔اللہ مسلسل انہیں ڈھیل دیئے جا رہا ہے اور ان کی رسی ڈھیلی چھوڑی جا رہی ہے۔اللہ کے پیغمبر ان کی اس سرکشی پر جب عذاب سے ڈراتے ہیں تو وہ پلٹ کر یہ کہتے ہیں کہ کہاں ہے وہ عذاب؟ آخر وہ کہاں اٹک گیا ہے۔وہ ہم تک پہنچتے کیوں نہیں پاتا وہ اس طرح کا جتنا مذاق اڑاتے ہیں اللہ تعالیٰ اتنی ہی انہیں ڈھیل دیئے جا رہا ہے اور عذاب کو مؤخر کر رہا ہے یہ ان کے مذاق کی ایسی خطرناک سزا ہے جس سے بڑھکر کسی خطرناک چیز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے مچھلی کا شکاری کنڈی پھینکنے سے پہلے کنڈی کے سرے پر گوشت کا ٹکڑا اٹکا دیتا ہے۔مچھلی اسے غذا سمجھ کر اسے کھانے کیلئے لپکتی ہے تو وہ کانٹا اس کے منہ میں اتر جاتا ہے۔شکاری جب دیکھتا ہے کہ مچھلی آ پھنسی ہے۔تو وہ کھینچنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ڈور ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔تاکہ کانٹا اچھی طرح اس کے حلق میں اتر جائے۔مچھلی اسے غذا سمجھ کر خوش ہو رہی ہے اور شکاری خوش ہے کہ کانٹا حلق میں اترتا جا رہا ہے۔

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلتِ عمل کا دراز ہوتے جانا دونوں پہلو رکھتا ہے۔اس میں رحمت کا پہلو بھی ہے کہ شائد اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر گناہ گار تائب ہو جائیں اور سرکش راہ راست پر آ جائیں اور۔اس میں سزا کا پہلو بھی ہے کہ وہ رسی دراز کر دیتا ہے تاکہ مجرم اپنے جرائم میں اضافہ کرتا چلا جائے اور پھر جب گرفت ہو تو بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔اس آیت میں مہلت سے دوسرا پہلو مراد ہے کہ وہ جس چیز کو اپنے لئے مذاق کا موقع سمجھے ہوئے ہے وہی ان کے لئے عذاب کا پیش خیمہ بننے والی ہے۔لیکن رسی کے دراز ہونے نے انہیں بالکل اندھا کر دیا ہے اور وہ اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتے پھر رہے ہیں۔اور یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ پروردگار پکڑنے میں جلدی اس لئے بھی نہیں کرتے کیونکہ اسے کمزور حکمران کی طرح اس بات کا اندیشہ نہیں ہوتا کہ آج اگر مجرم کو نہ پکڑا گیا تو ہو سکتا ہے پھر یہ گرفت میں نہ آئے۔ممکن ہے یہ طاقت پکڑ لے اور ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔کیونکہ اللہ کی طاقت کے سامنے کسی کی طاقت نہیں چلتی۔وہ جب چاہے پکڑ سکتا ہے اس کے نہ پکڑنے کو اس کی کمزوری نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ وہ جتنا دیر سے پکڑتا ہے اتنا شدید پکڑتا ہے۔ٹھیک کہا کسی نے:

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ ۖ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝

(یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت ان کیلئے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے) (البقرۃ:۱۶)

Marfat.com

اشتراء کا مفہوم:

اس آیت میں اِشْتَرَوا استعمال ہوا ہے۔ اس کا مصدر ہے اشتراءٌ اس کا عام طور پر معنی کیا جاتا ہے "خریدنا"۔ لیکن معمولی غور وفکر سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ آدمی جب کسی چیز کو خریدتا ہے تو وہ چیز کی قیمت دیتا ہے اور اس کے بدلے میں وہ چیز لے لیتا ہے اور یہ دونوں چیزیں مال ہیں اور انسان کی ضرورت ہیں۔ کسی کو پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی کو کسی چیز کی کیونکہ ہر جگہ نہ ہر چیز کام دیتی ہے اور نہ پیسہ کام آتا ہے۔ آدمی کو بھوک لگی ہے تو بھوک اشیائے خوردنی سے مٹتی ہے پیسے سے نہیں۔ لیکن اشیائے خوردنی پیسے ہی سے خریدی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں چیزیں انسان کو عزیز ہیں۔ لیکن جب ایک چیز کے بدلے میں دوسری چیز کو لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک چیز پر دوسری چیز کو ترجیح دیتا ہے۔ یہیں سے اشتـــراء میں ترجیح دینے کا معنی پیدا ہوا کیونکہ آدمی جب پیسے دے کر کوئی چیز لیتا ہے تو اس نے اس چیز کو پیسوں پر ترجیح دی ہے۔ اس لئے ہم نے آیت کریمہ میں اس لفظ کا معنی "ترجیح دینا" کیا ہے۔

اس رکوع کی گزشتہ آیات میں مختلف پیرایوں میں جن لوگوں کا تذکرہ ہوا ہے وہ سارے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کے مقابلے میں کفر یا نفاق کو ترجیح دی۔ اللہ نے اپنے پیغمبر کو مبعوث فرما کر ان کیلئے ہدایت کا ایک راستہ کھولا اور انہیں یہ موقع دیا کہ وہ زندگی کی گمراہیوں سے نکل کر ہدایت کی روشنی میں آسکیں۔ لیکن کسی نے یہ سوچ کر کہ اگر میں اس پیغمبر پر ایمان لے آیا تو مجھے معاشرے میں جو اہمیت حاصل ہے اور مجھے جو سرداری کا مقام میسر ہے وہ میرے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ کسی نے سوچا کہ نبوت تو ایک عظمت ہے اور عظمت ہمیشہ امراء اور روسا کے گھر آتی ہے۔ اگر اللہ نے نبوت دینا ہوتی تو وہ مکہ یا طائف کے کسی سردار کو دیتا یہ کیسے ممکن ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر ایک غریب اور نادار آدمی کو نبوت دے دی جائے اس شخص کی نبوت ماننے کا تو یہ مطلب ہوگا کہ اشراف قریش ناداروں کے سامنے جھک جائیں اور یہ جو ہم نے بڑی مشکل سے اپنے لئے ایک خاص مقام اور کچھ مراعات بنا رکھی ہیں یہ سب کچھ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے۔ بنی اسرائیل نے سوچا کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں۔ نبوت ہمارا حق ہے۔ ایک اُمی کو نبی ماننا یہ ہمارے خاندانی تفوق اور ہمارے انتسابات کی توہین ہے۔ دنیا میں ڈوبے ہوئے لوگوں نے سوچا کہ زندگی تو عیش وعشرت کا نام ہے۔ زندگی ایک ہی مرتبہ ملتی ہے، اسے دکھوں اور تکلیفوں کی نذر نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام تو ذمہ داریوں کا دین ہے اس میں قدم قدم پر قربانیاں ہیں۔ اس میں عزت خواہشات سے دست بردار ہو کر تقویٰ حاصل کرنے سے ملتی ہے اور آخرت میں سب سے بڑا مقام شہادت سے نصیب ہوتا ہے۔ ایسا دین جو جان جوکھوں میں ڈال دے اور جس میں صرف جنت کی امیدوں کے سوا اور کوئی خوشی کا موقع نہ ہو۔ ایسے دین کو قبول کر کے ہم اپنی زندگی کو اجیرن کیوں کرلیں۔ یہ تھے وہ لوگ جن کے سامنے آنحضرت ﷺ اللہ کی طرف سے ہدایت لے کر آئے۔ اب ان کے سامنے یہ کشمکش اور یہ تقابل تھا۔ انہوں نے سوچا کہ کل کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں آج کیوں فکر مند ہوا جائے اور ایک موہوم کل کے بدلے میں آج کی لذتوں اور سرفرازیوں کو ہاتھ سے کیوں جانے دیا جائے۔ اس لئے انہوں نے اپنا آج یعنی دنیا کے عیش وعشرت کو بچالیا اور ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس طرح سے انہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی۔ لیکن افسوس ان کی تجارت نے انہیں کوئی نفع نہ دیا انہوں نے کل کے بدلے میں آج خریدا اور اس میں نفع کی بات یہ سمجھی کہ آج تو ہمارے پاس سب کچھ ہے لیکن کل کے بارے ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس لئے محض اس امید پر کہ کل کو سب کچھ مل جائے گا ہم آج کے عیش وعشرت کو کیوں چھوڑیں۔ لیکن اسلامی انقلاب کی مسلسل کامرانیوں نے انہیں اندھیرے غاروں میں دھکیل دیا۔ ہدایت سے انکار کر کے انہوں نے خود اپنے آپ کو ہدایت سے محروم رکھا اور جس دنیا کو انہوں نے بچانا چاہا اسلام کی کامیابیوں سے وہ دنیا بھی ان کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ مکہ فتح ہوگیا، تو قریش کی ساری عظمتیں

Marfat.com

خاک میں مل گئیں۔ طائف فتح ہو جانے کے بعد طائف کے رئیسوں کا سارا کروفر تباہ ہو کر رہ گیا۔ یہود جو مسلمانوں کو کوئی اہمیت دینے کیلئے تیار نہ تھے ان کا ایک ایک قبیلہ ذلت کا شکار ہوا۔ بالآخر ان کو جزیرۂ عرب سے نکلنا پڑا۔ حتی کہ پوری دنیا میں کفر کی عظمت اور حکومت زوال کا شکار ہو گئی۔ اس لئے فرمایا کہ انہوں نے آخرت کے بدلے میں دنیا حاصل کی تھی اور ہدایت کے بدلے میں گمراہی کو ترجیح دی تھی لیکن یہ تجارت ان کے کچھ کام نہ آئی۔ ہدایت سے خود منہ پھیرا اور ان کی دنیا اسلامی انقلاب کی کامیابی سے تاریکیوں میں ڈوب گئی۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ صُمٌّ ۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝

(ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایسی تاریکیوں میں چھوڑ دیا جن میں ان کو کچھ نظر نہیں آتا ۝ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں) (البقرۃ: ۱۷ تا ۱۸)

منافقین کی دو تمثیلیں

اس آیت کریمہ میں جن لوگوں کی مثال دی گئی ہے، وہ دو طرح کے لوگ ہو سکتے ہیں یا تو وہ لوگ مراد ہیں جن کا ذکر ان الـذیـن کـفـروا الخ والی آیت میں آیا ہے یعنی وہ لوگ جن کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی سرداری کے زعم اور دنیا کی محبت میں ڈوب کر ایسا رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے وہ قبولیت حق کی استعداد سے محروم ہوتے گئے اور بالآخر اللہ کے قانون کی گرفت میں آ گئے اور یا اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو منافق تھے بظاہر ایمان کا اظہار کرتے تھے لیکن حقیقت میں ان کے دل میں ایمان کی رمق نہ تھی۔ وہ نام کے مومن تھے لیکن دل و دماغ کے کافر تھے۔ ان کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے شدید تاریکی میں کوئی قافلہ جا رہا ہے اور تاریکی کے باعث ان کے لئے راستہ تلاش کرنا ناممکن ہو رہا ہے کہ اچانک اللہ کے ایک بندے نے آگ روشن کر دی تا کہ یہ لوگ آگ کی روشنی میں منزل تک پہنچنے کا راستہ پہچان سکیں۔ لیکن جب اس روشنی نے پوری طرح ماحول کو روشن کر دیا اور صحیح راستہ پہچان کر منزل تک پہنچنے میں کوئی دشواری باقی نہ رہی اور ساتھ ساتھ آگ روشن کرنے والا نہائت ہمدردی اور خیر خواہی سے انہیں اس روشنی میں چلنے کی تلقین بھی کرتا رہا اور راستے کی رہنمائی بھی کرتا رہا لیکن اچانک ان کی بدقسمتی نے انہیں آ پکڑا کہ انہوں نے اس روشنی میں چلنے سے انکار کر دیا اب آپ اندازہ فرمایئے کہ روشنی پھیل جانے کے باعث تاریکیاں سمٹ گئیں ہیں۔ لیکن یہ بدنصیب مسافر آنکھیں بند کئے اس روشنی کی طرف منہ کیے بیٹھے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے انہیں آنکھوں کے نور سے محروم کر دیا ہے اور پھر وہ تاریکیوں میں اس طرح گھر گئے ہیں کہ انہیں راستہ نظر نہیں آ رہا۔ یہ مثال دے کر واضح فرمایا جا رہا ہے کہ حضور کی بعثت سے پہلے تمام لوگ گمراہیوں کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے طبقات انسانی میں سے ایک ایک طبقہ اپنے اپنے توہمات کا شکار تھا کسی کو معلوم نہ تھا کہ زندگی کا راز کیا ہے اور زندگی عطا کرنے والے کو کس طرح خوش کیا جا سکتا ہے۔ ہر طرف سے گھٹا ٹوپ اندھیروں نے علم و دانش کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ اچانک اللہ کی غیرت کو جوش آیا کہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو ہدایت دے کر مبعوث فرمایا آپ نے تشریف لا کر اس قوت سے تبلیغ و دعوت کا صور پھونکا کہ ہر طرف

Marfat.com

ہدایت کی روشنی پھیل گئی اب بجائے اس کے کہ لوگ لپکتے ہوئے اس روشنی کو قبول کرتے اور زندگی کا سفر کامیابی سے طے کرتے لیکن ان کے قومی تعصّبات، نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ یا تو اس روشنی کا بائیکاٹ کر دیں یا اس روشنی کو بجھانے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں۔ جب صورتحال یہاں تک پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور تمرد کو دیکھ کر ان کی محرومی کا فیصلہ فرما دیا۔ اُن کی آنکھوں کا نور ان سے چھین لیا۔ اور وہ کفر، شرک اور نفاق کی ایسی تاریکیوں میں ڈوب گئے کہ اب ان کو اس سے نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ اب ان کی بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ وہ ہر طرح کی صلاحیت سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ وہ اندھے ہیں کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے گونگے ہیں کسی کو پکار نہیں سکتے اور بہرے ہیں کسی کی پکار سن نہیں سکتے انہوں نے مسلسل انکار اور سرکشی کے باعث چونکہ اپنی صلاحیتوں کو بالکل مردہ کر دیا جس کی وجہ سے وہ اللہ کے اُس قانون کی گرفت میں آ گئے جس قانون کے تحت دل و دماغ پر مہر کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ اب وہ ہدایت کی طرف لوٹ نہیں سکتے۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (البقرۃ: ۱۹ تا ۲۰)

(یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو اس میں تاریکیاں ہوں، کڑک ہو اور چمک ہو۔ وہ ٹھونس رہے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑکے کی وجہ سے موت سے ڈر کر حالانکہ اللہ تعالیٰ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو ۝ قریب ہے کہ بجلی اچک لے ان کی آنکھوں کو، جب جب بجلی ان کیلئے چمکتی ہے تو وہ اس میں چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے رک جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو سلب کر لیتا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

صَيِّبٌ کا لفظ سخت بارش کیلئے بھی آتا ہے اور زور کے ساتھ برسنے والے بادل کیلئے بھی لیکن یہاں یہ لفظ موسلا دھار بارش کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سماء کا لفظ عام طور پر نیلے آسمان کیلئے بولا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ابر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس سے ہمارے سروں پر جو فضا چھائی ہوئی ہے وہ مراد لی جاتی ہے۔ صواعق صاعقہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور اس بجلی کیلئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔

اس میں ایک ایسے قافلے کی مثال دی گئی ہے جو حالت سفر میں ہے کہ اسے موسلا دھار بارش نے آ پکڑا ہے۔ اس کے بعد بارش میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے جو عموماً سخت بارشوں میں پیش آیا کرتی ہیں۔ پھر ایسی بارش اور اس طرح کی مشکلات میں مسافر جس طرح کی کیفیات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کی منظر کشی کی گئی ہے۔ تاریک رات میں بارش سے تاریکی اور بڑھ جاتی ہے جبکہ ہاتھ سے ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا ایسے میں جب بجلی چمکتی ہے تو مسافر ایک طرف تو اس کی روشنی کو غنیمت سمجھ کر قدم آگے بڑھانے لگتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے کوندنے سے سراسیمہ بھی ہوتے ہیں۔ حوصلہ مند اور اولوالعزم مسافروں کا کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اس صورتحال کا حوصلے سے مقابلہ کرتے ہیں لیکن بے مقصد اور بے حوصلہ مسافر بے صبری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے وہ بجلی کے کڑکوں سے بچنے کیلئے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے لگتے

Marfat.com

ہیں۔حالانکہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بجلی سے آدمی بچ تو نہیں سکتا اگر وہ موت کی پیامبر بن کر آئی ہے تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینا شتر مرغ کی طرح موت سے تو نہیں بچا سکتا۔

اب اس مثال کا منافقین پر انطباق کر کے دیکھئے، اس مثال سے قرآن کریم منافقین کی تصویر کشی کرنا چاہتا ہے۔اس لئے اسے سمجھنے کیلئے الفاظ کی مراد کو سمجھ لینا چاہئے۔یہاں تیز بارش سے مراد قرآنِ کریم اور اللہ کی طرف سے آنے والا دین ہے۔ظلمتوں سے مراد، اس دین کے مقابلے میں اٹھنے والا مخالفتوں کا ہجوم ہے اور رعد و برق سے مراد وہ مختلف قسم کے مصائب ہیں جو ہر ایمان لانے والے کو اس راستے میں پیش آتے ہیں۔کبھی وہ رعد کی صورت دہلا کے رکھ دیتے ہیں اور کبھی برق کی صورت بھونچکا دیتے ہیں۔صاحبِ ایمان لوگ جب ان مصائب سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ اسے ایمان کے راستے کی سنت سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایمان کا کھرا اور کھوٹا ہونا ان مصائب میں مبتلا ہونے کے بعد ہی واضح ہوتا ہے۔یہ اس راستے کی آزمائشیں ہیں، جو اللہ سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں کو ہمیشہ پیش آتی ہیں کیونکہ۔

محبت کے مقدر میں کہاں آرام اے ہمدم
کہیں شعلہ کہیں بجلی کہیں سیماب ہوتی ہے

ایک مومن کی نظر ہمیشہ اللہ کے انعامات پر رہتی ہے۔وہ جانتا ہے کہ ان آزمائشوں پر استقامت سے اللہ کی جانب سے وہ انعامات ملتے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔اس لئے اس راستے میں آنے والی ہر مصیبت اسی محبوب کا پیغام محسوس ہوتی ہے۔جو اسے اور زیادہ استقامت کی ہمت عطا کرتی ہے۔اقبال نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ٹھیک کہا ہے۔

نہ چھٹا وہ آستانہ تجھ سے ایک دم کیلئے
کسی کے عشق میں تو نے مزے ستم کیلئے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

لیکن منافقین اپنے اندر چونکہ ایمان کی یہ کیفیات نہیں رکھتے تھے۔اس لئے وہ ان مصائب کو مصائب سمجھ کر اس سے سراسیمہ ہوتے اور ہر ممکن طریقے سے اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔اور اس کیلئے مختلف حیلے بہانوں سے ایمان کے تقاضوں سے جی چراتے ہیں جس طرح موت سے ڈر کر کوئی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے تو وہ موت سے بچ نہیں سکتا۔اسی طرح مختلف حیلے بہانوں سے ایمانی تقاضوں سے جی چرانا اللہ کی ناراضی سے نہیں بچا سکتا وہ ہزار اس کیلئے عذر تلاش کریں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ انہیں اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔یہ منافقین جب قرآن کے ان احکام کو دیکھتے ہیں جن سے ان کی خواہشاتِ نفس اور ان کے تعصباتِ جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے تو یہ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور جب مسلمانوں کے ساتھ چلتے ہوئے نامساعد حالات سے واسطہ پڑتا ہے تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں اچک لی جائیں گی لیکن جب حالات معمول پہ آتے ہیں یا کہیں مالِ غنیمت ملنے کی امید ہوتی ہے تو یہ پھر اسلام کے دامن کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی اس روش کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ متذکرہ بالا منافقین کی طرح انہیں بھی کانوں اور آنکھوں سے محروم کر دیا جاتا۔لیکن پروردگار نے ان صلاحیتوں سے انہیں محروم نہیں کیا کیونکہ انہوں نے اپنے دل و دماغ کے دروازے اسلام کیلئے بالکل بند نہیں کئے اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ جرم کے مطابق سزا دیتا ہے۔لیکن انہیں اللہ کے غضب اور اس کی قدرت سے بے فکر نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

Marfat.com

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعْبُدُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُمْ وَٱلَّذِينَ مِن
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ فِرَٰشًا
وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهِۦ مِنَ
ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا۟ لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾
وَإِن كُنتُمْ فِى رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا۟ بِسُورَةٍ مِّن
مِّثْلِهِۦ وَٱدْعُوا۟ شُهَدَآءَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٢٣﴾
فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ وَلَن تَفْعَلُوا۟ فَٱتَّقُوا۟ ٱلنَّارَ ٱلَّتِى وَقُودُهَا
ٱلنَّاسُ وَٱلْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَٰفِرِينَ ﴿٢٤﴾ وَبَشِّرِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟
وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ ۖ
كُلَّمَا رُزِقُوا۟ مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوا۟ هَٰذَا ٱلَّذِى رُزِقْنَا
مِن قَبْلُ ۖ وَأُتُوا۟ بِهِۦ مُتَشَٰبِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَٰجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ
وَهُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٥﴾ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَسْتَحْىِۦٓ أَن يَضْرِبَ مَثَلًا
مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ
ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ فَيَقُولُونَ مَاذَآ أَرَادَ ٱللَّهُ
بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِۦ كَثِيرًا وَيَهْدِى بِهِۦ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ
بِهِۦٓ إِلَّا ٱلْفَٰسِقِينَ ﴿٢٦﴾ ٱلَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعْدِ

Marfat.com

مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ
فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ
كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى
السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

رکوع۔ ۳ (اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی ،جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو جو تم سے پہلے تھے، تا کہ تم بچ جاؤ ○ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت اور اتارا آسمان سے پانی۔ پھر نکالے اس سے پھل تمہارے کھانے کیلئے، پس نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کا مقابل اور تم جانتے ہو۔ اگر تم شک میں ہو اس چیز کی جانب سے جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے۔ تو لاؤ، اس کے مانند کوئی سورت اور بلالو اپنے حمائتیوں کو بھی اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو ○ پس اگر تم نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو پھر ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر بنیں گے، جو تیار کی گئی ہے کافروں کیلئے۔ اور بشارت دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے ،اس بات کی کہ ان کیلئے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی ، جب جب ان کے پھل ان کو کھانے کو ملیں گے تو کہیں گے کہ یہ وہی ہیں جو اس سے پہلے ہمیں عطا ہوا تھا، حالانکہ وہ دیئے گئے اس سے ملتا جلتا، اور ان کیلئے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی تمثیل بیان کرے، خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ جانتے ہیں یہی بات حق ہے، ان کے رب کی جانب سے۔ رہے وہ لوگ، جنہوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کے بیان کرنے سے اللہ کا کیا منشا ہے۔ اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر انہی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔ جو اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کا اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اسے توڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں ، یہی لوگ ہیں جو نامراد ہونے والے ہیں۔ جو اللہ کے عہد کو مضبوطی سے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں نامراد ہونے والے۔ تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے، تو اس نے تم کو زندہ کیا۔ پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ○ وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے، پھر آسمان کی طرف توجہ کی اور سات آسمان استوار کردیئے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے) (آیت ۲۱ تا ۲۹)

Marfat.com

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ○
الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

(اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی۔ جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ ○ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت اور اتارا آسمان سے پانی۔ پھر نکالے اس سے پھل تمہارے کھانے کیلئے، پس نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کا مقابل اور تم جانتے ہو) (البقرۃ: ۲۱ تا ۲۲)

سورۃ البقرۃ کے آغاز میں پروردگار نے اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب وہ ہے جس کے مُنَزَّل مِنَ اللّٰہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس لئے جو طالب ہدایت اس سے ہدایت حاصل کرنے کیلئے اسے پڑھنا چاہے، اسے اطمینان ہونا چاہئے کہ یہ کتاب، اللہ ہی کی کتاب ہے، اسی نے نازل فرمائی ہے۔ جس طرح اس کا علم ہر طرح کی نارسائی اور ہر طرح کی غلطی سے پاک ہے، اسی طرح اس کی کتاب بھی فکری اور عملی رہنمائی دیتے ہوئے کسی فکری نارسائی، کسی عملی تضاد اور کسی عصبیت کی شکار نہیں ہوتی۔ البتہ اس سے استفادہ کیلئے یہ ضروری ہے کہ آدمی کے اندر کم سے کم تقویٰ پایا جاتا ہو۔ وہ ذہنی شعور سے بہرہ ور ہو، مشاہدے کی قوت رکھتا ہو، مشاہدات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت سے محروم نہ ہو اور اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ میری زندگی بے مقصد نہیں، میرا پیدا کرنے والا یقیناً میری زندگی کے بارے میں ایک دن مجھ سے باز پرس کرے گا۔ یہ تقویٰ کی پہلی منزل ہے، قرآنِ کریم سے استفادہ کیلئے یہ بنیادی شرط ہے، جس کے بغیر قرآنِ کریم سے استفادہ ممکن نہیں۔ چنانچہ اس استفادہ کے عمل کے نتیجے میں وہ صفات پیدا ہوتی ہیں جن سے یہ استفادہ کا عمل مکمل ہوتا ہے پھر ان صفات کا ذکر کرنے کے بعد ان صفات کے حاملین کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے اس ہدایت پر ہیں جس کی دعا انہوں نے اھدنا الصراط المستقیم کی صورت میں کی تھی اور یہی لوگ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے جو قرآنِ کریم سے استفادہ کیلئے پہلی شرط سے ہی محروم ہوں۔ ان لوگوں میں دو طرح کے افراد ہیں۔ ایک تو وہ جنہوں نے بالکل اس روشنی سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس کے سامنے اپنے دل و دماغ کے دروازے مقفل کر دیئے ہیں۔ ان لوگوں کو قدرت ہدایت حاصل کرنے سے بالکل محروم کر دیتی ہے کیونکہ ان لوگوں نے اپنی روش سے اپنے آپ کو اس محرومی کا مستحق بنا دیا ہے اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو کبھی کبھی اس روشنی کیلئے آنکھیں کھولتے ہیں، اس کی طرف بڑھنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے مفادات، تعصّبات، نفسانی خواہشات، دنیوی علائق اور کردار کی کمزوریاں انہیں اس طرف بڑھنے نہیں دیتیں۔ یہ بھی عموماً ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم سے استفادہ کے حوالے سے اور حق کو قبول کرنے کی نسبت سے انسانوں کی تقسیم کا ذکر کرنے کے بعد پیشِ نظر آیت کریمہ سے قرآنِ کریم نے اپنی دعوت پیش کرنا شروع کی ہے۔ جس کیلئے آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے ہیں اور جس کیلئے قرآنِ کریم کا نزول ہوا ہے۔ دعوت کو پیش کرنے سے پہلے انسانوں کی صفات کے اعتبار سے تقسیم کی گئی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں یہی ایک تقسیم ہے جو فطری بھی ہے اور منطقی بھی۔ اس کے علاوہ انسانوں نے خود جتنی تقسیمیں کر رکھی ہیں۔ وہ سب مصنوعی اور غیر فطری ہیں اور وہ انسانیت کیلئے نہایت مہلک اور تباہ کن ہیں اور اس تقسیم کا ذکر بھی اس لئے کیا گیا ہے، تاکہ لوگ قرآنِ کریم کھولنے سے پہلے اچھی طرح اپنا جائزہ لے لیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ اگر واقعی ہدایت حاصل کرنا مقصود ہو اور قرآنِ کریم کا پیغام سمجھنے کی خواہش ہو تو پھر ضروری ہے کہ ہر آدمی اپنا جائزہ لے کر دیکھے کہ قرآنِ کریم نے قرآن سے استفادہ کیلئے جن صفات کو لازم ٹھہرایا ہے۔ کیا وہ ہم میں موجود بھی ہیں یا نہیں اور اگر ان میں کمی محسوس ہو تو قرآنِ کریم کے طالب کو اس کیلئے فکر مند ہونا چاہئے۔

Marfat.com

قرآن کی دعوت تمام نوعِ انسانی کیلئے ہے

اس دعوت کو پیش کرنے کیلئے پروردگار نے یاایہا الناس کہہ کر پوری نوعِ انسانی کو خطاب کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم کی دعوت نہ صرف عربوں کیلئے ہے اور نہ صرف بنی اسمٰعیل کیلئے بلکہ پوری نوعِ انسانی اس کی مخاطب ہے۔ جہاں کہیں کوئی انسان بستا ہے اور جہاں جہاں دھرتی پانی دیتی ہے۔ قرآنِ کریم ان سب کیلئے ہدایت و رہنما ہے۔ اس لئے پروردگار نے قرآنِ کریم کو ذکر للعالمین قرار دیا ہے یعنی یہ قرآن تمام اہل دنیا کیلئے نصیحت ہے اور آنحضرت ﷺ کو اسود و احمر کا رسول اور رحمت للعالمین کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہر رنگ کے آدمی کی طرف اور دنیا کے ہر علاقے کی طرف اللہ کے رسول اور اس کی رحمت بن کر آئے ہیں۔ آپ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرح یہ نہیں فرمایا کہ میں بنی اسرائیل کی بھیڑوں کو اکٹھا کرنے آیا ہوں اور نہ دیگر انبیاء کی طرح صرف اپنی قوم تک اپنی دعوت کو محدود رکھا، جس کی طرف وہ مبعوث ہوئے تھے بلکہ حالات نے جیسے ہی آپ کو مہلت دی آپ نے سلاطین عالم کے نام مکاتیب تحریر فرمائیں، انہیں ہدایت کی طرف بلایا اور صاف صاف فرمایا کہ اسلام لے آؤ تو بچ جاؤ گے، ورنہ تمہاری اور تمہاری رعایا کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ یہ پوری نوعِ انسانی کی طرف ایک ہادی اور ایک ہدایت نامے کا آنا ایک ایسا مژدۂ جاں فزا ہے جس پر جتنا بھی اللہ کا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ آپ کی ختم نبوت اور آپ کی نبوت و رسالت کی وسعت نے پوری دنیا کیلئے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا کہ اب تمہیں مختلف مذاہب کا انتساب الگ الگ رہنے پر مجبور نہیں کرے گا۔ قوموں کا الگ الگ رہنا انتظامی مجبوری ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کوئی مجبوری نہیں کہ انسانوں کے دل و دماغ الگ الگ انتسابات رکھیں اور یہ انتسابات انہیں کبھی اکٹھا نہ ہونے دیں۔ ہندو قیامت تک کیلئے ہندو رہیں اور یہودی اور عیسائی قیامت تک کیلئے یہودی اور عیسائی رہیں۔ کیونکہ ان کے مذہب نے انہیں یکجائی کی تعلیم نہیں دی۔ لیکن اسلام کا عالمگیر ہونے کا دعویٰ یہ وحدت کی ایک ایسی بنیاد ہے جس میں سارے مذاہب اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ قرآنِ کریم نے جو دعوت پیش کی ہے اس میں سارے انبیائے کرام پر ایمان لانے کو لازم ٹھہرایا ہے۔ البتہ اس نے فکری اور عملی رہنمائی کیلئے قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے اور آپ ہی کی رہنمائی کو آخری سند سمجھنے پر اس لئے اصرار کیا ہے کہ پہلے مذاہب اپنی افادیت کھو بیٹھے، ان پر نازل ہونے والی کتابیں تحریف اور ترمیم کا شکار ہو گئیں۔ بڑے سے بڑے مذہب کے پاس بھی جزوی حقیقت باقی رہی، وہ حقیقت کے بڑے حصے کو کھو چکے، شریعت خیانتوں کی نذر ہو گئی۔ رسم و رواج اور خود ساختہ چیزوں کو شریعت کا نام دے دیا گیا۔ حالات کے دباؤ اور ایمان میں کمی کے باعث دین اور شریعت کا حلیہ بگڑتا چلا گیا۔ آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے امتوں کی متاع گم گشتہ ازسرِنو انہیں عطا فرمائی۔ اس لئے یہاں اپنی دعوت کے آغاز میں تمام انسانوں کو خطاب فرما کر انہی حقائق کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کو سمجھنے کیلئے دو باتیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔

ا۔ آپ کوئی نئی دعوت لیکر تشریف نہیں لائے اور نہ قرآنِ کریم کوئی نئی دعوت پیش کر رہا ہے۔ بلکہ یہ وہی دعوت ہے جسے تمام انبیائے کرام نے پیش کیا۔ قرآنِ کریم نے مختلف مواقع پر گزشتہ انبیائے کرام کی دعوت کا حوالہ دیا ہے اور ان کے الفاظ کو بھی دہرایا ہے۔ وہ بعینہٖ وہی نقاط ہیں جس کا یہاں ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی دعوت نئی ہوتی تو یقیناً سابقہ انبیائے کرام سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی۔ لیکن اس دعوت کا بعینہٖ سابقہ انبیائے کرام کی دعوت کے مطابق ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ سابقہ انبیاء کی امتوں نے جس دعوت کو گم کر دیا اور جس میں انہوں نے تحریف اور ترمیم کر ڈالی قرآنِ کریم اسی دعوت کو جامعیت اور کمال کے ساتھ نہ صرف پیش کر رہا ہے بلکہ پہلی امتوں کی خیانتوں پر تنقید اور گرفت بھی کر رہا ہے۔

Marfat.com

۲۔ اس دعوت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کا بنیادی نقطہ وہی ہے جو انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کسی نہ کسی کی رہنمائی کا محتاج ہے۔ زندگی سے متعلق بنیادی تصورات، کائنات سے انسان کا رشتہ، انسانوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور اس حوالے سے حقوق و فرائض کی شناخت، یہ کم سے کم ضرورتیں ہیں۔ جو ہر انسان کو شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد پیش آتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان ضرورتوں کا جواب کون دے؟ اور اس کے ساتھ ہی دوسری بات یہ کہ اجتماعی زندگی کا تصور اجتماعی زندگی کے اداروں کے بغیر ناممکن ہے۔ کوئی سا ادارہ بھی وجود میں لانے سے پہلے سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ادارے کا سربراہ کون ہوگا؟ اس ادارے کی پالیسی طے کرنے کا اختیار کسے ہوگا؟ جو لوگ اس ادارے میں کام کریں گے ان کی رہنمائی کون کرے گا؟ اور وہ کس کے سامنے جوابدہ ہوں گے؟ جب تک ان سوالوں کو جواب نہ مل جائے اس وقت تک کوئی ادارہ وجود میں نہیں آ سکتا اور اگر آ جائے تو چل نہیں سکتا۔ گھر انسان کا پہلا ادارہ ہے۔ جس گھر میں یہ طے نہیں کر لیا جاتا کہ میاں بیوی کی صورت میں شوہر اس گھر کا سربراہ ہے اور ماں باپ اور اولاد کے ہوتے ہوئے باپ کو یہ مقام یہ حاصل ہے۔ اس وقت تک وہ گھر کبھی سلامتی سے زندگی کا سفر جاری نہیں رکھ سکتا کیونکہ گھر چار دیواری اور چھت کا نام نہیں۔ میاں بیوی میں باہمی محبت، اولاد پر شفقت اور بچوں کی طرف سے احترام سے گھر وجود میں آتا ہے۔ جس گھر میں بچے ماں باپ کا احترام نہ کریں، ماں باپ بچوں کی تربیت کیلئے وقت نہ نکال سکیں اور میاں بیوی باہمی تعلقات میں خیانت کریں تو وہ گھر ہوتے ہوئے بھی گھر کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہی حال باقی سب اداروں کا بھی ہے کہ جب تک سربراہی اور مرکز اطاعت کا مسئلہ حل نہیں کیا جاتا اور اطاعت کی حدود طے نہیں ہوتیں اس وقت تک کسی ادارے کا چلنا ناممکن ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو غور کیجئے کہ زمین انسان کا گھر ہے جہاں انسانوں کو زندگی کی ایک مہلت ملی ہے اور اسی مہلت عمل کے بارے میں قیامت کے دن باز پرس ہوگی۔ کیا اس گھر میں بسنے کیلئے سب سے بنیادی سوال اس کے سوا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے کہ اس گھر میں رہنے والوں کو کس کی رہنمائی میں زندگی گزارنی ہے اور کس کی اطاعت کرنی ہے اور ان کے اپنے ارادوں اپنی خواہشوں اور اپنی امنگوں کی حدود کیا ہیں؟ جب تک ان باتوں کا فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک یہ زمین حیوانوں کا مسکن تو ہو سکتی ہے انسانوں کا مسکن نہیں بن سکتی۔

اسی لئے ہر پیغمبر نے سب سے پہلے اسی سوال کو اٹھایا کہ لوگو! ذرا غور کرو تم کس کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارو گے اگر تم اس کیلئے عقل کو رہنما بناؤ جو یقیناً اللہ کا سب سے بڑا عطیہ ہے تو ذرا غور کیجئے کہ ہر آدمی کی عقل دوسرے سے متفاوت ہے اور قوموں کا باہمی غور و فکر کا معیار بے پناہ اختلاف رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ انسان کے اندر عقل کے علاوہ کچھ اور بھی داعیات ہیں۔ اس کے اندر خواہش کا جذبہ بھی ہے امنگوں کی فراوانی بھی ہے، مفادات کا ہنگامہ بھی ہے، اشتعال اور محبت کی بے پناہی بھی ہے اور یہ جذبات ایسے ہیں جو بہت دفعہ عقل پر غلبہ پا لیتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں اگر عقل کو بنیادی انسانی معاملات میں رہنما تسلیم کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی کے بارے میں کوئی ایک متعین زاویۂ نگاہ، ایک متعین فکری اسلوب، ایک متعین ضابطۂ حیات، کبھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس لئے انسانی زندگی کی صحت و سلامتی کیلئے ضروری ہے کہ اس کی رہنمائی اس ذات کے سپرد کی جائے جو ان تمام کمزوریوں سے پاک ہو اور انسان کو اس کی اطاعت کا پابند کیا جائے جس کی اطاعت کرتے ہوئے آدمی کبھی کسی تحفظ ذہنی اور جذباتی ناہمواری کا شکار نہ ہو۔ اس لئے ہر پیغمبر نے اپنی قوم سے کہا یا قوم! اُعْبُدُوا اللّٰہَ ''اے قوم! اللہ کی بندگی کرو'' وہی ذات ہے جس کی رہنمائی ہر غلطی سے مبرا ہے اور اسی کی اطاعت ہے جو تمہیں ہر کمزور جذبے سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ پیش نظر آیت کریمہ میں قرآن کریم نے بھی اسی دعوت کو پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ ''اپنے رب کی عبادت کرو''۔

Marfat.com

عبادت کا مفہوم

عبادت کے معنی اور مفہوم کے حوالے سے سورۃ الفاتحہ کی تشریح کے ضمن میں ہم مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ جس میں ہم نے بتایا تھا کہ عبادت کا اصل معنی غلامی ہے اور غلامی میں چونکہ آقا کی اطاعت لازمی ہوتی ہے، اس لئے اطاعت بھی عبادت کے مفہوم میں شامل ہوگئی۔ جب یہ غلامی ایک ایسی ذات کی ہو جو خالق و مالک اور معبود بھی ہو تو پھر اس غلامی کا حق پرستش کی صورت میں ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے پرستش کا مفہوم بھی عبادت میں شامل ہو گیا۔ اب جب ہم قرآنِ کریم میں عبادت کا حکم پڑھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے اللہ کی غلامی کرو اسی کی اطاعت کرو، اور اسی کی پرستش کا حق ادا کرو۔ اگر کوئی شخص اللہ کی غلامی کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن اس کی نماز نہیں پڑھتا یعنی اس کی پرستش نہیں کرتا یا اس کے احکام کے اطاعت نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی غلامی نہیں کر رہا کیونکہ اس کی غلامی اطاعت اور پرستش کے بغیر نہیں ہوتی اور دوسری بات اس سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ غلام اپنے آقا کا جزوی غلام نہیں ہوتا وہ اپنے آقا سے کبھی یہ نہیں کہتا کہ میں آپ کا غلام ضرور ہوں لیکن میں آپ کی اطاعت نہیں کروں گا اور نہ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں آپ کی فلاں بات تو مانوں گا فلاں نہیں مانوں گا۔ اگر وہ غلام ایسا کہے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے آقا کی برہمی کا عالم کیا ہوگا۔ وہ یا تو اسے سخت سزا دے گا اور یا اسے کسی اور آقا کے حوالے کر دے گا۔ بالکل اسی طرح ہم اللہ کے غلام ہیں ہماری غلامی جز وقتی نہیں بلکہ ہمہ وقتی ہے۔ ہم اپنے اللہ سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم مسجد میں تو آپ کے غلام ہیں سو نماز پڑھیں گے لیکن مسجد سے باہر نکل کر پھر ہم آپ کے غلام نہیں ہیں یا غلام تو ہیں لیکن آپ کی اطاعت کے پابند نہیں ہیں۔ ہم کاروبار کریں گے تو اپنی مرضی سے ملازمت کریں گے تو اپنے طریقے سے حکومت چلائیں گے تو اپنی خواہش اور اپنے مفادات کے مطابق، ملک میں آئین وہ نافذ کریں گے جسے ہم خود بنائیں گے۔ غرضیکہ پوری زندگی ہماری مرضی سے چلے گی البتہ بچہ پیدا ہوگا تو اس کے کان میں تیرا نام ضرور پھونکیں گے۔ لیکن پھر اس کی تعلیم و تربیت کیلئے پلٹ کر تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کو کبھی نہیں دیکھیں گے۔ مرنے پر تیرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نماز جنازہ بھی پڑھیں گے اور تیری کتاب کی تلاوت سے ایصال ثواب بھی کریں گے۔ لیکن تیری کتاب جو ہمیں قانون اور آداب سکھاتی ہے اسے ہم کبھی جاننے کی بھی کوشش نہیں کریں گے۔ اس روش کو کوئی بھی عقل مند آدمی نہ اطاعت کہہ سکتا ہے نہ پرستش اور غلامی تو اس سے بھی بڑھ کر اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینے کا نام ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے تھے۔ اس میں ایک تو اللہ کی عبادت پر دلیل پیش کی گئی ہے اور دوسرا ایک تعریض کی گئی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اے انسانو! تم جانتے ہو کہ تم مخلوق ہو تم نہ تو از خود پیدا ہوئے ہو اور نہ کسی دوسری مخلوق نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تم چاہے مشرکین سے تعلق رکھتے ہو یا اہلِ کتاب سے تم سب اللہ ہی کو اپنا خالق سمجھتے ہو۔ تمہیں خود اس سوال پر غور کرنا چاہئے کہ جو کسی چیز کو بناتا یعنی تخلیق کرتا ہے وہ چیز اس بنانے والے کی ہدایات کی پابندی کرتی ہے یا کسی اور کے اشاروں پر چلتی ہے اور اس چیز پر حکم چلانے کا حق اس کے موجد اور اس کے خالق کو ہے یا کسی اور کو؟ تم تسلیم کرو گے کہ یہ حق یقیناً موجد اور خالق کو ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ جب تم مانتے ہو کہ تمہیں اللہ نے پیدا فرمایا ہے تمہیں اس نے عدم سے وجود بخشا آج تم اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھو لیکن تمہارا وجود اسی کا مرہونِ منت ہے۔ اگر وہ تمہیں پیدا نہ کرتا تو تمہارا کہیں وجود نہ ہوتا اور پھر پیدا کر کے تمہاری حفاظت نہ کرتا یا پیدائش کے عمل میں جو وقت ماں کے پیٹ میں گزرتا ہے اس میں اگر وہ نگرانی نہ کرتا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں ہلاکت سے نہ بچا سکتی۔ اور پھر اگر وہ تمہیں صرف جسم عطا کر کے چھوڑ دیتا وہ

Marfat.com

بے شمار صلاحیتیں اور جذبات جس سے انسانی زندگی کی ہمہ ہمی ہے اگر وہ تمہیں عطا نہ کرتا تو تم پیدا ہونے کے بعد بھی دھرتی کا بوجھ ہونے کے سوا کچھ نہ ہوتے۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ جس ذات کے احسانات کے بوجھ تلے تم دبے ہوئے ہو بجائے اس کی بندگی اور اطاعت کرنے کے تم دوسروں کی بندگی کرتے ہو حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنے محسن کو پہچانو اور صرف اسی کی بندگی کرو۔

مِنْ قَبْلِکُمْ کا مفہوم

یہ جو فرمایا کہ جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے تھے ان کو بھی پیدا کیا۔ اس میں تعریض یہ ہے کہ جس کی تم مخلوق ہو تو تم سے پہلے پیدا ہونے والے بھی تو اسی کی مخلوق ہیں۔ مخلوق کو اگر خالق ہی کی بندگی کرنی چاہئے۔ تو جو تم سے پہلے پیدا ہوئے ہیں تو کیا انہیں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنا جائز ہے؟ یقیناً انہیں بھی اللہ ہی کی بندگی کرنی چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح اللہ کے بندے ہیں۔ بندہ ہونے کے اعتبار سے تم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ تم نے اپنے جیسے بندوں کو اللہ کی بندگی اور عبادت میں شریک کرلیا اور ان کے مجسمے اور بت بنا کر ان سے مرادیں مانگنے اور پرستش کرنے لگے کیونکہ تمام مشرک قومیں جن کا ہم آسمانی کتابوں میں تذکرہ پڑھتے ہیں ان کے بیشتر معبود وہی لوگ تھے، جو اپنی زندگی میں اپنی نیکیوں کے باعث لوگوں میں مقبول ہو گئے۔ پھر ان کے مرنے کے بعد لوگوں نے پہلے ان سے عقیدت کا اظہار کیا، پھر رفتہ رفتہ یہ عقیدت پرستش اور بندگی کی صورت اختیار کر گئی۔ مشرکینِ عرب کے جن مشہور بتوں کے نام ہم سنتے ہیں ان میں بیشتر عرب کی تاریخ کی ہر دل عزیز اور نیک نام شخصیتیں تھیں۔ جو اپنے کارناموں کے باعث لوگوں میں مقبولیت اختیار کر گئیں۔ لوگوں نے ان کے مرنے کے بعد ان کی تصویریں بنائیں، پھر ان کے مجسمے بنے، آہستہ آہستہ ان کی پوجا شروع ہو گئی۔ یہاں ان کے نام نہاد ان معبودوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ بھی تمہاری طرح اللہ کی مخلوق تھے تو تم نے ان کو خدا کیوں بنالیا؟

اس آیتِ کریمہ کے اسلوب پر غور کیجئے! یہ فرمایا جا رہا ہے کہ "لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی"۔ اس کے بعد فرمایا "وہ رب جس نے تمہیں پیدا کیا"۔ براہِ راست یہ نہیں فرمایا کہ تم اپنے خالق کی پوجا اور بندگی کرو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکینِ عرب اور دوسری قومیں بھی اللہ کو خالق ہونے کے اعتبار سے وحدہٗ لاشریک مانتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ کے سوا مخلوقات کا خالق کوئی نہیں، سب کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے۔ لیکن جہاں تک رب ہونے کا تعلق ہے، وہ اللہ کو بھی رب مانتے تھے اور اس کے سوا اور نہ جانے کس کس کو انہوں نے اللہ کی صفتِ ربوبیت میں شریک کر رکھا تھا۔ سورۃ فاتحہ کے درس میں ہم نے رب کے لفظ کی بھی وضاحت کی ہے وہاں دیکھ لینا چاہئے۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہاں شائد اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اے مشرکینِ عرب! تم نے تو اپنے بتوں اپنے بزرگوں، اور اپنے قومی سرداروں کو اللہ کی ربوبیت میں شریک کر رکھا ہے۔ اسی طرح اے اہلِ کتاب! تم اپنے اَحبار و رُہبان کو رب بنا چکے ہو حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ رب تو صرف وہ ذات ہے جو تمہاری خالق بھی ہے۔ اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ چونکہ اسی کی صفتِ ربوبیت زندگی بھر تمہاری تربیت کرتی، ضروریاتِ زندگی فراہم کرتی اور نوازشات سے گراں بار کرتی رہتی ہے کہ وہ تمہاری رب ہو یعنی اسے حِلّت و حرمت کا اختیار ہو وہی تمہارے لئے آخری سند اور اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہو۔ اسی کے احسانات کا تقاضا ہے کہ اسی کے سامنے سجدۂ شکر بجالایا جائے اور اسی کے احکام کے سامنے سر جھکایا جائے۔ اس طرح سے اللہ کی ربوبیت کا ذکر فرما کر اسے ہر طرح کی پرستش، بندگی اور غلامی کا مستحق ٹھہرا کر اور اسے خالق قرار دے کر، تمام اہلِ مذاہب کے مسلّمہ عقیدے کو بنیاد بنا کر، اس کے لازم کی حیثیت سے دلیل کے طور پر پیش فرمایا۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ "لوگو! بندگی کرو اپنے رب

Marfat.com

کی''، کیونکہ رب ہی اپنے احسانات اپنی کرم فرمائیوں اور اپنے مربی ہونے کے باعث ہر طرح سے تمہاری بندگی کا مستحق ہے۔ مزید فرمایا کہ اس لئے بھی اس کی بندگی کرو کیونکہ خود تمہارے عقیدے کے مطابق وہ تمہارا خالق بھی ہے۔ تمہارے اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جسے تم خالق مانتے ہو اسی کو رب مانو اور اسی کو ہر لحاظ سے اپنا معبود، اپنا آقا، اپنا حاکم حقیقی اور اپنا راہنما تسلیم کرو اور یہ حکم جو تمہیں دیا جا رہا ہے یہ اس لئے نہیں کہ اللہ تمہاری بندگی کا محتاج ہے ساری کائنات اس کے قانونِ تکوینی کی پابند ہے۔ کوئی پتہ اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا سب اس کے حکم کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں اگر تم اس کی بندگی نہیں کرو گے۔ تو اس کی کبریائی اور حاکمیت میں کوئی فرق نہیں پڑیگا۔ تمہیں یہ حکم اس لئے دیا جا رہا ہے تا کہ تم بے ایمانی اور بداعمالی کے انجام سے بچ جاؤ، تا کہ تم اللہ کے غضب سے بچ جاؤ، تا کہ اللہ کے عذاب سے بچ جاؤ کیونکہ جو غلام اپنے آقا کی فرمانبرداری نہیں کرتا، اسے یا تو سزا دی جاتی ہے اور یا اسے کسی دوسرے ظالم آقا کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم بھی اللہ کی بندگی نہیں کرو گے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا حادثہ پیش آسکتا ہے اور آج اگر ہم تدبر سے کام لیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پورا عالم اسلام اسی حادثے کی گرفت میں ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ کو خالق قرار دے کر تمام نوع انسانی کو ان کے مخلوق ہونے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس طرح سے ان کے سامنے دلائل انفس میں سے ایک دلیل نفسی کا ذکر فرمایا کہ تم جب مخلوق ہونے کی حیثیت سے اپنی حالت پر غور کرو گے اور اپنی حیثیت سمجھنے کی کوشش کرو گے تو تم یقیناً اس نتیجے پر پہنچو گے کہ ایک مخلوق کو اپنے خالق کی ہی بندگی کرنی چاہئے۔

توحید اور اللہ کی بندگی پر دلائلِ آفاق سے استدلال:

دوسری آیتِ کریمہ میں اللہ کی توحید اور بندگی کیلئے صرف اسی کے مستحق ہونے پر دلائل آفاق میں سے چند دلیلیں ذکر فرمائی جارہی ہیں اور دلائل کا انداز اس قدر سادہ، اس قدر دلنشیں اور اس قدر دل میں اتر جانے والا ہے کہ وہ جس طرح ایک ان پڑھ اور جاہل کو اپیل کرتا ہے، بالکل اسی طرح ایک عالم فاضل اور ایک دانشور کو بھی متوجہ کرتا ہے۔

غور فرمایئے! اس آیت کریمہ میں اللہ کی توحید پر جو دلیل پیش فرمائی ہے اس میں چار چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے اور وہ چاروں چیزیں ایسی ہیں جو ہر ایک کی ضرورت بھی ہیں اور ہر ایک کی نگاہوں میں بھی رہتی ہیں ان سے صرف نظر نہ عالم کر سکتا ہے نہ جاہل، لیکن دونوں ان سے اپنے اپنے طریقے سے متمتع ہوتے ہیں۔ ایک جاہل جب اس آیت کو سنتا ہے کہ میرا اللہ وہ ہے جس نے جس طرح مجھے پیدا کیا اسی طرح اس نے میری ضروریات بھی فراہم کیں۔ میرے دنیا میں آنے سے پہلے اس نے یہاں ایک ایسا کارخانہ بسا دیا جہاں سے مجھے ہر ضرورت میسر آسکتی ہے۔ اس نے سب سے پہلے مجھے ٹھکانہ دیا اور آغوش مادر کی طرح میرے لئے زمین کا بچھونا بچھا دیا۔ اور زمین کو اس طرح بچھایا کہ ایک تھکاوٹ سے چور آدمی جب ننگی زمین پر آرام حاصل کرنے کیلئے لیٹتا ہے تو وہ بالکل اس طرح گہری نیند میں ڈوب جاتا ہے جیسے بچہ اپنی ماں کی گود میں سو جاتا ہے۔ نہ اسے لوہے کی طرح سخت بنایا کہ آدمی اس پر لیٹ نہ سکے نہ اسے اتنا نرم بنایا کہ آدمی اس میں دھنس کے رہ جائے باوجود اس کے کہ اس کی مٹی انسان کے لئے نرم بنائی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں تحمل اور برداشت ایسی رکھی کہ پہاڑوں کا بوجھ اٹھاتی اور انسانی عمارتوں کو سہارا دیتی ہے اور اس استقلال اور استقامت کے ساتھ ساتھ نرمی اتنی رکھی کہ ہر غلے کے دانے دانے کو اس طرح پالتی ہے جیسے ماں اپنے بچے کو اپنی آغوش میں جھولا دیتی ہے۔ پھر آسمان کو بنایا تو ایسا مزین کہ اندھیرا ہوتے ہی جب آدمی اداسی میں ڈوبنے لگتا ہے تو آسمان پر

Marfat.com

روشن قندیلیں اس کے دل کو لبھانے لگتی ہیں۔ آسمان کے قلب میں چمکنے والا چاند اسے محبت کے گیت سناتا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی ضرورت پانی ہے۔ چنانچہ آسمان سے چھم چھم پانی برسایا گیا۔ جس نے ایک طرف پیاس بجھانے کا سامان کیا اور دوسری طرف زمین کی آبیاری کی اور پھر ندی نالوں چشموں اور آبشاروں کی شکل میں حسن و جمال کا ایک ایسا مرقع تیار کیا جس نے نہ جانے کتنے اجاڑ اور محزون دلوں کو خوشیوں کا خزانہ بخشا۔ پھر اسی پانی اور زمین کے ملاپ سے انسان کی غذائی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ پانی زمین کو سینچتا ہے۔ زمین کی قوت روئیدگی ہر بیج کی تربیت کرتی ہے۔ کہیں سبزا سر اٹھا رہا ہے کہیں فصلیں لہلہا رہی ہیں کہیں قد آور درخت کھڑے سایہ دے رہے ہیں یا پھل دے رہے ہیں کہیں بیلیں بچھی جا رہی ہیں۔ جو اپنے دامن میں سبزیاں اور پھلوں کو لئے خوانِ نعمت آراستہ کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: لوگو! فیصلہ کرو یہ زمین کا بچھونا، آسمان کی چھت، زمین کی قوت روئیدگی اور پانی کا بادلوں سے برس کر تمہاری پیاس کا سامان کرنا اور زمین کو سینچ کر تمہاری غذائی ضرورتوں کو پورا کرنا کیا یہ سب کچھ اللہ کے سوا کوئی اور کر سکتا ہے؟ اور تم جانتے ہو کہ یہ کام اور کوئی نہیں کر سکتا نہ تم کر سکتے ہو اور نہ وہ کر سکتے ہیں جن کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے۔ تو پھر خود سوچو تم نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کیوں بنایا۔ ایسا بے عقلی کا کام کسی کو بھی زیب نہیں دیتا اس لئے اس سے توبہ کرو اور اللہ ہی کو اپنا معبودِ برحق اور وحدہٗ لاشریک خدا مانو۔

لیکن جب انہیں نعمتوں پر ایک عالم اور دانشور غور کرتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ یہ زمین کہاں سے آئی؟ ماہرینِ ارض نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ آج سے ہزار ہا صدیوں پہلے ایک بہت بڑا ستارہ سورج کے قریب سے گزرا۔ زورِ کشش سے سورج کے چند ٹکڑے کٹ کر دور خلا میں گھومنے لگے، ان میں سے ایک زمین تھی۔ ان ٹکڑوں کو قریب کے ستاروں نے کھینچ کر متوازن کر دیا۔ زمین کی دو حرکتیں ہیں۔ ایک اپنے گرد جو 24 گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے اور دوسری آفتاب کے گرد جو 365 دن لیتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق زمین کو آفتاب سے جدا ہوئے آج 2 ارب صدیاں گزر چکی ہیں لیکن ان گردشوں میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا۔ ورنہ علمائے ہیئت کے تمام حساب غلط ہو جاتے۔ اپنے گرد زمین ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے اور آفتاب کے گرد 68000 میل فی گھنٹہ کے حساب سے۔ اگر اس کی پہلی رفتار کو دس گناہ کم کر دیا جائے تو شب و روز دس گنا لمبے ہو جائیں گے۔ جون میں 140 گھنٹے کا گرم دن زمین کو جھلس کر رکھ دے گا اور جنوری کی اتنی ہی طویل رات ہر شے کو منجمد کر دے گی اور اگر اسے بڑھا دیا جائے تو ہر شے کا وزن کم ہوتا جائے گا اور جب یہ رفتار 16200 میل فی گھنٹہ تک پہنچے گی تو کسی چیز میں کوئی وزن نہیں رہے گا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا درختوں اور مکانوں کو گرا دے گا اور ہاکی کا بال ہٹ ہونے کے بعد ہوا میں اڑ جائے گا اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔

زمین کا وزن پانچ ارب بلین ٹن ہے۔ اگر آدھا ہوتا، تو کششِ ثقل نصف رہ جاتی اور اشیا کا وزن آدھا ہو جاتا۔ اگر یہ وزن دوگنا ہوتا، تو ہر چیز کا وزن ڈبل ہو جاتا۔

زمین سورج سے تقریباً 9 کروڑ 29 لاکھ میل دور ہے۔ اگر یہ فاصلہ کم ہوتا، تو ہم گرمی سے مر جاتے اور زیادہ ہوتا تو سردی سے مر جاتے۔ کرۂ زمین کا رخ آفتاب کی طرف بالکل سیدھا نہیں، بلکہ 23 درجہ کے قریب ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ یہی جھکاؤ موسموں کا سبب ہے، اگر ایسا نہ ہوتا، تو ہر دن پچھلے دن جیسا ہوتا اور ہم سردی و گرمی، بہار اور برسات کے مناظر، غذاؤں اور پھلوں سے محروم رہ جاتے۔

آغاز آفرینش میں جب زمین ٹھنڈی ہوئی، تو دو گیسیں یعنی نائٹروجن اور آکسیجن باہم مل کر ہوا میں تبدیل ہو گئیں۔ نائٹروجن کی مقدار 78.3 تھی اور آکسیجن 20.99۔ آکسیجن ایک آتش پذیر گیس ہے۔ اگر فضا میں اس کی مقدار زیادہ ہوتی، تو آسمانی بجلی کے

Marfat.com

ایک شرر سے آگ بھڑک اٹھتی اور سب کچھ جل جاتا اور اگر موجودہ مقدار نصف ہوتی، تو نہ چولہوں میں آگ جلتی اور نہ حیوانی زندگی باقی رہتی۔ کرۂ ہوا میں ذراتِ گرد اور آبی بخارات اور گیسوں کی وجہ سے کچھ کثافت ہو جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو لاتعداد شہاب، جو کثیف ہوا کی رگڑ سے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں ہم پر اتنے شرر اور پتھر برساتے کہ زندگی ختم ہو جاتی۔

یہ تو زمین سے متعلق بے شمار حقائق میں سے چند حقائق ہیں جنہیں سائنس اور تحقیق کی نگاہ دیکھ سکی ہے۔ رہے اس کی افادیت کے وہ پہلو جن کا تعلق انسان کی غذائی ضروریات سے ہے۔ اس کیلئے اور کچھ نہیں تو انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے پر ہی غور کرے کہ یہ آخر کہاں سے آتا ہے کہ انسان اپنی غذا کیلئے دانۂ گندم زمین میں کاشت کر کے اسے دفن کر کے آجاتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ دانہ مرجائے، مگر بجائے مرنے کے اس میں زندگی کی سوئی پھوٹتی ہے، جو بڑھتے بڑھتے تنا بنتی ہے۔ پھر اسے خوشے لگتے ہیں۔ خوشوں میں دانوں کے موتی بھر دیئے جاتے ہیں۔ سورج کی کرنیں پانی کے ڈول بھر بھر کر فضا میں ابر کی چادریں پھیلا دیتی ہیں۔ ابر پانی برسا کر کھیتی کی آبیاری کا سامان کرتا ہے، سورج اسے گرمی پہنچاتا ہے، چاند اسے حلاوت دیتا ہے، ہوا اسے لوریاں دیتی ہے، زمین اپنی قوت نمو بروئے کار لاتی ہے اور پھر قدرت نہ جانے کیسی کیسی قوتوں کو وہاں کام میں لا کر انسان کے لئے غذا فراہم کرتی ہے۔ سائنس دان کہتا ہے کہ نائٹروجن حیوانی و نباتاتی حیات کا لازمی جزو ہے۔ یہ دو طریقوں سے زمین میں داخل ہوتی ہے۔ اول خوردبینی اجرام یا بکٹیریا کے ذریعے جو زمین کی بالائی تہہ میں رہتے ہیں اور کھاد وغیرہ کھا کر ایک ایسا رس خارج کرتے ہیں، جن میں نائیٹروجن بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نصف چھٹانک زمین میں ان کی تعداد ایک کھرب پینتیس ارب کے قریب ہوتی ہے اور زمین کے ہر ایکڑ میں ان کا کام بارہ آدمیوں کے برابر ہوتا ہے۔ اگر 100 ایکڑ کھیت میں 10 کسان ہل چلا رہے ہیں تو 1200 مزدوروں کا ایک مخفی لشکر بھی وہاں کام کر رہا ہوتا ہے۔ غور فرمایئے !! اس غذا کو مہیا کرنے اور اسے پروان چڑھانے میں انسان کا حصہ کتنا ہے اور اللہ کا کتنا؟ پروردگار خود فرماتے ہیں:

اَفَرَءَیْتُم مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ

(کیا تم نے اپنی کھیتی پر کبھی غور کیا۔ زراعت کون کرتا ہے تم یا ہم؟)

زمین کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی ان عنایات کو سامنے رکھو اور پھر بتاؤ۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب

انسان کی دوسری فوری اور ناگزیر ضرورت پانی ہے۔ آدمی پانی کی حقیقت پر غور کرے اور پھر اس کے فوائد سمجھنے کی کوشش کرے، تو اللہ کی قدرت نمایاں نظر آتی ہے۔ جس کے آئینے میں انسان اپنے پروردگار کو دیکھ سکتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس قدر فراخی اور

Marfat.com

وسعت کے ساتھ اللہ نے پانی کے خزانے پیدا فرمائے ہیں۔زمین کی تخلیق کے ساتھ جب پانی کو پیدا فرمایا گیا،تو کس طرح قیامت تک کی مخلوقات کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا۔ نہ جانے کتنے زمانے گزر گئے،لیکن آج تک پانی کے خزانوں میں کبھی کمی نہیں آئی اور پھر چونکہ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے،جس سے انسان کبھی صرف نظر نہیں کرسکتا۔اس لئے ہوا کے بعد اس کے ناپید اکنار سمندر پیدا فرمائے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں پانی کا پہنچنا آسان نہیں کیا گیا۔کہیں سمندروں کو پیدا کیا گیا۔کہیں چشمے جاری کردیئے گئے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ انتظام فرمایا کہ سردیوں میں پہاڑوں پر برف جما کر گرمیوں میں اسے پگھلا کر زمین کی آبیاری کا سامان کردیا گیا اور پھر ایک ایسا حیرت انگیز انتظام دیکھنے میں آتا ہے کہ سمندر سے بھاپ اٹھا کر بادلوں کی چادریں بچھائی جاتی ہیں اور انہیں اس طرح برسایا جاتا ہے کہ زمین کا ایک ایک ریشہ معمور ہو جاتا ہے اور پھر ایسا نہیں ہوتا کہ سارا پانی زمین میں جذب ہو جائے اور زمین دلدل بن جائے اور نہ ایسا ہوتا ہے کہ سارا پانی بہہ جائے اور ندی نالوں میں پہنچ جائے اور زمین مناسب آبیاری سے محروم رہ جائے۔بلکہ قرآن کہتا ہے کہ ضرورت کے مطابق ہم پانی زمین میں جذب کرتے ہیں جہاں مزید ضرورت ہوتی ہے اس کو روک دیتے ہیں اور باقی پانی ہم ندی نالوں اور جدولوں کی شکل میں واپس دریاؤں اور سمندروں میں لے جاتے ہیں اور پھر پانی کے اوصاف کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے اور بے ساختہ اپنے رب کی یاد آنے لگتی ہے۔ان میں چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ پانی کو سیال پیدا کیا گیا۔اگر ایسا نہ ہوتا تو اس سے پیاس بجھتی،نہ کپڑے صاف ہوتے اور نہ کھیتیاں سیراب ہوتیں۔

۲۔ جب پانی جمنے لگتا ہے تو وہ کثیر مقدار میں حرارت خارج کرتا ہے۔جس سے نیچے کا پانی متاثر ہوتا ہے اور غیر منجمد رہتا ہے۔اگر سردیوں میں سارا پانی جم جاتا تو تمام مچھلیاں اور پانی کے دیگر جانور مر جاتے۔

۳۔ برف پانی سے ہلکی ہوتی ہے یہ پانی کی سطح پر رہ کر نیچے کے پانی کو انجماد سے بچاتی ہے۔

۴۔ اگر سمندر منجمد ہوتے تو دنیا سردی سے ہلاک ہو جاتی،اگر ابل رہے ہوتے تو گرمی سے مر جاتی۔اس کا اعتدال ہی بقائے حیات کا باعث ہے۔

نباتات سے استدلال

اسی طرح جب ہم اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نباتات کی چاروں طرف پھیلی ہوئی ایک دنیا دکھائی دیتی ہے۔درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں،سبزے کی چادریں بچھی ہوئی ہیں،فصلیں لہلہا رہی ہیں۔لیکن کبھی ہم نے نباتات کے اعجاز پر غور نہیں کیا کہ یہ نباتات صرف کائنات کا حسن ہی نہیں یہ ہمارے لئے مدار حیات بھی ہیں۔یہ غلہ اور پھل جو ہم کھاتے ہیں،سب نباتات سے حاصل ہوتے ہیں یہ ربڑ،یہ کاغذ،یہ کوئلہ،یہ تیل،یہ صابن،سب نباتات کا کرشمہ ہے۔ہماری الماری میں سجی ہوئی کتابیں وہ جنگل ہیں جنہیں مزدور کاٹ کر کاغذ کے کارخانوں تک لے گئے تھے۔پھولوں کے ننھے پودے سے لے کر چنار کے درخت تک آپ کو نباتات کی کروڑوں اقسام نظر آئیں گی۔ان میں کچھ باغوں کی آرائش ہیں،کچھ ہماری غذا ہیں اور کچھ متاعِ حیات،یہ سب ایک ہی زمین سے اگتی ہیں اور ایک ہی پانی سے نشوونما پاتی ہیں۔لیکن کمالِ تخلیق دیکھئے کہ سب کی حیثیت،رنگ،قامت،تاثیر،بو اور ذائقہ الگ الگ ہے۔

Marfat.com

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ.

(زمین کے پاس پاس ایسے قطعات ہیں جن میں کہیں کھیتی، کہیں انگور اور کہیں کھجور کے درخت ہیں۔ان میں سے کچھ ایک جڑ سے نکلتے ہیں اور کچھ الگ جڑوں سے۔ان سب کی پرورش ایک ہی پانی سے ہوتی ہے لیکن ان کے ذائقے الگ الگ ہیں۔ان باتوں میں ارباب دانش کیلئے کتنے ہی اسباب وشواہد موجود ہیں)

درخت اپنے پتوں کا دامن ہوا اور سورج کے سامنے پھیلا کے ان سے زندگی کی بھیک مانگتے ہیں۔ان کی جڑیں بطنِ زمین سے پانی اور غذا لے کر بلند شاخوں تک پہنچاتی ہیں اور پھلوں میں رس، مٹھاس اور خوشبو بھرتی ہیں۔کیا یہ سب کچھ اتفاقاً ہو رہا ہے اور اس انتظام کے پیچھے کوئی ہمہ بین آنکھ اور ہمہ دان دانش کارفرما نہیں؟ ہر صحیح الدماغ آدمی کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔یہ جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے یہ اتفاقاً نہیں ہو رہا ہے بلکہ دنیا کی کوئی طاقت ایسا کرنا بھی چاہے تو اسے ہرگز اس کی قدرت نہیں یہ تو سب کچھ اس ذات بابرکات کے حکم سے ہو رہا ہے جو اس کائنات کی خالق و مالک اور اس کی رب ہے۔اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اقرار کئے بغیر چارہ نہیں۔قرآنِ کریم اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے بعد ارشاد فرماتا ہے کہ جب اس کائنات کی تخلیق اور اس کی ربوبیت میں اللہ کا کوئی شریک نہیں اور تم اس حقیقت کو خوب جانتے ہو کیونکہ یہ فطرت کی پکار اور عقل کا تقاضا ہے۔اس لئے تم پر لازم ہے کہ کسی کو اللہ کا ند نہ بناؤ۔ انداد "ند" کی جمع ہے۔جس کے معنی ہمسر، ہم پایہ، مدمقابل، مشابہ اور کفو کے ہیں۔

دلیلِ تخالف

اس آیت کریمہ پر اگر مزید تدبر کی نگاہ ڈالیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اس آیت میں جتنی چیزوں کا ذکر فرمایا ہے وہ سب ایک دوسرے کی ضد ہیں۔مثلاً زمین اور آسمان، پانی اور مٹی، زمین کے اندر کا بیج اور اوپر مٹی کی تہہ اور پھر بارش کا برسنا۔ان تمام میں نسبت ضد اور مخالف کی ہے بلکہ قدرت نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز میں ثنویت رکھی ہے اور ان کے اندر باہمی تضاد رکھا ہے۔اسی لئے ارشاد فرمایا:

وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ

(ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے)

ان میں باہمی نسبت، سازگاری کی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد کی ہے۔بایں ہمہ ان کے درمیان ہمیں حیرت انگیز توافق اور سازگاری نظر آتی ہے۔بجائے ایک دوسرے سے ٹکرانے اور الجھنے کے ایک دوسرے کے وجود کی حفاظت اور مقصد تخلیق کی تکمیل میں اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ ایک کا بغیر دوسرے کے وجود بالکل بے معنی دکھائی دیتا ہے۔خود انسان ہی کو دیکھئے اس کو مرد اور عورت کی دو انواع میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور پھر دونوں کو الگ الگ طبعی خصوصیات، جبلی صفات اور اندرونی احساسات کا اختلاف دے کر بالکل ایک دوسرے سے الگ الگ شخصیتیں بنا دیا گیا مگر دونوں میں ایک دوسرے کی کشش اور ایک دوسرے کی تکمیل کی فکر اس طرح دلوں میں راسخ کر دی گئی کہ مرد کے پاس جو کچھ ہے وہ عورت کیلئے مطلوب و مرغوب بنا دیا گیا اور عورت کے پاس جو کچھ ہے اسے مرد کے تقاضوں کا جواب ٹھہرایا گیا۔اس طرح باہم ایک

Marfat.com

دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہو گئے ہیں یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے۔ زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت و برودت، سب زوجین کی طرح ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں مگر باہم شدید اتصال بھی رکھتے ہیں۔ حتی کہ ایک کا دوسرے کے بغیر وجود بے مقصد معلوم ہوتا ہے توافق کا یہ قانون ہم صرف ضدین میں ہی نہیں پاتے بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق اور سازگاری ہے۔

ہر چیز اپنی ہستی کی بقاء اور اپنے وجود کی نشوونما کے لئے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لئے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا ہی لے لیجئے، یہ اپنے وجود میں کمال کو نہیں پہنچ سکتا تاوقتیکہ زمین اس کے لئے گہوارے کا کام نہ دے، سورج اس کے لئے سمندر سے پانی کے ڈول بھر بھر کر فضا میں ابر کی چادریں پھیلا کر اس کے لئے آبیاری کا سامان نہ کرے، موسم اس کے لئے نگرانی کا فرض انجام نہ دے، چاند اس کو ٹھنڈک نہ پہنچائے، سورج اس کے لئے گرمی مہیا نہ کرے اور ہوائیں اس کو لوریاں نہ دیں، یہ سارے عناصر باہم مل جل کر سرگرم کار رہتے ہیں۔ تب جا کر گندم کا ایک پودا اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے اور گیہوں کا ایک دانہ تیار ہو کر خرمن تک پہنچنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس پوری صورتحال کو نگاہوں میں رکھئے اور پھر اندازہ فرمایئے! اگر یہاں اللہ کے سوا کسی اور کی حکومت ہوتی اور اس ربوبیت کے عمل میں کوئی اور بھی شریک ہوتا تو کیا متضاد عناصر میں یہ حیرت انگیز توافق پیدا ہو سکتا۔ اگر زمین کے اندر کسی اور دیوتا کا ارادہ کارفرما ہوتا اور آسمان میں کسی اور کی خدائی چل رہی ہوتی تو مختلف ارادوں کے تصرفات میں یہ موافقت اور یہ سازگاری کس طرح پیدا ہو سکتی۔ اس لئے کائنات کا ذرہ ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں اگر ایسا ہوتا تو یہ کائنات اولاً تو وجود میں نہ آتی اور اگر آتی تو باقی نہ رہ سکتی۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ○

(اگر تم شک میں ہو اس چیز کی جانب سے جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے۔ تو لاؤ، اس کے مانند کوئی سورت اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو ○ پس اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو پھر ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر بنیں گے، جو تیار کی گئی ہے کافروں کیلئے) (البقرۃ: ۲۳ تا ۲۴)

عقیدۂ رسالت پر قرآنِ کریم سے استدلال

سابقہ دونوں آیتوں میں ایک اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہوئے اس کی توحید پر مخلوقات کی تخلیق انسان کیلئے ان کی افادیت، ان کے درمیان تنوع اور تضاد اور باہمی توافق کو بطور دلیل کے بیان فرمایا گیا ہے۔ اب پیش نظر دو آیتوں میں اسلام کے دوسرے بنیادی عقیدے کو ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ جسے ہم رسالت کہتے ہیں اور اس پر قرآنِ کریم کو بطور دلیل کے پیش کیا جا رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب نبوت اور رسالت کا دعویٰ فرمایا تو ہر قوم کی طرح آپ کی قوم نے بھی آپ سے آپ کی نبوت کی دلیل مانگی۔ آپ نے اس پر دو دلائل بیان فرمائے۔ سب سے

Marfat.com

پہلے اپنے ذاتی کردار کو پیش کیا اور کوہ صفا پر کھڑے ہو کر لوگوں سے برملا سوال کیا کہ کیا زندگی میں میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے؟ تمہیں کبھی مجھ سے غلط بیانی کا تجربہ ہوا ہے؟ جب سب نے اعتراف کیا کہ چالیس سالوں میں ہم نے آپ کو ہمیشہ الصادق اور الامین پایا تو تب آپ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا اور یہ بتلایا کہ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے مجھ پر اللہ کی وحی اترتی ہے اللہ کا سب سے مقرب فرشتہ جبریل مجھ پر قرآن کریم نازل کرتا ہے۔ ایک طرف تم میری ذات کی صداقت کو دیکھو اور دوسری طرف مجھ پر اترنے والی کتاب کو ملاحظہ کرو۔ قوم آپ کی صداقت کے اعتراف کے باوجود آپ کی نبوت کی تصدیق کیلئے تیار نہ ہوئی اور قرآنِ پاک کو جھٹلانے کیلئے انہوں نے مختلف طریقے اختیار کئے جسے ہم ایک ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم پر کفار کے اعتراضات اور ان کا جواب

۱۔ کبھی تو یہ کہا کہ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ کتاب تم پر اللہ کی طرف سے اترتی ہے بلکہ ہمارا گمان یہ ہے کہ تم اسے خود لکھ لیتے ہو محنت سے چند فصیح و بلیغ بول بنا لیتے ہو اور اسے ہمارے سامنے پیش کر کے یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اسے اللہ نے اتارا ہے۔

۲۔ کبھی یہ کہا کہ معلوم ہوتا ہے اس کتاب کی تیاری میں کوئی تمہاری مدد کرتا ہے۔ یہ ایک سازش ہے جسے مختلف لوگوں نے مل کر تیار کیا ہے اور مقصود اس سے قوم کے شیرازے کو پارہ پارہ کرنا ہے۔

۳۔ اور کبھی یہ کہا کہ قرآنِ کریم دراصل ایک شاعری ہے۔ اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو اسے شاعری کے مضامین اور شعر کا اسلوب القاء کرتا ہے۔ اسی طرح تم پر بھی کسی جن کا اثر ہے وہی تم پر اس کتاب کی آیات اتارتا ہے اور اسی کو تم لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہو۔

قرآنِ کریم نے اسی ترتیب سے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ سب سے پہلے یہ بات فرمائی کہ تم کہتے ہو محمد ﷺ خود اس کتاب کے مصنف ہیں۔ اگر واقعی یہ بات صحیح ہے تو پھر اس کا فیصلہ کوئی مشکل بات نہیں۔ اس لئے کہ تم جانتے ہو کہ محمد ﷺ تمہاری طرح قریش کے ایک فرد ہیں۔ تمہاری ہی طرح آپ مکہ میں پروان چڑھے ہیں۔ تمہارے ہی ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے ہیں۔ جن لوگوں سے ملنے کا تمہیں اتفاق ہوا ہے انہیں سے وہ ملے ہیں۔ انہوں نے بیرون ملک چند دنوں کے چند سفر کئے ہیں جبکہ تم بہت زیادہ سفر کر چکے ہو اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ مکہ اور گرد و پیش میں کوئی تعلیمی ادارہ نہیں جس سے وہ علم حاصل کر سکتے جس طرح تم اُمی ہو وہ بھی اُمی ہیں۔ اس کے باوجود تمہارے دعویٰ کے مطابق اگر وہ ایسی آیات تیار کر لیتے ہیں جسے وہ اللہ کا کلام کہہ کر پیش کرتے ہیں اور اسی کو کتاب اللہ کہتے ہیں تو تمہارے لیے کیا مشکل ہے کہ تم بھی ویسی ہی کتاب یا ویسی ہی آیات بنا کر لے آؤ اور اگر تم انفرادی طور پر ایسا نہیں کر سکتے ہو تو تم سب اہل مکہ اور باہر کے لوگوں کو بھی ساتھ ملا کر کوشش کر دیکھو اگر تمہاری طرح کا ایک شخص بقول تمہارے کچھ لوگوں کو ساتھ ملا کر ایک کتاب تیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ تم کسی کا نام بھی نہیں لیتے ہو تو تمہارے ساتھ مدد کرنے کیلئے تو بے شمار لوگ موجود ہیں تم میں بڑے سے بڑا خطیب موجود ہے ایسے ایسے شاعر موجود ہیں جن کی دھاک پورے عرب میں بیٹھی ہوئی ہے۔ تم سب کو اپنے ساتھ بٹھاؤ اور انہیں مجبور کرو کہ وہ اس کتاب کا جواب تیار کریں اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ کوئی جن قرآنِ کریم کی تیاری میں آپ کی مدد کر رہا ہے تو تمہارے تو جنات سے دیرینہ رشتے ہیں تمہارے کاہن ان سے تعلق کا ہمیشہ دعویٰ کرتے ہیں تم ہمیشہ ان کے نام کی جے پکارتے ہو اور ہر مشکل میں ان سے مدد طلب کرتے ہو تم انہیں بھی اپنی مدد کیلئے بلا لو۔ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ واقعی جنات

Marfat.com

انسانوں کی مدد کرتے ہیں تو ایسا موقعہ جس میں تمہارے دین کی سچائی کا سوال ہے، یقیناً جن تمہاری مدد کریں گے۔ اپنے سارے شعراء ،خطباء، فصحاء اور جنات کی مدد سے تم اس بات کو جھوٹا ثابت کر دو کہ قرآنِ کریم اللہ کی کتاب ہے اور جس کی مثال لانا کسی کے بس میں نہیں۔

قرآن کریم کا چیلنج

قرآنِ کریم نے تین شکلوں میں یہ چیلنج دیا ہے۔ پہلے تو فرمایا کہ جن وانس مل کر اس قرآن جیسا کوئی قرآن بنا کر لائیں۔ جب اس کے جواب میں خاموشی رہی۔ لیکن مخالفت جاری رہی تو پھر فرمایا اس جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور جب یہ بھی نہ ہو سکا تو پھر فرمایا: فاتوا بسورۃ من مثلہ ''اس جیسی ایک ہی سورت بنا کر لے آؤ''۔ اندازہ کیجئے! اس سے ہلکا چیلنج اور کیا ہو سکتا ہے کہ صرف ایک سورت بنا کر لائی جائے کیونکہ سورت سے مراد کوئی بڑی سورت نہیں سورۃ الکوثر جیسی تین بولوں پر مشتمل سورۃ ہی پیش کر دو تب بھی چیلنج کا جواب ہو جائے گا، لیکن اگر تم ایسا نہ کر سکو اور یقیناً نہیں کر سکو گے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنی واضح دلیل اور اتنی مضبوط حجت قائم ہو جانے کے بعد بھی تم اگر رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لاؤ اور آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کرو اور قرآن کریم کو اللہ کی کتاب نہ مانو تو پھر اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اولاً دنیا ہی میں عذاب آئے اور اگر اللہ کی مشیت سے تم دنیا میں عذاب سے بچ جاؤ تو پھر جہنم کی اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ یہاں جن پتھروں کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد عام پتھر نہیں بلکہ وہ پتھر ہیں جنہیں بتوں کی شکل میں یا استھان کی شکل میں پوجا گیا ہو۔

بتوں کو عذاب دینے کی وجہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرک اور کفر وہ آتش گیر مادے ہیں جس سے جہنم کی آگ بھڑکتی ہے۔ جن انسانوں میں یہ مادہ ہو گا وہ بھی اسی آگ کی تیزی کے کام آئیں گے اور جن پتھروں میں اس شرک کی آمیزش ہو گی انہیں بھی ایندھن کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے اس کی وضاحت بھی کر دی ہے ارشاد فرمایا: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ''بے شک تم اور جن کی تم پوجا کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہو گے''۔ یعنی جن بتوں کو تم پوجتے ہو جو پتھروں سے تراشے جاتے ہیں انہیں بھی جہنم میں ڈالا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح ان میں شرک کا آتش گیر مادہ موجود ہے جس کی وجہ سے جہنم کی آگ بھڑکے گی اسی طرح انہیں جہنم میں ڈالنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب یہ لوگ اپنے ساتھ انہیں بھی جہنم میں جلتا ہوا دیکھیں گے تو تب انہیں اندازہ ہو گا کہ جنہیں ہم خدا بنائے بیٹھے تھے ان کی اصل حقیقت کیا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ عرب اپنی فصاحت کلام میں یکتا تھے۔ ان کی طلاقت لسانی اور شعر گوئی کا پوری دنیا میں جواب نہ تھا اس لئے ان کیلئے قرآنِ کریم کا جواب دینا کوئی مشکل نہ تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے اگر جواب نہیں دیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جواب دے نہیں سکتے تھے بلکہ انہوں نے اسے درخور اعتناء نہیں سمجھا اور اپنی حیثیت سے اسے بہت فروتر جانا۔ لیکن اس طرح کی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو عربوں کے مزاج سے ناواقف ہو اور جس کے سامنے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں برپا ہونے والی کشمکش کی تاریخ نہ ہو۔ ورنہ جو آدمی عربوں کے مزاج سے آگاہی رکھتا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ عربوں میں غیرت وحمیت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی جس طرح وہ جنگ میں پیچھا دکھانے کو موت سے بدتر خیال کرتے تھے اسی طرح اگر انہیں خطابت یا شاعری میں مقابلے کا چیلنج دیا

Marfat.com

جاتا تو وہ اسے غیرت کا مسئلہ بنا لیتے اور جب تک اپنے مقابل کا چیلنج قبول کرتے ہوئے جواب نہ دے لیتے انہیں چین نہیں آتا تھا۔ ملک کے دور دراز کسی کونے کا کوئی آدمی ملک کے دوسرے کنارے پر رہنے والے کسی آدمی کی ہجو کہتا تھا تو یہ لمبا سفر کر کے اس کا جواب دینے کیلئے وہاں پہنچتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات کی رہنمائی میں اٹھنے والی تحریک کا 21 سال تک عربوں نے اس طرح مقابلہ کیا کہ اس کیلئے بیسیوں لڑائیاں لڑیں۔ اپنے بھائی بند اور بچے قتل کرائے مسلمانوں کو ہر طرح کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ اسی کشمکش میں عرب کی سرزمین ان کیلئے تنگ ہوگئی، خوش نصیب اسلام کی آغوش میں آگئے۔ بدنصیب قتل ہوگئے یا ملک سے بھاگ گئے۔ جزیرۂ عرب کی حد تک کفر مکمل طور پر فنا ہوگیا۔ جس قوم نے ایسی جانگسل کشمکش میں پیچھا نہ دکھایا اور جس نے خوں ریز معرکوں میں اپنے کفر سے کبھی پسپائی اختیار نہ کی ہو۔ اس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ انہوں نے مخالفت میں سب کچھ کیا لیکن یہ قرآن کریم کا چیلنج اس لئے قبول نہ کیا کہ وہ ان کے نزدیک چنداں اہمیت کا حامل نہ تھا حالانکہ اسی پر کفر و اسلام کے معرکے کا دارومدار تھا۔ تو یہ بات کم فہمی اور بے عقلی کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ قرآن کریم میں آخر ایسی کیا بات ہے کہ قرآنِ کریم کے اس چیلنج پر صدیاں گزر گئیں اور دنیائے کفر نے اسلام کو نا کام کرنے کیلئے ہر طرح کا جتن کر ڈالا لیکن اس چیلنج کا جواب دینے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ کس قدر آسان کام ہے کہ اگر قرآن جیسی کتاب یا اس جیسی چند سورتیں یا بدرجہ آخر ایک ہی سورت لا کر پیش کر دی جائے اور دنیا کے اہلِ علم و دانش فیصلہ کر دیں کہ واقعی یہ کوشش قرآن جیسی یا قرآن سے بہتر ہے تو اسلام کے پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔

وجوہِ اعجاز

اس حوالے سے مختلف علماء نے اعجازِ قرآن کے نام سے ان وجوہِ اعجاز کو بیان کیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی مثال لانا انسان کے لئے ممکن کیوں نہیں۔ اس پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان وجوہِ اعجاز میں سے اپنی ہمت کے مطابق کچھ نہ کچھ عرض کر دیں۔

الفاظ کا اعجاز

کسی بھی کتاب کا مطالعہ شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے اس کے الفاظ سے واسطہ پڑتا ہے۔ کتاب چاہے علم وفن کے کسی شعبہ سے متعلق ہو الفاظ کا استعمال تو ہر مضمون کی ضرورت ہے۔ اگر الفاظ فصاحت و بلاغت کی ٹکسال سے ڈھل کے نکلے ہیں تو پہلے ہی مرحلہ میں کتاب کا قاری کتاب کے مطالعے میں ایک لذت اور فرحت محسوس کرتا ہے۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا علمی مقام کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی ہمیں سب سے پہلے الفاظ کا حسن اپنی طرف کھینچتا ہے۔ لیکن اس حسن اور خوبی کو سمجھنے کیلئے اصل ذریعہ تو پڑھنے والے کا اپنا حسن ذوق ہے۔ اگر وہ فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہے تو پھر اسے قواعد و ضوابط یا لغت سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جس طرح جمالیاتی ذوق رکھنے والا ہر خوبصورت چیز میں پہلی نظر پڑتے ہی خوبصورتی محسوس کئے بغیر نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا ذوق چند ہی لمحوں میں فیصلہ کر دیتا ہے کہ اس چیز میں خوبصورتی اور حسن کس کمال پر ہے۔ البتہ! جس شخص میں جمالیاتی ذوق کی کمی ہوگی اسے کسی بھی چیز کی خوبصورتی کو سمجھانے کیلئے اصول و ضوابط کا حوالہ دینا پڑے گا۔ قرآنِ کریم کو جب عرب کے فصحاء و بلغاء نے دیکھا تو مخالف اور دشمن ہوتے ہوئے بھی اس

Marfat.com

کی فصاحت وبلاغت کے حسن سے گھائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ولید بن مغیرہ ہو، عتبہ بن ربیعہ ہو یا نضر بن حارث ہو، یہ لوگ ایمان نہیں لائے، لیکن قرآنِ کریم کی فصاحت وبلاغت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے علاوہ کئی اور اشراف قریش تھے جو قرآنِ کریم کو چھپ چھپ کر سنتے تھے۔ وہ اپنے قومی تعصبات کے باعث مخالفت بھی کرتے تھے، لیکن ساتھ ہی قرآن کی عظمت کو تسلیم بھی کرتے تھے۔ لیکن اہلِ عجم کو فصاحت وبلاغت کے بعض حوالوں سے واضح کرنا پڑے گا کہ قرآنِ کریم میں وہ ایسی کیا بات ہے جس نے اسے معجز بنا دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے جب ہم اس کے الفاظ کو دیکھتے ہیں تو الفاظِ قرآن کے تین پہلو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

۱۔ دنیا کی کسی بھی زبان کی بڑی سے بڑی ادبی کتاب کو دیکھ لیجئے وہ یہ دعویٰ کبھی نہیں کر سکتی کہ اس کتاب کی عبارت آرائی جن الفاظ سے ہوئی ہے ان میں کوئی لفظ بھی غیر فصیح نہیں کیونکہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس کا ایک ایک لفظ فصاحت وبلاغت کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ عربی زبان بھی اپنی انتہائی وسعت کے باوجود اس کمزوری سے مبرّا نہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں الحمد سے لے کر والناس تک نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہے۔ جسے تبدیل کرنا کلام میں عیب پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اگر کہیں اسے کوئی ایسی بات کہنا پڑی ہے جس کے صحیح مفہوم کی ادائیگی کیلئے عربی زبان میں کوئی فصیح لفظ موجود نہیں تو قرآنِ کریم نے اس لفظ کے استعمال کی بجائے عربی زبان کو ایک نیا لفظ عطا کیا ہے جس سے وہ مفہوم صحیح طور پر ادا ہو جاتا ہے جو قرآنِ کریم کے پیشِ نظر ہے۔ مثلاً زمانہ جاہلیت میں موت کے مفہوم کو ادا کرنے کیلئے بہت سے عربی الفاظ مستعمل تھے مثلاً موت، ھلاک، فنا، حتف، شعوب، حمام، منون، سام، قاضیہ، نیط، فود، مقدار، جباز، قتیم، حلاق، طلاطل، طلاطلہ، عول، ذام، کفت، جداع، جُزرۃ، خالج۔ لیکن ان میں سے اکثر الفاظ کے پس منظر میں اہلِ عرب کا یہ قدیم نظریہ جھلکتا تھا کہ موت کے ذریعہ انسان کے تمام اجزاء ہمیشہ کیلئے فنا ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں۔ قرآنِ کریم نے جب موت کی حقیقت بیان کرنا چاہی تو اس نے متذکرہ بالا الفاظ میں سے کسی ایک کا استعمال کرنا پسند نہیں کیا کیونکہ ان کے اندر جو تصور کارفرما تھا وہ اسلامی عقیدے کے بالکل برعکس تھا۔ اس لئے قرآنِ کریم نے ایک ایسا لفظ عربی زبان کو دیا جو نہایت خوبصورت مختصر اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اس مفہوم کو ادا کر رہا ہے جو موت کی حقیقت ہے۔ وہ لفظ ہے "تَوَفِّی" جس کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو پورا پورا وصول کر لینا" اس لفظ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ موت ابدی فنا کا نام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح قبض کرنے کا نام ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ چاہے وہ جسم کے منتشر اجزا اکیجا کر کے ان میں دوبارہ روح لوٹا سکتا ہے۔ موت کیلئے یہ لفظ قرآنِ کریم سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا۔ اور آج نہ صرف عربی زبان بلکہ اردو زبان میں بھی وفات کے لفظ سے اس کا استعمال عام ہے۔

۲۔ اسی طرح آپ ہر زبان میں دیکھیں گے کہ بعض ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جو صوتی اعتبار سے فصیح اور پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے۔ لیکن زبان میں چونکہ ان الفاظ کا متبادل نہیں ہوتا۔ اس لئے اہلِ زبان انہیں استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کی حیرت میں ڈال دینے والی فصاحت وبلاغت اس کیلئے عجیب راستہ نکالتی ہے کہ وہ اس لفظ کو استعمال نہیں کرتی۔ البتہ! بات کہنے کیلئے ایسی خوبصورت تعبیر اختیار کرتی ہے کہ بات بھی ادا ہو جاتی ہے لیکن اس لفظ کے استعمال کی نوبت نہیں آتی۔ عربی میں تعمیرِ مکان کیلئے پکی ہوئی اینٹوں کیلئے جتنے الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ سب ثقیل، مبتذل اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً آجر، قرمد اور طوب، یہ تینوں الفاظ صوتی اعتبار سے غیر فصیح سمجھے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے فرعون اور ہامان کا واقعہ ذکر کرتے ہوئے جب یہ بیان کرنا چاہا کہ فرعون نے اپنے وزیر

Marfat.com

ہامان کو حکم دیا تھا کہ میرے لئے ایک اونچا محل تعمیر کرنے کیلئے اینٹیں پکاؤ۔ تو اس میں اینٹوں کا لفظ آنا ناگزیر تھا اور میں عرض کر چکا ہوں کہ عربی زبان میں اینٹوں کے لئے تینوں مستعمل لفظ غیر فصیح ہیں۔ قرآنِ کریم کیلئے یہ بات نامناسب تھی کہ وہ انسانی تحریروں کی طرح مجبور ہو کر غیر فصیح لفظ استعمال کرے۔ چنانچہ اس نے اس مفہوم کو ادا کرنے کیلئے ایسا معجزانہ انداز اختیار کیا کہ مفہوم بھی ادا ہو گیا اور ثقیل الفاظ کے استعمال کا عیب بھی کلام میں پیدا نہ ہوا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَاۤ أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرِي فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا

(اور فرعون نے کہا! اے سردارانِ قوم! مجھے اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم نہیں پس اے ہامان! گیلی مٹی پر آگ روشن کر کے میرے لئے ایک محل تعمیر کرو)

اس آیتِ کریمہ میں دیکھ لیجئے کہ اینٹیں پکانے کا مفہوم بھی ادا ہو گیا لیکن اس کیلئے غیر فصیح لفظ کے استعمال کی نوبت نہیں آئی۔

۳۔ اسی طرح عربی زبان میں بعض الفاظ مفرد ہونے کی صورت میں نہایت سبک اور فصیح ہیں۔ لیکن ان کی جمع ثقیل سمجھی جاتی ہے۔ اس کی ادائیگی میں نسبتاً ثقالت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً زمین کو عربی زبان میں ''ارض'' کہتے ہیں۔ یہ واحد اور مفرد ہونے کی شکل میں کس طرح چست اور ہلکا پھلکا لفظ ہے۔ لیکن اس کی جمع دو صورتوں میں آتی ہے اور دونوں ہی ثقیل سمجھی جاتی ہیں۔ ''ارضون اور اراضی''۔ یہ دونوں لفظ اہلِ ذوق کو بوجھل محسوس ہوتے ہیں اور ان کے خیال میں ان کی وجہ سے کلام کی سلاست پر اثر پڑتا ہے۔ لیکن جہاں بھی جمع کا مفہوم ادا کرنا ہو تو عرب مجبور ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی لفظ کو استعمال کریں۔ لیکن قرآنِ کریم میں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کہیں بھی ارض کو جمع کی صورت میں استعمال نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ جہاں یہ بتانا تھا کہ جس طرح اللہ نے سات آسمان بنائے ہیں اسی طرح سات زمینیں بھی بنائی ہیں تو وہاں بھی ارض کو مفرد صورت میں اس طرح لایا گیا ہے کہ جمع کا مفہوم ادا ہو گیا ہے۔ ذرا اس آیتِ کریمہ کو پڑھئے اور سر دھنئے۔ اللہ الذی خلق سبع سمٰوٰت ومِنَ الاَرضِ مِثلَهُنَّ ''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے ہیں اور زمین میں سے بھی اتنی ہی''۔ اس آیتِ کریمہ میں دیکھئے سماء کی جگہ جمع لائی گئی ہے لیکن ارض کی جمع لانے کی بجائے ومن الارض مثلھن کہہ کر اس خوبی سے مفہوم ادا کیا کہ فصاحت و بلاغت سجدہ ریز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ان دو مثالوں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کا معیار اس کمال تک پہنچا ہوا ہے کہ جس کی مثال لانا انسان کیلئے ممکن نہیں۔

ترکیب کا اعجاز

قرآن کے قاری کو عام کتابوں کی طرح دوسری جس چیز سے سابقہ پڑتا ہے وہ ان الفاظ سے بننے والے جملوں کی ترکیب اور ان کی ساخت ہے۔ قرآنِ پاک کا ایک ایک جملہ اپنے اندر وہ حسن، وہ چابک دستی، وہ چستی، اور وہ خوبصورتی رکھتا ہے کہ دوسری کسی کتاب میں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مشکل سے مشکل بات کو سلاست کا لباس پہنا دینا، سادہ سی بات کو شوکت و شکوہ کی تصویر بنا دینا، اور پھر ان میں شیرینی پیدا کر دینا کہ حسنِ ذوق رکھنے والا داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ قرآنِ کریم کا معمول ہے کہ میں صرف اس کی ایک مثال پر اکتفا

Marfat.com

کرتا ہوں۔عرب جیسے جری، بہادر، اور قانون سے بے خبر معاشرے میں خوں ریزی عام سی بات تھی۔ وہ اسے روکنے کیلئے قاتل سے قصاص لینے کو بہت بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور اسی لئے اس پر ہمیشہ اپنے خطبوں اور اپنی حکمتوں میں زور دیتے رہتے تھے چنانچہ اس مفہوم کے کئی مقولے ان میں مشہور ہو گئے تھے۔ مثلاً القتل احیاء للجمیع ''قتل اجتماعی زندگی ہے'' اور القتل انفی للقتل ''قتل سے قتل کی روک تھام ہوتی ہے۔'' اکثروا القتل لیقل القتل ''قتل زیادہ کرو تا کہ قتل کم ہو جائے''۔ ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زبان زدِ عام تھے اور انتہا درجہ فصیح سمجھے جاتے تھے۔ قرآنِ کریم نے بھی اس مفہوم کو ادا فرمایا ہے، لیکن اس شان سے ادا فرمایا ہے کہ تمام مشہور جملوں کی فصاحت و بلاغت اس کے سامنے ماند ہو کر رہ گئی ہے۔ ارشاد ہے: ولکم فی القصاص حیاۃ ''اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے''۔ اس جملے کے اختصار جامعیت، سلاست، شوکت، اور معنویت کو جس پہلو سے دیکھئے بلاغت کا معجز شاہکار معلوم ہوتا ہے اور پہلے کے تمام جملے اس کے سامنے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔

اسلوب کا اعجاز

الفاظ اور ترکیب کے اعجاز کے بعد قرآنِ کریم کا حیرت میں ڈال دینے والا اعجاز وہ ہے جس کا اظہار قرآنِ کریم کے اسلوب میں ہوتا ہے۔ وہ بظاہر ایک فصیح و بلیغ عربی زبان کی کتاب ہے لیکن اس کے اسلوب کی شیرینی، اثر اندازی اور رنگارنگی اپنے اندر وہ وسعت اور ندرت رکھتی ہے کہ آدمی جیسے جیسے اسے پڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے اس طرح حیران و ششدر ہوتا جاتا ہے جس طرح ایک آدمی اگر کسی ایسے گلشن میں داخل ہو جائے جس میں بے شمار اقسام کے پھول کھلے ہوئے ہوں اور ہر پھول کا رنگ، خوشبو، سائز، اور شکل و صورت بالکل ایک دوسرے سے الگ ہو تو آدمی اس گلشن میں رنگ و نور کے سیلاب میں ڈوبتا تو چلا جاتا ہے لیکن اس کیلئے ان پھولوں کے رنگوں کی پہچان، ان میں ہر ایک کی انفرادیت کی شناخت، ان میں سے ہر ایک کی خوشبو کا الگ الگ احساس اور ان میں پائے جانے والے تنوع کا شمار ہرگز ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآنِ کریم بھی ایک ایسا گلشن ہے جس کے اسلوب کے اتنے رنگ ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے گلشن میں بھی ان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے زبانِ قلم کو یارا نہیں کہ اس کے اسلوب کے بارے میں کوئی کافی شافی بات لکھ سکے۔ لیکن اس میں جو باتیں بہت نمایاں ہیں جن کو جان لینا ہی اس کے اعجاز کو سمجھ لینے کیلئے کافی ہے ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ہم کرتے ہیں۔

1:۔ سب سے پہلی جو چیز اسے پڑھتے ہوئے یا سنتے ہوئے آدمی کو ورطۂ حیرت میں ڈالتی ہے وہ اس کا صوتی آہنگ ہے۔ قرآنِ کریم منظوم کتاب نہیں، وہ سراسر نثر پر مشتمل ہے۔ لیکن آج تک دنیا میں کوئی ایسی کتاب نثر میں نہیں لکھی گئی جس کو پڑھ کر یا سن کر آدمی کے جمالیاتی ذوق کو تحریک ہوتی ہو اور وہ ایک لذت اور حلاوت محسوس کرتا ہو۔ شعر میں تو ملتے جلتے الفاظ قافیہ آرائی، اوزان کی پابندی اور کبھی کبھی ردیف کی یکسانیت ایک صوتی آہنگ پیدا کرتی ہے، جو لطف و لذت کا باعث بنتی ہے۔ لیکن نثر میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہوتی لیکن کوئی شخص بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ جب بھی کوئی اچھا قاری قرآنِ پاک کو اس میں ڈوب کر پڑھتا ہے تو سننے والا ممکن ہی نہیں کہ اس کے سحر میں مسحور نہ ہو جائے۔ ایسے بہت سارے واقعات مشہور ہیں کہ غیر مسلم تک قرآنِ پاک شوق سے سنتے اور اس کی تاثیر سے متاثر ہوتے اور بسا اوقات ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ ممکن ہے اہلِ علم اس کا سبب قرآنِ کریم کے متوازن صوتی آہنگ کو قرار دیں، لیکن کسی اہلِ علم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس کا سراغ پا سکے یا اس کی مثال لا سکے کہ یہ متوازن صوتی آہنگ عروض اور وزن کی پابندیوں کے بغیر کس طرح ممکن ہے اور قرآنِ

Marfat.com

کریم میں وہ کیا اسباب ہیں جس کی وجہ سے یہ معجزہ وجود میں آیا ہے۔لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص کو بھی ادبی ذوق اور جمالیاتی حس کا کچھ حصہ ملا ہے، وہ قرآنِ کریم کے اس اعجاز کو محسوس کیئے بنا نہیں رہ سکتا۔

۲۔ دنیا کے بڑے بڑے فصیح وبلیغ ادیب اور خطیب گزرے ہیں۔لیکن اگر ان کے ادب اور ان کی خطابت کا تجزیہ کیا جائے تو آپ محسوس کریں گے کہ ہر ادیب اور خطیب کا ایک خاص رنگ اور ایک خاص آہنگ ہے اور جب وہ اس سے باہر نکلتا ہے تو بے رنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔پھر یہ بات بھی ہے کہ بڑے سے بڑے آدمی کا بھی ایک خاص ذوق ہوتا ہے اور ہمیشہ وہ اپنے ذوق کے مطابق لکھنے یا بولنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔اس کے مطالعے کے مخصوص میدان ہوتے ہیں اور اس سے ہٹ کر وہ کبھی کوئی موثر رول ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔لیکن قرآنِ کریم کے اسلوب کا عجیب عالم ہے کہ لوگوں نے اسلوب کی قسمیں کی ہیں، خطابی، ادبی اور علمی۔لیکن قرآنِ کریم کا اسلوب ان تمام اسالیب پر حاوی ہے۔وہ علم وادب، نصیحت وفہمائش اور دعوت وقانون کی ایک ایسی بہار ہے جس کے جلو میں اپنے اپنے وقت اور ضرورت کے مطابق تمام اسالیب پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔اس میں بیک وقت شگفتگی بھی ہے اور متانت بھی۔اس میں زور بھی ہے اور بالیدگی بھی۔اس کا مخاطب صاحبِ علم ہے تو علم کے موتی چنتا ہے۔الہڑ دیہاتی ہے تو وہ بھی سر دھنتا ہے۔محققین ہیں تو ان کیلئے تحقیق کا وافر سامان موجود ہے۔کوئی سائنس کا ذوق رکھنے والا ہے تو اس کے لئے فلسفہ اور سائنس کے دقیق مسائل کا حل بھی موجود ہے۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم بعض دفعہ ایک ہی بات کوئی مرتبہ دہرا کر کہتا ہے لیکن کیا مجال ہے کہ اس کی تاثیر میں کمی آنے پائے اس نے بعض ان مضامین کو بھی بلاغت کے اوجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔جس میں کوئی بشری ذہن ہزار کوشش کے بعد بھی کوئی ادبی چاشنی پیدا نہیں کر سکتا۔مثلاً قانونِ وراثت کو لیجئے یہ ایک ایسا خشک اور سنگلاخ موضوع ہے کہ اس میں دنیا کے تمام ادیب اور شاعر مل کر بھی ادبیت اور عبارت کا حسن پیدا نہیں کر سکتے۔لیکن قرآنِ کریم نے جس اسلوب سے سورۃ نساء میں وراثت کے مسائل بیان کیے ہیں اسے پڑھتا ہوا آدمی یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ کسی ادبی شہ پارے کی تلاوت کر رہا ہو، اس کا ایک ایک جملہ اس کے دامنِ ذوق کو کھینچتا ہے۔مختصر یہ کہ اسلوب کے بے شمار پہلو ہیں، جن کو شمار کرنے کیلئے بھی ایک سفینہ چاہئے۔لیکن قرآنِ پاک ایک ایسا خزینہ ہے جس میں علم کے ہر گوشے تحریر وتقریر کے ہر زاویے اور ادب کے ہر پیمانے کے حوالے سے ایسے بیش بہا ہیرے اور جواہرات بھرے ہوئے ہیں کہ اہلِ ذوق کا تجسس تھک کر ہار جاتا ہے، لیکن اس خزانے میں کبھی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کی پیشگوئیاں

قرآنِ کریم کے وجوہِ اعجاز کا ایک پہلو وہ چیزیں ہیں جن کی صداقت دنیا پر منکشف ہو چکی ہے۔ہم یہاں قرآنِ پاک کی تعلیمات کا ذکر نہیں کر رہے کیونکہ انہیں جانچنے کیلئے علم اور دیانت چاہئے۔لیکن وہ باتیں جنہیں تاریخ نے سچا ثابت کر دکھایا یا دنیا ان انکشافات کو ماننے پر مجبور ہوگئی ان میں سے ہم چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

ا۔ آنحضرت ﷺ کی مکی زندگی میں دنیا کی دو عظیم طاقتوں یعنی روم اور ایران میں شدید جنگ جاری تھی۔اس جنگ میں ایرانی فوجیں مسلسل رومیوں پر غالب آتی جا رہی تھیں۔ملک کا بیشتر حصہ رومیوں کے ہاتھوں سے چھن چکا تھا۔ایرانی لشکر شام کے بڑے بڑے شہروں کو تاراج کرتا ہوا قسطنطنیہ کے دامن میں پڑاؤ ڈال چکا تھا۔رومی حکومت کیلئے اپنی آزادی برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہو رہا تھا۔اس صورتحال سے قریشِ مکہ بہت خوش تھے وہ ایران کو آتش پرست ہونے کی وجہ سے اپنے مشابہ اور روم کو اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے مشابہ سمجھتے تھے اور ایرانیوں کا غلبہ ان کے نزدیک اپنی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا شگون تھا۔ان حالات میں سورۃ روم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔جس کا ترجمہ یہ ہے:

Marfat.com

"الٓـمّٓ۔ روم والے قریب ترین سرزمین (یعنی شرقِ اردن) میں مغلوب ہوگئے اور وہ اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سالوں میں غالب آجائیں گے۔ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے کام پہلے بھی اور بعد بھی۔ اور اس روز مسلمان اللہ کی مدد کی وجہ سے خوش ہوں گے، اللہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ زبردست اور مہربان ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

جو لوگ روم اور ایران کے جنگی حالات سے باخبر تھے ان کیلئے یہ پیشگوئی قطعی طور پر ناقابلِ یقین تھی۔ چنانچہ قریش کے ایک ممتاز سردار ابی ابن خلف نے حضرت ابوبکر سے شرط لگالی کہ اگر تین سال کے دوران رومی غالب آگئے تو میں تمہیں دس اونٹ دوں گا اور غالب نہ آسکے تو تم مجھے دس اونٹ دو گے۔ اس وقت اس طرح کی شرط جائز تھی۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ نے اسے منظور فرمالیا اور آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع کی آپ نے فرمایا قرآن نے بضع سنین "چند سالوں میں" فرمایا ہے اور عربی میں لفظِ بضع کا اطلاق "تین سے لے کر نو سالوں" تک ہوتا ہے۔ لہٰذا تم ابی ابن خلف سے اونٹوں کی تعداد بڑھا کر شرط کی مدت نو سال مقرر کرلو۔ مشہور مورخ ایڈورڈ گبن اس پیشگوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس وقت جب کہ یہ پیش گوئی کی گئی کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از قیاس نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمے کا اعلان کر رہے تھے۔" (سقوط زوالِ سلطنتِ روما۔ ج:۵، صفحہ:۷۳،۷۴)

اپنی پہلی شکست کے ٹھیک سات سال بعد قیصرِ روم بالکل خلافِ توقع قسطنطنیہ سے باہر نکلا اور اس کی فوجوں نے ایرانیوں پر پے در پے حملے کرکے ان کو متعدد مقامات پر شکست دی اور اس کے بعد رومی لشکر ہر جگہ غالب ہی آتا چلا گیا۔ اس طرح سے قرآنِ کریم کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

۲۔ قرآن کی پیش گوئیوں میں آنحضرت ﷺ کے قیامِ مکہ کے دوران وہ پیش گوئی بھی ہے جس میں قرآنِ کریم نے واضح طور پر فرمایا کہ اسلام مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے اور مکہ کے اطراف سمیٹے جا رہے ہیں۔

مکی زندگی میں قریش کے مظالم سے تنگ آکر آپ نے ہجرت کا ارادہ فرمایا۔ قریش بالکل سر پر پہنچ گئے تو آنحضرت نے نہائیت اطمینان سے صدیق اکبر سے فرمایا: گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ان اللہ معنا "بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ قرآنِ کریم نے انہیں الفاظ میں اس واقعہ کو ذکر کیا اور پھر جب آپ غارِ ثور میں تین دن قیام کے بعد مدینہ طیبہ کے راستے پر جحفہ کے قریب پہنچے تو وہاں سے مکہ معظمہ جانے والی سڑک نظر آئی اور طبعی طور سے آپ کو وطن کی یاد آئی اور اسے مستقلاً چھوڑ دینے کے خیال سے رنج ہوا۔ تو قرآنِ کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ان الذی فرض علیک القران لرآدک الی معاد "بلاشبہ! جس ذات نے قرآن کے احکام آپ پر فرض کئے ہیں وہ دوبارہ آپ کو لوٹائے گا"۔ اس وقت آپ جس بے سروسامانی کے عالم میں مکہ مکرمہ سے نکلے تھے اس کے پیشِ نظر ظاہری لحاظ سے اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کی کوئی توقع نہ تھی۔ لیکن چند ہی سال بعد آپ اسی شہر مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور یہ پیشین گوئی پوری ہوکر رہی۔

۳۔ اس طرح کی پیش گوئیاں جن کا تعلق ذہانت اور حالات سے ہو تو کوئی بھی ذہین آدمی حالات کا جائزہ لے کر کرسکتا ہے۔ لیکن ایسی پیش گوئی کرنا جس کا تعلق سراسر دوسری قوم کے ارادوں اور ان کے قلبی احساسات سے ہو، وہ یقیناً انسانی بساط سے باہر ہے۔ اس طرح کی پیشگوئی یقیناً وہی کتاب کرسکتی ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہو۔

Marfat.com

یہود ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اللہ کے چہیتے ہیں۔آخرت کی فلاح وکامیابی صرف ہمارے لئے ہے اور صرف ہم ہی لوگ جنت میں جائیں گے۔قرآنِ کریم نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے ایک بات کا ان سے مطالبہ کیا اور پھر حتمی انداز میں پیش گوئی فرمائی کہ تم یہ کام کبھی نہیں کروگے۔قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ

(آپ فرمادیجئے!(اے یہودیو!) اگر اللہ کے پاس صرف تمہارے لئے خالص طور پر دارِ آخرت ہے دوسروں کے لئے نہیں تو تم موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو (اور پھر حتمی انداز میں فرمایا) اور یہ لوگ اپنے کرتوت کی وجہ سے ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے)

اندازہ کیجئے! یہ پیش گوئی اس وقت کی جارہی ہے جب یہود کے تمام قبیلے پوری شان وشوکت سے مدینے میں آباد ہیں اور ہر طرف ان کے علم اور تقدس کے چرچے ہیں اور وہ ہمیشہ بحث اور مناظرے کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ چیلنج سن کر ان کو سانپ سونگھ گیا حالانکہ وہ ایک لمحے میں قرآنِ کریم کے اس چیلنج کو غلط ثابت کرسکتے تھے۔لیکن ان میں سے ایک شخص بھی اس چیلنج کو قبول کرنے کیلئے آگے نہ بڑھا۔

جنگِ احد کے دو گروہوں کے بارے میں یہ خبر دی گئی کہ ان میں سے دو جماعتوں نے دل میں ارادہ کرلیا تھا کہ پسپا ہوجائیں، ان کے دل کی حالت کو وہ خود جانتے تھے یا پروردگار۔لیکن پروردگار نے اپنی کتابِ پاک میں ان کے دل کے راز کو فاش کیا تو وہ اقرار کئے بغیر نہ رہ سکے۔جس کتاب کا نازل کرنے والا لوگوں کے قلبی احساسات، ان کے مخفی ارادوں، اور آئندہ کے عزائم کے بارے میں قطعی علم رکھتا ہو اس کتاب کو کتاب اللہ کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

۴۔ جس زمانے میں یہ کتاب نازل ہوئی ہے اس زمانے میں کسی کتاب کے دیر تک محفوظ رہنے کے اسباب یکسر ناپید تھے اور پھر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اس وقت تک جتنی کتابیں آسمانوں سے نازل ہوچکی تھیں وہ محفوظ نہیں رہی تھیں اور مخالفتوں کا ہجوم بجائے خود یہ کہتا ہوا دکھائی دے رہا تھا کہ اس کتاب کے باقی رہنے کی کوئی صورت نہیں۔باایں ہمہ! قرآنِ کریم نے خود دعویٰ کیا اور آج تک وہ دعویٰ اس کتاب میں موجود ہے: انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون ''ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے''۔دشمنوں سے پوچھئے کہ قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ اور اللہ کریم کا یہ وعدہ پورا ہوا یا نہیں۔صدیاں گزر گئیں اس کا کوئی شوشہ تک نہ بدل سکا۔اس کا کوئی نقطہ تک نہ مٹ سکا۔اس میں تحریف وترمیم کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔قرآنِ کریم کو مٹانے اور اس میں تحریف وترمیم کرنے کی جو سازشیں ہوتی رہیں اس کا ریکارڈ تاریخ میں محفوظ ہے۔قرآنِ کریم کی آیات اور سورتوں کی ترتیب بدل کر اہلِ مغرب کی نگرانی میں نہایت سستے نسخے قرآنِ کریم کے شائع کئے گئے۔لیکن لوگوں نے خود انہیں نفرت سے ٹھکرا دیا۔قرامطہ کے فتنے نے عالمِ اسلام کو ہلا ڈالا۔تاتاریوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا، کتب خانے جلا ڈالے، قدیم کتابوں کے بڑے بڑے ذخیرے دریا میں بہا دیئے۔انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں پریس پر پابندی لگا کر اور قرآنِ کریم کو جلا کر اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔لیکن قرآنِ کریم کی یہ پیشگوئی کہ اللہ اس کی حفاظت فرمائے گا آج تک اس پیش گوئی کی صداقت کو کوئی نہ جھٹلا سکا۔

Marfat.com

قرآنِ کریم کے انکشافات

قرآنِ کریم کی پیش گوئیوں کی طرح اس کے انکشافات بھی ہیں۔جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے انکشافات صرف کتاب اللہ کا ہی حصہ ہوسکتے ہیں اور جن باتوں نے اس کتاب کو معجز بنایا ہے ان میں یہ انکشافات بھی شامل ہیں۔ان انکشافات میں بہت سے علمی او رتاریخی حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے۔جن سے اس کتاب کے نزول کے وقت کوئی شخص بھی واقف نہیں تھا۔ان انکشافات کی ایک لمبی فہرست ہے لیکن ہم ان میں سے چند ایک کا ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ا۔ قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ جس وقت فرعون دریا میں غرق ہونے لگا تو اس نے جان بچانے کیلئے زبانی طور پر ایمان لانے کا اقرار کیا جس کے جواب میں باری تعالیٰ نے فرمایا:

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَکُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ○ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ اٰیَۃً ؕ

(اب (ایمان لاتا ہے؟) حالانکہ پہلے نافرمانی کرتا رہا اور فساد مچانے والوں سے تھا۔پس ہم تیرے بدن کو نجات دیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کیلئے عبرت بن جائے) (یونس ۱۰:۹۱)

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت اور اس کے بعد بھی صدیوں تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ فرعون کی لاش اب تک صحیح سلامت موجود ہے۔لیکن تقریباً دو صدیاں پیشتر اہرامِ مصر کی کھدائی میں ایک ایسا ہال دریافت ہوا جس میں بعض فراعنۂ مصر کی حنوط شدہ لاشیں ملیں۔جب انہیں تابوتوں سے نکال کر ان کی پٹیاں کھولی گئیں تو ایک لاش ایسی نکلی جس پر نمک کی تہہ جمی ہوئی تھی اور اس کی ناک پر مچھلی کے کاٹنے کا نشان تھا۔فرانسیسی ماہرین جوان لاشوں کا جائزہ لے رہے تھے،انہیں حیرت ہوئی کہ یہ نمک کی تہہ کہاں سے آگئی۔تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ ایک ایسا فرعون ہے جو کسی سمندر میں غرق ہوا اور پھر سمندر نے اس کی لاش باہر اگل دی اور یہ نمک سمندر کا نمک ہے جو پانی کے ساتھ اس کے جسم میں سرایت کر گیا اور پھر آہستہ آہستہ جسم کے اوپر آکر اس کی تہہ جم گئی۔تب انہیں معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم نے جس فرعون کے بارے میں خبر دی تھی کہ وہ بحرِ قلزم میں غرق ہوا تھا اور پھر ہم نے اس کے جسم کو نجات دے دی تھی اور اسے آنے والی نسلوں کیلئے باقی رکھا یہ وہی فرعون ہے۔چنانچہ آج اس کی وہ لاش قاہرہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔

۲:۔قرآن کریم کا دوسرا ارشاد ہے:

وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ○ (الذّٰریٰت ۵۱ : ۴۹)

(اور ہم نے ہر چیز کے دو جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو)

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت عالمِ تصور یہ تھا کہ نر اور مادہ کے جوڑے صرف انسانوں یا جانوروں میں ہوتے ہیں یا پھر چند نباتات میں۔لیکن سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ قرآنی حقیقت واضح ہوتی جارہی ہے کہ نر و مادہ ہر چیز میں موجود ہیں۔یہ اور بات ہے کہ

Marfat.com

کہیں ان جوڑوں کا نام نر و مادہ رکھ لیا کہیں مثبت (Positive) اور منفی (Negative) اور کہیں الیکٹرون اور پروٹون اور کہیں نیوٹرون اور پوزیٹرون بلکہ ایک آیت میں قرآنِ کریم نے صراحتہً یہ بھی واضح فرمادیا کہ بہت چیزوں میں جوڑوں کا پایا جانا ابھی لوگوں کو معلوم نہیں:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ O (۳۶:۳۶)

(پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑوں کو پیدا کیا ان میں جن کو زمین اگاتی ہے اور انسانوں میں سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جنہیں یہ لوگ نہیں جانتے)

مختصر یہ کہ جن وجوہِ اعجاز نے قرآنِ پاک کو معجزہ بنادیا ہے ان پر گفتگو نامکمل رہے گی اگر ہم اس موضوع کا تذکرہ نہ کریں جس سے یہ کتاب بحث کرتی ہے۔ اور ضمناً یہ ذکر نہ کریں کہ قرآنِ کریم نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر کس قدر اثر ڈالا ہے۔ ہم اس سلسلے میں دنیائے اسلام کے ایک مشہور مفکر کے خیالات مستعار لیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پوری کائنات پر حاوی ہے۔ وہ کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس کے نظم و آئین پر کلام کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق اور ناظم مدبر کون ہے؟ کیا اس کی صفات ہیں؟ کیا اس کے اختیارات ہیں؟ اور وہ حقیقتِ نفس الامری کیا ہے جس پر اس نے یہ پورا نظامِ عالم قائم کیا ہے۔ وہ اس جہان میں انسان کی حیثیت اور اس کا مقام ٹھیک ٹھیک مشخص کر کے بتاتی ہے کہ یہ اس کا فطری مقام اور یہ اس کی پیدائشی حیثیت ہے جسے بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس مقام اور اس حیثیت کے لحاظ سے انسان کے لئے فکر و عمل کا صحیح راستہ کیا ہے، جو حقیقت سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور غلط راستے کیا ہیں جو حقیقت سے متصادم ہوتے ہیں۔ صحیح راستے کے صحیح ہونے اور غلط راستوں کے غلط ہونے پر وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز سے نظامِ کائنات کے ایک ایک گوشے سے انسان کیلئے نفس اور اس کے وجود سے اور انسان کی اپنی تاریخ سے بے شمار دلائل پیش کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان غلط راستوں پر کیسے اور کن اسباب سے پڑتا رہا ہے اور صحیح راستہ جو ہمیشہ ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا کس ذریعہ سے اس کو معلوم ہوسکتا ہے اور کس طرح ہر زمانے میں اس کو بتایا جاتا رہا ہے۔ وہ صحیح راستے کی صرف نشاندہی کر کے نہیں رہ جاتی بلکہ اس راستے پر چلنے کیلئے ایک پورے نظامِ زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ جس میں عقائد، اخلاق، تزکیۂ نفس، عبادات، معاشرت، تہذیب، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت، قانون، غرض حیاتِ انسانی کے ہر پہلو کے متعلق ایک نہائیت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں وہ پوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اس صحیح راستے کی پیروی کرنے اور ان غلط راستوں پر چلنے کے کیا نتائج اس دنیا میں ہیں اور کیا نتائج دنیا کا موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے عالم میں رونما ہونے والے ہیں۔ وہ اس دنیا کے ختم ہونے اور دوسرا عالم برپا ہونے کی نہائیت مفصل کیفیت بیان کرتی ہے۔ اس تغیر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے بتاتی ہے۔ دوسرے عالم کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے۔ اور پھر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہاں انسان کیسے ایک دوسری زندگی پائے گا اور کس طرح اس کی دنیوی زندگی

Marfat.com

کے اعمال کا محاسبہ ہوگا، کن امور کی اس سے باز پرس ہوگی، کیسی نا قابلِ انکار صورت میں اس کا پورا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔کیسی زبردست شہادتیں اس کے ثبوت میں پیش کی جائیں گی۔ جزا اور سزا پانے والے کیوں جزا اور سزا پائیں گے۔ جزا پانے والوں کو کیسے انعامات ملیں گے اور سزا پانے والے کس کس شکل میں اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ اس وسیع مضمون پر جو کلام اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اس حیثیت سے نہیں ہے کہ اس کا مصنف کچھ صغری کبریٰ جوڑ کر قیاسات کی ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اس کا مصنف حقیقت سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ اس کی نگاہ ازل سے ابد تک سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ تمام حقائق اس پر عیاں ہیں کائنات پوری کی پوری اس کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ نوعِ انسانی کے آغاز سے اس کے خاتمہ تک ہی نہیں بلکہ خاتمہ کے بعد اس کی دوسری زندگی تک بھی وہ اس کو بیک نظر دیکھ رہا ہے اور وہ قیاس وگمان کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر انسان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جن حقائق کو علم کی حیثیت سے وہ پیش کرتا ہے ان میں سے کسی ایک کو بھی آج تک غلط ثابت نہیں کیا جاسکا۔ جو تصورِ کائنات وانسان پیش کرتا ہے وہ تمام مظاہر اور واقعات کی مکمل توجیہ کرتا ہے اور ہر شعبۂ علم میں تحقیق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ فلسفہ وسائنس اور علوم وفنون کے تمام آخری مسائل کے جوابات اس کے کلام میں موجود ہیں اور سب کے درمیان منطقی ربط ہے کہ ان پر ایک مکمل، مربوط، اور جامع نظامِ فکر قائم ہوتا ہے۔ پھر عملی حیثیت سے جو رہنمائی اس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو دی ہے، وہ انتہائی پاکیزہ ہی نہیں بلکہ ۱۴سو سال سے روئے زمین کے مختلف گوشوں میں بے شمار انسان بالفعل اس کی پیروی کر رہے ہیں اور تجربے نے ان کو بہترین ثابت کیا ہے۔ کیا اس شان کی کوئی انسانی تصنیف دنیا میں موجود ہے یا کبھی موجود رہی ہے جسے اس کتاب کے مقابلے میں لایا جاسکتا ہو؟''

کیا دنیا کی کوئی ایسی کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر اتنی وسعت اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہو کہ پہلے اس کی تاثیر نے ایک قوم کو بدلا اور پھر اس قوم نے اٹھ کر دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو بدل ڈالا۔ کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو۔ یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی نہیں رہ گئی ہے بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ ۱۴سو برس سے اس کے ان اثرات کا سلسلہ جاری ہے۔ اور روز بروز اس کے یہ اثرات پھیلتے چلے جارہے ہیں۔ آج اگرچہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں براہِ راست اس کے اثرات کم محسوس ہو رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی امتِ مسلمہ کو اگر کوئی چیز بچا رہی ہے اور بہت سارے دلوں میں شعلہ بن کر سلگ رہی ہے اور جب اندھیرا گہرا ہو جائے گا تو وہ روشنی بن کر طلوع ہوگی اور امتِ مسلمہ نئے سفر پر نکل کھڑی ہوگی۔ وہ یہی کتاب ہے اور یا وہ ذات ہے جس پر یہ کتاب نازل ہوئی تھی۔ یہی اس کا سب سے بڑا اعجاز ہے جس نے اس کتاب کو بے مثل اور معجز بنا دیا ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (البقرة: ۲۵)

Marfat.com

(اور بشارت دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے، اس بات کی کہ ان کیلئے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جب جب ان کے پھل ان کو کھانے کو ملیں گے تو کہیں گے کہ یہ وہی ہیں جو اس سے پہلے ہمیں عطا ہوا تھا، حالانکہ وہ دیئے گئے اس سے ملتا جلتا، اور ان کیلئے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے (اور یہ اسلوب انسانی فطرت کے عین مطابق ہے) کہ جب وہ انکار کرنے والوں ناشکری کرنے والوں یا بد عملی کرنے والوں کو اپنے عذاب سے ڈراتا ہے اور انہیں ان کے برے انجام سے آگاہ کرتا ہے تو ساتھ ہی ان لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال اختیار کرتے ہیں انہیں اچھے انجام اور اپنی رحمتوں اور نوازشوں کی بشارت بھی دیتا ہے۔ اللہ نے انسانی فطرت اس طرح کی بنائی ہے اور انسانی طبیعتوں کو اس طرح کے پیمانے میں ڈھالا ہے کہ وہ کسی بھی ذمہ داری کے کام کیلئے جلدی آمادہ نہیں ہوتا بالخصوص جس کام کیلئے اسے محنت کرنی پڑے یا مشقت سے گزرنا پڑے تو وہ اپنی طبیعت کو آسانی سے اس کیلئے ہموار نہیں کر سکتا ایسی صورت میں اسے آمادۂ عمل کرنے کیلئے دو ہی طریقے مؤثر ہوتے ہیں۔ (۱) ترغیب (۲) ترہیب۔ یعنی کسی انعام یا کسی معاوضے کی خواہش انسان کو عمل کیلئے اکساتی ہے۔ یا عمل نہ کرنے کی صورت میں کسی نقصان کا اندیشہ یا کسی سزا کا خوف اسے عمل پر مجبور کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان بنیادی طور پر معقولیت پسند ہے۔ عقل کی بات اسے اپیل کرتی ہے اور نیکی کی بات اسے اچھی لگتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ گرد و پیش کے اثرات طبیعتوں پر اتنے غالب آجاتے ہیں کہ طبیعتوں کا ان سے آزاد ہونا کسی بڑے محرک کا محتاج ہوتا ہے۔ اور وہ محرک ترغیب یا ترہیب کی صورت میں وجود میں آتا ہے۔ قرآنِ کریم بھی سب سے پہلے اپنی دعوت کو طبیعتوں میں اتارنے کیلئے دلائل سے کام لیتا ہے۔ عقل پسند اور حالات کے مقابلہ کرنے کے قابل طبیعتیں دلائل سے متاثر ہو کر قرآن کریم کی دعوت کو قبول کر لیتی ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد ہمیشہ تھوڑی رہی ہے۔ اس لئے عام انسانی حالت کو دیکھتے ہوئے قرآن کریم عموماً ترغیب اور ترہیب سے کام لیتا ہے۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ توحید و رسالت پر پہلے ایسے دلائل دیئے گئے جنہیں ہم دلائل قاطعہ اور حجج بالغہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جو طبیعتیں یا جو لوگ ایسے دلائل کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے دل و دماغ پر جمی ہوئی گرد ان دلائل سے اترنے نہیں پاتی تو ان کیلئے پروردگار نے پہلے ترہیب سے کام لیا اور انہیں یہ کہہ کر ان کے انجام سے ڈرایا کہ اگر تم اللہ کی کتاب کو اس کا چیلنج قبول کرنے میں ناکام ہو کر بھی کتاب اللہ ماننے سے انکار کرتے ہو تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے اور اس کے بعد اپنے اسلوب کے مطابق ان لوگوں کو بشارت سے نوازا جنہوں نے اللہ کی توحید رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب ماننے کا اقرار کیا اور اس کے دیئے ہوئے نظام زندگی کے مطابق زندگی کا رویہ بنانے کیلئے تیار ہو گئے۔ کہ ان کیلئے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔

عذابِ جہنم سے بچنے کیلئے اعمالِ صالحہ بھی ضروری ہیں

یہاں بطور خاص ایک بات کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ پیش نظر آیت کریمہ میں جن لوگوں کو بشارت دی جا رہی ہے ان کی دو صفات بیان کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایمان لائے ہر اس چیز پر جس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے اور دوسرا یہ کہ انہوں نے نیک عمل کیئے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جہنم کے عذاب سے بچنے کیلئے صرف ایمان کافی نہیں اس کیلئے اعمال صالحہ بھی ضروری ہیں۔ ایک شخص جو ایمانیات کو مان کر مومن بن جاتا ہے، لیکن وہ اللہ کی شریعت کے کسی حکم پر عمل نہیں کرتا ارکانِ اسلام کی فکر نہیں کرتا فرائض کی پابندی نہیں کرتا مکارم اخلاق کو اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتا ایسا شخص فقہ کی نگاہ میں اور مسلمانوں کے رجسٹر میں تو ضرور مسلمان کہلائے گا البتہ اسے گناہ گار مسلمان کہیں گے اور یہ محض ایمان اسے جہنم کے ابدی عذاب سے بھی شاید بچا لے۔ لیکن اگر وہ یہ چاہے کہ میں جہنم کی آگ سے بچ جاؤں اور مجھے کسی طرح کا بھی عذاب نہ

Marfat.com

ہواور میں حساب کتاب کے بعد سیدھا جنت پہنچ جاؤں تو یہ اعمال صالحہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اعمال صالحہ سے مراد وہ اعمال ہیں جو اللہ کی شریعت کے مطابق حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ محض اللہ کیلئے کئے جائیں۔ اگر ایک آدمی شرعی احکام کی پابندی تو کرتا ہے لیکن اس کی نیت میں اخلاص نہیں یا اس کے عقیدے میں شرک کی آمیزش ہے۔ یا پیش نظر اللہ کی رضا نہیں تو ایسا عمل عملِ صالح نہیں کہلاتا اور اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ مسلمانوں میں زوال کا شکار ہونے کے بعد جو مفاسد پیدا ہوئے ہیں ان میں ایک بہت بڑا فساد یہ ہے کہ ایمان بھی بے میل نہ رہا اخلاص دلوں سے جاتا رہا، حسنِ نیت کا تصور ہی اپنی اہمیت کھو بیٹھا، لیکن اس سے بھی بڑی خرابی یہ پیدا ہوئی کہ صرف ایمانی دعویٰ کو عمل کی پابندی کے بغیر کافی سمجھ لیا گیا۔ جو آدمی اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے چاہے اس کے اعمال قرآن و سنت کے یکسر خلاف ہوں، اسے مومن سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ بہت سے لوگ تو یہاں تک جسارت کر گزرتے ہیں کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں کون اچھا ہے اور کون برا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھائی اور برائی محض زبانی باتیں ہیں جن کا کوئی عملی وجود نہیں۔ اس آیت کریمہ میں صاف بتایا گیا ہے کہ اللہ جن لوگوں کو بشارت کے قابل سمجھتا ہے وہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اس کے احکام اور اس کی شریعت کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔ انہی کیلئے اللہ کی جنت ہے اور اللہ کے انعامات ہیں اور یہی لوگ ہیں جو اللہ کے پسندیدہ لوگ ہیں۔

متشابھًا کا مفہوم

قرآن کریم میں یہاں بھی اور اس کے علاوہ بیسیوں مقامات پر جنت کا نقشہ کھینچتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ وہ ایسے باغات ہوں کے جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی۔ عرب جیسے صحرائی اور ریگستانی علاقے میں سرسبز باغ اللہ کی بیش بہا نعمت تھی۔ اور ویسے بھی میدانی علاقوں میں بھی باغات کی قدر و قیمت اور اس کی دل آویزی ہمیشہ انسانی آرزوؤں میں نمایاں مقام کی حامل رہی ہیں۔ کوئی بھی مصنوعی منظر باغ کی دل آویزی کا مماثل نہیں ہوسکتا۔ لیکن قرآن کریم باغوں میں سے بھی جنت کے باغات کا نقشہ کھینچتے ہوئے یہ ضرور کہتا ہے کہ اس کے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔ کیونکہ باغ کا سب سے زیادہ دلکش تصور یہ ہے کہ وہ بلندی پر ہو اور اس کے نیچے نہر جاری ہو۔ بلندی اس کے منظر کی دل کشی میں اضافہ کرتی ہے اور سیلاب وغیرہ کی آفتوں سے محفوظ رکھتی ہے اور نیچے بہنے والی نہر اس کی شادابی کی ضمانت دیتی ہے۔ سورۃ بقرۃ ہی کی آیت نمبر 265 میں تو بطور خاص اس کا ذکر فرمایا کمثل جنة بربوة کہ ایسا باغ جو بلندی پر ہو۔ ''ربوۃ'' بلند جگہ یا بلند ٹیلے کو کہتے ہیں۔ تو مقصود اس سے جنت کی دل آویزی، سرسبزی، شادابی اور دل کشی کو نمایاں کرنا ہے۔ اس کے بعد جنت میں اہل جنت کو جو نعمتیں میسر آئیں گی اور جو انہیں عیش دوام نصیب ہوگا اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جنت کی نعمتوں کا حال یہ ہوگا کہ جب بھی اہل جنت کو کھانے کیلئے کوئی پھل دیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ پھلوں کی افراط ہوگی اور درختوں کے ساتھ اس طرح پھل لٹک رہے ہوں گے کہ کھانے سے پہلے ان کی دل کشی ہی انسان کی لذت کو دوچند کرنے کیلئے کافی ہوگی جنت کا ہر باسی جب اس منظر کی خوبصورتی اور رعنائی میں ڈوبا ہوا ہوگا تو خدام پھلوں کے طشت سجائے جب انہیں اپنی طرف متوجہ کریں گے، تو وہ دیکھ کر یہ کہیں گے (یہاں کہنے سے عربی اسلوب کے مطابق دونوں ہی معنی مراد لئے جاسکتے ہیں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے یا جی ہی جی میں کہیں گے) کہ یہ تو وہ پھل ہیں جو اس سے پہلے ہمیں دیئے جا چکے ہیں اس کے بھی دو مطلب ہوسکتے ہیں ایک مطلب تو یہ کہ تھوڑی دیر پہلے خدام نے جو ہماری خدمت میں پھل پیش کئے تھے وہ اسی طرح کے تھے اور یہ بھی اسی قسم کے پھل ہیں۔ لیکن جب وہ انہیں کھا کر دیکھیں گے تو ان کا مزا اور ان کی لذت اور ان کی خوشبو پہلے کھائے ہوئے پھلوں سے اس قدر مختلف ہوگی اور وہ اس قدر خوش ذائقہ ہوں گے کہ وہ حیران ہو کر رہ جائیں گے اور وہ سمجھ جائیں گے کہ اللہ کی قدرت کی کوئی انتہا

Marfat.com

نہیں وہ جس فراوانی سے پھل پیدا کرتا ہے اور پھر پھلوں میں جس قدر تنوع پیدا کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ لطف ولذت میں ایسی ایسی جدتیں پیدا کرسکتا ہے جو انسان کے خواب وخیال میں بھی نہیں گزر سکتیں۔

دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ یہ پھل جو ہمارے سامنے پیش کیے جارہے ہیں، یہ اپنی شکل وصورت اور رنگ روپ میں بالکل ویسے ہی ہیں جیسے اللہ نے ہمیں دنیا میں عطا فرمائے تھے وہاں آم دیا تھا تو کئی کئی قسموں پر مشتمل اور لطف ولذت میں بالکل ایک دوسرے سے مختلف اور انگور دیئے تھے تو قدوقامت اور مزے اور لذت میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر یہ جنت کے پھل بھی معلوم ہوتا ہے اپنی ساری خوبی اور رعنائی کے باوجود ویسے ہی ہیں جیسے ہم دنیا میں کھا چکے ہیں۔لیکن جب وہ انہیں کھا کر دیکھیں گے تب انہیں اندازہ ہوگا کہ یہ پھل تو دنیا کے پھلوں سے ہر لحاظ سے مختلف ہیں۔جنت کے پھل محض ان کے ہم شکل تھے لیکن شکل وصورت کے علاوہ کسی چیز میں بھی وہ ان کے ہمسر نہ تھے۔

قرآنِ کریم نے اس بات کو بھی ایک سے زیادہ جگہ بیان کیا ہے کہ جنت میں اہلِ جنت کو نہ پیاس لگے گی نہ بھوک کی تکلیف ہوگی۔یعنی وہ تمام عوارض اور وہ تمام حاجات جو انسان کی مشکل کا باعث بھی ہیں اور کمزوری کا بھی اور اگر بروقت انہیں پورا کرنے کا موقع نہ ملے تو وہ جان لیوا بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔غذا کی یافت میں اگر تاخیر ہوجائے اور بھوک کا دورانیہ بڑھ جانے کے باعث ناقابلِ برداشت ہونے لگے۔تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہی بھوک اور اشتہا جو نعمتوں میں لطف ولذت کا حقیقی سبب ہے کس قدر تکلیف دہ بھی ہے۔جب بھوک برداشت نہیں ہوتی تو کمر دوہری ہونے لگتی ہے چلنا مشکل ہوجاتا ہے۔کمر سیدھی رکھنے کیلئے اور چلنے اور کام کرنے کی آسانی پیدا کرنے کیلئے عرب پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتے تھے۔لیکن جنت میں آدمی کو بھوک نہیں لگے گی۔لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ بھوک کے بغیر بہتر سے بہتر کھانا اور بہتر سے بہتر نعمت آدمی کو مزا نہیں دیتی۔بھوک ہو تو نانِ جویں بھی خوش ذائقہ معلوم ہوتا ہے۔بھوک نہ ہو تو مرغ مسلم بھی کھانے کو جی نہیں چاہتا۔لیکن جنت میں اللہ کا عجیب احسان ہوگا کہ انسان کو کوئی حاجت لاحق نہیں ہوگی۔بھوک لگے گی نہ پیاس لیکن اس کے باوجود جنت کی نعمتیں انہیں مزا دیں گی وہ جتنی کھائیں گے ہر دفعہ نئے لطف ولذت سے شاد کام ہوں گے۔

انسانی احساسات اللہ نے اس طرح تخلیق فرمائے ہیں کہ ان کے تقاضوں کی بجا آوری محض غذائی ضرورتیں پورا کردینے سے نہیں ہوتی کسی آدمی کو محل میں رہائش دے دیجئے خدام خدمت میں لگا دیجئے۔ضرورت کی ہر چیز بافراط مہیا کردیجئے۔لیکن کسی کو اس سے ملنے نہ دیجئے۔اسے تنہائی میں زندگی گزارنے پر مجبور کردیجئے یقین جانئے وہ شخص متذکرہ بالا نعمتوں کے باوجود خودکشی کرنے پر تیار ہوجائے گا۔اس سے معلوم ہوتا ہے انسانی احساسات کا تقاضا صرف غذائی ضرورت کا پورا ہونا ہی نہیں بلکہ انسانوں سے ملنا اور دوست احباب کے ساتھ بزم آرائی بھی ہے۔مولانا محمد علی جوہر کو قیدِ تنہائی میں رکھا گیا ضروریاتِ زندگی کی کوئی کمی نہ تھی۔لیکن آپ جیسا صابر آدمی بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

قید اور قید بھی تنہائی کی
شرم رہ جائے شکیبائی کی

دوست احباب سے بڑھ کر انسانی احساس کی سیرابی اور زندگی کی خوشگواری کیلئے مرد کو بیوی کی اور عورت کو شوہر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت صرف جوانی میں نہیں بڑھاپے میں بھی علیٰ حالہٖ قائم رہتی ہے۔اللہ نے مرد وعورت کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ہر ایک کی شخصیت میں ایک جھول رکھا ہے جو دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس لئے مرد بیوی کے بغیر اور بیوی شوہر کے بغیر اپنی شخصیت میں نامکمل رہتے ہیں۔دونوں کے احساسات کی سیرابی ایک دوسرے کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔لیکن اس کیلئے شرط یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں اللہ سے ڈرنے والے اسلامی قالب میں ڈھلے ہوئے، مکارمِ اخلاق کے پیکر اور شائستہ اطوار ہوں۔دونوں ایک دوسرے کیلئے جیتے اور ایک

Marfat.com

دوسرے کیلئے مرتے ہوں اور اللہ کے خوف نے جس طرح انہیں حقوق آشنا بنایا ہو اسی طرح ان کے اندرونی احساسات کی تہذیب بھی کی ہو۔ایسی صورتحال میں تنگی وترشی اور خوشحالی وبدحالی اضافی چیزیں ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ازواجِ مطہرة کامفہوم

میری ان گزارشات کو پیش نظر رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں میں بطور خاص ازواج مطہرة کا ذکر فرمایا ہے جس کا ترجمہ عام طور پر ''پاکیزہ بیویاں'' کیا جاتا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ازواج، زوج کی جمع ہے۔اس کا اطلاق شوہر پر بھی ہوتا ہے اور بیوی پر بھی کیونکہ زوج کا معنی ہے ''جوڑا'' اور دونوں ایک دوسرے کیلئے جوڑا ہیں۔مطہرہ مؤنث ہونے کی وجہ سے یہ گمان کیا گیا ہے کہ یہاں بیویوں کی صفت کے طور پر آیا ہے۔لیکن ہم جانتے ہیں کہ مؤنث جمع کی صفت کے طور پر بھی آتا ہے، چاہے وہ جمع مذکر ہو یا مؤنث۔اس لئے اگر ازواج مطہرہ سے شوہر اور بیوی دونوں مراد لئے جائیں تو الفاظ میں اس کی گنجائش ہے۔اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جنت میں اللہ تعالیٰ اہل جنت کو جو بیش بہا نعمتیں عطا فرمائیں گے ان میں ایک بہت بڑی نعمت یہ بھی ہوگی کہ مرد اور عورت دونوں کو ایسے جوڑے دیئے جائیں گے (یعنی مرد کو بیوی اور عورت کو شوہر) جو مطہر ہوں گے۔ مطہر کا مطلب یہ ہے کہ جن کی فکری اور عملی تطہیر ہو چکی ہوگی، جنہیں تربیت سے یا من جانب اللہ اس طرح شائستہ بنا دیا ہوگا کہ نہ ان کی فکر میں کجی ہوگی نہ عمل میں خرابی اور نہ مزاج میں ناہمواری۔وہ دونوں ایک دوسرے کیلئے سرتاپا ہمدردی اور خیر خواہی ہوں گے۔ان کے مزاج اور ان کی فکر میں اسقدر ہم آہنگی ہوگی کہ سوچ سے لے کر عمل تک کہیں اختلاف جنم نہیں لے گا۔دونوں ایک دوسرے کیلئے مسرت اور خوشی کا باعث ہوں گے۔مزید فرمایا کہ جنت میں یہ قیام اور یہ نعمتوں کی فراوانی اور یہ میاں بیوی کی ہم آہنگی سے جو مسرتوں سے بھرپور ماحول میسر آئے گا اس ماحول سے اہل جنت کو کبھی نکلنے کا حکم نہیں دیا جائے گا وہ اس جنت میں ہمیشہ رہیں گے نہ انہیں کبھی موت آئے گی نہ ان نعمتوں کو کبھی زوال ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ (البقرة: ٢٦)

(اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی تمثیل بیان کرے، خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی۔تو جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ جانتے ہیں یہی بات حق ہے، ان کے رب کی جانب سے۔رہے وہ لوگ، جنہوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کے بیان کرنے سے اللہ کا کیا منشا ہے۔اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر انہی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔جو اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کا اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اسے توڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو نامراد ہونے والے ہیں)

Marfat.com

دفع دخلِ مقدر

اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے کفار کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے۔اعتراض اگرچہ نقل نہیں کیا گیا لیکن جواب سے خود بخود سمجھ میں آرہا ہے۔کفار کا اعتراض یہ تھا کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ قرآن کریم اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور یہ اس کا کلام ہے اگر یہ واقعی اللہ کا کلام ہوتا تو جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہر طرح کے عیب سے پاک اور تمام عظمتوں سے بڑھ کر عظیم ہے ایسا ہی اس کا کلام، کلام کی کمزوریوں سے پاک اور اعلیٰ سے اعلیٰ کلام کی ایک نادر بلکہ برتر مثال ہونا چاہئے۔کوئی باوقار آدمی کبھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے منہ سے کوئی ہلکی بات نکلے۔وہ جب بھی بات کرے گا اپنے وقار اور اپنی عظمت کو ہمیشہ پیش نظر رکھے گا اور اگر اس کے منہ سے اس کی ذات سے فروتر کلمات نکلنے لگیں تو لوگوں کو تعجب بھی ہوتا ہے اور اس کی ذات کو نقصان بھی پہنچتا ہے۔یہ قرآنِ کریم اگر اللہ کا کلام ہے تو اس میں کہیں مکھی، کہیں مچھر اور کہیں مکڑی کی مثالیں کیوں دی گئی ہیں وہ اپنی تمثیلات میں ان چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کا نام کیوں لیتا ہے؟ اسے اگر تمثیل پیش بھی کرنی ہو تو تمثیل پیش کرتے ہوئے ایسی چیز کا نام لینا چاہئے جو اس کی شان کے لائق ہو۔چنانچہ پیش نظر آیت کریمہ میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی تمثیل بیان کرے ضربِ مثل کا معنی ہوتا ہے کسی حقیقت کو تمثیل کے پیرایہ میں سمجھانا، اور یہاں لفظ استعمال ہوا ہے لا یستحی ''اللہ نہیں شرماتا'' مفسرین یہ کہتے ہیں کہ استحیاء کا معنی ہوتا ہے ''کسی چیز سے رک جانا یا کسی چیز کو چھوڑ دینا''۔مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ بات کو سمجھانے کیلئے کوئی مثال دینے سے رکتا نہیں کیونکہ تمثیل میں جو مثال پیش کی جاتی ہے وہ متکلم کی شان کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ وہ مخاطب کے حال کے مطابق ہوتی ہے۔مخاطب اگر ایک ایسا کام کر رہا ہے، یا اس کی حالت ایسے منظر کی غماز ہے۔جس میں وہ اپنی سطح سے بہت نیچے گر کر کیڑے مکوڑوں کی سطح پر آ گیا ہے تو اس کی حالت کو واضح کرنے کیلئے کیڑے مکوڑوں ہی کا نام لیا جائے گا کسی بڑی چیز کا نہیں اور نام لینے والا اور مثال دینے والا مثال دیتے ہوئے اپنی شخصیت کو سامنے نہیں رکھتا بلکہ مخاطب کو سامنے رکھ کر مثال تجویز کرتا ہے۔اور یہ تمثیل کا انداز اختیار کرنا پہلی آسمانی کتابوں کا بھی شیوہ رہا ہے۔کیونکہ اعلیٰ حقائق اور روحانی لطائف کو تمثیل کے انداز میں بیان کرنے سے انہیں سمجھانا آسان ہو جاتا ہے اور مزید یہ کہ مخاطب اگر بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا تو براہِ راست بات کہنے یا عام انداز اختیار کرنے کی بجائے اگر تمثیل کا انداز اختیار کیا جائے تو اس سے بات واضح بھی ہو جاتی ہے اور مخاطب کیلئے اس کا انکار مشکل بھی ہو جاتا ہے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی آسمانی کتابوں کی طرح قرآن کریم نے بھی اس صنفِ کلام کو استعمال کیا ہے۔مثلاً ایک جگہ مشرکین کو یہ سمجھانے کیلئے کہ قدرت اور عظمت کا حقیقی مالک صرف اللہ ہے۔تم نے اللہ کے ساتھ جن قوتوں کو شریک بنا رکھا ہے وہ جنات ہوں، فرشتے ہوں یا تمہارے مصنوعی دیوتا اور دیویاں ان کے پاس کوئی طاقت وقدرت نہیں اور کس قدر عجیب بات ہے کہ تم اللہ جیسے قادر مطلق کے ساتھ ان بے طاقت قوتوں کو پکارتے ہو اور ان سے مرادیں مانگتے ہو اسی طرح تم نے پتھروں کو تراش کر جو خدا بنا رکھے ہیں وہ تو ان سے بھی زیادہ بے طاقت اور گئے گزرے ہیں چنانچہ ان دونوں باتوں کو تمثیل کے انداز میں اس طرح بیان فرمایا کہ ذہنوں کیلئے اس کا سمجھنا آسان کر دیا۔

يَآاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّايَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ .

Marfat.com

(اے لوگو! ایک تمثیل پیش کی جارہی ہے، اسے غور سے سنو۔ بے شک جن لوگوں کو، اللہ کو چھوڑ کر، تم پکارتے ہو، وہ کسی مکھی تک کو پیدا نہیں کرسکتے، اگرچہ وہ سب جمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھیاں کوئی چیز چھین لیں تو وہ ان سے بچا نہیں سکتے)

یہاں دیکھئے! وہ جن قوتوں کو معبود بنائے بیٹھے تھے ان کی بے طاقتی اور کمزوری بیان کرنے کیلئے یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ تو ایک مکھی تک کو پیدا نہیں کرسکتے اور ان کے بتوں کا حال یہ ہے جن کے سامنے وہ سر جھکاتے اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ ان کے حلوے پوریوں کو اگر مکھیاں کھا جائیں تو وہ ان سے بچا نہیں سکتے۔ غور فرمایئے! ان کی کمزوری کو ظاہر کرنے کیلئے اس سے بہتر تمثیل اور کیا ہوسکتی ہے اس میں مکھی کی مثال ان کی حالت سے مطابقت کی وجہ سے دی گئی ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے۔ تو تمثیل کا اصل حسن یہ ہے کہ وہ پوری طرح صورت واقعہ کو کھول کر رکھ دے۔ اس میں صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ کس خوبی سے بیان ہوئی ہے۔ اس میں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ تمثیل کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہی طریقہ پہلی آسمانی کتابوں میں بھی رہا ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بہت ساری تمثیلات بیان کی گئی ہیں۔ یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اصولوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے لیکن جزئیات کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ مذہب کی اصل روح ان کے یہاں مرچکی تھی۔ لیکن اس کے مظاہر میں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ لڑتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی اس کی گمراہی پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا: کہ تم مچھروں کو چھانتے ہو اور اونٹوں کو نگل جاتے ہو۔ اس میں توجہ طلب اونٹ اور مچھر کا لفظ نہیں ہے بلکہ وہ تشبیہ ہے جس نے ان کی پوری حالت کو نمایاں کر کے رکھ دیا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ تمثیل اصنافِ کلام میں سے ایک صنف ہے۔ جس کو عموماً اعلیٰ حقائق اور روحانی لطائف کی وضاحت کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی ایسے لوگوں کی حالت کو نمایاں کرنے کیلئے بھی جو انسانی سطح سے نیچے گر چکے ہوں۔ لیکن وہ نہ اپنی حالت پر غور کرنے پر تیار ہوں اور نہ دوسرے لوگ ان کے عمومی اثرات کے باعث توجہ دینے کی زحمت کریں۔ البتہ ان تمثیلات سے ہر جگہ اثر یکساں نہیں ہوتا جن کی طبیعت میں سلامتی ہے اور وہ حقائق کو جاننے کے متمنی ہیں وہ تو ان تمثیلات کو بیش بہا نعمتوں کا درجہ دیتے ہیں اور ان تمثیلات کو دیکھتے ہوئے ان کی طبیعت کھل جاتی ہے کیونکہ جو بات غور وفکر سے مشکل سے ہاتھ آتی ہو۔ لیکن ایک تمثیل انہیں آسان کردے تو قبول کرنے والی طبیعتیں یقیناً اس سے خوشی اور مسرت محسوس کرتی ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو ان حقائق کے دشمن ہیں اور جن کی زندگی یکسر اس کے الٹے رخ پر چل رہی ہے اور یا ان تمثیلات کی زد براہِ راست ان پر پڑتی ہے تو وہ فوراً بدک اٹھتے ہیں اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری وہ کمزوریاں جنہیں ہم چھپانا چاہتے تھے ان تمثیلات نے ان کو اس طرح نمایاں کردیا ہے کہ وہ عام لوگوں کی نگاہوں میں آگئی ہیں۔ وہ ایسی تمثیلات پر سراپا احتجاج بن جاتے ہیں۔ لیکن ان کی معنویت پر چونکہ کوئی گرفت نہیں کرسکتے، اس لئے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے بال کی کھال اتارنے لگتے ہیں۔ وہ اس بات پر کبھی بحث نہیں کرتے کہ اس تمثیل نے کس بنیادی حقیقت کو نمایاں کیا ہے اور کس برائی پر گرفت کی ہے بلکہ وہ اس کے ارکانِ تشبیہ میں سے کسی رکن کو لے کر یا وجہ شبہ کو پکڑ کر تنقید کے تیر برسانا شروع کردیں گے۔ پروردگار نے اگر ان کی فروتر حالت کی نشاندہی کرتے ہوئے مکھی یا مچھر کی مثال دی ہے تو وہ مثال کے مفہوم کو یکسر نظر انداز کر کے یہ کہیں گے کہ اگر یہ کلام اللہ کا کلام ہے تو اس میں مکھی یا مچھر کی مثالوں کا کیا معنی؟ کیا پروردگار کی عظیم ذات کبھی اس طرح کے چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑوں کی مثال دے سکتی ہے؟ پروردگار اگر کوئی مثال دیتا تو وہ یقیناً اس کی اپنی ذات کی شایانِ شان ہوتی۔ اس طرح سے وہ اپنے ضمیر اور دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں اور نتیجۃً اپنی عاقبت تباہ کرلیتے ہیں۔

Marfat.com

ہدایت وضلالت کا قانون

چنانچہ جانبین کا یہی رویہ ان کی ہدایت اور ضلالت کا فیصلہ کرتا ہے۔یعنی جولوگ تمثیل کی معنویت پر غور کر کے اسے قبول کرنے کیلئے آگے بڑھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کیلئے ہدایت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔لیکن جولوگ متذکرہ بالا رویہ اختیار کرتے ہیں، ان کیلئے اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے اور گمراہی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ محض یہ ایک عمل ان کی گمراہی کا فیصلہ کر دیتا ہے بلکہ یہ عمل اور یہ سوچ اصلاً ان کے اس رویے کا نتیجہ ہوتی ہے جسے قرآنِ کریم نے فسق قرار دیا ہے۔اس لئے ارشاد فرمایا کہ اللہ صرف فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے۔یعنی اللہ کا قانون جو بندوں کے اعمال کے مطابق حرکت میں آتا ہے اس قانون کے مطابق اس وقت گمراہی کا فیصلہ ہوتا ہے جب کوئی شخص فِسق کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔اس کے بعد اگلی آیت کریمہ میں پروردگار نے خود فاسقین کی وضاحت فرمادی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی نگاہ میں فسق سے کیا مراد ہے۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ص وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ o (البقرة:۲۷)

(جو اللہ کے عہد کو مضبوطی سے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔یہی لوگ ہیں نامراد ہونے والے)

فسق کا معنی ومفہوم

فِسق کا معنی ہے،''نکل جانا'' بلکہ زیادہ واضح مفہوم میں ''اچھل کر نکل جانا یا پھلانگتے ہوئے نکل جانا''۔عربی کا ایک محاورہ ہے جس سے اس کے معنی پر روشنی پڑتی ہے۔فسقت الرطبة عن القشرة ''کھجور (کی گٹھلی) چھلکے سے پھدک کر نکل گئی''یعنی اگر آپ انگوٹھے کی پور پر کھجور کو رکھ کر اس کے ایک کنارے پر انگشتِ شہادت کے پور سے دباؤ ڈالیں تو گٹھلی چھلکے سے پھدک کر نکل جاتی ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فِسق اس نکلنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اچھلنے، کودنے اور پھلانگنے کا ارادہ بھی شامل ہو۔قرآنِ کریم میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے کہ جو شخص معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جاتا ہے، اسے فاسق کہتے ہیں۔البتہ یہ نافرمانی اور معروف سے نکل جانا کبھی معمولی درجے کا بھی ہوتا ہے یعنی ایک آدمی فرائض میں غفلت کرنے لگے، یا ادب واحترام میں لاپرواہی دکھانے لگے لیکن ایک رویہ یہ ہے کہ نمازوں سے یکسر تعلق توڑ لیا جائے بے حیائی اور بے شرمی کو تہذیب کا نام دے دیا جائے اور بڑی سے بڑی نافرمانی پر بھی طبیعت میں گرانی پیدا نہ ہو۔بلکہ طبیعت اس کو معمول کی بات سمجھے، اور پھر یہ رویہ اگر اپنی حد تک محدود رہے تو شریعت کی زبان میں اسے ''فِسق'' کہا جاتا ہے۔لیکن اگر یہ نافرمانی کھلم کھلا کی جانے لگے اور کوئی ملامت اس پر اثر انداز نہ ہو تو اسے عموماً فجور کا نام دیا جاتا ہے۔فقہ کی زبان میں گناہِ کبیرہ کا ارتکاب اور صغیرہ پر اصرار کو فِسق کہا جاتا ہے۔لیکن قرآنِ کریم بڑی سے بڑی نافرمانی جو کفر تک پہنچا دیتی ہے، اسے بھی فِسق سے تعبیر کرتا ہے۔پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ایسے ہی لوگوں کو فاسق کہا گیا ہے۔

Marfat.com

فاسق کی دو نمایاں علامتیں

ان کے فسوق کو بیان کرتے ہوئے چند نمایاں باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں کہ یہ فاسق لوگ وہ ہیں جو اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں۔اس سے مراد دو طرح کے عہد ہو سکتے ہیں۔ایک تو وہ عہد ہے جسے ’’عہد الست‘‘ کہا جاتا ہے کہ جسے عالم ارواح میں پروردگار نے تمام روحوں سے لیا تھا۔سب سے پوچھا تھا: الست بربکم تو سب نے جواب میں کہا تھا: بلٰی کہ آپ ہی ہمارے رب ہیں ہم اس کا اقرار کرتے ہیں۔تو جو آدمی اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، وہ اس عہد کو توڑتا ہے کیونکہ اللہ کو رب ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم ہمیشہ آپ کے احکام کی اطاعت اور آپ کی ذات کی بندگی کریں گے اور یا اس عہد سے مراد وہ عہد ہے، جو ہر مومن ایمان قبول کرتا ہوا کلمہ شہادت پڑھکر اللہ کے ساتھ کرتا ہے۔جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ ’’میں گواہی دیتا ہوں اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں‘‘ تو وہ درحقیقت یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کے سوا کسی کو معبود اور حاکم حقیقی نہیں سمجھتا۔میں اسی کی بندگی کروں گا اور اسی کے احکام کی اطاعت کروں گا۔جو لوگ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اس کے احکام کی اطاعت نہیں کرتے یا اس کے مقابلے میں دوسروں کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔بجائے اللہ کے دیئے ہوئے آئین اور قانون کو نافذ کرنے کے وہ دوسروں کے وضع کردہ یا اپنے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کرتے ہیں تو وہ اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں۔کیونکہ ایک مسلمان اسلام قبول کرنے کے بعد جس طرح اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا، اس کے سوا کسی اور کی نماز نہیں پڑھ سکتا، اسی طرح وہ اپنے مال و دولت میں تصرف اپنے اعضاء و جوارح کا استعمال اپنی قلبی اور دماغی صلاحیتوں سے خدمت بھی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہیں لے سکتا۔وہ جس طرح انفرادی اور شخصی زندگی میں اللہ کا بندہ ہے اسی طرح وہ اجتماعی زندگی میں بھی اللہ کا بندہ اور اس کی بندگی کے عہد میں بندھا ہوا ہے۔تو جہاں تہاں بھی بندگی اور اطاعت کا یہ عہد ٹوٹتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہیں فسق کا ارتکاب شروع ہو جاتا ہے۔مزید فرمایا کہ فاسق وہ لوگ ہیں کہ وہ ہر اس رشتے کو کاٹتے ہیں، جسے جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس مختصر سے جملے میں اس قدر وسعت ہے کہ انسانی تمدن و اخلاق کی پوری دنیا پر جو دو آدمیوں کے تعلق سے لے کر عالمگیر بین الاقوامی تعلقات تک پھیلی ہوئی ہے، صرف یہی ایک جملہ حاوی ہے۔ان میں سے ہر تعلق ٹوٹنے سے انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے قیام و استحکام پر زد پڑتی ہے اور ان کے ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

تصور کیجئے! میاں بیوی کے تمام تر تعلقات کا دارومدار اس عہد کی پابندی پر ہے جو نکاح کی صورت میں دونوں نے ایک دوسرے سے باندھا ہے۔پھر اولاد کا وجود اور ان کی تعلیم و تربیت کا تمام تر دارومدار اس بات پر ہے کہ ماں باپ اپنے عہد و پیمان کی پابندی کرتے ہوئے اولاد کی ذمہ داریوں کا بوجھ کہاں تک اٹھاتے ہیں، اسی پر گھر کی سلامتی کا دارومدار ہے۔اور پھر یہ گھر کی سلامتی خاندان کے وجود کی بنیاد بنتی ہے اور خاندان کی مضبوطی آگے چل کر قومی استحکام کی ضمانت دیتی ہے۔اسی وجہ سے اسلام نے رحمی رشتوں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور آنحضرت ﷺ نے قطع رحمی کو بہت بڑا جرم قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔پھر یہیں سے معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے۔پھر پورے معاشرے میں معاشرے کا ایک ایک فرد ہمسائیگی اور معاشرت کے عہدوں میں بندھا ہوا ہے۔بازاروں اور منڈیوں میں کاروبار اور معاشی ہم آہنگی کا دارومدار اس عہد و پیمان پر ہے جو کاروبار کرنے والے ایک دوسرے سے استوار کرتے ہیں۔سماجی رشتے قومی تعلقات حکومت اور عوام کے باہمی روابط پھر اس سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی تعلقات ان تمام کا دارومدار درجہ بدرجہ ان عہود و مواثیق پر ہے جن کے نتیجے میں یہ تعلقات وجود میں آتے ہیں۔اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ تو اسلامی رشتے کی وجہ سے اللہ اور رسول سے کئے

Marfat.com

ہوئے عہد میں بندھے ہوئے ہیں۔جن کی سلامتی پر پوری امت مسلمہ کی قوت اور سلامتی انحصار کرتی ہے۔جہاں اس میں دراڑیں پڑتی ہیں وہیں سے امتِ مسلمہ کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔جو لوگ ان رشتوں میں سے کسی رشتے کو بھی کاٹتے ہیں اور کسی بندھن کو بھی توڑتے ہیں وہ اپنی اس بدعہدی اور بدعملی کے باعث زمین میں فساد کا راستہ کھولتے ہیں۔پھر جیسے جیسے یہ عہد ٹوٹتے جاتے ہیں ویسے ویسے یہ زمین فساد سے بھرتی جاتی ہے۔اور یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ جس معاشرے میں فساد پھیل جائے اس کی قومی بنیادیں استوار نہیں رہتیں۔ایک ایک کرکے ادارے ٹوٹنے لگتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انسانی اقدار بھی دم توڑ جاتی ہیں۔نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ہر سو نامرادی اور ناکامی اپنا تسلط جمالیتی ہے۔اسی لئے یہاں ارشاد فرمایا گیا: اُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ. (یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں)

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ (البقرة:۲۸تا۲۹)

(تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے، تو اس نے تم کو زندہ کیا۔ پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ○ وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے، پھر آسمان کی طرف توجہ کی اور سات آسمان استوار کر دیئے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے)

عقیدۂ آخرت پر اماتت واحیا سے استدلال

زیر بحث رکوع میں پہلے عقیدۂ توحید کو دلائل کے ساتھ بیان فرمایا، اس کے بعد عقیدۂ رسالت کو اعجازِ قرآن کی دلیل کے ساتھ مؤکد کیا۔لیکن دونوں جگہ توحید و رسالت کا نام لئے بغیر دلائل کے انداز اور دلائل کی زبان سے ان عقیدوں کی طرف متوجہ کیا گیا۔اب پیشِ نظر آیات کریمہ میں قیامت اور آخرت کے عقیدے کو بیان کیا جا رہا ہے۔لیکن یہاں بھی قیامت اور آخرت کا نام مذکور نہیں لیکن دلیل کی زبان بول رہی ہے کہ قیامت ثابت کی جا رہی ہے اور مزید قابل توجہ بات یہ ہے کہ قیامت کے انکار کو اللہ کا انکار قرار دیا گیا ہے۔جس طرح رسالت کا انکار رسول اللہ ﷺ کا انکار ہے اور جس طرح توحید کا انکار اللہ کا انکار ہے اسی طرح قیامت کا انکار بھی اللہ کا انکار ہے کیونکہ قیامت کا انکار نتیجہ ہے اللہ کی چند بنیادی صفات کے انکار کا۔جو آدمی اللہ کے بارے میں اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ زندگی اور موت اسی کے قبضے میں ہے وہی محیی بھی ہے اور ممیت بھی ہے۔وہ کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اللہ ایک دفعہ تو زندہ کر سکتا ہے دوبارہ نہیں کر سکتا اور پھر اگر دوبارہ زندہ کر دے تو زندگی کو دوام نہیں دے سکتا۔اسی طرح جو آدمی اللہ کی قدرتِ کاملہ کو تسلیم کرتا ہے اور وہ مانتا ہے کہ وہی قادرِ مطلق ہے تو وہ کبھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ کبھی ایک ایسا دن بھی آئیگا جب تمام دنیا تباہ کر دی جائے گی اور پھر کبھی ایسا دن آئے گا جب تمام جن وانس دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور اللہ کی عدالت میں پیش ہوں گے کیونکہ اللہ کے قادرِ مطلق ہونے کا تو مفہوم ہی یہ ہے کہ وہ جب چاہے کائنات کو بسا دے اور جب چاہے اس کی بساط لپیٹ دے اور جب چاہے اسے دوبارہ زندہ کر دے اور پھر اس زندگی کو دوام دے دے۔اسی طرح جو آدمی اللہ کی صفتِ عدل کو تسلیم کرتا ہے وہ کبھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اللہ

Marfat.com

تعالیٰ کی صفت عدل پوری طرح ظہور پذیر ہوگی۔شہنشاہ اور بادشاہ بھی، عالمگیر اور عالم پناہ بھی، انبیاء اور اولیاء بھی، امراء اور علماء بھی، مزدور اور گدا بھی سب اپنے اپنے نامہ اعمال لئے اپنے اللہ کے سامنے جواب دہی کے لئے کھڑے ہوں گے۔ وہ نیکیوں پر اجر دے گا، برائیوں پر سزا دے گا۔ ظالموں سے ظلم کا حساب لے گا۔ مظلوموں اور بے نواؤں کو حق دلایا جائے گا۔ جنہیں دنیا میں ظلم سے نجات نہ ملی اور وہ اپنی بے کسی کے باعث اپنا بدلہ نہ لے سکے اندھی گولی کے مقتول کے وارث قاتل کو نہ پکڑ سکے اور قانون کی نگاہ بھی وہاں تک نہ پہنچ سکی اور اگر کبھی کوئی بڑا مجرم پکڑا گیا تو عدالت اس کی قوت کے سامنے سرنگوں ہوگئی اگر کسی نے سینکڑوں اور ہزاروں قتل کئے تو اولاً قانون اسے پکڑ نہ سکا اور اگر پکڑا بھی گیا تو ایک قتل کے بدلے میں اس کی گردن کٹ گئی۔ لیکن باقی سب مقتولوں کا خون رائیگاں گیا۔ لیکن قیامت کے دن ان سب سے حق دلایا جائے گا۔ ہزاروں کے قاتل کو ہزاروں بار قتل کی سزا سے گزرنا ہوگا ہر مجرم اپنے جرم کی نوعیت اور وسعت کے مطابق سزا پائے گا۔ اگر ایسا دن جہاں ہر ایک کو اس کا بدلہ ملے وجود میں نہیں آسکتا تو پھر اللہ کی صفتِ عدل کا ظہور کب ہوگا۔ ایسا دن چونکہ قیامت ہی ہوگا اس لئے اگر قیامت کا انکار کردیا جائے تو اللہ کی صفتِ عدل کا انکار کرنا پڑیگا۔ اس لئے یہاں قیامت کے انکار کو کفر قرار دیا گیا کیونکہ قیامت کا انکار مستلزم ہے اللہ کی بنیادی صفات کے انکار کو اور اللہ کی بنیادی صفات کا انکار چونکہ کفر ہے اس لئے قیامت کا انکار بھی کفر ہے۔ چنانچہ انہیں باتوں کو اس آیتِ کریمہ میں دلیل کے طور پر پیش فرمایا کہ تم اللہ کا، یعنی قیامت کا کیسے انکار کرتے ہو؟ کہ یہ بات تمہیں تسلیم ہے کہ تم حالت عدم میں تھے تمہارا دنیا میں کوئی وجود نہ تھا اللہ نے تمہیں پیدا کرکے زندگی بخشی کہ تم کتمِ عدم سے وجود میں آگئے اور پھر تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے جنازے اٹھتے ہیں اسی طرح ایک دن تمہارا جنازہ اٹھے گا اور تم بھی موت کا شکار ہو جاؤ گے۔ کتنی قومیں صفحۂ ہستی پر طلوع ہوئیں اور پھر غروب ہوگئیں زندگی اور موت کا یہ کھیل ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے تمہیں بھی انکار نہیں۔ تو عجیب بات ہے کہ تم قیامت کی صورت میں ایک ہمہ گیر تباہی اور موت کا کیسے انکار کرتے ہو؟ جو پروردگار اب لوگوں کو موت دے رہا ہے وہ سب کو یکبارگی کیوں نہیں دے سکتا اور پھر اگر وہ ہمہ گیر موت دینے کے بعد دوبارہ پھر سب کو زندہ کردے تو اس سے تمہیں انکار کیوں؟ آج پوری دنیا میں جو لوگ زندہ ہیں یہ پچاس، سو سال پہلے نہیں تھے اور مزید اتنے سالوں کے بعد جواب ہیں وہ بھی نہیں ہوں گے اور ان کی جگہ نئے لے چکے ہوں گے۔ جو پروردگار آج اس موت و حیات پر قادر ہے آخر وہ دوبارہ زندہ کرنے پر قادر کیوں نہیں؟

دوسری آیتِ کریمہ میں امکانِ قیامت کے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے اشارہ کیا جارہا ہے کہ قیامت کا آنا ممکن ہی نہیں ضروری بھی ہے۔ کیونکہ اللہ کی ذات جس طرح عادل و قادر ہے، حکیم بھی تو ہے۔ اور کوئی حکمت والی ذات کبھی کوئی کام بے مقصد تو نہیں کیا کرتی۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونے کی طرح بچھا دیا اور اسی کے اندر اس نے تمہارے لئے غذا کے خزانے رکھے اور اس زمین کی تمام نعمتوں کو تمہارے لئے یا غذا بنایا یا ابتلا بنایا پھر تمہیں ذوقِ تسخیر دے کر زمین کی ہر مشکل نعمت کو مسخر کرنے کی اجازت دے دی اور حلال و حرام کی تعلیم دے کر اس سے متمتع ہونے کا حق دے دیا۔ مزید یہ کہ تمہارے سروں پر آسمان کی چھت تانی اور آسمان کو جس طرح قندیلوں سے روشن کیا اسی طرح اسے سات آسمانوں میں تقسیم کردیا۔ اس کا مفہوم تو ہم نہیں سمجھتے لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ آسمان کی طرف سے بے شمار نعمتیں ہم پر برس رہی ہیں اور ہمارے ذوقِ تسخیر کو انگیخت بھی کررہی ہیں۔ ذرا اندازہ کیجئے! پروردگار نے جو اتنا بڑا خوانِ کرم ہمارے لئے بچھایا ہے اور ہمیں جو قدم قدم پر اپنے احسانات سے گراں بار کیا ہے تو کیا ہماری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہوگا؟ زمین پر اگر گھاس کی کوئی پتی بھی پھوٹتی ہے تو اس کا بھی کوئی مقصد ہے تو اس کائنات کے گلِ سرسبد انسان کا کوئی مقصد نہ ہو اس سے زیادہ احمقانہ بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے پروردگار نے ارشاد فرمایا: أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَٰكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا

Marfat.com

لَا تُرْجَعُوْنَ "کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں عبث (بے مقصد) پیدا کیا ہے کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے"۔ یعنی ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا نہیں کیا تمہارا ایک مقصد ہے جو ہم اپنے انبیاء کرام کے ذریعے تمہیں پہنچا رہے ہیں اور اسی کا حساب لینے کیلئے ایک دن تم ہمارے پاس لائے جاؤ گے۔ تمہارا شائد گمان یہ ہے کہ اگر تم ہمارے پاس لائے بھی گئے تو تمہارے اعمال کی تفصیلات سے ہم شائد بے خبر ہوں گے۔ ایسا نہیں ہم تو ہر چیز کے جاننے والے ہیں تمہارا کوئی عمل اور تمہاری کوئی بات ہمارے علم سے باہر نہیں۔ اس لئے قیامت آئے گی اور تمہیں اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْأَرْضِ خَلِيْفَةً ۗ قَالُوْٓا
أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّىْٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ
اٰدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ أَنْۢبِئُوْنِىْ
بِأَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ
إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ أَنْۢبِئْهُمْ
بِأَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ أَنْۢبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّىْٓ
أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۙ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ
تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا إِلَّآ إِبْلِيْسَ ۖ
أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۖ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ
وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا

Marfat.com

مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي
الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ
فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ
فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

رکوع ۴۔ (اور یاد کرو! جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، انہوں نے عرض کیا، کیا آپ زمین میں اُس کو خلیفہ مقرر کریں گے، جو اس میں فساد مچائے اور خوں ریزیاں کرے، آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کیلئے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں، فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔ اور اس نے سکھا دیئے آدم کو ساری چیزوں کے نام پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا مجھے بتلاؤ ان چیزوں کے نام اگر تم سچے ہو ٥ انہوں نے عرض کیا کہ تو پاک ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے، بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے ٥ پھر اللہ نے آدم سے کہا تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا، میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو چھپاتے تھے۔ اور یاد کرو! جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے اس سے انکار کیا، اور وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس میں سے کھاؤ جتنا چاہو اور جہاں سے چاہو اور اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔ پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات، تو اس نے اس کی توبہ قبول کی۔ کیونکہ وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا! اتر و یہاں سے سب، تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے، تو ان کیلئے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ٥ اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) (آیت ۳۰ تا ۳۹)

Marfat.com

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ O

(اور یاد کرو! جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، انہوں نے عرض کیا، کیا آپ زمین میں اُس کو خلیفہ مقرر کریں گے، جو اس میں فساد مچائے اور خوں ریزیاں کرے، آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کیلئے تقدیس تو ہم کرہی رہے ہیں، فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے) (البقرۃ:۳۰)

گزشتہ رکوع میں پروردگار نے انسانوں کو اپنی بندگی کی دعوت دی اور اس کی بنیاد یہ رکھی کہ چونکہ پروردگار ہی تمہارا خالق، تمہارا مالک، تمہارا روزی رساں، تمہاری زندگی کے تمام امکانات اور ضروریات کو فراہم کرنے والا اور دنیا بھر کی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے، اس لئے وہی تمہارا آقا اور حاکم ہے بندگی، غلامی اور پرستش اسی کو زیب دیتی ہے۔ لہٰذا اس کی بندگی میں کسی اور کو شریک مت کرو۔ رہی یہ بات کہ اس بندگی کے طور طریقے کیا ہوں؟ اس کی حدود اور اس کے آداب کیا ہوں؟ اس کی تفصیلات کا علم کیسے ہو؟ اس کیلئے نبوت اور قرآنِ کریم پر ایمان لانے کا حکم دیا اور اس پر محکم دلائل قائم کیے۔ انسان چونکہ جواب دہی کے احساس کے بغیر ذمہ داری اور فکر مندی سے کسی کام کرنے کیلئے بہت کم تیار ہوتا ہے۔ اس لئے دلائل سے یہ بات واضح کردی گئی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب تمہیں اپنے ایک ایک عمل کا حساب اپنے اللہ کو دینا ہوگا۔ اس دعوت کے نتیجے میں مخالفت اور مخاصمت کی صورت میں جو شدید ردعمل سامنے آیا اس نے اگر ایک طرف اس دعوت کے امکانات کو مخدوش بنا دیا تو دوسری طرف ذات رسالت مآب ﷺ اور مسلمانوں کیلئے زندگی دشوار کردی۔ جب ہم اس ردعمل کے اسباب تلاش کرتے ہیں تو ان اسباب میں سب سے زیادہ دو سبب کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جزیرۂ عرب میں بالخصوص اور پوری دنیا میں بالعموم اس دعوت کے مخاطبین نے محسوس کیا کہ اگر اسلام کی دعوت کو قبول کرلیا جاتا ہے اور قرآنی فکر دل و دماغ میں اتر جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں دنیا میں جو انقلاب برپا ہوگا اس میں کسی کی ذاتی عظمت، ذاتی چوہدراہٹ، دولت کی حاکمیت، سرمائے کا غرور، گروہوں کا تسلط، قبائل کی اجارہ داری اور تخت و تاج کی ہیبت کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ انسانیت کی بنیاد پر ایک نیا انسانی معاشرہ پیدا ہوگا۔ جس میں صرف اللہ کی حاکمیت ہوگی لوگ نام ونسب سے نہیں صرف اعمال سے پہچانے جائیں گے۔ عزت کا معیار انتسابات نہیں ہوں گے، صرف تقویٰ، صلاحیت اور خدمت ہوگی۔ دوسرا سبب یہ کہ بعض قبائل اور بعض قومیں اس بات پر یقین رکھتی تھیں کہ ہمیں اپنے نسب اور خاندانی وجاہت کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہماری اس اہمیت کی وجہ سے کوئی قوم اور کوئی قبیلہ ہمارا ہمسر نہیں ہوسکتا اس لئے جب کوئی بات عزت اور سربلندی کی کسی دوسری طرف سے ان کو سنائی دیتی تھی تو وہ فوراً حسد کا شکار ہوجاتے تھے۔ خاندانی یا قومی عصبیت یا حسد کی وجہ سے وہ کسی طرح گوارا نہیں کرسکتے تھے کہ کسی اور کیلئے کوئی عزت کی بات قبول کرنے کیلئے تیار ہوجائیں۔ قریش بطور ایک قبیلے کے اور یہود بطور ایک قوم کے بری طرح اس مرض کا شکار تھے۔ یہود اپنی قوم کے باہر خدا کا نام سننے کیلئے تیار نہ تھے، ان کیلئے یہ بات موت کے برابر سمجھی جاتی تھی کہ ان کے سوا کسی اور خاندان یا قوم میں اللہ کی وحی اترے۔ اسی طرح قریش کیلئے اپنے کسی قبیلے کے کسی فرد یا باہر کے کسی قبیلے کے کسی شخص کے بارے میں یہ سوچا بھی نہ جاسکتا تھا کہ وہ نبوت کا دعویٰ کرے اور پھر نبوت کے باعث وہ باقی قبائل پر عزت اور عظمت حاصل کرلے۔

Marfat.com

حاصل کلام یہ کہ ذاتی وجاہتوں، قومی عظمتوں اور موروثی تخت وتاج نے اسلام کی مخالفت اس لئے کی کہ اللہ کی حاکمیت ان سب کی وجاہتوں اور عظمتوں کو ختم کر دینے کا باعث ہوتی۔ اور قریش اور یہود نے حسد کی بنیاد پر اسلام کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس طرح ہم نے اپنے لئے جو عظمتیں اور عزتیں بنا رکھی ہیں، وہ سب ختم ہو جائیں گی۔ اور حسد کسی دوسرے کیلئے عزت اور عظمت کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ پیشِ نظر رکوع میں ان دونوں باتوں کا نہ صرف جواب دیا گیا ہے بلکہ تاریخی حقائق کی روشنی میں ایک آئینہ بھی دکھا دیا گیا ہے۔ جس سے اگر کوئی اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرے تو نہائت آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔

سب سے پہلی بات یہ واضح کی گئی ہے کہ تم نے زمین پر جو اپنے نام اور اپنے طریقوں سے ریاستیں اور حکومتیں قائم کر رکھی ہیں۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے تجاوز ہے کیونکہ جب ہم نے پہلے انسان کو پیدا کر کے زمین پر بھیجا تھا، تو اس پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ تم نے زمین پر جا کر اللہ کی خلافت قائم کرنی ہے اپنی حکومت نہیں۔ اور جہاں تک تعلق ہے یہود اور قریش کے حاسدانہ طرزِ عمل کا انہیں بھی تاریخ کا یہ ورق پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا کہ آدم قافلۂ نبوت کے پہلے فرد تھے۔ ان کے ساتھ ابلیس نے حسد کیا تھا۔ حضرت آدم کے زمین پر آنے سے پہلے آسمان یا جنت میں کیا جانے والا یہ پہلا گناہ ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا کہ آدم کو اللہ نے سرفرازی بخشی اور ابلیس کے حصے میں رسوائی اور ناکامی آئی۔ آج پھر اگر یہود اور قریش ابلیس کی تاریخ دہرا رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ حضرت آدم کی طرح سرفراز ہوں گے آپ کی دعوت اسلامی کامیاب ہوگی اور یہود اور ان کے طریقے پر چلنے والے ابلیس کی طرح خائب وخاسر ہوں گے۔ انہی دونوں حقائق کو پیشِ نظر رکوع میں حکمتوں سے بھرپور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جس کا تذکرہ ہم قرآن کی بیان کردہ ترتیب کے ساتھ کریں گے۔

"اذ" کا محلِ استعمال

سب سے پہلا لفظ ہے اذقال، عربی زبان میں جب کسی بات کا آغاز اذ سے ہوتا ہے تو وہ اصل میں اُذْکُرْ کے معنی میں ہوتا ہے۔ یاد کرو، تصور میں لاؤ، ذہن میں تازہ کرو، یہ اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو سرگزشت بیان کی جاتی ہے، یا کسی سرگزشت کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اس میں یہ تصور دینا مقصود ہوتا ہے کہ جس سرگزشت کا حوالہ دیا جا رہا ہے مخاطب اس سے پوری طرح واقف ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ یقین دلانا مقصود ہوتا ہے کہ متکلم اس سرگزشت کے صحیح ہونے پر پوری طرح یقین رکھتا ہے اس لئے مخاطب کو بھی متکلم کے اعتماد پر اس سرگزشت کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ یہاں جس سرگزشت کا بیان شروع ہو رہا ہے اس میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ متکلم خود پروردگار ہے وہ تو اس سرگزشت کو نہ صرف یہ کہ پوری طرح جانتا ہے بلکہ اس سرگزشت کا خالق بھی ہے اور مخاطب اس میں آنحضرت ﷺ ہیں وہ وحیِ الٰہی کی ایک ایک بات پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی اس کے جتنے بالواسطہ مخاطب ہیں، ان میں سے یہود تو آسمانی کتابوں کے باعث اس سرگزشت پر یقین رکھتے ہیں۔ رہے مشرکین عرب وہ اگرچہ علمی طور پر تو ایسی باتوں سے بالکل جاہل ہیں لیکن سینہ بسینہ پھیلنے والی باتوں میں چونکہ یہ سرگزشت ایک معروف حقیقت ہے اس لئے ان کے اس سے بے خبر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

اس سرگزشت میں جس اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر باقی مخلوقات کی طرح پیدا نہیں فرمایا کہ دنیا میں انہیں وجود ملے پھر وجود کی بقا، اس کی ضروریات فراہم کرنے کیلئے پوری زندگی ایک کشمکش اور مصروفیت میں گزرے اور پھر طبعی موت ان کا خاتمہ کر دے۔ ان کی جبلت اور ان کے حواس ان کے رہنما ہوں بلکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ارادہ عقل اور شعور دے کر بھیجا ان کی زندگی کے مقاصد متعین فرمائے۔ انہیں اپنے خالق ومالک اور معبود ورب سے آگاہی بخشی اور ان پر یہ واضح کیا کہ تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ

Marfat.com

ہے کہ تم نے اپنے رب کی بندگی کرنی ہے اور اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اور ہر مقام پر اسی کے بندہ ہونے کا ثبوت دینا ہے بلکہ مزید انہیں یہ بھی رہنمائی بخشی کہ تمہارا کام صرف ذاتی زندگی میں اللہ کی بندگی کرنا نہیں بلکہ تمہیں اللہ نے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تمہارا فرض صرف اتنا ہی نہیں کہ اس کی بندگی کرو بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی ہدایت کے مطابق کام کرو۔ اور زمین پر اس کی بندگی کو نافذ کردو۔

خلیفہ سے کیا مراد ہے؟

خلیفہ وہ ہوتا ہے جو کسی کی مِلک یا مُلک میں خلیفہ بنانے والے کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ اس تعریف کو اگر ہم سامنے رکھیں تو چند باتیں خود بخود اس سے واضح ہوتی ہیں اور بعض اشکالات کا خود بخود جواب بھی مل جاتا ہے۔

مثلاً ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ خلیفہ اصل میں وہ ہوتا ہے جو کسی کا جانشین اور اس کی جگہ لینے والا ہو۔ اس زمین پر پہلے جنات آباد تھے۔ جب انہوں نے زمین میں فساد مچایا اور سرکشی کا رویہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ انہیں زمین سے نکال دو اور دور دراز پہاڑوں اور بے آباد جزیروں میں دھکیل دو پھر ان کی جگہ انسان کو زمین میں بسایا گیا۔ اس لحاظ سے انسان جنات کا خلیفہ ہے۔ اس میں دو باتیں قابل توجہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ جو فرض کرلیا گیا ہے کہ زمین میں انسان سے پہلے جنات آباد تھے، ان کی سرکشی کے باعث ان کو زمین سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ انسانوں کو آباد کیا گیا اس کا ثبوت کیا ہے؟ قرآن میں اس کا ذکر نہیں کسی صحیح حدیث سے اس کا ثبوت نہیں ملتا محض چند اشاروں اور کنایوں سے ایک حقیقت تراش لینا کوئی علمی خدمت نہیں۔ دوسری یہ بات کہ قومیں قوموں کی جگہ آباد ہوتی رہتی ہیں۔ ایک قوم دوسری کی جگہ لے لیتی ہے۔ اس لئے ایک قوم کو دوسری قوم کا اس معنی میں خلیفہ قرار دینا کہ وہ اس کی جگہ آباد ہوگئی ہے لغوی لحاظ سے غلط بھی نہیں۔ لیکن جس اہتمام کے ساتھ پروردگار آدم کے خلیفہ بنانے کی بات فرمارہے ہیں کیا اس سے یہ تاثر پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ محض ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کی جگہ آباد ہونا تھا اور پھر اس کے بعد فرشتوں کے حوالے سے جن اشتباہات کا ذکر کیا گیا ہے اور جس طرح حضرتِ آدم کو علم دیئے جانے کی بات کی گئی ہے کیا اس سے واقعی یہی بات سمجھ میں آتی ہے؟ بالکل سامنے کی بات ہے اور اس میں کوئی پیچیدگی نہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا اور اپنی مقدس ترین مخلوق کا اسے مسجود بنا کر زمین پر اس کی عظمت اور بڑائی کا اعلان کیا۔

خلیفہ کے لفظ سے ہی انسان کی خلافتِ ارضی کی حیثیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض باتیں خود اس لفظ سے پھوٹتی ہیں کہ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ زمین کا مالک ایسا ہے جسے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے کسی سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑتی وہ کبھی غفلت، نیند یا اونگھ کا شکار نہیں ہوتا اس کی مصروفیات کبھی اپنی مملکت کی دیکھ بھال سے اسے غافل نہیں کرتیں اس کی مملکت کی وسعتیں اس کے علم اور اس کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتیں اور اس کے اختیارات میں کوئی دوسرا شرکت نہیں کرسکتا۔ زمین پر اس کے سوا کسی کی حکومت نہیں اس لئے جس مخلوق کو زمین پر خلیفہ بنایا جائے گا وہ یقیناً اسی کا خلیفہ ہوگا جو زمین کا مالک اور حاکم ہے اور چونکہ زمین پر اس کی حاکیت بلاشرکتِ غیرے ہے تو یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ زمین پر نائب بننے والا جو اختیارات بھی رکھے گا وہ اس کے ذاتی نہیں ہوں گے بلکہ اصل مالک کے عطا کردہ ہوں گے۔ اس کا کام اصل مالک کے اختیارات کو زمین اور اہلِ زمین پر نافذ کرنا ہے اور اس طرح اپنے مالک کی منشا کو پورا کرکے اس کی رضا حاصل کرنا ہے۔

Marfat.com

اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین پر انسان کو خلیفہ بنا کر بھیجا تو یقیناً کچھ اختیارات بھی عطا فرمائے کیونکہ اختیارات کے بغیر تو ایک گھر کا نظام نہیں چلایا جا سکتا چہ جائیکہ پوری زمین کا نظام چلایا جائے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے کسی کا محتاج نہیں اس کی مملکت کے دور دراز علاقوں میں بھی اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ انسان کو اختیارات دے کر زمین میں اپنا نائب بناتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ تم یہ مفوضہ اختیارات اللہ کی منشا کے مطابق استعمال کرتے ہو یا اپنے مفاد یا اپنی خواہش کو پورا کرنے کیلئے اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہو۔

انسان چونکہ زمین میں صرف اللہ ہی کا نائب ہے اور یہ زمین صرف اللہ ہی کی ملک ہے اس لئے انسان کو یہ بات کسی طرح زیب نہیں دیتی کہ وہ اللہ کی اس زمین پر کسی اور کو مالک سمجھے اور اللہ کے احکامات کی بجائے کسی اور کے احکامات نافذ کرے۔

خلافت کے تصور سے یہ بات سمجھنا بھی کوئی مشکل نہیں کہ جس پروردگار نے انسان کو اختیارات دے کر زمین پر بھیجا ہے اسی نے یقیناً ان اختیارات کے استعمال کا طریقہ بھی سکھایا ہوگا اور اس کی آزادی کی حدود بھی مقرر کی ہوں گی، جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کو اگر اپنی خلافت کا احساس ہو تو وہ کبھی ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا اور اگر کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلیفہ نہیں بلکہ مالک سمجھتا ہے۔اور وہ اس بات کو بھول گیا ہے کہ وہ مطلق العنان نہیں بلکہ خلیفہ اور نائب ہونے کی حیثیت سے اللہ کے سامنے جوابدہ ہے وہ اس کی ایک ایک بددیانتی اور ایک ایک خیانت پر مواخذہ بھی کرے گا۔

مزید اس سے یہ بات بھی اخذ کی جا سکتی ہے کہ جس طرح کوئی بھی حاکم اپنے کسی ماتحت کو کوئی ذمہ داری سونپتا ہے تو سب سے پہلے اس کی اہلیت کا جائزہ لیتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کی زمین کی خلافت ان لوگوں کو مل جائے جو اس کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔شائد یہی وجہ ہے کہ اللہ نے زمین پر جس انسان کو سب سے پہلے خلیفہ بنا کر بھیجا وہی پہلا نبی بھی تھا۔پھر جتنے نبی دنیا میں آئے وہی اللہ کے خلیفہ تھے اور وہ نبوت کے ساتھ ساتھ زمین پر اللہ کی خلافت کا فرض بھی انجام دیتے تھے۔آخری خلیفہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔آپ کے بعد چونکہ نبوت ختم ہوگئی اس لئے حضور ﷺ نے خود فرمایا کہ پہلے نبی امامت و سیادت کا فرض انجام دیتے تھے اور وہی سیاستِ منزل سے لے کر سیاستِ ملک تک کے آداب سے آگاہ کرتے تھے۔لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا بلکہ خلفاء ہوں گے جو خلیفۃ اللہ نہیں ہوں گے بلکہ خلیفۃ الرسول ہوں گے۔ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ انسان کو اللہ نے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کے بھیجا تھا تاکہ وہ زمین پر اپنی حکومت و ریاست کا صور نہ پھونکیں اور اپنی وجاہتوں اور عظمتوں کے جھنڈے نہ گاڑیں بلکہ اللہ کے دین کو نافذ کریں اللہ کے احکام کو غلبہ دیں اور جس طرح سے باقی پوری کائنات اللہ کی اطاعت کی وجہ سے فساد سے محفوظ اور اطمینان اور عافیت سے رواں دواں ہے اس طرح زمین بھی ہر طرح کے فساد سے محفوظ رہے اور تمام انسان نہائت خیر و عافیت سے زندگی گزاریں۔

فرشتوں کے سوال کا منشاء

پروردگار نے جب فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، تو انہوں نے محض اطمینان کیلئے یہ بات پوچھی کہ آپ زمین میں ایک ایسی مخلوق کو خلیفہ بنائیں گے جو زمین میں جا کر فساد مچائے گی اور خوں ریزی کرے گی۔اس پر بعض لوگوں کو گمان ہوا ہے کہ فرشتے شائد مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انہیں آئندہ پیش آنے والے واقعات کی پہلے سے خبر ہو جاتی ہے۔لیکن اگر اگلی آیات

Marfat.com

پڑھ لی جائیں تو یہ غلط فہمی خود بخود دور ہو جاتی ہے۔ رہی یہ بات کہ ان کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ زمین میں انسان فساد مچائے گا۔ اگر ہماری متذکرہ بالا گزارشات پیش نظر رہیں تو بڑی آسانی سے اس بات کا جواب مل جاتا ہے۔ فرشتوں نے یہ محسوس کیا کہ پوری کائنات کو فساد سے محفوظ رکھنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ جو اس کائنات کا حقیقی مالک اور حاکم ہے اس کائنات میں اسی کے احکام نافذ کئے جائیں کیونکہ امن صرف اس بات کا نام نہیں کہ کسی نہ کسی طرح جرائم روک دیئے جائیں بلکہ حقیقی امن کی ضمانت جس بات سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ جو ملک کا جائز اور اصل حکمران ہے اس کی حکومت تسلیم کی جائے۔ اس کے وضع کردہ آئین کو نافذ کیا جائے اور ملک کا نظام اس طرح چلایا جائے جس طرح اس کے حاکمِ حقیقی کا منشا ہو۔ اور اگر اس حاکم حقیقی کے منشا کو نظر انداز کر کے اس کے آئین سے روگردانی کر کے اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کا انکار کر کے بظاہر امن قائم کر بھی دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ امن قائم کرنے والوں کو امن مل جائے۔ لیکن دوسرے لوگ تو اسی طرح خطرے کی زد میں رہیں گے۔ یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے ڈاکوؤں کا کوئی گروہ کسی شہر پر قبضہ کر کے بظاہر لوگوں کیلئے امن قائم کر دے اور ملکی آئین کو موقوف کر دے تو کوئی بھی شخص اس میں چھپے ہوئے فساد کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فرشتوں نے محسوس کیا کہ جس مخلوق کو خلافت دی جا رہی ہے اسے یقیناً اختیارات بھی دیئے جائیں گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ اس مخلوق میں خواہشات بھی ہیں اور ہوس بھی، خود غرضی بھی ہے اور مفادات سے محبت بھی۔ ایک ایسی مخلوق جو اس طرح کے جذبات سے مسلح ہو اور پھر اسے اختیارات بھی دے دیئے جائیں۔ نتیجہ معلوم ہے کہ وہ اپنے مفادات کے حصول اور اپنے خواہشات کو پورا کرنے کیلئے جب اختیارات کا استعمال کرے گی تو ہر جگہ تصادم ہوگا۔ دل ٹوٹیں گے، خون بہے گا اور زمین فساد سے بھر جائے گی۔ ساتھ ہی ایک اور بات بھی فرشتوں نے عرض کی کہ نئی مخلوق کے پیدا ہونے سے تو صرف فساد کے اندیشوں کو ہی تقویت ملتی ہے حالانکہ اس کائنات کی اگر کوئی ضرورت ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اللہ کے احکام کی تعمیل ہوتی رہے اس کے فرامین بجالائے جاتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی مبارک کے مطابق سارا جہاں پاک صاف رکھا جائے اور اس کی تسبیح و تقدیس ہوتی رہے، ہر جگہ اس کی حمد و ثنا کے ترانے گونجیں۔ ہر زبان اس ذکر سے زمزمہ سنج رہے اور یہ کام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم خدام ادب پہلے بھی کر رہے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے۔ تو جو ہونا چاہئے وہ تو ہو رہا ہے اور جو نہیں ہونا چاہئے۔ نئی مخلوق کے پیدا ہونے سے اس کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔ اس لئے بصد ادب عرض ہے کہ باری تعالیٰ ہم اس نئے فیصلے کی مصلحت نہیں سمجھ سکے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ انہوں نے اپنے آپ کو خلافتِ ارضی کا زیادہ اہل ثابت کیا تھا اس لئے کہ یہ بات فرشتوں کی فطری صفات کے بالکل برعکس ہے۔ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا کیا ہے وہ اپنی روحانیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے غائت درجہ قرب و اتصال رکھتے ہیں۔ اللہ کے ہر حکم کے سامنے تعمیل کیلئے جھک جانا ان کی سرشت میں داخل ہے پروردگار کے کسی فیصلے کے بارے میں لیت و لعل یا شک و ارتیاب ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی طرح اللہ نے ان کے اندر کسی چیز کی ہوس نہیں رکھی وہ خود غرضی سے بالکل ناواقف ہیں۔ ایک ایسی پاکیزہ مخلوق کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ خود اپنے لئے خلافت چاہتے تھے اور پروردگار کے فیصلے پر انہیں اعتراض تھا یہ سراسر قلتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ ان کے جواب میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ ”جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے“۔ یعنی تم اس فیصلے کو اس لئے سمجھنے میں دشواری محسوس کر رہے ہو کہ تم اس پوری سکیم سے واقف نہیں اس میں جو حکمتیں اور مصلحتیں مخفی ہیں تمہارا علم اسے ادراک نہیں کر سکتا۔ جب تمہارے سامنے یہ پوری سکیم آئے گی، تو پھر تمہیں اس کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ اس لئے ایک مختصر جواب دے کر اصل حقیقت کی طرف اشارہ کر کے انہیں مطمئن کر دیا۔ لیکن ان کی مزید یکسوئی اور مزید حقائق واضح کرنے کیلئے حضرت آدم کا پہلے انسان کی حیثیت سے ان سے اس طرح تعارف کرایا جس سے انسان کی ان صفات کو نمایاں کیا ہے جو خلافتِ ارضی کیلئے ضروری ہیں اور جن کی وجہ سے انسان کو خلافتِ ارضی کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔

Marfat.com

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ (البقرة: ۳۱ تا ۳۳)

(اور اس نے سکھا دیئے آدم کو ساری چیزوں کے نام پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا مجھے بتلاؤ ان چیزوں کے نام اگر تم سچے ہو ۝ انہوں نے عرض کیا کہ تو پاک ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے، بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے ۝ پھر اللہ نے آدم سے کہا تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا، میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو چھپاتے تھے)

یہاں ایک دفعہ پھر ذہن میں سابقہ بحث کا خلاصہ مستحضر کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو جو انسانوں کے جد امجد ہیں۔ خلافتِ ارضی کے منصب پر فائز کرنا چاہتا ہے اور فرشتے یہ جان کر کہ خلافت بغیر اختیارات کے نہیں ہوتی اور یہ بھی دیکھ کر کہ آدم خواہشات اور آزادانہ ارادوں کا حامل بھی ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ زمین میں اس کی خلافت سے خوں ریزی ہوگی اور فساد برپا ہوگا۔ انہوں نے بات کو سمجھنے کیلئے بڑے ادب سے عرض کیا کہ پروردگار تیرے بندوں اور تیری مخلوق کی جانب سے جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تیری تسبیح و تقدیس ہوتی رہے اور تیری حمد کے ترانے گونجتے رہیں اور زمین کو تیری مرضی مبارک کے مطابق پاک وصاف رکھا جائے اور یہ سارے کام تیرے یہ عاجز بندے اپنے مقدور کے مطابق بجا لا رہے ہیں اور تیری مخلوقات میں سے کوئی مخلوق ایسی نہیں جو اپنی تسبیح اور اپنی نماز سے واقف نہ ہو۔ حتی کے درختوں کے پتے اور زمین پر مٹی کے ڈھیلے تک تیری تسبیح میں مشغول رہتے ہیں تو پھر اس نئی مخلوق کو پیدا کرنے اور اسے خلافت کا منصب عطا کرنے کی حکمت کیا ہے؟ اس کے جواب میں پروردگار نے آدم علیہ السلام کو علم الاشیا سے نوازا۔ اس علم کے لئے جو تعبیر اختیار کی گئی وہ یہ ہے کہ اللہ نے آدم کو اشیا کے نام سکھائے، اس لحاظ سے دو چیزیں ہمارے پیش نظر ہیں ایک تو یہ کہ بنیادی بحث کو دیکھتے ہوئے یہ بات تو واضح ہے کہ آدم کو علم کی دولت دی گئی اور وہ علم وہ تھا جو خلافت ارضی کی ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے ضروری تھا اور یقیناً یہ علم ایسا تھا جس کے متحمل فرشتے نہیں ہوسکتے تھے اور دوسری یہ بات کہ اس علم کو اسماء کا علم قرار دیا گیا ہے۔ اس تعبیر میں کیا حقیقت پنہاں ہے؟

علم الاشیاء کیا ہے؟

سب سے پہلے پہلی بات کو لیجیے کہ خلافت کی ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے کون سا علم درکار تھا؟ جسے آدم کو عطا کیا گیا ہے لیکن فرشتے اس کے متحمل نہ ہوسکے حالانکہ قرآن وسنت سے کہیں یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے اس علم کی تعلیم کیلئے آدم علیہ السلام کیلئے الگ کوئی انتظام کیا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ سکھانے کا عمل فرشتوں اور آدم کیلئے یکساں تھا۔ البتہ آدم اور فرشتوں کی صلاحیتوں اور حقائق کو اخذ کرنے کی

Marfat.com

صلاحیت میں چونکہ فرق تھا اس لئے آدم علیہ السلام نے اس تعلیم کو سمجھا اور اس کے مغز کو پالیا۔ لیکن فرشتے اسے اخذ نہ کر سکے۔ اس لئے جب دونوں کا امتحان لیا گیا تو فرشتے جواب نہ دے سکے اور آدم علیہ السلام نے ان کے سامنے ان تمام باتوں کو کھول کر بیان کر دیا اور یا یہاں تعلیم سے مراد تعلیم کا عمل نہیں بلکہ تعلیم کی صلاحیت کی تخلیق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو الگ الگ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ فرشتوں کو وہ صلاحیتیں دی گئی ہیں جو ان کی اپنی ذمہ داریوں کے مطابق ہیں اور آدم علیہ السلام کو وہ صلاحیت عطا کی گئی ہے جو خلافت ارضی کیلئے ضروری ہے۔ لیکن اصل سوال اپنی جگہ ہے کہ وہ علم کیا تھا؟ تھوڑے سے تدبر سے کام لیں تو اس علم کی دو جہتیں معلوم ہوتی ہیں۔ علم کی ایک جہت وہ ہے، جس کا تعلق انسان کی ذات اور اس کے اندرونی احساسات سے ہے اور علم کی دوسری جہت وہ ہے، جس کا تعلق انسانی ضروریات اور اس کے متعلقات سے ہے۔ جہاں تک علم کی پہلی جہت کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کو اللہ نے خیر و شر میں امتیاز کرنے کا شعور بخشا ہے وہ اگر نفسیاتی علائق اور بیرونی دباؤ سے آزاد ہو کر غور و فکر سے کام لے تو بڑی آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ حق کیا ہے؟ باطل کیا ہے؟ صحیح کیا ہے؟ غلط کیا ہے؟ حسن کیا ہے؟ اور قبح کیا ہے؟ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر خواہشات بھی پیدا کی گئی ہیں۔ محبت اور نفرت کے جذبات بھی ہیں، قوت واہمہ بھی ہے، عقل جیسا جوہر بھی عطا کیا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ نارسائی کا ایک لاحقہ بھی ہے حواس کی دولت بھی دی گئی ہے۔ لیکن وہ غلطیوں سے اور حدود سے ماوراء ہرگز نہیں۔ مزید یہ کہ اس کے اندر مفادات کی ہوس اور حرص بھی ہے۔ یہ تمام موانع ایسے ہیں، جو اس کے شعور کو بعض دفعہ مغلوب کر لیتے ہیں۔ پھر اس کیلئے صحیح فیصلے پر پہنچنا آسان نہیں رہتا اور یہی وہ امتحان اور آزمائش ہے جو اسے باقی مخلوقات سے ممتاز کر دیتی ہے۔ اس لئے ایک علم تو ایسا ہونا چاہئے جو اسے یہ بات سکھائے کہ خیر و شر کے امتیاز کے شعور کو کس طرح ان موانع سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو یہ تمام جذبات اور خواہشات زوردار ہونے کے باوجود بھی اس پر قابو نہیں پا سکتیں؟ اور وہ کیا چیز ہے جو جب انسان کے اندر سے نکل جائے تو انسان انسانیت کی سطح سے گر کر بعض دفعہ حیوانی سطح سے بھی گر جاتا ہے؟ انسان چونکہ خلیفۃ اللہ بنا کر بھیجا جا رہا ہے اس لئے اسے ایک ایسے علم کی ضرورت ہے جس سے وہ اپنے اس آقا کی معرفت حاصل کر سکے جس کا وہ خلیفہ ہے اور اس کے اندر ایک زوردار جذبہ ابھرے تو اس کی زندگی کا حقیقی مقصد اپنے آقا کی معرفت اس کے قرب کی خواہش اور بالآخر اسی سے وصل اس کی زندگی کا ہدف بن جائے۔ درحقیقت یہی وہ علم ہے جس کو قرآن کریم نے (العلم) سے تعبیر کیا ہے۔ یہی وہ علم ہے جس تک رسائی انسان کی براہِ راست نہیں ہوتی اسی علم کو لے کر اللہ کی کتابیں اترتی ہیں اور اللہ کے نبی مبعوث کیے جاتے ہیں۔

علم الاشیاء کو علم الاسماء سے کیوں تعبیر کیا گیا؟

دوسرا علم جس کی انسان کو ضرورت ہے اس کا تعلق انسان کی ضروریات سے بھی ہے اور اللہ کی ان مخلوقات کے ساتھ بھی جن سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے اور اس کائنات کے ساتھ بھی جس میں انسان مکین ہے۔ پھر اس علم کی بھی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ تو یہ ہے کہ مجھے اشیائے ضرورت کس طرح اور کون سی حاصل کرنی ہیں؟ کن سے تمتع کرنا ہے اور کن سے پرہیز کرنا ہے؟ یعنی کون سی چیزیں میرے لئے حلال ہیں اور کون سی حرام؟ کون سی جائز ہیں اور کون سی ناجائز؟ علم کی اس شاخ کا تعلق بھی پہلے علم سے ہے اور یہ بھی وحی الٰہی کی رہنمائی کی محتاج ہے۔ اس علم کی دوسری شاخ یہ ہے کہ انسان کو زمین پر بھیجا جا رہا ہے تو اس کے اندر قوت تسخیر جذبہ تسخیر، قوت عمل، ایجاد و اختراع کا جذبہ بھی پیدا کیا جا رہا ہے اور اس کیلئے اس کی فطرت اور عقل میں ضروری حد تک رہنمائی رکھ دی گئی ہے۔ اسے بتا دیا گیا ہے کہ زمین تیرے لئے ہے، اس کا

Marfat.com

گردوپیش تیرا ہے، یہ آسمانوں کی وسعتیں بھی تیری ہیں۔ زمین میں چھپے ہوئے خزانوں کو نکالنا، زمین کی قوتِ روئیدگی سے کام لینا، زمین اور فضائے آسمانی کی قوتوں کو مسخر کر کے ان سے خدمت لینا، یہ تیرا حق ہے۔ تمہارا اصل ہدف تو اللہ کی رضا کا حصول ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ محنت اور ذوقِ تسخیر سے کام لینا، یہ بھی تم پر لازم ہے۔ جو چیزیں انسانی ضرورت کا درجہ رکھتی ہیں، ان کیلئے علم و ہنر پیدا کرنا، ایجاد و اختراع سے کام لینا یہ فرضِ کفایہ ہے۔ اور مخالفتیں طاقت پکڑ لیں، تو ان سے دفاع کیلئے یا انہیں زیر کرنے لئے قوت کا فراہم کرنا، یہ کبھی فرضِ عین ہے اور کبھی فرضِ کفایہ ہے۔ مختصر یہ کہ یہ علم کی وسیع دنیا ہے جس کا تعلق آدم اور انسان سے ہے۔ لیکن فرشتوں کی زندگی میں ان باتوں کا کوئی دخل نہیں۔

اس لئے پروردگار نے جب اس علم کی بنیادی باتوں سے حضرتِ آدم کو آگاہ کیا اور یہ بنیادی احساسات، جبلت، فطرت اور جذبات کی شکل میں اس کے اندر رکھ دیئے گئے اور اسے ان تمام سے شناسا بنایا گیا اور پھر اس سے پوچھا گیا کہ تم اس علم کی تفصیل بیان کرو تو اس نے بڑے آسانی سے ان چیزوں کو بیان کر دیا لیکن فرشتے چونکہ ان احساسات سے اور ان صلاحیتوں سے بے نیاز رکھے گئے ہیں۔ انہیں علم وہ دیا گیا ہے جن کا تعلق ان کی ملکوتی زندگی سے ہے اور اگر انہیں زمینی معاملات کی کوئی خدمت بخشی بھی گئی ہے تو صرف ان کی ذمہ داری کی حد تک اس کا علم دیا گیا ہے۔ لیکن ان کے اندر وہ جامعیت نہیں رکھی گئی جو انسان میں ہے۔

دوسرا معاملہ تعبیر کا ہے کہ قرآن کریم نے علم الاشیاء کو یا علم کو علم الاسماء کا نام دیا ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو تمام نام سکھائے۔ اس سے مراد کیا ہے؟ بات اصل میں یہ ہے کہ انسان کے علم کی پہلے بھی یہی صورت رہی ہے اور آج بھی یہی ہے کہ وہ ہر چیز کا علم نام کے ذریعے سے اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ زندگی کے کسی شعبے، کائنات کی کسی چیز، انسانی رویوں میں سے کوئی رویہ، علمی اور فکری دریافتوں میں سے کسی دریافت کے بارہ میں ہم جاننا چاہیں تو ہم ہمیشہ اسماء سے مدد لیتے ہیں اور اسم ہی سے اس کا آغاز کرتے ہیں۔ سائنس اور آرٹ یہ علم کی دو الگ الگ شاخیں ہیں۔ اور ہم ان دونوں کو دو ناموں سے جانتے ہیں پھر آگے ان دونوں کے تفصیلی اور ذیلی اسماء ہیں اور ان کے الگ الگ شعبے ہیں۔ ان سب کو ہم ان کے ناموں سے پہچانتے ہیں حتیٰ کہ انسانوں کی، شہروں کی اور استعمال میں آنے والی چیزوں کی شناخت صرف اسماء سے ہوتی ہے۔ آپ کسی سے علم کے کسی گوشے کے بارے میں، کسی حقیقت کے بارے میں، کسی فرد کے بارے میں، کسی تاریخی حادثے کے بارے میں علیٰ ہذا القیاس ایسی ہی کسی چیز کے بارے میں جاننا چاہیں تو فوراً آپ اس کا نام یا عنوان معلوم کرتے ہیں اور اس کی تفصیلات کا علم حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے، جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو بے شمار علوم کے نام بتا دیئے گئے اور یا یہ ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا کر دی گئی کہ وہ خود ایک حقیقت کا نام رکھے اور پھر اس کی تفصیلات جاننے کیلئے تحقیق اور تجسس سے کام لے۔ بعض اہلِ علم نے اس کے بعض دوسرے مفاہیم بھی بیان کیے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ فرشتوں کو یہ گمان تھا کہ اولادِ آدم زمین میں خوں ریزی کا باعث بنے گی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اولادِ آدم کا مشاہدہ کرایا جن، میں انبیا اور رسل، مجددین اور مصلحین اور شہداء اور صدیقین بھی پیدا ہونے والے تھے۔ ان کو دکھا کر یہ بتایا کہ اگر اولادِ آدم کے اندر ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے جو اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات کو بے جا طور پر استعمال کریں گے، تو ساتھ ہی ان کے اندر ایسے لوگ بھی اٹھیں گے جو خود بھی اس ذمہ داری کا حق ادا کریں گے اور دوسروں کو بھی ان ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کیلئے سردھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ مختصر یہ کہ اللہ نے آدم کو علم کی دولت عطا فرما کر فرشتوں پر یہ واضح کر دیا کہ تمہیں یہ جو شبہ ہے یہ مخلوق زمین پر جا کر فساد پھیلائے گی، یہ صحیح نہیں کیونکہ ہم آدم کو صرف اختیارات ہی نہیں دے کر بھیج رہے اسے علم بھی دے رہے ہیں۔ علم ان کو غلط کام کرنے سے روکے گا، ان کے اندر ایک ایسا شعور پیدا کرے گا، جس سے ان میں خیر غالب آجائے گا اور شر مغلوب ہو جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ ان کا علم انہیں اس انجام سے بھی آگاہ کرتا رہے گا جو غلط کام کرنے کے نتیجے میں بالآخر انہیں بھگتنا پڑے گا۔

Marfat.com

سُبْحَان ...... کلمۂ تنزیہ

فرشتے جب اس بات سے آگاہ ہوگئے تو وہ پکار اٹھے سُبْحٰنَکَ لَاعِلْمَ لَنَآ اِلَّامَاعَلَّمْتَنَا ''یا اللہ تو پاک ہے'' یہ کلمہ تنزیہ ہے جو نامناسب اور خلافِ شان باتوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کیلئے استعمال ہوتا ہے اور قرآنِ کریم میں جابجا اس کا استعمال ہوا ہے اور یہاں فرشتے اس کلمہ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پروردگار تیری شان اس سے ارفع اور بلند ہے کہ تیرے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہو جو تیری حکمت اور مصلحت سے خالی ہو۔ ہم نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے، وہ محض ہمارے علم کی کمی کا نتیجہ ہے۔ ہمارے پاس تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے بخشا ہے۔ علم اور حکمت کا اصلی خزانہ تو تیرے ہی پاس ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو علم کا خزانہ عطا فرمایا تھا ان کو اسماء کی صورت میں فرشتوں کے سامنے جب پیش کیا تو وہ پہلے ہی اپنے عجز کا اعتراف کر چکے تھے اب ان کی عاجزی اور سرفگندگی میں مزید اضافہ ہوا۔ اس کے بعد پروردگار نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، جن میں خطاب اگرچہ فرشتوں سے ہے لیکن مقصود انسانوں کو سمجھانا ہے۔ ایک تو وہ بات جو پہلے اختصار سے فرمائی تھی اب اسے وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ کے ہر فیصلے کے بارے میں یہ بات ہر وقت ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اس کارخانۂ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ساری حکمتیں اور مصلحتیں صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں۔ فرشتے باوجود اللہ کے قرب کے ان حکمتوں اور مصلحتوں کو نہیں جانتے۔ اس لئے جب اس کارخانۂ قدرت میں اللہ کے کسی فیصلے کی حکمت سمجھ میں نہ آتی ہو تو اسے ہمیشہ اپنے علم کی کمی پر محمول کرنا چاہئے اس کے بارے میں کبھی بھی طبیعت میں شک وشبہ کو پیدا نہیں ہونے دینا چاہئے کیونکہ اللہ کا کوئی کام بھی حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں۔ لیکن اس کے سارے کاموں کی حکمتوں اور مصلحت کو جاننا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔

دوسری بات فرشتوں سے یہ فرمائی وَاَعْلَمُ مَاتُبْدُوْنَ وَمَاکُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ ''میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپا رہے ہو''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے سوال کو بھی سمجھتا تھا اور اس کی اصل وجہ کو بھی جانتا تھا، جس سے یہ سوال پیدا ہوا تھا۔ وہ وجہ یہ تھی کہ تم آدم کی خلافت کی اسکیم کے مضمرات سے بے خبر تھے۔ تم چاہتے تھے کہ وہ تم پر ظاہر کئے جائیں۔ اس مقصد کیلئے تم نے اس اسکیم کے برے پہلوؤں کی طرف جو واضح طور پر تمہیں نظر آئے بشکل سوال اشارہ کیا تاکہ تم پر اس کے وہ پہلو کھولے جائیں جو خیر کے ہیں۔ چنانچہ علم الاسماء کے حوالے سے وہ پہلو تم پر کھول دیئے گئے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر اپنے ایک احسان کے طور پر بیان فرمائی ہے کہ تمہارے سوال کے ظاہر و باطن دونوں کا جواب تمہیں دے دیا گیا ہے اس میں فرشتوں کیلئے کسی ملامت کا کوئی پہلو نہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط

اَبٰی وَسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ O

(اور یاد کرو! جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے اس سے انکار کیا، اور وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔) (البقرۃ۔۳۴)

Marfat.com

خلافت آدم کے حوالے سے موجود مخلوقات کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہی اور امتحان

اس رکوع کی سابقہ آیات میں حضرتِ آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کے حوالے سے پروردگار نے جب اپنے ارادے کا اظہار فرمایا تو فرشتوں نے پوری سکیم سے آگاہ نہ ہونے کے باعث اپنے علم کی کمی کی وجہ سے جن خدشات کا اظہار کیا تھا۔ پروردگار نے نہائت تفصیل کے ساتھ ان کا جواب دیا اور خلافتِ آدم میں جو مصلحتیں اور حکمتیں مخفی تھیں ان سے کسی حد تک آگاہ فرمایا اور فرشتے اپنے تئیں جن خطرات کو محسوس کر رہے تھے ان میں سے ایک ایک کو دور کر کے نہایت پیار سے انہیں مطمئن کیا۔ فرشتے جو سرتاپا عجز و اعتراف ہیں، وہ اس پر مزید شکر گزار ہوئے اور اپنی عاجزی کا اعتراف کیا اب اس آیتِ کریمہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اور ان کی خلافت کا اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ اس میں سب سے پہلی ضروری بات یہ تھی کہ اس وقت جو مخلوقات موجود تھیں اور جنہیں تمام مخلوقات میں ایک حیثیت اور اہمیت حاصل ہے انہیں خلافتِ آدم کے حوالے سے ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے اور مزید یہ بات بھی کہ ان کا امتحان بھی لیا جائے کہ وہ کہاں تک اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں جو حکم دیا گیا ہے اس میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں اور مزید یہ بات بھی کہ یہیں سے اس کشمکش اور اس سے پیدا ہونے والے نتیجے کی بھی ایک منظر کشی کی گئی ہے جس سے اس وقت اسلامی جماعت گزر رہی تھی اور جس کے اہم کردار نبی کریم ﷺ مسلمان اور قریشِ مکہ تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے فرشتوں کو حکم ہوا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔

سجدہ کا مفہوم

سجدہ کا معنی تو ہوتا ہے ''جھکنا''۔ لیکن اس کے مدارج ہیں کبھی تو رکوع کی شکل میں جھک جانے کو سجدہ کہتے ہیں اور کبھی یہ لفظ زمین پر سر رکھ دینے پر بولا جاتا ہے۔ اس کی صحیح شکل کیا تھی۔ محض حضرت آدم کی تعظیم اور ان کی عظمت کے سامنے جھک جانے پر یہ لفظ بولا گیا ہے یا اس سے حقیقی سجدہ مراد تھا۔ لفظ میں تو دونوں کیلئے گنجائش موجود ہے۔ لیکن احادیث و آثار کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد حقیقی سجدہ ہے یعنی زمین پر سر رکھ دینا۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کی اجازت ہے؟ جہاں تک سابقہ شریعتوں کا تعلق ہے، سابقہ آسمانی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ شریعتوں میں اس کی اجازت تھی۔ چنانچہ سورۃ یوسف میں یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ علماء نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ جہاں تک سجدۂ عبادت کا تعلق ہے یعنی عبادت کی نیت سے کسی کو سجدہ کرنا، اس کی اجازت تو کسی شریعت نے نہیں دی کیونکہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا ہر شریعت میں شرک قرار دیا گیا ہے۔ البتہ سجدۂ تعظیمی کی سابقہ شریعتوں میں اجازت تھی، جسے ہماری شریعت میں حرام قرار دے دیا گیا۔ البتہ سابقہ آسمانی کتابوں پر گہری نگاہ رکھنے والوں کا خیال ہے کہ اس زمانے میں جو سجدۂ تعظیمی کیا جاتا تھا۔ اس سے مراد صرف رکوع کی طرح جھکنا ہے، زمین پر سر رکھنا نہیں۔ لیکن بیشتر علماء یہ سمجھے ہیں کہ سابقہ شریعتوں میں صرف رکوع نہیں تعظیم کیلئے سجدہ کرنے کی بھی اجازت تھی۔ لیکن ہماری شریعت چونکہ آخری شریعت ہے جس میں توحید کو مکمل کر دیا گیا ہے، اس میں اس اجازت کو ختم کر دیا گیا ہے۔ متعدد احادیث میں آنحضرت ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ ایک صحابی حیرہ ریاست سے واپس آئے تو آکر بیان کیا کہ حیرہ کے حکمران کو اس کی رعایا سجدہ کرتی ہے اور ساتھ ہی کہا کہ حضور آپ تو ساری دنیا کے بڑے لوگوں اور حکمرانوں سے زیادہ واجب الاحترام ہیں، تو کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کریں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم میری وفات

Marfat.com

کے بعد میری قبر پر آؤ تو کیا سجدہ کرو گے؟ انہوں نے آنحضرت کی تعلیم کے مطابق عرض کیا کہ ہرگز نہیں تو آپ نے فرمایا کہ پھر اب مجھے کیوں سجدہ کرو گے۔ مزید فرمایا کہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز ہوتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ یہاں آدم کو سجدہ کرنے کا حکم پروردگار خود دے رہے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بظاہر سجدہ آدم کو کیا جا رہا ہے لیکن حقیقت میں آدم کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو کیا جا رہا ہے۔ منہ اگرچہ آدم کی طرف ہے، لیکن دلوں کا رخ اِلٰہ کی جانب ہے۔ تو یہاں لِاٰدَمَ اصل میں اِلٰی اٰدَمَ کے معنی میں ہے۔ اس لئے یہاں آدم کو سجدہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کی تعظیم بجالاؤ اور اس بات کو سمجھ لو کہ آدم کے زمین پر جانے کے بعد اور زمین پر اولاد آدم کے پھیل جانے کے بعد تمہارا کام ان کے سامنے مطیع اور مسخر ہونا ہے۔ زمین کا حاکم اللہ کی طرف سے آدم ہے۔ اس لئے زمین میں اسے اپنے معاملات انجام دینے اور اپنے اختیارات بروئے کار لانے کیلئے جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں، تمہارا کام اس کی مدد کرنا اور اس کیلئے اسباب فراہم کرنا ہے۔ وہ کام اچھا کرنا چاہے تو اس کی اچھائی کو آگے بڑھانا تمہارا کام ہے وہ کوئی برائی کرنا چاہے، تو اس کیلئے سازگار حالات پیدا کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ اسے مہلتِ عمل دیتا ہے، تو عمل کیلئے اسباب فراہم کرنا تمہاری ڈیوٹی ہے کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے زمین پر مجاز حکمران ہے، لیکن اصل فرماں روا اللہ کی ذات ہے۔ جب تک اصل فرمانروا اس کے اختیارات کو سلب نہیں کرتا تمہارے لئے اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔ اس طرح سے فرشتوں کا امتحان بھی تھا، وہ جانتے تھے کہ ہمیں نور سے پیدا کیا گیا ہے اور آدم کو بدبودار مٹی سے۔ لیکن وہ اس بات کو بھی جانتے تھے کہ شرافت اور عظمت مادۂ تولید سے نہیں ملتی وہ تو عبادت و اطاعت اور فرمانبرداری سے ملتی ہے۔ اس لئے وہ اس بحث میں پڑے بغیر کہ کس کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور کس کو نور یا نار سے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ سجدہ کرنے کا حکم اللہ کی جانب سے ہو رہا ہے، تو وہ سجدہ میں جھک گئے اور ہمیشہ کیلئے آدم کی عظمت کو قبول کر لیا اور اس طرح وہ سرخ رو ہو گئے۔ لیکن ابلیس اس بحث میں الجھ گیا کہ میں اپنے مادۂ پیدائش کے لحاظ سے آدم سے برتر ہوں۔ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ''تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا''۔ آگ مٹی کے سامنے کیسے جھک جائے۔ اس طرح اس نے جھکنے سے انکار کر دیا اور نامراد ٹھہرا۔

ابلیس کی تحقیق

ابلیس. ابلس سے افعیل کے وزن پر ہے۔ اس کا معنی ہے ''انتہائی مایوس''۔ یہ اس جن کا نام ہے، جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ فرشتہ نہیں تھا، قرآن کریم نے سورۃ طٰہٰ میں وضاحت کی ہے کان من الجن ففسق عن امر ربہ ''وہ جنات میں سے تھا اس نے اپنے رب کے حکم سے انحراف کیا''۔ اس پر بعض لوگوں کو اشکال ہوا کہ سجدہ کا حکم تو فرشتوں کو تھا، جنات کو نہیں۔ تو پھر ابلیس کو سجدہ نہ کرنے پر لعنت کا مستحق کیوں ٹھہرا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جنات اور فرشتوں میں اصلی فرق خصائص اور صفات کے پہلو سے ہے اپنی خلقت کے لحاظ سے جنات فرشتوں سے زیادہ دوری نہیں رکھتے۔ فرشتے نور سے پیدا ہوئے اور جنات نار سے۔ اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علی سبیل التغلیب جنات بھی اسی حکمِ سجدہ میں شامل تھے۔ چنانچہ سب جنات نے سجدہ کیا، لیکن ان کے گمراہ فرد ابلیس نے سجدہ سے انکار کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ جنات کا سردار تھا۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں،

Marfat.com

او الجن ایضاً کانوا مامورین مع الملئکة لکنه استغنی بذکر الملئکة عن ذکر هم فانه اذا علم ان الاکابر مامورون بالتذلل لاحدو التوسل به علم ان الاصاغر ایضاً مامورون به والضمیر فی فسجدوا راجع الی القبیلتین

(یا جن بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کے حکم میں شامل تھے لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد جنات کے ذکر کی ضرورت اس وجہ سے باقی نہیں رہی کہ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ بڑوں کو کسی کی تعظیم وتکریم کا حکم ہوا ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ چھوٹے بھی اس حکم میں شامل ہیں۔ اس صورت میں فسجدوا کی جو ضمیر ہے، وہ دونوں گروہوں کی طرف لوٹے گی)

حاصل کلام یہ کہ فرشتوں اور ان کے ضمن میں جنات کو آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر ایک تو انہیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ آدم چونکہ زمین پر اللہ کے خلیفہ بن کے جا رہے ہیں اور پھر ان کے بعد ہر پیغمبر اللہ کا خلیفہ ہوگا اور آخری پیغمبر خلیفۂ اعظم کے طور پر تشریف لائیں گے اور وہ پوری دنیا میں خلافت کی ذمہ داریاں ادا کریں گے۔ ان پر چونکہ نبوت ختم ہو جائے گی اس لئے اب یہ خلافت امت اسلامیہ کے تمام ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جائے گی جن میں اس خلافت کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت ہوگی۔ جو اپنے علم اور اپنے کردار کی پاکیزگی سے اللہ کی زمین پر اس کی حاکمیت کے نفاذ کیلئے آخر حد تک مساعی بروئے کار لا کر خلافت کا فرض انجام دیں گے۔ یہ کام چونکہ پوری امت کے برگزیدہ لوگوں کو انجام دینا ہے اس لئے حضور نے فرمایا کہ میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ اور ان میں ہمیشہ اہل حق کا ایک گروہ موجود رہے گا جو خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی کوششیں کرتا رہے گا۔ فرشتوں کو اس بات کا پابند کیا کہ زمین پر آدم اور اولاد آدم کو ہم نے اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے اس میں یقیناً ہر طرح کے لوگ ہوں گے، اچھے بھی اور برے بھی۔ تمہارا کام ان سب کیلئے اسباب فراہم کرنا ہے۔ کیونکہ تم زمین پر آدم کی حکومت کے اعضاء و جوارح کے طور پر کام کرو گے۔ جس طرح حکومت کے ارکان اور ملازمین کو اس بات سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ مجھے جو حکم دیا جا رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط انہیں صرف احکام کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ البتہ جب اصل حکمران اپنے ماتحت حکمران یعنی خلیفہ کو معزول کرنے یا سزا دینے کا فیصلہ کر لے تو پھر یہی اعضائے حکومت نہ صرف اصل حکمران کے نائب کی اطاعت سے انکار کر دیتے ہیں بلکہ حکم ملنے پر زنجیریں پہنانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ فرشتوں کو سجدہ کا حکم دے کر انہیں یہی بات سمجھانا مقصود تھی اور دوسری یہ بات کہ ان کا امتحان بھی مقصود تھا کیونکہ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے اور جنات نار سے۔ نور میں روشنی اور پاکیزگی ہے اور نار میں بلندی اور رفعت ہے۔ لیکن آدم کو کھنکھناتی مٹی اور سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا گیا ہے۔ اپنے مادۂ تولید و تخلیق کے اعتبار سے یقیناً فرشتوں اور جنات کو آدم پر فضیلت حاصل تھی۔ انہیں سجدے کا حکم دے کر ان کی آزمائش کی گئی کہ وہ اپنے نسب اور مادۂ تخلیق پر فخر کرتے ہوئے سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہیں یا اللہ کے حکم کا استحضار کرتے ہوئے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرشتے اس امتحان میں پورے اترے انہوں نے اللہ کے حکم کی عظمت کے سامنے سر جھکا دیا لیکن شیطان نسب کے بت کا پجاری نکلا۔ اللہ کے حکم کے سامنے بھی اس کا یہ بت ٹوٹ نہ سکا اور اس نے نہ صرف یہ کہ سجدہ کرنے سے انکار کیا بلکہ اپنے نسب کے حوالے سے معارضہ کرنے کی کوشش بھی کی۔

Marfat.com

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا
وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (البقرة:۳۵)

(اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس میں سے کھاؤ جتنا چاہو اور جہاں سے چاہو اور اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے)

اس آیت کریمہ میں تین باتیں نمایاں ہیں۔

۱۔ حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا جارہا ہے کہ آپ اور آپ کی زوجہ محترمہ جنت میں سکونت اختیار کریں اور جنت چونکہ ایسی جگہ ہے جس میں محنت سے کوئی چیز حاصل کرنا نہیں پڑتی بلکہ وہاں ہر نعمت کی فراوانی ہے۔ جنت کے باسی کیلئے صرف خواہش کے اظہار کی ضرورت ہے وہ نعمت اسے مل جائے گی اور پھر کوئی ایسی رکاوٹ بھی نہیں کہ فلاں نعمت تو تم حاصل کر سکتے ہو اس کے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ وہاں مکمل آزادی ہے، جنت میں رہنے والا جہاں چاہے گھومے پھرے، جو چاہے کھائے اور جتنا چاہے کھائے۔ اور مزید یہ بات بھی حضرت آدم اور حضرت حوا کو بتانا مقصود تھی کہ تمہاری اصل جگہ، اصل ٹھکانہ اور اصل منزل یہ جنت ہی ہے یہی خوشیوں اور مسرتوں کا مرکز اور یہی اللہ کے قرب کا آستانہ ہے اور یہیں اللہ کے انعامات برستے ہیں۔ دیکھنا یہ جنت تمہارے ہاتھوں سے نکل نہ جائے، چنانچہ قیامت تک آنے والے انسانوں کیلئے اس جنت کو مقصود اور مطلوب بنا دیا گیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کا امتحان

۲۔ دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جنت کی سب نعمتیں تمہارے لئے ہیں لیکن دیکھنا اس درخت کے قریب نہ پھٹکنا، اس سے پہلے چونکہ جنت کی نعمتیں کھانے کا ذکر ہے۔ تو سیاق کلام کو دیکھتے ہوئے یہ بات نہایت قرینِ قیاس ہے کہ اس درخت کے قریب نہ جانے کا مطلب اس درخت کا پھل نہ کھانا ہو۔ البتہ اس کیلئے جو تعبیر اختیار کی گئی ہے کہ اس کے قریب نہ جانا یہ انتہائی تاکید اور احتیاط پر دلالت کرتی ہے۔ یہ حکم دے کر معلوم ہوتا ہے حضرت آدم اور حضرت حوا کا امتحان لیا گیا اس سے پہلے ملائکہ اور جنات امتحان سے گزر چکے تھے اب حضرت آدم اور آپ کی زوجہ کا امتحان لیا جارہا ہے کہ جنت کی ساری نعمتیں ان کیلئے حلال کر دی گئی ہیں لیکن امتحان صرف ایک درخت کے پھل نہ کھانے کا ہے۔ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ جس چیز سے اسے روکا جاتا ہے اسی کی حرص اس میں پیدا ہوتی ہے۔ انسانی فطرت کا یہ پہلو اجاگر کرنا مقصود تھا تاکہ آدم اپنی اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ رہی یہ بات کہ درخت کون سا تھا؟ اس کے بارے میں قرآن وسنت خاموش ہیں۔ بعض اہل علم نے اپنے اندازے سے مختلف پھلوں اور غلوں کا نام لیا ہے لیکن ان کی حیثیت ظن وگمان کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ اصل مرجع جہاں سے اصل بات معلوم ہو سکتی ہے وہ صرف قرآن وسنت ہے۔ جب ان دونوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں تو پھر کس حوالے سے آخر کوئی بات کہی جاسکتی ہے؟ اور یہ بات بھی نہیں کہ اس درخت کے پھل میں کوئی ایسی خرابی تھی جس سے حضرت آدم اور حضرت حوا کی صحتیں بگڑ سکتی تھیں۔ مقصود صرف آزمائش تھی۔ جیسے آج بھی انسانوں کی آزمائش ہو رہی ہے کہ اس دنیا کو بھی اللہ نے ایسی ایسی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا ہے کہ یہ بھی ایک چھوٹی جنت معلوم ہوتی ہے۔ ٹھیک کہا کسی نے۔

Marfat.com

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

قسم قسم کے غلے اور ترکاریاں، نوع بنوع پھل، ایک خوانِ نعمت ہے جو رنگارنگ نعمتوں سے بھرپور زمین پر بچھا دیا گیا ہے اور اس میں بیشتر نعمتوں کے استعمال کرنے اور ان سے متمتع ہونے کی اجازت ہے۔ صرف چند نعمتیں ہیں جنہیں استعمال کرنے سے ہمیں روک دیا گیا ہے۔ آپ دیکھ لیجئے کہ زمین سے پیدا ہونے والی بے شمار سبزیوں، غلوں اور پھلوں میں سے کسی چیز کے کھانے سے ہمیں نہیں روکا گیا البتہ ان سے شراب کشید کرنے یا نشہ آور چیزیں بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ بے شمار پالتو جانور، شکاری جانور اور پھر رنگارنگ پرندے ہیں، جن کا گوشت کھانے کی انسان کو اجازت دی گئی۔ صرف چند جانوروں کا گوشت کھانے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ لیکن انسان کا عجیب حال ہے کہ جن چیزوں سے روکا گیا ہے، انہیں کو استعمال کرنے اور ان سے محظوظ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بے شمار پھل اس کے کام ودہن کی لذت کیلئے موجود ہیں لیکن اسے شراب پینے کی خواہش رہتی ہے۔ بے شمار جانوروں کا گوشت میسر ہے لیکن وہ خنزیر اور دوسرے حرام جانوروں کے گوشت کی طرف لپکتا ہے اور اگر اسے روکا جائے تو ابلیس کی طرح معارضہ بھی کرتا ہے۔

ظلم کا مفہوم

۳۔ تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ دیکھو اگر تم نے اس درخت کا پھل کھا لیا تو تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ ظلم حق تلفی کو کہتے ہیں اور ظالم حق تلفی کرنے والے کو۔ جب کوئی آدمی اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ متعدد حقوق تلف کرتا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اللہ کی ذات کا یہ حق ہے اور وہی اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے کیونکہ جس نے ہمیں زندگی اور زندگی کی نعمتیں عطا فرمائی ہیں یقیناً اسی کا یہ حق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے جب کوئی آدمی اللہ کی اطاعت سے انحراف کرتا ہے تو وہ اللہ کے اس حق کو تلف کرتا ہے۔ اسی طرح انسان جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا کوئی عمل کرتا ہے تو اس میں جس طرح اپنے اعضاء و جوارح کو استعمال کرتا ہے اور جس طرح اپنی دماغی کاوشوں اور قوائے نفس کو استعمال کرتا ہے اسی طرح اور کئی چیزوں اور کئی انسانوں کو بھی اپنے اس کام میں شریک ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ تو جتنی چیزیں اور جتنے انسان اس نافرمانی میں استعمال ہوتے ہیں یہ نافرمانی کرنے والا ان سب کے حقوق تلف کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو اپنی فرمانبرداری کیلئے پیدا کیا تھا۔ جب اس نے زبردستی انہیں اللہ کی نافرمانی میں استعمال کیا تو گویا اس نے ان کی حق تلفی کی۔ اسی طرح خود انسان کو اللہ نے اپنی بندگی اور اپنی اطاعت کیلئے پیدا کیا ہے۔ مگر جب یہ نافرمانی کرتا ہے تو ایک تو بجائے خود نافرمانی اپنے اوپر ظلم اور حق تلفی ہے اور دوسرا یہ کہ اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ اس کی ان کرتوتوں کے باعث اس کا جسم جہنم میں جلے گا۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ (البقرۃ: ۳۶)

(تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے)

Marfat.com

حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ کی حقیقت اور معصوم ہونے کا مفہوم

درخت کے قریب نہ جانے کا حکم دے کر اللہ نے حضرت آدم اور حضرت حوا کی جو آزمائش کی تھی وہ اس میں ناکام ہو گئے اور اس ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنت چونکہ فرمانبرداری کے نتیجے میں ملتی ہے نافرمانی کی صورت میں نہیں اسلئے نافرمانی پر حضرت آدم اور حضرت حوا کو وہاں سے نکلنے کا حکم دے دیا گیا۔ حضرت آدم پہلے انسان ہی نہیں پہلے پیغمبر بھی تھے، اس لئے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا پیغمبر اللہ کی نافرمانی کرسکتا ہے؟ کیونکہ امت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ ہر پیغمبر معصوم پیدا ہوتا ہے وہ کبھی اللہ کی نافرمانی یعنی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ صغیرہ اللہ کے نبیوں سے سرزد ہو سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نبی کبیرہ اور صغیرہ ہر طرح کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ عقیدہ واقعی صحیح ہے تو پھر حضرت آدم نبی ہوتے ہوئے بھی اس نافرمانی کے مرتکب کیسے ہوئے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نبی جان بوجھ کر عمداً اور ارادے کے ساتھ کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ کبھی اللہ کا حکم بھول جائیں اور اس کے مخالف کام کر بیٹھیں یا اللہ کا حکم کسی معاملے میں موجود نہ ہو، تو وہ اپنے اجتہاد سے کوئی ایسا کام کریں بعد میں وحی اس کے خلاف نازل ہو یا کسی شخص کی نیت سے آگاہ نہ ہونے کے باعث اس کی باتوں پر اعتماد کر کے ظاہر کے مطابق حکم دے دیں اور بعد میں اللہ کی جانب سے اس پر گرفت آئے اس طرح کی باتیں اللہ کے نبیوں سے سرزد ہو سکتی ہیں۔ قرآن کریم میں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ حضرت آدم کے واقعے کو دیکھئے قرآن کریم نے اگرچہ ان کی نافرمانی کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد فرمایا: عَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ ''آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی'' لیکن اس نافرمانی کے حوالے سے قرآن کریم نے جو تصریحات دی ہیں ان کو پیش نظر رکھیں تو دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اللہ کے کسی بھی پیغمبر سے اگر کسی ایسی لغزش کا صدور ہو جس میں شریعت کا کوئی حکم نہ ٹوٹے۔ البتہ نبوت کے مقام بلند کی نسبت سے اسے لغزش کہا جاسکتا ہو تو پروردگار بعض جگہ اسے گناہ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ وہی کام اگر کوئی عام آدمی کرتا تو شاید اسے نیکی سمجھا جاتا لیکن جب وہی کام پیغمبر کرتا ہے تو اس کے رتبۂ بلند کے باعث پروردگار اس پر گرفت فرماتے ہیں۔ کیونکہ

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم کو کیسے بھول گئے؟

لیکن اس طرح کی لغزشیں جنہیں زیادہ سے زیادہ خلاف اولیٰ یا اجتہادی غلطی کہا جاسکتا ہے۔ عصمتِ انبیاء کے خلاف نہیں ہوتیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جہاں کہیں بھی حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے سلسلے میں تصریحات کی گئی ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس غلطی میں حضرت آدم کا ارادہ شامل نہ تھا۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا: فَنَسِیَ اٰدَمُ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ''آدم بھول گئے اور ہم نے ان میں ارادہ نہیں پایا''، یعنی جب حضرت آدم سے اس درخت کا پھل کھانے کا ارتکاب ہوا تو حضرت آدم نسیان کا شکار تھے۔ انہیں یاد ہی نہ رہا کہ مجھے اس درخت کا پھل کھانے سے روکا گیا ہے اور پروردگار جو دلوں کے بھید جانتا ہے وہ فرماتا ہے کہ آدم میں اس نافرمانی کا ارادہ موجود نہیں تھا اور ہم سب جانتے ہیں کہ بھول کر بے ارادہ اگر آدمی کوئی گناہ کر بیٹھے تو اس پر مواخذہ نہیں ہوتا اور بعض دفعہ اس فعل کا اعتبار ہی نہیں کیا جاتا آدمی روزے میں بھول کر کھا پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ گہری نیند میں اگر نماز قضا ہو جائے تو اس کا مواخذہ نہیں ہوگا کیونکہ اس میں نماز چھوڑنے کا ارادہ نہیں پایا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے روکنے کے باوجود جب اس پھل کو کھالیا تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھول گئے اور ان کے اندر

Marfat.com

اللہ کی نافرمانی کا ارادہ موجود نہیں تھا۔اس کا جواب پیش نظر آیت کریمہ میں موجود ہے اور دوسری آیات میں اس کی وضاحت ہے۔اس میں فرمایا گیا ہے کہ آدم نے خود اس فعل کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔سورۃ اعراف میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ شیطان نے پہلا جال یہ پھینکا کہ اللہ کا نام لے کر قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ بن کے آیا ہوں۔مجھ پر اعتبار نہ کرو لیکن کیا اللہ کا نام لے کر بھی کوئی جھوٹ بول سکتا ہے؟اس لئے میں حلفاً کہتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں سراسر تمہاری بھلائی ہے۔آدم علیہ السلام ابھی تک جنت کی پاکیزہ فضا میں رہنے کے عادی تھے۔انہیں اپنی بیوی کے سوا کسی دوسرے شخص سے واسطہ نہ پڑا تھا۔وہ مکر وفریب کی چالوں کو نہیں سمجھتے تھے۔انہیں گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ اللہ کا نام لے کر جھوٹ بھی بولا جاسکتا ہے۔کیونکہ جو شخص اللہ کا نام لیتا ہے وہ یقیناً مومن ہوگا اور مومن تو کبھی جھوٹ نہیں بولتا چہ جائیکہ وہ اللہ کا نام لے کر جھوٹ بولے اور دوسرا جال اس نے یہ پھینکا کہ تم دونوں اللہ کی محبت کے اسیر ہو۔اسی کا نام تمہارے ورد زبان رہتا ہے اسی کی محبت میں ڈوبے رہتے ہو اسی کی قربت تمہاری زندگی کا حاصل ہے۔لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ تم یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکتے۔یہ وصل کے لمحے ہمیشہ نہیں رہیں گے۔آدم وحوا یہ سن کر یقیناً انتہائی پریشان ہوئے ہوں گے۔تو ان کی پریشانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کہا کہ تم محبت میں دیوانے ہوئے جاتے ہو اور تم اس جنت سے نکلنے کا صدمہ شائد برداشت نہ کرسکو کیونکہ یہ جنت ہی اصل میں اللہ کے قرب کی علامت ہے اس لئے میں تمہاری خیر خواہی میں یہ بات کہتا ہوں کہ جس درخت کا پھل کھانے سے تمہیں روکا گیا ہے۔اگر تم وہ پھل کھالو تو تم ہمیشہ جنت میں رہنے والوں میں سے ہوجاؤ گے۔آپ جانتے ہیں کہ محبت ایک ایسا زوردار جذبہ ہے جس کے سامنے عقل کی باتیں یا دلائل نہیں ٹھہر سکتے جب شیطان نے انہیں قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ جنت کا قیام اور تمہارے قرب کا دوام صرف اس پھل کے کھانے میں ہے تو حضرت آدم وحوا محبت کے نشہ میں مخمور ہونے کے باعث بالکل بھول گئے کہ ہمیں اس کے کھانے سے روکا گیا ہے۔اور انہوں نے وہ پھل کھالیا۔لیکن یہ پھل کھاتے ہوئے اللہ کی نافرمانی کا تصور ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا۔جیسے ہی انہوں نے یہ پھل کھایا جنت کی خلعت فاخرہ ان کے جسموں سے اتر گئی اور انہیں یہ حکم دیا گیا کہ تم اس جنت سے اتر جاؤ اور زمین پر چلے جاؤ وہاں تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔

اھبطوا کے حکم میں کون کون شامل ہیں؟

یہاں حکم دیا گیا ہے اھبطوا ''تم سب اتر جاؤ''۔اس میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے کہ اتر جانے کا یہ حکم کن کن لوگوں کو شامل ہے۔یعنی اس کے مخاطب کون کون ہیں؟ایک رائے تو یہ ہے کہ اس کے مخاطب حضرت آدم اور حضرت حوا ہیں۔اس پر سوال پیدا ہوا کہ یہ تو جمع کا صیغہ ہے حضرت آدم اور حضرت حوا تو دو ہیں۔اگر وہ دو ہی مراد ہوتے تو تثنیہ کا صیغہ ہونا چاہئے تھا۔جواب دیا گیا کہ اس میں ذریت آدم بھی شریک ہے کہ تم اپنی اولاد سمیت زمین پر اتر جاؤ لیکن یہ جواب سراسر تکلف کے سوا کچھ نہیں۔قرآن کریم میں اگرچہ بعض جگہ تثنیہ کا صیغہ بھی استعمال ہوا ہے،تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم اور حضرت حوا نہیں بلکہ دو گروہ مراد ہیں۔ایک گروہ حضرت آدم اور حضرت حوا کا اور دوسرا ابلیس اور اس کے پیروکاروں کا۔یہاں بھی یہی مراد معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم حضرت حوا اور ابلیس کو حکم ملا کہ تم سب زمین پر چلے جاؤ۔ابلیس کو تو پہلے ہی مردود قرار دے کر وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا جاچکا تھا اور اس کو بھی فاھبط کے لفظ سے ہی تعبیر کیا گیا ہے۔اس کے بعد فرمایا کہ تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ یہ بات اولاد آدم کے بارے میں کہی گئی ہے کہ زمین میں اولاد آدم یعنی انسان ایک دوسرے سے دشمنی کریں گے ایک دوسرے کو ماریں گے خوں ریزی کریں گے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں میں فطری تعلق دشمنی کا نہیں بلکہ انس اور محبت کا ہے۔دشمنی ان میں شیطان کی کوششوں سے پیدا ہوتی ہے۔اگر ایسے اسباب اور

Marfat.com

حالات نہ پیدا کئے جائیں، جن کی وجہ سے انسانوں میں لڑائی تک نوبت پہنچے تو انسان کبھی آپس میں لڑنا پسند نہیں کرتے بلکہ آپس میں محبت سے رہنا، ہمیشہ انسان کی خواہش رہی ہے۔ یہاں اصل میں یہ کہا جا رہا ہے کہ اے آدم وحوا اور اے ابلیس! تم سب زمین پر چلے جاؤ اور یہاں ابلیس نے آدم کو پھسلا کر جو دشمنی کا بیج بویا ہے، زمین پر یہ مزید برگ و بار لائے گا۔ وہاں شیطانی قوتیں انسان کو بہکا کر دشمنی کا حق ادا کریں گی اور انسانوں میں جو اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار بندے ہوں گے، وہ شیطانی قوتوں کا مقابلہ کر کے شیطان سے اپنی دشمنی کا ثبوت دیں گے۔ اور خود قرآن کریم نے بھی جابجا اس بات کو واضح کیا ہے کہ انسان اور شیطان میں عداوت فطری ہے، یہ انسان کی گمراہی ہے کہ وہ شیطان کی دشمنی کو سمجھنے کی بجائے اسے دوستی سمجھ لیتا ہے اور پھر اس کے ہتھے چڑھ کر اس کی خدمت بجالاتا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے جابجا شیطان کو عدو مبین قرار دیا ہے۔ اور حضرت آدم کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن شیطان ہے۔ دیکھنا تجھے کہیں جنت سے نہ نکلوا دے اور اولادِ آدم کو بھی ایسی ہی ہدایت دی گئی تھی۔ سورۃ کہف میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (کھف ۔ ۵۰) ''تو کیا تم ابلیس اور اس کی اولاد کو میرے بالمقابل اپنا دوست بناؤ گے۔ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں''۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اب تمہیں زمین میں رہنا ہے۔ لیکن تمہارا یہ زمین کا قیام ہمیشہ نہیں، وہاں تمہیں ایک محدود وقت کیلئے رہنے کا سامان دیا گیا ہے۔ تمہاری اصل منزل یہی جنت ہے۔ لیکن یہ مت بھولنا کہ یہ جنت نافرمانوں کی جگہ نہیں۔ جن لوگوں نے زمین ہی کو جنت سمجھ لیا اور وہ شیطان کے ہتھے چڑھ گئے تو ان کا انجام نہائت اندوہناک ہوگا۔ زمین پر تم ایک کشمکش سے گزرو گے۔ شیطانی قوتیں تمہیں اللہ کے نائب کی حیثیت سے اللہ کی حاکمیت کو غالب کرنے کا موقع نہیں دیں گی۔ وہ قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کریں گی۔ وہ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر تمہارے لیے مشکلات پیدا کریں گی۔ لیکن تمہیں اس چندروزہ زمین کے قیام میں جی لگانے کی بجائے اپنی منزل کی تیاری میں لگے رہنا ہے اور اس راستے میں جو بھی قربانی دینا پڑے اس سے دریغ نہیں کرنا تاکہ اللہ کی رضا تمہیں حاصل ہو اور تم پھر اپنی جنت گم گشتہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ O

(پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات، تو اس نے اس کی توبہ قبول کی، کیونکہ وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے) (البقرۃ ۔ ۳۷)

تلقی کا معنی اور مفہوم

تلقّی کا معنی ہے ''سیکھ لینا یا پالینا'' اسی کے فعل متعدی کا معنی ہوتا ہے ''سکھانا''۔ تو اس کا معنی ہوگا کہ آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لئے۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ یہ کلمات اللہ نے سکھائے۔ حالانکہ امر واقعہ یہی ہے کہ یہ کلمات اللہ نے عطا فرمائے اور سکھائے۔ تو کلام کی یہ تعبیر یقیناً اپنے اندر کوئی معنویت اور حکمت رکھتی ہے۔ حقیقت تو اللہ جانتا ہے، لیکن جو بات بظاہر سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ابلیس کی قسم پر اعتماد اور پروردگار سے گہری محبت کے جوش میں آکر آپ ممنوعہ درخت کا پھل تو کھا بیٹھے لیکن اس نافرمانی کے اثرات ظاہر ہونے پر جب اللہ کی ناراضگی کا خیال آیا تو آپ تڑپ اٹھے آپ کو اس سے پہلے ایسی کسی صورتحال سے چونکہ واسطہ نہیں پڑا تھا اس لئے آپ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی ناراضگی کو دور کرنے کیلئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے معافی کے طلب گار ہونا چاہتے تھے لیکن اللہ کی ناراضگی کے احساس

Marfat.com

سے زبان بند ہو چکی تھی۔ دل اس صدمے سے خون خون ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اللہ کی ناراضگی کا سامنا کریں تو کیسے کریں۔ اس کی بے پایاں عنایات سامنے آتیں تو دل پر اور چوٹ لگتی۔ رات دن آہیں کھینچنے اور آنسو بہانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ حضرت آدم اور حضرت حوا نے اپنی انابت و استغفار کا سارا سرمایہ آستانہ عالیہ پر ڈھیر کر دیا تھا۔ لیکن زبان کو ابھی تک ہمت نہ ہو رہی تھی کہ مناسب الفاظ سے اللہ سے بخشش کی دعا مانگیں اور اس سے مغفرت کے طلب گار ہوں۔

حضرت آدم کی یہ شکست و ریخت اور آپ کی درماندگی اور فروتنی اللہ کے حضور کام آئی رحمت حق کو جوش آیا اور حضرت آدم کو وہ کلمات سکھائے جو ایک طرف اللہ کی شان کے لائق ہیں اور دوسری طرف اس میں اپنی عاجزی اور درماندگی کا انتہائی اعتراف بھی ہے۔ بعض اہل علم نے بعض کمزور روایات کے سہارے مختلف قسم کے کلمات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سورۃ اعراف میں جب پروردگار نے خود حضرت آدم وحوا کے دعائیہ کلمات کو ذکر فرمایا ہے اور اسی پر توبہ کی قبولیت کی نوید بھی سنائی گئی ہے۔ تو اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ یہی وہ کلمات ہیں جو حضرت آدم نے پروردگار سے سیکھے تھے۔ وہ کلمات یہ ہیں۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ O

(دونوں نے دعا کی ”اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا (جو کچھ ہم سے آپ کی نافرمانی ہوئی ہم اس کی کوئی توجیہ نہیں کرتے ہمیں اعتراف ہے کہ ہم نے اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا یعنی جن جانوں کو آپ کی فرماں برداری کے سوا کوئی چیز زیب نہیں دیتی تھی ان سے آپ کی نافرمانی کا ارتکاب ہوا) اگر آپ نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کھایا تو ہم برباد ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے)

ان دعائیہ کلمات پر غور کیجئے! ایک تو اپنی غلطی کا صاف صاف اعتراف ہے، توجیہ کی کوئی کوشش نہیں۔ دوسری یہ بات کہ آپ کی نافرمانی معمولی بات نہیں یہ ہمارے لئے ہلاکت، بربادی اور نامرادی ہے۔

توبہ کے دو بنیادی عناصر

اس ہلاکت سے بچنے کیلئے اگر کوئی نسخۂ شفا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ ہی سے مغفرت کی بھیک مانگیں اور آپ ہی سے رحمت کی التجا کریں۔ آپ نے اگر ہماری مغفرت فرمادی اور ہم پر رحم فرمایا تو ہم بربادی سے بچ جائیں گے اور اگر آپ نے کرم نہ فرمایا تو ہماری بربادی میں کوئی دیر نہیں۔ یہ دو تصورات جو حضرت آدم کی توبہ کے سلسلے میں ہمیں عطا ہوئے ہیں یہ انسانیت کی جان ہیں کہ انسان نہ جانے دنیا کی کیسی کیسی کامیابیوں کو زندگی کا حاصل سمجھتا ہے اور کیسی کیسی دنیوی ناکامیوں کو اپنے لئے سم قاتل خیال کرتا ہے، یعنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے حوالے سے اس کا محور صرف دنیا اور دنیا کی کامیابیاں اور ناکامیاں ہیں۔ لیکن یہاں فرمایا گیا ہے کہ تمہارا اصل سرمایہ زندگی کے وہ اعمال ہیں جس کے نتیجے میں تمہیں اللہ کی رضا حاصل ہے اور تمہارے لیے اصل نامرادی اس چیز میں ہے جس کے نتیجے میں اللہ ناراض ہو جائے اور تم اس کی رحمت سے محروم کر دیئے جاؤ۔ چنانچہ ان کلمات کے ساتھ جب حضرت آدم اور حضرت حوا نے توبہ کی تو اللہ فرماتا ہے۔ فَتَابَ عَلَيْهِ اللہ تعالیٰ نے ان پر رجوع برحمت فرمایا اور ان کی توبہ قبول فرمائی۔

Marfat.com

تاب کا معنی ومفہوم

تَـــاب کا اصل معنی ہے۔ ''لوٹنا در رجوع کرنا''۔ لیکن جب اس کے ساتھ علیٰ کا صیغہ آتا ہے، تو اس میں رحمت کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا معنی کیا جاتا ہے ''توبہ قبول کرنا''۔ دوسری بات یہ ذہن میں رہنی چاہئے کہ تَـــاب کا فاعل جب بندہ ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے ''توبہ کرنا''یعنی معصیت سے اطاعت کی طرف لوٹ آنا۔ کفر سے ایمان کی طرف آ جانا۔ بدعملی سے نیک عملی کی طرف لوٹ آنا۔ گمراہی سے راہِ راست کی طرف پلٹ آنا۔ لیکن جب تَـاب کا فاعل اللہ ہو، تو پھر اس کا معنی ہوتا ہے غضب سے رحمت کی طرف لوٹ آنا، ناراضگی سے خوشنودی کی طرف آ جانا۔ یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ حضرت آدم نے جب توبہ کی تو اللہ تعالیٰ رحمت کے ساتھ ان کی طرف لوٹ آیا۔ ناراضگی کی بجائے انہیں اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد فرمایا انه هـو التواب الرحیم ''بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے'' تَوّاب تَائب سے اسم مبالغہ ہے۔ بہت توبہ قبول کرنے والا اور یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ التائب کا معنی ہے توبہ کرنے والا یا توبہ قبول کرنے والا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے تمام نام چونکہ توقیفی ہیں اس لئے تائب کو معنوی مناسبت کے باوجود اللہ کے ناموں میں شمار نہیں کیا جاتا۔

توبہ اسلام کا طرۂ امتیاز......اس کی حقیقت

آیت کے اس حصے سے بطور خاص اس تصور کی طرف اشارہ ہے جو اسلام کا طرّۂ امتیاز ہے باقی تمام مذاہب یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان سے جب کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو اس گناہ کی سزا ملنا ضروری ہے۔ کیونکہ جس طرح ہر چیز کا ایک لازمی نتیجہ ہوتا ہے اور وہ نکل کر رہتا ہے اسی طرح گناہ کا لازمی نتیجہ سزا ہے جسے بہر حال گناہ گار کو بھگتنا ہوگا۔ کوئی آدمی ہزار کوشش کرے کہ میں دنیا میں گناہ کی زندگی چھوڑ کر نیکی کی زندگی اختیار کرلوں اور ایک نیک آدمی کی حیثیت سے باقی زندگی گزاروں۔ لیکن ان مذاہب کے نزدیک اس کا کوئی امکان نہیں۔ عیسائیت نے یہ امکان پیدا کرنے کیلئے کفارے کا عقیدہ اختراع کیا جو سراسر غیر حقیقت پسندانہ بھی ہے اور عقل کے خلاف بھی۔ لیکن ہندومت نے تو آواگون اور تناسخ کا عقیدہ دے کر انسانیت کو ایک ایسے گورکھ دھندے میں ڈال دیا ہے جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ عیسائیت کے غلط تصور نے اگر مذہبی پیشوائی کو غلط رخ پہ ڈالا ہے اور عام عیسائیت پر چلنے والوں کو گناہوں پر دلیر کر دیا ہے تو ہندومت وغیرہ مذاہب نے انسانیت کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ کوئی آدمی جب یہ سوچتا ہے کہ بری زندگی سے نکلنے کا اب کوئی راستہ نہیں ہے تو وہ مایوسی کی دلدل میں اتر جاتا ہے۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا کہ وہ خودکشی کر لے یا گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے۔ اسلام نے اس کے بالکل برعکس دو تصورات دیئے۔ ایک تو یہ کہ انسان کی معنوی اور روحانی زندگی پر بھی اسی قانون کی حکومت ہے جو پروردگار کا قانون کائنات کے باقی علاقات میں کارفرما ہے۔ ہم یہاں دیکھتے ہیں انسان بیمار ہوتے ہیں درختوں کو بیماریاں لگتی ہیں حیوانات مختلف امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اگر بروقت بیماری کے علاج کی صحیح کوشش کی جائے تو شفا نہ ہو۔ مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے بھی بیمار ہونے پر کوئی معالج کبھی یہ نہیں کہتا کہ ہر چیز کا ایک نتیجہ ہوتا ہے اس لئے یہ بیماری بھی نتیجہ خیز ہو کر رہے گی، اسے روکا نہیں جا سکتا۔ تو جس طرح ہر جسمانی بیماری کا علاج ممکن ہے اسی طرح معنوی اخلاقی اور روحانی بیماریوں کا علاج بھی ممکن ہے۔ جس طرح جسمانی بیماریوں کے مختلف نام ہیں۔ اسی طرح معنوی اور روحانی بیماریوں کو بھی

Marfat.com

گناہ کی مختلف تعبیروں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ کائنات میں پروردگار کا ایک ہی نظام کارفرما ہے، جسمانی بیماریوں میں جس طرح علاج کو اس نے موثر تسلیم کیا ہے اسی طرح روحانی اور اخلاقی بیماریوں میں بھی کوئی شخص اگر اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کوشش کی بھی قدر فرمائی ہے۔ اور توبہ کے نام سے اس کا طریقہ بتایا ہے۔ دوسری بات وہ یہ کہتا ہے کہ نیکی پر جزاء اور بدی پر سزا یہ ان کا طبعی نتیجہ نہیں کہ جس کو ہم لازمی قرار دیں بلکہ جزا اللہ کا فضل ہے جو سراسر اس کے اختیار میں ہے اور سزا بھی اس کے اختیار میں ہے وہ چاہے تو سزا دے اور چاہے معاف کر دے۔ البتہ اس کا فضل اور اس کی رحمت اس کی حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے اس لئے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا۔ جب کسی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچی نیت کے ساتھ اس کی رضا کیلئے بھلائی کی تھی۔ اور جس بھلائی کو رد کر دیتا ہے اسے اس بنا پر رد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل بھلے کام کی سی تھی، مگر اندر اپنے رب کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا اسی طرح وہ سزا اس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کی بجائے مزید ارتکاب جرم کی خواہش موجود ہو۔ اور اپنی رحمت سے معافی اس قصور پر دیتا ہے جس کے بعد بندہ اپنے کیے پر شرمندہ اور آئندہ کیلئے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم کیلئے بھی اللہ کے ہاں مایوسی اور ناامیدی کا کوئی موقع نہیں بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف اپنی نافرمانی پر نادم او ربغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعت کی روش اختیار کرنے پر تیار ہو۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

''ہم نے کہا! اترو یہاں سے سب، تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے، تو ان کیلئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ○ اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔'' (البقرۃ: ۳۸ تا ۳۹)

حکم میں اعادہ کا مفہوم

اس آیت کریمہ کا پہلا جملہ گزشتہ سے پیوستہ آیت میں بھی آ چکا ہے۔ وہاں بھی اترنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہاں اسی حکم کا پھر اعادہ کیا گیا ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ گزشتہ حکم ضرور دیا گیا تھا لیکن اس کا نفاذ نہیں ہوا تھا اگر اس کا نفاذ ہو چکا ہوتا تو دوبارہ حکم دینے کی نوبت نہ آتی اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ پہلی دفعہ یہ حکم حضرت آدم کی لغزش کے نتیجے کے طور پر دیا گیا تھا۔ جس میں ناراضگی کا اظہار تھا اور اب یہ حکم اس وقت دیا جا رہا ہے جب پروردگار حضرت آدم اور حضرت حوا کی لغزش کو معاف فرما چکے ہیں۔ اور یہ حکم دے کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ دنیا میں تمہارا بھیجا جانا اس لئے نہیں ہے کہ وہ تمہارے لئے کوئی دار العذاب ہے۔ بلکہ ہم اپنے سابقہ حکم کو برقرار رکھ کر معافی دینے کے باوجود یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زمین پر تمہارا جانا میری حکمت کے مطابق ہے کیونکہ اللہ کی حکمت نے پہلے سے تمہیں خلافت ارضی کیلئے چن لیا تھا۔ اب تمہیں وہاں جانے کا جو حکم دیا جا رہا ہے، وہ اس لئے دیا جا رہا ہے تاکہ تم اپنی اصل ذمہ داری کے مقام پر پہنچو اور وہاں جا کر اپنے فرائض

Marfat.com

سنبھالو اور آیت کے دوسرے حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کو زمین پر جو اتارا جا رہا ہے تو صرف آدم کی حیثیت سے نہیں اتارا جا رہا بلکہ آپ کے سر پر نبوت کا تاج بھی رکھ دیا گیا ہے۔ اب آپ زمین پر نبی اور خلیفہ کے پروٹوکول کے ساتھ تشریف لے جائیں گے اور آپ کو وہ ساری آزادیاں اور سہولتیں میسر ہوں گی جو اس منصب کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے ضروری ہیں

آیت کے دوسرے حصے فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ الخ سے ایک نہائت اہم حقیقت واشگاف کی جا رہی ہے کہ ہم نے آدم کو زمین پر اگرچہ حواس اور جوہر عقل جیسے آلات دے کر بھیجا ہے۔ جن سے وہ کام لے کر زندگی کے بیشتر معاملات کو حل کر سکتے ہیں۔ لیکن حق و باطل، خیر و شر کا معاملہ اتنا آسان نہیں کہ جو انسان کی فطرت اور عقل کے حوالے کر کے چھوڑ دیا جائے۔ اور مزید یہ کہ جنت میں حضرت آدم اور حوا جس طرح شیطان کے بہکاوے کا شکار ہوئے اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ شیطان کے بہکاوؤں کا مقابلہ صرف عقل سے ممکن نہیں اسی طرح اللہ کے احکام اور اللہ کی پسند اور ناپسند کا علم اور زندگی کیلئے ایک ایسی رہنمائی جو ہر طرح کی غلطیوں سے پاک ہو صرف حواس اور عقل سے تلاش نہیں کی جا سکتی اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کی طرف سے وحی کا سلسلہ جاری ہو اور اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے ایک ایسی روشنی کا انتظام کرے جس میں انسان آسانی سے زندگی کا سفر جاری رکھ سکے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں پروردگار یہ وعدہ فرما رہے ہیں کہ تم زمین پر چلے جاؤ لیکن تمہاری زندگی گزارنے کیلئے ہدایت اور رہنمائی میری طرف سے آئے گی۔ میں اس کیلئے پیغمبر بھیجوں گا، ان پر کتابیں نازل کروں گا جو ہر دور میں تمہاری رہنمائی کیلئے کافی ہوں گی۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ تمہاری دنیوی سلامتی اور اخروی سرخ روئی کا دار و مدار صرف اس بات پر ہوگا کہ تم میری ہدایت کی پیروی کرتے ہو یا نہیں کرتے۔ اگر تم نے خوش دلی اور حسن نیت کے ساتھ میری ہدایت کی پیروی کی تو پھر تمہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی چیز تمہیں غمگین کر سکے گی۔ خوف مستقبل کے اندیشوں کو کہتے ہیں۔ اور حزن ماضی میں پیش آنے والے صدمات اور فکر مندیوں کو۔ اللہ کی ہدایت کو قبول کرنے کے نتیجے میں دنیا ہی میں ایک ایسا معاشرہ تیار ہو جاتا ہے جو مستقبل کے اندیشوں سے کبھی اندیشہ ناک نہیں ہوتا۔ اللہ پر توکل اور اس کی ہدایت پر چلنے کی وجہ سے ان کا مستقبل ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ اگر کوئی تکلیف آتی بھی ہے تو وہ جنت کے پھولوں کی طرح کھل اٹھتی ہیں اور اگر کبھی کوئی بحران سر اٹھاتا ہے تو یا تو وہ ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا کیونکہ اللہ کی تائید و نصرت ان کے ساتھ ہوتی ہے اور یا اس کے نتیجے میں انہیں شہادت کا تمغہ نصیب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر تم میں سے کسی نے محض اپنی عقل کو اپنی رہنمائی کیلئے کافی سمجھا یا لوگوں کے بتائے ہوئے طریقوں کو اپنا رہنما بنا لیا یا تم نے اللہ کی دی ہوئی رہنمائی میں پیوند کاری سے کام لیا یا تم نے اللہ کی ہدایت کو اپنی خواہشات کے تابع بنا لیا یا تم نے اللہ کی ذات کے ساتھ کوئی شریک بنا لیے اور انہیں ہدایت اور رہنمائی کا حق دے دیا تو یہ تمام صورتیں اللہ کی رہنمائی سے انکار کے مترادف ہیں۔ کبھی اس انکار کی صورت کفر کی ہوتی ہے اور کبھی تکذیب کی۔ لیکن دونوں صورتوں میں گمراہی ان کا مقدر بن جائے گی۔ یہ گمراہی دنیا میں بھی ایک عذاب بن جاتی ہے۔ لیکن اصل عذاب جو اس گمراہی کے نتیجے میں ملے گا وہ قیامت کے دن جہنم کا عذاب ہے۔ جس میں یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے اور کوئی ان کو نجات دینے والا نہیں ہوگا۔

اس رکوع میں بہت سے حقائق منکشف ہوئے ہیں۔ تشریح کے ضمن میں ہم موقع کی مناسبت سے وضاحت بھی کرتے رہے ہیں۔ لیکن آخر میں چند باتوں کی نشان دہی کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ا۔ سب سے پہلے تخلیق آدم کو ایک حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انسان کی ابتداء کے بارے میں بعض مفروضوں کے حوالے سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے قطع نظر یہاں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ آدم کو اللہ نے دستِ قدرت سے بنایا اور اسے یہ اعزاز بخشا کہ فرشتوں تک نے

Marfat.com

اسے سجدہ کیا۔اس طرح سے وہ اس کائنات کا کُل سر سبد ٹھہرا اور اسے بتا دیا گیا کہ یہ ساری کائنات تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے۔لیکن تم خود صرف اللہ کیلئے پیدا کئے گئے ہو۔تمہیں ہم نے قوت تسخیر دی ہے ارادہ شعور اور عقل سے نوازا ہے۔پھر تمہیں ان قوتوں کو بروئے کار لانے کی آزادی بھی بخشی ہے۔لیکن صرف ایک قدغن لگائی گئی ہے کہ تمہارا ہر استعمال اور تمہارا ہر ارادہ اور تمہاری ہر تسخیر کا نتیجہ اللہ کے احکام کے تابع ہونا چاہئے۔

۲۔ اس زمین پر تمہاری حیثیت اللہ کے نائب اور خلیفہ کی ہے۔نائب اپنی ذات میں خود مختار نہیں ہوتا تم بھی اس زمین پر خود مختارانہ زندگی نہیں گزارو گے۔خلیفہ کے پاس جو بھی اختیارات ہوتے ہیں وہ ذاتی نہیں ہوتے بلکہ ان اختیارات کا سرچشمہ وہ حکمران ہوتا ہے، جس کا وہ خلیفہ اور نائب ہے۔تمہیں چونکہ اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے اس لئے دیکھنا اپنے اختیارات کو آزادانہ استعمال نہ کرنا بلکہ اس طرح استعمال کرنا جس طرح اختیارات دینے والے نے تمہیں ہدایت دی ہے۔

۳۔ آدم کا اصل امتیازی پہلو اس کی علم میں برتری ہے۔جن میں سب سے مقدم علم اس ہدایت کا علم ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوتی ہے اور جس کے مطابق زندگی گزارنے کا انسان کو پابند ٹھہرایا گیا ہے۔اس کے بعد وہ تمام علوم ہیں جن سے انسانی ضرورتیں وابستہ ہیں اور جن پر انسانیت کی بقا اور مفسدین کے دفاع کا دارومدار ہے۔اس میں دنیا اور دین کی کوئی تقسیم نہیں۔دین رہنمائی مہیا کرتا ہے، اس کی رہنمائی میں وجود میں آنے والی دنیا بھی دین بن جاتی ہے۔امت مسلمہ کو جب دشمن قوتوں سے خطرہ لاحق ہوتا ہے تو تمام دفاعی علوم بھی دین کی طرح فرض اور واجب ہو جاتے ہیں۔

۴۔ آدم اور ابلیس کی کشمکش سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ غلطی آدم سے بھی ہوتی ہے اور ابلیس سے بھی۔لیکن آدم کی آدمیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ غلطی پر کبھی اصرار نہیں کرتا متنبہ ہو جانے کے بعد فوراً توبہ کی طرف لپکتا ہے۔اپنی اصلاح کرتا اور اللہ کو راضی کرنے میں اس وقت تک لگا رہتا ہے جب تک اس کی رضا کا یقین نہیں ہو جاتا۔ابلیس کی غلطی کی بنیاد غلط فہمی، سہو یا ناواقفیت نہیں ہوتی بلکہ اس کی بنیاد ذاتی سربلندی کا غرور ہوتا ہے۔کبھی یہ غرور نام و نسب سے پیدا ہوتا ہے۔کبھی دولت و امارت سے اور کبھی قوت و شوکت سے۔گناہ کی یہ بنیاد اتنی مضبوط ہے کہ جس کے نتیجے میں سرکشی پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتی اور جب ذہن سرکشی کا شکار ہو جاتا ہے تو پھر اس پر کوئی نصیحت اثر نہیں کرتی۔یہی وجہ ہے کہ ہم اس واقعہ میں دیکھتے ہیں کہ حضرت آدم نے رو رو کر نہ صرف مغفرت حاصل کر لی بلکہ نبوت کے سزاوار ٹھہرے۔لیکن ابلیس سرکشی کا شکار ہوا معارضہ تک جا پہنچا اور راندۂ درگاہ ٹھہرا۔

۵۔ آدم اور ابلیس کی سرگزشت سے قریش اور یہود کو آئینہ دکھایا گیا ہے کہ اس آئینہ میں غور سے اپنی شکل پہچانو تم جس راستے پر چل رہے ہو یہ ابلیس کا راستہ ہے تو جس طرح ابلیس کو دونوں جہانوں کی رسوائی ملی اور آدم سرافراز ہوئے اسی طرح ذلت اور نکبت تمہارا مقدر بنے گی اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمان کامیاب اور کامران ٹھہریں گے۔

۶۔ قیامت تک آنے والے انسانوں کیلئے یہ حقیقت کھول دی گئی ہے کہ تم محض اپنی فطرت اور عقل کے بل بوتے پر راہ صواب اور صراط مستقیم نہیں پا سکو گے جب تک تم اللہ کی طرف سے آخری پیغمبر پر اترنے والی ہدایت اختیار نہ کرو۔اسی میں تمہاری دنیا ہے اور اسی میں تمہاری عقبیٰ۔اور آج جب کہ دنیا تیزی سے تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے اور مسلمان زوال کی انتہا کو چھو رہے ہیں۔تو آج اس ہدایت کو آویزۂ گوش اور زندگی کی رہنما بنانے کی شائد سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

یہ بزمِ آب و گِل جتنی کہ برہم ہوتی جاتی ہے
محمد کی شریعت اور محکم ہوتی جاتی ہے

Marfat.com

يٰبَنِیٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیٓ
اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّایَ
فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ
كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِیْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّایَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا
الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ
تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

رکوع ۵۔ (اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم کو عطا کی اور میرے عہد کو پورا کرو۔ میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو۔ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے، جو تصدیق کرنے والی ہے اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے۔ اور تم اس کے پہلے کافر نہ بنو، اور میری آیات کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو اور میرے غضب سے بچو۔ اور حق اور باطل کو گڈمڈ نہ کرو اور حق کو نہ چھپاؤ دراں حالیکہ تم جانتے ہو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ کیا تم لوگوں کو وفاداری کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم سمجھتے نہیں۔ اور مدد چاہو صبر اور نماز سے، اور بے شک یہ بھاری چیز ہے مگران لوگوں کیلئے جو ڈرنے والے ہیں ○ جو گمان رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) (آیت ۴۰ تا ۴۶)

Marfat.com

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ○ (البقرة: ۴۰)

(اے بنی اسرائیل !یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم کو عطا کی اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو)

گزشتہ رکوع سے پیوستہ رکوع میں انسانوں کو اللہ نے اپنی عبادت اور بندگی کی دعوت دی تھی اور بتایا تھا کہ ہرانسان اپنی ذات میں اللہ کا بندہ اور اس کا غلام ہے اور اللہ اس کا معبود اس کا آقا اور حاکم حقیقی ہے۔اس کے بعد گذشتہ رکوع میں مزید یہ حقیقت واضح کی گئی کہ تم صرف اللہ کے بندے ہی نہیں ہو بلکہ تم اس زمین پر اللہ کے نائب اور خلیفہ بھی ہو۔اس کائنات کا خالق و مالک چونکہ اللہ ہی ہے اس لئے یہ بات عقل اور فطرت کا تقاضا ہے کہ باقی کائنات کی طرح زمین پر بھی اللہ کی حاکمیت نافذ ہو اور اسی کے احکام کے مطابق زمین پر رہنے والے زندگی گزاریں۔البتہ جن وانس اور باقی مخلوقات میں فرق یہ ہے کہ باقی تمام مخلوقات اللہ کے احکامِ تکوینی کے پابند ہیں،لیکن جن وانس چونکہ عقل وشعور کی نعمت کے ساتھ ساتھ اطاعت ومعصیت اور شکر وکفر کی آزادی سے بھی نوازے گئے ہیں۔اس لئے ان پر اللہ کا قانون صرف تکوینی نہیں تشریعی بھی نافذ ہوگا اور تشریعی قانون کیلئے اللہ اپنے پیغمبر مبعوث کرے گا اور ان پر اپنی کتابیں اتارے گا۔پیغمبر اللہ کے خلیفہ ہوں گے اور ان کے بعد اس خلافت کی ذمہ داریوں کو وہ لوگ ادا کریں گے جو پیغمبروں کے پیروکار اور ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے والے ہوں گے۔اس طرح سے انسانوں کی یہ دوہری ذمہ داری ٹھہری کہ وہ انفرادی طور پر اللہ کی بندگی بھی کریں اور اجتماعی طور پر اہلِ زمین پر اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہوئے خلافت کی ذمہ داریاں بھی ادا کریں۔اب پیشِ نظر رکوع میں ایک ایسے گروہ کو خطاب کیا جارہا ہے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں اللہ کے نبیوں کے ساتھ مل کر یا ان کی نیابت میں خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرا گیا تھا۔اور وہ کام جو اللہ کے نبی دنیا میں کرنے کیلئے آتے ہیں یہ گروہ نبیوں کے ساتھ مل کر یا ان کی اقتدا میں اس کام کا مکلف بنایا گیا اور اس وقت کی تمام دنیا کی خیر وفلاح کا ذمہ دار انہیں ٹھہرا کر حامل دعوت ہونے کا شرف بخشا گیا۔بظاہر اس کہانی کو بیان کرتے ہوئے تاریخ کے چند اوراق الٹے جارہے ہیں لیکن حقیقت میں چند اہم حقائق کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔

ا۔ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے براہِ راست مخاطب جو لوگ تھے،وہ تین قسم پر مشتمل تھے۔ (۱) قریش،جو حضور کا اپنا خاندان تھا۔ (۲) مدینہ منورہ کے اوس وخزرج، (۳) اہلِ کتاب،یعنی بنی اسرائیل۔ان میں سے یہ تیسرا گروہ یعنی بنی اسرائیل ان تینوں میں اہم حیثیت کا حامل تھا۔

بنی اسرائیل کا مفہوم اور ان کی مذہبی اور منصبی تاریخ

''اسرائیل'' درحقیقت حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام یا آپ کا لقب ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے فرزند حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔عبرانی زبان میں اسر کا معنی ہے ''بندہ'' اور ایل کا معنی ہے ''اِلٰہ''۔اس لحاظ سے اسرائیل کا معنی ہے ''عبداللہ یا بندۂ خدا''۔بنی اسرائیل چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے مختلف بیٹوں کی اولاد

Marfat.com

تھے اس لئے وہ اپنے آپ کو بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کہلاتے تھے۔البتہ اسرائیل کے معنی میں انہوں نے اپنی سرشت کے مطابق تبدیلی کی تھی۔ بجائے اس کو عبداللہ کے معنی میں لینے کے انہوں نے اس کا ترجمہ ''بطل اللہ'' کیا تھا اور اسی کو تقویت دینے کیلئے انہوں نے تورات میں ایک داستان بھی اختراع کر دی۔ جس میں یہ دکھایا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اللہ سے کشتی ہوئی۔اس طرح سے انہوں نے نبوت کی حقیقت کو پامال کر کے رکھ دیا اور نبی اور اللہ کے درمیان جو تعلق ہے اسے بالکل بدل ڈالا۔تاریخ کے مختلف ادوار میں بنی اسرائیل میں اللہ کے نبی پیدا ہوتے رہے اور پھر ان میں چند ایسے جلیل القدر رسول بھی آئے جن پر اللہ نے اپنی کتابیں نازل فرمائیں۔اور وہی کتابیں آج محرف شکل میں عہد عتیق اور عہد جدید کے نام سے یہود و نصاریٰ کے پاس موجود ہیں۔اسی نبوت و رسالت کے باعث اللہ نے اس خاندان کو عظمت بخشی۔ان میں اگر ایک طرف علم کی ہمہ ہمی رہی تو ساتھ ہی مختلف ادوار میں یہ خاندان حکومتوں پر فائز بھی رہا اور زمین کے بڑے حصے کیلئے اللہ کے دین کا سرچشمہ اسی خاندان میں ابلتا رہا اور یہی لوگ توحید کی علم برداری کا فرض انجام دیتے رہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان میں زوال آیا اور آنحضرت ﷺ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے یہ لوگ اس طرح زوال کا شکار ہوئے کہ باوجود اپنے پاس کتاب رکھنے کے کتاب کی روح سے بے بہرہ ہو گئے۔احکام شریعت میں تبدیلیاں کیں اور اس کے اجتماعی نفاذ سے یکسر منحرف ہو گئے۔ان کی اپنی عدالتوں اور پنچایتوں میں ان کے بڑے لوگوں کی خواہشات قانون کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ان کے عوام نے اللہ کی حاکمیت کے تصور کو اس طرح بدل ڈالا کہ اپنے احبار و رہبان کو ربوبیت کے مقام پر فائز کر دیا۔شریعت کے چند وہ احکام باقی رہ گئے جن کا تعلق حاکمیت سے نہیں بلکہ عبودیت سے ہے اور زندگی کا پورا تانا بانا رسم و رواج کی پابندیوں سے تیار کر ڈالا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز حد تک انہیں اہلِ کتاب ہونے پر ناز تھا۔اس لحاظ سے وہ اپنے سوا کسی اور کو راہِ راست پر نہیں سمجھتے تھے۔زندگی میں ہر طرح کی بدعملی کے باعث آخرت میں جواب دہی کے احساس سے بچنے کیلئے انہوں نے اس طرح کے اعتقادات اختیار کر لئے تھے کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں بلکہ اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔اس لئے قیامت کی بازپرس کا ہمیں کوئی اندیشہ نہیں۔ان کا ذکر فرما کر پروردگار گفتہ آید در حدیثِ دیگراں کے طور پر امت مسلمہ کو متوجہ فرما رہا ہے کہ جس طرح تم سے پہلے بنی اسرائیل خلافت کا فرض انجام دینے کیلئے حاملِ دعوت امت کے طور پر اٹھائے گئے تھے آج تمہیں بھی ان کی اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ناکامی کے باعث اسی ذمہ داری کیلئے اٹھایا جا رہا ہے۔تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اس گذشتہ امت کے احوال پر نظر رکھو۔ہم تمہارے سامنے ان کی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ کے نمایاں ابواب کھولیں گے تاکہ تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ جب کوئی قوم اس منصب پر فائز ہوتی ہے۔تو وہ اگر اللہ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کس طرح انعامات کی بارش ہوتی ہے اور اگر وہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے پہلو تہی کرتی ہے اور حبِّ دنیا کی اسیر ہو کر دینی تقاضوں کو نظر انداز کرتی ہے تو پھر کس طرح مختلف شکلوں میں اللہ کے عذاب کا کوڑا اس پر برستا ہے۔

۲۔ بنی اسرائیل چونکہ توحید نبوت اور آخرت کے ماننے والے لوگ تھے اور وہ اللہ کی نازل کردہ کتابوں کو تسلیم بھی کرتے تھے۔لیکن ان کی بداعمالیاں اور کتاب اللہ میں ترمیم اور تحریف کی جرات اور پھر اللہ کی کتاب کی طرف بلانے والوں سے ان کی دشمنی کے رویے نے انہیں جس حد تک پہنچا دیا تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دور کے اس حد تک بگڑے ہوئے مسلمان تھے کہ جن میں اسلام کے نام کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہی تھی۔لیکن انہیں اس بات پر فخر تھا کہ ہمیں دنیا میں ہمیشہ ایک خاص مقام حاصل رہا ہے

Marfat.com

اور مختلف ادوار میں ہم پر اللہ کے انعامات برستے رہے ہیں۔ اس رکوع میں اسی حوالے سے ان سے خطاب فرما کر انہیں ان کا اصل مقام اور منصب یاد دلایا گیا ہے۔ اور پھر انہیں دعوت دی گئی ہے کہ تمہارے مقام اور منصب کا تقاضا یہ ہے کہ تم سب سے پہلے آگے بڑھ کر اسلام کی دعوت کو قبول کرو۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کی دعوت میں کوئی ایسی بات نہیں جو تمہارے لئے اجنبی ہو وہ کسی ایسی بات کا حکم نہیں دے رہے، جو سابقہ آسمانی کتابوں کی ہدایت کے خلاف ہو۔ اور دین کی جو بنیادیں سابقہ آسمانی کتابوں نے پیش کی ہیں ان میں سے کسی بات کا وہ انکار نہیں کر رہے۔ اصولِ دین میں ان کی دعوت تمہاری دینی دعوت سے بالکل ہم آہنگ ہے اور ان میں سے کسی بات کا انکار کرنا تمہارے لیے ممکن نہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم اس دعوت کو دوسروں سے آگے بڑھ کر قبول نہ کرو۔

۳۔ بنی اسرائیل سے مختلف ادوار میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا اور آپ کی اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کی علامتیں ان کی کتاب میں موجود تھیں ان کا حوالہ دے کر انہیں یاد دہانی کرائی جا رہی ہے کہ دوسرے لوگ تو اس دعوت کو اس وقت قبول کریں گے جب دعوت ان کے دل و دماغ میں اترے گی لیکن تمہارے لئے یہ دعوت نہ صرف جانی پہچانی ہے بلکہ تم تو عہد و پیمان کے باعث بھی اس دعوت کو قبول کرنے کے پابند ہو۔ لیکن تمہیں صرف اس لئے اسے قبول کرنے سے انکار ہے کہ تم نے حب دنیا میں مبتلا ہو کر جو طور اطوار اختیار کر لئے ہیں اور جس طرح تمہارے علماء نے مصنوعی سیادت و قیادت کا ایک بہروپ اختیار کر رکھا ہے۔ اور جس طرح تم نے سادہ لوح عوام کو دین کا غلط تصور پیش کر کے اپنی عقیدت میں جکڑ کر اپنے لئے چڑھاووں اور نذر نیاز کا انتظام کر رکھا ہے تمہیں اندیشہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا اور تمہارا بھرم کھل جانے سے تمہاری آمدنی کے سارے سلسلے ختم ہو جائیں گے اس لئے تم اس دعوت کو قبول کرنے سے انکاری ہو۔ اس طرح سے ایک تو ان کے ضمیر کو جھنجھوڑا تا کہ ان میں کسی کے ضمیر میں زندگی ہے تو وہ بیدار ہو جائے ورنہ جو لوگ ان کے علم سے متاثر ہونے کے باعث ہمیشہ ان سے رجوع کرتے ہیں ان کے سامنے ان کی اصل حقیقت واضح ہو جائے۔ اور اس طرح سے ان کو غلط فہمیاں پیدا کرنے کا جو موقع ملا ہوا ہے وہ ختم ہو جائے۔ ان حقائق کو ذہن میں رکھ کر ہمیں آئندہ آیات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں چار باتیں تشریح طلب ہیں۔ ا: اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ ''اے بنی اسرائیل! میری نعمت کو یاد کرو''۔ نعمت کا معنی ہوتا ہے ''احسان'' اور کبھی عام عطیہ کو بھی نعمت کہہ دیتے ہیں۔ لیکن یہاں اُذْكُرُوْا کے لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ مراد وہ عام نعمتیں نہیں جو عام انسانوں کو میسر ہیں بلکہ وہ خاص افضال و عنایات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں یا خاص قوموں کو نوازتا ہے۔ اس لحاظ سے جب دیکھیں تو قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر دو طرح کی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔

ا۔ اس وقت کی معلوم دنیا میں اللہ تعالیٰ نے صرف بنی اسرائیل کو اپنے دین کی سربلندی خلقِ خدا کی ہدایت اور لوگوں کی اصلاح کیلئے منتخب فرمایا۔ اور انہیں حاملِ دعوت ہونے کا شرف بخشا، توحید اور شریعت کی امانت ان کے سپرد کی گئی۔ اور انہی میں اللہ کے نبی مبعوث ہوتے رہے اور یہ ایک ایسا شرف ہے جسے حاصل کرنا کسی انسانی گروہ کے اختیار میں نہیں۔ یہ سراسر اللہ کی دین ہے جسے وہ عطا کر دے۔

۲۔ حق و باطل کی کشمکش میں یقیناً مشکلات پیش آتی ہیں۔ بنی اسرائیل کو بھی مختلف ادوار میں پیش آئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد بنی اسرائیل کو بطور خاص حق کی علمبرداری کیلئے اٹھایا گیا۔ پھر جس طرح وقت کی ایک قاہر قوت کے ساتھ ان کا تصادم ہوا اور پھر جس طرح ان کا وطن چھوٹا اور پھر جس طرح ان کو صحرائی زندگی اختیار کرنا پڑی۔ یہ مشکلات کا حوصلہ شکن سلسلہ تھا لیکن قدم قدم پر جس طرح اللہ کی عنایات ان پر برستی رہیں اور جس طرح ہر مشکل میں اللہ نے ان کی دستگیری فرمائی اور پھر رفتہ رفتہ انہیں حکومتوں کا مالک بنا دیا۔ اور ایک وقت آیا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی قوت بن گئے۔ یہ وہ عنایات اور احسانات ہیں جن کا قرآن کریم نے بھی جا بجا ذکر کیا ہے۔

Marfat.com

۳۔ اَلَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ ''میری وہ نعمتیں یاد کرو، جو میں نے تم پر انعام کی ہیں''۔نعمت بھی اللہ کا انعام ہوتا ہے۔اور وہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔لیکن اس کے بعد بطور خاص یہ فرمانا کہ مین نے تم پر انعام کیا۔اس سے بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی گمراہی کی طرف اشارہ ہے۔بنی اسرائیل کو جن تصورات نے بگاڑا اور جس کے نتیجے میں ان کی دینی زندگی داغ داغ ہوگئی وہ ان کا یہ تصور تھا کہ وہ ہر نعمت کو اپنی اہلیت اور استحقاق کا نتیجہ سمجھتے تھے۔جب تک کوئی شخص اپنے محسن کی مہربانیوں کو احسانات سمجھتا ہے تو اس کے دل میں اپنے محسن کی قدر و عظمت ہوتی ہے۔وہ اس کی اطاعت کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔لیکن جب وہ کسی عنائت کو اپنا حق سمجھ لیتا ہے تو پھر وہ محسن کو محسن سمجھنے سے انکار کر دیتا ہے اور احسان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جذبات سرے سے پیدا ہی نہیں ہو پاتے۔بنی اسرائیل نے بھی جب اللہ کے انعامات کو اپنے نسب کا نتیجہ سمجھا اور اس کو ذاتی استحقاق قرار دیا تو رفتہ رفتہ اللہ سے ان کا رشتہ ٹوٹتا چلا گیا۔شروع شروع میں اطاعت کا جذبہ کمزور ہوا، اور پھر بڑھتے بڑھتے اللہ کے دین سے بے نیازی ان کا معمول بن گئی۔اس سے بنی اسرائیل کو اگر ایک طرف انعامات کی یاد دہانی کرائی ہے تو ساتھ ہی ان کی بدعملی کے اصل سبب پر توجہ بھی دلائی ہے کہ شائد وہ اس طرح سے اپنی گمراہی کے سبب کو سمجھ کر تائب ہونے کی کوشش کریں۔

۴۔ اَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ ''تم میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا''۔ان دو جملوں میں پروردگار نے بنی اسرائیل پر اپنے ایک احسان کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے اور ان کی ذمہ داریاں بھی ان کو یاد دلائی ہیں۔دونوں جملے خود بول رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کوئی عہد لیا ہے اور اس کے بدلے میں ان سے کوئی عہد کیا ہے۔عہد ہمیشہ دو برابر کے افراد یا دو برابر کے گروہوں میں ہوتا ہے یا اگر جانبین میں مراتب کا تفاوت بھی ہو تو وہ اتنا نہیں ہوتا کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کاروباری گفتگو نہ کر سکیں۔لیکن جانبین اگر اس طرح کے ہوں کہ ایک طرف بادشاہ ہے اور دوسری طرف ایک مزدور۔یا ایک طرف عطا کرنے والا ہے اور دوسری طرف ہاتھ پھیلانے والا۔یا ایک طرف حاکم ہے اور دوسری طرف محکوم تو ان کے درمیان کبھی معاہدہ نہیں ہوتا۔ہاں اس کی ایک ہی صورت ہے کہ بادشاہ، محسن یا حاکم خود کسی کو فریق مان لے اور محض عطا اور بخشش کے طور پر اس سے کوئی معاہدہ کرے کہ تم اگر یہ خدمت انجام دو گے تو ہم تمہیں اس پر یہ عطا کریں گے۔جب کہ وہ محض ایک حکم کے ذریعے ہر طرح کی خدمت لینے کے مجاز ہیں۔اللہ تعالیٰ نے بھی جب بنی اسرائیل پر شریعت نازل کی تو ساتھ ہی ان سے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اس شریعت پر عمل کرو گے تو اس کے نتیجے میں ہم تمہیں دنیا و آخرت کی فلاح و کامرانی سے نوازیں گے۔یا قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ ہم نے مومنوں سے ایک معاہدہ کیا اور اس معاہدے کا ذکر ہم نے تورات اور انجیل میں بھی کیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہی معاہدہ اہلِ کتاب کے ساتھ بھی تھا۔وہ معاہدہ کیا ہے؟ ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ ''بے شک اللہ نے خرید لی ہیں مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس وعدے پر کہ اس کے بدلے میں ان کیلئے جنت ہوگی''۔اللہ کا اپنے بندوں سے یہ معاہدہ بندوں کیلئے اتنا بڑا اعزاز ہے کہ اس سے بڑے اعزاز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ کریم نے اس معاہدے کو سورۃ مائدہ آیت نمبر ۱۲ میں خود میثاقِ بنی اسرائیل سے یاد فرمایا ہے اور اس میں شریعت کی پابندیوں کے بدلے میں اپنی معیت اور اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا اور دوسرے ایک اور معاہدے کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کی وضاحت ہمیں تورات کتاب استثنا سے بھی ملتی ہے اور قرآنِ کریم کی سورۃ اعراف سے بھی۔میں دونوں کے حوالے عرض کرتا ہوں۔کتاب استثنا 19-15 میں ہے

Marfat.com

(خداوند تیرا خدا تیرے لئے ہی تیرے درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا...... میں ان کیلئے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا)

اب قرآن پاک میں اس عہد کی طرف اشارہ دیکھئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے رحمت کی جو دعا کی، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ o اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ز یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ لا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o

(الاعراف: ۱۵۶ تا ۱۵۷)

(اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے، میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کیلئے جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ یعنی جو پیروی کرتے ہیں رسول نبی اُمی کی جن کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، وہ ان کو حکم دیتے ہیں نیکی کا اور وہ روکتے ہیں منکر سے۔ اور ان کیلئے جائز کرتے ہیں پاکیزہ چیزیں اور حرام کرتے ہیں ان پر ناپاک چیزیں اور دفع کرتے ہیں ان پر سے بوجھ او رپھندوں کو جو ان پر تھے۔ پس جو ان پر ایمان لائے اور جنہوں نے ان کی حمایت کی اور مدد دی اور اس روشنی کی پیروی کی جو ان کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)

ان دونوں حوالوں میں آپ نے دیکھا ہے کہ بنی اسرائیل سے شریعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا عہد بھی لیا تھا۔ اسی عہد کی بجا آوری پر حضور کی تشریف آوری کے بعد بنی اسرائیل پر رحمت کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اور قرآن کریم میں تو یہ بات بالکل واضح کر دی گئی کہ نبی آخرالزمان پر ایمان ان کے ساتھ عقیدت واحترام، ان کا اتباع اور ان کی نصرت (جس کے نتیجے میں اللہ کا دین غالب آجائے) ہی بنی اسرائیل اور تمام مسلمانوں کیلئے فلاح کی ضامن ہے۔ اسی وعدے کی یاد دلا کر بنی اسرائیل سے کہا جا رہا ہے کہ آج اگر تم سلامتی چاہتے ہو اور دنیا اور آخرت کی تمہیں کامیابی درکار ہے تو پھر تمہیں اپنے عہد کو پورا کرنا چاہئے۔

۵۔ وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ ''اور مجھ ہی سے ڈرو''۔ اس جملے میں بھی ضمیر کو فعل سے اسی طرح پہلے لایا گیا ہے جس طرح اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں لایا گیا ہے۔ وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ جہاں فعل کے مفعول کو فعل سے پہلے ذکر کیا جائے تو اس میں حصر کا معنی پیدا

Marfat.com

ہو جاتا ہے۔اور یہ اس فعل کے اہتمام اور اس پر زور دینے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ فارھبون اصل میں فارھبونی ہے۔لیکن ضمیر متکلم کو فعل سے پہلے لاکر معنی میں زور پیدا کر دیا گیا ہے۔اگر فَارْهَبُوْنِی ہوتا تو اس کا معنی ہوتا "پس مجھ سے ڈرو" لیکن اب ضمیر متکلم کی تقدیم سے معنی میں اہتمام پیدا ہو گیا تو اب اس کا معنی ہوگا "پس مجھ ہی سے ڈرو" اللہ کے ساتھ کیے گئے وعدے پورا کرنے میں یقیناً مشکلات پیش آئیں گی، یقیناً بہت سارے مفادات سے ہاتھ اٹھانا پڑے گا، یقیناً بہت سی مراعات سے کنارہ کش ہونا پڑے گا۔ممکن ہے لوگ تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تمہاری سیادت وریاست کو نقصان پہنچے۔لیکن یاد رکھو یہ چیزیں اللہ کے مقابلے میں پرواہ کرنے کی نہیں ہیں۔یہ ساری چیزیں چھوٹ جائیں اور اللہ راضی ہو جائے تو وہ سب کچھ عطا کر سکتا ہے۔لیکن اگر وہ ناراض ہو گیا تو ساری ریاستیں اور سیادتیں اور مال و دولت کے انبار اور لوگوں کا رجوع اللہ کے غضب سے نہیں بچا سکے گا۔اس لئے تمہیں ہر طرح کے خوف سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ سے ڈرنا چاہئے اور اللہ سے ڈرنے کا نبی آخر الزمان کی تشریف آوری کے بعد فوری تقاضا یہ ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠
وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِیْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّایَ فَاتَّقُوْنِ ۝ (البقرة: ۴۱)

(اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے، جو تصدیق کرنے والی ہے اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے
اور تم اس کے پہلے کافر نہ بنو، اور میری آیات کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو اور میرے غضب سے بچو)

مَآ اَنْزَلْتُ سے مراد

اس آیت کریمہ میں اللہ کے آخری رسول اور قرآن کریم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ مَآ اَنْزَلْتُ سے مراد اگرچہ قرآن کریم ہے اور قرآنِ کریم اللہ کی کتاب ہے اور یہ بات مسلمہ ہے کہ کوئی کتاب بھی کسی پیغمبر کے بغیر نہیں اترتی۔جب تک پیغمبر پر ایمان نہ لایا جائے کتاب پر ایمان لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو جو بات خود بخود کلام سے واضح ہو رہی ہے اس کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔جب یہ فرمایا گیا کہ اس چیز پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کی ہے تو یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ یہ کتاب جس زبان سے پڑھ کر سنائی جا رہی ہے اور جو زبان اس کو اللہ کی کتاب کے طور پر پیش کر رہی ہے اس کتاب پر ایمان لانے سے پہلے اس پر ایمان لاؤ پھر اس کے واسطے سے اس کتاب کو تسلیم کرو۔

مصدقاً کا مفہوم

اس کے بعد دونوں کے حوالے سے ایک بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ تمہیں تو اس پیغمبر اور اس کتاب کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ دونوں تو تصدیق کر رہے ہیں ان کتابوں کی اور اس دین کی جو تمہارے پاس ہے۔البتہ اس تصدیق کے دو پہلو ہیں،ایک پہلو ہے کہ قرآنِ کریم بار بار اس بات کی تصدیق کر رہا ہے کہ جس طرح میں اللہ کی طرف سے آیا ہوں اسی طرح تورات، زبور اور انجیل بھی اللہ ہی کی طرف سے نازل کی گئی تھیں۔ان چاروں کتابوں کا سرچشمہ ایک ہی ذات خداوندی ہے جن پر یہ کتابیں اتری تھیں وہ سب اللہ کے نبی اور رسول تھے۔ان کتابوں نے جو تعلیمات پیش کی تھیں میں اصولی طور پر اس کی تصدیق کرتا ہوں، مجھے اگر انکار ہے تو ان چیزوں سے ہے جو غلط طریقوں

Marfat.com

سے ان کتابوں میں شامل کردی گئی ہیں یا تحریف کر کے ان کی شکل بگاڑ دی گئی ہے۔اس طرح سے قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ اہلِ کتاب کے پاس جو صحیفے ہیں ان کی تصدیق کر رہے ہیں۔اس پر سے تو اہلِ کتاب کو آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کا شکر گزار ہونا چاہیے چہ جائیکہ اسے ماننے سے انکار کردیں۔

دوسرا پہلو اس تصدیق کا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی اور قرآنِ کریم جیسی عظیم کتاب اس طرح ان کی کتابوں کی تصدیق کر رہی ہیں کہ ان کی کتابوں نے جابجا آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی علامات ذکر کی تھیں۔آنحضرت کا تو نام مبارک اور حلیہ تک ان کتابوں میں موجود تھا۔آپ کی بعض نمایاں عادات تک ان میں بیان کی گئی تھیں۔یہ بھی بتایا گیا تھا کہ آنے والا نبی بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا۔اسی طرح قرآن پاک میں نازل کردہ تعلیمات کے حوالے سے بہت سی باتیں پہلی کتابوں میں موجود تھیں۔آپ پر نازل ہونے والی وحی کی صفات تک کو بیان کیا گیا تھا اور اہلِ کتاب ہمیشہ ان علامتوں کو لوگوں کے سامنے بیان کیا کرتے تھے۔اب جب حضور تشریف لائے اور قرآنِ کریم نازل ہوا تو وہ بالکل ان صفات کے مطابق اور ان کا پیکر بن کر آئے، جیسا ان کی کتابوں نے بیان کیا تھا۔تو آنحضرت کا ان کتابوں کی بیان کردہ صفات کا حامل ہونا اور قرآن کریم کا انہی بیان کردہ نمایاں خصوصیات کا پرتو ہونا ایک ایسی تصدیق ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ دونوں ایک ایک علامت کا مصداق بن کے آئے جبکہ ان کی کتابوں کی بیان کردہ پیشگوئیاں اور علامتیں اب تک اپنے حقیقی مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں۔اب اس کتاب اور اس پیغمبر کے ظہور نے ان کا مصداق دنیا کے سامنے پیش کر کے ان کی کتابوں کو سندِ تصدیق عطا کردی اور اس طرح سے بنی اسرائیل کا سر فخر سے بلند ہوگیا کہ دیکھو ہماری کتابوں نے صدیوں پہلے جو کچھ کہا تھا آج دنیا نے اپنی آنکھوں سے اسے سچا ہوتا دیکھ لیا تو جس پیغمبر اور جس کتاب نے ان کا سر فخر سے بلند کیا غضب خدا کا تم بجائے اس کے کہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس پیغمبر کا دامن تھامتے اور اس کتاب کو سینے سے لگاتے تمہی سب سے پہلے اس کا انکار کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔اس لئے ارشاد فرمایا گیا۔ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ "تم ہی سب سے پہلے اس کے کافر نہ بنو"۔

اول کافر کا مفہوم

اَوَّلَ کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے۔کبھی اس کا مضاف الیہ نکرہ مفرد ہوتا ہے، جیسے اس آیت میں ہے اور کبھی جمع ہوتا ہے۔جیسے:
اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ "اگر اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں سب سے پہلا اس کا عبادت کرنے والا ہوتا"۔تو یہاں دیکھئے العابدین جمع ہے۔دونوں کے استعمال میں فرق یہ ہے کہ واحد ہونے کی صورت میں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کوئی اور بھی ہے یا نہیں لیکن جمع آنے کی صورت میں مفہوم یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلا میں ہی ہوں مجھ سے پہلا کوئی نہیں۔

تم سب سے پہلے کافر نہ بنو کا یہ مطلب نہیں کہ جب دوسرے کفر کرنے لگیں تو تمہیں بھی کفر کرنے کی اجازت ہے۔لیکن تمہیں سب سے پہلے یہ حرکت نہیں کرنی چاہئے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ایک ایسی قوم ہو جو اصولِ دین سے واقف ہو، تم صاحب کتاب امت ہو۔تمہاری کتابوں میں نبی آخر الزمان کی علامتیں موجود ہیں۔ان علامتوں سے تم اچھی طرح رسول اللہ ﷺ اور قرآنِ کریم کو پہچانتے ہو کہ وہ دونوں اللہ کی جانب سے ہیں۔دنیا کے دوسرے لوگ اگر آپ پر ایمان لانے سے انکار کریں تو ان کیلئے کوئی عذر ہوسکتا ہے۔لیکن تمہارے لئے تو کوئی عذر نہیں ناواقف بھول جائے تو تعجب نہیں ہوتا لیکن جاننے بوجھنے والا غلطی کرے تو نہ صرف کہ تعجب ہوتا ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اصل

Marfat.com

غلطی کرنے والے تم پہلے شخص ہو کیونکہ ناواقف کی غلطی تو قابل ذکر نہیں ہوتی۔ دوسرا اس کا مطلب یہ ہے کہ قریش اور اہلِ مکہ نے اگرچہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کا انکار سب سے پہلے کیا کیونکہ اہلِ کتاب سے واسطہ تو ہجرت کے بعد پڑا۔ لیکن اہلِ مکہ نے اگر حضور کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو سب نے نہیں کیا بلکہ ایک خاصی بڑی تعداد ایمان لانے والوں کی بھی تھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہجرت کے بعد مہاجرین کہلائے۔ اگر قریش میں بڑے بڑے مخالف اور معاند نظر آتے ہیں تو دوسری طرف قریش ہی میں جاں نثاروں اور فرمانبرداروں کی بھی کمی نہیں جنہوں نے مسلسل ۱۳ سال تک مخالفتوں کی آندھی میں بھی اسلام کا چراغ جلائے رکھا۔ پھر جب حضورؐ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں آپ کو اوس وخزرج سے واسطہ پڑا تو ایک مختصر عرصے میں ان کی اکثریت مسلمان ہوگئی۔ لیکن اگر کسی گروہ نے ایک محدود اقلیت کو چھوڑ کر بحیثیت قوم اسلام قبول کرنے سے انکار کیا اور اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ صرف بنی اسرائیل اور اہلِ کتاب ہیں۔ تو یہاں تقابل بحیثیت قوم کے فرمایا جارہا ہے کہ ایک طرف بنی اسرائیل کی قوم ہے اور دوسری طرف اُمی عرب ہیں، چاہے وہ عدنانی ہوں یا قحطانی۔ ان دونوں کا تقابل کریں تو بحیثیت قوم صرف اہلِ کتاب نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس لئے فرمایا کہ مجموعی طور پر تمہیں ہی اسلام قبول کرنے کیلئے آگے بڑھنا چاہئے تھا لیکن تمہی سب سے پہلے کافر ہوگئے، تمہارے لئے یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی۔

اہلِ کتاب کی اسلام دشمنی کا حقیقی سبب

ہماری متذکرہ بالا گزارشات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اہلِ کتاب پر آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی حقانیت پوری طرح واضح تھی۔ ان کے اہلِ علم کے ذہنوں میں اسلام کی صداقت کے بارے میں کوئی اخفا نہیں تھا۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے میں صرف ٹھوکر ہی نہیں کھائی بلکہ وہ اسلام کے بدترین معاند اور دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور آنحضرت ﷺ کی انہیں راہِ راست پر لانے کیلئے تمام مساعی جمیلہ غیر مؤثر رہیں۔ ایک قاری اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ ہم نے عرض کیا واقعی تعجب میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن پروردگار نے اس آیت کے اگلے جملے میں اس حقیقت سے نقاب اٹھایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسلام قبول نہ کرنا دراصل چند در چند خرابیوں کا منطقی نتیجہ تھا۔ اس کیلئے جو تعبیر اختیار کی گئی ہے اس میں قلت فکر کے باعث عموماً یہ بات ذہنوں سے اوجھل رہی۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ''میری آیتوں کو ثمنِ قلیل کے بدلے میں مت بیچو''۔ بعض بر خود غلط قسم کے لوگوں نے تو اس کا یہ مطلب لیا کہ ثمنِ قلیل یعنی تھوڑی قیمت پر کتاب اللہ کی آیات کو بیچنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ لیکن اگر آیات کی کوئی بڑی قیمت مل جائے تو پھر یہ قیمت لے لینے میں کوئی حرج نہیں، حالانکہ یہ ایک معروف اسلوب ہے جس کے مطابق یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ مفہوم اس کا یہ ہے کہ بعض حقیقتیں یا بعض چیزیں اس قدر عظیم ہوتی ہیں کہ دنیا کے مال و دولت سے اس کی قیمت نہیں لگائی جاسکتی یعنی وہ معاوضے بدلے یا قیمت سے ماوراء اور بالا ہوتی ہیں، پوری دنیا بھی ان کی قیمت نہیں بن سکتی۔ ایسی چیزوں کی خرید و فروخت میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان کی قیمت کیا طے ہوئی ہے بلکہ بجائے خود ان کی قیمت کا طے ہونا ہی اور اس کو سامانِ فروخت سمجھ لینا ہی اس قدر مکروہ اور شنیع فعل ہے کہ جس سے نفرت ہونی چاہئے۔ آدمی ثمنِ قلیل کو چونکہ فطری طور پر حقیر اور قابلِ نفرت سمجھتا ہے اس لئے اس فعل کی کراہت اور شناعت کو نمایاں کرنے کیلئے یہ تعبیر اختیار کی جاتی ہے کہ تم ایسی بے نظیر چیزوں کو کسی بھی قیمت پر بیچو تم نے گویا ان کو ثمنِ قلیل کے بدلے بیچا ہے۔

Marfat.com

لیکن اس آیت میں مزید غور وفکر سے جو بات ذہن میں آتی ہے اور جسے درحقیقت یہاں بیان کرنا مقصود ہے۔ وہ یہ بات نہیں کہ وہ کتاب اللہ کی آیات کو کس قیمت پر بیچ رہے ہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے اللہ کی طرف سے نئی ہدایت کو قبول کرنے کے راستے میں جو اصل رکاوٹ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ انسانیت سے تہی دامن ہو گئے۔ روحانی زندگی ان کیلئے ایک اجنبی چیز بن گئی۔ دین جو بندے اور خدا کے درمیان ایک رشتہ ہے، وہ ان کیلئے کاروبار ہو گیا۔ اب ان کی زندگی میں دین، شریعت، آخرت ناقابل قدر چیزیں ہیں۔ یہ درحقیقت مفادات کے بندے اور ہوس کے اسیر ہیں۔ یہ ہر کام کرنے سے پہلے اپنے مفادات کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ان کی زندگی کا اصل ہدف دنیا، دولتِ دنیا اور دنیوی عزت وشہرت ہے۔ اس کیلئے انہیں کچھ بھی بیچنا پڑے یا اقدارِ انسانیت کو نیلامی پر چڑھانا پڑے تو انہیں دریغ نہیں ہوگا۔ اللہ کے دین کو چھوڑ دینا اور آخرت کو بھول کر دنیا ہی کو اپنا محبوب اور اپنا مقصود بنالینا اور ہر فیصلے کو مفادات کی نگاہ سے دیکھنا یہ وہ رویہ ہے جس کی یہاں نشاندہی کی گئی ہے۔ اسی رویئے نے اہلِ کتاب کو آنحضرت ﷺ اور آپ کی دعوت کی دشمنی پر اکسایا اور یہی سوچ اور رویہ ہر دور میں انسانیت کی تباہی کا باعث بنتا رہا۔ جب کوئی فرد یا کوئی قوم اس گمراہی کا شکار ہوتی ہے تو پھر اس کی زندگی پر اصل حکمرانی مفادات کی ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کو درہم و دینار کے حوالے سے دیکھتی ہے۔ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بالکل یہ تصویر ہوتی ہے۔

خاک باش و خوک باش ویاسگِ مردار باش
ہرچہ باشی باش لیکن اندکے زردار باش

اب ان کے اندیشے زندگی کی معنوی قدروں اخلاقی عظمتوں کی شکست وریخت یا آخرت میں جواب دہی کے حوالے سے نہیں ہوتے بلکہ ان کے تمام تر اندیشوں کا تعلق صرف ان کے مفادات سے ہوتا ہے۔ قوموں کا نشیب وفراز اجتماعی زندگی کی شکست وریخت ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ انہیں اندیشہ ہوتا ہے تو صرف بازار کے اتار چڑھاؤ کا، پیداوار کے گرنے یا بڑھنے کا، کرنسی کی قیمت میں کمی بیشی کا، یا پالیسیوں میں نقصان رساں عناصر کے در آنے کا۔ چنانچہ آیت کے آخری حصے میں ان کی اسی بیماری کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا: وَإِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ''اور مجھ ہی سے ڈرو'' اس تلقین میں بھی اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ کی طرح ایک اہتمام اور زور ہے۔ جس نے حصر کا معنی پیدا کر دیا ہے کہ تمہارے خوفوں اور اندیشوں کا تعلق ان چیزوں سے نہیں ہونا چاہیئے جن سے تم نے بنالیا ہے اور جن کی وجہ سے تمہاری زندگی کا رخ بالکل مخالف سمت کی طرف بدل گیا ہے۔ اب تمہارا رخ اللہ یا آخرت کی طرف ہونے کی بجائے دنیا اور مفاداتِ دنیا کی طرف ہے حالانکہ زندگی سود وزیاں کے اندیشہ سے برتر حقیقت کا نام ہے۔ اس میں جو چیز صالح خون بن کر دوڑتی ہے اور جو اس کی سمت کو درست رکھتی ہے، وہ اللہ کے سامنے جواب دہی کے نتیجے میں اپنے انجام کا خوف ہے۔ اس لئے تمہیں اگر کوئی خوف یا اندیشہ ہونا چاہیئے تو وہ صرف یہ کہ تمہیں بہرحال میرے پاس آنا ہے تم اپنی ان بداعمالیوں کے ساتھ میرا سامنا کیسے کرو گے؟ اور تمہارے پاس تمہاری ان بداعمالیوں کا کیا جواب ہوگا؟ تم نے جو اللہ سے شریعت پر مضبوطی سے قائم رہنے کا عہد کیا تھا اور یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ نبی آخر الزمان اور قرآن پر ایمان لاؤ گے بلکہ تم نے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی عہد و پیمان باندھا تھا کہ تمہیں جو کتاب عطا ہوئی ہے خلقِ خدا کے سامنے اس کی شہادت دو گے اور اس کے کسی بھی جز کو چھپاؤ گے نہیں۔ لیکن اب جب کہ تم نے دنیا کی حرص میں مبتلا ہو کر ہر عہد کو توڑ ڈالا اور مفادات کے بندے بن کر رہ گئے بتاؤ میرے پاس آ کر اس کا کیا جواب دو گے۔ اس لئے آج بھی تمہارے پاس یہ فیصلہ کرنے کا موقع باقی ہے کہ تمہیں مجھ سے ڈرنا ہے یا اپنے مفادات کے بارے میں اندیشوں کا اسیر رہنا ہے۔ دونوں صورتوں میں انجام واضح ہے۔

Marfat.com

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

فَارْهَبُوْنِ اور فَاتَّقُوْنِ کا مفہوم اور دونوں میں فرق

گزشتہ آیت میں فَارْهَبُوْن کا لفظ آیا ہے۔ جو رہبت سے ہے اور یہاں فَاتَّقُوْن کا لفظ آیا ہے۔ جو اتقاء یا تقویٰ سے ہے، لفظی معنی تو دونوں کا ''ڈرنا'' ہوتا ہے۔ لیکن اہلِ علم اس کے مظاہر میں فرق کرتے ہیں۔ کسی کی عظمتوں کے جلال وتصور سے جو لرزش اور کپکپی طاری ہوتی ہے وہ رہبت ہے اور کسی صاحب عظمت وجلال کے قہر وغضب سے بچنے اس کے مقرر کردہ حدود کی مخالفت سے احتراز اور اس کے احکام وآیات کی خلاف ورزی سے اجتناب واحتیاط کی جو بے چینی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اور جو خلوت وجلوت ہر جگہ آدمی کو بیدار اور چوکنا رکھتی ہے وہ تقویٰ ہے۔ دونوں آیتوں میں ان دونوں لفظوں کا استعمال جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار نے بنی اسرائیل کو اپنے احسانات کا احساس دلا کر اور ان سے لئے ہوئے عہد وپیمان کی یاد دلا کر اور اپنی ذات کی عظمت وجلال سے ان کے دلوں میں ایک ایسی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے ان کے دل لرز اٹھیں اور پھر ان کو ایمان کی دعوت دے کر اور جن کمزوریوں کا وہ شکار ہیں، ان کی نشاندہی کر کے ان کے انجام سے انہیں آگاہ کیا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک ایسی ہولناک صورتحال سے انہیں دوچار ہونا پڑے گا، جس کی فکرمندی اگر آج پیدا کر لی جائے تو ہر اٹھا ہوا غلط قدم رک سکتا ہے۔ ورنہ اللہ کے غضب سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہوگی۔ یہ انجام کی فکر ہی ہے جو انسان کو اللہ کے غضب سے بچا سکتی ہے اور اگر یہ فکر پیدا نہیں ہوتی اور اللہ کا غضب محض ایک مفروضہ بن کے رہ جاتا ہے، تو پھر زوال کی شکار امتوں کے اصحابِ علم ودانش بھی اپنے علم سے قوموں کی رہنمائی کا کام نہیں بلکہ قوموں کے بگاڑ کا کام لیتے ہیں۔ یہود چونکہ اسی زوال کا شکار ہو چکے تھے اس لئے ان کا اخلاقی زوال اسی انتہاء کو چھو رہا تھا جس کا ذکر اگلی آیتِ کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O (البقرۃ: ۴۲)

(اور حق اور باطل کو گڈمڈ نہ کرو اور حق کو نہ چھپاؤ دراں حالیکہ تم جانتے ہو)

لا تلبسوا الحق بالباطل کا مفہوم

لا تلبسوا ۔ لبس سے ہے۔ یہ لفظ مختلف معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن تمام معانی میں ایک تشابہ اور مناسبت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً لَبِسَ الثَّوْبَ کا معنی ہے ''اس نے کپڑا پہن لیا۔'' لبس الامرُ عَلَيه کا معنی ہے ''اس نے معاملہ کو گڈمڈ کر دیا''۔ کبھی اس کا معنی ہوتا ہے ''ایک دوسرے سے ٹکرا دینا''۔ جیسے قرآنِ کریم میں ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ
تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا

(کہہ دیجئے! وہ اللہ قادر ہے اس بات پر کہ بھیجے تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے یا تمہارے نیچے سے یا تمہیں گروہ در گروہ کر کے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا دے) (الانعام ۶:۶۵)

Marfat.com

اسی طرح لبس الشی بالشی کے معنی ہوتے ہیں "ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ خلط ملط اور گڈمڈ کر دیا" یہاں بھی اس کا یہی مفہوم ہے کہ تم حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط اور گڈمڈ نہ کرو۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ کے دین میں ان کی یہ جسارت ان کے اسی رویئے کا تسلسل تھا جس کا ذکر سابقہ آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے۔ صاحبِ تفہیم قرآن نے اس کا جو مفہوم بیان کیا ہے ہم افادۂ عام کیلئے اس کو نقل کرتے ہیں:

(اس آیت کو سمجھنے کیلئے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ اہلِ عرب بالعموم ناخواندہ لوگ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے بھی تعلیم کا چرچا زیادہ تھا اور انفرادی طور پر ان میں ایسے ایسے جلیل القدر عالم پائے جاتے تھے، جن کی شہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے عربوں پر یہودیوں کا علمی رعب بہت زیادہ تھا۔ پھر ان کے علماء اور مشائخ نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان جما کر اور اپنی جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا کاروبار چلا کر اس رعب کو اور بھی زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اہلِ مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے۔ کیونکہ ان کے آس پاس بڑے بڑے یہودی قبائل آباد تھے۔ رات دن کا ان سے میل جول تھا اور اس میل جول میں وہ ان سے اسی طرح شدت کے ساتھ متاثر تھے جس طرح ایک ان پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدن اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ان حالات میں جب نبی کریم ﷺ نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی، تو قدرتی بات تھی کہ ان پڑھ عرب اہلِ کتاب یہودیوں سے جا کر پوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں اور ایک کتاب کو مانتے ہیں۔ آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو ہمارے اندر نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھے ہیں، ان کے متعلق اور ان کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے چنانچہ یہ سوال مکے کے لوگوں نے بھی یہودیوں سے بارہا کیا اور جب نبی کریم ﷺ مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہودی علماء کے پاس جا جا کر یہی بات پوچھتے تھے۔ مگر ان علماء نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لئے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ توحید جو محمد ﷺ پیش کر رہے ہیں غلط ہے یا انبیاء اور کتب آسمانی اور ملائکہ اور آخرت کے بارے میں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس میں کوئی غلطی ہے یا وہ اخلاقی اصول جن کی آپ تعلیم دے رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز غلط ہے۔ لیکن وہ صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کرنے کیلئے بھی تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ وہ نہ سچائی کی کھلی کھلی تردید کر سکتے تھے، نہ سیدھی طرح سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ہر سائل کے دل میں نبی کریم ﷺ کے خلاف، آپ کی جماعت کے خلاف اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے۔ کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے تھے۔ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ شکوک وشبہات میں پڑ جائیں اور طرح طرح کی الجھن میں ڈالنے والے سوالات چھیڑ دیتے تھے تاکہ لوگ ان میں خود بھی الجھیں اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے پیروؤں کو بھی الجھن میں ڈالنے کی کوشش کریں۔ ان کا یہی رویہ تھا جس کی بناء پر ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو، اپنے جھوٹے پروپیگنڈے اور شریرانہ شبہات واعتراضات سے حق کو دبانے اور چھپانے کی کوشش نہ کرو اور حق وباطل کو خلط ملط کر کے دنیا کو دھوکا نہ دو)

Marfat.com

آیت کے آخر میں وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (حالانکہ تم جانتے ہو) ارشاد فرما کر ان کے خبث باطن پر ضرب لگائی ہے اور ان کی کتمان کی عادت پر یوں گرفت کی ہے کہ تمہیں خوب معلوم ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری کتابوں میں نبی کریم ﷺ کی صفات موجود ہیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے کس طرح آسمانی کتابوں میں قلم کاریاں کی ہیں اور تحریف اور ترمیم کی [illegible] حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی، ان کی قربان گاہ اور مکہ کی سرزمین سے ان کا تعلق بیت اللہ کی تعمیر اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وہاں بسانا [illegible] ان کا تعلق ختم کرنے کیلئے کیا کیا تبدیلیاں کی تھیں۔ لیکن بے شمار [illegible] وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کہہ کر ان کے ضمیر کے اوپر ٹھوکا لگائی ہے کہ اگر ان کے ضمیر میں بھی زندگی ہے تو شاید وہ [illegible] اللہ [illegible] لوٹ آئیں۔

اس کے بعد [illegible] جس سے ان کے اللہ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کی یاد دہانی [illegible] آیت [illegible] ارشاد فرمایا:

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ۝ (البقرۃ:۴۳)

(اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو)

اس آیت کریمہ میں تین حکم دیئے گئے ہیں۔ (۱) اقامت صلوٰۃ (۲) ایتاءِ زکوٰۃ (۳) رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع۔ جہاں تک پہلے دو حکموں کا تعلق ہے ان کا ذکر ہم سورۃ فاتحہ کے درس میں تفصیل سے کر چکے ہیں۔ جہاں تک تیسرے حکم کا تعلق ہے [illegible] رکوع کے معنی تو ہوتے ہیں [illegible] کی طرف جھک جانے، تواضع ظاہر کرنے اور فقر و غربت سے [illegible] نماز ہوتی ہے لیکن یہاں چونکہ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ کا لفظ بھی ساتھ آیا ہے [illegible] بلکہ مزید بھی چند باتوں کی طرف اشارہ مفہوم ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ذہن میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے تمہارے آباؤ اجداد سے جو عہد لیا تھا اور جس عہد کے تم بھی پابند ہو اس کے اہم ارکان نماز اور زکوٰۃ ہی تھے۔ سورۃ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے اس عہد کا ذکر فرمایا ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ الخ

(اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان پر بارہ نقیب مقرر کئے اور اللہ نے فرمایا میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی)

اس عہد میں ملاحظہ کیجئے کہ اس عہد کے دو بنیادی ستون نماز اور زکوٰۃ ہیں۔ انہی دونوں کا دوبارہ حکم دے کر بنی اسرائیل سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہارے پاس محمد رسول اللہ ﷺ جو دعوت لے کر آئے ہیں اس میں کوئی نئی بات نہیں بنیادی اعتقادات بھی وہی ہیں اور بنیادی عبادات بھی وہی ہیں۔ تم آخر کس بنیاد پر اس دعوت کا انکار کر رہے ہو۔ اس وقت بھی تمہیں نماز اور زکوٰۃ ہی کا حکم دیا گیا تھا اور اب بھی تمہیں یہی حکم دیا جا رہا ہے۔ مزید یہ فرمایا گیا کہ اس وقت بھی تمہاری قومی شیرازہ بندی اسی نماز کے ذریعے کی گئی تھی اور اب بھی تمہاری شیرازہ بندی کیلئے

Marfat.com

تمہاری گم گشتہ متاع کو دوبارہ تمہارے حوالے کیا جارہا ہے۔ آج تم نے اپنی سیرت و کردار کی بنیاد اور جماعتی شیرازہ بندی کا تانا بانا مفادات اور ہوس کے عوامل سے تیار کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم سیرت و کردار کی ہر خوبی اور اجتماعی زندگی کی ہر آورش سے محروم ہو گئے ہو۔ اگر تمہیں اپنے آپ سے کچھ بھی ہمدردی ہے تو دوبارہ اسی نسخۂ شفا کی طرف پلٹو جس نے تمہیں پہلے شفا بخشی تھی کیونکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تمام تر دارومدار اللہ سے تعلق درست ہونے اور بندوں سے تعلق کے صحیح ہونے پر ہے اور یہ دونوں تعلق نماز اور زکوٰۃ سے درست ہوتے ہیں اور پھر جماعتی شیرازہ بندی نماز باجماعت سے پیدا ہوتی ہے اسی سے حاکم اور محکوم کا فرق مٹتا ہے اور امیر اور غریب اور مختلف طبقات کا تفاوت ختم ہوتا ہے اور جب یہ اساسی رشتے ٹوٹنے لگتے ہیں تو جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اور جماعت اور قوم کے افراد اخلاقی صفات سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اقامت الصلوٰۃ اور ایتاء الزکوٰۃ کا حکم یہود کیلئے

دوسری بات ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تین باتیں جو ارشاد فرمائی گئی ہیں یہ بنی اسرائیل کیلئے تعریض کا پہلو بھی رکھتی ہے۔ انہیں شرم دلائی جارہی ہے کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو جو نبوت دی تو سب سے پہلا حکم نماز ہی کے بارے میں تھا۔ سورۃ طٰہٰ آیت نمبر ۱۴ میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اللہ نے کوہِ طور پر موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ○

(میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں اور نماز کو قائم کرو میری یاد کیلئے) (طٰہٰ:۱۴)

یہ پہلا حکم ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا پھر اسی نماز باجماعت کو جماعتی شیرازہ بندی کا ذریعہ بنانے کا حکم دیا گیا تھا۔ سورۃ یونس آیت نمبر ۸۷ میں ارشاد فرمایا:

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ

(اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ تم اپنی قوم کیلئے مصر میں گھر مقرر کرلو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو) (یونس)

لیکن بنی اسرائیل نے ان احکامات کا جو حشر کیا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مذہبی صحیفوں سے نماز کا ذکر تک ختم کر ڈالا۔ ایک اہلِ علم کی تحقیق کے مطابق یہود زیادہ سے زیادہ سال میں صرف ایک مرتبہ سجدہ کرنا واجب سمجھتے تھے اور اس کیلئے بھی ان کے علماء نے اجازت دے رکھی تھی کہ اگر کوئی شخص کھڑے کھڑے کسی دیوار یا کھمبے پر اپنی پیشانی رکھ دے تو ادائے فرض کیلئے یہ بھی کافی ہے اور رکوع کا تصور تو انہوں نے اپنی عبادات سے بالکل ختم کر ڈالا۔ یہاں شائد اسی لئے خاص طور پر رکوع کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ عجیب حادثہ یہ ہے کہ یہود کے ایک فرقے کا خیال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نماز کا سرے سے حکم ہی نہیں دیا تھا یہ محض بعد والوں کی بدعت ہے۔ قرآن کریم نے شاید اسی لئے بنی اسرائیل کے زوال کے سلسلے میں ان کی بداعمالیوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جس کا ذکر سب سے پہلے فرمایا وہ نماز کا ضائع کر دینا ہے۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ ''پھر ان کے بعد ان کے نالائق جانشین آئے جنہوں نے نماز ضائع کر دی''۔

Marfat.com

جہاں تک زکوٰۃ کے حکم کا تعلق ہے اس کا یہود نے اگرچہ انکار تو نہیں کیا، لیکن ان کے علماء اور کاہنوں نے اس کا مصرف فقرا و مساکین کے بجائے اپنے آپ کو قرار دے دیا۔ چنانچہ کتاب احبار جس میں کاہنوں کے حقوق و فرائض اور نذر اور قربانیوں وغیرہ کا ذکر ہے فقرا اور مساکین کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ پیداوار کے عشر، پہلوٹی کے فدیے اور ہر قسم کی نذریں اس میں کاہنوں کیلئے مخصوص کر دی گئی ہیں اور اس طرح زکوٰۃ کے اصلی حقدار فقرا اور غربا کی بجائے علماء اور کاہن بن کے رہ گئے۔ یعنی ان کے علماء کو دنیا کی حرص و آز نے اس حد تک اندھا کر دیا کہ شرعی احکام کو بھی انہوں نے اپنی حرص کا ذریعہ بنا لیا۔ زکوٰۃ اور نذر و نیاز جو سراسر غریبوں کی غربت دور کرنے کیلئے مشروع کئے گئے تھے۔ وہ بھی انہوں نے پیٹ کا جہنم بھرنے کیلئے اپنے لئے خاص کر لئے۔

علماء سوء کتنے بھی حق سے دور چلے جائیں اور کیسے ہی دنیا کے حریص ہو جائیں وہ اپنا لبادہ کبھی نہیں اترنے دیتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی تمام تر دولت کا سرچشمہ جاہل عوام ہیں۔ وہ انہیں مذہب کا حقیقی خادم اور خدا رسیدہ جان کر ان کی خدمت میں نذرانے پیش کرتے ہیں اور پھر اپنے لئے دعاؤں کے طالب ہوتے ہیں۔ اس لئے جب بھی یہ لوگ عوام کے سامنے آتے ہیں، تو ہمیشہ مذہب نیکی اور بھلائی کی باتیں کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے شکار ان کے ہاتھوں سے نکلنے نہ پائیں اور ان کی فتوحات میں کمی نہ آنے پائے۔ اگلی آیتِ کریمہ میں ان کے اسی فریب کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(کیا تم لوگوں کو وفاداری کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم سمجھتے نہیں) (البقرۃ۔۴۴)

اَلْبِرُّ کا مفہوم

اس آیت کریمہ میں البر کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ "اے علمائے یہود! تم لوگوں کو تو بِرٌّ کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو"۔ بر کا ترجمہ عام طور پر "نیکی" سے کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں جس طرح علماء یہود پر گرفت ہو رہی ہے اور ان کے اس گناہ کو قومی جرم کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے البر کا ترجمہ نیکی کرنا مفہوم کو واضح کرنے کیلئے کفایت نہیں کرتا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کی جو وضاحت صاحب تدبر قرآن نے کی ہے وہ مفہوم کی وضاحت میں زیادہ موثر معلوم ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"بِرّ: بر کا لفظ عربی زبان میں ایفائے عہد، وفاداری اور ادائے حقوق کے معنی میں آتا ہے۔ حقوق میں ہر قسم کے حقوق شامل ہیں، بنیادی اور حقیقی بھی۔ مثلاً اللہ کی فرمانبرداری، والدین کی اطاعت اور خلق کے ساتھ ہمدردی۔ پھر آگے چل کر اس میں وہ حقوق بھی شامل ہو جاتے ہیں جو قول و قرار اور معاہدات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے لفظ احسان نیکی کی تمام قسموں پر حاوی ہے اور عدل کا بھی ہم معنی ہے۔ اپنے استعمالات کے لحاظ سے یہ لفظ اثم (حق تلفی) عقوق (والدین کی نافرمانی) غدر (بے وفائی) اور ظلم کا ضد ہے۔ بَرٌّ اور بَارٌّ اس سے صفت کے صیغے میں استعمال ہیں۔ مثلاً کہیں گے۔ بَرٌّ بِوَالِدِہٖ "وہ اپنے باپ کا فرمانبردار ہے"۔ بر بالقسم کے معنی ہیں "اس نے اپنی قسم پوری کی"۔

Marfat.com

قرآن مجید میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں وارد ہے:

وَكَانَ تَقِيًّا ٥ وَّبَرًّا ۢ بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا (مریم: ۱۳، ۱۴)

(وہ پرہیز گار اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا)

دوسری جگہ فرمایا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ (آل عمران: ۹۲)

(تم اللہ کی فرمانبرداری کا حقیقی درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو)

اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ہے:

اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ٥ (طور: ۲۸) (بے شک وہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والا اور مہربان ہے)

نیز فرمایا ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ (۲. مائدہ)

(اور تعاون کرو ایفائے حقوق اور تقویٰ کے کاموں میں اور نہ تعاون کرو حق تلفی اور تعدی کے کاموں میں)

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ بر کا لفظ ایک پہلو سے نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں پر مشتمل ہے۔ لیکن اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے یہ حقوق اور فرائض کے ایفا کیلئے آتا ہے۔

اس آیت کے مخاطب یہود کے علماء اور اکابر ہیں۔ آخر کا ٹکڑا اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ''اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو''، ہمارے اس خیال کی نہایت واضح طور پر تائید کر رہا ہے۔ ان علما اور اکابر کو مخاطب کر کے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ تم عوام کو تو بڑے زوروں سے حقوق اور فرائض ادا کرنے کی تلقین کرتے ہو، لیکن یہ تلقین کرتے وقت اپنے آپ کو بالکل بھول جاتے ہو۔ لوگوں کو تو نصیحت کرتے ہو کہ اپنے مال تمہارے حوالہ کریں لیکن خود تمہارے اوپر خدا کے اور غریبوں کے جو حقوق ہیں ان کا خیال تمہیں کبھی نہیں آتا، بلکہ تم لوگوں کا دیا ہوا مال ہڑپ کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ تم نے دوسروں پر تو اپنی اطاعت پوری سطوت کے ساتھ واجب کر رکھی ہیں، یہاں تک کہ تم ان کے رب بن بیٹھے ہو، لیکن خود اللہ کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری سے بالکل آزاد ہو، نماز اور زکوٰۃ کو ضائع کر کے تم نے پورے دین کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ علمائے یہود کی اس حالت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی نہایت بلیغ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:۔

''اس نے کہا اے شرع کے عالمو! تم پر بھی افسوس کہ تم ایسے بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے، آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے۔'' (لوقا ۱۱۔۴۷)

غور کیجئے، انجیل کے ان الفاظ اور قرآن مجید کے مذکورہ بالا الفاظ میں کتنی مطابقت ہے!

Marfat.com

آیت کے آخر میں فرمایا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ''کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے''۔ یعنی اگر تم مذہب کی حقیقت اور روح سے بالکل بے بہرہ ہو گئے ہو اور حبِّ دنیا اور حبِّ جاہ نے تمہارے اندر سے اخلاقی صفات نکال دی ہیں، تو تمہارے سروں میں عقل تو ہے۔ تم اگر کتاب سے کام نہیں لیتے تو عقل سے پوچھ کر دیکھ لو کہ جس قوم کے اہلِ علم، اہلِ دانش اور مذہبی رہنماؤں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ جن باتوں کا لوگوں کو حکم دیں اور جن باتوں کی افادیت صداقت اور اہمیت پر زور دیں اور خود ان کی زندگی کا عمل اس کے یکسر خلاف ہو اور ان کے قول و عمل میں تضاد واقع ہو جائے اور وہ اپنی زندگی کیلئے الگ جزیرے بنا کر بیٹھ جائیں تو اس قوم کے شیرازے کو بکھرنے سے کون روک سکتا ہے۔ یعنی مذہب کو تو ایک طرف رہنے دیجئے، اگر تم اپنی قوم کے معاملے میں تھوڑا سا بھی اخلاص رکھتے ہو اور تم اپنی قومی وحدت کے بارے میں اگر واقعی سنجیدہ ہو تو اپنی عقل سے پوچھو کہ تمہارا یہ رویہ آخر کیا نتائج پیدا کرے گا۔

اگلی آیت کریمہ میں آخری بات کے طور پر یہ ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ اگرچہ تمہارے اعمال میں تبدیلی کی امید بہت مشکل ہے لیکن اگر تمہارے کسی طبقے میں اس تبدیلی کی کچھ بھی خواہش ہو تو ہم تمہیں اس کا علاج بتا دیتے ہیں اگر تم اس پر عمل کرو تو تمہاری وہ کمزوریاں جن سے نکلنا تمہارے لئے مشکل ہو رہا ہے ان سے نکلنا تمہارے لئے آسان ہو جائے گا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

(اور مدد چاہو صبر اور نماز سے، اور بے شک یہ بھاری چیز ہے مگر ان لوگوں کیلئے جوڈرنے والے ہیں ۝ جو گمان رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) (البقرۃ: ۴۵ تا ۴۶)

عہدِ الٰہی کی پابندی کیلئے صبر اور نماز سے استعانت

بنی اسرائیل سے فرمایا جارہا ہے کہ اگر تم عہدِ الٰہی کو از سرِ نو استوار کرنا چاہتے ہو اور تمہارے لئے اس عہدِ الٰہی کی پابندی دشوار ہو رہی ہے اور تمہارے سرکش قلوب احکامِ الٰہی کی پابندیوں کو اپنے لئے دشوار محسوس کر رہے ہیں تو ہم تمہارے لئے ایک نسخہ تجویز کئے دے رہے ہیں جس پر عمل کرنے سے تمہارے لئے عہدِ الٰہی کی پابندیوں پر چلنا آسان ہو جائے گا۔ اس نسخہ کے دو اجزا ہیں ''صبر اور نماز''۔ اگر تم نماز پڑھنا شروع کر دو اور صبر کو زندگی کا معمول بنا لو تو تمہارے لیے اللہ کے احکام پر چلنا کوئی مشکل نہیں رہے گا۔ نماز اللہ کے ساتھ عہدِ وفا کو استوار کرتی اور دن میں پانچ دفعہ اس عہد کی تجدید کرتی ہے۔ اگر آدمی شعور کے ساتھ نماز کو اختیار کرے تو زندگی میں کوئی بھی باقی نہیں رہتی۔ موذن جب نماز کیلئے پکارتا ہے تو سب سے پہلے اللہ کی کبریائی کا حوالہ دیتا ہے اور نمازی جب نماز کا آغاز کرتا ہے تو اس کا آغاز بھی اللہ اکبر سے ہوتا ہے تو وہ ہاتھ اٹھا کر اس کی عظمت کو سلام کرتا ہے اور ہاتھ باندھ کر اس ذاتِ کبریا کے سامنے اپنی بندگی اور غلامی کا اقرار کرتا ہے پھر اس کے بعد اس غلامی کے جتنے طریقے ممکن ہیں وہ تمام کو بجا لاتا ہے کبھی اس کے حضور غلاموں کی طرح کھڑا ہوتا ہے، کبھی جھکتا ہے، کبھی غلاموں کی طرح بیٹھتا ہے اور بالآخر سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور زبان پر اسی ذاتِ کبریا جس کو وہ اپنا آقا مان چکا ہے کی تسبیح و تہلیل کے ترانے مچلتے ہیں اور دل اس کے تصور، اس کی محبت اور اس کی خشیت سے سرشار رہے۔ یہ عمل آدمی سے پانچ دفعہ کرایا جاتا ہے اور بنی اسرائیل سے بھی یقیناً ایسا ہی عمل بار بار کروایا جاتا تھا۔ ج

Marfat.com

آدمی اللہ کی آقائی اور اس کی حکمرانی اور اپنی غلامی اور محکومی کو بار بار اس طرح دہراتا اور شعور سے دہراتا ہے۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کرسکتا ہے یا وہ کسی اور کے سامنے سر جھکا سکتا ہے یا کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرسکتا ہے۔ یہ کمزوریاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب نماز کی حقیقت زندگیوں سے نکل جاتی ہے۔ بنی اسرائیل نے نماز سے رشتہ توڑا تو اللہ سے رشتہ ٹوٹ گیا اب کہاں کے حقوق وفرائض کہاں کی انسانیت اور کہاں زندگی کی وہ طہارت جو فکری پاکیزگی اور اخلاقی بالیدگی کی ضمانت ہوتی ہے۔ البتہ بعض دفعہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ انفرادی یا اجتماعی زندگی میں مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے اور مشکلات اگر واقعی سنگین ہوں اور آدمی کی ہمت کیلئے چیلنج بن جائیں تو بعض دفعہ اس کے سامنے کمزوری کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اس نسخۂ شفا کے دوسرے جز کے طور پر اس کا علاج صبر کے نام سے تجویز فرمایا۔ صبر کا لغوی معنی تو ''روکنا اور باندھنا'' ہے۔ لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشاتِ نفس کا وہ انضباط ہے، جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب وضمیر کے پسند کئے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے یہاں یہی بات فرمائی جارہی ہے کہ تم اپنے اندر مشکلات اور موانع پر قابو پانے کیلئے وہ اخلاقی صفت پیدا کرو جو نماز سے تمہارے اندر پیدا کرنا مقصود ہے۔ اگر تم پر خواہشات کا غلبہ ہو یا وقت کی قوتیں تمہیں جھکانا چاہیں یا نفسانی ترغیبات تمہیں زیر کرنا چاہیں تو ان پر قابو پانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے ارادے کو مضبوطی سے باندھو اور اپنی قوت کو مجتمع کرو اور یہ فیصلہ کرلو کہ میں ٹوٹ سکتا ہوں، لیکن جھک نہیں سکتا۔ میں پیٹ پر پتھر باندھ سکتا ہوں، لیکن حرام لقمہ پیٹ میں نہیں ڈال سکتا۔ میں سر کٹوا سکتا ہوں، لیکن غیر اللہ کے سامنے جھکا نہیں سکتا۔ اس ارادے کی توانائی کیلئے نماز کے ذریعے اللہ سے مدد مانگو۔ وہی دلوں کو قوت دینے والا اور وہی دلوں کو پاکیزگی عطا کرنے والا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کا یہی معمول تھا۔ کوئی مشکل پیش آتی تو فوراً نماز کی طرف متوجہ ہوتے کوئی دشمن ان کو چیلنج کرتا تو اس کا سامنا کرنے کا فیصلہ کرتے لیکن مدد اللہ سے مانگتے۔ کوئی صدمہ پیش آتا تو فوراً زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون اور حسبنا اللہ وغیرہ کلمات جاری ہوجاتے۔ اس میں اپنے عزم بالجزم کا اظہار بھی ہے اور اللہ سے مدد کی طلب بھی ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مجموعۂ مضامین میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ یونیورسٹی کے ایک نہایت ہونہار اور نیک نام طالب علم کا انتقال ہوگیا۔ سب کو نہایت صدمہ پہنچا ان کے گھر اطلاع کی گئی والد آئے، تکفین وتدفین کے بعد جب روانگی کا وقت آیا تو باپ نے اپنے ہاتھ سے بیٹے کا سامان باندھا خود سامان اٹھایا لڑکے ساتھ ٹرین میں انہیں چھوڑنے کیلئے گئے انہوں نے واپس آکر بتایا کہ ٹرین کے سفر میں مرحوم لڑکے کے والد اپنے بیٹے کے بستر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور اللہ کا ذکر کرتے رہے۔ لیکن جب طبیعت بے قابو ہونے لگتی تو نماز کیلئے نیت باندھ کر کھڑے ہوجاتے پھر بستر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے لیکن غم کی شدت جب حد سے بڑھنے لگتی تو پھر نماز کیلئے کھڑے ہوجاتے اس طرح سے انہوں نے پورا سفر طے کیا جو نماز اور صبر سے مدد طلب کرنے کی بہترین مثال ہے۔

اہلِ کتاب کو یہی طریقہ سکھایا گیا کہ تم اس طریقے سے عہدِ الٰہی کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو دوبارہ استوار کرسکتے ہو۔ لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ یہ آسان نہیں مشکل ہے۔ صرف ان لوگوں کے لئے آسان ہے جو خشوع کرنے والے ہیں۔ اس میں پہلا سوال تو یہ ہے کہ انها کی ضمیر کا مرجع کیا ہے۔ بعض اہلِ علم کی رائے ہے کہ اس کا مرجع صلوٰۃ ہے یعنی نماز آسان نہیں مشکل ہے۔ لیکن بعض دیگر اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس کا مرجع نماز اور صبر سے استعانت ہے۔ یعنی اپنی زندگی میں تبدیلی لانے اور عہدِ الٰہی سے استواری پیدا کرنے کیلئے تمہیں نماز اور صبر سے مدد طلب کرنی چاہئے۔ لیکن یہ آسان نہیں، ایک مشکل پراسس (Process) ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے آسان ہے، جن کے اندر خشوع پایا

Marfat.com

جاتا ہے۔خشوع اصل میں اس قلبی سکون اور انکساری کو کہتے ہیں جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں دل بھی جھک جاتا ہے اور اعضاء و جوارح بھی اپنی سرکشی چھوڑ دیتے ہیں۔ جب تک کسی شخص میں یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی وہ نہ نماز کی طرف متوجہ ہوسکتا ہے اور نہ نماز اور صبر سے مدد لے سکتا ہے۔ پروردگار نے دوسری آیتِ کریمہ میں خاشعین کی قلبی کیفیت کو خود ایسی تعبیر دے دی ہے، جس سے خاشعین کی تعریف متعین کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ ایک نہ ایک دن اللہ کے سامنے جواب دہی کیلئے پیش کیے جائیں گے۔ انہیں بہر صورت اپنے رب سے ملنا ہے اور ان کی زندگی کی آخری منزل مکمل فنا نہیں بلکہ اللہ کے حضور حاضری ہے۔ زندگی کا سفر نہ بے جہت ہے نہ منزل سے بے گانہ اس زندگی کی انتہا قیامت ہے اور قیامت کے بعد اللہ کے سامنے پیشی ہے اور پھر اس کا نتیجہ جزا اور سزا کا ترتب ہے۔

ظن کا مفہوم

لیکن یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ آیت میں یظنون کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے ''وہ گمان کرتے ہیں''۔ لیکن اہلِ لغت ہمیں بتاتے ہیں کہ ظن کا لفظ گمان کیلئے خاص نہیں بلکہ اس لفظ کی خوبی یہ ہے کہ یہ اندیشہ اور گمانِ غالب سے لے کر یقین اور قطعیت کے ہر درجہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ آدمی کے دل کی کیفیت ایسی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی صداقت کیلئے پہلے ہی مرحلہ میں یقین سے ہمکنار نہیں ہو جاتا بلکہ شروع میں وہ گمان کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور پھر یہ گمان بڑھتے بڑھتے یقین تک پہنچتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے ایک ایسا لفظ استعمال کیا ہے جو قلب کی تمام کیفیتوں پر حاوی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ
نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ

Marfat.com

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ
اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ
وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ
اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ
فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ
اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ
حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾
ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا
عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ
طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ
شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ
خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا
غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ
السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

Marfat.com

رکوع ٦۔ (اے بنی اسرائیل! میرے اس احسان کو یاد کرو جو میں نے تم پر بطور انعام کیا اور اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں دنیا والوں پر فضیلت دی۔ اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی۔ نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی، نہ ان سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔ اور وہ وقت یاد کرو! جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی تھی۔ جو تمہیں برے عذاب چکھاتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔ اور (وہ وقت یاد کرو!) جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھاڑ دیا، پھر ہم نے تمہیں نجات دے دی، اور آلِ فرعون کو ہم نے غرق کر دیا، دراں حالیکہ تم دیکھ رہے تھے۔ اور یاد کرو! جب کہ ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا، پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظلم کرنے والے تھے ○ پھر ہم نے تم سے درگزر کیا اس کے بعد، تا کہ تم شکر گزار بنو۔ اور یاد کرو! جب کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور فرقان دیا تا کہ تم ہدایت حاصل کرو۔ اور یاد کرو! جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ پس تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو اور اپنی جانوں کو قتل کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک۔ پھر اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور یاد کرو! جب کہ تم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز تمہارا یقین کرنے والے نہیں، جب تک ہم خدا کو اعلانیہ دیکھ نہ لیں۔ تو تم کو کڑک نے آ پکڑا اور تم دیکھتے رہ گئے، پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا تا کہ تم شکر گزار بنو۔ اور تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارے، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں اور انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ اور یاد کرو! جب ہم نے کہا کہ داخل ہو جاؤ اس بستی میں، پس کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو فراغت کے ساتھ، اور داخل ہو بستی کے دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور کہتے جاؤ حِطَّةٌ حِطَّةٌ ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے اور خوب کاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے ○ تو ظالموں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے۔ پس ہم نے اتارا ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا تھا آسمان سے عذاب، یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی جو وہ کر رہے تھے) (آیت ٤٧ تا ٥٩)

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○

(اے بنی اسرائیل! میرے اس احسان کو یاد کرو جو میں نے تم پر بطور انعام کیا اور اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں دنیا والوں پر فضیلت دی) (البقرۃ:٤٧)

سابقہ رکوع کے آغاز میں بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا گیا ہے۔ اب بارے دِگر اسی انداز میں خطاب فرمایا جا رہا ہے۔ اس پر غور کرنے سے کئی باتیں کھلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

Marfat.com

ا۔ جو ذات یا جو گروہ بہت عزیز ہو جب اس کے اندر بگاڑ پیدا ہو تو اس کا چاہنے والا اس کے بگاڑ کو سب سے زیادہ محسوس کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اسے نہایت پیار اور محبت سے دوبارہ راہِ راست پر لایا جائے۔ چنانچہ وہ نہایت محبت بھرے انداز میں اسے بار بار پکارتا ہے اس کی غلطیوں پر متنبہ کرتا ہے اور اس کا اصلی مقام یاد دلا کر اسے اپنی اصلاح کی دعوت دیتا ہے۔ کسی کا بیٹا بگڑ جائے تو باپ اور بیٹے میں جو حقیقی محبت کا رشتہ ہے اس رشتے کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے باپ اپنے بیٹے کے بگاڑ کو سب سے زیادہ محسوس کرتا ہے۔ وہ طریقے طریقے سے اسے نصیحت کر کے راہِ راست پر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ نصیحت کرتے ہوئے بار بار بیٹا بیٹا کہہ کر اپنے بیٹے کو پکارتا ہے۔ تاکہ بیٹے کو اس بات کی شرم محسوس ہو کہ جو باپ مجھے بیٹا بیٹا کہتے ہوئے نہیں تھکتا میں اس کی نصیحت کو نظر انداز کرتے ہوئے شرم محسوس کیوں نہیں کرتا۔ اللہ کا کوئی بیٹا نہیں، لیکن جن پر اس کی عنایت کی نظر ہوتی ہے وہ ان سے معاملہ ایسا ہی کرتا ہے جیسے کوئی چاہنے والا اپنے پسند کے لوگوں سے کیا کرتا ہے۔

۲۔ بنی اسرائیل کے لفظ سے خطاب کر کے یہ تصور دینا بھی معلوم ہوتا ہے کہ اے لوگو! تم یاد کرو کہ تم کس کی اولاد ہو۔ تم اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہو جو اللہ کے نبی اور حضرت اسحٰق اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی وراثت کے امین تھے۔ انہیں دنیا کی ہدایت کیلئے مبعوث کیا گیا یہی ان کا مقصدِ زندگی تھا اور یہی ان کا منصبی فریضہ تھا۔ تم اگر واقعی جائز طور پر بنی اسرائیل کہلاتے ہو تو تمہیں سوچنا چاہیے ۔

باپ کا علم اگر بیٹے کو نہ ازبر ہو
تو پھر پسر لائقِ میراثِ پدر کیوں کر ہو

تم نے جو طرزِ عمل اختیار کر لیا ہے، جو طور اطوار اپنا لئے ہیں۔ زندگی میں جو ترجیحات طے کر لی ہیں، دنیا کو مقصود بنا کر جس طرح آخرت کو فراموش کر دیا ہے اور اللہ کے نبیوں کی تعلیمات اور اللہ کی کتابوں کو پس پشت ڈال چکے ہو۔ کیا حضرت یعقوب کی اولاد ہونے کا یہی تقاضا ہے؟ تمہیں اگر اور کچھ یاد نہیں تو اپنی نسبتوں کو تو خوب یاد رکھتے ہو کاش ان نسبتوں کی حقیقت کو سمجھنے کی بھی کوشش کرو۔ اور یہ بھی جانو کہ ان نسبتوں کے تقاضے کیا ہیں۔

بنی اسرائیل کی فضیلت کی حقیقت

۳۔ سابقہ رکوع کے آغاز میں اپنے انعامات کی یاد دلائی تھی۔ لیکن انعامات کا ذکر نہیں فرمایا تھا۔ لیکن یہاں ان بے شمار انعامات میں سے سب سے پہلے اس انعام کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب انعامات سے افضل اور سب انعامات کی بنیاد ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ''یاد کرو میں نے تمہیں دنیا والوں پر فضیلت دی'' اس فضیلت سے مراد قوموں کی ہدایت اور رہنمائی کا وہ منصب ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک خاص دور میں منتخب فرمایا تھا۔ اس وقت کی دنیا اپنے پاس دنیا کی ہر نعمت رکھتی تھی۔ ریاستوں کی کمی تھی نہ حکومتوں کی، زمینیں آباد تھیں، زراعت ترقی پر تھی، ایک خاص حد تک صنعتیں رواں دواں تھیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں دولت کی ریل پیل تھی۔ لیکن ان کے پاس وہ نعمت نہیں تھی جو اللہ کی نعمتوں میں سب سے عظیم ہے۔ اس نعمت سے بنی اسرائیل کو نوازا گیا تھا۔ اپنی توحید کی علمبرداری اللہ نے ان کے سپرد کی تھی۔ نبوت کا چراغ ان کے گھروں میں جلتا تھا۔ زندگی گزارنے کا ضابطہ اور دنیا اور آخرت کی کامیابیوں کے اصول بنی اسرائیل کے سپرد کیے گئے تھے۔ وہ روشنی جس سے زندگی کی تاریکیاں دور ہوتی ہیں۔ اس روشنی کا امین بنی اسرائیل کو بنایا گیا تھا اور انہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ تم نور اور روشنی لے کر ہر اس جگہ پہنچو جہاں تاریکیوں کے ڈیرے ہیں۔ تم اپنے گرد و پیش کی انسانی دنیا کو اس کے خالق و مالک سے آگاہ کرو۔ انہیں بتاؤ کہ تمہارا

Marfat.com

Marfat.com

آپ اس کو چھوڑ دیجئے ۔ جیسے بعض دفعہ قاتل کو دیت ادا کر کے چھڑالیا جاتا ہے ۔ تو وہاں بھی پروردگار سے یہ پوچھ لیا جائے کہ ان گناہوں کا کیا معاوضہ ہوسکتا ہے چنانچہ جو معاوضہ طے ہوا سے ادا کر کے چھڑالیا جائے اور تیسری صورت یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے گناہوں کی پاداش میں پکڑا جائے تو اس کے مددگار اس کی مدد کیلئے پہنچ جائیں اور اپنی حمایت اور مدد کے زور سے اسے چھڑالیں ۔ کسی کے کام آنے کی یہی تینوں صورتیں ہیں ۔ اللہ فرماتا ہے وہاں یہ تینوں صورتیں ممکن نہیں ہوں گی ۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لینی چاہئے کہ اس اسلوبِ کلام سے بظاہر یہ بات مترشح ہو رہی ہے کہ شفاعت کرنے والے، معاوضہ ادا کرنے والے اور مدد کرنے والے اپنی سی کوشش کریں گے لیکن ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکے گی ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا ۔ وہاں سرے سے اللہ کے غضب کے سامنے نہ کوئی کسی کی سفارش کرسکے گا ، نہ مدد کو پہنچے گا نہ کوئی معاوضہ کا تصور کرسکے گا ۔ عربی زبان کا ایک اسلوب یہ ہے کہ اس میں بظاہر ایک شے کے لازم کی نفی ہوتی ہے لیکن مقصود درحقیقت ملزوم کی نفی ہوتی ہے ۔ یہاں بھی مقصود لازم کی نہیں بلکہ ملزوم کی نفی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے دوزخیوں کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ''نہ ہمارے کوئی سفارش کرنے والے ہیں اور نہ سرگرم دوست ۔'' یعنی ایسا نہیں کہ سفارش یا مدد قبول نہیں کی جائے گی بلکہ سرے سے کوئی سفارش کرنے والا اور کوئی مدد کو پہنچنے والا نہیں ہوگا ۔ جہاں تک معاوضہ دینے اور حمایت اور مدد سے چھڑالینے کا تعلق ہے ۔ اس کے بارے میں نہ بنی اسرائیل میں کوئی غلط فہمی تھی اور نہ امت اسلامیہ میں کوئی غلط فہمی ہے ۔

شفاعت کی حقیقت

البتہ شفاعت کے بارے میں بنی اسرائیل بھی بری طرح غلط فہمی کا شکار تھے اور اس امت کے بھی بہت سے افراد اس غلط فہمی کا شکار ہیں ۔ قرآنِ کریم اور سنت رسول ﷺ نے نفسِ شفاعت سے انکار نہیں کیا بلکہ نصوصِ قرآن وسنت سے اس کا اثبات ہوتا ہے ۔ البتہ اس کو مشروط ٹھہرایا گیا ہے ۔ وہ شرط یہ ہے کہ جہاں تک کافر، مشرک اور منافق کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو شفاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ جن لوگوں کا ایمان پر خاتمہ ہوا ہے لیکن نیکیوں میں کمی اور برائیوں میں زیادتیوں کے باعث اندیشہ ہے کہ انہیں جہنم میں بھیج دیا جائے ان کے بارے میں شفاعت کا امکان ظاہر کیا گیا ہے ۔ لیکن اس میں شرط یہ ٹھہرائی گئی ہے ۔ کہ جس کے بارے میں اللہ اجازت دیں گے اس کے بارے میں پیغمبر یا اللہ کے نیک بندے سفارش کریں گے ۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ بغیر اذن خداوندی کے جو چاہے اور جس کے بارے میں چاہے شفاعت کرنا شروع کردے ۔ حتیٰ کہ وہ پہلی شفاعت جسے شفاعت کبریٰ کہا گیا ہے ۔ وہ بھی اللہ کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں ہوگی ۔ میری اس سے مراد یہ ہے کہ جب تمام انسان میدانِ حشر میں حساب کتاب کے انتظار میں کھڑے ہوں گے اور منظر اتنا ہولناک ہوگا کہ ہر شخص نفسی نفسی پکار رہا ہوگا ۔ لوگ آخر اولوالعزم رسولوں کی طرف رجوع کریں گے کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ انسانوں کا حساب کتاب شروع کریں لیکن کوئی پیغمبر اور رسول بھی اس کی جرأت نہ کرسکے گا ۔ آخر میں لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جائیں گے ۔ حضور فرماتے ہیں کہ میں اجازت طلبی کیلئے سربسجدہ میں رکھ دوں گا اور اس وقت میں نہیں جانتا کہ میں کن کلمات سے اللہ کی حمد وثنا کروں گا اس وقت اللہ کی جانب سے وہ کلمات تحمید وتمجید میرے دل میں القاء کیے جائیں گے ۔ میں ان کلمات سے اللہ کو یاد کروں گا ، میں نہیں جانتا کتنا عرصہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز رہوں گا ۔ پھر آواز آئے گی ، ''محمد سر اٹھاؤ ، مانگو دیا جائے گا'' ۔ پھر میں عرض کروں گا ''یا اللہ! تیری مخلوق بے حد

Marfat.com

پریشانی میں ہے۔ حساب کتاب شروع کرنے کا حکم عطا فرمائیے"۔ اس شفاعت اور سفارش کے بعد اللہ تعالیٰ حساب کتاب شروع کرنے کا حکم دیں گے۔ بالکل اسی طرح جس کسی کے بارے میں بھی آنحضرت ﷺ یا اللہ کے نیک بندوں میں سے کوئی سفارش کرنا چاہے گا تو سب سے پہلے اللہ سے اجازت طلب کرے گا۔ اجازت ملے گی تو سفارش کرے گا ورنہ کوئی بھی سفارش کی جرأت نہ کر سکے گا اور اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اللہ کسی کو سزا دینا چاہے گا لیکن انبیائے کرام اور اولیائے عظام سفارش سے اسے چھڑالیں گے تو اس سے تو جزاوسزا کا پورا قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر بغیر کسی اصول اور بغیر اذنِ خداوندی کے سفارش سے کام چلنے لگے تو پھر ایمان وعمل کی کیا ضرورت ہے؟ یہی تو وہ تصور ہے جس نے ہمیشہ قوموں کو گمراہ کیا۔ اسی تصور نے بنی اسرائیل کو تباہ کیا اور اسی کے ہاتھوں ہم تباہ ہو رہے ہیں۔ بدعمل سے بدعمل آدمی اس سہارے اپنی بداعمالیاں جاری رکھتا ہے کہ ہم اللہ کے محبوب پیغمبر کی امت ہیں۔ اگر اللہ نے ہمارا مواخذہ کرنا چاہا بھی تو حضور یہ مواخذہ نہیں ہونے دیں گے تو شفاعت اور سفارش کا یہ تصور جو ہمارے ذہنوں میں ہے، قرآن وسنت کے بالکل برعکس ہے۔ اگر اسے قبول کر لیا جائے تو جیسے میں نے پہلے عرض کیا پوری شریعت تلپٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہم جب کسی کے پاس سفارش کیلئے جاتے ہیں تو سفارش کرنے والا دو تصورات لے کر جاتا ہے ایک تو یہ کہ جس کے پاس میں جا رہا ہوں وہ مقام ومرتبہ میں میرے برابر ہے یا مجھ سے فروتر ہے یا کم از کم میرا اس پر اتنا اثر ہے کہ وہ میری سفارش کو رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اللہ کریم کے بارے میں اگر کوئی ایسا تصور کرے کہ مخلوق میں سے بڑی سے بڑی مخلوق بھی اللہ کے برابر ہو سکتی ہے یا اس پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ تو یہ ایک ایسا کفر ہے جو معرفتِ خداوندی سے محرومی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ جس شخص کو اللہ کی ذات وصفات سے کچھ بھی آگاہی ہے وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ خالق ومخلوق برابر ہو سکتے ہیں۔ سفارش کے حوالے سے دوسرا تصور یہ ہے کہ سفارش کرنے والا جب کسی سزا دینے والے کے پاس سفارش کیلئے جاتا ہے تو وہ جا کر یہ کہتا ہے کہ آپ نے جس شخص کو سزا دی ہے یقیناً آپ نے اس کو مجرم سمجھ کر سزا دی ہے کیونکہ آپ کو اس کے بارے میں ایسی ہی اطلاعات دی گئی ہیں لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے وہ شخص بالکل بے گناہ ہے۔ آپ کو جو کچھ بتایا گیا وہ بالکل غلط ہے آپ چونکہ اس شخص کو خود نہیں جانتے آپ نے اطلاعات پر اعتبار کیا میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں تاکہ آپ کو یقین دلاؤں کہ میں ذاتی طور پر اسے جانتا ہوں وہ شخص ہرگز ایسا نہیں۔ اندازہ فرمائیے کیا اللہ تعالیٰ کسی شخص کے بارے میں بے خبر بھی ہو سکتے ہیں؟ جس ذاتِ خداوندی کے علم کا یہ حال ہے کہ وہ کائنات کے ان گوشوں سے بھی واقف ہے، جہاں تک کسی انسان کی رسائی نہیں اور جس کے علم کی وسعتوں کا حال یہ ہے کہ وہ انسان کے دل ودماغ میں آنے والے خیالات تک کو جانتا ہے۔ صحرا میں کوئی پتہ گرتا ہے تو وہ اسے دیکھتا ہے، سمندر کے نیچے کوئی مچھلی حرکت کرتی ہے، تو وہ اس کی آواز سنتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔ اس کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ کوئی سفارش کرنے والا جا کر اسے یہ کہے کہ آپ نے غلط اطلاعات پر اعتبار کر کے فلاں شخص کو جو سزا دی ہے وہ بالکل غلط ہے میں اس کے صحیح حالات سے آپ کو آگاہی دینے کیلئے آیا ہوں۔ اس لئے شفاعت کا یہ تصور تو اللہ کی ذات وصفات کے تصور کیلئے بالکل اجنبی بلکہ مخالف ہے۔ لیکن بنی اسرائیل ایسے ہی تصورات میں الجھے ہوئے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان کی پوری زندگی ایمان وعمل کے نور سے محروم ہو گئی تھی اور یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ وہ امت اسلامیہ جو قیامت تک کیلئے انسانی ہدایت کے عظیم منصب پر فائز کی گئی ہے، اس کی بھی بڑی تعداد اسی گمراہی کا شکار ہے۔ وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ ایمان وعمل کے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور توجہ دلانے پر اسی جاہلانہ تصور کا سہارا لیتے ہیں۔

Marfat.com

ان دونوں آیتوں پر ایک دفعہ پھر نظر ڈال لیجئے۔آپ محسوس کریں گے کہ بنی اسرائیل کو ان کی نسبتوں اوران کے منصب کے حوالے سے ان کا حقیقی مقام یاد دلایا گیا ہے اور پھر معا بعد وہ آخرت کے بارے میں جن گمراہیوں کا شکار ہو کر اپنی پوری زندگی کو داغ داغ کر چکے ہیں۔اس کی پوری تصویر ان کے سامنے کھینچ دی گئی ہے اور پھر انہیں دعوت دی گئی ہے کہ ذرا غور کرو تمہارا نشیمن کن بلندیوں پر تھا اور آج تم کن پستیوں میں گر گئے ہو۔یہ آخری امت بھی چونکہ انہی کے نقوش قدم پر چل رہی ہے،اس لئے ہمارے قومی شاعر نے جو قرآنِ کریم کا طالب علم ہے،بالکل اسی اسلوب پر اس امت کو بھی غیرت دلانے کی کوشش کی تھی۔

اس نے کہا تھا:۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

پھر آگے چل کر،اُمت کی حالت پر دل گرفتہ ہو کر کہتا ہے:۔

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

بس یہی بات بنی اسرائیل سے کہی جا رہی ہے اور حقیقت میں ہمیں سنائی جا رہی ہے۔اے کاش!ہم سننے کی کوشش کریں۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ (البقرۃ: ۴۹)

(اور وہ وقت یاد کرو!جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی تھی۔جو تمہیں برے عذاب چکھاتے تھے،تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی)

اس آیت کریمہ سے بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایسے نمایاں واقعات پیش کئے جا رہے ہیں،جس سے بنی اسرائیل کا بچہ بچہ واقف تھا۔اس لئے بجائے تفصیل بیان کرنے کے اشاروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔آنحضرت ﷺ کے ہم عصر بنی اسرائیل اگرچہ براہِ راست ان واقعات سے تعلق نہیں رکھتے تھے،لیکن وہ اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ پیش آنے والے ان واقعات کو نہ صرف تسلیم کرتے تھے بلکہ ان پر فخر بھی کرتے تھے۔اس لئے قرآنِ کریم نے ان واقعات کو اس طرح پیش کیا ہے گویا یہ انہیں کے ساتھ پیش آئے ہیں۔ان واقعات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بیسیوں احسانات کا ذکر فرمایا ہے اور ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کے رویے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ احسانات پر شکر ادا کرنے کی بجائے،عموماً ناشکری کرتے رہے۔ان میں اطاعت گزار لوگوں کا تناسب معصیت کار اور نافرمان لوگوں سے کم تھا۔انہوں نے ایک سے ایک بڑی ناشکری اور بدعملی کا ارتکاب کیا۔لیکن اللہ نے عموماً ان کے ساتھ رحمت کا سلوک فرمایا مگر جب یہ حد سے گزر جاتے رہے تو پھر اللہ کا عذاب بھی آیا۔بنی اسرائیل کی تاریخ تو حضرت یعقوب علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے،لیکن یہاں جن واقعات کا تذکرہ ہو رہا ہے،ان کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دَور سے ہے۔یہیں سے بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوتا ہے،جس کا تذکرہ تورات میں ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب بنی اسرائیل کو حاملِ دعوت امت ہونے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔چونکہ یہ تاریخ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے اس لئے سب سے پہلے ان واقعات کا ذکر کیا جا رہا ہے،جن کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ہے اور یہی دور مصائب کے لحاظ سے بنی اسرائیل کا بدترین دور بھی ہے۔

Marfat.com

آل کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں آلِ فرعون کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یوں تو یہ اہل کا مترادف ہے، لیکن اس میں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔ اس سے مراد صرف کسی کی اولاد نہیں ہوتی بلکہ یہ لفظ آل واولاد، قوم وقبیلہ اور اتباع وانصار پر بولا جاتا ہے۔ یہاں بھی مراد یہ ہے کہ معاملہ صرف فرعون اور اس کی اولاد تک نہ تھا بلکہ فرعون کی حکومت کے تمام اعوان وانصار فرعون سے خاندانی یا مذہبی تعلق رکھنے والے لوگ اور اہلِ مصر میں سے اس کے خیر خواہ یا مفاداتی رشتہ رکھنے والے سب لوگ مراد ہیں۔

فرعون سے مراد

اسی طرح فرعون کسی متعین بادشاہ کا ذاتی نام نہیں بلکہ یہ قدیم شاہانِ مصر کا عام لقب تھا۔ نام اس کا رعمسیس یا منفتاح تھا تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر بادشاہوں کے نام نہیں چلتے بلکہ وہ اپنے لقب سے پکارے جاتے ہیں، جس طرح ہمارے زمانہ میں ابھی کل تک جرمنی کے بادشاہ کو قیصر، روس کے تاجدار کو زار، اور ترکی کے فرماں روا کو سلطان کہتے تھے۔ مصر میں جب تک بادشاہت رہی والیٔ مصر کو سلطان یا خدیو کہا جاتا تھا۔ والیٔ دکن کو نظام کہتے تھے، اسی طرح یہ فرعون بھی جیسا کہ میں نے عرض کیا اس بادشاہ کا نام ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واسطہ پڑا۔ البتہ اب جدید تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جس کے گھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پلے بڑھے ہیں اس کا نام رعمسیس تھا۔ البتہ جس کے سامنے آپ دعوت لے کر گئے اور جس کے ساتھ آپ کی کشمکش جاری رہی اور جو بالآخر بحرِ قلزم کی موجوں کی نذر ہوا وہ اس فرعون کا بیٹا منفتاح تھا۔ قرآنِ کریم کی بلاغت کی داد دیجئے وہ تاریخ کی تحقیق کے درپے تو نہیں ہوتا کیونکہ وہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں البتہ ایسا لفظ استعمال کر جاتا ہے جس سے صحیح بات کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی قرآنِ کریم نے فرعون کا نام نہیں لیا بلکہ فرعون کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے مصر کا ہر بادشاہ مراد لیا جا سکتا ہے۔ اب اگر وہ ایک تھا تو بھی فرعون تھا اور اگر اس کی جگہ دوسرے نے لے لی اور اس سے حضرت موسیٰ کا واسطہ پڑا تو وہ بھی فرعون تھا اور یہ عمومی لفظ دونوں پر صادق آتا ہے۔

یَسُوْمُوْنَکُمْ کا مفہوم اور تفصیل

اس آیتِ کریمہ میں اپنے احسانات میں سے سب سے پہلا احسان یہ ذکر فرمایا ہے کہ آلِ فرعون تم پر بدترین مظالم ڈھا رہے تھے اور پھر ان مظالم کی تفصیل بیان کرنے کی بجائے صرف ایک ظلم کا ذکر کیا ہے۔ لیکن تاریخ اور تورات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل جو پیغمبروں کی اولاد تھے اور جنہوں نے مصر پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی طویل عرصے تک حکومت کی تھی۔ اس طرح سے وہ نہایت معزز لوگوں کی قوم تھے۔ لیکن اب آلِ فرعون کے ہاتھوں وہ اس حال کو پہنچ گئے تھے کہ گھروں سے لے کر بازاروں تک ہر طرح کی بیگار ان سے لی جاتی تھی۔ بنی اسرائیل کی عورتیں گھروں میں فرعونیوں کی خدمت کرتیں، گھروں کی صفائی کا کام کرتیں، برتن مانجھتیں اور بچوں کی دیکھ بھال کرتیں اور گھروں میں عموماً آنے جانے کے باعث ان کی عزت اور عفت ہر وقت ہوس کا ہدف بنی رہتی اور مرد دن بھر بیگار کرنے میں جتے رہتے۔ سخت سے سخت کام ان سے لئے جاتے۔ بعض دفعہ گھوڑوں اور بیلوں کی جگہ انہیں جوت

Marfat.com

لیا جاتا اور بڑی بڑی عمارتوں میں وہ اینٹیں اور پتھر اٹھانے کا کام کرتے، پہاڑوں سے پتھر توڑ توڑ کر لانے کا کام بھی انہیں سے لیا جاتا۔ ایک بدترین غلامی کا دور تھا جس سے یہ گزر رہے تھے۔ اسی کو قرآنِ کریم نے یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے تعبیر کیا ہے۔ ''سوم'' کسی پر سخت ترین بوجھ ڈالنے کو کہتے ہیں۔ ان پر ظلم سے لے کر محرومی تک ہر طرح کا بوجھ لدا ہوا تھا۔ البتہ ایک جان سلامت تھی سو وہ بھی سلامت نہ رہی۔

بچوں کے قتل کا سبب

کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرعون نے کوئی نہایت بھیانک خواب دیکھا، جس کی تعبیر اس دور کے تعبیر کے ماہرین نے یہ بتائی کہ عنقریب بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو بڑا ہو کر تیری حکومت کیلئے تباہی کا باعث بنے گا۔ اسی خواب کے باعث فرعون نے اس خطرے سے بچنے کیلئے یہ انتظام کیا کہ اگر لڑکی ہو تو اسے زندہ چھوڑ دیا جائے اور اگر لڑکا پیدا ہو تو اسے قتل کر دیا جائے یا دریا کے پانی میں بہا دیا جائے۔ لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ فیصلہ خواب کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ سراسر ایک سیاسی فیصلہ تھا۔ مصر کے قرب و جوار میں ایسے قبائل آباد تھے جو فرعون اور اس کی حکومت کے دشمن تھے۔ وہ آئے دن شورش برپا کرتے اور حکومت کا نظام تہس نہس کر دیتے۔ ادھر جب فرعون نے یہ محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کی آبادی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے اور مصر میں ان کی آبادی کا تناسب تشویش کی حد کو چھونے لگا ہے۔ تو اس نے عمائدین حکومت سے مشورہ کیا کہ اگر بنی اسرائیل کی آبادی اسی تیزی سے بڑھتی رہی اور انہوں نے اگر قبائل کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کر لیا تو یہ ہماری حکومت کیلئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ قبل از وقت اس کا سدِ باب کیا جائے۔ چنانچہ بچوں کے قتل کا یہ فیصلہ اسی خطرے کو روکنے کی ایک تدبیر تھی۔

قرآنِ کریم نے ان کے اس فیصلے کا ذکر کرتے ہوئے بیٹوں کیلئے فرمایا ہے: ''وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے'' بیٹوں کیلئے تو ''ابناء'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں بجائے ''بنات'' کا لفظ استعمال کرنے کے ''نساء'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے حالانکہ بیٹیوں کو بنات کہا جاتا ہے، نساء نہیں کہا جاتا۔ نساء تو جوان اور بڑی عمر کی عورتوں پر بولا جاتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں الفاظ کے انتخاب میں بنی اسرائیل کے جذبات کو چھیڑنا مقصود ہے تاکہ ان کے دلوں میں تشکر کے جذبات ابھریں۔ بیٹوں کا لفظ بول کر ان کے دلوں میں اولاد کی محبت کے جذبات پیدا کئے گئے تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ بیٹوں کا قتل محض انسانی المیہ نہیں تھا بلکہ وہ انتہائی سنگ دلی اور سفاکی کا مظہر بھی تھا۔ ظالم سے ظالم حکومتیں بھی بچوں پر ظلم کرنا کبھی پسند نہیں کرتیں اور انسانی احساسات کا حال یہ ہے کہ بڑی عمر کے لوگوں کے قتل ہونے پر انسانی احساسات اس قدر بے قابو نہیں ہوتے جتنے اولاد اور وہ بھی چھوٹی اولاد کے قتل پر بے قابو و ربرہم ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ اگر بیٹوں کے ساتھ بیٹیوں کے زندہ رکھنے کی بات کی جاتی تو اس سے تو ایک نیکی کا تاثر ابھرتا ہے کہ چلئے اگر وہ بیٹوں کو مارتے تھے تو بیٹیوں سے تو کوئی تعرض نہیں کرتے تھے۔ لیکن نساء کا لفظ کہہ کر ان کی شقاوت کو ہی نمایاں نہیں کیا گیا بلکہ بنی اسرائیل کے جذباتِ غیرت کو بھی ہوا دی گئی ہے کہ وہ تمہاری بیٹیوں کو اس لئے زندہ نہیں چھوڑتے تھے کہ وہ بیٹیاں ہیں بلکہ اس لئے زندہ چھوڑتے تھے کہ وہ بڑی ہو کر عورتیں بنیں تاکہ ان کی ہوس رانی کے کام آئیں۔

ذرا غور کیجئے! کسی قوم پر اس سے بڑا ظلم نہیں ہو سکتا کہ ان کی نرینہ اولاد کو ختم کر کے ان کی نسل ختم کر دی جائے اور ان کی عورتوں کو باقی رکھ کر گھروں میں ان سے خدمت بھی لی جائے اور ساتھ ساتھ ان کی قوم کی غیرت کا جنازہ بھی نکال دیا جائے۔ یہ وہ بدترین آزمائشوں کا سلسلہ

Marfat.com

تھا جو بنی اسرائیل کیلئے عذابِ عظیم بن گیا تھا۔ پھر اللہ کی رحمت حرکت میں آئی اور اس نے بنی اسرائیل کو اس عذابِ عظیم سے اس طرح نجات دی کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے۔ انہوں نے فرعون کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور اللہ کی بندگی کی طرف اسے بلایا۔ فرعون نے اس دعوت کو قبول کرنے کی بجائے بنی اسرائیل پر مظالم میں اور شدت پیدا کر دی۔ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ کئی سالوں تک یہ کشمکش جاری رہی، بنی اسرائیل اگرچہ گمراہی کی دلدل میں اتر چکے تھے لیکن پھر بھی اللہ کو مانتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا اقرار کرتے تھے اور آخرت کو تسلیم کرتے تھے۔ یوں کہہ لیجئے کہ وہ بگڑے ہوئے مسلمان تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ فرعون اور اہلِ مصر کسی طرح راہِ راست اختیار کرنے کو تیار نہیں تو آپ نے اللہ کی ہدایت کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ آپ بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر ملکِ شام جو ان کا آبائی وطن تھا ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے آپ نے فرعون سے مطالبہ کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ لیکن فرعون نے اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ فرعونی اس دعوت کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں اور بنی اسرائیل چونکہ پوری طرح ان کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ کوئی آزادانہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اس لئے ان کا مصر میں رہنا اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے تباہ کن ہے۔ انہیں ایک اسلامی امت بنانے کیلئے ضروری ہے کہ اس غلامی سے انہیں نجات ملے۔ اب اس کی ایک ہی صورت تھی کہ آپ انہیں رات کی تاریکی میں لے کر نکلیں اور کسی طرح ملکِ شام پہنچ جائیں۔ چنانچہ اسی فیصلے کے مطابق وہ رات کی تاریکی میں بنی اسرائیل کو لے کر نکلے اس زمانہ میں نہ آج جیسی باقاعدہ سڑکیں تھیں، نہ راستوں میں روشنی کا انتظام، شب کی تاریکی میں راستہ بھول گئے۔ اور بجائے اس کے کہ شمال کی طرف کچھ اور آگے بڑھ کر اپنے دائیں طرف مشرق کی طرف مڑتے، وہ پہلے ہی مشرق کو گھوم گئے۔ ادھر فرعون کو بھی خبر ہو گئی، وہ اپنے لشکر کی کمان خود کرتا ہوا، تیزی سے تعاقب میں آپہنچا۔ اب اسرائیلیوں کے سامنے یعنی مشرق کی جانب سمندر تھا اور دائیں بائیں شمال اور جنوب میں پہاڑیاں تھیں اور پشت پر یعنی مغرب کی جانب مصری لشکر۔ اب وہ دیکھ رہے ہیں کہ سامنے بحرِ قلزم کی موجوں نے راستہ روک لیا ہے اور پیچھے فرعون کی فوجوں نے ان کا نکل بھاگنے کا راستہ بند کر دیا ہے۔ اب وہ دو موتوں کے درمیان ہیں بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں چونکہ ابھی انہیں تربیت کا موقع نہیں ملا تھا اور برسوں کی غلامی نے ان کے اندر نہ کوئی انفرادی خوبی چھوڑی تھی اور نہ اجتماعی۔ عزم و ہمت اور مشکلات سے کھیلنا آزاد لوگوں کے شیوے ہیں۔ غلامی کا حاصل تو زندگی کی ضروریات کے حصول کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ کندہ ناتراش قوم چیخ اٹھی: اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ''اے موسیٰ! ہم تو پکڑ لئے گئے''۔ تم ہمیں یہاں اس لئے لائے تھے کہ ہم چوہوں کی طرح مار دیئے جائیں۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ پر اعتماد اور نبوت کے جلال سے بولے۔ كَلَّا ''ہرگز نہیں!'' اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ''یقیناً میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ ضرور مجھے راستہ دے گا''۔ یہ بحرِ قلزم کی موجیں میرا راستہ نہیں روک سکتیں اور فرعون کی فوجیں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس کے بعد کیا ہوا، اگلی آیتِ کریمہ میں اس کا ذکر ہے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

(اور (وہ وقت یاد کرو!) جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھاڑ دیا، پھر ہم نے تمہیں نجات دے دی، اور آلِ فرعون کو ہم نے غرق کر دیا، درآں حالیکہ تم دیکھ رہے تھے) (البقرة:٥٠)

Marfat.com

بنی اسرائیل کا بحرِ قلزم کو عبور کرنا

موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ بحرِ قلزم پر اپنا عصا مارو، چنانچہ جیسے ہی آپ نے اپنا عصا پانی کی طرف بڑھایا، بحرِ قلزم کی موجیں دائیں بائیں پہاڑوں کی طرح کھڑی ہو گئیں اور نیچے خشک زمین نظر آنے لگی۔ اب بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ سمندر میں اتر جاؤ اور بے تأمل اسے پار کر جاؤ۔ اس آیتِ کریمہ میں جس طرح اسے بیان کیا گیا ہے اس میں فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ میں بِكُمْ کا استعمال قابلِ غور ہے۔ بعض اہلِ علم با کو سبب کیلئے قرار دیتے ہیں یعنی تمہیں بچانے اور تمہیں راستہ دینے کیلئے ہم نے سمندر کو پھاڑا۔ لیکن با معیت، مصاحبت اور ملابست کیلئے بھی ہوتی ہے۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''ہم نے تمہیں ساتھ لے کر دریا کو پھاڑتے ہوئے عبور کیا''۔ یعنی جس طرح کوئی کسی کو گود میں اٹھا کر دریا پار کرا دے، اسی طرح ہم نے تمہیں دریا پار کرایا یعنی تم کسی ہموار زمین میں خطرات سے محفوظ اس طرح خرام کے انداز میں نہیں چلے ہو گے جس طرح تم خراماں خراماں خوشی میں ڈوبے ہوئے کامیابی کے نشے میں مخمور دریا عبور کر رہے تھے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا مظہر تھا۔ معجزات پیغمبر سے ظہور پذیر ہوتے ہی رہتے ہیں اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ یہ واقعہ اگرچہ حیرت انگیز ہے لیکن ایسا بھی حیرت انگیز نہیں کیونکہ بحری زلزلہ کے وقت ایسی صورتیں پیش آجایا کرتی ہیں۔

دریائے گنگا کا غائب ہو جانا

مؤرخین کہتے ہیں کہ جنوری 1934ء رمضان کے مہینے میں جو عظیم الشان زلزلہ بہار اور اطراف بہار میں آیا تھا اس موقع پر صوبہ کے صدر مقام شہر پٹنہ میں دن دیہاڑے کوئی اڑھائی بجے کے وقت ایک مجمع کثیر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گنگا جیسے وسیع وعریض دریا کا پانی چشمِ زدن میں غائب ہو گیا اور اتنے چوڑے پاٹ میں بجائے دریا کے دھارے کے خشک زمین نکل آئی اور یہ حیرت انگیز اور دہشت ناک منظر چار پانچ منٹ تک قائم رہا۔ یہاں تک کہ دریا اسی برق رفتاری کے ساتھ یک بیک زمین سے ابل کر پھر جاری ہو گیا (یہ واقعہ ایک وقائع نگاہ کے قلم سے انگریزی روزنامہ ''پانیر'' 2 جنوری 1934ء کی اشاعت میں درج ہے)۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے واقعات اور بھی کہیں ہوئے ہیں۔ لیکن جہاں بھی ہوئے ہیں اللہ کی قدرت سے ہوئے ہیں انسانوں کے بس میں نہیں کہ وہ اس طرح کے واقعات کو جنم دے سکیں۔ مزید یہ کہ جس طرح یہ واقعہ پیش آیا وہ اس طرح نہیں کہ کوئی بحری زلزلہ آیا ہو بلکہ پوری قوم جس کی تعداد لاکھوں میں ہے، وہ خطرات میں گھری پریشان بحرِ قلزم کے کنارے کھڑی ہے اور اللہ کا پیغمبر اللہ کے حکم سے دریا کے پانی کی طرف اپنا عصا بڑھاتا ہے اور دریا اچانک تھم جاتا ہے۔ پانی کے پہاڑ دائیں بائیں ایستادہ ہو جاتے ہیں اور اس وقت تک ایستادہ رہتے ہیں جب تک بنی اسرائیل عافیت سے دریا کو پار نہیں کر جاتے پھر اسی پر بس نہیں بلکہ دوسرے کنارے پر جب فرعون اپنے لشکر سمیت پہنچتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ پانی نے راستہ دے دیا ہے اور بنی اسرائیل پار اتر گئے ہیں تو وہ اپنے لشکر سمیت دریا میں اتر جاتا ہے اور جب اس کا آخری سپاہی بھی پانی کی زد میں آجاتا ہے تو اچانک پانی کی موجیں آپس میں مل جاتی ہیں اور فرعون اپنے لشکر سمیت ڈوب جاتا ہے۔

Marfat.com

عبرت کیلئے فرعون کی لاش کا محفوظ رہنا

اس پورے واقعہ پر غور کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ واقعہ اللہ کی قدرت کے نتیجے میں پیغمبر کے معجزے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ قرآنِ کریم نے اس واقعہ کی کچھ تفصیلات دوسری جگہ بھی ذکر فرمائی ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ فرعون جب ڈوبنے لگا تو اس نے اللہ پر ایمان لانے کا اعلان کیا یعنی اس نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا تو پروردگار کی جانب سے اسے کہا گیا: اٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ''اب تجھے خدا پر ایمان لانے کا خیال آیا حالانکہ تو اس سے پہلے مفسدین میں سے تھا'' البتہ! اس کلمے کے باعث اسے اتنی رعائیت دی گئی، فرمایا کہ آج ہم تیرے بدن کو نجات دے دیں گے یعنی تمہاری موت کے بعد تمہاری لاش کو باہر پھینک دیا جائے گا تاکہ تو بعد کے آنے والوں کیلئے عبرت بن جائے۔ چنانچہ سمندر نے اس کی لاش اگل دی، وہ تیرتی ہوئی جھیل میں پہنچی وہاں سے نشیبی علاقے میں گری جہاں سے مصریوں نے اسے اٹھایا اور چونکہ گارے میں لت پت ہو چکی تھی اس لئے قریبی کسی چشمے پر اسے دھویا گیا اس جگہ کو آج تک ''حمامِ فرعون'' کہتے ہیں۔ پھر اس لاش کو محل میں پہنچایا گیا، اور مصری جس طریقے سے لاشوں کو حنوط کر کے محفوظ کر دیا کرتے تھے، اس کی لاش کو بھی حنوط کیا گیا اور اہرامِ مصر میں رکھ دیا گیا۔ صدیاں گزر گئیں کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ لاش کہاں ہے۔ قرآن کے سوا کوئی اس علم اور خبر کا دعویدار نہ تھا اس لئے دشمنانِ اسلام یہ پھبتی کستے تھے کہ قرآنِ کریم نے ایک غلط خبر دی ہے۔ لیکن کم وبیش پونے دو سو سال پہلے بعض اہرامِ مصر کی کھدائی ہوئی تو اس میں ان کو ایک ایسا ہال ملا جس میں بعض فراعنہ کی لاشیں اور بعض نوادر تھے۔ فرانسیسی ماہرین نے جب ان لاشوں پر سے پٹیاں کھولیں تو وہ ایک لاش کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ اس میں دو چیزیں ایسی تھیں جو باقی لاشوں میں نہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی ناک کا اگلا حصہ کٹا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے مچھلی نے کھایا ہے اور دوسری یہ بات کہ اس کے پورے جسم پر نمک کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ حیرانی کی بات تھی کہ نمک کہاں سے آ گیا۔ تحقیق کا قدم جب آگے بڑھا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ لاش ایسے فرعون کی ہے جو سمندر میں ڈوب کر مرا ہے۔ مچھلی نے اسے کھانا چاہا لیکن سمندر نے یہ لاش باہر اچھال دی اور سمندر کا پانی چونکہ نمکین ہوتا ہے، پانی نمک سمیت جسم میں سرایت کر گیا۔ حنوط کرنے والوں نے پانی تو نکال دیا لیکن نمک جسم کے اندر رہ گیا، جو وقت گزرنے کے ساتھ جسم کے اوپر آتا گیا اور اس طرح نمک کی تہہ جسم پر جم گئی۔ اب ان کو تلاش ہوئی کہ کیا کوئی فرعونِ مصر کبھی ڈوب کر بھی مرا، تب انہیں قرآنِ کریم کی پیش گوئی بتائی گئی اور اس طرح سے یہ قرآنِ کریم کی حقانیت کا ایک منہ بولتا ثبوت میسر آ گیا۔ آیتِ کریمہ کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ جب فرعون اور اس کا لشکر تمہارے سامنے ڈوب رہا تھا، تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ تم دنیا کی ایک بے مایہ، پسماندہ اور غلام قوم تھے۔ آج تمہارا یہ حال ہے کہ سمندر کی طغیانی تمہارے سامنے سہم جاتی ہے۔ لیکن فرعون جو اپنے آپ کو رب کہتا تھا اور اہلِ مصر اسے رب تسلیم کرتے تھے اور طاقت کے نشہ میں مخمور تھے، وہ تمہارے سامنے تمام طاقت اور دعوؤں سمیت ڈوب رہا تھا۔ اس سے بڑھ کر اللہ کا اور احسان کیا ہوگا۔

البحر ...... چونکہ دریا اور سمندر دونوں پر بولا جاتا ہے اس لئے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ اس سے مراد شاید دریائے نیل ہے۔ بحرِ قلزم یا بحرِ احمر نہیں حالانکہ دریائے نیل تو بنی اسرائیل کے مسکن سے مغرب کی طرف واقع تھا اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کیلئے مشرق کی طرف تھا۔ نیل سے اس راستہ کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مصر سے شام کی راہ کے قریب بحرِ قلزم تھا، اسی کے تنگ شمالی سرے کی جانب یہاں اشارہ ہے۔ مصر کے مشرق میں جہاں نہر سویز کھدگئی ہے۔ اس سے متصل جنوب میں، نقشہ میں سمندر دو مثلثوں کی شکل میں تقسیم نظر آئے گا، یہاں ان میں سے مغربی مثلث مراد ہے، اسرائیلیوں نے اسی کو عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا میں قدم رکھا تھا۔ جدید ترین اثری تحقیق کے مطابق یہ واقعہ ۱۴۴۷ ق م یا اس کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔

Marfat.com

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝ (البقرة: ۵۱ تا ۵۲)

(اور یاد کرو! جب کہ ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا، پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم ظلم کرنے والے تھے ۝ پھر ہم نے تم سے درگزر کیا، اس کے بعد، تاکہ تم شکر گزار بنو)

گوسالہ پرستی کا واقعہ

بنی اسرائیل جب فرعونیوں کی غلامی سے نجات پا کر بحرِ قلزم عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ گئے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد انہوں نے خود موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اب ہمیں زندگی گزارنے کیلئے کوئی رہنما اصول دیئے جائیں۔ جس کی روشنی میں ہم ایسی زندگی گزاریں جس سے ہمارا اللہ راضی ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تو پروردگار نے احکام وہدایات دینے کیلئے انہیں کوہِ طور پر طلب فرمایا۔ لیکن یہ ہدایت فرمائی کہ کوہِ طور پر آ کر تیس شب وروز، روزے اور اعتکاف کی حالت میں رہو تاکہ تم میں وہ قلبی اور روحانی استعداد پیدا ہو جائے جو کتاب الٰہی کے بارِ عظیم کو اٹھانے کیلئے ضروری ہے۔ کتب الٰہیہ کے نزول کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے ہر نبی کو کتاب اتارنے سے پہلے ایک خاص مدت تک ایک ایسے ماحول میں رہنے کا حکم دیا جس میں اس کے گردوپیش فضائے ملکوتی اور انوارِ الٰہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلسل روزہ رکھنے اور اللہ سے لو لگائے رہنے سے دل ودماغ میں ایک ایسی پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے، جس سے انسانی کثافتیں کم اور ملکوتی صفات غالب آ جاتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں کلامِ الٰہی کا تحمل اور انوارِ الٰہی کی برداشت نسبتاً آسان ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایسی ہی کیفیت میں ایک خاص عرصے تک رکھا گیا اور تب انہوں نے وہ پہاڑی وعظ کہا جو کتابِ الٰہی کا پیش خیمہ ہے۔ ہمارے رسول پاک ﷺ چالیسویں سال میں پہنچ کر ایسے خلوت پسند بنا دیئے گئے کہ آپ نے آبادی چھوڑ کر غارِ حرا کو اپنا مسکن بنایا۔ آپ وہاں مسلسل روزے اور اعتکاف کی حالت میں تھے کہ آپ پر انوارِ الٰہی کی تجلی پڑی اور کلامِ الٰہی نے آپ کے قلبِ مبارک کو اپنا مورد بنایا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی خاص حکمت کے تحت جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مزید دس دن کوہِ طور پر ٹھہرنے کا حکم دیا تو آپ چونکہ بنی اسرائیل کو تیس شب وروز کا کہہ کر گئے تھے اس دس روزہ تاخیر کے باعث مفسدین کو اپنا کام کرنے کا موقع مل گیا ان میں سامری نام کا ایک شعبدہ باز منافق تھا جو بنی اسرائیل میں جانا پہچانا جاتا تھا اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنی اسرائیل کے زیورات جو مصر سے نکلتے ہوئے شائد اس کے پاس جمع کرا دیئے گئے تھے، سے ایک بچھڑا بنایا اور وہ چونکہ پیشہ کے اعتبار سے ایک سنار تھا اور سونے سے مختلف شکلیں تیار کرنے کا ماہر تھا۔ اس نے اپنے فن کا ذہانت سے استعمال کرتے ہوئے بچھڑے کو اس شکل میں ڈھالا کہ اس کے اندر ہوا گزرنے سے بولنے کی آواز آتی تھی جس طرح ہارن ہوا ہی کے گزرنے سے بجتا ہے، اسی طرح کی اس نے کوئی تکنیک استعمال کی تھی۔ لیکن سادہ لوح عوام کو ان کی قدیم گوسالہ پرستی کی عادت کے باعث بہکانے میں کامیاب ہو گیا کہ اصل میں یہی گوسالہ تمہارا خدا ہے اور یہی مصر سے تمہیں نجات دے کر لایا ہے۔ موسیٰ نہ جانے کہاں بھول گئے انہیں واپس آنا ہوتا تو آ گئے ہوتے۔ چنانچہ گوسالہ پرستی کے اسیر لوگ جواب تک اپنے آپ کو اس سے نجات نہ دے سکے تھے، اس فریب میں آ گئے اور انہوں نے اس بچھڑے کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس پر چڑھاوے چڑھائے اور اس کی پوجا کرنا شروع کر دی۔ موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر ہی اللہ تعالیٰ نے اس حادثے کی اطلاع دی، آپ نہایت پریشان ہوئے کہ میں اللہ تعالیٰ سے کتابِ ہدایت لینے کیلئے آیا ہوں لیکن میری قوم کا

Marfat.com

حال یہ ہے کہ میری چالیس شب وروز کی غیر حاضری میں جب کہ حضرت ہارون علیہ السلام جیسے پیغمبران میں موجود تھے،شرک جیسی عظیم گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔تورات میں بھی باب 32 اور آیات 1 تا 7 میں اس واقعہ کو ذکر کیا گیا ہے۔قرآن کریم میں اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد پروردگار فرماتا ہے: وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ''اے بنی اسرائیل!تم موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں گوسالہ پرستی کا ارتکاب کر کے ظلم کر رہے تھے''۔''ظلم''،حق تلفی کو کہتے ہیں اور ایسی حرکت کا نام بھی ظلم ہے جو سراسر خلاف عقل اور خلاف فطرت ہو۔ان دونوں حیثیتوں سے اگر ہم غور کریں تو ظلم کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔انسان کی ذات وصفات کا خالق صرف اللہ ہے۔اسی نے اسے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔اس کے عملِ تخلیق اور احسانات کو دیکھتے ہوئے سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی کی جا سکتی ہے یا کسی اور کے سامنے سر جھکایا جا سکتا ہے۔اسی طرح انسانی فطرت جو ہمیشہ ٹھیک راستے پر چلتی ہے اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ مخلوق خالق کے سوا اور کسی کے سامنے نہ جھکے۔اور احسان سے گراں بار شخص اپنے محسن کے سوا کسی اور کی بندگی کیلئے تیار نہ ہو۔لیکن بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی کا ارتکاب کر کے اگر ایک طرف عقل اور فطرت کے تقاضوں کو پامال کیا تو دوسری طرف انہوں نے خود اپنے نفس کی سخت تحقیر کی۔انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات اور اپنا خلیفہ بنایا ہے۔کیا خلیفۃ اللہ کیلئے یہ بات مناسب ہے کہ وہ ان چیزوں اور ان مخلوقات کے سامنے جھکے جو اس کی خدمت کیلئے پیدا کی گئی ہیں؟ جب وہ اپنے سے فروتر مخلوق کے سامنے جھکتا ہے،تو وہ حقیقت میں اپنے نفس اور اپنی حیثیت کی حق تلفی کرتا ہے۔

بنی اسرائیل کا یہ جرم اس قدر مکروہ اور اپنے نتائجِ بد میں اس قدر خطرناک تھا کہ اس پر اگر اللہ کا غضب بھڑکتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔لیکن اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنے احسان کے طور پر اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تم نے تو ہر طرح سے اپنی تباہی کا سامان کیا،لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم دیکھو کہ اس نے اتنا بڑا جرم بھی معاف کر دیا اور یہ معافی صرف اس لئے تھی تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو۔اس کی نعمتوں کی قدر پہچانو اپنی حیثیت کو سمجھو اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے میں کوتاہی نہ کرو۔لیکن ساتھ ہی اس جرم کی شناخت کو مزید واضح کرنے کیلئے ارشاد فرمایا:

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۝ (البقرة: ۵۳)

(اور یاد کرو! جب کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور فرقان دیا تاکہ تم ہدایت حاصل کرو)

فرقان کا مفہوم

یعنی اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا جرم تم نے اس وقت کیا جب ہم موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان دے رہے تھے یعنی ہم تو تمہاری ہدایت کا سامان کر رہے تھے اور تمہیں زندگی گزارنے کیلئے صحیفۂ حیات دے رہے تھے اور تم کتاب سے تو خیر کیا فائدہ اٹھاتے تم نے کتاب دینے والی کی ذات وصفات میں شریک بنا کر کھڑا کر دیا۔اس آیتِ کریمہ میں کتاب سے مراد تو ظاہر ہے ''تورات'' ہے۔لیکن یہ فرقان کیا ہے؟ اس پر غور کرنے سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں اور دونوں ہی صحیح ہیں۔فرقان کا معنی ہے،''حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز''۔فرق کرنا دو طرح سے ہوتا ہے،ایک تو یہ کہ یہ کتاب ایسی ہے،جو اپنی مراد میں بالکل واضح ہے اس کے احکام وہدایات میں کوئی ابہام نہیں اور اس کی تعلیمات اس قدر فیصلہ کن ہیں کہ حق وباطل میں کسی آمیزش کا اندیشہ باقی نہیں رہتا یہ ایک ایک بات کو پوری طرح کھول کر بیان کر دیتی ہے اور اس کی تعلیمات نے اپنے سامنے جو مقصد اور منہج رکھا ہے اس میں کوئی الجھاؤ محسوس نہیں ہوتا۔اس لحاظ سے یہ فرقان کتاب ہی کی صفت ہو گی

Marfat.com

اور کتاب اور فرقان کے درمیان واؤ کو ہم تفسیر اور بیان کی واؤ قرار دیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کتاب سے فائدہ اٹھانے والے اور اس پر عمل کرنے والے کو اللہ کی طرف سے ایک ایسا شعور ملتا اور ایک ایسی حکمت عطا ہوتی ہے۔ جس سے وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں بڑی آسانی سے حق کو پہچان لیتا ہے اور کبھی باطل کا شائبہ بھی اسے اشتباہ میں مبتلا نہیں کر سکتا اس لحاظ سے یہ فرقان، کتاب سے ایک زائد چیز ہے۔ بعض لوگوں نے ایک اور پہلو سے بھی اس پر غور کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح اللہ کے نبی کو اپنی امت کی رہنمائی کیلئے کتاب دی جاتی ہے۔ اسی طرح اسے اپنی اور اپنی دعوت کی حقانیت ثابت کرنے کیلئے ایک معصوم اور دل آویز شخصیت بھی عطا ہوتی ہے جو بجائے خود فرقان کا کام دیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے ایسے معجزات عطا کیے جاتے ہیں، جن کی مثال لانے سے لوگ عاجز ہوتے ہیں اور نتیجۃً وہ کھل کر اور پوری قوت سے مخالفت کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ رفتہ رفتہ اندھے مخالفین تحلیل ہو جاتے ہیں اور باقی لوگ دعوتِ اسلامی کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ "الفرقان" صرف تورات ہی کی صفت نہیں بلکہ اللہ کی ہر کتاب فرقان بن کے آتی ہے اور اس کا ہر نبی بھی اپنی ذات میں فرقان ہوتا ہے۔ اس لئے قرآنِ پاک کو بھی فرقان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ "بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا"۔ قرآنِ کریم میں الفرقان صفت کے طور پر بھی آیا ہے اور قرآنِ کریم کے نام کے طور پر بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اسم اپنے مسمّیٰ کی شناخت اور صفت اپنے موصوف کا تعارف ہوتی ہے۔ فرقان بھی قرآنِ کریم کیلئے ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں اگرچہ یہ بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی کا جو عظیم جرم کیا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ اجتماعی گناہوں کو اس وقت تک معاف نہیں کیا کرتا جب تک کہ سزا کے ذریعے اس کے اثراتِ بد کا ازالہ نہیں کر دیتا۔ بنی اسرائیل نے بھی اجتماعی طور پر یہ گناہ کیا تھا۔ کچھ لوگ تو براہِ راست اس گناہ کے مرتکب ہوئے لیکن ایک بڑی تعداد نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ رکتے نہیں تو انہوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ پہلے گروہ کی سرکشی اور دوسرے گروہ کی کنارہ کشی اور مداہنت نے حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو غیر موثر کر دیا۔ اب ضروری تھا کہ جس گناہ نے بنی اسرائیل کی اتنی بڑی تعداد کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، اس کے اثراتِ بد کا ازالہ کیا جائے۔ اس لئے اگلی آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ
فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ
فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○ (البقرۃ: ۵۴)

(اور یاد کرو! جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ پس تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو اور اپنی جانوں کو قتل کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک۔ پھر اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے)

پہلی آیات میں جس فعل کو ظلم قرار دیا تھا اس فعل کا نام نہیں لیا تھا۔ اس آیتِ کریمہ میں نام لے کر بتایا کہ وہ ظلم یہ تھا کہ تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے آپ پر ظلم کیا یعنی اپنی تحقیر بھی کی اور اپنی ذات کی حق تلفی بھی کی۔ اب تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اس کی تلافی کیلئے اللہ سے معافی کیلئے رجوع کرو۔ توبہ کا معنی "لوٹنا" ہوتا ہے یعنی آدمی اپنے گناہ پر نادم ہو کر آئندہ گناہ نہ کرنے کے مکمل عزم

Marfat.com

کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے کہ "یا اللہ! میرا گناہ معاف فرما دے"۔ یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ سے معافی مانگو۔لیکن یہ صرف کلمات توبہ سے معافی نہیں ہوگی تاوقتیکہ جنھوں نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے ان کی گردنیں نہ کٹیں اور جنھوں نے ان کے جرم پر خاموشی اختیار کی وہ خود ان کی گردنیں نہ کاٹیں۔

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کا مفہوم

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی گردنوں پر تلواریں چلائیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ تمہارے اپنے خاندان اور اپنے قبیلے کے کن کن لوگوں نے اس کا ارتکاب کیا ہے وہ اگرچہ تمہارے خون کے رشتہ دار ہیں لیکن اللہ کی وحدانیت کے مقابلے میں کوئی رشتہ کام نہیں دیتا۔اس لئے تم خود اپنے ہاتھوں سے ایسے لوگوں کو قتل کرو۔چنانچہ بنی اسرائیل نے اپنے اپنے قبیلے کے شرک کرنے والوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا اور اس طرح سے تورات کی روایت کے مطابق 3 ہزار آدمی قتل ہوئے۔تورات نے یہ وضاحت کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنے خاندان بنی لاوی کو یہ فریضہ سونپا گیا تھا اور انہوں نے تمام قبیلوں کے مشرک لوگوں کو قتل کیا، لیکن حقیقت یہ نہیں۔امرِ واقعہ یہ ہے کہ ہر قبیلے کے لوگوں نے اپنے قبیلے کے مشرکوں کو قتل کیا۔اگر صرف بنی لاوی کو اس کا حکم دیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔لیکن جب ہر قبیلے نے اپنے اپنے قبیلے کے مشرکوں کو قتل کیا تو اس طرح ایک طرف اگر خانہ جنگی کا امکان ختم ہو گیا تو دوسری طرف زندہ رہنے والوں کا بھی امتحان ہو گیا کہ وہ اپنے خونی رشتہ داروں کو اپنے ہاتھوں قتل کر کے کس قدر اللہ کے دین کے ساتھ مخلص ہیں۔یہ بالکل ایسا ہی امتحان تھا جس طرح جنگِ بدر میں مسلمانوں کو اپنے ہی عزیزوں کے خلاف تلوار نکالنا پڑی تھی کیونکہ مکے سے آنے والے کفار کے لشکر میں کتنے ہی ایسے لوگ تھے جن سے مہاجرین کی قریبی رشتہ داریاں تھیں۔کسی کا باپ ادھر تھا تو بیٹا ادھر، کسی کا ماموں ادھر تھا تو بھانجا ادھر، کسی کا ایک بھائی اگر مسلمانوں میں تھا تو دوسرا کافروں میں۔جو لوگ اس طرح کے امتحانوں میں پورا اترتے ہیں ان کے اخلاص میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔آخر میں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ شرک کرنے سے چونکہ آدمی مرتد ہو جاتا ہے۔مرتد کی سزا اسلام کی طرح موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی قتل ہی تھی۔اس لئے ان کیلئے یہی سزا تجویز کی گئی۔

اگلی آیتِ کریمہ میں اسی سلسلۂ بیان کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔اللہ کے مزید احسانات کا تذکرہ اور بنی اسرائیل کی ایمان و عمل کی کمزوریوں پر مبنی بداطواریوں کی یاددہانی، ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (البقرۃ:۵۵تا۵۶)

(اور یاد کرو! جب کہ تم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز تمہارا یقین کرنے والے نہیں، جب تک ہم خدا کو اعلانیہ دیکھ نہ لیں ○ تو تم کو کڑک نے آ پکڑا اور تم دیکھتے رہ گئے، پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا تاکہ تم شکر گزار بنو)

گوسالہ پرستی کے حادثہ کے بعد اپنی قوم کے ستر منتخب آدمیوں کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر گئے کہ گوسالہ پرستی جیسے عظیم گناہ پر اجتماعی طور پر اللہ سے معافی مانگیں۔اس وقت یہ واقعہ پیش آیا جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے اور یا یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب تورات اللہ تعالیٰ سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ان بڑے بڑے لوگوں کے پاس آئے جنھیں اپنے ساتھ کوہِ طور پر لے گئے تھے اور خو

Marfat.com

آگے بڑھ گئے اوران کو پیچھے چھوڑ گئے تھے۔توان لوگوں نے صاف طور پر حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم جب تک خوداپنی آنکھوں سے پروردگار کو نہ دیکھ لیں اس وقت تک ہم تورات پر ایمان لانے اور آپ کی باتیں ماننے کیلئے تیار نہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل شک کے ایسے مریض تھے کہ انہیں کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ واقعی اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کرتے ہیں۔جب بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں اللہ کی طرف سے کوئی حکم پہنچاتے تو وہ اس حکم کو ماننے میں تامل کرتے تھے۔حیرت ہوتی ہے کہ جس پیغمبر کے معجزات انہوں نے سالہا سال تک دیکھے اور جس کے عصا نے ان کی آنکھوں کے سامنے سمندر کو دولخت کر دیا اس کے بارے میں انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ واقعی اللہ کا رسول ہے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام تر دین اور شریعت کا دارومدار اللہ کے رسول پر ایمان لانے پر ہے۔اس موقع پر انہوں نے مزید جسارت یہ کی کہ صرف شک وشبہ کا ہی اظہار نہیں کیا بلکہ صاف طور پر اپنے ایمان کو کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے مشروط کر دیا۔اللہ نے اپنی مشیت اور حکمت سے اپنے اور بندوں کے درمیان انبیاء کو واسطہ بنایا ہے لیکن بنی اسرائیل اس واسطے کو ہٹا دینے پر اصرار کر رہے تھے۔

غضب الٰہی کا سبب اور اس کی صورت

آپ کو ممکن ہے یہ خیال آئے کہ ان پر اللہ کا غضب اس لئے نازل ہوا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنا چاہا حالانکہ اللہ کو دیکھنے کی خواہش تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی کر چکے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کوئی جرم نہیں۔البتہ اس کے دیکھنے کو ایمان کیلئے شرط قرار دینا یہ ایک ایسا جرم ہے جو اللہ تعالیٰ کے پورے قانون کو توڑ دینے کے مترادف ہے۔موسیٰ علیہ السلام نے دیکھنے کی خواہش کی تو انہیں پیار سے بتایا گیا کہ تم ان ناسوتی آنکھوں سے مجھے نہیں دیکھ سکتے۔وہ فوراً سمجھ گئے تو انہوں نے اپنی اس خواہش پر معافی مانگی۔لیکن بنی اسرائیل کا اپنی اس بات پر اصرار اور پھر اس کو شرط قرار دینا اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث بنا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی اس گستاخی پر صَاعِقَه نے انہیں آپکڑا۔جب کہ سورۂ اعراف میں کہا گیا ہے کہ انہیں رَجْفَة نے آپکڑا۔ صَاعِقَه ''گرج اور کڑک'' کو کہتے ہیں اور اس بجلی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے اور رَجْفَة کے معنی ''زلزلہ'' کے ہیں۔عجیب بات ہے کہ ایک ہی واقعہ کو قرآن کریم نے ایسے دو لفظوں سے تعبیر کیا جو مختلف معنی رکھتے ہیں۔لیکن جب ہم تدبر سے کام لیتے ہیں تو اس میں کوئی عجیب بات معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ان لوگوں پر جب اللہ تعالیٰ کی تجلی ظاہر ہوئی تو اس کے اثرات دو طرح سے نمودار ہوئے۔ایک طرف زلزلہ آیا اور ساتھ ہی بجلیاں بھی گریں اور گرج اور کڑک نے پورے ماحول کو ہلا کر رکھ دیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔بے ہوشی میں دونوں احتمالات ہیں کہ یہ بے ہوشی حواس کا تعطل ہو اور یا مکمل موت کی صورت ہو کیونکہ موت جس طرح فنا کو کہتے ہیں اسی طرح اس کا اطلاق بے ہوشی یا نیند پر بھی ہوتا ہے۔لیکن یہاں موت مراد لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں۔بلکہ جس طرح سے ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اس میں زیادہ امکان موت ہی کا ہے۔یہ اگرچہ انہیں اپنی گستاخی کی سزا ملی۔لیکن ساتھ ہی اللہ کی رحمت جوش میں آئی۔جس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ''پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت سے اٹھایا حالانکہ تمہارے جرم کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم موت کی وادیوں میں دفن کر دیئے جاتے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں دوبارہ زندہ اٹھا کھڑا کیا تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو''۔پھر اسی سلسلے کے مزید احسانات کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحرائے سینا میں بنی اسرائیل غلطیوں پر غلطیاں کرتے ہیں۔لیکن پروردگار مسلسل عفو و درگزر سے کام لے رہے ہیں بلکہ انعامات کی بارش کی جا رہی ہے کہ شاید وقت کے ساتھ ساتھ یہ قوم ایمان وعمل کی کمزوریوں پر قابو پا سکے۔

Marfat.com

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ط كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَارَزَقْنٰكُمْ ط وَمَاظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ o (البقرة:۵۷)

(اورتم پر بدلیوں کا سایہ کیااورتم پر من وسلویٰ اتارے،کھاؤان پاکیزہ چیزوں میں سے جوہم نے تم کو بخشی ہیں اورانہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے)

اللہ کے احسانات

ہم پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ بحرِ قلزم عبور کرنے کے بعد بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے مختلف علاقوں میں قیام پذیر ہوئے۔یہ لوگ بے سروسامانی میں گھر سے نکلے تھے۔کوئی خیمہ ڈیرہ ساتھ نہ تھا۔ہوتا بھی تو کب تک کام دیتااوراس صحرا میں کوئی سر چھپانے کوجگہ نہ تھی۔ایسی صورت حال میں جہاں غذا کاحصول ان کی بہت بڑی ضرورت تھی،اس سے بھی بڑی ضرورت دھوپ کی تپش اور موسم کی شدت سے بچاؤ کاسامان کرنا تھااور یہ کوئی آسان بات نہ تھی۔آج جب کہ وسائل کے اعتبار سے دنیا بہت ترقی کرچکی ہے،تب بھی اگرکسی ملک میں چند ہزار مہاجرین کامسئلہ پیدا ہوجاتا ہےتو ساری دنیا میں اپیلیں ہونے لگتی ہیں۔اقوامِ متحدہ تک حرکت میں آجاتی ہے۔لیکن بنی اسرائیل کے پاس تو وسائل نام کی کوئی چیز نہ تھی اوران کی تعداد بھی لاکھوں میں کہی جاتی ہے۔ان حالات میں ان کے سروں پر بادل کا چھاجانااورسفر میں بھی بادل کا ساتھ ساتھ چلنااور تورات کے مطابق رات کوان کے ساتھ ساتھ روشنی کے ستون کا رہنااور پھر غذا کیلئے من وسلویٰ کامہیا ہونا۔یہ اللہ کااتنا بڑا انعام ہے کہ انسانی حکومتیں اپنے تمام تر وسائل کے باوجوداس کاتصور بھی نہیں کرسکتیں۔اللہ نے ان پر بادل کا سایہ کرکے ان کوموسم کی شدت سے بچایا۔ورنہ یہ لوگ دھوپ کی تپش سے جل جاتے اورغذا کی ضرورت کوپورا کرنے کیلئے من وسلوٰی کاانتظام کیا۔

من وسلویٰ کی تحقیق

مــن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ترنجبین یادھنیے کے دانوں کی طرح شبنم کی صورت ایک چیز گرتی تھی،جودرختوں کے پتوں زمین پر جم جاتی اورخشک ہوکردانوں کی شکل اختیار کرلیتی اور بنی اسرائیل نہایت آسانی سے اسے اکٹھی کرکے چپاتیاں بنالیتے اور یہ مزے میں اس قدر میٹھی اورایسی لذیذ تھی کہ شاید کوئی دوسری میٹھی چیزایسی لذیذ نہ ہواور سلویٰ بٹیریابٹیر کی طرح کاایک پرندہ تھا،جوسمندر کی طرف سے اڑکرآتااور اتنا قریب اڑتااوراتنی مختصرسی اڑان بھرتا کہ آدمی ہاتھ بڑھاکراسے پکڑلیتااس سے ان کی گوشت کی ضرورت پوری کی گئی۔"مــن کو یہود نے استفہام کی شکل دے دی اور یہ کہا کہ اس کا نام اس لئے مــن پڑاکہ لوگوں نے جب پہلے پہل اس کوزمین پر پھیلے ہوئے دیکھا ایک دوسرے سے کہا من من کہ یہ کیا ہے؟حقیقت یہ ہے کہ یہ سراسران کی بدمذاقی کی دلیل ہے۔عربی زبان میں من اورشاید عبرانی میں بھی "احسان" کے معنوں میں آتا ہے۔یہ چونکہ اللہ کا بہت بڑااحسان تھااس لئے اس کومن کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔اسی طرح سلویٰ "ہمدردی اور خیرخواہی" کو کہتے ہیں۔یہ گویا کہ خیرخواہی کاعمل تھاجواللہ تعالیٰ کے کرم سے ظہور میں آیا۔یہ نعمتیں دے کران سے کہا گیایاان نعمتوں کی کثرت زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ اللہ نے یہ جونعمتیں تمہیں عطا کی ہیں انہیں شوق سے کھاؤ۔یہ تمہارے لئے پاکیزہ ہیں ان سے تمہارے د

Marfat.com

دو ماغ میں پاکیزگی پیدا ہوگی۔لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ احساس ہمیشہ توانا رہے کہ یہ اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں اور تورات میں بتایا گیا ہے کہ یہ بھی ان سے کہا گیا تھا کہ یہ اللہ کی نعمتیں جو تمہیں بغیر محنت کے ملی ہیں انہیں ذخیرہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ جو اللہ آج نعمت دیتا ہے وہ کل بھی دے گا۔ذخیرہ کرنا بے اعتمادی کے مترادف ہے کہ آج تو یہ نعمت مل گئی ہے، ہوسکتا ہے کل نہ ملے۔لیکن بنی اسرائیل ذخیرہ اندوزی سے باز نہ آئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نعمتیں سڑنے لگیں اس کے بعد بجائے انہیں خطاب کرنے کے پروردگار نے ان سے منہ پھیر کر یہ بات فرمائی کہ ہم تو ان پر انعامات کی بارش کرتے رہے لیکن وہ ایسے احسان ناشناس تھے بجائے احسانات کا حق ادا کرنے کے انہوں نے ہمیشہ احسان فراموشی، حق تلفی، حق شکنی اور ظلم کا رویہ اختیار کیا۔جس کے نتیجے میں مختلف مصائب کا شکار ہوئے جو ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔ہم ان پر ظلم کرنے والے نہیں تھے وہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔

وَاِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ فَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ نَّغۡفِرۡ لَـكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ‌ؕ وَسَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَيۡرَ الَّذِىۡ قِيۡلَ لَهُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ۝ (البقرۃ:۵۸تا۵۹)

(اور یاد کرو! جب ہم نے کہا کہ داخل ہو جاؤ اس بستی میں، پس کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو، فراغت کے ساتھ اور داخل ہو بستی کے دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور کہتے جاؤ حِطَّةٌ حِطَّةٌ ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے اور خوب کاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے ۝ تو ظالموں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے۔ پس ہم نے اتارا ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا تھا آسمان سے عذاب، یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی جو وہ کر رہے تھے)

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی اور معجزانہ طریقے سے ان کی غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ تم پر اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں جن کا تقاضا یہ ہے کہ جب اپنی غذائی ضرورت کو پورا کرنے اور لذتِ کام و دہن کیلئے ان نعمتوں سے استفادہ کرو تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا اور اس کے احکام کی بجا آوری کو کبھی نہ بھولنا کیونکہ صحرائی زندگی میں تمہیں کسی سزا دینے کیلئے نہیں لایا گیا اور نہ یہ نعمتیں عیش و عشرت کیلئے دی جارہی ہیں، یقیناً اس قومی انقلاب کے پیچھے ایک روحانی اور با مقصد انقلاب ہے۔جس کیلئے تمہیں تیار کیا جارہا ہے۔ اس لئے وہ مقصدی زندگی ہمیشہ تمہارے پیشِ نظر رہنی چاہیے۔لیکن ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ بنی اسرائیل نے آئندہ حالات میں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے ناشکری کا رویہ اختیار کیا اور اللہ کے احکام کی اطاعت اور بجا آوری کی بجائے انکار اور معصیت کو اپنا طرزِ عمل بنالیا۔چنانچہ یہ آیتِ کریمہ ان کے اسی طرزِ عمل کی وضاحت کررہی ہے۔اس میں ایک تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے جس میں بنی اسرائیل اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے اور پھر اسی سلسلے میں ان پر اللہ کا عذاب بھی آیا۔اس واقعہ کی تفصیلات تو ذکر نہیں فرمائی گئیں کہ یہ واقعہ کہاں اور کیسے پیش آیا لیکن بین السطور سے یہ بات ضرور جھلکتی ہے کہ وہ یقیناً کوئی شہر ہوگا جسے بنی اسرائیل فتح کرچکے تھے اور یا اس کی فتح یقینی ہوگئی تھی۔اب صرف بنی اسرائیل کو اس میں داخل ہونے اور قابض ہونے کے آداب سکھائے جارہے تھے۔

Marfat.com

اَلْقَرْیَۃَ کا مفہوم اور اس کا مصداق

اس شہر کیلئے اس آیت میں اَلْقَرْیَۃَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قَرْیَۃَ کا معنی ''جمع ہونے کی جگہ'' کے ہیں۔ جمع ہونے کی جگہ چھوٹی بھی ہو سکتی ہے اور بڑی بھی اس لئے اس لفظ کا اطلاق چھوٹی بستی پر بھی ہوتا ہے اور بڑے شہر پر بھی۔ اسلوب کلام بتا رہا ہے کہ وہ یقیناً کوئی بڑا شہر تھا ورنہ تاریخی اعتبار سے وہ قابل ذکر نہ ہوتا۔ اب رہی یہ بات کہ وہ شہر کون سا تھا یہ بات ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی محض اندازے ہیں جن میں سے کوئی اندازہ بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ البتہ قرائن سے بعض باتیں گمان کی جا سکتی ہیں۔ جس سلسلۂ واقعات میں یہ واقعہ ذکر ہو رہا ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ یہ شہر جزیرہ نمائے سینا کا ہی کوئی شہر ہوگا۔ لیکن قرآن کریم چونکہ تاریخی ترتیب سے زیادہ عبرت و نصیحت کے پہلو کو اہمیت دیتا ہے اور پھر فَکُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا کا جملہ اس پر قرینہ ہے کہ یہ شہر ارض فلسطین کا کوئی شہر ہوگا۔ کیونکہ فلسطین ہی ایک ایسا علاقہ ہے جو اپنی سرسبزی اور شادابی میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس میں ہر طرح کی نعمتوں کی بہتات ہے۔ اس لئے اہل علم نے گمان کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد ''اریحا یا یریحو'' ہو۔ حضرت ابن عباس اور ابن زید کی یہی رائے ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہی شہر ہے جو سب سے پہلے بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد ''شطیم'' ہو، جو یریحو کے بالمقابل دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر آباد تھا۔ شہر کوئی بھی ہو مقصود شہر کا تذکرہ نہیں بلکہ اس بات کو واضح کرنا ہے کہ کسی شہر کا فتح ہو جانا اور وہ بھی بنی اسرائیل جیسی منفعل قوم کے ہاتھوں اللہ کا ایک بڑا احسان ہے۔ اسی احسان کے شکر کی ادائیگی کیلئے انہیں یہ حکم دیا گیا کہ اب جب تم شہر میں داخل ہو تو تمہارے رویے سے یہ نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم ایک ایسی فاتح قوم ہو جسے اپنی طاقت اور قوت پہ ناز ہے اور جو اپنے آپ کو فرعونِ بے سامان سمجھتے ہیں بلکہ تم شہر میں اس طرح داخل ہو کہ شہر کی فصیل کے دروازے سے جب تم گزرنے لگو تو تمہارے سر اللہ کے حضور عاجزی اور بندگی کے تصور سے جھکے ہوئے ہوں۔

سجداً کا مفہوم

سجدہ کے اصل معنی ''سر جھکانے'' کے ہیں۔ اس کی کامل شکل زمین پر سر رکھ دینا ہے۔ لیکن محض جھک جانے کو جس طرح ہم رکوع کہتے ہیں سجدہ بھی کہتے ہیں۔ اس لئے قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہاں صرف عاجزی کے اظہار کیلئے سر جھکانا مراد ہے۔ لیکن اس کی تکمیل اس وقت ہوگی جب یہ لوگ قصرِ اقتدار میں پہنچ کر لوگوں سے خطاب کریں گے۔ اس وقت انہیں لوگوں کے سامنے آنے سے پہلے اور ان کیساتھ معاملہ کرنے سے قبل اللہ کے حضور نماز ادا کرنی چاہیے۔ تاکہ اس حکم پر پوری طرح عمل ہو جائے۔ آنحضرت ﷺ کا فتح مکہ کے موقع پر جو عمل اور رویہ تاریخ نے ریکارڈ رکھا ہے اس سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ اور صحابہ کی پوری فوج اسی طرزِ عمل کا نمونہ تھی۔ محدثین اور مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور جب مکہ میں داخل ہو رہے تھے تو آپ کا سرِ مبارک عاجزی سے اس حد تک جھکا ہوا تھا کہ بار بار کجاوے کی اگلی لکڑی سے ٹکرا جاتا تھا اور زبان پر اللہ کی حمد و ثنا اور اس کی کبریائی کے الفاظ جاری تھے۔ جب آپ کو بتایا گیا کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جھنڈے کو حرکت دیتے ہوئے ابوسفیان کو سنا کر یہ بات کہی ہے کہ آج کعبہ حلال ہوگا۔ مطلب یہ تھا کہ سرزمینِ حرم میں آج لڑائی ہوگی خون بہے گا اور قریش کو اپنے ظلم اور زیادتی کا خمیازہ بھگتنا ہوگا، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ہرگز نہیں! آج کعبۃ اللہ کی حرمت کا دن ہے اور ساتھ ہی حکم دیا کہ سعد سے علم لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے''۔ اسی طرزِ عمل کا حکم بنی اسرائیل کو دیا گیا تھا۔ سر جھکا کر داخل ہونے سے جسمانی طور پر اللہ کے شکر کی بجا آوری ہو جاتی ہے۔ لیکن اللہ نے اسے تکمیلی شکل دینے کیلئے زبان کو بھی اس سے ہم آہنگ کر دیا اور یہ حکم دیا کہ تم شہر میں داخل ہوتے ہوئے حِطَّۃٌ حِطَّۃٌ کہتے جانا۔

Marfat.com

حِطَّةٌ کی تحقیق

حِطَّةٌ خبر ہے اور اس کا مبتدا محذوف ہے۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ اصل عبارت مَسْئَلَتُنَا حِطَّةٌ ہے۔ حِطَّةٌ اصل میں عبرانی کا لفظ ہے، وہیں سے عربی میں آیا۔ عربی میں اس کا معنی ''جھاڑ دینا'' ہے یعنی گناہوں پر جھاڑ دینا۔ عربی اور عبرانی دونوں قریب الماخذ ہیں اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ عبرانی میں بھی اس کا یہی معنی ہوگا۔ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا کہ تم یہ جملہ زبان سے ادا کرتے ہوئے شہر میں داخل ہونا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! آپ سے ہماری درخواست بخشش اور معافی ہے ہم آپ سے مغفرت چاہتے ہیں۔ ہم سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ہم اپنی غلطیوں سے توبہ کرتے ہیں آپ ہماری غلطیوں کو معاف فرمائیں۔ اس لئے توبہ اور استغفار کرتے ہوئے شہر میں داخل ہونا دوسرا اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم شہر میں داخل ہونے کے بعد شہر کے باشندوں سے درگزر اور معافی کا سلوک کرنا نہ ان کی غلطیوں کی انہیں سزا دینا اور نہ ان پر ظلم کرنا اور بہتر یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں ہی اس بات کا مصداق قرار دی جائیں۔ آیت کے آخر میں مزید دو باتیں ارشاد فرمائی گئیں کہ اگر تم شہر میں داخل ہوتے ہوئے عاجزی کی تصویر بن کے رہو اور تمہاری زبان پر توبہ اور استغفار کے کلمات ہوں اور تمہارا طرزِ عمل بھی انہیں باتوں کا عکاس ہو تو ہم تمہیں خوشخبری دیتے ہیں کہ شہر کو فتح کرنے اور پھر اس میں داخل ہونے اور اہلِ شہر کے ساتھ معاملہ کرنے میں چونکہ سخت انضباطِ نفس کی ضرورت ہے۔ بہت ممکن ہے کہ تم سے غیر شعوری طور پر کوتاہیاں سرزد ہوں یا تمہاری جماعت کے بعض افراد اس اعلیٰ طرزِ عمل اور کردار کا ثبوت نہ دے سکیں تو ہم تمہاری ان لغزشوں کو معاف کر دیں گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی دیتے ہیں کہ اگر تم نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے کردار کی پاکیزگی اور اللہ کے ساتھ تعلق میں مزید بہتری پیدا کر لی اور اپنی بساط کی حد تک بہتری لانے میں کوشاں رہے تو نہ صرف یہ کہ تمہاری غلطیاں معاف کی جائیں گی بلکہ ہم اپنے فضل و کرم میں اضافہ بھی کریں گے۔ محسنین کے لفظ میں بھی دونوں باتوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ احسان کا معنی جس طرح دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیکی کرنا ہے اسی طرح اس کا معنی اپنے طرزِ عمل کو زیادہ سے زیادہ مہذب، پاکیزہ اور خشیتِ الٰہی سے گراں بار بنانا بھی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگوں کے ساتھ احسانات کرو گے اور اپنے آپ کو خشیتِ الٰہی کا آئینہ دار بنا لو گے تو ہم اپنے فضل و کرم میں اس طرح اضافہ کریں گے کہ آج تم نے ایک شہر فتح کیا ہے اس کے بعد مزید فتوحات کا راستہ کھل جائے گا اور تم جب تک اپنے کردار کی خوبیوں اور رعنائیوں کو زندہ رکھو گے اس وقت تک تم اس زمین پر عزت اور سربلندی کے ساتھ زندہ رہو گے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل ان تمام باتوں کا آئینہ دار ہے۔ آپ اور آپ کے صحابہ استغفار اور ذکر اللہ بھی کرتے رہے اور ساتھ ہی عام معافی کا اعلان بھی کر دیا اور جب آپ کے بدترین دشمن بے بس آپ کے سامنے کھڑے تھے تو آپ نے انہیں بجائے سزا دینے کے معاف فرما دیا۔ آپ کے اور صحابہ کرام کے اسی طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ پورا جزیرۂ عرب دو ہی سالوں میں آپ کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اس حکم کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ دوسری آیتِ کریمہ میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ انہیں کہا گیا تھا کہ تم اللہ سے بخشش مانگتے ہوئے حِطَّةٌ حِطَّةٌ کہتے ہوئے عاجزی سے شہر میں داخل ہونا۔ لیکن جو کچھ ان سے کہا گیا تھا انہوں نے یکسر اسے بدل ڈالا۔ یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ انہوں نے حِطَّةٌ کو کس لفظ سے بدلا۔ مفسرین نے مختلف الفاظ نقل کیے ہیں۔ زیادہ ملتا جلتا لفظ حِنْطَةٌ ہے۔ جس کا معنی ہے ''گندم''۔ وہ حِطَّةٌ کی بجائے حِنْطَةٌ حِنْطَةٌ کہتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے یعنی انہوں نے اس لفظ کو ایک ایسے لفظ سے بدلا جس سے اللہ کا حکم مذاق بن کر رہ گیا۔ اس لفظی تبدیلی نے یقیناً ان کے طرزِ عمل میں بھی تبدیلی پیدا

Marfat.com

کی۔وہ بجائے اس کے کہ شہر میں ایک ایسے فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے جو اللہ سے ڈرنے والے اور بندوں کے ساتھ عدل واحسان کا سلوک کرنے والے ہوتے۔انہوں نے اپنی زبان اور عمل سے یہ ثابت کیا کہ ہم ایسے لوگ ہیں جن پر صرف شکم کی حکومت ہے۔ہم تو اس شہر کی نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونا چاہتے ہیں۔جب کوئی قوم بندۂ شکم ہو جاتی ہے تو پھر اس کی غذائی ضرورتیں تمام حدود پامال کر دیتی ہیں۔ان کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشیں ظلم کا راستہ کھولتی ہیں۔پھر نہ صرف کہ لوٹ کھسوٹ ہوتی ہے بلکہ عفتوں کے فانوس بھی بجھتے ہیں۔چنانچہ بنی اسرائیل نے بھی اہلِ شہر پر صرف ظلم کے پہاڑ ہی نہیں توڑے بلکہ بائبل کی روایت کے مطابق وہاں بڑی بدکاریاں کیں اور موآبی عورتوں کی دل کھول کر عزتیں لوٹیں۔عیش وعشرت میں اس حد تک اندھے ہوئے کہ اہلِ شہر کی دعوت پر ان کی مشرکانہ قربانیوں میں بھی شریک ہونے لگے۔اس پر اللہ نے ان پر ایک سخت وبا بھیجی جس میں ان کے 24,000 نفوس ہلاک ہو گئے۔یہی وہ عذاب ہے جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے آسمان سے ان پر عذاب نازل کیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عذاب کی نوعیت عام حوادث سے بالکل مختلف نوعیت کی تھی۔طاعون اللہ کا ایسا ہی عذاب ہے، جو اچانک پھوٹتا ہے اور پھر پھیلتا چلا جاتا ہے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک اور احسانِ عظیم کا ذکر فرمایا ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ
فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ
عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ
وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن
نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنبِتُ
الْأَرْضُ مِن بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ
قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ۚ اهْبِطُوا
مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ ۗ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ
وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ

Marfat.com

اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾

رکوع ۷۔ (اور یاد کرو! جب موسیٰ نے اپنی قوم کیلئے پانی کی دعا کی، تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصاء مارو، تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے جان لیا اپنے اپنے گھاٹ کو۔ (ہم نے کہا) کھاؤ اور پیو، اللہ کے رزق میں سے اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اور یاد کرو! جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے ان نعمتوں میں سے نکالے جو زمین اگاتی ہے، یعنی اس کی سبزیاں، ککڑیاں، لہسن، مسور اور پیاز، کہا گیا بہتر چیز کی بجائے تم ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو۔ کسی شہر میں جا بسو، تو وہ چیز تمہیں مل جائے گی جو تم نے طلب کی ہے، اور ذلت اور پست ہمتی ان پر مسلط کر دی گئی۔ وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے، یہ اس سبب سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ حدودِ شرع سے نکل نکل جاتے تھے) (آیت ۶۰ تا ۶۱)

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ (البقرة: ۶۰)

(اور یاد کرو! جب موسیٰ نے اپنی قوم کیلئے پانی کی دعا کی، تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصاء مارو، تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے جان لیا اپنے اپنے گھاٹ کو۔ (ہم نے کہا) کھاؤ اور پیو، اللہ کے رزق میں سے اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو)

پانی کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر دشتِ صین میں پہنچے تو وہاں پانی کا کوئی چشمہ نہ ملا سخت پریشانی ہوئی۔ کتاب، گنتی، باب ۲۰ تورات میں اسے وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ہم وہیں سے اسے نقل کرتے ہیں:

(اور پہلے مہینہ میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت دشتِ صین میں آ گئی اور وہ لوگ قادس میں رہنے لگے ...... اور جماعت کے لوگوں کیلئے وہاں پانی نہ ملا۔ سو وہ موسیٰ اور ہارون کے خلاف اکٹھے ہوئے اور لوگ موسیٰ سے جھگڑنے اور یہ کہنے لگے، کاش ہم بھی اس وقت مر جاتے جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرے۔ تم خداوند کی جماعت کو اس دشت

Marfat.com

میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی یہاں مریں اور تم نے کیوں ہم کو مصر سے نکال کر اس بری جگہ پہنچایا ہے۔ یہ تو بونے کی اور انجیروں کی اور تاکوں اور اناروں کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہاں تو پینے کے لئے پانی تک میسر نہیں اور موسیٰ اور ہارون جماعت کے پاس سے جا کر خیمۂ اجتماع کے دروازے پر اوندھے منہ گرے۔ تب خداوند کا جلال ان کے اوپر ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اس لاٹھی کو لے اور تو اور تیرا بھائی ہارون تم دونوں جماعت کو اکٹھا کرو اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس چٹان سے کہو کہ وہ اپنا پانی دے اور تو ان کیلئے چٹان سے ہی پانی نکالنا، یوں جماعت کو اور ان کے چوپایوں کو پلانا۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے حضور سے اسی کے حکم کے مطابق وہ لاٹھی لی اور موسیٰ اور ہارون نے جماعت کو اس چٹان کے سامنے اکٹھا کیا اور اس نے ان سے کہا، اے باغیو! کیا ہم تمہارے لئے اس چٹان سے پانی نکالیں۔ تب موسیٰ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس چٹان پر دوبارہ لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہہ نکلا اور جماعت نے اور ان کے چوپایوں نے پیا)

ہر قبیلے کیلئے الگ الگ گھاٹ

تورات کی اس عبارت کو غور سے پڑھیے اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ پانی کی نایابی کے باعث بنی اسرائیل جب نہایت مشکل صورتحال سے دوچار ہوئے تو انہوں نے کس طرح بے صبری کا اظہار کیا اللہ کے دونوں عظیم پیغمبروں کے ساتھ ان کا کیا رویہ رہا وہ بالکل اس بات کو بھول گئے کہ اب تک من وسلویٰ کی صورت میں جو ہماری غذائی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں اور موسم کی شدت سے بچنے کیلئے جو ہمارے سروں پر بادلوں کی چھت تان دی گئی ہے۔ وہ سراسر اللہ کا احسان اور پیغمبر کا معجزہ ہے۔ ہماری کسی کوشش کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ آج اگر ہمیں پانی نہیں مل رہا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ غیر معمولی طریقے سے مہیا فرما دیں گے۔ لیکن انہوں نے تمام آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اللہ کے سامنے بے صبری اور اس کے نبیوں کے سامنے گستاخی کا رویہ اختیار کیا۔ لیکن اس کے بالکل برعکس ہم حدیبیہ میں دیکھتے ہیں کہ پانی بالکل ختم ہو گیا قریش مکہ شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے رہے، قریب قریب پانی کا کوئی چشمہ نہیں لیکن صحابہ نے بالکل بے صبری نہیں دکھائی، البتہ نہایت ادب واحترام سے آنحضرت ﷺ سے دعا کی درخواست کی آپ نے اللہ سے دعا مانگی اور ساتھ ہی ایک بڑے پیالے میں ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ مشکیزے میں پانی کے جو چند قطرے باقی ہیں اسے میرے ہاتھ پر الٹ دو۔ جیسے ہی یہ چند قطرے آپ کے ہاتھ پر گرے تو حضور کی پانچوں انگلیوں سے پانچ چشمے پھوٹ پڑے۔ اور ڈیڑھ ہزار انسانوں اور جانوروں کی پانی کی ضرورت پوری کر دی گئی۔ بنی اسرائیل کو بھی ان کے رویے کی بدصورتی کے باوجود اللہ نے اپنے کرم سے نوازا اور ایک چٹان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے پر بارہ چشمے رواں ہو گئے۔ چونکہ قبیلے بھی بارہ تھے۔ اگر چشموں کی تعداد کم وبیش ہوتی تو یہ لوگ پانی کے حاصل کرنے میں لڑ لڑ کر مر جاتے ہر قبیلے کا گھاٹ مقرر کر دیا گیا تاکہ کسی قبیلے کا دوسرے قبیلے سے تصادم نہ ہو۔ جس چٹان سے یہ چشمے جاری کئے گئے تھے وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ یہ زمین سے تقریباً 15 فٹ بلند ہے۔ سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں ان کی شہادت یہ ہے کہ چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ چٹان میں ہر چشمہ چٹان کی دونوں جانب سے بہتا تھا۔ اس لئے بارہ چشموں کے چوبیس شگاف تھے۔ ہزاروں سال گزر جانے کے باعث صحرا کی اڑتی ہوئی ریت نے بعض شگافوں کو بند کر دیا ہے۔ بعض سیاحوں کی روایت کے مطابق بیس شگاف اب بھی اس میں باقی ہیں۔

Marfat.com

نعمت کا حق

اتنا بڑا انعام کرنے کے بعد فرمایا: کھاؤ اور پیو اور زمین میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔ جب غذائی ضرورت پورا کرنے کیلئے من وسلویٰ کی نعمت عطا کی گئی تھی تو اس وقت صرف فرمایا کلوا من طیبت مارزقنا کم "تمہیں جو پاکیزہ نعمتیں عطا کی ہیں ان نعمتوں میں سے کھاؤ"۔ اب کھانے کی نعمتوں کے ساتھ جب پینے کی نعمت بھی مل گئی اور انسانوں کی غذائی ضرورت پوری ہوگئی تو پھر فرمایا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا "کھاؤ اور پیو" کیونکہ کھانے اور پینے دونوں کا سامان ہو چکا، لیکن ساتھ ہی یہ بات یاد رہے کہ جب بھی کسی قوم میں اللہ کی نعمتوں کی فراوانی ہوتی ہے تو عموماً وہ قوم بجائے اللہ کا شکر ادا کرنے کے ظلم اور ناشکری کا رویہ اختیار کرتی ہے۔ جس سے زمین میں فساد پھیلتا ہے۔ فساد کا سب سے بڑا سبب اللہ کے احکام کی اطاعت نہ کرنا ہے۔ لیکن اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں پر ایک مخصوص طبقہ قابض ہو جائے اور دوسرے لوگ اس سے محروم کر دیئے جائیں۔ نعمتوں سے یہ محرومی محروم طبقوں میں ایک نہ ایک وقت میں اشتعال پیدا کرتی ہے اور یہ اشتعال جب اجتماعی شکل اختیار کرتا ہے تو لاوے کی صورت ابل پڑتا ہے۔ جس سے خانہ جنگی شروع ہوتی ہے اور اجتماعیت برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے یہاں حکم دیا گیا ہے کہ دیکھنا تم یہ رویہ اختیار نہ کرنا۔

مــن وســلــویٰ کے ساتھ پانی کے چشموں کے رواں ہونے سے غذائی ضرورتیں پوری کر دی گئیں اور اس طرح سے صحرا میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور نوازشات اس حد تک پہنچ گئیں جس کے بعد حمد وشکر کے سوا کوئی اور رویہ باقی نہیں رہنا چاہئے۔ بنی اسرائیل کیلئے لازمی تھا کہ ان بنیادی ضرورتوں کے مل جانے کے بعد وہ مقصدی زندگی کی طرف توجہ دیتے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ ہمیں مصر سے نکال کر اس صحرا میں آخر کیوں بسایا گیا ہے۔ ہمیں غلامی سے نجات دے کر آزادانہ زندگی آخر کیوں عطا کی گئی؟ لیکن انہوں نے بجائے ان باتوں پر غور کرنے کے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس کا ذکر اگلی آیتِ کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّاۗىِٕهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ ھُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ ھُوَ خَيْرٌ ۭ اِھْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ (البقرة: ٦١)

(اور یاد کرو! جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے ان نعمتوں میں سے نکالے جو زمین اگاتی ہے۔ یعنی اس کی سبزیاں، ککڑیاں، لہسن، مسور اور پیاز۔ کہا کیا بہتر چیز کی بجائے تم ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو۔ کسی شہر میں جا بسو، تو وہ چیز تمہیں مل جائے گی جو تم نے طلب کی ہے۔ اور ذلت اور پست ہمتی ان پر مسلط کر دی گئی۔ وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے، یہ اس سبب سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ حدودِ شرع سے نکل نکل جاتے تھے)

Marfat.com

چند مشکل الفاظ کی تشریح

آیت کی تشریح سے پہلے چند الفاظ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ آیت میں "بقل" کا لفظ آیا ہے۔ یہ کسی خاص سبزی کا نام نہیں بلکہ اس لفظ کا اطلاق تمام سبزیوں اور ترکاریوں کی تمام اقسام پر ہوتا ہے۔ اسی طرح اس میں لفظ استعمال ہوا ہے "فوم"۔ اس کا معنی لہسن بھی کیا جاتا ہے اور گندم بھی۔ اس لئے مختلف اہلِ علم نے ان میں سے کوئی ایک معنی مراد لیا ہے۔ اس آیت میں ایک لفظ آیا ہے "مصرا"۔ اس سے مراد ملکِ مصر نہیں بلکہ کوئی عام شہر مراد ہے۔ کیونکہ مصر "شہر" کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ جہاں بھی قرآن پاک میں یہ لفظ ملکِ مصر کیلئے استعمال ہوا ہے غیر منصرف استعمال ہوا ہے جس پر تنوین نہیں آیا کرتی اور یہاں یہ منصرف صورت میں آیا ہے اس لئے اس سے کوئی سا بھی شہر مراد ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اس آیتِ کریمہ میں ادنیٰ کا لفظ آیا ہے۔ یہ دناءت سے ہے۔ جس کا معنی ہوتا ہے "گھٹیا" جو خیر کا متضاد ہے۔

ادنیٰ اور خیر سے کیا مراد ہے اور تقابل کن دو چیزوں میں ہے

اس آیتِ کریمہ کو گہرے غور وفکر سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آیت کے الفاظ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل من وسلویٰ کی صورت میں ایک ہی طرح کی غذا کھاتے کھاتے تنگ آگئے تھے اور انہوں نے ان متنوع غذاؤں کا مطالبہ کیا جنہیں کھانے کے وہ عادی تھے۔ اس پر پروردگار نے انہیں ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں من وسلویٰ کی صورت میں اعلیٰ ترین غذا سے نوازا جارہا ہے جو دنیا میں کسی اور کو میسر نہیں۔ لیکن تم ایسے نالائق ہو کہ تم اعلیٰ غذا کو چھوڑ کر غلے اور ترکاریوں سے متعلق غذاؤں کی خواہش کررہے ہو۔ کہاں من وسلویٰ اور کہاں یہ زمین سے اگنے والی معمولی غذائیں۔ حالانکہ اگر یہی بات ہوتی تو کوئی منصف مزاج شخص بھی اس مطالبے کو ناروا کہنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ بہتر سے بہتر غذا بھی آدمی ہمیشہ نہیں کھا سکتا۔ چند ہی دنوں کے بعد ایک طرح کی غذا سے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ ہم لوگ عید قربان کے موقع پر گوشت جیسی اعلیٰ غذا سے نوازے جاتے ہیں۔ لیکن عید کے تین دن گزارنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ لوگ ان تین ہی دنوں میں گوشت سے تنگ آجاتے ہیں اور دوسری چیزیں ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ انسان کی فطرت اور طبیعت کا یہ انداز بھی اللہ ہی کی تخلیق ہے۔ اس لئے اس طرح کی خواہش پر انسان انسانوں کو ملامت نہیں کرتے چہ جائیکہ انسانوں کا خالق کسی فطری مطالبے پر نہ صرف ملامت کرے بلکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کیلئے اسے درسِ عبرت بنادے۔ حقیقت یقیناً اس سے مختلف ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جس سے انسانی جسم کی بقا کا تعلق ہے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق انسان کی روح، انسان کے اخلاق اور اگر وہ انسانوں کا گروہ اللہ کی جانب سے حاملِ دعوت امت بنادیا گیا ہے تو اس کی بقا، عزت وسربلندی اور اولوالعزمی کا تعلق ہے پہلے طرح کی چیزوں کو انسانی ضروریات کہتے ہیں اور دوسری طرح کی چیزوں کو انسانی مقاصد۔ اگر تو مقاصد کے ساتھ ساتھ انسانی ضرورتیں میسر رہیں تو دونوں کا ساتھ لے کر چلنا انسان کیلئے ضروری ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوجائے کہ انسانی ضرورت تکلف کے درجے میں پہنچ جائے اور یا بڑھتے بڑھتے تعیش میں داخل ہوجائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی مقاصد کو نقصان پہنچتا ہے اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب انسانی ضرورتیں مقاصد کی جگہ لے لیتی ہیں۔ پھر ارادے دم توڑنے لگتے ہیں، ولولوں کی موت واقع ہوجاتی ہے، خطرات سے کھیلنا ایک ڈراؤنا خواب بن جاتا ہے، زندگی انسانوں کو گزارنے لگتی ہے۔ انسان زندگی کی کشمکش سے عاری ہوجاتے ہیں۔ ٹھیک یہی وقت ہوتا ہے جب دوسری قومیں ایسی قوم پر چڑھ دوڑتی ہیں اور اسے غلامی کی

Marfat.com

زنجیروں میں جکڑ دیتی ہیں۔ یہ قوم بلند ہمتی، بلند عزمی اور اجتماعی زندگی سے تو پہلے ہی محروم ہو چکی ہوتی ہے اب اس کے سامنے اس کے سوا کوئی ہدف نہیں ہوتا کہ وہ بار برداری کے جانوروں کی طرح فاتح قوم کی ذلیل سے ذلیل خدمات کیلئے اپنی گردنیں جھکا دے اور اپنی بقا کیلئے فاتح قوم کے ہاتھوں غذا کے جو نوالے ملتے رہیں اسی پر اکتفا کر کے بیٹھ جائے۔ چنانچہ یہ چند نوالے ہی اس کے لئے زندگی کا محبوب مقصد بن جاتے ہیں۔ زمین سے اگنے والی ترکاریاں اور زمین سے اگنے والا غلہ ان خاک بازوں کا مطمحِ نظر بن جاتا ہے۔

بنی اسرائیل فرعونیوں کی غلامی کا شکار ہو کر ایسی ہی پست ہمت قوم بن چکی تھی، جس کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہ تھا۔ زمین پر خدمت بجالانے والے جانوروں کی طرح انہیں صرف پیٹ بھر کر چارہ ملنا چاہئے۔ اس کیلئے انہیں کیسی ہی ذلت برداشت کرنا پڑے وہ اس کیلئے تیار تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے اندر جب زندگی کا صور پھونکنا چاہا تو آپ نے محسوس کیا کہ غلامی نے ان کے اندر وہ چیز نہیں رہنے دی جو زندگی کے اہداف کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے انہیں غلامی سے نجات دلائی اور صحرائے سینا کی آزاد فضا میں انہیں آزادی کا درس دینا شروع کیا۔ یہاں وہ حقیقی کشمکش شروع ہوئی جس کی طرف اس آیتِ کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں ایک ایسی زندہ قوم میں تبدیل کرنا چاہتے تھے، جن کیلئے زندگی کی سختیاں زندگی کیلئے سامانِ سفر کی حیثیت رکھتی ہوں، جو کم سے کم کھانے پینے کو اپنے لئے کافی سمجھتی ہو۔ ان کو حقیقی لذت مہمات کے سرانجام دینے میں ملتی ہو وہ اللہ کی رضا کیلئے بڑے سے بڑے خطرے سے کھیلنا بھی اپنے لئے محبوب مشغلہ سمجھتی ہو۔ وہ جانتی ہو کہ مجھے اللہ نے کھانے پینے کیلئے نہیں بلکہ اپنی بندگی اور اس زمین کو اس کی نافرمانی سے پاک کرنے کیلئے اٹھایا ہے۔ اس لئے مجھے اس حقیقی مقصد کو لے کر آگے بڑھنا ہے میری حقیقی لذت پلٹنے جھپٹنے میں ہے۔ پر عیش زندگی میں نہیں۔ میں نے ایک شاہین کی طرح اس خاکدان سے کنارہ کر لیا ہے جہاں رزق صرف آب ودانہ کا نام ہے۔ میرے سامنے وسیع اہداف ہیں، وسیع منزلیں ہیں، میری ہر منزل آبلہ پائی کا تقاضا کرتی ہے۔ مجھے ایک سپاہی کی طرح اپنی ہمت کے گھوڑے پر بھروسہ ہونا چاہئے۔ میرا کم سے کم سامانِ رسد میری کامیابی کی ضمانت ہے۔ میری امیدیں قلیل اور میرے مقاصد جلیل ہیں۔ مجھے ہر وقت مقاصد کی فکر کیلئے فکرمند اور مقاصد کے حصول کیلئے سرگرم رہنا ہے۔ ایسے گروہ، ایسی قوم اور ایسی امت کیلئے ظاہر ہے کھیتی باڑی، کاروبار، اور زندگی کے ایسے ہی دیگر مشاغل کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس لئے جب بنی اسرائیل نے زمین سے اگنے والی نعمتوں کا تقاضا کیا تو یہ تقاضا بجائے خود مکروہ نہیں تھا، لیکن اس میں اصل کراہت اور ہلاکت کی بات یہ تھی کہ یہ اصل میں شاہینوں کو بلند پروازی سے ہٹا کر خاک بازی پہ ڈالنے والی بات تھی اور یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ تم آزادی کی جس نعمت سے ہمیں بہرہ ور کرنا چاہتے ہو اور تم نے ہماری زندگی کیلئے جو نیا اسلوب تجویز کیا ہے ہمیں وہ ہرگز منظور نہیں۔ ہم ایسی روکھی پھیکی غذا جو آسانی کے ساتھ ہمیں مل رہی ہے پر قانع نہیں رہ سکتے۔ ہمیں تو پر تعیش زندگی چاہئے چاہے اس کیلئے غلامی کی ذلت ہی کیوں نہ قبول کرنی پڑے۔ یہاں انہی دونوں باتوں میں تقابل کیا جا رہا ہے کہ مسلسل غلامی نے تمہیں قوت امتیاز سے بھی محروم کر دیا ہے تم صرف کھانے پینے کی چیزوں کو تو جانتے ہو لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ آزادی اور غلامی میں کیا فرق ہے؟ تم چٹخاروں کے ایسے رسیا ہو گئے ہو کہ تم فرعون کی غلامی میں رہ کر پیٹ بھر کر کھانے کو پسند کرتے ہو۔ لیکن اگر تمہیں یہ چیزیں میسر نہ آئیں تو تمہارے نزدیک اس آزادی کی بھی کوئی قدر و قیمت نہیں جس میں اللہ کے سوا کسی کی کوئی حکومت نہیں۔ حالانکہ ہاتف غیبی یہ پکارتا سنائی دیتا ہے۔

سنو اے ساکنانِ ارضِ ہستی، ندا یہ آ رہی ہے آسمان سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

Marfat.com

یہ حادثہ صرف بنی اسرائیل کا نہیں تاریخ عالم ایسے حوادث سے بھرپور ہے۔ جب بھی قومیں دل کی بجائے پیٹ کی بات سننے لگتی ہیں اور مقاصد سے تہی دامن ہو کر ضروریاتِ زندگی کو مقاصد بنا لیتی ہیں تو پھر ان کی تہذیب اور ان کا تمدن ان کی معنوی، روحانی اور فتوحاتی زندگی کا آئینہ دار نہیں ہوتے بلکہ مطعومات و مشروبات اور ملبوسات میں حد سے بڑھے ہوئے تنوع اور زندگی کے طور اطوار میں تکلفات اور تعیشات کے عکاس ہوتے ہیں۔ بے ضرورت بڑی سے بڑی عمارتوں کا اٹھانا، انسانوں کو طبقات میں تقسیم کرنا، اور ایک اعلیٰ کلاس کو ملاء اعلیٰ کی مخلوق بنا دینا، وسائل زندگی کی فکر میں ڈوبے رہنا اور خود زندگی کی اعلیٰ صفات کو نظر انداز کر دینا ان کا معمول بن جاتا ہے۔ ایسی قوم دھرتی کا بوجھ بن جاتی ہے۔ بظاہر ان کے چہرے روشن ہوتے ہیں لیکن دل اجاڑ ہوتے ہیں۔ ان کی عیش گاہیں، ان کے کلب، ان کے ہوٹل آباد ہوتے ہیں، لیکن ان کے گھر ویران ہوتے ہیں۔ یہ زمین پر رینگنے والے حشرات الارض کی طرح بے بسی، بے ہمتی اور ناتوانی کی منہ بولتی تصویر ہوتے ہیں۔ جن میں زندگی کی کوئی امنگ نہیں ہوتی۔ الفاظ کے طوطے مینا اڑاتے اور زندگی کی حقیقتوں سے جی چرانے والے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسی انسانی بھیڑ پر جب بھی کوئی طاقتور حملہ کرتا ہے تو انہیں اپنا غلام بنا لیتا ہے۔ کوئی سراج الدولہ اور کوئی ٹیپو اور کوئی سید احمد اور شاہ اسماعیل اور کوئی سنوسی جان دے کر بھی انہیں زندگی کا درس دینے سے عاری رہتا ہے اور ان جیسے لوگوں کی قربانیوں کے اثرات سے اگر سیاسی آزادی مل بھی جاتی ہے تو تہذیبی، تمدنی، معاشی اور علمی آزادی نصیب نہیں ہوتی۔

اِھبطوا مصراً کا مفہوم

بنی اسرائیل جب غلامی کے اثرات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی کاوشوں سے بھی نکل نہ پائے تو اللہ نے حکم دیا کہ اگر وہ عظیم مقصد تمہیں عزیز نہیں جس کیلئے یہ صحرانوردی کرائی جارہی ہے۔ بلکہ اس کے مقابلے میں تم اپنے کام و دہن کی لذت کو چھوڑنے کیلئے بھی تیار نہیں ہو تو پھر یہ چیزیں تمہیں کسی شہر میں مل سکتی ہیں تمہارے سامنے صحرائے سینا کی بستیاں یا ارضِ فلسطین ہے اس کے کسی شہر کو فتح کر لو تو جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تمہیں مل جائے گا۔ لیکن یاد رکھو! تمہیں اس کیلئے اپنے بلند منصب سے نیچے اترنا ہوگا۔ کیونکہ کھیتی باڑی کرنا حاملِ دعوت امتوں کا کام نہیں ہوتا۔ یہ کام دوسری قومیں انجام دیتی ہیں۔ اس لئے جب مدینہ طیبہ میں مسلمانوں نے اپنی کھیتی باڑی اور کاروبار کی دیکھ بھال کی اجازت مانگی تھی تو پروردگار نے فرمایا تھا: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ''اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں مت ڈالو''۔ یعنی تم دنیا کی قسمتیں بنانے اٹھے ہو۔ تمہاری قوت دعوت و جہاد میں ہے، ان کاموں میں نہیں۔ بنی اسرائیل سے بھی یہی فرمایا جارہا ہے، ھبوط ''مہمان کے اترنے'' کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کا اصل معنی بلندی سے پستی کی طرف اترنا یا گرنا بھی ہے۔ اس سے اشارہ اسی گراوٹ کی طرف ہے۔ یہاں مصر سے مراد ملکِ مصر نہیں بلکہ کوئی سا بھی شہر ہے۔ لیکن مصر کا لفظ لا کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جب تم اصل مقصد بھول کر لذتِ کام و دہن میں لگ جاؤ گے، تو پھر یاد رکھو کہ تم پھر کسی نہ کسی مصر کی غلامی کے شکنجے میں جا پھنسو گے کیونکہ شکم پروری غلامی کا ہمیشہ پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں قومی افتخار اجتماعی قوت اور مقصدی یگانگت قصۂ پارینہ بن جاتی ہیں۔ پوری قوم افراد کا ایک بے ہنگم گروہ ایک منتشر بھیڑ اور جانوروں کا ایک ایسا ریوڑ بن جاتی ہے، جس پر ذلت و مسکنت اور بے بسی اور ناتوانی کی مہر لگ جاتی ہے۔ یہ زندہ رہتی ہے مگر عبرت کی تصویر بن کر۔

Marfat.com

بنی اسرائیل عبرت کیلئے زندہ ہے

چنانچہ بنی اسرائیل تاریخ کے مختلف ادوار میں اسی حوالے سے پہچانے جاتے ہیں اور قرآنِ کریم یہاں بتا رہا ہے کہ ان کی سرکشی اور بد عملی کے باعث اللہ نے ان پر جو عذاب مسلط کیا ہے وہ اسی ذلت و مسکنت کا عذاب تھا۔ انہیں قدرت نے بار بار سنبھلنے کا موقع دیا لیکن جیسے جیسے ان کی سرکشی بڑھتی گئی ویسے ویسے عذاب کا شکنجہ کسا جاتا رہا۔ عجیب بات یہ ہے کہ قومیں بنتی، اٹھتی، زوال پذیر ہوتیں اور فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں اور پھر ان کے صرف تذکرے باقی رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس قوم کو اللہ نے نشانِ عبرت کے طور پر آج تک زندہ رکھا ہوا ہے۔ انہیں آخری سنبھلنے کا موقعہ آنحضرت ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کی صورت میں میسر آیا لیکن جب انہوں نے اس سے بھی فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا تو یہ عذاب ان کیلئے تقدیر مبرم بن گیا۔ تاریخ کا ہر دور اس کی تصدیق کرتا رہا ہے یروشلم اور فلسطین سے تو بہت عرصہ پہلے نکالے جا چکے تھے۔ لیکن پھر نجران، مدینہ اور خیبر بھی ان کی پناہ گاہ نہ بن سکا۔ وہاں سے نکالے گئے تو یورپ کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے۔ لیکن چونکہ یہ اپنی قومی خباثتوں سے باز نہیں آتے اور یہ شائد اللہ ہی کے عذاب کا اثر ہے اس لئے وقتاً فوقتاً جو قوم بھی ان کو پناہ دیتی رہی، اسی کے ہاتھوں یہ عذاب کا شکار بھی ہوتے رہے۔ نازی جرمنی میں ان کا قتلِ عام کیا گیا، اٹلی، ہنگری اور رومانیہ وغیرہ میں بھی ادھیڑے کھدیڑے گئے۔ آج اگرچہ اسرائیلی ریاست کے نام سے یہ ایک مملکت کے مالک ہیں لیکن یہ بات کسی تعجب کا باعث نہیں ہونی چاہئے کیونکہ قرآنِ کریم نے سورۃ آل عمران چوتھے پارے میں واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا تھا:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ

(ان پر ذلت تھوپ دی گئی ہے وہ جہاں بھی پائے جائیں۔ سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی رسی کو پکڑ لیں یا لوگوں کی پناہ میں آجائیں)

یعنی یہ عذاب ہر جگہ ان کا پیچھا کرے گا۔ یہ ذلت کی تصویر بنے رہیں گے۔ اس سے نکلنے کی صرف دو صورتیں ہیں، ایک مستقل ہے ایک عارضی ہے۔ مستقل صورت یہ ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو تھام لیں۔ یعنی اسلام قبول کر لیں۔ اس کے بعد ان کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہوگی یہود کی نہیں اور دوسری عارضی صورت یہ ہے کہ وہ کسی بڑی مملکت اور حکومت کی پناہ میں آجائیں۔ آج کی اسرائیلی ریاست ہر اہلِ نظر جانتا ہے کہ امریکہ کی چھاؤنی ہے۔ یوں تو پوری دنیائے کفر اسے دودھ پلا کر پال رہی ہے لیکن امریکہ بطورِ خاص اس کے لئے پناہ مہیا کرتا ہے۔ اسے توانائی فراہم کرنے کیلئے عراق کو تباہ کیا گیا اور مصر کے ساتھ جنگِ رمضان میں پوری طرح اسے تحفظ دیا گیا۔ بالآخر صدر سادات کو کہنا پڑا کہ میں اسرائیل سے تو لڑ سکتا ہوں امریکہ سے نہیں لڑ سکتا۔ پوری دنیا اگر اس کے نسلی تعصبات اور ظالمانہ اقدامات کے خلاف کوئی قراردادِ مذمت پاس کرتی ہے تو امریکہ اسے ویٹو کر دیتا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسرائیلی ریاست اصل میں امریکی ریاست ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور آج اس ریاست کو پناہ دینے والے اس کے خاتمے کا باعث بنیں گے کیونکہ یہود اپنی عقربی خصلت کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ وہ اپنے محسنوں کو بھی نیش زنی سے باز نہیں کر سکتے اور جہاں تک ان کی مسکنت کا تعلق ہے یعنی ان کی غربت اور مفلسی کا، تو اس پر بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے اگرچہ دنیا میں یہود کا مالدار ہونا ایک ضرب المثل بن گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ محض دھوکہ اور مغالطہ ہے۔ دولت و ثروت جتنی بھی ہے، وہ قومِ یہود کے صرف اکابر و مشاہیر تک محدود ہے ورنہ عوام یہود کا شمار دنیا کی مفلس ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

Marfat.com

سائیکلوپیڈیا جلد ۱۰ صفحہ نمبر ۱۵۱ میں لکھا ہے (گو یہود کا تمول ضرب المثل کی حد تک شہرت پا چکا ہے۔ لیکن اہلِ تحقیق کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جس جس ملک میں آباد ہیں وہاں کی آبادی میں انہیں کے مفلسوں کا تناسب سب سے بڑھا ہوا ہے۔) اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۱ میں ہے (عموماً یہود دوسری قوموں سے کہیں زیادہ غریب ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے چند افراد بہت زیادہ دولت مند ہیں۔)

بنی اسرائیل کے مبتلائے عذاب ہونے کی وجوہ

آیت کریمہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے جو ان کو سزائیں دیں اور ان پر جو عذاب مسلط کیے اس کی دو وجہ بیان فرمائی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ اس انکار کی تین صورتیں تھیں۔ کبھی تو وہ اللہ کے احکام کو صاف صاف ماننے سے انکار کر دیتے تھے کبھی احکام کو ماننے کے باوجود اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیتے تھے اور تیسری صورت یہ تھی کہ اللہ کے احکام کی ایسی تاویلیں کرتے تھے جو احکام کی صورت اور حقیقت دونوں کو بدل کر رکھ دیتی تھیں۔ درحقیقت وہ صرف اپنی خواہش کے پرستار تھے۔ بظاہر وہ اپنے آپ کو مومن اور مسلم کہتے تھے لیکن عمل کے اعتبار سے اللہ کے دین سے ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی یہ سرکشی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اللہ کے نبیوں کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ جسارت کی انتہا یہ تھی کہ وہ اپنے ان اعمالِ شنیعہ کیلئے کسی تاویل کا سہارا بھی نہیں لیتے تھے بلکہ وہ اپنے ان ظالمانہ کرتوتوں پر فخر کا اظہار کرتے تھے۔

بغیر الحق کا مفہوم

قرآن کریم نے بغیر الحق کہہ کر شاید اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جدید تحقیق سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود ان قاتلوں کے معیار سے بھی یہ قتل ناجائز تھے۔ یعنی خلافِ عدل تو تھے ہی قانونِ وقت کے لحاظ سے خلافِ قانون اور بے ضابطہ بھی تھے۔ سلسلہ اسرائیلی کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ ان پر جس طرح الزامات لگائے گئے اور جس طرح ان کے مقدمے کا فیصلہ ہوا اور جس طرح صلیب تک پہنچانے کی کوشش کی گئی حال ہی میں اٹلی کے ایک ایڈووکیٹ روزیڈی (Rosedi) اور انگلستان کے ایک بیرسٹر (Innes) نے قدیم دستاویزات کی چھان بین کر کے آپ کے مقدمہ کی روداد یں الگ الگ شائع کی ہیں ان کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے مقدمہ میں یہ نہیں ہوا کہ رومی حاکم عدالت سے سزائے صلیب کا فیصلہ سنانے میں کوئی اجتہادی غلطی ہوگئی ہو بلکہ ہوا یہ کہ یہود نے ایک بالکل جھوٹا استغاثہ کھڑا اور پہلے اپنی مذہبی عدالت میں اور پھر ملک کی عام فوجداری عدالت میں بالکل ہی بے ضابطہ کارروائیاں کر کے حکمِ سزا دلوانے میں کامیاب ہوگئے۔ رومی اور جیسے بھی کچھ ہوں آئین دوستی اور قانون پرستی تو ان کی مشہور رہی ہے۔ جب ان تک کے عہد میں یہ اندھیر ہوا تو پھر قدیم ترین انبیاء کی مظلومیت کا کیا ٹھکانہ جن کے قتل میں غالباً ضابطہ کی ظاہری اور رسمی صورت بھی نہیں برتی گئی۔ بغیر الحق سے اس صورتِ حال کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

ہم تفہیم القرآن سے مثال کے طور پر بائبل کے چند واقعات کو نقل کرتے ہیں، جس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قرآنِ کریم نے قتل انبیاء کا جو ان پر الزام لگایا ہے، وہ خود اس کے معترف تھے۔

Marfat.com

۱۔ حضرت سلیمان کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہوکر دو ریاستوں (یروشلم کی دولت یہودیہ اور سامریہ کی دولت اسرائیل) میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہود کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی آرامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرمانروا آسا کو کو سخت تنبیہ کی۔ مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کی بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ (تواریخ، باب ۱۷، آیت ۷۔۱۰)

۲۔ حضرت الیاس (ایلیاء Elliah) علیہ السلام نے جب بعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور از سرِ نو توحید کی دعوت کا صور پھونکنا شروع کیا تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کے پیچھے پڑ گیا، حتیٰ کی انہیں جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ اس موقع پر جو دعا حضرت الیاس نے مانگی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

''بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا........... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں، سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔'' (۱۔ سلاطین، باب ۱۹، آیت ۱۔۱۰)

۳۔ ایک اور نبی حضرت میکایاہ کو اسی اخی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا (۱۔ سلاطین، باب ۲۲، آیت ۲۶۔۲۷)

۴۔ پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریاء نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے انہیں عین ہیکل سلیمانی میں مقدس او رقربان گاہ کے درمیان سنگسار کردیا گیا۔ (۲۔ تواریخ، باب ۲۴، آیت ۲۱)

۵۔ اس کے بعد جب سامریہ کی اسرائیلی ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم ہوچکی اور یروشلم کی یہودی ریاست کے سر پر تباہی کا طوفان تلا کھڑا تھا تو یرمیاہ نبی اپنی قوم کے زوال پر ماتم کرنے اٹھے اور کوچے کوچے انہوں نے پکارنا شروع کیا کہ سنبھل جاؤ ورنہ تمہارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہوگا۔ مگر قوم کی طرف سے جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے ان پر لعنت اور پھٹکار کی بارش ہوئی، پیٹے گئے، قید کیئے گئے، رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیئے گئے تاکہ بھوک اور پیاس سے وہیں سوکھ سوکھ کر مرجائیں اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ قوم کے غدار ہیں، بیرونی دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں۔ (یرمیاہ، باب ۱۵، آیت ۱۰، باب ۱۸، آیت ۲۰۔۲۳، باب ۲۰، آیت ۱۔۱۸ باب ۳۶ تا باب ۴۰)

۶۔ ایک اور نبی حضرت عاموس کے متعلق لکھا ہے کہ جب انہوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے برے انجام سے خبردار کیا تو انہیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوت کرو۔ (عاموس، باب ۷، آیت ۱۰۔۱۳)

۷۔ حضرت یحییٰ (یوحنا) علیہ السلام نے جب ان بداخلاقیوں کے خلاف آواز اٹھائی جو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے دربار میں کھلم کھلا ہو رہی تھیں، تو پہلے وہ قید کئے گئے پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کردیا۔ (مرقس، باب ۶، آیت، ۱۷۔۲۹)

Marfat.com

۸۔ آخر میں حضرت عیسٰی علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے علماء اور سردارانِ قوم کا غصہ بھڑکا کیونکہ وہ انہیں ان کے گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان وراستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا، رومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا اور جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمہاری خاطر یسوع اور برابّا ڈاکو دونوں میں سے کس کو رہا کروں، تو ان کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ برابّا کو چھوڑ دے اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا۔ (متی، باب ۲۷۔ آیت ۲۰ تا ۲۶)

یہ ہے اس قوم کی کی داستانِ جرائم کا ایک نہایت شرمناک باب جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں مختصراً اشارہ کیا گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس قوم نے اپنے فساق و فجار کو سرداری و سربراہ کاری کیلئے اور اپنے صلحا اور ابرار کو جیل اور دار کیلئے پسند کیا ہو، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی لعنت کے لئے پسند نہ کرتا تو آخر اور کیا کرتا۔ (تفہیم القرآن جلد اول، ص: ۸۱، ۸۱، ۸۲، حاشیہ نمبر ۷۹)

ممکن ہے آپ کو اس بات پر حیرت ہو رہی ہو کہ بنی اسرائیل اپنے بگاڑ میں اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ وہ اللہ کے نبیوں کو قتل کرنے کی جسارت کر گزرتے تھے۔ لیکن اے کاش! ہم کبھی اپنی تاریخ کے آئینہ میں بھی جھانک کر دیکھیں بلکہ آج ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسے دیکھ کر اندازہ کریں کہ کیا ہمارے گریبان کی کوئی دھجی باقی رہ گئی ہے؟ میں دور کی بات نہیں کرتا 1857 کے حالات ہماری قومی تاریخ کے ابواب ہیں۔ اس میں ہمارے امراء اور جاگیرداروں نے کیا رول ادا کیا؟ اور پھر جن لوگوں نے ہمیں غلامی کی دلدل سے نکالنا چاہا اور انہوں نے استعمار سے پنجہ آزمائی کی ہم نے اس فیصلہ کی کشمکش میں کس کا ساتھ دیا؟ سراج الدولہ کس کی غداری کا شکار ہوئے؟ سلطان ٹیپو کن لوگوں کی سازشوں سے مارے گئے؟ سید احمد شہید اور ان کے ساتھی کن لوگوں کی مخبری پر شہید کئے گئے؟ اور سرحد میں خلافت کا نظام قائم ہو جانے کے بعد وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ایک ہی رات میں ان مقدس لوگوں کو کہ گزشتہ پانچ سو سال کی تاریخ میں جن کی نظیر نہیں ملتی ایک ہی رات میں قتل کر ڈالا؟ آج پوری دنیائے اسلام میں حق و باطل کا ایک معرکہ برپا ہے۔ ایک طرف کروسیڈی امریکہ اور اس کے حمائتی ہیں اور دوسری طرف اسلام سے والہانہ محبت رکھنے والا طبقہ ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے! ان نیک نہاد اور سرفروش مخلص مسلمانوں کو کون پکڑ پکڑ کر کفر کی طاقتوں کے حوالے کر رہا ہے؟ خود عالم اسلام کے اکثر ملکوں کی جیلیں کن لوگوں سے بھری جا رہی ہیں؟ کون لوگ ہیں جن کو دہشت گرد قرار دے کر نشانِ عبرت بنایا جا رہا ہے؟ اور کون لوگ ہیں جن پر اللہ کی زمین تنگ کر دی گئی ہے؟ اور جو لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ کون لوگ ہیں؟ اور کن لوگوں کے ساتھی ہیں؟ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی کیا اس پر تعجب ہونا چاہئے کہ بنی اسرائیل اس حد تک کیوں پہنچ گئے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ:۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ شکن نئے
وہی قوتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

اسی لئے اگلی آیتِ کریمہ میں تمام مذہبی گروہوں کا نام لے کر اصولی بات کہی گئی ہے۔ جو اللہ کے دین کا اصل تقاضا ہے اور جس دنیا اور آخرت کی کامیابی کا دارومدار ہے۔

Marfat.com

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَ
الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾
وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَا اٰتَيْنٰكُمْ
بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ
بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ
فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۚ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى
لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا
هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا ادْعُ
لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا
فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا
بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ

Marfat.com

شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ
تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَاؕ قَالُوا
الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع

رکوع ۸۔ (اور جولوگ ایمان لاچکے ہیں اور جولوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی۔(غرض) جوکوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، سوان سب کیلئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے اور نہ کوئی اندیشہ ان کیلئے ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے۔اور یاد کرو! جب ہم نے تم سے عہد لیا اور ہم نے تمہارے اوپر کوہِ طور کو بلند کیا۔(اور کہا) پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ اور جو کچھ اس میں ہے، اس کو یاد رکھو تا کہ تم متقی بن جاؤ۔ پھر تم نے اس کے بعد اعراض کیا تو اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم نامرادوں میں سے ہو چکے ہوتے۔اور تم خوب جان چکے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے سبت کے بارے میں تجاوز کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ o پھر ہم نے اسے عبرت بنادیا اس زمانہ کے اور اس کے بعد کے لوگوں کیلئے اور نصیحت بنادیا اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے۔اور وہ وقت یاد کرو! جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ذبح کرو ایک گائے۔وہ بولے کہ آپ ہمارا انداق اڑا رہے ہیں۔موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں۔انہوں نے کہا! ہماری طرف سے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، دونوں عمروں کے درمیان ہو۔سو اب کر ڈالو جو کچھ تمہیں حکم دیا جا رہا ہے o وہ بولے! اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو۔دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو o وہ بولے! اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ اچھی طرح واضح کردے کہ وہ کیسی ہو؟ اس لئے کہ گایوں کے امتیاز میں گھپلا ہو رہا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے o موسیٰ علیہ السلام نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت کرنے والی نہ ہو، جو زمین کو جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو۔بالکل یک رنگ ہو۔اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔وہ بولے !اب تم واضح بات لائے ہو۔پھر انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے) (آیت ٦٢ تا ٧١)

Marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَاخَوْفٌ
عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ ٥ (البقرة: ٦٢)

(اور جولوگ ایمان لا چکے ہیں اور جولوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی۔ (غرض) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، سوان سب کیلئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے اور نہ کوئی اندیشہ ان کیلئے ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے)

اَلَّذِیْنَ هَادُوْا سے مراد

اس آیتِ کریمہ میں چار گروہوں کا ذکر کرنے کے بعد ایک اصولی بات ارشاد فرمائی ہے۔ ہم اس کی وضاحت کرنے سے پہلے ہم ان چاروں گروہوں کا تعارف کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والے مومن اور مسلمان مراد ہیں۔ اَلَّذِیْنَ هَادُوْا سے وہ لوگ مراد ہیں۔ جنہوں نے یہودیت اختیار کی یہودی مذہب کے پیروکار بن گئے اور اپنا نام یہودی رکھ لیا۔ اس لفظ کے استعمال کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل اپنے حقیقی مذہب کے اعتبار سے تو مسلمان ہی تھے۔ لیکن جب ان میں بگاڑ انتہا کو پہنچ گیا تو وہ اپنا اصل نام تک بھول گئے۔ انہوں نے مسلمان کہلانے کی بجائے اپنے آپ کو یہودی کہلانا شروع کر دیا۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ان میں چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہوذا کی اولاد کو حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے تک پہنچ کر وہ چونکہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئے اس لئے انہوں نے اپنا اصل نام چھوڑ کر یہوذا کی طرف اپنی نسبت کر لی اور باقی گروہوں نے بھی رفتہ رفتہ اسی نام کو اپنے مذہبی اور قومی نام کے طور پر قبول کر لیا۔ شروع شروع میں ممکن ہے تلفظ کچھ مختلف رہا ہو لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہودی کا لفظ مستحکم ہو گیا۔ اب اس نام کے ساتھ جو لوگ اپنے آپ کو منسوب کر رہے تھے۔ ان میں ایک گروہ تو وہ تھا جو نسب کے اعتبار سے بنی اسرائیل کہلاتا تھا اور دوسرا گروہ وہ تھا جنہوں نے یہودیوں کے زیرِ اثر رہنے کی وجہ سے یہ مذہب اختیار کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب یہود ایک نسلی مذہب ہے تبلیغی مذہب نہیں۔ کسی غیر اسرائیلی کو باضابطہ یہودی بنانے کا طریقہ ان کے ہاں بالکل نہیں۔ لیکن عرب میں متعدد قبیلے ایسے آباد تھے جو نہ پیدائشی یہودی تھے نہ نسلاً اسرائیلی بلکہ عرب یا غیر بنی اسرائیل تھے۔ لیکن یہود کی صحبت سے متاثر اور ان کے علوم سے مرعوب ہو کر انہوں نے پہلے یہود کے طور طریقے اور پھر ان کے عقیدے اختیار کر لئے اور رفتہ رفتہ ان کا شمار بھی یہودی آبادی میں ہونے لگا۔ بجائے الیہود کے اَلَّذِیْنَ هَادُوْا لانے میں یہی نکتہ مضمر ہے۔ تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ یہاں ذکر جس گروہ کا ہو رہا ہے اس سے مراد صرف بنی اسرائیل نہیں بلکہ وہ تمام لوگ مراد ہیں جو مذہب یہود سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل کی قومی حکومت و وجاہت کا خاتمہ تو ظہورِ اسلام سے مدتوں پہلے بلکہ کہنا چاہئے کہ ۷۰ عیسوی میں مشرک رومیوں کے ہاتھوں بیت المقدس کی بربادی کے بعد ہی ہو گیا تھا اور رسول ﷺ کے معاصرین یہود کی حیثیت صرف مذہبی اور دینی فرقہ کی رہ گئی تھی۔ یہاں اسی فرقہ کا ذکر ہو رہا ہے۔

Marfat.com

نصاریٰ کون ہیں؟

اَلنَّصٰرٰی: نصاریٰ جمع ہے،نصرانی کی۔ملکِ شام(حال فلسطین) میں ایک قصبہ ناصرہ ہے۔علاقہ گلیلی میں بیت المقدس سے ستر میل شمال میں اور بحرِ روم سے مشرق میں بیس میل کے فاصلے پر موجودہ آبادی آٹھ اور نو ہزار کے درمیان ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آبائی وطن یہی قصبہ ہے اور آپ یسوع ناصری اسی مناسبت سے کہلاتے ہیں۔ناصرہ ہی کو عربی تلفظ میں نصران بھی کہتے ہیں۔نصرانی کا انتساب اسی قصبہ کی جانب ہے۔ سموا بذلک انتساباً الی قریة یقالُ لها نصران (راغب) نصران قریة بالشام ینسب الیه النصٰری (جوھری) یہی اشتقاق ایک روایت میں حضرت ابن عباس صحابی سے ابن جریر نے نقل کیا ہے اور یہی قول قتادہ و ابن جریج تابعین کا ہے۔بعض نے اسے عربی کا لفظ فرض کر کے نصرت سے مستقق سمجھا ہے۔لیکن قول صحیح یہی ہے جو ابھی گزر چکا ہے۔خوب خیال کرلیا جائے کہ قرآن یہاں ذکر مسیحیوں کا نہیں نصاریٰ کا کر رہا ہے اور قرآنِ کریم کا ہر لفظ پُر حکمت ہوتا ہے۔مسیحی وہ ہیں جو اناجیلِ اربع پر ایمان رکھتے ہیں۔مسیح کو خدا کا نبی نہیں، خدا کا بیٹا مانتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ان کے قالب میں حلول کر آیا تھا۔آخرت میں نجات دینے والا خدا کو نہیں مسیح ابن اللہ کو یقین کرتے ہیں۔اور خدائی کو تین اقنوموں میں تقسیم کر کے ایک ناقابلِ فہم فلسفہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر اقنوم بجائے خود بھی خدا ہے اور تین اقنوم مل کر بھی ایک ہی خدا بنتے ہیں۔اس کھلے ہوئے شرک کے قائلوں کا ذکر ہرگز اس مقام پر مقصود نہیں اس لئے نام بھی جو مشہور اور چلا ہوا تھا اسے ترک کر کے نصاریٰ لایا گیا۔نصاریٰ۔نصرانی معرب ہے Nazarene کا۔حضرت مسیح کے سچے پیروان کو نبی ماننے والے ابتدائی زمانے میں Nazarenes کہلاتے تھے۔یہ توحید کے قائل تھے اور بجائے اناجیلِ اربع کے صرف انجیل متی کو مانتے تھے۔آگے چل کر یہی لوگ ابونیہ بھی کہلائے۔لیکن جب مشرکانہ عقائد کا زور بندھا اور اصل مسیحیت حلولیت اور تثلیث ہی قرار پا گئی تو قدرۃً نصرانیت کا ستارہ بھی گردش میں آیا اور نصرانی اور نصرانیت کے الفاظ بجائے عزت و تکریم کے تحقیر کے موقع اور ذم کے محل میں استعمال ہونے لگے۔موجودہ مسیحیت سرتاسر پولوسیت ہے۔اور تمام تر پولوس Paul طرسوی کی تعلیمات پر مبنی ہے۔یہ حضرت مسیح کے چند روز بعد ہی شروع ہو گئی تھی اور نصرانی اس کے بالکل منکر تھے۔ (تفسیر ماجدی)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ کریم جس گروہ کا نصاریٰ کے نام سے ذکر کرتا ہے۔وہ موجودہ عیسائی نہیں ہیں جو اپنے آپ کو مسیحی کہلانا پسند کرتے ہیں اور نصاریٰ کے لفظ کو باعث تحقیر سمجھتے ہیں۔قرآنِ کریم نے عیسیٰ علیہ السلام کے جن پیروکاروں کی تعریف کی ہے اور جنہیں مسلمانوں کے قریب قرار دیا ہے، وہ وہ لوگ تھے جو کہتے تھے، انا نصاریٰ "ہم نصاریٰ ہیں" اور اس پر فخر کرتے تھے۔یہ لوگ خلیفۂ برحق شمعون کے پیروکار تھے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے جانشینوں نے آنحضرت ﷺ پر ایمان لا کر اسلام کی دولت پائی۔

صابیوں سے کون مراد ہیں؟

اَلصَّابِئِیْنَ: صابی کی جمع ہے۔اس کے لفظی معنی میں مختلف باتیں کہی جاتی ہیں۔بعض اہلِ علم کا گمان ہے کہ یہ لفظ "صباء" سے بنا ہے۔صباء کے معنی "طلوع ہونے" کے ہوتے ہیں۔ممکن ہے یہ لوگ اپنی ستارہ شناسی اور معرفت نجوم میں مہارت کے سبب سے اس نام سے موسوم ہوئے ہوں۔لیکن مشرکین مکہ نے جس طرح اس لفظ کا استعمال کیا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صابی اس شخص کو کہتے تھے جو اپنے دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں آجائے یا اس کی طرف مائل ہو جائے۔امامِ راغب نے اس کا یہی معنی کیا ہے۔یہ ایک مذہبی فرقہ گزرا ہے، جو عرب

Marfat.com

کے شمال مشرق میں شام و عراق کی سرحد پر آباد تھا اور بعض لوگ جزیرہ موصل کو اس کا مسکن قرار دیتے ہیں۔ ان کے اعتقادات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ یہ لوگ دینِ توحید اور عقیدۂ رسالت کے قائل تھے اور اس لئے اصلاً اہلِ کتاب میں سے تھے۔ اپنے آپ کو نصاریٰ یحییٰ کہتے تھے۔ گویا حضرت یحییٰ علیہ السلام کی امت تھے۔ حضرت عمر اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسے محقق صحابہ نے ان کا شمار اہلِ کتاب میں کیا ہے۔ اس لئے وہ ان کے ذبیحہ کو حلال سمجھتے تھے۔ البتہ مجاہد اور حسن کا خیال یہ ہے کہ یہ لوگ کسی خاص دین کے پیرو نہیں تھے بلکہ یہودیت اور مجوسیت کے مابین تھے۔ لیکن قتادہ اور حسن بصری سے یہاں تک منقول ہے کہ وہ اہلِ قبلہ تھے اور پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو خود بھی عراقی تھے اس لئے زیادہ امکان ہے کہ وہ ان کے بارے میں زیادہ آگاہی رکھتے ہوں۔ وہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال سمجھتے تھے اور ان کی عورتوں سے نکاح بھی جائز قرار دیتے تھے۔ تاریخِ عراق پر ایک مستند مستشرق کی کتاب کا اردو ترجمہ کچھ عرصہ پہلے انجمنِ ترقی اردو دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کے صفحہ ۴۷ پر فاضل مترجم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور لفظ مینڈین Mandean پر حاشیہ دیتے ہیں۔

(مینڈین بزبان آرامی بمعنی اولوالعلم اس فرقہ کے لوگ عراق میں اب بھی موجود ہیں اور صابیون کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ اگرچہ عیسائی نہیں ہیں تاہم جان دی بپٹسٹ کو مانتے ہیں۔ عراق کے عوام الناس ان کو حضرت یحییٰ کی امت کہتے ہیں) (ایران بہ عہد ساسانیاں)

حقیقت یہ ہے کہ یہ محض اندازے ہیں اس مذہب کے ماننے والوں کا اب کہیں وجود نہیں ملتا، نہ کوئی ان کی مستند تاریخ موجود ہے۔ اس وجہ سے ان کے متعلق اعتماد سے کوئی بات کہنا مشکل ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کے زمانہ نزول میں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرقہ کی حیثیت سے ان لوگوں کا وجود بالکل معروف تھا۔

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں بنی اسرائیل جو اللہ کے نبیوں کی اولاد تھے، پروردگار نے ان پر اپنے بے پایاں احسانات کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں کا تذکرہ بھی فرمایا۔ آخر میں نتیجہ نکالتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہ بنی اسرائیل جب اپنی سرکشی کے باعث حدود سے تجاوز کر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی پھٹکار ماری۔ جس کے نتیجے میں یہ لوگ نمونۂ عبرت بن گئے۔ اس لئے اے دنیا کے تمام مذہبی گروہو! تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ خاندانی یا گروہی انتساب اللہ کے یہاں سرخ رو ہونے کیلئے کافی نہیں۔ بلکہ اس کی بارگاہ میں قبولیت پانے کیلئے جو سرمایہ درکار ہے اس کا نام ایمانِ خالص اور عملِ صالح ہے تمہاری نسبت چاہے کسی گروہ سے بھی ہے حتیٰ کہ اگر تم مسلمانوں سے بھی تعلق رکھتے ہو اور امت محمدیہ میں ہونے کا تمہیں شرف حاصل ہے تو یاد رکھو ایمان و عمل کے بغیر محض ایمان کا دعویٰ یا محض گروہی نسبتیں تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی۔ اگر یہ نسبتیں کام آنے والی ہوتیں تو بنی اسرائیل اپنے انجامِ بد کو نہ پہنچتے۔ بین السطور میں یہ بات بھی جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ بنی اسرائیل یا یہودی ہی اصل میں تمام مذہبی گروہوں کی بنیاد ہیں۔ عیسائی اور صابی ان کے بعد وجود میں آئے اور انہیں کا بگاڑ دوسرے گروہوں پر اثرانداز ہوتا رہا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بنی اسرائیل میں جتنی گمراہیاں پیدا ہوئیں اس کا سبب ان کا یہ بنیادی تصور تھا نحن ابناء الله و احباء ہٗ "ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں"۔ اس لئے قیامت کے دن ہمیں کسی باز پرس کا اندیشہ نہیں اور اگر کوئی معمولی باز پرس ہوئی بھی تو ہو سکتا ہے چند دنوں کیلئے جہنم جانا پڑے لیکن اس کے بعد پھر جنت ہی ہمارا ٹھکانہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے چہیتوں کے سوا کسی اور کو جنت کیسے دے سکتا ہے؟ ان کے اس غلط اعتقاد نے ان کی پوری عملی زندگی کو ویران کر دیا۔ وہ جزا اور سزا سے بے نیاز ہو کر ہر برائی پر

Marfat.com

جری ہو گئے۔اس لئے اس آیت کریمہ میں امت محمدیہ کے سامنے بھی اس پوری تاریخ کے تناظر میں یہ بات فرمائی جا رہی ہے کہ تم بھی کہیں اپنی نسبت پر مغرور ہو کر اپنی اعتقادی اور عملی زندگی کو تباہ نہ کر لینا۔ کیونکہ اگر ایمان اور عمل کی خرابیاں اللہ کے نبیوں کی اولاد کو تباہ کر سکتی ہیں تو تم اس برے انجام سے کیسے بچ سکو گے۔ اس لئے سب سے پہلے ان کا ذکر فرمایا گیا ہے اور باقی گروہوں کا ذکر تاریخی آئینہ کے طور پر ان کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ بس یہی وہ حقیقت ہے جو اس آیت میں بیان فرمائی گئی ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں کے اخذ کردہ غلط مفہوم کی تردید

سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت میں یہ بیان کرنا ہرگز مقصود نہیں کہ نجات کیلئے کن کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ گروہی وابستگیاں ایمان و عمل کے بغیر تباہی کا باعث تو ہو سکتی ہیں نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔ لیکن نہ جانے کس طرح بعض متکلمین اور منکرین سنت نے اس سے یہ بات اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان مذاہب کے ماننے والے اگر اپنے اپنے مذہب کے مطابق عمل کرتے رہے تو ان کی نجات کیلئے کافی ہے۔ انہیں محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآنِ کریم پر ایمان لانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر مذہب بنیادی طور پر سچائی کا حامل ہے اس لئے کسی دوسرے مذہب کو ماننا یا کسی دوسرے نبی کو تسلیم کرنا اس کی کوئی ضرورت نہیں حالانکہ یہ بات اگر تسلیم کر لی جائے تو نہ صرف مذہب کی تاریخ تلپٹ ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ سیاقِ کلام سے بھی اس کا کوئی جوڑ باقی نہیں رہتا اور ساتھ ہی ساتھ جو لوگ قرآن کریم کو مانتے ہیں اور پھر اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں تو ان کیلئے اس سوال کا جواب دینا ناممکن ہو جاتا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اور قرآنِ کریم کو ماننا ضروری نہیں تو پھر جن آیات میں آنحضرت اور قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے آخر ان آیات کا کیا مفہوم ہو گا؟ اور مزید یہ بات بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو سالہا سال تک اہلِ کتاب کو دعوت دی وہ کس بات کی دعوت تھی اور پھر حضور کی دعوت اور اہلِ کتاب کے درمیان جو کشمکش رہی ہے اور جس کے نتیجے میں یہود کو ملک چھوڑنا پڑا۔ حتی کہ خلافتِ راشدہ میں پورے جزیرۂ عرب سے انہیں نکال دیا گیا۔ اس کی آخر کیا توجیہ کی جائے گی؟ یہ تو بالکل سامنے کی باتیں ہیں جو معمولی غور و فکر کرنے والا آدمی بھی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس خیال سے کہ اس بات کو برسوں سے بڑی شد و مد سے پھیلایا جا رہا ہے اور آج بھی ہمارا دانشور طبقہ جو صریحاً اسلام کا انکار کرنے کی جرات نہیں رکھتا وہ اس طرح کی باتوں کی اوٹ میں اپنے خبث باطن کا اظہار کرتا رہتا ہے اور دلیل کے طور پر اس آیتِ کریمہ کو پیش کرتا ہے۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس پر ایک مختصر گفتگو کی جائے۔

کسی بھی کتاب کی کسی بات کو سمجھنے کیلئے تین باتوں کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔

۱۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ جس سیاقِ کلام میں یہ بات کہی جا رہی ہے اس بات کو اس سیاقِ کلام سے مربوط ہونا چاہئے یہ نہیں ہو سکتا کہ سیاقِ کلام سے کوئی اور بات مفہوم ہو رہی ہو لیکن اسی سلسلے کی کسی عبارت کا مفہوم بالکل اس کے برعکس مراد لے لیا جائے۔

۲۔ کتاب کی کسی بھی عبارت کا مفہوم وہ معتبر سمجھا جاتا ہے جو کتاب کی مجموعی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہو اور اگر کوئی ایسا مفہوم مراد لے لیا جائے جو کتاب کی مجموعی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا تو یہ کتاب کا ایسا تضاد ہے جس سے بڑھ کر کوئی اور عیب نہیں ہو سکتا۔

۳۔ کتاب میں اگر کسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور اس کتاب کی کسی عبارت سے اس حکم کے خلاف کسی بات کا اگر وہم ہو رہا ہے تو اس وہم کو جھٹک دیا جائے گا۔ عبارت کا مفہوم وہ لیا جائے گا جو اس حکم کے مطابق ہو گا۔ آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان تینوں حوالوں سے اس آیتِ کریمہ کا وہ مفہوم جو منکرینِ حدیث لے رہے ہیں۔ صحیح بیٹھتا ہے یا غلط؟ سب سے پہلے ہم سیاقِ کلام کو دیکھتے ہیں۔

Marfat.com

سورۃ بقرۃ کا جو مرکزی مضمون ہے وہ قرآنِ کریم اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت ہے کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک پر ایمان لانا دوسرے پر ایمان لانے کو مستلزم ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں محمد ﷺ کو اللہ کا رسول مانتا ہوں تو اسے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ وہ قرآنِ کریم کو بھی اللہ کی کتاب مانے کیونکہ حضور نے زندگی بھر قرآنِ کریم کو اپنی دعوت کی بنیاد بنایا اور بار بار یہ دعویٰ کیا کہ جس خدا نے مجھے رسول بنایا ہے اس نے مجھ پر قرآن جیسی کتاب اتاری ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی اگر قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب مانتا ہے تو اس کیلئے لازم ہو جاتا ہے کہ جس ذاتِ عزیز پر وہ کتاب نازل ہوئی ہے اسے بھی اللہ کا رسول تسلیم کرے کیونکہ کتابیں ہمیشہ رسولوں پر نازل ہوتی ہیں خلا میں معلق نہیں ہوتیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے سورۂ بقرۃ کی آیت نمبر ۴۰ اور ۴۱ پڑھیے۔ آیت نمبر چالیس میں بنی اسرائیل سے وعدہ پورا کرنے کیلئے کہا گیا ہے اور وہ وعدہ کیا تھا کہ جب بھی نبی آخرالزماں تشریف لائیں گے تم ان پر ایمان لاؤ گے۔ اور اس کے بعد فرمایا وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ''اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے جو تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے۔'' وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ''اور تم سب سے پہلے اس کے کفر کرنے والے مت بنو'' اسی کی چند آیات کے بعد یہ آیتِ کریمہ ہے جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔

غور فرمایئے! چند آیات پیشتر پروردگار حکم دے رہے ہیں کہ جس نبی پر ایمان لانے کا تم سے ہمیشہ وعدہ لیا گیا وہ نبی تشریف لے آئے اور ان پر ہم نے کتاب بھی نازل کردی۔ اب ایفائے عہد کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کتاب پر ایمان لاؤ اور اس نبی پر ایمان لاؤ جس پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے۔ اسی سلسلۂ کلام میں آگے جا کر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ کوئی بھی مذہبی گروہ ہو اس کی نجات کیلئے ایمان وعمل ضروری ہے محض گروہی وابستگی کافی نہیں۔ انصاف سے کہیے کہ یہاں جس ایمان کی بات ہو رہی ہے کیا وہ ایمان صرف اپنے اپنے مذہب پر ایمان ہے یا اس ایمان سے وہ ایمان مراد ہے جس کا آیت نمبر ۴۱ میں حکم دیا گیا ہے۔ یقیناً سیاق وسباق کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں جس ایمان کا ذکر ہو رہا ہے وہ قرآن اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ آیت نمبر ۴۱ میں صاف فرمایا گیا ہے کہ اگر تم قرآنِ پاک اور نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لاؤ گے تو یہ صریحاً کفر ہو گا اور دیکھو تم سب سے پہلے کفر کرنے والے نہ بنو۔ میں نہیں سمجھتا جو شخص اس آیتِ کریمہ کا وہ مفہوم مراد لیتا ہے جو سابقہ آیات کے بالکل خلاف ہے وہ قرآن کریم کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے کہ جس کتاب میں اس قدر کھلا تضاد ہو کہ جس بات کو وہ خود کفر قرار دے چند آیات کے بعد اسی کا حکم دینے لگے ایسی غلطی تو معمولی مصنف بھی نہیں کرسکتا، چہ جائیکہ خالقِ کائنات اور غلطیوں سے پاک علم رکھنے والی ذات اپنی کتاب میں ایسی غلطی کا ارتکاب کرے۔

آیئے! ہم اسی بات کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ قرآنِ پاک نے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کا نہ صرف حکم دیا ہے بلکہ اسی کو دنیا اور آخرت کی کامیابی کا ضامن ٹھہرایا ہے۔ اور پھر اس میں مزید احتیاط یہ کی گئی ہے کہ عام انسانوں کو آنحضرت کی بعثت عامہ کے حوالے سے الگ حکم دیا اور اہلِ کتاب کیلئے الگ ذکر فرمایا تاکہ آنے والی دنیا میں کوئی اس تاویل کا سہارا نہ لے سکے کہ عام انسانوں کیلئے تو آنحضرت پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن اہلِ کتاب چونکہ پہلے ہی اپنے اپنے نبیوں اور کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے ان کیلئے اس کی کوئی پابندی نہیں۔ اب دونوں کی مثالیں قرآن مجید میں دیکھئے۔ عام لوگوں کیلئے آنحضرت کی بعثت کا ذکر فرما کر بطورِ خاص اللہ پر اور آپ پر ایمان لانے کا حکم دیا حالانکہ جب یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں پیغمبر فلاں قوم کیلئے مبعوث ہوئے ہیں تو اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ ان پر ایمان لانا ہو گا لیکن پروردگار نے کسی بات کو بھی مبہم نہیں رہنے دیا۔ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

(کہہ دو! اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔اس اللہ کا جس کیلئے ہے آسمان اور زمین کی بادشاہی۔نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ۔وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر جو ایمان لاتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم راہ یاب ہو) (الاعراف:۱۵۷)

اس آیت کریمہ میں دیکھئے کہ تمام انسانوں کی طرف آنحضرت ﷺ کی بعثت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔اس میں اگرچہ کوئی ابہام نہیں لیکن بہانہ جو طبیعتیں یہ کہہ سکتی تھی کہ اس سے مراد شائد صرف عرب کے لوگ ہیں۔اس لئے اس ابہام کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ آپ اس اللہ کے رسول بن کر آئے ہیں، جس کی حکومت اور جس کی مملکت میں زمین اور آسمان سب شامل ہیں۔اس لئے اس کا رسول بھی جہاں جہاں بھی جن اور انس کا وجود ہے سب کیلئے رسول بن کر آیا ہے۔پھر آیت کے دوسرے حصے میں رسول کے لفظ کو بھی مبہم نہیں رہنے دیا بلکہ آپ کا وصفی نام جس کا تذکرہ پہلی آسمانی کتابوں میں ہے۔اس کا ذکر فرما کر پوری طرح بات کو کھول کر رکھ دیا۔

جیسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جب آپ تمام انسانوں کی طرف رسول بن کر آئے ہیں تو ان میں اہلِ کتاب بھی شامل ہیں۔لیکن پروردگار نے قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب کا اس حوالے سے الگ ذکر فرمایا اور ان کی فلاح و کامرانی کو اسی ایمان پر منحصر قرار دیا۔سورۃ الاعراف میں موسیٰ علیہ السلام کی اپنی امت کیلئے دعا کا ذکر کیا گیا ہے جس میں آپ نے اپنی امت کیلئے اللہ سے رحمت مانگی ہے۔اس کے جواب میں پروردگار نے فرمایا کہ یہ رحمت ان لوگوں کے لئے خاص ہوگی جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے جن کو پیغمبر آخر الزمان کا زمانہ ملے گا وہ ان پر ایمان بھی لائیں گے۔بلکہ ان کیلئے اللہ کی رحمت کا تمام تر دارومدار اللہ اور اس کے آخری رسول پر ایمان لانے پر ہوگا۔ارشاد فرمایا:

وَاكْتُبْ لَنَا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِىْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِىَّ الْاُمِّىَّ الَّذِىْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ؕ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (الاعراف:۱۵۵ تا ۱۵۶)

Marfat.com

(اور ہمارے لئے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی لکھ دے ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔فرمایا، میں اپنا عذاب جس پر چاہتا ہوں نازل کرتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔ سو میں اس کو لکھ رکھوں گا، ان لوگوں کیلئے جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے ٥ جو اس رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، جو ان کو حکم دیتا ہے نیکی کا اور روکتا ہے برائی سے اور حلال ٹھہراتا ہے ان کیلئے پاکیزہ چیزیں اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزیں اور ان سے دور کرتا ہے وہ بوجھ اور پھندے جو ان پر تھے۔پس جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے اس کی تائید اور مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)

ان آیات پر غور کیجئے! ان میں نہایت مبہم انداز میں اہلِ کتاب اور دوسرے تمام انسانوں کو آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور پھر دنیا اور آخرت کی کامیابی کا دارومدار اسی پر رکھا گیا ہے۔اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہاں ان آیات میں قرآنِ پاک میں جو حکم دیا ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہے لیکن زیرِ بحث آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مذہبی گروہ کیلئے اپنے اعتقادات کے مطابق عمل کرنے میں ہی نجات ہے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ان کیلئے ضروری نہیں تو اندازہ فرمایئے اس سے بڑھ کر کسی کتاب کے اندر تضاد کی اور بدتر سے بدتر مثال کیا ہوسکتی ہے؟ حالانکہ قرآنِ پاک کے طالب علم جانتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے۔ایک جگہ اگر وہ ایک بات کو مبہم یا مجمل انداز میں ذکر کرتا ہے تو دوسری جگہ اس اجمال یا ابہام کو کھول دیتا ہے۔اور یہ تفصیل اور توضیح پہلی آیت کی تفسیر بن جاتی ہے۔جب بھی کوئی قرآنِ کریم کا طالب علم ان آیتوں کا مفہوم متعین کرنا چاہے گا تو وہ دونوں آیتوں کو سامنے رکھے گا۔یہاں بھی زیرِ بحث آیت کریمہ کا وہی مفہوم معتبر ہوگا جو مندرجہ بالا مفصل آیاتِ کریمہ کی روشنی میں واضح ہو رہا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی عام تعلیمات سے اس آیت کی وضاحت میں ہمیں کیا مدد ملتی ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے جہاں بھی ایمان کا ذکر فرمایا ہے وہاں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کو اکٹھے ذکر فرمایا ہے۔اس لئے قرآنِ کریم میں آپ سینکڑوں جگہ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کے الفاظ دیکھیں گے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔مزید ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سورۃ نساء میں رسول اللہ کے احکام سے پہلوتہی کو نفاق قرار دیا گیا ہے اور پروردگار نے قسم کھا کر یہ بات فرمائی کہ یہ لوگ ہزار ایمان کا دعویٰ کریں لیکن جب تک آپ کو زندگی کے ہر معاملے میں فیصلہ کن اتھارٹی تسلیم نہیں کریں گے اس وقت تک یہ صاحبِ ایمان نہیں ہوں گے۔علاوہ ازیں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو لوگ بظاہر اپنے آپ کو مومن کہتے تھے لیکن وہ حقیقت میں مومن نہیں تھے تو ان سے صراحۃً فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہوا (یعنی ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے۔''

اندازہ فرمایئے! اللہ کو وہ ایمان قبول نہیں جس میں رسول اور کتاب پر ایمان شامل نہ ہو۔اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں بھی قرآنِ کریم نے مجمل ایمان کا ذکر کیا ہے وہاں پوری امت نے بالاجماع ان تمام چیزوں پر ایمان لانا مراد لیا ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔مثلاً سورۃ العصر کو دیکھ لیجئے اس میں صرف ایمان کا ذکر ہے۔لیکن تمام مفسرین نے اس میں تمام ایمانیات کو شامل کیا ہے۔جن میں اللہ، اس کے رسول اور قرآنِ کریم پر ایمان کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔

Marfat.com

ہم نے تین پہلوؤں سے زیر بحث آیت کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔آپ ان تینوں پہلوؤں پر غور فرمائیں اور پھر خدا لگتی کہیے کہ کیا قرآنِ کریم کی کسی آیت میں اس بات کا دور دور تک بھی امکان ہوسکتا ہے کہ ایمان سے مراد اپنے اپنے مذہب کے اعتقادات پر ایمان ہے۔نہ اس میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان شامل ہے اور نہ قرآنِ کریم پر ایمان۔یعنی یہودی یہودی رہے۔عیسائی عیسائی رہے اور صابی صابی۔ان سے بالکل نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نبی آخری الزمان پر ایمان کیوں نہ لائے؟ تم نے قرآنِ پاک کی تعلیمات کو قبول کیوں نہ کیا؟ اگر اس بات کو ذرا سا بھی تسلیم کرلیا جائے تو پھر اس بات کا جواب دینا ناممکن ہوجاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کس مقصد کیلئے ہے؟ اور آپ نے ۲۳ سال تک جس مقصد کی بالا دستی کیلئے جان توڑ کوششیں کیں اور زندگی کا ہر دکھ اٹھایا وہ مقصد آخر کیا تھا؟ اگر اہلِ مذہب کو اپنے مذہب ہی پر باقی رہنا تھا تو پھر قرآنِ کریم کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ

(اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ وہ اسے تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کردے)

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد دنیا کے لئے صراطِ مستقیم پانے اور نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لایا جائے اور آپ کی پیروی کی جائے اس کے سوا نجات حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔صرف اللہ پر ایمان لانا بھی رسول پر ایمان لانے کے بغیر ناممکن بھی ہے اور بے معنی بھی۔اللہ کے رسول دنیا میں آکر جس کشمکش سے گزرتے ہیں اس کی بنیاد اللہ کا انکار نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے رسول اور اس کی تعلیمات سے انکار ہوتا ہے کیونکہ رسول کی تعلیمات کے بغیر اللہ پر ایمان ایک ایسی بے معنی چیز ہے جس کی کوئی شکل متعین نہیں کی جاسکتی۔اسی لئے دین کے دشمنوں نے ہمیشہ ایمان باللہ سے ایمان بالرسول کو الگ کرنے کی سازش کی ہے تا کہ اس کے ذریعے سے پورے دین کو ایک موم کی ناک بنا دیا جائے کہ پھر ہر بدطینت شخص اپنی اپنی مرضی کے مطابق اس کا حلیہ بناتا اور بگاڑتا رہے۔

اس مناسب تنبیہ کے بعد اگلی آیاتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں کو ذکر کیا جارہا ہے۔جس کے نتیجے میں ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی ایمان وعمل کے نور سے محروم ہوگئی اور قرآنِ کریم کے نزول کے وقت ان کے پاس اپنے ماضی کی عظمت کے افسانوں کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ان کی تاریخ کو ان کے سامنے رکھ کر بتایا جارہا ہے کہ تم ایک خاص مقصد کیلئے ایک خاص منصب پر فائز کیے گئے تھے جب تم نے اس مقصد کو نظر انداز کردیا تو وہ منصب بھی تم سے چھن گیا۔تم اگر چاہتے ہو کہ دوبارہ تمہیں پھر وہی سرافرازیاں حاصل ہوں تو اس کیلئے تمہیں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا ہوگا ورنہ اس کے بغیر تو تم ایک ایسا گروہ ہو جو دوسروں کیلئے اپنے اندر سامانِ عبرت کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔چنانچہ دوسروں کو عبرت اور انہیں شرم دلانے کیلئے ان کے ماضی کے چند اوراق الٹے جارہے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (البقرة: ٦٣)

(اور یاد کرو! جب ہم نے تم سے عہد لیا اور ہم نے تمہارے اوپر کوہِ طور کو بلند کیا۔(اور کہا) پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ اور جو کچھ اس میں ہے، اس کو یاد رکھو تا کہ تم متقی بن جاؤ)

Marfat.com

قرآنِ کریم اور تورات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے خود مطالبہ کیا کہ اب جب کہ ہم مصر کی غلامی سے آزاد ہو کر جزیرہ نمائے سینا میں ایک آزاد زندگی شروع کر چکے ہیں تو ہمارے پاس زندگی گزارنے کا ایک ہدایت نامہ ہونا چاہئے۔ جس کی روشنی میں ہم یہ جان سکیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا اور ہماری کن باتوں سے اللہ راضی ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے؟ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی اور آپ کی دعا کو قبولیت کا شرف ملا اور اللہ تعالیٰ نے تورات جیسی عظیم کتاب عطا فرمائی۔ جب یہ کتاب بنی اسرائیل کو دی گئی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے احکام پر عمل کرنا ان کی حیلہ جو طبیعتوں کیلئے گراں ہونے لگا۔ غلامی نے ان کے اندر خواہشوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت پہلے ہی مفقود کر ڈالی تھی اب جو ان کو ایک ذمہ دار اور آزادی کی حفاظت کرنے والی قوم کی مانند زندگی گزارنے اور اس کی ذمہ داریاں اٹھانے کے احکام دیئے گئے تو انہوں نے بے عملی اور بعض دفعہ انکار کا رویہ اختیار کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو دامنِ کوہ میں طلب کیا اور ان سے اس کتاب کے بارے میں عہد و پیمان لئے۔ میثاق کا لفظ اسی عہد کیلئے استعمال ہوا ہے۔

میثاق کا مفہوم

میثاق اس عہد کو کہتے ہیں جو کسی اہم معاملہ کیلئے پورے شعور اور پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ باندھا گیا ہو اور جس کی وفاداری کا تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہو چنانچہ انہیں بھی نہایت مؤکد طریقے سے تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا اور تورات کے حوالے سے تمام ذمہ داریاں ادا کرنے کا پابند کیا گیا۔ جب ان سے یہ عہد لیا جا رہا تھا تو اس وقت قرآنِ کریم اور تورات کے بیان کے مطابق ان کے سروں پر کوہِ طور کو معلق کر دیا گیا۔

رَفعِ طور کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں تو رَفَعْنَا کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی ہم نے تم پر طور کو بلند کیا۔ لیکن سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۷۱ میں یہ فرمایا گیا ہے: وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ ''اور یاد کرو! جب کہ ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو اس طرح اٹھایا گویا کہ وہ سائبان ہے۔'' ان دونوں تعبیروں کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اگر پہاڑ کے دامن میں کوئی قافلہ ٹھہرا ہوا ہو اور پہاڑ میں زلزلہ آ جائے تو دیکھنے والوں کو یقیناً ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پہاڑ ہم پر گرا ہی چاہتا ہے۔ لیکن پہاڑ میں زلزلے کا آنا اور دیکھنے والوں کا ایسا محسوس کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں، جسے قرآنِ کریم جیسی ابدی کتاب میں ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا جاتا۔ اس لئے زیادہ واضح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یقیناً ایسی صورتحال پیدا ہو گئی تھی کہ دیکھنے والے طور کو ایستادہ نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ سر پر تنا ہوا دیکھ رہے تھے، جیسے سر پر سائبان تنا ہوتا ہے اور یہ ایسی صورتحال تھی جس نے انہیں بھونچکا کر رکھ دیا۔

Marfat.com

کوہِ طور

اس آیت میں الطّور کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے بارے میں یاد رہنا چاہئے کہ طور مطلق پہاڑ کو بھی کہتے ہیں اور جزیرہ نمائے سینا کے ایک مخصوص اور متعین پہاڑ کا بھی نام ہے۔ جدید جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ طور کا اطلاق جزیرہ نمائے سینا کے متعدد پہاڑوں پر ہوتا ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے سلسلہ میں جبل طور سے مراد جبل سینا ہوتا ہے۔ لیکن خود جبلِ سینا کی کوئی ایک چوٹی نہیں متعدد چوٹیاں ہیں انہیں میں سے کسی کا نام طور ہوگا۔

اس کیفیت میں انہیں یہ حکم دیا گیا کہ جو کتاب ہم نے تمہیں دی ہے اسے مضبوطی سے تھامو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد چار صفحہ نمبر ۳۲۱ میں کہا گیا ہے کہ ''اللہ نے پہاڑ کو ان لوگوں پر الٹ کر اوندھا کر دیا اور ان سے کہا کہ تورات کو اگر قبول کرتے ہو تو خیر ورنہ یہیں تمہارا مدفن بن کر رہے گا''۔ قرآنِ کریم کا بیان زیادہ جامع معلوم ہوتا ہے۔ دونوں جملوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سمیٹ لیا ہے۔ مضبوطی سے تھامنے میں اجتماعی زندگی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اجتماعی زندگی میں اللہ کے احکام کا نفاذ آئین اور قانون کی شکل میں ہوتا ہے۔ جس میں تمام حقوق وفرائض بھی سمٹ آتے ہیں اور کوتاہی کی صورت میں حدود کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اسی طرح معاملات کے ضمن میں شرع وتقضا بھی وجود میں آتے ہیں۔ ہمیشہ اسی میں آ کر امتیں کمزوری دکھاتی ہیں۔ انفرادی زندگی میں بھی احکامِ خداوندی کی اطاعت اگرچہ آسان نہیں، لیکن فی الجملہ اس کا تعلق عبادات اور آداب سے ہوتا ہے۔ جس پر عمل کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے اس لئے اجتماعی زندگی میں کتاب کو نافذ کرنے کیلئے ایمان کی مضبوطی اور ہیئت اجتماعی کی وابستگی اور قوت درکار ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں قوت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اصلاح کا بیک وقت رواں دواں رہنا قوموں کی زندگی کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے دونوں کا بطورِ خاص ذکر فرمایا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم اور تورات دونوں میں اس کی تاکید کرتے ہوئے ترغیب اور ترہیب سے کام لیا گیا ہے۔ کتابِ استثناء ۲۸ میں ہے:

(اگر تو کوشش کر کے خداوند اپنے خدا کی آواز سنے تا کہ ان حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ سے فرماتا ہوں دھیان رکھ کر عمل کرے تو خداوند تیرا خدا زمین کی قوموں کی بہ نسبت تجھے سرافراز کرے گا)

آگے چل کر تورات میں ارشاد فرمایا گیا ''لیکن اگر تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوانہ ہوگا کہ اس کے سارے شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ کو بتاتا ہوں دھیان رکھ کر تو عمل کرے تو ایسا ہوگا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی اور تجھ تک پہنچیں گی'' وَاذْكُرُوا مَافِيهِ میں جہاں تورات پر انفرادی زندگی میں عمل کرنا مقصود ہے وہیں کتاب کی حفاظت، کتاب کا حفظ، قرأت اور اس کے ادارے کھولنا اور اس کی تعلیمات کو عام کرنا سب کچھ شامل ہے۔ آخر میں فرمایا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ''اگر تم انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تورات کو پوری طرح نافذ کر دو اور اس کی روشنی میں زندگی کی تمام ذمہ داریاں بروئے کار لاؤ تو پھر امید کی جاسکتی ہے کہ تمہاری زندگی میں پاکیزگی، اللہ کا خوف اور حقوق وفرائض کا احساس توانا ہو جائے اور دوسرا معنی تتقون کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر تم تورات پر پوری طرح عمل کرو تو پھر تم اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہو۔ ورنہ جس اہتمام کے ساتھ یہ کتاب تمہارے حوالے کی جارہی ہے تمہاری کوتاہیوں کی صورت میں تمہارے لئے وبال اور عذاب کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

Marfat.com

ایک شبہ کا جواب

مندرجہ بالا گزارشات سے ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل و تمیز دے کر خیر و شر کے معاملے میں فی الجملہ ایک آزادی بخشی اور خیر و شر کا راستہ اختیار کرنے میں یہی آزادی ان کا حقیقی امتحان ہے کہ وہ اللہ کی عطا کردہ قوتِ تمیز سے کام لے کر خیر کا راستہ اختیار کرتے ہیں یا شر کا۔ خیر کا راستہ اختیار کرنے والوں کیلئے دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح کا وعدہ فرمایا گیا ہے اور شر کا راستہ اختیار کرنے والوں کیلئے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس لئے نہ کسی سے زبردستی ایمان قبول کرایا جاتا ہے اور نہ کسی کو زبردستی کفر کے راستے پر چلایا جاتا ہے۔ بلکہ واضح طور پر فرمایا: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ''دین قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں''۔ لیکن بنی اسرائیل کے معاملے میں تو معلوم ہوتا ہے کہ تورات پر ایمان و عمل کیلئے انہیں مجبور کیا گیا اور ان کے سروں پر کوہِ طور معلق کر کے حکم دیا گیا کہ اس تورات کو مضبوطی سے تھامو ورنہ تمہیں کوہِ طور سے کچل دیا جائے گا۔ یہ پروردگار کی طرف سے عطا کردہ آزادی کے سراسر خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض یا اشتباہ قلتِ فہم کا نتیجہ ہے۔ تھوڑے سے تدبر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بنی اسرائیل مصر ہی میں موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کر چکے تھے۔ اسی لئے وہ آپ کے حکم کے مطابق ہجرت کرنے پر آمادہ ہوئے۔ تورات ان کو اس لئے نہیں دی گئی کہ وہ اس کے ذریعے ایمان لائیں۔ صاحبِ ایمان تو وہ ہو چکے تھے تورات تو انہیں ایمان کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کیلئے دی گئی تھی۔ دنیا کے ہر مہذب قانون کی طرح اللہ کا قانون بھی یہ ہے کہ جس طرح کوئی قانون زبردستی کسی کو اپنا شہری نہیں بناتا۔ لیکن جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت قبول کر لیتا ہے تو پھر اسے ملکی قانون کی پابندیاں قبول کرنا پڑتی ہیں اور اگر وہ اس میں کوتاہی کرے تو سزا کا مستحق ہوتا ہے اور اگر انکار کرتا ہے تو اسے بغاوت کی سزا ملتی ہے۔ یہی حال اللہ کے قانون کا بھی ہے۔ وہ ایمان لانے پر مجبور نہیں کرتا لیکن جب کوئی شخص ایمان لے آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی حاکمیت اور اللہ کے قانون کی بالادستی کو قبول کر لیتا ہے۔ اب وہ اگر اس میں کوتاہی کرے گا یا سرکشی کا رویہ اختیار کرے گا تو ضرور طاقت استعمال کی جائے گی۔ بنی اسرائیل چونکہ مومن اور مسلمان ہونے کے بعد سرکشی کا رویہ اختیار کر رہے تھے اس لئے انہیں کوہِ طور کے دامن میں کھڑا کر کے اللہ کے جلال سے ڈرایا گیا کہ تم یہ مت سمجھو کہ تم جس خدا کے ماننے کا اقرار کر چکے ہو اور موسیٰ علیہ السلام جس خدا کے پیغمبر ہیں وہ کوئی ایسا خدا ہے جس کے پاس کوئی طاقت نہیں اور اس کے احکام نصیحت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارا خدا ایسی زبردست قوتوں کا مالک ہے کہ اس کے ایک اشارے سے پہاڑ تم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں اور اس کائنات کی تمام قوتیں تمہارے خلاف حرکت میں آ سکتی ہیں۔ اس لئے اس کے جلال کو اپنے سامنے رکھو اور پھر اپنے طرزِ عمل کو متعین کرو۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ ۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (البقرة: ٦٤)

(پھر تم نے اس کے بعد اعراض کیا تو اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم نامرادوں میں سے ہو چکے ہوتے)

Marfat.com

یعنی تورات کو اس تاکید اور اہتمام کے ساتھ ان کے حوالے کرنا اور پھر یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ انہیں کہنا کہ اس تورات کی تعلیمات پر عمل کے نتیجے ہی میں تم اپنی دنیا اور آخرت بنا سکتے ہو اور اگر تم نے اس کے احکام سے روگردانی کی اور اس کتاب کا حق ادا نہ کیا تو تم اللہ کے عذاب کا شکار بھی ہو سکتے ہو اور پھر مسلسل ان احکام کی یاددہانی کیلئے وہ اپنی آنکھوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی دیکھتے رہے اور اللہ کی رحمتوں کا نزول بھی برابر ان پر ہوتا رہا۔ بایں ہمہ انہوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کتاب سے اعراض کا رویہ اختیار کیا۔ کبھی اس کتاب کے احکام کو تاویلوں کا تختۂ مشق بنایا، کبھی صریحاً اطاعت سے انکار کر دیا، اس سب کچھ کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ اللہ کے عذاب کا کوڑا ان پر برستا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا جاتا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے ہم عصر اہلِ کتاب سے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ یہ سارے جرائم تمہارے اسلاف نے کئے۔ لیکن چونکہ تم ان کے کرتوتوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہو اور تم اپنے آپ کو ان کا ہر لحاظ سے حقیقی جانشین ثابت کر رہے ہو اس لحاظ سے ان کے یہ اعمال تمہارے اعمال ہیں کیونکہ تم ان کے فکری اور عملی وارث ہو ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ انہیں تباہ کر دیا جاتا نتیجۃً تمہارا دنیا میں کہیں وجود نہ ہوتا۔ لیکن تمہارا ان تمام بداعمالیوں کے باوجود صفحۂ ہستی پر ایک مذہبی گروہ کے طور پر موجود ہونا یہ سراسر اللہ کا فضل ہے کہ تمہاری تاریخ کے مختلف ادوار میں اگرچہ تمہارے اسلاف بڑی سزاؤں سے گزر چکے ہیں لیکن تمہیں مکمل طور پر تباہ نہیں کیا گیا یہ صرف اس لئے تاکہ تمہیں پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی بعثت سے سنبھلنے کا ایک آخری موقعہ دیا جائے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر دوبارہ عزت کی زندگی حاصل کر لو۔ ورنہ تمہیں اب تک جس طرح سامانِ عبرت بنا کر رکھا گیا ہے آئندہ تمہارے ساتھ اس سے بھی بدترین سلوک ہوگا۔

امتِ مسلمہ کیلئے لمحہ فکریہ

امت محمدیہ کیلئے بھی اس میں لمحۂ فکریہ ہے کہ بنی اسرائیل اور یہود جو امت محمدیہ ہی کی طرح ایک حاملِ دعوت امت تھے ان کے بارے میں صاف صاف بتایا جا رہا ہے کہ ان کی بقا اور عزت کا تمام تر دارومدار ان کی طرف نازل ہونے والی کتاب پر عمل کرنے پر تھا۔ جب تک وہ اس پر عامل رہے تو وہ دنیا کی ایک عظیم قوم تھے۔ انہیں بڑے بڑے ملکوں کی حکمرانی بھی حاصل تھی۔ لیکن جب انہوں نے اپنی کتاب سے اعراض کیا تو وہ سامانِ عبرت بن کر رہ گئے۔ آج اس امت کیلئے بھی سوچنے کا موقعہ ہے کہ ہماری قسمت بھی ترازو میں ہے۔ قرآنِ کریم ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت محفوظ شکل میں ہمارے پاس ہے، ہمارے ساتھ بھی اللہ کا وہی وعدہ ہے جو اہلِ کتاب کے ساتھ تھا۔ ہماری بقا اور سرافرازی کا دارومدار اسی دین سے وابستگی پر ہے۔ ورنہ اس سے اعراض کی صورت میں ہمارے ساتھ بھی وہی ہوگا جو اہلِ کتاب کے ساتھ ہو چکا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ٥
فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ٥ (البقرة: ٦٥ تا ٦٦)

(اور تم خوب جان چکے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے سبت کے بارے میں تجاوز کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ ٥ پھر ہم نے اسے عبرت بنا دیا اس زمانہ کے اور اس کے بعد کے لوگوں کیلئے اور نصیحت بنا دیا اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے)

Marfat.com

نقض عہد کی مثال

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ بنی اسرائیل کو اللہ نے نہایت اہتمام کے ساتھ اور ترغیب اور ترہیب سے کام لیتے ہوئے تورات حوالے کی اور ان پر اچھی طرح یہ بات واضح کردی کہ تورات کے احکام پر عمل کرنے ہی میں تمہارے لئے فلاح و کامرانی کا راز مضمر ہے۔ لیکن بنی اسرائیل نے ایک وقت آیا کہ ان ساری تاکیدات کو نظر انداز کرتے ہوئے احکامِ تورات سے روگردانی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ روگردانی اور اعراض کا مکمل عمل بیک وقت رونما تو نہیں ہوا ہوگا۔ مختلف وقتوں میں سرکشی یا نافرمانی کی مختلف صورتیں سامنے آئی ہوں گی۔ چنانچہ ان کے اعراض کی جستہ جستہ مثالیں اگلے رکوعوں میں دور تک بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ اس کی سب سے پہلی مثال اس آیتِ کریمہ میں دی گئی ہے۔

یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟

سورۃ الاعراف میں اس واقعہ کو کسی حد تک تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ہم بھی اگر اللہ کو منظور ہوا تو وہیں اس کی تفصیل عرض کریں گے۔ لیکن آیت کی وضاحت کیلئے اجمالاً عرض یہ ہے کہ یہ واقعہ سورۃ اعراف کے بیان کے مطابق ایک ایسے شہر میں پیش آیا جہاں بنی اسرائیل کی کوئی شاخ آباد تھی اور وہ شہر ساحل سمندر پر واقع تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا زمانہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ حضرت داؤد کا زمانہ حکومت ''۱۰۱۳ قبل مسیح تا ۹۷۳ قبل مسیح'' کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر کا نام ''ایلات'' تھا۔ اسی بستی کو 'ایلہ' بھی کہا گیا ہے۔ یہ فلسطین کے جنوب میں عرب کی عین شمالی سرحد پر قدیم علاقہ ادوم میں بحرِ قلزم کی مشرقی خلیج میں لبِ ساحل واقع ہے۔ موجودہ جغرافیہ میں اس کو 'عقبہ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور عقبہ، خلیج عقبہ کی مشہور بندرگاہ ہے۔ اس شہر میں یہودی آباد تھے۔ انہیں اللہ نے حکم دیا تھا کہ تم سبت کے دن کو اللہ کی یاد اور عبادت کیلئے مخصوص کردو۔ ''سبت''، ہفتہ کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن ان کیلئے محترم بنایا گیا تھا اور اس دن کے بارے میں حکم دیا کہ اس روز تجارت، زراعت، شکار وغیرہ ہر قسم کا دنیوی کام ممنوع ہوگا اور جو اس دن کوئی دنیوی کام کرے گا اس کی سزا قتل ہوگی۔ چنانچہ تورات میں آج بھی یہ الفاظ موجود ہیں۔ پس سبت کو مانو اس لئے کہ وہ تمہارے لئے مقدس ہے اور جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے ..... جو کوئی سبت کے دن کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے (خروج ۳۱:۱۴، ۱۵)'' یہاں اس واقعہ کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن وہ اشارہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ یہاں 'لام اور قد' دو حرف تاکید کیلئے آئے ہیں۔ قد، تحقیق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور لام حرف تاکید ہے۔ اس لئے تاکید کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ تم اس واقعہ کو جانتے ہو۔ یعنی تمہاری تاریخوں میں یہ واقعہ محفوظ ہے اور لوگوں میں چونکہ اکثر اس کا تذکرہ رہتا ہے اس لئے سب اس واقعہ سے آگاہ ہیں۔ جو واقعہ اس قدر مشہور ہو اس کی تفصیل بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہوتی۔ مزید یہ بھی فرمایا کہ تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ تم نے یعنی تمہارے اسلاف نے سبت کے بارے میں حدود سے تجاوز کیا تھا۔ یعنی انہیں سبت کے احترام اور اس کے تقدس کو ملحوظ رکھنے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کو انہوں نے پاؤں تلے روند ڈالا۔ انہیں دنیوی کاروبار کرنے کی ممانعت کی گئی تھی لیکن انہوں نے طریقے طریقے سے کاروبار جاری رکھا۔ یہ لوگ چونکہ ساحلِ بحر پر آباد تھے اور ساحلِ بحر پر رہنے والے لوگوں کی گزر بسر کا بڑا ذریعہ مچھلی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی فرمانبرداری کو آزمانے کیلئے حکم دیا گیا کہ تم ہفتے کے چھ دن شوق سے شکار کرو لیکن سبت کے روز سبت کے احترام میں شکار کرنے پر پابندی ہے۔ لیکن جب انہوں نے نافرمانی کا رویہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں شدت پیدا کردی اور اس کی صورت

Marfat.com

یہ ہوئی کہ ہفتے کے چھ دن بہت کم مچھلی ملتی ۔لیکن سبت کے دن سطح آب پر مچھلیاں درانہ وار اٹھکیلیاں کرتی نظر آتیں۔ مچھلی ہمیشہ پانی میں ڈوب کر تیرتی ہے ۔لیکن قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ سبت کے دن مچھلیاں سر اٹھائے سطحِ آب پر تیزی سے شکاریوں کی طرف بڑھتی چلی آتیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل اس آزمائش کی تاب نہ لا سکے انہوں نے اس حکم کو توڑنے کیلئے حیلے نکالے۔ سمندر سے کچھ فاصلے پر گڑھے کھود لئے اور ان گڑھوں تک نالیاں نکال لیں۔ چنانچہ سبت کے دن ان نالیوں کے دہانے کھول دیتے اور مچھلیاں اپنے گڑھوں میں بھر لیتے اور اتوار کے دن گڑھوں سے مچھلیاں پکڑ لیتے اس طرح سے وہ یہ تاثر دیتے کہ ہم نے اللہ کے حکم کی تعمیل بھی کی اور اپنی ضرورت بھی پوری کر لی۔ اس طریقے سے انہوں نے اللہ کے حکم کو ایک مذاق بنا کر رکھ دیا۔ اس پر اللہ کا عذاب حرکت میں آیا اور یہ سارے نافرمان لوگ بندر بنا دیئے گئے۔

مسخ حقیقی تھا یا معنوی

بعض لوگوں کو گمان یہ ہے کہ وہ ظاہری طور پر بندر نہیں بنائے گئے تھے بلکہ یہ مسخ اور چہروں کا بگاڑ معنوی طور پر ہوا تھا کہ شکلیں ان کی انسانوں کی تھیں لیکن طور اطوار بندروں جیسے ہو گئے تھے۔ یہ سزا بھی کوئی کم سزا نہیں لیکن جس طرح اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے اور جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور مزید فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اس واقعہ کو اس وقت کی دنیا اور بعد کے آنے والوں کیلئے عبرت بنا دیا ہے کہ جنہوں نے انہیں دیکھا وہ بھی کانپتے رہے اور جنہوں نے ان کے بارے میں سنا ان پر بھی لرزہ طاری ہوا۔ اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ الفاظ کو حقیقی معنی میں لیا جائے۔ روایات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کیا یہ موجودہ بندر انہیں کی اولاد ہیں؟ آنحضرت نے جواب دیا کہ نہیں۔ بندر اس واقعہ سے پہلے بھی موجود تھے، موجودہ بندر انہیں بندروں کی اولاد ہیں۔ لیکن بنی اسرائیل کے لوگوں کو جو بندر بنایا گیا تھا وہ تین دن کے بعد مر گئے تھے۔ وہ تین دن تک ایک دوسرے کو دیکھ کر روتے رہے چیختے رہے بالآخر فنا کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس واقعہ میں عبرت کا سامان تو اس قدر ہے کہ آدمی اگر بالکل دل کا اندھا نہ ہو جائے تو وہ اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں نصیحت بھی ہے۔ لیکن نصیحت ہمیشہ ان لوگوں کو ملتی ہے جو گوشِ نصیحت نیوش رکھتے ہوں اور جن کے پہلو میں قلبِ سلیم موجود ہو۔ آیئے اس واقعہ میں دیکھیں کہ اس میں ہمارے لئے کیا کیا نصیحتیں مضمر ہیں۔

اس واقعہ میں مضمر نصیحتیں

۱۔ سبت کا دن ان کیلئے مقدس بنایا گیا تھا۔ یعنی اسے ذکر اللہ اور عبادت کے لئے مخصوص کیا گیا تھا تاکہ ہفتہ بھر دنیوی جھمیلوں کی مصروفیت دلوں پر جو زنگ چڑھا دیتی ہے اس کے اتارنے کا سامان ہوتا رہے۔ آدمی ہزار کوشش کرے کہ وہ ہر کام کو اللہ کے احکام کے مطابق انجام دے۔ لیکن انسانی فطرت یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں کوتاہی بھی ہو جاتی ہے اور کبھی نہ کبھی طبیعت خواہشات سے زنگ آلود بھی ہو جاتی ہے۔ دنیوی مشاغل اپنے اثرات ضرور چھوڑتے ہیں۔ اللہ سے تعلق میں یکسوئی نہیں رہتی۔ اس کے علاج کیلئے ضروری ہے کہ کوئی ایک دن ایسا ہو جس میں تمام دنیوی آلائشوں سے یکسو ہو کر آدمی اللہ کو یاد کر سکے۔ چنانچہ سبت کا دن اسی غرض کیلئے بنی اسرائیل کیلئے مقرر کیا گیا تھا۔ عیسائیوں نے شائد اسی غرض کو سامنے رکھتے ہوئے اتوار کے دن کو اپنے لئے مقدس بنا لیا۔ انجیل سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان کے لئے اتوار کے دن کو مقدس ٹھہرایا گیا ہو۔ لیکن عیسائی بہرحال اس دن کو ایسا ہی مقدس سمجھتے ہیں جیسے یہود کیلئے سبت کا دن۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد

Marfat.com

جب ایک نئی امت وجود میں آئی تو پروردگار نے ان کیلئے جمعہ کے دن کو مقدس ٹھہرایا۔ یہود کی طرح مسلمانوں کو یہ حکم تو نہیں دیا گیا کہ تم اس میں کوئی دنیا کا کاروبار نہیں کر سکتے۔ البتہ! یہ ضرور تاکید فرمائی گئی کہ جمعہ کی اہمیت اور عظمت کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ جمعہ کی نماز کی اہتمام کے ساتھ پابندی کرنا اور اس دن کو ذکر اللہ اور تذکیر و دعوت کیلئے زیادہ سے زیادہ مخصوص کرنے کی کوشش کرنا۔

چنانچہ قرونِ اولیٰ میں ہم مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ جمعہ کے دن عموماً دنیوی کاروبار سے احتراز کرتے تھے، دن ڈھلنے سے پہلے ہی جمعہ کی نماز کیلئے مسجدیں بھر جاتی تھیں اور جمعہ کیلئے مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماعات ہوتے تھے۔ انہیں اجتماعات میں خلفاء بڑے بڑے فیصلوں کے اعلانات کرتے تھے۔ اس دن کی عظمت کیلئے حضور نے بے شمار فضائل بیان فرمائے اور یہاں تک تاکید فرمائی کہ جمعرات ہی سے جمعہ کی تیاری شروع ہو جانی چاہئے۔ آنحضرت کا ارشاد ہے: ''جو شخص جمعہ کی صبح کو اٹھ کر یہ پوچھتا ہے کہ آج کونسا دن ہے؟ وہ برباد ہو گیا'' مزید فرمایا کہ ''جمعہ کے دن اللہ کی جانب سے فرشتے مسجدوں کے دروازے میں رجسٹر لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جس میں ہر آنے والے کا نام لکھتے ہیں اور یہ نام لکھنے کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھتے ہیں جب تک خطیب خطبہ دینے کیلئے منبر پر فروکش نہیں ہو جاتا۔ خطیب کے آ جانے کے بعد وہ رجسٹر بند کر کے خود خطبہ سننے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد جو لوگ آتے ہیں وہ جمعہ کی نماز سے تو ضرور سبکدوش ہو جائیں گے لیکن ثواب و درجات سے محروم کر دیئے جائیں گے۔'' ہمیں سوچنا چاہئے کہ مسلمانوں کا آج کا طرزِ عمل جمعہ کے بارے میں کس حد تک بگڑ گیا ہے۔ ظہر کی چار رکعتوں کی بجائے دو رکعت پڑھنے کا اس لئے حکم دیا گیا ہے تاکہ دو رکعت کی جگہ دین سیکھنے کیلئے خطیب کی تقریر سننے کا اہتمام کیا جائے کیونکہ جمعہ کا اصل مقصد تذکیر و دعوت ہے صرف عبادت نہیں اور تذکیر و دعوت تقریر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

قوموں کی تاریخ کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہر قوم نے اپنے مقدس دن کو اپنی شناخت کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ اسرائیل کی حکومت یہودی ہونے کی وجہ سے سبت کی عظمت کو سمجھتی ہے اس لئے انہوں نے اپنی مملکت میں سبت کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے چھٹی کا دن بنایا ہے۔ کیونکہ جب ہفتے میں چھٹی کا دن آتا ہے تو ہر عمر کے آدمی کے ذہن میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ چھٹی آخر اسی دن کیوں کی جاتی ہے؟ کسی اور دن کیوں نہیں؟ اسی سے اس کے سامنے اس دن کی اہمیت اور عظمت واضح ہوتی ہے اور اس سے انہیں اپنی شناخت میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ عیسائی باوجود اس کے کہ صدیوں سے مذہب کی حقیقت سے بے گانہ ہو چکے ہیں ان کے یہاں مذہب کے نام کے سوا شائد ہی کوئی چیز باقی رہ گئی ہو۔ بایں ہمہ انہوں نے اتوار کے دن کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ جہاں بھی گئے انہوں نے اتوار کو اپنی شناخت بنائے رکھا۔ برصغیر میں جب ان کو حکومت بنانے کا موقع ملا تو انہوں نے یہاں بھی اتوار کے دن کو چھٹی کے دن کے طور پر مقرر کیا۔ لیکن ہماری بدنصیبی کا عجیب عالم ہے کہ ہم نے اپنے مقدس دن کو شناخت کے طور پر استعمال کرنا تو دور کی بات ہے عبادت کے نور سے بھی محروم کر دیا۔ کاروبار سے نکل کر یا دفتر سے چھٹی ہونے کے بعد جمعہ کیلئے ایسے وقت میں پہنچنا کہ خطیب کی تقریر سننے کا بھی موقع ملے یہ ہمارے لئے مشکل ہو کر رہ گیا ہے۔ اذانیں گونجتی رہتی ہیں کاروبار جاری رہتا ہے۔ دفتر سے نکل کر گھر پہنچتے پہنچتے جمعہ کا اکثر وقت نکل جاتا ہے۔ لوگ یا تو جمعہ ہی نہیں پڑھتے یا جمعہ پڑھتے ہیں تو صرف عربی خطبہ یا دو رکعت نماز کی حد تک۔ کاش! ہم کبھی اپنی ان محرومیوں پر غور کر سکیں۔

۲۔ اس بستی کے رہنے والوں پر جو عذاب آیا اس کا سبب صرف یہ نہیں تھا کہ انہوں نے سبت کے تقدس کو پامال کیا تھا۔ بلکہ اس پامالی کی شکل میں انہوں نے احکامِ خداوندی کا تمسخر اڑایا تھا۔ انہیں شکار کھیلنے سے روکا گیا تھا تو انہوں نے مخالفت اور نافرمانی کے لئے حیلے تجویز کر لئے۔ چنانچہ دین کو اس طرح مذاق بنانے اور اللہ کے احکام کو بگاڑنے کی انہیں یہ سزا ملی کہ وہ بندر بنا دیئے گئے اور آج تک بطورِ عبرت ان کا

Marfat.com

ذکر کیا جاتا ہے۔ ہمارے لیے اس میں سوچنے کا مقام یہ ہے کہ انہوں نے ایک حکم کا مذاق اڑایا تو ان کا انجام یہ ہوا۔ ہم نے تو دین کا بند بند توڑ ڈالا۔ معاشرت، معیشت، سیاست، قانون، تہذیب اور تمدن میں کون سی چیز ایسی ہے جس میں ہم نے احکامِ خداوندی کی پرواہ کی ہے۔ جن کی معاشرت اللہ کے احکام کے مطابق ہے ہم انہیں دقیانوسی سمجھتے ہیں۔ جو تہذیبی طور پر مسلمان رہنا چاہتے ہیں، ہم انہیں آثارِ قدیمہ میں شمار کرتے ہیں۔ جو اللہ کے قانون کی بالادستی پر اصرار کرتے ہیں انہیں ہم انتہا پسند قرار دیتے ہیں۔ سود کے معاملے میں ہم نے اللہ کے قانون کا وہ مذاق اڑایا ہے کہ پناہ بخدا۔ شرم وحیا کو اللہ کے رسول نے نصف ایمان قرار دیا ہے۔ ہم نے بے حیائی کو اپنی تہذیب سمجھ لیا ہے اور اس میں ہماری جسارتوں کا عالم یہ ہے کہ ہمارا پورا میڈیا اس میں غرق ہو گیا ہے اور جو زیادہ بے حیائی کا کردار کامیابی سے ادا کرتا ہے، ہم اسے تمغہ دینا ضروری سمجھتے ہیں اور اگر وہ مرجاتا ہے تو ہم اسے ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتے ہیں۔ احکامِ شریعت کا مذاق اڑانا اور انہیں پرانے وقتوں کی باتیں قرار دینا ہمارے دانشور طبقے کا معمول ہو گیا ہے۔ اگر بنی اسرائیل پر چند احکام کا تمسخر اڑانے سے اللہ کا عذاب ٹوٹتا ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا انجام کیا ہوگا؟ یہ تو آنحضرت ﷺ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ ہم مسخ کے عذاب سے بچے ہوئے ہیں ورنہ ہم نے بھی اپنے چہرے بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس وقت پورا عالمِ اسلام ذلت کے جس عذاب میں مبتلا ہے وہ ہمارے اپنے اعمال کا شرعی نتیجہ ہے۔ جب کوئی اللہ کا بندہ مسلمانوں کی اس حالتِ زار پر اپنے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو ادھر سے آواز آتی ہے۔

جب میں کہتا ہوں کہ یااللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

۳۔ زیرِ بحث آیتِ کریمہ میں غور کرنے سے ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو سبت کے احترام کے سلسلے میں بطورِ خاص یہ حکم دیا گیا کہ تم سبت کے دن شکار نہ کھیلو۔ وہ لوگ چونکہ ساحلِ بحر پر رہنے والے تھے اور ساحل کے مکینوں کی غذا میں عموماً مچھلی کو غالب حصہ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بات تو قابلِ فہم ہے کہ مچھلی کے شکار کے بغیر ان کیلئے غذائی ضرورت کو پورا کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن اس کیلئے یہ کیا ضروری تھا کہ وہ سبت کے دن بھی مچھلی پکڑتے۔ باقی ہفتے کے 6 دن کیا مچھلی کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے کفایت نہیں کرسکتے تھے۔ آج کی متمدن دنیا میں بھی متعدد ملکوں میں ہفتے کے دنوں میں ایک دن گوشت کا ناغہ ہوتا ہے اور اس سے قومی سطح پر کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ اگر وہ ایک دن مچھلی کا گوشت حاصل نہ کر پاتے تو یقیناً ان کیلئے بھی کوئی بڑا مسئلہ نہ ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ انہیں پیغمبر کے ذریعے اچھی طرح یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ اگر تم نے سبت کے احترام میں شکار کھیلنا نہ چھوڑا تو تم پر اللہ کا عذاب آسکتا ہے۔ بایں ہمہ انہوں نے شکار پر ضد کی۔ البتہ اس کیلئے ایسے حیلے تلاش کئے جس سے اللہ کا حکم مذاق ہو کر رہ گیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ وہ گوشت کی ایک دن کی کمی کو برداشت کیوں نہ کر سکے؟

بعض اہلِ علم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ان کی بے صبری کی وجہ یہ تھی کہ ہفتے کے چھ دنوں میں بہت کم مچھلی دریا میں آتی تھی۔ لیکن سبت کے دن مچھلی ہجوم کر کے آتی تھی، جس سے باقی چھ دنوں کی کمی بھی پوری ہوجاتی۔ اب اگر وہ سبت کے دن بھی مچھلی نہ پکڑتے تو یقیناً ان کی غذائی ضرورت پورا نہ ہوتی۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ لیکن اس سے سوال کا مکمل جواب نہیں ملتا البتہ سوال ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ جو اپنی مخلوق کو غذا فراہم کرتا ہے۔ اس میں عام طور پر کبھی ایسا

Marfat.com

نہیں ہوتا کہ غذا کی بہم رسانی کا جو ذریعہ ہے اس میں اچانک رکاوٹ پیدا کر دی جائے یا اسے کسی دن کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے۔ اس کا تو مستقل ایک تکوینی نظام ہے جو اللہ کی مشیت اور حکمت کے مطابق چلتا رہتا ہے اور جب کبھی کہیں کسی ایسی تبدیلی کا ظہور ہوتا ہے تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی سبب کارفرما ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں بھی ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ ایسا سبب کیا پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اللہ کے نظام میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ قرآنِ کریم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ اللہ کا جب کوئی بندہ اللہ کے حکم کے مطابق حلال رزق پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے حلال رزق میں ایسی برکت ڈال دیتا ہے کہ وہ تھوڑا بھی ہو جب بھی اس کی ضرورتوں کیلئے کفایت کر جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ حلال رزق پر اکتفا کی بجائے حرام رزق پر ہاتھ مارتا ہے بلکہ حلال رزق پر صبر کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور وہ اللہ کے حکم کو یکسر نظر انداز کر کے اپنے نفس یا شیطان کی بندگی کرنے لگتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی طبیعت کو اس طرح کا بنا دیتے ہیں کہ حلال رزق اس کیلئے کافی نہیں ہوتا۔ وہ چاہے بڑی تعداد میں بھی ہو لیکن وہ یہی محسوس کرتا ہے کہ میرا اس سے گزارہ نہیں ہوگا۔ شیطان اسے ضروریات کی فراوانی سے ڈراتا ہے۔ کبھی فقر کی تباہ ناکیاں اس کے سامنے لا کھڑی کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حرام کو اپنی ضرورت سمجھنے لگتا ہے۔ آج بھی ہم اگر اپنے گردوپیش پر نظر دوڑائیں تو دیکھ سکتے ہیں کہ جو لوگ رشوت سے پرہیز کرتے ہیں اور ہر طرح کے حرام مال سے اجتناب کرتے ہیں، اللہ انہیں برکت عطا فرماتا ہے اور ان کی تنخواہ ان کیلئے کافی ہو جاتی ہے لیکن جو لوگ حرام ذرائع تلاش کر لیتے ہیں اور پھر اس میں بڑھتے چلے جاتے ہیں، ان کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ انہیں ہزار سمجھاؤ کہ تم حرام کھا رہے ہو کل کو اللہ کو جا کر کیا جواب دو گے؟ تو وہ بڑی عاجزی سے جواب دیتے ہیں کہ کیا کریں؟ تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا۔ ہمارے حلال ذرائع اس کیلئے کفایت نہیں کرتے حالانکہ انہیں کے ساتھ کام کرنے والے انہیں جیسی ضروریات رکھنے والے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو تنخواہ ہی میں گزارہ کرتے ہیں اور ان کا گزارہ ہو جاتا ہے۔ ان کے حق میں اللہ کا یہی قانون حرکت میں آتا ہے کہ ان کے مال میں بے برکتی کر دی جاتی ہے اور ان کی طبیعت میں یہ بات اتار دی جاتی ہے کہ تم حرام کے بغیر گزارا نہیں کر سکتے۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہو گئی تھی۔ مسلسل اللہ کی نافرمانیوں کے باعث وہ اللہ کے قانون کی زد میں آ گئے اور بے صبری میں حدود سے تجاوز کر گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے عذاب نے انہیں اہلِ دنیا کیلئے عبرت بنا دیا۔

اگلی آیاتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کے نقضِ عہد اور سرکشی کی ایک اور مثال بیان فرمائی گئی ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ○ (البقرة:٦٧)

(اور وہ وقت یاد کرو! جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ذبح کرو ایک گائے، وہ بولے کہ آپ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں)

Marfat.com

نقضِ عہد کی دوسری مثال

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی امیر آدمی کا ایک بیٹا تھا۔ جواس کا تنہا وارث تھا۔اس کی زندگی میں کوئی دوسرا اس کا وارث نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اس کے چچا کے بیٹوں نے سوچا کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہتا ہے تو ہمیں تو وراثت سے کوئی حصہ نہیں ملے گا اس لئے بوڑھے تایا کی وراثت میں حصہ لینے کی ایک ہی صورت ہے کہ اس کے بیٹے کو قتل کردیا جائے چنانچہ دولت کے لالچ میں انہوں نے یہ قتلِ ناحق کیا اور اس کی لاش اٹھا کر آبادی سے باہر پھینک آئے اور خود ہی اس کے لئے مدعی بھی بن بیٹھے۔اب جب کہ قاتل کی تلاش شروع ہوئی تو کسی کوان پر تو شبہ بھی نہیں ہوا اوران کے علاوہ اگر کوئی قاتل ہوتا تو ممکن ہے تلاش سے مل جاتا۔ مایوسی پر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ اللہ سے دعا کریں تاکہ مقتول کے قاتل کا پتہ چلے۔اس پر پروردگار نے انہیں حکم دیا کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ ’’ بقرۃ ‘‘ عربی زبان میں گائے اور بیل دونوں پر بھی بولا جاتا ہے اور صرف گائے پر بھی۔

قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بقرۃ کا معنی گائے ہے بیل نہیں۔ یہاں بعض اہلِ علم نے اس حکم کو قسامہ پر قیاس کیا ہے ۔اس لئے ان کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل میں چونکہ قسامہ کا طریقہ مروج تھا اس لئے اسی کے مطابق اللہ نے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔قسامہ کے طریقے کی تفصیل تورات کی کتاب استثنا سے معلوم کی جاسکتی ہے ۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قتل ہوجاتا اور آبادی سے باہر اس کی لاش ملتی اور یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کا قاتل کون ہے تو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں قاتل کی تلاش کیلئے یہ حکم دیا گیا تھا کہ بنی اسرائیل کے بزرگ اور قاضی نکل کر دیکھیں کہ لاش کے سب سے زیادہ قریب کون سی بستی اور شہر ہے۔ پھر اس شہر کے بزرگ کوئی ایسی کم عمر گائے لیں، جس سے کبھی کوئی کام نہ لیا گیا ہو اور نہ وہ جوئے میں جوتی گئی ہو۔اسے لے جاکر ایک ایسی زمین میں ذبح کریں۔جس میں کاشت نہ کی گئی ہو اور پھر اس شہر کے سارے بزرگ جو اس مقتول کے سب سے قریب رہنے والے ہوں۔اس گائے کے اوپر ہاتھ دھوئیں اور یہ کہیں کہ نہ ہم نے اس مقتول کو قتل کیا ہے اور نہ ہماری آنکھوں نے کسی اور کو قتل کرتے دیکھا ہے۔ یہ گویا قسم کا طریقہ تھا جسے قسامہ کہا جاتا تھا۔لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا کہ کیا آپ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں حالانکہ وہ قسامہ سے تو واقف تھے۔اس لئے اسے وہ کسی طرح مذاق سے تعبیر نہیں کرسکتے تھے۔معلوم یہ ہوتا ہے کہ انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم یہ کہہ کر دیا گیا تھا کہ اس سے تمہارے مقتول کے قاتل کا پتہ چل جائے گا۔اس لئے انہوں نے کہا کہ قاتل کے پتہ چلانے سے گائے کے ذبح کا کیا تعلق ہے؟ گائے ذبح بھی ہوجائے تو یہ کیسے معلوم ہوسکے گا کہ مقتول کا قاتل کون ہے؟ اللہ کے نبی نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اللہ کے حکم کو لوگوں تک پہنچاتے ہوئے مذاق کا تصور کرنا بھی جہالت ہے۔ یہ حرکت تو تم بھی نہیں کرسکتے۔ میں اللہ کا رسول ہوکر یہ جاہلوں والی حرکت کیسے کرسکتا ہوں؟

اصل بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل صدیوں تک مصر اور مصریوں کے درمیان رہتے رہتے بہت سے مشرکانہ رسوم سیکھ گئے تھے۔انہی میں سے یہ بھی ایک بات تھی کہ گائے کی عظمت بلکہ تقدیس ان کے دلوں میں رچ بس گئی تھی۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی گائے کی تقدیس مشرکانہ مذہب کا ایک جز تھی۔گائے کی یہ تقدیس ان کے دلوں سے نکالنے کیلئے تورات کی روایت کے مطابق مختلف مواقع پر انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا جاتا رہا۔انہیں میں سے یہ بھی ایک موقعہ تھا۔مقصود یہ تھا کہ جب وہ اپنے ہاتھوں سے گائے کے گلے پر چھری چلائیں گے تو

Marfat.com

گائے کی الوہیت کے تصور اور اس کی تقدیس کے عقیدے پر ضرب لگے گی اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ جس کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کیا جاسکتا ہے۔ وہ مقدس یا معبود کیسے ہوسکتا ہے؟ اور جب اسی کے واسطے سے قاتل کی خبر ملے گی تو انہیں یقین آجائے گا کہ اگر گائے میں کوئی عظمت ہوتی تو اس کی لاش ہمارے سامنے نہ پڑی ہوتی۔ عظیم وہ ذات ہے جس نے ہمارے ہاتھوں سے گائے کو ذبح کروایا اور پھر اسی کے ذریعے قاتل کا پتہ بھی دیا۔ اگلی آیات میں تفصیل بیان کی گئی ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل نے اللہ کے حکم کی بجا آوری سے بچنے کیلئے بہانے تراشے اور سوالات کے ذریعے راستے نکالنے کی کوشش کی۔ جس سے شریعت الٰہی کے بارے میں ان کے طرزِ عمل اور ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ وہ گائے کیسی ہو؟ اس پر انہیں بتادیا گیا کہ نہ وہ بالکل بوڑھی ہو نہ بالکل چھوٹی عمر کی۔ گائے کی پہچان کیلئے یہ وضاحت کافی تھی۔ لیکن انہوں نے پھر اس کے رنگ کے بارے میں سوال کیا، جب رنگ کے بارے میں بھی بتادیا گیا تو پھر مزید سوال کیا بلکہ پہلے سوال ہی کو دہرایا کہ وہ گائے کیسی ہو؟ کس قسم کی ہو؟ جب اس پر مزید وضاحت کی گئی تو تب انہوں نے محسوس کیا کہ اس حکم کی تعمیل کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: اس بے یقینی اور بے دلی کے ساتھ انہوں نے گائے ذبح تو کر ڈالی لیکن وہ کرنا چاہتے نہیں تھے۔ بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ آخری سوال کرتے ہوئے انشاءاللہ کا لفظ ان کے منہ سے نکل گیا تھا اس لفظ کی برکت سے انہیں اس عمل کی توفیق ہوگئی ورنہ شائد وہ اس سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو جاتے۔ اب دیکھئے وہ آیاتِ کریمہ جن کا ترجمہ ہی وضاحت کیلئے کافی ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَاهِيَ ط قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ط عَوَانٌ م
بَيْنَ ذٰلِكَ ط فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ o قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ط قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ
اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ لا فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ o قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَاهِيَ لا اِنَّ
الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ط وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ o قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ
الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ج مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ط قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ط
فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ o (البقرة: ۶۸ تا ۷۱)

(انہوں نے کہا! ہماری طرف سے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، دونوں عمروں کے درمیان ہو۔ سو اب کر ڈالو جو کچھ تمہیں حکم دیا جارہا ہے o وہ بولے! اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو۔ دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو o وہ بولے! اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ اچھی طرح واضح کردے کہ وہ کیسی ہو؟ اس لئے کہ گایوں کے امتیاز میں گھپلا ہو رہا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پاجائیں گے o موسیٰ علیہ السلام نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت کرنے والی نہ ہو، جو زمین کو جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو۔ بالکل یک رنگ ہو۔ اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ وہ بولے! اب تم واضح بات لائے ہو۔ پھر انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے)

Marfat.com

روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی نیک آدمی تھے، جن کا ایک ہی بیٹا تھا اور ایک ہی ان کے پاس بچھیا تھی۔ انتقال کے وقت انہوں نے دونوں کو اللہ کے سپرد کیا۔ اللہ نے اس بچے کے مال میں اس طرح برکت دی کہ بنی اسرائیل نے جب گائے ذبح کرنے کے حکم کی تعمیل میں حیل وحجت سے کام لیا اور سوالات کرتے گئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر وہ کوئی عام سی گائے بھی ذبح کر دیتے، تو قبول کر لی جاتی۔ لیکن ان کے سوالات کے نتیجے میں گائے کی صفات میں اضافہ ہوتا گیا، جو ان کے لئے پابندیاں بن گئیں۔ اب جب ان متذکرہ صفات کی حامل گائے کی تلاش شروع ہوئی، تو پوری آبادی میں کوئی گائے ویسی نہ ملی۔ سوائے اس گائے کے، جس کا مالک مذکور مرحوم کا بیٹا تھا۔ اس نے منہ مانگے داموں پر گائے ان کے ہاتھ بیچی۔ جو بالآخر انہیں لینا پڑی۔ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ گائے اپنی صفات کے باعث بالکل ویسی تھی جس طرح کی گائے مصر کے لوگ اپنی پوجا کیلئے منتخب کیا کرتے تھے۔ یوں تو ان کے ہاں ہر گائے مقدس تھی لیکن جس گائے کی بڑی چاہت سے پوجا کی جاتی اور اس کو بہت مقدس سمجھا جاتا وہ ایسی ہی صفات کی حامل گائے ہوتی تھی۔ اس طرح کی گائے کو بنی اسرائیل کے ہاتھوں ذبح کروانے ہی سے ان کے اندر سے گائے کی تقدیس کا شرک نکل سکتا تھا۔ ورنہ وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ صحیح ہے کہ ہم نے گائے ذبح کی ہے لیکن درحقیقت جو گائے اپنے اندر الوہیت کی شان رکھتی ہے وہ عام گائے نہیں ہوتی بلکہ وہ خصوصی صفات کی حامل گائے ہوتی ہے۔ تو متذکرہ صفات کی حامل گائے ان کے ہاتھوں سے ذبح کروا کر ان کے مشرکانہ جذبات کو پوری طرح کچل ڈالنے کی سعی کی گئی۔ اب اگلی آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کے مشرکانہ احساسات کی اصلاح کیلئے تو کسی وقت بھی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا جا سکتا تھا لیکن قاتل کی تلاش کے سلسلے میں گائے کے ذبح کرنے کا حکم کیا سبب رکھتا تھا؟ اسے واضح کیا جا رہا ہے۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ
تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ
الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ
الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ
مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا
اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ

Marfat.com

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَٰمَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ
مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا
قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ
بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا
تَعْقِلُونَ ﴿٧٦﴾ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا
يُعْلِنُونَ ﴿٧٧﴾ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَٰبَ إِلَّا أَمَانِيَّ
وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَٰبَ
بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ
ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ
مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ
قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ
أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً
وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَٰبُ النَّارِ ۖ هُمْ
فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ أُولَٰئِكَ
أَصْحَٰبُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٨٢﴾

Marfat.com

رکوع ۹۔ اور (وہ وقت یاد کرو!) جب تم نے ایک شخص کو قتل کرڈالا تھا، پھر تم آپس میں اس باب میں جھگڑنے لگے اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جسے تم چھپارہے تھے ہ تو ہم نے کہا: اس (میت) پر اس گائے کا کوئی ٹکڑا مارو، اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہوگئے ، پس وہ پتھر کی مانند ہوگئے یا ان سے بھی زیادہ سخت، پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی جاری ہوجاتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کررہے ہو۔ تو کیا تم اس کی توقع رکھتے ہو کہ وہ لوگ تمہارے (کہنے سے) ایمان لے آئیں گے، دراں حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ کا کلام سنتے ہیں اور پھر اس میں تحریف کرتے ہیں، بعد اس کے کہ اسے سمجھ چکے ہیں اور وہ اسے جانتے بھی ہیں ہ اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن ہیں اور جب آپس میں تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا تم انہیں وہ بتادیتے ہو جو اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے کہ وہ تمہارے رب کے پاس تم سے حجت کریں، کیا تم سمجھتے نہیں ہ کیا انہیں نہیں معلوم ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان میں ان پڑھ بھی ہیں جو کتابِ الٰہی کا کوئی علم نہیں رکھتے، بجز جھوٹی آرزوؤں کے اور یہ صرف اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔ سو خرابی ہے ان لوگوں کیلئے جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑی سی قیمت حاصل کرلیں۔ پس ان کیلئے خرابی ہے اس چیز کے سبب سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کیلئے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو وہ کماتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تو دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں، بجز چند گنے چنے دنوں کے۔ آپ کہئے! کیا تم اللہ کے ہاں سے کوئی وعدہ لے چکے ہو؟ تو اللہ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک ایسی تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تمہیں کچھ علم نہیں۔ البتہ! جس نے کمائی کوئی بدی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ہ اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے بھلے کام کئے، تو وہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) (آیت ۷۲ تا ۸۲)

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

(اور (وہ وقت یاد کرو!) جب تم نے ایک شخص کو قتل کرڈالا تھا، پھر تم آپس میں اس باب میں جھگڑنے لگے اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جسے تم چھپارہے تھے ہ تو ہم نے کہا: اس (میت) پر اس گائے کا کوئی ٹکڑا مارو، اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو) (البقرۃ:۲:۷۲تا۷۳)

Marfat.com

اس آیتِ کریمہ میں اِدّٰرَءْتُم کا لفظ آیا ہے۔ یہ درء سے ہے۔ درء کے معنی ''جھگڑنے کے بھی ہیں اور دفع کرنے کے بھی''۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر دفع کرنے کے معنی میں ہی آیا ہے۔ مثلاً فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ. وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ. يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اس آیتِ کریمہ میں اِدّٰرَءْتُم بروزنِ اِفَّاعَلْتُم سے مراد آپس میں جھگڑنا اور ایک دوسرے پر الزام لگانا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں وہ اصل مقصد بیان کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ایک شخص قتل ہو گیا تھا اس کے قاتل کے بارے میں معلوم نہیں ہو رہا تھا اور لوگ ایک دوسرے پر اس کے قتل کا الزام لگا رہے تھے معلوم ہوتا ہے یہ الزام تراشی فساد تک پہنچ رہی تھی۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعا کرنے پر اللہ نے حکم دیا کہ تم ایک گائے ذبح کرو اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا لے کر مقتول کی لاش کو مارو یعنی اسے چھوا دو۔ مقتول زندہ ہو کر بتائے گا کہ قاتل کون ہے؟ چنانچہ اس گائے کو ذبح کرنے کے بعد ایسا ہی کیا گیا۔ مقتول زندہ ہو گیا اور اس نے بتایا کہ میرے چچا کے بیٹوں نے مجھے قتل کیا ہے۔ یہ بتانے کے بعد وہ مر گیا۔ اس طرح اس کے قتل کا معمہ تو حل ہو گیا اور قوم میں اس واقعہ کے نتیجے میں جو تفرقہ پیدا ہو رہا تھا اس سے بچ گئی۔ لیکن دوسری آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو اور نشانیوں کے اصل مقصد کو سمجھو۔ اب ہمیں غور یہ کرنا چاہئے کہ یہاں کیا نشانیاں دکھائی گئی ہیں اور ہمیں ان سے کیا سبق لینا چاہئے۔ گہرے غور و فکر سے تو حسبِ توفیق بہت ساری باتیں سمجھ میں آسکتی ہیں۔ لیکن معمولی غور و فکر سے بھی دو باتیں تو بالکل سامنے کی بات معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ بنی اسرائیل کو اس طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تم ذرا غور کرو کہ گائے بھی باقی جانوروں کی طرح ایک جانور ہے۔ وہ اگر دودھ دیتی ہے تو کئی اور جانور بھی دودھ دیتے ہیں۔ اس کا اگر گوشت کھایا جاتا ہے تو کئی اور جانوروں کا گوشت اس سے ہر لحاظ سے بہتر بھی ہے۔ اس کا اگر چمڑہ کام آتا ہے تو یہی افادیت دوسرے جانوروں کے چمڑوں میں بھی ہے۔ تو پھر آخر کس وجہ سے تم گائے کی تقدیس کے قائل ہو گئے ہو؟ اور تم انسان ہو کر اس معمولی درجہ کے جانور کے سامنے جھکتے ہو اور اس کا احترام بجا لاتے ہو، بظاہر تو گائے میں تقدیس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ! صرف ایک بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ مصر کے رہنے والے لوگ گائے کے بارے میں یہ سمجھتے تھے کہ اس کے اندر صفات الوہیت پائی جاتی ہیں اور وہ اپنی ذات میں بڑی قدرتوں کی حامل ہے۔ اگر تم بھی مصریوں کی طرح یہ سمجھتے ہو تو ذرا کھلی آنکھوں سے دیکھو کہ تمہارے چند آدمیوں نے اسے پکڑ کر زمین پر لٹایا پھر زبردستی چھری سے اس کا گلا کاٹ ڈالا پھر اس کے گوشت کے پارچے بنا ڈالے یعنی اس کا انگ انگ کاٹ ڈالا۔ اگر گائے میں واقعی کوئی قدرت اور طاقت تھی اور وہ غیر معمولی صفات کی حامل تھی تو اس نے اپنے آپ کو بچانے کیلئے مدافعت کیوں نہ کی؟ اگر وہ واقعی غیر معمولی تقدیس کی مالک ہے تو اس کے گلا کاٹ دینے پر تم پر کوئی عذاب کیوں نہیں آیا؟ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تمہارے ہاتھ شل ہو جاتے، زمین پھٹ جاتی اور تم پر اللہ کا غضب بھڑکتا۔ لیکن اس میں سے کچھ بھی نہیں ہوا اور ہونا بھی نہیں چاہئے تھا کیونکہ گائے بچاری ایک جانور کے سوا کچھ نہیں۔ اسے انسانوں کی ضرورت اور خدمت کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ انسانوں کی بے سمجھی ہے کہ وہ گائے میں نہ جانے کیا کیا فرض کر بیٹھے ہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اب جبکہ گائے کی لاش تمہارے سامنے پڑی ہے اور تم نے اس کا گلا کاٹ کر دیکھ لیا کہ اس کے اندر کوئی غیر معمولی قوت نہیں اور جو اس میں معمولی حیوانی مزاحمت تھی۔ ذبح ہونے کے بعد وہ بھی ختم ہو گئی۔ اب تو وہ ایک بے جان لاشہ ہے لیکن جب تم اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر مقتول کے جسم سے مس کرتے ہو تو مقتول زندہ ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوت و قدرت نہ گائے میں ہے نہ تم میں، قوت اور قدرت کا مالک اصل میں وہ ہے جس کے حکم سے تم نے گائے کو ذبح کیا اور اسی کے حکم سے تم نے اس کے

Marfat.com

گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم سے مَس کیا اور مقتول زندہ ہو گیا۔ جس خداوندِ ذوالجلال کے حکم سے مردے زندہ ہو جائیں اور وہ اپنے حکم سے جس چیز کو چاہے زندگی کا سبب بنا دے۔ عجیب بات ہے کہ تم اس کے سامنے جھکنے کی بجائے جانوروں کے سامنے جھکتے ہو اور اس سے ڈرنے کی بجائے جانوروں کے بارے میں عجیب وغریب تصورات اختیار کرتے ہو۔ قوت وقدرت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ اس کے حکم سے ہر چیز وجود میں آتی ہے اور اسی کے حکم سے ہر وجود فنا ہوتا ہے۔ اسی کے حکم سے بنی اسرائیل جیسی قوم کو جسے غلامی نے مار ڈالا تھا ازسرِ نو قومی زندگی ملی اور وہ ظالم جو اپنے آپ کو ربی الاعلیٰ کہتا تھا بحرِ قلزم کی موجوں کی نذر ہو گیا۔ اسی کے حکم سے بنی اسرائیل کیلئے بحرِ قلزم میں بارہ راستے بنے۔ اسی کے حکم سے اے بنی اسرائیل کے لوگو تمہیں من وسلویٰ مل رہا ہے اور بادل تمہارے سروں پر سایہ کر رہے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ان ساری قدرتوں کے پیچھے تمہیں وہ قادرِ مطلق نظر نہیں آتا۔ لیکن گائے کی صورت میں تمہیں نہ جانے کیا دکھائی دیتا ہے کہ کبھی تم اس کی تقدیس کے قائل ہو جاتے ہو اور کبھی تم اس کی پرستش کرنے لگتے ہو۔ ہر مخلوق کی کمزوری اور بے بسی کا یقین کر لو، چاہے وہ مخلوق جانوروں کی شکل میں ہو یا تخت پر فائز حکمرانوں کی شکل میں یا مشیخیت اور تقدس کے دعوے داروں کی صورت میں اور صرف اللہ کی قدرت اور حکمرانی کا یقین پیدا کرو۔ چاہے اس کی دعوت دینے والے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام جیسے بے نوا درویش ہوں یا حضرت محمد ﷺ جیسے گدڑی پوش ہوں۔ وہ جب اپنی قدرت کا اظہار کرنے پر آتا ہے تو کبھی بحرِ قلزم کی منہ زور موجوں سے اظہار کرتا ہے اور کبھی غارِ ثور کے دہانے پر مکڑی کے جالے سے کرتا ہے تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ بحرِ قلزم کی موجیں تو خود اپنے اندر ایک قوت رکھتی ہیں۔ اس لئے خود انہوں نے فرعون کو غرق کر دیا۔ لیکن مکڑی کا جالا تو سب سے کمزور چیز ہے لیکن عرب کے سورما تعاقب کرتے ہوئے جب غارِ ثور کے منہ تک پہنچ گئے تو مکڑی کے جالے نے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا تو مکڑی کے جالے کی بے بسی اللہ کی قدرت سے طاقت میں ڈھل گئی۔ تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ وہ خدائے لم یزل کسی چیز کا محتاج نہیں۔ ہر چیز اس کی محتاج ہے، کسی کی قوت اپنی قوت نہیں، ہر ایک کی قوت اسی کی عطا ہے۔ یہ بات اگر سمجھ میں آجائے جو بنی اسرائیل کو سمجھائی جا رہی تھی تو آج بھی امتِ مسلمہ کی کایا پلٹ سکتی ہے اور وہ قوت کے اصل سرچشمہ سے اپنا تعلق جوڑ کر اپنی بے بسی کا مداوا کر سکتے ہیں۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرۃ:۷۴)

(پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، پس وہ پتھر کی مانند ہو گئے یا ان سے بھی زیادہ سخت، پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی جاری ہو جاتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو)

ثُمَّ استبعاد کیلئے بھی آتا ہے اور ترتیب وتراخی کیلئے بھی۔ یہاں ان کے رویے پر استبعاد کے اظہار کیلئے آیا ہے۔ گزشتہ آیات میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاتھوں ایک گائے ذبح کروائی گئی اور اسی کے گوشت کے ایک ٹکڑے کے مس کرنے سے اللہ کے حکم سے مقتول زندہ ہو گیا اور اس نے خود بتایا کہ میرا قاتل کون ہے۔ جس طرح اس سے پہلے مختلف مواقع پر بنی اسرائیل نے اللہ کی قدرتوں کو علانیہ بچشم سر دیکھا اسی طرح اب بھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا اور بولتے ہوئے سنا۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ان کے دلوں

Marfat.com

میں اللہ کی کبریائی اور اس کی قدرتِ کاملہ کا یقین پوری طرح سرایت کر جاتا اللہ کے ذکر سے ان کے دل کانپتے اور وہ اس کے احکام کے سامنے جھکتے چلے جاتے۔ لیکن بجائے اس کیفیت کے پیدا ہونے کے انہوں نے ہر موقعہ پر جس طرح لیت ولعل اور بے عملی اور بد عملی کو اپنا وتیرہ بنائے رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دلوں میں قبولیتِ حق کی نرمی پیدا ہونے کی بجائے تنگی اور سختی پیدا ہوگئی اور رفتہ رفتہ وہ اتنے سخت ہوگئے کہ پتھروں کی سختی اور سنگینی بھی ان کے سامنے ماند پڑ گئی۔

دل کب سخت ہوتا ہے

انسان کا عجیب حال ہے کہ وہ ماننے پر آتا ہے تو پتھروں کے سامنے جھک جاتا ہے اور اکڑنے پر آتا ہے تو اللہ کے سامنے اکڑ جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی قلوب میں جتنا مروت، ہمدردی، خیر خواہی، رحمت اور مودت کا احساس اور جذبہ پایا جاتا ہے کسی اور میں نہیں پایا جاتا وہ بسا اوقات دوسروں کیلئے جان دے دیتا ہے، دوسروں کے لئے بھوکا رہ سکتا ہے، دوسروں کیلئے ہر قربانی دینے کیلئے تیار ہو جاتا ہے، بڑے سے بڑا دکھ دوسروں کیلئے اٹھانے سے دریغ نہیں کرتا، اس کے دل کا سوز و گداز اللہ کی بے پایاں رحمت کا آئینہ دار ہے۔ لیکن جب وہ سخت ہو جاتا ہے تو پھر دنیا کا ہر ظلم، ہر جبر اور ہر سنگینی اس کے سامنے ہیچ دکھائی دیتی ہے۔ وہ محض شوق سے بستیاں اجاڑتا ہے، قوت اور طاقت کے گھمنڈ میں لاکھوں انسانوں کو لقمہ اجل بنا دیتا ہے، وہ انسانوں کو تڑپتا ہوا دیکھ کر سکون محسوس کرتا ہے۔ لیکن یہ صورتِ حال اچانک پید نہیں ہوتی انسان فطری طور پر ویسا ہی بنایا گیا ہے جیسا اسے ہونا چاہئے۔ لیکن جب وہ اللہ کے احکام سے منہ موڑتا ہے، عمل کے معاملے میں لیت و لعل کا شکار ہو جاتا ہے۔ پیغمبروں کی صالح زندگی کی پیروی کرنے کی بجائے وہ ان سے اختلاف کرتا ہے اور اپنے لئے دوسرے نمونے اختیار کرتا ہے تو پھر اس کا دل اور اس کے احساسات بگڑنے لگتے ہیں۔ جو بگڑتے بگڑتے اس انتہا کو پہنچ جاتے ہیں کہ پتھروں کی سنگینی اور سختی بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بنی اسرائیل نے بھی جب اللہ کے احکام کے معاملے میں ایسی ہی روش اختیار کی تو وہ اس حد تک بگڑے کہ اللہ کے نبیوں کو قتل کرنا بھی ان کے مشکل نہ رہا۔ اسرائیلی صحیفوں میں ان کے اس رویے کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے جس سے قرآنِ کریم کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت یرمیاہ ایک پیغمبر گزرے ہیں، ان کے صحیفے میں بنی اسرائیل کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ تربیت پذیر نہ ہوئے۔ انہوں نے اپنا چہرہ چٹان سے سخت تر بنایا، انہوں نے پھرنے سے انکار کیا۔ سارے بنی اسرائیل بے حیائی کی پیشانی رکھتے اور سنگدل ہیں۔ (یرمیاہ ۳:۱۵) البتہ قرآنِ کریم نے ''اَوْ'' کا لفظ استعمال کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بنی اسرائیل سارے ایک جیسے نہیں تھے ان کی طبیعتوں کی سنگینی اور سختی میں فرق تھا، کچھ تو پتھر جیسے سخت تھے اور کچھ اس سے بھی زیادہ سخت۔

انسان کا پتھر سے زیادہ سخت ہونا حقیقت ہے

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ کوئی انسان پتھر جیسا یا اس سے زیادہ سخت کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ شائد مبالغہ کا اسلوبِ بیان ہے جو قرآن کریم نے اختیار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کی تعبیر ہے۔ پتھروں میں جو سختی ہوتی ہے وہ ان کو ان صلاحیتوں سے محروم نہیں کرتی جو قدرت نے ان کے اندر ودیعت کی ہوتی ہیں۔ پتھر چاہے کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو اگر اس کے اندر اللہ نے پانی کی سوت جاری کرنے کی صلاحیت رکھی ہے تو وہ کبھی اس سے محروم نہیں ہوتا۔ اس کی سختی پانی کے راستے میں حائل نہیں ہوتی۔ لیکن انسان جب بگڑتا ہے تو اس کا بگاڑ آہستہ آہستہ قانونِ الٰہی کے بموجب ان تمام صلاحیتوں سے اسے محروم کر دیتا ہے جو فطرت کی طرف سے اسے ودیعت

Marfat.com

ہوتی ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جب کوئی فرد یا کوئی قوم اللہ کے اس قانون کے مطابق دل کی سختی کا شکار ہوتی ہے تو پھر نہ اس کا علم اس کے کام آتا ہے نہ اس کی تہذیب اس کا راستہ روکتی ہے۔ وہ چاہے جمہوریت کا داعی کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنے مفادات کی پاسداری کیلئے جمہوریت کا ایک ایک ٹانکہ توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ساری دنیا میں حقوق کی دہائی دینے کے باوجود کمزور قوموں کے حقوق پاؤں تلے روندتا ہے۔ انسانی آزادیاں اس کے نزدیک بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ آج اگر پتھروں سے بھی بڑھ کر سنگین دلوں کے مصداق تلاش کرنے ہوں تو آپ کو امریکہ اور برطانیہ کی طرف دیکھ لینا ہی کافی ہے۔ جس سے یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ آجاتی ہے کہ دلوں کے سخت ہو جانے کا کیا مفہوم ہے اور اگر بنی اسرائیل ہی کی تاریخ کے حوالے سے ان کے دلوں کی سنگینی کا اندازہ کرنا ہو تو آج کی اسرائیلی ریاست کے ذمہ داروں کا فلسطینیوں کے ساتھ رویہ دیکھ لیجئے۔ لیکن قرآنِ کریم ان کے سامنے خصوصاً اور پوری دنیا کے سامنے عموماً یہ آئینہ رکھ رہا ہے، جس میں ہر قوم اپنی شکل پہچان سکتی ہے۔ جہاں تک پتھروں سے پانی کا جاری ہونے یا اللہ کے خوف سے پتھروں کے لڑھک جانے کا تعلق ہے تو یہ کوئی شاعرانہ اسلوبِ بیان نہیں بلکہ بنی اسرائیل تو اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کیونکہ ان کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے اکٹھے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور یہ بھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ طور کے ایک حصہ پر جب اللہ کی تجلی پڑی تو وہ پاش پاش ہو گیا۔ لیکن افسوس یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ان کے دلوں کی سنگینی بڑھتی گئی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس امت کو آگاہی دیتے ہوئے فرمایا تھا:

اِنَّمَا اَھْلَکَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُم کَثْرَۃُ مَسَائِلِھِم وَاِخْتِلَافِھِم عَلٰی اَنْبِیَائِھِم

(اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم سے پہلے لوگوں کو سوالات کی کثرت نے اور اپنے نبیوں کی مخالفت نے ہلاک کیا)

یعنی جب بھی ان کے سامنے اللہ کے احکام پیش کئے گئے تو انہوں نے فوراً آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے سامنے سر نہیں جھکایا بلکہ ہمیشہ کوشش کی کہ سوالات کے راستے سے بچ نکلنے کی کوشش کریں اور اس طرح سے اپنی بے عملی کا جواز پیدا کریں اور اپنی زندگی بنانے کیلئے بجائے اپنے نبیوں کے اسوہ حسنہ کے اتباع کرنے کے انہوں نے ہمیشہ ان سے اختلاف کیا اور مخالفت کی۔ یہی بے عملی آہستہ آہستہ دل کی سنگینی کا باعث بنتی ہے جو ہلاکت تک پہنچا کر چھوڑتی ہے۔ ہمیں متنبہ کیا گیا تھا کہ دیکھنا تم یہ راستہ اختیار نہ کرنا۔ لیکن نہایت دکھ سے کہنا پڑتا ہے آج ہمارا رویہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ قانونِ اسلامی کیلئے ہماری آمادگی ایک قصۂ پارینہ بن چکی ہے ہم نے قرآن و سنت کے منصوص احکام کو بھی عجیب و غریب سوالات اٹھا کر متنازع بنا کر رکھ دیا ہے۔ غیر ملکی تہذیب و تمدن کے آثار نے ہمارے تعامل اور روایات کو شکست و ریخت کا شکار کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی اسلامی زندگی کی ایک ایک قدر گم کرتے جا رہے ہیں اور یہ وہ راستہ ہے جس راستہ پر چل کر بنی اسرائیل تباہ ہوئے اور ہم اسی راستہ پر بگٹٹ بھاگے جا رہے ہیں۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ○

Marfat.com

تو کیا تم اس کی توقع رکھتے ہو کہ وہ لوگ تمہارے (کہنے سے) ایمان لے آئیں گے، دراں حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ کا کلام سنتے ہیں اور پھر اس میں تحریف کرتے ہیں، بعد اس کے کہ اسے سمجھ چکے ہیں اور وہ اسے جانتے بھی ہیں ٥ اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن ہیں اور جب آپس میں تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا تم انہیں وہ بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے کہ وہ تمہارے رب کے پاس تم سے حجت کریں، کیا تم سمجھتے نہیں ٥ کیا انہیں نہیں معلوم ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں) (البقرۃ:۷۵تا۷۷)

ایک التفات

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کی طرف التفات ہے اور اس التفات اور خطاب کا ایک پس منظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اوس وخزرج کے لوگ جو مدینہ طیبہ میں رہتے تھے اور جو مسلمان ہونے کے بعد انصار کے معزز لقب سے پکارے گئے۔ یہ بنیادی طور پر مشرکین مکہ کی طرح بالکل ان پڑھ اور مکتبی تعلیم سے ناواقف لوگ تھے۔ جو علومِ شریعت، نبوت، وحیِ الٰہی، توحید اور آخرت وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ البتہ ان کے ہمسائے میں یہود آباد تھے جن سے ہر وقت کا ملنا جلنا تھا۔ یہود اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے مذہب کے بنیادی تصورات اور نبوت اور وحیِ الٰہی کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ انہی سے اوس وخزرج کے لوگ بھی دین کی بعض اصطلاحات سن چکے تھے۔ انہی دینی باتوں کے سلسلے میں یہود سے ایک بات انہوں نے تکرار کے ساتھ سنی تھی کہ ایک نبی آنے والے ہیں جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے وہ ان کو ساتھ لے کر دوسری قوموں پر غلبہ حاصل کریں گے اور ایک بڑی حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اب اس آنے والے نبی کا زمانہ قریب ہے، جیسے ہی وہ تشریف لائیں گے ہم ان پر ایمان لا کر تم پر غلبہ حاصل کریں گے اور جن لوگوں نے آج تک ہمارے ساتھ زیادتیاں کی ہیں ان کا حساب چکائیں گے۔ مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر جب اوس وخزرج کے چند لوگوں سے آنحضرت ﷺ کی ملاقات ہوئی اور آپ نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر ہم سے یہود کیا کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ پہلے ایمان لے آئیں اور ہم پیچھے رہ جائیں اس لئے تم اس نعمت کے حصول میں سبقت کرو۔ چنانچہ وہ لوگ ایمان لے آئے پھر ایک مختصر عرصے میں مدینہ منورہ میں گھر گھر اسلام پھیل گیا۔ آنحضرت ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ آ گئے۔ اب اوس وخزرج کو خیال ہوا کہ یہود چونکہ آنے والے نبی کے بارے میں جانتے تھے وہ یقیناً جوق در جوق اسلام کی آغوش میں آئیں گے اور مدینہ مرکزِ اسلام بن جائے گا۔ چنانچہ اسی خیال سے مسلمانوں نے اپنے ملنے والے یہودیوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کی لیکن ان کا رویہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ نہ صرف ایمان لانے کو تیار نہیں بلکہ آئے دن ان کی طرف سے کوئی نہ کوئی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ مسلمانوں کو ایک طرف تو اس سے پریشانی ہوئی اور دوسری طرف انہیں دشمنانِ اسلام اور منافقین کی طرف سے اس طرح کی باتیں سننا پڑیں کہ دیکھو! اگر یہ وہی پیغمبر ہوتے جن کا یہود کو انتظار تھا تو یقیناً یہود آگے بڑھ کر ان پر ایمان لاتے اور ان کے بڑے بڑے علما کبھی ایمان لانے میں پس و پیش نہ کرتے۔ لیکن ان کا موجودہ رویہ یہ بتاتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس سے نئے نئے مسلمانوں میں پریشانی پیدا ہوتی۔ اس پس منظر کے باعث یہاں اس سلسلۂ بیان میں مسلمانوں کو خطاب کر کے ایک تو انہیں تسلی دی جا رہی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی مخالفت سے بددل نہ ہوں ان کے سامنے ان

Marfat.com

کی اصل حالت کوکھول کر بیان کیا ہے کہ جس قوم کا رویہ اپنے نبیوں کے ساتھ یہ رہا ہو اور جنہوں نے اللہ کی کتابوں کے ساتھ وہ سلوک کیا ہو جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے تو تم ان سے قبولیت اسلام کی توقع کیسے کرسکتے ہو اور دوسری یہ بات بھی کہی جارہی ہے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ جولوگ یہود میں سے تمہارے پاس آتے ہیں، پس پردہ ان کی حرکات کیا ہیں وہ تم سے کیا کہتے ہیں اور آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے تم ان کی فریب کاری کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اسی فریب کاری کو واضح کرنے اور ان کے گروہی طلسم کو توڑنے کیلئے ان آیات میں باقاعدہ ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ وَقَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ سے ان کے علما اور مشائخ کے کرتوت بیان کیے گئے ہیں کیونکہ یہی وہ طبقہ تھا جو تمام قومی اور دینی معاملات میں انہیں رہنمائی دیتا تھا، عوام انہی کی عقیدت کے جال میں پھنسے ہوئے تھے اور اوس و خزرج بھی انہیں کے علم سے متاثر اور مرعوب تھے اس لئے ضروری تھا کہ سب سے پہلے انہی کا اصل حلیہ انہیں دکھایا جاتا۔ علما ہوں یا مشائخ ان کی اصل قدر و قیمت اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ وہ جس کتاب کو کتاب اللہ کہتے اور اس کی پیروی اور ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اس کے ساتھ ان کی وابستگی کی کیفیت اور حقیقت کیا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ یہ گروہ جو اپنے آپ کو تورات کا عالم کہتا ہے اور اس کتاب پر عمل کرنے کے باعث وہ اپنی مشیخیت کا دعوے دار ہے۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ اس کتاب کے ساتھ انہوں نے کیا طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ اسے سنتے ہیں یعنی وہ کتاب ان کیلئے اجنبی نہیں ان کے کان اس سے مانوس ہیں۔ ممکن ہے اپنی مجلسوں میں اسے سن کر جھومتے بھی ہوں جس سے لوگوں کو یہ تاثر دیتے ہوں کہ ہمارا اللہ کی کتاب سے کس قدر قلبی رشتہ ہے اور مزید اس سے یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ جس کتاب کو سن کر وہ اس قدر متاثر ہوتے ہیں یقیناً اسے کماحقہ سمجھتے بھی ہیں۔ لیکن کتاب سے ان کی وابستگی اور اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے استحضار کا ان کے دلوں میں حال یہ ہے کہ وہ اس کتاب میں تحریف کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہ نہ سمجھئے کہ انجانے میں یا بے علمی سے نہ سمجھنے کے باعث وہ تحریف کر بیٹھتے ہیں۔ ہرگز نہیں! بلکہ وہ جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر ارادے کے ساتھ تحریف کرتے ہیں اور انہیں خوب معلوم ہوتا ہے کہ وہ تحریف کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ قَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ میں دونوں صورتیں ممکن ہیں کہ کان ناقصہ قرار دیا جائے یا تامہ۔ یعنی اس گروہ سے ان کے اسلاف مراد لئے جائیں یا خود ان کو مراد لیا جائے جو رسول اللہ ﷺ کے معاصرین ہیں۔ البتہ سیاقِ کلام کا تقاضا یہ ہے کہ معاصرین ہی مراد لیے جائیں۔ (متقدمین میں سے صاحبِ تفسیر کبیر نے انہیں کو مراد لیا ہے) اس لئے نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ یہ کہا جارہا ہے کہ موجودہ یہود کے علما اور مشائخ کا یہ رویہ ہے اور وہ تحریف کرتے ہوئے اس قدر اللہ سے بے خوف ہوتے ہیں کہ وہ جانتے بوجھتے یہ حرکت کرتے ہیں۔

تحریف کا مفہوم

اب سوال یہ ہے کہ یہ تحریف کیا تھی جو وہ کرتے تھے؟ تحریف کا مطلب تو یہ ہے کہ بات کو اصل معنی اور مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق ایسے معنی پہنا دیئے جائیں جو قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہوں۔ لیکن اس کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ یہ تحریف لفظی بھی ہوتی ہے اور معنوی بھی۔ انہوں نے ہر طرح سے تورات میں تحریف کی۔ کبھی تو ایسا کیا کہ لفظ کی ادائیگی کے طریقے کو بدل ڈالا اور اس کی قرأت میں ایسی تبدیلی کی کہ لفظ کی اصلِ ساخت ہی بدل گئی۔ مثلاً مروہ کے ساتھ چونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا تعلق ہے اور مروہ بیت اللہ کے سامنے پہاڑی کا نام ہے جہاں سے حاجی سعی کا آغاز کرتے ہیں۔ لیکن یہود نے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ ذبیح اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نہیں بلکہ حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے مروہ کے تلفظ میں تبدیلی کی تاکہ مروہ کو ملکِ شام میں دکھایا جاسکے۔ مروہ کو بگاڑ کر مورہ یا مریا کر دیا گیا۔

Marfat.com

کبھی انہوں نے عبارت میں کمی بیشی کی۔ کہیں سے کوئی جملہ حذف کر دیا کہیں اضافہ کر دیا تاکہ عبارت کا مفہوم ہی بدل کر رہ جائے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہجرت کے واقعہ میں اس طرح تبدیلیاں کی گئیں کہ بیت اللہ اور مکہ معظمہ سے ان کا تعلق کاٹ دیا گیا اور یہ ثابت کرنا مشکل ہو گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی حجاز میں آئے تھے اور انہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی۔

معنوی تحریف کی صورت میں انہوں نے الفاظ کے ترجموں میں تبدیلیاں کیں۔ مثلاً کسی لفظ کے اگر دو معنی ہو سکتے ہیں تو انہوں نے بجائے اس کے کہ وہ معنی مراد لیتے جو سیاق و سباق کے مطابق تھا۔ انہوں نے وہ معنی مراد لیا جو ان کے وضع کردہ اعتقادات کے مطابق تھا۔ مثلاً عبرانی میں ''ابن'' بیٹے کو بھی کہا جاتا ہے اور بندہ اور غلام کیلئے بھی بولا جاتا ہے۔ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ثابت کرنے کیلئے ابن کا ترجمہ بیٹا کیا اور اسی پر اصرار کیا اور دوسرے معنی سے انکار کر دیا۔ اسی طرح ''اب'' کا معنی باپ بھی ہوتا ہے اور مربی اور رب بھی۔ انہوں نے ہر جگہ اب کا ترجمہ باپ ہی سے کیا اور اس طرح سے عقائد کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ آنحضرت ﷺ کا نام اور آپ کی صفات کا تذکرہ تورات اور انجیل دونوں میں ہے۔ لیکن اہلِ کتاب نے پوری کوشش کی کہ جو چیز بھی آنحضرت ﷺ کے وجود پر دلالت کرتی ہے اسے اللہ کی کتابوں سے نکال دیا جائے۔ غرضیکہ تحریف کی جتنی بھی شکلیں ممکن ہیں وہ تمام تحریفیں بنی اسرائیل نے اللہ کے کلام میں کی ہیں اور اس دیدہ دلیری کے ساتھ کی ہیں کہ وہ جانتے تھے کہ ہم یہ تحریف کر رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے معاصر یہود و نصاریٰ میں تحریف کا مرض تو اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ لیکن یہود کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیماری انہیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملی تھی۔ ان کی طرف آنے والے پیغمبروں نے ہمیشہ اس جسارت پر انہیں ٹوکا تھا۔ یرمیاہ نبی اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ ''تم نے زندہ خدا رب الافواج ہمارے خدا کی باتوں کو بگاڑ ڈالا ہے''۔ (یرمیاہ ۲۳، ۳۷) اور یہ تحریف شائد اس لئے بھی ان کے لئے آسان ہو گئی کہ آج خود یہود و نصاریٰ اپنے آسمانی صحیفوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کتابوں اور صحیفوں کے مضامین و مطالب ہمارے انبیاء کے دلوں پر القا ہوتے تھے۔ پھر وہ انبیاء کرام انہیں الہاماتِ معنوی کی روشنی میں اپنے الفاظ میں نوشتے تیار کر دیتے تھے۔ اس صورتِ حال میں جب نیت بھی فاسد ہو تو پھر تحریف کرنا کیا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اگر ان کی کتابیں الفاظ سمیت نازل ہوتیں تو یقیناً ان میں تبدیلی مشکل ہوتی۔ لیکن پیغمبروں کی اپنی زبان میں ہونے کی وجہ سے ان میں قلم کاری آسان ہو گئی اور پھر جب دوسری زبانوں میں ترجمے ہوئے تو وہ اصل متن کے ساتھ نہیں چھپتے تھے بلکہ تنہا ترجمے ہی متن کے قائم مقام سمجھ لئے گئے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان کے علمائے سو کو اپنی خواہشات کے مطابق تحریف کرنے کا موقع مل گیا۔ مسلمانوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جس قوم کے مذہبی علما کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ کی کتاب کو بگاڑنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ ان کے بارے میں تم یہ کیسے امید کر سکتے ہو کہ وہ کبھی آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر ایمان لے آئیں گے۔

علما کے بعد دوسرا گروہ یہود میں سے عام پڑھے لکھے لوگوں کو گروہ تھا۔ لیکن اسلام دشمنی اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ بغض میں سب ایک دوسرے کے ساتھ شریک تھے۔ یہ لوگ باقاعدہ مسلمانوں کی مجالس میں آتے، ان سے تعلقات بڑھاتے اور یہ بھی دعویٰ کرتے کہ ہم بھی تمہاری طرح مومن ہیں۔ ہمیں کوئی بیگانہ مت سمجھو، اس طرح سے مسلمانوں کو اپنے اعتماد میں لے کر بہکانے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب اپنے بڑے لوگوں یا مذہبی قائدین سے ملتے تو وہ باقاعدہ انہیں سرزنش کرتے کہ تم مسلمانوں میں کیوں جا کر بیٹھتے ہو۔ اور تم مسلمانوں کے ساتھ اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے کیوں ایسی باتیں بتا دیتے ہو جن سے وہ تمہارے خلاف حجت قائم کر سکیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گفتگو کی روا روی میں بعض دفعہ ان کے منہ سے آنحضرت ﷺ کے بارے میں ان کی کتابوں میں جو صفات، خصوصیات اور کامیابیوں کی خبریں دی گئی ہیں وہ ان میں سے بعض باتیں مسلمانوں کو بتا دیتے تھے۔ لیکن ان کے بڑے لوگوں کے فسادِ عقیدہ کو ملاحظہ کیجئے کہ ان لوگوں سے کہتے کہ تمہاری یہی وہ

Marfat.com

باتیں ہیں جو مسلمان تمہارے رب کے سامنے تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔ گویا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر یہود مسلمانوں کو ایسی باتیں نہ بتائیں تو قیامت کے دن ان پر کوئی مقدمہ قائم نہ ہو سکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کو مانتے تو تھے لیکن اس کے علم کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ یہود جو کچھ مسلمانوں کے خلاف کر رہے ہیں اور یا ان کی کتابوں میں جو کچھ ان کے پیغمبر کے بارے میں کہا گیا ہے اللہ کو بھی ان باتوں کا شائد علم نہیں اور اگر مسلمانوں کے علم میں یہ باتیں آ گئیں تو وہ اللہ کے سامنے انہیں باتوں کو بطور دلیل پیش کریں گے اور اس طرح یہود پر فرد جرم عائد ہو جائے گی۔ لیکن بعض اہلِ علم نے عندربکم کا ایک اور مفہوم مراد لیا ہے ان کا خیال ہے کہ عندربکم یا عنداللہ کا لفظ ایک مضبوط دلیل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تو یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے مسلمانوں کو ان کے پیغمبر اور اسلام کے بارے میں وہ باتیں بتا دیں جو ہماری کتابوں میں موجود ہیں تو یہ ایک ایسی مضبوط دلیل ہے، جس سے مسلمان دنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی تمہارے خلاف حجت قائم کریں گے۔ کیا تمہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم اپنے ہی خلاف مسلمانوں کو دلائل مہیا کر رہے ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کی تعلیمات، پیش گوئیوں، بشارتوں اور علامتوں کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہوگا وہ محض اہلِ کتاب کے بتانے سے ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس جاننے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ گویا وہ یہ سمجھتے تھے اور آج کا پورا یورپ اور ان کے مستشرقین بھی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآنِ مجید اللہ کی کتاب نہیں جب وہ قرآنِ کریم پر تبصرہ کرنے بیٹھتے ہیں تو اس مفروضہ کو بنیاد بنا لیتے ہیں کہ اس میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ یہود کی تورات، عیسائیوں کی انجیل اور اس طرح کے دوسرے انسانی ذرائع سے لیا گیا ہے۔ محمد ﷺ پر کوئی وحی نہیں اتری تھی۔ جب آدمی ان تضادات پر غور کرتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اگر محمد ﷺ اللہ کے رسول نہیں اور قرآنِ کریم اللہ کا کلام نہیں تو پہلی آسمانی کتابوں میں ان کا تذکرہ کیوں ہے؟ اور پھر یہ آسمانی کتابوں کے بیان کردہ علامتوں کے مصداق کیوں ہیں؟ لیکن عجیب بات ہے کہ اس کا جواب ان کے پاس کوئی نہیں، لیکن وہ حقیقت کو قبول کرنے اور سمجھنے کیلئے بالکل تیار نہیں۔ ان کی اسی جہالت اور نادانی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ کیا یہ اہلِ کتاب نہیں جانتے کہ یہ جو کچھ پیغمبرِ اسلام کے بارے میں کہتے ہیں اور جو مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اس میں ہر جلی اور خفی بات کو اللہ جانتا ہے اور ان کا کوئی عمل بھی اللہ کی نگاہوں سے چھپا ہوا نہیں۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ٥ (البقرة: ٧٨)

(اور ان میں ان پڑھ بھی ہیں جو کتابِ الٰہی کا کوئی علم نہیں رکھتے، بجز جھوٹی آرزوؤں کے اور یہ صرف اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں)

امی سے مراد

یہاں یہود کے تیسرے گروہ کا ذکر ہے۔ جنہیں عوام کالانعام کہا جاتا ہے۔ امیون ''امی'' کی جمع ہے۔ امی اس شخص کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو اور مکتبی تعلیم سے بالکل ناواقف ہو۔ جسے ہم عام طور پر جاہل کہہ دیتے ہیں۔ اس سے پہلے علما اور عام تعلیم یافتہ لوگوں کا تذکرہ ہو چکا اور مسلمانوں کو ان کے کرتوت دکھائے گئے تا کہ مسلمان یہ سمجھ سکیں کہ ایسے لوگوں سے اسلام قبول کرنے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

Marfat.com

جہلاء کا دین صرف آرزوئیں ہیں

لیکن جہلا میں چونکہ اس طرح کی باتیں نہیں ہوتیں وہ اپنی جہالت کے باعث وہ جرائم تو نہیں کرسکتے جن کے لئے علم درکار ہوتا ہے۔اس لئے اس بات کا امکان ہوسکتا تھا کہ مسلمان جہلائے یہود سے ایمان لانے کی امیدیں وابستہ کرلیتے۔اس لئے ان جہلا کے بارے میں بھی بتایا جارہا ہے کہ اسلام قبول کرنے کی اُمیدان سے بھی مت رکھو اس لئے کہ اسلام تو ایک ضابطۂ حیات ہے جو زندگی گزارنے کے اصول دیتا ہے اور پھران اصولوں پر پابندی کرنے کا حکم دیتا ہے۔وہ کسی وابستگی کو ایمان وعمل کے بغیر اہمیت کے قابل نہیں سمجھتا۔تو ایک ایسا دین جس میں ذمہ داریاں ہوں ان لوگوں کیلئے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا جو ذمہ داریوں کو قبول کرنے کا تصور بھی نہ رکھتے ہوں۔البتہ آرزوئیں ان کی اس طرح کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے یہاں آخرت میں بخشش ہے تو صرف انہی کیلئے اور جنت میں جائیں گے تو صرف وہی جائیں گے۔ایسے لوگوں سے مسلمان یہ کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ وہ اسلام جیسے دین کو قبول کرلیں گے۔

قرآنِ کریم نے یہاں امانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔جو امنیه کی جمع ہے۔جس کے معنیٰ ''آرزو،تمنا اور خواہش'' کے ہیں۔یعنی دین کے بارے میں ان کا تصور یہ ہے کہ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو یہودی یا نصرانی کہلائیں۔بس یہ نسبت ہماری نجات کیلئے کافی ہے۔قرآنِ کریم نے ان کی چند آرزوؤں کا مختلف مواقع پر ذکر بھی کیا ہے۔ایک تو ابھی ایک آیت کے بعد ہی آرہی ہے اور ایک کا ذکر آگے چل کر کیا گیا ہے۔اس کا میں یہاں ذکر کردیتا ہوں۔ وقالوا لن يدخل الجنة الا من كان هودا او نصارىٰ تلك امانيهم ''اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں نہیں جائیں گے مگر یہودی اور نصرانی یہ ان کی آرزوئیں ہیں''۔یعنی وہ جنت کو یہودی اور نصرانی کیلئے وقف سمجھتے ہیں۔گویا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو انہی کیلئے پیدا فرمایا ہے۔ان کے سوا کسی اور کے جنت میں جانے کا کوئی امکان نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے تھے: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ''اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں''۔ظاہر ہے جنت اللہ تعالیٰ اپنے بیٹوں اور چہیتوں ہی کو دیں گے۔دوسرے کسی مذہب کے ماننے والے کا اس سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔

اندازہ فرمائیے کہ جو لوگ اس قسم کی آرزوؤں کے حوالے سے جی رہے ہوں اور اس قسم کے اوہام میں مبتلا ہوں اور اس طرح کے سہانے خواب ان کا دین ہوں اور وہ چند رسوم کے سوا دین کی کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔وہ اسلام قبول کرنے کیلئے کیسے تیار ہوسکتے ہیں؟ان کی زندگی کا دارومدار چونکہ تمام تر ظن وگمان پر ہے اس لئے علم کی کوئی بات ان کے یہاں بار نہیں پاسکتی اور قرآنِ کریم تو سرتاسر علم ہے جو حقیقت پسندی کا درس دیتا ہے اور ایمان وعمل کے راستے سے اللہ کے ساتھ جوڑتا ہے ایک ایسی کتاب اور ایک ایسا دین ان کیلئے کیسے قابلِ قبول ہوسکتا ہے؟ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ وہ کیسے جاہل لوگ تھے جنہوں نے چند مصنوعی خواہشوں اور آرزوؤں کو اپنا مذہب بنا رکھا تھا۔لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔زوال پذیر قوموں کے یہی طور اطوار ہوتے ہیں۔امتِ مسلمہ کی حالت کا جائزہ لے کر دیکھ لیجئے۔ایک بڑے طبقے نے محرم کے دس دنوں کی مصنوعی مصروفیتوں کو اپنے لئے نجات کی ضمانت سمجھ لیا ہے۔اور وہ باقی سارا سال مذہب کی پابندیوں سے آزاد رہتے ہیں۔کتنے ایسے لوگ ہیں جو کسی بزرگ کا دامن گرفتہ ہونا اور عقیدت کو نجات کیلئے کافی سمجھتے ہیں اور کتنے اللہ کے نام نہاد ایسے نیک بندے بھی ہیں جو لوگوں کو یہ کہہ کر مرید کرتے ہیں کہ تمہیں نمازیں پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں تمہارے ہر گناہ کی ذمہ داری ہمارے سر ہے۔مرید سال بہ سال ایسے مشائخ کو نذرانے اور فتوحات دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے جنت خرید لی اور ایسے لوگوں کی تعداد تو بے شمار ہے جو بعض راتوں کی عبادت اور بعض دنوں کے روزوں کو پوری زندگی کی نجات کیلئے کافی سمجھتے ہیں۔حالانکہ یہ لوگ اس امتِ مسلمہ سے

Marfat.com

تعلق رکھتے ہیں جن کے ہاتھوں میں اللہ کی کتاب اور اس کے عظیم رسول کی زندگی کا روزنامچہ پوری طرح محفوظ ہے۔ اگر وہ دینی ذمہ داریوں کو سمجھنا چاہیں تو اس کیلئے ہر جگہ امکانات میسر ہیں۔ ابھی تک اس امت میں خیر غالب ہے اور صالح علما کا ایک بڑا طبقہ موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے جو کچھ عرض کیا ہے حالت اس سے بھی زیادہ ناگفتہ بہ ہے تو پھر ہم اہلِ کتاب کی حالت پر تعجب کا اظہار کیوں کریں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ○ (البقرۃ: ۷۹)

(سو خرابی ہے ان لوگوں کیلئے جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑی سی قیمت حاصل کرلیں۔ پس ان کیلئے خرابی ہے اس چیز کے سبب سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کیلئے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو وہ کماتے ہیں)

علماءِ یہود کے کرتوت

یہود کے تینوں گروہوں کی بداعمالیوں اور فکری ژولیدگیوں کا ذکر کرنے کے بعد اب پھر ان کے سربرآوردہ گروہ یعنی علما کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ جن کے بارے میں پہلے بتایا جاچکا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف تک کرڈالی۔ یہاں ان کی ایک مزید کرتوت کو بیان کرکے سزا بھی بیان کی گئی ہے کہ ان اللہ کے بندوں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کی کتاب میں تحریف ہی کے مجرم نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنے ایسے فتاویٰ کو جو انہوں نے کسی شرعی سند کے بغیر لکھے اور جن کا مقصد اپنی دنیوی اغراض کو پورا کرنا اور اپنے ماننے والے عوام کو خوش کرنا تھا، کتاب اللہ کا درجہ دے دیا اور یہ کہا کہ ہم نے جو کچھ اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے وہ سراسر اللہ کی کتاب سے نہ صرف ثابت ہے بلکہ اسی سے ماخوذ ہے۔ یہاں الکتاب کا لفظ کتاب اللہ کے معنی میں نہیں بلکہ شریعت کے احکام وقوانین کیلئے آیا ہے۔ اور مراد اس سے وہ فتاویٰ ہیں جو انہوں نے شرعی احکام جاری کرتے ہوئے مرتب کئے۔ اپنے ہاتھوں سے لکھنے کا مطلب یہی ہے کہ ان فتووں کیلئے کتابِ الٰہی کے اندر کوئی بنیاد اور سند نہیں تھی۔ یہ محض ان کے طبع زاد اور من گھڑت فتوے تھے۔ لیکن ان کا انتساب وہ اللہ اور اس کی شریعت کی طرف کرتے تھے۔ پھر ان فتووں کے جاری کرنے کے سامنے جو مقاصد تھے انہیں بھی پروردگار نے افشاء فرمادیا۔ فرمایا: لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا کہ وہ یہ ساری حرکتیں اس لئے کرتے تھے تاکہ اس کے بدلے میں فوائد اور منافع حاصل کرسکیں۔ یعنی یہ ان کی خدمتِ دین نہ تھی بلکہ حصولِ مال وجاہ کا ایک ذریعہ تھا۔ ثمن کے معنی "صرف نقد یا زرِ قیمت نہیں" بلکہ جو چیز بھی کسی چیز کے معاوضہ میں حاصل ہو وہ اس کی ثمن ہے۔ اس لئے مفسرین نے اسے یہاں اسی وسیع مفہوم یعنی مطلق دنیوی معاوضہ کے معنی میں لیا ہے۔ یعنی ان کے علما اپنے فتاویٰ کے معاوضہ میں ہر طرح کا معاوضہ وصول کرتے تھے۔ دولتِ دنیا کی شکل میں بھی اور جاہ ومنصب کی صورت میں بھی۔ کبھی وہ اپنے مذہبی رسوخ کو مال وزر کے حصول کا ذریعہ بناتے اور کبھی اسی واسطے سے اقتدار میں شرکت کا راستہ نکالتے۔ دونوں صورتوں میں ان کا مقصد اور ہدف دنیا ہوتی، جس سے اہلِ دنیا اور اربابِ حکومت فائدہ اٹھاتے اور دین کو اس سے بے پناہ نقصان پہنچتا۔ یہ تو علما کی وہ انفرادی جسارتیں ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ لیکن قومی سطح پر جو انہوں نے اللہ کی کتاب اور اس کی شریعت کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان نادانوں نے اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو اور اپنے خیالی فلسفوں کو اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلامِ الٰہی کے ساتھ خلط ملط کردیا اور

Marfat.com

ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بائبل کا عہد عتیق ہو یا عہد جدید اس میں اللہ کی کتاب کی آیات کو تلاش کرنا ناممکن ہو گیا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس میں جو کچھ اللہ کی جانب سے نازل کیا گیا تھا وہ کیا ہے اور جو کچھ انہوں نے اپنی طرف سے شامل کیا وہ کیا ہے؟ اگر کتاب اللہ کو اوپر متن کی طرح لکھ کر نیچے تشریحات کی صورت میں سب کچھ لکھ دیتے تب بھی شائد کتاب اللہ کی شناخت کا امکان باقی رہتا۔ لیکن انہوں نے تو سب کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا کہ اب اصل حقیقت کا پہچاننا ناممکن ہو گیا ہے۔ بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل عقیدہ گم کر دیا گیا ہے اور اپنے وضع کردہ خیالات کو اس کی جگہ لکھ دیا گیا ہے۔
فَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْھِمْ وَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ ۔ آیت کے اس آخری حصے میں علما کی ان مجرمانہ حرکتوں پر سزا سنائی گئی ہے۔ انہوں نے تو اپنے طور پر اللہ کے دین کو حصولِ زر کا ذریعہ بنایا لیکن اللہ نے اسے ان کیلئے دوہرا جرم قرار دیا اور دونوں کی الگ الگ سزا سنائی۔ ان کا ایک جرم یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ایسے فتاویٰ کو جو سراسر ان کے خانہ زاد اور ان کے نفس کی ایجاد تھے جن کے پیچھے شریعت کی کوئی سند نہ تھی انہیں اللہ کی طرف منسوب کیا تو اس پر سزا دیتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے اس طرح سے اپنے نفس کے اکسانے پر جو کچھ لکھا اس لکھنے پر ان کیلئے ہلاکت اور خرابی ہے اور پھر اس پر انہوں نے جو کچھ مال و زر یا عہدہ و منصب حاصل کیا وہ ان کا دوسرا جرم ہے اس پر بھی ان کیلئے تباہی اور بربادی ہے۔ دونوں جگہ ویل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ کسی بھی بندے کیلئے قیامت میں ایک ہی ہلاکت اور خرابی اس کی ابدی تباہی کیلئے کافی ہے۔ یہاں دو دفعہ انہیں یہ وعید سنائی گئی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کی ہلاکت کا کیا عالم ہوگا؟ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں داخل کر دیا جانا بجائے خود ایک تباہی اور بربادی ہے۔ لیکن خود جہنم کے بھی درجات اور وادیاں ہیں۔ ان میں ایک وادی کا نام ویل ہے جس سے خود جہنم پناہ مانگتا ہے ممکن ہے یہاں اس سے وہی مراد ہو۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰہِ عَھْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ عَھْدَہٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ: ۸۰)

(اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تو دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں، بجز چند گنے چنے دنوں کے۔ آپ کہیے! کیا تم اللہ کے ہاں سے کوئی وعدہ لے چکے ہو؟ تو اللہ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک ایسی تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تمہیں کچھ علم نہیں)

جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال

اس آیتِ کریمہ میں ان کی جھوٹی آرزوؤں کی ایک اور مثال بیان ہوئی ہے۔ اس سے پہلے بتایا گیا ہے کہ ان کے عوام دین کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں وہ دین کو آرزوؤں کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور انہیں آرزوؤں کے سہارے وہ جنت کو اپنے لئے لازمی تصور کرتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ ان کی آرزوؤں میں سے یہ بھی ایک آرزو تھی کہ ہمیں جہنم کا عذاب بالکل نہیں ہوگا، ہم چونکہ اللہ کی برگزیدہ امت ہیں ہمارے اعمال چاہے کیسے بھی ہوں، ہمارے جہنم میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر بفرضِ محال ہمیں جہنم جانا ہی پڑا تو وہ چند دنوں کی بات ہوگی، اس کے بعد ہم مستقل جنت میں واپس آجائیں گے۔

Marfat.com

ایاماً معدودۃ سے مراد

ان چند دنوں کے حوالے سے مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔لیکن ہمارے اکثر مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ جتنے دنوں تک یہودی گوسالہ پرستی میں مبتلا رہے اتنے دن وہ جہنم میں رہیں گے۔اس کی تائید خود یہود کے اکابر سے بھی ہوتی ہے۔تفسیر ماجدی میں ہے کہ پادری راڈول نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں اکابرِ یہود کے حوالہ سے لکھا ہے (ان دنوں سے مراد وہ دن ہیں جن میں قوم اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا رہی تھی یعنی کوئی چالیس دن) اور ایک دوسرے مسیحی مترجم قرآن ''سیل'' نے یہ مدت گیارہ مہینہ یا ایک سال نقل کی ہے۔اسی طرح ایک میعاد سات دن کی بھی نقل ہوئی ہے۔بہر حال وہ تھی کوئی محدود و متعین مختصر سی ہی مدت بلکہ بعض یہودی ماخذوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اسرائیلی اپنے کو آتشِ دوزخ کی زد سے بالکل ہی باہر اور محفوظ سمجھ رہے تھے۔چنانچہ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یہ عقیدہ یوں نقل ہوا ہے ''آتشِ دوزخ گنہگارانِ قومِ یہود کو چھوئے گی بھی نہیں اس لئے کہ وہ درِ جہنم پر پہنچتے ہی اپنے گناہوں کا اقرار کرلیں گے اور خدا کے پاس واپس آجائیں گے'' (جلد ۵ صفحہ ۵۸۳) اور یہود کے بڑے بڑے مقدس نوشتہ تالمود کے انتخابات کا جو مجموعہ انگریزی میں ڈاکٹر کوہن کا مرتب کیا ہوا Everyman's Library Series میں شائع ہوا ہے۔اس میں یوں آیا ہے۔''قیامت کے دن ابراہیم دیرِ دوزخ پر تشریف رکھتے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں نہ گرنے دیں گے (صفحہ ۴۰۴)''۔''جہنم کی آگ اسرائیلی گناہ گاروں پر کوئی قدرت نہیں رکھتی صفحہ (۴۰۵)''۔حاصل یہ کہ بنی اسرائیل اپنی قوم کو خدا کی لاڈلی اور دلاری سمجھے ہوئے تھے اور اس پر حد سے زیادہ نازاں تھے۔یہود کی زبان سے اس سلسلہ میں ہم (صیغہ جمع متکلم) جہاں جہاں بھی آیا ہے اجتماعی معنی رکھتا ہے۔یعنی مراد قوم اسرائیل ہے۔یہی وہ تصورات ہیں جنہوں نے ان کو ایمان و عمل کی زندگی سے یکسر بے گانہ کر دیا تھا۔آدمی ایمان و عمل کی ذمہ داریوں کو لازمی سمجھتے ہوئے بھی کوتاہیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔لیکن اگر وہ سرے سے اسے لازم ہی نہ سمجھتا ہو تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی زندگی کس طرح ایمان کے نور سے محروم اور عمل کی توانائی سے دور ہوگی۔یہ بات صرف بنی اسرائیل تک محدود نہیں جب بھی کوئی قوم ایسی بے ہودہ آرزوؤں کے ذریعے ایمان و عمل کی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتی ہے تو پھر اس کی تباہی کے بارے میں دو رائے نہیں ہوتیں۔بنی اسرائیل اسی طرح تباہ ہوئے اور امتِ مسلمہ کا بھی ایک معتد بہ طبقہ ایسی ہی آرزوؤں کا شکار ہو کر شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو چکا ہے۔انہوں نے اللہ کی رحمت اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا خانہ ساز اور مصنوعی مفہوم دل و دماغ میں بٹھا لیا ہے اور اس کے سہارے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم چونکہ آنحضرت ﷺ کی امت ہیں اس لئے قیامت کے دن ہمیں جہنم میں جانے کا کوئی کھٹکا نہیں۔اللہ اس گمراہی سے امت کو محفوظ فرمائے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (البقرة: ۸۱تا۸۲)

(البتہ! جس نے کمائی کوئی بدی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ○ اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے بھلے کام کئے، تو وہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

Marfat.com

نجات اور عدم نجات کا قانون

یہود نے نجات کیلئے جس طرح صرف نسبی انتساب کو کافی سمجھ لیا تھا اور باقی اہلِ مذاہب بھی اسی طرح کی متنوع گمراہیوں میں بتلا تھے۔ان سب کی تردید کیلئے یہاں نجات اور عدمِ نجات کا اصل قانون بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے یہاں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ تم کس نسل یا کس گروہ سے تعلق رکھتے ہو تمہارا رنگ کس طرح کا ہے، تمہاری مالی حیثیت کیسی ہے، اس کے یہاں تو صرف ایک چیز قابلِ قبول ہے وہ ہے ایمان اور عمل۔ جن حقیقتوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان پر ایمان لانا اور جن احکام پر عمل کرنا ضروری ہے ان پر عمل کرنا یہ نجات کا ذریعہ ہے اور اسی پر نجات کا دارومدار ہے۔ البتہ جس شخص یا جس گروہ نے اللہ کی نافرمانی اور گمراہی کا راستہ اختیار کیا اور پھر اس معصیت اور نافرمانی نے پوری طرح اسے اپنے گھیرے میں لے لیا کہ ایمان کا نور باقی رہا اور نہ فرمانبرداری کی آمادگی۔ یہ شخص جہنم کا ایندھن بنے گا۔ الفاظ پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خَطِیْٓـَٔتُهٗ سے مراد ہر بدی اور نافرمانی نہیں بلکہ ایسی بدی اور ایسی معصیت جو بدی کرنے والے کو اپنے گھیراؤ میں لے لے اور پوری طرح اسے ایمانی اور شرعی زندگی سے تہی دامن کر دے۔ وہ حرام کمائی کا ارتکاب کرنے لگے تو حلال کی پابندیوں کو ماننے سے انکار کر دے، وہ تجدد کا شکار ہو تو ایمان کی پابندیوں کو رجعت پسندی خیال کرنے لگے۔ وہ اسلام کو اللہ اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ معاملہ قرار دے کر پوری زندگی کو اس سے خارج کر دے۔ اپنی معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب، تمدن، تعلیم اور قانون ہر چیز کو اسلام سے نہیں بلکہ اپنی پسند سے اختیار کرنا کافی سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ تنہائی میں اللہ کو یاد کر لینا میری نجات کیلئے کافی ہے باقی زندگی کے تمام معاملات میں، میں آزاد ہوں جس طرح چاہوں اس میں رویہ اختیار کروں۔ یہ وہ راستہ ہے جو انسان کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے اور ایمان و عمل کی پابندی وہ راستہ ہے جو انسان کو جنت کی طرف لے جاتا ہے۔ پہلے راستے پر زندگی بھر چلنے والا ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور دوسرے راستے پر استقامت سے چلنے والا انشاء اللہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔ یہ وہ اصل الاصول ہے جس پر انسان کی نجات اور عدمِ نجات کا دارومدار ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ

بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا

وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ ط ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ

وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ

وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ

Marfat.com

تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ
فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ
وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ
مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْىٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ
الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ
عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع

رکوع ۱۰۔ (اور وہ وقت یاد کرو! جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ گے، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں کو ان کا حق دو گے اور لوگوں سے بھلی بات کہو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے بہت تھوڑے لوگ اور تم ہو ہی منہ موڑنے والے (گردن کش)۔ اور وہ وقت یاد کرو! جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو ٥ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے بھی ہو، پہلے ان کے خلاف حق تلفی اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو پھر اگر وہ تمہارے پاس اسیر بن کر پہنچ جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو۔ حالانکہ ان کا وطن سے نکالنا ہی تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ سے انکار کرتے ہو؟ پس جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں اس کی سزا کیا ہے؟ بجز دنیوی زندگی میں رسوائی کے اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے اور جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے۔ تو نہ تو ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے) (۸۳ تا ۸۶)

Marfat.com

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

(اور وہ وقت یاد کرو! جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ گے، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں کو ان کا حق دو گے اور لوگوں سے بھلی بات کہو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے بہت تھوڑے لوگ اور تم ہو ہی منہ موڑنے والے (گردن کش) (البقرۃ:۸۳)

نظمِ کلام کیلئے یہ بات ذہن میں رہے کہ گذشتہ رکوع میں ہم یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ اہلِ کتاب کو جس بات نے ایمان و عمل کی اہمیت سے محروم کر دیا، وہ ان کا نسلی اور نسبی افتخار تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم چونکہ انبیائے کرام کی اولاد ہیں اس لحاظ سے ہم اللہ کے چہیتے ہیں۔ ایمان وعمل کی کوئی کمزوری ہماری گرفت کا سبب نہیں بن سکتی۔ جنت پروردگار نے ہمارے ہی لئے پیدا کی ہے۔ بفرضِ محال اگر ہمیں جہنم میں جانا بھی پڑا تو وہ محض ضابطے کی کارروائی کیلئے چند دنوں کی بات ہوگی بلکہ بعض لوگوں کے قول کے مطابق ہم صرف جہنم کے دروازے تک لے جائے جائیں گے پھر اپنے گناہوں کے اعتراف کر لینے پر ہمیں واپس جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ یہاں اسی سلسلے میں فرمایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل اور اہلِ کتاب کو یاد رہنا چاہئے کہ وہ نہ صرف دوسری قوموں کی طرح ایمان و عمل کے پابند ٹھہرائے گئے تھے بلکہ ان سے بطورِ خاص اللہ نے اپنے احکام کی پابندی کا متعدد مواقع پر عہد بھی لیا تھا اور اس عہد کی وسعت کا حال یہ ہے کہ اس میں حقوق اللہ، حقوق العباد اور مکارمِ اخلاق تک سب کچھ شامل تھا۔ حیرانی ہے کہ جو گروہ بار بار اللہ سے اس کے دین اور شریعت کی پابندی کا عہد کرتا رہا وہ اس حد تک دین سے اعراض کا مرتکب ہوا کہ سرے سے ایمان و عمل کی ضرورت کا انکار کر بیٹھا۔

عہد کے عناصر

چنانچہ پیشِ نظر رکوع میں دو عہدوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ جن میں سے پہلے عہد کا ذکر زیرِ بحث آیتِ کریمہ میں ہے اور اس عہد کا ذکر یاددہانی کے طور پر کیا جا رہا ہے تاکہ بنی اسرائیل اور اہلِ کتاب اپنی غلطی کا احساس کر سکیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اس عہد میں اسلوب اگرچہ اخبار کا اختیار کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ انشاء کے معنی میں ہے۔

۱۔ بندگی رب

سب سے پہلے اس بات کا عہد لیا گیا کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں کرو گے۔ یعنی تمہیں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ یہ جملہ بجائے خود اپنے اندر اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اگر اس کے سوا اس عہد میں کسی اور بات کا ذکر نہ کیا جاتا تو جب بھی یہ جملہ پوری زندگی کے احاطہ کیلئے کافی ہوتا اللہ نے انسان کو اپنی بندگی کیلئے پیدا کیا ہے اور وہ ہر صورت میں اس کا بندہ ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ انسان بار بار عرفانِ ذات سے محروم ہونے کی وجہ سے بندگی کو بھول جاتا ہے۔ اللہ کے پیغمبر اور اس کی کتابیں اسے ہمیشہ اس کی اصل حیثیت

Marfat.com

یاد دلانے کیلئے آتی ہیں۔ یہاں بھی یہی فرمایا جارہا ہے کہ تم اللہ کے بندے ہو اس لئے اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنا تمہارے لیے ہرگز مناسب نہیں۔ اور یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ بندہ ہر حال میں بندہ ہوتا ہے۔ وہ ایک ہے تو تب بھی بندہ ہے اور اسے بندگی ہی کا فرض انجام دینا ہے اور اگر اس کی تعداد لاکھوں کروڑوں تک پہنچ جاتی ہے تو تب بھی وہ بندوں ہی کا اجتماع ہے جن میں سے ہر ایک کو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بندگی کا فرض انجام دینا ہے اور پھر بندگی کسی ایک طریقے تک تو محدود نہیں اس بندگی کا تعلق جس طرح عبادات سے ہے اسی طرح معاشرت، معیشت، تہذیب، تعلیم، سیاست، حکومت اور ریاست سے بھی ہے۔ انسان کی کوئی حیثیت بھی ہو اسے بہر صورت میں اللہ کی بندگی کرنی ہے، اسے جس طرح اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنے کی اجازت نہیں اسی طرح اس کے احکام کے سوا کسی اور کے حکم ماننے، اس کے آئین کے سوا کسی اور کا آئین اختیار کرنے، اس کی عطا کردہ تہذیب کے سوا کسی اور کی تہذیب اوڑھنے کی بھی اجازت نہیں۔ اس لحاظ سے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی اس حکم کے تحت اللہ کے اختیار میں آجاتی ہے، جس میں کسی اور شخصیت یا نظام کی گنجائش نہیں رہتی۔

۲۔ والدین سے حسن سلوک

لیکن اللہ تعالیٰ نے مزید کرم فرمایا کہ انسانوں کو گمراہی سے بچانے کیلئے اس عہد کو کھول دیا اور وضاحت سے فرمایا کہ تمہیں جس طرح اللہ ہی کی بندگی کرنی ہے اسی طرح تمہیں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے بھی پیش آنا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہاں اللہ کی بندگی اور والدین کے بارے میں جو حکم دیا جارہا ہے اس کا ذکر تورات میں بھی جابجا کیا گیا ہے۔ ہم صرف دو ایک مقام بطور نمونہ ذکر کرتے ہیں۔

> میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے تو اپنے لئے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر (خروج ۲۰، ۲۱۔۵)
>
> میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہووے تو اپنے لئے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے مت بنا تو انہیں سجدہ نہ کر نہ ان کی بندگی کر (استثناء ۵: ۷، ۸)
>
> اسی طرح والدین کے بارے میں تورات میں فرمایا گیا ہے:
>
> تو اپنے ماں باپ کو عزت دے (خروج: ۲۰: ۱۲)
>
> اپنے باپ اور اپنی ماں کو عزت دے جیسا کہ خداوند تیرے خدا نے فرمایا ہے۔ (استثناء ۵: ۱۶)

اسلام نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی بار بار تاکید کی ہے اور قرآن کریم نے اپنے اندازِ بیان سے اسے اس طرح مؤکد کیا ہے کہ جہاں بھی اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے اس کے فوراً بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں ایک تو یہ بات کہ اسلامی تعلیمات میں اللہ کے حقوق میں جس طرح سب سے مقدم اللہ کی عبادت اور بندگی ہے اسی طرح حقوق العباد میں سب سے مقدم والدین کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔ دوسری یہ بات کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی قرآن نے کتنی ہی تاکید کی ہو لیکن یہ بات واضح ہے کہ بندگی اور عبادت اللہ کے سوا کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ اگر اللہ کے سوا کسی اور کیلئے اس کی اجازت ہوتی تو والدین کیلئے ہوتی لیکن والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے والدین کی عبادت کی اجازت نہیں دی۔ حسنِ سلوک کے بارے میں بھی یہ یاد رہنا چاہیے کہ

Marfat.com

اس سے مراد صرف والدین کی عزت و احترام اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آنا ہی نہیں بلکہ ان کا حق ادا کرنا ہے۔ اگر کوئی اولاد اپنے والدین کی آؤ بھگت تو خوب کرتی ہے ان کا نام نہایت احترام سے لیتی ہے۔ لیکن ان کی ضروریات اور ان کی دیکھ بھال کی فکر نہیں کرتی تو اسے حسنِ سلوک نہیں کہا جا سکتا۔ حسنِ سلوک یا احسان تو حقوق کی ادائیگی سے بڑھ کر خدمت اور مروت کا نام ہے۔ جس کو آنحضرت ﷺ نے اپنے معجزانہ اسلوبِ کلام سے اس طرح سمیٹ دیا ہے کہ اس کے بعد کسی قسم کی غلط فہمی کا جواز نہیں رہ جاتا۔ باپ کے بارے میں فرمایا:

رِضَا الرَّبِّ فِی رِضَا الوَالِد وسَخَطُ الرَّبِّ فِی سَخَطِ الوَالِد

اللہ کی رضا مندی باپ کی رضا مندی میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے

یعنی باپ اگر خوش ہے اللہ بھی خوش ہے اور اگر باپ ناخوش ہے تو اللہ بھی ناخوش ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ محض خالی باتوں سے کسی بھی انسان کی خوشی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ ماں باپ کی اگر ضروریات پوری نہیں ہوتیں اور اولاد خوشحالی سے وقت گزارتی ہے ماں باپ بیمار ہیں اور اولاد ان کے علاج کی طرف توجہ نہیں دیتی۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ماں باپ محض ظاہری احترام اور آؤ بھگت سے تو خوش نہیں ہو سکتے۔ ان کی خوشی تو بہرصورت ان کی خدمت کرنے سے ہی ممکن ہو سکے گی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہاں صرف باپ کی خوشی کا ذکر ہے ماں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کو باپ سے بڑھ کر اولاد کی خدمت کا حق دار بنایا ہے۔ جب ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا: مجھ پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: تیری ماں کا۔ اس نے پوچھا اس کے بعد کس کا ہے؟ آپ نے پھر فرمایا تیری ماں کا۔ اس نے پوچھا پھر کس کا ہے؟ آپ نے فرمایا: تیرے باپ کا۔

اندازہ کیجئے! کہ جب ماں کا حق اللہ نے باپ سے زیادہ رکھا ہے تو اگر اللہ کی رضا مندی کا دارومدار باپ کی رضا مندی پر ہے تو پھر ماں کی رضا مندی کی اہمیت کا اندازہ خود کیا جا سکتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی بیمار ہوئے، آخری وقت آ پہنچا، جاں کنی شروع ہو گئی لیکن جان نکلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی گئی۔ آپ نے پوچھا ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے بتایا گیا کہ والدہ زندہ ہیں۔ آپ نے والدہ کو بلا کر پوچھا کہ آپ کا اپنے بیٹے کے بارے میں کیا خیال ہے انہوں نے ان کی نیکی کی بہت تعریف کی۔ آپ نے فرمایا میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان کا آپ کے ساتھ کیسا سلوک ہے؟ والدہ نے کہا: حضور یہ مت پوچھئے میرا دل جلا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا اماں اسے معاف کر دو۔ ورنہ اس کی جان نہیں نکلے گی۔ اماں نے کہا: کہ حضور اگر آپ حکم دیتے ہیں تو سرتابی کی مجال نہیں۔ لیکن اگر آپ مشورہ دیتے ہیں تو پھر مجھے معذور سمجھئے۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا: لکڑیاں اکٹھی کرو اور آگ جلاؤ۔ ماں نے پوچھا: اس آگ کو آپ کیا کریں گے۔ آپ نے فرمایا: تیرے بیٹے کو اس میں جلاؤں گا۔ جہنم کی آگ تو اس سے بہت شدید ہو گی۔ ماں نے جب دیکھا کہ میری وجہ سے بیٹا آگ میں جلے گا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو معاف کر دیا اور بیٹے کی جان نکل گئی۔ اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے خاندانی نظام میں ماں باپ کی کیا اہمیت ہے اور اس اہمیت کو کس طرح باقی رہنا چاہئے۔ ہمارے معاشرے میں دوسری تہذیبوں کے در آنے کے باعث جو شکست و ریخت ہو رہی ہے اس کے نتیجے میں سب سے پہلی خرابی یہ آئی ہے کہ بیٹے اپنے بیویوں اور اپنے بچوں کی ضروریات کو ماں باپ کی ضروریات پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ جب بھی اخراجات میں کمی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو سب سے پہلے ماں باپ کی ضروریات کو سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے جو بعض دفعہ ظلم کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص اپنے پاس اس بات کی گنجائش رکھتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی خدمت کر سکے تو پھر اسے اپنے ماں باپ کی خدمت سے ہاتھ کھینچنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اس کے ماں باپ کی ضرورتیں اس کی ذاتی ضرورتوں سے

Marfat.com

بھی بڑھ کر ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص اپنے جوان بیٹے کو ساتھ لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ حضور یہ میرا بیٹا ہے۔ بچپن میں اس کی ماں مرگئی تھی۔ میں نے اسے ماں بن کر پالا اس کو بانہوں میں اٹھایا لوریاں دیں، کندھوں پر کھلایا، انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا، بچپن اور لڑکپن میں ہر ضرورت کو پورا کیا میں تکلیف اٹھا کر بھی اس کیلئے ٹھنڈا سایہ بنا رہا۔ اب جبکہ یہ جوان ہو گیا ہے اور کمانے لگا ہے اور میں بوڑھا ہونے کے باعث کمانے سے معذور ہو گیا ہوں تو یہ اپنے پیسے کو مجھ پر خرچ کرنے سے دریغ کرتا ہے اور میری ضروریات کو پورا کرنے سے جی چراتا ہے۔ آپ نے خاموشی سے اس کی شکایت سنی اٹھے اور بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر باپ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بیٹے سے فرمایا:

اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ ’’تو بھی اور تیرا مال بھی تیرے باپ کا ہے‘‘۔

غور کیجئے! ماں باپ کو کس حد تک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں یہ تصور کس حد تک زوال پذیر ہے۔

ایک اور خطرناک طرزِ عمل پیدا ہو گیا ہے جو عموماً خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں نظر آتا ہے کہ ماں باپ کیلئے کھانے پینے اور رہائش کا معقول انتظام کیا جاتا ہے اور بعض گھروں میں نوکر خدمت کیلئے بھی موجود ہوتے ہیں لیکن بیٹے کیلئے ان کے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دفتر سے سرِ شام آتا ہے یا رات گئے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ بہت مروت سے کام لیا تو والدین کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو کر پوچھ لیتا ہے کہ ابا آپ کیسے ہیں؟ امی آپ کا کیا حال ہے؟ نوکر آپ کا خیال کرتے ہیں یا نہیں؟ اس کے بعد اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ ان چند منٹ کے سوا وہ اپنے والدین کے پاس بیٹھنے کی کبھی زحمت نہیں کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ ماں باپ کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں دیکھ بھال کی جا رہی ہے تو پھر کیا ضروری ہے کہ میں ان کے پاس بیٹھوں حالانکہ انسان صرف کھا پی کر زندہ نہیں رہتا بلکہ انسانوں کو انسانوں کا میل جول زندہ رکھتا ہے۔ قیدِ تنہائی میں بھی ساری سہولتیں ہوتی ہیں، صرف انسان کی شکل دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ اس سے بڑا عذاب کوئی نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے ماں باپ کے بارے میں فرمایا کہ اولاد کیلئے ماں باپ کو محبت سے دیکھنا اتنی بڑی فضیلت رکھتا ہے کہ اس کا اجر وثواب عمرہ جیسی عبادت کے اجر وثواب سے بڑھ کر ہے۔ چہرے کو دیکھنا اس لئے عبادت قرار دیا تا کہ اولاد محبت سے اپنے ماں باپ کے پاس بیٹھنے کیلئے وقت نکالے۔ بلکہ سورۃ بنی اسرائیل میں ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیتے ہوئے یہ وضاحت فرمائی گئی ہے کہ تم اپنے ماں باپ کو بڑھاپے میں بالکل اسی طرح محبت اور شفقت سے سنبھالو اور خدمت کرو جس طرح انہوں نے تمہیں تمہارے بچپن میں محبت اور شفقت سے پالا تھا۔ کیونکہ ماں باپ بڑھاپے میں بعض دفعہ اس حال کو پہنچ جاتے ہیں کہ وہ بالکل بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ اب اولاد کی ذمہ داری ہے کہ جس طرح ماں باپ بچوں کی بچگانہ حرکتوں پر ناراض ہونے کی بجائے خوش ہوتے اور شفقت کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح اولاد کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی کسی بات اور کسی حرکت پر اف تک نہ کہیں اور کبھی انہیں ڈانٹنے کی کوشش نہ کریں۔ جب بھی ان سے بات کریں تو نہایت شفقت اور نہایت عزت سے بات کریں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ شائد ہی کوئی خوش نصیب ہوگا جوان باتوں کو سمجھتا اور پھر نزاکتوں کو ملحوظ رکھتا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ ایک صاحب بوڑھے ہو گئے اور بیٹا جوان ہو کر کسی بڑے عہدے پر فائز ہو گیا۔ ایک دن اتفاق سے وہ گھر میں جلدی آ گیا والد کوٹھی کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی پاس آ کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد باپ نے دیکھا کہ دیوار پر ایک کوا آ کر بیٹھ گیا ہے۔ اس نے بیٹے سے کوے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: بیٹا یہ کیا ہے؟ اس نے کہا ابا جان یہ کوا ہے۔ اس نے پھر یہی سوال کیا۔ بیٹے نے نہایت نرمی سے جواب دیا: جب پانچ چھ دفعہ باپ نے یہی سوال دہرایا تو بیٹا غصے میں جھنجھلا کر کہنے لگا ابا جان! آپ بار بار ایک ہی سوال کیوں کیے جا رہے ہیں؟ میں کتنی دفعہ بتا چکا ہوں کہ یہ کوا ہے۔ آپ پھر اسی سوال کی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔ باپ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے بیڈروم

Marfat.com

میں گیا اور اپنی ایک پرانی ڈائری اٹھا لایا اس نے ایک صفحے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹے کو اسے پڑھنے کیلئے کہا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ آج میرا بیٹا تین سال کا ہو گیا ہے اب وہ توتلی زبان میں باتیں کرنے لگا ہے۔ آج میں لان میں بیٹھا تھا اور دیوار پر ایک کوا آکر بیٹھ گیا بیٹے نے مجھ سے پوچھا اباجان یہ کیا ہے؟ میں نے بتایا بیٹا یہ کوا ہے۔ اس نے پھر مجھ سے پوچھا میں نے پھر اس کو یہی جواب دیا۔ حتیٰ کہ اس نے یہ سوال ستر دفعہ دہرایا اور میں ہر دفعہ پہلے سے زیادہ خوشی کے ساتھ اس سوال کا جواب دیتا رہا۔ یہ صفحہ پڑھا کر باپ نے بیٹے سے کہا کہ بیٹا تم نے ستر دفعہ مجھ سے پوچھا اور مجھے غصہ نہ آیا اور میں نے پانچ چھ دفعہ ہی پوچھا تو تمہیں غصہ آگیا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے حکم دیا کہ ایسی حالت کو بعض دفعہ والدین پہنچ جاتے ہیں۔ دیکھنا ان کو جھڑکنے کی جسارت نہ کرنا۔ مغرب نے تو ماں باپ کے رشتے کو تباہ کر ڈالا۔ انہیں از کاررفتہ سمجھ کر نرسنگ ہومز میں پھینک دیا اور خود سال میں کرسمس ڈے پر کبھی ایک دفعہ مل آئے یا کارڈ بھیج دینا کافی سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا خاندانی نظام بکھر کر رہ گیا ہے۔ آج ان کا سوچنے سمجھنے والا طبقہ اس صورتحال سے پریشان ہے۔ لیکن وہ نہایت عیاری سے مشرق بالخصوص مسلمانوں کو اسی صورتحال سے دوچار کرنا چاہتا ہے۔ اور ہمارا پڑھا لکھا طبقہ چونکہ انہی کو اپنے لئے اسوہ سمجھتا ہے اور ہر معاملے میں ان کی پیروی کرتا ہے تو یہاں بھی بعض بڑے شہروں میں نرسنگ ہومز بننے لگے ہیں۔ اس لئے میں یہاں زور دے کر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام نے والدین کے تعلق کو خاندان کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اور خاندان مسلمانوں کے سیاسی نظام کی بنیاد ہے۔ اگر ہم اپنے معاشرے اور سماج کو دکھوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتے اور مغرب کی طرح اسے تباہی اور بربادی سے دوچار نہیں کرنا چاہتے تو پھر ہمیں اپنے خاندانی نظام کو بچانے کیلئے ماں باپ کے رشتے کو مستحکم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور جس جس طریقے سے اس رشتے کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ چاہے وہ تعلیم کے ذریعے ہوں یا ہمارے میڈیا کے باعث۔ ہمیں اس کو روکنے کی سنجیدہ کوشش کرنی چاہئے۔ اکبر مرحوم نے تعلیم کے حوالے سے بہت پہلے کہا تھا۔ آج وہ زندہ ہوتے تو شاید وہ میڈیا کے حوالے سے چیختے ہوئے سنائی دیتے۔ انہوں نے کہا تھا۔

ہم ایسی سب کتابیں لائقِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنہیں پڑھ پڑھ کے بچے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

۳۔ ذوی القربیٰ یتامیٰ اور مساکین سے حسن سلوک

پھر ذَوِي الْقُرْبٰى، يَتٰمٰى اور مَسٰكِين کو والدین پر عطف کرتے ہوئے ان کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حسنِ سلوک اور احسان دراصل حقوق کی ادائیگی کی سب سے اہم صورت کا نام ہے۔ یعنی جس میں حقوق کی ادائیگی بے دلی سے یا بوجھ سمجھ کر نہیں کی جاتی بلکہ اس میں احترام شفقت اور محبت کے جذبات بھی شامل ہوتے ہیں۔ قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے بارے میں چونکہ اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ محض زبانی اخلاق کو ہی کافی سمجھ لیا جائے۔ اس لئے سورۃ بنی اسرائیل میں قرآنِ کریم نے وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ "اور قرابت مند اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو" فرما کر ان کے حق کی وضاحت فرمادی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی کیلئے ایک دوسرے کے حقوق اور پھر اولاد کے حقوق کا تصور تو ایک جانی پہچانی سی بات ہے۔ ہر معاشرہ اس کا ادراک رکھتا ہے۔ لیکن خرابی جب بھی پیدا ہوتی ہے وہ ماں باپ کے حوالے سے اور اس کے بعد قرابت داروں اور مسکینوں کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ماں باپ کو بنیاد قرار دے کر پھر انہیں کے حوالے سے قرابت داری کے رشتوں کا لحاظ اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلام نے اگرچہ ان تصورات کو اس کی معراج تک پہنچایا ہے لیکن یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ ان باتوں کا حکم بنی اسرائیل کو

Marfat.com

بھی دیا گیا تھا۔ کیونکہ کوئی بھی معاشرہ اخلاقی بنیادوں پر اس وقت تک استوار نہیں ہوسکتا جب تک ماں باپ کے حقوق کو استحکام نہیں ملتا اور انہیں سے پھوٹنے والے ددھیالی اور ننھیالی رشتوں کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ ایک گھر سے دو رشتے جنم لیتے ہیں۔ جس سے تعلقات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور ذمہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ باپ کے خونی رشتوں کے ساتھ ساتھ ماں کے رحمی رشتے بھی شریک ہیں۔ یہ دو رشتے جس طرح ایک گھر کی مضبوطی کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح ہر گھر ان رشتوں کی بقا کے سروسامان میں شریک ہوتا ہے۔ اللہ کے قانون کی وسعت دیکھئے کہ اس نے اس قانون میں صرف اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے والے افراد کو ہی شامل نہیں کیا بلکہ ان کے فوراً بعد ذمہ داریوں میں ان کو بھی شامل کیا ہے جو اپنی بقا میں معاشرے کے محتاج بن جاتے ہیں۔ پھر ان کے بارے میں محض نصیحت نہیں فرمائی جارہی بلکہ ان کو حقوق میں شامل کیا جارہا ہے۔ یتیم وہ بچہ ہے جس کا باپ سر سے اٹھ گیا ہے اور مسکین وہ شخص ہے جو اپنا مالی استحکام کھو بیٹھا ہے۔ یہ قرابت داروں میں سے بھی ہوسکتے ہیں اور باہر سے بھی۔ اگر یہ قرابت داروں میں سے ہیں تو پھر ان کا حق دہرا ہے۔ قرابت داری کا الگ اور ضرورت اور احتیاج کا الگ اور اگر یہ قرابت داروں سے باہر کے لوگ ہیں تو جس کے ہمسائے میں ہیں، وہ ہمسائیگی کے حق کے ساتھ ساتھ ان کی احتیاج کا حق ادا کرنے کا بھی ذمہ دار ہے اور مجموعی طور پر معاشرہ ہر ایسے محتاج کی کفالت کا ذمہ دار ہے جو اپنی کفالت کا خود متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا یہ معمول تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے دائیں بائیں کی فکر میں رہتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ کہیں ہمارے قرب وجوار میں رات کو کوئی بھوکا تو نہیں سویا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کسی کا بھوکا سونا مسلمان معاشرے کے لئے عذاب کا باعث ہوسکتا ہے اور پھر اس ترتیب کو بھی ملاحظہ کیجیے جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یتیم کی مسلمان معاشرے میں کیا اہمیت ہے۔ اگر مسلمانوں نے اسی اہمیت کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہوتیں تو بنی اسرائیل کی طرح ہمارا معاشرہ نہ احتیاج کا شکار ہوتا اور نہ ٹوٹ پھوٹ میں مبتلا ہوتا۔

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا مفہوم اور اس کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں جس طرح انسانی اصلاح اور انسانی زندگی کو دکھوں سے بچانے کیلئے حقوق وفرائض کے حوالے سے ہدایات دی ہیں، ان کی اہمیت کا حقیقی اندازہ تو اس وقت ہوتا ہے جب کوئی معاشرہ انہی بنیادوں پر قائم ہوتا اور انہی احتیاطوں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ لیکن ان حقوق کے سلسلے میں جس حسنِ اعجاز کا اظہار فرمایا گیا ہے، وہ بجائے خود حیران کن ہے۔ معاشرے کے ضرورت مند طبقوں کے ساتھ حسنِ اخلاق کا حکم دینے سے معاشرے کی معاشرتی اور معاشی ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں۔ لیکن آدمی جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ مزید تین احکام دیے گئے ہیں۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ۔ ''اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور سلیقے سے بات کرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو''۔ تو شروع میں ان احکام کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حسنِ سلوک کا حکم دینے کے بعد آخر ان احکام کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن جب غور وفکر کا قدم آگے بڑھتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ واقعی یہ احکام وہی ذاتِ بابرکات دے سکتی ہے جس نے انسانی فطرت کو پیدا کیا ہے۔ ہم چونکہ انسانی فطرت کے مالہ وماعلیہ سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اس لئے ہمیں فطری احساسات کا کماحقہ اندازہ نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ ایک امیر آدمی بعض دفعہ یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرنا پسند کرتا ہے۔ لیکن ان سے خوش دلی سے پیش آنا اور تبسم اور مسکراہٹ سے ان سے ملنا اور ان کی عزتِ نفس کو ملحوظ رکھنا اور ان سے نصیحت ومحبت کی بات کرنا اسے کبھی گوارا نہیں ہوتا۔ مال خرچ کردینا آسان ہے، لیکن حاجت مندوں سے فاصلہ رکھے بغیر ملنا مشکل ہے۔ آدمی جب کسی کی مدد کرتا ہے تو اسے بڑائی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب

Marfat.com

وہ کسی چھوٹے آدمی کو برابری کی سطح پر ملتا ہے تو اس کے بڑائی کے احساس پر چوٹ پڑتی ہے۔ جو اسے اچھا نہیں لگتا۔ لیکن اگر کسی معاشرے کی شیرازہ بندی کرنی ہے اور اسے عزتِ نفس دے کر باوقار بنانا ہے تو پھر ان فاصلوں کو ختم کیے بغیر چارہ نہیں۔ جب یہ فاصلے مٹ جاتے ہیں تو معاشرہ غیر شعوری طور پر مضبوط اور توانا ہو جاتا ہے۔ طبقات مٹ جاتے ہیں اور اخوت اور محبت کا چلن عام ہو جاتا ہے۔ انہی فطری احساسات کو توانا کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ لوگوں کی صرف مدد ہی نہ کرو بلکہ جب بھی ان کے ساتھ آمنا سامنا ہو تو ہمیشہ خندہ پیشانی، خندہ روئی، شیریں لبی کے ساتھ پیش آؤ۔ ان کی مجلسوں میں جانے اور ان کی دعوتیں قبول کرنے کی عادت بناؤ۔ آپس میں ایک دوسرے کو سلام کہنے میں پہل کرنے کی کوشش کرو، یہ سب کچھ تو عام حالات کیلئے نصیحتیں ہیں۔ لیکن اگر معاملہ ہو یتیموں کے معاملات کا، انفاق فی سبیل اللہ کا، وراثت کی تقسیم کے وقت یتیموں اور مسکینوں کے آجانے کا یا ایسے ہی کسی اور موقعہ کا تو ایسے مواقع پر حسن کلام اور خندہ روئی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ آنے والا بے وقت آئے یا اس کے رویے سے شکایت کا موقع پیدا ہو جائے یا وہ مدد لینے کیلئے آیا ہے لیکن مدد دینے والے کے دل میں اس کیلئے رنجش ہے۔ ایسے تمام مواقع کیلئے بطورِ خاص قرآن کریم نے بھلی بات کہنے کا حکم دیا ہے۔ ان دونوں طرح کے احوال کو سامنے رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں اس حکم دینے کی کیا اہمیت ہے۔

نماز اور زکوٰۃ کی اصل حیثیت

اس کے بعد **اقیموا الصلوٰۃ** کا حکم دے کر **لاتعبدون الااللہ** کی عملی شکل متعین فرمائی ہے اور **اتوالزکوۃ** سے ذہنوں میں یہ بات پیوست کردی گئی ہے کہ حاجت مندوں کی مدد کرنا وہ یتیم اور مسکین ہوں یا کسی اور صورت میں، یہ صرف تمہارے جذبۂ سخاوت کا اظہار ہی نہیں بلکہ اس کی ایک قانونی حیثیت بھی ہے۔ اس طرح سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ایک سطح پر رکھ کر دینی احکام کو ایک اکائی کی شکل دے دی گئی ہے اور یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ کا فرماں بردار بندہ بننے کیلئے جس طرح حقوق اللہ کی ادائیگی ضروری ہے، اسی طرح حقوق العباد کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ حاصل کلام یہ کہ بنی اسرائیل سے ان باتوں کا عہد لیا گیا تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے معاصر بنی اسرائیل کو بتایا جارہا ہے کہ ''تم پھر اس سے برگشتہ ہوگئے یعنی تمہارے اسلاف نے ان احکام سے روگردانی کی اور پھر یہ روگردانی کوئی حادثاتی یا وقتی نہیں تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم ہو ہی گردن کش لوگ''۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ کا مفہوم

ان کی برگشتگی کیلئے پہلے تو تَوَلَّيْتُمْ فعل استعمال کیا جو کسی کام کے ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس کے بعد ''معرضون'' اسمِ فاعل لایا گیا ہے، جو ان کی مستقل خصلت اور عادتِ مستمرہ پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی ایسا نہیں کہ تمہاری یہ روگردانی اور حقوق کی ادائیگی سے پہلو تہی کوئی وقتی یا ایک نسل کی بات ہو بلکہ یہ تو تمہاری مستقل خصلت اور پہچان رہی ہے اور تم آج تک اسی سے پہچانے جاتے ہو۔ تورات میں بھی بالکل انہی الفاظ میں بنی اسرائیل کے رویے کا ذکر کیا گیا ہے، چند حوالے ملاحظہ فرمائیے۔

''وہ اس راہ سے جو میں نے انہیں فرمائی جلد پھر گئے۔'' (استثنا ۱۹:۱۰)

''میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے۔'' (خروج ۳۲:۹)

Marfat.com

''اس لئے کہ تم گردن کش لوگ ہو۔'' (خروج ۳۳:۳)

''بنی اسرائیل کو کہہ دو کہ تم گردن کش لوگ ہو۔'' (خروج:۳۳:۵)

بنی اسرائیل کے بارے میں اس طرح کے ریمارکس جابجا ملتے ہیں۔اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ گردن کشی اور نافرمانی بنی اسرائیل کی علامت اور شناخت بن گئی تھی۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (البقرة:۸۴تا۸۵)

(اور وہ وقت یاد کرو! جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو ○ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے بھی ہو، پہلے ان کے خلاف حق تلفی اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو پھر اگر وہ تمہارے پاس اسیر بن کر پہنچ جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو۔ حالانکہ ان کا وطن سے نکالنا ہی تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ سے انکار کرتے ہو؟ پس جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں اس کی سزا کیا ہے؟ بجز دنیوی زندگی میں رسوائی کے اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے اور جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں)

ایک اور عہد کا حوالہ

ان آیات کریمہ میں ایک اور عہد کا ذکر کیا جا رہا ہے، جو بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا اور پھر جس طرح بنی اسرائیل نے اس عہد کی مٹی پلید کی اور اسے ایک مذاق بنا کر رکھ دیا، اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔عہد کو یاد دلاتے ہوئے بنی اسرائیل سے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے دین نے تمہارے اندر ایک دینی اخوت پیدا کر دی ہے۔تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے ہو، دیکھنا اس اخوت کو آپس میں لڑ کر اور خون بہا کر نقصان نہ پہنچانا کیونکہ اگر تم آپس میں لڑو گے تو تمہارا شیرازہ بکھر جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور دشمن تم پر دلیر ہو جائے گا۔اسی طرح آپس میں ایک دوسرے کو وطن سے نکالنے کی کوشش نہ کرنا، یعنی تمہارے لئے آپس کی لڑائی بھی حرام ہے اور ایک دوسرے کو گھروں سے نکال کر بے وطن کرنا بھی حرام ہے۔قرآن کریم کہتا ہے: جب تم سے اس بات کا عہد لیا گیا تھا تو تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا اور اس کے گواہ بھی بنے تھے۔یعنی

Marfat.com

تم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم ہمیشہ اس کی پابندی کریں گے اور چونکہ تورات میں اس عہد کا آج تک ذکر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کے گواہ بھی ہو اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اس عہد کا اقرار کیا تھا اور تم اس اقرار کے وقت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موجود بھی تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو خیمۂ عبادت کے سامنے بلا کر انہیں اللہ کا حکم سناتے اور ان سے عہد لیتے تھے۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ تم نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موجود رہ کر اس عہد کا اقرار کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہایت تاکید کے ساتھ تم سے یہ عہد لیا گیا تھا۔ مزید یہ کہ اسی پر تمہاری قومی شیرازہ بندی اور وحدت واخوت کا دارومدار ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے اس عہد کو توڑا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں بنی اسرائیل نے ایک دوسرے کا خون بہایا، ایک دوسرے کی بستیاں اجاڑیں، گھر مسمار کیئے اور ایک دوسرے کو وطن سے نکالا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ بنی اسرائیل کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ زمانہ ہے۔ اس دور میں بنی اسرائیل قومی اور دینی لحاظ سے عروج پر تھے۔ وہ دنیا کی سب سے مضبوط ریاست اور طاقتور فوج کے مالک تھے۔ کوئی قابلِ ذکر قوت ان کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ تھی۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا نالائق ثابت ہوا ان کے غلام نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ رفتہ رفتہ یہ ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ایک کا نام یہودیہ قرار پایا اور دوسری کا نام اسرائیل۔ اس کے بعد صدیوں تک یہ لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں لگے رہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے افراد کو قتل کیا۔ ایک دوسرے سے بستیاں اور شہر چھینے پھر اسی پر بس نہیں ایک دوسرے کے خلاف ہر طرح کے ظلم اور سرکشی حق شکنی اور حق تلفی کو وتیرہ بنایا۔ اور ایک دوسرے کے خلاف دشمنوں سے بھی مدد لینے سے دریغ نہ کیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک کہ وقت کی جابر قوتوں نے انہیں ادھیڑ کر ڈھیر کر نہیں رکھ دیا۔ ان کی اس خانہ جنگی کے باعث کبھی صور وصیدا کے حکمران ان پر لشکر کشی کرتے رہے اور کبھی بابل والوں کے ہاتھوں سے قدرت نے ان کو پٹوایا اور کبھی رومیوں نے ان کو پامال کیا۔ لیکن انہیں جب بھی موقعہ ملا اپنی اصلاح کرنے کی بجائے انہوں نے یہی رویہ اختیار کیا۔

عہد کے حوالے سے بنی اسرائیل کا مضحکہ خیز رویہ

عجیب بات یہ ہے کہ یہ آپس میں خون ریزی کرنے اور ایک دوسرے کو وطن سے نکالنے سے تو باز نہیں آئے جس کا ان سے عہد لیا گیا تھا۔ البتہ انہوں نے یہ مضحکہ خیز رویہ ضرور اختیار کیا کہ مخالف طاقتوں کے ساتھ مل کر جب بھی انہوں نے ایک دوسرے پر حملہ کیا اور اس قتل ونہب کے نتیجے میں جب بنی اسرائیل ایک دوسرے کے ہاتھوں قیدی بنے تو یہ انہیں فدیہ دے کر چھڑانے کیلئے پہنچ گئے اور دلیل یہ دی کہ تورات میں اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اگر تمہارے بھائی بندوں میں سے کوئی قیدی بن جائے تو انہیں فدیہ دے کر آزاد کرانا بہت بڑی نیکی ہے تو ہم اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے دینی اور قومی بھائیوں کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت بھی آنحضرت ﷺ کے معاصر یہود کا یہی رویہ تھا۔ مدینہ منورہ میں ان کے تین قبائل آباد تھے، بنوقینقاع، بنونضیر اور بنو قریظہ اور قحطانی عربوں کے دو قبیلے آباد تھے، اوس اور خزرج۔ یہود کے تینوں قبیلے ان دونوں عرب قبیلوں کے ساتھ حلیفانہ تعلقات رکھتے تھے۔ بنونضیر اور بنوقینقاع خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ اوس کے حلیف تھے۔ اوس وخزرج کی لڑائیوں میں یہ تینوں قبیلے اپنے اپنے حلیف کی مدد کرتے تھے۔ جنگِ بعاث جو سب سے طویل اور ہولناک لڑائی تھی اور کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس سال تک جاری رہی۔ اس میں بھی یہود نے اپنے اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر جنگ میں شرکت کی اور خوب ایک دوسرے کا خون بہایا۔ لیکن جب بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ قیدی بن کر آئے تو پھر یہ فدیہ کی رقم لے کر اپنے حلیف

Marfat.com

کے پاس یہ کہہ کر ان کو چھڑانے کیلئے پہنچ گئے کہ فدیہ دے کر اپنے ہم مذہب بھائیوں کو آزادی دلانا یہ اللہ کا حکم ہے۔اس لئے ہم اس حکم کے تحت اپنے بھائیوں کو چھڑانا چاہتے ہیں۔قرآنِ کریم ان سے کہتا ہے کہ تم سے تو اس بات کا عہد لیا گیا تھا کہ تم ایک دوسرے سے لڑ کر نہ ایک دوسرے کا خون بہاؤ گے اور نہ کسی کو گھروں سے نکالو گے۔لیکن تم نے دشمنوں کے ساتھ مل کر ایک دوسرے کا خون بہایا اور پھر ان کو گھروں سے نکال کر قیدی بنایا لیکن تمہیں اللہ کی اس کھلی خلاف ورزی پر نہ کبھی اللہ کا خوف آیا اور نہ احکامِ خداوندی کی تعمیل کا خیال آیا۔لیکن جب وہ قیدی بن کر خود ان لوگوں کے پاس آئے جن کی تم نے اپنے بھائیوں کے خلاف مدد کی تھی، تو تم دینی اور قومی جذبے کے حوالے سے ان کیلئے فدیہ لے کر آ گئے۔ ہوتا کہ انہیں قید سے آزاد کرا سکیں۔آخر یہ کیا مذاق ہے کہ جو تم سے عہد لیا گیا تھا اس کو تو تم نے بری طرح پامال کیا، لیکن جب اسی پامالی کے نتیجے میں اسیری تک نوبت پہنچی تو تمہیں فدیہ دے کر چھڑانے کیلئے اللہ کا حکم یاد آ گیا تا کہ تم قومی ہمدردی اور بہی خواہی کی دھونس بھی جما سکو اور تمہارا اللہ کے احکام کی اطاعت کا بھرم بھی قائم رہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اللہ کی کتاب کو بھی خواہشاتِ نفس کے تابع کر رکھا ہے اس کے جس حصے کو چاہتے ہو مان لیتے ہو اور جس سے چاہتے ہو انکار کر دیتے ہو۔لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس طرح سے تم دوہرے جرم کا ارتکاب کر رہے ہو۔ایک تو یہ کہ تم اللہ کے احکام کو توڑتے اور اس کی نافرمانی کرتے ہو اور دوسرا یہ کہ اپنے من پسند حکم پر عمل کر کے اس کا تمسخر اڑاتے ہو کہ عمل تو تم خواہشِ نفس پر کرتے ہو لیکن نام تورات کا لیتے ہو۔تمہیں معلوم ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کا انجام یہ ہے کہ تمہیں دنیا میں ذلت و نکبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔تم دنیا کی ذلیل ترین قوم بن جاؤ گے اور آخرت میں تمہیں شدید ترین عذاب دیا جائے گا۔

امتِ مسلمہ کیلئے لمحۂ فکریہ

جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں تو بنی اسرائیل عذاب کے پہلے حصے کا شکار ہو چکے تھے۔یعنی ان کی دنیا میں کہیں حکومت باقی نہیں رہی تھی اور دنیا کے کسی خطے میں انہیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔وہ تمام قوموں کی نگاہوں میں عبرت کا سامان بن کر رہ گئے تھے۔رہا آخرت میں شدید ترین عذاب کا ذکر، ظاہر ہے وہ اس سے بھی بچ نہیں پائیں گے۔لیکن ان کی قومی زندگی کا یہ ایک ورق امتِ مسلمہ کیلئے اپنے اندر ہزار اسباق رکھتا ہے اور اسی لئے قرآنِ کریم نے اسے قیامت تک کیلئے امتِ مسلمہ میں باقی رکھا تا کہ یہ امت اس سے سبق سیکھے اور اس انجام سے دوچار نہ ہو جس سے بنی اسرائیل دوچار ہوئے۔لیکن نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہود کا یہ رویہ کہ کتابِ خداوندی کے جس حکم کو چاہا مان لیا اور جس کا چاہا انکار کر دیا اور اس طرح اللہ کی کتاب کو اپنی خواہشاتِ نفس کے تابع رکھا۔امتِ مسلمہ نے بھی پوری طرح اختیار کر لیا ہے۔ان کے پاس تو محرف کتابیں تھیں اور ان کے نبیوں کی سنت بالکل مٹ چکی تھی۔لیکن ہمارے پاس تو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت ایک روزنامچہ کی طرح بالکل محفوظ ہے۔لیکن ہماری بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ پورے عالمِ اسلام میں ایک ملک بھی ایسا نہیں جس میں پوری طرح اللہ کی شریعت نافذ ہو۔امتِ مسلمہ کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو مانتے ہیں، اس کی کتاب کو مقدس جان کر چومتے اور سر پر رکھتے ہیں۔لیکن اس کے ہر حکم پر عمل کرنا اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے ایسے لوگ بھی بالخصوص ہمارے بالائی طبقات میں موجود ہیں جنہیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے کوئی سروکار نہیں۔لیکن اکثریت اس کو مانتی ہے لیکن عمل کرنے سے گریز کرتی ہے اور ہمارا عمل اگر کہیں ہے بھی تو اس کا تعلق زیادہ سے زیادہ عبادات تک ہے۔ہماری زندگی ایک لطیفہ بن کر رہ گئی ہے ہم عبادات کا پورا نظام تو قرآن

Marfat.com

وسنت سے لیتے ہیں لیکن زندگی کے باقی تمام شعبوں میں ہمیں کتاب وسنت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ قانون کی بات ہوتی ہے تو ہم سوئیٹزرلینڈ، یورپ، امریکہ یا ۱۹۳۷ کے ایکٹ کی طرف دیکھتے ہیں۔ معاشرت کی بات ہوتی ہے تو کبھی ہندو معاشرت ہمارے سامنے ہوتی ہے اور کبھی مغربی معاشرت۔ معیشت کی نوبت آتی ہے، تو کبھی سوشلزم ہمیں یاد آتا ہے اور کبھی سرمایہ داری، اور حکومت کی بات ہوتی ہے تو ہم مغربی ڈیمو کریسی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اور ہماری تعلیم کی تمام تر بنیادیں مغربی نظام تعلیم سے مستعار لی گئی ہیں۔ ہماری تہذیب اور ہمارا تمدن سراسر مغربی تہذیب وتمدن کی جگالی ہے۔ غرضیکہ عبادات کے سوا زندگی کے کسی شعبے میں بھی ہم قرآن وسنت سے رہنمائی لینے کیلئے تیار نہیں۔ اس کے باوجود ہمارا دعویٰ ہے کہ ہماری کتاب، کتابِ زندہ ہے اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارے رسول ﷺ دانائے سبل بھی ہیں، ختم الرسل بھی اور مولائے کل بھی۔ یہ دوعملی جو ہماری پوری زندگی کی علامت بن گئی ہے یہ بنی اسرائیل کی زندگی کی ہوبہو تصویر ہے۔ اس کے نتیجے میں جو انجام ان کا ہوا ہمارا انجام بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ لیکن انتہائی دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارا انجام نوشتۂ دیوار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہم اسے پڑھنے کیلئے تیار نہیں۔ نجانے ہم اتنی سی معمولی بات کیوں نہیں سمجھتے؟ کہ جس طرح کوئی مشین دوسری مشینوں کے پرزے لگانے سے نہیں چلتی وہ جب بھی کام دے گی اپنے ہی پرزوں سے دے گی۔ آپ اپنی کلائی کی گھڑی میں اگر سلائی مشین یا گراموفون کے پرزے لگا دیں اور پھر یہ توقع رکھیں کہ وہ وقت بھی دے گی تو یہ سادگی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ نہ صرف کہ وقت نہیں دے گی بلکہ نہ وہ کپڑے سئے گی نہ اس سے کوئی سُر نکل سکے گا۔ تو انسانی زندگی جو اپنے اندر نہایت نزاکتیں رکھتی ہے وہ کس طرح پھل ہو سکتی ہے، کس طرح برگ وبار پیدا کر سکتی ہے اور کس طرح وہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنا فرض انجام دے سکتی ہے۔ اگر اسے ایک نظام اور ایک قانون کے تحت نہ لایا جائے۔ اس کا نتیجہ تو لازماً وہی ہوگا جو قرآنِ کریم کہتا ہے کہ دنیا میں رسوائی ہوگی اور آخرت میں عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ آج امتِ مسلمہ اپنے پاس ایک عظیم افرادی قوت اور بے پناہ وسائل رکھتے ہوئے جس طرح ذلت میں ڈوبتی جا رہی ہے۔ کیا ہمیں یہ بتانے کیلئے کافی نہیں کہ اس پر وہی عذاب مسلط کر دیا گیا ہے جس کا شکار بنی اسرائیل ہوئے تھے۔ اگر ہم اس عذاب سے نکلنا چاہتے ہیں اور آخرت میں سرخرو ہونا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں کھلے دل ودماغ کے ساتھ اپنے آپ کو قرآن وسنت کے حوالے کرنا ہوگا۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ۝ (البقرة: ۸۶)

(یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے۔ تو نہ تو ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے)

بنی اسرائیل کا اصل مرض

اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کی حقیقی بیماری کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ان کی وہ دکھتی رگ پکڑی ہے جس میں خرابی کے باعث ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی مسموم ہو کر رہ گئی ہے۔

Marfat.com

اشتراء کا مفہوم

یہاں اِشۡتَرَوۡا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔جس کے معنی ''خریدنے یا بیچنے'' کے ہیں۔لیکن جب خریدنے یا بیچنے کی حقیقت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت ترجیح دینے کے سوا کچھ نہیں۔آپ نے ایک چیز دے کر اس کے بدلے میں دوسری چیز لی۔تو اس حوالے سے آپ مشتری بھی ہیں اور بائع بھی کیونکہ دونوں دو چیزوں کا آپس میں تبادلہ کرتے ہیں اور دونوں میں سے ہر آدمی جو چیز لیتا ہے اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ اسے دوسری چیز پر ترجیح دے رہا ہے۔اس حقیقت کے پیشِ نظر اس کا ترجمہ ترجیح دینا بھی کیا جاتا ہے اور یہاں یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا اصل روگ یہ تھا کہ انہوں نے آخرت پر دنیا کی زندگی یا دنیا کو ترجیح دی۔ان کی نگاہوں میں زیادہ اہمیت آخرت کی نہیں بلکہ دنیا کی تھی اور انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ جس چیز کو ترجیح کے قابل سمجھتی ہے اسی کو عزت دیتی ،اسی کی اہمیت سمجھتی ،اسی کیلئے محنت کرنا ضروری سمجھتی ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس چیز کیلئے محنت کی جاتی ہے،وہی چیز ترقی کرتی ہے۔جو قومیں حیاتِ دنیا کو ترجیح دیتی ہیں،ان کی زندگی میں آپ کو ہوا اور پانی کی طرح چند چیزیں عام دکھائی دیں گی۔ان کی مجلسوں میں بار اسے ملے گا،جس کے پاس دنیا زیادہ ہوگی۔وہ رشتہ ناطہ اس سے جوڑیں گے،جس کے پاس دولت زیادہ ہوگی۔وہ اپنا اقتدار اس کے حوالے کرنا پسند کریں گے،جو اپنے پاس دولت رکھتا ہو۔اور ان کی محنت کا ہدف وہ تمام چیزیں ہوں گی،جس کا تعلق دنیوی زندگی سے ہے۔ان کے بازاروں میں مطعومات،مشروبات اور ملبوسات کے ڈھیر لگے ہوں گے۔ان کی ملوں کی چمنیاں دھواں اگلتی ہوں گی اور ان کی مشینیں ریشم کی ڈھیر پیدا کرتی ہوں گی۔ان کے کھیت سونا اگلتے ہوں گے،لیکن ان کی آبادیوں میں آپ کو ڈھونڈے سے کوئی انسان نہیں ملے گا۔کروڑوں کی دکان پر بیٹھنے والا آپ دیکھیں گے کہ اس کی نظر آپ کی جیب پر ہے۔جہاں ریشم کے ڈھیر بنے جاتے ہیں،وہیں آپ دیکھیں گے کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترستی ہیں۔جہاں آپ کو بوٹ چمکتے دکھائی دیں گے،وہاں آپ دیکھیں گے کہ چہرے رنگ اور رونق سے اجاڑ ہوگئے ہیں۔اکبر نے اپنے انداز میں بڑے دکھ سے یہ بات کہی تھی:

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز مر رہی ہے کیا چیز جی رہی ہے

دنیا پر محنت کے نتیجے میں دنیا زندہ اور توانا ہو جاتی ہے لیکن انسانیت اور اقدارِ انسانیت مر جاتے ہیں۔ہر بگڑنے والی قوم کی طرح بنی اسرائیل کا بھی یہی اصل روگ تھا۔قرآنِ کریم نے ان کی اصل بیماری کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انہوں نے جب آخرت پر دنیا کو ترجیح دی تو اس کے نتیجے میں ہوس،خود غرضی،لوٹ کھسوٹ،جھوٹ،خیانت،بدعہدی،انسان دشمنی،حسد،کینہ،بغض،خدا فراموشی اور خود فراموشی جیسی لعنتیں وجود میں آئیں۔جس کے نتیجے میں اللہ کی کتاب بھی ان کی دسترس سے نہ بچ سکی اور وہ بری طرح قومی توانائی سے محروم ہوتے چلے گئے۔ایسے لوگوں کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جب وہ عذاب کی گرفت میں آئیں گے تو ان سے نہ عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کو پہنچے گا جو انہیں عذاب سے بچا سکے۔

Marfat.com

واحسرتا! آج امتِ مسلمہ بھی بالکل اسی ڈگر پر چل رہی ہے۔اس کے تمام تر اہداف اور تمام تر کاوشیں حیاتِ دنیا کیلئے وقف ہو چکی ہیں۔نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آخرت کا احساس روز بروز کمزور ہوتا جارہا ہے۔اللہ سے تعلق ٹوٹ رہا ہے، رسول اللہ ﷺ کا اتباع چھوٹ رہا ہے۔انسانی قدریں روبہ زوال ہیں، خدا فراموشی بڑھتی جارہی ہے، جس کے نتیجے میں خود فراموشی پیدا ہوتی جارہی ہے۔ہم بھولتے جارہے ہیں کہ ہمارا ماضی کیا ہے؟ کن چیزوں نے ہمیں ایک امت بنایا تھا، اس امت کے مقاصد کیا تھے؟ اس کیلئے کیا چیزیں توانائی کا باعث تھیں اور کون سی چیزیں کمزوری کا سبب تھیں؟ ہم اپنا اصل آستانہ تک بھولتے جارہے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہر آستانے پر سجدہ ریز ہو رہے ہیں۔ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں روز بروز ماؤف ہوتی جارہی ہیں۔جن چیزوں سے ہماری شیرازہ بندی ہوئی تھیں وہ آہستہ آہستہ ہماری ملی زندگی سے خارج ہوتی جارہی ہیں۔ہمیں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ کل کو ہم اللہ کے سامنے کیا منہ لے کر جائیں گے اور رسول اللہ ﷺ کو کیا شکل دکھائیں گے؟

والی اللہ المشتکیٰ وھو المستعان

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ

وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ
وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى
اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَ
قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾
وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ
مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ
اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ

Marfat.com

اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ق وَهُوَ
الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ط قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ
قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ
اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا
مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ط خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ط
قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ق وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ط
قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ
كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ
عَلٰى حَيٰوةٍ ج وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ج يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ
سَنَةٍ ج وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ط وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع

رکوع ۱۱۔ (اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی تو کیا جب جب آئے گا کوئی رسول تمہارے پاس وہ باتیں لے کر جو تمہاری خواہشوں کے خلاف ہوں گی تو تم تکبر کرو گے؟ سو تم نے ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔ اور وہ یہ کہا

Marfat.com

کرتے تھے کہ ہمارے دل تو بند ہیں، (نہیں) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے تو شاذ و نادر ہی وہ ایمان لائیں گے۔ اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے مطابق ان پیشین گوئیوں کے جو ان کے ہاں موجود ہیں اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانے پہچانے ہوئے تھے تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا ایسے منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔ کیا ہی بری ہے وہ چیز جس سے انہوں نے اپنی جانوں کا مبادلہ کیا کہ وہ انکار کر رہے ہیں اس چیز کا جو اللہ نے اتاری ہے محض اس سرکشی کی بنا پر کہ اللہ نازل کرے اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، پس وہ اللہ کا غضب در غضب لے کر لوٹے اور منکروں کیلئے ذلیل کر دینے والا عذاب ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر تو ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اس سے کفر کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو ان کے پاس ہے۔ آپ کہئے! پھر تم اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے کیوں قتل کرتے رہے ہو، اگر تم مومن ہو؟ ٥ اور موسیٰ تمہارے پاس کھلے ہوئے نشان لے کر آئے تھے، اس پر بھی تم نے ان کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم ہو ہی ظالم۔ اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور تمہارے اوپر طور کو اٹھایا اور حکم دیا کہ جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو۔ انہوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی اور ان کے کفر کے سبب سے بچھڑے کی پرستش ان کے دلوں میں رچ بس گئی۔ ان سے کہو! اگر تم مومن ہو تو کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کا تمہارا ایمان تم کو حکم دیتا رہا۔ آپ کہہ دیجئے! اگر آخرت کا گھر خاص تمہارے ہی لئے ہے دوسروں کو چھوڑ کر، تو موت کی آرزو کر دیکھو اگر تم سچے ہو ٥ لیکن وہ اس کی آرزو کبھی بھی نہ کریں گے بسبب ان اعمالِ بد کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے ٥ اور آپ انہیں پائیں گے سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر، (یہاں تک کہ) مشرکوں سے بھی بڑھ کر ان میں سے ایک ایک یہ چاہتا ہے کہ اسے ہزار برس کی عمر دی جائے، حالانکہ اتنی عمر پانا بھی اسے عذاب سے بچانے والا نہیں اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں) (۸۷ تا ۹۶)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ٥

(اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی تو کیا جب جب آئے گا کوئی رسول تمہارے پاس وہ باتیں لے کر جو تمہاری خواہشوں کے خلاف ہوں گی تو تم تکبر کرو گے؟ سو تم نے ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے) (البقرۃ:۸۷)

Marfat.com

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ بنی اسرائیل کو ان کی اصل ذمہ داریوں کی یاددہانی کے سلسلہ میں ان کے آباؤاجداد کی تاریخ کے مختلف ابواب دہرائے جارہے ہیں جس میں بطورِ خاص انہیں یاد دلایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بنی اسرائیل کو دین عطا کیا تھا اور زندگی گزارنے کیلئے رہنما اصول دیئے تھے تو ان سے بعض عہدو پیمان بھی لئے گئے تھے، جن کا تعلق ان کی دینی زندگی کے اساسی اور بنیادی اصولوں سے تھا اور پھر یہ بھی بتایا کہ کس طرح تمہارے آباؤاجداد نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ان عہدوں اور مواثیق سے روگردانی کی اور پھر ان کی اصل بیماری کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بات بھی واضح فرمائی کہ ان کی زندگی میں اس انتہا درجے کے انحراف کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے زندگی کی ترجیحات کو بدل دیا تھا۔ ان کی منزل اور ان کا مقصد آخرت کی بجائے دنیا ہو کر رہ گئی تھی۔ جس نے بالآخر انہیں دنیاوی زندگی کی آلائشوں میں اس حد تک مبتلا کیا کہ وہ آخرت کی حقیقت سے محرومی کے نتیجے میں زندگی کی بالیدگی سے محروم ہو گئے۔

عہد کی یاددہانی کا انتظام

اب پیشِ نظر آیات میں یہ بتایا جارہا ہے کہ بنی اسرائیل کی ہدایت کیلئے صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کیا گیا تھا کہ ان سے چند عہدو پیمان لئے گئے اور زندگی کی رہنمائی کیلئے تورات جیسی کتابِ شریعت ان کے حوالے کر دی گئی۔ جس کے بارے میں تاکیدی اور تجدیدی کوششیں نہ ہونے کے باعث بنی اسرائیل گمراہی کا شکار ہو گئے بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دینی زندگی میں ثبات وقرار کیلئے موسیٰ علیہ السلام کے بعد یک بعد دیگرے اپنے رسول بھیجے جنہیں نئی کتابیں اور صحیفے بھی دیئے اور تورات میں بیان کردہ شریعت کی تجدید وتکمیل کا کام بھی جاری رہا۔ جب بھی بنی اسرائیل میں گمراہیاں پیدا ہوئیں اور بگاڑ حد سے بڑھا تو کسی نہ کسی نبی کی بعثت ہوئی جس نے انہیں گمراہیوں سے نکالنے کی کوشش کی اور بار بار انہیں ان کے عہد یاد دلائے اور شریعت کی پابندی کیلئے ان کے دل ودماغ کو آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ سلسلہ کئی نسلوں اور کئی صدیوں تک دراز رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنی بڑی تعداد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء ورسل بنی اسرائیل میں بھیجے ہیں کسی اور قوم میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شریعت سے جس قدر تغافل بلکہ انحراف مختلف ادوار میں بنی اسرائیل نے اختیار کیا اس کی مثال ملنا بھی دوسری قوموں میں مشکل ہے۔ انہوں نے صدیوں تک اللہ کی شریعت میں ترمیم وتحریف کا سلسلہ جاری رکھا، شریعت کے ایک ایک حکم کی پامالی کی، خانہ جنگی کے نتیجے میں قومی شیرازے کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے تذکیر اور یاددہانی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اسی دوران ان پر کئی دفعہ عذاب کا کوڑا بھی برسا، یہ برے حالوں میں مبتلا بھی ہوئے، قوموں کے ظلم وستم کا نشانہ بھی بنے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیاء کی تشریف آوری برابر جاری رہی۔ حتیٰ کہ انبیائے بنی اسرائیل کے سلسلے کی آخری عظیم شخصیت حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور اس شان کے ساتھ ہوا کہ جس کے سامنے دجل وفریب اور سہوونسیان کے تمام پردے تارتار ہو گئے اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ معجزات اس شان اور صراحت کے ساتھ عطا ہوئے کہ کسی ہٹ دھرم کے سوا ان کا انکار کرنا کسی اور کیلئے ممکن نہ رہا۔ وہ پیدا ہوئے تو بغیر باپ کے، قوم نے ان کی والدہ پر انگلیاں اٹھائیں تو اپنی والدہ کی پاکدامنی اور اپنی نبوت وصداقت کا اعلان اس شان کے ساتھ کیا کہ ابھی آپ کی عمر ایک دودن سے زیادہ نہ تھی اور آپ ماں کے بازوؤں میں لیٹنے کے سوا اور کوئی حرکت نہ کر سکتے تھے اور پھر اللہ نے آگے چل کر نبوت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا حکم دیا تو آپ کی نبوت کی تائید میں آپ کو ایسے ایسے معجزات عطا ہوئے کہ جنہیں دیکھ کر آپ کی صداقت کا اعتراف نہ کرنا ہٹ دھرمی اور کج فہمی کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ آنے والوں کو بتا دیتے کہ تم نے رات میں کیا کھایا اور کیا باقی رکھا، مادرزاد اندھوں کو ہاتھ پھیر کر بینا کر دیتے۔ پیدائشی کوڑھیوں کو آپ کے دستِ شفا سے شفا نصیب ہو جاتی۔ گونگے آپ کی توجہ سے بولنے لگتے۔ حتیٰ کہ آپ کی دعا سے بعض مردے بھی قبر سے اٹھ کر زندگی کا ثبوت دینے لگے۔

Marfat.com

آپ اندازہ فرمایئے! یہ عظیم شخصیت جو خرقِ عادت کے طور پر پیدا ہوئی معجزانہ طور پر کلام کیا اور محیّر العقول معجزات دکھائے۔لیکن قربان جایئے یہود کے کہ ان میں سے چند لوگوں کے سوا کسی کو ایمان کی دولت نصیب نہ ہوسکی بلکہ الٹا آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ دوسرے جادوگروں اور کاہنوں کی طرح آپ کا تعلق بھی شیطانوں اور بھوتوں کے سردار بعلزبول سے ہے اور اسی کی مدد سے آپ یہ سارے کرشمے دکھاتے ہیں یعنی آپ کوئی روحانی شخصیت نہیں بلکہ آپ سراسر ایک دنیوی شخصیت ہیں جنہوں نے کچھ چلے کاٹ کر شیطانی قوتوں کو مسخر کر رکھا ہے جن کی مدد سے آپ یہ حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تردید کیلئے یہاں زور دے کر یہ بات کہی گئی کہ اس عظیم شخصیت کا تعلق کسی جن یا شیطان سے نہیں بلکہ آپ کا تعلق اللہ سے ہے جس کے حکم سے انہیں روح القدس یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تائید حاصل ہے اور انہی کی تائید سے یہ معجزات وجود میں آتے ہیں۔

روح القدس کی تائید کے ذکر کا سبب

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ کے جتنے رسول دنیا میں آئے ہیں ہر ایک کو روح القدس کی تائید حاصل رہی ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت نہیں۔لیکن یہاں بطورِ خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیلئے روح القدس کی تائید کا ذکر اس لئے کیا جارہا ہے تاکہ یہود کے اس اعتراض کا جواب ہوجائے جس کا الزام وہ بڑی شدت سے آپ پر لگاتے تھے اور لوگوں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ تم جو کچھ حضرت عیسیٰ سے معجزات کی شکل میں دیکھ رہے ہو یہ شیطانی قوتوں کی تائید کا نتیجہ ہیں۔اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق شیاطین اور جنات سے ہے اور وہ آپ کی پشت پر ہیں۔انجیل میں یہود کے اس الزام کا ذکر بار بار آیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے متعدد دفعہ یہود کے اس الزام کا جواب دیا ہے۔ہم یہاں صرف ایک اقتباس انجیل متی سے پیش کرتے ہیں جس سے اس کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔ متی باب 12 میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے:

(اس وقت اس کے پاس لوگ اندھے گونگے کو لائے جس میں بدروح تھی اس نے اسے اچھا کردیا چنانچہ وہ گونگا بولنے اور دیکھنے لگا اور ساری بھیڑ حیران ہوکر کہنے لگی کہ کیا یہ ابنِ داؤد ہے۔فریسیوں نے سن کر کہا یہ بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد کے بغیر بدروحوں کو نہیں نکالتا۔اس نے ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا جس بادشاہی میں پھوٹ پڑتی ہے وہ ویران ہوجاتی ہے اور جس شہر یا گھر میں پھوٹ پڑے گی وہ قائم نہ رہے گا اور اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہوگیا۔پھر اس کی بادشاہی کیونکر قائم رہے گی اور اگر میں بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو تمہارے بیٹے کس کی مدد سے نکالتے ہیں۔پس وہی تمہارے منصف ہوں گے لیکن اگر میں خدا کے روح کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمہارے پاس آپہنچی یا کیوں کر کوئی آدمی کسی زور آور کے گھر میں گھس کر اس کا اسباب لوٹ سکتا ہے جب تک کہ پہلے اس زور آور کو نہ باندھ لے پھر وہ اس کا گھر لوٹ لے گا۔جو میرے ساتھ نہیں وہ میرے خلاف ہے جو میرے ساتھ جمع نہیں کرتا وہ بکھیرتا ہے۔اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ آدمیوں کا ہر گناہ اور کفر تو معاف کیا جائے گا مگر جو کفر روح کے حق میں ہوا، وہ معاف نہ کیا جائے گا اور جو کوئی ابن آدم کے برخلاف کوئی بات کہے گا تو وہ معاف کی جائے گی لیکن جو کوئی روح القدس کے خلاف کوئی بات کہے گا وہ معاف نہ کی جائے گی، نہ اس عالم

Marfat.com

میں اور نہ آنے والے عالم میں یا تو درخت کو بھی اچھا کہو اور اس کے پھل کو بھی اچھا، یا درخت کو بھی برا کہو اور اس کے پھل کو بھی برا، کیونکہ درخت پھل ہی سے پہچانا جاتا ہے) (متی باب ۱۲۔ آیات ۲۲،۲۳)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود پر دو طرح سے اتمام حجت کیا گیا ہے۔ ایک تو آخری اتمام حجت ہے جو آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے ہوا ہے۔ جس کے بعد ہدایت کے فیصلے مکمل ہو گئے لیکن اس سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری بھی ایک اتمام حجت کی صورت دکھائی دیتی ہے آنحضرت ﷺ کے بارے میں تو وہ لوگ نسلی تعصب کا شکار رہوئے کہ ہم بنی اسرائیل، بنی اسماعیل کے پیغمبر کو کیسے تسلیم کریں؟ لیکن عیسیٰ علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل ہی میں سے تھے اور پھر مزید یہ کہ انہیں ایسے واضح بینات کے ساتھ بھیجا گیا کہ جس کے بعد انکار کیلئے کوئی دلیل باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان کا ظہور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ستارۂ صبح کی مانند تھا وہ رات کے پچھلے پہر طلوع ہوتا ہے اور ایک مختصر سی عمر لے کر آتا ہے لیکن اپنی چمک دمک اپنی روشنی اور دل آویزی میں تمام ستاروں سے نمایاں ہوتا ہے اور اس کے آنے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو یہ خبر دے کہ اب آفتاب طلوع ہونے والا ہے جس کے آنے کے بعد تمام ستارے اور سیارے اپنی صف لپیٹ لیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تمام انبیائے بنی اسرائیل سے الگ شان سے تشریف لائے اور آپ نے پوری قوت سے لوگوں کو یہ بتایا:

اِنِّیْ مُبَشِّرًا ، بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ ، بَعْدِی اِسْمُهٗ اَحْمَد

(میں مبشر یعنی خوشخبری دینے والا بن کر آیا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہو گا)

اس طرح سے یہود پر آنحضرت ﷺ کے حوالے سے اتمام حجت کر دیا گیا تا کہ انہیں کسی طرح کی حیل وحجت کا موقعہ نہ رہے۔ لیکن اس کے بعد یہود نے جو کچھ کیا اور جس طرح سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے سے انکار کیا حتیٰ کہ وہ آپ کے جانی دشمن ہو گئے اسے دیکھتے ہوئے آدمی چکرا کر رہ جاتا ہے اور سوچ میں ڈوب جاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی خرقِ عادت ولادت پنگھوڑے میں آپ کا باتیں کرنا، اپنی نبوت کا اعلان کرنا اور پھر آپ کے حیرت انگیز معجزات یہ سب آپ کی صداقت کے ایسے منہ بولتے ثبوت ہیں جس کا انکار کرنا پاگل پن کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہود کے ایمان نہ لانے کا سبب

کیا یہود کی ساری قوم پاگل ہو گئی تھی؟ اور اگر یہ بات نہ تھی تو پھر ان کے ایمان نہ لانے کا آخر سبب کیا تھا؟ قرآنِ کریم نے اسی کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ اس قوم کی مسلسل بداعمالیوں اور سرکشیوں کے باعث ان کے اندر ایک ایسی سرشت اور جبلت پیدا ہو گئی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ایسی دعوت لے کر آیا جو ان کے سرکش نفس کیلئے قابلِ قبول اور سازگار نہ تھی تو انہوں نے نہ صرف اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ ان کی سرکشی کی انتہا یہ رہی کہ کسی نبی کی انہوں نے تکذیب کی اور کسی کو انہوں نے قتل کر ڈالا۔ جس قوم کی قومی سرشت یہ بن جائے اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ راہ راست اختیار کرے گی اور اس کے رد وقبول کے فیصلے عقل اور انسانیت کے مطابق ہوں گے سراسر ایک ایسی بات ہے جس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پھر ان کی بگڑی ہوئی سرشت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ان کے رویے اور اس پر اللہ کی طرف سے عتاب کا ذکر اگلی آیت میں فرمایا جا رہا ہے۔

Marfat.com

وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ○

(اور وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے دل تو بند ہیں، (نہیں) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کردی ہے تو شاذ و نادر ہی وہ ایمان لائیں گے) (البقرۃ:۸۸)

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ کا مفہوم

جس آدمی یا جس قوم میں شرافت اور انسانیت کی معمولی رمق بھی ہو وہ کبھی پیغمبرانہ دعوت کے جواب میں یہ رویہ اختیار نہیں کرتا جو ان کا معمول بن گیا تھا۔ وہ کبھی تو مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہتے کہ تم جو بات کہتے ہو، ہوسکتا ہے وہ صحیح ہو، لیکن ہم کیا کریں وہ ہمارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہونے پاتی، دل و دماغ تو اللہ کے قبضے میں ہیں تم اللہ سے دعا کرو کہ ہمارے دل تمہاری باتوں کیلئے کھل جائیں اور کبھی تحقیر کے انداز میں کہتے کہ تمھاری باتیں عقل و خرد سے اس حد تک عاری ہیں کہ ہمارے دل اسے قبول نہیں کرسکتے، کیونکہ ہمارے دل و دماغ اس قسم کی لایعنی باتوں کیلئے نہیں بنائے گئے۔ ہم معقولیت پسند لوگ ہیں، اگر تمہاری باتوں میں کوئی معقولیت ہوتی تو ہم آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرتے۔ لیکن ہم سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم فضول باتوں کو اہمیت دینے لگیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ جس بات پر فخر کررہے ہیں، انہیں اندازہ ہی نہیں کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے لعنت کا نتیجہ ہے۔ جب کوئی شخص یا کوئی قوم اپنے کفر پر گھمنڈ کرنے لگتی ہے اور ہدایت اور نیکی کی ہر بات انہیں ہلکی معلوم ہونے لگتی ہے تو وہ اللہ کے اس قانون کی گرفت میں آجاتی ہے جس کے نتیجے میں انسان کو ہدایت سے محروم کردیا جاتا ہے۔ جیسے منہ کا مزہ بگڑ جائے تو شہد بھی کڑوا لگتا ہے اسی طرح ان کو بھی ہدایت کی ہر بات معقولیت کی سطح سے گری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ ۙ وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ ۚ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ○

(اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے مطابق ان پیشگوئیوں کے جو ان کے ہاں موجود ہیں اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانے پہچانے ہوئے تھے تو انہوں نے اس کا انکار کردیا ایسے منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے) (البقرۃ:۸۹)

اس آیتِ کریمہ کے مطالب پر غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ جب کوئی قوم اپنی سرکشی اور بداعمالیوں کے باعث اللہ کی لعنت کا مورد بن جاتی ہے تو اس میں فکری اور عملی طور پر جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ ایسی حیرت انگیز ہوتی ہیں کہ عقل اس کی کوئی سی توجیہ کرنے سے عاجز ہوجاتی ہے۔ ذرا غور فرمایئے! بنی اسرائیل کی طرف نبی آخر الزماں مبعوث ہوتے ہیں آپ پر آخری کتاب قرآنِ کریم نازل کی جاتی ہے۔ اہلِ کتاب چونکہ اپنی کتابوں میں مرقوم نشانیوں کے باعث دونوں کو جانتے پہچانتے ہیں وہ کتاب کو بھی پہچانتے ہیں اور صاحبِ کتاب کو بھی اور پھر ایک ایک نشانی کو منطبق کرکے دیکھتے ہیں تو انہیں یقین آجاتا ہے کہ یہ وہی نبی ہیں اور وہی کتاب ہے، جس کا ہماری کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ انہیں اس آنے والے پیغمبر پر اس حد تک یقین تھا کہ وہ اسی کے حوالے سے اللہ کریم سے فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے اور اپنے

Marfat.com

دشمنوں کو یہ کہہ کر دھمکایا کرتے تھے کہ آج تم جو چاہو ہم پر ظلم کر لو لیکن وہ وقت دور نہیں جب وہ نبی آخر الزماں تشریف لائیں گے اور ان پر قرآن جیسی کتاب اترے گی تو ہم ان پر ایمان لا کر اور ان کی معیت میں تم پر فتح حاصل کریں گے اور تم سے ان مظالم کا انتقام لیں گے جو آج تم ہم پر کر رہے ہو۔ آپ ان دونوں باتوں کو نگاہوں میں رکھئے کہ وہ حضور ﷺ کے آنے کا یقین بھی رکھتے ہیں اور انہیں کی تشریف آوری پر اپنے درخشاں مستقبل کی امید بھی رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی کتابوں میں بیان کردہ علامات کے وہ پوری طرح مصداق بھی ہیں۔ ان دونوں باتوں کو دیکھتے ہوئے ایک غیر جانبدار مبصر یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اہلِ کتاب بالخصوص یہود کبھی آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے سے انکار کریں گے اور آپ کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ عملی زندگی میں جو کچھ ہوا وہ امید اور توقع کے بالکل برعکس ہے یہود نہ صرف کہ آپ پر ایمان نہیں لائے بلکہ انہوں نے اپنا پورا اثر ورسوخ اور تمام تر وسائل آپ کی دعوت اور آپ کے پیغام کو ناکام کرنے میں جھونک دیئے۔ عقل اس بات کی کوئی توجیہ کرنے سے بالکل عاجز ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی اس بات پر ایمان لانے سے اس مشکل کی عقدہ کشائی ہوتی ہے کہ یہود اس لئے ایمان کی دولت سے محروم رہے کہ وہ پہلے سے اللہ کی لعنت کے قانون کی گرفت میں آ چکے تھے۔ اگلی آیتِ کریمہ میں قرآنِ کریم نے ان کے اس عذرِ لنگ کو بیان کیا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایمان سے محروم رہے۔ لیکن اس کو بیان اس طرح فرمایا ہے ،جس سے یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ جب قومیں لعنت کا شکار ہوتی ہیں تو وہ کس قدر خلافِ عقل بہانوں کے سہارے بڑے بڑے قومی فیصلے کر ڈالتی ہیں اور یہی باتیں ان کی نامرادی کی دلیل بن جاتی ہیں۔ ارشاد فرمایا:

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○

(کیا ہی بری ہے وہ چیز جس سے انہوں نے اپنی جانوں کا مبادلہ کیا کہ وہ انکار کر رہے ہیں اس چیز کا جو اللہ نے اتاری ہے محض اس سرکشی کی بنا پر کہ اللہ نازل کرے اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، پس وہ اللہ کا غضب در غضب لے کر لوٹے اور منکروں کیلئے ذلیل کر دینے والا عذاب ہے) (البقرۃ:۹۰)

آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم پر ایمان نہ لانے کا جو سب سے بڑا سبب یہود کے یہاں معتبر سمجھا گیا وہ یہ تھا کہ نبوت و رسالت بنی اسرائیل کی خصوصیت ہے۔ صدیوں سے انہیں میں اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے آخری رسول بھی انہیں میں سے اٹھایا جانا چاہئے تھا۔ یہ یکا یک کیا ہوا کہ قریش یعنی بنی اسمٰعیل میں سے اللہ نے اپنا آخری رسول منتخب فرما لیا۔ ہم سب کچھ گوارا کر سکتے ہیں لیکن یہ بات ہمارے لئے قابلِ برداشت نہیں کہ ہم بنی اسمٰعیل کے پیغمبر پر ایمان لائیں۔ اندازہ فرمائیے! یہ ایک ایسی قوم کا فیصلہ ہے، جو صدیوں سے حاملِ دعوت امت کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ جن میں بڑے بڑے علما اور مشائخ پیدا ہوئے۔ وہ نبوت و رسالت کی حقیقت اور دینی ضروریات سے، بہت حد تک آگاہ ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ نبوت کسی خاندان کی میراث نہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ مقصود اللہ پر ایمان اور اس کی فرمانبرداری ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ نبی اور رسول کسی قوم اور قبیلے میں بھی آئے اسے اس لئے ماننا ضروری ہے کہ وہ اللہ کا نمائندہ ہے اور پھر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کے اختیارات غیر محدود ہیں وہ اپنے فیصلوں میں کسی کے مشوروں کا محتاج نہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہود نے اپنی کتابوں کی دی ہوئی آگاہی کے باعث محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآنِ کریم کی صداقت و حقانیت کو پہچان بھی لیا اور پھر اس کا اس لئے انکار کر دیا کہ آنے والا پیغمبر بنی

Marfat.com

اسمٰعیل میں سے کیوں اٹھایا گیا۔اس کا مطلب تو یہ ہے کہ نبوت بنی اسرائیل کی خصوصیت ہے اور اللہ تعالیٰ کو ہرگز یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے بنی اسرائیل کے علاوہ کسی اور قوم یا خاندان میں کسی پیغمبر کو مبعوث فرمائے۔اس طرح کی سوچ اور عمل صرف معصیت اور نافرمانی ہی نہیں بلکہ کھلی کھلی اللہ سے بغاوت ہے۔نافرمانی تو بعض دفعہ قابلِ معافی بھی ہوتی ہے اور کبھی اس سے درگزر بھی کیا جاتا ہے،لیکن بغاوت میں تو معافی یا رحم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس لئے فرمایا جارہا ہے کہ ان پر اللہ کا غضب بھڑکا اور یہ نادان یہ نہ سمجھ سکے کہ بنی اسرائیل جن پر صدیوں تک اللہ کی عنایات برستی رہی ہیں اور ہمیشہ اس کی رحمتیں ان پر نثار ہوتی رہی ہیں،اس لحاظ سے ان پر لازم تھا کہ وہ اپنے اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ رکھتے کہ اس بارگاہ سے ہمیشہ رحمتیں انہیں نصیب ہوتی رہتیں۔لیکن جب انہوں نے اس طرح کا انحراف اختیار کیا کہ بجائے ایمان واطاعت کے سرکشی اور بغاوت پر اتر آئے اور بندوں کے ساتھ ساتھ اللہ کے خلاف بھی تکبر اور نخوت اختیار کی تو پھر یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ٹھہرے اور تکبر کے ردعمل کے نتیجے میں ہمیشہ کی رسوائی ان کا مقدر بنادی گئی۔کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ یہ غضب درغضب کے مستحق اس لئے ہوئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ولادت سے لیکر رفع الی السماء تک سرتاپا معجزہ تھے ان کی نبوت کا انکار ایک بدیہی حقیقت کا انکار تھا۔لیکن جب یہود نے نہ صرف کہ ان کی نبوت سے انکار کیا بلکہ ان کے دشمن ہوگئے تو وہ اللہ کے غضب کے مستحق ٹھہرے۔اب رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کی صورت میں انہیں سنبھلنے کا ایک آخری موقعہ ملا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا ان کیلئے اس لئے بھی نہائت آسان تھا کیونکہ وہ اپنی کتابوں میں تفصیل سے آنحضرت کی علامات پڑھ چکے تھے۔اسی وجہ سے وہ آپ کو اچھی طرح پہنچانتے تھے۔بایں ہمہ ان کا آپ کی نبوت سے انکار بلکہ من حیث القوم آپ کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہونا دوسری دفعہ اللہ کا غضب بھڑکنے کا سبب ہوا۔اسی لئے یہاں ارشاد فرمایا کہ اب وہ صرف غضب کا شکار نہیں ہوئے بلکہ غضب بالائے غضب کے مستحق ٹھہرے۔

جو فرد یا جو قوم اللہ کی لعنت یا اس کے غضب کا مورد بنتی ہے اسے دوسری سزاؤں کے ساتھ ساتھ ایک حیرت انگیز سزا یہ ملتی ہے کہ وہ صحیح فیصلہ کرنے سے محروم ہوجاتی ہے۔اس کے افراد انفرادی فیصلوں میں ٹھوکر کھاتے ہیں اور قوم اجتماعی فیصلوں میں ہمیشہ راہِ صواب سے دور رہتی ہے۔اگلی آیتِ کریمہ میں ایسا لگتا ہے کہ ان کی اسی سزا کا ذکر کیا جارہا ہے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَيَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ ؕ قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ○ وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ مُّوۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ○

(البقرۃ: ۹۱ تا ۹۲)

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر تو ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اس سے کفر کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو ان کے پاس ہے۔آپ کہئے! پھر تم اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے کیوں قتل کرتے رہے ہو، اگر تم مومن ہو؟ ○ اور موسیٰ تمہارے پاس کھلے ہوئے نشان لے کر آئے تھے، اس پر بھی تم نے ان کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم ہو ہی ظالم)

Marfat.com

یہود کا ایمان نہ قرآن پر نہ تورات پر

پیشِ نظر دونوں آیات میں بنی اسرائیل کی پوری تاریخ از اول تا آخر سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے وقت سے لے کر آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری تک یہ اپنی سرکشی کے باعث اللہ کے جس غضب کے مستحق ہوئے تھے اور جس نے ان کو حق کی پیروی اور اصابتِ رائے سے محروم کر دیا تھا وہ بدستور ان پر نہ صرف مسلط ہے بلکہ ان کی علامت اور قسمت بن کر رہ گیا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں کی ہدایات کے مطابق اللہ کے آخری نبی پر ایمان لانے کے پابند ہیں۔ اسی کا ان سے عہد بھی لیا گیا تھا۔ اور ان کی کتابوں کی دی گئی آگاہی کے باعث وہ پیغمبر آخرالزمان کو اچھی طرح پہچانتے بھی ہیں۔ لیکن ان کے دل و دماغ کے تعطل اور اصابتِ رائے سے محرومی کو ملاحظہ فرمائیے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ نبی آخرالزماں پر ایمان لاؤ اور ان پر جو کتاب اتری ہے اسے آویزہ گوش اور فکر کا سامان بناؤ تو نہایت تکبر اور بے اعتنائی سے جواب دیتے ہیں کہ جو کچھ ہم پر ہمارے اپنے پیغمبروں کے واسطے سے نازل ہو چکا ہے ہم اسے مانتے ہیں اور وہی ہمارے لئے کافی ہے ہم اس کے علاوہ کسی اور کتاب یا پیغمبر کو ماننے کیلئے تیار نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دل و دماغ میں یہ بات پیوست ہو چکی ہے کہ نبوت بنی اسرائیل کے خاندان کی وراثت ہے وہ جب بھی آئے گی اسی خاندان میں آئے گی۔ اگر کسی اور خاندان اور قوم میں کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو ہم ہرگز اس پر ایمان نہیں لا سکتے۔ قرآنِ کریم نے ان کی اس بات پر دو طرح سے گرفت فرمائی ایک تو یہ فرمایا کہ خود اپنی کتابوں کو پڑھ کر دیکھو اگرچہ تم اپنی کتابوں میں ترمیم اور تحریف کر چکے ہو لیکن اس کے باوجود اب تک تمہاری کتابوں میں محمد رسول ﷺ اور قرآنِ کریم کی علامات مذکور ہیں۔ اسی وجہ سے تم آنحضرت کو اچھی طرح سے پہچانتے ہو اور تمہیں یقین ہے کہ تمہاری اپنی کتابوں کی گواہی کے مطابق یہ قرآن ہی حق ہے۔ اس کے خلاف ہر چیز باطل ہے۔ اگر تم واقعی اپنی کتابوں اور اپنے پیغمبروں کے مومن ہوتے تو تم ایک ایسی حقیقت کا کبھی انکار نہیں کر سکتے تھے جس کی شہادت تمہاری کتابیں بار بار دے رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم درحقیقت اپنی خواہشات کے پرستار ہو اگر تم حق کے جویا ہوتے اور تم اپنی کتابوں پر ایمان رکھتے ہوتے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ تم اللہ کے آخری نبی اور قرآن کریم کا انکار کر دیتے۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ اگر تم بنی اسرائیل میں آنے والے نبیوں کو مانتے ہو اور ان پر ایمان رکھتے ہو تو پھر بنی اسرائیل ہی میں سے اٹھائے جانے والے انبیاء کو تم قتل کیوں کرتے رہے ہو؟ تمہارا ایمان بھی عجب قسم کی چیز ہے کہ بنی اسرائیل میں اللہ کا نبی اگر کوئی ایسی دعوت لے کر اٹھا ہے جس سے تمہاری نفسانی خواہشات مطابقت نہیں رکھتیں تو تم اسے قتل کر ڈالنے سے گریز نہیں کرتے اور تمہارا ایمان تمہارے ظلم کا ہاتھ نہیں روکتا اور اگر بنی اسرائیل سے باہر ایک ایسے نبی مبعوث ہوتے ہیں کہ جس کی صداقت کی شہادت خود تمہاری کتابیں دے رہی ہیں تو تم جانتے بوجھتے اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہو اور بہانہ یہ کرتے ہو کہ ہم تو صرف ان نبیوں پر ایمان لاتے ہیں جو بنی اسرائیل کے خاندان سے اٹھائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ایمان کے نام پر بے ایمانی کرتے ہو اور تمہارا یہ طرزِ عمل کوئی نئی بات نہیں ہے موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں تم یہ طرزِ عمل اختیار کر چکے ہو حالانکہ یہ تمہاری تاریخ کے ابتدائی ایام ہیں اور اللہ کا عظیم پیغمبر تمہارے درمیان موجود ہے۔ اس کی چند روزہ غیر حاضری میں تم اپنی گمراہی کی انتہاؤں کو چھونے لگتے ہو کہ اپنے اس پروردگار (جس نے تمہیں فرعونیوں کی غلامی سے نجات دی اور قدم قدم پر جس کی قدرتوں اور رحمتوں کو تم نے بچشمِ سر مشاہدہ کیا) کے مقابل ایک بچھڑا بنا کر اس کی پوجا شروع کر دیتے ہو۔ یعنی آج صدیوں کے بعد تم بگاڑ کی جس انتہا تک پہنچ چکے ہو اس کے آثار تمہاری تاریخ کے ابتدائی دور ہی میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ حرکت چند نادان قسم کے لوگوں نے کی ہو گی۔ باقی پوری قوم تو یقیناً توحید کی پرستار اور اللہ کی شریعت کی پیروکار ہو گی۔ اگلی آیت

Marfat.com

کریمہ میں ان کی ایک اور بات سے پردہ اٹھایا جارہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گمراہی کے ساتھ ساتھ سرکشی بھی ان کے اندر مسلسل موجود رہی اور اللہ کے عظیم پیغمبر کی تربیت سے بھی یہ پوری طرح راہِ راست اختیار نہ کر سکے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

(اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور تمہارے اوپر طور کو اٹھایا اور حکم دیا تھا کہ جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو۔ انہوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی اور ان کے کفر کے سبب سے بچھڑے کی پرستش ان کے دلوں میں رچ بس گئی۔ ان سے کہو! اگر تم مومن ہو تو کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کا تمہارا ایمان تم کو حکم دیتا رہا) (البقرۃ:۹۳)

اس آیتِ کریمہ کو غور سے دیکھئے ان کی اس خوئے بد کو جو گمراہی کی مختلف صورتیں اختیار کرتی رہی ہے نہایت حکمت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے معاصر یہود کو یاد دلایا جارہا ہے کہ تمہارے علما اور مشائخ اپنے علم اور اپنی پاک دامنی کو جس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہیں اس کی حقیقت تمام تر تلبیس کی کوششوں کے باوجود لوگوں کے سامنے ہے۔ لیکن جب تمہیں کتاب اللہ سے نوازا گیا اور موسیٰ علیہ السلام باقاعدہ تمہاری تربیت فرمارہے تھے خود اس وقت تمہارا کیا حال تھا کہ تمہیں کتاب دی جارہی تھی اور تم پس و پیش سے کام لے رہے تھے۔ رفع طور کے نتیجے میں تم نے اسے قبول تو کر لیا لیکن سمع و اطاعت کے حوالے سے تمہارا حال یہ تھا کہ بظاہر تم اللہ کے احکام کو سنتے اور اطاعت کا دم بھرتے تھے۔ لیکن تمہارا عمل خود بولتا تھا کہ تم اطاعت نہیں معصیت کے پتلے ہو گویا جب تم سمع و اطاعت کا عہد کرتے تھے اس وقت بھی تمہارے باطن میں نافرمانی اور عصیان چٹکیاں لے رہا ہوتا تھا اسی کی سزا تمہیں اس دور میں یہ ملی کہ تمہارے رگ و پے میں عجل پرستی کی محبت اتار دی گئی اور تم بہانے بہانے سے شرک کی مختلف صورتوں میں ملوث ہوتے رہے۔ تم نے آج جو بہروپ اختیار کر رکھا ہے تمہاری پوری تاریخ اس کی نقاب کشائی کرتے ہوئے کہہ رہی ہے۔ ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

ان کے بہروپ کا نقاب کھینچ کر سوال کیا جارہا ہے کہ تمہیں مومن ہونے کا دعویٰ ہے لیکن کرتوت تمہارے یہ ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر تم مومن ہو تو ایسے ایمان سے ہزار دفعہ توبہ۔ جو تمہیں ایسے کرتوت کرنے کا حکم دیتا ہے۔

تمہاری جسارتوں کی کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کا عالم تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ کرتے ہوئے تمہیں اللہ کا خوف دامن گیر نہیں ہوتا۔ یہ دراصل اللہ کی طرف سے تم پر جو غضب نازل ہو چکا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تم نہ صرف حق کو قبول کرنے سے محروم کر دیئے گئے ہو بلکہ تم نے آخرت سے منہ موڑ لیا ہے اور دنیا ہی کو اپنا مقصود بنا لیا ہے اور آخرت کے بارے میں تمہارا باطل عقیدہ یہ بن گیا ہے کہ آخرت کی نعمتیں صرف تمہارے لئے مخصوص ہیں۔ تم دنیا میں جیسے چاہو اعمال کرو آخرت میں تم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ بلکہ آخرت تمہارے انتظار میں ہے اگلی آیات میں تعریض کے انداز میں اس پر گرفت فرمائی گئی ہے۔

Marfat.com

قُلۡ اِنۡ كَانَتۡ لَـكُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ عِنۡدَاللّٰهِ خَالِصَةً مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ
كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ○ وَلَنۡ يَّتَمَنَّوۡهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ ○
وَلَتَجِدَنَّهُمۡ اَحۡرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا ۛۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمۡ لَوۡ يُعَمَّرُ
اَلۡفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحۡزِحِهٖ مِنَ الۡعَذَابِ اَنۡ يُّعَمَّرَ ‌ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌ ۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ○

(آپ کہہ دیجئے! اگر آخرت کا گھر خاص تمہارے ہی لئے ہے دوسروں کو چھوڑ کر، تو موت کی آرزو کر دیکھو اگر تم سچے ہو○ لیکن وہ اس کی آرزو کبھی بھی نہ کریں گے بسبب ان اعمالِ بد کے جو اپنے ہاتھوں آگے بھیج چکے ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے○ اور آپ انہیں پائیں گے سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر، (یہاں تک کہ) مشرکوں سے بھی بڑھ کر ان میں سے ایک ایک یہ چاہتا ہے کہ اسے ہزار برس کی عمر دی جائے، حالانکہ اتنی عمر پانا بھی اسے عذاب سے بچانے والا نہیں اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں) (البقرۃ:۹۴ تا ۹۶)

ایک چیلنج

آنحضرت ﷺ سے کہا گیا ہے کہ آپ ان یہود سے کہیے، تم اپنی نسل کی تقدیس کو بنیاد بنا کر اپنی لئے جو تصورات بنا چکے ہو جن میں سے سرِ فہرست یہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ دارِ آخرت تمام لوگوں کے علاوہ خاص تمہارے لئے ہے۔ تم چونکہ اللہ کی چہیتی قوم ہو بلکہ بقول تمہارے تم اللہ کے بیٹے ہو اس لئے آخرت کی نعمتوں اور اعزازات پر تمہارے علاوہ کسی اور کے حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر تم اپنے خیالات میں واقعی راسخ ہو اور تمہارا یہ عقیدہ واقعی ایک پختہ عقیدہ ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ آخرت میں جو راحت و آرام اور جو رفعت و منزلت ہے، دنیا میں اس کا تصور بھی محال ہے۔ آخرت میں سوائے خوشیوں کے اور کچھ نہیں ہوگا وہاں غم یا کسی محرومی کی پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکیں گی تو پھر جس شخص کو یہ یقین ہو کہ ایک حسین مستقبل اور ایک عیش و آرام کی جگہ میرے لئے مخصوص ہو چکی ہے اور میرے انتظار میں ہے اس کیلئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ دکھوں بھری زندگی سے نکل کر اس عیش و آرام والی زندگی میں جانے کی تمنا نہ کرے۔ تمہارے عقیدے کی پختگی کا تقاضا یہ ہے کہ تم غم و آلام کی اس دنیا پر لعنت بھیجو اور آخرت میں جانے کی آرزو کرو اور دعائیں مانگو۔ لیکن اگر اس عقیدہ اور دعویٰ کے باوجود تم دنیا ہی کو اپنے لئے مقصد و محبوب بنالو، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم جس بات کا دعویٰ کر رہے ہو وہ کوئی حقیقت نہیں محض زبان کا جمع خرچ ہے۔ ظاہر ہے یہ الزام تم کسی بھی طرح قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتے، کیونکہ تمہارا یہ عقیدہ تمہاری تمام تر شرعی اور عملی زندگی کی بنیاد ہے اس بنیادی عقیدہ کے ثبوت کیلئے تمہارے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ تم موت کی تمنا کرو۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ تم جو دعویٰ کرتے ہو وہ بالکل حقیقت ہے اور اس حقیقت اور تمہارے عمل میں کوئی تضاد نہیں۔ اور اس سے تمہاری صداقت کھل کر سامنے آجائے گی۔

Marfat.com

اعجازِ قرآن کی دلیل

دوسری آیتِ کریمہ میں پروردگار نے حیرت انگیز انکشاف فرمایا کہ یہود اپنے تمام تر دعووں کے باوجود کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے کیونکہ وہ اپنے عقیدے کی خرابی اور اپنے اعمال کی بداطواری کو اچھی طرح سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمیں جو کتاب ہدایت دی گئی ہے اس میں ایمان و عمل ہی کو آخرت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے نسل اور نسب کو نجات کی بنیاد قرار دینا یہ ہماری اپنی اختراع ہے۔ جسے ہم نے قومی اور سیاسی مصلحتوں کے تحت اختیار کیا اور پھر اللہ کی کتاب میں ترمیم اور تحریف کرتے ہوئے اسے عقائد کا حصہ بنالیا۔ اس حقیقت کے شناسا ہونے کی وجہ سے وہ کبھی بھی موت کی تمنا کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہماری زندگی میں ایسی کوئی خوبی نہیں جو ہمیں جنت کا وارث بنا دے۔ انہیں ہزار کہیے کہ آخرت کا گھر تمہارا ہی ہے تو پھر وہاں جانے کی تم خواہش کیوں نہیں کرتے تو وہ جواب میں خاموش رہیں گے یا الٹی سیدھی ہانکیں گے لیکن کبھی بھی موت کا لفظ زبان پر لانے کی جرأت نہیں کریں گے۔ یہ کیسا خطرناک لمحہ فکریہ ہے کہ ایک قوم جسے اپنی سچائی کا دعویٰ ہے اور اسے اپنی سچائی کے ثبوت کیلئے صرف موت کی تمنا کرنا ہے اور زبان سے تمنا کا لفظ کہہ دینا کوئی مشکل کام نہیں لیکن قرانِ کریم کہتا ہے کہ وہ کبھی یہ جرأت نہیں کرسکیں گے اور تاریخی ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی ان آیات کے نزول کے بعد یہود کو سانپ سونگھ گیا۔ ان میں سے کسی آدمی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ میں موت کی تمنا کرتا ہوں۔ یہ ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ ہے جو قرآنِ کریم کی حقانیت اور اسلام کی صداقت کی ایک حجت قاطعہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ لوگ اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہوئے موت کی تمنا کردیتے تو اللہ تعالیٰ ان پر موت طاری کردیتا اور ایک یہودی بھی زندہ نہ رہتا۔ وہ لوگ چونکہ اہلِ کتاب تھے اس لئے جانتے تھے کہ کسی نبی کا چیلنج قبول کرنا اللہ کے عذاب کو دعوت دینا ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔

درازیِ عمر کی خواہش ان میں مشرکین سے بھی زیادہ ہے

تیسری آیتِ کریمہ میں فرمایا جارہا ہے کہ آخرت کے بارے میں ان کے دعوے سراسر ہیجان دعوے ہیں، ان کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی عملی زندگی کا حال تو یہ ہے کہ یہ لوگ کبھی بھول کر بھی آخرت کا نام لینا پسند نہیں کرتے۔ یہ دنیا ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ دنیاوی زندگی انہیں اس حد تک عزیز ہے کہ ان میں سے ایک ایک آدمی کی یہ خواہش ہے کہ کاش اسے ہزار ہزار سال کی زندگی مل جائے۔ ہزار سے مراد ہزار کا عدد نہیں بلکہ غیر معمولی طویل زندگی مراد ہے۔ اور یہ بھی فرمایا گیا کہ یہ زندگی کی حرص میں اس حد تک بڑھے ہوئے ہیں کہ مشرک لوگوں سے بھی ان کی حرص کہیں بڑھ کر ہے۔ مشرکین کی زندگی کے بارے میں حرص تو سمجھ میں آنے والی بات ہے کیونکہ ان کی غالب اکثریت آخرت پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ موت ہمیشہ کیلئے خاتمے کا نام ہے۔ اس کے بعد کسی دوسری زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ واضح ہے کہ جو آدمی یہ سمجھتا ہے کہ یہی زندگی حقیقی زندگی ہے اور اس کے بعد مکمل فنا ہے وہ یقیناً زندگی کے ایک ایک لمحے سے پیار کرے گا اور ہمیشہ اس کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لیتی رہے گی کہ کاش موت سے میرا سامنا نہ ہو اور میں زیادہ سے زیادہ زندگی کی خوشیوں سے لطف اندوز ہوسکوں۔ اس لئے مشرکین عرب کیلئے درازیِ عمر کی خواہش کرنا ایک فطری خواہش ہے۔ لیکن یہود جو صرف آخرت کے وجود ہی کو نہیں مانتے بلکہ اسے اپنے لئے مخصوص بھی سمجھتے ہیں ان کیلئے ہزاروں سالوں کی زندگی کی خواہش ان کی ایمانی اور دینی زندگی کی موت کے مترادف ہے۔ زندگی

Marfat.com

سے پیار کرنا معیوب نہیں البتہ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا یہ نہ صرف معیوب بات ہے بلکہ اس سے دینی اور اخلاقی زندگی کی بساط الٹ جاتی ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے ان تمام کتابوں اور صحیفوں میں ذکر فرمایا جو اس نے اپنے پیغمبروں پر نازل فرمائے ہیں اور سورۃ الاعلیٰ کی آخری آیتوں میں اسی مضمون کو نہایت موثر انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ جب بھی کوئی قوم جو مسلم ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے اس بنیادی حقیقت سے محروم ہوتی ہے تو وہ اس کی تباہی کے دن ہوتے ہیں۔ گزشتہ رکوع کے آخر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور اس رکوع کی اس آخری آیت میں اسے مزید کھول دیا گیا ہے۔ اور مزید کانٹے کی بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ یہ لوگ دنیا کی محبت میں اس حد تک ڈوب گئے ہیں کہ ان میں سے ہر شخص اپنے لئے ہزار ہزار سال عمر کی خواہش رکھتا ہے۔ لیکن انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہزار سالہ زندگی بھی انہیں اللہ کے عذاب سے بچا نہیں سکتی کیونکہ زندگی چاہے کتنی بھی طویل ہو جائے کوئی بھی زندگی والا اللہ کی آگاہی سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جس طرح چھوٹی عمروں والوں کے نامۂ اعمال اللہ کے سامنے ہیں اور وہ ان کے ایک ایک عمل سے واقف ہے۔ اسی طرح طویل عمر والے بھی اپنے تمام اعمال سمیت اس کے سامنے حاضر ہوں گے اور وہاں اپنے ایک ایک عمل کو محفوظ پائیں گے ان کی طویل زندگی اللہ کے عذاب سے انہیں بچا نہیں سکے گی۔ جس طرح وہ مختصر زندگی میں اللہ کی نگاہوں میں رہے طویل زندگی میں بھی وہ اس کی نگرانی میں ہوں گے۔ اس لئے انہیں اپنے طرزِ عمل کے بارے میں صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ وہ اللہ کے عذاب سے بچ سکیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى
قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ
وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ
بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا
نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ
رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ

Marfat.com

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ
السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ
وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ
فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ
بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ
وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ
خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝١٠٢
وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ ۝١٠٣ ع

رکوع ۱۲۔ (آپ کہہ دیجئے! جوکوئی جبرائیل کا مخالف ہے تو وہ جان لے کہ جبرائیل نے اس کلام کو آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے، مطابق ان پیشگوئیوں کے جو اس کے پہلے سے موجود ہیں اور ہدایت ہے اور ایمان والوں کیلئے خوشخبری ہے ہ جو کوئی مخالف ہو اللہ کا، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبرائیل اور میکائیل کا تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے۔ ہم نے بالیقین آپ پر نہایت واضح دلیلیں اتاری ہیں اس کا انکار صرف فاسق لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ کیا ان کی یہی روش قائم رہے گی کہ جب جب کوئی عہد کریں گے تو ان کا ایک گروہ اس کو اٹھا پھینکے گا بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے عاجز ہیں۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول ان پیش گوئیوں کے مطابق آیا جو ان کے پاس موجود ہیں تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینکا گویا اس سے آشنا ہی نہیں۔ اور ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان کے عہد حکومت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے، حالانکہ سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں ہی نے کفر کیا جو لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے اور وہ پیچھے لگ گئے اس علم کے بھی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتارا گیا تھا اور وہ دونوں کسی کو بھی (اس فن کی باتیں) نہیں بتاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو بس ایک آزمائش کیلئے ہیں تو تم کفر میں نہ پڑ جانا۔ مگر لوگ

Marfat.com

ان دونوں سے وہ علم سیکھتے جس سے وہ جدائی ڈال دیتے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان حالانکہ اس کے ذریعے سے نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر ہاں ارادہٗ الٰہی سے اور یہ وہ چیز سیکھتے تھے جو انہیں نقصان پہنچا سکتی ہے اور انہیں نفع نہیں پہنچا سکتی حالانکہ ان کو پتہ تھا کہ جس نے اس چیز کو اختیار کیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے اور بہت ہی بری ہے وہ چیز جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا اے کاش! وہ اس کو سمجھتے ٥ اور اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اس کا ثواب اللہ کے ہاں کہیں بہتر ہوتا۔ کاش! وہ جانتے) (۹۷ تا ۱۰۳)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ٥ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ٥

(آپ کہہ دیجئے! جو کوئی جبریئل کا مخالف ہے تو وہ جان لے کہ جبریل نے اس کلام کو آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے، مطابق ان پیشین گوئیوں کے جو اس کے پہلے سے موجود ہیں اور ہدایت ہے اور ایمان والوں کیلئے خوشخبری ہے ٥ جو کوئی مخالف ہوا اللہ کا، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبرائیل اور میکائیل کا تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے) (البقرۃ:۹۷تا۹۸)

حضرت جبرائیل سے دشمنی کا سبب

اس آیتِ کریمہ میں یہود کے بعض خیالات پر گرفت فرمائی گئی ہے۔ یوں تو وہ خیالات سراسر مضحکہ خیز ہیں لیکن چونکہ ان کا اثر دینی زندگی پر پڑتا اور اس سے ایمانی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے اس لئے اس پر شدت سے گرفت بھی فرمائی ہے اور جن جن باتوں پر اس کا اثر پڑ سکتا تھا اسے بھی واضح فرمایا ہے۔ سب سے پہلے یہ بات ایک خاص انداز میں فرمائی گئی جس سے ضمنی طور پر یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہود حضرت جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی رکھتے تھے اور جس کی کوئی بنیادی وجہ نہیں تھی بلکہ ان کے اپنے مفروضے تھے جنہیں انہوں نے دشمنی کا ذریعہ بنالیا تھا۔ وہ نہ جانے یہ کیسے سمجھ بیٹھے کہ حضرت جبریل اللہ کے عظیم فرشتے تو ہیں لیکن ان کا کام قوموں پر عذاب لانا ہے۔ بنی اسرائیل پر جو بڑی بڑی مصیبتیں آئیں ان کے لانے والے یہی جبرائیل تھے یعنی انہیں جبرائیل کا فرشتہ ہونے کا اقرار تھا۔ لیکن اس بات سے انکار تھا کہ وہ وحی بھی لایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ پر وحی لانے والے حضرت جبرائیل ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہم ایسی کتاب کو ماننے کیلئے تیار نہیں جس کے لانے والے حضرت جبرائیل ہوں کیونکہ یہ وہ فرشتہ ہے جو ہمیشہ ہم پر عذاب اور مصائب لے کر نازل ہوا ہے۔ بعض لوگوں کا گمان یہ تھا کہ وحی لانے والے اگرچہ جبرائیل ہی ہیں اور ہر پیغمبر پر وحی لے کر یہی نازل ہوتے رہے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہی وہ فرشتہ ہے جو بنی اسرائیل کے مصائب کا سبب بنتا رہا ہے۔ اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسے وحی دے کر بھیجا تو بنی اسرائیل میں ہوگا لیکن وہ جان بوجھ کر بنی اسمٰعیل میں حضرت محمد ﷺ پر وحی لے کر پہنچ گیا۔ اس طرح قرآنِ کریم ان پر اترا اور وہ اللہ کے نبی ہوگئے۔ لیکن یہ سب کچھ

Marfat.com

یا تو غلطی سے ہوا اور یا اس فرشتے نے زیادتی کی اور ہمیں اس نبوت سے محروم کر دیا۔ وجہ کچھ بھی ہو یہ ایک حقیقت ہے جو حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ حضرت جبرائیل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور جب عبداللہ بن صوریا کے پوچھنے پر آنحضرت نے فرمایا کہ جبرائیل مجھ پر قرآن لے کر آتے ہیں تو اس نے کہا کہ ہم ایسی کتاب کو ماننے کو تیار نہیں جو جبرائیل کے واسطے سے آتی ہے۔ کیونکہ یہ فرشتہ ہمارا دشمن ہے۔ ممکن ہے آپ کو اس بات پر تعجب ہو کہ اتنی بڑی حماقت بھی کوئی قوم کر سکتی ہے کہ وہ کسی فرشتہ کو اپنا دشمن سمجھ بیٹھے اور یا یہ سمجھے کہ وحی تو کسی اور پر آئی تھی فرشتہ غلطی سے کسی اور کے پاس لے گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمنی اپنے عجیب وغریب رنگ رکھتی ہے جس طرح محبت اور دوستی کے مختلف رنگ ہیں اسی طرح دشمنی کا بھی کوئی ایک رنگ نہیں۔ دشمنی میں مبتلا ہو کر بعض دفعہ افراد اور قومیں ایسے ایسے خیالات بنا لیتے ہیں، جن کی عام زندگی میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور عقل ان کو ماننے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوتی۔ لیکن ضد، حسد اور نسلی جنون اور فرقہ واریت کا بخار ایسی خطرناک چیزیں ہیں جو انسان کی عقل کو ماؤف کر دیتی ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے رسالہ ''ردروافض'' میں ایک طائفہ غرابیہ کا ذکر کیا ہے، جو روافض کا ایک گروہ ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت محمد حضرت علی سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ اس مشابہت کے باعث یہ غلطی ہوئی کہ حضرت جبرائیل کو بھیجا تو گیا تھا حضرت علی کی طرف وحی دے کر لیکن وہ غلطی سے حضرت محمد ﷺ کے پاس چلے گئے اور نبوت ان کو دے دی۔ اسی غلطی کی وجہ سے وہ حضرت جبریل پر لعنت بھیجتے ہیں اسی سے ملتا جلتا رویہ بنی اسرائیل کا ہے۔ پروردگار نے قرآنِ کریم میں ان کے اس خیال پر مختلف وجوہ سے گرفت فرمائی ہے۔ سب سے پہلے یہ بات فرمائی کہ تم جانتے ہو کہ جبرائیل اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ فرشتے ہیں اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ کوئی فرشتہ کبھی اللہ کے حکم سے نہ سرتابی کرتا ہے اور نہ کبھی اس کی تعمیل میں غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔ جب تم ان دونوں باتوں کو تسلیم کرتے ہو تو تم نے یہ کیسے تصور کر لیا کہ جبرائیل غلطی سے یا اپنی مرضی سے کسی کے پاس وحی لے کر چلے گئے ہوں گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ''حضرت جبریل نے اس قرآن کو اللہ کے حکم سے آپ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے دل پر اتارا'' اب اگر تم یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ قرآنِ کریم کا حضور پر اترنا اللہ کے حکم سے ہے، جبرائیل سے دشمنی کرتے ہو تو پھر یہ دشمنی جبرائیل سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے، کیونکہ جبرائیل تو اللہ کے حکم کے پابند ہیں انہیں جو حکم ملے گا اس کی تعمیل کے سوا وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ تمہیں اگر دشمنی کرنی ہے تو اللہ سے کرو لیکن یہ یاد رکھو کہ اللہ سے دشمنی کا انجام کیا ہوتا ہے۔

قرآن کی صفات

اس کے بعد قرآنِ کریم کی چند صفات بیان کی گئی ہیں تا کہ یہود کو اگر سوچنے کی توفیق ملے تو وہ اندازہ کر سکیں کہ قرآنِ کریم کو قبول نہ کرنا کن نعمتوں سے محروم ہونے کے مترادف ہے۔ اس کی پہلی صفت یہ ہے کہ تورات اور انجیل میں آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، آنحضرت اور قرآنِ کریم اس کے مصداق بن کر آئے ہیں۔ جس سے اگر ایک طرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ دونوں اللہ کی جانب سے ہیں اور برحق ہیں اسی طرح یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ تورات اور انجیل نے ان کے بارے میں جو صفات اور علامات بیان کی تھیں وہ بالکل صحیح تھیں۔ ان کے مصداق کے سامنے آجانے کے بعد اب ان کی صداقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔ اس طرح سے ان کتابوں کی عظمت اور اہلِ کتاب کی عزت میں بدرجہا اضافہ ہو گیا اب اگر تم قرآنِ کریم کو ماننے سے انکار کرتے ہو حالانکہ یہ قرآنِ کریم جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ تورات اور انجیل کی بیان کردہ صفات کے مطابق ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اپنی کتابوں کو ماننے سے انکار کر دیا

Marfat.com

تمہارے اس انکار سے نہ تو ان کتابوں کی صداقت میں کوئی فرق آئے گا اور نہ قرآنِ کریم اور آنحضرت کی حقانیت میں۔البتہ تمہارے بارے میں یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ تم جھوٹے لوگ ہو اور دینی معاملات میں صرف تمہارا رویہ ہی غلط نہیں بلکہ تم لوگوں کو فریب بھی دیتے ہو۔دوسری صفت یہاں قرآنِ کریم کی بیان کی گئی ہے، هُدًى یعنی "ہدایت"۔یہ قرآنِ کریم ہدایت بن کر آیا ہے۔دنیا کی ہدایت کیلئے ہر دور میں وقت کی ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنی کتابیں نازل فرماتا رہا ہے تاکہ لوگوں کو زندگی گزارنے کیلئے رہنمائی میسر آئے اور وہ قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں تو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ زندگی گزارنے کا وہ کون سا طریقہ ہے جس سے تمہیں دنیوی واخروی کامیابیاں مل سکتی ہیں اور تمہارا خدا تم سے خوش ہو سکتا ہے۔آج کے دور کی ضرورت کیلئے اور قیامت تک کیلئے اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی کو جو ہدایت دینا چاہتا ہے وہ اس نے قرآن کی شکل میں بھیج دی ہے۔اب اگر تم اس کا انکار کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دنیا کو اللہ کی ہدایت سے محروم رکھنا چاہتے ہو۔سوچ لو اس کا انجام کیا ہوگا۔تیسری صفت بیان فرمائی کہ قرآنِ کریم بشریٰ، یعنی بشارت ہے۔ان لوگوں کیلئے جو اس پر یقین لا کر اس کی ہدایت کے مطابق زندگی گزاریں گے۔ایسی کتاب کے انکار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان بالآخر اس بشارت اور خوشخبری سے محروم رہ جائے گا۔اس نقصان کا اندازہ وہی شخص اور وہی قوم کر سکتی ہے جسے اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس ہو۔

دوسری آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہود کو اندازہ نہیں کہ حضرت جبرائیل کی مخالفت کے منطقی نتائج کیا ہیں اور انہیں اس کا بھی احساس نہیں کہ کل کو اس کی سزا کیا ملنے والی ہے۔نتائج کے حوالے سے فرمایا گیا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جبرائیل کی مخالفت صرف جبرائیل کی مخالفت نہیں اس کا سب سے خطرناک نتیجہ تو یہ ہے کہ وہ اللہ کی مخالفت ہے کیونکہ جبریل جس کسی پر بھی وحی لے کر اترتے ہیں اللہ کے حکم سے لے کر اترتے ہیں۔اس طرح سے وہ اللہ کے نمائندہ ہیں۔اب کوئی شخص اگر حضرت جبرائیل کی مخالفت کرتا ہے تو وہ حضرت جبرائیل کی ذات کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ وہ اللہ کے نمائندہ کی مخالفت کرتا ہے اور اللہ کے نمائندہ کی مخالفت اللہ کی مخالفت ہے۔دنیا کا کوئی حکمران کبھی اپنے قاصد کی توہین یا اس کی ایذا رسانی کو برداشت نہیں کرتا۔تاریخ شاہد ہے کہ قاصدوں کے قتل پر بڑی بڑی جنگیں برپا ہو چکی ہیں۔اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے قاصد کی توہین اور اس کی مخالفت کو اپنی مخالفت قرار دے کر آیت کے آخری لفظ میں واضح کر دیا کہ اللہ کے نزدیک یہ کفر اور بغاوت ہے اور اس کا انجام ہر سوچنے والے پر واضح ہے۔مزید فرمایا کہ جبریل کی مخالفت اور دشمنی، صرف جبرائیل سے دشمنی نہیں یہ تمام فرشتوں اور تمام رسولوں سے دشمنی ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں میں کامل ہم آہنگی ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات منبع رشد و ہدایت ہے۔فرشتے اس ہدایت کے قاصد اور رسول اس کے پیکر، مبلغ اور منفذ ہیں۔ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی تمام کا انکار ہے جو درجہ بدرجہ اللہ کی ذات تک پہنچتا ہے۔آیت کے آخر میں جبریل کے ساتھ میکائیل کا ذکر فرمایا گیا ہے۔جبرائیل سے دشمنی یوں تو سارے فرشتوں سے دشمنی ہے لیکن عام کے بعد خاص کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میکائیل سے بھی دشمنی ہے۔ان کا نام بطورِ خاص اس لئے لیا گیا کہ یہود حضرت میکائیل سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ان کا خیال یہ تھا کہ یہ فرشتہ ہمیشہ ہمارا ہمدرد اور خیر خواہ رہا ہے۔اس لئے ان کا نام لے کر فرمایا کہ جبریل سے دشمنی کا نتیجہ یہ ہے کہ میکائیل سے بھی تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔دشمنی چاہے جبرائیل سے کرو یا میکائیل سے یہ سب سے دشمنی کے مترادف ہے، جو بالآخر اللہ سے دشمنی پر منتج ہوتی ہے اور یہ کفر ہے اور اللہ تعالیٰ چونکہ کافروں کا دشمن ہے اس لئے تم نے جبرائیل کی مخالفت سے اس کی دشمنی کو دعوت دی ہے۔غور کرو! اللہ کی دشمنی کا انجام کیا ہوگا؟

Marfat.com

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ ۚ وَمَا یَکْفُرُ بِھَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝ (البقرۃ:۹۹)

(ہم نے بالیقین آپ پر نہایت واضح دلیلیں اتاری ہیں اس کا انکار صرف فاسق لوگ ہی کر سکتے ہیں)

آیات بینات کی ایک جھلک

گزشتہ دو آیات کو ذہن میں رکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ یہودی علما نے اگرچہ جبرائیل کی دشمنی کو ذریعہ بنا کر عوام کو آنحضرت اور قرآن سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم ایک ایسی روشن کتاب ہے کہ جس کی عظمتوں کو ان معمولی باتوں سے گہنایا نہیں جا سکتا اور ذاتِ رسالت مآب ﷺ اپنے ساتھ ایسے واضح دلائل لے کر آئے ہیں کہ غور و فکر کرنے والوں کیلئے ان میں یقین و ایمان کے خزانے مدفون ہیں۔اس لئے آنحضرت کی نبوت کا انکار ایک عام آدمی کیلئے جو تعصبات کا مارا ہوا اور دشمنی سے اندھا نہیں ہے بہت مشکل ہو گیا ہے۔اس کا انکار صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو فاسق کے درجے کو پہنچ گئے ہوں۔فاسق کا مصدر ''فسق'' ہے۔فسق کا معنی ہوتا ہے ''ہر حد کو پھلانگتے ہوئے گزر جانا'' یعنی ایسا شخص جس پر نہ نصیحت اثر کرے نہ عقلی دلائل کو وہ وزن دینے کو تیار ہو، نہ عبرت کے شواہد اس کے دل و دماغ کو ہلا سکیں۔اس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ مجھے بہر حال مخالفت کرنی ہے اور مجھے ہر حد سے پھلانگتے ہوئے نکل جانا ہے، ایسے شخص کو فاسق کہا جاتا ہے۔یہ فسق کبھی چھوٹی باتوں میں بھی ہوتا ہے لیکن قرآنِ کریم بڑی بڑی نافرمانیوں پر عموماً اس کا اطلاق کرتا ہے۔یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی بجائے خود اپنے اندر ایک حجتِ قاطعہ کا سامان رکھتی ہے۔ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس ماحول میں جنم لیا اور جہاں آپ نے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے سال گزارے اس ماحول میں علم اور اخلاق تو دور کی بات ہے حرف شناسی تک کا سامان نہیں تھا۔ان لوگوں کو اپنے امی ہونے پر فخر تھا۔اخلاقیات سے وہ کوسوں دور تھے۔اللہ کے گھر کے جوار میں رہتے تھے اور اللہ کے گھر کی عظمت کو تسلیم بھی کرتے تھے۔لیکن اسی گھر کو انہوں نے ایک بت خانے میں تبدیل کر رکھا تھا۔توحید سے بالکل بے بہرہ، عبادت کی حقیقت سے ناواقف، اخلاقی زندگی سے تہی دامن، دین و شریعت کے نام تک سے بے گانہ، رحم، مروت، ہمدردی، غم گساری، شرم و حیا، رافت و رحمت، غرضیکہ بنیادی خصائل انسانیت سے بھی ان لوگوں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔پتھروں کے اس ڈھیر میں ہم حضور کو ایک ہیرے کی مانند چمکتا ہوا دیکھتے ہیں۔ماحول کی ہر گندگی سے دور، شرک کی ہر آلودگی سے الگ، بداخلاقی کی ہر بات سے مجتنب، انسان نما حیوانوں میں حقیقی انسان اور انسانیت کے تمام مکارم کا پیکر۔سوال یہ ہے کہ ایسی زندگی جو سراسر اپنے ماحول سے مختلف ہی نہیں بلکہ برعکس ہے، کیا اپنے اندر صداقت و حقانیت کی کوئی دلیل نہیں رکھتی؟ ایک دوسرے پہلو سے دیکھئے! آنحضرت ﷺ نے کسی شعبۂ علم کے حوالے سے بھی کسی سے کچھ نہیں سیکھا۔مکہ کا ماحول اپنے اندر علم نام کی کوئی چیز نہیں رکھتا۔آپ نے چند دنوں کے سوا مکہ کے باہر کوئی طویل سفر کیا نہ قیام رہا۔آپ کی معلومات کے ذرائع بھی وہی رہے جو مکہ کے رہنے والے لوگوں کے پاس تھے۔لیکن چالیس سال کی عمر کے بعد آپ غارِ حرا سے اس شان سے اترے کہ آپ کی زبان سے علم و حکمت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔آپ کے پہلو میں ایک نسخۂ کیمیا تھا جس نے انسان کی بگڑی ہوئی زندگی کو راہِ راست پر لانے اور اس کے دکھوں کو خوشیوں میں تبدیل کر دینے کے اصول واضح کیے۔دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تعلیم و تربیت نے مسِ خام کو کندن میں تبدیل کر دیا۔وہ معاشرہ جس میں ڈنگر ڈھور بستے تھے۔ایسے انسانوں میں تبدیل کر دیئے کہ آج تک مورخ حیران ہے کہ اتنے اجلے صاف ستھرے، صاف دل، بلند عزائم قلیل امیدوں والے اور جلیل مقاصد والے لوگ کیسے وجود میں آ گئے۔ایک ایسا معاشرہ

Marfat.com

وجود میں آیا جس کی مثال چشمِ فلک نے کبھی نہیں دیکھی۔ انہیں گنوار لوگوں میں ایک سے ایک بڑھ کر عالم، زاہد، جرنیل، جج، معلم، مربی، مزکی، تاجر، مجاہد، حکومتوں کا نظام چلانے والے پیدا ہوئے اور جن کی تعلیم و تربیت صرف اس ذاتِ عزیز کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ جس کے سپرد دنیا نے کچھ نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ دنیا کو ان خزانوں سے معمور کئے دے رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا سمجھنے کیلئے یہ دلیل کم ہے کہ ایک امی دنیا کو صرف علم ہی نہیں زندگی کا ایسا سلیقہ سکھا رہا ہے جس سے آج تک دنیا ناواقف تھی اور ایسے ایسے رازوں سے پردہ اٹھا رہا ہے جن کے جاننے کی کوئی صورت نہیں تھی اور مزید آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم کو بھی دیکھئے جو اپنی ذات میں ایک معجزہ ہے اور جس کی مثال لانے سے دنیا قاصر ہے اور قاصر رہے گی۔ یہ وہ آیاتِ بینات ہیں جن کی طرف ہم نے مختصراً اشارہ کیا ہے ان کا انکار کرنا کسی صحیح الفطرت، صحیح الدماغ اور غیر جانب دار انسان کا کام نہیں یہ کام صرف وہی کر سکتا ہے جسے یہاں فاسق سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

(کیا ان کی یہی روش قائم رہے گی کہ جب جب کوئی عہد کریں گے تو ان کا ایک گروہ اس کو اٹھا پھینکے گا بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے عاجز ہیں) (البقرۃ:۱۰۰)

ایک خبر جو بجائے خود حقانیت کی دلیل ہے

قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر ان عہدوں اور مواثیق کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے لئے ہیں اور ان مواثیق میں بطورِ خاص اس میثاق کا ذکر ہے جو ان سے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے آپ کی نصرت اور آپ کی اتباع کرنے کے حوالے سے لیا گیا تھا۔ پھر ان عہد شکنیوں کی گذشتہ آیات میں ایک تفصیل بیان کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ان لوگوں کا رویہ آنحضرت ﷺ قرآنِ کریم اور آپ کی دعوت کے بارے میں کس قدر مخاصمانہ ہے۔ اسی تاریخ اور آئندہ کے عزائم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس آیتِ کریمہ میں نہائت تعجب کے انداز میں اظہارِ حسرت کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ کیا یہود کا یہی رویہ رہے گا کہ جب بھی ان کی طرف کوئی اللہ کا رسول آئے گا اور ان سے سمع و اطاعت کا عہد لیا جائے گا تو یہ ہمیشہ عہد شکنی کا ارتکاب کریں گے اور جب بھی اللہ سے کوئی عہد باندھیں گے تو وقت آنے پر اسے توڑ پھینکیں گے۔ ممکن ہے ایک محدود تعداد عہد پر قائم رہے۔ لیکن جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے ان کے بارے میں قطعی فیصلہ سنا دیا کہ وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ فیصلہ بھی ہے اور خبر بھی۔ لیکن حالات نے ثابت کر دیا کہ قرآنِ کریم کی یہ خبر جو ایک امی کی زبان سے ادا ہوئی تھی، حرف بحرف پوری ہوئی۔ اگلی آیتِ کریمہ میں اسی خبر کے سچا ہونے کی گواہی بھی پیش کی جا رہی ہے اور یہود کی عہد شکنی کی ایک واقعاتی شہادت بھی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ:۱۰۱)

(اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول ان پیشین گوئیوں کے مطابق آیا جو ان کے پاس موجود ہیں تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینکا گویا اس سے آشنا ہی نہیں)

Marfat.com

رسول سے مراد

اس آیتِ کریمہ میں رسول سے مراد محمد رسول ﷺ ہیں۔ان کی ذرا عہد شکنیوں کو ملاحظہ کیجئے کہ تاریخ کے مختلف اوقات میں ان سے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا۔خود موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے ان سے جو عہد لیا گیا اس کا ذکر تو خود قرآنِ کریم کی سورۃ الاعراف میں موجود ہے اور پھر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تورات اور بعد میں آنے والی کتابوں میں آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی صفات اور علامات کو بھی اس حد تک بیان کر دیا گیا کہ جن کی موجودگی میں آنحضرت کی پہچان میں کوئی دشواری پیدا نہ ہو۔لیکن جب وہ اللہ کے رسول ان تمام صفات کے ساتھ متصف ہو کر اور ان تمام علامتوں کا مصداق بن کر تشریف لے آئے۔اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ اس پیغمبر کا استقبال کرتے لیکن انہوں نے بجائے ایمان لانے کے من حیث القوم اس کی دشمنی کا فیصلہ کیا۔ان میں سے بہت کم لوگوں کو ایمان کی توفیق ملی،ان کے بڑے گروہ نے اپنی ہی کتاب کے اس حصے کو جس میں آنحضرت اور قرآن کی صفات بیان کی گئی تھیں پیٹھ پیچھے پھینک دیا۔یعنی اسے ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی قوم کے سامنے اس طرح کا رویہ اختیار کیا جیسے وہ اس نبی آخر الزماں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور یہ بھی ہوسکتا ہے یہاں کتاب اللہ سے مراد قرآنِ کریم ہو۔تو پھر آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہود آنحضرت ﷺ کو اپنی کتابوں میں بیان کردہ صفات کے واسطے سے پہچانتے تھے اسی طرح قرآنِ کریم کو بھی پہچانتے تھے کیونکہ تورات میں قرآنِ کریم کی صفات بھی بیان کی گئی ہیں۔لیکن اس کے باوجود انہوں نے قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب کے طور پر ماننے سے انکار کر دیا اور ایسا رویہ اختیار کیا جیسے وہ قرآنِ کریم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔حالانکہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے ہیں تو یہود کے علماء نے آپس میں اعتراف کیا کہ جس آنے والے پیغمبر کا ذکر ہماری کتابوں میں ہے وہ یہی پیغمبر ہے۔حضرت عبداللہ ابن سلام جو یہود میں بہت بڑے عالم تھے وہ جب ایمان لائے تو انہوں نے کئی ایسے واقعات بیان کیے اور خود انہوں نے آنحضرت کو ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیا کہ آپ وہی اللہ کے نبی اور رسول ہیں جن کا اہلِ کتاب کو انتظار تھا۔یہود چونکہ اپنی کتابوں سے بھی برگشتہ ہو چکے تھے تو وہ تورات کی اس تعلیم کو قبول کرتے تھے۔جو ان کی خواہشاتِ نفس کے لئے بار ثابت نہ ہو۔لیکن جن باتوں میں وہ محسوس کرتے کہ ہمارے لئے ان پر عمل کرنا مشکل ہے اور ہمیں اپنی خواہشاتِ نفس سے ہاتھ اٹھانا پڑے گا تو وہ انہیں نظر انداز کر دیتے تھے۔اب ان کی دلچسپی اللہ کی کتاب سے نہیں بلکہ کچھ اور طرح کی چیزوں سے تھی،جس کا ذکر اگلی آیتِ کریمہ میں تفصیل سے فرمایا جا رہا ہے۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۗ وَلَبِئْسَ

Marfat.com

مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ (البقرة: ۱۰۲ تا ۱۰۳)

(اوران چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان کے عہدِ حکومت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے، حالانکہ سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں ہی نے کفر کیا جو لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے اور وہ پیچھے لگ گئے اس علم کے بھی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتارا گیا تھا اور وہ دونوں کسی کو بھی (اس فن کی باتیں) نہیں بتاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو بس ایک آزمائش کیلئے ہیں تو تم کفر میں نہ پڑ جانا۔ مگر لوگ ان دونوں سے وہ علم سیکھتے جس سے وہ جدائی ڈال دیتے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان حالانکہ اس کے ذریعے سے نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر ہاں ارادۂ الٰہی سے اور یہ وہ چیز سیکھتے تھے جو انہیں نقصان پہنچا سکتی ہے اور انہیں نفع نہیں پہنچا سکتی حالانکہ ان کو پتہ تھا کہ جس نے اس چیز کو اختیار کیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے اور بہت ہی بری ہے وہ چیز جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا اے کاش! وہ اس کو سمجھتے ○ اور اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اس کا ثواب اللہ کے ہاں کہیں بہتر ہوتا۔ کاش! وہ جانتے)

قوموں کا زوال سحر وساحری جیسی دلچسپیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے

قوموں کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو قوم اور امت اللہ کے دین سے وابستگی کی وجہ سے وجود میں آتی ہے، اس کی سرافرازی اور مضبوطی اسی دین کی وابستگی میں مضمر ہوتی ہے۔ جب تک وہ اللہ کے نبیوں کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتی رہتی ہے اور اللہ کی رضا کا حصول ان کا مقصود رہتا ہے اور اللہ کے رسول کی سنت ان کی زندگی کا طریقہ بنا رہتا ہے تو اس کے اندر زندہ قوم کی تمام صفات موجود رہتی ہیں۔ وہ اولوالعزم قوموں کی طرح زندگی کے جہاد میں شریک رہتی ہے اور اس کا ایک ایک فرد انسانی صفات کا پیکر اور دینی حسیات کا مرقع ہوتا ہے۔ اس کی روحانی اور معنوی زندگی چونکہ اس پر غالب رہتی ہے اس لئے مادی قوتیں اس کے سامنے مغلوب رہتی ہیں۔ وہ دنیا میں اللہ کا پیغام بن کر اس طرح زندہ رہتی ہے کہ تمام قوتیں اس کے ہم رکاب چلتی ہیں اور قدم قدم پر اللہ کی تائید اور نصرت اسے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن جب دین کا رشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ مادی زندگی کی اسیر ہو جاتی ہے تو پھر اس کی دلچسپیاں اللہ کی کتاب اور اللہ کے دین سے نہیں رہتیں بلکہ ایسے تمام علوم وفنون اس کی دلچسپی کا مرکز بن جاتے ہیں جو اس کے معدے کے جہنم کو بھرنے کا کام دیتے ہیں اور اس کے سفلی جذبات کی تسکین کا باعث بنتے ہیں۔ وہ چونکہ زندگی کی کشمکش سے عاری ہو جاتی ہے اس لئے اپنی کامیابیاں اور کامرانیاں ان علوم کے ذریعے حاصل کرنا چاہتی ہے جن سے اس کے کام بھی نکلتے رہیں لیکن نہ اسے محنت کی تکلیف اٹھانا پڑے اور نہ کسی معرکے سے واسطہ پڑے۔ آنحضرت ﷺ کے معاصر یہود ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ وہ اللہ کے دین سے دوری کے باعث زندگی کے مقاصد سے بے بہرہ اور اولوالعزمی، جاں سپاری اور سرفروشی جیسے جذبات سے محروم ہو گئے تھے۔ شمشیر وسناں سے ان کا تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ اب ان کی ساری دلچسپیاں سحر وساحری، ٹونے ٹوٹکے، جنتر منتر، جیسے سفلی اور شیطانی علوم سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ بجائے اللہ کی کتاب کو پڑھنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کے سحر وشعبدہ اور علمِ نجوم وغیرہ جیسے علومِ سفلیہ سے انہوں نے تعلق جوڑ لیا تھا۔ سحر وساحری کا چرچا تو کچھ نہ کچھ ہر دور میں رہا لیکن حضرت سلیمان کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے، ان کے روحانی علوم کے مقابلہ کے شوق میں شیاطینِ جن وانس کے ایک طبقہ میں یہ شوق بہت فروغ پا گیا تھا اور ان مفسدین نے

Marfat.com

اپنے ان علوم وفنون کو مدون بھی کرڈالا تھا۔ یہود نے اپنی اخلاقی پستی کے زمانہ میں انہیں چیزوں سے اپنا تعلق اس حد تک استوار کرلیا تھا کہ ان کے علما اور مشائخ انہیں چیزوں کے بل بوتے پر اپنے کاروبارِ علم اور دکانِ مشیخیت کو چلا رہے تھے اور لوگوں میں اپنے اعتماد کو بڑھانے کیلئے سحر وساحری کے اس علم کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب بھی کرتے تھے اور لوگوں کو یقین دلاتے تھے کہ یہ جو کچھ ہم کررہے ہیں یہ ہماری اپنی اختراع نہیں بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی قوت اور حشمت کا راز انہیں علوم میں تھا۔ مسلمانوں کے اندر بھی شائد یہی اثر سینہ بسینہ منتقل ہوا ہے کہ ہمارے عملیات کا کام کرنے والے نقشِ سلیمانی کے نام سے آج بھی بعض عملیات کرتے ہیں۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ

(جو کچھ نازل کیا گیا دو فرشتوں پر بابل میں یعنی ہاروت وماروت پر)

آیت کے اس ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے معاصر یہود جو سحر وساحری کا کاروبار کررہے تھے اس کا تعلق جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد کی اس جادوگری سے تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں شیاطین جن وانس کیا کرتے تھے اور انہوں نے بعد کے آنے والوں کیلئے اپنے ورثے کو مدون بھی کردیا تھا۔ اسی طرح ان کا تعلق اس جادوگری سے بھی تھا جس کا تعلق بابل کی سحر وساحری سے تھا۔ جو ہاروت وماروت کے ذریعے لوگوں تک پہنچا تھا۔ تاریخِ قدیم کے جاننے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ عہدِ رسالت اور طلوعِ اسلام سے صدیوں پہلے بنی اسرائیل دو مستقل حصوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک ٹکڑا وہ جو بخت نصر کے ہاتھوں جلاوطنی کے بعد کلدانیہ یا بابل (موجودہ عراق) میں رہ پڑا تھا اور یہیں بس گیا تھا۔ دوسری شاخ وہ جو ایک مدتِ دراز کے بعد وہاں سے واپس آکر پھر فلسطین میں آباد ہوئی۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ حقیقت واضح کی جارہی ہے کہ عہدِ رسالت کے معاصر یہود جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد کے رزائل وخبائث کے وارث تھے اسی طرح وہ بابل کی جادوگری کے امین بھی تھے۔ ان دونوں ورثوں سے کام لے کر وہ سحر وساحری کی دکان چلارہے تھے۔ لیکن بابل کے جادو کا ذکر کرنے سے پہلے (حالانکہ عہدِ سلیمانی اور بابل کے جادو اپنے اثر کے اعتبار سے ایک ہیں)۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ کا مفہوم

درمیان میں وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ''اور سلیمان نے کفر نہیں کیا شیاطین نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے''۔ کی عبارت پڑھ کر عجیب سا احساس ہونے لگتا ہے۔ کہ پہلا اور تیسرا جملہ آپس میں مربوط ہیں۔ درمیان میں ایک ایسی بات کہنا کیوں ضروری سمجھا گیا ہے جو بظاہر غیر مربوط معلوم ہوتی ہے اور پھر سلیمان علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں اور پیغمبروں کے بارے میں ہرامت کو یہ عقیدہ دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے نمائندے اور معصوم ہوتے ہیں کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے تو پھر یہ کہنا کہ سلیمان نے کفر نہیں کیا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی ملک کا بادشاہ یہ فرمان جاری کرے کہ ہمارا نائب السلطنت باغی اور غدار نہیں حالانکہ نائب السلطنت تو کبھی باغی یا غدار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں کسی بات کا تذکرہ بے سبب نہیں ہوتا۔ تحقیق سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ کتاب یعنی یہود اگرچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ کا پیغمبر تسلیم کرتے تھے، اور ان کی عظمت کے بھی قائل تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی طرف گندے سے گندے جرائم بھی منسوب کرتے تھے۔ حتیٰ کہ کفر وشرک تک کا الزام ان پر لگایا گیا۔ حالانکہ اللہ کے یہاں کفر وشرک سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں ہوسکتا۔ اس طرح کے

Marfat.com

الزامات یہود کی طرف سے یہودی قصص اور حکایات اور مسیحی آثار روایات ہی میں منقول نہیں بلکہ بائبل یعنی عہدِ عتیق کے صحائف جن پر یہود و نصاریٰ دونوں کا ایمان ہے میں بھی اس طرح کی تصریحات موجود ہیں۔ مثلاً

(جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا)　　(ا۔ سلاطین ۱۱، ۴، ۹، ۱۰)

مزید ملاحظہ کیجئے!

(سو از بسکہ اس کا دل خداوندِ اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا۔ اس لئے خداوند سلیمان پر غضب ناک ہوا کہ اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا)　　(ا۔ سلاطین: ۱۱، ۹، ۱۰)

قرآنِ کریم چونکہ اپنی دعوت کی بنیاد پیغمبروں کی عصمت پر رکھتا ہے اس لئے اس نے بات کو نامکمل چھوڑ کر پہلے یہ ضروری سمجھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے پیغمبر کا دامن اہلِ کتاب کے اڑائے ہوئے چھینٹوں سے پاک کر دے۔ لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی اس وضاحت کے باوجود دنیا سینکڑوں سال تک انہیں یہودیانہ تحریفات و اختراعات کا شکار ہو کر اس موحدِ اعظم کو نعوذ باللہ کافر اور مشرک سمجھتی رہی ہے اور قرآن کی صدائے حق اس ہنگامے میں دنیا کے کانوں میں نہ پہنچ سکی۔ یہاں تک کہ صدیاں گزر گئیں بالآخر اللہ کی قدرت کا اعجاز دیکھئے کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جو برطانوی تحقیق کا لب لباب ہے اس کے سب سے آخری ایڈیشن میں مقالہ زیرِ عنوان سلیمان میں لکھا گیا ہے:

(سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے)　　(جلد ۲، صفحہ ۹۵۲۔ طبع چہاردہم)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا خاص مسیحی فضلاء اور پرستارانِ بائبل کی تحقیق و تدقیق کا ثمرہ ہے اس میں تو یہاں تک ہے کہ بائبل کی جو آیتیں اوپر نقل ہو چکی ہیں ان کا حوالہ دے کر لکھا گیا ہے کہ یہ عبارتیں بعد میں بڑھائی گئی ہیں اور الحاقی ہیں۔ اور پھر لکھا ہے یہ غالباً صحیح ہے کہ سلیمان کی بیویاں متعدد تھیں اسرائیلی بھی، غیر اسرائیلی بھی۔ لیکن انہوں نے نہ تو سب کیلئے قربان گاہیں تیار کروائیں اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا۔ اس میں آپ نے دیکھا کہ ایک تو یہ بات فرمائی گئی کہ سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا۔ لیکن یہ نہیں بتلایا کہ کفر سے مراد کیا ہے لیکن اسی جملے کے دوسرے حصے میں یہ فرمایا کہ کفر شیاطین نے کیا، اور وہ کفر کیا تھا؟ کہ وہ لوگوں کو سحر اور جادو کی تعلیم دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سحر ہر لحاظ سے کفر ہے اور اس کے اگلے جملے میں جس کا پہلے بھی تذکرہ ہو چکا یہ بتلایا گیا ہے کہ یہود صرف عہدِ سلیمان کی جادوگری سے ہی واقف نہیں تھے بلکہ وہ سحرِ بابل سے بھی واقف تھے جو ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا۔

مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ سے کیا مراد ہے؟

اس جملے کو سمجھنے میں علما میں اختلاف ہوا ہے۔ ایک تو رائے یہی ہے کہ ہاروت و ماروت پر جادو کے علوم نازل کئے گئے تھے اور آگے لوگوں میں جس طرح عہدِ سلیمانی کا جادو پھیلا اسی طرح یہ جادو بھی پھیلا۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ عجیب بات ہے کہ جادو اگر کفر ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے آخر دو فرشتوں کے ذریعے لوگوں تک کیوں پہنچایا؟ اور پھر اللہ کی طرف سے انزال یا نزول کا تعلق کفریہ علوم کے حوالے سے نہایت کھٹکنے والی بات ہے۔

Marfat.com

اس پر رائے دیتے ہوئے علما نے کہا ہے کہ نزول اور انزال کا اطلاق صرف احکامِ تشریعی ہی میں نہیں ہوتا امورِ تکوینی میں بھی ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ تکوینیات کے سلسلے میں جو کام جیسا بھی کیا جاتا ہے اس کے لئے واسطہ او روسیلہ بہرحال فرشتے ہوتے ہیں۔ ہمارے اردگرد بے شمار کام فرشتوں سے لئے جا رہے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ہمیں ان کا شعور نہیں ہوتا اسی لئے قرآنِ کریم نے مختلف تکوینی معاملات میں فرشتوں کی ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک نازل کیے جانے کا تعلق ہے اللہ کی طرف سے نازل صرف کتاب وحکمت اور وحی والہام ہی نہیں ہوتا۔ قحط، بیماری، موت، سب کا نزول اور انزال بحیثیتِ مسبب الاسباب اللہ ہی طرف سے ہوتا رہتا ہے۔ محاورۂ قرآنی میں انزال کا تعلق رزق، پانی، لباس، پوشاک، لوہے اور چوپائے کے سلسلے میں صراحت کے ساتھ آیا ہے اور پھر ہاروت وماروت پر اس علم کا نازل کیا جانا جادوگری کیلئے نہیں بلکہ ایک اور مقصد کیلئے تھا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ بابل میں جادو کا جب بہت چرچا ہوا تو اس کے عجیب وغریب اثرات دیکھ کر جاہلوں کو اس کی حقیقت اور انبیائے کرام کے معجزات کی حقیقت میں اختلاط واشتباہ ہونے لگا اور بعض لوگ جادوگروں کو مقدس اور قابلِ اتباع سمجھنے لگے اور بعض لوگ جادو کو نیک کام سمجھ کر اس کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے لگے۔ جیسا موجودہ دور میں مسمریزم اور ہپناٹزم کے ساتھ لوگوں کا معاملہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ اور غلطی کو رفع کرنے کیلئے بابل میں دو فرشتے ہاروت وماروت نامی بھیجے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت اور اس کے شعبوں سے مطلع کر دیں تاکہ اشتباہ جاتا رہے۔ البتہ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام انبیائے کرام سے کیوں نہ لیا گیا؟ جب کہ ہدایت کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے تو یہ بھی ہدایت ہی کا ایک پہلو ہے۔ اسے بھی ان کے سپرد کیوں نہ کیا گیا؟ مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

(یہ کام انبیائے کرام سے اس لئے نہیں لیا گیا کہ اول تو انبیاء اور جادوگروں میں امتیاز وفصل کرنا مقصود تھا، ایک حیثیت سے گویا انبیائے کرام ایک فریق کا درجہ رکھتے تھے اس لئے فریقین کے علاوہ کوئی اور ثالث ہونا مناسب تھا)

دوسرے اس کام کی تکمیل بغیر جادو کے الفاظ کی نقل وحکایت کے عادۃً ہو نہ سکتی تھی اگرچہ نقلِ کفر کفر نہ باشد کے عقلی ونقلی مسلمہ قاعدہ کے مطابق ایسا ہو سکتا تھا مگر چونکہ حضراتِ انبیائے کرام مظہرِ ہدایت ہوتے تھے اس لئے ان سے یہ کام لینا مناسب نہ سمجھا گیا لہٰذا فرشتوں کو اس کام کے لئے تجویز کیا گیا۔ کیونکہ کارخانۂ تکوین میں جو خیر وشر سب پر مشتمل ہوتا ہے ان فرشتوں سے ایسے کام بھی لیے جاتے ہیں جو مجموعۂ عالم کے اعتبار سے بوجہ مصالحِ عامہ خیر ہوں لیکن لزوم مفسدہ کے سبب فی ذاتہ شر ہوں جیسے کسی ظالم وجابر یا موذی جانور وغیرہ کی نشوونما اور غور وپرداخت کہ تکوینی اعتبار سے تو درست ومحمود ہے اور تشریعی لحاظ سے نادرست ومذموم، بخلاف انبیائے کرام علیہم السلام کے کہ ان سے خاص تشریحات کا ہی کام لیا جاتا ہے جو خصوصاً وعموماً خیر ہی ہوتا ہے۔ گو کہ یہ نقل وحکایت مذکورہ غرض کے لحاظ سے ایک تشریعی کام ہی تھا لیکن پھر بھی بوجہ احتمال قریب اس امر کے کہ کہیں یہ نقل وحکایت بھی جادو پر عمل کا سبب نہ بن جائے جیسا کہ واقعہ میں ہوا تو حضرات انبیاء کو اس کا سبب براستہ نقل بنانا بھی پسند نہ کیا۔ البتہ کلیاتِ شرعیہ سے انبیائے کرام کے ذریعہ بھی اس مقصود کی تکمیل کر دی گئی۔ ان کلیات کے جزئیات کی تفصیلات بوجہ احتمالِ فتنہ انبیائے کرام کے ذریعہ نہیں کی گئیں۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ مثلاً انبیائے کرام نے یہ بتایا ہے کہ رشوت لینا حرام ہے اور اس کی حقیقت بھی بتلا دی۔ لیکن جزئیات نہیں بتلائے کہ ایک طریقہ رشوت کا یہ

Marfat.com

ہے کہ صاحبِ معاملہ سے یوں چال کر کے فلاں بات کہے وغیرہ وغیرہ کیونکہ اس طرح کی تفصیلات بیان کرنے سے تو لوگ اور ترکیبیں سیکھ سکتے ہیں۔ یا مثلاً اقسامِ سحر ہی میں مثال فرض کیجئے کہ قواعدِ کلیہ سے یہ بتادیا گیا کہ دستِ غیب کا عمل جس میں تکیہ کے نیچے یا جیب میں رکھے ہوئے روپے مل جائیں ناجائز ہے۔ لیکن یہ نہیں بتلایا کہ فلاں عمل پڑھنے سے اس طرح روپیہ ملنے لگتا ہے۔

بعض دوسرے اہلِ علم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ فرشتوں پر جو کچھ اتارا گیا تھا وہ جادو تھا۔ اس کو تو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ فرشتوں پر کوئی علم اتارا گیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا تھا؟ ان کے خیال میں وہ ایسا علم ہونا چاہئے جس کا فرشتوں پر اترنا موزوں بھی ہو اور جس کے انہماک یا غلط استعمال سے وہ خرابیاں بھی پیدا ہوسکتی ہوں جو یہاں اس علم میں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کا انہماک کتاب اللہ سے برگشتہ کرتا ہو۔ اس کی نوعیت ایک فتنہ کی ہو جس کے غلط استعمال سے آدمی کفر میں پڑسکتا ہو۔

اشیاء اور کلمات کے روحانی خواص کا علم

مولانا امین احسن اصلاحیؒ اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے نزدیک اس سے مراد اشیاء اور کلمات کے روحانی خواص وتاثیرات کا وہ علم ہے جس کا رواج یہود کے پیروں اور صوفیوں میں ہوا۔ جس کو انہوں نے گنڈوں، تعویذوں اور مختلف قسم کے عملیات کی شکل میں مختلف اغراض کیلئے استعمال کیا۔ مثلاً بعض امراض یا تکالیف کے ازالہ کیلئے یا نظرِ بد اور جادو وغیرہ کے اثرات دور کرنے کیلئے یا شعبدہ بازوں وغیرہ کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کیلئے یا محبت اور نفرت کے اثرات ڈالنے کیلئے۔ یہ علم اس اعتبار سے جادو اور نجوم وغیرہ کے علم سے بالکل مختلف تھا کہ اس میں نہ تو شرک کی کوئی ملاوٹ تھی اور نہ اس میں شیطان اور جنات کو کوئی دخل تھا۔ لیکن اپنے اثرات ونتائج کے پیدا کرنے میں یہ جادو ہی کی طرح زوداثر تھا۔ ممکن ہے بنی اسرائیل کو یہ علم بابل کے زمانہ اسیری کے دوفرشتوں کے ذریعہ سے اس لئے دیا گیا ہو کہ اس کے ذریعہ سے بابل کی سحر وساحری کا مقابلہ کرسکیں اور اپنی قوم کے کم علموں اور سادہ لوگوں کو جادوگروں کے رعب سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس بات کی طرف ہمارا ذہن دو وجہ سے جاتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل میں سحر وساحری اور نجوم کا بڑا زور تھا اور دوسری یہ کہ یہ بات سنت اللہ کے موافق معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی جگہ ایک غلط علم کا رعب اور زور ہو جس سے مفسد لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں تو وہاں اللہ تعالیٰ اس کے مقابلہ کیلئے اہلِ ایمان کو کوئی ایسا علم بھی عطا فرمائے جو جائز اور نافع ہو۔ آگے چل کر مولانا لکھتے ہیں: ''ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کیا اس طرح کا کوئی علم دنیا میں وجود بھی رکھتا ہے تو اس کے جواب میں ہماری گذارش یہ ہے کہ اس کا انکار ایک بالکل بدیہی بات کا انکار ہے۔ اگرچہ میں خود اس طرح کے کسی علم کا کبھی عامل نہیں بنا لیکن متعدد بار میرے اپنے تجربہ میں ایسی باتیں آئی ہیں جن کے بعد میرے لئے اس چیز کا انکار ممکن نہیں رہا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اسی علم کے باقیات ہیں جن کو ہمارے صوفیوں اور پیروں کے ایک طبقہ نے اپنایا اور اس سے انہوں نے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچایا بلکہ واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں اس کی مدد سے انہوں

Marfat.com

نے جوگیوں اور جوتشیوں وغیرہ کے مقابل میں اسلام اور مسلمانوں کی برتری بھی ثابت کی۔لیکن اخلاقی زوال کے بعد جس طرح یہود میں یہ علم علومِ سفلیہ کا ایک ضمیمہ اور دکانداری کا ایک ذریعہ بن کررہ گیا۔اس طرح ہمارے یہاں بھی یہ پیری مریدی کی دکان چلانے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا اور حق سے زیادہ اس میں باطل کے اجزا شامل ہو گئے جس کے سبب سے لوگوں پر اس کے اثرات بھی وہی پڑے جو قرآن نے بیان فرمائے‘‘۔(تدبرِ قرآن۔سورۃ البقرۃ)

فرشتوں کی معصومیت اوران کی طرف سے تعلیم سے پہلے تنبیہ

اس کے بعد کے جملے میں اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کی طرح ہاروت و ماروت کی معصومیت واضح فرمائی ہے کہ ان دونوں فرشتوں نے جو علم لوگوں تک منتقل کیا وہ پوری شرائط کے ساتھ تھا اور انہیں سکھانے سے پہلے بار بار یہ بات بتلاتے تھے کہ ہمیں ایک آزمائش بنا کر بھیجا گیا ہے کہ تم ہم سے یہ علم سیکھ کر دین کی بالادستی کا کام کرتے ہو یا اپنی نفسانیت کو غذا فراہم کرتے ہو۔بابل کا جادو تمہارے دین اور تمہارے اخلاق کو جو نقصان پہنچا رہا ہے ہمارا علم اس کا علاج ہے۔لیکن اگر تم نے اسے بھی ذاتی اغراض کیلئے استعمال کیا تو یہ علم بھی جادو ہی کی طرح تمہیں برباد کردے گا۔لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے واضح کرنے کے باوجود اگلے جملوں میں بتایا گیا ہے کہ یہود نے اپنی پست ہمتی، بد اخلاقی اور دناءت کے باعث اس علم سے بھی وہی کام لیا جس سے ان کی جسمانی اغراض پوری ہوتیں۔حتیٰ کہ میاں بیوی کا تعلق جو خاندان کی بنیاد ہے وہ بھی ان کے شر سے محفوظ نہ رہا حالانکہ یہود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جو لوگ اس طرح کے فتنوں میں پڑیں گے ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔لیکن انہوں نے ہر صورت میں نفسانی اغراض کی خاطر اس علم کو ایک کاروبار بنایا اور اللہ کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا حالانکہ اگر وہ اللہ کی کتاب پر ایمان لاتے اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرتے تو اللہ کے یہاں جو اجر و ثواب ملتا وہ انہیں نہال کر دیتا۔لیکن وہ اس سے محروم رہے۔کاش! وہ کبھی اس بات پر غور کرتے اور کتاب اللہ کی حقیقت کو سمجھتے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحب معارف القرآن نے سحر کی حقیقت پر جو کچھ لکھا ہے اسے یہاں نقل کر دیا جائے۔

سحر کی حقیقت

سحر بالکسر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو (قاموس) خواہ وہ سبب معنوی ہو جیسے خاص خاص کلمات کا اثر یا غیر محسوس چیزوں کا ہو، جیسے جنات وشیاطین کا اثر یا مسمریزم میں قوت خیالیہ کا اثر یا محسوسات کا ہو مگر وہ محسوسات مخفی ہوں، جیسے مقناطیس کی کشش لوہے کے لئے جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو یا دواؤں کا اثر جب کہ وہ دوائیں مخفی ہوں یا نجوم وسیارات کا اثر۔

اسی لئے جادو کی اقسام بہت ہیں، مگر عرف عام میں عموماً جادو ان چیزوں کو کہا جاتا ہے، جن میں جنات وشیاطین کے عمل کا دخل ہو یا قوت خیالیہ مسمریزم کا یا کچھ الفاظ وکلمات کا کیونکہ یہ بات عقلاً بھی ثابت ہے اور تجربہ ومشاہدہ سے بھی اور قدیم وجدید فلاسفہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حروف وکلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثیرات ہوتی ہیں، کسی خاص حرف یا کلمہ کو کسی خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تاثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے یا ایسی تاثیرات جو کسی انسانی بالوں یا

Marfat.com

ناخنوں وغیرہ اعضاء یا اس کے استعمالی کپڑوں کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں شامل کر کے پیدا کی جاتی ہیں جن کو عرف عام میں ٹونہ ٹوٹکا کہا جاتا ہے اور جادو میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

اصطلاحِ قرآن وسنت میں سحر ایسے امر عجیب کو کہا جاتا ہے، جس میں شیاطین کو خوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفر وشرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدح کی گئی ہو یا کواکب ونجوم کی عبادت کی گئی ہو، جس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔

کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں، جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا خون استعمال کرنا یا جنابت ونجاست کی حالت میں رہنا، طہارت سے اجتناب کرنا، وغیرہ۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد ان اقوال وافعال سے حاصل کی جاتی ہے، جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں۔ مثلاً تقویٰ، طہارت اور پاکیزگی، بدبودار اور نجاست سے اجتناب ذکر اللہ اور اعمالِ خیر۔

اسی طرح شیاطین کی امداد ایسے اقوال وافعال سے حاصل ہوتی ہے، جو شیطان کو پسند ہیں، اسی لئے سحر صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہیں، پاکی اور اللہ کے نام سے دور رہیں، خبیث کاموں کے عادی ہوں، عورتیں بھی ایامِ حیض میں یہ کام کرتی ہیں تو مؤثر ہوتا ہے، باقی شعبدے اور ٹوٹکے یا ہاتھ چالاکی کے کام مسمریزم وغیرہ ان کو مجازاً سحر کہہ دیا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

سحر کی اقسام

امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ سحر کی مختلف قسمیں ہیں، شعبدہ باز اپنی ہاتھ چالاکی سے ایسے کام کر لیتے ہیں کہ عام لوگوں کی نظریں اس کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں، یا قوت خیالیہ مسمریزم وغیرہ کے ذریعہ کسی کے دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے کہ وہ ایک چیز کو آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، مگر اس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں ہوتی، کبھی یہ کام شیاطین کے اثر سے بھی ہو سکتا ہے کہ مسحور کی آنکھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے جس سے وہ ایک غیر واقعی چیز کو حقیقت سمجھنے لگے، قرآنِ پاک میں فرعونی ساحروں کے جس سحر کا ذکر ہے وہ اسی قسم کا سحر تھا، جیسا کہ ارشاد ہے:

سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ ''انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا''

اور ارشاد ہے: يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ''ان کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ آنے لگا کہ یہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں''

اس میں یخیل کے لفظ سے یہ بتلا دیا گیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں جو ساحروں نے ڈالی تھیں نہ در حقیقت سانپ بنیں اور نہ انہوں نے کوئی حرکت کی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوتِ متخیلہ متاثر ہو کر ان کو دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی۔

دوسری قسم اس طرح کی تخییل اور نظر بندی ہے جو بعض اوقات شیاطین کے اثر سے ہوتی ہو، جو قرآن کریم کے اس ارشاد سے معلوم ہوئی: بَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ''میں تمہیں بتلاتا ہوں

Marfat.com

کہ کن لوگوں پر شیطان اترتے ہیں ہر بہتان باندھنے والے گناہ گار پر اترتے ہیں۔ نیز دوسری جگہ ارشاد ہے:
وَ لٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ''یعنی شیاطین نے کفر اختیار کیا لوگوں کو جادو سکھانے لگے''۔
تیسری قسم یہ ہے کہ سحر کے ذریعے ایک شے کی حقیقت ہی بدل جائے، جیسے کسی انسان یا جاندار کو پتھر یا کوئی جانور بنادیں، امام راغب اصفہانی ابوبکر جصاص وغیرہ حضرات نے اس سے انکار کیا ہے کہ سحر کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت بدل جائے بلکہ سحر کا اثر صرف تخییل اور نظر بندی ہی تک ہوسکتا ہے، معتزلہ کا بھی یہی قول ہے، مگر جمہور علماء کی تحقیق یہ ہے کہ انقلاب اعیان میں نہ کوئی عقلی امتناع ہے نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم پتھر ہو جائے یا ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف منقلب ہوجائے اور فلاسفہ کا جو یہ قول مشہور ہے کہ انقلاب حقائق ممکن نہیں، ان کی مراد حقائق سے محال، ممکن، واجب کی حقیقتیں ہیں کہ ان میں انقلاب عقلاً ممکن نہیں کہ کوئی محال ممکن بن جائے یا کوئی ممکن محال بن جائے اور قرآن عزیز میں فرعونی ساحروں کے سحر کو جو تخییل قرار دیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سحر تخییل ہی ہو اس سے زائد اور کچھ نہ ہو اور بعض حضرات نے سحر کے ذریعہ انقلاب حقیقت کے جواز پر حضرت کعب احبار کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو مؤطا امام مالک میں بروایت قعقاع بن حکیم منقول ہے۔

لَوْلَا کَلِمَاتٌ اَقُوْلُھُنَّ لَجَعَلَتْنِی الْیَھُوْدُ حِمَارًا

''اگر یہ چند کلمات نہ ہوتے جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی مجھے گدھا بنادیتے''
گدھا بنادینے کا لفظ مجازی طور پر بیوقوف بنانے کے معنیٰ میں بھی ہوسکتا ہے، مگر بلا ضرورت حقیقت کو چھوڑ کر مجاز مراد لینا صحیح نہیں، اس لئے حقیقی اور ظاہری مفہوم اس کا یہی ہے کہ اگر میں یہ کلمات روزانہ پابندی سے نہ پڑھتا تو یہودی جادوگر مجھے گدھا بنادیتے۔
اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں اول یہ کہ سحر کے ذریعے انسان کو گدھا بنادینے کا امکان ہے دوسرے یہ کہ جو کلمات وہ پڑھا کرتے تھے ان کی تاثیر یہ ہے کہ کوئی جادو اثر نہیں کرتا، حضرت کعب احبار سے جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کلمات کیا تھے تو آپ نے یہ کلمات بتلائے:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ لَیْسَ بِشَیْءٍ اَعْظَمُ مِنْہُ وَبِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ الَّتِیْ لَایُجَاوِزُھُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَّ بِاَسْمَاءِ اللّٰہِ الْحُسْنٰی کُلِّھَا مَاعَلِمْتُ مِنْھَا وَمَالَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ وَبَرَءَ وَذَرَءَ اخرجہ فی الموطاء باب التعوذ عند النوم

(میں اللہ عظیم کی پناہ پکڑتا ہوں جس سے بڑا کوئی نہیں اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے کلمات تامات کی جن سے کوئی نیک و بد انسان آگے نہیں نکل سکتا اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے تمام اسماء حسنیٰ کی جن کو میں جانتا ہوں اور جن کو نہیں جانتا، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور جو بویا اور پھیلایا ہے)

Marfat.com

خلاصہ یہ ہے کہ سحر کی یہ تینوں قسمیں ممکن الوقوع ہیں۔
جس طرح انبیائے کرام کے معجزات یا اولیاء کی کرامات سے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں جو عادۃً نہیں ہوسکتے، اسی لئے ان کو خرقِ عادت کہا جاتا ہے۔ بظاہر سحر اور جادو سے بھی ایسے ہی آثار مشاہدے میں آتے ہیں، اس لئے بعض جاہلوں کو ان دونوں میں التباس بھی ہوجاتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ جادوگروں کی تعظیم وتکریم کرنے لگتے ہیں، اس لئے دونوں کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔

سحر اور معجزے میں فرق

سو یہ فرق ایک تو اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے اور ایک ظاہری آثار کے اعتبار سے۔ حقیقت کا فرق تو یہ ہے کہ سحر اور جادو سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں یہ دائرۂ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں۔ فرق صرف اسباب کے ظہور وخفا کا ہے۔ جہاں اسباب ظاہر ہوتے ہیں وہ آثار ان اسباب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور کوئی تعجب کی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن جہاں اسباب مخفی ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے اور عوام اسباب کے نہ جاننے کی وجہ سے اس کو خرقِ عادت سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ وہ درحقیقت تمام عادی امور کی طرح کسی جن شیطان کے اثر سے ہوتی ہے۔ ایک خط مشرقِ بعید سے آج کا لکھا ہوا اچانک سامنے آکر گر گیا، تو دیکھنے والے اس کو خرقِ عادت کہیں گے، حالانکہ جنات وشیاطین کو ایسے اعمال وافعال کی قوت دی گئی ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہو تو پھر کوئی خرقِ عادت نہیں رہتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سحر ظاہر ہونے والے تمام آثار اسباب طبعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مغالطہ خرقِ عادت کا ہوجاتا ہے۔
بخلاف معجزہ کے کہ وہ بلاواسطہ فعل حق تعالیٰ کا ہوتا ہے، اس میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ کو حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہوجا، مگر ٹھنڈک بھی اتنی نہ ہو جس سے تکلیف پہنچے بلکہ جس سے سلامتی حاصل ہو، اس حکم الٰہی سے آگ ٹھنڈی ہوگئی۔
آج بھی بعض لوگ بدن پر کچھ دوائیں استعمال کرکے آگ کے اندر چلے جاتے ہیں۔ وہ معجزہ نہیں بلکہ دواؤں کا اثر ہے۔ دوائیں مخفی ہونے سے لوگوں کو دھوکا خرقِ عادت کا ہوجاتا ہے۔
یہ بات کہ معجزہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآن عزیز کی تصریح سے ثابت ہے۔ ارشاد فرمایا: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ”کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی، درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے۔“ مراد یہ ہے کہ ایک مٹھی خاک اور کنکر کی سارے مجمع کی آنکھوں تک پہنچ جانا اس میں آپ کے عمل کو کوئی دخل نہیں، یہ خالص حق تعالیٰ کا فعل ہے۔
معجزہ اور سحر کی حقیقتوں کا یہ فرق کہ معجزہ بلاواسطہ اسباب طبعیہ کے براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے اور جادو اسباب طبعیہ مخفیہ کا اثر ہوتا ہے۔ حقیقت سمجھنے کیلئے تو کافی وافی ہے۔ مگر یہاں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ عوام الناس اس فرق کو کیسے پہچانیں، کیونکہ ظاہری صورت دونوں کی ایک سی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کے پہچاننے کیلئے بھی حق تعالیٰ نے کئی فرق

Marfat.com

ظاہر کردیئے ہیں۔ اول یہ کہ معجزہ یا کرامت ایسے حضرات سے ظاہر ہوتی ہے جن کا تقویٰ طہارت و پاکیزگی اخلاق و اعمال کا سب مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے برعکس جادو کا اثر صرف ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو گندے، ناپاک، اللہ کے نام سے اور اس کی عبادت سے دور رہتے ہیں، یہ چیز ہر انسان آنکھوں سے دیکھ کر معجزہ اور سحر میں فرق پہچان سکتا ہے۔
دوسرے یہ کہ عادۃ اللہ یہ بھی جاری ہے کہ جو شخص معجزے کا دعویٰ کر کے کوئی دعویٰ کرنا چاہے اس کا جادو نہیں چلتا، ہاں معجزہ کے دعوے کے بغیر کرے تو چل جاتا ہے۔

کیا انبیاء پر بھی جادو کا اثر ہو سکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے۔ وجہ وہی ہے جو اوپر بتلائی گئی کہ سحر درحقیقت اسباب طبعیہ ہی کا اثر ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام اسباب طبعیہ کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں، یہ تأثر شانِ نبوت کے خلاف نہیں، جیسے ان کا بھوک پیاس سے متاثر ہونا بیماری میں مبتلا ہونا اور شفا پانا، ظاہری اسباب سب جانتے ہیں، اسی طرح جادو کے باطنی اسباب سے بھی انبیاء علیہم السلام متاثر ہو سکتے ہیں اور یہ تأثر شانِ نبوت کے منافی نہیں۔
رسول اللہ ﷺ پر یہودیوں کا سحر کرنا اور اس کی وجہ سے آپ پر بعض آثار کا ظاہر ہونا اور بذریعہ وحی اس جادو کا پتہ لگنا اور اس کا ازالہ کرنا احادیثِ صحیحہ میں ثابت ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سحر سے متاثر ہونا خود قرآن میں مذکور ہے۔
آیات يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى اور وَاَوْجَسَ فِي نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوسٰى، اس پر شاہد ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا
وَاسْمَعُوْا ۗ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ
اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ
رَّبِّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ
مِثْلِهَا ۗ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ
اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

Marfat.com

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ
كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ
فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ
مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ
بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ
اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ
اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ
اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ
مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

رکوع ۱۳۔ (اے وہ لوگو! جو ایمان رکھتے ہو تم "رَاعِنَا" نہ کہو "اُنْظُرْنَا" کہا کرو اور غور سے سنا کرو اور
کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے۔ نہیں چاہتے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اہل کتاب میں سے اور نہ مشرکین کہ تمہارے
اوپر تمہارے رب کی طرف سے کوئی رحمت نازل ہو اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کیلئے جس کو چاہتا ہے اللہ بڑے
فضل والا ہے۔ جو ہم منسوخ کرتے ہیں کوئی آیت یا کوئی آیت نظر انداز کر دیتے ہیں تو لے آتے ہیں ہم اس سے بہتر یا
اس کے مانند کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ٥ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہی کیلئے ہے سلطنت آسمانوں اور
زمین کی اور تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی دوست ہے نہ مددگار۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اس طرح کے سوال
کرو جس طرح کے سوال اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے اور جو لوگ ایمان کو کفر سے بدل دیں گے وہ شاہراہ سے بھٹک

Marfat.com

گئے o بہت سے اہلِ کتاب یہ چاہتے ہیں کہ وہ تمہارے ایمان کے بعد پھر تمہیں کفر کی حالت میں پلٹا دیں محض اپنے حسد کی وجہ سے، حق کے اچھی طرح واضح ہو جانے کے باوجود تو درگزر کرو اور نظر انداز کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو نیکی بھی تم اپنے لئے کرو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اہلِ کتاب نے کہا! ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا، مگر وہ شخص جو یہودی ہو یا عیسائی یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔ فرما دیجئے! (اے پیغمبر!) اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔ کیوں نہیں! جس نے سپرد کر دیا اپنی ذات کو، اللہ کے اور وہ محسن بھی ہو، تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے۔ نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔" (آیت ۱۰۴ تا ۱۱۲)

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقُولُوا۟ رَٰعِنَا وَقُولُوا۟ ٱنظُرْنَا وَٱسْمَعُوا۟ ۗ وَلِلْكَـٰفِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ O (البقرة: ۱۰۴)

(اے وہ لوگو! جو ایمان رکھتے ہو، تم "رَاعِنَا" نہ کہو "اُنْظُرْنَا" کہا کرو اور غور سے سنا کرو اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے)

یہود کے خبثِ باطن کا اظہار

یہود کا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ رویہ زیرِ بحث ہے۔ اس سلسلے میں ان کا طرزِ عمل، ان کی دلچسپیاں، ان کی ترجیحات، ان کے تعصبات، حاملِ دعوت امت ہونے کے باوجود ان کی اللہ اور اس کے دین کے مقابلے میں جرأت و جسارت اور پھر آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف ان کی شوخیاں اور سازشیں ایک ایک چیز کو مختلف اسالیب سے ذکر کیا جا رہا ہے۔ اسی سلسلے میں مسلمانوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہود جب تمہاری مجالس میں آتے ہیں اور خاص طور پر آنحضرت ﷺ کی صحبت میں بیٹھتے ہیں تو تم بجائے اس کے کہ ان کی شرارتوں کو سمجھو تم حسنِ ظن اور خوش فہمی کے باعث ان کے طرزِ عمل کو ان کے حسنِ نیت اور نیک ارادوں پر محمول کرتے ہو اور اسی وجہ سے تم ان کے اصل ارادوں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کی سادہ لوحی اور مومنانہ اخلاص کے باعث وہ جو حرکتیں کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے اور جن کی وجہ سے اسلام کی دعوت اور آنحضرت کی وجاہت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا۔ ان آیات میں ان سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے تاکہ مسلمان یہود کے اصل چہرے کو پہچاننے میں کامیاب ہو جائیں اور پھر ان کی سازشوں سے محفوظ رہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ان کی جس شرارت کو ذکر کیا جا رہا ہے، وہ یہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتے۔ حضور جب دین کی کوئی بات سکھاتے یا کوئی نصیحت فرماتے تو وہ آگے بڑھ بڑھ کر آپ کو متوجہ کرنے کیلئے بار بار راعنا کہتے۔ راعنا کا معنی ہوتا ہے۔ آپ ہماری رعائت فرمائیے ہمیں بات سمجھنے کا موقع دیجئے۔ اپنی بات کو دوبارہ بیان فرما دیجئے تاکہ ہم اچھی طرح سمجھ جائیں۔ یہ بالکل اسی طرح کا جملہ ہے جیسے انگریزی میں کہتے ہیں **I beg your pardon** ان کے اس طرزِ عمل سے مسلمان یہ سمجھتے کہ ان لوگوں کو علم سے کتنی محبت ہے اور یہ دین کے معاملے میں کتنے فکر مند ہیں کہ بار بار آنحضرت ﷺ کو متوجہ کر کے بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل

Marfat.com

سے مسلمانوں کو ان کے ایمان لانے کی امید پیدا ہوگئی اور وہ اپنے دلوں میں اس بات سے خوشی محسوس کرنے لگے کہ یہ لوگ اگر مسلمان ہوجائیں، چونکہ یہ مذہب کو سمجھنے والے لوگ ہیں اور صدیوں سے ان کا دین سے ایک رشتہ ہے تو اس سے یقیناً اسلامی دعوت کو تقویت ملے گی۔ اور اہلِ کتاب میں تیزی سے یہ دین مقبول ہوجائے گا اور وہ اپنے حسنِ ظن کے باعث اس طرف بہت کم توجہ دیتے تھے کہ یہود راعنا کہتے ہوئے اصل میں کچھ اور کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پروردگار نے ان کی اس شرارت اور خباثت سے پردہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ تم غور سے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ یہاں دین سیکھنے کیلئے نہیں آتے بلکہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کیلئے آتے ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ جب گفتگو کررہے ہوتے تو وہ بار بار یہ تاثر دینے کیلئے کہ ہم آپ کی بات کو بڑی توجہ سے سن رہے ہیں لیکن جب کسی بات کے سمجھنے میں ہمیں دشواری پیش آتی ہے تو ہم راعنا کہہ کر آپ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ راعنا کہتے ہوئے اپنی خباثتِ نفس کا اظہار کرتے تھے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آنحضرت کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں لیکن در پردہ وہ آپ کی بات کو ہلکا کرنے، مذاق اڑانے یا آپ کی توہین کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

راعنا کا مفہوم

راعنا کا عربی زبان میں تو مفہوم یہی ہے کہ آپ ہماری رعایت فرمائیے لیکن عبرانی زبان میں یہ کلمہ بدگوئی کیلئے استعمال ہوتا ہے اور یا پھر وہ یہ حرکت کرتے کہ راعنا کو ذرا نیچے کی طرف دبا کر اس طرح ادا کرتے کہ وہ راعینا بن جاتا۔ جس کا معنی بالکل بگڑ کر رہ جاتا۔ راعی عربی زبان میں چرواہے کو کہتے ہیں اور ''نا'' ضمیر متکلم ہے۔ تو اس کا معنی ہے ''ہمارا چرواہا''۔ اس طرح کی حرکتوں سے ان کے اندرونی بغض کو تسکین ملتی اور وہ دل ہی دل میں خوشی محسوس کرتے اور جب ان مجالس سے اٹھ کر آپس میں تنہا ہوتے تو کھلکھلا کر ہنستے اور قہقہے لگاتے کہ دیکھو ہم نے مسلمانوں اور ان کے پیغمبر کو نعوذ باللہ کس طرح مذاق بنا رکھا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی عزت وحرمت کو بچانے کیلئے اللہ نے حکم دیا کہ ایک ایسا لفظ جس کو غلط معنوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے اسے اپنی مجلسی زندگی سے بالکل نکال دو اور اس کی جگہ وہ لفظ اختیار کرو جس سے اس طرح کا احتمال پیدا نہ ہوسکتا ہو۔ اس لئے فرمایا کہ راعنا کی بجائے اُنْظُرْنَا کہا کرو۔ اس کا معنی ہے ''ہماری طرف توجہ فرمایئے، ہمیں مہلت دیجئے، ہمارا انتظار فرمایئے، ذرا توقف فرمایئے''۔ یہ جو ہم نے کہا وہ ایک سیدھے سادے لفظ کو توڑ مروڑ کو اس طرح استعمال کرتے جس سے انہیں اپنے خبث باطن کی تسکین کو موقع ملتا۔ یہ محض ہماری ذہنی اپج نہیں بلکہ پروردگار نے قرآنِ کریم میں صراحت سے یہی بات بیان فرمائی ہے ایک جگہ ارشاد فرمایا:

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ

(یہود میں وہ لوگ بھی ہیں جو کلام کو اس کے موقع ومحل سے ہٹاتے ہیں اور اپنی زبانوں کو لچکا کر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا دین پر طنز کرنے کیلئے)

Marfat.com

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ راعنا کے تلفظ میں زبان لچکا کر اپنے خبثِ باطن کا اظہار کرتے تھے اور مزید یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کی یہ خباثت صرف اسی لفظ تک محدود نہیں تھی بلکہ جب بھی ان کو موقع ملتا وہ یہ حرکت ضرور کرتے۔ مثلاً جب حضور کوئی حکم دیتے یا نصیحت کرتے تو وہ کہتے سمعنا کہ ہم نے آپ کی بات سن لی اور دبی زبان میں سر جھکا کر منہ نیچا کر کے عَصَینَا بھی کہتے جس کا معنی ہے کہ ''ہم نے نافرمانی کی''۔ لیکن عَصَینَا کو اس طرح ادا کرتے کہ سننے والا اسے اَطَعْنَا سمجھے اور کبھی اپنی بات گوش گزار کرنے کیلئے کہتے وَاسْمَعْ جس کا معنی ہے ''ہماری بات سماعت فرمائیے''۔ لیکن ساتھ ہی چپکے سے کہتے غَیرَ مُسْمَعٍ ''اللہ کرے تجھے کوئی بات سنائی نہ دے'' اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ دیکھو جو بات کہی جارہی ہے وہ کیسی ناشنیدنی اور نہ سننے کے قابل بات ہے۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس طرح کی حرکتوں سے آنحضرت کی مجلس کی سنجیدگی اور آپ کی ذاتی وجاہت کو کس قدر نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے یک قلم اس طرح کے الفاظ کو مجلسی الفاظ سے خارج کر دیا گیا تاکہ کسی کو اس طرح دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع نہ ملے۔ اس سے ہمیں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

الفاظ اپنا وزن رکھتے ہیں اور ان میں ایک نفسیاتی اثر بھی ہے

ایک تو یہ بات کہ الفاظ بہر حال اپنا وزن رکھتے ہیں اور ان کی ایک نفسیاتی حقیقت بھی ہے اس لئے اگر کسی لفظ کے بارے میں یہ گمان ہو کہ اس سے غلط فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور اس کے استعمال سے رسول اللہ ﷺ کی عزت یا دین کی حرمت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تو اس کے استعمال سے خود بھی بچنا چاہئے اور ماحول کو بھی اس سے محفوظ رکھنا چاہئے اور جدید دنیا کا تو تجربہ بھی ہے کہ شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے میں اور نظریات کو پختہ کرنے اور ہلکا کرنے میں الفاظ کا کھیل سب سے زیادہ ہے۔ بظاہر معصوم سے الفاظ کے ذریعے قیامت اٹھا دی جاتی ہے۔ الفاظ ہی کے استعمال سے مقدس اور معصوم شخصیتیں محل نظر بنا دی جاتی ہیں اور انہیں کی سخاوت سے بونے لوگ قد آور بنا دیئے جاتے ہیں۔ اور قابلِ نفرت اشیا کو مرغوب بنا دیا جاتا ہے۔ اور محترم چیزوں کو بے اعتبار کر دیا جاتا ہے۔

مشتبہ الفاظ سے بھی مسلمانوں کو بچنا چاہئے

اسلامی اعتقادات میں چونکہ اللہ اور اس کے رسول کی شخصیت بنیاد اور اساس کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح کردار کی تعمیر میں بنیادی عقائد اور اخلاقی اقدار سب سے مؤثر عامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں الفاظ کے طوطے مینا اڑانے کی کبھی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات اور رسول اللہ ﷺ کی صفات کو توقیفی حیثیت دی ہے تاکہ کسی کو ان کے بارے میں غلط الفاظ کے استعمال کی جرات نہ ہو اور مکارمِ اخلاق کو بھی سنت کے ستون کے ساتھ باندھ دیا ہے تاکہ کسی کو سخن طرازی ناروا کے گل کھلانے کا موقع نہ ملے۔

دوسری بات اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی جائز فعل سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ملتی معلوم ہو تو یہ جائز فعل بھی ناجائز ہو کر رہ جاتا ہے۔ جیسے اگر کسی عالم کے جائز فعل سے جاہلوں کے مغالطہ میں پڑنے اور ناجائز کاموں میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو اس عالم کیلئے یہ جائز فعل بھی ممنوع ہو جائے گا۔ بشرطیکہ یہ فعل شرعاً ضروری اور مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو۔ جس طرح آنحضرت ﷺ کی خواہش تھی کہ بیت اللہ کو دوبارہ بنائے ابراہیمی کے مطابق تعمیر کیا جائے کیونکہ قریشِ مکہ نے جب اس کو بنایا تھا تو مصارف کی کمی کے باعث انہوں نے

Marfat.com

اس کا ایک حصہ بیت اللہ میں شامل نہیں کیا جسے ''حطیم'' کہتے ہیں اور اس عمارت میں بعض تبدیلیاں بھی کر دیں جو بنائے ابراہیمی کے خلاف تھیں۔لیکن آنحضرت ﷺ نے جب دیکھا کہ نو اور دس ہجری میں تیزی سے لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں لیکن ابھی تک انہیں تربیت کا موقع نہیں ملا جس سے ان کا مزاج پوری طرح اسلامی قالب میں ڈھل جاتا تو آپ نے اپنی خواہش پر عمل کرنے سے گریز فرمایا بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ تیری قوم اگر حدیث الاسلام نہ ہوتی یعنی لوگ نئے نئے مسلمان نہ ہوئے ہوتے تو میں بیت اللہ کو اس طرح تعمیر کرتا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔لیکن اب چونکہ عوام کے فتنہ میں پڑ جانے کا احتمال ہے تو میں اس نیک کام کو نہیں کروں گا اس سے معلوم ہوا کہ نیکی کا کام بھی جو فتنہ کا باعث ہو سکتا ہو اس کو عمل میں لانے سے گریز کرنا سنت نبوی کا منشا ہے۔

الفاظ کے استعمال پر یہ پابندی بظاہر کوئی بڑی پابندی نہیں لیکن اگر بعض الفاظ کا استعمال عادت بن جائے تو اس کا چھوڑنا یقیناً ایک مشکل کام ہوتا ہے۔مزید یہ بات بھی کہ اگر ماحول ایسا ہو جس میں منافقین یا دشمنانِ دین بھی موجود ہوں تو پھر ایسی پابندی مخلص اور غیر مخلص میں فرق کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے کیونکہ صریح ممانعت کے بعد اگر پھر بھی کوئی شخص ممنوع الفاظ کے استعمال کی جرأت کرتا ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں اسلام کے خلاف حسد یا دشمنی کی آگ بھڑک رہی ہے۔چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی اس پابندی سے یہی فائدہ ہوا کہ یہودیوں کا آنا جانا بند ہو گیا اور اگر کوئی آیا بھی تو اس کیلئے اپنا اعتبار باقی رکھنے کی خاطر اس حکم کی تعمیل ضروری ہو گئی تاکہ مسلمانوں کے سامنے اس کا بھرم قائم ہو جائے اور پھر اس حکم کو حقیقی مؤثر بنانے کیلئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا۔ اسمعوا کہ تم غور اور توجہ سے سنو یعنی یہودی تو اب اپنے خبثِ باطن کا اظہار نہیں کر سکیں گے اب اگر وہ کوئی بات پوچھیں گے تو راعنا کی بجائے انظرنا کہہ کر پوچھیں گے۔لیکن اللہ کے رسول کی عظیم شخصیت سے بار بار سوال کرنا بھی ادب کے اعلیٰ تقاضوں کے مطابق نہیں۔سوال کی ضرورت یا آپ سے رعایت کیلئے عرض کرنے کی ضرورت تب ہو گی جب آپ کے ارشادات کو پوری طرح غور سے نہیں سنا جائے گا۔اس لئے مسلمانوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی ایک ایک بات کو پوری توجہ اور انہماک سے سنیں۔ویسے بھی آنحضرت ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ آپ دینی فرائض کی تعلیم دیتے ہوئے کبھی رواں دواں گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ ٹھہر ٹھہر کر اس طرح گفتگو فرماتے کہ اگر کوئی آدمی آپ کے الفاظ شمار کرنا چاہے تو وہ شمار کر سکتا تھا۔اور مزید یہ کہ جس بات پر آپ زور دینا چاہتے یا اسے دل و دماغ میں اتارنا چاہتے تو آپ اسے دہرا کر بیان کرتے تھے بعض دفعہ اسے تین دفعہ دہراتے۔اس اہتمام اور احتیاط کی گفتگو کے بعد پوچھنے کی ضرورت بہت کم پیدا ہوتی اور شاید یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن کریم میں صحابہ کے جن سوالات کو ذکر کیا گیا ہے ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔آیت کے آخر میں فرمایا: وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ''اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے''۔یہاں عام کفر کا ذکر نہیں بلکہ یہاں مراد وہ کفر ہے جو آنحضرت ﷺ کی صحبت میں اپنے خبثِ باطن کے باعث الفاظ کے غلط استعمال سے پیدا ہو۔یعنی اگر تم راعنا جیسا کوئی لفظ بگاڑ کر اس طرح ادا کرتے ہو جس سے آنحضرت ﷺ کی شان اور قدر و منزلت کو نقصان پہنچتا ہے تو یہ وہ کفر ہے کہ جس کا ارتکاب کرنے والوں کو قیامت میں صرف عذاب نہیں بلکہ عذاب الیم ہو گا۔ اَلِيْم کا معنی ہے ''دردناک'' یعنی وہ عذاب اس قدر شدید ہو گا کہ خود عذاب بھی اس عذاب سے عذاب میں ہو گا۔کیونکہ دردناک اس درد کو کہتے ہیں جس سے درد بھی درد محسوس کرے۔حدیث میں آتا ہے، حضور نے فرمایا کہ جہنم کی بعض وادیاں ایسی ہیں جس سے باقی جہنم پناہ مانگتا ہے، یعنی جہنم بھی اس کی ہولناکی سے درد اور عذاب محسوس کرتا ہے۔

Marfat.com

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

(نہیں چاہتے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اہلِ کتاب میں سے اور نہ مشرکین کہ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے کوئی رحمت نازل ہو اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کیلئے جس کو چاہتا ہے اللہ بڑے فضل والا ہے) (البقرۃ:۱۰۵)

معاندین کے باطن پر روشنی

اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ سوال صرف چند الفاظ کے استعمال کا نہیں جو یہود اپنے خبثِ باطن کے اظہار کیلئے کرتے ہیں بلکہ اصل مسئلہ ان کی ذہنیت اور سوچ کا ہے۔ وہ بظاہر تمہارے پاس آ کر ہمدردی جتانے کی کوشش کرتے ہیں اور تمہیں یہ یقین دلاتے ہیں کہ انہیں تمہارے دین اور ایمان کی بہت فکر ہے اور وہ خود بھی اسلام کے بارے میں مخلصانہ طرزِ عمل رکھتے ہیں اور اس کو جاننے اور سیکھنے کی تڑپ رکھتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین وہ اس درد میں یکساں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت ورسالت جیسی رحمت بنی اسمٰعیل کے گھر میں کیسے نازل کر دی۔ ان کو یہ حسد کسی قیمت چین نہیں لینے دیتا کہ نبوت تو نبی اسرائیل کا ورثہ تھی ہمیشہ انہیں میں سے نبی اٹھائے گئے اور انہیں میں وحی الٰہی کی رحمت اترتی رہی یہ اچانک آخر کیا ہو گیا کہ بنی اسرائیل کو محروم کر کے بنی اسمٰعیل کو اس سے نواز دیا گیا اور مشرکین اس بات پر پیچ پا ہیں کہ قبائل میں ہمیشہ عزت وکرامت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کیلئے کوششیں جاری رہتی ہیں۔ ہر قبیلہ دوسروں سے معزز ہونے کیلئے ایسے کارنامے انجام دیتا ہے۔ جس سے وہ دوسروں کی ہمسری کے قابل ہو سکے بلکہ ان سے آگے بڑھ جائے۔ لیکن یہ نبوت ایک ایسی فضیلت ہے جس کو کوئی اپنے زورِ بازو سے حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بنی ہاشم کو یہ فضیلت عطا کر دی گئی ہے تو وہ تو ہمیشہ کیلئے دوسرے قبیلوں سے آگے بڑھ گئے اور پھر اسی پر بس نہیں ان کے ہاں فضیلت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب دولت وثروت ہے۔ لیکن یہ کیا اندھیر مچا کہ ایک ایسے شخص کو نبوت دے دی گئی جو ان کے معاشرے کا ایک غریب ترین شخص تھا جو یتیم پیدا ہوا اور جس نے وراثت میں ایک اونٹنی اور ایک لونڈی کے سوا کچھ نہیں پایا آج وہ سب کیلئے صرف اس لئے محترم ہوتا جا رہا ہے کہ اس کے سر پر نبوت کا تاج رکھ دیا گیا ہے۔ یہ دلوں کے وہ زخم ہیں جو نہ اہلِ کتاب کو چین لینے دیتے تھے نہ مشرکین کو اللہ تعالیٰ جواب میں صرف ایک بات فرماتے ہیں کہ نبوت یقیناً اللہ کی رحمت ہے اور یہ رحمت اللہ کی ملکیت ہے وہ جسے چاہتا ہے اس رحمت کا حق دار بنا دیتا ہے اور اس فضیلت کیلئے خاص کر دیتا ہے۔ تم آخر اس پر اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو؟ تمہارا اصل مسئلہ یہ نہیں کہ تمہیں نبوت نہیں ملی بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ محمد ﷺ کو کیوں ملی؟ اللہ بڑے فضل والا ہے وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے مسلمان اس فضل سے نوازے گئے ہیں تو انہیں اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اہلِ کتاب اور مشرکین کی ذہنیت اور ان کے حسد اور بغض کو بھی سمجھ لینا چاہئے تا کہ وہ اپنے آپ کو ان کے شر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر سکیں۔

Marfat.com

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ
عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

(جو ہم منسوخ کرتے ہیں کوئی آیت یا کوئی آیت نظر انداز کر دیتے ہیں تو لے آتے ہیں ہم اس سے بہتر یا اس کے مانند کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ○ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہی کیلئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی دوست ہے نہ مددگار) (البقرۃ:۱۰۶تا۱۰۷)

یہود کی ایک شرارت کا ذکر اور جواب

یہود کی شرارتوں کے بارے میں مسلمانوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے اور وہ مسلمانوں کو فکری اور عملی اعتبار سے غیر مطمئن کرنے کیلئے جو سوالات اٹھاتے تھے، ان کا جواب بھی دیا جا رہا ہے۔ پیش نظر آیات میں ان کی اسی قسم کی ایک شرارت کو ذکر فرمایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ ان کی شرارت یہ تھی کہ دیکھو! تمہارا پیغمبر اور تم پر اترنے والی کتاب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ اور تورات اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی کتابِ ہدایت ہے۔ اور ان دونوں باتوں کو تسلیم کرنا تمہارے ایمانیات کا ایک لازمی جزو بھی ہے۔ اس کے باوجود یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ تورات کو کتابِ ہدایت تسلیم کرنے کے باوجود اسے منسوخ ٹھہرا کر عمل اور اختیار کے اعتبار سے معطل کر دیا گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو نبی ماننے کے باوجود ان کے اتباع کو ختم کر دیا گیا ہے حالانکہ نبی کی سنت بھی موجود ہے اور اس پر اترنے والی کتاب بھی تمہارے سامنے ہے۔ تو ان دونوں کی موجودگی میں ایک نئی نبوت کا دعویٰ اور نئی کتاب کی پیش کردہ شریعت کے احکام پر عمل کرنے کی دعوت آخر کیا معنی رکھتی ہے۔ اگر پہلے نبی موجود ہیں اور وہ برحق ہیں تو نئے نبی کے آنے سے ایک نئے اختلاف کو پیدا کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اور پہلی شریعت موجود ہے تو پھر نئی کتاب کی شکل میں ایک نئی شریعت پیش کرنے کا فائدہ کیا؟ البتہ! یہ نتیجہ ضرور نکلے گا بلکہ نکل رہا ہے کہ نئی نبوت اور نئی کتاب پر ایمان لانے والے پہلے سے نبوت اور کتاب رکھنے والوں کو کافر کہہ رہے ہیں اور یہ پہلی نبوت اور کتاب کے حامل لوگ نئے نبی پر ایمان لانے والوں کو مرتد ٹھہرا رہے ہیں۔ نتیجتاً ایک ایسی چپقلش اور ایک ایسا تصادم وجود میں آ گیا جس سے امن درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس نئے تجربے کو روک دیا جائے اور پہلے سے موجود شریعت پر عمل کیا جائے۔ مزید براں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ پروردگار نے اپنے آخری نبی اور اپنی آخری کتاب بھیج کر پہلی نبوت اور شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کو طویل انسانی تجربے کے بعد یہ احساس ہوا ہے کہ میں نے پہلے جو شریعت بھیجی تھی اس میں مجھے حالات کا اندازہ کرنے میں غلطی ہوئی۔ لیکن اب حالات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر انسانی زندگی کی بقا اور اس کی بہتری منظور ہے تو اب ایک نئی شریعت آنی چاہئے تاکہ انسان آج کے حالات کے تناظر میں اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

غور کیجئے! یہ کتنا سنگین الزام ہے جو نسخ کی صورت میں منطقی انداز میں لازم آتا ہے اور یقیناً جب یہ باتیں مسلمانوں سے سرگوشی کے انداز میں کہی جا رہی ہوں گی اور دبے دبے طریقے سے انہیں مسلمانوں میں پھیلایا جاتا ہو گا، تو اس سے کس قدر برے اثرات پیدا ہوتے ہوں گے۔ قرآنِ

Marfat.com

کریم نے اس کا جواب دیتے ہوئے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی ہے کہ یہود اس بات کو ایک خطرناک نتیجے کے طور پر پیش کر رہے ہیں حالانکہ وہ اس کائنات کی ایک ایسی حقیقت ہے جو تمہیں اپنے گردوپیش میں دکھائی دیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صبح ہوتی ہے تو شام آ کر اسے منسوخ کر دیتی ہے۔ پھر صبح ہوتی ہے تو شام پر خطِ نسخ پھر جاتا ہے اور انسانی زندگی کا حسن صبح و شام کے اسی انقلاب اور اسی نسخ میں ہے۔ اسی طرح ہم موسموں کے تغیرات کو دیکھتے ہیں کبھی بہار آتی ہے اور کبھی خزاں، کبھی گرمی اور کبھی سردی اور کبھی چلچلاتی دھوپ اور کبھی گھنگھور گھٹائیں یہ وہ حقائق ہیں جن کا شب و روز ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور انہیں سے انسانی زندگی میں نہ صرف ایک حسن ہے بلکہ اس کی ضرورتوں کی بجا آوری اور اس میں آرام و راحت کے حصول کیلئے بھی ان چیزوں کا وجود لازمی ہے۔

نسخ کا مفہوم

نسخ کے اصل معنی "ہٹانے اور مٹانے" کے ہیں۔ اور اصطلاح میں "ایک حکم کو دوسرے حکم سے بدل دینا" ہے۔ چاہے یہ تبدیلی نئے حکم کی شکل میں ہو یا پہلے حکم کو ختم کر دینے کی شکل میں ہو۔ یہ نسخ پہلی شریعتوں اور قوموں میں بھی ہوا اور موجودہ شریعت میں بھی ہوا۔ پہلی قوموں اور شریعتوں میں تبدیلی یا نسخ کے حوالے سے چند باتیں ذہن نشین رہنی چاہییں۔

نسخ ارتقاء کا لازمی نتیجہ ہے

ا۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ انسانی زندگی اس کے احساسات اور انفعالات، اس کا ذہنی افق، اس کے خیالات کی وسعت، اس کے رحمی اور قرابتی رشتے اور فرد سے قبیلے تک اور قبیلے سے قوم تک کا تصور یہ سب کچھ ایک ارتقا کی شکل میں وجود میں آیا ہے۔ انسانی زندگی مسلسل ارتقا کے نتیجے میں ترقی کرتی رہی ہے اس کی بنیادی ضرورتیں تو ہمیشہ ایک جیسی رہی ہیں لیکن اس کے مسائل و وسائل، اس کے جبلی احساسات، اس کی فکری توانائیاں، اس کے تہذیبی اور تمدنی مدارج وقت اور تجربے کے ساتھ ساتھ ارتقا پذیر رہے ہیں۔ اس ارتقا کے سفر کو دیکھتے ہوئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انسان کو زندگی گزارنے کیلئے پہلے دنوں کا دیا ہوا دستور، آئین اور دستور العمل اگلے مراحل میں کام نہیں دے سکتا تھا اس میں بھی ارتقا کی ضرورت تھی اور وہ ارتقا اسی صورت میں ممکن تھا کہ ضرورت کے اختتام پر پہلی ہدایت اور رہنمائی منسوخ کی جاتی اور نئی ضروریات کے مطابق نئی رہنمائی مہیا کی جاتی۔ اسی کا نام نسخ ہے اور یہ نسخ انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ تبدیلی سے ہمکنار ہوتا رہا ہے۔ البتہ ایک بات یاد رہے، نسخ کا تعلق تمام تر احکام و قوانین سے ہے، عقائد و ایمانیات یا اخلاق وصفات یا واقعات و حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں عقائد اور ایمانیات ایسی چیزیں نہیں جن میں مختلف حالات میں تبدیلی پیدا کی جائے یہ ہمیشہ ایک جیسے رہے ہیں۔ اسی طرح واقعات و حقائق بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کبھی نہیں بدلا کرتے۔ البتہ احکام و قوانین میں حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی کا عمل ناگزیر ہوتا ہے۔ البتہ یہ تبدیلی خود قانون دینے والے کی طرف سے ہونی چاہئے کسی اور کی طرف سے نہیں۔ انسان کے ارتقائی سفر میں ہر دور کے حالات کے مطابق شریعت نازل ہوتی رہی ہے اور نئی ضرورتیں پیدا ہونے کے وقت نئی شریعت سے سابقہ شریعت کے بعض احکام منسوخ بھی ہوتے رہے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنی زندگی میں بلوغ کی عمر کو پہنچ گیا اور اس کے احساسات اور انفعالات پختہ ہو گئے تو نبی آخر الزماں تشریف لائے اور

Marfat.com

انہیں آخری شریعت دے کر پہلی شریعتوں کے وہ احکام منسوخ کردیئے گئے جو آئندہ زندگی میں چلنے کے قابل نہ تھے۔ جس سے انسانی سفر کو نقصان پہنچ سکتا تھا اور آخری نبی کی زبان سے تکمیلِ دین کا مژدہ سنا کر یہ خبر دے دی کہ اللہ کا قانون مکمل ہوگیا ہے یہ قیامت تک کے انسانوں کی ضرورتیں پوری کرے گا اس میں کسی قسم کے نسخ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

نسخ کے ذریعے پہلی شریعتوں کی تسہیل، تجدید اور تکمیل ہوئی

۲۔ یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ سابقہ آسمانی کتابیں ترمیم اور تحریف کا شکار ہوئیں۔ بعض احکام نکال دیئے گئے یا اپنی خواہشات کے مطابق انہیں تبدیل کردیا گیا۔ بعض بدعات کو شریعت کا حصہ بنا دیا گیا، حلت وحرمت میں تبدیلیاں کی گئیں۔ انبیائے کرام کی عصمت کے بنیادی تصور کو بدلا گیا۔ اللہ کے نبیوں کی طرف ایسے ایسے افعال منسوب کیے گئے جو کسی شریف آدمی کی طرف بھی منسوب نہیں کئے جاسکتے۔ اللہ کی صفات میں کبھی تشبیہ کو داخل کیا گیا کبھی تعطیل کو۔ قرآنِ کریم نے ان تمام چیزوں کی اصلاح کی اور اسے نسخ کا نام دیا۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ باری ہے:

فَيَنسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِه

(شیطان جو کچھ داخل کردیتا ہے اللہ اسے مٹاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے)

اس نسخ کے ذریعے پہلی شریعتوں کی تسہیل کی گئی اور کہیں نئے احکام دے کر تجدید کی گئی اور کہیں وہ احکام جسے اہلِ کتاب نے بالکل بھلا دیا تھا یا تو ان کی تجدید کی گئی اور یا انہیں نظر انداز کر کے ان کی جگہ نئے احکام دیئے گئے اور اس طرح شریعت کو محکم اور مکمل فرمایا گیا۔ یہ تو وہ نسخ ہے جس کا تعلق ادیانِ سابقہ سے ہے اور یہاں بطورِ خاص اسی کا ذکر کیا جارہا ہے۔ البتہ دوسرا نسخ وہ ہے جو اسلامی شریعت میں ہوا ہے۔ اس میں مسلمانوں میں مختلف تصورات پائے جاتے ہیں۔

اسلامی شریعت میں نسخ کے حوالے سے معتزلہ کا موقف

ایک نقطۂ نگاہ معتزلہ کا ہے جو ابو مسلم اصفہانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اسلامی شریعت اور قرآنِ کریم میں نسخ ممکن تو ہے لیکن یہ عملی طور پر ہوا نہیں، قرآنِ کریم کی تمام آیات محکم ہیں۔ اس لئے کسی آیت کو منسوخ نہیں کہا جاسکتا اور جو آیتیں منسوخ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اسلامی شریعت میں عمل اس سے مختلف احکام پر ہو رہا ہے۔ تو وہ بھی درحقیقت منسوخ نہیں ان آیات کی حقیقت یہ ہے کہ ان میں بیان کردہ حکم خاص حالات کیلئے تھا جب حالات بدل گئے تو نیا حکم آگیا، لیکن پہلے حکم کو منسوخ نہیں کیا گیا وہ اپنی جگہ باقی ہے۔ اگر کبھی مسلمان معاشرے میں پھر وہی حالات پیدا ہوجائیں تو پھر ان احکام پر عمل کرنا ہوگا۔

یہ نقطۂ نگاہ نہ صرف کہ غلط ہے بلکہ نہایت خطرناک بھی ہے۔ آج اگر کسی حکومت کے ہاتھ میں یہ اختیار دے دیا جائے تو وہ پوری شریعت کو موم کی ناک بنا کر رکھ دے گی۔ احکام پر عمل کرنا تو ہمیشہ ہی خواہشِ نفس کیلئے گراں ہوتا ہے یہ اسی گرانی کو بہانہ بنا کر بیشتر احکام کو معطل کر کے رکھ دے گی اور یہ کہے گی کہ جب حالات حسبِ حال ہوں گے تو تب ان احکام پر عمل کیا جائے گا۔ ناموافق حالات میں ہمیں اس صورتحال پر عمل کرنا چاہئے جو احکام کے نزول سے پہلے تھی۔ اس کا نتیجہ وہی ہوگا جس طرح ایک شخص نے اہلِ حق کے نام سے مضامین لکھے

Marfat.com

تھے تو اس نے نمازوں کی تعداد کو کم کرتے ہوئے یہ دلیل دی تھی کہ نماز کی ادائیگی کیلئے خشوع وخضوع لازمی ہے اس کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی۔ ظہر کا وقت چونکہ انتہائی کاروباری مصروفیت کا وقت ہے ایسے مصروف وقت میں نماز ادا کرنا خشوع وخضوع کے ساتھ تو کسی طرح ممکن نہیں کیونکہ آدمی ہزار کوشش کرے اس کی تمام تر توجہ اپنی مصروفیت کی طرف ہوگی۔ اس لئے ظہر کی نماز کے فرض ہونے کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اور جہاں تک عصر کی نماز کا تعلق ہے اس میں آدمی تھکا ماندہ گھر کو لوٹتا ہے اور پھر یہی وقت حصول تفریح کیلئے کلب جانے کا ہوتا ہے۔ اس طرح کی مصروفیات میں بھی خشوع خضوع کا حصول ناممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عصر کی نماز کے فرض ہونے کی بھی کوئی عقلی وجہ نہیں ہوسکتی۔ باقی تین نمازیں رہ جاتی ہیں یہی تینوں خشوع خضوع کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہیں۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ نمازیں درحقیقت تین ہیں پانچ نہیں۔ قرآنِ کریم سے بھی یہی ثابت ہوتی ہیں لوگوں نے نہ جانے پانچ نمازیں کہاں سے نکال لیں۔

اندازہ فرمایئے! اس طرح کے دلائل سے کون سا حکم ترمیم کا شکار نہیں کیا جاسکتا۔ درحقیقت اس طرح کے لوگوں کے دماغ میں یہ تصور بیٹھا ہوا ہے کہ نسخ شائد کوئی عیب ہے جو قرآن کریم میں نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اللہ کی کتاب ہر طرح کے عیب سے پاک ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح دنیا کے قانون ساز ایک قانون بناتے ہیں بعد میں جب انہیں غلطی کا احساس ہوتا ہے تو بعض احکام کو ختم کرتے ہیں بعض کا اضافہ کرتے ہیں یا حالات کے بدلنے کے باعث محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب قوانین میں تبدیلی ہونا چاہئے کیونکہ قانون بنانے والے نہیں جانتے تھے کہ آئندہ چل کر حالات بدل جائیں گے اور قانون کے عمل درآمد میں دشواریاں ہوں گی۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآنِ کریم میں بھی نسخ ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور آنے والے دنوں میں حالات کیا صورت حال اختیار کریں گے، پروردگار کو اس بارے میں کوئی خبر نہیں ہوتی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ احکام انسانی زندگی کی تربیت اور انسانی زندگی کی آسانی کیلئے ہیں اور یہ تقریباً ایسے ہی ہے جیسے ایک حاذق حکیم اپنے مریض کیلئے نسخہ لکھتا ہے۔ پہلے وہ چند دنوں تک ایک دوا استعمال کرواتا ہے اور پھر چند دنوں کے بعد پہلی دوا کو ختم کرکے دوسرا نسخہ تجویز کرتا ہے۔ لیکن یہ نیا نسخہ تجویز کرنا اس لئے نہیں کہ پہلا غلط تھا بلکہ اس لئے ہے کہ پہلے نسخے سے جو کام لینا تھا وہ لے لیا گیا اس نسخے کی افادیت اتمام کو پہنچ گئی، اب باقی مرض کے علاج کیلئے نیا نسخہ درکار ہے اور حکیم کو پہلے سے معلوم تھا کہ چند دنوں کے بعد مریض کیلئے نیا نسخہ لکھنا ہوگا۔ چنانچہ جب وہ وقت آتا ہے تو وہ مریض کیلئے نیا نسخہ تجویز کرتا ہے۔ پروردگار نے بھی قرآنِ کریم میں بعض عبوری احکام دیئے اور جب وقت آگیا کہ اب ایک مستقل قانون دیا جائے تو عبوری احکام کو منسوخ کردیا گیا اور مستقل قانون عطا کردیا گیا کیونکہ جب عبوری احکام دیئے جارہے تھے تو اس وقت مسلمان معاشرے کی حالت ایسی نہ تھی کہ اس کو ایک مستقل قانون دیا جاتا۔

مثلاً وراثت کے احکام سے پہلے وصیت کا حکم دیا گیا اور اس میں یہ حق دیا گیا کہ وصیت لکھنے والا اپنی مرضی سے قرابت داروں کے حصے کا تعین کرے۔ لیکن بعد میں قانونِ وراثت نے اس حکم کو منسوخ کردیا۔ اسی طرح یہ حکم دیا گیا کہ اگر مسلمان عورت پر چار گواہوں کی گواہی سے بدکاری کا جرم ثابت ہوجائے تو اسے گھر میں بند کردو اور موت آنے تک اسے گھر سے باہر نہ نکلنے دو۔ لیکن جب حدِ زنا کا قانون آگیا تو اس نے اس حکم کو منسوخ کردیا۔ جب پہلا حکم نازل کیا گیا تھا تو اس وقت مسلمان معاشرے کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ مستقل قانون کا بوجھ اٹھا سکتا، اس وقت تک مسلمان اور غیر مسلم ملے جلے رہتے تھے اور یہود کا بھی آزادانہ آنا جانا تھا۔ ایسی صورت میں منکرات سے پرہیز کرنے کیلئے وہ مضبوط تربیت فراہم نہ کی جاسکتی تھی، جس سے معاشرے میں پاکیزگی پیدا ہوتی اور دوسری یہ بات کہ اگر گناہ کا فریق ثانی کوئی غیر مسلم ہوتا تو ابھی مسلمانوں کی حکومت اتنی مستحکم نہ ہوئی تھی کہ اسے بھی سزا دے سکتی۔ اس لئے ضروری تھا کہ جب تک اسلامی حکومت مستحکم نہ ہوجائے اور مسلمان معاشرہ غیر مسلموں کی آلودگی سے پاک نہ ہوجائے اس وقت تک مستقل قانون نہ دیا جائے۔

Marfat.com

قرونِ اولیٰ میں نسخ کا مفہوم

دوسرا نقطہ نگاہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا ہے۔ان کے نزدیک نسخ کا ایک وسیع مفہوم ہے وہ ہر طرح کی تبدیلی کو نسخ قرار دیتے تھے۔مثلاً پہلے اگر کوئی حکم عام ہے بعد میں کوئی آیت اتری جس نے اس میں خصوصیت پیدا کر دی یا پہلے ایک حکم مجمل نازل ہوا اس کے بعد اس کی تفصیل نازل ہوگئی یا کہیں کسی مطلق کو مقید کر دیا گیا یا کہیں استثنا پیدا کر دیا گیا۔تو سلف صالحین اس طرح کی تبدیلیوں کو بھی نسخ قرار دے دیتے تھے حالانکہ ایسے مواقع پر عام اور خاص، مجمل اور مفصل، مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ اور مطلق اور مقید میں توفیق پیدا کی جاسکتی تھی۔لیکن متقدمین ایسی کوئی سی کوشش کے بھی روادار نہ تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متقدمین کے نزدیک منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو تک پہنچ گئی۔

متاخرین کا نقطۂ نگاہ

تیسرا نقطہ نگاہ متاخرین کا ہے۔ان کے نزدیک نسخ صرف اس تبدیلی کا نام ہے جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہوسکے۔چنانچہ متاخرین نے جب اس طرح کی کوشش کی تو منسوخ آیات کی تعداد بہت کم ہوگئی۔متاخرین میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ علیہ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا۔ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے۔جن میں کوئی تطبیق بغیر توجیہ بعید کے ممکن نہیں۔یہی نقطۂ نگاہ، جمہور کا نقطۂ نگاہ ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔اب رہی یہ بات وہ منسوخ آیات کون سی ہیں۔تو یہ بحث اصول فقہ سے تعلق رکھتی ہے، ہماری مختصر گفتگو میں اس کیلئے گنجائش مشکل ہے۔

آیت کے آخر میں یہود اور مسلمانوں دونوں سے خطاب کر کے فرمایا جارہا ہے کہ تم ذرا اس بات پر غور کرو کہ کیا اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو شریعت سے نوازتا ہے تو کیا کتابِ شریعت اتارنے کے بعد اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے محروم ہوجاتا ہے کہ اسے ایک دفعہ تو اختیار تھا کہ جیسے چاہے احکام نازل کر دے لیکن اب ان میں کمی بیشی کرنا اس کے اختیارات سے باہر ہے۔اسے اس بات کا ہرگز اختیار نہیں کہ اگر وہ قوم جسے اس نے شریعت دی تھی اس نے بے شک کئی احکام میں ترمیم کر ڈالی ہو، کئی پر تحریف کا آرہ چلایا ہو اور بعض احکام سرے سے غائب کر دیئے ہوں اور مرورِ زمانہ سے انسانی تربیت کے حوالے سے نئی ضرورتیں پیدا ہو چکی ہوں۔لیکن اللہ تعالیٰ کو ہرگز اس بات کا اختیار نہیں کہ وہ نئے شرعی احکام نازل کرے یا پہلے احکام جنہیں لوگ نظر انداز کر چکے یا مٹا چکے ہوں ان کی تجدید کرے۔اللہ فرماتا ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو پھر تو یقیناً نسخ غلط ہے لیکن اگر تم اللہ کو ہر چیز پر قادر جانتے ہو اور اس کی قدرتوں پر تمہیں کامل یقین ہے تو پھر نسخ کے انکار کی کوئی وجہ معقول معلوم نہیں ہوتی۔نسخ یقیناً اللہ کی قدرت سے انکار کے مترادف ہے اور اللہ کی قدرت سے انکار صریحاً کفر ہے، جو کسی ایسے فرد یا قوم سے متوقع نہیں ہوسکتا جو اپنے آپ کو اہلِ کتاب کہے۔

نسخ پر اعتراض کی اصل وجہ

دوسری آیتِ کریمہ میں یہود کی ذہنیت کو کھول کر رکھ دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہود اصل میں نسخ پر جو شور مچارہے ہیں یہ تو محض ایک پردہ ہے اصل میں ان کا روگ اور ہے۔وہ درحقیقت آخری رسول کے آنے، آخری کتاب کے اترنے اور ایک نئی امت کے برپا ہونے سے یہ بات سمجھ گئے ہیں کہ اب صرف تورات کے بعض احکام منسوخ نہیں ہوں گے مسئلہ صرف نسخ احکام کا نہیں بلکہ ہمیں منصبِ امامت سے معزول کیا جارہا ہے۔اور ہماری جگہ ایک دوسری امت کا نصب اور تقرر ہورہا ہے۔ہم صدیوں تک جس عزت اور عظمت سے نوازے گئے ہیں وہ تاج

Marfat.com

ہمارے سروں سے اتارا جارہا ہے اور جن لوگوں کو اُمّیّ کہہ کر ہم تذلیل کرتے رہے ہیں یہ تاج ان کے سروں پر سجایا جارہا ہے۔ پروردگار ان کے اس پوشیدہ روگ کو افشا فرمارہے ہیں اور ہر قرآن کے پڑھنے والے اور ہر اس شخص سے جو اس دعوت کا مخاطب ہے سوال کررہے ہیں کہ تم بتاؤ کیا اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے تاجدار نہیں؟ کیا اس کے سوا آسمانوں اور زمینوں کا کوئی اور حاکم اعلیٰ بھی ہے؟ اگر واقعی اس کی حاکمیت اور تاجوری میں کوئی شریک اور ہمسر نہیں تو پھر وہ اگر احکام اور قوموں کا نسخ کررہا ہے اور یہود کو معزول کرکے امت محمدیہ کو اس پر فائز کررہا ہے تو یہود کو اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ یہود کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ تبدیلی آکر رہے گی اور وہ وقت دور نہیں جب تمہیں اپنے لئے کوئی حمایتی اور کوئی مددگار میسر نہیں آئے گا۔ عرب کی سرزمین تمہارے لئے تنگ ہوجائے گی تم نے جس طرح اللہ کے دین کو اپنی زندگیوں سے نکالا اسی طرح تمہیں بھی تمہارے گھروں اور تمہارے وطن سے نکلنا پڑے گا۔

اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَکُمْ کَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ○ وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِکُمْ کُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ (البقرۃ: ۱۰۸ تا ۱۰۹)

(کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اس طرح کے سوال کرو جس طرح کے سوال اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے اور جو لوگ ایمان کو کفر سے بدل دیں گے وہ شاہراہ سے بھٹک گئے ○ بہت سے اہلِ کتاب یہ چاہتے ہیں کہ وہ تمہارے ایمان کے بعد پھر تمہیں کفر کی حالت میں پلٹا دیں محض اپنے حسد کی وجہ سے، حق کے اچھی طرح واضح ہوجانے کے باوجود تو درگزر کرو اور نظر انداز کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

دلوں اور دماغوں کے مسموم کرنے کیلئے یہود کی مزید شرارتیں اور مسلمانوں کو تنبیہ

پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں بھی یہودیوں کی سازشوں اور شرارتوں کی طرف اشارہ فرما کر کمزور مسلمانوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ تم یہود کے طرزِ عمل کو سمجھنے میں کوتاہی کررہے ہو۔ وہ تمہارے سامنے آکر ایمان و عمل کے حوالے سے ایسی باتیں کررہے ہیں اور ایسے سوالات سجھاتے ہیں جسے تم ان کی خیرخواہی پر محمول کرتے ہو۔ تم یہ حسنِ ظن رکھتے ہو کہ وہ تمہارے ایمان اور دین کے بارے میں بڑے فکر مند ہیں اس لئے تمہیں وہ آکر سمجھاتے ہیں کہ تم اپنے پیغمبر سے یہ سوال کرو وہ سوال کرو اور فلاں فلاں بات کی وضاحت چاہو، تمہیں خوش فہمی یہ ہے کہ ان سوالات کے ذریعے یہود تمہارے ایمان میں پختگی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور تمہارے علم میں اضافے کے خواہش مند ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سوال ہمیشہ مفید نہیں ہوتا۔ اگر تو یہ علمی تحقیق اور ایمان کی سیرابی کیلئے ہو تو یقیناً مفید ہے، لیکن اگر سوالات کے ذریعے شک وارتیاب کی فضا پیدا کرنا اور طبیعت کو یکسو نہ ہونے دینا مقصود ہو اور یہی یہود کا مقصود بھی ہے تو اس سے بڑھ کر خطرناک بات کوئی اور نہیں ہوتی اور پھر مسلمانوں کو یہود کی تاریخ کی طرف توجہ دلائی کہ یہود کی ایمانی اور عملی حالت تمہارے سامنے ہے یہ لوگ اس حال کو اچانک نہیں پہنچے بلکہ تم اگر انہیں تاریخ کے تناظر میں دیکھو تو محسوس کروگے کہ یہ بجائے ایمان کی پختگی کے ایمان میں ہمیشہ اضمحلال کا شکار رہے ہیں اور کامل اطاعت

Marfat.com

کارویہ اختیار کرنے کی بجائے انہوں نے سوالات کے ذریعے ہمیشہ چور دروازے نکالے ہیں جس کے نتیجے میں نہ ان کے اندر ایمان کی قوت پیدا ہوئی اور نہ پیغمبر کی سنت سے وابستگی نصیب ہوئی اور بالآخر تباہی کا شکار ہوگئے ۔ بار بار ان کا ایمان کفر سے ہم آغوش ہوتا رہا، وہ تمہارے لئے بھی یہی چاہتے ہیں کہ بجائے اللہ اور رسول پر پختہ یقین پیدا ہونے کے تمہیں سوالات کی دلدل میں غرق کیا جائے۔

انسانی فطرت یہ ہے کہ جب اس میں یقین کی روشنی پیدا ہوتی ہے تو اس کے لئے اطاعت کی راہیں روشن ہوجاتی ہیں اسے شریعت کی ہر بات آسان اور روشن معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ساری کوشش ہر حکم پر عمل کرنا ہوتی ہے لیکن جب اس میں یقین پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر بات کو شک کے ترازو میں تولتا ہے تو پھر وہ اپنی اس کمزوری کے علاج کی بجائے سوالات کے ذریعے اس کمزوری کیلئے راستہ نکالتا ہے تاکہ اس کی بے یقینی پر پردہ پڑا رہے اور عمل کی مشقت اور صعوبت سے جان بچی رہے۔ بات بات پر سوال کرنا کسی تحقیق یا اطمینان کیلئے نہیں ہوتا بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ بے عملی کیلئے کوئی راستہ نکلے اور شخصیت کا بھرم بھی قائم رہے۔ اس کا خطرناک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عمل کی قوتیں آہستہ آہستہ مفلوج ہوجاتی ہیں، ترجیحات بدل جاتی ہیں اور آدمی ہر وہ کام کرتا ہے جس سے ضمیر جاگنے کی بجائے سویا رہے۔ یہود اسی لعنت میں گرفتار تھے اور مسلمانوں کو بھی وہ اسی مرض میں بتلا کرنا چاہتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ پرانے مسلمانوں کو یہ بیماری لگادی جائے اور نئے مسلمانوں کو یکسو نہ ہونے دیا جائے۔ اس لئے یہاں صاف صاف فرمایا کہ کیا تم بھی یہ چاہتے ہو کہ اسی طرح کے سوالات کرو جس طرح کے سوالات موسیٰ علیہ السلام سے کیے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے جو سوالات کئے تھے ان میں بنیادی طور پر موسیٰ علیہ السلام پر بے اطمینانی کا اظہار ہوتا۔ کبھی وہ یہ کہتے کہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تورات واقعی اللہ کا کلام ہے اور اس نے اسے آپ پر اتارا ہے اور کبھی اصرار کرتے کہ جب تک ہم اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں اس وقت تک ہم آپ پر ایمان نہیں لاسکتے۔ مسلمانوں کو بھی وہ اسی طرح کی باتیں سجھاتے تھے کہ تورات موسیٰ علیہ السلام پر یکبارگی نازل ہوئی تھی تم اپنے پیغمبر سے پوچھو قرآن ان پر ایک ہی دفعہ نازل کیوں نہیں ہوا؟ اور جس طرح تورات تختیوں پر کندہ کرکے دی گئی تھی اسی طرح قرآن لکھ کر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟ مسلمانوں سے یہ کہا جارہا ہے کہ دین کی اصل روح سمع و اطاعت، یقین، اللہ کی خشیت اور تقویٰ ہے اور اس طرح کے سوالات ان میں سے کسی چیز کو باقی نہیں رہنے دیتے۔ اس لئے یہ یاد رکھو یہ سوالات ایمان کو کفر سے بدلنے کی ایک کوشش ہے تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ نے تمہیں جو ایمان کی دولت بخشی ہے اسے کفر میں تبدیل کردو؟ اگر ایسا ہوا تو یوں سمجھو کہ سواء السبیل تم نے ہاتھوں سے کھودی اور تم صراط مستقیم سے محروم ہوگئے۔ آنحضرت ﷺ کی نگاہ میں یہ بات اس قدر اہم ہے کہ آپ نے ایک موقعہ پر تاکید کے انداز میں ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا اَهْلَکَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ کَثْرَتُ مَسَائِلِهِمْ وَاِخْتِلَافِهِم عَلٰی اَنْبِيَائِهِم

(تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کردیا ہے سوالات کی کثرت نے اور اپنے نبیوں سے اختلاف نے)

سوالات کی کثرت جیسا کہ پہلے عرض کیا قوت عمل کو مفلوج کردیتی ہے اور یقین اور یمان سے محروم کردیتی ہے۔ اور نبیوں سے اختلاف نہ صرف عملی آمادگی پیدا ہونے نہیں دیتا بلکہ صالح تہذیب و تمدن کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ ایمان و عمل کی یکسوئی نصیب کرتا ہے وہ کبھی سوالات کے بکھیڑے میں نہیں پڑتا۔ وہ صرف یہ جاننے کی خواہش رکھتا ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام کیا ہیں؟ اس کے بعد اس کی ساری توجہ اطاعت اور عمل پر ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک غیر مسلم مسلمان ہوئے تو انہیں اسلام کی تعلیم دیتے ہوئے بتایا گیا کہ یہ چیز فرض ہے یہ واجب ہے، یہ سنت ہے، یہ مستحب ہے تاکہ انہیں احکام میں ترتیب کا اندازہ ہوجائے تو انہوں نے اپنے استاد کو روک کر کہا کہ آپ

Marfat.com

یہ فرمایئے کہ ان سب باتوں پر عمل کرنا ہے انہوں نے کہا ہاں! تو وہ صاحب کہنے لگے کہ بس میرے لئے یہ بات کافی ہے۔ مجھے اس کی تفصیل جاننے کی ضرورت نہیں۔ جب یہ سب باتیں کرنے کی ہیں تو میں سب پر عمل کروں گا پھر جب ان کو بتایا گیا کہ یہ نواہی ہیں یعنی ان سے رکنا ہے۔ ساتھ ہی تفصیل بھی بتائی گئی کہ یہ حرام ہے، یہ مکروہ ہے وغیرہ تو انہوں نے پھر وہی بات کہی کہ اس کا مطلب ہے کہ مجھے ان سب سے بچنا ہے تو بس میں ان سب سے پرہیز کروں گا۔ مجھے تفصیل کی کوئی ضرورت نہیں درحقیقت یہ وہ روح ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے اور بے جا سوالات کی عادت یہ وہ چیز ہے جو اس روح کی قاتل ہے۔

یہود کی شرارتوں پر برہمی کی بجائے عفو وصفح کی ہدایت

اگلی آیتِ کریمہ میں یہود کی ذہنیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہود میں سے بیشتر لوگ ایسے ہیں جن کی خواہش یہ ہے کہ وہ کسی طرح تمہیں دوبارہ کافر بنا دیں اور اس خواہش کو پورا کرنے کیلئے وہ بہروپ بدل بدل کر تمہارے پاس آتے ہیں اور تم اپنی سادگی سے انہیں اپنا ہمدرد سمجھتے ہو تمہیں نہیں معلوم کہ ان کے دلوں میں تمہارے خلاف حسد کی آگ جل رہی ہے یہی وہ آگ ہے جس نے ان کے دلوں کی صلاحیت کو جلا کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ اسلام کی کسی بات کو صحیح تناظر میں سننے اور قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ انہیں اپنا کفر اس حد تک عزیز ہے کہ وہ تمہیں بھی کافر بنانے کیلئے رات دن کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے تم ان کا اصل چہرہ پہچاننے کی کوشش کرو۔ اس طرح سے قرآنِ کریم نے ان کے چہروں سے نقاب نوچ کر پھینک دیئے اور مسلمانوں کے سامنے ان کا اصل چہرہ ننگا کر دیا۔ لیکن اس سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ مسلمان برہمی میں کہیں ان سے الجھ نہ پڑیں، جب کہ حالات ابھی اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے کیونکہ ایک ساتھ مختلف محاذ کھول دینا قرینِ مصلحت نہیں ہوتا۔ اس لئے جذبات پر قابو پانے کیلئے حکم دیا فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔ عفو کا معنی ”دل سے معاف کر دینا“ بھی ہوتا ہے اور ”نظر انداز کر دینا“ بھی۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے۔ قرآن کریم نے دونوں معنوں میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے اور صفح کا معنی ”چشم پوشی کرنا“ بھی ہے اور ”نظر انداز کرنا“ بھی۔ یہاں معلوم ہوتا ہے چشم پوشی کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور نظر انداز کرنا بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ عرب شاعر بھی اسی معنی میں اس کو استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ایک حماسی شاعر کا شعر ہے

صفحنا عن بنی ذهلٍ و قلنا القوم اخوانٌ

ہم نے بنی ذہل سے چشم پوشی کی اور ہم نے کہا یہ لوگ اپنے ہی بھائی ہیں

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہود جو کچھ کر رہے ہیں وہ تم دیکھ رہے ہو اور جو ان کے دلی ارادے ہیں ان کو ہم نے واضح کر دیا ہے۔ لیکن ابھی ان سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی ان کے کرتوتوں کو نظر انداز کرو اور چشم پوشی سے کام لو۔ وہ بظاہر تم سے خیر خواہی کا اظہار کریں تو تم ان کا شکریہ ادا کر دو۔ لیکن دل میں اس بات کا یقین رکھو کہ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔ وہ وقت دور نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں تمہیں مزید ہدایات اور احکامات دے جس سے ان کے فتنے کا علاج ہو سکے۔ جس وقت یہ آیت اتری ہے اس وقت اس بات کا سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہود کی تباہی کے دن قریب آ رہے ہیں لیکن آیت کے اس ٹکڑے نے آنے والے دنوں کی خبر دے دی کہ عنقریب اسلام ترقی کرے گا اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ اتنی طاقت دے گا کہ پھر اللہ کے حکم سے کسی قبیلے کو مدینے سے نکالیں گے، کسی پر جزیہ عائد کریں گے اور کسی

Marfat.com

قبیلے کو ان کے جرائم کی پاداش میں تہ تیغ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ بنو قینقاع اور بنو نضیر کو مدینہ سے نکال دیا گیا پھر ان پر جزیہ عائد کر دیا گیا اور بنو قریظہ کو جنگِ خندق کے دوران شدید قسم کی عہد شکنی کے جرم میں تورات کے فیصلے کے مطابق تہ تیغ کر دیا گیا۔ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہو رہی تھی تو حالات کی اس کروٹ کا کسی کو تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حالات کچھ بھی ہوں اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ بے کسوں کو طاقت ور بنا دیتا ہے اور طاقت ور شر پسندوں کو ہلاکت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

(اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو نیکی بھی تم اپنے لئے کرو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے) (البقرۃ: ۱۱۰)

معرکہ سر پر ہے، تیاری کرو

مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ یہود کے تمام تر برے ارادوں کے باوجود تمہیں ابھی ان کو برداشت کرنا ہے۔ ان سے معرکہ جلد ہونے والا ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ تم اس کیلئے تیاری کرو۔ تیاری دو طرح کی ہوگی، ایک تیاری تو یہ ہے کہ تم اپنا تعلق اللہ سے مضبوط کرو۔ تمہارا تعلق جتنا اللہ سے مضبوط ہوتا جائے گا تمہاری شخصیت اتنی مضبوط ہوتی جائے گی۔ تمہارے اندر یقین کی قوت ایک طرف تو تمہیں ہر طرح کے خوف سے بے نیاز کر دے گی اور دوسری طرف مخالفین کی وسوسہ اندازیاں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ تم روحانی اور اخلاقی لحاظ سے روز بروز بہتر ہوتے چلے جاؤ گے۔ اللہ سے مضبوط تعلق کے باعث تمہارے دل و دماغ میں ہر وقت اللہ کی ذات و صفات کا تصور مستحضر رہے گا۔ جس کی وجہ سے کسی قوت کے سامنے جھکنا کسی گناہ کی طرف ہاتھ بڑھانا کسی پر ظلم کرنا تمہارے لئے مشکل ہو جائے گا۔ تمہارے دل و دماغ کی اس طرح تطہیر ہوگی کہ کوئی برا ارادہ جنم نہیں لے سکے گا اور کوئی غلط خیال جگہ نہیں بنا سکے گا۔ اللہ سے تعلق کی وجہ سے تمہاری باہمی شیرازہ بندی پختہ سے پختہ تر ہوتی جائے گی۔ مسلمانوں کو اس تعلق کی یکسانی ایک لڑی میں پرو دے گی۔ جس میں ہم خیالی بھی ہوگی، ہم رنگی بھی اور ہم دلی بھی ہوگی۔

دوسری تیاری یہ کرنی ہے کہ باطل کی تمام قوتیں تمہیں مٹا دینے کا فیصلہ کر چکی ہیں۔ ایک اجتماعی کشمکش تمہاری طرف بڑھ رہی ہے اس میں جہاں مضبوط عقیدے اور پاکیزہ اخلاق کی ضرورت ہے، وہیں جنگ کی تیاری کیلئے اسباب کی فراہمی بھی لازمی ہے۔ دشمنوں نے اگرچہ تمہارے لئے کمائی کے پیشتر مواقع بند کر دیئے ہیں لیکن جو کچھ بھی تمہارے خوشحال لوگوں کے پاس ہے اسے اسلامی قوت کیلئے فراہم کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ اس لئے زکوٰۃ اور انفاق کے ذریعے ایک طرف تو مسلمانوں کی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کرو اور دوسری طرف آلاتِ جنگ اور سامانِ جنگ کی تیاری میں اسے صرف کرو کیونکہ بڑے سے بڑا مومن بھی تلوار اور گھوڑے کے بغیر بالعموم جنگ نہیں کر سکتا۔ تم پیٹ پر پتھر باندھ کر چند دنوں تک جی سکتے ہو لیکن بغیر آلاتِ جنگ کے دشمن کا سامنا نہیں کر سکتے۔ اس لئے نماز کے ذریعے ایک مومنِ کامل تیار ہوگا اور زکوٰۃ کے ذریعے جہاد کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔

Marfat.com

مسلمان چونکہ ایسے حالات سے گزر رہے ہیں جس میں مالی دشواریاں بے پناہ ہیں۔اللہ کے راستے میں زکوٰۃ اور انفاق آسان نہیں۔اس لئے ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ تم جو کچھ بھی اللہ کے راستے میں خرچ کروگے اس کا اجر وثواب اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے۔اللہ کے ہاں اجر وثواب کی موجودگی میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔مسلمانوں کو تو ہمیشہ اللہ نے دنیا میں بھی اس کا صلہ دیا ہے۔خلافتِ راشدہ کی تاریخ دیکھ لیجئے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان بے مایہ لوگوں کو زمین کے بڑے حصے پر حکومت عطا فرمائی اور زمین کے خزانے ان کیلئے کھول دیئے۔ مزید آیت کے آخر میں یہ بھی فرمایا کہ مسلمانو تم جن حالات سے گزر رہے ہو اور ان ناموافق حالات میں تم جو کچھ کر رہے ہو اس کی ایک ایک چیز ہماری نگاہوں میں ہے۔تمہارا کوئی عمل ہم سے مخفی نہیں اور دشمنوں کی کسی سازش سے بھی ہم بے خبر نہیں۔وہ اپنے انجام سے دوچار ہوں گے اور تم اپنے درخشاں مستقبل سے نوازے جاؤ گے۔

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○

(اہلِ کتاب نے کہا! ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا مگر وہ شخص جو یہودی ہو یا عیسائی یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔فرما دیجئے! (اے پیغمبر!) اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو) (البقرۃ: ۱۱۱)

راہِ نجات کیا ہے؟

سابقہ آیات میں یہود و نصاریٰ کی شرارتوں سازشوں اور گستاخیوں کا ذکر فرما کر مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا تاکہ وہ ان کی شرارتوں کے اثراتِ بد سے محفوظ رہ سکیں۔پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں مسلمانوں کو ان کی مزید ایک شرارت سے متنبہ کیا گیا ہے جس کا تعلق انسانی نجات سے ہے۔جس شخص کا تعلق بھی مذہب سے ہے اس کے لیے سب سے بنیادی بات جو ازبس اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا میں کامیابی اور آخرت میں نجات کا راستہ کیا ہے؟ ہر مذہب نے انسانوں کو اس راستے کی دعوت دی ہے۔یہود و نصاریٰ مسلمانوں اور دوسرے لوگوں سے یہ کہتے تھے کہ تم نئے آنے والے نبی کے پاس اس لیے جاتے ہو کہ وہ تمہیں نجات کا راستہ بتائیں حالانکہ اس سے پہلے یہودیت اور نصرانیت یہ راستہ کھول چکی ہیں اور اسلام ان دونوں کی صداقت کو تسلیم کرتا ہے۔یہود اپنے آپ کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں اور عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور قرآنِ کریم ان دونوں نبیوں اور ان پر نازل ہونے والی تورات اور انجیل کی صداقت کی تصدیق کرتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ جس طرح اپنے نبیوں اور اپنی کتابوں کی صداقت کے علم بردار ہیں، اسی طرح نبی آخر الزمان ﷺ اور قرآنِ کریم ان کے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔اس سے از خود یہ بات واضح جاتی ہے کہ نبیوں اور کتابوں کا اصل فریضہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے راہِ نجات واضح کریں اور یہودیت اور عیسائیت یہ کام پہلے سے کرتے چلے آرہے ہیں اور اسلام بھی اسے تسلیم کرتا ہے۔تو پھر آخر ایک نئی نبوت اور نئی کتاب کی ضرورت کیا ہے؟ یہ تو بلاوجہ ایک فتنہ پیدا کرنے کی کوشش ہے جبکہ اس کے بغیر ضرورت پوری ہو رہی ہے۔یہ وہ بات ہے جو یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کر رہے تھے کہ تمہیں اگر نجات مطلوب ہے تو اس کے لئے تم یہودیت کا راستہ کا اختیار کرو یا عیسائیت کا تم نجات پا جاؤ گے۔اسلام کے چکر میں پڑ کر بلاوجہ نہ اپنے لئے مشکل پیدا کرو اور نہ دوسروں کیلئے۔

Marfat.com

قرآنِ کریم نے اس کا جواب دیتے ہوئے سب سے پہلے ان کے مذہب کی حقیقت کو اجاگر کیا کہ مذہب دنیا میں انسانی اصلاح کیلئے آتا ہے، جس میں عقیدہ، اخلاق، معاشرت، معاملات اور آداب تک ہر چیز کی اصلاح کی جاتی ہے اور پوری زندگی کو اس راستے پر ڈال دیا جاتا ہے، جس سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ یہ محض چند آرزوؤں یا خواہشوں کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ ایک ضابطۂ حیات اور دستور العمل ہوتا ہے۔ جس کے مطابق فکری زندگی کی تعمیر ہوتی ہے اور زندگی کا پورا تانا بانا اسی کی ہدایت کے مطابق بُنا جاتا ہے۔ انسان آزادی سے اپنی خواہشات کے مطابق زندگی نہیں گزارتا بلکہ اس کی زندگی ان اصولوں اور ان آداب کی پابندی میں گزرتی ہے جو مذہب پیش کرتا ہے۔ لیکن یہود و نصاریٰ نے اپنے مذہب کو چند خوبصورت تصورات، چند خواہشات اور چند رسم و رواج کا نام دے رکھا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم زندگی گزارنے کیلئے اللہ کی طرف سے کسی عطا کردہ قانون کے پابند نہیں بلکہ ہم آزاد مخلوق ہیں جو چاہیں سو کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ہماری نجات کیلئے یہ بات کافی ہے کہ ہم اپنا انتساب یہودیت کی طرف رکھتے ہیں یا عیسائیت کی طرف۔ جنت ہمارے ہی لئے پیدا کی گئی ہے۔ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں اس لئے آخرت میں کسی طرح کی ناکامی کا ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ اس طرح سے انہوں نے اپنے مذہب کو خوبصورت آرزوؤں کا نام دے کر مذہب کی آزادیوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے: یہ امانی اور یہ آرزوئیں یہ تمہارا مذہب ہیں۔ جس میں نہ کوئی فکری تطہیر کا سامان ہے اور نہ عملی پابندیوں کا۔ اس کے بعد ان سے سوال فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک مذہب صرف خواہشات کا نام ہے کہ جس میں تمہیں کوئی عمل کیے بغیر جنت مل سکتی ہے، تو پھر یہ کوئی ایسی بات تو نہیں جسے خود سے اختیار کر لیا جائے۔ جنت اللہ کی ہے وہ محض چند خواہشات کے سہارے زندگی گزارنے والوں کو تو عطا نہیں کرے گا اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تم اپنے دعوے میں سچے ہو، تو پھر تمہارے پاس جو اللہ کی کتابیں ہیں ان میں سے کوئی دلیل پیش کرو جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ نجات کیلئے صرف یہودی یا عیسائی ہونا کافی ہے ایمان و عمل کی صعوبت اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس سوال کے جواب میں یہود و نصاریٰ کو سانپ سونگھ گیا وہ اس کا کیا جواب دے سکتے تھے چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں پروردگار نے خود اس کا جواب ارشاد فرمایا:

بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

”کیوں نہیں! جس نے سپرد کر دیا اپنی ذات کو، اللہ کے اور وہ محسن بھی ہو، تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے، نہ انہیں کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ (البقرۃ:۱۱۲)

”بلیٰ“ اپنے ماسبق کی نفی و تردید کیلئے ہوتا ہے۔ یعنی نجات یہودی یا نصرانی ہونے میں نہیں بلکہ نجات کا اصل اور صحیح اصول یہ ہے کہ نجات دو باتوں پر منحصر ہے۔ ۱: اسلام، ۲: احسان۔

اصولِ نجات

۱۔ اسلام کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کر دے۔ فکری طور پر بھی اور عملی طور پر بھی۔ اس کے اعتقادات کی بنیاد صرف اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی ہدایات ہوں اور اس کے عمل کا دارومدار اس کی نازل کردہ شریعت پر ہو۔ وہ ہر اس بات کو صحیح سمجھے جسے اللہ کی کتاب اور اس کا نبی صحیح قرار دے اور ہر اس بات کو باطل سمجھے جسے وحی الٰہی باطل قرار دے۔ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں کو برحق

Marfat.com

جانے۔ وہ کسی نبی کی محبت میں غلو کی وجہ سے دوسرے نبی کا انکار نہ کرے۔ وہ ہر نبی کو سچا سمجھے لیکن عمل اس شریعت پر کرے جو اس کی زندگی میں نئے نبی پر نازل ہو۔ وہ چونکہ اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کر چکا ہے، اس لئے اس کا اصل مطلوب اور مقصود اللہ کی ذات ٹھہرے۔

۲۔ دوسری چیز احسان ہے۔ احسان کا معنی ہے اللہ کے احکام کی تعمیل حسبِ استطاعت بہتر سے بہتر انداز میں کرنے کی کوشش کرنا۔ یعنی جو شخص اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کرنے کے باعث اس کے ہر حکم کو تسلیم کرتا ہے، تو اس کا محض تسلیم کرنا کافی نہیں بلکہ نجات کیلئے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ وہ ان احکام پر بہتر سے بہتر انداز میں نہائت اخلاص کے ساتھ اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس کو زندہ رکھتے ہوئے عمل کرنے کی کوشش کرے۔ جس شخص میں یہ دو صفات جمع ہو جائیں گی یعنی وہ ایمان و عمل میں پختہ ہو جائے گا اسے کسی گروہی انتساب کی ضرورت نہیں، یہی دو صفات اس کی نجات کی ضامن ہیں کیونکہ ان دونوں صفات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی گروہی تعصبات سے آزاد ہو جاتا ہے اور ہر طرح کی آلودگیاں اس کے دل و دماغ سے نکل جاتی ہیں۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ کا نبی سمجھتا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ کا نبی جانتا ہے اور وہ بجا طور پر دونوں کا احترام کرتا ہے، لیکن نجات کو ان میں منحصر نہیں سمجھتا۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ان کے بعد اللہ نے نبی آخرالزمان کو آخری کتاب اور آخری شریعت دے کر مبعوث فرمایا ہے، تو اب اس کے عمل کا دارومدار تمام سابقہ انبیاء پر ایمان کے ساتھ ساتھ نبی آخرالزمان پر ایمان اور ان کی شریعت پر ہوگا کیونکہ سابقہ انبیاء کے زمانے میں منشائے ایزدی یہ تھا کہ ان کی لائی ہوئی شریعتوں پر عمل کیا جائے۔ لیکن جب آخری رسول تشریف لے آئے اور آخری شریعت آ گئی تو اب ان پر ایمان لانا اور قیامت تک ان کی شریعت پر عمل کرنا نجات کیلئے لازمی ٹھہرا۔ یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے، جو قیامت تک آنے والے انسانوں کیلئے نسخۂ شفا ہے اور اسی کے نتیجے میں ان کو وہ زندگی ملے گی جو ہر طرح کے خوف اور حزن سے پاک ہوگی۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ جنت کی تعبیر ہے

خوف کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے اور حزن کا تعلق ماضی کے واقعات سے۔ دنیا میں یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ایک آدمی مستقبل میں خوف سے محفوظ ہو جائے اور ماضی کے واقعات پر اسے کبھی حزن و غم نہ ہو۔ اللہ کے نبی بھی آنے والے دنوں میں ناگوار حوادث سے محفوظ نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک کو اولاد کی خوشیاں بھی دیں اور پھر بیٹوں کی موت کا صدمہ بھی دیا جس کی وجہ سے حضور اشکبار بھی ہوئے۔ البتہ! ان میں اور ان کے راستوں پر چلنے والوں میں طرّہ امتیاز یہ ہے کہ غم و الم کا شکار تو وہ بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ اللہ سے شکایت کبھی نہیں کرتے۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں لیکن دل ہمیشہ اللہ کے فیصلوں پر مطمئن رہتا ہے۔ اس لئے جب قرآنِ کریم اس طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے کہ ان کے لئے نہ تو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے، تو اس سے دو باتیں مراد ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دنیا میں ان کو حوادث سے سابقہ پیش آ سکتا ہے، لیکن یہ حوادث ان کی حوصلہ مندیوں کے لئے چیلنج نہیں بن سکتے۔ ان کے اعتماد اور توکل میں کبھی کمی نہیں آتی۔ ان کے دل ہمیشہ اللہ سے مطمئن اور شاداں اور فرحاں رہتے ہیں اور دوسری بات یہ مراد ہوتی ہے کہ اللہ ان کو آخرت میں جنت جیسی نعمت عطا فرمائے گا جس کی بنیادی شناخت یہ ہے کہ جو شخص جنت میں جائے گا اسے کبھی حزن و غم سے واسطہ نہیں پڑے گا کیونکہ حزن و غم اور پریشانیاں جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گی، اس لحاظ سے یہ تعبیر جنت کا متبادل ہے۔ جب اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایسا اجر عطا فرمائے گا، جس کی وجہ سے نہ انہیں کوئی خوف ہوگا نہ حزن۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت عطا فرمائے گا۔

Marfat.com

اگلی آیت کریمہ میں یہود و نصاریٰ کے فکری، قولی اور عملی تضاد کو واضح کیا جا رہا ہے۔ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جنت میں داخلے کیلئے یہودی یا نصرانی ہونا ضروری ہے یعنی دونوں ایک دوسرے کیلئے اس حد تک روادار ہیں کہ یہودی نصرانی کو جنتی قرار دے رہا ہے اور نصرانی یہودی کو اور دونوں ہی تورات پر عمل کے داعی بھی ہیں۔لیکن اصل حقیقت کیا ہے؟

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّ
قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ
الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ
يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَ
مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ
وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ
اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۬ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ
اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ
بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ
فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ
اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ

Marfat.com

قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ
بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ
تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ
اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ
الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ
بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

رکوع ۱۴۔ (اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں درآنحالیکہ وہ سب (ایک ہی) کتاب آسمانی پڑھتے ہیں۔اسی طرح وہ لوگ بھی کہنے لگے انہیں سا قول جو (کچھ بھی) علم نہیں رکھتے۔سو اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس باب کا فیصلہ کردے گا جس میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں۔اوراس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روک دے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے۔یہ لوگ اس لائق ہی نہیں کہ ان میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے o ان کیلئے دنیا میں (بھی بڑی) رسوائی ہے اور آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے o اور اللہ ہی کا ہے مشرق (بھی) اور مغرب (بھی) سو تم جدھر کو بھی منہ پھیرو اللہ ہی کی ذات ہے۔اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے۔اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایک بیٹا بنالیا ہے۔پاک ہے وہ بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے o سب اس کے فرماں بردار ہیں وہ موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اور جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرلیتا ہے تو بس اتنا ہی اس سے کہتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتا ہے۔اور کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی عظیم نشانی کیوں نہیں آجاتی؟ اسی طرح کہہ چکے وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے۔انہیں کا سا کہنا،ان کے قلوب متشابہ ہوگئے ہم نے اپنی نشانیاں تو کھول کر بیان کی ہیں ان لوگوں کیلئے جو یقین رکھتے ہیں۔ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے،خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور آپ سے اہلِ دوزخ کی بابت سوال نہیں کیا جائے گا اور ہرگز خوش نہیں ہوں گے آپ سے یہود اور نصاریٰ جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں۔آپ کہہ دیجئے! کہ بے شک اللہ کی ہدایت وہی ہدایت ہے،اگر آپ پیروی کرنے لگیں ان کی خواہشات کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا تو آپ کیلئے اللہ کی گرفت کے مقابلے میں نہ کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔جن لوگوں کو ہم

Marfat.com

نے کتاب دی ہے وہ اسے اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اسے پڑھنے کا حق ہے وہ لوگ اس پر ایمان لے آئیں گے اور جو کوئی اس سے کفر اختیار کرے گا تو یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں) (آیت ۱۱۳ تا ۱۲۱)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

(اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں درآنحالیکہ وہ سب (ایک ہی) کتاب آسمانی پڑھتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی کہنے لگے انہیں سا قول جو (کچھ بھی) علم نہیں رکھتے۔ سو اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس باب کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں) (البقرۃ: ۱۱۳)

یہود و نصاریٰ کے باہمی تعلقات کی حقیقت

اصل حقیقت یہ ہے کہ یہود نصاریٰ کو شرعی حوالے سے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں اور نصاریٰ یہود کے بارے میں ایسا ہی احساس رکھتے ہیں دونوں ایک دوسرے کے نزدیک صرف گمراہ ہی نہیں بلکہ کافر ہیں۔ یہود تو نصاریٰ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے باعث مرتد اور کافر قرار دیتے تھے خود اگرچہ مختلف قسم کے شرک میں مبتلا تھے، لیکن عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کو صریحاً کفر سمجھتے تھے اور جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے، وہ بھی یہود کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ شریعتِ موسوی سے متعلق موجودہ انجیلوں میں تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے۔

''آدمی شریعت کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے سے راست باز ٹھہرتا ہے۔'' (گلتیون ۲:۱۶)

''شریعت کے اعمال سے کوئی بشر راست باز نہ ٹھہرے گا۔'' (ایضاً ۲:۱۷)

''راست بازی اگر شریعت کے وسیلہ سے ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا'' (ایضاً ۲:۲۰)

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اصطلاحِ انجیل میں مطلق شریعت سے مراد شریعتِ موسوی ہی ہوتی ہے۔ اس لئے اوپر حوالوں میں جو شریعت کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد شریعتِ موسوی ہے۔ وھم یتلون الکتٰب سے ان کے تضاد کو مزید واضح کیا گیا ہے۔ یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ دونوں کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، یعنی مجموعہ صحائفِ بنی اسرائیل جس کو آج عہد نامۂ عتیق کہتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ دونوں ان صحیفوں کے الہامی اور مقدس ہونے کے قائل ہیں اور انہیں پڑھتے اور ان سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اندازہ کیجئے کہ دونوں ایک دوسرے کی تکفیر اور تفسیق کرتے ہیں۔ اگر ان دونوں کا ایک دوسرے کو کافر ٹھہرانا صحیح ہے، تو پھر دونوں کا ایک دوسرے کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا مذہب قبول کرنے سے جنت میں داخلہ ہو جائے گا، کہاں تک صحیح ہے اور اگر واقعی یہودی یا نصرانی ہونے سے جنت کا استحقاق ثابت ہوتا ہے، تو پھر دونوں ایک دوسرے کو کافر کیوں قرار دیتے ہیں؟ یقیناً اس کے پیچھے کوئی اور جذبہ کام کر رہا ہے۔ لیکن اس کا ذکر کرنے سے پہلے مزید ایک حیران کن بات دیکھ لیجئے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو کافر ٹھہراتے ہیں اور صرف اپنے آپ کو برحق سمجھتے ہیں، یہی حال ان لوگوں کا بھی ہے جو شریعت و نبوت کے حوالے سے کچھ نہیں جانتے، مراد اس سے مشرکین عرب

Marfat.com

ہیں۔وہ بھی یہود ونصاریٰ کے بارے میں یہی سمجھتے اور کہتے تھے کہ ان کا دین میں کوئی حصہ نہیں ہے، وہ سراسر گمراہ لوگ ہیں۔ یہود ونصاریٰ بھی ان کے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں اہلِ کتاب نے ان کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیا، ان کے اسی تضاد اور مسلمانوں سے دشمنی کو واضح کرنے کیلئے پروردگار نے ایک جگہ ارشاد فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ○

(کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہیں جبت پر اور طاغوت پر اور کہتے ہیں ان لوگوں کیلئے جنہوں نے کفر کیا (مشرکینِ عرب) کہ یہ مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں)

مسلمانوں سے دشمنی نے ان کو متحد کر رکھا ہے

اب پوری صورتحال کو از سرِ نو ایک دفعہ دیکھ لیجئے کہ یہود ونصاریٰ ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ جنت میں جانے کیلئے یہودی یا نصرانی ہونا ضروری ہے۔اسی طرح یہ مشرکینِ عرب کو کافر قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی انہیں مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ بھی سمجھتے ہیں اس کھلے تضاد کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہے، وہ صرف اسلام اور مسلمان دشمنی کا ہے۔اس دشمنی کے جذبے نے ان کے درمیان ایک اتحاد پیدا کر دیا ہے ان کی آپس کی دشمنی مسلمانوں سے دشمنی کے سامنے دب کر رہ گئی ہے اور وہ دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ حقیقت اور صداقت صرف ہمارے درمیان دائر ہے، اسلام اور مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام سراسر گمراہی کا نام ہے اور مسلمان بالاتفاق گمراہ ہیں، ہماری آپس کی دشمنی پر نہ جایئے، ہم مسلمانوں کے مقابلے میں بالکل متحد اور یک رائے ہیں۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا: فَاللّٰهُ یَحْکُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ "سو اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس باب میں فیصلہ کر دے گا جس میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کا آپس میں اختلاف اور پھر مشرکینِ عرب اور ان کا آپس میں اختلاف، دنیا میں اس کے فیصلے کی ایک ہی شکل تھی کہ یہ لوگ نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لاتے اور اس طرح ان کے تمام اعتقادی اور عملی اختلافات کا حل انہیں مل جاتا کیونکہ جب بھی امتیں اختلافات کا شکار ہوئی ہیں تو نئی نبوت اور نئی شریعت نے ان کے درمیان فیصلہ کیا آخری نبی ﷺ کی تشریف آوری سے تمام دنیا کے اختلافات کے ختم ہونے کی سبیل پیدا ہوئی، لیکن یہود ونصاریٰ نے چونکہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اس لئے اب دنیا میں تو ان کے اختلافات کے حل ہونے کی کوئی صورت نہیں صرف ایک صورت ہے کہ یہ لوگ قیامت کا انتظار کریں۔قیامت کے دن اللہ تعالیٰ محسوس طور پر ان حقائق کو کھول کر رکھ دے گا جنہیں آج تسلیم کرنا انہیں مشکل ہو رہا ہے۔لیکن وہ فیصلہ ایسا ہوگا جس سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ اس فیصلے کی روشنی میں انہیں تلافی مافات کی مہلت نہیں ملے گی بلکہ اس کے نتیجے میں یہ ہمیشہ کی سزا کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

ہم اس سے پہلے بھی پڑھ چکے ہیں کہ یہود اہلِ کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا ایک تعلیمی نظام بھی رکھتے تھے ان میں بڑے بڑے علماء موجود تھے۔ان کے مدارس، مدراس کے نام سے قائم تھے اور اپنی قوم کی تعلیمی اور مذہبی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ان کے اس علم کا تمام اہلِ عرب پر ایک رعب تھا، چنانچہ مشرکینِ عرب اپنا ہم مذہب نہ جانتے ہوئے بھی ان کے علم سے مرعوب رہتے تھے اور جب بھی کوئی مذہبی بحث چھڑتی تو وہ عموماً انہیں کی طرف رجوع کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہ یہود علماء و مشائخ نے اپنے تورع، تقویٰ اور تقدس کا ایسا

Marfat.com

بھرم قائم کر رکھا تھا کہ خواہی نہ خواہی ان کی مخالفت کو ایک اہمیت دی جاتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری پر بھی عرب انہیں کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ مذہب کو جاننے والے اور اللہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ اس لئے اگر یہ اس نئے نبی کو مان لیتے ہیں تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے اور اگر یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نبی سچا نبی نہیں ورنہ یہود کبھی اس سے انکار نہ کرتے۔ چنانچہ اگلی آیاتِ کریمہ میں ان کی بعض بداعمالیوں اور فکری کج رویوں کا ذکر فرما کر ان کا اصل چہرہ دکھایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۞ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۞

(اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روک دے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے۔ یہ لوگ اس لائق ہی نہیں کہ ان میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے ۞ ان کیلئے دنیا میں (بھی بڑی) رسوائی ہے اور آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے ۞ اور اللہ ہی کا ہے مشرق (بھی) اور مغرب (بھی) سو تم جدھر کو بھی منہ پھیرو اللہ ہی کی ذات ہے۔ اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے) (البقرۃ:۱۱۴تا۱۱۵)

ایک دوسرے کے معابد کی تخریب اور ان میں عبادت سے روکنا

مذہب کے ماننے والے لوگوں میں جب انحراف شروع ہوتا ہے تو بڑی سے بڑی بدعملی کا ارتکاب بھی ان میں غیر متوقع نہیں ہوتا البتہ اللہ کے گھروں کی بربادی اور بے حرمتی اور ان میں اللہ کے ذکر کرنے سے روکنا، یہ بہت کم وقوع پذیر ہوتا ہے۔ لوگ دین کی روح سے بے گانہ ہو جاتے ہیں لیکن دین کے مظاہر سے عموماً جڑے رہتے ہیں۔ لیکن جب کوئی مذہب کا ماننے والا گروہ اللہ کے گھروں کی بے حرمتی کرنے لگے اور ان میں اللہ کا نام لینے سے روکنے لگے تو یہ ایک ایسی بدعملی ہے جس پر ہمیشہ لعنت اور پھٹکار کی جاتی ہے۔ کوئی فرد اس کا ارتکاب کرے تو اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کوئی قوم یہ حرکت کرے تو وہ داستانِ عبرت بن جاتی ہے اور دنیا انہیں سب سے بڑا ظالم گروہ سمجھتی ہے۔ ان آیات میں یہود و نصاریٰ اور اشارۃً مشرکینِ عرب کا اسی مکروہ حرکت کے حوالے سے ذکر کیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں نے اپنی پاکدامنی کی حکایت تو بہت دراز کر رکھی ہے اور کرتوت ان کے یہ ہیں کہ ان میں سے ہر گروہ اللہ کے گھر کی بے حرمتی کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ان میں سے ہر گروہ نے جب بھی اسے موقع ملا اس نے دوسرے گروہ کے عبادت خانوں کو مسمار کیا، بے حرمتی کی اور لوگوں کو اس میں داخل ہونے سے روکا۔ مشرکینِ مکہ نے تو مسلمانوں کیلئے حرمِ کعبہ کو ممنوع قرار دے دیا تھا، حتیٰ کہ حضور جب عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے جوار میں حدیبیہ میں پہنچ گئے تو قریش نے آپ کو حرم کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اسی طرح ٹائٹس رومی کے عہد میں رومی مشرکین نے یہود اہلِ توحید کو بیت المقدس میں اللہ کا ذکر کرنے سے روک دیا تھا۔ یمن کے حکمران ابرہہ نے بیت اللہ کو گرانے کیلئے ساٹھ ہزار انسانی فوج اور ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد ساتھ لے کر حملہ کیا۔ اللہ کی غیرت جوش میں آئی اور اس نے ان میں سے ایک ایک کو چن چن کر جہنم واصل کیا۔ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ابرہہ عیسائی تھا اور افریقہ کی عیسائی حکومت کے ماتحت تھا۔ اس نے

Marfat.com

حملہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ قیصر (عیسائی بادشاہ) کے اشارے سے کیا تھا تاکہ لوگ بیت اللہ کو بھول جائیں اور بیت المقدس کی پوجا کرنے لگیں۔ تاریخ میں بے شمار واقعات کا سراغ ملتا ہے جس میں یہود و نصاریٰ نے ایک دوسرے کے معابد کی بے حرمتی کی اور طاقت ملنے پر انہیں مسمار کر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ تو اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں مسجدوں میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے کیونکہ مسجد تو اللہ کا گھر ہے یہاں تو اللہ سے ڈرتے ہوئے داخل ہونا چاہئے اور جس کے دل میں اللہ کا خوف اور اللہ کے گھر کا احترام نہ ہو اس کے لئے اللہ کے گھر میں کوئی گنجائش نہیں ایسے لوگوں کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں یہود و نصاریٰ کی باہمی مذہبی لڑائیوں کی طرف ایک اور پہلو سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بیت المقدس یہود و نصاریٰ دونوں کا قبلہ ہے۔ لیکن نصاریٰ اس کی مشرقی جانب کو محترم سمجھتے ہیں اور یہود اس کے مقابل میں مغربی جانب کو۔ عیسائیوں کا خیال یہ ہے کہ حضرتِ مریم علیہا السلام بیت المقدس کے مشرقی گوشے میں معتکف ہوئی تھیں، اس لئے وہ ہمارے لئے زیادہ محترم ہے۔ قرآنِ کریم نے سورۃ مریم میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ بیت المقدس میں عبادت کرتے تو مشرقی جانب کو اپنا قبلہ بناتے۔ یہود نے، معلوم ہوتا ہے ان کی مخالفت میں مغربی جانب کو اپنا قبلہ بنالیا۔ چنانچہ بیت المقدس کے اندر یہ لڑائی ہمیشہ جاری رہتی اور جب یہ لوگ سفر میں ہوتے تو وہاں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نہیں بلکہ عیسائی مشرقی جانب اور یہود اس کی مغربی جانب منہ کر کے عبادت کرتے۔ اس طرح سے انہوں نے مشرق اور مغرب کی جہتوں کو قبلہ بناڈالا اور اس پر سالہا سال ان میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مشرق ہو یا مغرب شمال ہو یا جنوب سب اللہ کی مخلوق اور مملوک ہے کسی سمت کو دوسری سمت پر اہمیت حاصل نہیں۔ تم بیت المقدس کو قبلہ بنا کر جس جہت کی طرف بھی رخ کرتے ادھر تم اللہ کو پاتے۔ ہر سمت اور ہر جہت اللہ تعالیٰ کیلئے یکساں ہے۔ وہ سب کا یکساں خالق ہے، حاکم ہے، مالک ہے، کسی خاص سمت میں کوئی بھی خاص تقدیس، کوئی شائبۂ الوہیت، کوئی شانِ حق نمائی موجود نہیں۔ مشرک قوموں میں ایک مشترک گمراہی عموماً موجود رہی ہے کہ وہ اللہ کو مجسم سمجھنے کے باعث کسی جگہ پر اس کو متمکن سمجھتے ہیں۔ اس تمکن کی وجہ سے وہ کسی نہ کسی جہت کو مقدس قرار دے دیتے، مصری، ہندی، رومی، تمام مشرک قوموں نے خدا کو کسی نہ کسی جہت میں فرض کر کے خود اس جہت کو مقدس مانا ہے اور چونکہ سورج دیوتا کا مرتبہ مذاہب شرکیہ میں عموماً اہمیت کا حامل رہا ہے، اس لئے شاہِ خاور کے طفیل میں سمت مشرق ہی عموماً مقدس سمجھی گئی اور دنیا کے اکثر علاقوں میں پجتی رہی۔ معلوم ہوتا ہے سمت پرستی کا شرک اہلِ کتاب میں دوسری مشرک قوموں کی طرف سے آیا اور مسیحی مذہب چونکہ عقائد و عبادات دونوں میں اپنے وقت کے رائج رومی مذہب ہی کا ثنیٰ یا پرتو ہے۔ اس لئے وہ تو کھلم کھلا مشرق پرستی میں مبتلا ہو گیا اور یہود جنہیں اپنی توحید پر ناز تھا وہ بھی تمام تر محفوظ نہ رہ سکے بلکہ ان کے بعض فرقے تو پوری طرح اس کی لپیٹ میں آگئے۔ بعض قوموں نے مشرق کے جوڑ پر مغرب کے تقدس کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ مشرق اگر خطۂ حیات ہونے کے بنا پر مقدس ہے تو مغرب بھی خطۂ موت اور دیارِ ہلاکت ہے۔ شاہ خاور کا طلوع اگر مشرق سے ہوتا ہے، تو روزانہ غروب اور فنا تو مغرب ہی میں ہوتا ہے، تو پھر مغرب کو مقدس کیوں نہ سمجھا جائے۔

قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ سے اس شرک کی جڑ بھی اکھاڑ دی اور یہود و نصاریٰ کا پول بھی کھول دیا اور آگے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حاکمیت کی ہمہ گیری بھی واضح فرمادی۔

Marfat.com

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا لا سُبْحٰنَهٗ ط بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ o
بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ o

(اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایک بیٹا بنالیا ہے۔ پاک ہے وہ بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے o سب اس کے فرماں بردار ہیں وہ موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اور جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرلیتا ہے تو بس اتنا ہی اس سے کہتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتا ہے) (البقرة: ۱۱۶ تا ۱۱۷)

ولد کی تحقیق

''ولـــد'' کا لفظ مذکر مؤنث اور واحد جمع سب کیلئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ سے اولاد کے حوالے سے جو شرک قوموں میں رہا ہے، ان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف چونکہ مذکر مؤنث ہر طرح کی اولاد منسوب کی گئی ہے اس لئے ولد کا لفظ لا کر ان تمام کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق عیسائیوں کی گمراہی

بتانا یہ مقصود ہے کہ اہلِ کتاب جو اپنے آپ کو اللہ کے دین کا وارث اور حاملِ دعوت امت سمجھتے ہیں اور اپنے مقابلے میں کسی کو مذہبی اور علمی طور پر اہمیت دینے کو تیار نہیں ان کے مذہبی علم کا اندازہ کیجئے کہ ایک طرف وہ توحید کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف اللہ کیلئے اولاد تسلیم کرتے ہیں اور اس معاملے میں اس حد تک گر جاتے ہیں کہ جس طرح کے شرک میں مشرکینِ عرب مبتلا ہیں اور جنہیں یہ امی کہہ کر تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسی طرح کے شرک میں یہ بھی مبتلا ہیں۔

مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اہلِ کتاب کے دونوں گروہوں کا حال بھی ان سے بہتر نہیں۔ یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ اس طرح سے یہ تمام گروہ جو مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا چکے ہیں، مذہب کے اعتبار سے نہائت پست سطح پر کھڑے ہیں جبکہ اہلِ کتاب کو خصوصاً اپنی علمیت کا بڑا زعم ہے۔ بعض اہلِ علم نے اِتَّخَذَ وَلَدًا کا ترجمہ کیا ہے ''لے رکھا ہے ایک بیٹا'' یا ''بنا رکھا ہے ایک بیٹا''۔ جس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کا بیٹا تو کوئی نہیں البتہ اس نے اپنے لئے ایک متبنیٰ بنا رکھا ہے۔ تفسیر ماجدی کے مصنف کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی تلمیحات کو پوری طرح سمجھنے کیلئے قرآن کے صدہا مقامات کی طرح یہاں بھی اس کی ضرورت ہے کہ نظر اہلِ باطل کے عقائد وخیالات پر ذرا گہری ہو۔ مسیحیوں کے ہاں ایک زبردست فرقہ **Adoptionists** کے نام سے گزرا ہے۔ ان کے مرکزی عقیدہ کیلئے اصطلاحی لفظ تبنیت یعنی **Adopionism** کا ہے۔ عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح خلقۃً خدا نہیں۔ وہ خدا پیدا نہیں ہوئے، وہ خدا شروع سے بنے بنائے اور آپ سے آپ نہیں ہیں۔ بلکہ اصلاً وخلقۃً وہ انسان ہی تھے۔ البتہ اقنوم ثالث یعنی روح القدس کا فیضان شروع سے ان پر ہونے لگا تھا۔ اس لئے وہ قدوسیت کے ایسے اوجِ کمال پر پہنچ گئے اور روحِ الٰہی ان کے اندر ایسی حلول کرگئی کہ اقنومِ اول یعنی خدائے برتر واعظم نے انہیں اپنا بیٹا قرار دے کر اپنا متبنیٰ بنا کر شریک الوہیت کرلیا اور اب وہ ربوبیت

Marfat.com

، مالکیت وغیرہ جملہ صفاتِ الٰہی میں شریک وسہیم ہیں۔اس عقیدہ کے وجود کی شہادت تاریخ میں ۱۸۵عیسوی میں ملتی ہے۔آٹھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اسے الحادوزندقہ قرار دیا۔بارہویں صدی میں اس نے پھر زور پکڑا اور پھر یہ لوگ زندیق قرار پائے۔مسیحیت کے سلسلے میں یہ یاد رہنا چاہیئے کہ مسیحی مذہب میں عقیدہ ابنیت کوئی ثانوی درجہ یا فرعی حیثیت نہیں رکھتا مسیحیت کی روح اور جان یہی عقیدہ ہے۔

اللہ کو بیٹا بنانے کی تردید

سُبْحٰنَہٗ کلمہ تنزیہی ہے۔اس سے اس عقیدہ کی شناعت اور گراوٹ کا اظہار مقصود ہے کہ غضب خدا کا کہ تم ایک طرف تو اللہ کو کائنات کا خالق و مالک مانتے ہو اور پھر ساتھ ہی مخلوقات کے ساتھ اس کی رشتہ داریاں بھی بنا لیں۔کہاں اللہ کی بزرگ و برتر ذات اور کہاں محتاج فانی اور بے بس مخلوق۔ان دونوں کا آخر آپس میں کیا جوڑ۔اس طرح کے عقائد اختیار کرنا یقیناً اللہ کریم کی کھلی توہین ہے۔

مزید فرمایا کُلٌّ لَّہٗ قَانِتُوْنَ ''سب اس کے فرماں بردار بندے ہیں'' مخلوقات میں کوئی چھوٹا ہو یا بڑا اللہ کے ساتھ ایک ہی رشتہ ہے وہ ہے غلامی اور فرمانبرداری کا۔کوئی مخلوق ایسی نہیں جو جبلت کے اعتبار سے یا اپنے ارادے سے اللہ کی تکوینی محکومی اور فرمانبرداری سے بے نیاز ہو۔کوئی انسان چاہے اللہ کو ماننے سے بھی انکار کردے لیکن وہ تکوینی طور پر اس کی فرمانبرداری سے انکار نہیں کرسکتا۔کیونکہ انسان اور باقی تمام مخلوقات بھی اپنے مخلوق ہونے کے حصار میں پوری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔کسی مخلوق کی یہ مجال نہیں کہ اللہ کے بنائے ہوئے چوبیس گھنٹوں میں کوئی گھنٹہ،کوئی منٹ،کوئی لمحہ اپنے لئے پیدا کرسکے۔بڑے سے بڑے ماہرینِ سائنس بھی اس بات پر قادر نہیں کہ اللہ نے زمان ومکان کی جو حدیں مقرر کردی ہیں ان سے قدم باہر نکال سکیں۔کون ایسا ہے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی فضائے کائنات سے باہر ایک گز،ایک فٹ یا ایک انچ جگہ بھی اپنے لئے تلاش کرسکے؟کس کے بس میں ہے کہ اللہ کے پیدا کردہ قانونِ حرارت،برودت اور رطوبت سے بے نیاز رہ سکے اور اس کے باندھے ہوئے قانونِ کششِ اجسام سے بغاوت کرسکے۔بڑے سے بڑے موجد،بڑے سے بڑے صناع کا کمال بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس نے نظامِ تکوینی کے ضابطوں اور قاعدوں کی مزاج شناسی میں کمال پیدا کرلیا ہے ورنہ مسبب الاسباب کے حضور میں وہ بالکل دوسروں کی طرح فرمانبردار بندے ہیں۔

بدیع کا مفہوم

اس کے بعد کی آیتِ کریمہ میں شرک کی مذمت اور اللہ کی توحید کی وضاحت کے سلسلہ میں مزید فرمایا کہ تم اللہ کیلئے بیٹے بناتے ہو۔بیٹا تو اسے چاہیئے جسے اپنی احتیاجات میں مدد کی ضرورت ہو۔جو اپنے بڑھاپے میں ایک لاٹھی کی ضرورت کا احساس رکھتا ہو جو اپنے پیچھے اپنے نام کو زندہ رکھنے کیلئے کسی کو پیچھے چھوڑ جانا چاہتا ہو اللہ تعالیٰ کو ان چیزوں میں سے کسی چیز کی حاجت نہیں۔اس کی قدرت کی بے پناہی کا حال تو یہ ہے کہ وہ صرف زمین وآسمان کا خالق ہی نہیں بلکہ بدیع ہے۔ بدیع یہاں مُبدِع کے معنی میں ہے۔یعنی وہ ایسی ذات ہے جو ہر چیز کو عدم سے وجود میں لاتی ہے اور پھر یہ عدم سے وجود میں لانا اس طرح نہیں کہ پہلے سے مادہ موجود تھا اس کی مثالیں موجود تھیں اللہ تعالیٰ نے اسی طرح ایک نئی چیز تخلیق فرمادی۔نہیں!ایسا نہیں،وہ زمین وآسمان اور باقی مخلوقات کو اس طرح وجود میں لایا ہے کہ نہ پہلے کوئی مادہ موجود تھا نہ کوئی مثال یا نمونہ۔اسے کائنات کو وجود میں لانے کیلئے نہ کسی آلے کی حاجت پڑی نہ کسی مال مسالے کی۔پھر اپنی تخلیقات میں نہ وہ کسی مقام ومکان کا پابند ہے نہ زمان ووقت سے مقید۔نہ کسی نمونہ کا محتاج وہ صناع ہے کاریگر نہیں۔

Marfat.com

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی صفتِ خلق اور صفتِ ایجاد میں وحدہٗ لاشریک اور بے مثال ہے، اسی طرح وہ اپنی مخلوق پر پوری طرح قدرت اور حکومت بھی رکھتا ہے وہ صاحبِ ارادہ، ذی حیات اور صاحبِ اقتدار خدا ہے۔ وہ یونان کے فلسفیوں اور بعض مشرکوں کے خدا کی طرح ایک بے جان مسلوب الارادہ، علت العلل یا آخری سبب نہیں۔ اس کی قدرت کی ہمہ گیری کا عالم تو یہ ہے کہ وہ جس چیز کو کُن کہتا ہے وہ ہو جاتی ہے۔ کُن کہنے سے یہ مراد نہیں کہ وہ یہ دو حرف بولتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ارادے کو بروئے کار آنے میں کسی اور چیز کی احتیاج نہیں ہوتی۔ یہ تو ایک اندازِ بیان ہے جو بندوں کے فہم کے مطابق اختیار کیا گیا ہے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں جس بات کا پہلے اشارہ کیا گیا ہے اس کی مثال دے کر اسے کھول دیا گیا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ جب لوگ اللہ تعالیٰ کی شریعت اور اس کے دین سے بے نیاز ہو کر اس کے ساتھ مخلوقات کو شریک کرنے لگتے ہیں تو وہ اہلِ کتاب کی طرح چاہے کتاب کے وارث اور علمِ دین کے دعوے دار ہی کیوں نہ ہوں ان کی سطح بھی مشرکینِ عرب سے بلند نہیں ہوتی۔ مشرکینِ عرب علمِ الٰہی اور وحیِ الٰہی کی حقیقت سے بالکل بے خبر تھے۔ وہ نبوت و ہدایت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ شرک کے معاملے میں وہ بھی اسی طرح کی باتیں کرتے تھے جس طرح کی اہلِ کتاب کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک ایک ایسی لعنت ہے جس میں مبتلا لوگ ایک ہی طرح سے سوچنے لگتے ہیں جہالت تو خیر ایک معذوری سمجھی جاتی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس جرم کی وجہ سے اہلِ علم کا علم بھی مسلوب ہو جاتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○

(اور کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی عظیم نشانی کیوں نہیں آجاتی؟ اسی طرح کہہ چکے وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے۔ انہیں کا سا کہنا، ان کے قلوب متشابہ ہو گئے ہم نے اپنی نشانیاں تو کھول کر بیان کی ہیں ان لوگوں کیلئے جو یقین رکھتے ہیں) (البقرۃ: ۱۱۸)

مشرکین کے بعض مطالبات کا جواب

اس آیتِ کریمہ میں لَا یَعْلَمُوْن سے مشرکین مراد ہیں۔ عموماً قرآن کریم نے اس طرح کے الفاظ سے مشرکینِ مکہ یا مشرکینِ عرب کا تذکرہ کیا ہے کیونکہ وہی لوگ تھے جو دین کی بنیادی ضروریات اور بنیادی علم سے بے بہرہ تھے۔ مشرکینِ مکہ میں سے بڑے بڑے لوگ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے جواب میں ایک یہ بات بھی کہتے تھے کہ اے محمد ﷺ! تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ کی تم پر وحی اترتی ہے۔ تم بھی ہماری طرح ایک انسان ہو اگر یہ وحی تم پر اتر سکتی ہے اور اللہ تم سے باتیں کر سکتا ہے تو ہم سے کیوں نہیں کر سکتا۔ ہم دنیوی مال و دولت اور جاہ و منزلت کے اعتبار سے تم سے بڑھ کر ہیں۔ تو پھر اللہ کیلئے ہم سے بات کرنے میں آخر کیا مانع ہے۔ چلئے اگر ہم سے بات نہیں ہو سکتی تو تم ہمارے پاس کوئی ایسی عظیم نشانی یا معجزہ لے کر آؤ جسے دیکھنے کے بعد ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ کبھی وہ کہتے کہ مکہ کی سرزمین جو پہاڑوں سے اٹی پڑی ہے اسے میدانی علاقے میں تبدیل کر دو اس کے میدانوں میں باغات لہلہانے لگیں۔ کبھی وہ حضور سے مطالبہ کرتے کہ پہاڑوں کو سونے کا بنا دو اور اگر یہ سب کچھ نہیں تو اتنا تو ہونا چاہئے کہ تم جب لوگوں کو اللہ کا قرآن سنانے نکلو تو ایک فرشتہ تمہارے ساتھ ہونا چاہئے جو ہٹو بچو

Marfat.com

کہتا ہوا تمہارا راستہ صاف کرے قرآنِ کریم ان کی ایسی ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ باتیں کوئی نئی نہیں اسی طرح کی باتیں اہلِ کتاب کے آباؤ اجداد بھی کرتے رہے۔ انہوں نے بھی کبھی اللہ کو دیکھنے اور کبھی اس سے باتیں کرنے کا مطالبہ کیا کبھی اور طرح طرح کی نشانیاں مانگیں۔ ایسا لگتا ہے کہ شرک اور اللہ کے دین کی نافرمانی انسانی دل و دماغ اور قلبی احساسات کو اس حد تک مفلوج کر دیتی ہے کہ وہ اہلِ علم ہوتے ہوئے بھی اسی طرح کی بے سروپا باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان کے دل ایک طرح کے احساسات کی زمین بن جاتے ہیں۔ ان کے مطالبات ایک طرح کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ شک و ارتیاب کے مریض اور بے یقینی کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے معجزے کو دیکھ کر بھی مزید معجزات کے طالب ہوتے ہیں، انہیں جتنے بھی معجزات دکھائے جائیں وہ ان کے لئے بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ لوگ ایک ایک معجزہ طلب کرتے ہیں حالانکہ ہم نے معجزات اور نشانیاں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں لیکن ان کی طرف سے آئے دن نئے نئے مطالبات کا سبب یہ نہیں کہ انہیں نشانیاں دکھائی نہیں گئیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ یقین و ایمان سے خالی ہیں۔ یہ معجزات دیکھتے ہیں، لیکن ان کا نفس انہیں مزید دیکھنے کیلئے اکساتا ہے اور بڑے سے بڑے معجزے کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا جاتا ہے۔ پیغمبر جن باتوں کی دعوت دیتا ہے، ان کی صداقت اور حقانیت کیلئے تو زمین اور آسمان کا گوشہ گوشہ گواہی دیتا ہے۔ انسان اگر غور کرے تو اس کے چاروں طرف اللہ کی کبریائی، اس کی حاکمیت، اس کی قدرت، اس کی ربوبیت اور خود انسان کی بے بسی اور ہدایت کی احتیاج کے دلائل اور نشانات ہر سو پھیلے ہوئے ہیں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ پیغمبر کی اپنی ذات بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ پیغمبر جس قوم کی طرف آتا ہے وہ اسی قوم کا ایک فرد ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اگرچہ تمام دنیا کی طرف مبعوث ہوئے لیکن سب سے پہلے آپ نے جن لوگوں کو دعوت دی آپ انہیں میں سے ایک فرد یعنی قریشی تھے۔ آپ نے انہیں کے ماحول میں پرورش پائی۔ انہیں کی آپ زبان بولتے تھے۔ آپ کی معلومات کے وسائل وہی تھے جو ان کے تھے۔ آپ کے کردار کی تعمیر میں وہی عوامل اپنا کردار ادا کر رہے تھے، جس سے مکہ کا ایک ایک فرد شناسا تھا۔ لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ آپ ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان جیسے نہیں تھے؟ آپ اپنی سیرت و کردار میں بالکل ان سے الگ تھے۔ پتھروں کے اس ڈھیر میں آپ ہیرے کی مانند چمکتے تھے۔ چالیس سالہ زندگی میں بھی کسی نے آپ میں کوئی عیب یا کمزوری نہیں دیکھی جبکہ مکہ کا ماحول اپنے اندر برائیوں اور جرائم کے سوا کچھ نہیں رکھتا تھا۔ آپ کو الصادق اور الامین کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ بے حیائی کے اس ماحول میں آپ کنواری لڑکیوں سے بڑھ کر حیادار تھے۔ مکہ کے باقی نوجوانوں کی طرح آپ نے کسی کے سامنے کبھی زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا۔ لیکن جیسے ہی آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا آپ کی زبان سے علم کے سوتے پھوٹنے لگے۔ آپ ایک ایسی کتاب پڑھ کر سنانے لگے، جس کی زبان کا شکوہ، جس کے لب و لہجے کی دل آویزی، جس کی معلومات کی گہرائی، جس کے بیان کردہ نظامِ فکر کا اعتدال، جس کے اخبار کی صداقت، جس کے فیصلوں اور حاکمیت کی قطعیت غرضیکہ اس کتاب میں پھیلا ہوا جہانِ معنی ایک ایسا دبستانِ فکر و حکمت اور ایک ایسا قانونِ عدل و احسان ہے کہ جس کی نظیر لانے کیلئے سوچنا بھی انسانی فکر سے ماوراء ہے۔ پھر ایک قدم آگے بڑھ کر جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ امی نبی پہلے دن جن کامیابیوں کی خبر دے رہا تھا، ہر آنے والا دن اس کی تعبیر بن کر آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ جب اس نے دعوت الی اللہ کا آغاز کیا تھا تو سرزمین مکہ جہنم کی طرح دہک اٹھی تھی۔ لیکن جب وہ دنیا سے رخصتِ سفر باندھ رہا تھا تو پورا جزیرۂ عرب جنت بداماں بن چکا تھا۔ وہ گردنیں جو بتوں کے سوا کہیں نہیں جھکتی تھیں، وہ اللہ کے سامنے ایسی جھکیں کہ ہر آستانہ انہوں نے

Marfat.com

اپنے پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ یہ حیرت انگیز انقلاب اور اس داستان کا ایک ایک ورق، کیا اپنے اندر نشانات اور معجزات نہیں رکھتا؟ یقیناً رکھتا ہے۔ لیکن اس کیلئے دل ونگاہ کی پاکیزگی اور یقین وایمان کی دولت چاہیے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے اور دلائل کا حق ادا کر چکنے کے بعد اگلی آیتِ کریمہ میں مخالفین پر اتمام حجت کیا جا رہا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے۔

اِنَّا اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا وَّلَا تُسۡئَلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ ○

(ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور آپ سے اہلِ دوزخ کی بابت سوال نہیں کیا جائے گا) (البقرۃ:۱۱۹)

مخالفین سے کہا جا رہا ہے کہ دنیا کو جس حق کی ضرورت ہے اور جو سچائی انسان کے اندر کی آواز ہے۔ جس پر قائم رہ کر انسان کو دنیوی اور اخروی کامیابی نصیب ہو سکتی ہے اور جس کی روشنی سے جہالت اور کفر کی تاریکیاں دور ہو سکتی ہیں۔ اور جس پر عمل کے نتیجے میں انسان کو آسودگی نصیب ہو سکتی ہے۔ وہ حق دے کر اللہ تعالیٰ نے اے پیغمبر آپ کو بھیج دیا ہے۔ آپ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ اب قیامت تک کیلئے ہدایت آپ کی ذات سے وابستہ ہے۔ آپ پر ایمان اور آپ کی ہدایت پر عمل سے نوعِ انسانی کو فوز وفلاح مل سکتی ہے اور آپ پر ایمان نہ لانے کی صورت میں آپ کو یہ حق ہے کہ آپ انہیں جہنم کے عذاب سے ڈرائیں اور دنیوی ناکامیوں سے متنبہ کریں۔ حق آپ کی زبان سے بول رہا ہے، آپ کا ایک ایک بول اور ایک ایک فیصلہ دنیا کیلئے قانون بھی ہوگا اور نتیجہ خیز بھی۔ کیونکہ آپ کے بعد اب پروردگار کسی کی زبان سے انسانی بھلائی کے فیصلے نہیں کرے گا اور کوئی انسانوں کو تباہی سے بچنے کیلئے کوئی نیا راستہ نہیں بتا سکے گا۔ مخالفین کو آپ کی اس حیثیت کو سمجھنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ان میں سے کچھ لوگ اس راستے پر چلنے سے گریزاں ہیں اور وہ شیطان کے رستے پر چلنے کیلئے اصرار کرتے ہیں، تو پھر اے پیغمبر! آپ کو اس بات پر فکر مند نہیں ہونا چاہیے کہ یہ لوگ ایمان نہ لا کر جہنم کا ایندھن بنیں گے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن آپ سے پوچھا جائے کہ آپ نے شائد ان کو دین کی دعوت دینے میں سستی کی۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ آپ اس کا خیال بھی نہ کیجئے۔ وہ لوگ اپنے اعمال کی پاداش میں پکڑے جائیں گے۔ آپ سے اس بارے میں ہرگز باز پرس نہیں ہوگی۔

وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ مَالَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ○ (البقرۃ:۱۲۰)

(اور ہرگز خوش نہیں ہوں گے آپ سے یہود اور نصاریٰ جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں۔ آپ کہہ دیجئے! کہ بے شک اللہ کی ہدایت وہی ہدایت ہے، اگر آپ پیروی کرنے لگیں ان کی خواہشات کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ چکا تو آپ کیلئے اللہ کی گرفت کے مقابلے میں نہ کوئی دوست ہوگا نہ مددگار)

Marfat.com

اہلِ کتاب کی اصل بیماری کا تجزیہ

اہلِ کتاب اور مشرکین کی سازشوں کو بھی کھول دیا گیا ہے اور ان کے خیالاتِ باطلہ کی دلائل و براہین سے تردید بھی کر دی گئی۔ اب اس آیتِ کریمہ میں اہلِ کتاب کی مذہبی اور قومی سرشت کے بارے میں مسلمانوں کو آگاہی دی جا رہی ہے تاکہ مسلمان مستقبل میں ان کے ساتھ تعلقات بناتے اور معاملات کرتے ہوئے ان حقائق کو سامنے رکھیں اور اپنی قومی اور ملی پالیسیاں ان کی روشنی میں طے کریں۔

اہلِ کتاب کی مذہبی اور قومی سرشت کے بارے میں اس آیتِ کریمہ میں غور کرنے سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ اہلِ کتاب فکری اور عملی جمود میں انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ زوال پذیر قوموں کی طرح ان کے فکری سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ جن باتوں کو وہ اپنا دین قرار دے چکے ہیں اور صدیوں کی بدعملیوں نے انہیں جس راہ پر پختہ کر دیا ہے۔ اس میں وہ کسی ترمیم اور تبدیلی کیلئے تیار نہیں۔ یوں تو ہر قوم کیلئے یہ مشکل مرحلہ ہوتا ہے کہ وہ صدیوں کی جمی ہوئی گرد کو یکلخت کیسے جھاڑ ڈالے اور جن باتوں کو وہ حقائق کا درجہ دے چکی ہے ان کے مقابلے میں نئے حقائق کو کیسے تسلیم کرے۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

لیکن تمام قومیں اس حادثے میں یکساں نہیں ہوتیں۔ اگر سب کا حال ایک جیسا ہوتا تو اللہ کی طرف سے ہدایت کا اترنا اور نبیوں کی کاوشیں بیکار ہوتیں۔ دنیا میں ہر اصلاحی کوشش وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتی۔ ہم بہت ساری قوموں کو دیکھتے ہیں وہ زوال میں ڈوب چکی تھیں لیکن مصلحین کی کوششوں سے ان میں نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ اسلام کے آنے کے بعد دنیا میں تبدیلی اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں بطورِ خاص یہود و نصاریٰ کے بارے میں یہ آگاہی دی گئی ہے کہ ان کا جمود اس حد تک مستحکم ہو چکا ہے کہ تمہاری کاوشیں ان میں تبدیلی کیلئے شاید مؤثر نہ ہو سکیں۔ وہ ایک ایسے مذہبی پندار کا شکار ہیں کہ وہ تم سے اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے جب تک تم ان کے طریقے کو اختیار نہ کر لو۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے پاس کتاب کا علم بھی رکھتے ہیں اور ان میں بڑے بڑے علما بھی موجود ہیں لیکن مشکل یہ آ پڑی ہے کہ ان کے علم اور ان کے دین نے ان کے اندر راست بازی، حقیقت پسندی، اور طلبِ حق کا جذبہ پیدا کرنے کی بجائے قومی برتری کا غلو پیدا کر دیا۔ انہوں نے اپنی بڑائی اور پاکیزگی کیلئے ایسے ایسے عقائد اختیار کر لیے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ان تصورات نے ان کو ایسا برخود غلط بنا دیا ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کو اپنے برابر سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ اسلام چونکہ ان کی کمزوریوں اور خیانتوں کو نمایاں کرتا ہے اور انسانی زندگی کی آسانی کیلئے ایک مکمل نظامِ حیات دیتا ہے جس کے قبول کر لینے کے بعد زندگی میں وہ راحت ملتی ہے جس کیلئے زندگی ہمیشہ تلاش اور جستجو میں رہی ہے اس لئے یہود اور نصاریٰ اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ اسلام اور مسلمانوں کی زندگی ان کے لئے موت کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ مسلمانوں سے تعلقات قائم رکھنے کیلئے یہ لازمی سمجھتے ہیں کہ مسلمان ان کے دین اور ملت کو اختیار کر لیں۔ حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ ہدایت کا سرچشمہ اللہ کی ذات کے سوا کوئی اور نہیں ہے اس لئے ہدایت وہی ہے جو اللہ کی جانب سے آئے۔ کبھی وہ موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے آئی تھی کبھی عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اور اب محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے اسی ہدایت کا نزول ہوا ہے۔ اگر یہ لوگ

Marfat.com

ہدایت کے طالب ہوتے تو یہ آگے بڑھ کر اسلام کا دامن تھامتے لیکن مشکل یہ ہے کہ انہوں نے اپنی خواہشات کو دین کا نام دے دیا ہے اور اس پر اصرار یہ ہے کہ ساری دنیا ان کے ہوائے نفس اور خواہشات کی پیروی کرے۔ حالانکہ اس بات کو وہ بھی جانتے ہیں کہ پیروی ہدایت کی کی جاتی ہے خواہشاتِ نفس کی نہیں۔ جب انہوں نے اپنا دین خواہشاتِ نفس کے تابع کر دیا تو ان کے اس نام نہاد دین کی پیروی کیسے ممکن ہے۔ لیکن وہ اندھے تعصب سے اپنی بات پر قائم اور اپنی ہٹ دھرمی پر مصر ہیں۔ یہ دو تو وہ پہلو ہیں جو اس آیتِ کریمہ میں سرسری سا غور کرنے پر بھی سمجھ میں آتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے یہود و نصاریٰ کی تاریخ کو غور سے پڑھا ہے اور ان کے تعصّبات کی گہرائی کو ناپا ہے وہ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں"

کرے قبول اگر دینِ مصطفیٰ انگریز

سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے ان کے مذہب کو ''اہواء'' کیوں قرار دیا ہے؟ قوموں کی ہوائے نفس عام آدمی کی ہوائے نفس سے بہت خطرناک ہوتی ہے۔ اس سے نسلیں متاثر ہوتیں اور جغرافیے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اخلاقی اقدار کے مفاہیم بدل جاتے ہیں۔ الفاظ کی طلسم آرائی سے ہولناک نتائج برآمد ہونے لگتے ہیں۔ حقوق کی پاس داری کے دعوے دھرے رہ جاتے ہیں اور انسانیت منہ چھپانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال آج کا دور ہے۔ جس میں ایک ملک کا سیکولر صدر کروسیڈی کارروائیاں کرتا ہے لیکن اس کو اخلاقی اقدار اور ریشمی الفاظ کا لبادہ پہناتا ہے۔ جب کوئی قوم اس گراوٹ میں مبتلا ہو جاتی ہے تو پھر اس سے ہدایت قبول کرنے کی توقع کرنا ایک بے کار توقع ہے۔ آنحضرت ﷺ چونکہ اپنے اندر انسانی درد اور نہایت دردمند دل رکھتے تھے اس لئے وہ اپنے بدترین دشمن کیلئے بھی ہدایت کیلئے کوشاں رہتے اور دعائیں کرتے۔ انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی حرکتیں دیکھ کر آپ دل گرفتہ نہ ہوں یہ لوگ اپنے قومی جمود اور قومی تعلّی کے باعث ہدایت قبول کرنے سے محروم ہو گئے ہیں۔ پھر عتاب آمیز انداز میں فرمایا: اگر آپ ان کے مذہب کی پیروی کرنے لگیں جو سراسر خواہشاتِ نفس کا دوسرا نام ہے حالانکہ آپ کے پاس وحی الٰہی کا سرمایہ موجود ہے۔ اور وحی کا نور آپ کا راستہ روشن کر رہا ہے۔ تو یہ ایک ایسی غلطی ہوگی جس سے آپ اللہ کی تائید اور نصرت سے محروم ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ خطاب اگرچہ آنحضرت ﷺ سے ہے لیکن عتاب یہود و نصاریٰ پر ہے کہ تمہیں اپنی گمراہی کی ہولناکی کا اندازہ نہیں تم تو ایک ایسی گمراہ روش اختیار کر چکے ہو کہ اگر ہمارا پیغمبر بھی اس کی طرف مائل ہونے لگے تو وہ بھی ہماری نصرت اور تائید سے محروم ہو جائے۔ اس سے تمہیں اندازہ ہونا چاہئے کہ تمہارے اس رویے کے باعث قیامت کے دن تمہارے ساتھ کیا بیتنے والی ہے۔ البتہ اہلِ کتاب میں سے ایسے لوگ جو ان مذکورہ برائیوں سے محفوظ ہیں ان کے بارے میں امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایمان کی دعوت سے بہرہ ور ہو جائیں۔ ان کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اسے پڑھنے کا حق ہے وہ لوگ اس پر ایمان لے آئیں گے اور جو کوئی اس سے کفر اختیار کرے گا تو یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں) (البقرۃ: ۱۲۱)

Marfat.com

صالحین اہلِ کتاب

اہلِ کتاب کے بارے میں عام پالیسی بیان کرنے کے بعد یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اہلِ کتاب کی غالب اکثریت اگرچہ خیر سے محروم ہو چکی ہے لیکن ان میں ایک محدود اقلیت ایسے لوگوں کی ضرور موجود ہے جن کے دلوں میں ابھی تک ایمان کی روشنی باقی ہے۔ یہ اہلِ کتاب کا اگرچہ ایک مختصر سا گروہ ہے لیکن ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت اللہ نے کتاب انہی کو عطا کی تھی کیونکہ ان کا کتاب کے ساتھ رشتہ ہمیشہ قائم رہا وہ جب اس کی تلاوت کرتے ہیں تو اس طرح کرتے ہیں جیسے اس کا حق ہے۔ وہ اس کتاب کو کتاب میں ڈوب کر پڑھتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ اسے اللہ نے نازل کیا ہے اور اپنے بندوں کو اس کتاب کے ذریعے وہ زندگی گزارنے کا سلیقہ عطا فرمایا ہے جس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ وہ اس میں ترمیم و تحریف کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اس کا پوری طرح احترام بجالاتے اور اس کے احکام کے سامنے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ چنانچہ یہی لوگ ہیں کہ جو کتاب سے صحیح فائدہ اٹھانے کے نتیجے میں ایمان سے بہرہ ور ہوں گے۔ یہی لوگ دنیا اور آخرت میں نوازے جائیں گے اور جو لوگ اس علمِ خداوندی اور کتابِ ہدایت سے کفر کا راستہ اختیار کریں گے وہ دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھائیں گے اور ہمیشہ کی ذلت اور محرومی ان کا مقدر بن جائے گی۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ
مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰٓى
اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ
قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذْ
جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ
اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا
بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ قَالَ

Marfat.com

اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ
مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ
قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَ
اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ
مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ
وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ
عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

رکوع ۱۵۔ (اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم کو بخشیں اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی ○ اور اس روز سے ڈرو جب نہ کوئی کسی کے کام آئے گا اور نہ اس کی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے سفارش نفع پہنچا سکے گی اور نہ انہیں مدد ہی پہنچ سکے گی۔ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند امور میں آزمایا اور انہوں نے وہ انجام دے دیئے ارشاد ہوا کہ میں یقیناً تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، بولے اور میری نسل سے بھی؟ ارشاد ہوا کہ میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا۔ اور یاد کرو! جب کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کیلئے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو اور ابراہیم اور اسمٰعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک رکھو۔ اور یاد کرو! جب کہ ابراہیم نے دعا کی اے رب! اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے باشندوں کو جو ان میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں پھلوں کی روزی عطا فرما۔ فرمایا، جو کفر کریں گے، انہیں بھی کچھ دن بہرہ مند ہونے کی مہلت دوں گا۔ پھر میں ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف دھکیلوں گا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ اور یاد کرو جب کہ ابراہیم اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے

Marfat.com

انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہماری جانب سے قبول فرما، بیشک تو سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہم دونوں کو تو اپنا مسلم (فرمانبردار) بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی امتِ مسلمہ (ایک فرمانبردار امت) اٹھا اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما، بے شک تو توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ اے ہمارے رب! تو ان میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے) (آیت ۱۲۲ تا ۱۲۹)

يٰبَنِيٓ اِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○

(اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم کو بخشیں اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی ○ اور اس روز سے ڈرو جب نہ کوئی کسی کے کام آئے گا اور نہ اس کی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے سفارش نفع پہنچا سکے گی اور نہ انہیں مدد ہی پہنچ سکے گی۔) (البقرۃ:۱۲۲ تا ۱۲۳)

یہ دونوں آیتیں، اس سے پہلے سنتالیس اور اڑتالیس نمبر کے تحت تھوڑے سے فرق کے ساتھ گزر چکی ہیں۔ وہاں ان کی بقدر استعداد وضاحت ہو چکی ہے۔ البتہ! یہاں ایک بات غور طلب ہے کہ بنی اسرائیل کے تذکرے کے آغاز میں جب یہ آیات گزر چکی ہیں تو اب دوبارہ انہیں کیوں لایا گیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے آغاز میں سب سے پہلے بنی اسرائیل کو یاد دلایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کیسے کیسے احسانات کیے تھے حتیٰ کہ تمہیں اس وقت کے اہلِ دنیا پر فضیلت عطا فرمائی تھی۔ ساری دنیا میں تم ہی توحید کے علم بردار اور دعوتِ دین کے امانت دار تھے تمہیں حاملِ دعوت امت کا منصب سونپا گیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی وارننگ دی گئی تھی کہ تمہیں اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے ایک ایسے دن سے بھی واسطہ پڑنے والا ہے جس دن کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔ ذمہ داریوں کی کوتاہی کی صورت میں اگر گرفت ہوئی تو نہ کوئی سفارش چلے گی، نہ معاوضہ قبول کیا جائے گا۔ لیکن تم نے ان ذمہ داریوں کے ساتھ جو سلوک کیا اور اپنے منصب کی جو ناقدری کی اور جس طرح تم نے اپنا ملی چہرہ بگاڑا اور جس طرح تم نے شریعت کا پیراہن تار تار کیا گذشتہ دس رکوعوں میں اس کا مفصل تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ جس سے خوب اندازہ ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل اب اس قابل نہیں رہے کہ اپنے عظیم منصب پر فائز رہ سکیں۔ اب دوبارہ ان آیات کو لا کر پھر یاد دلایا گیا ہے کہ تمہیں اللہ نے ایک عظیم منصب سے نوازا تھا اور ساتھ ہی اس کی باز پرس کے سلسلے میں تمہیں آگاہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن تم نے چند ایسے غلط تصورات اپنا لئے جس نے تمہاری دینی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ تم اپنے منصب کی نزاکتوں کو تو کیا ملحوظ رکھتے تم تو عام بھلے انسانوں کی سطح سے بھی نیچے گر گئے۔ لیکن تمہیں آج تک یہ پندار سہارا دے رہا ہے کہ تم اللہ کے نبیوں کی اولاد بلکہ اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہو۔ دنیا میں کوئی قوم تمہاری ہم سر نہیں ہو سکتی اور آخرت میں تم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ تمہاری اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے ہم تمہارے سامنے تمہاری تاریخ کا وہ باب اول واشگاف کر رہے ہیں جس باب کے نظروں سے اوجھل ہونے کے باعث تم فکری اور عملی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ سے اس کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ
قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝ (البقرة: ۱۲۴)

(اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم کوان کے پروردگار نے چند امور میں آزمایا اورانہوں نے وہ انجام دے دیئے ارشاد ہوا کہ میں یقیناً تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، بولے اور میری نسل سے بھی؟ ارشاد ہوا کہ میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعارف

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انسانی ہدایت کیلئے مقتدیٰ اور امام بنایا گیا۔ انہی سے تاریخ کی دو عظیم قومیں وجود میں آئیں بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل، دونوں کے جد امجد آپ ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو عظیم بیٹے عطا فرمائے، جن میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بڑے تھے۔ انہیں مکہ کی سرزمین میں آباد کیا گیا اور ان کی اولاد بنی اسمٰعیل کہلائی۔ قریش انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔ دوسرے بیٹے حضرتِ اسحٰق علیہ السلام ہیں۔ انہیں اللہ نے حضرت یعقوب علیہ السلام جیسا بیٹا دیا۔ ان کے بارہ بیٹے ہوئے، انہیں کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے کیونکہ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا، جس کا معنی ہے عبداللہ۔ بنی اسرائیل کا معنی ہے "اسرائیل یعنی عبداللہ کی اولاد"۔ مزید تفصیل سے پہلے ہم چاہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعارف کرا دیا جائے۔ یہ نام پہلی بار قرآن کریم میں آیا ہے۔ قرآن کے مخاطب اول اہلِ عرب تھے جو شخصیتیں ان کے لئے معلوم و معروف تھیں، قرآن ان کے نام ان کے سامنے بے تکلف بغیر کسی تعارف کے لے آتا ہے اور پھر ابراہیم تو وہ بزرگ تھے جن سے مشرکینِ عرب کے ساتھ ساتھ یہود و نصاریٰ بھی خوب واقف تھے۔ ان کا تعارف اور بھی غیر ضروری تھا۔ ابراہیم علیہ السلام وہی ہیں جو اسلامی عقیدہ کے علاوہ یہودی اور نصرانی عقیدہ میں بھی ایک بڑے جلیل القدر پیغمبر ہو گزرے ہیں۔ تورات میں آپ کا نام ابرام اور ابراہم دونوں طرح سے آیا ہے تورات کی روایت ہے کہ آپ کے اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس پشتوں کا فرق ہے یعنی آپ ان کی گیارہویں پشت میں تھے لیکن خود تورات ہی کے شارحین کا خیال بعض قوی قرائن کی بنا پر یہ ہے کہ تورات میں نسب نامہ کی کچھ پشتیں چھوٹ گئی ہیں۔ سالِ ولادت سر چارلس مارسٹن محقق اثریات کی جدید ترین تحقیق کے مطابق 2160 ق م ہے اور عمر شریف تورات میں ۱۷۵ سال درج ہے۔ سالِ وفات اسی حساب سے 1985 ق م ٹھہرتا ہے۔ والد کا نام تارح تھا یا عربی تلفظ میں آزر تھا۔ آزر نام کا تلفظ قدیم زبانوں میں کئی طرح سے آیا ہے۔ مسلمانوں کیلئے قرآنی لفظ آزر کافی ہے۔ وطن آبائی ملک بابل کا کلدانیہ (انگریزی تلفظ میں کالڈیہ) تھا۔ جدید جغرافیہ میں اسی کو ملک عراق کہتے ہیں۔ جس شہر میں آپ کی ولادت ہوئی اسی کا نام تورات میں (Ur) آیا ہے۔ مدتوں یہ شہر نقشہ سے غائب رہا۔ اب از سر نو نمودار ہو گیا ہے کھدائی کے کام کی داغ بیل 1894ء ہی میں پڑ گئی تھی۔ 1922ء میں برطانیہ اور امریکہ کے ماہرین اثریات کی ایک مشترک تحقیقی مہم برٹش میوزیم اور پنسلونیا یونیورسٹی کے زیر اہتمام عراق کو روانہ ہوئی اور کھدائی کا کام پورے سات سال تک جاری رہا۔ رفتہ رفتہ پورا شہر نمودار ہو گیا اور عراق گورنمنٹ کے محکمہ آثارِ قدیمہ نے عجائب خانہ کے حکم میں لا کر ان کھنڈروں کو محفوظ کر دیا۔ یہ شہر خلیج فارس کے دہانہ فرات اور عراق کے پایۂ تخت بغداد کے تقریباً درمیانی مسافت پر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی

Marfat.com

اور نبوت چونکہ مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصرانیوں کو بھی مسلّم ہے اس لئے ان قوموں کے علما نے بھی آپ کے حالات کی تحقیق و جستجو میں کوئی درجہ کاوش کا اٹھا نہیں رکھا ہے۔ موجودہ محرّف بائبل میں تاریخی غلطیوں کی کثرت سے اکتا کر بعض روشن خیال محققین نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابراہیم نامی کوئی تاریخی شخصیت گزری ہی نہیں یہ محض ایک نوعی نام تھا یا ہر شیخ قبیلہ کا لقب۔ لیکن اب پھر تحقیق کا رخ بدلا اور بیسویں صدی کے ربع اول کے ختم ہوتے ہوتے پھر آپ کی تاریخی شخصیت کا پوری طرح قائل ہو جانا پڑا۔ نسلِ اسرائیل اور نسلِ اسمٰعیل دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک مدتوں سے چلی آ رہی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں سلسلوں کے مورثِ اعلیٰ تھے اللہ کی نعمتِ خاص الخاص یعنی توحید کی علمبرداری اب نسلِ اسرائیل سے اس کی مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں چھن کر ایک اسمٰعیلی پیغمبر کے واسطہ سے اب ساری دنیا کیلئے عام ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ابراہیمی شخصیت اور ان کے ضمن میں اسمٰعیلی شخصیت کی مرکزیت اور اہمیت سے دنیا کو روشناس کر دیا جائے چنانچہ یہاں یہی ہو رہا ہے۔ (ماخوذ از تفسیر ماجدی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک تو یہ تعارف ہے جو تاریخ نے ہمارے سپرد کیا ہے اور دوسرا تعارف وہ ہے جو قرآن کریم کراتا ہے۔ قریش اور بنی اسرائیل دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اولاد ہونے کا تعلق رکھتے ہیں اور دونوں کو اس بات پر اصرار ہے کہ ہم چونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں اور اللہ نے ابراہیم کو تمام دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کیا تھا اور آپ کی اولاد ہی میں ہزاروں سال تک نبوت چلی اس لئے کوئی قوم دنیا میں ہماری ہمسر نہیں ہو سکتی۔ زندگی میں ہم چاہے کیسے ہی کرتوت کریں ہماری نسلی شرافت جس طرح دنیا میں ہمارے لئے عزت کا باعث ہے اسی طرح آخرت میں بھی ہماری نجات کا ذریعہ ہے اور پھر بنی اسرائیل اس نسلی شرافت و کرامت کے نشے میں اس حد تک مخمور ہیں کہ وہ بنی اسمٰعیل کو بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہی نہیں بلکہ ان کی امامت کے وارث بھی ہیں۔ اللہ نے بنی اسرائیل ہی میں انبیاء پیدا کیے کتابیں اتاریں اور انہیں حاملِ دعوت امت ہونے کا شرف عطا کر کے ساری دنیا پر فضیلت دے دی۔ اس لئے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہماری ہمسری کا دعویٰ کرے اور نہ یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ ہمارے خاندان کے سوا کسی اور خاندان میں نبوت آ سکے۔ قرآنِ کریم حضرت ابراہیم کی نسل کی ان دونوں شاخوں کی ہدایت اور اصلاح کیلئے حضرت ابراہیم کا وہ تعارف پیش کرتا ہے، جس کا تعلق نسل اور نسب سے نہیں بلکہ اُس حقیقت سے ہے جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی امامت پر فائز کیا گیا تھا۔

ابتلاء کا مقصد

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی جا رہی ہے کہ ابراہیم ہمارے نبی تھے، لیکن ان کو دنیا کی امامت و قیادت کے منصب پر فائز کرنے سے پہلے ان تمام آزمائشوں میں ڈالا گیا، جن آزمائشوں میں سے گزرنا اس منصب کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے۔ اگر کسی کو بغیر کسی آزمائش میں پورا اترے اور بغیر چند صفات کو اپنے اندر پیدا کیے امامت و قیادت مل سکتی، تو اس کے سب سے زیادہ مستحق حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے کیونکہ وہ اللہ کے نبی تھے اور اللہ نے اس کارِ خاص کیلئے ان کو منتخب فرمایا تھا۔ لیکن یہ اللہ کی سنت ہے جو کبھی نہیں بدلے گی کہ وہ جب کسی فرد یا قوم کے سپرد دنیا کی ہدایت کا کام کرتا ہے تو اسے سب سے پہلے ان آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے، جس سے اس کے اندر اللہ کی اطاعت، اللہ کا خوف، اللہ پر بھروسہ، دنیا سے بے التفاتی، آخرت میں کامیابی کی حرص اور بے خوف و خطر خلقِ خدا

Marfat.com

کی اصلاح جیسی صفات پیدا ہوتی ہوں۔ آزمائشوں میں مبتلا کرنا اذیت رسانی یا دکھ میں مبتلا کرنے کیلئے نہیں ہوتا بلکہ اس سے مقصود وہ صلاحیتیں پیدا کرنا اور انہیں نشو ونما دینا ہوتا ہے جو اللہ نے بندوں کے اندر ودیعت فرمائی ہیں، یہ آزمائشیں کبھی نرم ہوتی ہیں کبھی سخت، کبھی سرد ہوتی ہیں کبھی گرم، کبھی حوصلہ افزا ہوتی ہیں کبھی ہمت آزما، ہر طرح کے حالات میں مبتلا کر کے اس کارِ عظیم کیلئے تیار کرنا مقصود ہوتا ہے جسے بندوں کی ہدایت یا انسانوں کی امامت وقیادت کہا جاتا ہے۔

کلمات سے کیا مراد ہے؟

''ابتلٰی''، فعل ماضی ہے۔ اس کا مصدر ہے'' ابتلاء ''۔ اس کا معنی'' جانچنا، پرکھنا، آزمانا اور امتحان کرنا'' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امتحان کرنے اور آزمانے کیلئے مختلف قسم کی آزمائشوں میں مبتلا کیا وہ آزمائشیں کیا تھیں۔ ان کیلئے کلمات کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو کلمہ کی جمع ہے اس کے معنی'' لفظ کے یا بات'' کے ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں مراد اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عزیمت اور استقامت کو آزمایا۔ سب سے پہلے انہیں اپنے اہلِ خانہ اور اپنے والد کو توحید کی دعوت دینے کا حکم ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اور ان کے والد ملک کے امیر کبیر آدمی ہی نہیں تھے بلکہ اثر واقتدار میں بہت بڑی حیثیت کے مالک تھے۔ عراق کے سب سے بڑے بت خانے کے پروہت تھے۔ جس طرح ہندوستان میں راجہ کے بعد پروہت ہی کا مقام سمجھا جاتا ہے اور یہ دونوں باہمی ملی بھگت سے اقتدار کے مزے لوٹتے ہیں۔ یہی حال عراق میں بھی تھا۔ آپ چونکہ اکلوتے تھے اس لئے جانتے تھے کہ باپ کے مرنے کے بعد یہ ساری دولت وقیادت میرے حصے میں آئے گی اور باپ کو ناراض کرنے کی صورت میں دنیا میرے قدموں کے نیچے سے کھینچ لی جائے گی۔ لیکن آپ نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی بے دریغ اپنے والد اور اپنے خاندان کو توحید کی دعوت دی اور شرک کی مذمت کرتے ہوئے انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا، انہیں گھر سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد آپ کو عام لوگوں اور حکومت کو توحید کی دعوت دینے کا حکم دیا گیا چنانچہ آپ نے عمومی دعوت کے ساتھ ساتھ ایک دن موقع پا کر اپنی قوم کے بت کدے میں اذان بلند کی اور ان کے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ چنانچہ انہیں دینِ آبائی کی توہین کے جرم میں آگ میں ڈالنے کا فیصلہ ہوا۔ ایک بہت بڑا آگ کا الاؤ جلایا گیا جسے دیکھ کر ہی پتہ پانی ہوتا تھا آپ بے خطر اس الاؤ میں کود گئے اور اللہ نے آپ کی اس عزیمت اور استقامت کو دیکھتے ہوئے آپ کے لئے آگ کو گلزار بنا دیا پھر بادشاہ کے سامنے آپ کو پیش ہونا پڑا اور اس نے اپنے اقتدار اور حکومت کے جبر اور رعب سے آپ کو دینِ حق سے پھیرنا چاہا مگر بجائے اس کے کہ مرعوب ہوتے آپ نے حجتِ ابراہیمی سے اس کو مبہوت کر کے رکھ دیا۔ اقتدار جب دلیل کی جنگ ہار گیا اور آپ کے حوصلوں کو شکست دینے میں کامیاب نہ ہو سکا تو وطن چھوڑنے کا حکم دیا۔ اللہ کی جانب سے بھی ہجرت کا حکم آ گیا۔ چنانچہ آپ سالوں تک مختلف ملکوں میں اللہ کی توحید اور دین کی دعوت لے کر مارے مارے پھرتے رہے۔ آج فلسطین میں ہیں تو کل شرق اردن میں، آج بابل میں ہیں تو کل مصر میں، نہ جانے کہاں کہاں آپ نے اللہ کی دین کی خاطر غربت کی صعوبتیں اٹھائیں اسی حق امانت کی ادائیگی ہی میں عمر چوراسی سال کو پہنچ گئی کہ اللہ نے بیٹا عطا فرمایا۔ بڑھاپے کی اولاد اور وہ بھی اکلوتی کسے پیاری نہیں ہوتی۔ حضرت اسمٰعیل آپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن گئے۔ لیکن ابھی بچے نے دودھ نہیں چھوڑا تھا کہ اللہ کی طرف سے حکم آ گیا کہ ماں اور بیٹے کو صحرائے عرب میں اللہ کے گھر کے پڑوس میں چھوڑ آؤ جہاں کل کو اللہ کا گھر آباد ہونے والا تھا۔ لیکن وہاں گھاس کی پتی تک نہیں اگتی تھی۔ کہیں کہیں خانہ بدوشوں کے سوا کوئی

Marfat.com

انسانی آبادی نہیں تھی آپ بلاتامل ماں بیٹے کو ساتھ لے کر اس دشتِ غربت میں پہنچے اور معمولی سا سامانِ خورد ونوش ان کے حوالے کر کے واپس لوٹ گئے ۔ اللہ اپنے بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا بچے نے پیاس سے جب ایڑیاں رگڑیں تو اللہ نے وہیں سے پانی کا چشمہ جاری فرمادیا جسے دستِ ہاجرہ نے جلدی جلدی منڈیر بنا کر بہنے سے روک دیا اور وہ گہرا ہوتے ہوتے کنواں بن گیا جسے آج بیرِ زم زم کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ حضرت ہاجرہ پر رحم فرمائے اگر وہ پانی کو بہنے سے نہ روکتیں تو وہ رواں دریا بن جاتا۔ اللہ نے حضرت ہاجرہ اور ان کے صاحبزادے کی گزر بسر کے اور اسباب بھی مہیا فرمادیئے بچہ پروان چڑھنے لگا جب وہ اس قابل ہوگیا کہ اپنے باپ کا ہاتھ بٹا سکے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو ایسی سخت آزمائش میں ڈالا جس کا تصور بھی کپکپادینے کیلئے کافی ہے اور اس پر طرفہ یہ کہ آپ کی اطاعت اور محبت کے امتحان کیلئے صراحتاً حکم نہیں دیا بلکہ خواب دکھایا کہ آپ حضرت اسمٰعیل کو ذبح کررہے ہیں۔

بیٹے کی قربانی کا کٹھن امتحان

پیغمبر کا خواب چونکہ وحی ہوتا ہے اس لئے حضرت ابراہیم سمجھ گئے کہ مجھ سے بیٹے کی قربانی مانگی جارہی ہے۔ اندازہ کیجئے! ایک طرف بڑھاپے کا سہارا، اکلوتا اور محبوب فرزند کہ زندگی بھر کے ارمان اس کی ذات سے وابستہ ہیں اور دوسری طرف اللہ جل جلالہ کا حکم۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان اور اللہ سے بے پناہ محبت دیکھیے کہ آپ نے بے دریغ اس بازی کیلئے آستینیں چڑھالیں اور یہ ثابت کردیا کہ گھر ہو یا وطن، دولت ہو یا اقتدار، بیوی ہو یا فرزند، یہ تعلق اور محبت کے تمام حوالے بہت عزیز ہیں، لیکن اللہ سے تعلق اور اس کی محبت ان سب سے بڑھ کر اور ان سب پر غالب ہے۔ اس کے مقابلے میں ان میں سے کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ تو وہ کڑے اور سخت امتحانات تھے جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گزارا گیا لیکن ان بڑے بڑے امتحانات کے ساتھ ساتھ ایسے بہت سے اعمال واحکام کی پابندیاں بھی آپ پر عائد کی گئیں جن پر عام حالات میں عمل کرنا اور پھر اس پر مداومت اختیار کرنا آسان نہیں ہوتا لیکن آپ نے ان میں سے ہر ایک پر بتمام وکمال عمل کر کے دکھایا۔ ان اعمال کا تذکرہ بعض احادیث میں فطری احکام کے تحت آیا ہے۔

ابنِ کثیر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں انہوں نے ذکر فرمایا ہے کہ پورا اسلام تیس حصوں میں دائر ہے۔ جس میں دس سورۂ برات میں مذکور ہیں اور دس سورۂ احزاب میں اور دس سورۂ مومنون میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تمام چیزوں کا پورا حق ادا کیا اور ان سب امتحانات میں پورے اترے اور کامیاب رہے۔

سورۂ برأت میں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کی دس مخصوص علامات وصفات کا اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (التوبة: ١١٢)

(وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع وسجدہ کرنیوالے، نیک باتوں سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والے اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سنادیجئے)

Marfat.com

اور سورۃ مومنون کی دس صفات یہ ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ o اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ o فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ o اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ o

(یقیناً ان مسلمانوں نے فلاح پائی o جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرنے والے ہیں o اور جو لغو باتوں سے برکنار رہنے والے ہیں o اور جو اپنے آپ کو پاک کرنے والے ہیں o اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں o لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی لونڈیوں سے کیونکہ ان پر کوئی الزام نہیں o ہاں! جو اس کے علاوہ طلب گار ہوں ایسے لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں o اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں o اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں o ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) (المومنون: ۱ تا ۱۱)

اور سورۃ احزاب میں مذکورہ دس صفات یہ ہیں۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا o

(بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راستباز مرد اور راستباز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں ان سب کیلئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے) (الاحزاب: ۳۵)

Marfat.com

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کیلئے جتنی علمی، عملی، اخلاقی صفات مطلوب ہیں وہ ان تینوں سورتوں کی چند آیات میں جمع کر دی گئی ہیں اور یہی صفات وہ کلمات ہیں جن میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا امتحان لیا گیا اور آیت وَاِذِابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ میں انہیں صفات کی طرف اشارہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام کی تعمیل اور امتحانِ الٰہی میں کامیابی انسان کو دینی پیشوائی اور سرداری کا مستحق بنا دیتی ہے انبیائے کرام اور آپ کے راستے پر چلنے والوں کا یہی امتیاز ہے۔ آپ تاریخ میں ایسے بہت سے صالح انسانوں کو دیکھیں گے جو اعمال صالحہ کے انجام دینے میں نمونے کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن حق و باطل کی آویزش میں یا عزیمت اور استقامت کے مقام پر کمزور ثابت ہوتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کا عزم و ارادہ پہاڑوں کو شرما دیتا ہے۔ لیکن اعمال پر مداومت میں بہت کمزور ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام احکام کی تعمیل اور عزیمت اور استقامت کے امتحان دونوں میں سرخرو ٹھہرے۔

مختصر یہ کہ جب زندگی کی ہر چاہت اور محبت اللہ کے راستے میں قربان کر ڈالی اور دنیا کا ہر خطرہ اور ہر مشکل جو آدمی کے حوصلے کیلئے چیلنج بن سکتی ہے اللہ کے راستے میں برداشت کر لی تو تب اللہ نے فرمایا کہ ابراہیم میں تجھے لوگوں کا امام بنا رہا ہوں۔

کلمہ کے ایک اور پہلو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا ایک ایک صفحہ جاں بازی اور جاں سپاری کے کارناموں سے درخشاں ہے۔ جن میں سے ہم نے چند ایک کا ذکر کیا ہے لیکن کلمات کے لفظ کو دیکھتے ہوئے ان کارناموں کی گہرائی کا کچھ اور اندازہ کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم اور دیگر آسمانی کتابیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو جب احکام دیتا ہے تو عموماً اس پر عمل کو آسان کرنے کیلئے ترغیب سے بھی کام لیتا ہے اور اجر و ثواب کا ذکر بھی فرماتا ہے۔ ترغیب سے طبیعتیں عمل کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اجر و ثواب اور صلے کو دیکھ کر قربانی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام کو جتنے احکامات دیئے گئے ہیں جو آپ کیلئے امتحان کا درجہ رکھتے ہیں وہ بغیر کسی ترغیب اور اجر و ثواب کا ذکر کیے محض کلمات کی صورت میں یعنی محض احکام کی شکل میں دیئے گئے۔ جس طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی محض خواب دکھا کر طلب کی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دیکھنا یہ مقصود تھا کہ کیا میرا خلیل ترغیب اور اجر و ثواب کی امید پر ہماری طرف مائل ہوتا ہے یا ہر وقت اس کا دل ہمارے لئے تڑپتا اور ہماری رضا پر قربان ہونے کیلئے بے چین رہتا ہے۔ چنانچہ خلیل اللہ نے ثابت کر دیا کہ جس طرح زیتون کا تیل شعلۂ آتش کے قریب آنے سے بھڑک اٹھتا ہے اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دل اللہ کا حکم آنے سے تعمیل اور قربانی کیلئے بے قرار ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی شخصیت اس قابل ہے کہ وہ دنیا کی امامت و قیادت کے منصب پر فائز کی جائے۔

امامت کا منصب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفات کا امین

اس پوری صورتحال سے بنی اسرائیل کو یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا کی امامت کا جو تاج تمہارے سروں پر رکھا گیا تھا وہ ابراہیم علیہ السلام کی ان صفات اور اس روایت کا امین تھا۔ اس کا تعلق آپ کے نسب یا نسل سے نہیں تھا بلکہ ان ذمہ داریوں ان وفاشعاریوں اور ان جاں سپاریوں سے تھا جس کی درخشاں تاریخ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے روشن ہے۔ تمہیں تو انہیں کی طرح عزیمت و استقامت اور اطاعت و محبت الٰہی کا ثبوت دینا تھا۔ لیکن تم نے جو کچھ کیا اس کی ایک مجمل تاریخ گذشتہ دس رکوعوں میں گزر گئی۔

Marfat.com

اس آیتِ کریمہ کے دوسرے حصے نے اس حقیقت کو مزید مبرہن کر دیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے امامت کی خوشخبری سنائی تو آپ نے عرض کی کہ یہ امامت کا منصب صرف میرے لئے ہے یا میری اولاد بھی اس سے نوازی جائے گی۔اس کے جواب میں پروردگار نے ارشاد فرمایا: لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ''میرا یہ وعدہ ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے'' یعنی آپ کی امامت آپ کی صفات کے ساتھ مشروط ہے آپ کی ذات یا آپ کے نسب کے ساتھ نہیں۔ جو شخص آپ کی اولاد میں سے ہوگا لیکن ان صفات سے اور ایمان وعمل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہوگا اس کا اس منصب سے کوئی رشتہ نہیں۔قرآنِ کریم میں جابجا ظلم کا لفظ حق شکنی اور حق تلفی کے ساتھ ساتھ شرک، بدعملی اور نافرمانی کیلئے بھی استعمال ہوا ہے۔ایک جگہ فرمایا:

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ○ (الصّٰفّٰت: ۱۱۳)

(اور ان دونوں کی اولاد میں ٹھیک عمل کرنے والے بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم کرنے والے بھی)

یہاں ظالم کا لفظ محسن کے مقابلے میں آیا ہے۔اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حسنِ عمل سے محروم ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روش پر قائم نہیں ہیں وہ ظالم ہیں اور ظالموں کو امامت سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔اس وضاحت سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ بنی اسرائیل اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور انہیں ایک وقت میں امامت وسیادت کا منصب بھی دیا گیا تھا۔لیکن جب رفتہ رفتہ حضرت ابراہیم کی روش اور اللہ کے نبیوں کی لائی ہوئی شریعت وہدایت سے بےگانہ ہوگئے۔تو وہ اس امامت وسیادت سے محروم کر دیئے گئے اور جہاں تک بنی اسمٰعیل کا تعلق ہے ان پر اگرچہ حاملِ دعوت ہونے کی ذمہ داری تو نہیں ڈالی گئی لیکن ایمان وعمل کی ذمہ داریوں کے وہ بھی مکلف تھے۔انہوں نے آہستہ آہستہ شریعت کا ایک ایک تسمہ توڑ ڈالا اور ایمان وعمل کی تمام ذمہ داریوں سے بیگانہ ہوگئے۔اس لئے ان کا تو سرے سے حضرت ابراہیم کی وراثت سے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔حاصل کلام یہ کہ بنی اسرائیل ہوں یا بنی اسمٰعیل اللہ تعالیٰ نے اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ''میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں'' فرما کر یہ واضح کر دیا کہ حضرت ابراہیم بنی اسرائیل کے بھی امام ہوں گے اور بنی اسمٰعیل کے بھی۔آپ کی نسل سے وجود میں آنے والی یہ دونوں شاخیں صرف آپ کی اولاد ہی نہیں ہوں گی بلکہ آپ ان کے امام اور پیشوا بھی ہوں گے۔البتہ آپ کی امامت اور پیشوائی کے وارث وہ لوگ ہوں گے جو ایمان وعمل سے بہرہ ور اور حضرت ابراہیم کی روش پر قائم ہوں گے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں اسی سے پھوٹنے والی بات کہی گئی ہے کہ جب بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل دونوں کے امام اور پیشوا حضرت ابراہیم ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ان دونوں شاخوں کا قبلہ بھی وہی ہو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کریں گے اور اس کو قبلہ ٹھہرائیں گے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○

(اور یاد کرو! جب کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کیلئے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو اور ابراہیم اور اسماعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک رکھو) (البقرة: ۱۲۵)

Marfat.com

البیت کا مفہوم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو قبلہ بنایا آپ کی اولاد بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کیلئے اسے قبلہ ٹھہرایا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس گھر کی تعمیر کی قرآن کریم نے اسے البیت سے تعبیر کیا ہے جس سے مراد ''بیت اللہ'' یعنی ''خانہ کعبہ'' ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش باب بارہ میں اس کو ''بیت ایل'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایل عبرانی میں ''اللہ'' کو کہتے ہیں تو ''بیت ایل'' کا ترجمہ ہوگا ''بیت اللہ''۔ قرآنِ کریم نے اس گھر کو سب سے قدیم گھر قرار دیا ہے۔ اس لئے اسے البیت العتیق سے تعبیر فرمایا مسیحیت کو کعبہ کی تقدیس و برکت کے ساتھ ساتھ کعبہ کی قدامت بھی نہایت گراں گزرتی ہے، لیکن ان کیلئے مشکل یہ ہے کہ آج تک وہ انکار کی کوئی ایسی دلیل پیش نہ کر سکے جو قابلِ تسلیم ہوتی بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں انگریز مصنف باسورتھ سمتھ کو لکھنا پڑا:

''یہ وہ معبد ہے جس کی قدامت عہد تاریخ سے پرے ہے۔'' (محمڈ اینڈ محمڈن ازم: صفحہ ۱۶۶)

پھر آگے مشہور و قدیم رومی مورخ ڈایوڈ گورس سکولس جس کا زمانہ خود حضرت مسیح سے ایک صدی قبل کا ہے کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہ معبد قدیم ترین تھا اور ساری نسل عرب کا نہایت مقدس مرجع تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بیت اللہ کا قدیم ہونا اور سب کا قبلہ ہونا یہ خود تورات کے مطالعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ تورات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہود کو شروع ہی سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی قربانیوں کا قبلہ مکہ معظمہ کی سمت کو قرار دیں۔ اسی طرح جس قربانی کا نام ان کے ہاں قدس الاقدس ہے، اس کا رخ جنوب کی طرف ہونا ضروری تھا۔ سالانہ قربانی جو ان کے ہاں سب سے بڑی قربانی خیال کی جاتی تھی اس کا رخ بھی جانب جنوب ہی ہوتا۔ ان کے خیمۂ عبادت کا رخ بھی جانب جنوب ہی ہوتا تھا۔ بیت المقدس کی تعمیر بھی اس طرح ہوئی تھی کہ اس کا رخ جنوب کی جانب تھا اور یہ بات یاد رہے کہ بیت المقدس سے مکہ معظمہ جنوب کی جانب ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس طرح ہم خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے ہیں اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی تمام ذریت کی عبادت و قربانی کا قبلہ بھی خانہ کعبہ ہی تھا۔ اسی رخ پر ان کا خیمہ عبادت بھی تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے اسی رخ پر بیت المقدس کی تعمیر ہوئی تھی۔

یہود کی تحریفات پر تنقید

یہود نے حضرت ابراہیم کا تعلق خانہ کعبہ سے توڑنے کیلئے عجیب و غریب تحریفات سے کام لیا ہے۔ انہوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حضرت ابراہیم نے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت اسمٰعیل نہیں بلکہ حضرت اسحٰق ہیں اور جس جگہ قربانی کی وہ جبل یروشلم ہے نہ کہ مروہ اور اللہ کی عبادت کیلئے انہوں نے جو گھر بنایا وہ بیت المقدس ہے نہ کہ بیت اللہ اور حضرت ابراہیم نے ہجرت کے بعد جس جگہ سکونت اختیار کی وہ جوار بیت اللہ نہیں وہ کنعان ہے۔ اور ان باتوں کو ثابت کرنے کیلئے حقائق کی وہ قطع و برید کی کہ الآمان والحفیظ۔ مولانا حمید الدین فراہی کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انہوں نے اپنے رسالہ مَنْ هُوَ الذَّبِيح میں ان تحریفات کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا اور تورات ہی کے بیانات سے یہ ثابت کیا کہ حضرت ابراہیم نے اپنے وطن سے نکلنے کے بعد حضرت اسحٰق کی والدہ کو تو کنعان میں چھوڑا اور خود حضرت اسمٰعیل اور

Marfat.com

ان کی والدہ کے ساتھ بیر سبع کے بیابان میں قیام کیا۔ یہ جگہ غیر آباد جگہ تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے سات کنویں کھودے اور درخت لگائے۔ یہیں ان کو خواب میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم صادر ہوا اور وہ حضرت اسمٰعیل کو لے کر مروہ کی پہاڑی کے پاس آئے اور اس حکم کی تعمیل کی۔ اسی پہاڑی کے پاس انہوں نے حضرت اسمٰعیل کو آباد کیا۔ پھر یہاں سے لوٹ کر وہ بیر سبع گئے اور اپنے قیام کیلئے ایسی جگہ منتخب کی جو خانہ کعبہ سے قریب بھی ہو اور جہاں سے وقتاً فوقتاً حضرت اسحٰق کو دیکھنے کیلئے بھی جانا آسانی سے ممکن ہو۔ ظاہر ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے قیام اسی علاقہ میں فرمایا نہ کہ شام میں تو ان کو نماز کیلئے ایک مرکز کی تعمیر بھی اسی علاقے میں کرنے کا حکم ہونا چاہئے تھا چنانچہ آپ نے اللہ کے حکم سے مکہ معظمہ میں بیت اللہ کی تعمیر کی۔ جہاں تک بیت المقدس کا تعلق ہے، اس کی تعمیر تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی اور ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سینکڑوں سال بعد کا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں بیت اللہ کی تعمیر پہلی تعمیر نہیں تھی بلکہ یہ سابقہ تعمیر کی تجدید تھی۔ اس بارے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کو کس نے تعمیر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلی تعمیر فرشتوں نے کی دوسری تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے۔ طوفانِ نوح کے وقت بیت اللہ کو اٹھا لیا گیا یا مسمار ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی تاریخ کیا ہے، تاریخ سے کوئی بات ثابت نہیں۔ قرآنِ کریم سے اشارۃً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس جگہ ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیوی اور بچے کو ٹھہرانے کا حکم دیا وہ بیت اللہ کے قریب جگہ تھی۔ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ ''اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کی جگہ بتلا دی''۔ روایات میں کہا گیا ہے کہ اس وقت اللہ کا گھر ایک ٹیلے کی شکل میں تھا اس ٹیلے کے نیچے اس کی بنیادیں مدفون تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس ٹیلے کی مٹی کو ہٹایا تو بیت اللہ کی بنیادیں نکل آئیں اور انہیں پر بیت اللہ کی تعمیر ہوئی۔ اس لئے میں نے عرض کیا کہ یہ تعمیر درحقیقت سابق تعمیر کی تجدید تھی۔ اس کے بعد بیت اللہ کی تاریخ پوری روشنی میں ہے۔ کسی عمارت بلکہ کسی بھی تاریخی جگہ کے وجود اور اس کے حالات کے بارے میں اتنی بڑی تعداد میں اور اس تواتر میں شہادتیں موجود نہیں ہوں گی جس طرح بیت اللہ کے بارے میں ہیں۔ پورا عرب بیت اللہ سے عقیدت رکھتا تھا اور دنیا بھر کے مخالفین اس کے اثرات کی ہمہ گیری کو دیکھ کر تلملاتے رہے۔ ان تاریخی شہادتوں کے علاوہ خود اس گھر کی اندورنی شہادتیں اسے اللہ کا گھر ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں ان شہادتوں میں سے دو کا ذکر کیا گیا ہے۔
ا:۔ مثابۃ ۲:۔ امنا۔ اب ہم اس کی مختصر سی وضاحت کرتے ہیں۔

مثابۃ کا مفہوم

مثابۃ :۔ مصدر ''ثوب'' کے معنی میں ہے اس کا معنی ہے کسی چیز کا اپنی اصلی حالت یا حالتِ مقصودی کی طرف لوٹنا۔ جب کچھ لوگ کسی مقام کی طرف لوٹتے ہیں تو کہا جاتا ہے ثاب القوم اور اسی سے مثابۃ اسم ظرف ہے۔ اس میں ''ۃ'' مبالغہ کی ہے۔ جس سے اس کے معنی میں زور اور تاکید پیدا ہو گئی ہے۔ اس لحاظ سے مثابۃ کا معنی ہوگا وہ مقام جس کی طرف انسان بار بار رجوع کرے اور پھر بھی جی نہ بھرے۔ اندازہ لگایئے! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اس گھر کی تعمیر فرمائی تو اس کے چاروں طرف خشک پہاڑوں کے سوا کچھ نہ تھا چند خانہ بدوشوں کے خیمے تھے اور چند ببول کے درخت۔ خاردار جھاڑیوں کے سوا کوئی سرسبز چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ چشمۂ زم زم جاری ہونے کی وجہ سے بنو جرہم کے کچھ لوگ آباد ہو گئے تھے اور کھجور کے چند درخت اگ آئے تھے۔ اس حال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا جاتا ہے کہ

Marfat.com

آپ ایک ٹیلے پر کھڑے ہوکر مخلوقِ خدا کو پکاریں کہ وہ اس گھر کی زیارت کیلئے آئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حیران ہوکر عرض کی یا اللہ! میری آواز تو ان ٹیلوں میں گم ہوکر رہ جائے گی، کون سنے گا اور کون آئے گا؟ لیکن حکم دیا گیا، جس طرح سورۃ حج میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ یَاْتُوْکَ رِجَالًا الخ ''ابراہیم لوگوں کو پکارو، لوگ تمہاری پکار پر آئیں گے، پیدل بھی اور دبلی سواریوں پر سوار ہوکر بھی، وہ ہر تنگ گھاٹی اور دروں سے نکلتے ہوئے آئیں گے''۔ راستے تو ان سے آباد ہوں گے ہی پہاڑ بھی ان کا راستہ نہ روک سکیں گے۔ چار ہزار سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا جب ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے یہ ندا دی تھی۔ اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی اللہ کی مخلوق کا ہجوم ہے جو کشاں کشاں بیت اللہ کی طرف چلا آتا ہے اور یہ ہجوم صرف حج ہی کے موقع پر نہیں بلکہ سارا سال بھی اس گھر کی زیارت کیلئے زائرین کا ایک تانتا بندھا رہتا ہے۔ روئے زمین کے ہر خطے، ہر علاقے اور ہر ملک میں رہنے والے لوگ اس گھر کی حقیقت سے بہرہ ور اور اس کی زیارت کیلئے بے تاب رہتے ہیں۔ اس پر مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ جو ایک دفعہ زیارت سے مشرف ہوتا ہے وہ بار بار آنے کیلئے تڑپتا ہے حالانکہ جب یہ گھر بنایا گیا تھا تو اس گھر کی زیارت کیلئے آنا جانا جان جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا اور آج بھی اس گھر کے گرد و پیش ایسے کوئی قدرتی مناظر نہیں جنہیں دیکھنے کیلئے لوگ لپکتے ہوئے آئیں لیکن اس کے باوجود لوگوں کا ہجوم ہے کہ دنیا کی کسی خوبصورت ترین جگہ پر بھی یہ ہجوم دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مثابہ بنایا ہے کہ لوگ اس میں جمع ہوں گے ہجوم اس کی طرف امڈ کر آئے گا اور جو ایک دفعہ آئے گا وہ بار بار آنے کی آرزو کرے گا۔ ایک سیدھا سادہ مکان ہے جو سیاہ قبا پہنے کھڑا ہے بظاہر اس میں خوبصورتی اور دلکشی کی کوئی صورت نہیں لیکن دل ہیں کہ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ لوگ دیوانہ وار اس کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ حجرِ اسود کو چومنے کیلئے بے قرار ہوتے ہیں۔ آدمی حیران ہوکر سوچتا ہے ؎

کوئی بات تو ہے آخر مے کدے میں ضرور

جو دور دور سے مے خوار آ کے پیتے ہیں

امنا کا مفہوم اور اس کی وضاحت

اس کی دوسری صفت ''امناً'' بیان کی گئی ہے۔ امناً، ''مامن'' کے معنی میں ہے۔ یعنی امن کی جگہ۔ جس شخص کی نگاہوں میں نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل کی تاریخ ہے وہ خوب جانتا ہے کہ جس قدر بدامنی، سفاکی، ظلم، لوٹ مار، اور جان و مال کا غیر محفوظ ہونا جزیرۂ عرب میں تھا شائد دنیا کے کسی علاقے میں نہ تھا۔ جزیرۂ عرب کی سرزمین بدامنی کا ایک جہنم تھی۔ جس کی لپٹوں میں قبیلے کے قبیلے جل رہے تھے۔ اکیلے وکیلے سفر کرنے کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا قافلے بھی محافظوں کی موجودگی کے باوجود لٹنے سے محفوظ نہیں تھے۔ اس حالت میں ہم بیت اللہ کو ہی نہیں بلکہ پورے حرم کو دیکھتے ہیں کہ بدامنی کے دہکتے ہوئے جہنم میں یہ حفظ و امان اور محبت اور آشتی کا ایک ایسا جزیرہ تھا جسے چیلنج کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ وحشی اور منہ زور عرب قبیلے حرم کی حدود میں پہنچتے ہی عجز و انکسار کے پیکر بن جاتے تھے۔ وہ اگر اپنے باپ کے قاتل کو بھی اس جگہ دیکھ لیتے تو اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی جراٴت نہ کرتے تھے۔ وحشی قبائل بھی حرم کی حدود میں کبھی ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی جسارت نہیں کرسکتے تھے۔ وہ عام جنگ و قتال کو حرم کی حدود میں حرام سمجھتے تھے۔

Marfat.com

ان دو صفات پر ہی غور کر لیا جائے تو یہ صفات بجائے خود بیت اللہ کے اللہ کے گھر ہونے کی ایسی دلیلیں ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔ ایک ایسا ملک جس میں کوئی قانون نہ ہو، ایک ایسا شہر جس کی کوئی پولیس نہ ہو، کوئی احتسابی ادارہ نہ ہو جو کسی کا احتساب کر سکے، ایسے شہر میں ہزار ہا آدمیوں کا جمع ہونا جن میں دشمن قبائل کی کمی بھی نہ ہو، لیکن ان کا کسی سے نہ الجھنا اور حرم کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو ہر طرح کی لڑائی اور سرکشی سے صرف اس لئے دور رکھنا کہ وہ حرم کی حدود میں ہیں اور یہاں اللہ نے ان باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے۔ غور فرمائیے! دلوں کی گہرائیوں تک اتر جانے والی یہ تاثیر اللہ کے گھر کے سوا کسی اور گھر میں بھی ہو سکتی ہے؟

مقام ابراہیم سے کیا مراد ہے؟

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ''اور مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو''۔ اس گھر کے بیت اللہ ہونے کی یہ ایک تیسری ضمنی دلیل ہے۔ یہ ایک پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر بیت اللہ کی دیواروں کی تعمیر کی تھی۔ اس پتھر کی عجیب خصوصیت تھی کہ یہ دیوار کی بلندی کے ساتھ ساتھ ''گو'' کی طرح بلند ہوتا جاتا تھا اور اس میں مزید حیران کن بات یہ ہے کہ یہ پتھر نبوت کے جلال سے پگھل گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں پاؤں کے نشانات اس میں ثبت ہو گئے۔ چار ہزار سال کا زمانہ گزر گیا آج بھی یہ پتھر خلیل اللہ کے پاؤں کے نشانات سمیت بیت اللہ کے سامنے موجود ہے اور قوموں کی شہادت اس کے وجود اور اس کی حیثیت کی گواہ ہے۔ آیت کریمہ کے اس جملے میں اسی پتھر کو مقام ابراہیم کہا گیا ہے اور اسے مصلیٰ بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے اس پتھر کو مقامِ ابراہیم قرار دیا۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب آپ طواف سے فارغ ہوئے تو آپ مقامِ ابراہیم کے پاس تشریف لائے اور آیت کے اس جملے کی تلاوت فرمائی اور پھر مقام ابراہیم کے پیچھے اس طرح دو رکعت نماز پڑھی کہ منہ تو بیت اللہ کی طرف رہا لیکن درمیان میں مقامِ ابراہیم بھی تھا۔ اس لئے فقہائے امت نے لکھا ہے کہ طواف کے بعد دو نفل پڑھنا احناف کے نزدیک واجب ہیں اور شوافع کے نزدیک سنت۔ البتہ ان دو نوافل کا مقامِ ابراہیم کے پیچھے ادا کرنا واجب نہیں سنت ہے۔ اگر اس کے پیچھے جگہ نہ ملے اور حرم کی کسی دوسری جگہ پڑھ لے تو نوافل ادا ہو جائیں گے۔

صاف رکھنے کا مفہوم

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ۔ ''عهد'' جب الٰی کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے کسی پر کوئی ذمہ داری ڈالنا اس کو کسی شرط کا پابند بنانا۔ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل پر ذمہ داری ڈالی یعنی انہیں بیت اللہ کی تولیت سپرد کی اور ان کی یہ ذمہ داری ٹھہرائی کہ وہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع اور سجود کرنے والوں کیلئے پاک رکھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے گھر کا متولی ہو چاہے کوئی فرد یا خاندان ہو یا حکومت اللہ کے گھر کی صفائی اور اس کی تطہیر ان کی پہلی ذمہ داری ہے۔ یہی حال مساجد کا بھی ہے، متولیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مساجد کو بھی اللہ کے گھر کی طرح صاف ستھرا رکھیں۔ اب سوال یہ ہے کہ صاف ستھرا رکھنے سے کیا مفہوم ہے؟ اس سے مراد ہر اس چیز سے صفائی اور پاک صاف رکھنے کی کوشش ہے جو اس گھر کے مقصدِ تعمیر کے منافی ہے۔ طواف اعتکاف اور نماز کیلئے ضروری ہے کہ آدمی کا جسم، آدمی کے کپڑے، آدمی کا گرد و پیش اور ماحول ہر طرح کی گندگی سے پاک و صاف ہو۔ اس لئے

Marfat.com

حکم دیا گیا کہ ناپاکی کی حالت میں مسجدوں میں داخل نہ ہونا چہ جائیکہ خانہ کعبہ میں وہاں تو اور بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ناپاک کپڑے پہن کا نہ آنا، منہ سے بدبو نہیں آنی چاہیے، اس لئے سگریٹ، سگار یا حقہ پی کر اللہ کے گھروں میں جانے سے ممانعت کردی گئی اور اللہ کے گھر اور مساجد میں کوئی ایسی گندگی نہیں ہونی چاہئے جس سے طبیعتیں کراہت کرتی ہوں کیونکہ یہ تو دل جمعی اور اللہ سے لو لگانے کی جگہیں ہیں۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے مسجد کی دیوار کے ساتھ بلغم لگا ہوا دیکھا آپ نے خود اسے کھرچا اور وہاں پر خوشبو منگوا کر لگائی۔ دوسری چیز جس سے تطہیر کرنی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں لہو ولعب کے ہنگامے نہ ہوں آوازیں بلند نہ ہوں دنیاداری کی باتیں نہ ہوں، کوئی ایسی چیز نہ ہو جو اللہ سے لو لگانے میں مانع ہو اور جس سے طبیعتوں کی یکسوئی میں خلل واقع ہو اور سب سے اہم بات یہ کہ اللہ کے گھر کو غیر اللہ کی بندگی اور عبادت سے محفوظ رکھا جائے۔ وہاں اصنام واوثان نہ ہوں۔ کوئی ایسی حرکت نہ ہو جس سے اللہ کی عبادت کی حقیقت کو نقصان پہنچے۔

مختصر یہ کہ اللہ کے گھر کو ہر نجاستِ ظاہری، معنوی اور اعتقادی سے پاک صاف رکھا جائے اور ان لوگوں کیلئے اسے تیار رکھا جائے جو اس گھر کے مقصدِ تعمیر سے واقف اور اس سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں۔ انہیں تین ناموں سے تعبیر فرمایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر کی تعمیر کا مقصد یہی تین باتیں ہیں۔ ۱۔ طواف۔ ۲: اعتکاف۔ ۳: نماز۔

طواف: بیت اللہ کے اردگرد پھیرے لگانے کا نام ہے۔ سات پھیرے لگانے سے ایک طواف مکمل ہوتا ہے۔ حجرِ اسود سے طواف کا آغاز ہوتا ہے اور یہیں پر اختتام ہوتا ہے۔ طواف ایک ایسی عبادت ہے جو سب عبادات سے افضل ہے اور وہ صرف بیت اللہ کے ہی ساتھ ممکن ہے۔ اس کے علاوہ ہر طرح کی عبادت اور نیکی کہیں بھی کی جاسکتی ہے۔ دنیا کے کسی خطے میں نماز بھی پڑھی جاسکتی ہے روزہ بھی رکھا جاسکتا ہے زکوٰۃ بھی دی جاسکتی ہے قربانیاں بھی کی جاسکتی ہیں لیکن طواف صرف بیت اللہ ہی کا ہوتا ہے کسی اور بڑی سے بڑی بارگاہ کا طواف حرام ہے۔ کسی مسجد کا طواف بھی جائز نہیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کے مرقدِ مبارک کا طواف بھی ناجائز ہے نماز سب سے زیادہ اللہ سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن طواف اگر پورے شعور کے ساتھ کیا جائے تو اس میں محبت الٰہی کے جذبات جس طرح ابھرتے ہیں وہ کسی اور عبادت میں ممکن نہیں۔ اس میں تو آدمی ایسی کیفیت اپنے اندر محسوس کرتا ہے، جیسے پروانہ شمع کے گرد منڈلاتا ہے اور بالآخر اسی پر قربان ہوجاتا ہے۔ یہ دراصل ایک استعارہ ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلمان کی ساری عبادتیں سارے اعمال اور ساری زندگی کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا آغاز بھی اللہ پر ایمان سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام بھی اللہ پر قربان ہوجانے سے ہوتا ہے۔

عاکفین، عاکف کی جمع ہے۔ **عکوف** کا لفظی معنی کسی جگہ کے رہنے کو تعظیماً لازم کرلینا ہے۔ اور اس کی اصل روح دوسری چیزوں سے صرفِ نظر کر کے کسی خاص چیز کو پکڑ لینا ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں اعتکاف نام ہے مسجد کے اندر بہ نیت عبادت قیام کو کسی مدت کیلئے لازم کرلینا۔ بجز بشری ضرورتوں کے اور کسی حال میں باہر نہ نکلا جائے۔ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف سنتِ کفایہ موکدہ ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں عاکف سے مراد وہ عکوف یا اعتکاف کرنے والا ہے جو ہر طرف سے کٹ کر اللہ کی یاد کیلئے اس گھر کا ہو کر رہ جائے۔ اس کی شکل رمضان میں اعتکاف کی بھی ہوسکتی ہے اور اس کے علاوہ کسی اور وقت میں اللہ سے لو لگانے کی بھی۔ پاؤں توڑ کر لو لگا کر بیٹھ جانا اور شدید ضرورت کے بغیر کہیں نہ جانا یہ وہ چیز ہے جو اللہ کی محبت کے جذبات ابھارنے کیلئے نہائت موثر ہے۔ اس میں اپنی عبدیت کی عاجزی بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ عقل کی حدود بھی واضح ہوجاتی ہیں اور دل کے احساسات بھی آہستہ آہستہ محبتِ الٰہی میں ڈھلنے لگتے ہیں۔

Marfat.com

رکعٌ، راکعٌ کی جمع ہےاور سجود، ساجد کی جمع ہے۔رکوع اور سجود سے نماز مراد ہے۔کیونکہ یہ دونوں نماز کے اہم ارکان ہیں۔کبھی تو اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اس کی بندگی کے اقرار کیلئے سب سے زیادہ ضروری ہوتا ہے اور یہ عزیمت اور استقامت کی ایک علامت بھی ہے اور کفر اور باطل کے مقابلے میں حمیتِ حق کا اظہار بھی۔لیکن آدمی جب عجز و نیاز کا سرمایہ اللہ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے تو پھر اس کی سرخوشی کا اظہار رکوع سے شروع ہوتا ہے اور سجدے پر تکمیل پذیر ہوجاتا ہے۔یہاں ان دونوں کا ذکر کر کے ایک تو بندگی کی تمام صورتوں کو جمع کرنا مقصود ہے اور دوسرا اہلِ کتاب پر شائد تعریض بھی ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں ان کی نماز کا بھی لازمی ستون تھیں انہوں نے پہلے ان دونوں کا ضائع کیا اور پھر نماز ہی ضائع کرڈالی۔لیکن اسلام چونکہ ایک مکمل دین ہے، وہ اگرچہ روحِ دین اور باطن کی اصلاح پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔لیکن ساتھ ہی بندگی کی مخصوص صورت و ہیئت کو بھی باقی رکھنے پر اصرار کرتا ہے کیونکہ جس طرح ظاہر باطن کی اصلاح کا محتاج ہے، اسی طرح ظاہر بھی باطن کی اصلاح کی دلیل اور مؤید ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا بھی ذکر آیا ہے۔بیت اللہ کی تولیت دونوں کے سپرد کی گئی تھی۔لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت اسمٰعیل ہی کو یہ ذمہ داری سونپی جانے والی تھی اور انہیں کی پشت سے آنحضرت ﷺ کا ظہور اور امتِ مسلمہ وجود میں آنے والی تھی۔اس لئے مناسب ہوگا کہ ان کے تعارف میں بھی چند باتیں عرض کردی جائیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تعارف

حضرت اسمٰعیل حضرت ابراہیم کے فرزند اکبر تھے، آپ کی مصری بیوی حضرتِ ہاجرہ کے بطن سے تھے۔سالِ ولادت غالباً 2074 ق م ہے۔سالِ وفات غالباً 1937 ق م ہے۔تورات میں ہے کہ عمر 137 سال کی پائی۔آپ کے بارہ فرزند ہوئے اور ان سے بارہ نسلیں چلیں۔تورات میں ان بارہ فرزندوں کے نام درج ہیں اور یہ تصریح ہے کہ (یہ اپنے قبیلوں کے بارہ رئیس تھے۔پیدائش:۲۵، ۱۲)عرب کا مشہور عالی نسب قبیلہ قریش آپ ہی کی نسل سے ہے۔اس لئے آپ رسول اللہ ﷺ کے بھی مورثِ اعلیٰ ہوئے۔اہلِ کتاب کہلانے والوں نے آپ کے خلاف زہر اگلنے اور اپنے خبث و عناد کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔تاہم اپنی کتاب کی تصریحات کو کیا کریں گے، جو تحریف و تلبیس کی ہر ممکن کوشش کے بعد بھی نہ مٹ سکیں۔ان میں ابراہیم خلیل کی دعا بھی شامل ہے اور خداوند کریم کے وعدے بھی اور تاریخ کا بیان بھی۔

(اور ابراہام نے خدا سے کہا کہ کاش! اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔(پیدائش:۱۷، ۱۸)۔اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے آبرومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا۔(پیدائش، ۱۷، ۲۰)۔اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔(پیدائش ۲۱: ۱۸)۔اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیرانداز ہوگیا) (پیدائش ۲۱: ۲۱)

آپ کی والدہ ماجدہ حضرتِ ہاجرہ شاہِ مصر کی صاحبزادی تھیں اور مصر کا شاہی خاندان حضرت ابراہیم کے خاندان کی ایک شاخ تھا۔عراق سے منتقل ہوکر مصر میں آباد ہوگیا تھا۔جب حضرت ابراہیم اپنے سفر میں ادھر سے گزرے تو بحیثیت ایک شیخ قبیلہ کے آپ کو شاہِ مصر نے اپنا مہمان بنایا اور رخصت کے وقت آپ کے اعزاز و اکرام میں اپنی صاحبزادی کو بطور تحفہ کے پیش کیا اور تواضع و انکسار کی راہ سے کہ مشرقی میزبانی کا خاصہ ہے۔کہا کہ یہ آپ کی کنیزی کیلئے ہدیہ ہے، اردو زبان میں یہ محاورہ آج تک چلا ہوا ہے۔شادی بیاہ کے موقع پر بڑے سے بڑا معزز شخص بھی اپنی لڑکی کو کنیز ہی کہہ کر داماد اور سمدھی کے سامنے پیش کرتا ہے۔لیکن مشرقی تواضع کے اس عام پیرایۂ بیان کے باوجود معاندین

Marfat.com

اس لفظ کو ایک بڑی معتمد اور مستند دستاویز سمجھتے ہیں اور ام اسمٰعیل ان کے ہاں آج تک کنیز ہی چلی آ رہی ہے۔ واقعات بہر حال واقعات ہیں انہیں کوئی کہاں تک جھٹلا سکتا ہے۔ اسی جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اکابر احبار یہود کے حوالہ سے ہے:

(ہاجرہ فرشتہ ہی کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہوئی ان کی عصمت مآبی اس سے ظاہر ہے کہ ابراہیم نے انہیں اپنے پاس سے الگ کر دیا جب بھی ان کی وفاداری میں فرق نہ آیا۔ ان کے نام کے ایک معنی آراستہ بھی بیان ہوئے ہیں اور یہ اس بنا پر کہ وہ زیورِ اخلاق وحسنِ عمل سے آراستہ تھیں) (جلد ۶، صفحہ ۱۳۸)

''اور اسی میں ایک دوسری جگہ یہ روایت بھی درج ہے: ''بادشاہ نے خود اپنی صاحبزادی بطور کنیز ہدیہ کر دی۔'' (جلد ۱۱، صفحہ ۵۵)
اور قصصِ یہود کا جو مجموعہ گینزبرگ نے چار جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے اس میں ہے:

(بادشاہِ مصر نے عہد کر لیا کہ وہ ابراہیم کو ہر طرح پر قوت وشوکت بنا کر رہے گا، چنانچہ اپنی بیٹی تک ہدیہ دے دی۔ سارہ کی تعلیم وتربیت میں رہ کر وہ بھی ویسی ہی باخدا بن گئیں اور ہر طرح سے ابراہیم کی رفاقت کے قابل) (جلد ۱، صفحہ ۴۲۸ و ۲۳۷) (ماخوذ از تفسیر ماجدی)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

(اور یاد کرو! جب کہ ابراہیم نے دعا کی اے رب! اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے باشندوں کو جو ان میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں پھلوں کی روزی عطا فرما۔ فرمایا، جو کفر کریں گے، انہیں بھی کچھ دن بہرہ مند ہونے کی مہلت دوں گا۔ پھر میں ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف دھکیلوں گا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے) (البقرۃ: ۱۲۶)

مومنین کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں (امن اور رزق عطا فرما)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس سرزمین میں بیت اللہ کی تعمیر کی اور اس کے جوار میں جس سرزمین میں حضرت اسمٰعیل کو آباد کیا اس کیلئے بلد کا لفظ استعمال فرما کر گویا اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ سرزمین بے آب وگیاہ صحرا ہے اور ایک ایسی وادی ہے جس میں سبزے کا نشان تک نہیں۔ اسے ایک شہر کی صورت آباد فرما۔ اس کے رہنے والوں کو امن عطا فرما اور رزق کی دولت سے مالا مال فرما۔ یہ دو دعائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لئے فرمائیں کہ ان دونوں کے بغیر کسی سرزمین کا شہر کی صورت اختیار کرنا ناممکن ہے۔ اس وقت اگرچہ وہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ لیکن خانہ بدوش قبائل پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں موسموں کے تغیر کے ساتھ ادھر سے ادھر منتقل ہوتے ہوئے یہاں سے ضرور گزرتے تھے اور جب کہ چاہِ زمزم کے وجود میں آنے کی وجہ سے پانی کی نعمت میسر آ گئی تھی تو ان خانہ بدوشوں کی آمد ورفت یہاں زیادہ ہو گئی ہو گی۔ لیکن ایک چشمہ یا ایک کنواں اس بے آب وگیاہ وادی میں کیسے آبادی کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ اس لئے یہاں کی گزر بسر کا ذریعہ گلہ بانی یا شکار یا پھر لوٹ مار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دو دعائیں کیں کہ ''یا اللہ! اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور انہیں پھلوں کا رزق عطا فرما''۔

Marfat.com

دونوں دعائیں کس طرح قبول ہوئیں؟

اللہ تعالیٰ نے جس طرح یہ دونوں دعائیں قبول فرمائیں اور حضرت اسمٰعیل اور ان کی اولاد کو جو برکتیں عطا کیں وہ تاریخ کی ایک ایسی زندہ اور درخشاں حقیقت ہے کہ کوئی باشعور شخص اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ جہاں تک اس کو امن کی جگہ بنانے کا سوال ہے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے ساتھ ساتھ شہر اور اس کے مضافات کو حرم قرار دے کر ہر طرح کی بدامنی سے اسے محفوظ کر دیا۔ ہر طرح کی لڑائی بھڑائی یک قلم ممنوع ہوگئی۔ جو شخص بھی حرم کی حدود میں داخل ہو جاتا وہ اللہ کی امان میں آجاتا، کوئی شخص اپنے دشمن پر بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ انسان تو ایک طرف رہے کسی جانور کو اذیت پہنچانا بھی حرام ٹھہرایا اور اس شہر کی آبادی کا مزید ایک انتظام یہ کیا کہ چار مہینوں کو حرمت والے مہینے قرار دیا۔ جن میں ایک مہینہ عمرے کیلئے اور تین مہینے حج کی عبادت کیلئے مختص کیے گئے۔ ان چار مہینوں میں پورے عرب سے سرزمینِ حرم کی طرف لوگ اُمڈتے ہوئے آتے۔ لیکن کوئی ان سے تعرض کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

مزید حیران کن بات یہ ہے کہ اللہ کے اس گھر اور اس کے جوار میں رہنے والوں کو بیرونی دشمنوں سے بھی اس طرح محفوظ کر دیا گیا کہ کوئی مکہ معظمہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ کسی بیرونی دشمن کو اس گھر کو نقصان پہنچانے کی ہمت نہیں ہوئی اور اگر کسی نے ایسی جسارت کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قدرتِ قاہرہ سے اسے عبرت بنا دیا۔

دوسری دعا آپ نے اس سرزمین میں رہنے والوں کیلئے رزق کی فرمائی۔ اس کو بھی جس طرح قبول فرمایا گیا اسے دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ اس سرزمین میں دور دور تک زراعت کا کوئی نشان تک نہیں۔ کوئی پھل وہاں نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود صدیوں سے اس شہر کے رہنے والوں کو اس قدر رزق مل رہا ہے کہ کبھی کسی چیز کی کمی کی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اللہ کے درپردہ کیا انتظامات ہیں وہی بہتر جانتا ہے لیکن بظاہر جو چیز محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بیت اللہ کو مرکزِ حج قرار دے دیا تو ساتھ ہی لوگوں کے دلوں میں اس گھر کی طرف ایک میلان پیدا کر دیا۔ جیسے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پھیلتی گئی، ویسے ویسے لوگوں کا ہجوم اس سرزمین کی طرف بڑھتا گیا۔ یہاں لوگ مہینوں قیام کرتے۔ اس اجتماع کے باعث یہاں بازار لگ جاتے اور ان بازاروں میں عرب کے گوشے گوشے سے مالِ تجارت پہنچتا اور اس طرح یہاں کی تجارت کو فروغ ملتا جیسے جیسے یہ تجارت بڑھتی گئی ویسے ویسے زندگی کی ضرورت کی ہر چیز مکہ کی سرزمین کی طرف سمٹنے لگی اور اس طرح سے یہاں کے رہنے والوں کو ہر طرح کا رزق میسر آگیا۔

اللہ کے اس گھر کی تولیت اور حضرت ابراہیم کی دعوت کے وارث ہونے کے باعث قریش کو پورے عرب میں ایک اقتدار اور احترام میسر آگیا۔ لوگ ان سے عقیدت بھی رکھنے لگے اور ان کے سیاسی مقام کو بھی تسلیم کرنے لگے۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے تجارتی قافلے قریب کے تمام ممالک کی طرف مالِ تجارت لے کر جانے لگے۔ ان کے تجارتی قافلوں کو احترام کی وجہ سے نہ صرف کہ کوئی روکتا نہیں تھا بلکہ ہر قبیلہ اپنی حدود میں حفاظت سے گزارنا اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا۔ اس سہولت کے باعث قریش کی تجارت پھیلتی گئی اور ان کی صرف ضرورتیں ہی نہیں بلکہ مکلف زندگی کا بھی سروسامان ہوتا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الایلاف میں قریش پر اپنے اسی احسان کا ذکر فرما کر ان سے اپنی بندگی کا مطالبہ بھی کیا۔

Marfat.com

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝

(قریش کو چاہیئے کہ اس گھر کے رب کی بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور
خوف سے امن دیا) (القریش:۳ تا ۴)

مختصر یہ کہ پروردگار نے غیر معمولی طریقوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو قبول فرمایا اور اہلِ مکہ کی رزق کی ضرورتیں بھی پوری کیں اور امن کی دولت سے بھی مالا مال کیا۔

ایک اشکال کا جواب

یہاں ممکن ہے قرآنِ کریم کے کسی قاری کو اشکال پیدا ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطورِ خاص پھلوں کے رزق کی دعا کیوں فرمائی۔ اس لئے کہ انبیائے کرام عموماً مقید دعا نہیں کیا کرتے یہ تو ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کے سامنے تجویز رکھنے والی بات ہے۔ جو شائد اس بارگاہِ عالی کے مناسب نہیں۔ دوسری یہ بات کہ انسان کی غذائی ضرورت صرف پھلوں سے تو پوری نہیں ہوتی۔ اس کیلئے تو مختلف قسم کی نعمتیں درکار ہوتی ہیں کیونکہ تنوع پسندی انسان کی فطرت ہے۔ وہ زیادہ دیر تک اس سے صبر نہیں کر سکتا۔

یہ اشکال درحقیقت قلتِ فہم کا نتیجہ ہے۔ ہم نے سرسری نظر میں یہ فیصلہ کر لیا کہ ثمرات ان پھلوں کو کہتے ہیں جو تفکہ کے طور پر کھائے جاتے ہیں حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ ایسی نعمتوں کو ''ثمرات'' نہیں ''فواکہ'' کہا جاتا ہے۔ جنہیں ہم اردو زبان میں میوہ جات کہتے ہیں۔ ثمرہ اصل میں ہر چیز کی پیداوار کا نام ہے، زمین سے جو بھی پیداوار ہوتی ہے وہ اس کا ثمرہ ہے۔ چاہے وہ گندم ہو جو ہو یا اس طرح کی دوسری غذائی اجناس ہوں، حتی کہ ترقی یافتہ زمانے میں صنعتیں جو کچھ Produce کرتی ہیں وہ اس صنعت کی پیداوار اور اس کا ثمرہ ہوتا ہے۔ اس لئے شائد قرآنِ کریم نے ایک دوسری جگہ ثَمَرٰتُ کُلِّ شَیْءٍ ''ہر چیز کے پھل'' فرمایا ہے۔ اس میں جو وسعت ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے صرف میوہ جات تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔

امامت صالحہ اور رزقِ دنیا میں فرق ہے

اس آیت کریمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ثمرات کی دعا سب کیلئے نہیں بلکہ صاحب ایمان لوگوں کیلئے کی ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو خلافت و امامت کی نوید سنائی تو آپ نے عرض کی کیا یہ منصب میری اولاد کو بھی ملے گا تو پروردگار نے فرمایا کہ آپ کی اولاد میں سے جو ظالم ہوں گے وہ اس منصب کے اہل نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اسی کو سامنے رکھتے ہوئے آپ نے یہاں بھی اللہ اور آخرت پر ایمان کے ساتھ اس دعا کو مشروط کر دیا کیونکہ اللہ کے نبیوں اور اس کے صالح بندوں کی اصل شناخت ہی یہ تسلیم و رضا ہوتی ہے۔ وہ جس چیز میں اللہ کی رضا دیکھتے ہیں فوراً اس کی طرف لپکتے ہیں۔ لیکن پروردگار نے اس غلط فہمی کی فوراً اصلاح فرما دی کہ ایمان و عمل امامتِ صالحہ کیلئے شرط ہے، رزقِ دنیا بالکل دوسری چیز ہے۔ امامتِ صالحہ صرف مومنین صالحین کو ملے گی مگر رزقِ دنیا مومن اور کافر سب کو دیا جائے گا۔ اسی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر کسی کو رزقِ دنیا فروانی سے مل رہا ہو تو وہ اس غلط فہمی میں نہ پڑے کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور وہی اللہ کی طرف سے پیشوائی کا مستحق بھی۔ رزق تو پروردگار کی بارگاہ سے سب کو ملے گا، لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ جو لوگ اس رزق کی

Marfat.com

ناشکری اور کفرانِ نعمت کرتے ہوئے ایمان وعملِ صالح کے بغیر زندگی گزاریں گے، ممکن ہے انہیں زندگی میں کوئی افتاد نہ پڑے لیکن آخرت میں وہ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔ دنیا کو ہی سب کچھ سمجھنے والے اے کاش اس بات کو سمجھ لیں کہ اس چندروزہ عیش کے نتیجے میں انہیں ہمیشہ کیلئے جس جہنم میں ڈالا جائے گا وہ کس قدر برا ٹھکانہ ہے۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ o

(اور یاد کرو جب کہ ابراہیم اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہماری جانب سے قبول فرما، بیشک تو سننے والا جاننے والا ہے) (البقرۃ: ۱۲۷)

تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا

کس قدر والہانہ اندازِ بیان ہے کہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں کو بتایا جارہا ہے کہ وہ کیسا مبارک اور انسانیت کیلئے قابلِ فخر وقت ہوگا جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ بنی اسرائیل کے لوگو! تم نے تاریخ کو مسخ کرکے رکھ دیا ہے۔ ذرا غور سے دیکھو! اس گھر کی بنیادیں اٹھانے والے ابراہیم ہیں۔ بیت المقدس کو تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا تھا جو حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے ہیں اور سینکڑوں سال بعد آئے ہیں تو پھر فیصلہ کرو اللہ کا سب سے قدیم گھر جو حضرت ابراہیم کا بھی قبلہ رہا وہ کون سا تھا؟ اسی طرح غور سے دیکھو کہ حضرت ابراہیم کے ساتھ اس تعمیر میں حضرت اسمٰعیل بھی برابر کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ وہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر نہ صرف تعمیر میں شریک ہیں بلکہ دعاؤں میں بھی شریک ہیں۔ لیکن تم نے ان دونوں بزرگوں کا تعلق بیت اللہ سے کاٹ کر رکھ دیا اور ذبیح اللہ بجائے حضرت اسمٰعیل کو قرار دینے کے حضرت اسحٰق کو قرار دے رہے ہو۔ مزید غور کرو! کہ ان دو مقدس معماروں کے دلوں میں کیا ارمان چٹکیاں لے رہے ہیں کہ جس گھر کی وہ بنیادیں اٹھا رہے ہیں۔ جیسے جیسے اس کی بنیادیں بلند ہو رہی ہیں ویسے ویسے ان کے ارمان بھی اور ان کی پاکیزہ آرزوئیں بھی عرشِ الٰہی کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ وہ برابر اپنے رب سے دعا کر رہے ہیں کہ یا اللہ! تو ہماری دعاؤں کو سننے والا ہے اور تو ہمارے دلوں کی کیفیتوں کو بھی جاننے والا ہے تجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ ہم کیا کیا آرزوئیں رکھتے ہیں یہ گھر تو آپ کے حکم سے بن رہا ہے لیکن اس کے باوجود بھی آپ کی بے نیازیوں کو دیکھتے ہوئے ہم ڈرتے ہیں کہ ہماری تعمیری کاوشیں بارِ قبول پائیں گی یا نہیں۔ اس لئے ہم اپنی کاوشوں کی قبولیت کیلئے بھی سرتاپا دعا ہیں اور اس کے ساتھ وہ آرزوئیں بھی جو اس گھر کے مقاصد سے متعلق ہیں ان کی قبولیت کیلئے بھی ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ اس جملے سے گمان ہوتا ہے کہ ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے جو اللہ کے گھر کی تعمیر کی ہے وہ پہلے سے موجود بنیادوں کے اوپر کی ہے کیونکہ یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ انہوں نے بنیادیں رکھی تھیں بلکہ یہ فرمایا جارہا ہے کہ وہ بنیادوں کو اٹھا رہے تھے۔ اس سے ان روایات کی تائید ہوتی ہے، جس کا ذکر ہم پہلے بھی کرچکے ہیں کہ پہلے یہ گھر ایک ٹیلے کی شکل میں تھا جس کے نیچے اس کی بنیادیں دبی ہوئی تھیں۔ اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم نے جب اس ٹیلے کو کھودا تو اس کی بنیادیں نکل آئیں اس کے اوپر عظیم باپ بیٹے نے اللہ کے گھر کی تعمیر کی۔ اگلی آیاتِ کریمہ میں ان آرزوؤں کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے، جو دونوں باپ بیٹے کے دلوں میں مچل رہی تھیں اور جنہوں نے بالآخر دعاؤں کی صورت اختیار کرلی۔

Marfat.com

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ (البقرة:۱۲۸)

(اے ہمارے رب! ہم دونوں کو تو اپنا مسلم (فرمانبردار) بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی امتِ مسلمہ (ایک فرمانبردار امت) اٹھا اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما، بے شک تو توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے)

دعا کی وضاحت

تعمیر بیت اللہ کے دوران جو دعائیں بیت اللہ کے پاکیزہ معماروں کے لبوں تک آئیں اور انہیں اللہ کی کتاب میں ذکر فرما کر پروردگار نے لافانی کر دیا۔ یہ دعائیں اپنی گہرائی اور گیرائی میں بے نظیر ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر بے ساختہ اور فطری ہیں کہ آدمی ان کے سحر میں ڈوب جاتا ہے۔ سب سے پہلے غور فرمایئے! دعا مانگنے والے عام انسان نہیں بلکہ ان میں ایک اللہ کے خلیل ہیں اور دوسرے اللہ کی رضا کے ذبیح۔ تاریخ ان کی عظمتوں کی گواہ ہے۔ لیکن وہ اللہ کی بارگاہ میں اس قدر عاجز اور سرافگندہ ہیں کہ بار بار ربنا ان کے منہ سے بے ساختہ نکل رہا ہے۔ انہیں دنیا کی قیادت وامامت کا منصب مل چکا ہے، لیکن بارگاہِ رب میں ان کی عاجزی کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور پھر اپنے عظیم مقصد اور عظیم مقام کے حوالے سے کوئی چیز نہیں مانگ رہے بلکہ وہ چیز مانگ رہے ہیں جسے عام دیکھنے والی نگاہ بہت معمولی بات سمجھتی ہے۔

دعاؤں کا انداز دعا کا شعور بخشتا ہے

وہ پیغمبر ہیں، رسول ہیں، دنیا کے امام ہیں، لیکن صرف یہ درخواست کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا مسلمان بنا لے حالانکہ وہ نہ صرف کہ مسلمان ہیں بلکہ دنیا نے ان کی ذات اور ان کی زبان سے دینِ اسلام کی دولت پائی ہے اور جب بھی کوئی اسلام کیلئے اپنے اندر طلب یا تڑپ پاتا ہے تو وہ انہیں بزرگوں کی طرف نگاہیں اٹھاتا ہے اور انہیں کے نقوشِ قدم سے اللہ کے سامنے خودسپردگی کے انداز سیکھتا ہے۔ بایں ہمہ یہ دونوں باپ بیٹا اپنے لئے دعا کرتے ہیں کہ "یا اللہ! ہمیں اپنا مسلم اور فرمانبردار بنا"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر دو باتیں ہیں ایک تو یہ بات کہ اگرچہ ہمیں اللہ نے بیشمار سعادتوں سے نوازا ہے اور دنیا کیلئے ہمیں ہدایت کا سرچشمہ بنایا ہے۔ لیکن اللہ کے سامنے ہماری حیثیت ایک فرمانبردار غلام کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ کی نوازشات اپنی جگہ اور ہماری حقیقت شناسی اپنی جگہ۔ اس کی ذات اور اس کی بارگاہ اتنی عظیم ہے کہ وہاں ہر ایک کو عاجزی اور فرمانبرداری کی تصویر بن کر حاضر ہونا پڑتا ہے اور جب کسی کو یہ زعم ہو جائے کہ میں اللہ کے یہاں مقبول اور محترم ہوں اب مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں بار بار عاجزی سے اس طرح کی دعائیں مانگوں، سمجھ لیجئے وہ شخص برباد ہو گیا۔ اس لئے اللہ والوں کا حال پر میوہ شاخ کی طرح ہوتا ہے کہ جیسے جیسے وہ پھلوں اور میووں سے گراں بار ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے جھکتی چلی جاتی ہے۔ اللہ کے نبی اور ان کے راستے پر چلنے والے بھی اللہ کی نوازشات سے جیسے جیسے گراں بار ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے ان کی عاجزی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کی فکر کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے اپنی فکر کرتے ہیں۔ اپنے لئے بیش از بیش فرمانبرداری اور عاجزی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اس لئے یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے سب سے پہلے اپنے فرمانبردار ہونے کی دعا مانگی۔

Marfat.com

اللہ کے نبی بھی انسان ہوتے ہیں، وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح احساسات اور میلانات رکھتے ہیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح انہیں بھی اپنی اولاد پیاری ہوتی ہے۔ لیکن ان میں اور دوسرے انسانوں میں فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ ہمیشہ اپنی اولاد کیلئے دنیا اسباب دنیا اور زخارفِ دنیا کی دعائیں کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کے نبیوں کی نگاہ میں دنیا سے کہیں بڑھ کر آخرت اور دین کی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ دنیا سے پہلے وہ چیز مانگتے ہیں جو آخرت میں کام آنے والی ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے جب اللہ سے مانگنے کیلئے دامن پھیلایا تو اپنی اولاد کیلئے بھی وہی دولت مانگی جو اپنے لئے مانگی تھی کہ یا اللہ! ہمیں بھی اپنا مسلمان بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک امتِ مسلمہ یعنی فرمانبردار امت اٹھا۔ جن کی زندگی کا مقصد تیری فرمانبرداری تیرے دین کی سربلندی اور تیرے لئے اپنا سب کچھ قربان کردینے کے سوا کچھ نہ ہو کیونکہ اسلام کا معنی فرمانبرداری اور خود سپردگی ہے۔ آدمی سب کچھ اپنے اللہ کے سپرد کردیتا ہے وہاں سے جو ہدایت ملتی ہے اس کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ اپنی ذات، اپنے احساسات، اپنے تصورات، اپنے تخیلات، اپنے دل و دماغ کی رعنائیاں، اعضاء و جوارح کی توانائیاں، اپنا مال و دولت، اپنا اثر و اقتدار، سب کچھ اللہ کے حوالے کردیتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو اللہ کی ملکیت اور اپنے پاس امانت سمجھتا ہے۔ انہیں اس طرح استعمال میں لاتا ہے جس طرح اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس آیت میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام اپنی اولاد میں سے ایسی ہی امت اٹھانے کی دعا فرما رہے ہیں۔ امت ظاہر ہے ایک فرد کا نہیں ایک قوم اور ایک گروہ کا نام ہے۔ جسے زندگی گزارنے کیلئے ایک وطن چاہئے۔ زندگی میں تنظیم کیلئے ایک حکومت چاہئے۔ انفرادی اور اجتماعی اداروں کو چلانے اور نظم و نسق کی درستی کیلئے ایک آئین اور ایک قانون چاہئے۔ ضروریات کو پورا کرنے کیلئے وسائل چاہئیں۔ دشمنوں سے دفاع کیلئے طاقت اور قوت چاہئے۔ انہیں چیزوں سے امت باقی رہتی اور اپنا وجود منواتی ہے۔ انہیں چیزوں سے دنیا میں اسے ایک وقار اور ایک مقام ملتا ہے۔ یہاں یہ دعا مانگی جارہی ہے کہ الٰہی! ہماری ذریت میں ایک امت اٹھا اور انہیں یہ ساری نعمتیں اور دولتیں عطا فرما، لیکن اسے تیری مُسلِمہ ہونا چاہئے ان کا وطن تیری بندگی اور تیری اطاعت کی سرزمین ہو۔ ان کا آئین اور قانون تیرے احکام پر مشتمل اور تیری رضا کے مطابق ہو۔ ان کے ادارے تیری حقانیت کے علمبردار ہوں، ان کی قوت تیری قوت ہو، جو تیرے دین کی محافظ اور بندگانِ خدا کی کفیل ہو۔ ان کے ملک اور ان کی ریاست کو دیکھ کر لوگوں کو اندازہ ہو کہ ایک ایسی ریاست جس کا انتساب اللہ کی طرف ہو اور جو اپنا حقیقی حاکم اللہ کو سمجھتی ہو وہ کس طرح کی ہوتی ہے، اس کے خدوخال کیسے ہوتے ہیں، اس کی ترجیحات کیسی ہوتی ہیں، جس طرح ایک فرد اپنی ذات اور اپنے مفادات کو کبھی نہیں بھولتا وہ امت بھی تیری ذات اور تیرے دین کے مفادات کو کبھی نظر انداز کرنے والی نہ ہو بلکہ جب دنیا پر خود فراموشی اور خدا فراموشی کا دورہ پڑے تو یہ امت اور اس کا ایک ایک فرد تیری ذات کو یاد کرنے والا، یاد دلانے والا اور تیرے دین کا پیکر، مبلغ اور مناد ہو۔ جب دنیا کفر و باطل کی تاریکیوں میں ڈوب جائے اور ظلم کے اندھیرے گہرے ہوجائیں۔ تو اس کا ایک ایک فرد اس موذن کا کردار ادا کرے جس کی اذان سے ہر طرح کی تاریکیاں چھٹتیں ظلم کے پہرے ٹوٹتے اور نئی سحر طلوع ہوتی ہے۔ بقول اقبال:

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

Marfat.com

یہاں اس حقیقت پر غور فرمایئے! دعا مانگنے والے حضرتِ ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام ہیں اور دونوں اپنی ذریت میں سے امت مسلمہ اٹھائے جانے کی دعا مانگ رہے ہیں۔ اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ ایسی امت مانگی جارہی ہے جو حضرت ابراہیم بواسطہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہو۔ دوسرے لفظوں میں جو حضرت اسمٰعیل کے صلب سے وجود میں آئے۔ ظاہر ہے جو امت حضرت اسمٰعیل کے صلب سے اور آپ کی ذریت ہوگی وہ بنی اسمٰعیل کہلائے گی اس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسمٰعیل میں نبی آخرالزمان تشریف لائیں گے اور ان کی دعوت کے نتیجے میں وہ امت پیدا ہوگی جسے امتِ محمدیہ یا امتِ مسلمہ کہا جائے گا۔ اس میں بنی اسرائیل کا دور تک کوئی تعلق نہیں اس لئے ان کا یہ دعویٰ کرنا کہ نبی آخرالزمان بنی اسرائیل میں سے آئیں گے، سراسر خود فریبی کے سوا کچھ نہیں اور مزید یہ بات بھی کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے اپنے آپ کو مسلم بنائے جانے کی دعا کی ہے اور اپنی پشت سے جس امت کو اٹھانے کی دعا کی ہے اسے بھی امت مسلمہ قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے نہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کا یہودیت یا نصرانیت سے کوئی تعلق ہے نہ اس امت کا ان دونوں مذاہب سے کوئی تعلق ہے

اراءۃ کا مفہوم

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا مزید یہ دعا مانگی کہ ''یااللہ! ہمیں ہماری عبادت کے طریقے سکھا اور ہماری توبہ قبول فرما''۔ اس میں ارنا کا لفظ قابلِ توجہ ہے۔ ''اراءۃ'' کا معنی ہوتا ہے ''دکھانا''۔ ''اَرِ'' اسی سے امر ہے، تو اس کا معنی ہوگا ہمیں ''دکھا''۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ ''الٰہی! ہمیں ہماری عبادات کے طریقوں کی اس طرح آگاہی بخشئے کہ جیسے ہم ان طریقوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں''۔ یہ تعلیم اور آگاہی یقیناً وحی الٰہی کے ذریعے سے ہوگی، لیکن اسے ہمارے دماغوں اور دلوں کیلئے اس قدر سہل واضح اور دل نشیں بنادے کہ جیسے ہم نے یہ طریقے اپنے کانوں سے نہیں سنے بلکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اس لحاظ سے اراءۃ تعلیم اور تفہیم کے معنی ہی میں ہے، لیکن اس میں گہرائی اور گیرائی زیادہ ہے۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ کی طرف سے بندوں کو جو رہنمائی ملتی ہے اس کا سابقہ انبیاء کے دور میں یہ طریقہ بھی رہا ہے کہ نبی کو خواب میں کوئی بات دکھادی جاتی تھی اور نبی کا خواب چونکہ وحی ہوتا ہے اس لئے نبی اس خواب کے مطابق خود بھی عمل کرتا اور اپنی امت کو بھی حکم دیتا تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں اسی کو آپ نے حکم سمجھا اور آپ عمل پر کمربستہ ہوگئے اور یا ایسا ہوتا تھا کہ فرشتہ ظاہر ہوکر مطلوب کام کی طرف رہنمائی کردیتا تھا۔ یہاں یہ دونوں چیزیں بھی مراد ہوسکتی ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ آپ ہمیں اس طرح رہنمائی سے نوازیئے کہ اس میں کسی طرح کا اشتباہ باقی نہ رہے۔

مناسک کی تحقیق

مَنَاسِکُ. مَنْسَکُ کی جمع ہے۔ نَسَکَ کے اصل معنی ''دھونے اور پاک کرنے'' کے ہیں نسک الثوب کے معنی ہیں ''کپڑے کو دھوکر پاک کیا''۔ اسی سے نُسُکُ ہے۔ جس کے معنی ''قربانی'' کے ہیں۔ قربانی بندے کو گناہ کی آلودگی اور آلائشوں سے پاک کرکے اللہ تعالیٰ کا تقرب عطا کرتی ہے۔ اسی سے مَنسک ہے، جس کے معنی ''قربانی کے طریقہ'' کے بھی ہیں اور ''قربان گاہ'' کے بھی۔ اس کی جمع مناسک ہے جو حج کے تمام سلسلۂ عبادات و مراسم پر حاوی ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۰ میں فرمایا: فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ

Marfat.com

''جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو''۔اس دعا میں مناسک سے مراد عمومی طور پر تمام عبادات کے طریقے بھی مراد لئے جا سکتے ہیں، لیکن خاص طور پر یہاں مناسکِ حج کا ذکر کیا جا رہا ہے کیونکہ اللہ کے گھر کی تعمیر کے بعد یا اس کے دوران یہ دعائیں مانگی جا رہی ہیں تو اس گھر سے عبادات بھی وابستہ ہیں اور حج کی عبادت تو اسی گھر کے ساتھ مخصوص ہے۔اس لئے ضروری تھا کہ اس گھر کو بناتے ہوئے یہ دعائیں مانگی جاتیں اور ساتھ یہ فرمایا: وَتُبْ عَلَيْنَا ''تو ہماری توبہ قبول فرما''۔

توبہ کا مفہوم

تَـــابَ کا معنی ''لوٹنا'' ہوتا ہے۔جب اس کا فاعل بندہ ہو تو اس کا مطلب ہے ''بندہ معصیت سے اطاعت کی طرف لوٹ آیا ہے یا اپنی سرکشی سے عبدیت کی طرف لوٹ آیا ہے یا شیطان کی چاکری سے اللہ کی فرمانبرداری کی طرف لوٹ آیا ہے''۔لیکن جب اس کا فاعل اللہ ہو اور صلہ علیٰ کے ساتھ آئے تو پھر اس کا معنی ہوتا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ رحمت کے ساتھ اپنے بندوں کی طرف لوٹ آیا ہے''یعنی پہلے اگر ادھر سے بے التفاتی تھی تو اب التفات ہونے لگا، پہلے اگر رحمت دور تھی تو اب اللہ کی طرف سے رحمت برسنے لگی، یہاں اللہ کی رحمت کی ہی دعا کی جا رہی ہے۔یا اللہ! ہماری توبہ قبول فرما اور ہمارے ساتھ رحمت کا معاملہ فرما اور اپنی اس دعا کو اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کہہ کر مزید حسب حال بنا دیا ہے کہ الٰہی! ہم تیرے عاجز بندے ہیں ہمیں صرف تیری عنایات پر بھروسہ ہے ہمارا دستِ سوال صرف آپ ہی کے سامنے پھیلتا ہے اور آپ کی شان بھی یہ ہے کہ آپ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں اور رحم اور کرم فرمائی ہمیشہ آپ کا شیوہ ہے۔اس لئے ہم پر بھی رحمت نازل فرما، رحم کا معاملہ فرما۔

اپنی عاجزی اور خود سپردگی کے واسطے سے جب اللہ کی رحمت کو متوجہ کر لیا اور اس کی صفات کے حوالے سے جب رحمت کے قرب کو محسوس کیا تو پھر وہ دعا مانگی جس کے نتیجے میں انسان کو دنیوی اور اخروی کامیابیاں نصیب ہونے والی تھیں اور انسانیت کو وہ روشن صبح نصیب ہونے والی تھی، جس سے انسانیت کا مقدر ہمیشہ کیلئے جگمگانے والا تھا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (البقرة:۱۲۹)

(اے ہمارے رب! تو ان میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے)

''رَبَّنَا'' سے صفت ربوبیت کی توجہ دلا کر رسالت پر دلیل قائم کی:

اس دعا کا ایک ایک لفظ انتہائی قابلِ توجہ اور از بس سبق آموز ہے۔رَبَّنَا کہہ کر اللہ کی صفتِ ربوبیت کے حوالہ سے عرض کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں زندگی کی جو نعمتیں، زندگی کے امکانات، زندگی کی رعنائیاں، میسر ہیں، یہ سب تیری صفتِ ربوبیت کا صدقہ ہیں۔تو نے ہمیں خلق کر کے چھوڑ نہیں دیا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ جو ضرورت پیدا ہوئی اسے بھی مہیا فرمایا، بچپن دیا تو اس کے سنبھالنے والے بھی دیئے، لڑکپن

Marfat.com

دیا تو اس کے ناز بردار بھی عطا کئے، جوانی دی تو جوانی کے ولولے بھی دیئے، عمر آگے بڑھی تو شعور کی آگہی بھی عطا کی، دل ودماغ کی رعنائیاں بخشیں تو قوتِ عمل اور ارادوں کی بلندی سے بھی مالا مال کیا، زندگی میں تنوع کا ذوق دیا تو قوتِ ایجاد بھی بخشی، حسن دیا تو حسن کا اداشناس بھی بنایا، عشق بخشا تو پگھلنے کی توفیق بھی دی، غرضیکہ زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی ربوبیت کے احسانات سے گراں بار ہے۔ لیکن یہ ساری نعمتیں بے کار ہوتیں اگر زندگی کی صحیح نہج صحیح منزل، اور صحیح سمت کا شعور نہ بخشا جاتا۔ زندگی کے پر پیچ رستوں میں صراطِ مستقیم کی خبر نہ دی جاتی۔ شیطنت کے ہر طرف پھیلے ہوئے بہکاووں میں ہدایت اور ہادی سے بہرہ ور نہ کیا جاتا۔ چنانچہ اس کی صفتِ ربوبیت نے ہمیں اس معاملے میں بھی بے سہارا نہیں چھوڑا اس نے اس بات کو اپنی ذمہ داری ٹھہرایا اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی ''بے شک زندگی میں رہنمائی دینا ہماری ذمہ داری ہے''۔ اس کے لئے اس نے رسول بھیجے کتابیں اتاریں اور انسان کو گمراہی سے بچانے کا انتظام کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ کے گھر کے پاس اپنی اولاد کو بسایا اور اس سرزمین کو شہر بنایا، اس کیلئے امن اور رزق کی دعائیں مانگیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دعا نہ مانگی جاتی جس کے نتیجے میں انسان کو انسانیت ملتی ہے، شہروں میں صحیح معاشرت وجود میں آتی ہے، حکومت کا صحیح تصور پیدا ہوتا ہے، صحیح قانون اور صحیح آئین وجود میں آتا ہے اور بالخصوص زندگی اللہ کے گھر سے وابستہ ہو جاتی ہے اور انسان اپنی زندگی کے راز کو پالیتا ہے۔ چنانچہ اسی کیلئے آپ نے اللہ سے آخری رسول مانگا اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور یہ فرمایا کہ یہ رسول ہم سب سے آخر میں بھیجیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذہانت کی داد دینا پڑتی ہے کہ آپ نے رسول مانگا تو ان تمام ضرورتوں اور نزاکتوں کا بھی خیال رکھا جو کسی بھی امت کیلئے رسول سے استفادہ کی خاطر ضروری ہیں۔ پہلی بات فرمائی کہ یا اللہ! جن لوگوں کو میں تیرے محترم گھر کے پاس بسا رہا ہوں ان میں وہ رسول بھیجنا جس کی تعلیم کے نتیجے میں ایک امتِ مسلمہ وجود میں آئے کیونکہ اگر ان میں وہ رسول نہ آیا تو وہ امت وجود میں نہیں آئے گی جس کے کندھوں پر پوری دنیا کی اصلاح کا بوجھ ڈالا جانے والا ہے اور دوسری بات یہ فرمائی کہ یا اللہ ان میں وہ رسول بھیجنا جو انہیں میں سے ہو جن کو یہ لوگ جانتے پہچانتے ہوں جو ان کی زبان بولتا ہو، جو ان کے معروف کو سمجھتا ہو، جو ان کا مزاج آشنا ہو، اور یہ لوگ اس رسول کے خاندان سے واقف ہوں اور اس کی قبل از نبوت زندگی ان کے سامنے گزری ہو، تاکہ انہیں اس سے استفادہ کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے اور اس کی قوم اس رسول پر بے خبری کے باعث کوئی الزام اور کوئی عیب نہ لگا سکے اور انہیں دونوں باتوں میں اشارہ اس جانب بھی ہے کہ یہاں چونکہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد بسے گی تو جو رسول انہیں میں سے آئے گا وہ یقیناً آلِ اسمٰعیل میں سے ہوگا۔ اس کا بنی اسرائیل سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ یہ بات قرآنِ کریم، بنی اسرائیل کو سنا رہا ہے کہ تم نے جس طرح لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے کہ آخری آنے والا نبی بنی اسرائیل میں سے ہوگا ہم تمہارے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا وہ ورق الٹ کر دکھا رہے ہیں جس کا تعلق بیت اللہ سے ہے اور جس میں اس نے آنے والے پیغمبر کیلئے دعائیں مانگی ہیں اس میں بنی اسرائیل یا بنی اسحٰق کا دور تک کوئی تعلق نہیں کیونکہ ان کی اولاد مکہ معظمہ یا عرب میں آباد نہیں ہوئی اس سرزمین میں حضرت اسمٰعیل کی اولاد آباد ہوئی ہے اس لئے یہ دعائیں انہیں سے تعلق رکھتی ہیں اور یہی بات تورات سے بھی ثابت ہوتی ہے تثنیہ باب اٹھارہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مشہور پیشگوئی ذکر کی گئی ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے:

''تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا''

یہ الفاظ صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسمٰعیل ہیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ایک فرد ہیں اور آپ کے بھائی بنی اسمٰعیل ہیں۔ آپ کے بھائیوں میں سے نبی برپا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نبی بنی اسمٰعیل میں سے آئیگا کیونکہ اگر اس نبی کو بنی

Marfat.com

اسرائیل میں سے آنا ہوتا تو پھر یہ نہ کہا جاتا کہ تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا بلکہ یوں کہا جاتا کہ تمہیں میں سے تمہاری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قرار دیتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں آپ لوگوں کو اپنے معاملہ کی ابتدا بتلاتا ہوں کہ میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کے خواب کا مظہر ہوں۔''

عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت سے مراد ان کا یہ قول ہے جسے قرآنِ کریم نے نقل کیا ہے: اِنِّی مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَدُ ''میں بشارت دینے کیلئے آیا ہوں ایک ایسے رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا'' اور والدہ ماجدہ نے حالتِ حمل میں یہ خواب دیکھا تھا کہ میرے بطن سے ایک نور نکلا جس سے ملک شام کے محلات جگمگا اٹھے۔ حالی نے اسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ۔

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت
بڑھا جانب بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت
چلے آئے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل و نوید مسیحا

بعثت رسول ؐ کے تین مقاصد

اس کے بعد، آنے والے رسول کے تین مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ ۱: تلاوتِ آیات۔ ۲: تعلیمِ کتاب وحکمت۔ ۳: تزکیہ نفوس۔

تلاوت اور تعلیم کو الگ الگ بیان کرنے کی وجہ

یہاں غور کیجئے! تلاوت اور تعلیم کو الگ الگ دو مقاصد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے اور تعلیم کا معانی سے۔ ان دونوں کو الگ الگ بیان کرنے سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں۔ جب قرآنِ پاک کی تعریف کی جاتی ہے تو صرف اس کے معانی کو قرآن نہیں کہا جاتا بلکہ یہ کہا جاتا ہے: ھو النظم والمعنی جمیعا کہ ''قرآنِ کریم الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے''۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب کی طرح اسلام میں وحی کا تصور صرف معنی کا دل میں القا کر دینا نہیں وہ اپنی کتابوں کے بارے میں یہی تصور رکھتے ہیں کہ ان کتابوں کا معنی اور مفہوم ان کے پیغمبروں پر نازل ہوا تھا جسے انہوں نے اپنے الفاظ میں ترتیب دے کر اپنی امتوں تک پہنچایا، شائد یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتی گئیں اور ہر ترجے کو انہوں نے کتاب اللہ قرار دیا جس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ جس اصل زبان میں سب سے پہلے وہ کتاب مرتب ہوئی تھی وہ مٹ گئی۔ باقی صرف ترجے رہ گئے اب یہود اور نصاریٰ کو یہ تک معلوم نہیں کہ ان کی کتابیں اصل میں کس زبان میں تھیں۔ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ قرآن وسنت کے دلائل پر مبنی ہے کہ آنحضرت ﷺ پر قرآن کے

Marfat.com

الفاظ نازل ہوئے تھے، جس طرح آج ہم قرآنِ پاک کے الفاظ کی تلاوت کرتے ہیں، اسی طرح یہ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئے تھے اور مزید یہ کہ صرف الفاظ ہی نازل نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کے پڑھنے کا طریقہ ان کے مخارج، ان کی ادائیگی کا اسلوب، ان کا لب ولہجہ، جسے آج تجوید کے نام سے ایک فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو قرآنِ پاک پڑھنا سکھایا اور پھر انہیں الفاظ کا دور ہر سال ایک دفعہ حضور کے ساتھ کرتے اور آخری سال دو دفعہ کیا۔ آنحضرت ﷺ نے یہی لب ولہجہ اور قرآنِ پاک پڑھنے کا طریقہ امت تک منتقل کیا۔ چنانچہ آج ہم جب قرآنِ پاک پڑھتے ہیں تو ہم ان دونوں باتوں کی پابندی کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی لفظ بدلنے نہ پائے، اس کے اعراب میں غلطی نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ پڑھنے کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ آنے پائے۔ آنحضرت ﷺ کی تلاوت سے اہلِ علم نے جو اصول اخذ کئے ہیں انہیں فنِ تجوید کے نام سے مدون کردیا گیا ہے۔ قراء حضرات انہیں اصولوں کی پابندی سے قرآنِ پاک خود پڑھتے ہیں اور دوسروں کو پڑھنا سکھاتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی صرف قرآن پاک کے معنی اور مفہوم اور اس کے احکام کو قرآن قرار دیتا ہے تو وہ سخت غلطی کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مقصود اگرچہ قرآن پاک کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے لیکن چونکہ الفاظ بھی قرآنِ کریم کی حقیقت میں شامل ہیں اور یہی کلام اللہ ہے اس لئے ان سے صرفِ نظر کرنا انتہائی گمراہی ہے۔ مسلمانوں کو اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن حصولِ ثواب وتقرب کیلئے قرآنِ کریم کی تلاوت انتہائی ضروری ہے۔ ایک آدمی اگر قرآنِ کریم کو نہیں سمجھتا وہ صرف اس کو سادہ پڑھنا جانتا ہے، تو قرآن سمجھنے کی کوشش نہ کرنا یقیناً ایک کوتاہی ہے جس کی باز پرس ہوگی۔ لیکن بغیر سمجھے اس کی تلاوت اجر وثواب سے خالی نہیں۔ یہ اللہ کا کلام ہے اسے پڑھنے سے آدمی اپنے رب سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کے انوار اس پر برستے ہیں، وہ جتنا اخلاص اور محبت سے پڑھے گا اتنا ہی اجر وثواب سے نوازا جائے گا۔ صحابہ کرام باوجودیکہ قرآنِ پاک کی زبان کو خوب سمجھتے تھے لیکن وہ صرف غور وفکر پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مسلسل اس کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دفعہ قرآنِ پاک ختم کرنا تو ایسا معمول تھا جس میں کوئی صحابی بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ قرآنِ پاک کے الفاظ کے بارے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ اور یہ نازک احساس ہی ہے جس نے آج تک قرآنِ پاک کے الفاظ میں کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی اور یہ قرآن سے محبت کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں ہمیشہ ایک بڑی تعداد حفاظ کی رہی ہے اور اسی عقیدہ اور احساس کا نتیجہ ہے کہ فقہائے کرام نے صرف ترجمے کو بغیر الفاظ کے شائع کرنا حرام قرار دیا ہے اور صرف ترجمے کو قرآن کہنے سے منع کیا ہے اور یہ بھی ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص صرف ترجمہ پڑھتا ہے تو اسے قرآن پڑھنے پر جو اجر وثواب ملتا ہے وہ اس سے محروم رہے گا۔

آیاتِ قرآنی کی تحقیق

آیاتِ قرآنی اگرچہ الفاظ ہی کے مجموعے کا نام ہے، لیکن اس کا معنی اور مفہوم ایک اور حقیقت کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے۔ آیات، آیت کی جمع ہے۔ یہ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جاسکے۔ اس پہلو سے آسمان اور زمین کی ہر چیز آیت ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر چیز اللہ کی قدرت اور حکمت اور اس کی مختلف صفاتِ خلق وتدبیر پر ایک دلیل ہے۔ اسی طرح انبیائے کرام کے معجزات بھی آیت کہلاتے ہیں کیونکہ وہ بھی اپنے پیش کرنے والوں کی سچائی پر دلیل تھے۔ علی ہذا القیاس قرآن پاک کے الگ الگ جملوں کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر آیت کی حیثیت ایک دلیل اور برہان کی ہے۔ جس سے اللہ کی صفات اور اس کے احکام وقوانین کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اور ان میں سے ایک ایک آیت بعض دفعہ گہری حقیقتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

Marfat.com

تلاوتِ آیات

مختصر یہ کہ الفاظِ قرآن، قرآن کی حقیقت میں شامل ہیں۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کے منصبی فرائض میں سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآنِ کریم کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ تلاوت کے ساتھ جب علیٰ کا صلہ آتا ہے تو اس سے فعل تلاوت میں ایک زور اور اختیار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اللہ کا نبی اللہ کی کتاب کی تلاوت" کرتا ہے تو وہ اس طرح تلاوت نہیں کرتا جیسے خوش الحان قاری لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتا ہے۔ وہ خود بھی جھومتا ہے لوگ بھی جھومتے ہیں بلکہ اللہ کا نبی جب قرآن پڑھ کر سناتا ہے تو وہ اللہ کے قاصد اور اس کے سفیر کی حیثیت سے اللہ کے فرامین اللہ کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ سننے والے چاہے ہزار مخالف ہوں، چاہے ان کے ہاتھوں پیغمبر کی جان کو بھی خطرہ ہو لیکن جب وہ قرآن پڑھتا ہے تو چونکہ اس کی زبان سے اللہ بولتا ہے اس لئے اس کا لب ولہجہ ایک تحکم کا انداز رکھتا ہے اور اس کی بے خوفی اور بے نیازی احکم الحاکمین کی بے خوفی اور بے نیازی کا پرتو ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں جو کچھ پڑھ کر سنا رہا ہوں یہ میرا نہیں بلکہ اللہ کا کلام اور اس کے احکام کا مجموعہ ہے۔ اس کے لب ولہجہ میں شان وشکوہ کے ساتھ ساتھ گہری فکری مندی اور دل سوزی بھی ہوتی ہے۔ جس سے وہ سننے والوں کے نازک احساسات کو بھی انگیخت کرتا ہے اور آنے والے خطرے سے بھی انہیں آگاہ کرتا ہے کہ اگر تم نے قرآن کریم کو کما حقہ اہمیت نہ دی تو یاد رکھو! تم اللہ کے عذاب کا شکار ہو جاؤ گے۔

تعلیم کتاب وحکمت

آنحضرت کا دوسرا فرضِ منصبی، تعلیمِ کتاب وحکمت ہے۔ تعلیم تلاوت سے ایک بالکل مختلف اور زائد چیز ہے۔ تلاوتِ آیات کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کا رسول لوگوں کو وہ آیات پڑھ کر سنا دیتا ہے جو اس پر نازل ہوئیں۔ پڑھنے کا طریقہ ان پر واضح کر دیتا ہے۔ ضرورت محسوس ہوئی تو آداب سے آگاہ کر دیتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ اس کا معنی اور مفہوم کیا ہے۔ اس کا تعلق تلاوت سے نہیں تعلیم سے ہے۔ ایک معلم کا کام یہ ہے کہ وہ کسی بھی کتاب کے پڑھنے والے کو پہلے الفاظ کے معنی سمجھائے پھر ان کی مراد واضح کرے، پھر اس میں اگر کوئی مشکلات ہوں تو انہیں آسان کرے، اگر اس میں کوئی اجمال ہے تو اس کی تشریح کرے، ابہام ہے تو وضاحت کرے۔ اگر بین السطور کوئی اعتراض، کوئی اشکال، مقدر ہے تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی چیز مضمر ہے تو اسے کھولے، اگر کسی آیت کا تعلق احکام سے ہے تو احکام کا معنی اور مفہوم واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عملی صورت کو بھی واضح کرے۔ یعنی تھیوری کو پریکٹس میں لا کر دکھائے اور اگر ضرورت مخاطب کی ذہنی تربیت کی ہو تو سوالات کی صورت میں ذہن کو جلا دینے کی کوشش کرے۔ غرضیکہ جن جن باتوں سے افہام وتفہیم میں آسانی ہو، فکر وتدبر کی صلاحیت بڑھے اور کتابِ الٰہی پر غور کرنے کی استعداد میں اضافہ ہو وہ سب کچھ کرنا ایک معلم کی تعلیمی ذمہ داری ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو تعلیم دیتے ہوئے ان تمام چیزوں کا خیال رکھا اور ان تمام ضرورتوں کو پورا فرمایا بلکہ آپ کی تعلیم کی جو امتیازی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی عمل سے صرف عمل کا نمونہ ہی پیش نہیں فرمایا بلکہ عمل کی آمادگی کیلئے جن احساسات محرکات اور کیفیتوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے ایک ایک چیز کو آپ نے تعلیم کا حصہ بنا لیا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ تلاوتِ کتاب کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آپ پر قرآن کی صورت میں نازل ہوا وہ آپ نے پڑھ کر سنا دیا لیکن ان آیات کی تعلیم دیتے ہوئے آپ نے جو کچھ

Marfat.com

فرمایا جو وضاحتیں فرمائیں، جو شرح و تفسیر کی، جو تفصیلات مہیا فرمائیں، جو عمل کر کے دکھایا، یہ سب کچھ یقیناً تلاوتِ کتاب سے ایک زائد چیز ہے۔ یہی وہ زائد چیز ہے جو تعلیم کا لازمی حصہ ہے اس کے بغیر تعلیم کا کوئی تصور ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف کسی کتاب کو پڑھ کر سنا دینا تو تعلیم نہیں تعلیم تو جیسے پہلے عرض کیا اس سے ایک زائد چیز ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا اپنے پاس اپنے اساتذہ کے تشریحی نوٹس محفوظ رکھتے ہیں، انہیں کی مدد سے وہ کتاب کو سمجھتے ہیں اور انہیں کی مدد سے وہ امتحان کی تیاری کرتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی ان سے یہ کہے کہ تمہارے پاس اصل ٹیکسٹ بک یعنی نصابی کتاب موجود ہے تو تمہیں ان تشریحی نوٹس کی کیا ضرورت ہے؟ تو وہ کہنے والے کی جہالت پر ہنسیں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ معلم کی ضرورت اسی لئے تو ہے کہ وہ کتاب کی تعلیم دے اور یہ تشریحی نوٹس اسی تعلیم کا ثمرہ ہی تو ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم کے نتیجے میں احادیث اور سنت وجود میں آئی ہیں، کتاب اللہ کو ان کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ تشریح اور تفسیر کے حوالے سے قدم قدم پر حدیث و سنت کی ضرورت پڑتی ہے اور کتاب اللہ کے احکام کا تو تمام تر دارومدار حدیث اور سنت پر ہے ورنہ ان کی کوئی سی شکل متعین کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہی وہ بیان ہے جس کی ذمہ داری لیتے ہوئے پروردگار نے فرمایا:

اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَه ''اس کتاب کا بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے''۔

حکمت کیا ہے؟

تعلیم کتاب میں ہم نے یہ جو عرض کیا کہ قرآن سیکھنے والوں میں فکر و تدبر کی صلاحیت پیدا کرنا اور قرآنِ کریم میں غور و فکر کی استعداد پیدا کرنا یہ بھی تعلیم کا ایک حصہ اور معلم کی ذمہ داری ہے۔ درحقیقت عام ضروریات سے آگے بڑھ کر قرآن پاک کا ایسا ادراک پیدا کر دینا کہ جس سے استنباط اور استنتاج کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور عبارت کے ساتھ ساتھ کتاب کے اشارات اور اس کی دلالات کو سمجھنے کا ملکہ بھی پیدا ہو جائے اور پھر دل میں ایک ایسی لگن پیدا ہو جائے جس سے کتاب سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کے حقوق ادا کرنے کی امنگ بھی کروٹ لینے لگے۔ تو یہی وہ چیز ہے جس کو حکمت کہا جا سکتا ہے اور یہ چیز قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حدیث اور سنت کے سائے میں رہنے سے ملتی ہے۔ اہلِ علم نے اگرچہ حکمت کے مختلف مفہوم مراد لئے ہیں۔ کہیں اس کو علم صحیح کہا گیا ہے، کہیں نیک عمل، کہیں عدل و انصاف، کہیں قولِ صادق، لیکن حضرت شیخ الہند نے اس کا ترجمہ تہہ کی باتوں سے کیا ہے اور یہی وہ تہہ کی بات ہے جو آنحضرت ﷺ کی حدیث اور سنت سے ملتی ہے۔ جو سرتاپا قرآنِ کریم ہی سے ماخوذ اور مستنبط ہوتی ہے۔

تزکیۂ نفوس کا مفہوم

آنحضرت ﷺ کا تیسرا فرضِ منصبی تزکیۂ نفوس ہے۔ تزکیہ کا معنی ہے ''صاف ستھرا بنانا''۔ اس میں دو مفہوم شامل ہیں، ایک ہے ظاہری اور باطنی نجاسات سے پاک کرنا۔ ظاہری نجاسات سے تو سب واقف ہیں باطنی نجاسات سے مراد کفر، شرک، غیر اللہ پر اعتماد کلی اور اعتقادِ فاسد نیز تکبر و حسد، بغض، حب دنیا وغیرہ ہیں۔ ان تمام نجاستوں سے پاک کرنا بھی تزکیہ میں شامل ہے۔ دوسرا مفہوم جو اس میں شامل ہے وہ ہے نشو و نما دینا۔ درحقیقت یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ اسے مثال سے یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک کاشت کار زمین میں کوئی فصل پیدا کرنے سے پہلے زمین کا تزکیہ کرتا ہے۔ اس میں اگر جڑی بوٹیاں پھیلی ہوئی ہیں تو وہ انہیں اکھاڑ پھینکتا ہے زمین میں اگر

Marfat.com

کھائیاں ہیں تو وہ انہیں پاٹتا ہے۔ کہیں ٹیلے ہیں تو انہیں زمین کے برابر کر دیتا ہے پھر زمین میں ہل چلا کر، سہاگہ دے کر زمین کو بھربھری بناتا ہے یعنی وہ تمام علائق اور موانع جو کاشتکاری میں رکاوٹ ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک ایک چیز کو ختم کرتا ہے۔ اس طرح سے زمین جب کاشتکاری یا تخم قبول کرنے کے قابل ہو جاتی ہے تو تب وہ تخم کاشت کرتا ہے۔ یہ تزکیہ کا پہلا مرحلہ ہے۔ پھر جب وہ تخم کاشت کر دیتا ہے، تو اب دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اب ضروری ہے کہ جس چیز کو کاشت کیا گیا ہے، اسے کھاد کے ذریعے اور مسلسل نگرانی سے اس قابل بنایا جائے کہ ہواؤں کے جھونکے اسے جڑ سے نہ اکھاڑ سکیں۔ آبیاری کا ایسا سامان ہو کہ دھوپ کی تمازت اسے جلانے میں ناکام رہے۔ اسے ہر ممکن طریقے سے اس قابل بنایا جائے کہ اس میں استقلال اور استقامت کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ان دونوں مراحل کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ تزکیہ کا عمل مکمل ہو گیا ہے۔ بالکل یہی حال انسانی نفوس اور انسانی طبائع کا ہے۔ سب سے پہلے تزکیہ کیلئے یہ ضروری ہے کہ جس کا تزکیہ کرنا مقصود ہو اس کے افکار کی حالت کو دیکھا جائے اگر اس میں فکری جمود ہے تو اسے توڑا جائے اور اگر اس کے دل و دماغ میں غلط قسم کے افکار جگہ بنا چکے ہیں تو انہیں نکالنے کی تدبیر کی جائے۔ اگر خواہشات مقاصد کا درجہ حاصل کر چکی ہیں تو ان کیلئے صحیح نہج اختیار کی جائے اور اگر ضروریات پوری زندگی پر غالب آ چکی ہیں تو زندگی کا حقیقی شعور پیدا کیا جائے اور اس کے مقاصد کا صحیح تعین کیا جائے۔ فکری نہج کو درست کرنے کے بعد اخلاقی حالت کو دیکھا جائے، اگر حسنِ اخلاق کے بجائے اخلاقِ فاسدہ طبیعت میں راسخ ہو چکے ہیں تو ان کے ازالے یا امالے کی کوشش کی جائے اور اگر بلند انسانی اقدار کی جگہ حیوانی خصوصیات نے جگہ لے لی ہے تو انہیں انسانی اقدار سے بدلنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح سے جب تزکیہ کا طالب تمام موانع سے آزاد ہو جائے تو اب اس کے اندر اللہ اور رسول کی محبت، دین سے والہیت، اللہ کا خوف اور فکر آخرت کے اثرات گہرے کرنے کی کوشش کی جائے اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تزکیہ کے طالب میں استقلال اور استقامت کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہو گی جس کے نتیجے میں افکار باطلہ، اخلاقِ فاسدہ اور ہوائے نفس اس پر حملہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ وہ بڑی توانائی اور ثابت قدمی سے ان میں سے ایک ایک چیز کا مقابلہ کر سکے گا۔ رفتہ رفتہ اس میں یہ قوت پیدا ہو جائے گی کہ وہ دوسروں سے متاثر ہونے کی بجائے دوسروں پر اثر انداز ہو گا اس کا ہر عمل متعدی ہو گا جس سے دوسرے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ جس طرح پانی مختلف اثرات سے جم کر جب برف بن جاتا ہے، تو پھر وہ صرف پانی نہیں رہتا بلکہ دوسروں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ جو بھی اسے ہاتھ لگاتا ہے ٹھنڈک محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور جس ماحول میں اسے رکھا جائے گا وہ ماحول برودت کے اثرات قبول کیئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اس تفصیل سے آپ نے اندازہ کیا ہو گا کہ تزکیہ تعلیم سے ایک مشکل کام ہے جس کیلئے نہائت دیدہ ریزی، مشقت اور صبر و ریاض کی ضرورت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کیلئے تزکیہ کرنے والے کو اپنی شخصیت پگھلانی پڑتی ہے۔ اسی کی شخصیت کے اثرات ہیں جن سے دوسری صالح شخصیتیں وجود میں آتیں اور آہستہ آہستہ ایک چمن کھل اٹھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کا تزکیہ ایسی ہی کاوشوں اور ایسے ہی احساسات کے ساتھ فرمایا تھا۔ جس کا نتیجہ تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ وہ لوگ جو علم کے لحاظ سے جاہل، اخلاق کے لحاظ سے بدقماش اور انسانیت کے لحاظ سے پرلے درجے کے حیوان تھے، اس تزکیہ کے عمل نے پہلے انہیں ہر طرح کی کج روی اور برائی سے نکالا اور اس کے بعد مسلسل محنت سے اس طرح انہیں نشو و نما دیا کہ ابو بکر ص، صدیق ہو گئے، عمر ص، فاروق اعظم بن گئے، عثمان ص، صاحب الحیاء کہلائے اور علی ص، حیدر کرار ہو گئے، خالد ص، سیف اللہ بن گئے، ابو عبیدہ ص، امین الامت بن گئے، غرضیکہ ایک ایک صحابی چرخ ہدایت کا ایسا ستارہ بن کے چمکا کہ جس نے باطل کی ہر ظلمت کو کافور کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کے تزکیہ نے صحابہ میں جو حیرت انگیز صفات پیدا کیں اقبال نے ان میں سے چند کا ذکر بڑی خوبصورتی سے مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے۔

Marfat.com

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دوجہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیِ اربابِ ذوق فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل

تزکیہ کی حقیقت کو جتنی گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جائے اتنی ہی اس کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ایک تزکیہ کرنے والا ایک طرف تو علمی طور پر تزکیہ کے طالب کو ایک ایک عقیدۂ فاسد، ایک ایک فکری کج روی، ایک ایک بداخلاقی، ایک ایک عادتِ بد اور ایک ایک گندے تصور سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر مسلسل تربیت سے ان چیزوں سے اسے پاک بھی کرتا ہے۔لیکن انسان کی اس کمزوری کا کیا علاج کیا جائے کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک چیز کے غلط ہونے کو جانتا ہے، وہ علمی طور پر خوب واقف ہے کہ فلاں چیز میرے دین کیلئے مہلک ہے اور اچھے ماحول میں رہ کر یا زوردینے پر وہ بری چیزوں سے بچنے کی کوشش بھی کرتا ہے، لیکن اس کے اندر وہ قوت پیدا نہیں ہوتی جو اسے بری چیزوں کے قریب نہ جانے دے اور وہ امنگ اس کے اندر نہیں اٹھتی جو اسے ہر اچھی بات کا دیوانہ بنا دے۔غالب کا مشہور شعر ہے ؂

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

تزکیہ کیلئے صحبتِ صالح ضروری ہے

مقصود تو طبیعت کو اطاعت و زہد کی طرف لانا ہے اگر وہ اطاعت و زہد کے ثواب کو جان کر بھی ادھر نہیں آتی تو پھر جاننے کا کیا فائدہ؟ یہی وہ مرحلہ ہے، جو انسانی تربیت کیلئے سب سے مشکل ہے۔ہم تعلیم کے زور سے بہتر سے بہتر کتابیں پڑھا کر لٹریچر کا مطالعہ کرا کے تربیت کی کوشش کرتے ہیں لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ اس سے کیفیت وہی پیدا ہوتی ہے جس کا ذکر غالب نے کیا ہے۔کہ ان کاوشوں سے علمی آگاہی میں تو ضرور اضافہ ہوتا ہے لیکن عمل کی مطلوب کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔اللہ کے نبی اور ان کے راستوں پر چلنے والے علمی آگاہی کے ساتھ ساتھ یہ قوت بھی تزکیہ کے نتیجہ میں پیدا کرتے ہیں۔وہ صرف یہی نہیں بتاتے کہ تمہیں مسلمان کی حیثیت سے کیا کرنا چاہئے بلکہ وہ طبیعتوں میں نیکی کی آمادگی بھی پیدا کرتے ہیں۔جس طرح ایک مہذب آدمی کو صاف ستھرا رہنے کیلئے سمجھانا نہیں پڑتا علم کے رسیا کو مطالعے کیلئے ترغیب نہیں دینا پڑتی۔ایک کھلاڑی کو سٹیڈیم کا راستہ نہیں دکھانا پڑتا کیونکہ ان کے اندر ان تمام کاموں کیلئے ایک آمادگی، رغبت یا ان کا احساس پہلے سے موجود ہے۔یہی احساس اگر نیکی کو جاننے والے کے اندر پیدا کر دیا جائے تو پھر اسے نیکی کی ترغیب دینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔شاید اسی لئے آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کیلئے نیکی کی تعریف یہ فرمائی تھی کہ نیکی وہ ہے جو تجھے خوش کرے اور برائی وہ ہے جو تیرے دل کی پھانس بن جائے۔لیکن یہ اس صاحبِ ایمان کیلئے ہے۔جس کے اندر نیکی کا حقیقی شعور پیدا ہو چکا ہو اور یہ حقیقی شعور محض علم سے پیدا نہیں ہوتا نہ اس کیلئے کتابیں کفایت کرتی ہیں بلکہ اس کیلئے ایسے لوگوں کی صحبت اور تربیت ضروری ہے جن کے اندر نیکی ایک متعدی عمل بن چکا ہو اور جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آتا ہو اور جن کی صحبت میں بیٹھ کر دنیا کی محبت کم ہوتی ہو اور آخرت کی محبت بڑھتی ہو۔کتابوں سے تو علم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی صحبت حقیقت میں شخصیت ساز ثابت ہوتی ہے۔اکبر مرحوم نے ٹھیک کہا تھا ؂

Marfat.com

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

کیفیت سے کیفیت پیدا ہوتی ہے

جب ہم کسی ایسے اللہ والے کی صحبت میں بیٹھتے ہیں کہ جب وہ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے تو اس کے منہ میں پانی بھر بھر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس نے جنت کی نعمتیں چکھ کر دیکھی ہیں اور جب وہ جہنم کے عذاب کا ذکر کرتا ہے تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اور اس کے جسم پر کپکپی چھوٹ جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی ہولناکیوں کو دیکھ چکا ہے۔ اندازہ فرمائیے! جنت اور جہنم کا حقیقی احساس آپ کو جنت اور جہنم کی تفصیلات پڑھ کر ہوگا یا ایسے اللہ والے کی اس طرح کی کیفیات دیکھ کر۔ اس طرح کی کیفیتیں ہیں جب دوسرے کی طرف منتقل ہوتی ہیں تو ان کے نتیجے میں شخصیت سے شخصیت بننے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے یہ صحبتیں دراز ہوتی جاتی ہیں، ویسے ویسے شخصیت کی تعمیر تکمیل پذیر ہوتی جاتی ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے قرآنِ کریم میں یہ ضرور پڑھا کہ نماز خشوع خضوع سے ادا کرنی چاہئے۔ لیکن یہ خشوع وخضوع ہمارے اندر اس وقت پیدا ہوا اور اس کا صحیح تاثر ہمیں اس وقت نصیب ہوا جب ہم نے آنحضرت ﷺ کو قیام لیل میں دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور اللہ کے خوف اور اس کی محبت سے آپ کے سینے سے اس طرح آواز نکلتی ہے، جیسے ہنڈیا ابلنے سے نکلتی ہے۔

ہم نے دنیا سے بے رغبتی اور زہد کے بارے میں بہت کچھ پڑھا بھی اور سنا بھی لیکن ہمارے اندر اس کی حقیقت اس وقت جلوہ گر ہوئی جب ہم نے حضور کے شکمِ مبارک پر پتھر بندھے ہوئے دیکھے اور جب ایک دفعہ بستر پر چند اشرفیاں پڑی رہ گئیں تو آپ نماز کے بعد فوراً گھر کی طرف لپکے اور اس وقت چین آیا جب آپ نے اشرفیوں کو خیرات کر دیا اور فرمایا کہ ''محمد'' اس حال میں اللہ سے ملے گا کہ اس کے گھر میں دنیا کا مال پڑا ہوگا۔

تزکیہ کا یہ مرحلہ جس کا تعلق تمام تر اہل اللہ کی صحبت سے ہے آنحضرت ﷺ سے امت کو منتقل ہوا ہے اور قرآنِ پاک میں کئی جگہ اس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا: یَـٰۤأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ''مسلمانوں اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کی صحبت میں رہو''۔ تزکیہ اور اصلاح کیلئے بنیادی چیز اللہ کا تقویٰ ہے اور وہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک علمِ صحیح کے ساتھ ساتھ سچوں یعنی اللہ والوں کی صحبت اختیار نہ کی جائے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور پھر آپ کے فرائضِ نبوت کے بیان کرنے کے بعد آخر آیت میں اللہ نے اپنی دو صفتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ''عزیز اور حکیم''۔ ''عزیز'' کا معنیٰ 'غالب اور عزت اور قوت والے' کے ہیں۔ یعنی وہ ذات جو پوری قوت وہیبت، شان وشکوہ اور اختیار او راقتدار کے ساتھ کائنات پر حکمرانی کر رہی ہے۔ ''حکیم'' کا معنی ہے ''وہ ذات جس کے ہر کام میں حکمت، مصلحت اور مقصد وغایت ہو'' ان دو صفتوں کے لانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شائد ہمیں یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات پر پوری قوت اور پورے غلبے کے ساتھ حکومت کر رہا ہے۔ اس کی قوت اور غلبے میں کوئی کمی نہیں اور کسی کی مجال نہیں جو اس کی حکومت کو چیلنج کر سکے۔ وہ ہر چیز پر پوری طرح حاوی اور متصرف ہے۔ لیکن اس کی حکومت اور اقتدار کا یہ معنیٰ نہیں کہ وہ اپنی قوت وزور سے جو چاہے کر ڈالے بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت اور مصلحت کے ساتھ کرتا ہے کیونکہ وہ عزیز ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہے اس کا کوئی کام بھی حکمت اور مصلحت سے خالی

Marfat.com

نہیں ہوتا۔ وہ چونکہ عزیز ہے، اس لئے اس نے اپنی قوت سے اس کائنات کو پیدا کیا ہے، لیکن وہ عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی ہے، اس لئے اس نے اپنی پیدا کی ہوئی اس مملکت میں اپنے سفیر اور پیغمبر بھی بھیجے تاکہ وہ اس کی رعیت کو اس کے احکام اور قوانین سے آگاہ کریں۔ چنانچہ اس کے سفیروں اور پیغمبروں میں سے سب سے آخری سفیر اور پیغمبر "محمد ﷺ" کو بھیجا جا رہا ہے تاکہ قیامت تک کیلئے اس مملکت میں بسنے والے انسانوں کو اللہ کے احکام اور قوانین سے آگاہ کریں اور زندگی کو اس طرح گزارنے کا طریقہ سکھائیں جس سے اللہ راضی ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ
اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ
وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٠﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ
قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ
وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ
اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ
الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ
اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا
وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٣﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا
كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٤﴾ وَ
قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ
حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٣٥﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

Marfat.com

وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ
رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾
فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا
هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣٧﴾ ط
صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿١٣٨﴾
قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَ
لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿١٣٩﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ
اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ
كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ
اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٠﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤١﴾ ع

رکوع ١٦۔ (اورکون ہے جو اعراض کر سکے ملّتِ ابراہیم سے مگر وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی برگزیدہ کیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرہ میں ہوں گے۔ اور وہ وقت یاد کرو! جب حضرت ابراہیم کو ان کے پروردگار نے فرمایا، اسلام لے آؤ (سب کچھ سپرد کردو)، حضرت ابراہیم نے کہا میں نے اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کے سپرد کردیا۔ اور ابراہیم نے اسی ملت کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی، اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے دینِ اسلام کو منتخب فرمایا تو تم نہ مرنا مگر اسلام کی حالت پر ٥ کیا تم اس وقت

Marfat.com

موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا جب اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے آباؤ اجداد ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق۔ کے معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ یہ ایک گروہ تھا جو گزر گیا اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کمایا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بارے میں تم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہودی بنو یا نصرانی تو ہدایت پا جاؤ گے۔ کہو! بلکہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو اللہ کی طرف یکسو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ مسلمانو! کہو! ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور اس ہدایت پر ایمان لاؤ جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی اور ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اسی کے فرماں بردار ہیں۔ اگر وہ اس طرح ایما ن لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر وہ اعراض کریں تو پھر وہ درپے مخالفت ہیں ان کے مقابلے میں تمہارے لئے اللہ کافی ہوگا وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔ کہہ دو! کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو حالانکہ وہی ہمارا بھی رب ہے وہی تمہارا بھی رب ہے ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں اور ہم خالص اسی کیلئے ہیں۔ کیا تم دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد یہودی تھے یا نصرانی۔ پوچھو! تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے چھپائے اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ یہ گروہ تھا جو گزر چکا اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کمایا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کی بابت تم سے سوال نہ ہوگا) (آیت ۱۳۰ تا ۱۴۱)

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (البقرة: ۱۳۰)

(اور کون ہے جو اعراض کر سکے ملتِ ابراہیم سے مگر وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی برگزیدہ کیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرہ میں ہوں گے)

رَغِبَ، یَرْغَبُ کا معنی ہوتا ہے "رغبت کرنا، مشتاق ہونا"۔ لیکن جب اس کا صلہ عن سے آتا ہے، جیسے اس آیتِ کریمہ میں آیا ہے تو پھر اس کا معنی بالکل الٹ جاتا ہے۔ پھر اس کا معنی ہوتا ہے "بے رغبت ہونا، بے زار ہونا اور اعراض کرنا"۔ یہاں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ نہائت تحدی اور چیلنج کے انداز میں یا تعجب اور افسوس کے انداز میں فرمایا جا رہا ہے کہ ملتِ ابراہیم سے کوئی شخص اعراض نہیں کر سکتا بجز اس آدمی کے جس نے اپنے آپ کو بیوقوف بنا لیا یا اپنا نصیبہ بگاڑ لیا۔ ایسے آدمی کے کسی فیصلے پر افسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ فیصلے وہ قابلِ ذکر اور قابلِ قدر ہوتے ہیں جو عقل و خرد سے کیے جائیں اور پھر ان کے پیچھے گہری بصیرت اور گہرا احساس پایا جاتا ہو۔ اگر ملتِ ابراہیم کے بارے میں عقل و خرد اور احساس کے ساتھ فیصلہ کرنے کی کوشش کی جائے تو ملتِ ابراہیم کے اتباع کا فیصلہ تو ہو سکتا ہے اس سے اعراض کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔

Marfat.com

ملت ابراہیم کا مفہوم

ملتِ ابراہیم کا معنی ہے ابراہیم کا طریقہ یعنی ابراہیم کا دین، اس کا طرزِ عمل، اس کا ضابطۂ حیات۔ اسے دیکھنے اور سمجھنے کیلئے ہمارے پاس کئی معیارات ہیں۔ سب سے پہلا معیار تو یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ سے سابق آیاتِ کریمہ میں ابراہیم علیہ السلام کے کارناموں ان کے گہرے احساس ان کی للّٰہیت، ان کے تاریخی آثار، ان کی سوچ اور ان کی دعاؤں کا ذکر ہے۔ اس پورے خاکے کو سامنے رکھیئے، پھر غیر جانب داری سے دیکھئے کہ اس سے کیسی تصویر وجود میں آتی ہے۔ وہ تصویر ایک ایسی مقدس شخصیت کی ہے جس کی زندگی تمام تر اللہ کی رضا کے حصول کا دوسرا نام ہے۔ اس کا ایک ایک ورق اللہ کی رضا اس کی اطاعت اس کے دین کی تبلیغ واشاعت، اس کی سربلندی اور اسی کیلئے قربانیوں کے نور سے روشن ہے۔ انہیں کارناموں اور قربانیوں کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس عظیم شخصیت کو دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ اس کے ہاتھوں اس گھر کی تعمیر کراتا ہے جو اللہ کی بندگی اور عبادت کا سب سے پہلا مرکز اور دنیا بھر کی ہدایت کا سب سے پہلا سرچشمہ ہے۔ اسی کی دعاؤں سے وہ رسول مبعوث ہوتا ہے، جس کا اٹھایا ہوا انقلاب پوری نوعِ انسانی کی ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے اور اسی کی برکت سے ایک ایسی امت وجود میں آتی ہے جو اس زمین کے بڑے حصے پر اللہ کے نام کو بلند کرتی اور اس کے دین کو نافذ کرتی ہے۔ یہی وہ ملتِ ابراہیمی ہے جس نے اسلام کے نام سے ایک نئی تاریخ کو جنم دینا شروع کیا ہے۔ پھر جب ہم اس کی تعلیمات کو دیکھتے ہیں تو اس کی ایک ایک تعلیم عین طبعِ سلیم کی ترجمان ہے۔ اس نے اعتقادات سے لے کر احکامات تک جو کچھ انسان کو دیا ہے وہ عین دینِ فطرت اور طبعِ سلیم کی پکار ہے۔ اس نے جماعت یعنی سوسائٹی کا جو نظام قائم کیا ہے وہی بہتر نظامِ اجتماعی ہے۔ ہر فرد کیلئے جو ضابطۂ عمل بنا دیا وہی بہترین ضابطۂ شخصی ہے۔ عقل و جذبات، فرد و جماعت، دل و دماغ، جسم و روح، حریت و اطاعت، حیاتِ بشری کے متضاد و متناقض عناصر کی جتنی باہمی رعایت شریعتِ اسلام نے ملحوظ رکھی ہے، دنیا کے کسی قانون میں اس کی نظیر نہیں ملے گی۔ یہ تو ملتِ ابراہیم کی نئی شکل ہے جس کی اسلام نے تجدید کی ہے۔ لیکن جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کی ہمہ گیری کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہودی، نصرانی اور مشرکینِ عرب اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود حضرت ابراہیم کو اپنا قائد اور پیشوا مانتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک دوسرے کے انبیاء کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن حضرت ابراہیم کے ماننے میں وہ متفق ہیں۔ اس لئے قرآنِ کریم نے کہا وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا "ہم نے اس کو دنیا میں برگزیدہ کیا اور چن لیا"۔ یہ دنیا میں ان کی برگزیدگی کی دلیل ہے کہ تمام گروہ باہمی ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہوئے بھی حضرت ابراہیم کی ذات پر جمع ہیں اور جہاں تک آخرت کا تعلق ہے مشرکینِ عرب تو آخرت کے تصور سے ہی بے نیاز ہیں اور جہاں تک اہلِ کتاب کا تعلق ہے ان کے نوشتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے فضائل اس وقت بھی درج تھے اور آج تک لکھے چلے آتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی یہی ہر دل عزیزی ہے جس کی وجہ سے اللہ کا دین کہنے کی بجائے ملتِ ابراہیم کہہ کر ان تمام گروہوں کو اس طرف متوجہ کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی سابقہ آیات میں بھی اور اس کے بعد کے آنے والی آیات میں بھی ملتِ ابراہیم کی پوری طرح وضاحت کر دی گئی ہے کہ ملتِ ابراہیم اسلام کے سوا کوئی اور چیز نہیں۔

اس آیتِ کریمہ کا آخری جملہ ہے وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ "ابراہیم آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے"۔ عجیب بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں اُس گروہ کا ذکر فرمایا ہے جن پر اللہ نے انعامات کی بارش فرمائی ہے اور جن کے راستے پر چلنے کی سورۃ الفاتحہ میں ہر مسلمان دعا کرتا ہے، اس گروہ کے افراد انبیاء ہیں، صدیق ہیں، شہدا ہیں اور صالحین ہیں۔ گویا صالحین کا آخری درجہ ہے۔ لیکن پیشِ نظر

Marfat.com

آیتِ کریمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے۔اسی طرح ہم سورۃ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا دیکھتے ہیں: تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ "یااللہ! مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں وفات دینا اور صالحین کے گروہ میں مجھے شامل فرمانا"۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالحین منعم علیھم کا آخری درجہ نہیں بلکہ یہ کوئی ایسا مقام ہے جس کی تمنا انبیاء کرام بھی کرتے ہیں۔بات درحقیقت یہ ہے کہ مسلم اور صالح دو ایسے لفظ ہیں جس کے ابتدائی معنی بھی معتبر ہیں اور انتہائی معنی بھی۔عام معنی میں یہ لفظ ہر نیک مسلمان کو شامل ہے، جس آدمی کو ہم احکامِ اسلامی کا پابند دیکھتے ہیں اسے ہم صالحین میں شمار کرتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ عام نیک آدمی بھی صالحین مین شامل ہے۔لیکن اللہ کے وہ نیک بندے جن کی زندگی دوسروں کیلئے نمونہ ہے جنہوں نے اللہ کی بندگی اور اطاعت کا مقدور بھر حق ادا کیا ہے، اور ان کا شمار انبیائے کرام میں ہوتا ہے انہیں بھی مسلم اور صالح کہا جاتا ہے کیونکہ ان الفاظ میں اس قدر وسعت ہے اور ان میں اس قدر درجات ہیں کہ پیغمبر بھی اس کا آخری درجہ حاصل کرنے کیلئے آرزو کرتے ہیں۔جس طرح ایک معمولی صحت کا آدمی بلکہ اپاہج تک انسان کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے اور اسے بھی انسان کہا جاتا ہے جو اپنی صحت اور توانائی میں دوسروں کیلئے مثال ہوتا ہے۔اسی طرح جو شخص نیکی اور اطاعت کے ادنیٰ درجہ میں ہے وہ بھی مسلم اور صالح ہے اور جو ان درجات کو حاصل کرتے کرتے پوری دنیا کا امام بن جاتا ہے۔وہ بھی مسلم اور صالحین میں شمار ہوتا ہے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں دنیا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برگزیدہ ہونے اور آخرت میں آپ کے سرافراز ہونے کی حقیقی وجہ بیان کی گئی ہے۔اور یہی چیز حضرت ابراہیم کی پوری زندگی کا عنوان بھی ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (البقرة: ۱۳۱)

(اور وہ وقت یاد کرو! جب حضرت ابراہیم کو ان کے پروردگار نے فرمایا، اسلام لے آؤ (سب کچھ سپرد کردو)، حضرت ابراہیم نے کہا میں نے اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کے سپرد کردیا)

اسلام کا مفہوم

اَسْلِمْ کا معنی ہے "اسلام لے آ" اور اسلام کا معنی ہے "سپرد کردینا، حوالہ کردینا"۔بندے اور اس کے رب کے درمیان حقیقت میں یہی رشتہ ہے۔اس میں کمی اور کمزوری گمراہی ہے اور اس سے اعراض اور انحراف کفر ہے۔اسی رشتے کو پختہ کرتے چلے جانا اور اس کی نزاکتوں کو سمجھ کر سرتاپا تسلیم وانقیاد بن جانا، اس تعلق کی معراج ہے اور یہی ملتِ ابراہیم اور اسلام ہے۔حضرت ابراہیم سے جب کہا گیا کہ تم اپنا آپ ہمارے سپرد کردو تو اس کا مطلب یہ تھا کہ آج کے بعد تمہارا سر ہمارے سوا کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔تمہارے دل میں کسی کی محبت اللہ کی محبت پر غالب نہ آئے، تمہارے دل میں ہر نفرت کا آخری حوالہ صرف اللہ کی ذات ہو، تمہاری زندگی کی منزل صرف رضائے خداوندی ہو، تمہارے دل میں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہو، تمہاری چاہتیں خواہشیں آرزوئیں اس کے دربار سے اذن لے کر آگے بڑھیں، تمہارے دل میں اپنی ذات کے غلبے کیلئے نہیں بلکہ اللہ کے دین کے غلبے کیلئے خواہشیں مچلیں، تمہاری ذات کا سفر اللہ کے سوا کسی اور طرف نہ ہو، تمہارا وطن وہ ہو جہاں دین غالب ہو، تمہاری ہجرت صرف اللہ کی طرف ہو اور تمہاری پناہ گاہ صرف اللہ کی ذات ہو، تمہاری نماز اور تمہاری قربانی،

Marfat.com

تمھارا مرنا اور جینا صرف اللہ کیلئے ہو۔ حضرت ابراہیم نے اس کے جواب میں عرض کی اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَحا لانکہ آپ کا جواب ہونا چاہئے تھا: اَسْلَمْتُ لَکَ ''میں نے سب کچھ تیرے سپرد کر دیا''۔ اس جملے میں خود سپردگی کے ساتھ ساتھ اظہارِ ذات بھی ہے، ایسا لگتا ہے جیسے کہنے والا سینہ بجا کر کہتا ہے کہ میں آپ ہی کا ہوں آپ کا غلام ہوں، آپ کا وفادار ہوں، مجھ سے بڑھ کر آپ کا بندۂ بے دام کون ہو سکتا ہے۔ اس میں اگرچہ ہر طرح کی وفاداری کا اظہار ہے، لیکن نفی ذات نہیں ہے جس کے بغیر خود سپردگی اور وفاداری اپنی معراج کو نہیں پا سکتی۔ اس لئے حضرت ابراہیم نے عرض کیا کہ میں نے سب کچھ رب العالمین کے سپرد کیا۔ اور ایسا کر کے میں نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا اور نہ میں اس کارنامے کو انجام دینے والا پہلا شخص ہوں۔ اس کائنات کی ایک ایک چیز اپنے خالق کے سامنے سر ڈالے ہوئے ہے۔ کلی اس کی اجازت کے بغیر نہیں چٹکتی، پھول اسی کی رضا کیلئے مہکتا ہے، سورج کی کرن اسے سجدہ کرنے کے بعد سفر کا آغاز کرتی ہے، پہاڑوں کا استقلال اسی کیلئے ہے، سائے اسی کے سامنے دراز ہوتے ہیں، سبزہ اسی کے جلال سے لپٹتا ہے، جبرئیل جیسا مطاع امین اور صاحب قوت فرشتہ سدرۃ المنتہٰی پر پہنچ کر اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہوا کہتا ہے ۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

ہر چھوٹی بڑی مخلوق اپنی ذات کی نفی کر کے اسی کے احکام اور اسی کی رضا کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ میں بھی اسی جہانِ رنگ و بو کا ایک فرد ہوں اس لئے میں کائنات کی اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں بھی آپ کے سامنے اپنی شخصیت، اپنے علاقات، اپنے احساسات، اپنے انفعالات، اپنی توانائیوں، اپنی قوتوں، اپنی فکری رفعتوں اور اپنی ناتوانیوں کو آپ کے سپرد کرتا ہوں اور آپ کے آستانے پر ڈھیر کرتا ہوں۔ یہ ہے حقیقت میں ملت ابراہیمی جس کی عملی تصویر حضرتِ ابراہیم کی ذات والا صفات تھی۔ جس طرح اس کی تعلیمات آپ کی ذات سے پھوٹتی تھیں اسی طرح اس کا شدید احساس آپ کی زبان سے دوسروں تک منتقل بھی ہوتا تھا۔ زندگی بھر اس نے دعوت و تبلیغ اور جہاد کی صورت اپنا سفر جاری رکھا اور جب آخری وقت آیا تو وصیت کی شکل اختیار کر گیا۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ط يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ط اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ لا اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ط قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ج وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ O (البقرۃ: ۱۳۲ تا ۱۳۳)

(اور ابراہیم نے اسی ملت کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی، اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے دینِ اسلام کو منتخب فرمایا تو تم نہ مرنا مگر اسلام کی حالت پر O کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا جب اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے آباؤ اجداد ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق۔ کے معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں)

Marfat.com

وصّٰی کامصدر توصیة ہے۔ جس کا معنی ہے "وصیت کرنا"۔ لیکن یہ یادر ہے کہ عربی کا لفظ وصیت اردو کے وصیت سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اردو میں بسترِ مرگ کی خواہشوں اور مرنے والے کی آخری ہدایتوں کو وصیت کہا جاتا ہے لیکن عربی میں اس کا معنی تعلیم اور تلقین کرنا ہے چاہے یہ تعلیم و تلقین کوئی شخص اپنی وفات کے وقت کرے یا زندگی کے کسی دوسرے مرحلے پر اور قرآنِ کریم نے اسے حکم دینے کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے اور عام عربی زبان میں بھی اس معنی میں اس کا استعمال عام ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے آٹھ تھے۔ ۱:۔ حضرت اسمٰعیل، حضرتِ ہاجرہ مصریہ کے بطن سے، ۲:۔ حضرتِ اسحٰق، حضرت سارہ عراقیہ کے بطن سے، ۳:۔ زمران، ۴:۔ یقسان، ۵:۔ مدان، ۶:۔ مدیان ۷:۔ اسیاق ۸:۔ سوخ۔ یہ سب حضرتِ قتورہ کے بطن سے تھے۔

حضرت یعقوب، حضرت ابراہیم کے پوتے اور حضرت اسحٰق کے فرزند ہیں۔ اسرائیل آپ ہی کا دوسرا نام ہے۔ عمر حسبِ روایت تورات ۱۴۷ سال کی پائی، زمانہ غالباً ۲۰۰۰ ق م تا ۱۸۵۳، ولادت کنعان فلسطین میں ہوئی، ۱۸۷۰ میں اپنے نامور فرزند حضرت یوسف نبی کے پاس منتقل ہوگئے اور وہیں وفات پائی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے چار ازواجِ مطہرات سے بارہ فرزند تھے۔ ان کے نام حسبِ تصریح تورات حسبِ ذیل ہیں۔

۱: روبن، ۲: شمعون، ۳: لاوی، ۴: یہوداہ، ۵: اشکار، ۶: زبلون، ۷: یوسف علیہ السلام، ۸: بن یامین، ۹: دان
۱۰: نفتالی، ۱۱: جد، ۱۲: آشر۔ (پیدائش ۳۵: ۲۴، ۲۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت

حضرت ابراہیم کی اس وصیت کا ذکر اگرچہ یہود کے صحیفوں میں کہیں نہیں ملتا لیکن انسانی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہمیشہ بڑے لوگوں نے جن پر خصوصاً اللہ کے دین کی ذمہ داریاں رہی ہیں انہوں نے جس طرح اللہ کے دین کی سربلندی اور اپنی اولاد کو اس سے وابستہ رکھنے کیلئے زندگی بھر کام کیا اسی طرح جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا صحیفۂ حیات اختتام کو پہنچ رہا ہے تو کسی مناسب وقت پر اپنی اولاد یا اپنے خاندان کے بڑے لوگوں کو جمع کر کے ان باتوں کی ضرور وصیت کرتے رہے ہیں، جنہیں وہ اپنی اولاد اور خاندان کیلئے دینی اور قومی حوالے سے انتہائی ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جس طرح پوری زندگی خلق اللہ کی ہدایت اور اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے گزری اس میں یہ بات انتہائی قرینِ قیاس ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں کو نہائت اہتمام سے اس کی وصیت فرمائی ہوگی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیسری پشت تک یہ اہتمام پورے عروج پر رہا حضرتِ یعقوب آپ کے پوتے ہیں انہوں نے بھی اپنے بیٹوں کو اسی طرح نصیحت فرمائی اور مضمون چونکہ واحد ہے اس لئے قرآنِ کریم نے ایک ہی جگہ دونوں کو ذکر فرمایا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واسطے سے قریش کو اس طرف توجہ دلائی جائے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے حوالے سے بنی اسرائیل کو سوچنے پر مجبور کیا جائے۔ وصیت میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا کیا نصیحتیں فرمائی گئی ہوں گی لیکن ان میں دو باتیں جو اساس کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کا اختصار سے یہاں ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک تو یہ بات فرمائی کہ "اے میرے بیٹو! تم زندگی کے معاملات اور طرزِ عمل میں آزاد نہیں ہو کہ جس طرح چاہو زندگی گزارو بلکہ اللہ نے تمہارے لئے ایک دین یعنی طرزِ عمل اور ضابطۂ حیات چن لیا ہے اور وہ سابق آیت کریمہ کے مطابق اسلام ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنی زندگی کا یہ رویہ بنانا ہوگا کہ تمہیں ہر

Marfat.com

معاملے میں اللہ کی ہدایت کو دیکھنا اور اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور سب کچھ اسی کیلئے قربان کرنا اور سپرد کر دینا ہے۔ یہی وہ دینِ اسلام ہے جسے قرآنِ کریم نے بھی بار بار ذکر کیا ہے اور یہاں تک فرمایا:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ

(کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں طوعًا یا کرھًا سب اسی کے مطیع ہیں اور سب اسی کی جانب لوٹیں گے)

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ اس دین سے وابستگی زندگی کے کسی خاص دور کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو پوری زندگی کا معمول ہے یہی زندگی کا قانون اور دستور ہے اسی سے تنہائیاں آباد ہوتی ہیں، اسی سے شخصیتیں بنتی ہیں، اسی سے زندگی کو آداب ملتے ہیں۔ زندگی ڈھل جاتی ہے یہ دین نہیں ڈھلتا۔ اسی کے ساتھ وابستگی میں زندگی کا سفر تمام ہو جاتا ہے۔ لیکن دین اپنی آب و تاب کے ساتھ انسانیت کو روشنی دیتا رہتا ہے۔ اس لئے فرمایا: فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ تمہیں پوری زندگی مرتے دم تک مسلم بن کر گزارنی ہے، اس میں یہودیت یا نصرانیت کی کوئی جگہ نہیں کیونکہ یہ دونوں چیزیں حضرت ابراہیم کے سینکڑوں سال بعد وجود میں آئی ہیں، ان کا ملتِ ابراہیم سے کوئی تعلق نہیں۔

وصیت کا نفسیاتی پہلو

حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام کی اسی وصیت کو ایک دوسرے پہلو سے نہایت موثر بنایا جا رہا ہے۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ ایسی اولاد جو زندگی میں اپنے ماں باپ کی نصیحتوں پر کان نہیں دھرتی اور ماں باپ ہمیشہ ان سے شاکی رہتے ہیں، لیکن جب ماں باپ کا آخری وقت آتا ہے اور یہ بے نیاز اولاد جب دیکھتی ہے کہ ماں باپ کا ساتھ چھوٹنے لگا ہے تو انہیں اپنے رویے پر کچھ نہ کچھ توجہ ہوتی ہے۔ جو وقت گزر گیا اسے تو اولاد لوٹا نہیں سکتی لیکن آخری وقت کی نصیحتوں کو وہ ضرور کوشش کرتی ہے کہ آویزۂ گوش بنائے۔ یہاں اسی انسانی فطرت کو متوجہ کیا گیا ہے کہ اے اہلِ کتاب تم نے آج تک اپنے بزرگ آباؤ اجداد کی نصیحتوں کو توڑنے مروڑنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ لیکن کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے بوقتِ مرگ کیا نصیحتیں کی تھیں۔ تم انہیں یہودیت یا نصرانیت کے مورثِ اعلیٰ سمجھتے ہو کیا تم اس وقت موجود تھے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا تم یقیناً موجود نہیں تھے لیکن تمہارا خدا تو موجود تھا۔ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ آخری وقت میں حضرت یعقوب نے کیا نصیحت کی تھی۔ تم نے اگر آج تک ان کی تعلیمات اور فرمودات پر کان نہیں دھرا تو ان کی آخری وقت کی وصیت کا تو خیال کرو۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو جمع کر کے پوچھا تھا کہ بتاؤ تم ہمارے بعد کس کی بندگی کرو گے تو ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم یہودیت اور نصرانیت کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ یا ہم آپ کی پوجا کریں گے۔ کیونکہ آپ اللہ کے نبی ہیں ہمارے باپ ہیں اللہ کی برگزیدہ شخصیت ہیں۔ آپ سے بڑھ کر بندگی اور پوجا پاٹ کا اور کون مستحق ہو سکتا ہے؟ انہوں نے نہایت عاجزی اور وثوق کے ساتھ جواب دیا تھا کہ ہم اسی معبود کو پوجیں گے جو آپ کے آباؤ اجداد کا معبود ہے اور جس طرح آپ نے اسی کی تسلیم و انقیاد میں زندگی گزاری ہے ہم بھی اسی تسلیم و انقیاد کو اپنا وطیرہ بنائیں گے۔ جس طرح آپ اس کے مسلم بن کے رہے ہیں ہم بھی اس کے اسی طرح مسلم بن کر رہیں گے۔

Marfat.com

تورات سے قرآن کی تائید

اس وصیت کا ذکر اگرچہ تورات میں نہیں ملتا لیکن یہود کے لٹریچر میں اس وصیت سے ملتی جلتی جو روایت ملتی ہے اس کے الفاظ اگرچہ قرآن کے الفاظ سے کچھ مختلف ہیں لیکن ان سے تائید قرآن کے بیان ہی کی ہوتی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اپنی تفسیر میں یہود کے لٹریچر سے مندرجہ ذیل دو حوالے نقل کیے ہیں۔ ایک حضرت اسحٰق کی وصیت سے متعلق ہے دوسرا حضرت یعقوب کی وصیت سے متعلق ہے۔

''جب اسحٰق نے دیکھا کہ اس کا وقت موعود آپہنچا تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا: میں تمہیں خدا تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات اعلیٰ، عظیم، قیوم، عزیز ہیں اور جو آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا خالق ہے کہ تم خوف اسی کا رکھنا اور عبادت اسی کی کرنا۔'' (گنز برگ، قصص یہود، جلد اول صفحہ ۴۱۶)

''یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا مجھے اندیشہ ہے کہ تم میں سے کوئی بت پرستی کا میلان رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں بارہ بیٹوں نے کہا: سن اے اسرائیل! اے ہمارے باپ! ہمارا خدا وہی خدائے لم یزل ہے، جس طرح تیرا دلی ایمان ایک خدا پر ہے، اسی طرح ہم سب کا دلی ایمان ایک خدا پر ہے۔'' (گنز برگ کی قصصِ یہود جلد ۲، صفحہ ۱۴۱)

ان وصیتوں کی واضح حکمتیں

اس وصیت میں غور کیجیے! اس میں متعدد باتیں سرسری نظر سے بھی محسوس ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب کی نگاہ میں سب سے اہم بات جس کو انہوں نے زندگی کے آخری لمحوں میں بطورِ امانت اپنی اولاد کے سپرد کیا ہے۔ وہ اللہ کی توحید اور اللہ کے احکام کی بے ساختہ اطاعت ہے۔ ان کی پوری زندگی اس امانت سے عبارت ہونی چاہیے۔ وہ زندگی کے جھمیلوں میں اور کچھ بھی بھول جائیں تو مضائقہ نہیں مگر یہ کبھی نہ بھولیں کہ ان کا معبود اور ان کا حاکمِ حقیقی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ یہ زندگی اسی کی امانت ہے اس لئے اسی کی اطاعت اور بندگی میں گزرنی چاہیے۔ دوسری بات جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی چوتھی نسل تک بھی اس بات میں کوئی تردد نہیں تھا کہ جس طرح ان کے آباؤ اجداد ایک اللہ کے پوجنے والے تھے اور ان کی زندگی اسلام کی سچی تصویر تھی ہماری زندگی بھی ہو بہو اسی طرح ہونی چاہیے اور ہمیں بھی انہیں کے نقوشِ قدم پر زندگی کا سفر رواں دواں رکھنا چاہیے اور تیسری بات جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل نے بنی اسمٰعیل کے بارے میں عجیب و غریب تصورات بنالئے ہیں اور ان کو اپنے ہم مرتبہ سمجھنے کیلئے تیار نہیں حتیٰ کہ ان کے جدامجد حضرتِ اسمٰعیل سے اپنا تعلق یکسر توڑ لیا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی پہلی نسل میں ہمیں ایسا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا وہ پورے احترام کے ساتھ حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام کو بھی اپنے آباؤ اجداد میں شمار کرتے ہیں اور انہیں بھی اللہ کا عظیم رسول سمجھتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ جس طرح حضرت اسحٰق علیہ السلام کی دوسری نسل اس وقت وجود میں آچکی تھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بھی دوسری نسل سرزمین مکہ میں پھیل رہی ہوگی۔ اس وقت تک حضرت یعقوب کی اولاد یعنی بنی اسرائیل میں حضرت اسمٰعیل اور ان کی اولاد کے بارے میں کوئی منفی تاثر نظر نہیں آتا وہ یقیناً ان کے بارے میں اپنے دلوں میں وہی احساسات رکھتے ہوں گے جو بھائیوں کی صالح اولاد ایک دوسرے کے لئے رکھتی ہے بلکہ تورات میں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی وحی میں بنی اسمٰعیل کو ان کا بھائی کہہ کر ذکر کیا گیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

Marfat.com

بھی ان کا تذکرہ بھائی کہہ کر ہی کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسد اور عناد کا جذبہ جو بعد میں بنی اسرائیل میں بنی اسمٰعیل کے بارے میں پیدا ہوا اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے یہ منفی جذبات کب پیدا ہوئے اور کیوں پیدا ہوئے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں بحث سمیٹ کر اس کا خلاصہ مخاطب کے سامنے رکھا جا رہا ہے جو درحقیقت دل و دماغ میں اتارنا مقصود ہے۔

تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○

(یہ ایک گروہ تھا جو گزر گیا اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کمایا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بارے میں تم سے سوال نہیں کیا جائے گا) (البقرۃ: ۱۳۴)

بحث کو سمیٹ کر ایمان و عمل اور آخرت کی جوابدہی کی طرف متوجہ کیا گیا

اسی سلسلۂ بیان میں گزشتہ کسی جگہ یہ بات گزر چکی ہے کہ یہود کی گمراہی اور دین سے لاتعلقی کے متعدد اسباب تھے، لیکن ان میں ایک اہم تر سبب یہ تھا کہ وہ ایمان و عمل کو نجات کی بنیاد بنانے کی بجائے نسل اور نسب کو بنیاد بنا چکے تھے۔ انہیں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ ہماری بداعمالیوں کے نتائج کیا ہوں گے بلکہ ان کے اعتماد اور بھروسے کی سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو انبیائے کرام کی اولاد اور اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ کا رشتہ دار سمجھتے تھے۔ اس نسبت کو وہ اتنا عظیم جانتے تھے کہ اس کی موجودگی میں کسی اور چیز کو اہمیت دینے کیلئے تیار نہیں تھے۔ ان کا یقین تھا کہ دنیا کی سرافرازیاں ہمارے سوا کسی اور کیلئے نہیں اور آخرت میں جنت کیلئے اس سے بڑا استحقاق اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کے نبیوں کی اولاد ہیں۔ جنت میں اگر ہم نہیں جائیں گے تو کیا ایرے غیرے لوگ جائیں گے۔ یہ سہارے انہیں لے بیٹھے اور ان کی دینی اور اجتماعی زندگی انہیں مفروضوں کے باعث ایمان و عمل کے نور سے محروم ہو گئی۔ چنانچہ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے خلاصے کے طور پر انہیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ انبیاء اور اللہ کے نیک بندوں کا گروہ جن کا تذکرہ ہم نے گزشتہ آیات میں کیا ہے، اپنی مقدس اور سرفروشانہ زندگی گزار کر اپنے اللہ کے پاس جا چکے ہیں۔ قیامت کے دن ان کے اعمال انہیں کے کام آئیں گے وہ اپنے کارہائے جلیلہ کے باعث اللہ کے بیش از بیش تقرب کے مستحق ہوں گے۔ لیکن ان کے یہ اعمال اور یہ کارنامے کسی اور کیلئے سہارا نہیں بنیں گے، وہاں کسی گروہ یا کسی فرد سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم کس کی اولاد ہو بلکہ صرف ایمان و عمل کے بارے میں سوال ہو گا۔ ایمان و عمل ہی وہ سکہ ہو گا جو قیامت کے دن چلے گا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اور ایک موقع پر بنی ہاشم کے بڑے بڑے سرداروں سے فرمایا کہ آج جو کچھ کر سکتے ہو کر لو تمہارا یہی سرمایہ کل کو کام آئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ تم خالی ہاتھ محشر میں پہنچ جاؤ اور پھر مغفرت کیلئے میرے پاس آؤ۔ میں تمہارے لئے وہاں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ ہر پیغمبر نے اپنے ماننے والوں کو یہی تعلیم دی۔ پیغمبر اپنے ماننے والوں کی شفاعت ضرور کریں گے، لیکن اس کا تعلق اعمال کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے ساتھ ہو گا۔ ایمان و عمل سے محرومی کی صورت میں کسی شفاعت کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ وہاں تو ہر ایک سے اس کا اپنا سرمایۂ عمل پیش کرنے کیلئے کہا جائے گا۔ کسی دوسرے کا عمل اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔ اولاد ماں باپ کے کام نہیں آئے گی، ماں باپ اولاد کے کام نہیں آئیں گے۔ مرشد مسترشد کے کام نہیں آئے گا اور مسترشد مرشد کے کام

Marfat.com

نہیں آئے گا۔ وہاں ہر ایک کو اپنی صلیب خود اٹھانا ہوگی، کسی سے کسی دوسرے کے اعمال کے بارے میں باز پرس نہیں ہوگی۔ جب اپنے ہی اعمال وہاں کام آئیں گے تو پھر اعمال کی جگہ تو یہ دنیا ہے، یہی دار العمل ہے۔ یہاں مہلتِ عمل میسر ہے، موقعہ ہے یہاں کچھ تیاری کر لی جائے۔ جس نے آج یہ موقعہ کھو دیا کل کو آباؤ اجداد کے اعمال چاہے وہ اللہ کے نبی کیوں نہ ہوں اولاد کے کام نہیں آئیں گے۔ یہی بات اس آیتِ کریمہ میں خلاصہ بحث کے طور پر بنی اسرائیل سے خصوصاً اور تمام نوعِ انسانی سے عموماً فرمائی جارہی ہے۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ
اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

"اور وہ کہتے ہیں کہ یہودی بنو یا نصرانی تو ہدایت پاجاؤ گے۔ کہو! بلکہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو اللہ کی طرف یکسو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔" (البقرۃ:۱۳۵)

یہودیت اور نصرانیت کے برسرِ باطل ہونے پر مضبوط دلیل

اس آیتِ کریمہ سے پہلے کا سلسلۂ کلام دیکھتے ہوئے جب ہم اس آیت کو پڑھتے ہیں تو یہ آیت بظاہر بے ربط سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ فصاحت وبلاغت اور علمِ کلام کا ایک شاہکار دکھائی دیتی ہے۔ سب سے پہلی جو چیز ذہن میں ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت سے پہلے کئی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تاریخ اور تعارف کے حوالے سے جو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں اور اسی کے ضمن میں آنحضرت ﷺ کی بعثت کو جس طرح دعائے خلیل کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے اور پھر جس طرح حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کے اعتقادات اور زندگی کی روش کو نمایاں کیا گیا ہے، اس کے بعد یہودیت یا نصرانیت جیسے تصورات کیلئے کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ آدمی ان دلائل کو پڑھتے ہوئے توقع کرنے لگتا ہے کہ یہودی بالخصوص ان دلائل سے متاثر ہو کر یا تو اسلام کے دامن میں آجائیں گے یا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کریں گے۔ لیکن جب ہم اچانک ان کی طرف سے اس آیت کی صورت میں یہودیت اور نصرانیت کی دعوت کو دیکھتے ہیں اور اس پر ان کا اصرار دیکھتے ہیں کہ وہ اسی کو ہدایت کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو اس بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ قوموں کا جب زوال مکمل ہوجاتا ہے تو ان کیلئے اپنی روش میں ترمیم کرنا اور صحیح بات کو قبول کرنا واقعی سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے وہ اپنے طرزِ کہن کو کسی طرح بھی بدلنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ اقبال نے اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہود ونصاریٰ کا بالکل یہی حال معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ متعصب اور بند ذہن لوگوں کی طرح صرف دعوے ہیں کہ ہدایت صرف ہمارے پاس ہے۔ اسلام کی اس حوالے سے کوئی گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے علم کی دنیا میں بے دلیل دعووں کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی۔

Marfat.com

دوسری بات جو اس آیتِ کریمہ کو پڑھتے ہوئے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ دلائل کی دنیا میں اس حد تک بے بس ہو گئے تھے کہ اب وہ بظاہر دعویٰ کی صورت میں جو بات کہتے ہیں اس میں کوئی وزن نہیں۔ بلکہ وہ تضاد کا شاہکار ہے۔ ان کے اسی دعوے کو دیکھئے وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کو نجات کیلئے ہدایت کی ضرورت ہے اور ہدایت صرف یہودیت اور نصرانیت میں ہے۔ اسلام تو محض ایک نئی بات ہے ہدایت کی موجودگی میں ایک نئی بات فتنہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک یہودی یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم اگر نجات کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو تو بے شک تم یہودیت اختیار نہ کرو نصرانی بن جاؤ نجات پا جاؤ گے اور عیسائی یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم اگر ہدایت کے طالب ہو تو بے شک عیسائیت اختیار نہ کرو یہودی ہو جاؤ تو ہدایت مل جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہدایت پر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہود نے نہ صرف عیسائیت کا انکار کیا ہے بلکہ عیسائیت جن کی طرف منسوب کی جاتی ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی طرف۔ انہوں نے نہ صرف انہیں ماننے سے انکار کیا بلکہ وہ انہیں عدالت کے کٹہرے تک لے گئے اور وہاں بزعمِ خود صلیب دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی وجہ سے آج تک یہ دونوں مذاہب ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کرنے کیلئے بالکل تیار نہیں۔ عام عقلِ انسانی سے فیصلہ لے لیجئے کہ جب یہ دونوں مذاہب ایک دوسرے کی صداقت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تو دونوں ایک دوسرے کو ہدایت کا ذریعہ کیسے قرار دے رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا کھلا تضاد ہے جس کا کوئی جواب ممکن نہیں۔ اس سے صرف ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ دلائل کی دنیا میں بے بس ہونے کے بعد دونوں نے اپنی بقا کیلئے ایک ہی راستہ دیکھا ہے کہ مسلمانوں کی دشمنی کے جذبے سے اکٹھے ہو جاؤ اور اپنے اختلافات کو بھلا کر اپنی زندگی کے تحفظ کا راستہ اختیار کرو۔ غور فرمایئے کہ قرآنِ کریم نے ہو بہو دعوت کی صورت میں ان کا دعویٰ نقل کیا ہے لیکن درحقیقت ان کے برسرِ باطل اور غلط ہونے کی کتنی مضبوط دلیل ہے۔ اس کو ممکن ہے آپ الزامی دلیل سمجھیں لیکن اس آیت کے دوسرے حصے میں نہایت مثبت انداز میں تاریخ کا سینہ چیر کر ان کے اس دعوے کا رد کیا گیا ہے جس کا جواب وہ قیامت تک نہیں دے سکتے۔ تفہیم القرآن میں مولانا مودودی نے بڑی خوبی سے اس کا ذکر فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں:

اس جواب کی لطافت کیلئے دو باتیں نگاہ میں رکھئے:

> ''ایک یہ کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں ''یہودیت'' اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی اور ''عیسائیت'' جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسرِ ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے تو حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیا اور نیک لوگ جو ان مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ ''یہودیت'' یا ''عیسائیت'' نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار ان مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں بلکہ دراصل اس کا مدار اس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے، جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔

Marfat.com

دوسرے یہ کہ یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیم ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی صفات وخصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اس راہِ راست سے منحرف ہوگئی ہیں، جس پر حضرت ابراہیم چلتے تھے کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہوگئی ہے۔"

حنیف کا مفہوم

حاصل کلام یہ کہ ہدایت کا راستہ یہودیت یا نصرانیت نہیں بلکہ ملتِ ابراہیم ہے اور حضرت ابراہیم کے بارے میں یہ بات مسلّم ہے کہ وہ حنیف تھے۔ حنیف، حنف سے ہے، جس کے اصل معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔ حنیف اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے کٹ کر پوری یکسوئی کے ساتھ خدا کا ہو رہے۔ حضرت ابراہیم نے پوری یکسوئی کے ساتھ ہر طرف سے کٹ کر جو راستہ اختیار کیا تھا وہ نہ مشرکین کا راستہ تھا اور نہ یہود و نصاریٰ کے انتسابات تھے بلکہ وہ وہ راستہ تھا جسے ملت ابراہیم کہا جارہا ہے اور جس کی گزشتہ آیات میں وضاحت گزر گئی۔ اس لئے اب ہدایت کا راستہ ایک ہی ہے کہ ملت ابراہیم کی پیروی کی جائے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ کو منصوب لایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کوئی فعل محذوف ہے۔ یعنی یہ کہا جارہا ہے: اِتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْـرٰهٖمَ "ملت ابراہیم کی پیروی کرو"۔ جن کو تم مورثِ اعلیٰ مانتے ہو، جن کی اولاد میں سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہو، ان کی ساری زندگی اسلام کی سچی تصویر تھی اور وہ زندگی بھر اسی شاہراہ پر چلتے رہے ہیں۔ آج بھی اس کے سوا کوئی ہدایت اور نجات کا رستہ نہیں ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○

(مسلمانو! کہو! ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور اس ہدایت پر ایمان لاؤ جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی اور ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اسی کے فرماں بردار ہیں) (البقرۃ:۱۳۶)

یہود و نصاریٰ کی دعوت کے جواب میں کلمۂ جامعہ

اس آیتِ کریمہ میں یہود و نصاریٰ کی دعوت کا جواب بھی ہے اور ملت ابراہیم کی تشریح وتعبیر بھی کہ تم ہمیں یہ دعوت دیتے ہو کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے۔ لیکن ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ ہم اللہ کی ہدایت کے مطابق اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس ہدایت پر ایمان

Marfat.com

رکھتے ہیں جو اللہ کی طرف سے ہمارے رسولِ پاک ﷺ کے واسطے سے ہم پر اتاری گئی ہے۔ اسی طرح ہم ایمان رکھتے ہیں اس ہدایت پر جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی مختلف شاخوں پر ان کے انبیاء کے واسطہ سے اتری ہے اور ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ یعنی ہم ایسا نہیں کرتے کہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کا انکار کردیں۔ کسی نبی پر اترنے والی کتاب کو مانیں اور کسی کو ماننے سے انکار کردیں۔ ہم چونکہ اللہ کے فرماں بردار ہیں اس کی فرمانبرداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے برگزیدہ بندوں میں سے جنہیں نبوت عطا کرتا ہے ہم ان کی نبوت پر ایمان لائیں اور جو ہدایات ان پر نازل فرماتا ہے ان کو بھی تسلیم کریں کیونکہ اگر ہم اللہ کے نبیوں کے درمیان تفریق کرنے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم جسے چاہتے ہیں اسے نبوت دے دیتے ہیں۔ اللہ کے کسی کو نبی بنانے سے ہم اس کو نبی ماننے کے پابند نہیں ہوتے۔ یہ نہ صرف نبی کی نبوت سے انکار ہے بلکہ اللہ کے اس حق کا بھی انکار ہے کہ نبوت عطا کرنا اور انسانوں کی ہدایت کیلئے کتابیں اتارنا یہ صرف اللہ کا حق ہے کسی کو اس میں شریک نہیں کیا جاسکتا۔ یہ آیتِ کریمہ ایک ایسا کلمۂ جامعہ ہے جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا ہے۔ جس کی بنیاد پر مسلمان تمام انبیائے کرام، رسولانِ عظام اور تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ گزشتہ انبیائے کرام اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ اللہ کے رسول اور نبیوں نے اللہ کی طرف سے اپنی اپنی امتوں کو جو تعلیمات دی تھیں ان کی امتوں نے یا تو ان میں ملاوٹ کردی یا ان کے کچھ حصہ کو فراموش کردیا بعض احکام کو ترمیم اور تحریف کی نذر کرڈالا بعض احکامات کو حالات کے دباؤ کے تحت بدل ڈالا یا کتاب اللہ ہی سے نکال دیا۔ اس لئے اب موجودہ صورت میں جو شریعتیں ان کے پاس ہیں وہ نہائت ناقص نہائت غیر محفوظ، اور ناقابلِ عمل ہیں۔ ان کی اسی حالت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری رسول بھیجا اور آخری کتاب اتاری جو سابقہ تمام کتابوں کی جامع اور قیامت تک کیلئے نہ صرف قابلِ عمل بلکہ واجب العمل ہے۔ ہم سابقہ تمام انبیائے کرام کی صداقت اور حقانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان پر اترنے والی تمام کتابوں کو منزل من اللہ سمجھتے ہیں لیکن وہ محفوظ نہ رہنے کے باعث اب قابلِ عمل نہ رہیں اس لئے اب پروردگار نے آخری نبی بھیجا اور آخری کامل شریعت آگئی جس پر عمل کرنا ہمارے لئے فرض اور واجب ٹھہرا۔ لیکن یہود اور نصاریٰ نے جو رویہ اختیار کیا ہے انہوں نے صرف یہ نہیں کیا کہ آنحضرت ﷺ کو ماننے سے انکار کیا ہو بلکہ ان کا سابقہ رویہ بھی یہ رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ وہ سابقہ انبیاء میں سے بھی کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے۔ یہود اس سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر چکے اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے کتنے انبیاء کرام ہیں جن کو انہوں نے نہ صرف تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو قتل تک کرڈالا اور جن کو تسلیم بھی کیا تو وہ بھی اس طرح کیا کہ تسلیم نہ کرتے تو اچھا تھا۔ مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ کا عظیم پیغمبر بھی مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان پر بدکاری کا الزام بھی رکھتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت کے ساتھ ساتھ ان کی شوکت اور عظمت کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی کہتے ہیں کہ ان کی غیر معمولی قوتیں ان کے سحر و علمِ نجوم کے باعث تھیں اور اسی سحر کی مدد سے وہ جنات پر حکومت کرتے رہے ان کی اس روش کو قرآنِ کریم نے بیان کرتے ہوئے ایک حقیقی اور خطرناک نتیجے کی نشاندہی فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۝ (النسآء: ۱۵۰)

(اور وہ چاہتے ہیں کہ تفریق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ سے راہ پیدا کریں)

Marfat.com

اس آیت پر غور کیجئے! یہود کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ بعض نبیوں کو مانتے ہیں اور بعض کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن نبیوں کو وہ مانتے ہیں تو یہی سمجھ کر مانتے ہیں نا کہ وہ اللہ کے نبی ہیں اور اللہ نے ان کو نبوت عطا کی ہے اور جس کو اللہ نبوت عطا کرے اللہ کے بندوں کیلئے اس کا ماننا لازم ہو جاتا ہے لیکن جن کو ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں آخر وہ کیوں کرتے ہیں؟ اگر وہ واقعی اللہ کے نبی ہیں تو ان کا انکار در حقیقت اللہ کا انکار ہے اور یہ ایسا جرم ہے جو نبیوں کے نہ ماننے سے بھی بڑا جرم ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ در حقیقت اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کر رہے ہیں اور وہ اس کے درمیان کوئی تیسرا راستہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اللہ کے نبیوں کا ماننا اللہ کے حکم سے نہ ہو بلکہ ان کی اپنی پسند اور خواہشات کے تابع ہو کر رہ جائے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہود کا یہ طرزِ عمل کس طرح قدم قدم پر تضادات کو ابھار رہا ہے اور کیسے نئے نئے سوالات کو جنم دے رہا ہے اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا کلمہ جامعہ کس قدر اللہ کے سامنے تسلیم و انقیاد کا اظہار ہے۔ وہ ہر نبی کو اپنے سر کا تاج اور ان کی تعلیمات کو اپنی آنکھوں کا نور سمجھتے ہیں وہ جس طرح سابقہ انبیاء اور ان کی تعلیمات کو تسلیم کرتے ہیں اسی طرح نبی آخر الزمان ﷺ اور ان پر نازل ہونے والی کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں کیونکہ یہ سب ایک ہی منبع نور سے پھوٹنے والی شعائیں ہیں۔ اور وہی تعلیمات ہیں جنہیں جامع اور کامل شکل میں قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے اور وہی احکامِ شریعت ہیں جو نئی شکل نئی شان اور نئے کمال کے ساتھ شریعت اسلامی کی صوت میں نازل کیے گئے ہیں۔ ہر شریعت اپنے دور کی رہنما رہی ہے، جیسے جیسے انسانی فکر ارتقا پذیر ہوئی ہے ویسے ویسے شرعی احکام تکمیل کے مراحل طے کرتے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ جب انسان بلوغ کی عمر کو پہنچ گیا اور پوری دنیائے انسانیت سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آنے لگی تو قرآنِ کریم اور سنت رسول ﷺ کی شکل میں ایک کامل اور مکمل شریعت نازل کی گئی اور قرآنِ کریم میں تکمیل دین کا اعلان فرما دیا گیا اور اس دین کی بنیادی روح چونکہ تسلیم و انقیاد رہی ہے اس لئے اس کا نام بھی اسلام رکھا گیا ہے۔ اس کا آغاز بھی اسی نام سے تھا اور اسی کی تکمیل بھی اسی نام سے ہوئی ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

(اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر وہ اعراض کریں تو پھر وہ در پے مخالفت ہیں ان کے مقابلے میں تمہارے لئے اللہ کافی ہوگا وہ سننے والا اور جاننے والا ہے) (البقرۃ:۱۳۷)

کلمۂ جامعہ پر ایمان اور ایمان کے لیے نمونہ

گزشتہ آیتِ کریمہ کی صورت میں جس طرح ایک کلمۂ جامعہ پیش کیا گیا جس کے ماننے سے آدمی اس راستے کا مسافر بن جاتا ہے جو اسلام کا راستہ ہے اور جس کی منزل جنت ہے۔ اسی طرح اس کلمہ کو ماننے والوں اور اس کے مطابق زندگی گزارنے والوں کا نمونہ بھی پیش کیا گیا کہ اگر تم اس کلمہ پر ایمان لاتے ہو تو تمہیں کس طرح ایمان لانا چاہئے اور اس کے تقاضے کس طرح پورے کرنے چاہئیں، اس آیتِ کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کا نمونہ مسلمان ہیں۔ ان کا ایک ایک فرد اس کلمے کی تصویر ہے۔ یہی بات اسی سورۃ کے دوسرے رکوع میں بھی فرمائی گئی ہے: اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ”جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے ہیں“۔(

Marfat.com

یہاں لوگوں سے مراد صحابہ کرام ہیں۔ان کا ہر چھوٹا بڑا آدمی ان لوگوں میں شامل ہے) تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں۔انہوں نے پوری زندگی ایمان کے حوالے کردی ہے۔اگر ان کا دین ان سے مال مانگتا ہے تو یہ پیش کر دیتے ہیں، ان سے وقت مانگتا ہے تو انہیں انکار نہیں ہوتا، ان سے وطن کی قربانی مانگتا ہے تو وطن چھوڑ دیتے ہیں، انہیں میدانِ جنگ میں بلاتا ہے تو جان تک نذر کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔انہوں نے تو اپنا سب کچھ اس راستے میں لٹا دیا ہے، تو یہ تو سراسر دیوانگی ہے، پاگل پن ہے ،ہم ایسا نہیں کر سکتے۔یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں اللہ کی رضا عزیز نہیں، تمہیں اپنے گروہی تعصبات عزیز ہیں۔تمہیں اسلام کی خاطر سب کچھ اللہ کے راستے میں سپرد کر دینا گوارہ نہیں کیونکہ اس طرح تمہارے وہ تمام مفادات جو تم نے دین کے نام پر حاصل کر رکھے ہیں وہ ایک ایک کر کے تمہارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔لیکن اس کا کیا کیا جائے ہدایت کا راستہ اس کے سوا کوئی اور نہیں۔

اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اسلام کوئی سیاست بازی نہیں یہ تو دنیا و عقبیٰ کی کامیابی کی ضمانت ہے۔اس میں نہ سخن سازیاں کام آتی ہیں، نہ دکھاوے کی چلت پھرت اور نہ وقت گزاری کے حربے۔یہ تو پوری زندگی بدلنے کا ایک معاملہ ہے، اس لئے اپنے گروہی تعصبات کو چھوڑ کر اگر اسلام کی طرف آنے کا حوصلہ ہے تو پھر اس طرح آؤ جس طرح تم اصحابِ رسول ﷺ کو دیکھ رہے ہو۔اگر اس طرح اپنے آپ کو بدلو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔تمہارے دعوے کے مطابق یہودیت اور نصرانیت میں ہدایت نہیں بلکہ ہدایت یکسر اللہ کے احکام کے مطابق اللہ کی رضا کیلئے سب کچھ سپرد کر دینے کا نام ہے اور اسی کو اسلام کہتے ہیں۔اگر تم یہ روش اختیار کرتے ہو تو تم وہی مقام پالو گے جو اصحابِ رسول کا ہے۔لیکن اگر تم اس طرح اپنے آپ کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہو تو پھر مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ پھر تمہیں یہود کے بارے میں کھلے ذہن کے ساتھ یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ ان کے ساتھ یکجائی تو دور کی بات ہے معمولی تعلق بھی رکھنا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ وہ صاف صاف تمہاری مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔وہ کسی طرح بھی اپنی انفرادیت اسلام میں گم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ان کی از اول تا آخر یہ کوشش ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو مٹا دیں۔تمہارے دلوں میں اگر ان کیلئے کوئی نرم گوشہ ہے تو اسے نکال دیجئے اور یہ بات سمجھ لیجئے کہ تمہارا ان کے ساتھ یہ تصادم چند دن کی بات نہیں بلکہ یہ ان کی قومی اور ملی پالیسی کا لازمی عنصر ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کیلئے مشکلات پیدا کریں گے۔اس کیلئے یہود و نصاریٰ میں اتحاد بھی ہوگا اس کیلئے مشرکین کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے سے بھی انہیں دریغ نہیں ہوگا وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہر قوت کو اپنے ساتھ لے کر چلیں گے۔یہ ان کی ایک ایسی مستقل پالیسی ہے جو ہمیشہ قائم رہے گی۔قرآنِ کریم نے مختلف جگہوں پر اہلِ کتاب کی اس روش کو نمایاں کیا ہے تاکہ مسلمان اپنی قومی اور ملی پالیسیوں میں ان کی ظاہری روش سے کبھی دھوکہ نہ کھائیں۔لیکن افسوس ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص پالیسی ساز طبقہ نجانے اس حقیقت کو بار بار کیوں نظر انداز کرتا ہے۔اقبال نے ان کے گھر میں بیٹھ کر ان کے حسن و قبح کا اندازہ کیا۔اس نے جیسے جیسے ان کے اندر جھانکا ویسے ویسے بدمزہ ہوتا گیا۔کبھی تو اس نے اپنی قوم کو توجہ دلانے کیلئے کہا

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اور کبھی اپنے گہرے تاثر کو اس طرح قلم بند کیا

نشستم بانکویانِ فرنگی
ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

Marfat.com

اور فرنگی کے بارے میں اس نے زندگی بھر کے تجربات کو نچوڑتے ہوئے کہا

کرے قبول اگر دینِ مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

مسلمانوں کی ذمہ داری

یہاں بھی اسی حقیقت سے آگاہ کرنے کے بعد فرمایا جارہا ہے کہ تمہیں اب فکران سے مقابلے کی ہونی چاہئے ۔یہ ہرمیدان میں تمہارے لئے مشکلات پیدا کریں گے۔لیکن اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ چونکہ سازشی لوگ تھے اور سازشی ہمیشہ بزدل بھی ہوتا ہے۔یہ بھی سامنے آکروار کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔لیکن درپردہ مسلسل کوشش کرتے رہتے تھے کہ کسی طرح آنحضرت ﷺ پر مہلک وار کریں۔کئی مرتبہ ان بدبختوں نے حضور کو قتل کرنا چاہا،لیکن ہمیشہ اللہ کی حفاظت نے حضور کو محفوظ رکھا چونکہ ان کا اصل ہدف آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی رہتی تھی اس لئے براہِ راست آنحضرت کو خطاب کرکے آپ کو اور مسلمانوں کو تسلی دی جارہی ہے کہ اہلِ کتاب کی روش آپ کے سامنے رہنی چاہئے لیکن گھبرانے کی بات نہیں فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ''ان کے مقابلے میں تمہارے لئے اللہ کافی ہوگا''۔یہ اہلِ کتاب جو کچھ کرتے ہیں انہیں کرنے دیجئے، آپ اللہ کی ہدایت کے مطابق ان کی طرف سے ہوشیار رہتے ہوئے اپنا فرض انجام دیتے رہیے، یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔اگر لڑائی آپ کی اور ان کی ہوتی تو پھر شائد کوئی پریشانی کی بات ہوتی مگر جب آپ کی طرف سے اللہ کافی ہے تو پھر آپ کی لڑائی اللہ تعالیٰ خود لڑیں گے اور جس کا سب کچھ اس کا اللہ ہو اسے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔وہ ہزار سازشیں کریں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ سے سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔کیونکہ وہ سمیع بھی ہے اور علیم بھی ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○ (البقرة:۱۳۸)

(اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں)

گزشتہ آیات میں یہود کی طرف سے یہودیت اور نصرانیت کی دعوت کے جواب میں انہیں دعوت دی گئی تھی کہ تم اس طرح اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ جس طرح مسلمان ایمان لائے ہیں۔یہ ایمان ایسا ہے جس میں تمام سابق انبیاء اور سابقہ شریعتوں پر ایمان بھی شامل ہے ۔اس ایمان میں کسی ذہنی تحفظ، کسی قومی انانیت، اور کسی گروہی انفرادیت کا کوئی جواز نہیں ۔جس طرح مسلمانوں نے تمام انتسابات مٹا کر اور تمام تعصبات کو یکسر ختم کرکے ملتِ ابراہیم یعنی اللہ کے دین کا دامن پکڑا ہے اور اپنا سب کچھ اس کے سپرد کر دیا ہے، تم بھی اسی طرح کلیۃً اسلام کی آغوش میں آجاؤ۔اب اس آیتِ کریمہ میں انہیں بتایا جارہا ہے کہ جب تم اس طرح مکمل طور پر اسلام کی آغوش میں آجاؤ گے اور غیر اللہ سے تمام علاقات توڑ لو گے اور ہر طرح کے تحفظات اور تعصبات سے دامن چھڑا لو گے تو پھر تم پر حقیقی معنوں مین وہ رنگ چڑھے گا جسے اللہ کا رنگ کہا جاتا ہے۔اور تمہاری شخصیت میں وہ نکھار آئے گا جس پر صرف اللہ کی رحمت کا سایہ ہوگا۔

Marfat.com

یہود و نصاریٰ پر تعریض

یہاں صبغة یعنی رنگ کا لفظ لا کر یہود و نصاریٰ کے رویے پر تعریض بھی ہے کہ تم جب کسی کو یہودی بناتے ہو تو اسے غسل دیتے ہو اور اس سے یہ سمجھتے ہو کہ جس کو غسل دیا گیا ہے اس پر ایک نیا رنگ چڑھ گیا ہے جو یہودیت کا رنگ ہے اور یہی رنگ اللہ کو پیارا ہے۔ لیکن یہ رنگ وہ ہے جسے تم اپنے تخیل میں محسوس تو کر سکتے ہو لیکن اس کا اثر یہودیت قبول کرنے والے پر دور دور تک نہیں ہوتا اور نہ کوئی دوسرا شخص اس آدمی کو کسی دوسری شخصیت میں ڈھلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ بلکہ یہ محض ایک ظاہری اور فارمل کارروائی ہے۔ جسے یہودیت کے نام سے اختیار کر رکھا ہے اور جس کا زندگی کی تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح عیسائی بھی پیدا ہونے والے بچے کو رنگ دار پانی سے غسل دیتے تھے اور عیسائی ہونے والے کو بھی اسی رنگ دار پانی سے نہلایا جاتا تھا۔ اسے وہ عیسائیت کا رنگ سمجھتے تھے اور اس کا نام اصطباغ رکھتے تھے۔ لیکن یہ رنگ بھی پیدا ہونے والے بچے یا عیسائیت قبول کرنے والے کی شخصیت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔

اللہ کا رنگ عبدیت کا رنگ ہے

یہود و نصاریٰ کو یہاں توجہ دلائی جا رہی ہے کہ مذہب کے نام پر یہ ظاہری کارروائیاں مذہبی تکلف کے سوا کچھ نہیں۔ حقیقی تبدیلی جس کے نتیجے میں ایک بہتر انسان وجود میں آتا ہے وہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ رنگین پانی کا رنگ نہ چڑھایا جائے بلکہ اللہ کے رنگ میں دل و دماغ کو رنگا جائے ظاہری شخصیت سے لے کر باطنی اور معنوی شخصیت تک صرف اللہ کا رنگ جھلکتا ہوا محسوس ہو یہ وہ رنگ ہے جس سے بڑھ کر کوئی رنگ نہیں۔ یہ رنگ اصل میں عبدیت کا رنگ ہے اس لئے فرمایا وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ''اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں''۔ بندہ کا حقیقی رنگ بندگی ہے اور بندگی کا تقاضا سب کچھ اللہ کی اطاعت میں دے دینا، دل کو اس کی محبت سے آباد کرنا اور اپنی پوری شخصیت کو اس طرح اس کے دین میں ڈھال دینا ہے کہ ہر دیکھنے والی نگاہ اس کی بندگی میں اللہ کی کبریائی اور اس کی حاکمیت کی چھاپ دیکھے۔ اس کی ذات اس کے دین کی امین، اسکی صلاحیتیں اس کی رضا کی پاسبان، اس کا اقتدار اس کی حاکمیت کا خادم، اس کی روح اس کے عشق میں سرشار، اس کی عقل اس کے دین کے نور سے روشن اور اس کے راستے میں مرمٹنا اس کی بندگی کی معراج ہو۔ یہ ہے اللہ کا دین اور اس کا رنگ جسے اختیار کرنے سے وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جسے اختیار کرنے کی یہود اور نصاریٰ کو دعوت دی جا رہی ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ○

(کہہ دو! کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو حالانکہ وہی ہمارا بھی رب ہے وہی تمہارا بھی رب ہے ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں اور ہم خالص اسی کیلئے ہیں) (البقرة:۱۳۹)

Marfat.com

یہود و نصاریٰ سے اظہارِ برأت

آنحضرت ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپ یہود و نصاریٰ سے کہیے کہ اگر تم اس کلمہ جامعہ کو قبول کرنے اور اللہ کے رنگ کو اختیار کرنے سے انکار کرتے ہو اور تمہیں اپنی روش پر اصرار ہے کہ تم اللہ کے نبیوں میں تفریق اور تقسیم جاری رکھو گے جس کو چاہو گے مانو گے اور جسے چاہو گے انکار کردو گے حالانکہ تم جانتے ہو کہ تمام انبیائے کرام جن کا تمہاری کتابوں میں بھی ذکر ہے اللہ ہی کے بھیجے ہوئے ہیں اور نبی آخر الزمان ﷺ کی تشریف آوری کے بارے میں تمہاری کتاب میں واضح ہدایات موجود ہیں اور ان کی علامات اس لئے بیان کی گئی ہیں تاکہ تمہیں ان کی پہچان میں غلطی نہ لگے۔ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود اگر تمہارے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اصل جھگڑا ہمارے ساتھ پیغمبروں کے بارے میں نہیں بلکہ اللہ کے بارے میں ہے کیونکہ جب تم جانتے ہو کہ انبیائے کرام اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور جن کتابوں کو وہ پیش کررہے ہیں وہ بھی اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں تو پھر ان انبیائے کرام میں سے کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا یہ درحقیقت اللہ کا انکار ہے اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنا خدا الگ بنا رکھا ہے حالانکہ اللہ ایک ہے وہی ہمارا رب ہے اور وہی تمہارا رب ہے۔ لیکن اگر تمہارا تعصب اور عناد یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ تم اللہ کی کبریائی کو بھی چیلنج کرنے لگے ہو تو پھر تم سے کسی قسم کی بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ہر بات تو بحث کے قابل نہیں ہوتی اور ہر بحث کرنے والا بحث کا حق بھی نہیں رکھتا، بحث کے یہاں تک پہنچنے کے بعد ہم اس بحث کا دروازہ بند کرتے ہیں۔ البتہ تم سے ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تمہارے اعمال بھی ترازو میں ہیں اور ہمارے اعمال بھی۔ تم اپنے اعمال کے بارے میں اگر سوچنے کیلئے تیار نہیں ہو تو ہم اعلان کئے دیتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان سب کچھ اپنے اللہ کے حوالے کردیتا ہے۔ اسی کے احکام سے جیتا اور اسی کے احکام پر مرتا ہے۔ آخری چیز جس کی حفاظت سب سے مشکل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دل و دماغ میں بھی اللہ کے سوا کسی کا خیال نہ ٹھہر سکے۔ وہاں بھی صرف اللہ ہی کی ذات اور اس کی صفات کا بسیرا ہو۔ ہم اپنے دل و دماغ کو خالص کرتے ہوئے یہ عرض کرتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے مخلص ہیں۔ ہمارے دلوں کی گہرائی کا حال نہ کسی فرشتے کو معلوم ہے نہ شیطان کو۔ اسے صرف ہمارا رب جانتا ہے ہم اسے بھی اپنے اللہ کیلئے خالص کرچکے ہیں۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

(کیا تم دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد یہودی تھے یا نصرانی۔ پوچھو! تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے چھپائے اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کررہے ہو)　(البقرۃ:۱۴۰)

بحث کو ختم کرتے ہوئے پھر ایک دفعہ یہود و نصاریٰ پر اتمام حجت کی جارہی ہے اور ان سے پوچھا جارہا ہے کہ کیا تم واقعی یہ کہتے ہو کہ حضرت ابراہیم، اسماعیل اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولادیں یہودی تھے یا نصرانی۔ اگر تمہارا اب بھی یہی خیال ہے تو پھر یہ نہایت

Marfat.com

خطرناک صورتحال ہے کیونکہ تمہاری کتابیں ان حقائق سے بھرپور ہیں کہ یہ تمہارے بزرگ یہودیت اور نصرانیت کے پیدا ہونے سے بہت پہلے گزرے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں اس بات کو پوری طرح واضح کیا ہے کہ وہ سرتاسر مسلم تھے اور ان کا کسی اور انتساب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن تم اپنی کتابوں کی واضح ہدایتوں کے باوجود ان کے یہودی یا نصرانی ہونے پر اصرار کر رہے ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا علم اللہ کے علم سے بڑھ کر ہے۔ اگر تم اتنا بڑا دعویٰ کرنے کی جرات نہیں کرتے بلکہ اللہ ہی کے علم کو اپنے علم سے بڑھ کر سمجھتے ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی کتابوں کی شہادتوں کو چھپا رہے ہو۔ تمہاری کتابیں گواہی دے رہی ہیں کہ اللہ کے تمام نبی یہودی یا نصرانی نہیں، مسلم تھے۔ لیکن تمہیں مسلسل اپنی بات پر اصرار ہے۔ تو پھر یاد رکھو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں۔ وہ تمہارے کرتوتوں اور شرارتوں کو خوب جانتا ہے وقت آنے پر وہ تمہیں بدترین سزا دے گا۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥

(یہ گروہ تھا جو گزر چکا اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کمایا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کی بابت تم سے سوال نہ ہوگا) (البقرۃ:۱۴۱)

یہ آیتِ کریمہ اسی رکوع میں اس سے پہلے بھی گزر گئی ہے۔ اس میں چونکہ ان کے بنیادی روگ کا ذکر کیا گیا ہے جس نے ان کی دینی زندگی تباہ کر دی ہے۔ اس لئے دوبارہ انہیں خبردار کیا جا رہا ہے کہ تم اپنے کرتوتوں کے بارے میں شائد اس لئے بے دھڑک واقع ہوئے ہو کہ تمہیں کسی گرفت کا اندیشہ نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم اللہ کے نبیوں کی اولاد ہیں ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ اگر کوئی ہوئی بھی تو ہمارے آباؤ اجداد ہمیں چھڑا لیں گے۔ اس لئے دوبارہ یاددہانی کرائی جا رہی ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد بہت عظیم لوگ ہیں لیکن ان کی نیکیاں اور ان کے کارنامے ان کے کام آئیں گے۔ تمہارے جرائم اور تمہارے گناہ تمہارے نامۂ عمل کا حصہ ہوں گے۔ اس لئے ان کی باز پرس تم سے ہوگی اور تم ہی اپنے جرائم کے حوالے سے سزا پاؤ گے۔ اس لئے اگر اپنے ہولناک انجام سے بچنا چاہتے ہو تو آج اپنے رویے کو درست کر لو ورنہ قیامت کے دن تمہارے آباؤ اجداد تمہارے کام نہیں آئیں گے۔

بنی اسرائیل پر تنقید سے مترشح ہونے والی حکمتیں

پہلا پارہ تکمیل پذیر ہوا اور اہلِ کتاب پر فی الجملہ تنقید مکمل ہوگئی۔ تنقید کی تکمیل پر چند ایسی بصیرت افروز باتیں ارشاد فرمائی گئیں جس میں اہلِ کتاب کے لئے عموماً اور مسلمانوں کیلئے خصوصاً غور و فکر اور نصیحت آموزی کا بہت سامان رکھا گیا ہے۔ اس پوری بحث میں یوں تو حقائق کا ایک جہان سمٹا ہوا ہے لیکن معمولی غور و فکر سے بھی جو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ان میں سے چند باتوں کو ہم ذکر کرتے ہیں۔

1۔ اہلِ کتاب پر تنقید نے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے نہ صرف نبوت اور شریعت کے حامل تھے بلکہ انہیں دنیا کی ہدایت اور رہنمائی کے منصب پر بھی فائز کیا گیا تھا۔ اور اس سلسلے میں ان سے مسلسل عہد و پیمان لئے گئے تھے اور ان پر یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ تمہیں دنیا پر جو عزت اور فضیلت عطا کی گئی ہے یہ تمہارے اس عہد و پیمان کے ایفا کے ساتھ مشروط ہے اگر تم نے اپنی حقیقی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کی تو پھر تم اس عزت اور فضیلت سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ چنانچہ اس تنقید نے پوری

Marfat.com

طرح یہ بات کھول کر رکھ دی کہ بنی اسرائیل اپنی منصبی ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے بری طرح قاصر رہے ہیں اور انہوں نے قدم قدم پر اللہ سے کئے گئے مواثیق کو توڑا ہے اب وہ ہرگز اس کے اہل نہیں رہے کہ انہیں دنیا کی امامت کے منصب پر باقی رکھا جائے۔

2۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم پیغمبرانہ زندگی کے چند گوشوں کو واضح کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انسانوں کی امامت وسیادت کے منصب پر اس لئے فائز نہیں کیا تھا کہ یہ کوئی موروثی منصب تھا بلکہ آپ نے اللہ کی اطاعت و بندگی اور اس راستے میں پیش آنے والی آزمائشوں میں سرخرو ہو کر اپنے آپ کو اس منصب کا اہل ثابت کیا تھا اور آئندہ کیلئے بھی آپ کو بتا دیا گیا تھا کہ آپ کی اولاد میں سے یہ منصب اسی کو ملے گا جو آپ کی طرح اپنی اہلیت کو ثابت کرے گا۔ بنی اسرائیل کا نااہل ہونا چونکہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے اس لئے اب اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اب اس امامت کے منصب پر ایک اور امت فائز کی جائے گی۔

3۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے چند اوراق الٹتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ ہی نے مکہ معظمہ میں اللہ کے پہلے گھر کو تعمیر کیا تھا اور اسی گھر کیلئے آپ نے یہ دعا مانگی تھی کہ یا اللہ اسے لوگوں کا مرکز بنانا اور اپنی اولاد کیلئے بار بار دعا کی کہ یا اللہ! اپنے اس گھر کو میری ساری اولاد کا قبلہ بنانا اور یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ آپ کی اولاد جس طرح حضرت اسمٰعیل تھے اسی طرح حضرت اسحٰق علیہ السلام بھی تھے اور دونوں ہی سے آگے سلسلۂ ہدایت چلا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کی نسل اور اولاد کیلئے اسی گھر کو قبلہ بنایا۔

4۔ حضرت ابراہیم نے اس گھر کی تعمیر کے بعد اللہ سے بطورِ خاص یہ دعا مانگی کہ یا اللہ! میری اولاد جو اس گھر کی تولیت اور خدمت کیلئے آباد ہو انہیں میں اپنا آخری پیغمبر بھیجنا تاکہ وہ پوری دنیا کیلئے اس گھر کو تیرے دین کا مرکز بنا دے۔ اور میری اور اسمٰعیل کی اولاد سے ایک امت اٹھانا جو صرف تیری فرماں بردار اور عبادت گزار ہو۔

تحویلِ قبلہ کی تمہید

ان تمام مقدمات کو پیشِ نظر رکھئے اور پھر غور فرمایئے کہ بنی اسرائیل کی معزولی کے بعد جس امت کو اس عظیم منصب پر فائز کیا جا رہا ہے کیا وہ امت اس آخری نبی کی امت کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ اور اس امت کو چونکہ پوری دنیا کی قیادت اور امامت کے منصب پر فائز کیا جا رہا ہے تو کیا اس کا قبلہ اس قبلے سے مختلف ہو سکتا ہے جسے اس قبلے کو تعمیر کرنے والے دنیا کے پہلے امام نے اپنا قبلہ بنایا تھا اور اسی قبلے کے صحن میں کھڑے ہو کر اس امت کیلئے دعائیں مانگی تھیں۔ یہ دونوں باتیں اس قدر واضح ہیں کہ معمولی غور و فکر سے بھی بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اس لئے جو آدمی بھی تاریخ کے ان گوشوں کو سامنے رکھ کر غور و فکر کرے گا وہ تحویلِ قبلہ کے حوالے سے کوئی اعتراض کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ البتہ! صرف وہ شخص اعتراض کر سکتا ہے جس کے دماغ میں سرنے سے عقل نہ ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں تھے تو آپ بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ آپ رکن یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان کھڑے ہوتے اس طرح سے آپ کا رخ مبارک بیت اللہ کی طرف بھی ہوتا اور بیت المقدس کی طرف بھی۔ مگر جب آپ ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لے آئے۔ تو دونوں کی طرف نماز میں منہ کرنا ممکن نہ رہا اس لئے آپ اللہ کے حکم سے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ آپ کا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اسلام کسی گروہ بندی کیلئے نہیں آیا اور آنحضرت ﷺ کسی گروہ کے پیغمبر نہیں بلکہ جس طرح آپ بیت اللہ کے پیغمبر ہیں اسی طرح آپ بیت المقدس کے بھی پیغمبر ہیں۔ اسی لئے آپ کو معراج کی رات

Marfat.com

مکہ معظمہ سے مسجدِ اقصیٰ یعنی بیت المقدس لے جایا گیا تاکہ لوگوں کے سامنے یہ بات کھل جائے کہ دنیا پہلے دو قبلوں میں تقسیم تھی اب اللہ کے وہ آخری نبی آ گئے ہیں جو نبی القبلتین ہیں البتہ تحویلِ قبلہ کے ساتھ یہ بات واضح کر دی کہ بیت المقدس کے قبلہ ہونے سے انکار نہیں۔

لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو دنیا کے اصل امام تھے اور جن کی امامت پہلے بنی اسرائیل کی طرف اور اب اس امت کی طرف منتقل ہو رہی ہے انہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی اور بیت المقدس سینکڑوں سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں وجود میں آیا اور اسے اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس کا رخ بیت اللہ کی طرف تھا کیونکہ اصل قبلہ بیت اللہ ہی تھا۔ بیت المقدس کو صرف انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ اس لئے بنایا گیا تھا کہ ایک تو اس کا رخ بیت اللہ ہی کی طرف تھا اور دوسری یہ بات کہ اس وقت کے سیاسی اور دینی حالات اس بات کی اجازت نہ دیتے تھے کہ بنی اسرائیل بیت اللہ کو قبلہ بنا کر اس کے حقوق کی ادائیگی کر سکیں اور ان کو جس مرکز کی ضرورت تھی بیت اللہ ان سے دور ہونے کے باعث ان کیلئے مرکز کی ضروریات پوری کر سکے۔ ان کی ملی، دینی، اور سیاسی ضرورتوں کا تقاضا یہ تھا کہ جن حدود میں وہ گھر کر رہ گئے ہیں وہیں ان کے لئے ایک قبلہ کی ضرورت کو پورا کیا جائے۔

کعبہ کی حقیقی ضرورت امت کو عقیدت اور عبادت کے حوالے سے ایک رخ دینا ہے اور ان کے دینی احساسات کو اس طرح اس کے ساتھ وابستہ کرنا ہے کہ وہ سال میں کم از کم ایک دفعہ پوری امت میں تحریک کا باعث بن سکے۔ امت کے صالح افراد کو چن چن کر اس طرح کھینچے جس طرح دل شریانوں سے خون کھینچتا ہے اور پھر ان میں دینی جذبات اور عقیدت اور محبت کی آگ بھر کر اس طرح واپس پوری امت میں پھیلا دے جس طرح دل خون کو پمپ کر کے اسے شریانوں میں واپس کرتا ہے ورنہ کعبہ کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ اس کی پوجا کی جائے، پوجا اور عبادت تو صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ یہ تو انسانی احساسات کی فطری ضرورت ہے کہ ان کی تطہیر کیلئے ایک محسوس نمونہ ان کے سامنے ہو جس کے طواف میں وہ عاشقانہ بے خودی محسوس کریں اور جس کی زیارت سے آنکھوں میں نور اور دلوں میں ٹھنڈک کا احساس ہو اور جس کے گرد و پیش میں بندگی اور عقیدت سرفروشی اور قربانی کی وہ عظیم یادگاریں بکھری ہوئی ہوں جس سے قدم قدم پر انسان کے خفتہ احساسات کو زندگی ملے۔ بنی اسرائیل کی دینی تعلیم و دعوت چونکہ بنی اسرائیل کی حدود سے باہر نہ نکل سکی اس لئے بجائے اس کے کہ دینی احساسات کے ساتھ انہیں آلِ اسمٰعیل سے ٹکرا دیا جاتا انہیں بیت المقدس کی شکل میں اللہ کا گھر دیا گیا جس کا رخ تو بیت اللہ کی طرف رہا لیکن بنی اسرائیل کی مرکزیت کی ضرورت پوری کرتا رہا۔ اب جبکہ نئی امت وجود میں آ گئی بنی اسرائیل اس منصب سے معزول ہو گئے اس امت نے اس منصب کی ذمہ داریاں سنبھال لیں تو یقینی بات تھی کہ انہیں مرکزیت کے لئے وہ قبلہ دیا جاتا جس کیلئے اس کے عظیم معمار نے دعائیں مانگی تھیں اور جسے قیامت تک کیلئے ہدایت کا سرچشمہ بننا تھا کیونکہ وہ پہلے دن سے جب دنیا میں اور کوئی قبلہ نہ تھا اسی حیثیت اور شناخت کا حامل بنایا گیا تھا۔

یہ تمام حقائق چونکہ یہود اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے تحویلِ قبلہ کا حکم دینے سے پہلے ان کے ردعمل کو حماقت اور بے وقوفی ٹھہرایا گیا اور ایک دوسرے پہلو سے ان کی بے وقوفی کو مزید نمایاں بھی فرمایا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ
كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا
جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ
مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى
الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ
فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾
وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا
اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ
اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ

Marfat.com

اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ (۱۴۶)

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ (۱۴۷)

پارہ ۲، رکوع: ۱ (اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا ان لوگوں کو اس قبلہ سے جس پر یہ پہلے تھے، کہہ دیجئے مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ اسی طرح ہم نے تمہیں ایک ''امت وسط'' بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو صرف اس لئے قبلہ بنایا تھا کہ ہم ممیز کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرنے والے ہیں ان لوگوں سے جو پیٹھ پیچھے پھر جانے والے ہیں۔ بے شک یہ بات بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ ہدایت نصیب کرے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں۔ یقین جانو اللہ تو لوگوں کے ساتھ بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ ہم دیکھتے رہے ہیں آسمان کی طرف آپ کے چہرے کے بار بار اٹھنے کو، سو ہم پھیرے دیتے ہیں آپ کو اسی قبلے کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ پس پھیر دیجئے اپنا رخ مسجد حرام کی طرف، اب جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنا رخ اسی کی طرف کرو جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ اگر آپ اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں بھی لے کر آ جائیں، تو بھی یہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے ہیں اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے ہیں۔ اگر تم اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی کریں گے تو بلاشبہ آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں البتہ ان میں ایک گروہ ہے جو حق کو چھپاتا ہے اور وہ جانتا بھی ہے O یہی حق ہے جو آپ کے رب کی جانب سے ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو) (آیت ۱۴۲ تا ۱۴۷)

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ O (البقرۃ: ۱۴۲)

''اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا ان لوگوں کو اس قبلہ سے جس پر یہ پہلے تھے، کہہ دیجئے! مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔''

Marfat.com

یہود کو بے وقوف قرار دینے کی وجہ اور متوقع ردعمل کا ذکر

ابھی تحویلِ قبلہ کا حکم نہیں دیا گیا لیکن مخالفین کی جانب سے جس ردعمل کی توقع کی جاسکتی تھی (پروردگار تو عالم الغیب ہونے کے باعث اس ردعمل سے پوری طرح آگاہ تھے) اس کا ذکر فرما کر مسلمانوں کے دل و دماغ کو آنے والے حالات کے لئے پوری طرح تیار کیا جارہا ہے اور ساتھ ہی یہ بتایا جارہا ہے کہ اوس و خزرج کے لوگ یہود کے علم سے چاہے کیسے ہی متاثر اور مرعوب ہوں لیکن اس معاملے میں یہود کا طرزِ عمل سراسر سفاہت اور بیوقوفی پر مبنی ہے کیونکہ اگر وہ اپنے علم سے کام لیں تو ان کی کتابیں اس بات سے بھرپور ہیں کہ آنے والے آخری نبی کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد یعنی قریش میں سے آنا ہے۔ وہ اس شہر میں پیدا ہوں گے، جہاں اللہ کا گھر موجود ہے۔ وہ اس امامت کے وارث ہوں گے جس کے لئے اس گھر کے معمار نے دعائیں مانگی تھیں اور آپ اسی بیت اللہ کو اپنا قبلہ بنائیں گے۔ اسی مرکزِ ہدایت سے آپ کے واسطے سے وہ انقلاب اٹھے گا جس کی برکات سے ساری دنیا فائدہ اٹھائے گی اور وہ آنے والا نبی دونوں قبلوں کی قیادت کو جمع کردے گا بنی اسرائیل کی قیادت ختم ہوجائے گی اور اس کی نبوت اور قیادت میں بننے والی امت اس عظیم منصب کی وارث ہوگی۔ یہ وہ باتیں ہیں جن میں سے ایک ایک بات سے یہود پوری طرح باخبر تھے اور ان کی کتاب ان میں سے ہر بات کی گواہ تھی۔ اندازہ کیجئے! کہ جس امت کے علماء علمی خیانت سے باز نہ آئیں اور وہ جانتے بوجھتے تجاہل عارفانہ کا ثبوت دیں تو انہیں اگر سفہاء کا خطاب نہ دیا جائے تو اور کیا دیا جائے اور ان کے طرزِ عمل کو سفاہت نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ جہاں تک عقلِ عام کا تعلق ہے جس میں علماء اور جہلا سب شریک ہیں اس حوالے سے بھی دیکھا جائے تو یہود کی سفاہت اور بے وقوفی حیران کردینے والی ہے۔ جو قوم اپنے پاس ایک دین، ایک شریعت اور ایک کتاب رکھتی ہے اس کے جہلا تک بھی عقیدے کی اس بنیادی بات کو ضرور سمجھتے ہیں کہ مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب صرف اللہ کی ملک ہیں۔ کسی جہت کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ کسی جہت کو اگر کوئی اہمیت حاصل ہوتی ہے تو صرف اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔ لیکن یہود و نصاریٰ نے بغیر کسی دلیل کے مشرق اور مغرب کو اپنے لیے مخصوص کرلیا اور صدیوں سے اسی بات پر آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اگر جہت میں اپنے طور پر کوئی تقدس ہوتا تو اللہ کی جانب سے کسی قبلے کی تعمیر اور تعیین کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا، نہ بیت اللہ وجود میں آتا، نہ بیت المقدس۔ لیکن یہود مذہبی طور پر ان بنیادی باتوں کو سمجھنے کے بعد بھی جہت کی تقدیس پر اصرار کررہے تھے اور مسلمانوں کو الزام لگا رہے تھے کہ تمہیں آخر کس چیز نے مجبور کیا ہے کہ تم جس قبلہ پر پہلے تھے اسے بدل ڈالو حالانکہ اگر وہ قبلہ اللہ نے مقرر کیا تھا تو اب بھی اللہ ہی کے حکم سے تبدیل کیا جارہا ہے۔ اگر بغیر حکمِ خداوندی اسے قبلہ بنایا گیا تھا تو پھر اسے بدل دینے میں حرج ہی کیا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ اصل چیز یہ نہیں کہ تم منہ کس طرف کرتے ہو بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تم کس کے حکم سے کرتے ہو۔ اس نے تمام دنیا کا قبلہ بیت اللہ کو بنایا تھا پھر ایک وقت آیا کہ انبیائے بنی اسرائیل کے لئے بیت المقدس کو قبلہ بنادیا گیا۔ اب نبی آخرالزماں کے آنے کے بعد پھر اسی بیت عتیق کو قبلہ بنانے کا حکم دیا جارہا ہے تو اس میں بقائمی ہوش و حواس اعتراض کی آخر کیا گنجائش ہے۔ صراطِ مستقیم صرف یہ ہے کہ اللہ کے حکم کو آخری سند سمجھا جائے اور اسی کی تعمیل کو اپنے لئے دنیا اور آخرت میں ذریعہ نجات سمجھا جائے۔

Marfat.com

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ O

(اسی طرح ہم نے تمہیں ایک ''امت وسط'' بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو صرف اس لئے قبلہ بنایا تھا کہ ہم ممیز کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرنے والے ہیں ان لوگوں سے جو پیٹھ پیچھے پھر جانے والے ہیں۔ بے شک یہ بات بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ ہدایت نصیب کرے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں۔ یقین جانو اللہ تو لوگوں کے ساتھ بڑا مہربان اور رحیم ہے) (البقرۃ:۱۴۳)

کَذٰلِکَ کا مفہوم

یہ آیت کریمہ اپنی معنوی گہرائی اور امت کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے نہایت معرکۃ الآرا آیت ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ قابلِ غور ہے، لیکن ہم تفصیل اور اطناب سے بچتے ہوئے چند ناگزیر حقائق کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔ سب سے پہلے کذلک پر توجہ دیجئے اس کا معنی ہے ''اسی طرح'' ہم نے تمہیں اسی طرح امتِ وسط بنایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ اشارہ کس طرف ہے؟ معمولی غور وفکر سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سیاقِ کلام میں جو موضوع زیرِ بحث ہے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ بنی اسرائیل پر کئی پہلوؤں سے تنقید ہوئی ہے۔ لیکن آخر میں دو باتوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ تمہیں اللہ نے اسلام کی دولت دے کر دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز کیا تھا۔ لیکن تم اس شاہراہِ ہدایت سے محروم ہو کر یہودیت اور نصرانیت کی دلدل میں اتر گئے۔ تم نے اپنے لئے ایک ایک حصار کھینچ لیا۔ یہود نے یہودیت کے تنگ نائے سے نکلنے سے انکار کر دیا اور عیسائیت نے عیسائیت ہی کو عافیت کدہ سمجھا اور اپنے اپنے مخصوص پیغمبر پر اکتفا کر کے باقی سب پیغمبروں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ شریعت میں بھی اپنی مرضی سے کمی بیشی کی اور اپنے اپنے گروہ کو حق کا اجارہ دار سمجھ کر حق کو اپنی ذات میں محدود کر لیا۔ اللہ کا دین جو ہوا اور پانی کی طرح سب کی ضرورت ہے، تم نے اسے گروہوں میں بانٹ دیا اور جب بھی اللہ کے کسی پیغمبر نے تمہیں اس گمراہی سے نکالنے کی کوشش کی تو تم نے اس کو یا تو قتل کر دیا اور یا مخالفت سے بے بس کر دیا۔ چنانچہ گزشتہ آیات میں اللہ نے اس صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے ان میں سے ایک ایک گمراہی پر تنقید کی اور ان کے آباؤ اجداد کی شہادت سے اسلام کی صراطِ مستقیم کو ان کے سامنے کھول دیا۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح ہم نے دوبارہ انسانوں کو صراطِ مستقیم کی خبر دی ہے، اسی طرح ہم نے اس صراطِ مستقیم کے علمبردار بنا کر مسلمانوں کو امت وسط بنایا ہے تا کہ دنیا میں وہ فرض انجام دیں جس فرض کی ادائیگی کا کبھی اہلِ کتاب کو پابند کیا گیا

Marfat.com

تھا۔ دوسری بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس کی صورت میں ان کی مرکز کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے قبلہ دیا تھا لیکن اس کا رخ بیت اللہ کی طرف رکھ کر اور تمام قربانیوں کا رخ بیت اللہ کی طرف مقرر فرما کر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ سب سے پہلا گھر جسے اللہ نے دنیا کے کعبہ کی فضیلت سے نوازا تھا وہ بیت اللہ ہی تھا۔ بیت المقدس تمہیں تمہاری ملی ضرورتوں کے تحت عطا کیا جا رہا ہے۔ اسے قبلہ بنا کر بیت اللہ کی اصل حیثیت سے انکار نہ کر دینا اور اس سے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا کہ قبلہ ہر امت کیلئے مرکزِ ہدایت اور شیرازہ بندی کا سب سے اہم ذریعہ ہوتا ہے لیکن اصل مقصود و مطلوب اللہ کی ذات ہوتی ہے۔ اسی کے حکم سے قبلہ کا تعین ہوتا ہے اور اسی کے حکم سے قبلہ کی تحویل ہوتی ہے۔ لیکن یہود و نصاریٰ نے اس حقیقت کو نظر انداز کر کے پہلے بیتِ ابراہیمی کے قبلہ ہونے سے انکار کیا اور پھر بیت المقدس میں مشرق و مغرب کے جھگڑے میں پڑ گئے اور بیت المقدس کے باہر مشرق و مغرب کو مقدس سمجھ کر جہت پرستی کا آغاز کر دیا اور اس طرح گمراہی در گمراہی میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو یہود و نصاریٰ دونوں کیلئے اصل پیشوا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ ان کا قبلہ کون سا تھا؟ مقامِ ابراہیم کہاں تھا؟ انہوں نے بیٹے کی قربانی کہاں دی تھی؟ اور نبی آخر الزمان اور آخری امت کیلئے کہاں کھڑے ہو کر انہوں نے دعائیں مانگی تھیں؟ اپنی کتابوں کی تعلیم کے باعث وہ ان باتوں میں سے ہر بات کو جانتے تھے۔ لیکن انہوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ایک ایک کر کے ان صداقتوں کو فراموش کر دیا۔ گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان صداقتوں اور اہلِ کتاب کی جسارتوں کا ذکر فرما کر از سرِ نو انسانوں کو صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرمائی ہے۔ فرمایا: جس طرح ہم نے تمہیں اس ہدایتِ گم گشتہ سے از سرِ نو وابستہ کیا ہے اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تمہیں ایک ''امت وسط'' بنایا ہے۔

امتِ مسلمہ کے امتِ وسط ہونے کا مفہوم

وَسَطٌ کا لفظ وَلَدٌ کی طرح مذکر مؤنث، واحد اور جمع سب کیلئے آتا ہے۔ وہ چیز جو دو طرفوں کے بالکل بیچ میں ہو اسے وسط کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی کی بھی معاملے کے مختلف پہلوؤں میں سے جو پہلو درمیان میں ہوتا ہے اسے ''اوسط الامور'' کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے خیر الامور اوسطھا معاملات میں بہتر اس کا اوسط ہوتا ہے۔ کسی بھی تقریب میں سب سے اہم شخصیت کی نشست عین درمیان میں ہوتی ہے اور یہ اس کے لئے عزت کی علامت ہوتی ہے۔ امت اسلامیہ کو امت وسط کہنے کا شائد یہی مطلب ہے کہ آپ دنیا کی تمام قوموں میں امت وسط کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی آپ کا مقام سب سے بلند ہے اور اللہ نے آپ کو تمام قوموں میں فضیلت سے نوازا ہے۔ یعنی وہ فضیلت جو کبھی بنی اسرائیل کو دی گئی تھی ان کی معزولی کے بعد وہ فضیلت آپ کو دی جا رہی ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا رہا ہے کہ آج سے آپ دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کئے جا رہے ہیں۔ یہی بات قرآنِ کریم میں ایک دوسری جگہ کنتم خیر امة ''تم سب سے بہتر امت ہو'' کے الفاظ میں دہرائی گئی ہے۔

اس لفظ کی معنویت میں مزید غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمہ کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم

Marfat.com

ہو۔عدل وانصاف کی وجہ سے اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اعتدال کی کیفیت ہواور اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے ایک ایسی حیثیت کا حامل ہو کہ جو دنیا کیلئے مینارۂ نور بھی ہو اور کمزوروں کے لئے سب سے بڑا سہارا ہو۔جس طرح دنیا رہنمائی کیلئے اس کی طرف دیکھے اسی طرح اپنی بے بسی میں مدد اور اعانت کی اسی سے طالب ہو۔وہ خیر اور بھلائی کی ایک ایسی قوت ہو کہ اس کی موجودگی میں کسی پر ظلم نہ ہو سکے۔نہ وہ کسی پر ظلم کرے اور نہ وہ کسی پر ظلم ہونے دے۔کسی امت کا عدل وانصاف پر قائم رہنا اس کی بقا کی دلیل ہے اور عدل اور انصاف کی قوت بن جانا، دنیا اور اہلِ دنیا کی بقا کا ضامن ہے۔اس لحاظ سے جب ہم مزید تدبر سے کام لیتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اس امت کو انہیں دونوں حیثیتوں کا نمائندہ بنایا ہے۔اس کی اپنی ذات میں اس کے تمام اداروں سمیت اعتدال کی ایک ایسی روش پائی جاتی ہے جس سے سرِ مو انحراف کرنے کی اجازت نہیں۔اور یہی اس کی زندگی اور اس کی اخلاقی اور روحانی صحت کی ضامن ہے۔جس طرح انسانی جسم اس وقت تک صحت مند رہتا ہے جب تک جسمانی اخلاط میں ایک اعتدال اور تناسب پایا جاتا ہے۔اگر ان اخلاط میں سے کوئی افراط وتفریط کا شکار ہو جائے تو جسم بیمار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔انسانی جسم کا حسن اس کے اسی اعتدال سے قائم ہے۔اس کے اعضاء کا تناسب، اس کے مزاج کی یکسانی، اس کے رنگ وروپ کی ہم آہنگی، اس کے صوتی زیر وبم کی دلآویزی، اور اس کے لب ولہجہ کی چاشنی یہ سب مل کر ایک ایسے اعتدال اور تناسب کو جنم دیتے ہیں جسے حسن کا نام دیا جاتا ہے۔یہی حال ہر قوم کی معنوی زندگی کا بھی ہے اس کی بھی اصل روح جسمانی اعتدال کے ساتھ ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال ہی ہے۔امت وسط کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔اس امت کے پورے نظامِ زندگی کا ذکر کرنا تو اس مختصر صحبت میں ممکن نہیں ہم صرف چند باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

امتِ وسط عقائد کے اعتبار سے

سب سے پہلی چیز جس سے قوموں کی شیرازہ بندی ہوتی اور فکر وعمل کی دنیا تعمیر ہوتی ہے وہ اس کے بنیادی تصورات ہوتے ہیں، جن کو شریعت کی زبان میں عقائد کہا جاتا ہے۔انہیں پر پوری دینی زندگی کا دار ومدار ہے۔اس حوالے سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہر مذہب کے بنیادی عقائد تین ہی رہے ہیں۔توحید، رسالت اور آخرت۔لیکن جب ہم ان عقائد کی تفصیل اور ان قوموں کے اندر ان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ قومیں جو اپنے پاس آسمانی مذاہب ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں خود ان کے عقائد اور ان پر ان کا عمل ایک ایسی افراط وتفریط کا شکار ہے جس سے زیادہ افراط وتفریط کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔یہود ایک طرف اللہ کو ذات وصفات میں ایک ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بھی کہتے ہیں۔عیسائی بھی توحید کے قائل ہیں، لیکن ساتھ ہی نہ صرف کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں بلکہ اقانیمِ ثلاثہ کے گورکھ دھندے کو انہوں نے عقائد کا محور بنا رکھا ہے۔رسالت کے بھی قائل ہیں، لیکن پیغمبر کو انسان ماننے کی بجائے اللہ کا بیٹا سمجھتے ہیں اور جن پیغمبروں کو انسان تسلیم کرتے ہیں ان کی معصومیت کو اپنی کتابوں میں انہوں نے بری طرح مجروح کر رکھا ہے۔

غور کیجئے! کہ جو پیغمبر اپنے کردار میں نمونہ نہیں بن سکتا وہ لوگوں کے سامنے پیغمبری کا فرض کیسے انجام دے سکتا ہے۔

Marfat.com

آخرت کو مانتے ہیں، لیکن نجات کا دارومدار نسل اور نسب پر رکھتے ہیں۔ اور اپنے آباؤ اجداد کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اگر اس بنیاد کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر آخرت میں جزا اور سزا کا کیا تصور باقی رہ جاتا ہے۔

ان تمام مذاہب کے مقابل میں اسلامی عقائد کو دیکھ لیجئے۔ توحید ہے تو بالکل خالص، بالکل بے میل، ہر آلودگی سے پاک اور ہر طرح کے شرک سے بالا۔ رسالت ہے، تو رسول کی ذات اس کی صفات اور اس کے پیغام میں کہیں جھول اور کہیں فاصلہ دکھائی نہیں دیتا۔ رسالت کو پیغام اور پیغامبر دونوں کا مرقع بنایا گیا ہے۔ رسول اپنی سیرت و کردار میں انسانیت کا ایک ایسا اعلیٰ نمونہ ہے جس میں ہر طبقۂ زندگی کیلئے رہنمائی موجود ہے۔

آخرت کے تصور کو اس طرح پوری زندگی پر حاوی کر دیا گیا ہے کہ انسان کا کوئی عمل اس سے آزاد نہیں۔ جزا اور سزا کے تصور کو بے لاگ بنا دیا گیا ہے۔ اللہ کے نبیوں اور اس کے نیک بندوں کے احترام کی حدود واضح کی گئی ہیں۔ شفاعت کا صحیح تصور دے کر انسان کو اپنے اعمال کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ دوسرے مذاہب کے اعتقادی افراط و تفریط کے مقابلے میں اسلامی عقائد میں کس حد تک اعتدال کارفرما ہے۔

عبادت کے اعتبار سے

مذہب کا ایک بہت بڑا شعبہ عبادت ہے۔ تمام دوسرے مذاہب کو دیکھئے کہ وہ نظریاتی طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عبادت اللہ ہی کی ہونی چاہئے لیکن عملی طور پر انہوں نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک طرف سیکولر دنیا ہے، جن کی پوری زندگی بندگی کے تصور سے بے گانہ ہے۔ دوسری طرف وہ مذہبی طبقہ ہے جو راہبانہ زندگی کا قائل ہے۔ عیسائیت بھی رہبانیت کو مذہب کی میراث سمجھتی ہے اور ہندوازم بھی جوگی ازم کو مذہب کا حقیقی پرتو سمجھتا ہے اس کے مقابلے میں اسلام کا تصورِ عبادت کس قدر اپنے اندر اعتدال رکھتا ہے۔ وہ جس طرح رہبانیت سے انکار کرتا ہے اسی طرح سیکولرازم سے بھی انکار کرتا ہے۔ وہ جس طرح ترکِ دنیا کو گمراہی سمجھتا ہے اسی طرح پوری زندگی کو اللہ کے احکام سے آزاد کر کے انسان کے حوالے کر دینے کو بھی گمراہی سمجھتا ہے۔

معاشرت اور تمدن کے حوالے سے

معاشرتی اور تمدنی پہلو سے دیکھیں تو دنیا کے مذاہب چونکہ اپنی معاشرت اور اپنے تمدن کو مذہب سے آزاد کر چکے ہیں اس لئے ان میں افراط و تفریط کا ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن بعض باتیں تو ان میں ایسی مضحکہ خیز ہیں کہ جس کی کوئی توجیہ کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً ایک طرف تو عیسائیت کے وہ اخلاقی نظریات دیکھئے جو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں کہ دشمن ان کے ساتھ کوئی بھی سلوک کرے وہ صبر، درگزر اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ان کا وہ رویہ ہے جس کی آج پوری دنیا شکار ہے۔ اولاً تو ان کا مذہبی طبقہ ہر جگہ اپنی تہذیب کو اپنے مذہب کا پرتو قرار دیتا ہے لیکن اگر ایسا نہ بھی سمجھا جائے اور صرف ان کے تہذیبی دعوؤں کو ان کی تعلیم اور تجربات کا نچوڑ سمجھا جائے تو آج جس طرح انہوں نے دوسری قوموں کے سامنے اپنی تہذیب اپنے تمدن، اور اپنے اخلاق کی نمائش کی ہے وہ تو انسانیت کیلئے نہایت سبق آموز ہے۔ عرب تو بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے تھے، انہوں نے نسلیں زندہ درگور کر دی ہیں۔ تاتاریوں کا ظلم، تاریخ کے منہ پر ایک

Marfat.com

بدنما داغ ہے۔لیکن افغانستان،عراق، چیچنیا، بوسینیا، فلسطین، اور کشمیر میں ان کے مظالم تو دنیا بھر کے مظالم کو شرمادینے کیلئے کافی ہیں۔اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے اپنے دورِ عروج میں عدل واحسان کی جو مثالیں قائم کی ہیں اور جس طرح صرف انسانوں کو نہیں بلکہ حیوانوں ،کھیتیوں، شاہراہوں اور عام آبادیوں کو جو حقوق دیئے اس سے تہذیبی اعتدال کا پتہ چلتا ہے انسانوں میں مساوات تہذیب کا پہلا سبق بھی ہے اور اس کا ثمرہ بھی۔اس لحاظ سے اسلام کا نظامِ معاشرت، نظامِ معیشت، اور نظامِ سیاست قدم قدم پر اس کی عکاسی کرنے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن یہودیت، نصرانیت اور ہندومت نے جس طرح انسانی حقوق اور انسانی اخوت اور مساوات کی مٹی پلید کی ہے تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ہندوازم میں تو عجیب افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ایک طرف تو وہ کسی جانور کے خون بہانے کے بھی روادار نہیں،موذی جانوروں تک کو مارنا پسند نہیں کرتے۔سانپ کو دودھ پلاتے ہیں اور بندر اور لومڑیاں ان کی آبادیوں میں پلتے ہیں اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ انسانوں جیسے انسان جنہیں یہ شودر کہہ کر یاد کرتے ہیں ان کے بارے میں ان کا رویہ ہے کہ کسی بھی شودر کو قتل کر دینا ان کے نزدیک نہ صرف کہ گناہ نہیں بلکہ ثواب ہے۔ان کے ملکوں میں اور ان کی سرزمین پر کتے بلیوں اور موذی جانوروں تک کو امان ہے لیکن اگر کوئی شودر ان کی بستیوں میں آجائے تو وہ واپس نہیں جاسکتا۔کسی بھی مندر کے دروازے پر اس کا بلیدان کرنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔یہ سوچ کر تعجب ہوتا ہے کہ جس طرح باقی انسان ہیں اسی طرح شودر بھی انسان ہیں، وہ بھی باقی انسانوں کی طرح ماں باپ کے گھر پیدا ہوتے ہیں،ان کے گھر میں بھی سورج کی روشنی اترتی ہے۔ان کے کھیتوں میں بھی فصلیں لہلہاتی ہیں۔ان کی آبادیوں میں بھی گھنگھور گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں۔ان کے یہاں بھی موسم بدلتے ہیں۔ان کے موسمِ بہار میں بھی پھول کھلتے اور کلیاں چٹکتی ہیں۔ پھر آخر انہوں نے ایسا کیا جرم کیا ہے؟ کہ وہ باقی ہندوؤں کی طرح انسانوں جیسی زندگی نہیں گزار سکتے۔وہ ہندوؤں کی عبادت گاہوں میں نہیں جاسکتے۔وہ ان کے بھشن نہیں سن سکتے۔درحقیقت یہی انسان کی وہ بے اعتدالی ہے جسے اسلام نے آکر اعتدال میں تبدیل کیا ہے۔اور اسی اعتدال کے باعث مسلمانوں کو امت وسط قرار دیا گیا ہے۔

امتِ وسط کا فریضۂ منصبی شہادت حق

لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ''امتِ محمدیہ کو ایک معتدل اور بہترین امت اس لئے بنایا ہے تاکہ وہ لوگوں پر حق کے گواہ بنیں۔یہ اس امت کا فریضۂ منصبی اور اس کے قیام کی ضرورت کا بیان ہے۔اسی منصب پر بنی اسرائیل کو فائز کیا گیا تھا انہوں نے مسلسل اللہ سے کیے گئے عہد و پیمان توڑے۔اس کی شریعت میں تبدیلیاں کیں اس کی صراطِ مستقیم گم کر دی اور اس کے مقرر کیے ہوئے قبلہ سے منحرف ہو گئے اور جن شہادتوں کے وہ امین بنائے گئے تھے ان شہادتوں کا حق ادا کرنے سے منحرف ہو گئے۔ایسی صورتحال میں نوعِ انسانی کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی ضرورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی امت برپا کرے جو اللہ کی سیدھی راہ پر قائم ہو جو خود عدل کی تصویر ہو، اور دنیا میں عدل قائم کرنے کیلئے اٹھے۔اسی عدل واحسان کو قائم کرنے کیلئے اللہ نے جو دین بھیجا ہے اس دین کی خود بھی عامل بنے اور قیامت تک لوگوں کے سامنے اس دین کی گواہی بھی دے۔سب سے پہلے اسی گواہی کے منصب پر اللہ کے رسول کو کھڑا کیا گیا تاکہ ان کا طریقہ اور عمل امت کیلئے نمونہ بھی ٹھہرے اور سنت بھی بنے۔آیئے اب دیکھتے ہیں کہ انہوں نے دنیا میں دین کی اس گواہی کا فرض کیسے انجام دیا۔جب آپ دنیا میں نبوت دے کر مبعوث کیے گئے تو پوری دنیا میں ایک شخص بھی اللہ

Marfat.com

کو ماننے والا اس کی اطاعت کرنے والا اور اپنی زندگی کو اس کے احکام کے مطابق گزارنے والا موجود نہیں تھا۔ آپ نے جب لوگوں کے سامنے اس گواہی کا حق ادا کرتے ہوئے اعلان فرمایا کہ لوگو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی حاکمِ حقیقی اس کائنات اور تم سب کا اصل مالک اور آقا ہے۔ تم اسی کا رزق کھاتے ہو، اسی نے تمہیں زندگی دی ہے۔ وہی تمہیں زندگی کی تمام نعمتیں عطا کرتا ہے۔ اسی نے تمہیں عقل وشعور سے بہرہ ور کیا ہے، لیکن یہ عقل وشعور سے بہرہ ور زندگی اور یہ نعمتوں سے گراں بار زندگی اس لئے تو نہیں دی کہ ایک دن وجود میں آئے اور پھر خود رو پودے کی طرح مل دل کر ختم ہو جائے۔ اس نے ہر دور میں زندگی گزارنے کیلئے رہنما کتابیں بھیجیں، معلم اور مربی بنا کر رسولوں کو مبعوث کیا تا کہ وہ تمہیں زندگی گزارنے کا طریقہ سکھائیں اور یہ بتائیں کہ تمہارا آقا کن باتوں سے راضی ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے۔ میں بھی اسی لئے بھیجا گیا ہوں اور مجھ پر ایک کتاب اتاری گئی ہے اور میں اپنی سچائی اور کتاب کے برحق ہونے کی گواہی دیتا ہوں۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ، میری دل آویز شخصیت، میری بے داغ سیرت وکردار، دیانت اور امانت سے بھرپور میرے معاملات اور مکارمِ اخلاق سے روشن میرے طور اطوار تمہارے سامنے ہیں، میری زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہارے سامنے گزرا ہے۔ ان میں کہیں بھی جھوٹ اور شک کا شائبہ نہیں، یہ وہ سچی گواہی ہے جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ہم سب کی زندگی کا ایک ایک لمحہ محفوظ ہو رہا ہے ہمارا کوئی عمل بھی ہمارے خالق ومالک کے علم سے باہر نہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا جب وہ ہم سب کو اپنے سامنے کھڑا کر کے ہمارے اعمال کا حساب لے گا سوچ لو اس وقت تمہارا جواب کیا ہوگا۔ میں نہائیت ہمدردی اور خیر خواہی سے تمہارے سامنے وہ نسخۂ شفا پیش کر رہا ہوں جسے اللہ نے مجھ پر اتارا ہے اور جس پر عمل کر کے تم اپنی زندگی اور آخرت کو سنوار سکتے ہو۔

لیکن اس کے جواب میں قوم نے وہی کیا جو ہر قوم اپنے پیغمبروں سے کرتی آئی ہے۔ زندگی کا کوئی دکھ ایسا نہیں جو آپ کو نہ پہنچایا گیا ہو۔ نماز پڑھتے ہوئے آپ کے سر پر اونٹ کی اوجھڑی ڈالی گئی جسے حضرت فاطمہ نے کسی کی مدد سے بڑی مشکل سے آپ کے سر سے اتارا اور آپ سر اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ آپ کے گلے میں پٹکا ڈال کر آپ کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ کے سرِ مبارک پر راکھ ڈالی گئی۔ لیکن آپ نے ہر تکلیف اٹھا کر اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا۔ وہ گالیاں دیتے رہے آپ دعائیں دیتے رہے۔ انہوں نے آپ کیلئے زندگی دشوار تر کر دی، آپ اللہ سے ان کیلئے رحمتیں مانگتے رہے۔ مکہ نے جب بری طرح آپ کی طرف سے اپنے دل ودماغ بند کر لئے تو آپ نے طائف کا رخ کیا۔ لیکن طائف کے اوباشوں نے آپ کی دعوت کے جواب میں ظلم اور بربریت کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ طائف کا کوئی پتھر ایسا نہیں جس نے آپ کے جسم کے کسی نہ کسی حصے کو زخمی نہ کیا ہو۔ آپ کا وہ خون جس کا جواب کوثر وتسنیم میں بھی نہیں، آپ کے زخموں سے بہتا رہا۔ آپ کا وہ جسمِ اطہر جس کا ایک ایک رونگھٹا عرشِ معلیٰ سے بھی افضل ہے، وہ زخموں سے خونچکاں ہوتا رہا۔ آپ کی وہ عزت وحرمت جس کے دامن میں فرشتے نماز پڑھنا فخر محسوس کریں ان اوباشوں کی زبانوں سے گھائل ہوتی رہی۔ آپ کی وہ شخصیت جس کا جواب پوری کائنات میں نہیں، اسے طائف میں بری طرح ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پھر آخر ایک وقت آیا کہ آپ کو وطن بھی چھوڑنا پڑا اللہ کا گھر جو آپ کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا اس سے بھی جدائی برداشت کرنا پڑی۔ مدینہ کی سرزمین نے آپ کی قدم بوسی کی لیکن دشمن نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ مسلسل آپ کو لڑائیوں میں جانے پر مجبور کیا

Marfat.com

گیا۔آپ کے عزیزوں کے لاشے اٹھے،آپ خود میدانِ جنگ میں زخمی ہوئے ،وہ دندانِ مبارک شہید ہوئے ،جن سے قرآنِ پاک کی شعائیں پھوٹا کرتی تھیں اس دہن سے خون بہا جس کا لعاب بیماروں کی شفا اور کڑوے پانی کو میٹھا کر دیتا تھا۔سالوں تک جاں سپاری اور جاں فروشی کے جاں گسل لمحات سے گزرنے کے بعد وہ معاشرہ وجود میں آیا جو اس کائنات کا حاصل تھا۔اس انسان نے جنم لیا صدیوں سے زندگی جس کی راہ تک رہی تھی۔وہ عدالتیں وجود میں آئیں جہاں صرف اللہ کا قانون فیصلے کرتا تھا۔وہ بازار اور منڈیاں بنیں جہاں پر کاروبار کرنے والے اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھنے والے تھے۔وہ گلی کوچے وجود میں آئے جن میں جرم کا کوئی تصور نہیں تھا۔شہروں کے شہر ایسے لوگوں سے معمور ہوئے جیسے لوگوں کو چشمِ فلک نے آج تک نہ دیکھا تھا۔رت بدل گئی موسم تبدیل ہو گیا انسانیت کی قسمت سنور گئی۔انسانیت کو ایک ایسی بہار نصیب ہوئی جس میں صرف خدا خوفی ، راست بازی،انسان دوستی،علم پروری اور آخرت کی جستجو کے پھول کھلتے تھے۔بارہ لاکھ مربع میل علاقے پر اس انقلاب کی ٹھنڈی چھاؤں پھیل گئی اور ڈیڑھ لاکھ کے قریب ایسے انسانوں کی ایک مضبوط قوم تیار ہوگئی جو حق کی سربلندی اور باطل کی سرکوبی کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتی تھی۔تب آپ نے آخری حج میں لوگوں سے پوچھا کہ لوگو! ہو سکتا ہے کہ اگلے سال تم مجھے نہ دیکھو۔قیامت کے دن تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا کہ جس شہادتِ حق کے منصب پر مجھے فائز کیا گیا تھا اس منصب کی ذمہ داریوں کو میں نے ادا کیا یا نہیں؟ کیا میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچایا؟ کیا میں نے امانت کا حق ادا کیا؟ کیا میں نے تمہارے ساتھ خیر خواہی کی؟ ایک ایک سوال پر لوگ چیخ رہے تھے کہ یا رسول اللہ! آپ نے اپنی ذمہ داری کا پورا حق ادا کر دیا۔آپ نے تین دفعہ آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر فرمایا کہ یا اللہ! تو گواہ رہ تیری مخلوق میرے بارے میں گواہی دے رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ آپ ہمیشہ کی عمر لے کر نہیں آئے تھے۔۶۳ سالہ عمرِ طبعی اور ۲۳ سالہ عمرِ رسالت گزار کر آپ اپنے اللہ سے جا ملے۔لیکن وہ شہادتِ حق جس کی ذمہ داری آپ نے ادا کی تھی اسے بعد کی نسلوں کیلئے اس امت کے سپرد کر گئے جسے آپ نے تربیت کیا تھا اور آپ نے مختلف وقتوں میں یہ بات سمجھائی کہ لوگو! تم میں سے ہر نسل اس امانت کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے۔کل کو تم سے پوچھا جائے گا کہ جس طرح میں نے یہ حقِ امانت ادا کیا تھا کیا تم نے بھی ایسا ہی کیا؟ کیا تم نے ویسے ہی دکھ اٹھائے جیسے میں نے اٹھائے تھے؟ کیا تم نے اسی احساسِ ذمہ داری کا ثبوت دیا جیسے میں نے دیا تھا؟ کیا تم نے اللہ کے دین کو گھر سے لے کر ایوانِ حکومت تک نافذ اور برپا کر کے یہ ثابت کیا کہ اللہ کا دین اب بھی قابلِ عمل ہے۔جس طرح آپ نے صحابہ کے سپرد یہ ذمہ داری کی اور انہیں بار بار اس کا احساس بھی دلایا اسی طرح قرآنِ کریم کی یہ آیت قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو یہ احساس دلاتی رہے گی کہ کل کو تم سے اسی ذمہ داری کے حوالے سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی اگلی نسل تک یہ امانت پہنچائی یا نہیں پہنچائی؟ کیا تم نے یہ ثابت کیا کہ ڈرنا صرف اللہ سے چاہئے؟ بھروسے کے قابل صرف وہی ذات ہے، سر صرف اسی کے سامنے جھکنا چاہئے،امیدیں صرف اسی سے باندھنی چاہئیں، آئین اسی کا واجب الاطاعت ہے۔وہی ہے جو مطاعِ مطلق ہے۔اس کے سوا کسی کی غیر مشروط اطاعت نہیں ہو سکتی۔اس کے حکم کے مقابلے میں کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔اس کی اطاعت کا وہ طریقہ معتبر ہوگا، جو طریقہ اللہ کے رسول نے چھوڑا ہے، جسے ہم سنتِ رسول کہتے ہیں۔قرآن بار بار پوچھتا ہے کہ لوگو بتاؤ جو امانت حضور اور آپ کے صحابہ چھوڑ گئے، وہ کہاں ہے؟ وہ ایثار، وہ استقامت، وہ ذاتِ رسالت مآب سے بے پناہ محبت، جو حضرت ابوبکر صدیق ؓ ہمارے حوالے کر گئے تھے، وہ کہاں ہے؟ حضرت فاروقِ اعظم ؓ کا وہ عدل کہاں ہے؟ جو وہ دنیا کو دے کر گئے تھے۔اور حضرت عثمان ؓ کی وہ شرم و حیا جوان کی شناخت بن گئی تھی،

Marfat.com

کہاں ہے؟اور کہاں ہے وہ علیؓ کا فقر، جس پر انہیں فخر تھا اور جس کی انہوں نے وراثت چھوڑی تھی؟ اسلام کا وہ پورا نظامِ زندگی جو صحابہ کے گھروں سے لے کر ان کے معاشرے کے ایک ایک ادارے اور ان کی ریاست کے ایک ایک شعبے اور ان کی حکومت کے ایک ایک ایوان میں برسرِ اقتدار تھا۔ وہ ہم نے کہاں کھودیا؟ ہمارے گھروں میں فقر نہیں سرمایہ داری ہے، ہمارے پاس عدل نہیں جانب داری ہے، ہمارے پاس رحم ومروت نہیں ظلم اور جہالت ہے، ہمارے پاس شرم وحیا نہیں ہر چور ہے پر ہم نے حوا کی بیٹیوں کو بے حیائی کی تصویر بنا کر اس طرح آویزاں کردیا ہے کہ حیا کا جنازہ نکل گیا ہے۔ ہمارے نصابِ تعلیم سے قرآنِ کریم کی آیات کھرچی جارہی ہیں۔ جہاد جسے اسلام کی چوٹی کہا گیا ہے وہ ایک گالی بن کر رہ گیا ہے۔ حکومت کے ایوانوں سے اللہ کے دین کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اور طاقتور حکمرانوں کا کلمہ پڑھا جارہا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم ہم سے باربار کہہ رہا ہے کہ سوچو! کل کو حقِ شہادت کے حوالہ سے تم سے پوچھا جائے گا، کیا جواب دو گے؟

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ

تحویلِ قبلہ اتباعِ رسولؐ کا امتحان بھی ہے

تحویلِ قبلہ پر جو ردِ عمل ہونے والا تھا۔ اس کے جواب کیلئے ذہنوں کو تیار کیا جارہا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا اور پھر فوراً بعد اس امت کی حقیقت کو نمایاں کرنے کیلئے ان کی اصل حیثیت کو واضح کیا گیا تاکہ وہ اپنی شناخت میں غلطی نہ کریں اور یہی شناخت تحویلِ قبلہ کی باعث بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے مخالفین کا جواب دیا گیا ہے اس کے بعد امت کی شناخت کے حوالے سے اس کی ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے اور ساتھ یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ تحویلِ قبلہ امت کی ضرورت تو ہے لیکن ساتھ ہی اس امت کو ہر طرح کی کمزوریوں سے دور کرنے کیلئے ایک آزمائش بھی ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیت کے حصے میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس وقت مخاطب دو طرح کے لوگ تھے ایک عرب، جو اپنے وطنی اور نسلی تفاخر میں بری طرح مبتلا تھے اور جاہلیت کے تعصبات نے ان کے رویے میں اور بھی سختی پیدا کردی تھی۔ دوسرے بنی اسرائیل تھے، جن کا نسل پرستی کا غرور کسی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ وہ اپنے سوا کسی کو تسلیم کرنے کیلئے ہی تیار نہ تھے۔ چنانچہ ان دونوں کے تعصبات اور فخر وغرور کے دعوؤں کا یہاں پوری طرح امتحان لیا گیا ہے کہ اگر تو یہ لوگ سوچ سمجھ کر اسلام کے دائرے میں آئے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کا حکم ہر طرح کی وابستگیوں پر غالب ہے تو ان کیلئے تحویلِ قبلہ محض اللہ کا ایک حکم ہے جسے تسلیم کرنا ان کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ لیکن اگر ان کے اندر وابستگیوں کے بت اب تک قائم ہیں تو وہ یقیناً اپنے اپنے قبلے پر اصرار کریں گے۔ بیت المقدس بنی اسرائیل کا قبلہ تھا اور بیت اللہ عربوں کا۔ جب بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تو عرب اسے اپنی قوم پرستی کے بت پر ناقابلِ برداشت ضرب سمجھتے تھے۔ جسے برداشت کرنے کیلئے مضبوط ایمان کی ضرورت تھی اور جب بیت اللہ کو قبلہ بنایا گیا تو یہ بات بنی اسرائیل کیلئے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہ تھی کیونکہ وہ نسل پرستی کے غرور میں مبتلا تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے دو دفعہ اسی لئے کعبہ کو بدلا تاکہ ان دونوں گروہوں کا اچھی طرح امتحان ہوجائے اور دونوں کو ان کی اپنی نگاہوں میں بھی اور لوگوں کے سامنے بھی نمایاں کردیا جائے کہ ان میں سے کون اسرائیلیت اور عربیت کا پرستار ہے اور کون صرف اللہ کا بندہ اور رسول ﷺ کا فرمانبردار ہے۔

Marfat.com

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مکہ معظمہ میں جب آنحضرت ﷺ کو نماز پڑھنے کا حکم ہوا تو اس میں صحابہ اور تابعین کا اختلاف ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کو بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا تھا یا بیت المقدس کی طرف۔ حضرت عبداللہ ابنِ عباس کا قول یہ ہے کہ پہلے ہی دن سے قبلہ بیت المقدس تھا، جو ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ مہینے تک باقی رہا۔ اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہوئے۔ البتہ رسول اللہ ﷺ کا عمل مکہ مکرمہ میں یہ تھا کہ آپ حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس بھی۔ البتہ مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد دونوں قبلوں کی طرف منہ کرنا ممکن نہ رہا اس لئے جب تک بیت اللہ کو قبلہ بنانے کا حکم نہیں آیا آپ نے بیت المقدس ہی کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھیں۔

وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قبلہ تبدیل کر لینا واقعی ایک بہت مشکل کام ہے کیونکہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جن چیزوں کا تعلق اس کے عقیدے اور دین سے ہو اس میں وہ ہمیشہ جذباتی ہو جاتا ہے اور کبھی بھی اپنی پرانی روش بدلنے کیلئے تیار نہیں ہوتا اور یہاں تو قبلہ کا تبدیل کرنا پیشِ نظر تھا اور یہ کوئی دین کی عام بات نہیں تھی بلکہ ایک امت کے مرکز کے تبدیل ہونے کا سوال تھا اس لئے یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ لیکن یہ مشکل ان لوگوں کیلئے تھی جو ابھی تک اپنی روایات کے اسیر اور اپنے جذبات کے بندے تھے۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ نے ہدایت دی اور وہ جانتے تھے کہ اصل چیز قبلہ نہیں بلکہ اللہ کا حکم ہے۔ ان کے لئے اللہ کے حکم کے سامنے جھک جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ چنانچہ وہ بڑی آسانی اور نہائت آمادگی کے ساتھ اللہ کے حکم کے سامنے جھک گئے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پروردگار خود فرما رہے ہیں کہ قبلہ کی تبدیلی کوئی آسان کام نہیں کیونکہ ہر ایک کو اپنے موروثی قبلے سے غائت درجہ جذباتی تعلق ہوتا ہے، تو پھر پروردگار نے آخر لوگوں کو اس امتحان میں کیوں ڈالا؟ کیونکہ مشکل امتحان میں ناکامی کا بھی ویسے ہی اندیشہ ہوتا ہے جیسے کامیابی کی امید ہوتی ہے۔

ایک سوال کا جواب

آیت کے آخری حصے میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ تمہیں اس سخت آزمائش میں اس لئے نہیں ڈالا گیا کہ تمہارا ایمان ضائع ہو جائے بلکہ اس لئے ڈالا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ اس کی رأفت اور اس کی رحیمی کا یہ تقاضا ہوا کہ وہ اپنے بندوں کو اس امتحان میں ڈالے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھنا چاہئے کہ جس باپ کو اپنے بچوں سے حقیقی محبت ہوتی ہے وہ ہر وقت اپنے بچوں کی ترقی اور ان کی بہتری کے لئے سوچتا ہے۔ اور اگر وہ سمجھ دار باپ ہے تو وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کوئی ترقی بھی بغیر محنت اور تکلیف اٹھائے نصیب نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ بے وقوف باپ کی طرح یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ اگر بیٹے کی تعلیمی ترقی کیلئے دوسرے شہر یا دوسرے ملک جانا ضروری ہے تو اسے اس لئے نہ جانے دے کہ پردیس میں رہنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہاں مختلف صعوبتوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے اور اگر یہ معلوم ہو کہ بیٹے کو آگے بڑھنے کیلئے مختلف قسم کے کورسز، ایکسر سائزز اور مشقوں سے گزرنا پڑے گا تو محض بیٹے کی محبت کی وجہ سے کبھی بھی بیٹے کو ان مشقتوں سے بچانا نہیں چاہے گا کیونکہ یہی وہ مشکلات ہیں جن سے گزرنے کے بعد بیٹا کسی حیثیت کے قابل ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص اتھلیٹ بننا چاہتا ہے تو روزانہ دوڑنے کے سوا چارہ نہیں۔ چاہے ابتدائی چند دنوں میں اس کے اعصاب احتجاج کرنے لگیں۔ جسے تیراکی سیکھنی ہے، اسے پانی کی موجوں سے لڑنا پڑتا ہے۔

Marfat.com

یہاں ایک ایسی امت تیار کی جارہی ہے، جسے دنیا کی امامت سپرد کی جارہی ہے اور جس نے شہادتِ حق کا فرض انجام دینا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے ایمان اور یقین کی آزمائشوں سے نہ گزارا جائے۔ محض اس خوف سے کہ کہیں وہ ناکام نہ ہوجائے۔ جو قوم ایسے خوفوں میں مبتلا ہوتی ہے، اسے ناکامیوں سے کوئی نہیں بچاسکتا۔

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

صحیح بخاری میں بروایت ابنِ عازب رضی اللہ عنہ اور ترمذی میں بروایت ابنِ عباس منقول ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا قبلہ بیت اللہ کو بنادیا گیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ جو مسلمان اس عرصہ میں انتقال کرگئے جبکہ نماز بیت المقدس کی طرف ہوا کرتی تھی اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنا ان کو نصیب نہیں ہوا ان کا کیا حال ہوگا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں نماز کو ایمان کے لفظ سے تعبیر کرکے واضح کردیا کہ ان کی نمازیں سب صحیح اور مقبول ہوچکی ہیں ان کے معاملے میں تحویلِ قبلہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

بخاری کی اس روایت کے مطابق یقیناً لوگوں نے یہ سوال کیا ہوگا اور اس کا جواب بھی دیا گیا لیکن سیاقِ کلام کے حوالہ سے جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ ایسی آزمائشوں میں ڈالا جانا امت کی مضمر صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کیلئے اللہ کی صفت رأفت کا اظہار ہے اور اسی میں لوگوں کے اعتراض کا جواب بھی ہے۔ اگلی آیتِ کریمہ میں تحویلِ قبلہ کا حکم اور اس کے ضروری احکام بیان کیے گئے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے حوالے سے ایک نہائیت دل نواز بات کہی گئی ہے۔

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ O (البقرۃ: ۱۴۴)

(ہم دیکھتے رہے ہیں آسمان کی طرف آپ کے چہرے کے بار بار اٹھنے کو، سو ہم پھیرے دیتے ہیں آپ کو اسی قبلے کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ پس پھیر دیجئے اپنا رخ مسجد حرام کی طرف، اب جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے رخ اسی کی طرف کرو جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور جو کچھ وہ کررہے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔)

سورۃ البقرۃ کے گزشتہ رکوع کی آیات میں حضرت ابراہیم، بیت اللہ اور آنحضرت ﷺ کے حوالے سے تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے آنحضرت ﷺ کو اچھی طرح یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ آپ کا قبلہ وہی ہوگا جس قبلے کی تعمیر کے وقت میرے لئے اور اس امت کیلئے میرے جدِ امجد نے دعائیں مانگی تھیں۔ لیکن اللہ کی طرف سے بعض مصلحتوں کے تحت (جنہیں اللہ ہی جانتا تھا) ابھی تحویلِ قبلہ کا حکم نہیں

Marfat.com

آرہا تھا تو آنحضرت ﷺ کا اشتیاق بڑھتا جارہا تھا چنانچہ جس طرح اپنے کسی محبوب کے انتظار میں نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اٹھا کرتی ہیں اسی طرح آنحضرت ﷺ کی نگاہیں بھی بار بار آسمانوں کی طرف اٹھتی تھیں کہ دیکھئے کب حضرت جبریل تحویل قبلہ کا حکم لے کر نازل ہوتے ہیں۔ آسمان کی طرف آپ کی نگاہیں اس لئے اٹھتی تھیں کیونکہ حضرت جبریل ہمیشہ آسمان سے ہی اترتے نظر آتے تھے۔ چنانچہ بالآخر وہ وقت آ گیا جو اس فیصلے کیلئے مقدر تھا لیکن اس سے پہلے آنحضرت کا آسمان کی طرف چہرے کو گردش دینا جو آپ کی خاص محبوبانہ ادا تھی اس کا جس طرح پروردگار نے ذکر فرمایا ہے وہ بجائے خود آنحضرت کی کلاہِ افتخار میں ایک ایسا ہیرا ہے جس کی چمک قیامت تک ماند نہیں پڑے گی۔ میرے ماں باپ قربان ہوں اس ذاتِ والا صفات پر کہ جس کے چہرے کی گردش کو اس پروردگارِ عالم کی نگاہیں دیکھتی ہیں۔ جس کے فیضان سے آسمان گردش کرتے اور اجرامِ فلکی حرکت کرتے ہیں اور کائنات محوِ پرواز ہے۔ اس کے بعد بجائے براہِ راست یہ ارشاد فرمانے کے کہ ہم کعبہ کی طرف آپ کو پھیر دیں گے ارشاد یہ ہوا کہ ہم اسے آپ کا قبلہ قرار دے دیں گے، جسے آپ خود قبلہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کی کمال رفعتِ مراتب اور کمال درجہ فنا و قبولیت ظاہر ہے۔ مولانا تھانوی نے فرمایا کہ ”اہلِ طریقت کے ہاں جو اصطلاح مقامِ مرادیت و محبوبیت کی آئی ہے، اس کی اصل یہی آیت ہے“۔ کیا ٹھکانہ ہے اس بلندیٔ مرتبہ کا کہ مولا خود طالب رضائے عبد ہو جائے۔ اس کے آگے کوئی مرتبہ تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ اقبال نے اسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے کہا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ ہے تحویلِ قبلہ کا حکم

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرما کر تحویل قبلہ کا حکم ارشاد فرمایا۔ یہی اصل حکم ہے جس سے کعبہ کی تبدیلی عمل میں آئی یہ حکم رجب یا شعبان ۲ ہجری میں نازل ہوا۔ ابنِ سعد کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بشر بن براء بن معرور کے ہاں دعوت پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ظہر کا وقت آ گیا اور آپ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے ذریعے سے یہ آیت نازل ہوئی اور اسی وقت آپ اور آپ کی اقتدا میں جماعت کے تمام لوگ بیت المقدس سے کعبے کے رخ پھر گئے اس کے بعد مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں اس کی عام منادی کر دی گئی۔

براء بن عازب کہتے ہیں کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے حکم سنتے ہی سب کے سب اسی حالت میں کعبہ کی طرف مڑ گئے۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ بنی سلمہ میں یہ اطلاع دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت پہنچی لوگ ایک رکعت پڑھ چکے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز پڑی ”خبردار رہو! قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف کر دیا گیا ہے“۔ سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رخ بدل دیا۔ خیال رہے کہ بیت المقدس مدینے سے عین شمال میں ہے اور کعبہ بالکل جنوب میں۔ نماز باجماعت پڑھتے ہوئے قبلہ تبدیل کرنے میں لامحالہ امام کو چل کر مقتدیوں کے پیچھے آنا پڑا ہو گا اور مقتدیوں کو صرف رخ ہی نہ بدلنا پڑا ہو گا بلکہ کچھ نہ کچھ انہیں بھی چل کر اپنی صفیں درست کرنی پڑی ہوں گی۔ چنانچہ بعض روایات میں یہ تفصیل مذکور بھی ہے۔

Marfat.com

کعبہ کے بجائے مسجد حرام کی طرف پھرنے کے حکم سے متعدد مصالح کی طرف اشارہ

جس جملے سے کعبہ کو بدلنے کا حکم دیا گیا ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ قبلہ چونکہ کعبہ کو بنایا گیا ہے اس لئے ہونا یہ چاہئے تھا کہ تحویلِ قبلہ کا حکم ان الفاظ میں ہوتا فول وجهک الی الکعبة او الی بیت الله لیکن اس کی بجائے شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرمایا گیا۔ اس سے کئی اہم مسائل پیدا ہوئے۔

اول یہ کہ اگر چہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے جس کو کعبہ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا استقبال اسی جگہ سے ہو سکتا ہے جہاں سے بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دور ہیں اور بیت اللہ ان کی نظروں سے غائب ہے اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جاتی کہ عین بیت اللہ کی طرف رخ کرو تو اس کی تعمیل بہت دشوار ہو جاتی، خاص آلات وحسابات کے ذریعہ بھی صحیح سمت کا استخراج دور کے شہروں میں مشکل اور غیر یقینی ہو جاتا اور شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدار سہولت و آسانی پر رکھا گیا ہے۔ اس لئے بجائے بیت اللہ یا کعبہ کے مسجد حرام کا لفظ رکھا گیا جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع رقبہ پر مشتمل ہے۔ اس کی طرف رخ پھیر لینا دور دور تک لوگوں کے لئے آسان ہے۔

پھر ایک دوسری سہولت لفظ شطر اختیار کر کے دے دی گئی ورنہ اس سے مختصر لفظ الی المسجد الحرام تھا۔ اس کو چھوڑ کر شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرمایا گیا۔ شطر دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایک نصف شے، دوسرے سمت شے۔ باتفاق مفسرین اس جگہ شطر سے مراد سمت ہے۔ تو اس لفظ نے یہ بتلا دیا کہ بلادِ بعیدہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خاص مسجد حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رخ ہو جائے تو نماز درست ہو بلکہ سمت مسجدِ حرام کافی ہے۔ (بحر محیط)

مثلاً مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لئے جانب مغرب مسجد حرام کی سمت ہے تو مغرب کی جانب رخ کر لینے سے استقبال قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا اور چونکہ گرمی، سردی کے موسموں میں سمتِ مغرب میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے اس لئے فقہا رحمہم اللہ نے اس سمت کو سمتِ مغرب وقبلہ قرار دیا ہے جو موسمِ گرما وسرما کی دونوں مغربوں کے درمیان ہے اور قواعدِ ریاضی کے حساب سے یہ صورت ہوگی کہ مغرب صیف اور مغرب شتا کے درمیان ۴۸ ڈگری تک سمت قبلہ قرار دی جائے گی، یعنی ۲۴ ڈگری تک بھی اگر دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمتِ قبلہ فوت نہیں ہوگی، نماز درست ہو جائے گی ریاضی کی قدیم اور مشہور کتاب شرح چغمینی باب رابع صفحہ ۶۶ میں دونوں مغربین کا فاصلہ یہی ۴۸ ڈگری قرار دیا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو صیغہ واحد کے ساتھ انفرادی طور پر حکم دینے کے بعد اجتماعی طور پر فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ کہہ کر پوری امت کو حکم دیا گیا ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ کو حکم دینا پوری امت کو حکم دینے کے مترادف تھا کیونکہ آپ اس امت کے رسول اور امام ہیں اور مزید یہ کہ جب آپ قبلہ بدل لیتے تو آپ کی اطاعت چونکہ امت پر فرض ہے تو امت کے لئے بھی قبلہ بدلنا فرض ہو جاتا۔ بایں ہمہ امت کے لئے الگ حکم دینے کا سبب یہ ہے کہ جس طرح اہلِ کتاب نے بیت المقدس کو قبلہ ماننے کے باوجود آپس میں اختلاف کیا بیت المقدس کے اندر بھی مشرق اور مغرب کی جہتیں اپنے اپنے لئے مخصوص کر لیں اور باہر صرف جہت پرستی تک محصور ہو کر رہ گئے۔ اس طرح بیت المقدس کا قبلہ ہونا صرف ایک علامت بن کر رہ گیا۔ اس تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے پروردگار نے انفرادی اور اجتماعی ہر حالت میں اس امت کو تاکیداً حکم دیا کہ تم کہیں اہلِ کتاب کی سی غلطی نہ کرنا۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز پڑھو یا الگ سے نماز پڑھو مسجد میں پڑھو یا گھر میں پڑھو تمہارا قبلہ ہر حال میں بیت اللہ ہی ہوگا۔

Marfat.com

اس حکم کی تاکیدِ مزید کیلئے نیز اہلِ کتاب کی طرف سے مخالفت کی حقیقت واضح کرنے کیلئے ارشاد فرمایا: وان الذین اوتوا الکتب الخ "بے شک جن لوگوں کو کتاب دی گئی وہ خوب جانتے ہیں کہ بیت اللہ کا قبلہ ہونا ایک امرِ حق ہے"۔ ان کی کتابوں نے ان کی ساری خیانتوں کے باوجود بعض حقیقتوں کو محفوظ رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے اہلِ کتاب اس بات سے واقف تھے کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی تعمیر ہے اور یہی بیت اللہ تمام ذریت ابراہیم کا اصل قبلہ رہا ہے۔ بیت المقدس تو تقریباً تیرہ سو سال بعد وجود میں آیا ہے اور یہ بات بھی وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آخری نبی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعوت کا اسی گھر کو مرکز بنائے گا اور یہیں سے وہ امت وجود میں آئے گی جو پوری دنیا کو ہدایت سے مالا مال کر دے گی۔ ان تمام باتوں کو جاننے کی وجہ سے جو لوگ کتاب کو بالکل پسِ پشت نہیں ڈال چکے ان کیلئے اس بات کا انکار کرنا ممکن نہیں کہ اصل قبلہ بیت اللہ ہی ہے۔ بیت المقدس کو عارضی طور پر محض آزمائش کیلئے قبلہ بنایا گیا تھا۔ ایسی کھلی اور نمایاں حقیقتوں کے باوجود یہود اگر کتمانِ حق سے باز نہیں آتے تو ان کیلئے تہدید کے انداز میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ ایک وقت آئے گا جب یہ اپنے کئے پر پکڑے جائیں گے اور ان کی ان حرکتوں کی انہیں سزا ملے گی۔

اگلی آیتِ کریمہ میں یہود کے رویہ کے حوالے سے آپ کو تسلی دی جا رہی ہے۔

وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَکَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

(اگر آپ اہلِ کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں بھی لے کر آجائیں، تو بھی یہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے ہیں اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے ہیں۔ اگر تم اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی کریں گے تو بلا شبہ آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے)۔ (البقرة:۱۴۵)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اللہ کے پیغمبر انسانوں کی ہدایت کے انتہائی درجہ حریص ہوتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہدایت قبول نہ کرنے کے نتیجے میں ان کا انجام بے حد خوفناک ہوگا۔ اس شدید احساس سے ان کا دل پگھلتا ہے اور وہ ہر ممکن طریقے سے انہیں راہِ راست کی طرف لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہزار انکار کریں وہ ان کے انکار کو بھی کسی نہ کسی سبب کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اور پھر اس سبب کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت آنحضرت کے قلبی احساسات اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں اور وہ نہائیت پیار سے آپ کے ایک ایک احساس پر اطمینان کا مرہم رکھنا چاہتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے دل میں شائد یہ خیال تھا کہ انہیں میری نبوت کے بارے میں شاید شبہ ہے اور اسی وجہ سے میرے ہر فیصلے اور ہر اقدام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اگر انہیں کوئی عظیم معجزہ دکھا دیا جائے تو ممکن ہے یہ میری نبوت پر مطمئن ہو جائیں اور یہ مخالفت کا معاملہ ختم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ تسلی دیتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ ہم

Marfat.com

دلوں کے رازوں سے واقف ہیں۔ہم ان کے احساسات کے بارے میں آپ کو آگاہی دینا چاہتے ہیں کہ انہیں آپ کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں، انہیں بیت اللہ کے حقیقی قبلہ ہونے میں بھی کوئی اشتباہ نہیں ان کا اصل معاملہ حسد اور عناد ہے۔آپ ان کو دنیا بھر کے معجزات دکھا دیں وہ کبھی بھی آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے۔اس لئے کہ اگر سبب اشتباہ ہوتا تو اسے دور کیا جا سکتا تھا لیکن جو جاگ کر خوابیدہ بنا رہے اس کو جگانے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہوتی۔ان کو مطمئن کرنے کی تو ایک ہی صورت ہے کہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کریں اور ظاہر ہے کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں کیونکہ پیغمبر دنیا میں حق کی علامت،حق کا نمائندہ،اور حق کا اظہار ہوتا ہے۔

اہلِ کتاب کی اتباعِ حق سے محرومی

جب اللہ کی جانب سے اس کے سامنے حق واضح ہو جاتا ہے تو اس کے سامنے اس بات کی بھی گنجائش نہیں ہوتی کہ وہ بھرے ہوئے حالات کو دیکھ کر چند دنوں کیلئے حق کے اظہار سے رک جائے۔اس لئے آپ کیلئے تو یہ کسی طور ممکن نہیں کہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کریں کیونکہ پہلا قبلہ منسوخ ہو گیا اور اس قبلے کا اعلان ہو گیا جو اصل قبلہ تھا اور جو قیامت تک باقی رہے گا۔مزید ایک اور بات فرما کر اہلِ کتاب کے غبارے سے بالکل ہوا نکال دی کہ آپ ان کی مخالفت کو اس قدر اہمیت ہی کیوں دیتے ہیں کیونکہ ان کی قبلہ سے وابستگی کا حال تو یہ ہے کہ باوجود یکہ یہود ونصاریٰ ایک ہی قبلہ یعنی بیت المقدس کے پیروکار ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے کیلئے تیار نہیں۔نصاریٰ نے مشرقی جانب کو اور یہود نے مغربی جانب کو قبلہ بنا رکھا ہے اور بیت المقدس سے باہر مشرق اور مغرب کی جہتیں ان کا قبلہ ہیں تو جو لوگ ایک قبلہ رکھتے ہوئے بھی ایک قبلہ پر جمع نہ ہو سکیں ان کی مخالفت کی آخر کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے؟

شریعت کے بارہ ان کا غیر سنجیدہ رویہ

انہوں نے دین کو بھی بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے حالانکہ قبلہ کی تبدیلی یا قبلہ کا تعین ایک حق کا معاملہ ہے۔جس کی دین میں بے حد اہمیت ہے۔جب ایسے بنیادی اہمیت کے حامل معاملے کے بارے میں اللہ کی جانب سے حقیقی علم نازل ہو جائے تو اس کے مقابلے میں کہی جانے والی باتیں ہوائے نفس کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔آنحضرت سے فرمایا جا رہا ہے کہ وحیِ الٰہی کے ذریعے علمِ حقیقی آپ کے پاس آ چکا ہے۔اگر آپ اس کے برعکس اہلِ کتاب کی بات کو ماننے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ''العلم'' کے مقابلے میں ہوائے نفس کی پیروی کرنا شروع کر دی ہے۔یہ تو ایک ایسا ظلم ہے جس کا کسی کیلئے بھی جواز نہیں۔چہ جائیکہ اس کا ارتکاب پیغمبر کریں اور یہ معاملہ اتنا سنگین ہے کہ اگر خدانخواستہ آپ بھی ایسا کریں تو باوجود عظیم مقام اور مرتبہ کے جو اللہ کے ہاں آپ کو حاصل ہے آپ بھی ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

بظاہر عتاب آپؐ پر، حقیقت میں اہلِ کتاب پر

یہ بات یاد رہے کہ اس آیتِ کریمہ میں بظاہر عتاب آنحضرت ﷺ پر ہے۔لیکن حقیقت میں ایسا نہیں، خطاب آپ سے ہے عتاب اہلِ کتاب پر ہے۔یہ بات سمجھانے کا ایک انداز ہے کہ جس بات کی شناعت کا یہ حال ہے کہ اگر پیغمبر بھی کرے تو ماخوذ ٹھہرے تو تم کس شمار قطار میں ہو۔تم اس عظیم جرم کا ارتکاب کر رہے ہو، سوچو انجام کیا ہوگا؟

اگلی آیتِ کریمہ میں اسی مضمون کو مزید مؤکد فرمایا گیا ہے۔

Marfat.com

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ O اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ O (البقرۃ: ۱۴۶ تا ۱۴۷)

(جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں البتہ ان میں ایک گروہ ہے جو حق کو چھپاتا ہے اور وہ جانتا بھی ہے O یہی حق ہے جو آپ کے رب کی جانب سے ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو)

اس آیتِ کریمہ میں غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب جو ایک امی پر نازل ہوئی وہ تاریخ کے بعض ایسے گوشوں کو بے نقاب کر رہی ہے اور بعض ایسی خیانتوں سے پردہ سرکا رہی ہے۔ جہاں تک مورخ کی نگاہ بھی شاذ و نادر ہی پڑتی ہے۔ سابقہ آیتِ کریمہ میں آپ نے دیکھا کہ اہلِ کتاب کا ذکر الذین اوتوا الکتب کہہ کر کیا گیا ہے اور یہاں اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ کہہ کر۔ معلوم ہوتا ہے یہود میں پوری قوم کے لوگ خیال و عمل کے لحاظ سے یکساں نہیں تھے۔ اگرچہ اس قوم کا غالب حصہ گمراہ ہو چکا تھا لیکن ایک محدود تعداد ایسی بھی تھی جو ابھی تک اللہ کی کتاب کی قدر و منزلت کو جانتی اور اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی قلیل اور مختصر طبقہ کا ذکر ہے کہ ان میں سے وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب عنایت کی تھی اور وہ اس کا حق بھی پہچانتے تھے۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ باقی پوری قوم نے تو اس کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور اگر جانتے بھی ہیں تو کتمانِ حق سے کام لیتے ہیں۔ لیکن یہ مختصر سا گروہ ایسا ہے، جسے اہلِ حق کا گروہ کہنا چاہئے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے یعرفونہ ''اس کو پہچانتے ہیں''۔ سوال یہ ہے ضمیر کا مرجع کیا ہے یعنی کس کو پہچانتے ہو؟ متقدمین میں عام خیال یہ رہا کہ وہ اس بات کو جانتے اور پہچانتے ہیں کہ بیت اللہ ہی اصل قبلہ ہے اور یہی آخری نبی اور آخری امت کا قبلہ ہوگا۔ تورات میں چونکہ یہ بات پوری طرح واضح ہے اس لئے انہیں اس کے قبلہ ہونے کا اس حد تک یقین ہے جس حد تک انہیں اپنے بیٹوں کی پہچان کا یقین ہے۔ جو بچہ سالوں تک ماں باپ کی گود اور نگاہوں میں پلتا ہے اس کی پہچان میں ماں باپ کبھی غلطی نہیں کرتے۔ اسی طرح جو بات کتاب اللہ نے قطعی انداز میں بتائی ہے اس کی پہچان تو اس سے زیادہ قطعی ہونی چاہئے۔

متوسطین اور متاخرین، عام طور پر اس بات پر متفق ہیں کہ اس آیت میں ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے کہ یہود میں اہلِ حق کا یہ طبقہ آنحضرت ﷺ کی پہچان میں کبھی غلطی نہیں کرتا کیونکہ آپ کی علامات سے تورات کے صفحات معمور ہیں۔ ضمیر کا مرجع قبلہ کو قرار دیا جائے یا آنحضرت ﷺ کو، مفہوم کے تعین میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو لوگ آنحضرت ﷺ کو پہچانتے ہیں کہ آپ اللہ کے آخری نبی ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ آخری نبی کا قبلہ بیت اللہ ہوگا، بیت المقدس نہیں۔ ان دونوں آیتوں کو غور سے پڑھ لیجئے تو کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ تحویلِ قبلہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر پہلی آسمانی کتابیں بھی پوری طرح شاہد ہیں۔ ان کتابوں کا جاننے والا کتمانِ حق کرے تو اور بات ہے، ورنہ اس کیلئے یہ حقیقت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس قدر مؤکد انداز میں بیت اللہ کی حقیقت کو واضح کرنے کے بعد ہر غیر جانب دار آدمی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جو کچھ کہا گیا ہے یہی بات حق ہے تیرے رب کی جانب سے۔ یہاں مبتدا محذوف ہے اصل عبارت اس طرح ہے ھذا ھو الحق پس تمہیں شک کرنے والوں میں سے نہیں ہونا چاہئے۔ حق آجانے کے بعد شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اور یہ حق تو ایسا ہے جس میں عقل اور نقل دونوں متفق ہیں۔

Marfat.com

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ
هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ
جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ
فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ
وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ
شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ
فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِىْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِىْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ۙ
كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ ؕ
فَاذْكُرُوْنِىْۤ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِىْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع

پارہ ۲، رکوع: ۲ (ہرایک کیلئے ایک سمت ہے اور وہ اسی کی طرف رخ کرنے والا ہے۔تم نیکیوں کی راہ میں سبقت کرو، جہاں کہیں تم ہوگے اللہ تم سب کو جمع کرے گا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔اور جہاں کہیں سے بھی تم نکلو تو اپنا رخ مسجدِ حرام کی ہی طرف کرو، بے شک یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔اور آپ جس جگہ سے بھی نکلیں اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف موڑ لیا کریں اور تم لوگ بھی جہاں کہیں ہو اپنے چہرے اس

Marfat.com

کی طرف پھیرلیا کرو تا کہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے، سوا ان لوگوں کے جوان میں سے ظالم ہیں۔ سو تم ان سے نہ ڈرو، مجھ ہی سے ڈرو تا کہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کروں اور تا کہ تم راہ یاب ہو۔ چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا میری شکر گزاری کرتے رہنا میری ناشکری نہ کرنا) (آیت ۱۴۸ تا ۱۵۲)

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ O (البقرة:۱۴۸)

(ہر ایک کیلئے ایک سمت ہے اور وہ اسی کی طرف رخ کرنے والا ہے۔ تم نیکیوں کی راہ میں سبقت کرو، جہاں کہیں تم ہو گے اللہ تم سب کو جمع کرے گا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

کُل کا مفہوم اور وِجھَةٌ کا مفہوم

لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ ''اس کے ترجمے کی ایک صورت یہ ہے کہ ''کُل'' کے بعد مضاف الیہ محذوف مانیں۔ عربی زبان میں جس طرح مضاف محذوف مانا جاتا ہے اسی طرح مضاف الیہ کا محذوف ماننا بھی رائج ہے۔ اور وِجْهَةٌ کا لغوی معنی ہے ''وہ چیز جس کی طرف رخ کیا جائے''۔ اس لئے حضرت عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ اس سے مراد قبلہ ہے اور حضرت ابی ابن کعب کی قرات میں اس جگہ وِجْهَةٌ کی بجائے قبلة منقول ہے۔ اس صورت میں اس جملے کا ترجمہ یہ ہوگا ''ہر قوم کیلئے ایک قبلہ ہوتا ہے''۔ جو قوم بھی کسی مذہب کی ماننے والی ہے اور اس کا کوئی نظامِ عبادت بھی ہے یقینی بات ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی قبلہ ہو۔

تحویلِ قبلہ پر واقعاتی اور نقلی دلیل

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قوم اپنی مرکزیت کیلئے کسی نہ کسی قبلے کی دعویدار ہے۔ اگر واقعی یہ دنیا کا دستور ہے اور اس کے واقعہ ہونے میں کوئی شبہ بھی نہیں تو اسی دستور کے مطابق مسلمان ایک الگ امت کے طور پر اٹھائے گئے ہیں۔ ان کا اپنا ایک دین ہے، جس کی طرف وہ پوری دنیا کو دعوت دے رہے ہیں۔ ان کا ایک نظام عبادت ہے تو دستورِ دنیا اور دستورِ مذہب کے مطابق ضروری ہے کہ ان کا بھی الگ ایک قبلہ ہو۔ اب جبکہ ان کا اس ضرورت کے تحت الگ ایک قبلہ مقرر کر دیا گیا ہے تا کہ ان کا قومی اور ملی تشخص مکمل ہو جائے تو مخالفین کو اس پر ہنگامہ اٹھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ''کُلٍّ'' اگرچہ یہاں نکرہ ہی استعمال ہوا ہے۔ لیکن عموماً اس سے مراد وہ خاص گروہ یا اشخاص ہوتے ہیں جن کا ذکر کلام میں اوپر گزر چکا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی جا بجا مثالیں موجود ہیں، مثلاً وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ''اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل ان میں سے ہر ایک صابروں میں سے تھا۔'' یہاں بھی معلوم ہوتا ہے لِكُلٍّ سے مراد یہود و نصاریٰ کے وہی گروہ ہیں جن کا اوپر ذکر چلا آرہا ہے۔

Marfat.com

آپ کی جہت اور منزل معین ہوگئی اب آپ منزل کی طرف سبقت کریں

آنحضرت ﷺ کی تسلی اور یکسوئی کیلئے فرمایا جا رہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک گروہ نے اپنے اپنے قبلہ کیلئے ایک جہت مقرر کر لی ہے۔ آپ انہیں کتنا ہی سمجھائیں، کتنا ہی زور لگائیں، یہ لوگ ماننے والے نہیں۔ جیسے جیسے آپ کوشش کریں گے، ویسے ویسے ان کی سرکشی میں اضافہ ہوتا جائے گا اور وہ خود بھی یہ چاہیں گے کہ آپ اسی طرح کی باتوں میں مصروف رہیں اور اصل فریضہ کی طرف کما حقہ توجہ نہ دے سکیں۔ اس لئے آپ ان کی طرف سے یکسو ہو کر اپنے کام میں لگ جائیے اور انہیں اللہ کے حوالے کیجئے۔ اللہ نے ملت ابراہیم کے حوالے سے صراطِ مستقیم آپ کے سامنے کھول دیا ہے۔ امتِ وسط کا آپ کو امام بنا کر آپ کے اور امت کے مقاصد متعین فرما دیئے ہیں اور کعبہ کے تعین سے آپ کی ایک جہت مقرر کر دی ہے۔ آپ کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ آپ کے پاس اتنا وقت کہاں کہ آپ ان ناہنجاروں کے پیچھے وقت ضائع کرتے پھریں، آپ کو تو بھلائیوں میں سبقت کرنی ہے۔ بعض دفعہ افراد اور قومیں کچھ کر گزرنے کیلئے دلوں میں تڑپ رکھتی ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا کریں۔ وہ بڑھنا چاہتی ہیں لیکن منزل کی خبر نہیں ہوتی۔ اللہ کے نبی کی بعثت اور نزولِ کتاب نے ایک امت کو وجود بخشا، زندگی کا شعور دیا، خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت عطا کی، اب صرف اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک جہت مقرر کر دی جائے اور مساعی کا ایک نشان ٹھہرا دیا جائے۔ تحویلِ قبلہ کے بعد یہ ضرورت بھی پوری ہو گئی۔ اب یہ بات ازبس ضروری ہے کہ غیر متعلق بحثوں سے دامن بچا کر ان روحانی خزانوں کے حصول کی کوشش کی جائے جس کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعائیں مانگی تھیں اور امت میں زندگی کا وہ شعور اجاگر کیا جائے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی سے قدم قدم پر ہمیں ملتا ہے اور وہ تاریخ از سرِ نو زندہ کی جائے جو اس کعبہ کی صورت میں اور اس کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس عزیمت کو اس امت کا کردار بنا دیا جائے جو صفا کے دامن میں اور مزدلفہ اور عرفات کے میدانوں میں سر اٹھائے کھڑی ہے۔ اور امت کو اس گھر سے اس طرح وابستہ کر دیا جائے کہ جسدِ امت کیلئے کعبہ ایسا ہو کر رہ جائے جس طرح جسم کیلئے دل کی حیثیت ہے۔ جس طرح دل کے بغیر جسم کا وجود نہیں، اسی طرح قبلہ کے بغیر ملت کا کوئی تصور نہیں۔ دل پورے جسم کی شریانوں سے خون کھینچتا ہے اور اسے پمپ کر کے زندگی کی حرارت سے بھرپور کر کے دوبارہ شریانوں میں بھیج دیتا ہے۔ کعبۃ اللہ بھی امت کے صالح عناصر کو ہر سال پوری امت میں سے چھانٹ کر کھینچتا ہے اور ان میں سے ایک ایک فرد کے دل و دماغ میں بندگی اور سرافگندگی، اطاعت و انابت اور جہاد و عزیمت کے تصورات بھر کر واپس ان کے ملکوں میں بھیج دیتا ہے تاکہ جو زندگی کا خزانہ یہاں سے لے کر جا رہے ہیں اسے جا کر لوگوں میں لٹائیں اور اس طرح سے ایک نئی زندگی کی روح پوری امت میں پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد فرمایا اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا ''جہاں کہیں تم ہو گے اللہ تم سب کو جمع کرے گا''۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ مسلمان تو پوری دنیا میں پھیل جائیں گے اور ان کیلئے چونکہ ایک قبلہ مقرر کر دیا گیا ہے اس لئے کوئی کسی طرف سے قبلہ کی طرف منہ کرے گا، کوئی کسی طرف سے۔ فرمایا تم جہاں بھی قبلہ کی طرف منہ کر کے اللہ کی عبادت کرو گے اللہ تم سب کو جمع کرے گا وہ جانتا ہے کہ کہاں کہاں میرے بندے نے مجھے سجدہ کیا ہے۔ اسی طرح تم نیکی اور بھلائی کی راہ میں جو جدوجہد بھی کرو گے وہ ضائع نہیں جائے گی۔ شرط صرف یہ ہے کہ تمہارا رخ اللہ کے گھر کی طرف رہنا چاہئے کیونکہ اللہ کے گھر کی طرف رخ کا مطلب فی الحقیقت اللہ کی طرف رخ ہے کیونکہ اس گھر کا ذرہ ذرہ اللہ ہی کی طرف متوجہ کرتا ہے اس گھر میں لگے ہوئے حجرِ اسود کو جب آدمی چھوتا ہے تو اس تصور سے اسے ہاتھ لگاتا ہے کہ میں اللہ کے ہاتھ پر اللہ کی بندگی اور اسی کی اطاعت کا عہد کرتا ہوں۔ ان

Marfat.com

تصورات کے ساتھ جب بھی کوئی نیکی کی جائے گی تو یقیناً ایسی نیکی ضائع نہیں ہوگی اللہ ان سب نیکیوں کو ایک دن جمع کرے گا اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مخالفین سے بحثوں میں الجھنے کی بجائے نیکیوں میں سبقت کرو۔ بھلائی کی راہوں میں بڑھو، مخالفین کو مخالفت کے پھپھولے پھپھوڑنے دو۔ ایک دن آئے گا جب اللہ تعالیٰ تم سب کو جمع کر کے فیصلہ کرے گا کہ کون حق کی راہ چلا؟ اور کس نے ضد اور ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کیا؟ اللہ کیلئے ان میں سے کوئی کام مشکل نہیں کیونکہ اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ○ (البقرة: ۱۴۹)

(اور جہاں کہیں سے بھی تم نکلو تو اپنا رخ مسجدِ حرام کی ہی طرف کرو، بے شک یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے)

سفر اور حضر میں ایک ہی حکم ہے

اس سے پہلے آیت نمبر ۱۴۴ میں قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم گزر چکا۔ اس میں آنحضرت ﷺ کو الگ حکم دیا گیا اور آپ کی امت کو الگ حکم دیا گیا۔ لیکن اس حکم کا تعلق صرف حضر کی حالت سے تھا۔ یعنی قیام کی حالت سے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہو یا اپنے شہر میں ہو یا مسجدِ نبوی میں ہو یا رسول اللہ ﷺ کے پیچھے جماعت سے نماز سے پڑھ رہے ہو یا کسی اور امام کی اقتدا میں پڑھ رہے ہو یا انفرادی طور پر نماز ادا کر رہے ہو ہر حال میں تمہیں مسجدِ حرام ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنی ہے۔ لیکن اب اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں سفر درپیش ہو تو سفر کے دوران یا پردیس میں جب تمہیں نماز پڑھنے کا موقع ملے تو وہاں یہ مت سمجھنا کہ چونکہ سفر کی نماز حضر کی نماز سے مختلف ہوتی ہے ممکن ہے قبلہ کے معاملے میں بھی مسافرت میں کوئی سہولت دی گئی ہو کیونکہ حالتِ سفر میں بعض دفعہ قبلہ کے تعین میں دشواری پیش آتی ہے۔ بالخصوص آدمی اگر غیر مُسلم ماحول میں سفر کر رہا ہو یا غیر مُسلموں کے شہر میں ہو تو پھر تو قبلہ کی جہت معلوم کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس اشکال کو دیکھتے ہوئے ممکن تھا بعض طبیعتیں قبلہ کی طرف منہ کرنے میں تساہل سے کام لیتیں یا اس عذر کو اہمیت دے کر جس طرف جی چاہتا لوگ نماز پڑھنا شروع کر دیتے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں صراحت سے یہ حکم دیا گیا کہ حالتِ قیام کی طرح حالتِ سفر میں بھی تمہیں قبلہ ہی کی طرف رخ کرنا ہے۔ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی اور کسی تساہل کی کوئی گنجائش نہیں۔ تم ایسی رعائتوں کی تلاش میں یہود و نصاریٰ کی طرح گمراہ نہ ہو جانا کہ وہ باوجود بیت المقدس کو قبلہ ماننے کے سفر کے دوران مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے یعنی انہوں نے قبلہ کو چھوڑ کر جہت کی پرستش شروع کر دی۔ اس لئے یاد رکھو تمہارے لئے ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ یہ قبلہ یقیناً اللہ کا مقرر کیا ہوا قبلہ ہے، تو اللہ نے سفر و حضر دونوں میں اسے تمہارے لئے قبلہ بنایا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضر میں تو تم اس کے حکم کی تعمیل کرو اور سفر میں اس سے لاپرواہی کرو۔ مزید فرمایا یہ بھی تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تمہارے ہر عمل سے واقف ہے۔ تم سفر میں نماز پڑھو یا حضر میں کسی صورت بھی وہ تمہاری نمازوں سے غافل نہیں تو اگر تم نے قبلہ کی طرف رخ کرنے کے معاملے میں تساہل سے کام لیا یا کسی اور جذبے سے اس حکم کی خلاف ورزی کی تو اللہ تمہارے اعمال اور اس کے محرکات تک سے واقف ہے تم اس کی باز پرس اور گرفت سے کیسے بچو گے۔

Marfat.com

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۚ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (البقرة: ۱۵۰)

(اور آپ جس جگہ سے بھی نکلیں اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف موڑ لیا کریں اور تم لوگ بھی جہاں کہیں ہو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر لیا کرو تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے، سوا ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں۔ سو تم ان سے نہ ڈرو، مجھ ہی سے ڈرو تاکہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کروں اور تاکہ تم راہ یاب ہو)

اس آیت میں تاکیدِ مزید کے ساتھ تحویلِ قبلہ کی تین حکمتیں

سابقہ آیات میں سفر اور حضر دونوں حالتوں کے مطابق یہ دونوں حکم بیان ہو چکے ہیں کہ تم چاہے سفر میں ہو یا اپنے گھر یا اپنے شہر میں تمہیں ہر صورت میں مسجدِ حرام ہی کی طرف منہ کرنا ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں دوبارہ انہیں دونوں حکموں کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ تاکید کیلئے یا تاکیدِ مزید کیلئے کسی حکم کا اعادہ ناقابلِ فہم نہیں۔ لیکن قرآنِ کریم جیسی کتاب جو ایجاز و بلاغت کا ایک معجزہ ہے اس میں اس طرح کی تکرار یقیناً طبیعتوں کو کھٹکتی ہے۔ لیکن اگر تھوڑا سا تدبر کر لیا جائے تو پھر یہ کھٹک خود بخود دور ہو جاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے جیسے اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ قرآنِ کریم صرف آئین یا قانون کی کتاب نہیں بلکہ یہ تو کتابِ ہدایت ہے اور کتابِ ہدایت کا اسلوب صرف یہ نہیں ہوتا کہ حکم دے کر چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کا اصل اسلوب تو یہ ہے کہ جو حکم دیا جائے اس کی طرف طبیعتوں کو مائل بھی کیا جائے۔ عقلی طور پر مطمئن کرنے کیلئے احکام کی حکمتیں بھی بیان کی جائیں اور اگر وہ حکم ایسا ہے جس کا تعلق ضروریاتِ دین سے ہے اور مزید یہ کہ اس پر عمل کرنے کیلئے اپنے خیالات اور معتقدات کی قربانی بھی دینا پڑتی ہے۔ تو پھر ضروری ہو جاتا ہے کہ ایسے حکم کو تاکید سے ذکر کیا جائے اور اس کی حکمتوں کو کھول کر بیان کیا جائے۔ تحویلِ قبلہ کا حکم بھی ایسی ہی نوعیت کا حکم ہے۔ جو لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہو رہے ہیں ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا قبلہ ہے۔ مشرکینِ عرب ہیں تو وہ بھی ایک قبلہ رکھتے ہیں اور اہلِ کتاب ہیں تو انہیں بھی اپنے قبلے پر اصرار ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے قبلہ کے تعین یا قبلہ کی تبدیلی کی بات کرنا کہنے کو تو آسان ہے لیکن دماغوں سے اس کو منوانا اور دلوں میں اتارنا ہرگز آسان نہیں۔ اس راستے میں بڑی کٹھن گھاٹیاں ہیں، ضروری تھا کہ یہ حکم اس طرح دیا جاتا کہ نہ تو اس کے سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آتا اور نہ اس میں کوئی اخفا رہتا اور نہ اس سے منافقانہ طبیعتیں کوئی غلط فائدہ اٹھا سکتیں۔ اور نہ علم و دانش کے رسیا لوگوں کیلئے اس کی حکمتیں جاننا مشکل ہوتا۔ چنانچہ ان تمام ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے قرآنِ کریم نے پہلے حالتِ حضر کیلئے حکم جاری فرمایا پھر حالتِ سفر میں اس کا حکم دیا پھر اس آیتِ کریمہ میں ان دونوں احکام کا تاکیدِ مزید کے طور پر اعادہ فرمایا لیکن ساتھ ہی اس حکم کی حکمتیں بھی بیان فرمائیں۔ تاکہ اندازہ ہو جائے کہ اب اس حکم کا اعادہ محض تاکیدِ مزید کیلئے نہیں بلکہ ان حکمتوں کو بروئے کار لانے کیلئے ہے کہ اگر وہ نگاہوں کے سامنے نہ رہیں تو امت ایسی غلطیوں کا ارتکاب کر سکتی ہے جس کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ چنانچہ اس کی تین حکمتیں بیان فرمائیں۔ ۱: قطعِ حجت، ۲: اتمامِ نعمت، ۳: راہ یابی۔

Marfat.com

اب ہم تینوں کی الگ الگ وضاحت کرتے ہیں۔

ا۔ قطعِ حجت سے مراد یہ ہے کہ ہم جو تمہیں اس طرح تاکید کے ساتھ مسجدِ حرام یا بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا بار بار حکم دے رہے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تم سے اس معاملے میں کوتاہی سرزد ہوئی تو یہود کو تمہارے خلاف بدگمانی پھیلانے اور ژاژ خائی کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔وہ تمہاری کوتاہیوں کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ یہ کیسے لوگ ہیں ایک طرف تو دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ نے بیت اللہ کو ہمارا قبلہ مقرر کردیا ہے اب ہم بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز نہیں پڑھ سکتے ورنہ اس سے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی اور دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ جب جی چاہتا ہے کبھی کسی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے ہیں اور کبھی کسی طرف۔اس طرح کی باتوں سے مسلمانوں کے بارے میں جو تصور پیدا ہوگا اس کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اگر مسلمانوں کا قبلہ نہ بدلا جاتا تو یہود کو یہ کہنے کا موقعہ ملتا اور اس طرح سے وہ بدگمانی پیدا کرتے کہ ہماری کتابوں میں نبی آخرالزماں کی جو علامتیں بیان کی گئی ہیں ان میں یہ علامت بھی ہے کہ اس آخری نبی کا قبلہ بیت اللہ ہوگا، بیت المقدس نہیں۔یہ صاحب تو بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے ہیں اور اپنی امت کو بھی اسی طرف منہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کے وہ آخری نبی نہیں۔اگر یہ آخری نبی ہوتے تو یقیناً بیت اللہ کو اپنا قبلہ بناتے۔ان کی اس حجت بازی سے اسی صورت بچا جاسکتا تھا کہ بیت اللہ کو قبلہ بنانے کا حکم دیا جاتا۔

کبھی یہود اس طرح کی باتیں کرتے کہ جب یہ پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والے ہمارے قبلے ہی کی طرف نماز پڑھتے ہیں یعنی ہمارے قبلے کو اپنا قبلہ تسلیم کرتے ہیں تو پھر نماز اور عبادت کے طریقوں میں ہمارے طریقہ سے الگ راہ کیوں اختیار کرتے ہیں۔ایک بنیادی چیز میں اشتراک کے بعد دوسری چیزوں میں اختلاف، اسے وہ نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ کی من گھڑت ایجاد قرار دیتے تھے۔بالخصوص آنحضرت ﷺ کا یہ دعویٰ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ملتِ ابراہیم پر مبعوث کیا ہے اور میں ملتِ ابراہیم کو ازسرِ نو زندہ کروں گا۔یہود اسی حوالہ سے پراپیگنڈہ کرتے تھے کہ اگر یہ پیغمبر ملتِ ابراہیم پر مبعوث ہوئے ہیں اور یہ بھی ان کا دعویٰ ہے کہ بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا تو پھر یہ ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز کیوں پڑھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو قبلہ قرار دے کر ان تمام رخنہ اندازیوں کے رستے بند کردیئے اور مسلمانوں کو تاکید در تاکید کی جارہی ہے کہ اگر تم نے اس حکم کی پابندی میں پوری طرح احتیاط نہ برتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہود کو زبان درازی اور وسوسہ اندازی کا موقعہ ملتا رہے گا اور اس طرح سے تمہیں کعبۃ اللہ کو مرکز قرار دے کر بھلائیوں اور خوبیوں کے حصول کیلئے حقیقی تگ و دو کرنے کا کبھی موقع نہیں ملے گا اور تمہاری دینی زندگی میں وہ یکسوئی اور قوت پیدا نہیں ہوگی جو تمہیں آگے بڑھنے کیلئے درکار ہے۔مزید فرمایا کہ تم اگر تحویلِ قبلہ کے حکم پر تمام تر احتیاطوں کے ساتھ عمل کرو تو یہود کیلئے کوئی بات کہنے کا موقعہ باقی نہیں رہے گا اور ان کی حجت بازیاں ختم ہوکر رہ جائیں گی۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی توپیں یکسر خاموش ہوجائیں گی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر معقولیت رکھنے والا آدمی یہ ضرور محسوس کرنے لگے گا کہ یہود کی باتوں میں کوئی وزن نہیں۔اس طرح وہ خود ہی اپنی مخالفت کی شدت سے رک جائیں گے۔البتہ ان میں جو ظالم اور شریر قسم کے لوگ ہیں وہ اس قطعِ حجت کے بعد بھی اپنی حرکتوں سے باز آنے والے نہیں ہیں۔تمہیں ایسے لوگوں کا ہرگز نوٹس نہیں لینا چاہیئے اور ان کی باتوں کو اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔بلکہ ایسے لوگوں کا علاج یہ ہے فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ’’ان سے نہ ڈرو صرف مجھ ہی سے ڈرو‘‘ یہ چھوٹا سا جملہ قومی اور تہذیبی تصادم میں سب سے بڑا ہتھیار ہے۔علم و دانش کا مقابلہ علم و دانش سے ہوتا ہے۔فوجوں کا مقابلہ میدانِ جنگ میں

Marfat.com

کیا جاتا ہے کاروباری مسابقت کاروبار میں ہوتی ہے۔لیکن قوموں کی مجموعی مسابقت کی جنگ وہ ہمیشہ قوموں کے رویے سے لڑی جاتی ہے۔ جس قوم میں قومی ملی اور دینی مورال توانا ہو اس کے عقائد میں پختگی ہو اس کے فکر میں روشنی ہو، اس کی تہذیب اور تمدن میں استقامت ہو، وہ اپنے افکار سے لیکر آداب تک مرعوبانہ ذہن رکھنے کی بجائے مومنانہ ذہن رکھتی ہو اور وہ فی الحقیقت داعی کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتی ہو۔ ایسی قوم نہ کبھی دوسری قوم کے سامنے گھبراتی ہے نہ دوسروں کے سامنے دریوزہ گری کرتی ہے، نہ وہ پرائے خیالات کی جگالی کرتی ہے۔ایسی قوم کا ایک ایک فرد خود اعتمادی سے سرشار ہوتا ہے، وہ علم و دانش اور حکمت کی ہر بات کو اپنی گمشدہ متاع سمجھتی ہے۔لیکن وہ اپنے فکری اور دینی سرمائے پر کبھی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔یہی وہ کردار ہے جسے یہاں اختیار کرنے کا حکم دیا جارہا ہے کہ تم صرف مجھ سے ڈرو کسی اور سے مت ڈرو۔اس میں فکر و عمل کی پوری دنیا سمٹ گئی ہے۔تہذیب و تمدن کے سارے حوالے اس میں موجود ہیں۔افادہ اور استفادہ کی تمام نزاکتیں اس میں بند ہیں اور یہی وہ حقیقی بیداری ہے جو مسلمان قوم کی معراج بھی ہے اور مطلوب بھی اور اسی کو اقبال نے توحید کا نام دیا ہے۔

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

۲۔ علم اور کردار کی یہی وہ پختگی ہے، جس کے نتیجے میں پروردگار اتمامِ نعمت کی دولت سے نوازتا ہے اور اتمامِ نعمت سے مراد تکمیلِ دین ہے۔یہاں جو تین حکمتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے یہ دوسری حکمت ہے کہ جب تم اپنے اندر اس طرح کا کردار پیدا کرلو گے تو تب ہم تمہیں تکمیلِ دین کی دولت عطا فرمائیں گے اور تکمیلِ دین کا جب اعلان کیا گیا ہے اس میں اس امت یعنی صحابہ کرام کو سرٹیفکیٹ بھی جاری کیا گیا ہے۔ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ''آج کافر قوتیں تمہارے دین سے مایوس ہوگئیں انہوں نے ہر طرح سے سرپٹخ کر دیکھا لیکن تمہارے معتقدات میں کوئی نقب نہ لگا سکے، تمہارے کردار میں کوئی کمزوری نہ پیدا کرسکے'' ۔اہلِ کتاب علم و دانش کے ہزار دعوؤں کے باوجود علم و یقین کے میدان میں ان امیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔مسلمانوں کی اپنی تہذیب اور اپنے تمدن نے امتِ مسلمہ کی شیرازہ بندی کی ان کی ریاست کا ایک ایک ادارہ اسی حوالے سے وجود میں آیا پوری دنیا مسلمانوں کے سامنے حرفِ معطل بن کررہ گئی۔چنانچہ قرآنِ کریم نے یہ سرٹیفکیٹ جاری کیا کہ کافر قوتیں تم سے مایوس ہوگئی ہیں۔لیکن یاد رکھو! اس کے بعد بھی اس صورتحال کو بدلنا نہیں چاہئے۔تمہیں میرے سوا کسی اور سے ہرگز نہیں ڈرنا۔اس کے بعد الیوم اکملت لکم کہہ کر تکمیلِ دین کا اعلان فرمایا۔دیکھ لیجئے! اس کی بنیاد یہی جملہ ہے جس کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے۔

۳۔ تیسری حکمت ہے ''راہ یابی'' لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ اگر تم چاہتے ہو اللہ تمہیں مکمل طور پر ہدایت سے نوازے تو پھر تمہیں اس قبلے سے اپنی وابستگی کو مکمل کرنا ہوگا۔اسی قبلہ سے وابستگی کا نتیجہ ملتِ ابراہیم ہے۔اسی گھر سے جنم لینے والے انقلاب کی علمبردار امتِ مسلمہ ہے اور اسی کے قائد اور رہبر سرورِ دو عالم ﷺ ہیں اور یہی گھر قرآن پاک کی تعلیم و تربیت کا مرکز ہے اور اسی کے گرد و پیش میں اللہ کی توحید اور اس کی بندگی کے نشانات پھیلے ہوئے ہیں۔اس لئے وہ مکمل ہدایت جو آدمی کو صراطِ مستقیم تک لے جاتی ہے وہ اسی گھر کے باعث نصیب ہوتی اور توانا ہوتی ہے۔تو اگر اس گھر کی وابستگی میں کوئی کمی آگئی تو ان حکمتوں میں سے کوئی چیز نصیب نہیں ہوسکے گی۔ان حکمتوں کو سمجھ لینے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ پروردگار نے تحویلِ قبلہ کا حکم دینے کے بعد اس قدر تاکید سے کیوں کام لیا ہے۔

Marfat.com

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ O (البقرة: ۱۵۱)

(چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے)

تشبیہ کس چیز کی؟

اس آیت کے آغاز میں ''کَمَا'' کا لفظ آیا ہے جس میں ''کَ'' حرفِ تشبیہ ہے۔ اس حرفِ تشبیہ کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تشبیہ کس چیز میں دی گئی ہے۔ اگر ہم سیاقِ کلام کو غور سے دیکھیں تو اس تشبیہ کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا۔ گزشتہ سے پیوستہ رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ذکر ہے۔ جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس قبلہ کی خدمت اور تولیت کیلئے ایک امتِ مسلمہ اپنے اللہ سے مانگی ہے جس قبلہ کی آپ نے اللہ کے حکم سے تعمیر کی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو پورا فرماتے ہوئے اس گھر کی آبادی اور خدمت کیلئے نہ صرف اس امت کو اٹھایا بلکہ اسے خیرِ امت اور امتِ وسط بنا کر پوری دنیا کی ہدایت کے حوالے سے قیادت وامامت کی ذمہ داری اس کے سپرد کر دی اور جس قبلہ میں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس امت کیلئے دعا مانگی تھی وہی قبلہ اس امت کا قبلہ بنا دیا گیا اور اسی مرکز کے حوالے سے اس کی شیرازہ بندی کی گئی۔ اب نہائیت ضروری تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو بھی تعبیر دی جاتی جس میں آپ نے اس امت ہی کی تعلیم اور تزکیہ کیلئے ایک رسول مانگا تھا اور جس کے واسطے سے قیامت تک کیلئے پوری دنیا کو ہدایت کی روشنی ملنے والی تھی۔ چنانچہ جب امت کا سفر شروع ہو گیا اس کی جہتِ سفر کیلئے ایک منزل اور اس کی شیرازہ بندی کیلئے ایک مرکز دے دیا گیا تو نہائیت ضروری تھا کہ اس سے پہلے اس رسول کو بھیجا جاتا جس کی تعلیم وتربیت سے امت کو ہدایت ملنا تھی اور جس کے نورِ ہدایت سے اس گھر کو دین کا مرکز بننا تھا۔ اس طرح سے اللہ کی الوہیت اور بندگی پر مبنی وہ انقلاب وجود میں آنا تھا جس کی علمبردار یہ امت ہوتی اور جس کا مرکز اللہ کا یہ گھر ہوتا اور جس کی امامت اور قیادت اللہ کے رسول کے ہاتھ میں ہوتی۔

وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ کا مفہوم

چنانچہ تحویلِ قبلہ کے سلسلہ کی ہدایات دینے کے بعد اللہ نے اس طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھا کہ دیکھو! تمہاری دینی اور شرعی ذمہ داریوں کی تکمیل کیلئے ہم نے صرف قبلہ ہی نہیں دیا بلکہ وہ رسول بھی دیا ہے جو تمہیں اللہ کی کتاب پڑھ کر سنائے گا اس کے احکام اور فرامین سے تمہیں آگاہ کرے گا پھر تمہیں باقاعدہ ان احکام کی تعلیم دے گا۔ اس علمِ صحیح کے ایک ایک گوشے اور اس کے انطباق کی ایک ایک حکمت واضح کرے گا اور احساسات وانفعالات اور اثرات وتاثرات کی پاکیزگی کیلئے تزکیۂ نفوس کرے گا اور تمہیں ان باتوں کی تعلیم دے گا جو تمہاری زندگی کی ضروریات کیلئے نہائیت ناگزیر ہیں، لیکن تم انہیں جانتے نہیں۔ اس آیت میں رسولِ اکرم ﷺ کے فرائض کے حوالے سے جن باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ہم گزشتہ سے پیوستہ رکوع میں اس کی تشریح کر چکے ہیں، اس لئے ہم اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ البتہ

Marfat.com

اس آیت کا آخری حصہ کہ وہ تمہیں ان باتوں کی تعلیم دے گا جس کو تم نہیں جانتے۔ یہ گزشتہ آیت سے ایک زائد بات ہے جس کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کے پیغمبر جب دنیا کی اصلاح کیلئے تشریف لاتے ہیں تو وہ دنیا کو ہر وہ چیز بتلاتے ہیں جو ان کی اصلاح کیلئے ضروری ہوتی ہے۔ ان میں ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں قوم پہلے سے جانتی ہے، لیکن نظرانداز کر چکی ہے۔ ایسی بھی چیزیں ہوتی ہیں جنہیں بالکل بھلایا جا چکا اور ایسے حقائق بھی ہوتے ہیں جنہیں لوگ بالکل نہیں جانتے۔ لیکن انسانی زندگی کیلئے ان کا علم ازبس ضروری ہے۔ چنانچہ اس دور میں آنحضرت ﷺ نے اپنی تشریف آوری کے بعد ان تمام ضرورتوں کو پورا فرمایا جن کی تفصیلات سے آپ واقف ہیں اور آج بھی ان کی تعلیمات جو قرآن وسنت پر مشتمل ہیں امت کیلئے مکمل رہنمائی کا سامان ہیں۔ لیکن ہم اس کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی دیکھتے ہیں کہ پیغمبر کی تعلیم صرف علم تک محدود نہیں ہوتی ان کی ہر بات عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر کسی بات کو صرف جاننا اور سمجھنا مقصود ہو تو اس کیلئے دماغی کاوشیں کافی ہیں۔ لیکن اگر اس کے لئے عمل ناگزیر ہو تو پھر دماغی کاوشیں اور سمعی اور بصری آلات کافی نہیں بلکہ اس کیلئے اصل ضرورت دل ودماغ کی ہم آہنگی، قلبی آمادگی، قلبی اطمینان بلکہ قلبی یقین ضروری ہے۔ جس علم کے پیچھے یقین نہ ہو وہ محض زبان کا جمع خرچ، دماغ کی عیاشی اور دل کا نفاق ہوتا ہے۔ ایسے علم سے ادارے تو چل سکتے ہیں لیکن توانا قومیں وجود میں نہیں آتیں۔ آ جائیں، تو اپنی بقا کا سامان نہیں کر سکتیں۔ اس لئے اللہ کے نبی علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اصل زور دل ودماغ کی ہم آہنگی پیدا کرنے اور یقین کی قوت سے بہرہ ور کرنے کیلئے صرف کرتے ہیں۔ اور یہی وہ قوت ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد قوموں اور افراد میں وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے سابقہ آیت میں فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ علم ویقین کی یکجائی اس قوت کو پیدا کرتی ہے جس میں اندیشہ ہائے دور دراز اور شک وارتیاب کے واہمے دم توڑ جاتے ہیں۔ بے یقینی کے برے اثرات کو سر اٹھانے کا موقع نہیں ملتا۔ پیغمبر کا اصل ہدف یہی ہوتا ہے اور ان کے پیروکار بھی ہمیشہ یہی دولت دنیا میں تقسیم کرتے ہیں۔ لیکن جب جہالت اپنے پنجے گاڑ لیتی ہے اور علم دین سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور زندگی کے مقاصد بگڑنے لگتے ہیں اور انسان اپنی اصل شناخت بھول جاتا ہے تو پھر اس کا علم اپنی جہت کھو دیتا ہے۔ اپنی اصل حیثیت گم کر بیٹھتا ہے مادے کا خدمت گزار بن کر پستیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ان خطرات سے انسانیت کو بچانا ہر دور میں تعلیماتِ پیغمبر کا اصل اعجاز ہے۔ حضور جن لوگوں میں تشریف لائے تھے ان کی بھی اصل ضرورت یہی تھی اور حضور نے انہیں اس حوالہ سے مالا مال کر دیا اور آج بھی انسان کی اصل ضرورت یہی ہے۔

لیکن آج ہم ان بنیادی حقائق سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں جو پیغمبر کی تعلیم کی شروعات کہلاتے ہیں۔ اللہ کی ذات انسانی علم کی مبدا و معاد ہے۔ یہی اول ہے اور یہی آخر ہے، یہی ظاہر ہے اور یہی باطن ہے۔ ایک مسلمان کو اس کے ساتھ کیسا تعلق رکھنا چاہیے یہ ہماری معلومات کی پہلی سیڑھی ہے۔ ہر مرحلے پر آنحضرت ﷺ نے اس کا یقین پیدا فرمایا ہے۔ غارِ ثور میں جب دشمن سر پر پہنچ گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہایت فکرمندی سے آنحضرت سے عرض کیا کہ حضور تلاش کرنے والے ہمارے سروں پر پہنچ گئے، وہ ذرا جھک کر دیکھیں تو ہم ان کی نظروں میں ہیں۔ تو آنحضرت ﷺ نے نہایت اطمینان سے فرمایا: لاتحزن ان اللہ معنا "مت گھبرا فکرمند نہ ہو بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ یہی یقین کی وہ قوت تھی جس نے حضرت صدیق اکبر سے لے کر آخری صحابی تک اسلام کی راہ میں آنے والی مشکلات کا سفر آسان کر دیا۔ لیکن ہم مجموعی طور پر آج اس سبق سے بے بہرہ ہیں۔ پوری امت یہ سمجھنے سے قاصر ہو گئی ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے اور ہم

Marfat.com

ایسے طور اطوار اختیار کریں کہ ہم اس کی معیت کا استحقاق پیدا کرلیں۔ اس کے بعد ہمارے لئے کوئی مشکل، مشکل نہیں رہے گی۔ لیکن ہمیں اللہ کے سوا ہر قوت کا ساتھ عزیز ہے اور اسے حاصل کرنے کی فکر بھی ہے۔ لیکن اللہ کے بارے میں ہم اس بنیادی تصور سے عاری ہو گئے ہیں۔ اس لئے اگلی آیتِ کریمہ میں کھول کر اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ O (البقرۃ: ۱۵۲)

(پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا میری شکر گزاری کرتے رہنا میری ناشکری نہ کرنا)

اللہ تعالیٰ اور اس امت کے درمیان ایک معاہدہ

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری، قرآنِ کریم کے نزول اور تحویلِ قبلہ کے حکم کے بعد اس امت کے وجود اس کی شیرازہ بندی اور اس کی بقا کے تمام سامان میسر ہو گئے یہ قافلۂ حق اپنے سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔ اب اس کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی ہے۔ اور اس دنیا میں اپنے مفوضہ کردار کو ادا کرنا ہے۔ اسے خوب معلوم ہونا چاہئے کہ اس کے وجود کی پہلی اینٹ اللہ کی یاد سے اٹھائی گئی ہے۔ اس کی زندگی کا سارا سرمایہ اس علم پر مشتمل ہے جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے اور اس امت کے دلوں کی روشنی اس اسوہ میں ہے جو اللہ کے رسول کا اسوہ ہے۔ اور ان کی تمام تر رفعتیں اور کامیابیاں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کی مرہونِ منت ہیں۔ وہی ہے جس کی معیت ہر وقت انہیں حاصل ہے وہ جس طرح ان کا حامی و ناصر ہے اسی طرح ان کے اعمال کا نگران بھی ہے۔ غرضیکہ اللہ کی یاد اور اس کا استحضار ایک مومن کی زندگی ہے وہ ایمانیات سے لے کر آدابِ زندگی تک ہر لحہ اللہ کی تعلیمات کا محتاج ہے اور اپنے ہر عمل میں قوت اور اس کی قبولیت کیلئے اللہ کی رحمت کا متمنی ہے۔ وہ اپنے کسی کام اور کسی ضرورت کے حوالے سے بھی اللہ سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس کو سمیٹتے ہوئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک مومن کی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنے اللہ کو یاد رکھے اور اللہ کی طرف سے بندے پر انعام یہ ہے کہ وہ اپنے بندے کی بندگی کو قبولیت سے نوازے اور اپنی نصرت و تائید سے اس کی بھرپور مدد فرمائے۔ یہ گویا ایک طرح سے ایک معاہدہ ہے جو اللہ اور اس امت کے درمیان ہوا ہے۔ اور یہی معاہدہ ہر امت کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ بنی اسرائیل کے حوالے سے بھی ہمیں بتایا گیا ہے کہ اسے بھی اسی طرح کی یاددہانی کی گئی تھی۔

اُذْکُرُو انِعْمَتِیَ الَّتِیٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنَ O

(میری اس نعمت کو یاد رکھو جو میں نے تم پر کی ہے اور میرے عہد کو پورا کرو اور میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے اور مجھ ہی سے ڈرو)

یہی معاہدہ اس امت سے کیا گیا ہے کہ تم اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں جو اللہ اور اس کے رسول نے تم پر عائد کی ہیں ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کرو۔ اسی کیلئے جیو اور اسی کیلئے مرو، تمہارا ہدف صرف اعلائے کلمۃ الحق ہونا چاہئے۔ اس کی خاطر تمہیں دنیا بھر سے ٹکرانا پڑے تو کبھی دریغ نہ کرو۔ اپنی ذات کی بالکل نفی کر دو، اپنے مفادات اور اپنے مرغوبات کو اسلامی مفادات میں گم کر دو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر

Marfat.com

مرحلے پر تمہیں اپنی نصرت سے نوازے گا۔مشکل سے مشکل مرحلے پر تمہاری مدد کرے گا،تمہاری زمینیں تمہارے لئے سونا اگلیں گی۔آسمانوں سے برکتوں کے دروازے کھل جائیں گے۔لیکن ساتھ ہی ایک وارننگ بھی دی ہے جو اس آیت کے دروبست میں جھلک رہی ہے۔

ذرا اس آیت کے الفاظ پر غور کیجئے!اس کا ترجمہ یہ ہے ''تم مجھے یاد رکھو تو میں تمہیں یاد رکھوں گا'' یاد رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ تم میری ہر نعمت کا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو۔تمہارا جسم،تمہاری جان،تمہارا مال،تمہاری زبانیں اور تمہارا قلم،تمہارے عہدے،تمہارے مناصب،تمہاری حکومتیں،تمہاری افرادی قوت،تمہارے ذرائع اور وسائل،تمہارے ذرائع ابلاغ،تمہاری فوج،یہ سب اللہ کی عطا کردہ نعمتیں ہیں۔ان کا شکر یہ ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز اللہ کی بندگی اللہ کے بندوں کی خدمت،اللہ کے دین کی سربلندی،اللہ کے احکام کی اطاعت اور اللہ کے رسول کی سنت پر عمل میں صرف ہو۔ناشکری یہ ہے کہ ان میں سے ہر چیز مذکورہ مقاصد سے مختلف مقاصد میں صرف ہو یا اپنی ذات اور ہوائے نفس کی خدمت میں خرچ ہو۔کہا اگر تم مجھے یاد رکھو اور ناشکری نہ کرو تو پھر میرا وعدہ ہے میں تمہیں یاد رکھوں گا یعنی تمہیں دنیا اور آخرت کی کامیابیوں سے نوازوں گا۔دنیا کی سب سے بڑی قوت تم بنو گے،تمہارا لوہا ہر لوہے کو کاٹے گا،تمہاری پیشانی کی سلوٹوں سے قوموں کی تقدیریں بدلیں گی۔یہ محض خیال آرائی نہیں صدیوں تک دنیا اس امت کو اسی بلندی پر دیکھ چکی ہے۔حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے دور کے اللہ سے ڈرنے والے حکمران تھے،جو ایک مزدور سے بھی سادہ زندگی گزارتے تھے۔لیکن ان کی ہیبت کا عالم یہ تھا کہ اس وقت کی معلوم زمین پر کوئی غیر مسلم حکومت ایسی نہ تھی جو انہیں خراج نہ دیتی ہو۔خلیفہ ہارون الرشید نے بادل کے ایک آوارہ ٹکڑے کو دیکھ کر کہا: ''تو جہاں چاہے جا کر برس،تیرے پانی سے جو پیداوار ہو گی وہ میرے ہی خزانے میں آئے گی'' پھر خود ہی اس کا مطلب بیان کیا کہ اگر یہ عالمِ اسلام پر برسے تو وہ میری مملکت ہے اور اگر یہ کسی غیر مسلم ملک پر برسے تو کوئی ایسا غیر مسلم ملک نہیں جو مجھے خراج نہ دیتا ہو۔آج یہ باتیں لوگوں کو افسانہ معلوم ہوتی ہیں۔لیکن تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی کہ ہم نے صدیوں تک ظالموں کی گردنیں جھکائی ہیں۔اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا جس کا تو ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

کہوں کیا ہم نشیں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

لیکن اسی آیت میں تنبیہ اور وارننگ بھی مضمر ہے کہ اگر تم مجھے یاد نہیں رکھو گے تو سوچ لو پھر اس کا انجام کیا ہو گا کیونکہ ہماری ہستی سے لے کر کامیابی تک پورا سفر اللہ کی ذات کا مرہونِ منت ہے۔اگر وہ ہمیں اپنی یاد سے نکال دے تو نتیجہ اس کا وہی ہو گا جو آج ہمارے ساتھ ہو رہا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی امت ہوتے ہوئے بھی آج ہم بدترین ذلت کا شکار ہیں۔کوئی ملک کسی دوسرے کی مدد کرنے کی ہمت نہیں کر رہا۔بلکہ ہم تو پتلیوں کی طرح غیر مسلم قوتوں کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔ہمیں اپنے مفادات سے زیادہ ان کے مفادات عزیز ہیں۔اپنے مسلمان بھائیوں کو غیر مسلموں کی خاطر قتل کرنے سے بھی ہمیں دریغ نہیں۔

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ
وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ
وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَ
بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا
لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ
مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ
شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ
وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ
يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا
وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ

Marfat.com

وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

پارہ ۲، رکوع: ۳ (اے ایمان والو! ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو، بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔ بے شک ہم تمہیں آزمائیں گے کسی قدر خوف، بھوک، اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور ان ثابت قدموں کو خوشخبری سنا دیجئے O جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کیلئے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں O یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں۔ بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں تو جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ ان دونوں کا طواف کرے اور جس نے کوئی نیکی خوشدلی کے ساتھ کی تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآں حالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کیلئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ! جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کر لی اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگے تو میں ان کی توبہ قبول کروں گا۔ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے O وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی۔ اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بے انتہا رحم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے) (آیت ۱۵۳ تا ۱۶۳)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ O (البقرة:۱۵۳)

(اے ایمان والو! ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو، بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے)

Marfat.com

آیت کا پس منظر اور تہہ منظر

اس آیتِ کریمہ کا صحیح مفہوم سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کا پس منظر پیش منظر اور تہہ منظر بھی سمجھا جائے۔ اس کا پس منظر اور تہہ منظر یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے اور مدینہ طیبہ میں آپ کے مخاطب اوس وخزرج کے علاوہ یہود کے تین قبیلے ہیں۔ مکہ معظمہ سے اگرچہ آپ ہجرت فرما چکے ہیں۔ لیکن وہ پس منظر میں رہ کر ابھی تک اسلام اور مسلمانوں کیلئے مسائل پیدا کر رہے ہیں۔ جہاں تک یہود کا تعلق ہے ان کی اسلام اور آنحضرت ﷺ سے دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ بری طرح حسد کی آگ میں جل رہے تھے۔ جس مذہبی سیادت اور منصبِ مشیخیت پر وہ فائز تھے اور جس کی وجہ سے ان کیلئے فتوحات کا دروازہ کھلا ہوا تھا، آنحضرت کی بعثت کے بعد وہ اپنے اس منصب کو ہلتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ نبی آخر الزماں قریش میں تشریف لا چکے ہیں۔ بیت اللہ کو ان کا الگ قبلہ بنا کر اللہ نے ان کو انفرادیت دے دی ہے اور اس سے ان کا قومی تشخص ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ روز بروز مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور اسلامی قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ اس بڑھتی ہوئی قوت کو اپنی قومی سیادت کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہمیں اللہ کی جانب سے امامت وقیادت کے منصب سے معزول کر کے نبی آخر الزماں کی امت کو فائز کیا جا رہا ہے۔ اب اگر یہ امت سیاسی طور پر بھی مستحکم ہو جاتی ہے تو ہمارے لئے جزیرۂ عرب میں کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ اس پوری صورتحال نے انہیں غیظ وغضب کی انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ دشمنی میں وہ پہلے بھی کم نہ تھے لیکن مسلمانوں کا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ان کو امید دلاتا تھا کہ شائد یہ ایک نکتۂ اشتراک مزید اشتراکات میں تبدیل ہو جائے۔ لیکن تحویلِ قبلہ کا حکم آنے کے بعد وہ دشمنی کے سوا ہر جذبے سے محروم ہو گئے۔ اب انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو سکے اس نوزائیدہ تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے یا کم از کم ان کیلئے زیادہ سے زیادہ مشکلات پیدا کی جائیں۔ اس طرح سے مسلمانوں کیلئے مدینہ طیبہ، جس کے وسائل پر بہت حد تک یہود قابض تھے اور عوام کے اندر ان کا بے پناہ اثر رسوخ پایا جاتا تھا، ایک ایسی بستی میں تبدیل ہو گیا جس میں ان کیلئے ہر طرف خطرات کے ناگ لہراتے ہوئے نظر آتے تھے اور آئندہ انہیں اس سے بھی بڑے خطرات کا اندیشہ تھا۔

دوسری طرف قریش تھے۔ جنہوں نے مسلسل مسلمانوں کو اذیتیں پہنچا کر مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کو بظاہر بے بس اور تنہا پا کر قتل کر دینے کا منصوبہ بنا چکے تھے کہ اللہ نے محض اپنے فضل وکرم سے آنحضرت ﷺ کو نہایت حفاظت کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا۔ اس سے اگرچہ قریش کو بڑا دھچکا لگا لیکن پھر بھی وہ یہ سمجھنے لگے کہ ان کی مسلمانوں سے جان چھوٹ گئی۔ اب مدینے کا اجنبی ماحول اور یہود جیسے خطرناک دشمنوں کی دشمنی مسلمانوں کو ختم کر دینے کیلئے کافی ہو گی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان تو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں ان کی طاقت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ نے بیتِ ابراہیمی کو ان کا قبلہ مقرر کر دیا ہے اور وہ یہ دعویٰ کرنے لگے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے ملتِ ابراہیم پر مبعوث کیا ہے اس لئے آپ اور آپ کی امت بیت اللہ کے صحیح اور جائز وارث ہیں۔ اس صورتحال نے ان کے اندر بھی ایک آگ لگا دی تھی اور وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر مسلمانوں کو ختم کرنے یا روکنے کی بروقت کوشش نہ کی گئی تو مسلمان آگے بڑھ کر خانہ کعبہ کو واگزار کرانے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ خانہ کعبہ کو مرکز بنا کر اسلامی تحریک کو تیزی سے آگے بڑھا سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مکہ ان کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا اور عرب کی طاقت ان کے ہاتھوں میں چلی جائے گی اور پھر قریش ان کے رحم وکرم پر ہوں گے۔

Marfat.com

آیت کا پیش منظر

قریش اور یہود کے ان اندیشوں نے آہستہ آہستہ فتنے کی شکل اختیار کرنا شروع کر دی اور دونوں نے مسلمانوں کے استیصال کیلئے ایک دوسرے کی مدد کرنے کے وعدے کر لئے۔ مسلمان اگرچہ ان حالات سے پوری طرح باخبر نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ تو علام الغیوب ہیں وہ تو ہر طرح سے ان حالات کو جانتے تھے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ اور اگلی آیات میں مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے متنبہ کیا اور ساتھ ہی ان خطرات سے عہدہ برآ ہونے کا حل بھی تجویز فرمایا۔ اس آیتِ کریمہ میں اگرچہ خطرات کا ذکر نہیں لیکن ایک تو اس کے بعد کی آیات میں خطرات کی طرف واضح اشارے موجود ہیں اور دوسرا اس آیت میں جس طرح مدد چاہنے اور پھر اس کیلئے صبر اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے اس میں جس طرح خطرات کی طرف اشارہ موجود ہے جسے ہر معمولی عقل رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے۔ آپ کسی فرد یا گروہ سے کہئے کہ تم اللہ سے مدد مانگو اور اس کیلئے صبر اور نماز کو اختیار کرو تو جو شخص بھی اپنے ماحول سے واقف ہے اور اپنے فرائض کی مشکلات سے بھی باخبر ہے اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ مجھے درحقیقت کیا کہا جا رہا ہے۔ چنانچہ مسلمان بھی اس سے پوری طرح باخبر ہو گئے کہ ہمارے سامنے خطرات کی گھٹائیں اٹھنے والی ہیں اس لئے ہمیں اس کیلئے تیاری شروع کر دینی چاہئے۔ چنانچہ تیاری کیلئے جو نسخہ تجویز ہوا، اس کے دو اجزا ہیں۔ ایک صبر، دوسرا نماز۔

خطرات اور مشکلات کا علاج

نظریاتی قوتیں جب کبھی ناموافق صورتحال سے دوچار ہوتی ہیں تو ان کیلئے سب سے بڑا سہارا ان کی اپنے نظریات سے کمٹمنٹ، وابستگی اور ان پر استقامت ہوتی ہے۔ یہی چیز ہے جو قوموں کو مشکل سے مشکل حالات میں حوصلہ مند بناتی اور مشکلات سے لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ دشمن کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ انہیں بے حوصلہ کر کے ان کا مورال توڑ ڈالا جائے تاکہ یہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگیں۔ ہر اٹھتی ہوئی آواز کو کوندتی ہوئی بجلی تصور کریں اور ہر چھوٹے بڑے خطرے کو دیکھ کر کمپرومائز کرنے پر تیار ہو جائیں۔ کسی قوم میں اگر واقعی ایسی کمزوریاں داخل ہو جائیں تو انہیں تباہ کرنے کیلئے دشمن کو زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑتی کیونکہ جس طرح مدافعت کی قوتیں باہر سے کام کرتی ہیں، اس سے بڑھ کر اندر سے کام کرتی ہیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھ اور سہمے ہوئے دماغ اور سراسیمہ قلوب کبھی بھی حالات کا سامنا نہیں کر سکتے۔ اس لئے سب سے پہلے اسی بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ تم اپنے اندر صبر کی قوت پیدا کرو، اپنے نظریات پر اڑ جاؤ، ہر قربانی دینے کیلئے تیار ہو جاؤ، ڈرنے اور سہمنے کی بجائے جرأت اور استقامت کو اپنا ہتھیار بناؤ۔ لیکن قربان جائیے قرآنِ کریم کی بلاغت پر کہ اس نے صبر کا لفظ استعمال کیا جو اپنے اندر بڑی معنوی وسعت رکھتا ہے۔ جو کچھ ہم نے عرض کیا اس کے ساتھ ساتھ صبر کے مفہوم میں تین اور باتیں بھی شامل ہیں، جسے اہلِ علم صبر کی تین قسمیں شمار کرتے ہیں۔

۱۔ صبر علی الطاعات، ۲۔ صبر عن المعصیات، ۳۔ صبر علی المصائب

۱۔ صبر علی الطاعات کا مطلب ہے اپنے نفس کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند کر دینا، نفس کو اطاعت کی زنجیر پہنا دینا، نفس کو اس قابل بنا دینا کہ خواہشات اسے اپنے راستے پر چلنے کیلئے آمادہ نہ کر سکیں۔ امیدیں اور آرزوئیں نفس کو مجبور نہ کر سکیں کہ وہ شریعت کے حکم کو چھوڑ کر امیدوں اور آرزوؤں کی پیروی کرنے لگے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت دل و دماغ اور نفس کیلئے مرغوب ہو جائے اور گناہ اور نافرمانی ان کیلئے مکروہ بن جائے۔

Marfat.com

۲۔ صبر عن المعصیات اس کا معنی ہے معصیتوں اور نافرمانیوں سے صبر۔یعنی آدمی اپنے آپ کو اس طرح مضبوط بنا دے کہ کوئی نافرمانی اس سے سرزد نہ ہونے پائے۔نافرمانی کے مقابلے میں وہ اڑ جائے۔اس کیلئے اسے کیسی ہی قربانی دینی پڑے اس سے کبھی دریغ نہ کرے۔

۳۔ صبر علی المصائب مصیبتوں پر صبر۔نیکی کے راستے میں مصیبتوں کا آنا ایک ایسی اٹل سنت ہے جسے بدلا نہیں جاسکتا۔جو آدمی حق کی علمبرداری کرتا ہے، باطل قوتیں اسے کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں اور جو شخص نیکی کو اپنا رویہ بنالیتا ہے، برائی کی قوتیں اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتی یا اسے بہکانے کی کوشش کرتی ہیں۔شریعت کی پابندی کرتے ہوئے جو شخص رزقِ حلال پر اصرار کرتا ہے گھر سے لے کر اس کے دفتر تک کتنے لوگ ہیں جو اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔دوست احباب کی مجلس میں جو دوست اپنے دوستوں کے برے ارادوں کا ساتھ نہیں دیتا ان کی بری مجالس کی رونق نہیں بنتا ان کی خواہشات کی تائید نہیں کرتا، ایسے دوست کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ایسی ہر طرح کی صورتحال کا مقابلہ کرنا اور پیش آمدہ مشکلات کو برداشت کرنا صبر علی المصائب ہے۔

یہ صبر کی مختلف قسمیں ہیں، جس میں قدرِ مشترک صرف ایک ہے۔وہ ہے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت اور اللہ کی رضا کا حصول یہ وہ عملی وابستگی ہے جو نظریاتی وابستگی سے مل کر انسانی عزم کو مضبوط بناتی ہے۔جس کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبے میں باطل سے مقابلہ کرنے کی ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جو حق و باطل کے معرکے میں اصل مطلوب ہے۔جو آدمی بھی یہ چاہتا ہے کہ میں حق و باطل کی آویزش میں اپنی ذمہ داریاں ادا کروں تو اسے سب سے پہلے اپنے اندر صبر کی قوت پیدا کرنی چاہئے۔یہ ایک ایسا سبق ہے جو نظریاتی پختگی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور عملی طہارت اور پاکیزگی کا بھی۔اس کے بغیر کبھی آدمی باطل کے مقابلے میں کھڑا نہیں رہ سکتا۔

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

دوسری چیز جس سے حق و باطل کے معرکے میں مدد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ نماز ہے۔

صبر کے سلسلے میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اگر اسے پیشِ نظر رکھا جائے تو دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ایک تو یہ کہ حق و باطل کے معرکے میں پامردی، استقلال، اور استقامت شرطِ اول ہے۔اور دوسری یہ چیز کہ صبر کا تعلق جس طرح ثابت قدمی سے ہے اسی طرح نفس کو معصیت سے بچانے اور نفس کو اطاعت کی زنجیر پہنانے سے بھی ہے۔حق و باطل کے معرکے میں صرف غنیم اور فریقِ مخالف پر بالا دستی اور برتری مقصود نہیں ہوتی بلکہ باطل کی سرکوبی اور حق کی سربلندی بھی مقصود ہوتی ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ اس معرکے کا ہر سپاہی اس حق کا پیکر، اطاعت گزار اور علمبردار ہو جس کیلئے وہ اس معرکے میں اترا ہے اور اس کی زندگی کے کسی شعبے میں بھی اس باطل کی پرچھائیں بھی نہ پڑے جس کو وہ ختم کرنا چاہتا ہے۔ایسے معرکے میں کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ آدمی جس حق کیلئے معرکہ آرا ہے اس حق کے ساتھ وابستگی بلکہ غائیت درجہ والہانہ تعلق میں کمی نہ آنے پائے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے اور دوسری یہ بات کہ چونکہ باطل کا ایک رنگ نہیں وہ ہزار رنگوں میں زندگی کے بیشتر شعبوں میں پھیلا ہوا ہے۔اس کی سرکوبی کرنا یا اس کا مقابلہ کرنا آدمی کے اپنے وسائل سے ممکن نہیں کیونکہ ہر باطل کے پیچھے شیطانی قوتیں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔اس کے مقابلے کیلئے ایسے بڑے سہارے اور پشت پناہ کی ضرورت ہے، جس کی مدد میسر آجائے تو شیطانی قوتیں اس کا سامنا نہ کر سکیں۔

Marfat.com

نماز سے مدد

یہ دونوں قوتیں صرف نماز سے میسر آتی ہیں۔ نماز کے ذریعے آدمی کا اس ذات سے براہِ راست والہانہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے جو حق کی سرچشمہ اور منبع ہے۔ جو خود حق ہے اور حق اس سے ظہور پذیر ہوتا ہے اور وہی ذات ہے جس کی مدد اور پشت پناہی کمزوروں کو مضبوط بناتی اور مغلوب کا غالب کر دیتی ہے۔ ایک بندۂ خدا جب نماز کے ارادے سے ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ سوائے اللہ کے تعلق کے باقی ہر تعلق کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ ان سے اظہارِ لاتعلقی کرتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھا کر غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ لیتا ہے۔ اس طرح سے وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ میں اللہ کے سوا ہر آستانے پر جھکنے سے انکار کرتا ہوں اور ہر بڑائی اور آقائی کے دعویدار کی غلامی سے نفرت کا اظہار کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ اپنے آقا کی مدح وثنا میں ڈوب جاتا ہے۔ اسی کی پناہ چاہتا ہے، اسی کے نام سے ہر کام کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اسی کی ذات کو مختلف صفات سے پکارتا ہے اور پھر اپنی عبدیت کا اظہار کرتے ہوئے عبدیت کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کیلئے اسی سے مدد کا خواستگار ہوتا ہے۔ فکر وعمل کی مختلف پگڈنڈیوں میں اسی سے صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرتا ہے۔ پھر اسی کی محبت اور اطاعت میں کبھی جھکتا ہے کبھی قیام کرتا ہے، کبھی غلاموں کی طرح بیٹھتا ہے، حتی کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ پھر اسی اظہارِ بندگی کے دوران وہ گھنٹوں اس کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے، جو اسے زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتی ہیں۔ اس کی آیاتِ رحمت پر رحمت کا طلبگار رہتا ہے اور اس کی آیاتِ عذاب پر اس کے عذاب سے پناہ مانگتا ہے۔ شب وروز میں پانچ مرتبہ اسی عمل کو دہراتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے دل ودماغ میں اللہ کی کبریائی اس سے وفاداری، اپنی عاجزی اور اس کی بندگی کا تصور ایک مضبوط ایمان بن کر اس کے دل کی دھڑکن اور اس کے دل کی روشنی بن جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے اللہ کو حاضر وناظر جانتا ہے۔ کوئی سا کام بھی کرے اسے یقین ہوتا ہے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ کسی حال میں بھی ہو وہ جانتا ہے کہ میں اللہ کی نگاہوں میں ہوں۔ میں تنہا بے بس اور بے کس نہیں ہوں۔ جو ذات میرے دل میں مکیں ہے وہی میرے گردوپیش میں بھی ہے، میں اس کے حصار میں ہوں۔ دنیا کی کوئی قوت اس کے مقابلے میں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ جب تک مجھے زندہ رکھنا چاہے کوئی مجھے مار نہیں سکتا اور جب مارنا چاہے کوئی بچا نہیں سکتا۔ میری زندگی کا رویہ اس کی اطاعت اور اس کی بندگی ہے اور میری زندگی کا سب سے بڑا ہدف اس کے نام، اس کی حرمت اور اس کے دین پر اپنے آپ کو قربان کر دینا ہے۔ اس طرح نماز اسے اللہ کی بندگی کا پیکر بھی بناتی ہے اور ساتھ ہی اسے ایک ایسی توانائی اور قوت سے بھی بہرہ ور کرتی ہے جس کی موجودگی میں وہ نہ اس آستانے سے لاتعلق ہوتا ہے اور نہ کبھی کسی کمزوری کا شکار ہوتا ہے۔ حق وباطل کے معرکے میں وہ یکہ وتنہا بھی ہو تو وہ اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتا کیونکہ اس کا اللہ اس کے ساتھ ہے۔ اگر وہ زندہ رہے تو حق کا خادم بن کر زندہ رہتا ہے اور اگر اسے موت اپنی طرف بلائے تو وہ شہادت کا طلب گار بن کر سب سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

حق وباطل کے معرکے میں چونکہ یہی دو قوتیں اساسی رول ادا کرتی ہیں، اس لئے بطورِ خاص ان کا حکم دیا کہ مسلمانو! تم جن نازک حالات سے گزر رہے ہو اس میں ضروری ہے کہ صبر اور نماز سے مدد چاہو کیونکہ یہی دونوں چیزیں تمہیں حق کے ساتھ وابستہ بھی رکھیں گی اور باطل کے مقابلے میں تمہیں پامردی اور استقامت بھی دیں گی۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ''بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ بظاہر یہاں اللہ کی معیت کی بشارت صبر کرنے والوں کو دی گئی ہے، نماز کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ نے مندرجہ بالا

Marfat.com

گزارشات میں دیکھا کہ صبر نماز سے الگ کوئی چیز نہیں ہے اور نماز ہی دراصل صبر کی قوت بھی عطا کرتی ہے۔اس لئے صابرین میں یہ دونوں ہی شامل ہیں۔لیکن بعض اہلِ علم نے اسے اس طرح بھی سلجھایا ہے کہ نماز میں تو یقیناً اللہ کی معیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ نماز کے دوران جتنا آدمی اللہ کے قریب ہوتا ہے، اتنا کسی اور حالت میں نہیں ہوتا۔اسی لئے نماز کو ''معراج المومنین'' کہا گیا ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ نماز واقعی نماز ہو، محض بیگار ٹالنے کی کوشش نہ ہو۔مزید یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جس نماز کا یہاں ذکر کیا گیا ہے جو مشکلات ومسائل میں آدمی کے لئے سہارا بنتی ہے وہ صرف پنجوقتہ فرض نماز نہیں بلکہ اس میں تہجد اور تمام نفل نمازیں بھی شامل ہیں کیونکہ نفل نمازیں بالخصوص رات کی نمازیں جبکہ دیکھنے والا کوئی نہ ہو، ایک مومن میں حقیقی روح اور زندگی پیدا کرتی ہیں اور انہیں سے اللہ کے ساتھ وہ مضبوط تعلق پیدا ہوتا ہے، جو کسی سخت سے سخت آزمائش میں بھی شکست نہیں کھاتا اور انہیں سے مومن کے دل میں وہ محبت اور خشیت پیدا ہوتی ہے، جو اللہ کے ساتھ اس کا حقیقی تعلق پیدا کرتی ہے۔

اندازہ فرمایئے! جن خوش نصیبوں کو اللہ کی معیت کا وعدہ مل جائے ان کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے اور پھر حق وباطل کے معرکے میں ان کی کمزوری کا وہم بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کمزور تو وہ ہوتا ہے جو تنہا ہو یا جس کا ساتھ دینے والے کمزور ہوں۔جس کے ساتھ اللہ ہو اس کے یہاں کمزوری کا کیا سوال؟ وہ بظاہر کمزور دکھائی بھی دیتا ہو، لیکن حقیقت میں وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے کیونکہ اسے طاقتور کی معیت حاصل ہے لیکن اس کا حقیقی احساس اس وقت ہوتا ہے جب آدمی حق وباطل کی کشمکش میں شریک ہو اور اسے انتہائی ناموافق حالات سے گزرنا پڑ رہا ہو اور رہا وہ شخص جو نمازیں تو پڑھتا ہے لیکن باطل سے مقابلہ کا کبھی کوئی تصور اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا اس کیلئے نماز ایک تسکین کا باعث تو بن سکتی ہے قوت کا باعث نہیں بنتی۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ

بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ O (البقرۃ۔۱۵۴)

(اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے)

زندگی اور موت سے متعلق اسلامی تصور

حق وباطل کی کشمکش میں سب سے مشکل مرحلہ وہ ہوتا ہے جب حق کی خاطر جان دینی پڑے۔انسان کتنا بھی بہادر ہو وہ بہرحال زندگی سے پیار کرتا ہے۔وہ اپنے لئے اور دوسروں کیلئے زندہ رہنا چاہتا ہے۔زندگی اگر سب سے بڑی نعمت اور سرمایہ ہے تو اسے کھودینا کسی کو بھی گوارا نہیں ہوتا۔جب کوئی سننے والا یہ سنتا ہے کہ فلاں شخص اس راستے میں مارا گیا تو موت کے لفظ سے اسے وحشت ہوتی ہے اور وہ اس سے خوف زدہ ہو کر حق کے راستہ سے ہی کنارہ کشی کر لیتا ہے۔اس لئے اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ عزیمت اور استقامت کے راستے پر چلنے کیلئے ضروری ہے کہ زندگی اور موت سے متعلق اسلام کے دیئے ہوئے صحیح تصور کو ذہنوں میں متحضر رکھا جائے کیونکہ جب تک یہ تصور طبیعتوں میں راسخ نہیں ہوگا، عزیمت اور استقامت کے راستے پر چلنا آسان نہیں ہوگا۔اہلِ دنیا یہی سمجھتے ہیں کہ جو شخص مرا یا مارا گیا وہ ختم ہوگیا اور اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں۔لیکن اسلام اپنے ماننے والوں کو زندگی اور موت کا جو تصور دیتا ہے، وہ اس سے یکسر مختلف ہے۔وہ یہ کہتا ہے کہ یہ زندگی تو چند روزہ اور فانی زندگی ہے۔اصلی زندگی جو ابدی زندگی ہے، اس کا آغاز تو اس وقت سے ہوتا ہے جب یہ

Marfat.com

زندگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ابدی زندگی مرنے کے بعد عالمِ برزخ اور پھر عالمِ آخرت میں حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے جاتے ہیں، وہ شہادت کا مرتبہ پالیتے ہیں اور انہیں ایک ایسی زندگی نصیب ہوتی ہے جو اس دنیوی زندگی سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اور اس زندگی میں وہ اللہ کے یہاں رزق بھی دیئے جاتے ہیں۔ اس کی تفصیلات بہت ہیں لیکن ان میں جو بات کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہے اس کیلئے ہم بیان القرآن سے استفادہ کرتے ہیں۔

''ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے ''شہید'' کہتے ہیں اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے۔ لیکن اس کی موت کو دوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے اور اسی سے جزا اور سزا کا ادراک ہوتا ہے۔ لیکن شہید کو اس حیات اور مُردوں سے ایک گونہ امتیاز حاصل ہے اور وہ امتیاز یہ ہے کہ اس کی یہ حیات آثار میں اوروں سے قوی ہے، جیسے انگلیوں کے اگلے پورے اور ایڑی، اگرچہ دونوں میں حیات ہے اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں۔ لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار، احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں۔ اسی طرح شہداء میں آثار حیات عام مُردوں سے بہت زیادہ ہیں۔ حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلاف معمولی مردوں کے اس کے جسدِ ظاہری تک بھی پہنچا ہے کہ اس کا جسم باوجود مجموعۂ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا اور مثل جسم زندہ کے صحیح سالم رہتا ہے۔ جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیاء کہا گیا ہے اور ان کو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی۔ مگر احکامِ ظاہرہ میں وہ عام مردوں کی طرح ہیں، ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں اور یہی حیات ہے جس میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ سلامت جسم کے علاوہ اس حیاتِ برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں۔ مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، ان کی ازواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔

پس اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء پھر اور معمولی مردے۔ البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء اور صالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں۔ سو مجاہدۂ نفس میں مرنے کو بھی اگر معناً شہادت میں داخل سمجھیں تو اس طور پر وہ بھی شہداء ہو گئے یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام مُردوں کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہمرتبہ دوسرے لوگ صالحین وصدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو، جس پر مدار ہے قتل کے شہادت ہونے کا اور صرف قتل شہادت نہیں ہے اور اگر بالفرض ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے، جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرائطِ شہادت ہونا دلیل قطعی تواتر وغیرہ سے ثابت ہو (جس کا شبہ صاحب روح المعانی کو ہو گیا ہے) تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء و شہداء کے جسم کو زمین نہیں کھاتی یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کر سکتی۔ اجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہو جانا پھر بھی ممکن ہے کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام وانواع کی دھاتیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں۔ اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہو جائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

Marfat.com

چنانچہ دوسرے اجسامِ مرکبہ اسلحہ وادویہ واخلاط واجسامِ بسیطہ مثل آب وآتش وباد کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے اور شہداء کی حیات بعد الممات انبیاء کی حیات قبل الممات سے اقویٰ نہیں اور بعض حصۂ ارض میں بعض اجزا غیر ارضیہ بھی شامل ہوجاتے ہیں جس طرح دوسرے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہوجاتے ہیں سو اگر ان اجزائے غیر ارضیہ سے ان کے اجساد متاثر ہوجاویں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا، جن میں حرمتِ اجساد علے الارض وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہے کہ امتیاز اجسادِ شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دوسری اموات سے زیادہ مدت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں گو کسی وقت میں ہوجاویں اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جاوے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارقِ عادت ہے اور خرقِ عادت کی دونوں صورتیں ہیں حفظ مؤبّد اور حفظ طویل اور چونکہ عالمِ برزخ، حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مدرک نہیں ہوتا اس لئے لَا تَشْعُرُوْنَ فرمایا گیا کہ تم ان کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○ (البقرۃ:۱۵۵تا۱۵۷)

(بے شک ہم تمہیں آزمائیں گے کسی قدر خوف، بھوک، اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور ان ثابت قدموں کو خوشخبری سنا دیجئے ○ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کیلئے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ○ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں)

آئندہ پیش آنے والی مشکلات کی طرف اجمالی اشارہ

پہلی آیتِ کریمہ میں بظاہر ان آزمائشوں کی طرف اجمالی اشارہ ہے جو آئندہ مراحل میں پیش آنے والی ہیں۔ لیکن غور وفکر سے اگر اس آیت کو پڑھا جائے تو اس کے الفاظ میں بعض اور حقائق بھی مضمر ہیں۔ مثلاً پہلے لفظ ہی کو دیکھئے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ "ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے"۔ اس میں دو باتیں نہایت قابلِ توجہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس میں لام اور نون ثقیلہ تاکید در تاکید کیلئے لائے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جس طرح کی مشکلات کا ذکر کر رہے ہیں ان کا آنا بے حد یقینی ہے۔ وہ اس راہ کی لازمی سنتیں ہیں۔ جب بھی کوئی مردِ خدا یا کوئی قافلۂ حق اس راہ پر چلا ہے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اسے اس طرح کی مشکلات سے دوچار نہ ہونا پڑا ہو۔ جس طرح ایک کاشت کار کاشتکاری کے دوران موسم کی شدت سے دوچار ہوتا ہے اسے محنت کرتے ہوئے پسینہ بہانا پڑتا ہے۔ اس کے جسمانی اعصاب کا بار بار امتحان ہوتا ہے اور پھر وہ کبھی امید و یاس کے مراحل سے بھی گزرتا ہے، اگر کوئی کاشتکار یہ کہے کہ مجھے زمین میں محنت کرنے سے انکار نہیں لیکن میں ان مشکلات کو برداشت

Marfat.com

کرنے کیلئے تیار نہیں ۔تو اسے یہی جواب سننا پڑے گا کہ یہ مشکلات تو اس کام کے لوازم ہیں ۔ان کے بغیر کاشتکاری یا زمین سے فصل وصول کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔یہی حال اللہ کے دین کی سربلندی اور اسے مخلوقِ خدا تک پہنچانے کا بھی ہے۔جو شخص بھی انسانی اصلاح کیلئے کوشش کرے گا اس کیلئے یہ یقینی ہے کہ وہ انسانوں کی مخالفت سے دوچار ہو۔مخالفین کے جو بس میں ہوگا وہ کر گزریں گے ۔اسے اگر اپنے فرض سے بے پناہ تعلق ہے تو اسے ان تمام مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

اسی حقیقت کو ذہن نشین کرانے کیلئے پروردگار نے تاکیدی لب ولہجہ اختیار فرمایا۔

مومن کی آزمائش سنت اللہ ہے

دوسری یہ بات کہ اس لفظ میں متکلم کا صیغہ استعمال ہوا ہے کہ ہم تمہیں آزمائیں گے حالانکہ وہ مخالفتیں اور آزمائشیں دشمنوں کی جانب سے پیش آئیں گی لیکن پروردگار اسے اپنی طرف منسوب فرما رہے ہیں ۔اس میں درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مخالفت تو یقیناً دشمن ہی کریں گے لیکن یہ سب کچھ اللہ کے اس قانون کے تحت ہوگا جو ازل سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق اور اہلِ باطل میں امتیاز کیلئے مقرر کر رکھا ہے ۔اگر حق کی خاطر مصائب نہ برداشت کرنا پڑیں اور ایمان کی کوئی قیمت ادا نہ کرنی پڑے تو پھر پتہ کیسے چلے گا کہ مخلص کون ہے؟اور منافق کون؟ جب قدم قدم پر ایمان اور اخلاص کی آزمائش ہوتی ہے تو مخلص مومن ہر طرح کی تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں حتی کہ اس راستے میں انہیں سر کٹوانے سے بھی دریغ نہیں ہوتا۔وہ جانتے ہیں کہ اللہ سے تعلق کا دعویٰ اور اس کے دین سے وابستگی کا دعویٰ محبت اور عقیدت کا سب سے بڑا دعویٰ ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی شخص نے محبت کا دعویٰ کیا ہو اور اسے آزمایا نہ گیا ہو۔

محبت کے مقدر میں کہاں آرام اے ہمدم
کہیں شعلہ کہیں بجلی کہیں سیماب ہوتی ہے

اگر محبت آزمائشوں سے نہ گزرے تو ہر بوالہوس محبت کا دعویٰ لے کر کھڑا ہو جائے اور مخلص اور غیر مخلص اور سچے اور جھوٹے کی تمیز ختم ہو جائے ۔اس لئے اللہ نے یہ قانون ٹھہرا دیا کہ جو شخص بھی ہم سے تعلق کا دعویٰ کرے گا، ہم اس کی آزمائش کیلئے اسباب ضرور پیدا کریں گے ۔اسی قانون کے تحت مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں عنقریب ان مراحل سے گزرنا پڑے گا اور تم ان تمام آزمائشوں سے دوچار کیے جاؤ گے، جن کا برداشت کرنا دنیوی حالات کے اعتبار سے بالعموم مشکل ہوتا ہے۔البتہ اس نے کسی حد تک اطمینان دلانے کیلئے بشیء کا لفظ استعمال کیا۔جس کا معنی ہوتا ہے'کسی قدر یا کچھ'جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آزمائشیں تو تمہیں ضرور پیش آئیں گی،لیکن وہ اس قدر نہیں ہوں گی، جو تمہاری عزیمت واستقامت کیلئے شکست دینے والی ہوں ۔اس لئے دل شکستہ اور پست ہمت ہونے کی بجائے تمہیں ہمت سے کام لینا چاہئے کہ اگر تم نے ہمت نہ ہاری تو تم ان حالات پر ضرور قابو پالو گے۔

Marfat.com

خوف

جو مشکلات پیش آسکتی ہیں ان میں سب سے پہلے ''خوف'' کا ذکر فرمایا۔خوف سے مراد ہے دشمنوں کی طرف سے حملہ کا خوف۔جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قریش اور یہود دونوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر سوچنا شروع کر دیا تھا کہ کس طرح مسلمانوں کی قوت توڑی جائے اور کس طرح اس نوزائیدہ تحریک کو ختم کیا جاسکے۔اس کیلئے انہوں نے آپس میں حملہ کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔کعب بن اشرف نے باقاعدہ خط وکتابت کے ذریعے قریش مکہ کو اکسایا اور ہر ممکن طریقے سے اپنی حمائیت کا یقین دلایا اور کرز بن جابر فہری نے باقاعدہ سواروں کا ایک دستہ لے کر مدینہ منورہ کی اس چراگاہ پر شب خون مارا جس میں آنحضرت ﷺ کے جانور بھی چرتے تھے اور وہ کئی اونٹ ہانک کر لے گیا اور چرواہوں کو قتل کر دیا۔اسی طرح دوسرے قبائل کی طرف سے بھی ہر وقت اندیشہ رہتا تھا کہ مدینے پر کہیں حملہ نہ کر دیں۔خود آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی بھی ان خطرات کی زد میں تھی۔یہود کی جانب سے ہر وقت آپ پر حملے کا اندیشہ رہتا تھا۔پہرے کے بغیر آپ کے لئے رات کو سونا مشکل ہو گیا تھا۔دن کے وقت بھی آنحضرت ﷺ اگر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تو صحابہ بے چینی سے آپ کو تلاش کرنے لگتے اور پھر یہ اندیشے محض اندیشے نہ رہے ان کی آپس کی ملی بھگت سے جنگِ بدر وجود میں آئی اور وہیں سے لڑائیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک مسلمانوں نے اپنے تمام حریفوں کا زور توڑ نہیں دیا۔

معاشی مشکلات

دوسرا لفظ اس آیتِ کریمہ میں جو مشکلات کے حوالے سے آیا ہے وہ ہے ''جوع''۔اس کا معنی تو ''بھوک'' ہے۔لیکن مراد اس سے وہ معاشی مشکلات ہیں جو قریش اور یہود کی مشترکہ مخالفت کے باعث وجود میں آئیں۔اس وقت ملک کی بیشتر تجارت اور معاشی وسائل عملاً یہود اور قریش کے قبضے میں تھے۔یہ دونوں گروہ چونکہ مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے اس لئے دونوں نے مسلمانوں کیلئے ہر طرح کی مالی مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی۔مسلمانوں کو کاروبار سے بے دخل کیا، قبائل میں ان کے خلاف نفرت اور عداوت کے ایسے بیج بوئے کہ کسی قبیلے سے تعلق قائم کرنا آسان نہ رہا۔راستے پر خطر بنا دیئے گئے مسلمانوں کیلئے ہر طرح کا سفر خطرات سے کھیلنے سے کم نہیں تھا۔پھر مدینہ جیسی چھوٹی سی بستی پر ہر طرف سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کا معاشی بوجھ بھی معاشی مشکلات پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔انہیں معاشی مشکلات کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو پیٹ پر پتھر باندھنا پڑتے تھے اور اکثر فاقوں کی نوبت آتی تھی۔لیکن صحابہ کے ایمان اور ایثار کی انتہا ہے کہ انہوں نے ان مشکلات کو اپنے ایمان کی آزمائش سمجھ کر نہائیت حوصلے سے برداشت کیا۔

مال اور جان کی کمی

اس کے بعد '' اموال اور انفس'' میں کمی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ جب دشمنوں کی طرف سے آئے دن مسلمانوں کو جنگ وجہاد میں جانے پر مجبور کیا جائے گا تو یہ دونوں چیزیں اس راستے میں کام آئیں گی۔سر بھی کٹیں گے اور اسلحۂ جنگ پر مال بھی خرچ ہو گا اور جہادی مصروفیات کے باعث مسلمان اپنے کاروبار اور کھیتی باڑی پر زیادہ توجہ نہیں دے سکیں گے۔تو مالی مشکلات میں اور زیادہ اضافہ ہو گا۔انہیں مشکلات کا نتیجہ تھا کہ جنگوں میں مسلمانوں کے پاس نہ مناسب اسلحہ ہوتا تھا نہ رسد اور کمک کی آسانیاں ہوتی تھیں۔بعض دفعہ مسلمان سپاہی مناسب لباس تک سے محروم ہوتے تھے۔لیکن مسلمانوں کی حوصلہ مندی اللہ پر بے پناہ ایمان اور جرأت اور استقامت نے ان تمام مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

Marfat.com

ثمرات میں کمی

اس کے بعد ''ثـمـرات'' کا ذکر فرمایا ہے حالانکہ ثمرات کا شمار اموال ہی میں ہوتا ہے الگ سے اس کا ذکر معلوم ہوتا ہے عرب کے شیوۂ مخاطبت کے مطابق ہے۔ عربوں میں عام طور پر مال کا لفظ اونٹ، بھیڑ بکریوں اور درہم و دینار پر بولا جاتا تھا۔ ثمرات کا لفظ عام طور پر پھلوں اور کھجوروں کیلئے مستعمل تھا۔ مدینہ منورہ میں خوراک کا زیادہ تر دارومدار کھجور ہی پر تھا۔ جنگی حالات چونکہ وقت کے پابند نہیں ہوتے کسی وقت بھی ایسا ہوسکتا ہے کہ کھجور پکی ہوئی ہو اور جنگ کیلئے نکلنا ناگزیر ہو جائے۔ ایسی صورتحال میں باقی اموال کی کمی کے ساتھ ساتھ اس طرح کا کوئی حادثہ بڑی مشکل کا باعث بن سکتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ پروردگار نے تمام ممکن خطرات کو مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیا اور انہیں یہ بتا دیا کہ تم نے اسلام قبول کر کے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا ہے اور مستقل امت بن کر پورے عرب کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ اب معاملہ صرف قریش سے نہیں بلکہ قریش اور یہود و نصاریٰ ایک متحدہ محاذ کی شکل میں تمہارے لئے مشکلات پیدا کریں گے۔ لیکن تمہیں اس بات کا یقین رکھنا چاہئے کہ اگر تم نے اسلام میں آنے کا اقدام سوچ سمجھ کر کیا ہے اور تم اپنے ایمان میں مخلص اور راست باز ہو تو پھر یہ آزمائشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ البتہ تمہیں ان کے مقابلے میں صبر کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا اور صبر کرنے والوں کی پہچان یہ ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ بجائے پریشان ہونے کے فوراً پکار اٹھتے ہیں:

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

اس مختصر سے جملے میں اس عقیدے کا بیان ہے جس کی چٹان پر مومن کی پوری زندگی صبر و استقامت کی تصویر بن کر ایستادہ رہتی ہے۔ دنیا انہیں تکلیفوں سے مضمحل کرنے یا ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ پہلے ہی اپنی نفی کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم تو محض اللہ کے بندے ہیں ہر لحاظ سے اس کی ''ملک'' ہمارا اپنا کچھ بھی نہیں۔ نہ بیوی نہ بچے نہ مال نہ جائداد، نہ وطن نہ خاندان، نہ جسم نہ جان۔

جو کچھ ہے سب خدا کا، وہم و گماں ہمارا

انسان کے سارے رنج وغم اور درد و حسرت کی بنیاد صرف اسقدر ہوتی ہے کہ وہ اپنی محبوب چیزوں کو اپنا سمجھتا ہے۔ لیکن جب ذہن اس عام مغالطہ سے خالی ہو گیا تو اب گلہ اور شکوہ کیسا؟ اور رنج و ملال کیوں؟ جب آدمی کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ میرا سب کچھ اللہ کا ہے اور میرے پاس اس کی امانت ہے تو پھر اللہ کے راستے میں دے دینے اور قربان کر دینے میں اسے تأمل نہیں ہوتا بلکہ وہ حقِ امانت کی ادائیگی کیلئے پریشان رہتا ہے کہ نہ جانے میں اس امانت کا حق ادا کر سکوں گا یا نہیں اور جب اسے نظر آتا ہے کہ امانت مانگی جارہی ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ مجھے موقعہ مل رہا ہے کہ میں امانت ادا کر کے سرخرو ہو جاؤں۔ بندے کا مال، اولاد، اثر ورسوخ حتیٰ کہ جان بھی اللہ کی امانت ہے۔ ان میں سے جسے بھی اللہ کے راستے میں دینے کا موقعہ آجائے مومن اسے دیتا ہوا کبھی نہیں گھبراتا بلکہ وہ بڑے سے بڑے خطرہ دیکھ کر بھی پکار اٹھتا ہے کہ میں تو اللہ ہی کا ہوں میرا سب کچھ اللہ کا ہے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے بلکہ فکر کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ دے کر بھی شاید سرخرو نہ ہو سکوں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

Marfat.com

صحابہ کی مثالوں سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔جنگِ خندق میں صحابہ نے جب دیکھا کہ سارا عرب ان کے مخالف اُمڈ آیا ہے اور آندھی کی طرح مدینہ کے افق پر چھا گیا ہے۔ بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے گھبرانے کی بجائے یہ کہا: ھـذا مـاوعـدنـاالله ورسوله وصدق الله ورسوله ومازادهم الا ايمانا وتسليما ''یہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں یہ تو وہی چیز ہے جس کا ہم سے ہمارے اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا (یہ مصائب تم پر آئیں گے تمہاری آزمائشیں ہوں گی دیکھنا صبر کا دامن نہ چھوڑنا)''۔اس صورتحال نے ان کے ایمان وتسلیم میں اور اضافہ کردیا۔

صحابہ نے اسکندریہ کا محاصرہ کررکھا تھا۔مقوقسِ مصر نے ایک دن مسلمانوں کے وفد سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ایک طرف رومی فوجیں ہماری مدد کیلئے پہنچا ہی چاہتی ہیں۔دوسری طرف دریائے نیل نے تمہارا راستہ روک رکھا ہے اور تمہارے سامنے ہم ہیں۔اس طرح تم تین طرف سے گھر گئے ہو،صرف تمہارے پاس ایک راستہ کھلا ہے جس سے تم پسپا ہوسکتے ہو۔میں تمہیں پسپائی کا موقعہ دینا چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ تمہارے افسروں اور تمہارے ہر سپاہی کو زرِ نقد بھی دیا جائے گا۔اگر تم میری پیش کش قبول کرلو تو بچ جاؤ گے۔ورنہ چند روز کے بعد تمہاری لاشیں دفن کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔مسلمان اس کی باتیں سن کر ہنسے اور کہنے لگے کہ موت سے تم ڈرتے ہو ہم نہیں۔ہم تو شہادت کو اللہ کا انعام سمجھتے ہیں۔اور یہ کندھوں پر سر اسی کی امانت سمجھ کر اٹھائے پھرتے ہیں تم نے تو ہمارے لئے منزل قریب کردی۔یہ ہمارے لئے خوشی کا موقعہ ہے پریشانی کا نہیں۔

۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی کے جرم میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا،ان میں حضرت یحییٰ تھانیسری بھی تھے۔انہیں اور ان کے ساتھیوں کو سزائے موت سنائی گئی۔چند دنوں کے بعد جب ان کی صحت کی رپورٹ مانگی گئی تو انگریز یہ جان کر حیران رہ گیا کہ موت کی سزا سننے کے بعد ان کی صحتیں پہلے سے اچھی ہوگئی ہیں اور ان کے چہروں سے خوشیوں کی بہاریں پھوٹ رہی ہیں۔اس نے تحقیق کا حکم دیا کہ معلوم کرو کہ ان کی خوشی کا سبب کیا ہے؟ تو قیدیوں نے انہیں بتایا کہ ہم اور ہمارا سب کچھ اللہ ہی کی ملک ہے۔ہم اسی کے لئے جیتے اور اسی کیلئے مرتے ہیں اور ہمیں ایک دن اللہ ہی کے روبرو حاضر ہونا ہے۔ہمارے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی کا موقعہ ہوگا کہ جس کی رضا کیلئے ہم زندگی کا بوجھ اٹھائے پھرتے تھے آج اسی کی رضا کیلئے اسے اتارنے کا موقعہ آگیا ہے۔چنانچہ جیسے جیسے وہ وقت قریب آتا جارہا ہے ویسے ویسے ہماری خوشیوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔یہ پھانسی کی تکلیف تو چند لمحوں کی تکلیف ہے لیکن جب ہم اللہ کے حضور سرخرو ہوکر پہنچیں گے تو وہاں سارے قرضے بیباک ہوجائیں گے۔ہر کھوئی ہوئی نعمت وصول ہوجائے گی۔اجروثواب کی صورت میں وہ نعمتیں ملیں گی جس کا آج ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔اندازہ کیجئے! یہ مختصر سا جملہ اور کلمہ صبر کرنے والوں کی کتنی بڑی ڈھال ہے،جس پر وہ مصیبت کے ہر وار کو روکتے ہیں۔لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ یہ کہہ کر آسانی سے اپنے آپ کو دشمن کے سپرد کردیتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں تم اللہ کے راستے میں ہمیں مارنا چاہتے ہو تو ہم حاضر ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے خطرے اور بڑی سے بڑی مصیبت کے سامنے یہ کہتے ہوئے تن کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور پھر کسی بھی خطرے سے ٹکراتے ہوئے یہی قول ان کیلئے قوت کا سامان بن جاتا ہے کہ ہم تو ہیں ہی اللہ کے،ہمارے پاس جو کچھ ہے اللہ کی رضا کیلئے نچھاور کردیں گے۔ہمیں اس پر کوئی گھبراہٹ نہیں کہ ہماری جان چلی جائے گی۔ہم جان سے بے گانہ ہوکر دشمن سے اور پہاڑوں سے ٹکرائیں گے۔سمندروں میں کود جائیں گے،ہم موت کا تعاقب کریں گے وہ ہم سے پیچھا چھڑائے گی۔تیسری آیت میں فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی عنایات ہوتی ہیں اور رحمتیں برستی ہیں۔وہ ہماری خاطر پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں تو ہم ان کیلئے قوت کا سامان بن جاتے ہیں اور

Marfat.com

یہی لوگ ہیں جو درحقیقت ہدایت کا راستہ پا رہے ہیں۔ انہوں نے اس راز کو پالیا ہے کہ زندگی ہماری منزل نہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کی رضا کا حصول ہماری منزل ہے اور یہ وہ منزل ہے جس میں اگر زندگی اور ہمارا سب کچھ کام آجائے تو ہم نے ہدایت کا راستہ پالیا اور یہی راستہ انہیں آخرت تک لے جائے گا جہاں وہ اپنے انہیں کارناموں کے باعث اللہ کی جنت کے مستحق ٹھہریں گے۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ O (البقرۃ:۱۵۸)

(بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں تو جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ ان دونوں کا طواف کرے اور جس نے کوئی نیکی خوشدلی کے ساتھ کی تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے)

اصل سلسلۂ کلام کی طرف رجوع

گزشتہ چند آیات سے پہلے سلسلۂ کلام یہ جاری تھا کہ مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تاریخ کے آئینہ میں یہ بتایا جا رہا تھا کہ تم اس نبی آخرالزماں کی امت ہو جس نبی کی بعثت کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعائیں مانگی تھیں اور تم وہ امت ہو جسے اللہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حوالے سے مانگا تھا کہ یہ امت ساری دنیا کی امامِ ہدایت بنائی جائے گی۔ اور تمہارے واسطے سے دنیا کو پیغام پہنچے گا جسے نبی آخرالزماں لیکر آئینگے اور تمہیں اس قبلہ کا وارث، متولی، اور پاسبان بنایا گیا ہے جسے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے تعمیر کیا تھا اور جس قبلہ کو آخری انقلاب کا مرکز بننا تھا اور یہ بھی بتایا گیا کہ یہی وہ قبلہ ہے جس کے چاروں طرف اللہ کی بندگی اور اس کیلئے سرفروشی کی داستانیں رقم ہیں اور جن کے پہاڑوں کے دامن میں قربانی اور ایثار کے نقوش اب تک روشن ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی دنیا کی امامت کے منصب سے معزولی اور اس امت کی اس منصب پر تقرری کے اعلان کے بعد بیت اللہ کو اس امت کا مستقل قبلہ اور مرکزِ ہدایت بنانے کا جب حکم دیا گیا تو اس کے نتیجے میں مخالفت وعناد کا جو طوفان اٹھنے والا تھا۔ اس سلسلۂ بیان کو روک کر اس سے آگاہ کرنا اور اس کے مقابلے کیلئے مناسب ہدایات دینا ضروری سمجھا گیا چنانچہ تحویلِ قبلہ کے حکم کے بعد یہ ہدایات دی گئیں اور ان مصائب کا مقابلہ کرنے والوں کو بشارتیں سنائی گئیں اور بالواسطہ انہیں کامیابیوں کی نوید دی گئی۔ اس آیتِ کریمہ سے دوبارہ پھر اس سلسلۂ کلام کو بحال کیا جا رہا ہے کیونکہ جس طرح اللہ کا گھر اس کے شعائر میں سے سب سے بڑا شعیرہ ہے اسی طرح اس کے اور بھی شعائر ہیں۔ جن کا تاریخی اور دعوتی تعلق جس طرح اللہ کے دین اور اللہ کی ذات کے ساتھ ہے اسی طرح اس گھر کے ساتھ بھی ہے۔

صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں

صفا اور مروہ انہیں شعائر میں بے حد اہمیت رکھنے والے شعائر ہیں۔ کسی زمانہ میں مسجدِ حرام کے پاس یہ دو عظیم دو پہاڑیاں تھیں، لیکن اب معمولی بلندی کے ساتھ محض چٹان سی ہو کر رہ گئی ہیں۔ صفا حرم شریف کی داہنی جانب ہے اور مروہ بائیں جانب دونوں کے درمیان فاصلہ چار سو ترانوے (۴۹۳) قدم یا تقریباً سات فرلانگ ہے۔ اس لئے تحویلِ قبلہ کا حکم دینے کے بعد ان کا ذکر کرنا ضروری سمجھا

Marfat.com

گیا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح بیت اللہ مسلمانوں کیلئے حج اور عمرہ کا حکم دے کر مرکز بنادیا گیا اور ہر سال مسلمانوں کیلئے حج کیلئے جانا اور کبھی کبھی عمرہ کیلئے جانا ضروری قرار دیا گیا تو صفا اور مروہ کے درمیان سعی چونکہ مناسکِ حج وعمرہ میں سے اہم منسک ہے۔ اس لئے قبلہ کے احکام کے ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ضروری تھا کہ صفا اور مروہ کا بھی ذکر کیا جاتا اور ان کی اصل حیثیت بحال کی جاتی کیونکہ مشرکین عرب نے جس طرح بیت اللہ کو جسے اللہ نے ساری دنیا کیلئے توحید کا مرکز بنایا تھا بت خانہ بنادیا اور عرب بھر کے قبائل کے پسندیدہ بت لاکر وہاں رکھ دیئے تاکہ عرب قبائل میں سے کسی کو بھی بیت اللہ کی مرکزیت میں شبہ نہ رہے۔ لیکن اس حرکت کے ساتھ بیت اللہ کو بجائے توحید کا مرکز بنانے کے شرک اور بت پرستی کا تیرتھ بنادیا گیا۔ اسی طرح صفا اور مروہ بھی جو تسلیم ورضا کی تاریخ کا مرکز اور عبودیت اور سرفروشی کے نقوش سے زندہ ہے وہاں بھی اساف اور نائلہ کے دو بت لاکر صفا اور مروہ پر رکھ دیئے گئے اور ان کی پوجا شروع کردی گئی یعنی جن دو پہاڑیوں نے حضرتِ ہاجرہ کی بے تابانہ بھاگ دوڑ اور بوڑھے باپ اور نوعمر بیٹے کی سرفروشی دیکھی وہی اب بت پرستی کے مناظر بھی دیکھ رہی تھیں اور اس طرح سے ان پہاڑوں کی تاریخ کو یکسر بگاڑ کر توحید کو بگاڑنے کی مکروہ کوشش کی جارہی تھی۔ چنانچہ ضروری تھا کہ جس طرح بیت اللہ کو حضرت ابراہیم کی تاریخ کے آئینہ میں توحید کا مرکز دکھایا گیا ہے اور مسلمانوں کو اس کی اصل حیثیت کی بحالی کا کام سونپا گیا ہے اسی طرح صفا اور مروہ کو بھی اصل حیثیت میں نمایاں کیا جاتا۔ اسی لئے تحویلِ قبلہ کے ذکر کے سلسلے میں، درمیان کے چند جملہ ہائے معترضہ کے بعد صفا اور مروہ کو شعائر اللہ کے طور پر ذکر کیا جارہا ہے تاکہ ان کے اصل مقام کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

شعائر اللہ کا تعارف

شعائر، شعیرہ کی جمع ہے۔ جس کے معنی علامت یا کسی ایسی چیز کے ہوتے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اس کا مظہر اور اس کا نشان ہو۔ چنانچہ ہمارے دین میں جن چیزوں کو شعائر اللہ کہا گیا ہے اگر آپ ان کی حیثیت، حقیقت اور تاریخ پر غور کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ واقعی اللہ کی یاد دلانے والی، اللہ کا شوق پیدا کرنے والی، اس کے دین کی طرف مائل کرنے والی اور اس کے راستے میں سرفروشی کا جذبہ پیدا کرنے والی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں ہیں کیونکہ مقصود بالذات تو وہ حقائق ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ لیکن ان چیزوں کو شعائر کی حیثیت چونکہ اللہ کی طرف سے عطا ہوئی ہے اس لئے ان کو ایک احترام اور تقدیس کا درجہ مل گیا ہے اور مسلمانوں کیلئے ان کا احترام کرنا ضروری ہے۔

"بیت اللہ" اللہ کے شعائر میں سے شائد سب سے بڑا شعیرہ ہے۔ مقصود اس کی عبادت کرنا نہیں بلکہ عبادت تو اللہ کی جاتی ہے، لیکن چونکہ یہ گھر اللہ کے ساتھ نسبتِ خاص رکھنے اور مرکزِ عبادت ہونے کی وجہ سے ایک خاص حیثیت کا مالک ہے۔ اس لئے اس کی تقدیس اور اس کا احترام مسلمانوں کے ایمان کا حصہ بن گیا ہے۔ ہم جب بھی اسے دیکھتے ہیں تو جہاں اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں وہیں اس کے احترام اور اس کی مرکزیت میں اضافے کیلئے اللہ ہی سے دعائیں مانگتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک مکان ہے، نہایت سادہ، نہایت پروقار، لیکن اس ایک کوٹھے نے دنیائے اسلام کو ایک جہت، ایک مرکزیت، ایک منزل اور ایک شعور میں پرو رکھا ہے۔ ہر سال لاکھوں لوگوں کے دل اس کی وجہ سے اللہ کی محبت سے سرشار ہوتے اور اپنی ذات کی معرفت سے آشنا ہوتے ہیں۔ دنیا کو مختلف طبقوں اور مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی اس امت کو ایک جگہ اور ایک رنگ میں دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہی اس گھر کا وہ حقیقی کردار ہے، جس نے اسے اللہ کے شعائر میں ایک اہم حیثیت کا حامل بنادیا ہے۔

Marfat.com

''حجرِ اسود'' بھی ایک شعیرہ ہے، جو بیت اللہ کے ایک کونے میں پیوست ہے۔ اسے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہاتھوں سے نصب کیا تھا۔ حدیث میں اسے اللہ کا دایاں ہاتھ قرار دیا گیا ہے۔ بندہ جب اسے ہاتھ لگاتا ہے تو وہ گویا اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے میثاقِ اطاعت کی تجدید کرتا ہے اور اپنے اس تعلق کو از سرِ نو استوار کرتا ہے اور جب اسے بوسہ دیتا ہے تو وہ اس طرح سے اللہ سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ جذبۂ اطاعت و بندگی اور عقیدت و محبت جو اس پاکیزہ پتھر سے شعاؤں کی طرح پھوٹتی ہے، اسی نے اس کو اللہ کا شعیرہ بنا دیا ہے۔

جمرات

حجاجِ کرام دس تاریخ کو پتھر کے جن تین ستونوں کو باری باری کنکر مارتے ہیں ان کو ''جمرات'' کہا جاتا ہے۔ یہ بھی شعائر اللہ میں سے ہیں کیونکہ ایک حاجی جب ان پر پتھر برساتا ہے، تو وہ درحقیقت ان پر نہیں برساتا بلکہ اللہ، بیت اللہ اور اسلام کے دشمنوں پر برساتا ہے اور ان کے خلاف مقدور بھر اعلانِ جہاد کرتا ہے اور اپنے عمل سے یہ تاثر دیتا ہے کہ میں جب اپنے ملک واپس جاؤں گا، تو میں اسی جذبے کے تحت ہر لادینی قوت سے لڑوں گا۔

اسی طرح ''صفا اور مروہ'' بھی اللہ کے شعائر میں سے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کی سرفروشی کی تاریخ ایک ہی ذات سے شروع ہوتی ہے اور اسی ذات سے معراج کو پہنچتی ہے۔ لیکن اس ذات کا سررشتہ کبھی ماں کے ہاتھ میں ہے کبھی باپ کے ہاتھ میں تاکہ یہ معلوم ہو کہ اِن دونوں شعائر سے ہمیں سرفروشی اور بندگی کا جو درس ملتا ہے وہ مرد اور عورت دونوں سے مل کر مکمل ہوتا ہے اور وہ دونوں اگر ایک ہی جہت اور ایک ہی تسلسل سے اپنا فرض انجام دیتے ہیں تو اس کے نتیجے میں سرفروشی کا عمل مکمل ہوتا ہے۔ میری مراد اس سے یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے نوزائیدہ بچے اسمٰعیل اور ان کی والدہ حضرتِ ہاجرہ کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں اللہ کے سہارے چھوڑ آئے تو حضرت ہاجرہ نے بیٹے کو ریت پر لٹا کر ان دو پہاڑیوں پر چڑھ کر اور پھر ان دونوں کے درمیان بھاگ کر یہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی کہ شائد ہمیں کوئی گزرتا ہوا قافلہ نظر آجائے یا کسی چشمے کا سراغ مل جائے اور اس طرح سے اس بے آب و گیاہ وادی میں ماں بیٹے کی زندگی گزرنے کی سہولت پیدا ہو جائے۔ اللہ نے ماں کی اس دوڑ بھاگ کو قبول فرمایا اور بیٹے کے ایڑیاں رگڑنے کی جگہ سے وہ چشمہ جاری فرمایا جو چار ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا، لیکن آج بھی پہلے دن کی طرح پانی سے بھرپور ہے۔ پھر ایک وقت آیا جب یہ بچہ دوڑنے بھاگنے کے قابل ہوا، تو باپ نے اللہ کے حکم سے اسی مروہ کے پاس اسے ذبح کرنے کی کوشش فرمائی۔ لیکن اللہ نے ہاتھ روکنے کا حکم دیا اور اِس قربانی کو اُس قربانی کی صورت دے دی جو آج ہم سال بہ سال عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر اللہ کے حضور جانوروں کی کرتے ہیں۔ اندازہ فرمایئے! یہی وہ پہاڑیاں ہیں جن سے امت مسلمہ کی خواتین ہاجرہ کی سعی و کاوش کا منظر دیکھتی ہیں اور اپنے سینوں کو بندگی اور عبودیت کے جذبوں سے سیراب کرتی ہیں اور یہی وہ پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان بوڑھا باپ نوعمر بچے کو ساتھ لئے مقتل کی طرف بڑھ رہا ہے اور وہ کارنامہ انجام دینے کی فکر میں ہے جس کی مثال انسانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی اور آج ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرتا ہوا ہر باپ اپنے دل و دماغ میں ایسے ہی جذبوں کو محسوس کرتا ہے جس میں بچوں کی قربانی کے نتیجے میں اسلام کی فصل لہلہاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

پسرِ خلیل کی سیکھ ادا جو ہے زندہ رہنے کی آرزو
کہ چھری رکے تو رکے مگر نہ سرکنے پائے ترا گلا

Marfat.com

شعائر کے سلسلے میں چند یادرکھنے کی باتیں

ان شعائر کے سلسلے میں چند باتیں ضرور ذہن نشین رہنی چاہئیں:

۱۔ شعائر اللہ، اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ اللہ اور رسول کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی طرف سے کسی چیز کو شعائر اللہ میں شامل کرے۔ نہ کسی چیز کو شعائر اللہ میں شامل کیا جاسکتا ہے نہ خارج کیا جاسکتا ہے۔ ادب واحترام اپنی جگہ لیکن وہ مقام ومرتبہ جو اللہ نے شعائر اللہ کو عطا کیا ہے وہ کسی کے عطا کرنے سے کسی کو نہیں مل سکتا۔ جو ایسا کرے گا وہ ایک بہت بڑی گمراہی کیلئے راستہ کھولے گا اور اللہ کے سامنے اسے جوابدہی کرنا پڑے گی۔

۲۔ جس طرح شعائر اللہ کا تقرر اللہ اور رسول کا اختیار ہے اسی طرح ان کے ادب واحترام کی حدود بھی اللہ اور رسول ہی کی مقرر کی ہوئی ہیں چنانچہ جس شعیرہ کا احترام اور اس کی تعظیم کی جو شکل اللہ اور اس کے رسول نے مقرر کردی ہے، ہم اس سے سرِ مو انحراف نہیں کرسکتے۔ مثلاً حجرِ اسود ایک شعیرہ ہے۔ ہمیں اس کیلئے حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس کی تعظیم کیلئے، طواف کرتے ہوئے اس کو بوسہ دیں، اسے ہاتھ لگا کر چومیں یا دور سے اس کی طرف اشارہ کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی طرف سے تعظیم کے ان طریقوں میں اضافہ کرتا ہے، مثلاً وہ حجرِ اسود کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہے، اس کو سجدہ کرتا ہے، اس کے سامنے نذریں پیش کرتا ہے، یا اس پر پھول چڑھانے لگتا ہے یا اس طرح کی کوئی اور حرکت کرتا ہے تو وہ اس طرح کی حرکتوں سے نہ صرف کہ حجرِ اسود کی تعظیم کا حق ادا نہیں کرسکے گا بلکہ وہ اللہ کے سامنے ان گمراہیوں کے لئے جوابدہ ہوگا۔ حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شائد اسی حکمت کے تحت اپنے دورِ خلافت میں حجرِ اسود کے سامنے کھڑے ہوکر فرمایا: ''اے حجرِ اسود! تو صرف ایک سیاہ پتھر ہے تو مجھے نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر تجھے اللہ کے رسول نے نہ چوما ہوتا تو میں تجھے کبھی نہ چومتا''۔

۳۔ شعائر اللہ کی تعظیم اور احترام کے ساتھ ساتھ جو اصل چیز پیشِ نظر رہنی چاہئے وہ یہ ہے کہ یہ شعائر تو علامتیں ہیں کسی خاص حقیقت کی اور ان حقائق کیلئے ان کی حیثیت صرف قالب کی ہے۔ اس لئے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ ان کا احترام بجالاتے ہوئے اصل حقائق کو دل ودماغ میں بسانے اور راسخ کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ اس میں اگر تساہل برتا جائے تو دین ایک مجموعۂ رسوم بن کر رہ جائے گا اور دین کی اصل روح زندگیوں سے نکل جائے گی، یہی حادثہ بنی اسرائیل پر گزرا اور وہ تباہ ہوگئے۔ امتِ مسلمہ کو اس بارے میں نہایت بیدار مغز رہنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ ہم اس تباہی کی طرف بہت سارا سفر کرچکے ہیں۔ صفا اور مروہ موجود ہیں ان کے درمیان سعی بھی ہورہی ہے، لیکن اس سعی میں وہ جذبات پیدا نہیں ہورہے جو اس سعی کا اصل حاصل ہیں۔ جمرات پر کنکر مارے جارہے ہیں، لیکن اللہ اس کے رسول اور دین کے دشمنوں سے ہمارے نیاز مندانہ تعلقات میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ جذبۂ جہاد ایک گالی بن کر رہ گیا ہے۔ ہماری روشن خیالی، ہماری اصل روح کو کچلتی جارہی ہے۔ اس لئے ان شعائر اللہ کا ذکر پڑھتے ہوئے ہمیں اپنے اندر جھانک کر اپنے آپ کو اور امت کو پڑھنا بہت ضروری ہے:

کتابوں کا لکھا تو عمر بھر پڑھتے رہے تشنہ
کبھی وہ بھی پڑھا ہوتا جو دیواروں پہ لکھا ہے

Marfat.com

صفااور مروہ کو شعائر اللہ میں سے قرار دینے کے بعد فرمایا: فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا اس جملے کا اسلوب صفا اور مروہ کو شعائر اللہ میں قرار دینے سے یکسر اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ جن دو پہاڑیوں کو شعائر اللہ قرار دیا جا چکا ہے ان کے بارے میں تو یہ کہنا چاہئے کہ ان کا طواف کرنا یعنی ان کے درمیان سعی کرنا از بس ضروری ہے۔ چہ جائیکہ یہ کہا جائے کہ جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرنا چاہے اس کیلئے کوئی ہرج نہیں کہ وہ ان دونوں کے درمیان سعی کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سعی کرنے کی اجازت دی جارہی ہے، حکم نہیں دیا جارہا۔ حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان سعی کرنا حج اور عمرہ کے دوران احناف کے نزدیک واجب ہے اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک سنت بھی ہے اور فرض بھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں جو فَلَا جُنَاحَ کہا گیا ہے، اس کا تعلق سعی کے حکم سے نہیں بلکہ سعی کی جگہ سے ہے۔ پیچھے میں عرض کر چکا ہوں کہ مشرکینِ مکہ نے دونوں پہاڑیوں پر دو بت نصب کر رکھے تھے اور ان کی وہ پوجا کرتے تھے۔ مسلمان ان بتوں کی وجہ سے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے میں کراہت محسوس کررہے تھے۔ چنانچہ ان مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ اگرچہ صفا اور مروہ کے درمیان یہ قباحت موجود ہے لیکن ان دونوں کے درمیان سعی وہ تو مناسکِ حج میں سے ہے وہ کسی وقتی رکاوٹ کی وجہ سے چھوڑی نہیں جاسکتی تم ان دو بتوں کی طرف نہ دیکھو بلکہ اللہ کے احکام کی طرف دیکھو اور خوش دلی سے ان کی تعمیل کرو۔ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا سے اسی بات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ اللہ کے یہاں وہ اطاعت قابلِ قبول ہوتی ہے جو خوشدلی سے کی جاتی ہے تم ان بتوں کو بالکل نظر انداز کرکے نہایت خوشدلی اور مکمل جذبۂ اطاعت کے ساتھ سعی کا عمل بجالاؤ تم دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اس عمل کی قدر فرمائیں گے۔

یہاں حج اور عمرہ کا ذکر آیا ہے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کی تھوڑی سی وضاحت کردوں۔

حج: عبادتِ اسلامی کا چوتھا رکن ہے یعنی نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے بعد چوتھا فریضہ ہے۔ امت کے ہر فرد پر خواہ وہ دنیا کے کسی علاقے کا باشندہ ہو اگر مصارفِ سفر کی استطاعت ہو، صحت بھی سفر کی متحمل ہو اور راستہ بھی پرامن ہو، تو پھر زندگی میں ایک بار فرض ہے۔ گویا دنیائے اسلام کی یہ بین الاقوامی سالانہ کانفرنس ہے۔ اس کے ارکان تین ہیں۔ (۱) پوششِ احرام، یعنی حدودِ حرم میں داخلہ سے پہلے عام لباس اتار کر احرام یعنی بے سلا ہوا لباس پہن لینا۔ (۲) میدانِ عرفات میں نو ذوالحجہ کو حاضری، اصطلاح میں اسے وقوف کہتے ہیں۔ (۳) طوافِ زیارت، یعنی وقوف کے بعد خانہ کعبہ کا طواف، اور واجباتِ حج چار ہیں۔ (۱) ۹ اور ۱۰ ذوالحجہ کی درمیانی رات میں مزدلفہ میں قیام۔ (۲) صفا اور مروہ کے درمیان سعی۔ (۳) مزدلفہ میں قیام کے بعد دس تاریخ کو منیٰ میں کنکریاں پھینکنا، جسے رمی جمرات کہا جاتا ہے۔ (۴) طوافِ کعبہ، یہ طوافِ فرض کے علاوہ ہے۔ اسے طوافِ صدر کہا جاتا ہے۔ قربانی کرنا، سر کے بال اتروانا وغیرہا، بہت سے سنن اور مستحبات ان کے علاوہ ہیں۔

عمرہ: اس کا دوسرا نام حجِ اصغر ہے۔ اس میں حج کی طرح مہینہ اور تاریخ کی قید نہیں۔ سال کے کسی مہینہ اور کسی دن میں بھی ہوسکتا ہے۔ نہ اس میں وقوفِ عرفات ہے اور نہ قیامِ مزدلفہ اور منیٰ۔ عمرہ کی نیت سے احرام حدودِ حرم یعنی میقات سے باہر باندھا جاتا ہے، طوافِ کعبہ اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرکے بال اتروائے جاتے ہیں اور آخر میں مقامِ ابراہیم کے پاس دو نفل پڑھے جاتے ہیں، درمیان میں آبِ زمزم پینا بھی مستحب ہے۔ بس انہیں چند افعال سے عمرہ مکمل ہوجاتا ہے اور احرام کھول دیئے جاتے ہیں۔

Marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ بَعْدِ مَابَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ O (البقرۃ: ۱۵۹)

(جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآں حالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کیلئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں)

یہود کے بعض جرائم

اس آیتِ کریمہ میں یہود پر کتمانِ حق، کتمانِ ہدایت، اور کتمانِ شریعت کا الزام لگا کر انہیں سخت ترین انجام کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس وعید کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود کا جرم کس قدر شدید اور کس قدر نا قابلِ معافی تھا۔ قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے کفار کے سوا جنہوں نے اپنے کرتوتوں سے بالکل اپنے آپ کو ہدایت سے محروم کر لیا ہو، کسی کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے دور اور لعنت کا سزاوار نہیں ٹھہراتے۔ اس لئے کہ برسوں کا کافر بھی کسی وقت توبہ کر کے اسلام کی آغوش میں آسکتا ہے۔

لعنت کا مفہوم

لعنت کا مطلب یہ ہے کہ ایمان، جو اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہے کسی شخص کو اس سے محروم کر دیا جائے، ایسے شخص کا انجام ہمیشہ کے جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اتنی بڑی سزا کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہود کے جرائم کی فہرست کتنی طویل اور ان کے جرم کی نوعیت کتنی عمیق ہے۔ غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جرائم دو طرح کے تھے۔ ایک طرح کے تو وہ ہیں جن سے ان کی پوری تاریخ بھری ہوئی ہے اور دوسری طرح کے وہ ہیں جس پر سیاقِ کلام دلالت کر رہا ہے۔ ان کے عام جرائم جن پر ان کی تاریخ شاہد ہے اور جن کی طرف بار بار قرآنِ کریم اشارے کرتا ہے ان میں سب سے بڑا جرم جسے ام الجرائم کہنا چاہیے وہ یہ تھا کہ اللہ نے ان سے ایک عہد لیا جس کا قرآنِ کریم میں ایک سے زیادہ مرتبہ ذکر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ ''اور یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب سے میثاق لیا کہ اس کتاب کو اچھی طرح لوگوں کے سامنے واضح کرنا''۔ اس کے عقائد کو ان کے دل ودماغ میں راسخ کرنا، ان کی تعلیمات کو ان کے لئے آسان بنانا، اس کے احکام سے انہیں پوری طرح باخبر کرنا، شریعت کے ایک ایک حکم کو ان کے سامنے کھول کر بیان کرنا۔ لیکن انہوں نے اس کے برعکس یہ حرکت کی کہ کتاب اللہ کے علم کو ربیوں اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود طبقے میں مقید کر دیا۔ یہودی عوام تک کو اس سے محروم رکھا اور جب جہالت عام پھیلنے لگی اور بداعمالیاں بڑھنے لگیں تو علماء نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کیلئے ہر طرح کی ضلالت اور بدعات کو عام رواج دیا۔ اللہ کے احکام تک کو چھپایا، بعض احکام میں تحریف تک کر ڈالی۔ حدود اللہ خواص کیلئے اجنبی بنادی گئیں۔ اس طرح سے ان کا معاشرہ اللہ کی عطا کردہ شریعت سے بے نیاز ہو گیا۔ وہ اپنے وضعی قوانین کے ذریعے عدالتوں میں فیصلے کرنے لگے۔ ایک ایسی امت جو دنیا کی رہنمائی کیلئے اٹھائی گئی ہو اور جسے دنیا کی

Marfat.com

ہدایت کا فریضہ ادا کرنا ہو اس کی طرف سے یہ مجرمانہ غفلت پوری دنیا کو ہدایت سے محروم کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جس سے زیادہ شنیع اور خطرناک جرم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور دوسری طرح کے جرائم جن کی طرف سیاقِ کلام رہنمائی کرتا ہے، وہ ان علامات اور نشانیوں کو چھپانا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں اس لئے نازل فرمائی تھیں تاکہ اہلِ کتاب کو آخری پیغمبر کی تلاش میں دشواری پیش نہ آئے۔ لیکن ان بدبختوں نے ان نشانیوں کو چن چن کر یا تو کتاب سے نکالنے کی کوشش کی اور یا ان کا اس حد تک حلیہ بگاڑ ڈالا کہ ان کا اصل چہرہ پہچاننا مشکل ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ کی نشانیاں اور قرآنِ کریم کی علامتیں اس صراحت سے بیان کی گئی تھیں کہ جن کی وجہ سے اہلِ کتاب حضور کو اور قرآنِ کریم کو اپنے بچوں سے بڑھ کر پہچانتے تھے۔ پھر آنحضرت ﷺ کا ملتِ ابراہیم پر مبعوث ہونا اور بیت اللہ کا حضرت ابراہیم کی تعمیر ہونا اور یہیں سے اس امتِ مسلمہ کا اٹھایا جانا جو اس گھر سے اٹھنے والے انقلاب کا ہراول بننے والی تھی اور اس کے گردوپیش میں پھیلی ہوئی وہ نشانیاں جس کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آئندہ چل کر آنحضرت ﷺ کی دعوت سے تھا۔

یہ سب چیزیں نہائیت واضح انداز میں تورات میں بیان کی گئی تھیں اور یہود کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ یہ امانت بے کم و کاست لوگوں تک پہنچائیں۔ لیکن یہود نے ان میں سے ایک ایک نشانی کو بدلا، مروہ کا نام تک بدل دیا گیا، حضرت ابراہیم کا بیت اللہ سے تعلق کاٹ دیا گیا، حضرت اسمٰعیل کی بجائے حضرت اسحٰق کو ذبیح اللہ ثابت کیا گیا اور بھی بہت ساری تبدیلیاں کیں تاکہ آخری نبی کی پیش گوئیوں سے متعلق لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کر دیا جائے۔ یہ یہود کے نہائیت مکروہ جرائم کا ایک ہلکا سا خاکہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کیوں لعنت فرمائی اور پھر اس لعنت کی وسعت کو دیکھئے کہ تمام لعنت کرنے والوں کو ان پر لعنت کرنے کا حکم دیا گیا۔ کہاں تو وہ وقت تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنے دور کے تمام لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی گئی تھی اور کہاں یہ وقت کہ انہیں سب کی لعنت کا مورد بنا دیا گیا۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو عظیم ذمہ داریوں سے گراں بار کرتا ہے تو اسے عظمت کا خلعت بھی پہناتا ہے۔ لیکن جب یہ تختِ عزت وعظمت پر فائز قوم بدنیت، بداطوار اور نااہل ہونے کا ثبوت دیتی ہے تو اسے صرف عزت کے تخت سے ہی اتارا نہیں جاتا بلکہ ذلت کی پستیوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہی انجام بنی اسرائیل کا بھی ہوا۔ اس آیتِ کریمہ کو پڑھتے ہوئے دل ودماغ ارتعاش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جگر خون ہونے لگتا ہے کہ یہ امتِ مسلمہ جس کے ہم افراد ہیں یہ بھی بنی اسرائیل کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سیادت اور امامت کے عظیم منصب پر فائز کی گئی اور آج اس منصب کے حوالے سے اس کی خیانتیں، اس کی نااہلیاں، اس کی سرکشی بلکہ بغاوت بنی اسرائیل کی تاریخ کی خبر دے رہی ہیں۔ شائد اسی کا نتیجہ ہے کہ پورا عالمِ اسلام ترازو کے ایک پلڑے میں ہے اور کلکِ تقدیر فیصلہ لکھنے کیلئے اللہ کے حکم کے انتظار میں سر جھکا چکا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ امت اپنے آپ کو بہتر بنا کر اللہ کی رحمتوں کو دعوت دے گی یا اپنے آپ کو بدتر بنا کر بنی اسرائیل کے انجام کو پہنچے گی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابھی اس امت کیلئے سنبھلنے کے امکانات موجود ہیں اور تشویش کی بات یہ ہے کہ یہ امکانات تو بنی اسرائیل پر بھی بند نہیں کئے گئے تھے لیکن انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھا کر اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ اگلی آیتِ کریمہ میں انہیں امکانات کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

(البتہ! جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کر لی اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگے تو میں ان کی توبہ قبول کروں گا۔ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں) (البقرۃ:۱۶۰)

Marfat.com

توبہ کے لیے شرط

اللہ تعالیٰ کی طرف سے برستی ہوئی لعنت سے صرف وہ لوگ محفوظ رہیں گے، جو عذاب کے آنے سے پہلے پہلے توبہ کرلیں گے اور توبہ بھی محض ارادہ اور خیال کی حد تک نہیں بلکہ اپنی اصلاح بھی کریں گے اور آج تک کتمانِ حق کا جو جرم کرتے رہے ہیں اس کی تلافی کی کوشش بھی کریں گے۔ ان کی حرکتوں نے اللہ کے دین کی بالادستی کو جو نقصان پہنچایا ہے، ان کے کمزور ارادوں نے جس طرح عوام کے عقائد میں اضمحلال پیدا کیا ہے اور جس طرح سے عام وخواص ملی حمیت اور غیرت سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ ان سب کی وہ اپنے عمل، اپنی تدبیر اور اپنے فیصلوں سے تلافی کی کوشش کریں گے۔ تو یہ لوگ ہیں جن کی اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والے اور مہربان ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ O خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ O (البقرۃ: ۱۶۱ تا ۱۶۲)

(بے شک جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہےO وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی)

قرآنِ کریم میں کفر کا مفہوم

''کفر'' کے اصل معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں بولا جانے لگا۔ ایمان کے معنی ہیں ماننا، قبول کرنا، تسلیم کرلینا۔ اس کے برعکس کفر کے معنی ہیں نہ ماننا، رد کردینا، انکار کرنا۔ قرآن کی رو سے کفر کے رویہ کی مختلف صورتیں ہیں:

1۔ ایک یہ کہ انسان سرے سے خدا ہی کو نہ مانے، یا اس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک اور معبود ماننے سے انکار کردے یا اسے واحد مالک اور معبود نہ مانے۔

2۔ دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اس کے احکام اور اس کی ہدایات کو واحد منبع علم وقانون تسلیم کرنے سے انکار کردے۔

3۔ تیسرے یہ کہ اصولاً اس بات کو بھی تسلیم کرلے کہ اسے اللہ ہی کی ہدایت پر چلنا چاہیے مگر اللہ اپنی ہدایات اور اپنے احکام پہنچانے کیلئے جن پیغمبروں کو واسطہ بناتا ہے، انہیں تسلیم نہ کرے۔

4۔ چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے اور اپنی پسند یا اپنے تعصبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی نہ مانے۔

5۔ پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے عقائد، اخلاق اور قوانین حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں ان کو یا ان میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے۔

6۔ چھٹے یہ کہ نظریے کے طور پر تو ان سب چیزوں کو مان لے مگر عملاً احکامِ الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے اور دنیوی زندگی میں اپنے رویے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ نافرمانی ہی پر رکھے۔

Marfat.com

یہ سب مختلف طرزِ فکر وعمل اللہ کے مقابلے میں باغیانہ ہیں اوران میں سے ہرایک رویے کوقرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔اس کے علاوہ بعض مقامات پرقرآن میں کفر کا لفظ کفرانِ نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہےاورشکر کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔شکر کے معنی یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے،انسان اس کا احسان مند ہو،اس کے احسان کی قدر کرے۔اس کی دی ہوئی نعمت کواسی کی رضا کے مطابق استعمال کرےاور اس کا دل اپنے محسن کے لئے وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو۔اس کے مقابلے میں کفر یا کفرانِ نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے محسن کا احسان ہی نہ مانے اوراسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے یا اس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اوراسے ضائع کردے یا اس کی نعمت کواس کی رضا کے خلاف استعمال کرے یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ غدراور بے وفائی کرے۔اس نوع کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی،نمک حرامی،غداری اورناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (ماخوذ''تفہیم القرآن'')

حاصل کلام یہ کہ جوشخص یا جوقوم کفر کا یہ رویہ اختیار کرلیتی ہےاور پھراسی پر زندگی گزاردیتی ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اللہ کی لعنت اور پھٹکاراس پر برسے۔لیکن اگر یہ قوم عام قوم نہ ہو بلکہ حاملِ دعوت امت ہواور دنیا کی ہدایت کیلئے اسے امامت وسیادت کے منصب پر فائز کیا گیا ہواور پھروہ یہ رویہ اختیار کرے، جسے کفر کہا جاتا ہے۔چاہے وہ زبان سے ہزار مسلمان ہونے کا دعویٰ کرےلیکن اس کے طور اطوار اس کی پالیسیاں اس کے اجتماعی فیصلے،اس کی عدالتیں،اس کے ایوان ہائے حکومت،تمام اسی رویے کی غمازی کرتے ہوں تو پھراس کا انجام وہی ہوگا جو اس آیتِ کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔اے کاش!بنی اسرائیل پراس تنقید کے آئینہ میں امتِ مسلمہ اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرےاور پھراس انجام سے بچنے کی فکر کرے۔جس سے بنی اسرائیل دوچار ہوچکے ہیں۔

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَالرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ O (البقرۃ:۱۶۳)

(اورتمہارامعبود ایک ہی معبود ہے،اس کے سوا کوئی معبود نہیں،وہ بےانتہا رحم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے)

گزشتہ آیتِ کریمہ پرسورۃ البقرۃ کا پہلا باب ختم ہوگیا۔اس میں بعض دوسرے اساسی مباحث کے ساتھ ساتھ زیادہ تر گفتگو بنی اسرائیل کے حوالے سے رہی۔ان کے عقائد سے لے کران کی عادات واطوار تک مختلف باتیں زیرِ بحث آئیں اورایک مکمل تنقید سے ان کی نااہلی کے اسباب واضح فرمائے گئے اورآخر میں منصبِ دعوت وامامت سے ان کی نااہلی کا اعلان کردیا گیا۔اور پھر مسلمانوں کوملتِ ابراہیم کا وارث قرار دے کراس عظیم منصب کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کردی گئیں۔اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ سے اس سورۃ کا دوسرا باب شروع کیا جارہا ہے۔جس میں اس نئی بننے والی امت کواس وقت کے حالات کے مطابق ہدایات دی جارہی ہیں،شریعتِ الٰہی کی تجدید کی جارہی ہے۔مشرکین اوراہلِ کتاب پرضمنی طور پرتنقید کے ساتھ ساتھ امتِ اسلامیہ کوان کے حقیقی مقاصد سے آگاہ کیا جارہا ہے۔

توحید ہی اسلام کا مبدأ ومعاد ہے

اللہ نے انسانوں کو جودین عطا فرمایا ہے،ہردور میں اس کی اساس اور بنیاد''توحید''رہی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ انسانی شعور کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ تصورِ توحید میں بھی ارتقاء ہوتا گیا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گزشتہ امتیں مذہبی طور پراس وقت تباہ ہوئیں جب انہوں نے عقیدۂ توحید کو بےمیل نہ رہنے دیا،اس میں شرک کیلئے راستے کھولےاور پھرآہستہ آہستہ اس نعمت سے محروم ہوگئیں۔

Marfat.com

یہ نئی بننے والی امت چونکہ انسانوں کی ہدایت کیلئے نئے سفر کا آغاز کر رہی ہے اس لئے انہیں بھی سب سے پہلے جس بات کا حکم دیا جارہا ہے وہ وہی توحید ہے، جو دین کی اصل اساس ہے۔ چنانچہ ہم پورے قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی کوئی اہم بحث ایسی نہیں جس میں عقیدۂ توحید کا حوالہ نہ دیا گیا ہو۔ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ فاتحہ میں عقیدہ توحید سے ہوا۔ سورۃ بنی اسرائیل نصف قرآن کی اہم ترین سورۃ ہے، وہاں دوبارہ اسی عقیدے کو نئی شان سے دہرایا گیا ہے۔ پھر قرآنِ پاک کی تعلیمات کا اختتام سورۃ اخلاص کی صورت میں اسی عقیدے پر کیا گیا ہے اور آخری دو سورتیں جنہیں ''معوذتین'' کہا جاتا ہے، وہ اسی خزانے کی حفاظت کیلئے محافظ کے طور پر اپنا فرض انجام دے رہی ہیں۔

اللہ کے وجود سے انکار انسانوں کو کبھی نہیں رہا کیونکہ اس کے وجود سے انکار اصلاً اپنی فطرت سے جنگ ہے، جو سراسر ایک منفی تصور ہے اور محض ایک منفی تصور زندگی کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ تاریخ میں ہمیں ہر طرح کے بگاڑ کی شہادتیں ملتی ہیں۔ لیکن کبھی انسانوں کی کسی قابلِ ذکر تعداد نے اللہ کے وجود سے انکار کیا ہو اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اس کی پہلی مثال ہماری قریبی تاریخ کا کیمونزم ہے جس نے انسان کو مذہب کے خلاف بغاوت پر اکسایا اور بالآخر اللہ کے وجود سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ اس انکار پر اٹھنے والی ایک توانا تحریک جس نے دنیوی اعتبار سے بے پناہ ترقی کی ستر سال کے بعد ہی اپنے خطرناک زوال میں ڈوب گئی اور جن لوگوں کو جبراً اس سے دور کیا گیا تھا انہیں جب آزادی کا موقعہ ملا تو معلوم ہوا کہ اگرچہ ان سے بہت کچھ چھن چکا ہے لیکن خدا کا تصور ان میں اب بھی باقی ہے۔ قرونِ ماضیہ کے وہ ادوار جنہیں ہم نہائیت پسماندگی کا زمانہ سمجھتے ہیں، اللہ کے وجود کی شہادتیں مختلف ناموں سے ان میں بھی پائی جاتی ہیں (سورۃ الفاتحہ کے درس میں، میں اس کا کسی حد تک تذکرہ کر چکا ہوں)۔ قرآنِ کریم شائد اسی وجہ سے اللہ کے وجود پر زیادہ بحث نہیں کرتا البتہ وہ اللہ کی توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال پر بحث کرتا ہے کیونکہ دنیا نے ہمیشہ اسی میں ٹھوکر کھائی ہے اور مختلف قسم کے شرک میں مبتلا ہو کر اپنی اصل حیثیت کو گم کر دیا ہے۔ اسی حقیقت کے تحت یہاں بھی امتِ مسلمہ کو سب سے پہلے توحید ہی پر توجہ دلائی گئی ہے۔ پہلے مثبت انداز اختیار کیا گیا ہے تاکہ توحید کا تصور دل و دماغ میں جڑ پکڑ جائے اور پھر منفی انداز اختیار کر کے ہر طرح کے شرک کی جڑ کاٹ دی ہے۔ ارشاد فرمایا: وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ''تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے''۔ اس کے بعد منفی انداز اختیار کر کے ہر طرح کے شرک کا خاتمہ کر دیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ''اس کے سوا کوئی معبود نہیں''۔ ہم نے سورۃ فاتحہ میں ''اِلٰـہ'' کی معنوی حیثیت پر کافی بحث کی ہے۔ اسی طرح رحمٰن اور رحیم کو بھی سمجھانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ بہتر ہے کہ اسے وہاں دیکھ لیا جائے۔ البتہ! یہاں نہایت اختصار سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ''اِلٰـہ'' جس طرح ''معبود'' کو کہتے ہیں اسی طرح مطلوب و مقصود اور حاکمِ حقیقی کو بھی کہتے ہیں۔ انسان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کی منزل کیا ہے، اس کے دل کی آبادی کس کی محبت سے ہونی چاہئے، وہ کون سا تعلق ہے، جو تمام تعلقات کا مبدا اور منتہا ہے۔ پھر وہ کون سی ذات ہے جسے انسان کیلئے راہنمائی فراہم کرنے کا حق ہے؟ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی ہر سطح پر آئینی، قانونی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی ہدایات دینا اور پھر اس کی پابندی کرانا یہ کس کو زیب دیتا ہے؟ انسان ہمیشہ تجربات کی زد میں رہا ہے، وہ ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا رہا ہے۔ لیکن کوئی ایسا نظامِ زندگی تشکیل نہیں کر سکا جو اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے والا اور تمام مشکلات کو حل کرنے والا ہو کیونکہ فطرتِ انسانی کو سمجھنا پوری طرح انسان کیلئے ممکن نہیں اور خواہشات اور مفادات کے دباؤ سے اپنے آپ کو آزاد کر لینا بھی انسان کیلئے آسان نہیں ہر خطے کے لوگ اپنے مفادات کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ہر قوم دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنے مخصوص تصورات رکھتی ہے۔ ہر نسل دوسری نسل کے بارے میں تحفظات رکھتی ہے۔ ہر خطہ اپنے اندر زندگی

Marfat.com

گزارنے والوں میں کچھ فطری داعیات کو ابھارتا ہے، جو دوسروں کیلئے قابلِ قبول نہیں ہوتے۔انسان پر عقل کی حکومت ہے، لیکن عقلوں مین انتہادرجے کا تفاوت ہے۔مزید یہ کہ نئے نئے فلسفوں نے عقل کو آزاد نہیں رہنے دیا بلکہ اسے خواہشات، مفادات اور تعصبات کا ایجنٹ بنادیا ہے۔ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ انسان اس جہانِ خیر وشر میں سواء السبیل تک پہنچنے پر اپنے تئیں قادر نہیں۔جب بھی انسانوں نے ایسی کوششیں کی ہیں تو انسانی فکر کا پلڑا کسی نہ کسی طرف جھک گیا ہے۔

آج کے روشنی علم وہنر کے زمانے میں بھی قوموں کے اجتماعی ادارے ایسے فیصلے کر رہے ہیں جنہیں اخلاقی لحاظ سے ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور انسانی اقدار کے حوالے سے ایک ایسی قیامت برپا ہے، جس نے جان مال اور آبرو کے حوالے سے بنیادی اقدار کا جنازہ نکال دیا ہے۔انہیں وجوہ کی بنا پر قرآنِ کریم بار بار لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ اگر تم ایک ایسی زندگی گزارنا چاہتے ہو جس میں دنیوی اور اخروی دونوں طرح کی فلاح نصیب ہو تو پھر تم اللہ کی توحید کا دامن مضبوطی سے تھام لو اور اس بات کو قبول کرلو کہ جس طرح تمام انسانوں کی جسمانی ضرورتیں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وجود میں آرہی ہیں اور اس کی صفتِ ربوبیت تمام مخلوقات کو پال رہی ہے اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کی ضرورتیں قدرت کی طرف سے پوری نہ ہو رہی ہوں۔اسی طرح ہماری روحانی، معنوی اور اجتماعی ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔اس نے ہر قوم کو ہدایت بخشی ہے، زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا ہے، اپنے پیغمبروں کی معرفت ایک ایسا نظام زندگی دیا ہے ، جس میں آئین سے لے کر تہذیب تک ہر ضرورت کو پورا فرمایا گیا ہے۔یہ سب کچھ اس نے اپنے ذمہ اس لئے لے رکھا ہے کہ وہ ''رحمٰن اور رحیم'' ہے۔اس کی رحمت جس طرح بچے کو پیدا کرتی، پروان چڑھاتی اور زندگی کی ضرورتیں مہیا فرماتی ہے۔اسی طرح اس کی رحمت نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ تمہارا رب کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے اور تمہاری انفرادی اور اجتماعی ضرورتیں کس طرح کے علم اور شعور سے پوری ہوسکتی ہیں۔اس کے سامنے صرف ہماری دنیا نہیں بلکہ آخرت بھی ہے۔اس لئے آخرت میں کامیابی کیلئے جس طرح کی رہنمائی ضروری تھی اور جس طرح کے اعمال درکار تھے، ان میں سے ایک ایک چیز سے ہمیں بہرہ ور فرمایا ہے کیونکہ یہ اس کی الوہیت کا تقاضا اور اس کی رحمت کا فیضان ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ
بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ
فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ
وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

Marfat.com

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا
لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ
لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ
اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ
الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ
مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ
عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

پارہ ۲، رکوع: ۴ (بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور جہازوں کے چلنے میں جو سمندر میں ان چیزوں کو لے کر چلتے ہیں، جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مامور ہیں، ان لوگوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے علاوہ دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتے ہیں، ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ سے رکھنی چاہیے اور جو ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جبکہ یہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے۔ اس وقت کا خیال کرو جب کہ مقتدا اپنے پیروکاروں سے اظہارِ برأت کریں گے اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تعلقات یک قلم ٹوٹ جائیں گے O اور ان کے پیرو بھی کہیں گے: اے کاش! ہمیں دنیا میں ایک بار اور جانا نصیب ہوتا کہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہارِ برأت کر سکتے، جس طرح انہوں نے ہم سے اظہارِ برأت کیا ہے۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال ان کو سرمایۂ حسرت بنا کر دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔" (آیت ۱۶۴ تا ۱۶۷)

Marfat.com

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ○

(بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور جہازوں کے چلنے میں جو سمندر میں ان چیزوں کو لے کر چلتے ہیں، جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مامور ہیں، ان لوگوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں) (البقرۃ:۱۶۴)

مخلوق سے خالق پر استدلال

اس آیتِ کریمہ میں مختلف مخلوقات اور مصنوعات کا ذکر فرما کر اس کائنات کے خالق اور صانع پر دلیل قائم کی گئی ہے اور پھر ان مخلوقات کے خواص پر توجہ دلا کر اس کی وحدانیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ وہ سب سے پہلے زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر فرماتا ہے وہ کہتا ہے کہ ذرا غور کرو! یہ زمین و آسمان کے سارے کارخانے جو دنیا کے ہر طلسم سے بڑھ کر حیرت انگیز اور انسانی سائنس کے ہر شعبہ سے عجیب تر ہیں۔ کیا اس بات کی دلیل نہیں کہ نہ یہ اپنے آپ وجود میں آسکتے ہیں اور نہ باقی رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی صاحبِ شعور، صاحبِ ارادہ، قادرِ مطلق ہستی ان کی صانع و خالق نہ ہو۔ ان تمام مظاہر فطرت کا تسلسل واستمرار ان کی یک رنگی و باقاعدگی ان کا نظم وانضباط ہر عقلِ سلیم کو مجبور کر رہا ہے کہ ان کے عقب میں ایک ذی اختیار فعال کا ہاتھ تسلیم کیا جائے۔ اسی عقلِ سلیم کو جو معمولی سی گھڑی کو بھی بغیر کسی ماہر فن اور صناع گھڑی ساز کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو پھر یہ عقلِ سلیم زمین و آسمان کے اس کارخانے کے بارے میں کیسے باور کر سکتی ہے کہ یہ کسی پیدا کرنے والے کے پیدا کئے بغیر ہی وجود میں آ گیا ہے؟ پھر آسمان و زمین کی پیدائش سے مراد صرف ان کا وجود ہی نہیں بلکہ ان کی وہ نفع رسانی اور نفع بخشی کی قوت بھی ہے جسے ہم جابجا اپنا کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ آسمان کی وسعتوں کا تو آج تک کوئی اندازہ نہ سکا اور نہ شائد ہو سکے گا، لیکن زمین جو ہمارے قدموں کے نیچے بچھی ہوئی ہے خود اس کے اندر جو بے شمار منفعت بخش چیزیں موجود ہیں اور اس کے پہلو میں جو سمندر کا لامتناہی خزانہ پھیلا ہوا ہے، جس کی مخلوقات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زمین کی مخلوقات سے بھی زیادہ ہیں۔ پھر ان تمام مخلوقات کو ملنے والا زندگی کا سامان اور ان میں سے ایک ایک کے وجود کی بے پایاں حکمتیں جن کا اندازہ کرنا بھی انسان کیلئے مشکل ہے۔ کیا یہ سب کچھ از خود وجود میں آ گیا؟ یا واقعی کوئی اس کا پیدا کرنے والا ہے اور اس نے کسی عظیم مقصد کیلئے ان کو پیدا کیا ہے؟ اور پھر ان مخلوقات میں پایا جانے والا حیران کن نظم وضبط اور سب کا مل کر ایک متعین مقصد کیلئے سفر کا تسلسل اور جہد و عمل کا محور اور ان کی گردش کے متعین راستے اور ان کی افادیت کا ناقابلِ انقطاع فیضان ان میں سے ایک ایک چیز یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ ان کے پیچھے ایک فعال ہستی موجود ہے جو نہایت حکمت و دانش کی مالک اور تدبیر و

Marfat.com

قدرت سے آراستہ ہے۔ یہ زمین و آسمان اپنی بے پناہ وسعتوں کے باوجود اسی طرح اللہ کی مخلوق ہیں اور اس کی اطاعت میں بندھے ہوئے ہیں جس طرح کائنات کا ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ۔ لوگوں نے اگرچہ کہیں آکاش دیوتا اور دھرتی دیوتا وغیرہ جیسے تصورات اپنی طرف سے گھڑے، لیکن یہاں بتایا جا رہا ہے کہ ان کی حیثیت مخلوق سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

کائنات کے نظم سے استدلال

اس کے بعد اَلـلَّیْلِ وَالـنَّھَار کا ذکر فرمایا کہ ذرا ان رات اور دن کو دیکھو کس طرح ایک تسلسل، پابندی اور نہایت نظم و ضبط کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے چلے آتے ہیں۔ جب سے سورج اور چاند وجود میں آئے ہیں اور زمین نے حرکت کرنا سیکھا ہے کبھی لیل و نہار کی آمد و رفت میں نہ انقطاع واقع ہوا ہے اور نہ بدنظمی پیدا ہوئی ہے۔ دنیا نے ان کو بھی دیوی دیوتا کا درجہ دیا اور ان کی پوجا کی ہے۔ لیکن یہاں ان کا ذکر کر کے اشارہ کیا کہ ان کا غیر مخلوق یا خود آفریدہ ہونا تو الگ رہا، یہ وقت و زمان کے بے حس اور بے جان اجزاء تو خود اپنی حرکت تک پر قادر نہیں۔ زمین کی حرکت سے رات دن وجود میں آتے ہیں، موسم بدلتے ہیں اور نہ جانے کیسی کیسی تبدیلیاں وجود میں آتی ہیں۔ لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ وہ کون ہے جس کی عظیم الشان کاریگری اور بے مثال صناعی کا یہ نمونہ ہے؟ فضا کے خلا میں کون ہے جو اسے تھامے ہوئے ہے؟ اس کے اور چاند، سورج، ستاروں اور سیاروں کے درمیان فاصلہ کا ایک خاص تناسب کس نے قائم کر رکھا ہے؟ اس کی رفتار کی ایک خاص شرح کس نے متعین کر دی ہے؟ آفتاب سے اسے ایک خاص مقدار میں روشنی اور گرمی کون پہنچا رہا ہے؟ چاند سے روشنی اور خنکی ایک متعین حساب کے ساتھ کس کا دستِ قدرت اس تک لا رہا ہے؟ آسمان اگر ٹھوس مادی اجسام ہیں تو بھی یا اگر خلا میں محض حدِ نظر ہیں تو بھی، ہر صورت میں ان کی وضع، ساخت، ترکیب، ہیئت، انسانی دسترس سے کتنی بالاتر ہے؟ ثوابت اور سیار کے سکون و حرکت کا نظام کون قائم کئے ہوئے ہے؟ ستاروں کی یہ روشنی اور ان کے طلوع و غروب میں یہ باقاعدگی کس کے حکم سے قائم ہے؟ نظامِ فلکی کے بے شمار اجزاء اور عناصر میں یہ ترتیب اور باہمی تناسب کس کی حکمت و صنعت کے دم سے زندہ ہے؟ رات اور دن کس طرح ایک برتر قانون کے اندر جکڑے نظر آ رہے ہیں؟ گرمی، سردی، برسات ہر موسم میں ان کے اندر مناسب وقت تبدیلیاں کون کرتا رہتا ہے؟ مختلف ملکوں میں ان کے طلوع و ظہور کے وقت کیسے بندھے ہوئے ہیں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ جس وقت کلکتہ میں دن نکلتا ہے، دمشق میں بھی دن نکل آئے۔ نہ یہ ہوتا ہے کہ امریکہ کی شام کبھی ایران کی شام بن جائے۔ جنوری میں جو اوقات اندھیرا چھا جانے کے ہوتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ جون میں وہی باقی رہ جائیں۔ آخر یہ رات دن کے بندھے ہوئے اور قانون کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تغیرات، کس کی حکومتِ قاہرہ اور حکمتِ کاملہ کی شہادت دے رہے ہیں؟ بحرِ ذخار سارے براعظموں کو اپنی گرفت میں لئے رہنے والا، رقبہ میں خشکی سے چہار چند اپنی اس ساری عظمت و ہیبت کے باوجود کس طرح مشتِ خاک انسان کے قبضہ میں آ گیا ہے۔ کس طرح لکڑی کے تختوں کو جوڑ جاڑ کر ان میں لوہے کی کیلیں ٹھونک ٹھانک کر ان پر لوہے کی چادریں چڑھا کر انسان سمندر کے بڑے سے بڑے مہیب فاصلوں اور مسافتوں کو طے کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس میں مد و جزر کب ہوگا؟ قمری مہینہ کی فلاں فلاں ہی تاریخوں پر ہوگا۔ اپنی ساری غضبناک تندی کے باوجود ایک خاص رقبہ کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ ایک مخصوص و متعین وزن کی چیزوں کو وہ اپنے اوپر تیرائے گا اور اس کے علاوہ وزن والی چیزوں کو ڈبو دے گا۔ اس کے پانی کا ایک مخصوص مزاج، خاص رنگ، خاص مزہ ہوگا۔ کنوؤں کے پانی سے مختلف

Marfat.com

دریاؤں کے پانی سے مختلف، اس طرح کے سینکڑوں دوسرے قانونوں کا پابند، اسے کس کی مشیت، کس کی قدرت، کس کی حکومت نے کر رکھا ہے؟ بارش کا خاص خاص فصلوں میں خاص خاص موسموں میں یا خاص خاص فضائی تغیرات کے ماتحت ہونا، بخارات کا ایک خاص گرمی پا کر سمندری جزیرۂ آب سے اٹھنا، ایک خاص فاصلہ تک اوپر جانا، ایک خاص درجہ کی سردی پا کر ان دخانی وہوائی اجزاء کا منجمد ہو جانا، ان کا بادل کی شکل اختیار کر لینا، ایک خاص درجہ ثقل تک بڑے بڑے بھاری اور بوجھل بادلوں کا فضا میں سنبھلے رہنا، پھر فلاں فلاں فضائی تغیرات کے ماتحت فلاں علاقہ تک جانا، پھر ایک بندھی ہوئی مقدار میں ایک متعین مدت کے اندر برس پڑنا، اس سے از سرِ نو خشک زمین میں جان پڑ جانا۔ یہ سارے ردوبدل کسی حکیم کی حکمت، کسی حاکم کی حکومت، کسی قادر کی قدرت کی کیسی کھلی ہوئی شہادت دے رہے ہیں۔ پھر حیاتِ نباتی کے علاوہ خود حیاتِ حیوانی جن عجائب کا مجموعہ ہے۔ ہر زندہ جسم میں بے شمار ذروں اور خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان کی جو ایک مخصوص ترتیب اور متعین ترکیب ہوتی ہے، ایک خاص درجہ کی حرارت جو حیات کو قائم رکھتی ہے، ایک خاص مقدار سے بڑھی ہوئی سردی جو اس لف میں نشر، اس اجتماع میں انتشار پیدا کر دیتی ہے۔ نظامِ تغذیہ، نظامِ تنفس، نظامِ تناسل، نظامِ عصبی وغیرہ جسم کے اندر متعدد نظامات پھر ہر نظام کے تحت بے شمار قاعدے اور ضابطے اس سارے نظامِ اعظم کی تکوین وقیام پر کس کی مشیت، کس کی حکومت کارفرما ہے؟ اس قسم کے سینکڑوں، ہزاروں سوالات پر انسان جتنا زیادہ غور اور نکتہ سنجی سے کام لے گا، توحید اور توحیدی حکمتوں کا نقش دل پر اور زیادہ ہوتا جائے گا۔ جاہلی اور غیر مومن قوموں کے فلسفہ اور سائنس کا صرف نقطۂ نظر غلط ہوتا ہے، اس کی اگر تصحیح ہو جائے اور ان علومِ مادی کا مطالعہ اگر ایمانی نقطۂ نظر سے شروع کر دیا جائے تو بجائے الحاد، ارتیاب وتشکک کے عرفان وایقان ہی کی راہیں روز بروز روشن ہوتی جائیں۔ (تفسیر ماجدی)

اس آیت پر اگر مزید تدبر کی نگاہ ڈالئے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اس میں شروع سے لے آخر تک اس کائنات کے متقابل بلکہ متضاد اجزاء وعناصر کا حوالہ دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے اس حیرت انگیز اتحاد وتوافق اور ان کی اس بے مثال باہم آمیزی وسازگاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو ان کے اندر اس کائنات کی مجموعی خدمت کیلئے پائی جاتی ہے۔ آسمان کے ساتھ زمین، رات کے ساتھ دن، کشتی کے ساتھ دریا۔ بظاہر دیکھئے تو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ضدین کی نسبت رکھتے ہیں۔ لیکن ذرا گہری نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اگر یہ ایک طرف ضدین کی نسبت رکھتے ہیں تو دوسری طرف اس کائنات کی خانہ آبادی کے نقطۂ نظر سے آپس میں زوجین کا سا ربط واتصال بھی رکھتے ہیں۔ یہ آسمان اور اس کے چمکتے ہوئے سورج اور چاند نہ ہوں تو ہماری زمین کی ساری رونقیں اور بہاریں ختم ہو جائیں بلکہ اس کی ہستی ہی نابود ہو جائے۔ اسی طرح یہ زمین نہ ہو تو کون بتا سکتا ہے کہ اس فضائے لامتناہی کے بے شمار ستاروں اور سیاروں میں سے کس کس کا گھر اجڑ کے رہ جائے۔ علی ہذا القیاس، ہماری اور ہماری طرح اس دنیا کے تمام جانداروں کی زندگی جس طرح دن کی حرارت، تمازت، روشنی اور نشاط انگیزی کی محتاج ہے، اسی طرح شب کی خنکی، لطافت، سکون بخشی اور خواب آوری کی بھی محتاج ہے، یہ دونوں مل کر اس گھر کو آباد کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سمندر کو دیکھئے اس کا پھیلاؤ کتنا ہوشربا اور ناپیدا کنار ہے اور اس کی موجیں کتنی مہیب اور ہولناک ہیں۔ لیکن دیکھئے اس سرکشی وطغیانی کے باوجود کس طرح اس نے عین اپنے سینہ پر سے ہماری کشتیوں اور ہمارے جہازوں کے لئے نہائیت ہموار اور مصفا سڑکیں نکال رکھی ہیں۔ جن پر ہمارے جہاز دن رات دوڑ رہے ہیں اور تجارت ومعیشت، تمدن ومعاشرت اور علوم وفنون ہر چیز میں مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملائے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

آگے آسمان سے بارش اور اس بارش سے زمین کے از سرِ نو باغ و بہار اور معمور و آباد ہو جانے کا ذکر ہے۔ غور کیجئے! کہاں زمین ہے اور کہاں آسمان۔ لیکن اس دوری کے باوجود دونوں میں کس درجہ گہرا ربط و اتصال ہے۔ زمین اپنے روئیدگی اور زندگی کے خزانے چھپائے ہوئے ہے لیکن یہ سارے خزانے اس وقت تک مدفون ہی رہتے ہیں جب تک آسمان سے بارش نازل ہو کر ان کو ابھار نہیں دیتی۔ اسی طرح کا رشتہ بادلوں اور ہواؤں کے درمیان ہے۔ بادلوں کے جہاز لدے پھندے اپنے بادبان کھولے کھڑے ہیں، لیکن یہ اپنی جگہ سے ایک انچ سرک نہیں سکتے۔ جب تک ہوائیں ان کو دھکے دے کر ان کی جگہ سے نہ ہلائیں اور ان کو ان کی مقرر کی ہوئی سمتوں میں آگے نہ بڑھائیں۔ یہ ہوائیں ہی ہیں جو ان کو مشرق و مغرب اور شمال اور جنوب میں ہنکائے پھرتی ہیں اور جب چاہتی ہیں ان کو غائب کر دیتی ہیں اور جب چاہتی ہیں ان کو افق پر نمودار کر دیتی ہیں۔

قولِ فیصل

اب سوال یہ ہے کہ غور و تدبر کی نگاہ اس دنیا کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے۔ کیا یہ اضداد اور متناقضات کی ایک رزم گاہ ہے؟ جس میں مختلف ارادوں اور قوتوں کی کشمکش برپا ہے یا ایک ہی حکیم و مدبر کا ارادہ ان سب پر حاکم و فرمانروا ہے، جو ان تمام عناصر مختلفہ کو اپنی حکمت کے تحت ایک خاص نظام اور ایک مجموعی مقصد کے لئے استعمال کر رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کائنات کے مشاہدہ سے یہ دوسری ہی بات ثابت ہوتی ہے۔ پھر مزید غور کیجئے! تو یہیں سے ایک اور بات بھی نکلتی ہے وہ یہ کہ یہ دنیا آپ سے آپ وجود میں نہیں آئی ہے اور نہ اس کے اندر جو ارتقاء ہوا ہے، وہ آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے عناصر مختلفہ میں ایک بالاتر مقصد کے لئے وہ سازگاری کہاں سے پیدا ہوتی جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔

غور کیجئے! تو یہ ایک ہی حقیقت، ایک طرف شرک کے تمام امکانات کا سدِ باب کر رہی اور دوسری طرف یہ ڈارونزم کے بھی وساوس کی جڑ کاٹ رہی ہے۔ (ماخوذ ''تدبر قرآن'')

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ O

(اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے علاوہ دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتے ہیں، ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ سے رکھنی چاہیے اور جو ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جبکہ یہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے) (البقرۃ:۱۶۵)

Marfat.com

اَنْدَادً کا مفہوم

گزشتہ آیتِ کریمہ میں توحید کے اثبات اور شرک کے رد میں ایسی جامع دلیل بیان فرمائی گئی ہے جس کے بعد شرک کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ دنیا میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جن پر کوئی دلیل اثر انداز نہیں ہوتی، چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے، جو دوسری قوتوں کو اللہ کا شریک اور ہمسر بناتے ہیں اور پھر اسی پر بس نہیں ان سے اس طرح محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ سے محبت کرنے کا حق ہے۔ اس میں شریک اور ہمسر کیلئے انداد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ انداد، ند کی جمع ہے۔ ند عربی زبان میں مثل اور مشابہ کو بھی کہتے ہیں اور مخالف اور مدمقابل کو بھی۔ چنانچہ انداد کے معنی ''اضداد اور اشباہ'' دونوں کیے گئے ہیں۔ کیونکہ دنیا میں دونوں طرح کا شرک مروج رہا ہے۔ بہت سی قوموں نے اپنے دیوتاؤں کو محض ایک خدائے اصغر یا ماتحت خدا تسلیم کیا ہے اور مجوس نے اہرمن کو یزدان کے حریف و مقابل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انداد سے مراد عموماً مورتیاں، بت اور دیوتا لیے گئے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں اور مفسرین نے اس کی وضاحت کی ہے کہ انداد سے مراد قوموں کے وہ سردار اور وہ لیڈر ہیں جن کے پیچھے لوگ چلتے ہیں۔

بعض اہلِ علم نے اس لفظ کو اس سے بھی زیادہ وسیع معنوں میں لیا ہے کیونکہ لفظ کے عموم میں ایسے تمام معنی کی گنجائش ہے۔ چنانچہ وہ یہ کہتے ہیں کہ انداد سے مراد ایسے لوگ ہیں جن کی عقیدت اور محبت اور جن کی اطاعت کا جذبہ اس حد تک پہنچ جائے کہ قلب و دماغ پر اس کا تسلط ہو جائے۔ چنانچہ مشرک قوموں کو دیکھ کر ان تمام معانی کی تصدیق کرنا پڑتی ہے۔ وہ زمانہ گزر گیا یا اب اگر کہیں ہے تو شاید کہیں پسماندہ علاقوں میں اس کے اثرات باقی ہوں جہاں بتوں، دیوتاؤں اور مورتیوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ بلکہ اب تو اصل شرک جو مشاہدے میں آرہا ہے اس کا زیادہ تر تعلق اطاعت، عصبیت اور محبت سے ہے۔ آج بھی مسیحیوں کو محبت اور تعلق خاطر خدا سے کہیں زیادہ خدا کے بیٹے اور پھر روح القدس اور مقدس کنواری سے ہے اور ہندوؤں کی محبت اور تعلقِ خاطر اپنے ایشور اور پرماتما سے کہیں زیادہ درگا مائی، لکشمی مائی اور اگنی دیوتا وغیرہ دیویوں، دیوتاؤں کے ساتھ اور رشیوں، منیوں اور سادھوؤں کے ساتھ ہے اور جہاں تک اطاعت، عقیدت اور عصبیت کا تعلق ہے، اس کے مظاہر تو آپ جابجا مشرک قوموں میں کیا، مسلمانوں میں بھی دیکھیں گے۔ وہ اللہ کو ایک مان کر بھی اس کی اطاعت اس شرط کے ساتھ کریں گے کہ اس کی زد نفسانی خواہشات، انفرادی اور اجتماعی مفادات، اور عہدہ اور منصب پر نہ پڑتی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ان کا اپنے اللہ سے تعلق اس وقت تک قائم ہے جب تک کسی اور تعلق سے اس کا تصادم نہیں ہوتا اور جب تصادم ہو جائے، تو پھر ترجیح دیتے وقت ہمیشہ جھکاؤ دوسرے تعلقات کی طرف ہوتا ہے، اللہ کے تعلق کو بھلا دیا جاتا ہے۔ جہاں تک قلبی تعلق جسے محبت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کا معاملہ تو اور بھی مشکل ہے۔ محبت ایک ایسا بے پناہ جذبہ ہے جو دوسرے تمام جذبوں پر غالب آجاتا ہے۔ نفع و نقصان کے تصورات بھی اس جذبہ کو شکست نہیں دے سکتے۔ کمزور سے کمزور انسان بھی محبت کے جذبے سے توانا ہو جاتا ہے۔ ایک بلی اپنے بچے کو بچانے کیلئے اسی جذبے سے قوت پا کر چیتے کی آنکھیں نکالنے کیلئے تیار ہو جاتی ہے۔ مامتا کے جذبے کی شدت تمام حیوانات میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے اور مامتا محبت ہی کا ایک روپ ہے۔ انسانوں کا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ لیکن انسانوں میں بالعموم دیکھا یہ گیا ہے کہ وہ کہنے کو کسی کو بھی محبوب قرار دیں لیکن حقیقت میں ان کا محبوب اپنے مفادات، اپنی آرزوئیں اور اپنی خواہشِ نفس کے سوا کچھ اور نہیں۔

Marfat.com

مومن سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے

چنانچہ جب تک انسان ایمانی قوت سے محروم رہتا ہے تو حُبِّ دنیا ہی وہ اصل جذبہ ہے جو ہر جگہ اسے کھینچے پھرتا ہے۔ مشرک لوگ تو اپنے بنائے ہوئے شریکوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کی محبت اللہ سے محبت پر غالب آجاتی ہے۔ لیکن یہ شریک بھی صرف بت اور دیوتا ہی نہیں بلکہ ان کے اپنے مفادات، عہدہ ومنصب، جاہ ومرتبہ، اور بڑی قوتوں سے تعلقات وہ انداد ہیں جن کی حقیقت میں پوجا کی جاتی ہے اور جن کے سامنے باقی تمام تعلقات بے وزن ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایک مومن وہ اپنی تمام ضرورتیں رکھتا ہوا بھی غیر مشروط محبت کا تعلق صرف اپنے اللہ سے رکھتا ہے۔ اسے اپنے ماں باپ، اپنے بیوی بچوں، اپنے دوست احباب اور ضرورت کی اور چیزوں سے بھی پیار اور محبت ہے۔ لیکن اس محبت کو وہ اللہ کی محبت پر کبھی غالب نہیں آنے دیتا۔ جب بھی ان دونوں محبتوں میں تصادم ہوتا ہے تو اللہ کی محبت کے سامنے باقی ہر محبت دم توڑ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ آدمی کی اپنی ذات اللہ کی محبت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اللہ کی محبت کا حق ادا کرتے ہوئے اگر مال لٹانا پڑے تو وہ دریغ نہیں کرتا، بچوں کی قربانی دینا پڑے تو وہ اس کے لئے تیار رہتا ہے، حتیٰ کہ اپنی ذات کو بھی اگر قربان کرنا پڑے تو اسے وہ نعمتِ غیر مترقبہ خیال کرتا ہے۔ ایک مومن اور غیر مومن میں یہی وہ حقیقی فرق ہے جو دونوں کی حقیقی پہچان ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ میں اسی حقیقت کو واشگاف فرمایا گیا ہے۔ مومن مردم بیزار نہیں ہوتا کہ وہ کسی سے بھی تعلق نہ رکھے، وہ نہایت دلآویز شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ مسلمان کے لہو میں دل نوازی کا سلیقہ پایا جاتا ہے۔ مروت واخوت مومن کا وہ حسنِ عالمگیر ہے جس سے پوری دنیا نے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ ایک شفیق باپ، ایک پیار کرنے والا شوہر، ایک ایثار کرنے والا بھائی، ایک مروت سے کام لینے والا شہری ہے۔ جس کی ایک ایک ادا سے اپنائیت جھلکتی ہے۔ لیکن اس کے یہ تمام تعلقات محبت کی اس سطح سے نیچے رہتے ہیں جہاں سے اللہ کی محبت شروع ہوتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر اس طرح کی تمام محبتیں اللہ کی محبت پر قربان کردی جاتی ہیں۔ لیکن اس کی ذات، اس کی صفات، اس کے احکام اور اس کے حقوق سے محبت کو کسی صورت بھی قربان نہیں کیا جاسکتا۔ آج امتِ مسلمہ نے اسی حقیقت کو کھو کر ٹھوکریں کھائی ہیں، وہ اللہ کی ذات پر ایمان رکھتی ہے لیکن دوسری قوتوں کے سامنے جھکتی ہے۔ وہ اللہ کی صفات کو مانتی ہے، لیکن دستِ سوال دوسروں کے سامنے دراز کرتی ہے۔ دلوں کو آباد دوسروں کے تصورات سے کرتی ہے۔ بڑی قوتوں کے نمائندہ افراد کو وہ اپنی قسمت کا مالک سمجھتی ہے۔ اور ان کی خواہشات پر اپنا سب کچھ قربان کردینا عقل کا تقاضا جانتی ہے۔ اس طرح سے اس نے اپنے اوپر وہ ظلم توڑا ہے جس سے اس کی پوری شخصیت بلکہ پوری تاریخ لہولہو ہو کر رہ گئی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کیلئے فرمایا گیا ہے کہ کاش! یہ ظالم لوگ اس وقت کو دیکھ سکتے جب یہ عذاب سے دوچار ہوں گے۔ تب ان کو پتہ چلے گا کہ دنیا میں اللہ کی قوت کے مقابلے میں کوئی قوت نہیں۔ وہاں بڑے بڑے حکمرانوں کو سرنگوں دیکھیں گے۔ کوئی کسی کو عذاب سے نہیں بچا سکے گا اور اللہ کا عذاب ایسا شدید ہوگا کہ آج اس کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں۔ تب ان کو اندازہ ہوگا کہ ہم نے جن قوتوں سے ایسا تعلق قائم کیا جیسا اپنے اللہ سے کرنا چاہئے تھا اور انہیں ہم نے عملی طور پر اللہ کا شریک بنائے رکھا وہ تو آج کسی اختیار کے حامل نہیں۔ نہ وہ اپنے آپ کو بچاسکیں گے اور نہ ہی کسی اور کو بچاسکیں گے۔ لیکن اس وقت کا جاننا کسی کام نہیں آئے گا کیونکہ وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔

Marfat.com

قوت کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے

اس آیتِ کریمہ میں اِنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا نہایت قابلِ توجہ ہے۔قیامت کے دن جب کافر لوگ عذاب سے دوچار ہوں گے اور کوئی انہیں بچانے والا نہیں ہوگا اور جس طرح یہ پکڑے جائیں گے اسی طرح ان کے لیڈر بھی عذاب میں گرفتار ہوں گے تب ان کو پتہ چلے گا کہ سارا زور اور اختیار اور قوت تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔درحقیقت یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے امتیں پھسلتی ہیں۔انسان کو کبھی کوئی لالچ بہکاتا ہے اور کبھی ڈر اور خوف اسے منزل اور راستہ بدلنے پر مجبور کردیتا ہے۔جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ میرا سامنا ایک بہت بڑی قوت والے سے ہے۔میں اس کی قوت کا مقابلہ نہیں کرسکتا اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے صفحۂ ہستی سے مٹادے گا یا میرا جینا عذاب کردے گا۔اس خوف کے نتیجے میں وہ سب کچھ کرنے کیلئے تیار ہوجاتا ہے چاہے اس سے ایمان بچے نہ انسانیت۔یہاں یہ بتلایا جارہا ہے کہ تمہیں اللہ کی قوت کا یقین قیامت کے دن عذاب دیکھ کر تو آئے گا ہی، کاش! آج یہ یقین اپنے اندر پیدا کرلو کہ جن پتلیوں کو تم طاقت کا مظہر سمجھ رہے ہو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔طاقت کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔تاریخ ایسی مثالوں سے بھرپور ہے کہ اللہ کی مدد سے چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں۔ممولے نے شہباز کو شکست دی۔نہایت پسماندہ قوتوں نے صدیوں کی مستحکم حکومتوں کو اکھاڑ پھینکا۔بڑے بڑے خداوندِ جہاں اس دنیا میں اٹھے،لیکن دستِ بے دادِ اجل سے کبھی رستگاری نہ پاسکے۔جس قوم نے بھی تاریخ کے اس سبق کو پہچانا اس نے تاریخ میں اپنا نام ثبت کردیا۔لیکن جس قوم نے اس سبق سے روگردانی کی وہ ایک بھولی بسری کہانی کے سوا اپنی کوئی جگہ نہ بناسکی۔

درحقیقت یہی وہ سب سے بڑا شرک ہے جس سے قرآن نے انسانوں کو بچانے کی کوشش کی ہے کہ انسان انسانوں سے وہ رشتہ جوڑتا ہے جو درحقیقت اپنے اللہ سے اسے جوڑنا چاہیے۔اگلی آیتِ کریمہ میں مشرکانہ زندگی سے جو نتیجہ نکلتا ہے اسی کے ایک اور پہلو کو واضح فرمایا گیا ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ O وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ O (البقرۃ: ۱٦٦ تا ۱٦۷)

(اس وقت کا خیال کرو جب کہ مقتدا اپنے پیروکاروں سے اظہارِ برأت کریں گے اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تعلقات یک قلم ٹوٹ جائیں گے o اور ان کے پیرو بھی کہیں گے: اے کاش! ہمیں دنیا میں ایک بار اور جانا نصیب ہوتا کہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہارِ برأت کرسکتے، جس طرح انہوں نے ہم سے اظہارِ برأت کیا ہے۔اسی طرح اللہ ان کے اعمال ان کو سرمایۂ حسرت بناکر دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا)

Marfat.com

متبوعین کی تابعین سے براءت

اِذۡ تَبَرَّاَالَّذِیۡنَ بدل ہے اِذۡ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ سے۔ یہ اسی عذاب کی مزید وضاحت ہے کہ مشرکوں نے جن لوگوں کو دنیا میں اللہ کا شریک اور ہمسر بنائے رکھا اور ان سے اس طرح محبت کی جیسے اللہ سے محبت کرنی چاہئے تھی۔ قیامت کے دن وہ لوگ جب مدد کیلئے ان کے پاس جائیں گے تو وہ صاف انہیں پہچاننے سے انکار کردیں گے۔ اور ان سے اظہارِ برأت کریں گے۔ یہ انہیں بار بار درخواست کریں گے کہ ہم دنیا میں آپ کے پیروکار رہے ہیں اور آپ سے محبت اور تعلق کو ہمیشہ اپنا اثاثہ سمجھا اور ہمیشہ آپ کی غیر مشروط اطاعت کی۔ لیکن وہ ان کے ساتھ ہر طرح کے تعلق سے انکار کردیں گے۔ دنیا میں جن تعلقات کی مضبوطی پر یہ ناز کرتے تھے اور دوسروں کو ڈراتے تھے وہاں وہ تعلقات یکسر ختم ہوکر رہ جائیں گے۔ دنیا میں قیامت کی یہ منظرکشی یہ بتانے کیلئے ہے کہ جو لوگ اپنی رہنمائی اور رہبری کیلئے غلط رہنماؤں اور پیشواؤں کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر زندگی بھر ان کے پیچھے چلتے رہتے ہیں انہیں اس سے سبق سیکھنا چاہئے۔ اور خاص طور پر امتِ مسلمہ کے افراد سابقہ امتوں کی ان گمراہیوں سے عبرت حاصل کریں اور ہر طرح اپنے آپ کو اس برے انجام سے بچانے کی کوشش کریں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھیں کہ برے رہنماؤں کے پیچھے چلنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس بات کا بھی یقین پیدا کریں کہ قیامت آئے گی اور وہاں ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا جوابدہ ہوگا۔ کوئی لیڈر اپنے پیروکاروں کے کام نہیں آئے گا اور خود لیڈر بھی اپنے انجام سے بچ نہیں سکیں گے۔ وہاں اگر کوئی چیز کام آئے گی تو وہ ایمان وعمل کا سرمایہ ہے، جو اللہ کے ساتھ حقیقی تعلق سے وجود میں آتا ہے اور اس تعلق کی تفصیلات سے قرآن وسنت مامور ہیں۔ آج جس نے ان ہدایات سے فائدہ اٹھالیا، وہ کل کو سرخرو ہوگا، ورنہ اس کا انجام بھی وہی ہوگا، جس کا تذکرہ ہم یہاں پڑھ رہے ہیں۔

تابعین کا ردِ عمل

اگلی آیتِ کریمہ میں ایک اور منظر دکھایا جارہا ہے کہ جب پیروکار یہ دیکھیں گے کہ ان کے لیڈر اور ان کے رہنما ان سے بالکل کٹ گئے ہیں اور وہ کسی طرح ان کی مدد کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں تو پھر وہ ردِعمل کے طور پر اللہ سے درخواست کریں گے کہ یا اللہ! ہمیں دنیا میں ایک بار جانے کا موقعہ عطا فرما تو ہم دنیا میں جاکر ان سے اسی طرح اظہارِ برأت کریں، جس طرح انہوں نے ہم سے کیا ہے۔ لیکن یہ ان کی خواہش حسرت کے سوا کچھ نہیں ہوگی۔ وہ بار بار اس کی تمنا کریں گے، لیکن یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی اور اپنے اعمال کے نتیجے میں جس عذاب سے وہ دوچار ہوچکے ہوں گے، اس سے نکلنا انہیں کبھی نصیب نہ ہوگا۔ قرآنِ کریم نے اس مضمون کو اور بھی کئی جگہ ذکر فرمایا ہے کہ قیامت کے دن جب ہوش آئے گا تو پیروکار اور فرمانبرداری کرنے والے، اپنے لیڈروں سے بری طرح اظہارِ بے زاری کریں گے اور اللہ سے درخواست کریں گے کہ یا اللہ! ہمارے لیڈروں کو دگنا عذاب دے کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور انہوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا۔ لیکن ان کا یہ واویلا حسرت کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا اور یہ بجائے خود ان کیلئے ایک عذاب کی حیثیت اختیار کرجائے گا کہ وہ اپنے رہنماؤں کے ساتھ اپنی قربانیوں اور وفاداریوں کو ایک عظیم اثاثہ سمجھتے تھے۔ لیکن آج ان کے وہی اعمال ان کیلئے سرمایہ حسرت بن جائیں گے۔

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا

مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَ
اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦٩﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا
مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ
كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ
صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٧١﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١٧٢﴾
اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ
بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٧٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ
الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ
بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٧٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى

Marfat.com

وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿١٧٦﴾

پارہ ۲، رکوع: ۵ (اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تو بس تمہیں برائی اور بے حیائی کی راہ سجھائے گا اور اس بات کی کہ تم اللہ کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کو تم نہیں جانتے۔ جب ان سے کہا جائے کہ تابعداری کرو اس حکم کی جو اللہ نے نازل فرمایا ہے۔ تو کہتے ہیں ہرگز نہیں! ہم تو تابعداری کریں گے اس کی جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہِ ہدایت پر رہے ہوں؟ مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیزوں کو پکارے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سنتی سمجھتی ہوں۔ یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں یہ سمجھ نہیں سکتے۔ اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ اور اللہ ہی کے شکرگزار بنو اگر تم اس کی بندگی کرنے والے ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے حرام کیا ہے تم پر مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی مجبور ہو جائے اور وہ خواہشمند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس کیلئے کوئی گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ بے شک جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں سے اتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف دوزخ کی آگ بھر رہے ہیں۔ ان لوگوں سے اللہ قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا نہ ان کو پاک کرے گا، ان کیلئے بس دردناک عذاب ہے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت پر اور عذاب کو مغفرت پر ترجیح دی یہ کس قدر صبر کرنے والے ہیں جہنم کی آگ پر۔ یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کو ایک قولِ فیصل بنا کر اتارا اور جن لوگوں نے اس کتاب کے معاملہ میں اختلاف کیا ہے وہ مخالفت میں بہت دور نکل گئے ہیں) (۱۶۸ تا ۱۷۶)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرة: ۱۶۸ تا ۱۶۹)

Marfat.com

(اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تو بس تمہیں برائی اور بے حیائی کی راہ سجھائے گا اور اس بات کی کہ تم اللہ کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کو تم نہیں جانتے)

شرک کی ایک اور صورت سے اجتناب کا حکم

گزشتہ رکوع سے جو نیا سلسلۂ کلام شروع ہوا ہے اس کا آغاز ''توحید'' کی دعوت سے ہوا ہے۔ پھر ''توحید'' پر ایک زوردار دلیل بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی اظہارِ تعجب کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ ایسے واضح دلائل کی موجودگی میں بھی انسانوں کا حال یہ ہے کہ وہ نہ صرف اللہ کے ساتھ دوسری قوتوں کو شریک ٹھہراتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہیں جیسی وہ اللہ سے کرتے ہیں۔ گویا ان کے شرک کی پہلی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ میں غیر اللہ کو اس طرح بسا لیتے ہیں، جیسے اللہ کو بسانا چاہئے۔ ان کے ساتھ ان کی وارفتگی اور فدائیت کا حال یہ ہے کہ ان کے نزدیک اللہ اور غیر اللہ میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں ان کے شرک کی دوسری صورت بیان کی جارہی ہے کہ ان کے دل و دماغ میں اللہ کے ساتھ ٹھہرائے گئے شریکوں کیلئے صرف ایک وابستگی اور تعلق ہی نہیں ہے بلکہ عملی زندگی پر اس کے اثرات بھی بہت گہرے ہیں۔

بالکل سامنے کی بات ہے کہ جب آدمی کسی کو اپنا اِلٰہ مانتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی غیر مشروط عبادت، محبت اور اطاعت کا عہد کرتا ہے اور اپنے دل و دماغ کو اس تعلق سے معمور کر لیتا ہے۔ لیکن یہ تعلق صرف ایک دعویٰ ہی رہتا ہے، جب تک عملی زندگی میں اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ عملی زندگی ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی کے ساتھ عبودیت کے تعلق کا دعویٰ کرنے والا اپنے اس دعوے میں سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ اگر وہ اپنے ہر معاملے اور ہر فیصلے میں اپنے تسلیم کردہ اِلٰہ کے فیصلے کو قبول کرتا ہے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے۔ لیکن اگر اس کے عملی زندگی میں تمام فیصلے اس سے آزاد رہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے دعوے میں یا تو جھوٹا ہے اور یا وہ دعوے کی حقیقت کو نہیں جانتا۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں عربوں سے خطاب کر کے کہا جارہا ہے کہ اگر تم اللہ کو الوہیت میں وحدہٗ لاشریک سمجھتے ہو تو پھر عملی زندگی میں اس کا اظہار ہونا چاہئے۔ اس کے اظہار کی آسان اور اولین شکل یہ ہے کہ تم اپنی غذا کیلئے ان چیزوں کو استعمال کرو یا ان چیزوں کو غذا بناؤ جنہیں اللہ نے حلال اور طیب ٹھہرایا ہے۔

''حلال'' حلّ سے ہے، جس کا معنی ہے ''گرہ کھول دینا'' حلال وہ چیز ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ جس کی گرہ کھول دیتے ہیں یعنی اس سے پابندی ہٹا لیتے ہیں اور بندوں کیلئے اس کے استعمال کی اجازت ہوجاتی ہے۔ طیب ''پاکیزہ'' چیز کو کہتے ہیں یعنی ایسی چیز کہ جو ظاہری گندگی سے بھی پاک ہو، عقلی اور اخلاقی مفاسد سے بھی مبرّا ہو اور ہر طرح کی باطنی اور شرک کی آلودگی سے محفوظ ہو یعنی تمہیں اپنی غذا ان چیزوں سے حاصل کرنی چاہئے جنہیں اللہ نے حلال ٹھہرایا ہے اور پاکیزہ بنایا ہے۔ عقلِ سلیم جن کی پاکیزگی کو محسوس کرتی ہے اور فطرتِ سلیمہ جس سے گھن نہیں کھاتی اور قوموں کا معروف ہمیشہ اس کی صحت پر اتفاق رکھتا ہے اور شرک کی کوئی آلودگی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکی۔

زندگی کے معاملات پر تحلیل و تحریم کے حوالے سے اثر انداز ہونا یہ شرک کی سب سے جلی صورت ہے۔ شیطان نے ہمیشہ اسی راستے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انسان نے ہمیشہ اس صورت کے جلی ہونے کے باوجود ارادۃً یا خطاً اس میں ٹھوکر کھائی ہے۔ ایک آدمی اللہ کو ماننے کا اقرار کرتا ہے، لیکن تحلیل و تحریم کا حق وہ صرف اللہ کو دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ کبھی وہ اس کا حق شیطان کو دے دیتا ہے اور شیطانی

Marfat.com

قوتوں کے سورنگ ہیں، جن کی پہچان میں ٹھوکر کھاتا ہے اور کبھی یہ حق اپنے معاشرے کو، کبھی سماج کو، کبھی پارلیمنٹ کو، کبھی آئین اور قانون کو دیتا ہے، جو کھلم کھلا ہر معاملے میں دخیل ہو کر اپنی بندگی کرواتے اور اپنی الوہیت منواتے ہیں۔ لیکن انسان کو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ میں کسی شرک کا ارتکاب کر رہا ہوں حالانکہ کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر پروردگارِ عالم کو ہمارے معاملات میں حلت و حرمت کے حوالے سے فیصلے کا اختیار نہیں یعنی وہ یہ اختیار نہیں رکھتا کہ ہماری جس بات کو چاہے حلال قرار دے دے اور جس کام کو چاہے حرام قرار دے دے تو پھر وہ آخر الٰہ کیسا؟ لیکن عرب اس بات کو سمجھنے کیلئے تیار نہیں تھے اور آج کا انسان بھی اس کے لئے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ مسلمان بھی کلمہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے آزادی چاہتے ہیں اور صدیوں سے اس بات پر ان کا اصرار جاری ہے حالانکہ قرآنِ کریم نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر تحلیل و تحریم شرک ہے۔ اسی وجہ سے قرآنِ کریم میں شرک اور تحلیل و تحریم کا مضمون جگہ جگہ ایک ساتھ بیان ہوا ہے۔ **وقال الذین اشرکوا لو شاء اللہ ماعبدنا من دونہ من شیء ولا حرمنا من دونہ من شیء** ''اور مشرک کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی چیز کو پوج سکتے اور نہ اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے''۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شرک اور تحلیل و تحریم دونوں ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ شیطان نے اسی معاملے میں ہمیشہ لوگوں کو گمراہ کر کے اپنی بندگی کروائی ہے۔ کتنے ایسے جانور ہیں جنہیں اللہ نے حلال ٹھہرایا لیکن مشرکینِ عرب نے شیطانی وسوسے پر ان کو اپنے لئے حرام ٹھہرایا اور کتنی حرام چیزیں ہیں جنہیں اللہ نے حرام ٹھہرایا لیکن دنیا نے نفسانی یا شیطانی وساوس میں مبتلا ہو کر انہیں اپنے لئے حلال کر لیا۔ قرآنِ کریم نے دونوں طرح کی مثالیں جا بجا بیان کی ہیں۔ سورۃ مائدہ اور سورۃ انعام میں بطورِ خاص اس کی تفصیل آئے گی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ شیطان نے جب حضرتِ آدم کی اولاد کو توحید کے راستے سے ہٹانے کا اعلان کیا تھا تو اس نے پوری صفائی اور جرأت کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا تھا کہ حلت و حرمت کے حوالے سے بطورِ خاص اولادِ آدم کو نشانہ بناؤں گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے پوجا پاٹ کے طریقوں اور بندگی کے مختلف اسالیب کی صورت میں انسانوں میں شرک داخل کیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تحلیل و تحریم کے ذریعے اس نے انسان کے اندر جو شرک کی پرورش کی ہے، وہ بھی بجائے خود ایک قابلِ ذکر چیز ہے۔ اسی کا ذکر دوسری آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے۔ ''وہ تمہیں صرف کھانے پینے کی چیزوں میں ہی حلال کو حرام سے بدل کر اور حرام کو حلال سے بدل کر شرک میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ اس کی دشمنی اتنی واضح ہے کہ وہ تو تمہیں ہر طرح کی برائی اور بے حیائی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے''۔

سوء اور فحشاء کا مفہوم

سوء کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے جسمانی اور مادی نقصان پر بھی بولا جاتا ہے اور ہر طرح کے گناہ پر بھی۔ یہاں ظاہر ہے کہ گناہ ہی مراد ہے۔ لیکن اکثر مفسرین اس سے ایسا گناہ مراد لیتے ہیں، جسے دیکھ کر ہر عقل مند شریف آدمی کو دکھ محسوس ہو اور **فحشاء** کا لفظ کھلی ہوئی بدکاری اور بے حیائی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس سے زنا، لواطت، اور ننگے ہو کر طواف کرنے جیسی برائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن جب **سوء** اور **فحشاء** دونوں ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں تو یہ نہ صرف تمام چھوٹی برائیوں ہی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں بلکہ ہر طرح کے مالی، جسمانی اور عقلی نقصانات اور کج رویاں بھی اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ یہ تو وہ گناہ اور بے حیائیاں ہیں جن کا تعلق انسانی معاملات اور انسانی اخلاق سے ہے۔ انہیں راستوں سے شیطانی قوتیں انسانوں میں داخل ہو کر تہذیب، ثقافت، اور

Marfat.com

تمدن کو تباہ کرتی ہیں۔ انہیں کے زیرِ اثر اخلاقِ فاسدہ کی اشاعت کیلئے نام نہاد علوم بھی وجود میں آتے ہیں اور ان برائیوں کو اجتماعی شکل دے کر آئین اور قانون کو ان کی پاسبانی کا فرض سونپ دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے الاہوں یعنی خداؤں کی ایک فصل تیار ہو جاتی ہے، جو پوری قومی زندگی پر امر بیل کی طرح چھا جاتی ہے۔ قومیں اس شرک میں مبتلا ہوتی ہیں، لیکن وہ اپنی روشن خیالی میں مست رہ کر کبھی یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کرتیں کہ ہم مسلمان کہلاتے ہوئے شرک کی کس دلدل میں جا اترے ہیں۔

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ اس کی ایک شکل تو وہ ہے جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت مشرکین میں موجود تھی کہ وہ اپنے بہت سارے مشرکانہ اعمال پر اسی بات سے دلیل لاتے تھے کہ یہ جو کچھ ہم مشرکانہ اعمال کر رہے ہیں اگر اللہ کو یہ منظور نہ ہوتے تو ہم کبھی اسے نہ کرتے اور نہ کبھی ہمارے آباؤ اجداد اس میں مبتلا ہوتے۔ پروردگار کا اس سے ہمیں نہ روکنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس پر خوش ہے۔

آج اس جدید دور میں فلسفے کے نام سے ہندو ازم اور عیسائیت میں بالخصوص مذہب کے حوالے سے ایسی ایسی چیزیں متعارف کرائی جا رہی ہیں اور ایسی ایسی بداعمالیوں پر مذہب سے دلیلیں تلاش کر کے لائی جا رہی ہیں کہ پرانا شرک اس کے سامنے ماند پڑ گیا ہے۔ یہ موقعہ نہیں کہ ہم اس کی وضاحت کریں۔ اس آیت کے پہلے لفظ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ نے ایسی تمام کاوشوں پر کا یہ کہہ کر ہمیں سراغ دے دیا ہے کہ یہ جو کچھ فلسفہ کے نام سے ہو رہا ہے یا جو کچھ مشرکین مکہ کہتے تھے، یہ سب شیطان کا امر تھا اور ہے۔

امر کا معنی و مفہوم

اَمَر کا معنی جس طرح "حکم دینا" ہوتا ہے، اسی طرح "کوئی بات سمجھانا، مشورہ دینا، دل میں ڈالنا اور وسوسہ اندازی اور نگاہوں میں کھبا دینا" بھی ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کے قلب میں ایک شیطانی الہام واثر ہوتا ہے اور دوسرا فرشتہ کی طرف سے۔ شیطانی وسوسہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ برے کام کرنے کے فوائد اور مصالح سامنے آتے ہیں اور حق کو جھٹلانے کی راہیں کھلتی ہیں۔ الہامِ فرشتہ کا اثر خیر اور نیکی پر انعام و فلاح کا وعدہ اور حق کی تصدیق پر قلب کا مطمئن ہونا ہوتا ہے۔

بڑے بڑے عرب شعراء بھی امر کو اس معنی میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ ایک مشہور حماسی شاعر کا شعر ہے:

اَمَرْتُهُمْ اَمْراً بِمُنْعَرِجِ اللِّوٰى   فَلَمْ يَسْتَبِيْنُوا الرُّشْدَ اِلَّا ضُحَى الْغَدِ

(میں نے ان کو اپنے مشورے سے منعرج اللوی ہی میں آگاہ کر دیا تھا لیکن میری بات ان کی سمجھ میں دوسرے دن کی صبح سے پہلے نہ آسکی)

امر کا دوسرا معنی ہوتا ہے "حکم دینا" اس معنی میں اس لفظ کا استعمال تو بہت معروف ہے۔ اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو قرآنِ کریم کی یہ آیتِ کریمہ ہمارے سامنے آج ان حقائق کو کھولتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، جن کا تصور بھی اس سے پہلے مشکل تھا۔ آج سے پہلے سوچا بھی نہ جا سکتا تھا کہ اس وسیع سطح پر کبھی شیطانی قوتیں اور کفر کی طاقتیں تمام مسلمانوں کو لادینیت کا حکم دے سکتی ہیں اور ان کی ایجنسیاں اور ان کے خفیہ ادارے، مسلمان ملکوں سے اس طرح مراسم مستحکم کر سکتے ہیں اور مسلمانوں میں سے اپنے ڈھب کے آدمی اس طرح تلاش کر سکتے ہیں کہ اسلام کے اساسی عقائد کے حوالے سے ان کے نظامِ تعلیم، ان کے دفاعی ادارے اور ان کی تہذیب و ثقافت میں اس طرح تبدیلیاں پیدا

Marfat.com

کردیں کہ امتِ مسلمہ کو اس وقت اس کی خبر ہو جب پانی سر سے گزر چکا ہو اور سیاسی اور حکومتی سطح پر غیر مسلم طاقتور حکومتیں اس طرح مسلمانوں کو لیڈ کریں اور ہر طرح کا دباؤ ڈال کر اس طرح ان سے اپنے مطلب کے فیصلے کروائیں کہ امتِ مسلمہ ان کے سامنے بے بس دکھائی دیتی ہو۔

اس صورتِ حال کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کا یہ کہنا کہ شیطان تمہیں ہر طرح کی برائی اور بے حیائی کا حکم بھی دیتا ہے اور مشورہ بھی دیتا ہے۔ اس کا حقیقت میں کیا مفہوم ہے؟ اور پھر اسی پر بس نہیں وہ امتِ مسلمہ کے راہنماؤں اور لیڈرانِ کرام کو مجبور کرتا ہے یا انہیں ذہنی غسل دیتا ہے کہ وہ اپنی قوم کو یہ یقین دلائیں کہ شیطان کی نمائندہ قوتیں جو کچھ تم سے کروا رہی ہیں، وہی اصل میں اللہ اور اس کے دین کا منشا ہے۔ تم نے اب تک اپنے دین کے نام سے جن باتوں کو ترجیح کے قابل سمجھ رکھا تھا وہ سراسر غلط تھا۔ اب تمہیں نئی روشنی میں آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیے اور پھر تمہیں اپنے اساسی عقائد میں تبدیلی بھی لانی پڑے تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

جب کوئی شخص یا کوئی قوم شیطانی قوتوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے تو ان کے فیصلہ کرنے والے ذہنوں کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر بالکل بانجھ ہو گئے ہیں۔ اپنے سیاسی، قومی اور تہذیبی معاملات کو وقت کی غالب قوتوں کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ادھر سے جو رہنمائی ملتی ہے اسی کے مطابق فیصلے کرنا یہ اپنی ذمہ داری سمجھتے اور اسی کو وقت کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک عام مذہبی رسوم کا تعلق ہے اس میں جب انہیں اللہ کے احکام کا حوالہ دیا جائے تو نہایت پست سطح پر اتر کر عام عوام کی طرح کے سہارے تلاش کرنے لگتے ہیں اور انہیں کو اپنی دینی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ اگلی آیتِ کریمہ میں ان کے اسی رویے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (البقرة: ۱۷۰)

(جب ان سے کہا جائے کہ فرمانبرداری کرو اس حکم کی جو اللہ نے نازل فرمایا ہے۔ تو کہتے ہیں ہرگز نہیں! ہم تو فرمانبرداری کریں گے اس کی جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہِ ہدایت پر رہے ہوں؟)

آباؤ اجداد کی اندھی تقلید

جب مشرکین سے یہ کہا جاتا کہ تم نے جو مشرکانہ رسوم بنا رکھی ہیں اور اپنی مرضی سے حلال و حرام کے فیصلے کر رکھے ہیں بلکہ خود ساختہ شریعت بنا رکھی ہے۔ آخر اس کا کیا جواز ہے؟ تمہارے سامنے اللہ کے احکام پیش کیے جا رہے ہیں۔ اللہ کا پیغمبر نہایت محکم دلائل کے ساتھ تمہارے سامنے اللہ کا دین پیش کر رہا ہے، تو تم اسے قبول کرنے سے کیوں گریز کر رہے ہو؟ تو وہ جواب میں یہ کہتے کہ ہم کسی ہدایت کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ہمارے پاس ہدایت کا صرف ایک ہی سرچشمہ ہے، وہ ہمارے آباؤ اجداد ہیں۔ ہم نے جو روایت ان سے پائی ہے ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ اپنے بڑوں کی تقلید کرنا اچھی قوموں کا ہمیشہ طریقہ رہا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس پر تنقید کرتے ہوئے تقلید اور پیروی کیلئے ایک اصول دے دیا ہے۔ جس کو بنیاد بنا کر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کس کی پیروی صحیح ہے اور کس کی پیروی غلط۔

Marfat.com

قرآنِ کریم کے عطا کردہ اصول کا حاصل یہ ہے کہ کسی بات کا آباؤاجداد کی میراث یا روایت بن جانا نہ اس کے غلط ہونے کا ثبوت ہے اور نہ اس کے صحیح ہونے کا کیونکہ جنہیں آباؤاجداد کہا جاتا ہے، وہ بھی اپنی اولاد کی طرح انسان ہی تھے۔ ان میں اچھے لوگ بھی تھے اور برے بھی، عقل والے بھی اور کم عقل بھی اور آج ان کی اولاد کل کو اپنی اولاد کیلئے آباؤاجدا کی حیثیت ہی اختیار کر جائے گی۔ تو آج ان کی جو اچھی یا بری حالت ہے یہ آباؤاجداد بن جانے سے بدل تو نہیں جائے گی۔ اس لئے محض کسی کا دنیا سے چلا جانا اور ان کا باپ دادا کہلانا نہ ان کے اچھے ہونے کی دلیل ہے اور نہ ان کے برے ہونے کی۔ اس لئے ان کی باتوں اور ان کے کاموں کے بارے میں یا ان کے مذہبی خیالات کے حوالے سے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ مرحوم ہو چکے ہیں، اس لئے ان کی ہر بات قبول کر لی جائے بلکہ ان کے خیالات ان کی روایات اور ان کے فیصلوں کو غیر جانبداری سے دیکھا جائے گا کہ ان کی حیثیت کیا ہے؟ اگر تو ان کا تعلق مجرد عقل سے تعلق رکھنے والی باتوں سے ہے تو انہیں عقل کے ترازو میں تولا جائے گا۔ اگر عقلِ صحیح انہیں قبول کر لے تو پورے احترام سے انہیں قبول کر لیا جائے گا ورنہ محض اس لئے اسے قبول نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمارے بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ اگر ان کی باتوں کا تعلق دین اور مذہب سے ہے تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ کیا اس کی کوئی مضبوط اور قابلِ اعتماد سند ہے یا نہیں؟ اگر واقعی کوئی مضبوط اور قابلِ اعتماد سند ان کی باتوں اور عقائد کو حضرت اسمٰعیل سے وابستہ کر دے تو یقیناً اس کے سامنے سر جھکا دیا جائے گا۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ یہ سب خانہ ساز باتیں ہیں تو محض آباؤاجداد کا احترام ان باتوں کو قبول کرنے کیلئے کافی نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل کی باتوں میں حجت اور دلیل عقل کو ہونا چاہئے اور دین کی باتوں میں واجب التسلیم دین کے حوالے کو ہونا چاہئے۔ جس طرح غلط بات کو آج کے کسی آدمی کے حوالے سے قبول نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح آباؤاجداد کے حوالے سے بھی قبول کرنا گمراہی ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے اس آیت اور اس طرح کی دوسری آیات کو ائمہ فقہ کی تقلید اور عدمِ تقلید کی بحث میں کھینچ لیا ہے۔ اولاً تو اس بحث سے ان آیات کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں لیکن اگر اس کے مفہوم سے اس حوالے سے بھی کوئی بات سمجھی جا سکتی ہے تو وہ بھی بالکل واضح ہے کہ شرعی مسائل دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن و سنت کے احکام بالکل واضح ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو اجتہاد اور قیاس کے ذریعے قرآن و سنت سے استنباط کیئے جاتے ہیں۔ تو اگر کسی عالم کے بارے میں یہ اطمینان ہو جائے کہ اس کے پاس قرآن و سنت کا علم بھی ہے اور اسے درجۂ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحۃً قرآن و سنت میں نہیں ان کو نصوصِ قرآن و سنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے۔ تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید اور اتباع بالکل جائز ہے کیونکہ ایسے عالم کی تقلید کا مطلب اس کا حکم ماننا اور اس کا اتباع کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی تقلید اور اتباع اللہ کے حکم کی اطاعت اور اس کا اتباع ہے۔ امامِ قرطبی نے اسی آیت کے ضمن میں یہی بات اپنے طریقے سے فرمائی ہے۔

تعلق قوم بھذہ الایۃ فی ذم التقلید (الیٰ) وھذا فی الباطل صحیح اما التقلید فی الحق فاصل من اصول الدین وعصمۃ من عصم المسلمین یلجاء الیھا الجاھل المقصّر عن درک النظر (قرطبی، ص ۱۹۴، ج ۲)

کچھ لوگوں نے اس آیت کو تقلید کی مذمت میں پیش کیا ہے اور یہ باطل کے معاملہ میں تو صحیح ہے۔ لیکن حق کے معاملہ میں تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حق میں تقلید کرنا تو دین کے اصول میں سے ایک مستقل بنیاد ہے اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ دین کے معاملہ سے تقلید ہی پر اعتماد کرتا ہے۔

Marfat.com

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ O (البقرة: ۱۷۱)

(مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیزوں کو پکارے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سنتی سمجھتی ہوں۔ یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں یہ سمجھ نہیں سکتے)

صورتِ حال کی تمثیل صورتِ حال ہے

یہ تمثیل ان لوگوں کی ہے جو عقل وبصیرت سے کام لینے کی بجائے اندھے بہرے ہو کر محض باپ دادا کی تقلید پر فخر کر رہے ہیں۔ جس طرح بھیڑ بکریاں بغیر سوچے سمجھے اپنے چرواہے کے پیچھے چلتی رہتی ہیں انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ چرواہا انہیں کہاں لے کر جائے گا اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ جدھر ایک بھیڑ بکری نے منہ کر لیا سب اس کے پیچھے منہ اٹھائے چل پڑیں۔ قطع نظر اس سے کہ ادھر جانے میں انہیں نقصان ہوگا یا فائدہ۔ یہ بھی اپنے ماں باپ کے پیچھے بھیڑ بکریوں کی طرح چل رہے ہیں یا انہیں میں سے کسی نے کوئی نئی راہ نکال لی ہے تو وہ اس راہ پر چل نکلے ہیں۔ بس دوسروں کی پیروی اور زمانے کے ساتھ چلتے رہنا یہ ان کا طرۂ امتیاز ہے، اس لحاظ سے ان کا رویہ بالکل بھیڑ بکریوں جیسا ہے۔ کبھی اگر چرواہا محسوس کرتا ہے کہ میرا گلہ غلط طرف چل نکلا ہے تو وہ انہیں اگر پیچھے سے پکارتا ہے تو پورا گلہ اس کی آواز تو سنتا ہے لیکن یہ سمجھنے کی زحمت نہیں کرتا کہ وہ انہیں کہتا کیا ہے؟ یہ لوگ بھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ہمیں حقائق کی طرف بلایا جا رہا ہے، کبھی ہم ان پر غور کرنے کی کوشش کریں، ممکن ہے اس میں ہمارا ہی بھلا ہو۔

قرآنِ کریم کہتا ہے، یہ لوگ اپنی روش بدلنے کیلئے بالکل تیار نہیں کیونکہ اس کیلئے جن بنیادی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ان سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں۔ یہ بہرے ہیں، کوئی بات سن کے نہیں دیتے۔ یہ گونگے ہیں، اقرارِ حق کیلئے ان کی زبان کھلتی نہیں۔ یہ اندھے ہیں، حق کو دیکھ نہیں سکتے۔ ہدایت سے ان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔

تشبیہ اور تمثیل میں فرق

یاد رہے! اس آیتِ کریمہ میں جو مثال دی گئی ہے وہ تمثیل ہے تشبیہ نہیں۔ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ میں کامل مشابہت ہوتی ہے، دونوں کے اجزا تک میں تشبیہ تلاش کی جاتی ہے۔ لیکن ممثل اور ممثل بہ کے تمام اجزا کی ایک دوسرے سے مطابقت ضروری نہیں ہوتی بلکہ صرف صورتِ واقعہ کی صورتِ واقعہ سے مطابقت ضروری ہوتی ہے۔ نیز اس کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ جس چیز کی تمثیل دی جا رہی ہے اس کی پوری صورت واضح کی جائے بلکہ صرف اس صورتِ واقعہ کی وضاحت ضروری ہوتی ہے جس سے تمثیل دی جاتی ہے۔ اسی کے آئینہ میں اس کا عکس بھی دیکھ لیتے ہیں جس کی تمثیل پیش کرنا مقصود ہے۔ اسی لئے ہم نے اس تمثیل کی وضاحت میں اس صورتِ واقعہ کی وضاحت ضروری سمجھی ہے جس کی تمثیل بیان کی جا رہی ہے اور یہ وضاحت اس آیتِ کریمہ کے اصل مضمون کو سمجھنے کیلئے کافی ہے۔

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ O (البقرة. ۱۷۲)

(اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ اور اللہ ہی کے شکرگزار بنو اگر تم اس کی بندگی کرنے والے ہو)

بدعات وخرافات کا ابطال دلائل سے بھی ہوتا ہے اور مستحکم کردار سے بھی

اس آیتِ کریمہ میں تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ مسلمانوں سے خطاب کر کے فرمایا ہے کہ مشرکین اپنے مشرکانہ رسوم وآداب پر اڑے رہنا چاہتے ہیں اور وہ کسی طرح بھی سمجھنے کیلئے تیار نہیں تو تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تحلیل وتحریم کے حوالے سے جس حد تک ان کے خیالات کی اصلاح دلائل سے ضروری تھی وہ ضرورت پوری کر دی گئی۔ البتہ ان کی بدعات وخرافات کا اثر ختم کرنے اور اس کا زور توڑنے کیلئے ضروری ہے کہ تمہارے اپنے عمل میں کوئی کمزوری نہیں ہونی چاہئے۔ کھانے پینے کے معاملے میں جب بھی کبھی ایسی چیز سامنے آئے جو مشرکین کے نزدیک حرام ہے اور اللہ نے اسے حلال کیا ہے، تو تمہارے لئے ازبس ضروری ہے کہ تم ایسی نعمت کو ضرور استعمال میں لاؤ تا کہ مشرکین کو اندازہ ہو جائے کہ ان کے رویے کا طلسم ٹوٹ رہا ہے اور خود تمہارے اندر اللہ کی کبریائی اور اس کی حاکمیت مطلقہ کا عقیدہ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ جن خیالات کا وہ مدتوں قائل رہا ہو اور جن چیزوں کو عمر بھر استعمال کرتا رہا ہو تو جب اس سے مختلف اسے کسی بات کا حکم دیا جائے تو اس کیلئے اپنے خیالات کو بدلنا اور اپنے اکل وشرب کی عادات میں تبدیلی ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ بار بار معمول سے مختلف کام کرتے ہوئے ایک جھجک پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ وہ کمزوری ہے جس سے انسان کے ایمان کو نقصان پہنچتا ہے۔ بنی اسرائیل میں آلِ فرعون کے ساتھ رہ کر گائے کا تقدس بلکہ اس کی پرستش کا عقیدہ پیدا ہو گیا تھا۔ بنی اسرائیل جب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے ہجرت کر کے صحرائے سینا میں پہنچ گئے تو وہاں سب کچھ بدل جانے کے باوجود بھی گائے کی محبت اور اس سے عقیدت ان کے دل سے نکلنے نہیں پاتی تھی۔ اس لئے پروردگار نے ایک خاص واقعہ کے حوالے سے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ جس جانور کو ہم نے خود ذبح کیا ہے اور اس کا بیجان جسم ہمارے سامنے پڑا ہے اگر اس میں الوہیت کی کوئی بات ہوتی تو وہ اس طرح ہمارے ہاتھوں موت کا شکار نہ ہوتی۔

ہندوستان میں جب ہندوؤں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو ان کیلئے بھی سب سے بڑی رکاوٹ گاؤ سے عقیدت اور محبت کا عقیدہ تھا۔ وہ مسلمان ہو کر بھی گائے کا گوشت کھانے کیلئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان کے اندر کا چور انہیں اس جسارت سے روکتا تھا۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ آج تک اس کے اثرات مسلمان معاشرے میں باقی ہیں۔ بہانے بہانے سے گائے کے گوشت سے پرہیز ابھی تک بہت سارے مسلمانوں میں باقی ہے۔ پورا یورپ گائے کا گوشت کھاتا ہے اور اسے چھوٹے گوشت پر ترجیح دیتا ہے اور انہیں کسی بیماری کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے یہاں نجانے کتنی بیماریاں بڑے گوشت سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ اسی لئے علماء کرام نے یہ فتویٰ دے رکھا تھا کہ ''کوئی ہندو مسلمان ہونے کے بعد جب تک گائے کا گوشت نہ کھائے اس کا ایمان معتبر نہ ہوگا''۔

Marfat.com

ایسی ہی کوئی صورتحال یہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔معلوم ہوتا ہے نئے نئے مسلمان ہونے والے لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جنہیں وہ چیزیں کھانے میں تامل ہوگا جنہیں وہ جاہلیت میں حرام سمجھتے تھے اور اسلام نے اسے حلال کر دیا یا وہ انہیں حلال سمجھتے تھے اور اسلام نے انہیں حرام کر دیا۔انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ تم پرانی زنجیریں توڑ ڈالو۔اب وہ تمام پاکیزہ چیزیں جنہیں اسلامی شریعت نے حلال کر دیا ہے انہیں نہ صرف خوشدلی سے استعمال کرو بلکہ دوسرا حکم یہ دیا کہ اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کرو کیونکہ اس سے بڑھ کر اور شکر کا کیا مقام ہوسکتا ہے کہ اللہ نے تمہیں گمراہی سے نکالا اور ہدایت کے راستے پر ڈال دیا اور تمہارے لئے ایسی نعمتوں کو جائز ٹھہرایا جو اپنے ظاہر اور اپنے باطن کے لحاظ سے پاکیزہ،خوشگوار،معتدل،صحت بخش اور روح پرور ہیں۔اس کے بالمقابل شیطان نے تمہیں جن چیزوں کا خوگر بنا رکھا ہے وہ سب کی سب روح،عقل،جسم اور اخلاق کو نقصان پہنچانے والی اور بے حیائی اور بدکاری کی راہیں کھولنے والی ہیں۔تیسری بات یہ فرمائی کہ اگر تم اللہ ہی کے بندہ ہو اور اسی کا اپنا معبود جانتے ہو تو پھر اس کی عطا کردہ نعمتوں کو استعمال کرتے ہوئے تمہیں جھجک کیوں لاحق ہوتی ہے؟اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی کہیں شرک کے اثرات باقی ہیں اور جب تک یہ شرک کے اثرات نہیں نکلیں گے اللہ کے ساتھ تمہاری خالص بندگی مکمل نہیں ہو سکے گی۔تمہیں اندر اور باہر ہر طرف سے اللہ کا بندہ بننا چاہئے کیونکہ

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

سورۃ انعام کی آیات ذیل میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فَکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کُنْتُمْ بِاٰیٰتِہٖ مُؤْمِنِیْنَ O وَمَا لَکُمْ اَلَّا تَاْکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَقَدْ فَصَّلَ لَکُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْکُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْہِ ط وَاِنَّ کَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَھْوَآئِھِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ط اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ O وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ ط اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا کَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ O وَلَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاِنَّہٗ لَفِسْقٌ ط وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِھِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ ج وَاِنْ اَطَعْتُمُوْھُمْ اِنَّکُمْ لَمُشْرِکُوْنَ O (الانعام:118 تا 121)

(پس جس پر اللہ کا نام ذبح کے وقت لے لیا گیا ہو ان کو بے جھجک کھاؤ،اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھنے والے ہو O اور آخر تم ان چیزوں کو کیوں نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے جب کہ وہ چیزیں تمہارے سامنے وضاحت سے بیان کی جاچکی ہیں جو حرام کر دی گئی ہیں الا آنکہ تم ان میں سے بھی کسی چیز کے کھانے پر مجبور ہو جاؤ۔بہت سے لوگ اپنی من گھڑت باتوں کی آڑ لے کر بغیر کسی علم کے لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔تمہارا رب خوب جانتا ہے حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کو O گناہ ظاہر اور گناہ باطن دونوں سے باز آؤ۔جو لوگ گناہ کی کمائی

Marfat.com

کر رہے ہیں وہ اپنی کمائی کا عنقریب بدلہ پائیں گے ٥ ہاں! ان چیزوں میں سے نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، یہ اللہ کی نافرمانی ہے اور شیاطین ہیں جو اپنے دوستوں کو القا کر رہے ہیں تا کہ وہ تمہارے ساتھ بحثیں اٹھائیں اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے)

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (البقرة:١٧٣)

(اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے حرام کیا ہے تم پر مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی مجبور ہو جائے اور وہ خواہشمند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس کیلئے کوئی گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا نہائیت مہربان ہے)

ملتِ ابراہیم میں حلال وحرام

روئے سخن مشرکین کی طرف ہے کہ تم نے جس طرح تحلیل وتحریم کا حق جو خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اپنے لئے مباح کر لیا ہے اور اس کے نتیجے میں تم نے کتنی حلال نعمتیں ہیں جو حرام کر ڈالی ہیں اور کتنی حرام چیزیں ہیں جو اپنے لئے حلال کر لی ہیں۔ اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ تم اپنی اس خانہ ساز شریعت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اور تم بات بات پر ملتِ ابراہیم کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔ حالانکہ ملتِ ابراہیمی میں جو چیزیں حرام کی گئی تھیں وہ صرف وہ تھیں جو پیشِ نظر آیت میں ذکر کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ جتنی چیزیں تم نے خود حرام کر ڈالی ہیں اس کا ملتِ ابراہیم سے تو کوئی تعلق نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس آیتِ کریمہ اور بعض دوسری آیات سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور یا وہ خواہشاتِ نفس کے تحت اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں جو چیزیں حرام کی گئی ہیں وہ صرف وہ ہیں جن کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یا سورۃ انعام کی ایک آیت میں اس سے بھی زیادہ وضاحت سے فرمایا گیا ہے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ

"کہہ دو! مجھے جو وحی کی گئی ہے اس میں تو کسی کھانے والے کیلئے بجز اس کے کسی چیز کو حرام نہیں پاتا کہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت یہ چیزیں ناپاک ہیں یا پھر اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے۔" (۱۴۵)

Marfat.com

اس آیت کریمہ کے اگر سیاق وسباق کو سامنے رکھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں یہ نہیں بتایا جا رہا کہ اسلامی شریعت میں کیا چیزیں حلال ہیں اور کیا حرام ہیں؟ بلکہ صرف یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ تم نے ملتِ ابراہیم کا نام لے لے کر جن چیزوں کو حرام کر رکھا ہے ان کا ملتِ ابراہیم سے تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ ملتِ ابراہیم میں اگر کوئی چیزیں حرام تھیں تو وہ صرف چار چیزیں ہیں، جن کا ان دونوں آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اگر ان آیات کو شریعتِ اسلامی کے حوالے سے دیکھا جائے کہ یہی چار چیزیں اسلامی شریعت میں حرام ہیں اور اس کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں۔ تو یہ بات قرآنِ کریم کی دوسری آیات کے صریحاً خلاف ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے! ان دونوں آیتوں میں میتۃ یعنی مردار کو حرام کیا گیا ہے۔ اور اس کی جو تفصیل سورۃ مائدہ میں بیان کی گئی ہے اس میں مزید سات چیزیں بیان کی گئی ہیں۔

اَلْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ

بعض دوسری آیات میں اور بھی بعض چیزوں کو حرام کیا گیا ہے۔ اس لئے ان آیات سے یہ سمجھنا کہ اسلامی شریعت میں صرف یہی چیزیں حرام ہیں سراسر قرآنِ کریم کی وضاحتوں کے خلاف ہے۔ ان آیات کا صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم نے عرض کیا کہ مشرکین سے کہا جا رہا ہے کہ ملتِ ابراہیم میں تو صرف یہ چیزیں حرام ہیں باقی چیزوں کو تم نے کیسے حرام کر ڈالا؟ جبکہ حرام وحلال کا فیصلہ کرنا اللہ کی صفت ہے اور تم نے اپنے آپ کو اور یا اپنے بتوں کو اللہ کی صفات سے متصف کر ڈالا۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہو سکتا ہے؟ اب ہم ان چیزوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں جنہیں اس آیتِ کریمہ میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ وہ چار چیزیں ہیں۔ ۱۔ میتة ''مردار'' ۲۔ خون، ۳۔ لحم خنزیز، ۴۔ وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

ان چاروں چیزوں کی جو تشریحات قرآن وسنت میں دی گئی ہیں ہم نہائیت اجمال سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

میتة۔ اس سے مراد ہر وہ مردہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کیلئے شریعت نے ذبح کرنے کی شرط لگائی ہے۔ جتنے بھی حلال جانور ہیں ہم انہیں اسلامی طریقے سے اگر ذبح کر لیں تو ہمارے لئے حلال ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ذبح کے بغیر طبعی یا غیر طبعی موت مر جائیں تو وہ مردار کہلاتے ہیں۔ البتہ دو طرح کے مردار ہیں جو اسلامی شریعت نے ہمارے لئے حلال ٹھہرائے ہیں۔ وہ تمام آبی جانور جنہیں شریعت نے حلال ٹھہرایا ہے ان کا مردار بھی ہمارے لئے حلال ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ ''تمہارے لئے سمندر کا شکار حلال کر دیا گیا ہے''۔ اس کیلئے ذبح کرنا کوئی ضروری نہیں۔ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے ہیں ایک مچھلی دوسرا ٹڈی۔'' مچھلی تو خشکی پر آ کر تھوڑی دیر کے بعد مر جاتی ہے۔ ٹڈی اگرچہ خشکی پر مرتی نہیں لیکن اسے بھی بغیر ذبح کیے آپ پکا کر یا بھون کر کھا سکتے ہیں۔ ہاں! البتہ مچھلی سڑ کر پانی کے اوپر آ جائے تو پھر وہ حرام ہو جاتی ہے۔

مردار کا جس طرح گوشت کھانا حرام ہے اسی طرح اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے۔ یہی حال تمام نجاستوں کا ہے۔ جس طرح ان کا استعمال حرام ہے اسی طرح ان کی خرید وفروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے۔ فقہا نے لکھا ہے کہ مردار جانور یا کوئی بھی ناپاک چیز خود تو مسلمان استعمال کر ہی نہیں سکتا، البتہ اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ کسی جانور کو کھلائے۔ جانور اپنے طور پر گندگی کھالیں جیسے مرغیاں نالیوں سے گندگی کھاتی رہتی ہیں، لیکن کسی مسلمان کیلئے اپنے اختیار سے کسی جانور کو گندگی کھلانا جائز نہیں۔ مجھے اس

Marfat.com

بات سے خیال گزرتا ہے کہ ہم جن مرغیوں کا گوشت کھاتے ہیں انہیں جو خوراک بڑے اہتمام سے ڈربوں میں بند رکھ کر کھلائی جاتی ہے، اس میں تو نہ جانے کتنی گندگیاں شامل ہوتی ہیں اور مردار کی کیا کیا آلودگیاں اس میں شامل کی جاتی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم اس بارے میں ہمارے فقہا کرام کیا فتویٰ دیتے ہیں۔ وہ مرغی جو آزادانہ باہر گھوم پھر کر ہر اچھی اور گندی چیز غذا کے طور پر کھاتی ہے اس کیلئے علماء کرام یہ کہتے ہیں کہ اگر اس کا گوشت کھانے کا ارادہ ہو تو اسے ایک دو دن گھر میں بند رکھنا چاہئے۔ تاکہ اس کی گندی غذا کا اثر دو رہو جائے۔ لیکن جو مرغیاں نہائیت گندہ خوراک سے پالی جاتی ہیں ان کیلئے کیا احتیاط کی جائے؟

میتة سے متعلق احکام کی وضاحت

اس آیتِ کریمہ میں میتة کے حرام ہونے کا حکم عموم کے ساتھ دیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میتة کے تمام اجزا کا استعمال حرام ہے۔ لیکن دوسری آیتِ کریمہ کے ایک جملے نے اس کی وضاحت فرمادی ہے یا اس عموم میں خصوص پیدا کردیا ہے۔ دوسری آیت میں عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗ کا جملہ شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مردار جانور کے وہ اجزا حرام ہیں جو کھانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال، اون، جو کھانے کی چیزیں نہیں، یہ سب پاک ہیں اور ان کا استعمال بھی جائز ہے۔ قرآنِ کریم نے ایک اور جگہ جانوروں کے بال اور ان کے اون کو مطلقاً حلال اور جائز الانتفاع ٹھہرایا ہے۔ اون اور بالوں کی طرح ہڈی سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، لیکن اسے کھانے میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے آپ کو تعجب ہو کہ ہڈی کو کھانے میں کون استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن آپ کے علم میں یہ بات ہونی چاہئے کہ ہڈی کا برادہ اور اس کا پوڈر مختلف غذاؤں میں استعمال ہو رہا ہے اور یہ جیلی نام کی چیز جو گھروں میں بڑے شوق سے کھائی جاتی ہے، اس کے استعمال میں مردار کی ہڈیاں تک استعمال ہوتی ہیں۔ اللہ کی پناہ! آج کے دور میں حلال وحرام کی پہچان کس قدر مشکل ہوگئی ہے۔ کھال میں چونکہ خون وغیرہ کی نجاست شامل ہوتی ہے اس لئے اسے دباغت سے پہلے حرام قرار دیا گیا ہے اور دباغت دینے کے بعد وہ حلال اور جائز ہے۔ اسی طرح مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا استعمال یکسر ممنوع ہے اور خرید وفروخت بھی حرام ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین اور بعض دوسرے صحابہؓ نے مردار کی چربی کو صرف کھانے کیلئے حرام قرار دیا ہے، خارجی استعمال کیلئے اس کی اجازت دی ہے۔ اس لئے اس کی خرید وفروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصاص) لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔

یہ بات یاد رہے کہ یہ جو کچھ کہا جارہا ہے یہ ان حلال جانوروں کے بارے میں ہے جو بغیر ذبح کے کسی دوسرے طریقے سے مرجانے کی وجہ سے حرام ہوئے ہیں۔ رہے وہ جانور جو اپنی ذات میں حرام ہیں جیسے تمام درندے، تمام شکاری جانور، تمام مکروہ جانور، یا وہ جانور جن کو نجس العین قرار دیا گیا ہے جیسے کتا یا خنزیر وغیرہ ان کی کوئی چیز بھی حلال نہیں۔ ان کی ہر طرح کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔ ان کی حرمت کا تعلق صرف کھانے پینے سے نہیں بلکہ ہر طرح کے استعمال سے بھی ہے۔

اَلـدَّم ۔ دوسری چیز جس کو حرام کیا گیا ہے، وہ دم ''خون'' ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں دم کا لفظ مطلق استعمال ہوا ہے۔ لیکن سورۃ انعام میں اس کے ساتھ مسفوح کا لفظ بھی آیا ہے۔ دمامسفوحا کا معنی ہے ''بہتا ہوا خون''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پر وہ خون حرام کیا گیا ہے جس میں بہنے کی صلاحیت ہو، جو جانور کے ذبح ہونے کے بعد خود بخود نکلتا ہے۔ لیکن جو خون جانور کے بعض حصوں سے الگ نہیں

Marfat.com

ہوتا یا دھونے سے ختم نہیں ہوتا وہ حرام نہیں۔ خرگوش کا گوشت دھوتے رہئے پانی میں اس کے خون کی آمیزش ختم نہیں ہوگی۔ اس لئے ایک حد تک دھونے کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر اس کے اندر کوئی خون رہ جاتا ہے تو وہ حلال ہے۔ اس لئے حضور نے فرمایا: ''ہمارے لئے دو خون حلال کر دیئے گئے ہیں، جگر اور طحال یعنی تلی۔'' اسی طرح مچھر، مکھی، کھٹمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں۔ کھایا تو نہیں جاتا لیکن اس سے کپڑا پلید نہیں ہوتا۔ ہاں اگر مقدار بڑھ جائے تو اسے دھوڈالنا چاہئے۔

جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے۔ جس طرح تمام نجاسات کی خرید وفروخت اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے اسی طرح خون کی خرید وفروخت بھی حرام ہے اور اس سے حاصل کی گئی آمدنی بھی حرام ہے۔

انسان کی اصل تربیت اللہ سے تعلق اور شرعی احکام کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں مذہب بے اثر ہو گیا ہے اور انسان نے اپنی ذات یا اپنے مفادات کو خدا کی طرح پوجنا شروع کر دیا ہے اور اس کے ذہن سے یہ بات نکل گئی ہے کہ میں اپنی ذات کو بھی اللہ کے دیئے ہوئے شعور سے ہٹ کر سمجھنے پر قادر نہیں ہوں وہیں وہیں ہم دیکھتے ہیں کہ معیارات بدل گئے ہیں غور وفکر کے انداز بگڑ گئے ہیں، حتیٰ کہ انسانی ذوق تک بہک گیا ہے۔ انسان کی فطرتِ سلیمہ ہمیشہ طیبات کی طرف مائل ہوتی ہے۔ ہر گندی چیز سے اسے گھن آتی ہے اسی لئے اسلامی شریعت نے خبائث کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ دنیا میں ایسے مہذب لوگ جو مدبر بھی مانے جاتے ہیں اور انہیں اپنی تہذیب پر بڑا فخر ہے۔ وہ اپنا پیشاب تک پیتے ہیں۔ ہندوستان کا ایک وزیر اعظم بڑے شوق سے یہ حرکت کرتا تھا اور اخباری نمائندوں کو ترغیب دیتا تھا۔ انتڑیاں اور خون جو خبائث میں شامل تھے کتنے مہذب ملک ہیں جن کے نہائیت تعلیم یافتہ لوگ ان دونوں کو اپنی غذا میں شامل کر چکے ہیں۔ انتڑیوں میں خون بھر کر انہیں روسٹ کر لیا جاتا ہے اور پھر کاٹ کاٹ کر بڑے مزے سے کھایا جاتا ہے۔ زندہ جانوروں کے بھیجے تک اس طرح کھائے جاتے ہیں کہ جانور شکنجے میں جکڑا ہوا نیچے تڑپ رہا ہوتا ہے اور صاحب بہادر بڑے شوق سے اسے تناول فرما رہے ہوتے ہیں۔

لحم الخنزیر ۔ تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لحم خنزیر ہے۔ آیت میں حرمتِ خنزیر کے ساتھ لحم کی قید ذکر کی گئی ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ اس سے مقصود گوشت کی تخصیص نہیں بلکہ اس کے تمام اجزا ہڈی کھال، بال، پٹھے سب ہی باجماع امت حرام ہیں۔ لیکن لحم کا لفظ بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہو سکتا ہو۔ اگرچہ کھانا حرام ہی رہے کیونکہ خنزیر کا گوشت ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا کیونکہ نجس العین بھی ہے اور حرام بھی ہے۔ صرف چمڑا سینے کیلئے اس کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا گیا ہے۔

مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ : چوتھی چیز جو حرام کی گئی ہے وہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ''وہ جانور جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو''، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں۔ ہم اس کی تفصیل معارف القرآن سے نقل کرتے ہیں۔

> اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کیلئے ذبح کیا جائے اور بوقت ذبح اس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ یہ صورت باتفاق وباجماعِ امت حرام ہے اور یہ جانور میتة ہے۔ اس کے کسی جزء سے انتفاع جائز نہیں کیونکہ یہ صورت آیت مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

Marfat.com

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے ناواقف مسلمان بزرگوں، پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں لیکن ذبح کے وقت نام اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں یہ صورت بھی باتفاق فقہا حرام اور مذبوحہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین وفقہا نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰه کا مدلول صریح قرار دیا ہے، جیسا کہ حواشی بیضاوی میں ہے:

فكل مانودی علیه بغیر اسم الله فهو حرام وان ذبح باسم الله تعالیٰ حیث اجمع العلماء لو ان مسلما ذبح ذبیحة وقصد بذبحه التقرب الی غیر الله صار مرتدا وذبیحته ذبیحة مرتد

(ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر کر دیا گیا وہ حرام ہے۔ اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو۔ اس لئے علماء وفقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کیلئے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاوے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلائے گا)

نیز در مختار کتاب الذبائح میں ہے۔

ذبح لقدوم الامیر ونحوه کواحد من العظماء یحرم لانه اهل به لغیر الله ولو ذکر اسم الله واقره الشامی (ص: ۲۱۴ ج: ۵)

(کسی امیر یا بڑے کے آنے پر جانور ذبح کیا تو وہ حرام ہوگا کیونکہ وہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰه میں داخل ہے اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو اور شامی نے اس کی تائید کی ہے)

بعض حضرات نے اس صورت کو مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰه کا مدلول صریح تو نہیں بنایا کیونکہ وہ بحیثیت عربیت تکلف سے خالی نہیں۔ مگر بوجہ اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی نیت کے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰه کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے۔ احقر کے نزدیک یہی وجہ احوط اور اسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کیلئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ، نصب ان تمام چیزوں کو کہا جاتا ہے جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے معنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو معبودات باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰه کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ما اهل کا مدلول

Marfat.com

صریح تو وہی جانور ہے جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا اور ذُبِحَ عَلَى النُّصُب اس کے بالمقابل آیا ہے جس میں غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا مراد ہے۔ اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کی ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کیلئے مگر بوقت ذبح اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شیخ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، ان کی عبارت یہ ہے:

وجرت عادة العرب بالصياح باسم المقصود بالذبيحة وغلب ذلک فی استعمالهم حتی عَبَّربه عن النية اللتي هي علة التحريم

(تفسیر قرطبی ص ۲۰۷ ج ۲)

(عرب کی عادت تھی کہ جس کیلئے ذبح کرنا مقصود ہوتا ذبح کرنے کے وقت اس کا نام بلند آواز سے پکارتے اور یہ رواج ان میں عام تھا یہاں تک کہ اس آیت میں تقرب الی غیر اللہ کو جو کہ اصل علت تحریم ہے اہلال کے لفظ سے تعبیر کر دیا)

امام قرطبی نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرام میں سے دو حضرات حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے باپ غالب نے ایک اونٹ ذبح کیا تھا جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں۔ مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰه میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا اور سب صحابہ کرام نے اس کو قبول کیا، اسی طرح امام مسلم کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہ سے سوال کیا کہ ام المومنین: ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار عجمی لوگوں میں سے ہیں اور ان کے یہاں تو روز بروز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا رہتا ہے۔ یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

اما ماذبح لذلک اليوم فلا تاكلوا ولكن كلوا من اشجارهم

(تفسیر قرطبی ص: ۲۰۷ ج: ۲)

جو جانور اس عید کے دن ذبح کیا گیا ہو وہ نہ کھاؤ لیکن ان کے درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہو۔

الغرض یہ صورتِ ثانیہ جس میں نیت تو تقرب الیٰ غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے۔ اول تو اشتراک علت یعنی نیت تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم میں ہے دوسرے وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے اس لئے یہ بھی حرام ہے۔

Marfat.com

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کے کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم لغیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں یہ جانور مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں بلکہ اس قسم کے جانور کو بحیرہ یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہے اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ فعل تو بنصِ قرآن حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ میں ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدہ باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے، اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے۔

مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوا اس کا مملوک ہے اگرچہ وہ اپنے غلط عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہو گیا، مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے۔ وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے۔

اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے تو اس کے لئے یہ جانور حلال ہے۔ جیسے کہ بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام پر بکری یا گائے وغیرہ کو اپنے نزدیک وقف کر کے چھوڑ دیتے ہیں، مندروں کے پجاریوں کو اختیار دیتے ہیں وہ جو چاہیں کریں، یہ مندروں کے پجاری ان کو مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔

یا اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں کہ بکرا یا مرغا چھوڑ دیتے ہیں اور مزارات کے مجاورین کو اختیار دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں تو جو لوگ ان جانوروں کو ان لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کیلئے یہ خریدنا اور ذبح کر کے کھانا اور فروخت کرنا سب حلال ہے۔

نذر لغیر اللہ کا مسئلہ:۔ یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً مٹھائی کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منت) کے طور سے، ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں۔ حضرات فقہا نے اس کو بھی......... اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم سے قرار دے کر حرام کہا ہے اور اس کے کھانے پینے دوسروں کو کھلانے اور بیچنے خریدنے سب کو حرام کہا ہے، کتب فقہ بحر الرائق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکورہ ہیں۔ یہ مسئلہ قیاسی ہے۔ جس کو بنصِ قرآنی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اللہ تعالیٰ کا کرم ہر حال میں بندوں کے شامل حال رہتا ہے۔ زندگی اللہ کی عطا کردہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ اسے کھو دینے کی یا ضائع کر دینے کی کبھی اجازت نہیں۔ زندگی کا سفر ہمیشہ ہموار نہیں رہتا اس میں نشیب و فراز ہر طرح کے آتے ہیں ایسا بھی ممکن ہے کہ آدمی کبھی کسی ایسی پریشانی کی گرفت میں آ جائے کہ اس کے پاس اس پریشانی سے نکلنے یا زندگی بچانے کیلئے کوئی حلال چیز میسر نہ ہو، حرام چیزیں اللہ نے روک دی ہیں اور حلال چیز اسے میسر نہیں۔ یہ وہ اضطرار ہے جس میں زندگی کا سفر دشوار ہو جاتا ہے۔ جس پروردگار نے زندگی عطا کی اور زندگی کی بے شمار نعمتیں بخشی ہیں اسی نے یہ کرم بھی فرمایا ہے کہ اگر کبھی ایسا موقعہ آ جائے کہ تم حرام چیز کے استعمال پر مجبور کر دیئے جاؤ تو پھر تمہیں کیا کرنا چاہئے اس آیت کے آخری حصے میں اسی بات کو بیان فرمایا گیا ہے۔

Marfat.com

اضطرار کا مفہوم

اضطر، ضر یضر سے باب افتعال ہے۔عربی زبان کے قاعدے کے مطابق ض کی مناسبت سے افتعال کی ت، ط سے بدل جاتی ہے۔اضطرار اس کا مصدر ہے، اضطرار اس کیفیت کو کہتے ہیں جب آدمی حرام چیز کے استعمال پر اس طرح مجبور کر دیا جائے کہ اس کے بغیر اس کی زندگی نہ بچ سکے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ تم اگر ایسی کیفیت میں مبتلا ہو جاؤ تو حرام چیزیں تو حلال نہیں ہو سکتیں، البتہ! جان بچانے کی حد تک چند شرائط کے ساتھ تمہیں ان کے استعمال کی اجازت ہے۔پہلی شرط یہ ہے کہ اس کے اندر اس حرام چیز کی چاہت پیدا نہ ہو یعنی وہ مجبوراً اس حرام چیز سے فائدہ تو اٹھائے لیکن دل میں اس کی کراہت بدستور موجود رہے۔دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اس حرام چیز سے اتنا فائدہ اٹھائے جس سے اس کی جان بچ جائے۔اس حد سے اسے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ان احتیاطوں کے ساتھ اگر اس حرام چیز سے فائدہ اٹھائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس حرام چیز کے استعمال کو معاف فرما دیں گے۔

رخصت اور عزیمت میں راہِ اعتدال

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس آدمی کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اس حرام چیز کو کھائے ورنہ اس کی جان نہیں بچے گی۔تو کیا ایسی مجبوری اور اضطرار میں اللہ نے رخصت دی ہے۔اس رخصت سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے یا آدمی یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ میں اگر اس سے فائدہ نہ اٹھاؤں اور اللہ کی رضا کیلئے اس حرام چیز سے بچتے ہوئے جان دے دوں تو کیا اس کی اجازت ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں نے تو رخصت پر عمل کرنے کو اس حد تک ضروری قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس رخصت سے فائدہ نہ اٹھا کر جان دے دیتا ہے تو ممکن ہے قیامت کے دن اس پر خودکشی کا مقدمہ قائم ہو جائے۔دوسری رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حرام چیز سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور وہ اس سے بچتے ہوئے جان دے دیتا ہے تو یقیناً وہ اللہ کے یہاں اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔حقیقت یہ ہے کہ راہِ صواب ان دونوں باتوں کے درمیان میں ہے اور وہ یہ ہے کہ رخصت سے فائدہ اٹھانا شریعت کے مزاج کا تقاضا ہے۔اللہ تعالیٰ نے جن معاملات میں بھی انسانوں کو رخصت دی ہے اس سے فائدہ اٹھانا اللہ کا ایک طرح سے شکر ادا کرنا ہے کیونکہ ان رخصتوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے مہربانی اور رحمت کا اظہار فرمایا ہے۔وہ ہماری کمزوریوں سے واقف ہے اس لئے اس نے ہم پر ایسا بوجھ نہیں ڈالا جو ہماری طاقت سے زیادہ ہو۔اس لئے جان پر کھیل کر رخصت کو نظر انداز کر کے عزیمت پر عمل کرنے کی کوشش کرنا یہ شریعت سے کشتی لڑنے کے مترادف ہے۔بیمار کو روزہ قضا کرنے کی رخصت دی گئی ہے لیکن وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تمام روزے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس طرح سے وہ شریعت سے کشتی لڑتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ''جو شریعت سے مقابلہ کرے گا وہ ڈھے جائے گا'' اس لئے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔البتہ کبھی معاملے کی نوعیت اس سے مختلف ہوتی ہے جو ایک مومن کی غیرت کا امتحان بن جاتی ہے۔مثلاً کسی جگہ کوئی فاسق و فاجر اور ظالم قسم کا حکمران جبر کے ذریعے ایسی صورتحال پیدا کر دیتا ہے کہ لوگوں کیلئے حرام راستے آسان ہو جاتے ہیں اور حلال اور جائز راستے آہستہ آہستہ بند ہونے لگتے ہیں نتیجۃً حلال و حرام کی تمیز مٹنے لگتی ہے۔ایسی صورت میں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ عزیمت کی راہ اختیار کی جائے اور دوسروں کے ایمان کو زندہ کرنے کیلئے اپنی جان قربان کر دی جائے۔ایسے ہی موقعہ کیلئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ ''سب سے افضل

Marfat.com

جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے" اور جو آدمی اس جہاد کے سلسلے میں شہید ہو جاتا ہے یعنی بادشاہ اس کا سر کٹوا دیتا ہے، آنحضرت ﷺ نے اسے سید الشہداء قرار دیا ہے۔ اس لئے اعتدال کا راستہ یہ ہے کہ شخصی زندگی اور معمول کے حالات میں تو رخصت پر عمل کیا جائے لیکن جب احقاق حق اور ابطالِ باطل کا فرض پکار رہا ہو اور اسلام کی عزت کا سوال سامنے ہو تو پھر رخصت پر نہیں عزیمت پر عمل کرنا چاہیے، چاہے اس کا نتیجہ کتنا ہی خطرناک نکلے۔ سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کارنامہ ہمیں اسی کا درس دیتا ہے اور امام احمد بن حنبل کی قربانیاں ہمیں یہی راہ دکھاتی ہیں۔ ایک مومن معمول کی زندگی میں نہایت اعتدال پسند اور نرم خو ہوتا ہے اور دوستوں کیلئے اس کا وجود بہار کے جھونکے کی مانند ہوتا ہے۔ لیکن معرکہ حق و باطل میں وہ عزیمت کا پیکر بن جاتا ہے اور باطل کا راستہ روکنے کیلئے ہر بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جاتا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْہِمْ ۚ وَلَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○

(بے شک جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں سے اتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف دوزخ کی آگ بھر رہے ہیں۔ ان لوگوں سے اللہ قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا نہ ان کو پاک کرے گا، ان کیلئے بس دردناک عذاب ہے) (البقرۃ: ۱۷۴)

اس رکوع میں خطاب اگرچہ مشرکینِ عرب یا نومسلموں سے رہا ہے کیونکہ اہلِ کتاب بالخصوص یہود پر گزشتہ ایک پارے میں سیر حاصل تنقید ہو چکی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب بھی ان جرائم کا ذکر ہوتا ہے جس نے امتوں کو تباہ کیا ہے تو اہلِ کتاب کا ذکر کیے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی کیونکہ ہر حرم کی شاخ اسی شجرہ سے پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

اہلِ کتاب کی بعض تحریفات

ملتِ ابراہیم کے حوالے سے جب عربوں کو بتایا گیا کہ اصلاً ملت ابراہیم میں کیا کیا چیزیں حرام تھیں اور تم نے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے کس طرح اس دائرے میں زیادتیاں کی ہیں۔ اسی طرح اہلِ کتاب سے بھی خطاب کرنا اس لئے ضروری ٹھہرا کہ جب اسلام نے حلال وحرام کے حوالے سے اس ضابطے کی طرف لوگوں کو دعوت دی جس کی اساس ملت ابراہیم اور وحی الٰہی کی رہنمائی تھی تو بجائے اس کے کہ اہلِ کتاب اس کی تائید کرتے انہوں نے اس کی مخالفت پر کمر باندھ لی اور ہر اس حقیقت کو چھپایا جو پروردگار تورات میں نازل فرما چکا تھا۔ یہ

Marfat.com

سب کچھ اس لئے کیا تا کہ ان کی مسندِ ارشاد اور مشیخیت کا منصب باقی رہے اور ان کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہے۔ قرآنِ کریم نے جب ان کے سامنے حلت وحرمت کے حوالے سے ان کی زیادتیوں کی نقاب کشائی شروع کی تو بجائے اس کو تسلیم کرنے کے انہوں نے نہ صرف اس کا انکار کیا بلکہ صاف صاف اس کے وجود ہی کے منکر ہو گئے اور ایسی باتوں پر اصرار کیا جن کا تورات میں کوئی وجود نہیں تھا۔ جب یہود نے یہ دعویٰ کیا کہ اونٹ کی حرمت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چلی آ رہی ہے تو قرآن نے ان کو چیلنج دیا:

قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

(ان سے کہو! کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تورات لا کر پیش کرو جو اس کے بعد اللہ پر جھوٹ باندھیں تو وہی لوگ اصلی ظالم ہیں)

اہلِ کتاب پر عتاب

اس ایک مثال سے اندازہ کر لیجئے کہ انہوں نے کس طرح اپنی مرضی سے حلت وحرمت میں دخل دیا اور کس طرح اصل حقیقت کو چھپاتے رہے۔ اسی طرح یہود اس بات سے واقف تھے کہ بعض چیزیں ان کی سرکشی اور کٹ حجتی کے باعث ان پر حرام کی گئی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ جب آخری نبی تشریف لائیں گے تو وہ تمہارے لئے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دیں گے اور جو قیدیں اور بندشیں تم پر آج عائد ہیں وہ سب دور ہو جائیں گی۔ لیکن یہود نے اس معاملہ میں بھی اپنی عادت کے مطابق حق پوشی اور کفرانِ نعمت سے کام لیا بجائے اس کے کہ اس پر اللہ اور اس کے رسول کے شکر گزار ہوتے الٹا ان باتوں کو دینداری اور تقویٰ کے خلاف قرار دیا اور آنحضرت ﷺ کی خوب مخالفت کی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ یہ سب کچھ اس لئے کر رہے تھے تا کہ ان کی دنیا بچی رہے اس کے لئے دین بیچ دینا اور اللہ کی کتاب میں خیانت کا ارتکاب کرنا ان کیلئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہیں شائد اس کا اندازہ نہیں کہ وہ دین بیچ کر جو دنیا اکٹھی کر رہے ہیں یہ جہنم کی آگ کے انگارے ہیں جو وہ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں۔ ان کے اس رویے نے ان کو اس حد تک بدنصیب بنا دیا ہے کہ وہ پروردگار جس کی عنایت سے ہر قسمت بنتی اور سنورتی ہے وہ قیامت کے دن ان کو منہ تک نہیں لگائے گا، ان سے بات کرنا پسند نہیں فرمائے گا یعنی ان کی طرف نگاہِ التفات نہیں فرمائے گا اور یہ لوگ تسلی کے ایک ایک لفظ کو ترسیں گے۔ مزید فرمایا کہ پروردگار انہیں پاک نہیں کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کا ایمان پر خاتمہ ہو گا لیکن اپنی بداعمالیوں کے باعث جنت میں جانے کے مستحق نہیں ہوں گے اللہ تعالیٰ انہیں جہنم میں عذاب دے کر بداعمالیوں کے گند سے پاک کرے گا اور جب وہ پاکیزہ ہو کر جنت میں جانے کے قابل ہو جائیں گے تو پھر انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ یہود سے ایسا معاملہ نہیں ہو گا وہ ہر چند اپنے آپ کو اللہ کے دین کا وارث سمجھتے ہیں لیکن ان کے جرائم ان کو پرلے درجے کا کافر ثابت کر چکے ہیں اس لئے وہ ابدی عذاب کیلئے جہنم میں بھیجے جائیں گے اور وہ عذاب، عذابِ الیم ہو گا جس کا تصور ہی دہلا دینے کیلئے کافی ہے۔

Marfat.com

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰی وَالۡعَذَابَ بِالۡمَغۡفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصۡبَرَهُمۡ عَلَی النَّارِ O (البقرة:۱۷۵)

(یہی لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت پر اور عذاب کو مغفرت پر ترجیح دی یہ کس قدر صبر کرنے والے ہیں جہنم کی آگ پر)

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت اس طرح سے بنائی ہے کہ اس کے بناؤ اور بگاڑ دونوں میں ایک ترتیب اور تدریج پائی جاتی ہے۔ اصلاح کا عمل بھی یکلخت اپنا کام مکمل نہیں کر لیتا بلکہ آہستہ آہستہ دلوں میں اس کی جوت لگتی ہے۔ایک احساس سا کروٹیں لینے لگتا ہے پھر دماغ اس کی تائید کرتا ہے زبان اقرار کرتی ہے اور باقی اعضاء وجوارح اس کی تعمیل میں لگ جاتے ہیں۔اس پر ایک زمانہ گزرتا ہے کہ پھر نیکی کا شعور ،ایک مزاج اور ایک رویے میں ڈھلنے لگتا ہے۔جو دھیرے دھیرے اصلاح کے عمل کو آگے بڑھاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے جب سیرت وکردار کا خوبصورت محل تعمیر ہو جاتا ہے۔بالکل اسی طرح بگاڑ بھی یکلخت اپنے پنجے نہیں گاڑتا وہ بھی ایک ترتیب اور تدریج سے آگے بڑھتا ہے۔ایمان میں کمزوری بے عملی کو پیدا کرتی ہے، بے عملی آہستہ آہستہ بدعملی کا روپ دھارتی ہے اور یہی بدعملی جب انسان پر غالب آجاتی ہے تو اس کا وہ رویہ وجود میں آتا ہے جو ہر برائی کی طرف لپکتا ہے اور ہر نیکی سے نفور اختیار کرتا ہے۔ ہر بری بات اچھی لگنے لگتی ہے، بری مجلسوں میں دل لگنے لگتا ہے، برے لٹریچر کو دماغ قبول کرنے لگتا ہے، آخر ایک ایسا وقت آتا ہے جب جنت ،جہنم ،ایمان کی باتیں ،حتی کہ خدا رسول تک مفروضہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ہر برائی نیکی کے مقابلے میں ترجیح کے قابل دکھائی دیتی ہے اور اگر کوئی مغفرت اور بخشش کی باتیں کرتا ہے تو ایسا شخص بھڑک کر اور برہم ہو کر یہ کہتا ہے کہ تمہاری جنت سے مجھے جہنم زیادہ عزیز ہے۔چنانچہ بگاڑ کا یہی وہ تدریجی عمل اور تکمیلی شکل ہے جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ اہلِ کتاب ہوں یا مشرکینِ عرب خدا فراموشی کے نتیجے میں خود فراموشی کے عذاب کا شکار ہو گئے ہیں۔نفع وضرر کے پیمانے ان کے یہاں جواب دے چکے ہیں۔وہ ایک ایسے مریض کی طرح جس کے منہ کا مزہ بگڑ جائے اسے شہد بھی کڑوا لگتا ہے ،انہیں نیکی کی ہر بات بری لگتی ہے۔وہ ہدایت کی ہر بات سے بدکتے ہیں اور گمراہی کی طرف لپکتے ہیں۔مغفرت اور بخشش کی باتیں ان کے نزدیک دقیانوسی ہیں۔وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہیں کہ گمراہی کے نتائج کیا ہوتے ہیں ،لیکن ان کا بگاڑ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ انہیں اللہ کے عذاب سے بھی ڈر نہیں لگتا۔اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پروردگار فرماتے ہیں: فَمَآ اَصۡبَرَهُمۡ عَلَی النَّارِ، مَآ اَصۡبَرَ، مَآ اَحۡسَنَ کی طرح اظہار تعجب کیلئے ہے۔مطلب یہ ہے کہ ان کی دیدہ دلیری دیکھئے کہ ہدایت کی جگہ ضلالت اور مغفرت کی جگہ عذاب کو ترجیح دے رہے ہیں۔اس جرأت اور ڈھٹائی کا کیا جواب ہے؟ اگلی آیتِ کریمہ میں ان کے اس انتہا پسندانہ رویے کا سبب بیان کیا گیا ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِیۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِی الۡکِتٰبِ لَفِیۡ شِقَاقٍۢ بَعِیۡدٍ O

(یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کو ایک قولِ فیصل بنا کر اتارا اور جن لوگوں نے اس کتاب کے معاملہ میں اختلاف کیا ہے وہ مخالفت میں بہت دور نکل گئے ہیں) (البقرۃ:۱۷۶)

Marfat.com

عتاب کا سبب

یہ لوگ اپنے بگاڑ کی انتہا اور اس کے نتیجے میں اللہ کے غضب کا شکار اس لئے ہوئے کہ اللہ نے ان پر یہ آخری کتاب قولِ فیصل کی حیثیت سے اتاری تاکہ مشرکینِ عرب اور اہلِ کتاب تحلیل و تحریم کے سلسلے میں جن اختلافات کا شکار ہوئے ہیں اور جس طرح انہوں نے ایک خانہ ساز شریعت کھڑی کر لی ہے اور سینٹ پال نے جس طرح سے عیسائیت میں نقب لگا کر تورات کی حرام کردہ چیزوں کو بھی حلال کر دیا ہے۔ اس گمراہی سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ یہ اس آخری کتاب پر ایمان لاتے اور اس کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی گمراہیوں اور کج رویوں کا علاج کرتے۔ لیکن انہوں نے حق پوشی اور تحریف کے ذریعے جس طرح اپنی شریعت کا حلیہ بگاڑا تھا، اس پر نہ صرف انہوں نے اصرار جاری رکھا بلکہ قرآنِ کریم کے بارے میں عجیب و غریب اختلافات کا راستہ کھول دیا اور اس کی مخالفت میں اتنی دور نکل گئے جہاں سے واپس لوٹنا آسان نہیں ہوتا۔ اس آیتِ کریمہ میں ''شقاق'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ شقاق ''مخالفت اور عناد'' کو کہتے ہیں۔ لیکن جب اس کے ساتھ بعید کی صفت آ جاتی ہے تو پھر اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک شخص مخالفت عناد اور دشمنی میں اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ اسے اپنے نفع و نقصان کا بھی کوئی ہوش نہیں رہا اور اس نے واپس پلٹنے اور تلافیِ مافات کے تمام امکانات کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ مشرکینِ عرب عموماً اور اہلِ کتاب نے خصوصاً ایسا ہی رویہ اختیار کیا جس پر انہیں اللہ کی طرف سے خود فراموشی کی سزا ملی اور وہ اپنے بارے میں صحیح فیصلہ کرنے سے محروم کر دیئے گئے۔ یہود کی پوری تاریخ بطورِ خاص اس بات کی گواہی کیلئے کافی ہے کہ جب قومیں حق کے عناد میں دور نکل جاتی ہیں تو انہیں حق کی ہر بات سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ انہیں گمراہی ہدایت نظر آتی ہے اور گناہ نیکی دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ خود فراموشی ہے جو افراد اور قوموں کیلئے عذاب کی صورت میں نازل ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے دوسری قوموں کو اس عذاب سے بچانے کیلئے سابقہ معذب قوموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں عرفانِ ذات سے محروم کر دیا''۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ بھی اس عذاب کا شکار ہو چکی ہے۔ والی اللہ المشتکیٰ

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ
ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ
وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ

Marfat.com

إِذَا عَٰهَدُوا ۖ وَالصَّٰبِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ
أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿١٧٧﴾ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ
بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ
فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ
مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ
أَلِيمٌ ﴿١٧٨﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوٰةٌ يَٰٓأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُونَ ﴿١٧٩﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ
خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا
عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ
عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ
مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ
إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

(اللہ کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرلو بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدقِ دل سے ایمان لائیں اور اپنے مال اس کی محبت کے باوجود قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب معاہدہ کربیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کر وہ لوگ جو فقر و فاقہ، تکالیفِ جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں

Marfat.com

جو سچے متقی ہیں ○ اے ایمان والو! تم پر فرض کیا گیا ہے مقتولوں کا قصاص لینا، آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، پھر جس کسی کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو اس کے لیے دستور کی پیروی کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک آسانی اور مہربانی ہے پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے ○ اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو! تا کہ تم حدودِ الٰہی کی پابندی کرو ○ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کیا گیا ہے والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرنا یہ حق ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ○ پس جو لوگ اس وصیت کو بدل ڈالیں اس کے سننے کے بعد تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو اس کو بدلتے ہیں، بے شک اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے ○ پس جس شخص کو اندیشہ ہو وصیت کرنے والے سے بے جا جانبداری یا حق تلفی کا تو وہ آپس میں صلح کرا دے اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔)

گزشتہ رکوع میں عربوں اور مسلمانوں کو توحید کی تعلیم دی گئی۔ توحید کے خلاف عربوں میں اور بنی اسرائیل میں جو تصورات پائے جاتے تھے اور جس جس طرح اللہ کی صفات میں بعض قوتوں کو شریک کیا گیا تھا ایک ایک کر کے ان سب پر تنقید کی گئی۔ اس ضمن میں مسلمانوں کو توحید کے ہمہ جہت تصور کو دل و دماغ میں راسخ کرنے کی تلقین کی گئی۔ اس طرح سے توحید کو بنیاد بنا کر اللہ سے وابستگی اور اس سے وفاداری کی بنیادیں مستحکم کی گئیں۔ انسانی زندگی کا حادثہ یہ ہے کہ انسان بعض دفعہ فکری طور پر جس سے وابستہ ہوتا ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ عملی لحاظ سے بھی اپنی وابستگی میں کامل ہو۔ بعض دفعہ فکری کاوشوں اور دماغی تصورات میں کوئی کمزوری نہیں ہوتی لیکن عمل سے الگ رہنے کی وجہ سے دماغی تصورات محض دماغ کی عیاشی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جب کبھی عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کا موقع آتا ہے تو اصولی بات کو چھوڑ کر فروعی باتوں کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل ایک عبرتناک مثال کی حیثیت سے نگاہوں کے سامنے تھے۔ انہیں نشانہ بنا کر تعریض کرتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ سے وفاداری کے تقاضے چند فروعی باتوں پر عمل کرنے سے ادا نہیں ہوتے جب تک اس کے لوازم و مراسم کی فکر نہیں کی جاتی اور ان کے حصول کو دینی زندگی کا حاصل سمجھ کر ہمہ تن کوشش نہیں کی جاتی۔ چنانچہ اس حقیقت کو اگلی آیت کریمہ میں پوری طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

Marfat.com

(اللہ کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرلو بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جواللہ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدقِ دل سے ایمان لائیں اور اپنے مال اس کی محبت کے باوجود قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کر وہ لوگ جو فقر وفاقہ، تکالیفِ جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔) (البقرہ: ۱۷۷)

البر کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں البر کا لفظ اس طرح استعمال کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ نہ صرف یہ کہ اس آیت کا اصل مفہوم اور عنوان ہے بلکہ اسلامی زندگی کی اگر کوئی غرض وغائیت مقرر کی جاسکتی ہے تو وہ یہی لفظ ہے۔ عام تراجم میں اس لفظ کا ترجمہ ''نیکی یا اطاعت'' کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ بالکل صحیح ہے لیکن اس ترجمہ سے اس لفظ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس لفظ کے مفہوم میں جتنی وسعت ہے کسی زبان میں بھی ایسا لفظ موجود نہیں جو اس کا حق ادا کرسکے اور معنی ومفہوم کی ساری وسعتوں کو سمیٹ سکے۔ البتہ! ایک ایسا لفظ بعض اہلِ علم نے ترجمے کے طور پر اختیار کیا ہے جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک اس کے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ وہ ہے ''وفاداری یا Commitment'' کیونکہ عربی لغت میں اس کا اصل مفہوم ''کسی کے حق کو پورا کرنا'' ہے اور حق میں کوئی تخصیص نہیں۔ ایک مومن پر اللہ کا بھی حق ہے، ماں باپ کا بھی، مخلوقِ خدا کا بھی اور اپنی ذات کا بھی۔ ان تمام حقوق کو ادا کرنا اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہے۔ حقوق کی ادائیگی اور حقوق کا ایفا اس لفظ کی اصل روح ہے۔ ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے، جو معاہدات، قول وقرار، حلف وولا، عقو اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہوجاتی ہیں، جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں۔ بر اور بار اس لفظ کے صیغے ہیں، برٌّ ابوالدیہ اس سعادت مند بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور ان کے حقوق پورے پورے ادا کرنے والا ہو۔ مختصر یہ کہ جتنے حقوق وواجبات ہیں اور جتنی نیکیاں اور بھلائیاں ہیں سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس قدر وسیع المعنی اور وسیع الاطراف مفہوم کو واضح کرنے کے لیے یقیناً کوئی ایک لفظ ناکافی ہوگا جو پوری طرح اس کے مفہوم کو ادا کرسکے۔ عربی زبان چونکہ اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے اس میں ایسے الفاظ کا ہونا تو چنداں بعید نہیں اور پھر قرآنِ کریم کا انتخاب بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ لیکن ایسے الفاظ کا دوسری کسی زبان میں ترجمہ یقیناً بہت مشکل ہے۔ اس لیے اس لفظ کے مفہوم کا بھی پوری طرح احاطہ کرنا کسی لفظ سے تو ممکن نہیں۔ ہاں! بعض اہلِ علم نے وفاداری سے جو اس کا ترجمہ کیا ہے وہ ایک حد تک اس لفظ کی روح کو ادا کردیتا ہے۔

وفاداری کے ایفاء کے لیے تین ناگزیر باتیں

کوئی آدمی یا کوئی قوم جب کسی کو اپنا آقا بنالیتی ہے تو آقا کے ساتھ اپنی وفاداری کے تعلق کو پختہ کرنے اور اس حق کی ادائیگی کے لیے تین کام کرنا ناگزیر ہوتے ہیں۔ پہلا کام تو یہ ہوتا ہے کہ اپنے آقا سے متعلق تصورات اور آقا کی صفات کو پوری طرح دل ودماغ کا حصہ بنالیا جائے، جب بھی آقا کا خیال آئے تو وہ تصورات اور وہ صفات اس کی ذات کے ساتھ ضم ہوکر رہ جائیں اس کے دل ودماغ کبھی ان تصورات

Marfat.com

سے بے گانہ نہ ہوں اور دوسری یہ بات کہ اس کا طرزِ عمل خود بولتا ہو کہ اس کا آقا کون ہے اور یہ واقعی اپنے آقا کا وفادار ہے۔ جس طرح اس کی فکر اس کی عقیدت میں ڈوبی ہوئی ہو اسی طرح اس کا ایک ایک عمل اس کی اطاعت کا آئینہ دار ہو اور تیسری چیز یہ کہ وہ اپنے زبان وقلم اور اپنے جذبات سے ہمیشہ وفاداری کے اس تعلق کا اظہار بھی کرتا رہے۔ اس اظہار کے لیے اسے کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے وہ کبھی دریغ نہ کرے۔ ان تینوں چیزوں میں پہلی چیز کی حیثیت بنیاد کی ہے، دوسری چیز کی حیثیت عمارت کی، اگر بنیاد مضبوط ہے گی تو عمارت بھی مضبوط ہوگی اور اگر بنیاد میں کمزوری ہے یا اس میں دراڑیں ہیں تو پھر عمارت کی ایک ایک دیوار کو شکست وریخت سے نہیں بچایا جاسکتا۔ رہی تیسری چیز تو اگر یہ دونوں چیزیں اپنی تمام تر صفات کے ساتھ موجود ہیں تو وہ چیز اس کی خوبصورتی اور اس کے ابلاغ کا ذریعہ بنتی ہے اور اگر پہلی دونوں چیزوں میں کمزوری ہے یا سرے سے موجود ہی نہیں تو پھر تیسری چیز پہلی دونوں چیزوں پر پردہ ڈالے رکھتی ہے اور ایک وقت آتا ہے جب دنیا اصل حقیقت سے باخبر ہوجاتی ہے اور یہ قوم ایک تماشہ بن کررہ جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت اہلِ کتاب پہلی دونوں باتوں یعنی ایمان اور حسنِ عمل کی دولت سے محروم ہوچکے تھے۔ البتہ! اس کمزوری کو چھپانے اور دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے انہوں نے چند فروعی باتوں کو اصل قرار دے کر اپنی قوم کی تمام تر توجہ اسی پر مبذول کررکھی تھی اور انہی فروعی باتوں کو بحث ومجادلہ کا ذریعہ بنا کر مذہب کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ قرآنِ کریم ان کو اصل حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ بندے کا اپنے رب سے تعلق بندگی کا تعلق ہے۔ اس کا رب اس کا آقا ہے اور بندہ اس کا غلام ہے۔ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اللہ سے یہ تعلق بندے کا کہاں تک قائم ہے، یہ دیکھا جائے گا کہ اس تعلق کے بقاء اور استحکام کے لیے جن جن حقائق پر دل ودماغ کو یکسو کرنے کی ضرورت ہے کیا وہ یکسوئی میسر ہے یا نہیں؟ اور مزید یہ کہ کیا زندگی کا طرزِ عمل دل ودماغ کی یکسوئی کے مطابق ہے یا نہیں؟ لیکن اگر یہ رویہ اختیار کرلیا جائے کہ اس بات کی تو بالکل پرواہ نہ کی جائے کہ دل ودماغ کی ایمانی کیفیت کا حال کیا ہے اور پوری زندگی کس راستے پر چل رہی ہے؟ البتہ چند فروعی باتوں پر جھگڑے کا بازار گرم رہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسے افراد اور ایسی قوم کا اللہ کے یہاں کیا انجام ہوگا؟ اور دنیا میں ان کا کیا مقام ہوگا؟ چنانچہ اسی بنیادی حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے فرمایا جارہا ہے کہ کسی بھی قوم کا قبلہ اس کے دینی تعلق کے اظہار کی ایک علامت ہے۔ اگر تمام دینی مقاصد اور دینی تقاضوں سے صرف نظر کرکے صرف اسی ایک بات پر تمام دینی صلاحیتیں مرکوز کردی جائیں کہ ہمارا قبلہ مشرق ہے یا مغرب؟ تو اس سے ایک قوم کا جھوٹا بھرم تو باقی رہ سکتا ہے لیکن اس کی حقیقی زندگی کو موت سے کوئی نہیں بچاسکتا۔ یہود نے اپنے دینی بھرم کو باقی رکھنے کے لیے مسلمانوں کے ساتھ لڑائی شروع کررکھی تھی کہ تحویلِ قبلہ کے نتیجے میں تم نے جو اپنے لیے نیا قبلہ تجویز کیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور اسی ایک نقطہ پر ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا۔ اللہ فرماتا ہے کہ اللہ سے وفاداری کا صرف یہی تقاضا نہیں یا صرف یہی علامت نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف بلکہ اصل بات تو دیکھنے کی یہ ہے کہ تمہارے ایمان وعمل کا حال کیا ہے اور پھر اس کے بعد ایمانیات اور اعمال کی ایک تفصیل دی گئی ہے اور اس سے مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی جارہی ہے کہ دیکھنا تم بھی یہود کی طرح فروعی مسائل میں اپنا وقت ضائع مت کرنا اور ان کی طرح فروعی باتوں میں الجھ کر اصل دین سے دستبردار نہ ہوجانا۔ اپنے قومی مزاج کو اس طرح کا نہ بنالینا کہ بے دینی اور بدعملی کے اونٹ نگلتے ہوئے بھی تمہیں کبھی خیال نہ آئے۔ لیکن فوائد کے حصول کے لیے حقوق کے مچھر چھاننے پڑیں تو اس سے بھی دریغ نہ کرو۔ لیکن اسی کے ضمن میں یہود پر تعریض بھی کی کہ تمہیں دینداری کے بہت دعوے ہیں لیکن قبلہ کے بارے میں تمہارا طرزِ عمل کیا رہا ہے کہ تم نے بھی دنیا کی اصلاح کرنے کی بجائے دنیا کی گمراہ قوموں کی طرح مشرق ومغرب کو اپنا قبلہ بنالیا۔ یہ سراسر دنیا کی مشرک قوموں سے ان کے ربط وضبط کا نتیجہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ کہاں ان کے یہ دعوے کہ ہم اللہ کے دین کے وارث ہیں اور

Marfat.com

اس لحاظ سے ہمیں تمام دنیا پر فضیلت حاصل ہے اور کہاں ان کا یہ حال کہ وہ بھی دیگر گمراہ قوموں کی طرح سمت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ حضور کی بعثت سے پہلے بیشمار گمراہیوں میں سے ایک اہم گمراہی یہ سمت پرستی تھی اور مختلف جاہل قوموں نے یہ اعتقاد جما لیا تھا کہ فلاں مخصوص سمت مثلاً مشرق مقدس ہے اور فلاں متعین جہت مثلاً مغرب قابلِ پرستش ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی جہت پرستی پر چوٹ لگائی کیونکہ اہلِ کتاب اس میں ملوث ہو چکے تھے اور ارشاد فرمایا کہ مشرق اور مغرب میں کوئی تقدیس نہیں اور اللہ سے وفاداری کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام نے اگرچہ خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا لیکن نماز کے لیے کوئی سمت بحیثیت سمت ہرگز متعین نہیں کی۔ اس نے صرف ایک متعین مکان یعنی خانہ کعبہ کو ایک مرکزی حیثیت دی ہے اور اسے قبلۂ توجہ ٹھہرایا ہے خواہ وہ کسی سمت میں پڑ جائے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے! کہ بیت اللہ مصر و طرابلس و حبشہ سے مشرق میں پڑتا ہے۔ ہندوستان، افغانستان اور چین سے مغرب میں شام و فلسطین اور مدینہ سے جنوب میں اور یمن اور بحرِ قلزم کے جنوبی ساحلوں سے شمال میں اور بہت سے مقامات سے ان مختلف سمتوں کے مختلف گوشوں میں۔

المشرق ''سورج دیوتا'' دنیائے شرک کا معبودِ اعظم رہا ہے۔ مشرک قوموں نے اس کی پرستش بڑی کثرت سے کی ہے اور یہ چونکہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اس لیے عموماً جاہل قوموں نے مشرق کو بھی مقدس سمجھ لیا ہے اور عبادت کے لیے مشرق کی طرف رخ پھیر لیا۔ یہود و نصاریٰ نے بھی انہی مشرک قوموں کی طرح بیت المقدس کے مشرق و مغرب کو اپنے درمیان تقسیم کر لیا اور بیت المقدس کے باہر مشرق و مغرب کی جہت ہی ان کے لیے قبلہ بن گئی۔ اس مشرکانہ ذہنیت کی تردید کے بعد فرمایا کہ اللہ سے وفاداری اور Commitment یہ نہیں ہے کہ تم سمت پرستی کا ارتکاب کرو اور مشرق و مغرب کے نام سے ہنگامے کھڑے کرو بلکہ اس کی وفاداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے دل و دماغ کے قبلے درست کرو۔ ولکن البر کے بعد مضاف محذوف ہے اصل عبارت اس طرح ہوگی ولکن البر بر من امن ''لیکن وفاداری اس شخص کی وفاداری ہے جو ایمان لائے''۔ پھر ایمانیات کی تفصیل بیان کی گئی ہے کیونکہ اصل مقصود تو سیرت و کردار کی تعمیر ہے اور سیرت و کردار کی عمارت وجود میں نہیں آتی تاوقتیکہ اس کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم نہ ہو اور وہ مضبوط بنیاد دل و دماغ میں ان تصورات کے راسخ کرنے سے اٹھائی جاتی ہے جنہیں ایمانیات کہا جاتا ہے کیونکہ جب تک آدمی میں ان بنیادی تصورات کا استحضار نہیں ہوتا اس وقت تک اس کے اعمال کے لیے کوئی محرک وجود میں نہیں آتا جو قوتِ ارادی کے لیے تحریک پیدا کر سکے اور خیر و شر میں تمیز پیدا کر سکے اور پھر اس کے نتیجے میں اعمال ظہور پذیر ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو عقائد کا نام دیا جاتا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا ؎

دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز عمل خوار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سے وفاداری اور حقیقی تعلق کے لیے جن ایمانیات کو ذکر کیا گیا ہے ہم اس کو نہایت اختصار کے ساتھ ایک ترتیب سے عرض کرتے ہیں۔

ا۔ اللہ پر ایمان: یعنی اللہ کے ایک ہونے اور اس کے ذات و صفات اور حقوق میں ہر طرح کے شرک یا شائبہ شرک سے بھی پاک ہونے پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ اس کی اطاعت سب پر غالب اور اس کا دیا ہوا ضابطۂ حیات سب سے بالا اور سب کے لیے لازم ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

کا رسول اور اس کے دین سے گہری وابستگی اور محبت یقیناً پہلی ضرورت ہے۔ لیکن اس محبت کو جو چیز سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے اور جس میں اعتدال نہ ہونے کی وجہ سے تمام رشتوں میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے وہ حبِّ دنیا ہے۔ جب آدمی مال و دولت سے اس طرح پیار کرے کہ مال و دولت اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی متاع بن جائے اور وہ تمام تعلقات اور رشتوں کو اس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو پھر باقی تمام رشتے اس کے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ کوئی بھی سمجھدار اور شائستہ آدمی کبھی اس الزام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ میں مال و دولت سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مال کے لیے ایمان چھوڑ دینا، دیانت چھوڑ دینا، رحم و مروت کے جذبات سے دستبردار ہو جانا اور اگر تصادم ہو جائے تو مال و دولت یا اس سے متعلقہ اشیاء کے حصول کے لیے خون بہا دینا، جان لے لینا اور کچھ نہیں تو ہر طرح کا دجل و فریب کر گزرنا یہ تو ہمارا قومی رویہ بن چکا ہے۔ مساجد تک اس سے محفوظ نہیں۔ خانقاہیں جو ذکر اللہ کا مرکز ہونی چاہئیں وہاں بھی یہی کاروبار ہوتا ہے۔ خون کے رشتے دنیا کی محبت پر قربان کر دیئے جاتے ہیں۔ چند مرلے زمین، چند لاکھ روپیہ، چند دنوں کی شہرت، چند دنوں کا منصب، یہ ہوس کی مختلف صورتیں ہیں۔ جس پر ہم اپنے عزیز ترین رشتے قربان کر دیتے ہیں۔ چھوٹے لوگ اگر اس کے لیے اپنی سطح کے مطابق دجل و فریب اور لڑائی دنگا کر گزرتے ہیں تو بڑے لوگ ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ملک و قوم کو بھی بیچنا پڑے تو دریغ نہیں کرتے۔ یہاں اللہ سے وفاداری کے تقاضوں کو پورا کرنے اور تمام حقوق کی ادائیگی کے لیے جس طرح ایمانیات پر زور دیا جاتا ہے، اسی طرح خالقِ فطرت نے مال سے تعلق کو بھی اس راستے پر ڈالنے کی تعلیم دی ہے جو راستہ اختیار کر کے بندگی اور انسانیت کے رشتے باقی رہتے ہیں اور اگر یہ راستہ اختیار نہ کیا جائے تو پھر کچھ بھی نہیں بچتا۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی جو مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ رؤف اور رحیم ہے اور جن کے لیے مسلمانوں کی کوئی تکلیف بھی قابلِ برداشت نہیں جو اپنے دل میں اس امت کے لیے والدین سے بڑھ کر شفقت رکھتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی پریشانی کا حقیقی سبب

قرآن و سنت کا مطالعہ کر جایئے آپ کہیں نہیں دیکھیں گے کہ جن باتوں سے ماں باپ پریشان ہوتے ہیں حضور کبھی ان باتوں پر پریشان ہوئے ہوں۔ بیٹے کی مالی حالت اگر اچھی نہیں یا وہ برسرِ روزگار نہیں تو ماں باپ کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔ لیکن حضور نے اپنی امت کے لیے اس حوالے سے کبھی پریشانی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ پریشانی کا اظہار فرمایا تو اس سے برعکس باتوں پر۔ آپ نے فرمایا:

مَاالفَقرُ اَخشٰی عَلَیکُم وَلٰکِنِّی اَخشٰی اَن تُبسَطَ عَلَیکُمُ الدُّنیَا کَمَابُسِطَت عَلٰی مَن کَانَ قَبلَکُم فَتَنَافَسُوهَا کَمَاتَنَافَسُوهَافَتُهلِکَکُم کَمَا اَهلَکَتهُم

(میں تم پر غربت سے نہیں ڈرتا لیکن میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا وسیع کر دی جائے جیسے پہلے لوگوں پر وسیع کی گئی پھر تم ایک دوسرے سے دنیا طلبی میں آگے نکلنے کی کوشش میں لگ جاؤ جیسے پہلے لوگ اسی تنافس اور دوڑ میں لگے رہے یہ صورتحال تمہیں اسی طرح تباہ کر دے گی جیسے پہلے لوگوں کو تباہ کیا۔)

Marfat.com

اندازہ کیجیے! آنحضرت ﷺ ہماری غربت سے پریشان نہیں بلکہ مال و دولت کی فراوانی سے پریشان ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مال و دولت کی فراوانی اپنی ذات میں پریشان کرنے والی چیز نہیں یہ اس وقت پریشان کن ثابت ہوتی ہے جب آدمی اس کی محبت کا اسیر ہو کر اسے اپنا مقصدِ زندگی بنالیتا ہے۔ اسے ضرورت کے وقت اور ضرورت کے مطابق نہیں کماتا بلکہ اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہنا اس کی دھن بن جاتی ہے۔ وہ اس بات سے پریشان نہیں ہوتا کہ میرے پاس کیا نہیں جسے میں حاصل کرلوں بلکہ اس کی پریشانی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس کیا کیا ہے تاکہ اس سے بہتر میں اپنے لیے حاصل کروں اور پھر وہ ایسی جوع البقر میں مبتلا ہوتا ہے کہ جسے کسی سطح پر جا کر بھی سیری کا احساس نہیں ہوتا بلکہ جیسے جیسے دولت بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے اس کی ہوس بھی بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ دنیا کے مسائل اور مصائب کو دیکھا جائے تو اس کا سبب بھوک یا وسائل کی کمی نہیں بلکہ اس کا حقیقی سبب ہر دنیادار کی ہوس ہے۔ اسے اپنی ہوس کے مطابق دنیا چاہیے اور ہوس اس کی اتنی وسیع ہے کہ تمام وسائل رزق پر قابض ہو کر بھی شائد اسے سکون نہ ملے۔ اس لیے وہ اسلامی زندگی جو ادائے حقوق اور ایفائے حقوق سے عبارت ہے اور جس کے نتیجے میں اللہ سے وفاداری کا حق ادا ہوتا ہے اسے حاصل کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ آدمی مال کی ہوس سے نکلے، وہ اسے کمائے ضرور، اس سے اپنی ضروریات بھی پوری کرے اور اپنے کاروبار کو جتنا بڑھا سکتا ہے بڑھائے لیکن اصل فکر صرف یہ ہو کہ میں دولت دولت کے لیے نہیں کما رہا بلکہ اس لیے کما رہا ہوں تاکہ میں اس میں اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرسکوں۔ اسے میں خیر کا ذریعہ اور خیر کی قوت بناؤں کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دولت ایک بہت بڑی قوت ہے اور اپنی ذات میں یہ خیر کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے اسے الخیر کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ بلکہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے کہنے کے مطابق مال و دولتِ دنیا پانی کی مانند ہے اور انسانی زندگی ایک کشتی کی مانند ہے۔ کشتی کا بوجھ اٹھانے والی اور اسے کہیں سے کہیں لے جانے والی چیز پانی ہے۔ یہی اس کشتی کی اصل قوت ہے اس کے بغیر کشتی اپنی جگہ سے سرک بھی نہیں سکتی۔ لیکن یہ قوت اس وقت تک ہے جب تک یہ کشتی کے نیچے ہے۔ اگر کہیں یہ کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو پھر کشتی کی تباہی و ہلاکت میں کوئی دیر نہیں ہوتی۔ یہ پانی کشتی کے نیچے اس وقت تک رہتا ہے جب تک دولت آدمی کے ہاتھ کی چھڑی ہو یا جیب کی گھڑی رہے لیکن اگر یہ دل کا محبوب بن جائے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اب اس کشتی کے ڈوبنے میں کوئی دیر نہیں کیونکہ دل کا محبوب بن جانے کے بعد پھر آدمی اسی کی پوجا کرتا ہے اس سے حقوق ادا نہیں کرتا۔ لوگ اس کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر جائیں' انسانیت پر قیامت گزر جائے' اللہ کا دین یتیم ہو جائے' ایک دولتمند آدمی پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے قرآن کریم نے انسان کی دکھتی رگ کو پکڑا اور بتایا کہ اللہ سے وفاداری کا حق ادا کرنے والے وہ لوگ ہیں جو مال سے محبت کے باوجود اسے اللہ کی راہ میں ہر اس جگہ خرچ کرتے ہیں جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ لیکن مال خرچ کرنے اور مال دینے کے حوالے سے علیٰ حبه کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے کہ وہ مال دیتے ہیں اس کی محبت میں۔

علیٰ حبه کا مفہوم

سوال یہ ہے کہ حبه کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ یعنی وہ کس کی محبت میں مال خرچ کرتے ہیں۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس کا مرجع اللہ کی ذاتِ گرامی ہے، لیکن بعض اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ اس کا مرجع خود مال ہے۔ لیکن عاجز کا ناقص گمان یہ ہے کہ دونوں ہی اس کا مرجع ہیں۔ مال اس کا مرجع ہے مال کی صفت کے اعتبار سے اور اللہ کی ذات اس کا مرجع ہے منتہا و مقصود کے اعتبار سے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بر یعنی اللہ سے وفاداری کے مقام کو وہ لوگ پہنچ سکتے ہیں جو اللہ کی راہ میں ایسا مال خرچ کریں جو نہایت قیمتی بھی ہو اور انہیں عزیز بھی ہو اور اس کا ہاتھ سے دینا آسان نہ ہو۔ چنانچہ ایک جگہ قرآنِ کریم نے واضح طور پر اسے بیان فرمایا: ارشاد فرمایا:

Marfat.com

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ

(تم ہرگز البر کونہیں پاسکو گے جب تک تم وہ خرچ نہ کرو جسے تم خود پسند کرتے ہو)

یا پھر آدمی ایسی چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے جس کا وہ خود انتہائی ضرورت مند ہو۔ وہ مالی پریشانیوں یا قحط اور گرانی کی وجہ سے خرچ کرنے کی ہمت نہ پارہا ہو اس کی آمدنی میں گھر کی ضرورتیں بھی بمشکل پوری ہورہی ہوں۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اس کا بھی ذکر فرمایا: ارشاد فرمایا:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

(اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ وہ بھوک سے ہوں)

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس کچھ مہمان آئے آپ نے اپنے سب گھروں میں ایک ایک کر کے کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو ہو تو مہمانوں کے لیے بھیجو۔ لیکن تمام ازواجِ مطہرات کی طرف سے جواب ملا کہ گھر میں اللہ کے نام کے سوا کچھ نہیں۔ غالبًا حضرت طلحہؓ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے انہوں نے عرض کیا حضور اجازت دیں تو میں ان مہمانوں کی میزبانی کروں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ وہ اپنے ساتھ مہمانوں کو لے گئے۔ بیوی کو جا کر بتایا کہ میرے ساتھ مہمان آئے ہیں۔ انہوں نے کہا گھر میں سوائے بچوں کے کھانے کے کچھ نہیں ہے۔ حضرت طلحہؓ نے کہا کہ بچوں کو کسی طرح بہلا پھسلا کر سلا دو اور جب میں مہمانوں کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھوں تو کسی بہانے دیا بجھا دینا۔ چنانچہ مہمانوں نے تاریکی میں کھانا کھایا اور انہیں اندازہ نہ ہوسکا کہ طلحہؓ ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہیں یا نہیں وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ ان کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ چنانچہ اس پر قرآنِ کریم کی یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو ایثار کا مستقل درس دے گئی کہ اللہ کے راستے میں انفاق اس طرح بھی ہوتا ہے کہ خود بھوکے رہو اور دوسروں کو کھانا کھلاؤ۔ آنحضرت ﷺ نے مختلف مواقع پر اسی کی تائید میں ارشادات فرمائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ سب سے افضل صدقہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک بے مایہ شخص اپنی محنت کی کمائی میں سے ایک ایسے عزیز پر خرچ کرے جو اس کے خلاف اپنے دل میں عداوت رکھتا ہو۔ ان باتوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے کس طرح کے ایثار اور کس طرح کے جذبات کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات یاد رکھنا ازبس ضروری ہے کہ بڑے سے بڑا ایثار اور بڑی سے بڑی نیکی اس وقت تک اللہ کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہوتی جب تک اس نیکی کا مقصد اللہ کی رضا کا حصول نہ ہو اور جب تک اللہ کی محبت دنیا کی محبت پر غالب نہ آئے۔ ایسے احساسات کے ساتھ اللہ کی راہ میں جب خرچ کیا جائے تو اس کے مصارف کی ایک ترتیب ہے جسے یہاں ذکر فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے اپنے قرابت داروں کا جائزہ لو۔ ان میں سے اگر کوئی شخص ضرورتمند اور تمہاری مدد کا محتاج ہے تو تمہیں دوسروں کی نسبت سب سے پہلے اس کی مدد کرنا چاہیے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ البر تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا مال قرابتداروں پر خرچ کرے۔

Marfat.com

۲:۔ آخرت پر ایمان: یعنی اس بات کا یقین کہ مرنے کے بعد جی کر اٹھنا ہے اپنے ہر قول و فعل کی اللہ کے سامنے جواب دہی کرنی ہے اور آخرت ہی کی کامیابی اصل کامیابی ہے۔ دنیا دار العمل اور مہلتِ عمل ہے اور آخرت دار الجزا اور تا ابد قرار گاہ ہے۔

۳:۔ فرشتوں پر ایمان: یعنی فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں۔ وہ اپنی ایک ہستی رکھتے ہیں اللہ نے ان کو معصوم اور قدسی صفت بنایا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ہدایت لانے والے امین اور معتمد ہیں۔ قضاء و قدر کے فیصلوں کی تنفیذ انہیں کے واسطے سے ہوتی ہے۔ یہ اللہ اور پیغمبروں کے درمیان وحی لانے کے لیے واسطہ ہیں۔ اگر ان کے معصوم ہونے کا یقین نہ ہو تو وحی کے محفوظ ہونے کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔ ان کے سردار جبریل امین ہیں جو تمام فرشتوں کے مطاع ہیں۔ اللہ کے یہاں ان کا بڑا مقام و مرتبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر وحی لے کر اترتے رہے۔ امین ان کا مستقل خطاب ہے کیونکہ وہ حق امانت میں نہ خیانت کرتے ہیں نہ خطا۔ انہیں قرآنِ کریم نے قوت والا قرار دیا ہے کوئی دوسری قوت ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ کوئی شیطانی قوت ان کے کام میں دخل انداز نہیں ہو سکتی۔

۴:۔ انبیاء و رسل پر ایمان: وہ چونکہ ایک ہی سرچشمۂ علم و ہدایت کے فیض یافتہ ہوتے ہیں اس لیے ان میں تفریق نہیں کی جا سکتی کہ کسی ایک کو مانا جائے اور کسی ایک کا انکار کر دیا جائے۔ اللہ کی طرف سے مامور ہونے اور اس کے نمائندہ ہونے کی وجہ سے تمام انبیاء یکساں احترام کے مستحق ہیں اور سب پر ایمان لانا کہ وہ اپنے اپنے وقتوں میں اللہ کے پیغمبر بن کر آئے تھے اور انہوں نے نوعِ انسانی کو ہدایت کا راستہ دکھایا تھا یہ ہمارے لیے از بس ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انبیاء اور رسولوں کی تعلیم اور ہدایت مرورِ زمانہ کے ساتھ تحریف و ترمیم کا شکار ہوتی رہی اور قوموں نے اسے طاقِ نسیاں کی نذر کر دیا۔ اسی وجہ سے بار بار اللہ کی طرف سے نبی اور رسول آتے رہے اور ان پر کتابیں اترتی رہیں، حتیٰ کہ آخری رسول کی بعثت کا فیصلہ اس وقت ہوا جب تمام دنیا اللہ کے نبیوں کی لائی ہوئی تعلیم سے یا تو بے بہرہ ہو چکی تھی اور یا اس میں ترمیم اور تحریف کے ذریعے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا گیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ ایک ایسا آفتابِ ہدایت طلوع ہو جو انسانوں پر چھائی ہوئی گمراہیوں اور ظلمتوں کی تاریکی کو ہدایت کے نور سے بدل دے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اس شان سے آفتابِ ہدایت بن کر تشریف لائے کہ علم و ہدایت کے تمام دعوے ان کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ سابقہ شریعتیں ماند پڑ گئیں، جس طرح تاریکیوں نے اپنی صف لپیٹی اسی طرح چھوٹی موٹی رہنمائی کی شمعیں بھی گل ہوتی چلی گئیں۔

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

حبِ دنیا میں بے اعتدالی بہت سی خرابیوں کا باعث ہے

ایمانیات کی تکمیل سے دل و دماغ کو توانا اور فکری قوتوں کو جلا دینے کے بعد ضروری تھا کہ انسانی زندگی کے اس رشتے کی طرف توجہ دی جاتی جس کے بگڑ جانے سے انسانی معاملات، انسانی تعلقات اور روئے زمین کا امن تباہ ہو جاتا ہے۔ نظری اور فکری ہدایت انسانی زندگی کے لیے صحیح سمت مقرر کر دیتی ہے۔ لیکن انسانی ضروریات کی الجھنیں اور انسانی تعلقات کی بے اعتدالی وہ نہ صرف انسانی تعلقات کو بگاڑتی ہے بلکہ نظریاتی سچائی کو بھی گہنا کر رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ وَاٰتَی الْمَالَ سے اسی ضرورت کو پورا فرمایا جا رہا ہے۔ دل و دماغ کی یکسوئی کے لیے اللہ اس

Marfat.com

کا رسول اور اس کے دین سے گہری وابستگی اور محبت یقیناً پہلی ضرورت ہے۔ لیکن اس محبت کو جو چیز سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے اور جس میں اعتدال نہ ہونے کی وجہ سے تمام رشتوں میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے وہ حبِّ دنیا ہے۔ جب آدمی مال و دولت سے اس طرح پیار کرے کہ مال و دولت اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی متاع بن جائے اور وہ تمام تعلقات اور رشتوں کو اس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو پھر باقی تمام رشتے اس کے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ کوئی بھی سمجھدار اور شائستہ آدمی کبھی اس الزام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ میں مال و دولت سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مال کے لیے ایمان چھوڑ دینا، دیانت چھوڑ دینا، رحم و مروت کے جذبات سے دستبردار ہو جانا اور اگر تصادم ہو جائے تو مال و دولت یا اس سے متعلقہ اشیاء کے حصول کے لیے خون بہا دینا، جان لے لینا اور کچھ نہیں تو ہر طرح کا دجل و فریب کر گزرنا یہ تو ہمارا قومی رویہ بن چکا ہے۔ مساجد تک اس سے محفوظ نہیں۔ خانقاہیں جو ذکر اللہ کا مرکز ہونی چاہئیں وہاں بھی یہی کاروبار ہوتا ہے۔ خون کے رشتے دنیا کی محبت پر قربان کر دیے جاتے ہیں۔ چند مرلے زمین، چند لاکھ روپیہ، چند دنوں کی شہرت، چند دنوں کا منصب، یہ ہوس کی مختلف صورتیں ہیں۔ جس پر ہم اپنے عزیز ترین رشتے قربان کر دیتے ہیں۔ چھوٹے لوگ اگر اس کے لیے اپنی سطح کے مطابق دجل و فریب اور لڑائی دنگا کر گزرتے ہیں تو بڑے لوگ ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ملک و قوم کو بھی بیچنا پڑے تو دریغ نہیں کرتے۔ یہاں اللہ سے وفاداری کے تقاضوں کو پورا کرنے اور تمام حقوق کی ادائیگی کے لیے جس طرح ایمانیات پر زور دیا جاتا ہے، اسی طرح خالقِ فطرت نے مال سے تعلق کو بھی اس راستے پر ڈالنے کی تعلیم دی ہے جو راستہ اختیار کر کے بندگی اور انسانیت کے رشتے باقی رہتے ہیں اور اگر یہ راستہ اختیار نہ کیا جائے تو پھر کچھ بھی نہیں بچتا۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی جو مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ رؤف اور رحیم ہے اور جن کے لیے مسلمانوں کی کوئی تکلیف بھی قابلِ برداشت نہیں جو اپنے دل میں اس امت کے لیے والدین سے بڑھ کر شفقت رکھتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی پریشانی کا حقیقی سبب

قرآن و سنت کا مطالعہ کر جائیے آپ کہیں نہیں دیکھیں گے کہ جن باتوں سے ماں باپ پریشان ہوتے ہیں حضور کبھی ان باتوں پر پریشان ہوئے ہوں۔ بیٹے کی مالی حالت اگر اچھی نہیں یا وہ برسرِ روزگار نہیں تو ماں باپ کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔ لیکن حضور نے اپنی امت کے لیے اس حوالے سے کبھی پریشانی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ پریشانی کا اظہار فرمایا تو اس سے برعکس باتوں پر۔ آپ نے فرمایا:

مَا الفَقرُ اَخشٰی عَلَیکُم وَلٰکِنِّی اَخشٰی اَنْ تُبسَطَ عَلَیکُمُ الدُّنیا کَمَابُسِطَتْ عَلٰی مَنْ کَانَ قَبلَکُم فَتَنَافَسُوهَا کَمَاتَنَافَسُوهَافَتُهلِکَکُم کَمَا اَهلَکَتهُم

(میں تم پر غربت سے نہیں ڈرتا لیکن میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا وسیع کر دی جائے جیسے پہلے لوگوں پر وسیع کی گئی پھر تم ایک دوسرے سے دنیا طلبی میں آگے نکلنے کی کوشش میں لگ جاؤ جیسے پہلے لوگ اسی تنافس اور دوڑ میں لگے رہے یہ صورتحال تمہیں اسی طرح تباہ کر دے گی جیسے پہلے لوگوں کو تباہ کیا۔)

Marfat.com

قرابتداروں پر خرچ کرنا

قرابتدار چاہے ددھیالی رشتے کے ہوں یا ننھیالی رشتے کے، چاہے قریب کے ہوں چاہے دور کے، چاہے وہ اس سے مخلصانہ تعلق رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، قرابت دار ہونے کی وجہ سے ان کا حق سب پر فائق ہے۔ اس بات پر اگر تھوڑا سا غور کرلیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کس طرح نہایت سادہ لیکن نہایت موثر طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایک ملک میں رہنے والوں کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا اور حصول معاش کے لیے مواقع اور ذرائع فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اسی لیے اسلامی مملکتیں رفاہی مملکتیں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ حکومت کی تمام مخلصانہ مساعی کے باوجود سو فیصد یہ ذمہ داری ادا نہیں ہوتی۔ اس لیے اسلام نے تمام خوشحال لوگوں کو اس میں شریک کردیا کیونکہ غربت کے علاج کے لیے جہاں یہ بات بہت ضروری ہے کہ حکومت اپنے تمام وسائل بروئے کار لائے وہیں یہ بات بھی انتہائی اہم ہے کہ مسلمانوں میں ایک دوسرے کی ضرورتوں کا گہرا احساس پیدا ہو کوئی مسلمان اپنے آپ کو بے بس اور بے کس محسوس نہ کرے۔ ہر مسلمان اپنی حیثیت کے مطابق دوسرے کی فکر کرنے کا مکلف بنایا گیا ہے اور پھر یہ ذمہ داری درجہ بدرجہ تمام معاشرے تک پھیلا دی گئی ہے۔ ہر آدمی کو اپنے قرابتداروں کے حوالے سے ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، ہمسائے کو محلے بھر کی ہمسائیگی کا احساس دلایا گیا ہے اور پھر جیسے جیسے تعلقات کی نوعیتیں بدلتی ہیں ویسے ویسے اس ذمہ داری کی نوعیت بھی بدلتی ہے۔ لیکن آغاز اس کا سب سے پہلے قرابت داروں سے کیا گیا ہے۔ اندازہ فرمائیے! جس معاشرے کا ہر خوشحال فرد دوسروں کی ضرورتوں کی وجہ سے پریشان رہنے لگے اس معاشرے میں بھوک کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ بھوک تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ وسائل پر جو تمام کی ضروریات کے لیے کافی ہیں چند لوگ قابض ہوجاتے ہیں۔ اگر اس قبضے کا راستہ روک دیا جائے اور ہر ایک کے دل میں دوسرے کی فکر پیدا کردی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ بھوک اور غربت کا علاج نہ ہو۔ علامہ اسد جو نومسلم جرمن اخبار نویس تھے وہ اپنی کتاب Road to Mecca میں لکھتے ہیں:

(میں جن دنوں اسلام کو سمجھنے کے لیے عرب ملکوں کی سیاحت کر رہا تھا تو میں نے ایک دن ٹرین میں دیکھا کہ جب دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اپنے اپنے ٹفن کھولے یا کینٹین سے کھانا منگوایا تو میں نے ایک عرب کو دیکھا جس نے اپنے تھیلے سے ایک روٹی نکالی اور اس کے دو حصے کیے ایک حصہ خود رکھ لیا اور دوسرا سامنے بیٹھے ہوئے عرب بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اگرچہ لینے سے انکار کیا لیکن اس کے اصرار پر لے لیا دونوں نے ایک روٹی سے پیٹ بھر لیا۔ علامہ لکھتے ہیں کہ مجھے تب اندازہ ہوا کہ خیر القرون میں مسلمانوں کی آسودگی کا اصل سبب یہی تھا کہ وہ نہایت سیر چشم تھے سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ہر آدمی دوسرے کے لیے فکرمند رہتا تھا۔ جس کے پاس ایک بھی روٹی تھی وہ دوسروں کے ساتھ بانٹ کر کھاتا تھا۔)

Marfat.com

یتیموں مسکینوں کی دیکھ بھال

یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ سب سے پہلے قرابت داروں کو دیکھا جائے اور اس کے بعد مسلمان معاشرے میں سب سے پہلے ان بچوں پر نظر پڑنی چاہیے جو سایۂ پدری سے محروم ہو چکے ہیں، جن کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی قریبی عزیز بھی باقی نہیں۔ اب یہ اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ یتیموں کی دیکھ بھال کا انتظام کرے۔ یتیم وہ نادار بچہ ہے جس کے باپ کا سایہ بلوغ سے پہلے اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اب جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوتا یعنی وہ بالغ نہیں ہوتا اس وقت تک اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی ضروریات اور اس کی تعلیم کا بندوبست کرے اور اگر وہ بالغ ہونے کے بعد بھی اپنی ضروریات کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوا تو ایسے شخص کو مسکین کہا جاتا ہے۔ تو یہ مسکین بھی اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے۔

مسافر کی مدد

بعض دفعہ ایک کھاتا پیتا خوشحال آدمی بھی دورانِ سفر کسی حادثے کا شکار ہو کر ضرورتمند بن جاتا ہے تو ایسے مسافر کی مدد کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس شخص کے مالی حالات کیسے ہیں؟ اگر سفر نے اسے محتاج کر دیا ہے تو اس کی ہر صورت میں مدد ہونی چاہیے۔ اگر وہ اپنی ذات میں محتاج اور نادار ہوتا تو مسکینوں میں شامل ہوتا۔ اس کا الگ ذکر کرنے کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کھوج کرید کرنے کی ضروت نہیں بلکہ سفر میں وہ جس مصیبت سے دوچار ہے اس میں اس کی مدد کرنا ازبس ضروری ہے۔

السآئلین

اس کے بعد والسآئلین، سوال کرنے والے بھی مال دیئے جانے کے مستحق ہیں۔ یہاں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے ان کا ذکر بھی چونکہ الگ سے کیا گیا ہے اس لیے ان کے بارے میں بھی تحقیق کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ جس نے بھی سوال کے لیے ہاتھ پھیلا دیا ہے اس نے گویا عزتِ نفس کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اس لیے اب اس کی مدد کرنا ضروری ہو گیا۔ لیکن یہ بات بھولنا نہیں چاہیے کہ جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس وقت مسلمان کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا بڑے شرم کی بات سمجھتے تھے۔ عربوں میں خودداری ہمیشہ سے رہی ہے اور اسلام نے انہیں توحید کا درس دے کر ہر ایک سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اس لیے ایسے لوگوں میں سے اگر کوئی شخص سوال کر ہی بیٹھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انتہائی ضرورت مند ہے۔ لیکن آج کے دور میں جبکہ بھیک مانگنا ایک پیشہ بن گیا ہے اور بڑے بڑے گینگ مختلف طریقوں سے یہ دھندا کرتے ہیں اور بعض تو ایسے گروپ بھی بن چکے ہیں جو دوسروں ملکوں میں اسی غرض کے لیے جاتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ہر ایک کو دے دینا شائد مناسب نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ گرانی اور وسائل معاش کی کمیابی نے سفید پوشوں کو بھی بعض دفعہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ معاملہ بڑی احتیاط کا طالب ہے۔ زیادہ تجسس کرنا تو ہرگز مناسب نہیں لیکن کسی نہ کسی حد تک دیکھ بھال کر لینا اور صحیح حاجت مند کو پہچاننے کی کوشش کرنا یہ بھی ضروری ہے۔

Marfat.com

وَفِي الرِّقَاب

وَفِي الرِّقَاب: اسی سلسلے کا یہ آخری مصرف ہے۔ رقاب، رقبہ کی جمع ہے ''گردن'' کو کہتے ہیں۔ رقاب سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ فک الرقاب کا معنی ہے ''گردنوں کا آزاد کرانا''۔ گردنوں سے غلاموں کی گردنیں مراد ہیں۔ اللہ سے وفاداری کا حق ادا کرنے اور اس کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے جن بڑے بڑے اعمال کا ذکر فرمایا گیا ہے ان میں غلاموں کی آزادی کے لیے کوشش کرنا شامل فرمایا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں ایک غلام کو طوقِ غلامی سے آزاد کرانا اور اسے آزاد انسانوں کی سطح پر لا کر اپنے شعور اور ارادے کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دینا اللہ کے یہاں کس قدر محبوب عمل ہے اور اسی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غلامی اسلام کے نظام کا کوئی حصہ نہیں بلکہ اس کے اہداف سے سراسر متصادم ہے۔ حضرت ربعی ابن عامر جب مسلمانوں کے نمائندہ بن کر ایرانی سپہ سالار رستم سے ملے اس نے آپ سے پوچھا کہ تم لوگ کس غرض سے ایران پر حملہ آور ہوئے ہو آخر تمہاری اس فوج کشی کا مقصود کیا ہے؟ تو آپ نے اس سے تین باتیں ارشاد فرمائی تھیں۔ جن میں سب سے پہلی بات یہ تھی کہ ہم اس لیے اپنے وطن سے نکلے ہیں تاکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلائیں انسان نے مختلف شکلوں میں انسان کو غلام بنا رکھا ہے۔ کہیں دولت کے زور پر، کہیں حکومت کے زور پر اور کہیں طاقت کے زور پر، اسلام ایسی ہر زنجیر کاٹ دینا چاہتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دین جو انسان کی بیڑیاں کاٹنے کے لیے آیا ہے اس کے حریم میں طوقِ غلامی کا تصور کیسے داخل ہوسکتا ہے؟ یہ تو اس وقت کے بین الاقوامی قانونِ جنگ کی مجبوری تھی جس نے مسلمان کو مجبور کیا کہ وہ وقتی طور پر غلامی کو گوارا کرلیں۔ لیکن اسلام نے اسے جس طرح ختم کیا اور جس طرح غلاموں کو گھروں میں جگہ دے کر اسلام کی نشر و اشاعت اور غلاموں کی تربیت کے مواقع پیدا کیے وہ مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے واقعات ہیں جس پر مسلمان ہمیشہ فخر کر سکتے ہیں۔ اس نے نہ تو رومیوں کی تاریخ دہرائی، نہ اس نے ایرانیوں کے ظلم کا راستہ کھلنے دیا، نہ اس نے جدید دور کے مسولینی اور ہٹلر کا طرزِ فکر اپنایا اور نہ اس نے یورپ اور امریکہ کے ہتھکنڈوں کا استعمال کیا اس نے انسانی سطح پر انسانی احساسات کو اجاگر کیا۔ انسانی محرومیوں کا مداوا کیا اور غلامی کی زنجیریں توڑنے کو عبادت کا درجہ دے دیا گیا۔ چنانچہ مسلمان حکمرانوں سے لے کر عام مسلمانوں تک اس نیکی کے اثرات دیکھنے میں آئے، ایک محدود وقت میں غلامی کے اثرات محدود سے محدود تر ہوگئے اور تربیت کے عمل نے انہیں غلاموں میں سے جوہرِ قابل کو نمایاں کیا اور ان میں ایسے افراد تیار ہوئے جنہیں ہم محدثین، مفسرین، متکلمین اور مجاہدین کی قابلِ عزت صفوں میں نمایاں مقام کے حامل دیکھتے ہیں اور یہ بھی تاریخِ انسانی کا ایک عجیب واقعہ رہے گا کہ انہیں غلاموں میں حکمران اٹھے جنہوں نے آزادوں پر حکومت کی اور ان کی قربانیوں نے تاتاریوں جیسے وحشیوں کا راستہ روکا، ٹھیک کہا کسی نے ؎

غلاموں کو سریرِ سلطنت پر جس نے بٹھلایا
غلاموں کے سروں پر کر دیا اقبال کا سایہ

ایک ہندو شاعر کہتا ہے ؎

کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا درِّ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

Marfat.com

یہ اسلام کا اعجاز اور مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج غلامی قانوناً ختم ہو چکی ہے لیکن ظالم انسانوں اور خدا بیزار تہذیب نے غلامی کی نئی شکلیں ایجاد کر لی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب انسان منڈیوں میں نہیں بکتے' لیکن آج قوموں کی معاشی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں معاشی قرضوں کی زنجیروں میں اس طرح جکڑا جاتا ہے کہ وہاں پیدا ہونے والا ہر بچہ سرمایہ دار ملکوں کا غلام ہوتا ہے۔ یہ تو وہ غلامی ہے جو بین الاقوامی سطح پر ہو رہی ہے اور جہاں تک ہر ملک کے اندر پلنے والی غلامی کا تعلق ہے اسے آپ ہر ترقی پذیر پسماندہ ملک میں دیکھ سکتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو سودی قرضوں کے باعث جیلوں میں بند ہیں، کتنے ایسے ہاری اور مضارع ہیں جو اپنے جاگیردار یا زمیندار سے لیے ہوئے قرضوں کے باعث اپنی اولاد تک کو گروی رکھ دیتے ہیں اور کتنے ایسے لوگ ہیں جو محض اپنی سادگی کے باعث قانون کی زد میں آ گئے اور اب وہ برسوں سے جیلوں میں سڑ رہے ہیں اور اگر کہیں ضمانت ہو جاتی ہے تو زرِ ضمانت ادا نہ کر سکنے کے باعث جیل کی خاک بن جاتے ہیں۔ یہ غلامی کی مختلف شکلیں ہیں نام ان کے کچھ بھی ہوں لیکن حقیقت ایک ہی ہے ایسے تمام مظلوموں، بے کسوں اور مجبور لوگوں کو ظلم کے ان شکنجوں سے آزادی دلانا انشاء اللہ تعالیٰ فک رقبۃ کی نیکی کا حصہ ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لینا چاہیے۔

وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ: اسلام کا مزاج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن باتوں کو دل و دماغ میں اتارنا چاہتا ہے اور جن صفات کو مزاج اور کردار کا حصہ بنانا چاہتا ہے اس کے لیے حکم بھی دیتا ہے، ترغیب بھی دیتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اس کی بار بار یاد دہانی کا انتظام بھی کرتا ہے۔ اسلامی سیرت کا دارومدار ایمانیات کی پختگی پر ہے۔ جب تک اللہ سے حقیقی تعلق پیدا نہیں ہوتا، اللہ کا خوف دل میں راسخ نہیں ہو جاتا، اللہ کی ذات وصفات کا استحضار نصیب نہیں ہوتا اور اللہ سے قلبی وابستگی پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک انسانی فکر اور انسانی اعمال میں کبھی تطہیر نہیں ہو سکتی۔ قلب و نگاہ کی پاکیزگی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی کو یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی ذات ہے جو علیم بذات الصدور ہے کوئی ہے جو میرے احساسات کو جاننے والا ہے کوئی ہے جو میرے ہر عمل کو پرکھنے والا ہے۔ اسی طرح مال و دولت کے حوالے سے ایک مال دار اس وقت تک اعتدال پیدا نہیں کر سکتا جب تک وہ یہ نہیں سمجھتا کہ میں اپنے پاس موجود مال و دولت کا مالک نہیں امین ہوں۔ جو اس کا مالک ہے وہ ایک دن مجھ سے اس کا حساب مانگے گا کہ تم نے میری دی ہوئی امانت کو خرچ کیا تھا یا نہیں اور اگر کیا تھا تو کیا انہیں مصارف میں خرچ کیا تھا جن کا میں نے حکم دیا تھا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قلب و نگاہ کی پاکیزگی اور علائق دینوی کی شائستگی اور بالیدگی کا دارومدار ان تصورات کے رسوخ پر ہے جن کا اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے اس لیے پروردگار نے اس بات کا اہتمام فرمایا کہ ان بنیادی تصورات کو اس طرح بار بار یاد دلایا جائے کہ آخر وہ سیرت و کردار کا حصہ بن جائیں یا سیرت و کردار اس کے زیر اثر تشکیل پذیر ہوں۔ اس لیے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا۔ کیونکہ دن میں پانچ وقت نماز کی ادائیگی اس قدر موثر نسخہ ہے کہ اگر نماز پڑھنے والا شعور سے نماز پڑھے اور اس کی طبیعت اثر پذیری کے احساس سے محروم نہ ہو چکی ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ نماز کے ذریعے ایمانیات کو دل و دماغ میں نفوذ پیدا کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ کیونکہ نماز اصلاً ایمان کی عظیم حقیقت کا مظہر ہے۔ نمازی جب نماز کی نیت کرتا ہے تو وہ اللہ کی الوہیت، اس کی کبریائی اور اپنی بندگی اور عاجزی کے تصور کو زندہ کرتا ہے۔ جب وہ ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہتا ہے تو دنیا کی ساری بڑائیاں اس کے قدموں میں سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ صرف ایک بڑائی اور عظمت اللہ کی ہے جس کا وہ اقرار کرتا ہے اور اس کے سامنے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اسی کی ثنا کرتا ہے' اس سے پناہ چاہتا ہے' اسی کے گن گاتا ہے' اسی کی حمد کے زمزمے الاپتا ہے' اسی کی بندگی کا اقرار کرتا ہے' اسی سے مدد کا طالب ہوتا ہے پھر اسی سے ہدایت مانگتا ہے' اپنی ہر آزادی سے دستبردار ہو کر اسی کی بندگی اور اطاعت کا عہد کرتا ہے اور ان تصورات کو عملی شکل دیتے ہوئے وہ کبھی جھکتا ہے' کبھی اٹھتا ہے' کبھی سجدہ ریز ہوتا ہے' کبھی دوزانو

Marfat.com

بیٹھتا ہے' دل اللہ کے خوف سے لرزتا ہے' آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں' دن میں پانچ دفعہ وہ امید و بیم کی کشمکش سے گزرتا ہے۔ اس طرح کے بار بار عمل سے اس کی زندگی کے تمام اعمال ایک نہج اختیار کر لیتے ہیں اس کا ذہن ایک منزل کا تعین کر لیتا ہے۔

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دولتِ دنیا سے اعتدال سے بڑھا ہوا تعلق بہت سارے مفاسد کا سبب بنتا ہے۔ انفاق کا حکم دے کر ذہنی تصورات کو درست کرنا اور انسانی معاملات کو مفاسد سے بچانا مقصود ہے۔ چنانچہ انفاق کے بنیادی تصور کو سیرت و کردار کا حصہ بنانے اور اس تصور کی یاد دہانی کے لیے زکوٰۃ کو قانونی حیثیت دی گئی اور اسے انفاق کا قانونی مظہر بنا دیا گیا۔ سال کے بعد جب اپنے پورے مال کا جائزہ لے کر آدمی زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور یہ سمجھ کر ادا کرتا ہے کہ اس کا ادا کرنا میرے لیے فرض ہے تو اسے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اگر یہ مال بندوں کی ملکیت ہوتا تو اس میں سے ایک حصہ ادا کرنا فرض نہ ہوتا اور اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے کہ مال میں قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور دوسرے ضرورت مندوں کا بھی حصہ ہے۔ تم مال دار ہو کر بھی غریب اور مسکین مسلمانوں سے الگ حیثیت کے مالک نہیں ہو، تمہاری ایک انسانی برادری ہے جس کے تم فرد ہو اور تمہارے ایک دوسرے کے حوالے سے حقوق و فرائض ہیں۔ انہیں حقوق و فرائض سے عہدہ برآ ہونا اسلامی زندگی ہے اسی اسلامی زندگی کی یاد دہانی نماز سے بھی کرائی جاتی ہے اور زکوٰۃ سے بھی۔ اور زکوٰۃ کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ضرورت مندوں کے حوالے سے جو ذمہ داریاں مالداروں پر عائد ہوتی ہیں وہ صرف زکوٰۃ ادا کرنے سے ادا نہیں ہو جاتیں اور جس انفاق کا ابھی ذکر کیا گیا ہے وہ صرف زکوٰۃ تک محدود نہیں بلکہ جس بر و تقویٰ کے حاصل کرنے کی یہاں بات ہو رہی ہے اس کے حصول کے لیے ادائے زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ اس طرح فیاضانہ خرچ کرنا بھی ضروری ہے کہ جس میں اخفا بھی ہو اور ضرورت کے مطابق اظہار بھی۔

اس کے بعد وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ سے ایفائے عہد کی صفت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ لیکن اسلوبِ کلام بدل گیا ہے اوپر انفاق، نماز اور زکوٰۃ کا ذکر فعل کی شکل میں آیا ہے لیکن یہ اسم فاعل اور صفت کی صورت میں ہے۔ عربی میں فعل کے صیغے صرف کسی فعل کے وقوع کو ظاہر کرتے ہیں لیکن صفت کے صیغے کسی مستقل صفت کسی خصلت اور کسی کردار کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کے اندر ایک عزم و جزم کی روح بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ سے بر و تقویٰ کا تعلق رکھنے والے اہلِ ایمان ایسے نہیں کہ ایفائے عہد ان کے لیے کسی وقت وقوع پذیر ہونے والا کوئی واقعہ ہو بلکہ جس طرح سورج سے روشنی، آگ سے تپش، موتی سے آب اور دریا سے بہاؤ الگ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اہلِ ایمان کے لیے ایفائے عہد ایک خصلت اور ایک کردار ہے جو ان سے منفک نہیں ہو سکتا۔ یہ ان کی پہچان اور شناخت ہے جو ان سے الگ نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد صبر و استقلال کو الصابرین کے لفظ سے ذکر فرمایا اور اس میں لفظی طور پر دو نزاکتیں رکھیں۔ ایک تو یہ کہ الصابرین بھی الموفون کی طرح صفت کی صورت میں ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ صبر و استقلال بھی ایفائے عہد کی طرح ان کی لازمی خصلت ہے اور دوسری یہ بات کہ الصابرین کو بغیر کسی ظاہری سبب کے حالت نصب میں لایا گیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے اہلِ نحو کی اصطلاح میں علی سبیل المدح یا علی سبیل الاختصاص سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان جو بر و تقویٰ کے راستے کے مسافر ہیں ان میں بطور خاص دیکھو گے کہ صبر و استقلال اور استقامت ان کا ایک ایسا نمایاں جوہر ہے جو زندگی کے کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔ چاہے وہ حالت فقر و فاقہ کی ہو، یا جسمانی عوارض سے پیش آنے والی تکالیف کی اور چاہے وہ حالتِ جنگ کی شدت اور ہولناکی ہو تم کبھی ان کے عزم کو شکست ہوتا، کبھی ان کے حوصلوں کو پست ہوتا نہیں دیکھو گے۔

Marfat.com

الموفون اور الصابرین کی وضاحت میں آپ نے دو باتیں محسوس کی ہوں گی۔ ایک تو یہ بات کہ اسلام کی نگاہ میں عقائد اور عبادات کی بڑی اہم حیثیت ہے۔ لیکن ان کا ذکر سیدھے سادے فعل کے صیغوں سے کیا گیا ہے۔ لیکن ایفائے عہد اور صبر کے لیے بالکل اسلوب بدل دیا گیا ہے اور اسے صفت کے صیغوں کے ساتھ بڑے اہتمام اور اختصاص کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں کا تعلق سیرت و کردار سے ہے اور سیرت و کردار کا معاملہ بڑا محنت طلب، جان مارنے والا، نہایت ریاضت اور تربیت کا محتاج اور عزم و جزم کا طالب ہوتا ہے کیونکہ کسی بڑی سے بڑی صداقت کا اقرار اور دل و دماغ سے اس کی تصدیق اگرچہ ایک مشکل کام ہے لیکن اتنا مشکل نہیں جتنا اس کے مطابق ایک مزاج تیار کرنا مشکل ہے۔ مزاج تیار ہونے کے بعد سیرت و کردار کو ایک شکل ملتی ہے۔ اس کے لیے بنیاد یقیناً عقائد اور عبادات ہیں' لیکن اس پر اٹھنے والی عمارت یقیناً نہایت اہتمام کی متقاضی ہے۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ کتنے نیک لوگ نمازوں کے پابند لیکن معاملات کے کھوٹے نکلتے ہیں۔ ایفائے عہد میں نہایت کمزور ثابت ہوتے ہیں اور اگر کبھی معاملہ استقامت کا طالب ہو اور حوصلہ مندی کا امتحان شروع ہو جائے تو سب نیکیاں دھری رہ جاتی ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہوتا ہے کہ زبانی جمع خرچ اور عادۃً نماز پڑھ لینے کو کافی سمجھ لیا گیا ہے، لیکن اس پر کردار کی جو عمارت تعمیر ہونا چاہیے تھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا گیا۔

دوسری بات جو آپ کو اس میں محسوس ہوگی وہ یہ ہے کہ سیرت و کردار کے حوالے سے صرف دو ہی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایفائے عہد اور صبر۔ حالانکہ اور بھی بہت سی چیزیں سیرت و کردار سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایفائے عہد وہ خوبی ہے جو باقی تمام اسلامی اور ایمانی خوبیوں کو ایک لڑی میں پرو کر رکھتی ہے۔ معاملہ حقوق اللہ کا ہو یا حقوق العباد کا، معاہدات چاہے اللہ سے ہوں یا بندوں سے، اور بندوں کی وسیع برادری میں چاہے امیر سے ہوں یا غریب سے، اپنوں سے ہوں یا بیگانوں سے ان کی حیثیت معاشرتی ہو' معاشی ہو' یا سیاسی' ان سب چیزوں کا تعلق عہد و پیمان سے ہے اور ان تمام عہد و پیمان اور حقوق و فرائض کا ادا کرنا بر اور تقویٰ کا تقاضا ہے۔ اس لحاظ سے غور فرمایئے! ایفائے عہد کی ایک صفت پیدا ہو جانے سے اللہ تعالیٰ اور بندوں کو تمام حقوق کی ادائیگی کی ضمانت مل جاتی ہے اور یہی البر کا تقاضا بھی ہے۔

اللہ کے حقوق ہوں یا مخلوقِ خدا کے' ان کی ادائیگی کبھی آسان نہیں ہوتی۔ ان کے راستے میں ہزاروں رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان حقوق کا ادا کرنا دینی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا، ملک و ملت کی ضرورتوں کو پورا کرنا نہایت صبر آزما کام ہے۔ کبھی اسلامی زندگی کے راستے میں فقر و فاقہ کے مراحل آتے ہیں کبھی جسمانی عوارض راستہ روک لیتے ہیں۔ کبھی جنگی حالات پوری قومی زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ایسی تمام حالتوں میں موقف حق پر قائم رہنا اور بر و تقویٰ کے تقاضوں کو نقصان نہ پہنچنے دینا اور بہر صورت اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنا صبر ہے۔ اللہ کی اطاعت پر جم جانا بھی صبر ہے۔ معصیت کے تمام راستوں کو بند کرنے کی کوشش کرنا یا اپنے آپ کو اس سے دور رکھنے کے لیے اڑ جانا یہ بھی صبر ہے۔ آپ اندازہ فرمایئے! اگر آدمی میں ایفائے عہد کا کردار جنم لے لیتا ہے اور صبر کی قوت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس کے لیے بر و تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچنے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے؟ اس لیے آخر میں فرمایا: اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ "یہی لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ وفاداری میں سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں متقی ہیں"۔

Marfat.com

اس طرح پروردگار نے ایک سراپا تشکیل فرما کر اس کے خدوخال ہمارے سامنے واضح فرما دیئے۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ البر اور تقویٰ کوئی مبہم اصطلاح یا کسی موہوم آدرش کا نام نہیں بلکہ وہ ایک سیرت و کردار کا نام ہے جس کے حامل کی یہاں تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جو امتِ مسلمہ کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے تا کہ وہ اس سے تقابل کر کے اپنی اصل شکل پہچاننے کی کوشش کریں۔ وہ اپنی قریبی تاریخ کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں کہ انہوں ایفائے عہد کے حوالے سے کیسی تاریخ رقم کی ہے؟ پاکستان بناتے ہوئے جو اللہ سے عہد کیا گیا تھا ہم نے اس کا کس طرح ایک ایک بند توڑا ہے۔ قبائلی علاقوں سے ہمارے قائد نے جو وعدے کیے اور جو انہیں تحفظات دیئے تھے ہم نے کس طرح ان پر خطِ تنسیخ کھینچا ہے۔ ہم نے اپنے پڑوسی ملک کے ساتھ کیا کیا وعدے کیے ہمارے وعدوں پر اعتبار کر کے جو لوگ اپنی آرام دہ زندگی اور اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر کفن بردوش ہمارے پاس آئے تھے ہم نے انہیں وعدوں پر اعتبار کرنے کی کیا سزا دی؟ اور پھر جب ہم پر سخت وقت آیا اور بڑی قوتوں نے ہمیں دھمکایا تو ہم نے جس طرح بے صبری کی تاریخ رقم کی اور جس طرح اپنے مسلمان بھائیوں کا خون بہایا اور اسلام اور مسلمان دشمنوں کو جس طرح اپنی زمین اور اپنا کندھا پیش کیا ان میں سے ہر واقعہ ایک سلگتا ہوا زخم ہے جو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کب چنگاری بن کر لو دینے لگے اور ہمیں اس کے نتیجے میں کیسی فصل کاٹنی پڑے۔ اندیشے دراز ہوتے جا رہے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

وہ معاشرہ جس کی بنیادیں بر و تقویٰ پر اٹھائی جاتی ہیں اور جس کی تصویر ہم نے اس آیتِ کریمہ میں دیکھی ہے، اسے معاشرتی اور سماجی سطح پر سب سے زیادہ نقصان دو باتوں سے پہنچتا ہے۔ ایک یہ کہ اس معاشرے میں حرمتِ جاں کا تصور کمزور ہونے لگے اور دوسرا یہ کہ وہ معاشرہ حبِ مال میں مبتلا ہو کر باہمی حقوق کو نظر انداز کر دے۔ چنانچہ اگلی آیاتِ کریمہ میں انہیں دونوں باتوں کے حوالے سے مسلمانوں کو ہدایات دی جا رہی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

اے ایمان والو! تم پر فرض کیا گیا ہے مقتولوں کا قصاص لینا، آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، پھر جس کسی کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو اس کے لیے دستور کی پیروی کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک آسانی اور مہربانی ہے پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے ۝ اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو! تا کہ تم حدودِ الٰہی کی پابندی کرو (البقرۃ: ۱۷۸ تا ۱۷۹)

Marfat.com

قصاص کا معنیٰ و مفہوم

قصاص عام مفہوم میں ''خون کے بدلے'' کو کہتے ہیں۔یعنی قاتل کے ساتھ وہی کیا جائے جو اس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے۔لیکن اس کا لفظی معنیٰ ''مماثلت'' ہے۔جس سے قصاص کی اصل روح کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ مماثلت کا مساوات کے بغیر حق ادا نہیں ہوتا اور حقیقی مساوات اور ہر سطح پر مساوات قصاص کی اصل روح ہے۔اسی طرح اس کا معنیٰ ''کسی کے پیچھے اس کے نقشِ قدم کے ساتھ ساتھ چلنا'' بھی ہے۔قرآنِ کریم نے مختلف آیات میں اس لفظ کو اس معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔مثلاً سورہ قصص آیت نمبر ۱۱ میں فرمایا گیا ہے:

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

(اور اس نے اس کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جا تو وہ دور سے اسے دیکھتی رہی اور لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوا)

قصیہ قصاص سے ہے اور اس کا معنیٰ ہے اس کے پیچھے پیچھے جاؤ'' یہ امر واحد مونث حاضر ہے۔اس معنیٰ میں بھی اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ قصاص کے مفہوم میں قاتل کا کھوج لگانا اس کا تعاقب کرنا، اس کے نقوشِ قدم کو تلاش کرنا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے قاتل تک پہنچنا اور آخر اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا یہ قصاص کا مقصد ہے۔لفظ کا معنیٰ جان لینے کے بعد آیتِ کریمہ کے الفاظ پر غور کیجیے۔فرمایا: مسلمانو تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص لینا فرض کیا گیا ہے۔ قَتْلٰی ''قتیل'' کی جمع ہے اور قتیل ''مقتول'' کو کہتے ہیں۔اس میں دیکھئے کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے مقتولوں کے قصاص کی فرضیت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اس خطاب کے اصل مخاطب کون ہیں؟ مقتول کے ورثا یا عام مسلمان معاشرہ؟ اگر مقتول کے ورثا مراد لیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ قصاص لینا ان پر فرض کیا گیا ہے تو پھر انہیں قاتل یا اس کے خاندان سے کسی طرح کی مفاہمت کی اجازت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام نے مقتول کے وارثوں کو قاتل سے مفاہمت کی اجازت دی ہے۔وہ چاہیں تو قاتل کو قصاص معاف کر دیں چاہیں تو دیت پر سمجھوتہ کر لیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں خطاب وارثوں کو نہیں بلکہ مسلمان معاشرے یا ان کی نمائندہ حکومت کو ہے۔

ایک آدمی کا قتل، جسدِ امت کے ایک عضو کا کٹ جانا ہے

اسلام کی نگاہ میں اگر کہیں قتل ہوتا ہے تو وہ اگرچہ براہِ راست نقصان اس گھر اور اس خاندان کا ہے جس کے ساتھ مقتول کی رشتہ داری ہے اور وہی براہِ راست صدمہ کا شکار بھی ہوں گے۔لیکن حقیقت میں یہ نقصان صرف مقتول کے وارثوں کا نہیں بلکہ پوری مسلمان سوسائٹی اور مسلمان معاشرے کا ہے کیونکہ مسلمان جسدِ واحد کی حیثیت رکھتے ہیں جسم کا اگر ایک عضو کٹ جائے یا ہاتھ کی ایک انگلی کٹ جائے تو یہ نقصان صرف ہاتھ کا ہی نہیں بلکہ پورے جسم کا ہے۔انگلی کٹنے کی تکلیف صرف ہاتھ ہی محسوس نہیں کرتا بلکہ پورا جسم اس سے بے چین اور بے خواب ہوتا ہے۔اسی طرح جب کوئی مسلمان قتل ہوتا ہے تو وہ جسدِ امت کا ایک عضو کٹتا ہے۔مسلمان اگر ایک عمارت کی مانند ہیں تو عمارت کی ایک دیوار گرتی ہے اور اگر وہ ایک درخت کی حیثیت رکھتے ہیں تو اس کا ایک تنا ٹوٹتا ہے اس لحاظ سے مقتول صرف اپنے خاندان کا مسئلہ نہیں بلکہ مسلمان معاشرے اور اسلامی حکومت کا مسئلہ ہے بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہنا چاہیے کہ سوال صرف مسلمان کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے زیرِ تحفظ کسی غیر مسلم کی جان بھی جاتی ہے تو تب بھی پورے اسلامی معاشرے کو بے چین ہو جانا چاہیے کیونکہ قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ ایک آدمی کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے ارشاد ہے:

Marfat.com

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ

جس نے کسی جان کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان ماری ہو یا زمین میں فساد مچایا ہو قتل کر دیا تو گویا اس نے سارے ہی لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا سب لوگوں کو زندہ کیا) (المآئدہ: ۳۲)

ایک آدمی کا قتل انسانیت کا قتل ہے

اس طرح سے قرآنِ کریم ایک شخص کے قتل کو مقتول کے وارثوں کا نہیں انسانیت کا مسئلہ قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے اس نقصان کی تلافی کے لیے بے قراری اور بے چینی صرف مقتول کے وارثوں کو نہیں ہونی چاہیے بلکہ پورے مسلمان معاشرے، پوری انسانیت، اور اسلامی حکومت کو ہونی چاہیے۔

قتل اللہ تعالیٰ کے قانون کی پامالی ہے

اگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو یہ معاملہ اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ جس طرح ایک شخص کا قتل انسانیت کا قتل ہے اسی طرح ایک شخص کا قتل اللہ کے قانون کی پامالی بھی ہے۔ حرمتِ جان کا تصور اور اس کی حفاظت کا قانون اللہ کی ہر شریعت میں موجود رہا ہے اور ہر دور کے رسول نے اپنی اپنی امت کو اس کی تعلیم دی ہے اور بنی اسرائیل کو بڑی تاکید کے ساتھ اس حکم کا پابند کیا گیا ہے۔ تو مسلمان معاشرے میں جب ایک شہ رگ کٹتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اللہ کے ایک قانون کی ایک دفعہ گر جاتی ہے۔ جب کہیں بھی خون بہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اللہ کے قانون کی بے حرمتی اور پامالی ہوتی ہے تو اس بے حرمتی اور پامالی کو روکنا صرف مقتول کے وارثوں کی ذمہ داری نہیں بلکہ تمام مسلمان معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں مسلمان معاشرے یا اسلامی حکومت پر مقتول کے قاتل سے قصاص لینا فرض کیا گیا ہے اور اس قصاص کے عمل کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے جو کچھ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے ایک ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ قاتل کا کھوج لگانا، اس کی تحقیق و تفتیش کے لیے تمام وسائل بروئے کار لانا اور اگر قاتل کسی بڑی حیثیت کا مالک یا کسی بڑے گینگ سے تعلق رکھتا ہے تو پوری قوت سے اس پر ہاتھ ڈالنا اور پھر عدالت میں اس معاملے کو لے جا کر فیصلے تک پہنچانا اور پھر فیصلے کو نافذ کرنا، ان میں سے کوئی بات بھی مقتول کے وارثوں کے ذمہ نہیں بلکہ یہ تمام حکومت کے فرائض ہیں۔ اس لیے کہ قاتل کی تحقیق و تفتیش عام لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوتی اور مقتول ضروری نہیں کہ اپنے پیچھے ایسے وسائل چھوڑ جائے جس سے اس کے وارث تحقیق و تفتیش کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں اور پھر اگر قاتل یا اس کا خاندان بڑی حیثیت کا مالک ہو تو ان سے عہدہ برآ ہونا مقتول کے وارثوں کے لیے بسا اوقات ممکن نہیں ہوتا۔ مزید تشویش کی بات یہ ہے کہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات کی ستم ظریفی یا دباؤ کے باعث مقتول کے وارث تحقیق و تفتیش کے چکر میں پڑنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے لیے اسے خطرہ سمجھ کر قاتل کی ہم نوائی کرنا شروع کر دیتے ہیں یا اس سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ ان تمام مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ قاتل کی تلاش کرے اور اسے کیفرِ کردار

Marfat.com

تک پہنچائے۔ البتہ! اس میں حکومت کو بعض باتوں کا پابند بھی کیا گیا ہے اور اسے اپنے طور پر فیصلہ کرنے کی مکمل آزادی نہیں دی گئی۔ ان کے لیے یہ لازم ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ بجائے خود فیصلہ کرنے کے مقتول کے اولیا کو یہ اختیار دے کہ وہ اسلامی قانون کی حدود کے اندر قاتل کے ساتھ جو معاملہ کرنا چاہیں کریں۔ اسے قتل کر دیں یا اس سے خوں بہا لے لیں، حکومت کا کام ان کے لیے ایسے حالات اور ایسا تحفظ فراہم کرنا ہے جس میں وہ اپنے اختیار کے مطابق فیصلہ کر سکیں۔ مقتول کے وارثوں کو یہ اختیار دینا دوررس نتائج کا حامل ہے۔ چنانچہ مقتول کے وارث جب دیکھتے ہیں کہ قاتل پر ہم کو اختیار دے دیا گیا ہے اور ہم چاہیں تو قصاص میں اس کی جان لے سکتے ہیں اور چاہیں تو اس کے ساتھ کوئی نرم رویہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ تو اس اختیار مل جانے سے ان کے بہت بڑے اور بہت گہرے زخم کے اندمال کی ایک صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا گیا ہوا عزیز واپس تو نہیں آسکتا لیکن ان کو ایک حوصلہ ضرور ملتا ہے کہ ہم اس معاشرے میں تنہا نہیں اور پھر جب اس اختیار کے بعد وہ قاتل کو معاف کریں گے یا اس سے دیت لینے پر راضی ہو جائیں گے تو یہ قاتل اور اس کے خاندان پر براہِ راست ان کا احسان ہوگا۔ جس سے اس انتہائی خطرناک دشمنی میں کمی ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ قتل دو خاندانوں میں انتقام کی آگ بھر دیتا ہے اور یہ معافی ازسرنو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دینے کا کام کر سکتی ہے۔ اس لیے اسلام نے مقتول کے اولیا کو یہ حق دیا تا کہ اس ظلم کے آثار مٹائے جاسکیں۔ اگر یہ سارا اختیار پولیس اور عدالت ہی کو سونپ دیا جاتا جیسا کہ موجودہ قوانین میں ہے تو پھر ان بہتر نتائج کے پیدا ہونے کی امید نہیں کی جاسکتی۔

قصاص کی روح کو زندہ کرنے والی ہدایت

اب اگر مقتول کے وارث یہ فیصلہ کر لیں کہ ہمیں بہر صورت قاتل سے قصاص ہی لینا ہے اور ہم کسی مفاہمت کے لیے تیار نہیں تو پھر قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ کے دوسرے جز میں ایک ایسی ہدایت عطا فرمائی ہے جس نے قصاص کی روح کو زندہ کر دیا ہے۔ قصاص کا تصور تو اسلام سے پہلے بھی موجود تھا لیکن وہ ایک انتہائی انتقام کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ جس میں عدل اور احسان کا کوئی شمہ باقی نہیں رہا تھا۔ اگر کسی بڑے قبیلے کا کوئی فرد مارا جاتا اور قاتل چھوٹے قبیلے کا ہوتا تو بڑے قبیلے کے سردار مطالبہ کرتے کہ ہم اپنے مقتول کے بدلے میں صرف ایک قاتل کو ہی قصاص میں قتل نہیں کریں گے بلکہ ہم اپنی حیثیتِ عرفی کے مطابق قاتل کے ساتھ مزید چند افراد کا خون بھی بہائیں گے کیونکہ اس چھوٹے قبیلے کا ایک فرد ہمارے قبیلے کے ایک فرد کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر مقتول کسی چھوٹے قبیلے کا ہوتا اور قاتل کسی بڑے قبیلے کا تو اولاً تو بڑے اور طاقتور قبیلے سے کسی طرح کا قصاص لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ یہ دعویٰ کرتے کہ ان کا کوئی فرد چونکہ ہمارے کسی فرد کے برابر نہیں تو ہم ایک معمولی آدمی کے قتل کے بدلے میں اپنے نہایت معزز قاتل کا گلا کیسے پیش کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یا تو اس مقتول کا خون رائیگاں جاتا اور یا پھر انہیں مجبوراً دیت لینا پڑتی۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ بات آئے کہ یہ تو دورِ جاہلیت کی باتیں ہیں جبکہ ہر قبیلہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ معزز خیال کرتا تھا۔ آج کا دور تو علم کی روشنی کا دور ہے آج تو اس طرح کی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کی جاہلیتِ جدیدہ جاہلیتِ قدیمہ سے بھی زیادہ انسانیت کی قاتل ہے۔ آج کی طاقتور دنیا سے کوئی کمزور ملک قصاص کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اب تو اندھیر نگری کا عالم یہ ہے کہ دنیا کے پانچ بڑے ملک اپنے پاس ''ویٹو'' کا اختیار رکھتے ہیں جس کی موجودگی میں کسی ایسے معاملے کا تصفیہ نہیں ہوسکتا جو ان کی ہوائے نفس اور مفادات کے مطابق نہ ہو۔ امریکہ طاقت کے زعم میں یہ بات کہتا ہوا ہرگز نہیں شرماتا کہ

Marfat.com

ہمیں دنیا کے کسی بھی ملک پر حملہ کرنے کا حق ہے اور کسی دوسرے ملک کو ہمارے ملک یا ہماری فوج کے خلاف عالمی عدالتِ انصاف میں جانے کا کوئی حق نہیں۔ جاہلیتِ قدیمہ میں انسان انسان پر ظلم توڑتا تھا لیکن اس کی وسعت بڑی محدود تھی اور پھر اسی جاہلیت میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ظلم کو ظلم کہتے تھے۔ لیکن آج کے دور میں ظلم کی وسعتوں سے زمین تنگ ہو گئی ہے اور ظلم کو الفاظ کا وہ جامہ پہنا دیا گیا ہے کہ وہ ظلم ہونے کے باوجود عدل دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے اس آیت میں حکم دیا کہ قاتل اور مقتول انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں۔ جو قتل کرے گا وہی قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے گا، چاہے وہ کسی بھی حیثیت کا مالک ہو اور ہر مقتول کے قتل کا بدلہ قاتل سے لیا جائے گا، چاہے وہ مقتول اپنی حیثیت میں کتنا بھی فروتر کیوں نہ ہو۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت، سب برابر پکڑے جائیں گے کوئی ان میں تبدیلی نہیں کر سکتا کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ ہمارا غلام تمہارے آزاد سے بہتر ہے۔ اس لیے ہم اپنے غلام کے بدلے میں آزاد کی جان لیں گے اور اپنی عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کریں گے۔ اس مساواتِ انسانی کا اعلان فرما کر زمانۂ جاہلیت کی تمام بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہود نے بھی اس معاملے میں شریف اور رذیل اور اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان امتیاز قائم کر رکھا تھا، اس اعلان سے وہ بھی ختم ہو گیا۔ اسلام نے خلافتِ راشدہ اور اس کے بعد بھی اسی کامل مساوات کے ساتھ فیصلے کیے۔ لیکن عدل و مساوات کے علمبردار یورپ اور امریکہ کو آج بھی کالوں اور گوروں کے امتیاز پر نظر ڈالنے کی بھی جرأت نہیں ہوئی۔

فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ ''پس جس کسی کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی''۔ اس جملے کے الفاظ پر غور کیجیے! اخ ''بھائی'' کس کو قرار دیا جا رہا ہے؟ ''مقتول کے قاتل'' کو۔ مقتول کے وارثوں سے کہا جا رہا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قاتل نے تمہیں ایسا زخم لگایا ہے جس کی تلافی اور اندمال کی کوئی صورت نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود تمہیں معلوم ہے کہ وہ تمہارا انسانی بھائی ہے اور اگر وہ کسی وقتی اشتعال میں آ کر یا غلط فہمی سے ایسا کر بیٹھا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ دینی بھائی بھی ہو۔ اس طرح بھائی کہہ کر پروردگار سفارش فرما رہے ہیں کہ تم اپنے بھائی کے ساتھ نرمی اختیار کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام قتل جیسے معاملات کو بھی ہیجان کا ذریعہ بننے نہیں دیتا۔ وہ قتل کو بھی قابلِ راضی نامہ سمجھتا ہے۔ وہ اس آگ کو الاؤ بنانے کی بجائے اسے بجھا دینا چاہتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس ذہنیت کو پنپنے کا موقعہ دیا جائے اور لوگوں کی جانیں غیر محفوظ ہو جائیں۔ دونوں پہلوؤں کا توازن کرتے ہوئے اگر مقتول کے وارث انسانی اخوت کے رشتہ کا پاس کرتے ہوئے قاتل کے ساتھ یہ رعائیت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ہم قصاص نہیں دیت لے لیں گے تو پھر قاتل اور اس کے قبیلے کو ہدایت کی جا رہی ہے: فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ''قاتل اور اس کے خاندان والوں کا فرض ہے کہ وہ احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبے کے ساتھ معروف کے مطابق دیت ادا کریں اور دیت کی ادائیگی نہایت احسن طریق سے کریں''۔

معروف کا مفہوم

معروف کا لفظ قرآنِ کریم نے کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد عربوں کا وہ طریقہ ہے جس پر عموماً ان کے معاشرے کا اتفاق ہوتا ہے اور جسے تمام عقلاء عقل کی بات سمجھتے اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جس میں کوئی بات مذہب کے مزاج سے متصادم نہیں ہوتی۔ اسلام نے متعدد مواقع پر اس کو قبول کیا ہے جب تک اللہ کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا تو آنحضرت ﷺ نے معروف پر عمل فرمایا اور جب حکم

Marfat.com

آ گیا تو حکمِ خداوندی کے بعد تو کسی بھی حکم کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی تو معروف کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ قصاص کے معاملے میں بھی عرب کا ایک معروف تھا کہ اگر دیت کی ادائیگی کا فیصلہ ہو جاتا تو ان کے ہاں دیت کی جو مالیت مقرر تھی اور جوان کا معروف کہلاتی تھی ،قرآنِ کریم نے اسی کو باقی رکھا اور اسلام نے اسے قانون کی حیثیت دے دی۔ یہاں اہلِ عرب کا وہی رواج اور دستور مراد ہے۔ ان کے ہاں جو دیت مروج تھی اور جسے اسلام نے قانونی شکل دے دی وہ سو اونٹ یا ہزار دینار یا دس ہزار درہم تھے۔ درہم آج کل کے مروجہ وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دیت دو ہزار نو سو تولے آٹھ ماشے چاندی ہوگی یعنی ۳۶ سیر ۳۶ تولے ۸ ماشے۔ اس دیت کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم پر اگر مقتول کے وارثوں نے احسان کیا ہے تو تمہیں اس کی قدر کرتے ہوئے حسنِ نیت کے ساتھ اس کی ادائیگی کرنی چاہیے کیونکہ اگر نیت اچھی نہ ہو تو دیت میں چونکہ عام طور پر اونٹ، بکریاں، غلہ اور کھجور وغیرہ ادا کی جاتی تھی، تو اس میں بڑی آسانی سے دھوکہ دیا جا سکتا تھا کہ جانور دیئے جائیں تو مریل دیئے جائیں، محض گنتی پوری کر دی جائے اور غلہ یا کھجور ادا کی جائے تو وہ بھی گھٹیا اور ردی قسم کی تو اس طرح سے کہنے کو تو دیت ادا ہو جائے گی لیکن حقیقت میں دیت نہیں ہوگی۔ کہا دیکھو تم ایسا نہ کرنا بلکہ احسان کا جواب احسان سے دینا اور دیت کی ادائیگی میں فیاضی اور کشادہ دلی کا ثبوت دینا۔ مزید فرمایا کہ قصاص میں قتل کی بجائے اللہ نے جو دیت کی اجازت دی ہے یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس لیے اگر ایک طرف تمہیں مقتول کے وارثوں کا شکر گزار ہونا چاہیے تو دوسری طرف اللہ کا بھی شکر بجا لانا چاہیے۔

اعتدٰی کا مفہوم

آخر میں فرمایا: فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ''اس پر بھی جو زیادتی کرے تو اس کے لیے عذابِ الیم ہے''۔ روئے سخن دونوں کی طرف ہے قاتل کی طرف بھی اور مقتول کے وارثوں کی طرف بھی کیونکہ زیادتی کا امکان دونوں طرف سے ہو سکتا ہے۔ بعض دفعہ مقتول کے وارث یہ سازش کرتے ہیں کہ اس وقت تو دیت لے کر اپنی مالی مشکلات کو دور کر لیں اور بظاہر قاتل کو معاف کر دیں لیکن جب کوئی مناسب موقعہ ہاتھ آئے گا تو ہم اس قاتل کو ٹھکانے لگا دیں گے اور یہ محض مفروضہ نہیں مقتول کے وارث اگر ایسا نہ بھی سوچنا چاہیں تو عموماً دائیں بائیں کے لوگ انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسلام نے دیت کو جواز دے کر اگر قاتل پر احسان کیا ہے کہ اس کی جان بچ گئی ہے تو مقتول کے وارثوں پر بھی احسان کیا ہے کہ مرنے والے کے یتیم بچوں کی گزر بسر کا ایک ذریعہ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن لوگ ہمیشہ یہ کہہ کر مقتول کے وارثوں کو اشتعال دلاتے ہیں کہ تم نے اپنے مرحوم کا خون بیچ ڈالا، تم نے اس کی قیمت لے لی یا تم نے ڈر کر یہ سمجھوتہ کر لیا۔ اسی طرح قاتل اور اس کے وارث وہ بھی بعض دفعہ سوچتے ہیں کہ ایک طرف پھانسی کا پھندا ہے اور دوسری طرف دیت کی مالیت ہے۔ اس وقت اگر ہم دیت دے کر جان بخشی کرالیں اور زندگی بچ جائے تو اس وقت ایسا کر لینا چاہیے۔ لیکن جب کبھی موقعہ ہاتھ آئے گا تو ہم ان کو کوئی نہ کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ دونوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ سمجھوتہ اور تصفیہ ہو جانے کے باعث دونوں میں سے جس نے بھی زیادتی ارتکاب کیا تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ دنیا میں تو تم ایک دوسرے سے فریب کر سکتے ہو لیکن اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکو گے۔

Marfat.com

قصاص میں زندگی ہے

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے جس طرح دنیا بدامنی کا جہنم بنی ہوئی تھی، اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ انسانوں میں مساوات ختم ہوگئی تھی اونچ نیچ اور ذات پات کے تصور نے انسانوں کے ایک طبقے کو ظالم اور دوسرے کو مظلوم بنا دیا تھا۔ لوگ قتل ہوتے تھے اور قاتل کو اس کے بدلے میں مارے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا تھا۔ جب ظالم اور قاتل کو ظلم کی چھٹی مل جائے اور یک طرفہ خون بہتا رہے تو پھر خوں ریزی اور فساد سے دنیا محفوظ نہیں ہوسکتی۔ آج بھی دنیا اپنی ساری ترقی اور روشنیِ علم و ہنر کے باوجود بدامنی کا جہنم بنی ہوئی ہے۔ اس کا سبب بھی یہی عدمِ مساوات اور ظالم کو ظلم کی کھلی چھوٹ ملنا ہے۔ اس پر ارشاد فرمایا جارہا ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰأُولِي الْأَلْبَابِ ''اے عقلمندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے'' تم اگر چاہتے ہو کہ دنیا میں امن قائم ہو اور انسانوں کی جان محفوظ ہوجائے تو اس کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں کہ تم قصاص سے کام لو پورے عدل اور انصاف سے مساوات کی روح کے مطابق اگر ہر خون کا بدلہ ملے اور ہر قاتل کیفرِ کردار کو پہنچے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دنیا میں امن قائم نہ ہوسکے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم خالص اور غیر جانبدار عقل سے کام لو۔ تم عقل سے سوچنے کی بجائے جذبات سے سوچتے ہو اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا نے اس کا عجیب فلسفہ تراش لیا ہے کہ جب کوئی آدمی کسی کو قتل کرتا ہے تو اس کا یہ کام اس کی ذہنی ناہمواری، دماغی بیماری اور نفسیاتی عوارض کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ ایک بیمار ہے جس کی وجہ سے اس سے اس طرح کے اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں تو بیمار آدمی تو ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے نہ کہ سزا کا' اس لیے قاتل کو سزا دینا سراسر اس پر ظلم ہے۔ یوں تو یہ فلسفہ بہت قدیم ہے لیکن قریبی دور میں بطورِ خاص اس کی بڑی پزیرائی ہوئی ،گاندھی اور ٹالسٹائی جیسے لوگ اس کے وکیل رہے۔ چنانچہ اسی جذباتیت کا نتیجہ ہے کہ بہت سارے ملکوں نے پھانسی کی سزا ختم کردی حالانکہ معمولی عقل کا آدمی بھی اس کو سمجھتا ہے کہ ہر بیماری رحم و مروت کی مستحق نہیں ہوتی اور نہ ہر زخم مرہم سے مندمل ہوتا ہے۔ اگر کسی آدمی کو سرطان (کینسر) ہوجائے تو آپ اس کے علاج کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جسم میں پھیلنا شروع ہوگیا ہے۔ تو ایسی صورتحال میں کوئی رحیم و کریم ڈاکٹر بھی یہ مشورہ دینے کی جرأت نہیں کرے گا کہ بیمار عضو تو ہمدردی کا مستحق ہے اس کو باقی رہنے دیجیے بلکہ وہ تو پہلی فرصت میں اس جوڑ کو کاٹ دے گا تاکہ جسم کے باقی اعضاء کو بچایا جاسکے۔

مجرمانہ ذہنیت کا علاج عقل اور حکمت سے ہونا چاہیے

چوری، ڈاکہ، زنا اور قتل یہ ایسی بیماریاں ہیں کہ جن کا وجود جسدِ امت کے لیے متعدی مرض کی حیثیت رکھتا ہے اور جن کو چھوڑ دینا باقی جسدِ امت کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو ایک آدمی تو قتل ہوگیا لیکن دوسرا آدمی اس کے قصاص میں قتل نہیں ہونا چاہیے اس طرح سے دو آدمیوں کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر تم عقل سے کام لو اور جذبات سے اپنے آپ کو الگ کرلو تو تب تمہیں اندازہ ہوگا کہ ایک آدمی کا قاتل پوری انسانیت کا قاتل ہے۔ اس آدمی کو بچانے کا مطلب یہ ہے کہ تم پوری انسانیت کو قتل کردینا چاہتے ہو کیونکہ ہلاکت کی طرف جو شگاف اس نے کھولا ہے تم اسے بند نہیں کرنا چاہتے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اے عقلمندو! اگر تم اس بات کو سمجھ جاؤ تو ممکن ہے کہ تم انسانیت کو تباہی سے بچالو اور اگر نہیں سمجھو گے تو اس کا نتیجہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے اور تاریخ بھی اس کے شواہد سے معمور ہے۔ آپ امریکہ ہی کو لے لیجیے! ذہنی بالیدگی، نفسیاتی آسودگی، کے جتنے وسائل وہاں میسر ہیں شائد کہیں اور نہ ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے

Marfat.com

احتسابی ادارے اتنے مضبوط ہیں کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بایں ہمہ جرائم کی رفتار جس قدر وہاں تیز ہے ترقی پذیر ممالک تو اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن کی سالانہ رپورٹیں پڑھ کر دیکھ لیجیے آپ حیران رہ جائیں گے کہ وہاں قتل کی وارداتیں دوسرے جرائم کے ساتھ ساتھ کس کثرت سے ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے عقل کے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے بالمقابل سعودی عرب کو دیکھ لیجیے وہاں چونکہ قانونِ قصاص نافذ ہے، اس لیے وہاں گنتی کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے فرمایا: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ تم مستقبل کے اندیشوں سے اسی صورت بچ سکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قانونِ قصاص کو قبول کر لو۔

مغرب اور امریکہ کو مظلوم سے زیادہ ظالم سے ہمدردی ہے

حیرانی کی بات یہ ہے کہ انسانی اقدار اور اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص یا جو خاندان کسی حادثے یا نقصان سے دوچار ہوتا ہے اس سے ہمدردی کی جائے اور اس کے نقصان کی تلافی کی کوشش کی جائے اور جو شخص اس نقصان کا باعث بنتا ہے اسے مجرم قرار دے کر قرار واقعی سزا دی جائے اور اسے انسانیت کا دشمن سمجھا جائے۔ لیکن یورپ اور امریکہ کے دانشوروں کا عجیب حال ہے اور انہی کے پیروکار مشرقی دانشور بھی انہیں کی جگالی کرنے لگے ہیں۔ آپ ان کے دلائل دیکھئے ان کا رویہ ملاحظہ فرمائیے، آپ کو اندازہ ہوگا کہ انہیں متاثر ہونے والے فریق سے کوئی ہمدردی نہیں بلکہ ان کی ساری ہمدردی اس شخص یا اس گروہ کے ساتھ ہیں جو دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے اور پھر یہ ثابت بھی ہو جاتا ہے کہ انہوں نے نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن یہ دانشور اپنی پوری دانش اور علم کا سرمایہ لے کر اسے بچانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جس کا گھر لٹ رہا ہے اس سے انہیں کوئی ہمدردی نہیں ہے، لیکن چور کے ہاتھ نہیں کٹنے چاہئیں یہ سنگدلی ہے۔ جس کی عزت لٹتی ہے، وہ ان کے نزدیک قابلِ توجہ نہیں، رحم کے قابل وہ ہے جس کو اس جرم کی پاداش میں قانون سزا دینا چاہتا ہے۔ اسی طرح جو شخص خاک و خوں میں غلطاں ہوتا ہے اور اپنے پیچھے بیوہ اور یتیم چھوڑ جاتا ہے، جنہیں سہارا دینے والا کوئی نہیں، کتنی زندگیاں ہیں جو اس حادثے کی وجہ سے اندھیروں میں ڈوب جاتی ہیں۔ لیکن جس شخص کی درندگی اور سنگدلی نے یہ ظلم ڈھایا اور ایک گھر کا چراغ بجھایا ہے جب اس کے گلے تک قانون کا ہاتھ پہنچتا ہے یا یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ شخص قاتل ہے تو فوراً قانون کے محافظ اور قانون کی بالادستی کے علمبردار اس کی مدد کو آپہنچتے ہیں۔ کبھی کسی نفسیاتی عارضہ کا بہانہ اور کبھی انسانیت کے نام سے ایک جان بچانے کی کوشش۔ یہ مغرب اور امریکہ کا وہ رویہ ہے جس نے ان کو مجرموں کا ساتھی بنا دیا ہے اور شائد اسی کے نتائج ہیں کہ ان کا حکمران اور پالیسی ساز طبقہ پوری دنیا کے لیے سب سے زیادہ ظالم ثابت ہو رہا ہے اور وہ اسے ظلم سمجھنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ ان کی انسانیت اس حد تک مر گئی ہے کہ وہ درندگی کو انسانیت کا نام دینے لگے ہیں۔ قرآنِ کریم شائد اسی صورتحال کی طرف لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کہہ کر متوجہ کر رہا ہے۔

حرمتِ جان کے بعد حرمتِ مال

حرمتِ جان کے بعد جس چیز کی حرمت اسلامی معاشرے میں بے حد اہمیت کی حامل ہے اور جس کا حرمتِ جان سے نہایت گہرا رشتہ ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شائد غلط نہ ہو کہ حرمتِ جان کو جب بھی کوئی صدمہ پہنچتا یا نقصان لاحق ہوتا ہے تو بالعموم حرمتِ مال کے تصور کے مجروح ہونے کے بعد پہنچتا ہے۔ جب بھی معاشرے میں مال و دولت سے تعلق حدود سے تجاوز کرتا ہے تو پھر مال و دولت کے حصول میں دست درازیاں ہونے لگتی ہیں حد سے بڑھتی ہوئی طلب کے نتیجے میں جائز ناجائز اور حرام و حلال کی تمیز مٹنے لگتی ہے۔ پھر یہی رشتہ سب رشتوں پر غالب آجاتا ہے، تمام اقدار

Marfat.com

اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں۔ رحم، مروت، ہمدردی، مدد، اعانت، غریب پروری، دوسرے کی ملکیت کا احترام، ان میں سے ایک ایک چیز اپنی قدر کھو دیتی ہے، تمام جذبات پر حبِّ مال کا جذبہ غالب آجاتا ہے۔ رشتے اسی رشتے سے وجود میں آتے اور اسی سے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اس کی موجودگی عزت کی علامت بن جاتی ہے اور اس سے محرومی ذلت کے مترادف سمجھ لی جاتی ہے۔ اس کی اس اہمیت اور خطرناکی کی وجہ سے حرمتِ جان کے قانون کو بیان کرنے کے بعد حرمتِ مال کے قانون کی طرف توجہ فرمائی گئی ہے۔ حرمتِ مال کے تحفظ اور اس کی تقویت کے لیے سب سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ قانون ہر آدمی کے حقوق متعین کرے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کے حقوق متعین اور محفوظ کر دیئے جائیں اور دوسرے لوگوں میں یہ اخلاقی سپرٹ پیدا کی جائے کہ وہ اس قانون کا احترام کریں۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں حرمتِ مال کے ضمن میں ایک عارضی قانون کے ذریعے سے اعزہ اور اقربا کے حقوق کا تعین کر کے ان کی حفاظت کا سامان کیا گیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝

(جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کیا گیا ہے والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرنا یہ حق ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے) (البقرۃ: ۱۸۰)

حرمتِ قانون کا عارضی قانون

یہ آیاتِ کریمہ معلوم ہوتا ہے مدینہ منورہ کے قیام کے ابتدائی سالوں میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب ابھی مدینے میں مخلوط آبادی ہے مسلمان، غیر مسلم اور منافقین ملے جلے رہ رہے ہیں۔ مدینے کے اطراف میں اعراب کا بسیرا ہے اور مضافاتی علاقوں میں یہود رہ رہے ہیں۔ آبادی کے ایک بڑے حصے نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے ابھی تک مدینے کی ریاست کو پوری طرح پاؤں جمانے کا موقعہ نہیں ملا۔ ریاست کی ناتمام شکل کی وجہ سے بعض معاملات میں مکمل ہدایات یا مستقل قانون دینے کا ابھی وقت نہیں آیا لیکن ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے معاملات کو درست کرنے اور ہر سطح پر ان کی تربیت کی انتہائی ضرورت ہے جسے التوا میں نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر قرآنِ کریم نے بعض معاملات میں عارضی قوانین دیئے ہیں، جو مستقل قوانین آنے کے بعد منسوخ ہو گئے، انہیں میں سے وراثت کے قوانین بھی ہیں۔ ابھی تک چونکہ ایک مستقل تفصیلی قانون نازل نہیں ہوا تھا لیکن حرمتِ مال کا تصور برابر اس کا تقاضا کر رہا تھا۔ اس لیے قرآنِ کریم نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہر مرنے والے کو یہ حکم دیا کہ وہ مرنے سے پہلے ایک وصیت کرے جس میں اپنے والدین اور اپنے اقربا کے حقوق کا تعین کرے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ کا معنی ہے "تم پر فرض کر دیا گیا ہے" كُتِبَ کے ساتھ جب علیٰ آتا ہے تو اس کے معنی میں فرضیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس جملے کا ترجمہ ہو گا کہ تم میں سے ہر شخص کے لیے وصیت کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی دو شرائط کا ذکر بھی فرمایا، ایک تو یہ کہ جب تم محسوس کرو کہ موت کا وقت قریب آرہا ہے بیماری بڑھتی جارہی ہے صحت کے امکانات کم ہوتے جارہے ہیں اور کمزوری روز بروز بڑھتی جارہی ہے تو سمجھ لو کہ موت اب زیادہ دور نہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تم اپنے پیچھے کوئی مال چھوڑ کر جارہے ہو۔ اگر مرنے والا گھر میں سوائے غربت کے اور کچھ نہیں چھوڑ رہا تو اس کے لیے وصیت کی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ وصیت کا مقصد

Marfat.com

یہ ہے کہ بعد میں وارث اپنا اپنا حصہ مقرر نہ ہونے کی وجہ سے لڑنا شروع نہ کردیں اور عدمِ تعین کی صورت میں چونکہ اس کا غالب اندیشہ ہوتا ہے اس لیے فرمایا اگر تم اپنے پیچھے کوئی مال چھوڑ رہے ہو تو وصیت ضرور کرو۔ وصیت کا معنی ہوتا ہے "کسی بڑے کی طرف سے چھوٹوں کو تلقین وہدایت کرنا یا حکم دینا"۔ یہ زندگی میں کیا جائے یا موت کے وقت کے قریب دونوں صورتوں میں اس کا مفہوم ایک ہی ہے۔

مال خیر ہے

یہاں دیکھئے مال کو خیر سے تعبیر کیا گیا ہے تا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ اسلام رہبانیت کا دین ہے اور اس میں مال و دولت سے نفرت سکھائی جاتی ہے مال و دولت بجائے خود سرتا پا خیر ہے۔ یہ فی ذاتہٖ کوئی شر نہیں رکھتا البتہ اس کا غلط استعمال اور اسے غلط حیثیت دے دینے سے زندگی میں مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کی بہت اہم ضرورت ہے اور ایک بہت بڑی قوت ہے۔ لیکن جب اس سے تعلق میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے یا اس کا استعمال غلط ہوتا ہے تو پھر اس سے زیادہ تباہ کن چیز بھی کوئی نہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

(زندگی کشتی کی مانند ہے اور مال و دولت دریا کے پانی کی طرح، کشتی کی اصل قوت پانی ہے، اگر پانی نہ ہو تو کشتی بے کار ہے۔ لیکن یہ قوت اس وقت تک ہے جب تک یہ پانی کشتی کے نیچے ہے لیکن اگر خدانخواستہ یہ کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو پھر کشتی کے لیے اس سے زیادہ تباہ کن کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح مال و دولت بھی جب تک ہاتھ کی چھڑی ہے یا جیب کی گھڑی تو کوئی نقصان نہیں دیتی۔ لیکن جب یہ دل کا محبوب بن جائے تو پھر اس سے زیادہ مہلک چیز کوئی نہیں)

وصیت سے متعلق تفصیل

عربوں کا معروف یہ تھا کہ ان کے دو تہائی مال میں اولاد کے حصے مقرر تھے اور ایک تہائی مال میں مرنے والا اپنے والدین اور اقربا کے لیے وصیت کرتا تھا جس میں وہ ان کے حقوق کا تعین کر دیتا تھا۔ چنانچہ اسلام نے مستقل قانونِ میراث دینے سے پہلے اس معروف کو باقی رکھا اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ یہاں اسی کا حکم دیا گیا ہے کہ تم پر یہ بات فرض کر دی گئی ہے کہ اپنی موت کے قریب تم اپنے چھوڑے ہوئے مال میں والدین اور قریبی عزیزوں کے حقوق مقرر کر دو اور ان کے لیے وصیت چھوڑ جاؤ اور اس وقت کے حالات میں اسے حق یعنی واجب قرار دیا گیا۔ لیکن قانونِ میراث کے نازل ہو جانے کے بعد ایک تو یہ بات منسوخ ہو گئی کہ دو تہائی صرف اولاد کے لیے ہوگا اور ایک تہائی میں والدین اور قریبی عزیزوں کے وصیت کے ذریعے حصے مقرر کیے جائیں گے۔ اللہ نے تمام وارثوں کے حقوق متعین فرما دیئے، اب کسی کو اس میں کمی بیشی کرنے کا حق نہ رہا اور دوسرا یہ حکم دیا گیا کہ اب تم اپنے کسی وارث کے لیے وصیت نہیں کر سکتے یعنی اللہ نے جو اس کے لیے حق مقرر کر دیا ہے تم وصیت کے ذریعے نہ اسے کم کر سکتے ہو نہ زیادہ کر سکتے ہو۔ ہاں! ایک صورت ممکن ہے کہ اگر تم اپنے کسی وارث کو زیادہ دینا چاہتے ہو مثلاً تم یہ دیکھتے ہو کہ وہ اپنے بھائیوں میں مالی اعتبار سے سب سے کمزور ہے یا کوئی اور ضرورت اسے لاحق ہے جسے پورا کرنے کے لیے اس کے پاس وسائل نہیں اور تم اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اسے فائدہ پہنچانا چاہتے ہو تو پھر تم اپنے وارثوں کو اپنی بیماری کے دنوں میں جمع کر کے ان سے وصیت کرنے کی اجازت لے لو۔ اگر وہ اس پر راضی ہو جائیں تو اب تم ان سے متعلق وصیت کر سکتے ہو اور اگر وہ راضی نہ ہوں تو پھر تمہیں کسی بھی وارث کے لیے وصیت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ حجۃ الوداع میں ڈیڑھ لاکھ انسانوں کے سامنے آنحضرت ﷺ نے اس کا اعلان فرمایا: لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ "وارث

Marfat.com

کے لیے کوئی وصیت نہیں''۔ یہ حدیث معنوی طور پر متواتر سمجھی جاتی ہے۔ دوسری یہ بات کہ اس میں وصیت کرنا جو فرض قرار دیا گیا تھا احکامِ میراث آجانے کے بعد وہ فرضیت بھی ساقط ہوگئی۔ البتہ اگر کسی آدمی کے پاس لوگوں کی امانتیں ہوں یا کسی کا قرض یا کسی کے حقوق اس کے ذمہ ہوں تو حضور کا ارشاد ہے کہ بغیر وصیت کیئے اس پر تین دن نہیں گزرنے چاہئیں اور تیسری یہ بات کہ ایک تہائی میں اب بھی وصیت کرنے کی اجازت ہے۔ ایسا شخص جو اس کے وارثوں میں شامل نہیں، چاہے وہ رشتہ داروں میں سے ہو اور چاہے بے گانہ۔ ایک تہائی میں اس کے لیے وصیت کرسکتا ہے۔ اسی طرح کسی بھی دینی یا رفاہی ادارے کو اگر وہ کچھ دینا چاہتا ہے تو ایک تہائی مال میں سے اس کے لیے بھی وصیت کرسکتا ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ ایک تہائی مال میں وصیت کرنا اب بھی ضروری ہے تاکہ اگر خاندان میں کچھ ایسے لوگ موجود ہوں مثلاً پوتا یا نواسہ جو انتہائی ضرورتمند ہیں لیکن وراثت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں تو یہ وصیت ان کے لیے حوصلے کا سامان ہوسکتی ہے۔

ان آیات کے نزول کے زمانے میں قانون کے نفاذ کا زیادہ تر دارومدار شاہدوں اور گواہوں کی امانت و دیانت پر تھا اور خود وصیت بھی عموماً زبانی کی جاتی تھی اور جو گواہوں ہی کے واسطے سے وارثوں تک پہنچتی تھی۔ اب اگر یہ گواہ گواہی میں خیانت کرے تو وراثت کے حقوق میں اختلاف پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لیے اگلی آیتِ کریمہ میں گواہوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا:

فَمَنْ ۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

(پس جو لوگ اس وصیت کو بدل ڈالیں اس کے سننے کے بعد تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو اس کو بدلتے ہیں، بے شک اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے) (البقرۃ:۱۸۱)

گواہوں کی عظیم ذمہ داری

اس آیتِ کریمہ میں گواہوں کو ان کے فرض کی اہمیت کا احساس دلایا جارہا ہے کہ وصیت کا ٹھیک ٹھیک نفاذ اس بات کا محتاج ہے کہ وصیت کے محفوظ ہونے کے اعتبار سے کوئی کمی نہ رہنے پائے اور وصیت کی امانت کے حامل چونکہ گواہ ہیں اس لیے اگر وہ چاہتے ہیں کہ وصیت کے نفاذ میں کوئی کمی بیشی نہ ہو تاکہ کسی کے حقوق پر ضرب نہ پڑے تو انہیں حتی المقدور اس کی حفاظت میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر تو وصیت کے سننے میں کوئی کمی رہ گئی اور یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ وصیت کرنے والے نے اصل میں کیا بات کہی تھی اس پر شائد اللہ مواخذہ نہ فرمائیں۔ لیکن اگر وصیت کو ٹھیک ٹھیک سنا اور اس کو محفوظ بھی کرلیا اور پھر اس کے بعد جان بوجھ کر اس میں کوئی تبدیلی کردی تو اللہ فرماتا ہے اس تبدیلی اور اس کے نتائج کی تمام تر ذمہ داری ان گواہوں پر ہوگی اور اللہ کے یہاں گواہی کو تبدیل کرنے کی وجہ سے وہ سب گناہ کے مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔ اس لیے گواہوں کو سخت عذاب سے بچنے کے لیے ایسی غلطی کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھ کر کمی بیشی کرتے ہیں کہ کسی کو کیا خبر کہ اصل وصیت کیا تھی تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ سمیع بھی ہے علیم بھی ہے۔ جب تم نے گواہی سنی تھی تو اللہ نے بھی سنی تھی۔ اس لیے اسے خوب معلوم ہے کہ گواہی حقیقت میں کیا تھی اور تم نے جس فسادِ نیت یا جس برے جذبے سے اس میں تبدیلی کی ہے اللہ اسے بھی جانتا ہے۔ جس طرح تمہیں گواہی میں تبدیلی کرنے پر وہ سزا دے گا اسی طرح اس کے پس پردہ جذباتِ بد پر بھی تمہاری گرفت کرے گا۔ تم بظاہر ایک جرم کروگے لیکن سزا تمہیں دو جرموں کی ملے گی۔

Marfat.com

حق تلفی اور ظلم جس طرح گواہوں کے وصیت بدلنے سے ظہور پذیر ہوتا ہے اسی طرح اس ظلم کو اس وقت بھی راستہ ملتا ہے جب وصیت کرنے والا غلط جذبات اور بری نیت سے وصیت کرتا ہے۔ اور اس میں اپنی خواہشِ نفس کو دخیل کرتا ہے۔ چنانچہ اس جرم کو روکنے کے لیے پروردگار نے اگلی آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا:

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(پس جس شخص کو اندیشہ ہو وصیت کرنے والے سے بے جا جانبداری یا حق تلفی کا تو وہ آپس میں صلح کرادے اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے) (البقرۃ: ۱۸۲)

وصیت کرنے والے کو بھی حق تلفی سے روکا جائے

خـــوف کا معنی جس طرح "ڈرنا" ہوتا ہے اسی طرح اس کا معنی "گمان کرنا، خیال کرنا، توقع کرنا اور اندیشہ کرنا" بھی ہوتا ہے۔ یہاں یہ اندیشہ کرنے کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔ جَـــنَفَ کا معنی تو "مائل ہونا" ہے۔ لیکن یہ عموماً "بے جا جانبداری" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اِثْم "حق تلفی" کو کہتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ سابقہ آیت میں اگرچہ وصیت میں ہر طرح کی تبدیلی سے روکا گیا ہے اور اسے ایسا گناہ قرار دیا گیا ہے جس کا وبال اس جرم کرنے والے پر پڑے گا۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے جس تبدیلی سے روکا ہے وہ وہ تبدیلی نہیں ہے جو وصیت کرنے والے کی بے جا جانبداری کی وجہ سے پیدا ہونے والے ظلم کو روکنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی اجازت دی گئی ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اگر گواہ یہ محسوس کریں کہ وصیت کرنے والا بے جا جانبداری سے کسی حق دار کی حق تلفی کا سبب بن رہا ہے اور اس کی وصیت کے نفاذ سے واقعی کسی کا حق مجروح ہو گا تو انہیں اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اس ظلم کو روکنے کی کوشش کریں۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اولاً تو وہ وصیت کرنے والے کو سمجھا بجھا کر اس ظلم سے رکنے پر آمادہ کریں اور اسے عدل و انصاف کی طرف آنے کی ترغیب دیں۔ لیکن اگر اس کا موقع نہ ہو تو پھر وہ وارثوں کے درمیان مفاہمت کی کوشش کریں کہ اگر وصیت کرنے والے نے کسی کے حق تلفی کی کوشش کی ہے یا کسی کو ناجائز فائدہ پہنچانے کا ارادہ کیا ہے تو تمام وارثوں کو بلا کر انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اس صورتحال کو قبول کرنے سے انکار کر دیں جسے حق سے زیادہ مل رہا ہے اسے سمجھائیں کہ وہ ایسی چیز قبول نہ کرے جو اس کا حق نہیں ہے اور جس کی حق تلفی ہو رہی ہے اسے حق دلانے کی کوشش کریں۔ اسی طرزِ عمل کو فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اگر تم نے حسنِ نیت سے ایسا کیا اور پھر بھی کوئی کمی بیشی رہ گئی تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

سابقہ آیات میں حرمتِ جان اور حرمتِ مال کی اہمیت کے پیشِ نظر اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ان کے اثرات کے باعث ان کے قوانین کو بیان کیا گیا۔ حرمتِ جان اور حرمتِ مال کو متاثر کرنے والی چیزیں چونکہ بنیادی طور پر طمع اور اشتعال، لالچ اور انتقام، خواہش اور ہیجان، جیسے جذبات کا غیر معتدل ہونا ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ایک ایسی عبادت فرض کی جائے جو نماز اور زکوۃ سے زیادہ مندرجہ بالا منفی جذبات کو اعتدال میں لانے اور صحیح رخ پر ڈالنے میں موثر ثابت ہو۔ روزہ جس طرح قلبی اور باطنی طور پر انسان کے ارادہ و نیت کی تطہیر کرتا اور سیرت و کردار کی تعمیر کرتا ہے اس سے زیادہ کسی اور موثر عامل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾
اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ
مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ
الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ
شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى
سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ
بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ
اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ
لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى
نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ
اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ
فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا

Marfat.com

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ
الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ
عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ
بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ
اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

(اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح فرض کیا گیا تھا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے گزرے ہیں تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔ گنتی کے چند دن۔ پس جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرے اور ان لوگوں پر جو اس کی طاقت رکھتے ہیں ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا پھر جو کوئی خوشی سے کرے نیکی تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اگر تم سمجھ رکھتے ہو ○ مہینہ رمضان کا ہے جس میں قرآنِ کریم نازل کیا گیا ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور دلیلیں روشن راہ پانے کی اور حق و باطل سے جدا کرنے کی سو جو شخص پائے تم میں سے اس مہینہ کو اسے چاہیے کہ روزے رکھے اس کے اور جو کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو تو اس کی گنتی پوری کرے اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے وہ تم پر دشواری نہیں چاہتا اور چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کرو اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ اس نے تم کو ہدایت کی اور تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو ○ اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں (تو انہیں بتایئے) کہ میں قریب ہوں میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہیے کہ وہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں ○ حلال کر دیا گیا تمہارے لیے روزہ کی رات میں اپنی عورتوں سے بے حجاب ہونا۔ وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی تم سے۔ پس اب اپنی عورتوں سے مباشرت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اور کھاؤ اور پیو تا آنکہ صاف نظر آئے تم کو صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے پھر رات تک روزہ پورا کرو اور اپنی عورتوں سے مباشرت نہ کرو جب تک تم مسجدوں میں اعتکاف کرو یہ اللہ کی حدود ہیں پس ان کے قریب

Marfat.com

مت جاؤ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں تا کہ وہ بچتے رہیں O اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے اور تم جانتے ہو۔)

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ O اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ

(اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح فرض کیا گیا تھا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے گزرے ہیں تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔ گنتی کے چند دن) (البقرۃ:۱۸۳ تا ۱۸۴)

اس آیتِ کریمہ میں غور کیجیے! تو مختلف حقائق آپ کو اپنی طرف متوجہ کریں گے سب سے پہلی بات یہ کہ احکام کا تعلق چونکہ صاحبِ ایمان لوگوں سے ہے کیونکہ جب تک کوئی آدمی ایمان نہیں لاتا وہ کسی حکم کا مکلّف نہیں ہوتا۔ اس سے اللہ کے یہاں احکام کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ اس سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم ایمان لانے میں کوتاہی کیوں کی؟ روزہ چونکہ عبادت سے متعلق ایک حکم ہے اس لیے صاحبِ ایمان لوگوں سے خطاب فرما کر اس کا حکم دیا گیا اور حکم کے لیے كُتِبَ عَلَيْكُمْ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمْ کا معنی ہوتا ہے ''تم پر فرض کر دیا گیا ہے''۔ اس صورت میں آیت کا ترجمہ یہ ہوگا ''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں''یعنی یہ محض صحت کی درستی یا عادتوں کی اصلاح کے لیے کوئی نسخہ تجویز نہیں کیا گیا کہ جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور جس کا جی چاہے نہ اٹھائے۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک حکم ہے جس کی حیثیت فرض کی ہے۔ البتہ! جس حاکمِ حقیقی نے اسے فرض ٹھہرایا ہے وہی بجا طور پر اس کا حق رکھتا ہے کہ جب چاہے اور جن لوگوں کے لیے چاہے اس کی فرضیت میں نرمی کر دے۔ البتہ! کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنے طور پر کوئی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ فرائض میں سے یہ فرض ایک مشکل فرض ہے۔ سخت موسم میں اپنی ضروریات سے رک جانا اور جوانی میں خواہشات نفس پر پہرہ بٹھا دینا، یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ اس لیے پروردگار نے رحمت کا اظہار فرماتے ہوئے اور مسلمانوں کو حوصلہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: یہ روزے سب سے پہلے تمہیں پر فرض نہیں کیے گئے بلکہ تم سے پہلے جتنے لوگ بھی گزرے ہیں اور جتنی امتیں تاریخ میں گزر چکی ہیں ان میں سے ہر امت پر نماز کی طرح روزے بھی فرض کیے گئے ہیں اور وہ یقیناً وہ اس سے عہدہ برا بھی ہوئے۔ مزید یہ بات کہ ان کی تعداد بھی کوئی غیر معمولی نہیں گنتی کے چند دن ہیں۔ روزے کی اہمیت اور افادیت کو دیکھتے ہوئے ان کی گنتی اور بھی کم معلوم ہوتی ہے اس لحاظ سے تمہیں نہایت شوق سے روزہ رکھنے میں ایک دوسرے سے سبقت کرنی چاہیے۔

روزہ ہر امت پر فرض کیا گیا ہے

قرآن کریم کے اس ارشاد (روزے پہلی امتوں پر بھی فرض کیے گئے) کے حوالے سے جب ہم مذاہب کی تاریخ دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مذہب ایسا نہیں رہا جس میں روزے فرض نہ کیے گئے ہوں۔ ہندوؤں کو بہت قدامت کا دعویٰ ہے۔ ان میں بھی ہر ہندی مہینے کی گیارہ بارہ تاریخ کو برہمن اکاوشی کا روزہ رکھتے تھے۔ اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے۔ بعض برہمن کاتک کے مہینے میں ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے تھے۔ جینی دھرم میں تو بڑی کڑی شرائط کے ساتھ روزہ موجود ہے۔ قدیم مصریوں میں بھی روزہ موجود رہا ہے، جس کا شمار تہواروں میں

Marfat.com

ہوتا تھا۔یونان میں صرف عورتیں تھسوفریا کی تیسری تاریخ کو روزہ رکھتی تھیں۔ پارسی مذہب میں گو عام پیروؤں پر فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے ہاں موجود تھا۔خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لیے تو پنجسالہ روزہ ضروری تھا۔

یہودیوں میں بھی روزہ ایک فریضۂ الٰہی کے طور پر موجود رہا ہے۔اگرچہ اس میں بہت کچھ ترمیم وتحریف کر ڈالی گئی۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر چالیس دن روزہ رکھا۔چنانچہ یہود عام طور پر حضرت موسیٰ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا بہتر سمجھتے تھے،لیکن چالیسویں دن کے روزے کو فرض سمجھتے تھے جو ان کے ساتویں مہینے (تشریں) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لیے اس کو عاشورہ کہا جاتا ہے۔اسی دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کے دس احکام ملے تھے۔اس لیے تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے۔اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور روزوں کی بھی تصریح آئی ہے،جن میں سے کچھ علاقائی اور مقامی کہے جاسکتے ہیں،کچھ انفرادی روزے بھی ہیں۔جنہیں ہر شخص اپنے حالات کے مطابق رکھ سکتا ہے کچھ گناہوں کے کفارہ کے لیے کچھ کسی مصیبت اور افتاد کے وقت رحمتِ خداوندی کے حصول کے لیے رکھے جاتے ہیں۔

عیسائی مذہب میں اگرچہ شرعی احکام ترتیب وتدوین کے مختلف ادوار سے گزرے ہیں اور شریعت کے بارہ ان کا تصور بھی بہت مختلف ہے۔تاہم اتنی بات ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔حضرت یحیٰ جو حضرت حضرت عیسیٰ کے گویا پیشرو تھے وہ بھی روزہ رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی۔مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورہ یعنی دسویں محرم کو روزہ رکھتے تھے کیونکہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا۔حاصل کلام یہ کہ کوئی مذہب بھی روزہ کے تصور سے خالی نہیں رہا۔اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی اصلاح اور تعمیرِ سیرت وکردار میں روزہ اتنا مؤثر اور اللہ کے قرب کے حصول کے لیے اس قدر لازمی ہے کہ اللہ نے ہر امت پر اسے لازم ٹھہرایا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر امت کو روزے کی صورت میں نوازا گیا۔سوال یہ ہے کہ آخر اس کے مقاصد کیا ہیں؟

روزہ کے تین مقاصد

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کہہ کر اور آئندہ آیات میں وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ سے اس کا جواب دیا گیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی فرضیت کے تین مقاصد ہیں:

۱: تقویٰ ۲: اللہ کی کبریائی کا یقین ۳: اللہ کا شکر

اب ہم اسی ترتیب سے نہایت اختصار کے ساتھ انہیں واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

1:۔ تقویٰ

تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے،پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں۔لیکن اصطلاح شریعت میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کردیتی ہے۔دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر ہر کام میں اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے۔قرآن

Marfat.com

پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْب ''اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتا ہے تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہے یعنی یہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو دلوں میں امور خیر کی تحریک پیدا کرتی اور شعائرِ الٰہی کی تعظیم سے ان کو معمور کرتی ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے ایک صحیح حدیث سے تصریحاً ثابت ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس سے یقیناً یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے جو تمام نیکیوں کی محرک ہے۔ اس کی بہترین تفسیر وہ ہے جو حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا تقویٰ کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: امیر المومنین! آپ کو کبھی ایسے راستے سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں اور راستہ تنگ ہو؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: بارہا۔ انہوں نے پوچھا تو ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں؟ حضرت عمر نے جواب دیا۔ میں دامن سمیٹ لیتا ہوں اور بچتا ہوا چلتا ہوں کہ کانٹے دامن میں الجھ کر اسے تار تار نہ کر دیں۔ حضرت ابی نے کہا ''بس اسی کا نام تقویٰ ہے''۔ زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے دونوں طرف افراط و تفریط خواہشات اور میلاناتِ نفس، وساوس اور ترغیبات گمراہیوں اور نافرمانیوں کی خاردار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس راستہ پر کانٹوں سے دامن بچاتے ہوئے چلنا اور اطاعتِ حق کی راہ سے ہٹ کر بداندیشی و بدکرداری کی جھاڑیوں میں نہ الجھنا۔ یہی تقویٰ ہے اور یہی تقویٰ پیدا کرنے کے لیے روزہ فرض کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باقی عبادات بھی تو قرآن کریم کی تصریح کے مطابق تقویٰ پیدا کرنے کے لیے ہی فرض کی گئی ہیں پھر روزہ کی اس حوالے سے کیا خصوصیت ہے؟ اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ پہلی یہ کہ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ انسان زندگی کی جس شاہراہ پر سفر کر رہا ہے وہ قدم قدم پر خواہشات و ترغیبات اور افراط و تفریط کے وساوس کے کانٹوں سے اٹا پڑا ہے۔ اپنے دل و دماغ اور دامن اطاعت کو ان کانٹوں سے بچا کر نکلنا کس قدر مشکل کام ہے اس لیے ضروری ہے کہ دل یعنی ضمیر کی بیداری کے لیے تمام ممکن عوامل سے کام لیا جائے اس لیے تمام عبادات سمیت روزے کو بھی اسی قلبی بیداری یعنی تقویٰ پیدا کرنے کے لیے لگا دیا ہے۔ دوسری بات یہ سامنے رہنی چاہیے کہ اگرچہ دوسری عبادات کا منتہائے مقصود بھی یہی تقویٰ ہے بلکہ پورے دین و شریعت کی روح بھی یہی ہے مگر روزہ اپنی اثر اندازی اور نتیجہ خیزی میں ان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اسی لیے شائد پروردگار نے روزہ کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔ فرمایا: اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ ''اور روزہ خاص میرے لیے ہے'' حالانکہ نماز زکوٰۃ حج قربانی بلکہ ہر نیکی جس کا پروردگار نے حکم دیا ہے سب اسی کے لیے ہے۔ اسی کی اطاعت میں اور اسی کی رضا و خوشنودی کے لیے اسے روبعمل لایا جاتا ہے۔ لیکن کسی نیکی کی نسبت پروردگار نے اس طرح اپنی طرف نہیں فرمائی۔ وجہ ظاہر ہے کہ باقی تمام عبادات اور تمام نیک اعمال یقیناً تقویٰ ہی پیدا کرتے ہیں مگر روزہ اس معاملے میں ان سے بدرجہا فائق ہے کیونکہ تمام عبادات اپنے اندر ایک اجتماعی صورت رکھتی ہیں۔ نماز جماعت کی پابندی کا تقاضا کرتی ہے اموالِ ظاہرہ میں زکوٰۃ کی مسنون صورت بیت المال کی پابندی کے ساتھ اجتماعی ہے اور اموال باطنہ میں بھی زکوٰۃ وصول کرنے والا تو بہر حال جانتا ہے حج تو ایک شہرت عام اور ابتلائے عام والی عبادت ہے اس لیے ان تمام عبادات میں بندے کی اپنے رب سے خصوصی تعلق کی حالت میں شکست و ریخت کے پیدا ہو جانے کا ہر وقت اندیشہ ہے اور اس بات کا ہر وقت امکان ہے کہ دکھاوے اور ریاکاری کے چھینٹے صفائے قلب کو گدلا کر دیں۔ ایک عابد و زاہد اپنی قلبی حالت پر مطمئن ہوتا ہے مگر اچانک خبر ہوتی ہے کہ اندر ہی اندر نیکی کی شہرت کی حرص اور حصول منفعت کی ہوس اپنا کام دکھا چکی ہے۔ کیونکہ

Marfat.com

براہیمی نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

مگر روزہ اس لحاظ سے ایک منفرد عبادت ہے اس میں دکھاوے ریاکاری اور ظاہر داری کا امکان بہت کم ہے۔ ایک آدمی کے روزے دار ہونے یا نہ ہونے کی بظاہر کوئی علامت نہیں ہوتی اس کے ایسے کوئی ظاہری اعمال نہیں جس سے دیکھنے والے کو ایک روزے دار کے روزے کا احساس ہو یہ خالصۃً بندے اور اس کے رب کا معاملہ ہے۔ روزہ دار اپنے مالک کی رضا کے لیے بھوکا پیاسا رہتا ہے اور دل ہی دل میں اس سے لو لگائے کاروبارِ زندگی میں مصروف رہتا ہے اور صرف اس کا مالک اس کے دل کی کیفیت سے واقف اور اس کے روزے سے آگاہ ہے۔ اس لیے جس قدر صفائے دل، بیداریِ قلب اور تعلق باللہ کے امکانات یہاں ہیں وہ دوسری عبادات میں نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے روزے کی نسبت پروردگار نے بطورِ خاص اپنی طرف فرمائی اور خصوصی اجر وثواب کی امید بھی دلائی۔ فرمایا: اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ ''روزہ میرے لیے ہے اور میں خود اس کا بدلہ دوں گا'' حالانکہ ہر نیکی کا بدلہ اللہ تعالیٰ خود ہی دیتے ہیں لیکن یہاں بطورِ خاص اپنی طرف نسبت فرما کر اجر وثواب میں افزونی اور اظہارِ خوشنودی کا سامان بھی کر دیا۔

اس حدیث کو اگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو روزے کی اہمیت اور عظمت اور اس کی صفتِ تقویٰ میں ہزار در ہزار چند اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ متذکرہ حدیث کو اس طرح پڑھا جائے (اور الفاظ میں اس کی گنجائش بھی ہے) اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ ''روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود اس کی جزا ہوں'' یعنی ایک روزہ دار روزہ اجر وثواب کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے لیے رکھتا ہے یعنی اس کا مطلوب ومقصود اس کا رب ہے جب کہ باقی تمام اعمال اجر وثواب کی امید میں کیے جاتے ہیں اور حصولِ جنت کو منتہائے مقصود سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ صحیح بھی ہے کیونکہ خود پروردگار کا ارشاد ہے: وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ''اور تیزی سے بڑھو اپنے رب کی مغفرت اور بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمان اور زمین ہیں'' اور یہ بھی صحیح ہے کہ جنت اسی کو ملے گی جس سے اللہ راضی ہو گا۔ لیکن یہاں سوال ہدف کی بلندی اور منتہائے مقصود کے ارفع واعلیٰ ہونے کا ہے۔ روزہ اپنے رکھنے والے کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ تمہارا دل اپنے آقا و مالک کی محبت سے اس طرح لبریز ہو جانا چاہیے کہ کسی اور کے لیے اس میں گنجائش نہ رہے۔ حتیٰ کہ جنت کے لیے بھی نہیں۔ یا یہ کہ تمہارا دل اپنے رب کے لیے ہر چیز بلکہ ہر تمنا سے بھی خالی ہو جائے اور اس کا دروازہ ہر خواہش کے لیے بند ہو جائے اور پھر تم کہہ سکو ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ایسی صورت میں خود میں اس کی جزا ہوں یعنی جو میری طلب میں دو عالم سے بے گانہ ہو کر میرے آستانے پر آ پڑا ہے میں اسے اپنا لیتا ہوں اور اسے اس حد تک نوازتا ہوں کہ اس کی محبت کا صلہ محبت سے دیتا ہوں: وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ''جو صرف مجھ ہی سے محبت کرتا ہے تو میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔'' اس کے بعد اور کیا رہ جاتا ہے، جس کی ایک آدمی تمنا کرے؟ ؎

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

Marfat.com

روزے کا ایک اور پہلو بھی نہایت توجہ کے قابل ہے وہ یہ کہ روزے سے اگرچہ مقصود جیسا کہ عرض کیا گیا قلب اور ضمیر کے احساسات کو ایسی زندگی دینا ہے جس سے نہ صرف وہ خیر وشر میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائے بلکہ خیر اس کی چاہت بن جائے اور شر سے اسے شدید نفرت پیدا ہو جائے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پروردگارِ عالم نے روزے کے جو اعمال مخصوص فرمائے ہیں اور جو اس کو ہیئت عطا کی ہے اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آدمی روزے کے لیے تمام اعمال احساسِ ذمہ داری اور کامل شعور کے ساتھ ادا کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ روزہ حقیقی تبدیلی کا ضامن نہ بنے۔

غور کیجیے! اللہ تعالیٰ نے چند دنوں کے نہیں بلکہ پورے ایک مہینے کے روزے فرض فرمائے اور ان روزوں کے ذریعے اپنے بندے سے مسلسل 720 گھنٹے تک ایک ایکسرسائز اور قوائد کرائی تاکہ اس طریقے سے اللہ کی بندگی کا اور اس کی اطاعت کا تصور پوری طرح اس کے دل ودماغ میں راسخ ہو جائے۔ اندازہ فرمایئے! وہ اشیائے خورد ونوش اور میاں بیوی کا جائز تعلق جو سال کے گیارہ مہینوں میں ہر طرح اس کے حلال اور مباح ہے۔ رمضان المبارک کے مہینے میں آکر اس کے لیے حرام ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی فجر طلوع ہوتی ہے اس وقت سے لے کر غروب آفتاب تک اس کے سامنے نعمتوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں، مگر کبھی اس کا ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتا، پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ جاتے ہیں مگر وہ پانی کا ایک گھونٹ گلے سے نیچے نہیں اتارتا اور پھر کوئی اسے دیکھنے والا نہیں ہوتا وہ تنہائی میں ممنوعہ چیزوں میں سے جس چیز سے چاہے تمتع کر سکتا ہے۔ کوئی نگاہ اسے دیکھنے والی نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود وہ کوئی ایسا کام کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا جس سے اس کا روزہ ٹوٹ سکتا ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اگر ایک آدمی نے محض عادت کے تحت بلا سوچے سمجھے روزہ نہیں رکھا ہے اور وہ اس طرح پورا ایک مہینہ اس اطاعت کی مشق جاری رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کے دل ودماغ بلکہ اس کے ہر رگ وریشہ میں اللہ کی اطاعت سمانہ جائے۔ وہ باقی گیارہ مہینوں میں بھی جب کسی غلط کام کی طرف ہاتھ بڑھائے گا یا قدم اٹھائے گا یا دل میں خیال بھی لائے گا تو اللہ کی اطاعت کا یہ تصور اور خدا کی برتری اور کبریائی کا یہ عقیدہ اسے بار بار روکے گا کہ دیکھو تم غلط کام کر رہے ہو اور پھر صرف یہی نہیں کہ ایک روزہ دار کو کھانے پینے اور مباشرت سے روکا گیا ہے اور اسی کی پورا مہینہ مشق کرائی ہے بلکہ قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ نے بھی واضح طور پر پوری زندگی کو اللہ کی معصیت سے پاک کر دینا روزے کا مقصد ٹھہرایا ہے اور جو آدمی صرف کھانے پینے اور مباشرت سے پرہیز کرتا ہے لیکن باقی زندگی کے معاملات میں خلاف شریعت امور سے اجتناب نہیں کرتا تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس نے ناحق بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کی اللہ کو ایسے روزے دار کے روزے کی ضرورت نہیں۔ فرمایا:

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ

(جس آدمی نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اللہ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے)

یہاں جھوٹ پر عمل کرنا قابلِ توجہ ہے۔ اس سے مراد زندگی کے کسی مرحلے میں بھی خلافِ شریعت امور پر عمل کرنا ہے۔ چاہے وہ مرحلہ ملازمت سے تعلق رکھتا ہو یا تجارت سے، وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اس کا تعلق سیاست سے ہو یا عدالت سے محکومیت سے ہو یا حاکمیت سے، جہاں بھی وہ خلافِ شریعت امور کو اختیار کرے گا، اس نے گویا جھوٹی زندگی کو اختیار کر لیا، اس سے اجتناب کرنا روزے کا اصل مقصد ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مزید فرمایا:

Marfat.com

كَمْ مِنْ صَائِمٍ فَلَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الظَّمَاْمُ وَ كَمْ مِنْ قَائِمٍ فَلَيْسَ لَهٗ مِنْ قِيَامِهٖ اِلَّا السَّهَرُ

(کتنے ایسے روزے دار ہیں جن کو روزے سے سوائے بھوک پیاس کے اور کچھ نہیں ملتا اور کتنے ایسے شب زندہ دار ہیں جن کو رتجگے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا)

2:۔ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا یقین

اس طرح ایک روزہ دار جب اپنی پوری زندگی کو اللہ کی اطاعت وحاکمیت میں دے دیتا ہے کہ طلوعِ سحر سے غروبِ آفتاب تک باوجودیکہ اس کے سامنے متنوع اور مرغن نعمتیں موجود ہیں لیکن صرف اس لیے اس کا ہاتھ ان کی طرف نہیں بڑھتا کہ اس کے مالک نے اسے ان نعمتوں کی طرف ہاتھ بڑھانے سے روک دیا ہے۔ اس کی نوجوان اور خوبصورت بیوی اس کے پاس موجود ہے لیکن وہ اسے چھونا تو درکنار اپنے دل ودماغ کو بھی جنسی جذبات سے صرف اس لیے محفوظ رکھتا ہے کہ اس کا آقا اس کے سینے کے جذبات سے واقف ہے اور آج اس نے ان جائز جذبات پر بھی قدغن عائد کردی ہے۔ اس کی زبان ہر قسم کی بدگوئی دل آزاری اور غیبت سے مجتنب ہے کیونکہ روزے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور پھر جیسے ہی غروبِ آفتاب کا اعلان ہوتا ہے تو یہ بند قفل کھل جاتا ہے اب یہ روزہ دار نیکی کے جذبے سے بھی اگر چاہے تو کھانے پینے سے نہیں رکتا کیونکہ اب اس کے مالک نے افطار کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ گویا یہ ایک کٹ پتلی یا مشین ہے جسے حرکت دینے والی تار اس کے اللہ کے ہاتھ میں ہے یہ اس کے ہلانے سے حرکت میں آتا ہے اور روکنے سے رک جاتا ہے۔ اس طرح مسلسل 720 گھنٹے ایک روزہ دار اپنی عبدیت وعبادت اور اللہ کی حاکمیت واطاعت کی مشق کرتا ہے تاکہ وہ اس احساسِ بندگی سے سرشار ہو کر اپنے ارادہ واختیار کو لگام دینے اور زندگی کے ہر معاملے کو اللہ کے سپرد کرنے اور اسی کی اطاعت میں بسر کرنے کے قابل ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ عبادت واطاعت کی اس مشق کے بعد (جو مکمل ایک ماہ جاری رہتی ہے) جب وہ چاند دیکھتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان پر ایک ترانہ جاری ہوجاتا ہے اور جب صبح کو وہ نمازِ عید کے لیے عیدگاہ کی طرف بڑھتا ہے تب بھی یہی ترانہ اس کے لبوں پر ہوتا ہے پھر جب اپنے گھر کو لوٹتا ہے تو راستہ بدل کر یہی نغمہ الاپتا ہوا جاتا ہے، گلی کوچے اس نغمے سے گونج اٹھتے ہیں اور سینے حوصلوں اور ولولوں سے معمور ہوجاتے ہیں۔ وہ نغمہ اور ترانہ کیا ہے؟ وہ ہے:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْد

(اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود برحق اور حاکم حقیقی نہیں اللہ سب سے بڑا ہے اور ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کو زیب دیتی ہے)

یہ ہے مفہوم وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰـهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ کا یعنی ہم نے روزہ اس لیے فرض کیا تاکہ تم اللہ کو ہی بڑا سمجھو اور اسی کی بڑائی کرو جس طرح اس نے (اپنی کتاب کے ذریعہ) تمہیں رہنمائی فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت، بندگی، عظمت اور کبریائی کے استحضار سے ایک روزہ دار کے اندر بالآخر ایک صلاحیت پیدا ہونے کی امید کی جاسکتی ہے جس کے بارہ میں یہاں ارشاد فرمایا گیا ہے: لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ''شاید تم شکر گزار بن جاؤ'' یعنی امید کی جاسکتی ہے کہ اس مسلسل محنت اور مداومت سے تمہارے اندر شکر کی صفت پیدا ہوجائے۔

Marfat.com

3:۔ شکر

شُکر وہ بلندترین صفت ہے، جس کا پیدا کیا جانا اسلامی عبادات کے مقاصد میں ایک بلندتر مقصد ہے۔اسی کی ضد کفر ہے جو ایک انسان کے لیے قبیح ترین اور عنداللہ مبغوض و مردود صفت ہے۔یہ دونوں صفات دراصل انسان کے دو بنیادی رویے ہیں۔جو اس کی فطرت کا تقاضہ بھی ہیں اور اس کی طبیعت کا خاصہ بھی۔اسی لیے ارشاد فرمایا گیا: اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ''ہم نے انسان کو راستہ بتادیا (اب وہ) شکرگزار ہے یا ناشکرگزار (کافر) شکرگزاری کا رویہ ایک مومن کی حقیقی منزل ہے''۔

شُکر کا معنی لغت میں یہ ہے کہ ''جانور میں تھوڑا سا چارہ ملنے پر تروتازگی پوری ہو اور دودھ زیادہ دے''۔اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ ''کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کردے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے''۔اس مفہوم پر غور کرنے سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

1:۔ شکر ایک ایسا رویہ ہے جس میں ضروریاتِ زندگی کی تقلیل اور مقاصد کی تکمیل پیشِ نظر ہوتی ہے امیدیں قلیل ہوتی ہیں اور مقاصد جلیل ہوتے ہیں۔آدمی خواہشات کا پتلا نہیں بلکہ اولوالعزمیوں کا پیکر ہوتا ہے۔صحابہ کرام جس کی عملی تصویر تھے۔بقول اقبال۔

ان کی امیدیں قلیل ان کے مقاصد جلیل
ان کی ادا دلفریب ان کی نِگہ دلنواز

اسے نا آسودہ آرزوئیں پریشان نہیں کرتیں بلکہ حرص و طمع سے دور وہ ایک سمٹ کر رہنے والا انسان ہوتا ہے۔اسے اپنے دل کی خواہشات اور اپنے دماغ کی اڑان گھاٹیوں پر اس طرح قابو ہوتا ہے کہ یہ عوامل اس سے غلط کام کروانے پر قادر نہیں ہوتے۔وہ اپنے نفسانی تقاضوں اور جسمانی قوتوں پر اس طرح حاوی ہوتا ہے کہ ان سے اپنے مطلوبہ مقاصد میں حسبِ ارادہ کام لینے کی قدرت رکھتا ہے،جسم اس سے اپنی ضروریات کے لیے درخواست کرتا ہے،حکم نہیں دے سکتا۔یہ شخص اپنی مرضی سے جس درخواست کو چاہتا ہے قبول کرلیتا ہے جسے چاہتا ہے رد کردیتا ہے۔عام مروج اسلوب میں کہہ لیجیے کہ اسے ضبطِ نفس حاصل ہوتا ہے۔لیکن یہ ضبطِ نفس ایسا نہیں جو اسے فرعون یا ہٹلر بنادے کیونکہ شکر کے تصور میں ایک دوسری حقیقت بھی شامل ہے وہ یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے منعم حقیقی اور اپنے محسن اصلی کو پہچانتا ہے۔وہ اس کے احسانات کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ ہے، وہ اپنی جان لڑا کر اور اپنی توانائیاں کھپا کر ان احسانات و انعامات کا حق ادا کرنا چاہتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا انعام و احسان بھی اپنی قدر و منزلت میں بے مثال و بے پناہ ہے اور وہ خود اپنی ساری توانائیوں اور وجاہتوں سمیت ایک ذرۂ بے مقدار ہے، وہ ضبطِ نفس کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی ضروریات کو کفائت و تقلیل کی زنجیر پہناتا اور اپنی خواہشات کو حدوداللہ میں محدود کردیتا ہے لیکن ساتھ ہی اپنے منعم کو پہچانتے ہوئے اپنی تمام صلاحیتوں کو احسان شناسی اور قدرشناسی میں صرف کردیتا ہے،اس طرح وہ ایک عابد و شاکر بندہ بننے کی کوشش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین عظیم نعمتوں سے نوازا ہے۔ ۱۔ دل، ۲۔ زبان، ۳۔ اعضاء و جوارح۔وہ ان تینوں کو اس کی قدرشناسی یعنی شکرگزاری میں استعمال کرتا ہے۔دل میں اسی کی قدرشناسی کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔زبان اسی کے احسانات کے اقرار

Marfat.com

واعتراف اوراسی منعم کی حمد وثناء میں زمزمہ سنج رہتی ہےاوراعضاء وجوارح اسی کے نام کی سربلندی، اسی کے پیغام کی نشرواشاعت، اور اسی کے بندوں کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ روزے کی مسلسل مشق اس کے اندراسی شکر کے جذبے کوابھارتی ہے۔اس کے اندر ایک طرف ضبطِ نفس کو پیدا کر کے جسمانی تقاضوں اور نفسانی خواہشات کو کمزور کرتی ہے۔ دوسری طرف منعم حقیقی سے گہرا تعلق اور وارفتگی پیدا کر کے مقاصد حیات کو سہل کر دیتی ہے۔ ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ روزہ نے طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک صرف کھانے پینے اور مباشرت سے روکا ہے حالانکہ ضروریات یہیں تک تو محدود نہیں اور اتنی سی پابندی سے ضبطِ نفس کہاں پیدا ہوسکتا ہے۔لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جسم کے بنیادی تقاضے تین ہی ہیں۔

1:۔ غذا جو زندہ رہنے اور بقائے جسم کے لیے ضروری ہے۔

2:۔ جنسی طلب جو بقائے نوع کے لیے ضروری ہے۔

3:۔ آرام جو قوت کارکردگی کی بحالی کے لیے ضروری ہے۔

روزے نے انہیں تینوں کو کمزور بلکہ حدود میں محدود کرنے کا کمال کیا ہے۔ وہ دن کو کھانے پینے اور مباشرت پر پابندی لگا کر ان پر قابو پانا سکھاتا ہے اور رات کو قیامِ لیل کا حکم دے کر آرام وراحت کی طلب کو محدود کرتا ہے کیونکہ درحقیقت یہی تینوں بنیادی مطالبے ہیں جو بڑھ کر اور اپنی حدود سے نکل کر خواہشات ومرغوبات کا ایک جہان پیدا کر دیتے ہیں۔ زمام اقتدار پھر انسان کے اپنے ہاتھ میں نہیں رہتی بلکہ جسم اور اس کے بہیمانہ تقاضوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور انسان بالکل بے قابو ہو کر خواہش نفس اور لذت پسندی کے دھارے میں بہتا چلا جاتا ہے۔ وہ آوارہ مویشیوں کی طرح ہر جگہ منہ مارتا ہے اس کو کھانے پینے اور خواہشات نفس پوری کرنے کا جنون ہو جاتا ہے وہ اس لیے کھاتا پیتا نہیں تاکہ زندہ رہے وہ زندہ اس لیے ہے تاکہ کھاتا پیتا رہے۔ بقول شیخ سعدی:

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است

تو معتقد کہ زیستن از بہرِ خوردن است

وہ اپنی ذہانت وفطانت بھی اسی خدمت میں لگا دیتا ہے تاکہ آئے روز اشیائے خورد ونوش میں نئی سے نئی اختراع کی جاسکے۔ اس کی تمام تر صلاحیت کھانوں کو زیادہ لذیذ پرتکلف اور متنوع بنانے میں صرف ہونے لگتی ہے۔ وہ ہاضم دواؤں اور بھوک کھولنے والے مشروبات ایجاد کرتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ کھانے اور جلد سے جلد ہضم کرنے کا موقع مل سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ساری ترقی وتوانائی کے باوجود اور مادی خوشحالی کی اس بلندترین سطح پر ہوتے ہوئے بھی کوہلو کے بیل اور زمین جوتنے والے جانور کی طرح ہو جاتا ہے اور اس کا دائرہ عمل صرف دو چیزوں کے درمیان محدود ہو کر رہ جاتا ہے یعنی کھانے کے کمرے (ڈائننگ ہال) اور بیت الخلاء۔ وہ ان دونوں کے سوا کسی اور مبداء ومعاد سے ناواقف اور اس طواف کے سوا کسی اور طواف وسعی سے ناآشنا رہتا ہے کھانے پینے کی خواہش کے سوا اس میں ہر چیز کی خواہش مر جاتی ہے اس کی تمام سوچیں صرف اسی ایک فکر میں ڈھل جاتی ہیں۔ قرآنِ مجید نے انسانوں کے اس طبقہ یا انسان نما جانوروں کے اس ریوڑ کی جو معجزانہ تصویر کھینچی ہے اس سے زیادہ سچی اور نادر تصویر ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ کہتا ہے:

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ

(ترجمہ: کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں اور کھا پی رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے پیتے ہیں آگ ہی ان کا ٹھکانہ ہے)

یہ صورتحال یقیناً کافر کو ہی زیب دیتی ہے جو صرف دنیا اور دنیوی عیش وعشرت کے سوا کسی بلند تر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔ مگر وہ قوم جو دنیا کو ایک دار العمل اور یہاں کی زندگی کو ایک مہلت عمل سمجھتی ہو جو صرف ضروریات کے لیے نہیں بلکہ ارفع و اعلیٰ مقاصدِ حیات کے لیے زندہ ہو جس کی تگ و تاز کے لیے دنیا ایک تنگنائے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی ہو جو آخرت کے لیے اور اسی کے تصور میں جیتی اور مرتی ہو اور جو صرف اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے اٹھائی گئی ہو اور جس کی پوری تاریخ اولوالعزمیوں، جفا کوشیوں، وفا شعاریوں اور جاں سپاریوں سے عبارت ہو، وہ یقیناً ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس لیے روزہ کے ذریعے ایسی چیزوں پر پابندی لگا کر جو انجام کار دل کی موت اور شکم و معدہ کی لامحدود سلطنت پر منتج ہوتی ہیں ایک ایسی زندگی کی تعمیر کا سامان کیا جو عبادت و عبدیت کے تصور سے بہرہ ور اللہ کی کبریائی کی حقیقت سے آشنا اور ادائے شکر پر مستعد ہو یعنی جس قوم کا ہر فرد عبادت کے واسطے سے اپنی عبدیت سے آگاہ ہو۔ ''وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ'' کی حقیقت سے واقف ہو اور ''لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'' پر عمل کے نتیجے میں ضبط نفس کی صلاحیت پیدا کر کے اللہ ہی کی اطاعت و بندگی کا خوگر ہو۔

مقاصد کے ذکر کے بعد فرمایا: اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ''گنتی کے چند دن''۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد کیا ہے؟

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے کیا مراد ہے؟ بعض اہلِ علم نے تین دن کے روزے مراد لیے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے ہر ماہ اللہ نے تین روزے فرض کیے تھے جو رمضان کے روزے فرض ہونے کے بعد منسوخ ہو گئے۔ لیکن دیگر اہلِ علم یہ کہتے ہیں کہ رمضان کے علاوہ اس امت پر اور کسی قسم کے روزے فرض نہیں کیے گئے۔ ہر ماہ میں آنحضرت ﷺ جو تین روزے رکھتے تھے ان کی حیثیت فرض روزوں کی نہیں بلکہ نفلی روزوں کی تھی۔ ہم اس سلسلے میں خود کچھ کہنے کی بجائے امام ابن جریر رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''ہمارے نزدیک حق سے قریب تر بات ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد ماہِ رمضان کے ہی ایام ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قابلِ اعتماد روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مسلمانوں پر رمضان کے روزوں کے سوا کوئی اور روزہ فرض کیا گیا ہو جو رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوا۔ آیت کا سیاق خود اس بات پر دلیل ہے کہ جو روزے ہم پر فرض ٹھہرائے گئے وہ رمضان ہی کے روزے ہیں کوئی اور روزے نہیں۔ ''شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ'' کے الفاظ خود ان ایام کی بلا کسی اشتباہ کے تعیین کیے دیتے ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ رمضان کے سوا کوئی اور روزے مسلمانوں پر فرض تھے جو رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوئے ان سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی روایت پیش کریں جو حجت بن سکے۔''

Marfat.com

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

(پس جوکوئی تم میں سے مریض ہو یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرے اور ان لوگوں پر جو اس کی طاقت رکھتے ہیں ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا پھر جوکوئی خوشی سے کرے نیکی تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اگر تم سمجھ رکھتے ہو) (البقرۃ:۱۸۴)

مریض اور مسافر کا مفہوم شرعی نقطہ نظر سے

اب کچھ روزے کے مسائل بیان کیے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلے یہ بات ارشاد فرمائی کہ تم میں سے جو شخص مریض ہو یا مسافر ہو تو اسے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے البتہ بعد میں اسے روزہ رکھنا ہوگا۔ اس میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ مریض اور مسافر کا اطلاق کس پر ہوتا ہے۔ مریض ایسے شخص کو بھی کہتے ہیں جو کسی شدید بیماری میں مبتلا ہو اور ایسا شخص بھی بیمار کہلاتا ہے جو معمولی بیماری کا شکار ہو۔ لیکن یہاں ہر طرح کا بیمار مراد نہیں بلکہ اس سے مراد ایسا شخص ہے کہ جس کے روزہ رکھنے کی وجہ سے مرض بڑھ جانے کا اندیشہ ہو یا روزہ نبھانا اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو۔ اب رہی یہ بات کہ اس بات کا کیسے فیصلہ ہو کہ روزہ رکھنے سے بیماری میں اضافہ ہو جائے گا؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی شریعت کے پابند معالج سے رائے لی جائے۔ وہ اگر یہ سمجھتا ہو کہ روزہ اس شخص کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث ہوگا یا اس کی بیماری بڑھ جائے گی تو پھر روزہ چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ آگے چل کر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے آسانی فرمانا چاہتا ہے تمہیں تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ معمولی زکام ہو یا طبیعت بوجھل ہو تو روزہ چھوڑ دیا جائے۔

مسافر کا اطلاق بھی معمولی سفر کرنے والے پر نہیں ہوتا عَلٰی سَفَرٍ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ سفر پر سوار ہو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ محض چند میل کی سیر نہ ہو بلکہ اس کے لیے اہتمام بھی ناگزیر ہو۔ اب رہی یہ بات کہ ایسے سفر کو کتنا طویل ہونا چاہیے، قرآنِ کریم نے اس کی تحدید نہیں فرمائی۔ رسول اکرم ﷺ کے بیان اور صحابہ کے تعامل سے امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بہت سے فقہا نے اس کی مقدار تین منزل مقرر کی ہے یعنی وہ مسافت جس کو پیادہ سفر کرنے والا آسانی سے تین روز میں طے کر لے، بعد کے فقہا نے میلوں کے حساب سے اندازہ لگا کر اڑتالیس (48) میل مقرر کیے ہیں۔

سفر کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مسافر اس وقت تک حالتِ سفر میں ہے جب تک وہ پندرہ دن کے لیے کہیں قیام نہیں کرتا اور اگر وہ دو دو، چار چار دن مختلف جگہ ٹھہرتا رہا اور سفر بھی جاری رہا تو اس طرح چاہے کتنی مدت گزر جائے اسے مسافر ہی سمجھا جائے گا اور وہ سفر ہی کے احکام کا پابند ہوگا۔

مسافر سفر سے لوٹ آئے یا کہیں مقیم ہو جائے اور مریض تندرست ہو جائے تو جتنے روزے چھوڑے گئے ہیں ان تمام کی قضا کرنا لازم ہے۔ لیکن اللہ نے یہ کرم فرمایا ہے کہ یہ قضا اس شخص کے لیے ہے جسے اتنے دنوں کے لیے زندگی موقع دے۔ اگر وہ اس

Marfat.com

مہلت سے پہلے ہی زندگی کا سفر پورا کر گیا تو نہ اس پر قضا لازم ہوگی اور نہ فدیے کی وصیت کرنا ضروری ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ رمضان کے فوری بعد قضا روزے رکھے جائیں۔ کسی وقت بھی یہ روزے رکھے جا سکتے ہیں۔ البتہ غیر معمولی تاخیر کرنا اس لیے مناسب نہیں کہ زندگی کا کیا بھروسا ہے کب بلاوا آئے۔

یُطِیْقُوْنَہٗ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟

وَ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ ''ان لوگوں پر جو اس کی طاقت رکھتے ہیں ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے'' سوال یہ ہے کہ یُطِیْقُوْنَہٗ میں ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس مرجع میں اختلاف کی وجہ سے آیت کے مفہوم میں اختلاف ہوا۔ ہمارے قدیم مفسرین نے اس ضمیر کا مرجع صیام کو ٹھہرایا ہے اور بعض دوسرے اہلِ علم نے اس کا مرجع صیام کو نہیں بلکہ طعام کو قرار دیا ہے۔ قدیم مفسرین میں مرجع میں اتفاق کے باوجود اس کی وضاحت اور انطباق میں اختلاف ہے۔ زیادہ تر اہلِ علم یہ کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت تو رکھتے ہیں لیکن کسی وجہ سے رکھنا نہیں چاہتے، دل نہیں چاہتا یا کوئی اور سبب ہے تو ان کیلے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ ایک مسکین کو کھانے کا فدیہ دے دیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مسلمان چونکہ اس طرح کے احکام کے خوگر نہیں تھے۔ اس لیے شروع شروع میں انہیں یہ سہولت دی گئی تھی لیکن اگلی آیت میں جو کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی اسے منسوخ کر دیا گیا اور وہ اس کی دلیل میں صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ سے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہمیں اختیار دے دیا گیا کہ جس کا جی چاہے روزے رکھے اور جس کا جی نہ چاہے نہ رکھے البتہ ہر روزے کا فدیہ ادا کرے لیکن دوسری آیت کے نازل ہونے کے بعد یہ اختیار ختم ہو گیا۔

ایک اور حدیث بھی استدلال میں پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبل کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتدائے اسلام میں تین تغیرات ہوئے اور روزے کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں۔ روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ہر مہینہ میں تین روزے اور ایک روزہ یومِ عاشورہ (یعنی دسویں محرم) کا رکھتے تھے پھر رمضان کی فرضیت نازل ہوگئی۔ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ تو حکم یہ تھا کہ ہر شخص کا اختیار ہے کہ روزہ رکھ لے یا فدیہ دے دے اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت مَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ نازل فرما دی، اس آیت نے تندرست قوی کے لیے یہ اختیار ختم کر کے صرف روزہ رکھنا لازم کر دیا، مگر بہت بوڑھے آدمی کے لیے یہ حکم باقی رہا کہ وہ چاہے تو فدیہ ادا کر دے۔

یہ تو دو تبدیلیاں ہوئیں تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں۔ جب سو گیا تو دوسرا روزہ شروع ہو گیا، کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آیت اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ الآیۃ نازل فرما کر یہ آسانی عطا فرما دی کہ اگلے دن کی صبح صادق تک کھانا پینا وغیرہ سب جائز ہیں۔ سو کر اٹھنے کے بعد سحری کھانے کو سنت قرار دیدیا گیا۔ صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد میں بھی اس مضمون کی احادیث آئی ہیں۔ (ابن کثیر)

Marfat.com

بعض دوسرے اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ یُطِیْقُوْنَہٗ میں ضمیر کا مرجع تو صوم ہی ہے۔لیکن اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزہ رکھ تو سکتے ہیں لیکن روزے کا تحمل ان کے لیے آسان نہیں مشکل ہے۔مثلاً زیادہ بوڑھے اشخاص یا حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں ان کے نزدیک طاقت اور وسعت میں فرق ہے۔وسعت تو امکان کے مترادف ہے اور طاقت میں یہ مفہوم شامل ہے کہ وہ کام کرنے والے کی قدرت میں تو ہو لیکن اس کے کرنے میں مشقت بہت زیادہ اٹھانی پڑے۔

الطاقة اسم لمقدار مايمكن للانسان ان يفعله بامشقة (راغب)

الوسع فوق الطاقة فالوسع اسم لمن كان قادرا على الشيء على وجه السهولة واما الطاقة فهو اسم لمن كان قادرا على الشيء مع الشدة والمشقة (كبير)

کشاف نے بھی اسی کے ہم معنی بات کہی ہے۔آیتِ کریمہ میں چونکہ طاقت کا مادہ استعمال ہوا ہے مندرجہ بالا وضاحتوں کے مطابق اس کا یہ ترجمہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ تکلیف کے ساتھ روزہ رکھ سکیں مثلاً بوڑھے مرد اور عورت، دودھ پلانے والی عورتیں اور حاملہ عورتیں ان کے لیے اجازت ہے کہ یہ بجائے تکلیف سے روزہ رکھنے کے کسی اور کو روزہ رکھوا دیں۔اگر آیت کا یہ مفہوم مراد لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ حکم منسوخ نہیں بلکہ علی حالہٖ قائم ہے۔

تیسرا نقطہ نگاہ اس سے یکسر مختلف ہے وہ اس کا مرجع صیام یا صوم کو نہیں بلکہ طعام کو قرار دیتے ہیں اور صوم کو اس کا مرجع قرار دینے پر ان کے چند ایک تحفظات ہیں۔کہا جاتا ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی رائے کے حامل لوگوں میں سے تھے۔یہ حضرات اسی سلسلے میں جو کچھ کہتے ہیں ہم ایک ترتیب سے اس کا خلاصہ عرض کر دیتے ہیں۔

۱:۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ صحابہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ چاہے وہ روزہ رکھیں اور چاہے ایک مسکین کے کھانے کا فدیہ دے دیں تو پھر کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کا کیا مطلب ہے؟ وہ فرض کیسا ہے؟ جس کے ساتھ ہی اس پر عمل نہ کرنے کا اختیار بھی دے دیا جائے؟

۲:۔ اس کی تائید میں بعض احادیث پیش کی جاتی ہیں اگر وہ اپنے مفہوم میں اس قدر واضح ہیں جیسا کہ کہا جا رہا ہے تو پھر قدیم مفسرین نے طاقت اور وسعت میں فرق کر کے یُطِیْقُوْنَہٗ کو ایک خاص معنی پہنانے کی کیوں کوشش کی ہے؟

۳:۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ عام لوگوں کو تو اس کی اجازت دے دی جائے کہ چاہیں تو روزہ رکھ لیں اور چاہیں تو فدیہ دے دیں۔لیکن مریض اور مسافر کے لیے پابندی برقرار رہے کہ حالتِ مرض اور حالتِ سفر میں تو روزہ چھوڑا جا سکتا ہے لیکن مرض سے صحت مند ہونے اور سفر کے ختم ہونے پر قضا کرنا لازم ہے۔روزے معاف نہیں ہو سکتے۔

۴:۔ سلبِ ماخذ بھی ایک حقیقت ہے اور اہلِ لغت کی تائید طاقت کے خصوصی معنی کے لحاظ سے بھی ایک اہمیت رکھتی ہے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خاصیاتِ ابواب کا معاملہ قیاسی نہیں سماعی ہے۔اس لیے جب تک اہلِ زبان کے استعمال کی مثالیں اس کے حق میں نہ لائی جائیں اور فصحائے عرب کی تائید اسے میسر نہ آئے اس وقت تک محض مفروضے کی بنیاد پر اتنا بڑا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔

Marfat.com

متذکرہ بالا تحفظات کی وجہ سے ان محققین کا کہنا یہ ہے کہ یُطِیْقُوْنَہٗ کی ضمیر کا مرجع طعام ہے۔ پوری عبارت اس طرح ہے: وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ ''جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہیں تو ان کے لیے بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔'' اس صورت میں چونکہ جملہ نہایت ثقیل ہو جاتا تھا اس لیے کلام کی روانی اعجاز اور بلاغت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک جگہ طعام مسکین کو حذف کر کے اس کی جگہ ضمیر لائی جائے اور دوسری جگہ جہاں اس کا اظہار ضروری ہے اس کو ظاہر کر دیا جائے تاکہ کلام غیر ضروری تکرار کے عیب سے پاک رہے۔ رہی یہ بات کہ اس صورت میں ضمیر کا مرجع ایک ایسے لفظ کو بنایا گیا ہے جس کا پہلے کہیں ذکر نہیں بلکہ بعد میں اس کا ذکر آیا ہے اسی کو اہلِ نحو کے یہاں اضمار قبل الذکر کا نام دیا جاتا ہے اور یہ کلام کا ایک عیب ہے اور قرآن کریم تو کسی طرح کے عیب کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اضمار قبل الذکر اس وقت عیب ہوتا ہے جب ضمیر کا مرجع متکلم کی نیت میں بھی مقدم نہ ہو۔ لیکن اگر متکلم کی نیت میں مقدم ہو اور محض تکرار سے بچنے یا بلاغت کے کسی اور تقاضے کے تحت وہ مرجع کو موخر کرنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں اضمار قبل الذکر کلام کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو لوگ بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہیں کر سکتے تھے انہیں اس بات کی اجازت تھی کہ دوسرے دنوں میں یا تو روزے رکھ کر ان چھوڑے ہوئے روزوں کی تلافی کر دیں اور یا ایک روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا بدل پورا کر دیں۔ لیکن اگلی آیت کے نازل ہونے کے بعد بیمار اور مسافر کے لیے بھی یہ رعائت منسوخ ہو گئی۔ اب ان کے لیے قضا شدہ روزوں کی جگہ بھی روزے رکھنا ہی ضروری ٹھہرا۔ آیت کے آخری جملے میں ارشاد فرمایا گیا ہے قضا روزے کا جو فدیہ مقرر کیا گیا ہے یہ ایک خوشحال آدمی سے کم سے کم مطالبہ ہے، اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلانا چاہے یا ان کے ساتھ کوئی اور نیکی کرے تو یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کے بعد یہ بھی اشارہ کر دیا گیا کہ فدیہ کی محض اجازت دی گئی ہے یہ روزے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم روزہ ہی رکھنے کی کوشش کرو اور وہ وقت دور نہیں جب یہ اجازت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ کے نازل ہونے کے بعد یہ اجازت منسوخ کر دی گئی۔

فدیہ کا مفہوم

ہماری گزشتہ بحث میں بار بار فدیہ کا ذکر آیا ہے بہتر ہے کہ اس کی تفصیل اور ضروری مسائل ذکر کر دیئے جائیں۔

ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے، نصف صاع ہمارے مروجہ سیر یعنی اَسی تولہ کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر ہوتے ہیں۔ اس کی بازاری قیمت معلوم کر کے کسی غریب مسکین کو مالکانہ طور پر دے دینا ایک روزہ کا فدیہ ہے۔ بشرطیکہ کسی مسجد، مدرسہ کی خدمت کے معاوضہ میں نہ ہو۔

مسئلہ: ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا یا چند روزوں کے فدیہ کو ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں، جیسا کہ شامی نے بحوالہ بحرالرائق قنیہ نقل کیا ہے اور بیان القرآن میں اسی کو نقل کیا گیا ہے۔ مگر حضرت نے امداد الفتاویٰ میں فتویٰ اس پر نقل کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں شامی نے بھی فتویٰ اس پر نقل کیا ہے۔ البتہ امداد الفتاویٰ میں ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ کئی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے، لیکن دے دینے کی گنجائش بھی ہے۔ یہ فتویٰ مورخہ ۱۳۵۳ھ امداد الفتاویٰ جلد دوم صفحہ ۱۲۴ میں منقول ہے۔

Marfat.com

مسئلہ: اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کروں گا۔ (بیان القرآن)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۗ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

(مہینہ رمضان کا ہے جس میں قرآنِ کریم نازل کیا گیا ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور دلیلیں روشن راہ پانے کی اور حق و باطل سے جدا کرنے کی سو جو شخص پائے تم میں سے اس مہینہ کو اسے چاہیے کہ روزے رکھے اس کے اور جو کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو تو اس کی گنتی پوری کرے اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے وہ تم پر دشواری نہیں چاہتا اور چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کرو اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ اس نے تم کو ہدایت کی اور تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو) (البقرۃ: ۱۸۵)

رمضان کی فضیلت کا حقیقی سبب

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے رمضان کی فضیلت اور اہمیت کو براہِ راست بیان کرنے کی بجائے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جس سے رمضان کی اہمیت بھی دل و دماغ میں اترتی چلی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ رمضان کی اس اہمیت اور فضیلت کا حقیقی سبب کیا ہے۔ مزید یہ کرم بھی فرمایا کہ قرآنِ کریم کی بعض خصوصی صفات کو بھی ذکر فرمایا گیا تاکہ لوگوں کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ قرآنِ کریم صرف فضیلت کی کتاب نہیں بلکہ اس کی بعض خصوصیات ہیں جس سے جہاں اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں انسانی زندگی سے اس کا ربط بھی واضح ہوتا ہے اور انسانوں کے لیے اس کی ضرورت بھی نمایاں ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم سب سے پہلے احادیث کی روشنی میں نہایت اختصار سے رمضان المبارک کی فضیلت اور قرآنِ کریم سے اس کا تعلق واضح کریں گے اور اس کے بعد جن تین خصوصی صفات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس کی وضاحت کی کوشش کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ رمضان المبارک کی برکتوں اور عظمتوں کی کوئی انتہا نہیں اس میں کیا ہوا عملِ صالح اپنی تاثیر نتیجہ خیزی اور اجر و ثواب کے اعتبار سے بے مثال و بے نظیر ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی عطاو بخشش کا ایسا بیش بہا خزانہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

لَوْيَعْلَمُ الْعِبَادُ مَافِىْ رَمَضَانَ لَتَمَنَّتْ اُمَّتِىْ اَنْ تَكُوْنَ السَّنَةُ كُلُّهَا رَمَضَانَ

(اگر بندے جان لیں کہ رمضان میں کیا ملتا ہے تو میری امت تمنا کرے کہ اے کاش سارا سال رمضان ہی رہے)

اس رمضان کے ذریعے سیرت و کردار کی تعمیر کا ایسا پروگرام دیا گیا ہے اور ایمان اور یقین کا ایسا سامان کیا گیا ہے کہ

Marfat.com

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ وَحِصْنٌ حَصِيْنٌ مِّنَ النَّارِ

(روزہ (گناہوں اور برائیوں کے سامنے) ڈھال ہے اور جہنم کی آگ سے بچاؤ کے لیے مضبوط قلعہ ہے)

یعنی روزہ انسان کے اندر ایک ایسا نیکی کا شعور اور احساس پیدا کر دیتا ہے جو گناہ اور معصیت کی ہر ترغیب اور خواہش نفس کے ہر حملے کے سامنے ڈھال اور رکاوٹ بن جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں آدمی صالح سیرت و کردار اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے ایک ایسے قلعے میں محفوظ ہو جاتا ہے جہاں جہنم کی آگ نہیں پہنچ سکتی۔

سوال یہ ہے کہ رمضان کی یہ تمام تر خیر و برکت اور انسانی سیرت و کردار کی تعمیر میں اس کی اثر اندازی کا سبب کیا ہے؟ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ رمضان المبارک کی ساری سعادتوں اور فضیلتوں کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم اس مہینہ میں نازل فرمایا اگر یہ کتاب مطہر و محترم کسی اور مہینہ میں نازل ہوتی تو بلاشبہ وہ مہینہ ایسی ہی عظمتوں کا حامل ہوتا۔ یہی کتاب ہے جس کی وجہ سے یہ امت خیر الامم بنی ہے اور رمضان خیر الشہور ٹھہرا ہے۔ آنحضرت ﷺ جو وجہِ تخلیقِ کائنات خاتم الانبیاء والرسل اور سید الاولین والاخرین ہیں یوں تو ان کے افضل واشرف ہونے کے بہت سے اسباب ہیں لیکن ان میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ آپ پر قرآنِ کریم جیسی کتاب نازل کی گئی یہی وہ کتاب ہے جس کے حقِ امانت کی ادائیگی نے آپ کو حرا کی تنہائیوں سے اترنے پر مجبور کیا۔ آپ جو انتہائی کم آمیز واقع ہوئے تھے اور عزلت نشینی اور گوشہ گیری آپ کے سکون واطمینان کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس کتاب کی گراں باریوں نے اختلاط و معاشرت ہی نہیں ایک ایک دروازے پر آپ کو دستک دینے پر مجبور کر دیا۔ آپ جو انتہائی کم گو دیکھے جاتے تھے اور کبھی کسی نے آپ سے خطبہ و تقریر تو دور کی بات ہے ایک کلمہ نصیحت بھی نہیں سنا تھا۔ اب آپ کی زبان سے حکمت و نصیحت کا چشمہ ابلنے لگا۔ اسی کتاب عزیز کی تلاوت اسی کی تعلیم اسی کی حکمت و دانش اسی کے تبشیر و انداز اسی کے وعد و مواعید اور اسی کی تبلیغ و دعوت آپ کی زندگی کا معمول بن گئی۔ پھر اس کے نتیجے میں آپ کی ذات جو ہر طرح کی تعریف و تحسین اور اعزاز و اکرام کی مستحق سمجھی جاتی تھی۔ اب تنقید ہی نہیں ہر طرح کے الزام و دشنام اور ہر طرح کی ایذا کا ہدف بن گئی اور زندگی کا ہر زخم اور ہر دکھ آپ نے اس بارِ امانت کی ادائیگی کے سلسلے میں نہایت صبر و سکون سے برداشت فرمایا۔ یہ ذات عزیز و گرامی جس کے پاؤں کی دھول بھی ساری کائنات سے افضل ہے اس کے سر مبارک پر رکھ پھینکی گئی۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپ کی جان لینے کی تدبیریں کی گئیں۔ طائف میں آپ پر پتھروں کی بارش کی گئی آپ کو وطن سے بے وطن کیا گیا۔ جان و تن کی آزمائشوں سے گزرنے پر آپ کو مجبور کیا گیا تا آنکہ اسی نسخہ کیمیا سے آپ نے عرب کی مس خام کو کندن بنا دیا اور ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کے نتیجہ میں

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

اس آیت کریمہ میں قرآنِ کریم کی تین خصوصی صفات کو بیان فرمایا گیا ہے جنہیں ہم نہایت اختصار سے عرض کرتے ہیں۔

الھدیٰ

قرآنِ کریم کی ایک صفت "الھدیٰ" ہے۔ ہدایت کے مختلف معنی ہیں۔

Marfat.com

۱: **فعل ھدایت: لیس علیک ھداھم** ''انہیں ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں''

۲: **صراطِ مستقیم: انک لعلی ھدی مستقیم** ''آپ یقیناً سیدھے راستے پر ہیں''

۳: **نشانِ راہ: اواجد علی النار ھدی** ''یا میں آگ پر کوئی نشان پاؤں''

۴: **قلبی نور وبصیرت: والذین اھتدوا زادھم ھدی** ''جولوگ راہ پاجاتے ہیں ہم ان کے قلبی نور وبصیرت میں اضافہ کردیتے ہیں''۔

یہ فعل ہدایت کبھی صرف اراء الطریق یعنی راستہ دکھانا ہوتا ہے اور کبھی ایصال الی المطلوب یعنی منزل مقصود تک پہنچانا ہوتا ہے۔ قرآن کریم ان تمام معنوں میں ہدایت ہے۔ یہ محض کتاب نہیں بلکہ یہ کتاب نصیحت بھی ہے، کتاب زندگی بھی ہے، کتاب قانون بھی ہے اور فلسفۂ قانون بھی ہے۔ یہ کتابِ اخلاق بھی ہے، یہ تاریخ، اسباب تاریخ اور نتائج سے بھی بحث کرتی ہے۔ یہ آدابِ زندگی اور اسلوبِ زندگی کی تعلیم بھی ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی کے جتنے شعبے ہیں یہ کتاب ان تمام سے متعلق رہنمائی دیتی ہے اور پھر اس پر اصرار کرتی ہے کہ یہی صحیح ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں ہوسکتا۔

بینات

یہ کتاب صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ اس میں ہدایت کے بینات بھی ہیں یعنی یہ زندگی کے بارہ میں جو ہدایات دیتی اور زندگی کے جس اسلوب کا حکم دیتی ہے اس پر دلائل بھی فراہم کرتی ہے۔ یہ صرف عمل کا سامان نہیں کرتی بلکہ عقل ودانش کو بھی غذا فراہم کرتی اور اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے اور اس کے یہ بینات عقلی بھی ہیں اور فطری بھی، استخراجی بھی ہیں اور استنتاجی بھی۔ یعنی دلائل وبراہین کے تمام اسالیب ہمیں اس کتاب میں ملتے ہیں لیکن بینات کی ایک خاص صورت جو اس کتاب کی خصوصیت ہے۔ وہ یہ کہ اس کے بینات تاریخی اور انسانی پیکر بھی ہیں۔ وہ جب یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی معرفت جو ہدایت بھیجی ہے اسے قبول کرو اسی میں تمہاری دنیوی اور اخروی بھلائی ہے تو پھر صرف عقلی ونقلی دلائل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عملی شواہد بھی پیش کرتا ہے۔ وہ ان افراد اور قوموں کی تاریخ بیان کرتا ہے جو اس ہدایت کو قبول کرنے کے نتیجے میں کامیاب وکامران ٹھہریں اور ان قوموں کا بھی ذکر کرتا ہے، جو اس کا انکار کر کے تباہی ونامرادی کا شکار ہوئیں۔ وہ انبیاء ورسل اور ان کی زندگی کو بطور عملی برہان کے پیش کرتا ہے کہ دیکھو ان لوگوں نے کس طرح ناموافق ونامساعد حالات میں اللہ کی دعوت کو پیش کیا اور تن تنہا وقت کی قوتوں سے ٹکراتے ہوئے زندگی گزاری۔ کبھی وقت کا دھارا بدلنے میں کامیاب ہوگئے اور کبھی اس راہ میں کام آکر استقامت اور اپنے موقف کی حقانیت کا چراغ روشن کر گئے بعد میں آنے والی نسلوں نے جس سے روشنی پائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس بیچارگی اور بے کسی کے ماحول سے اٹھے لیکن محض اپنے موقف کی حقانیت اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت اور اپنی بے پناہ استقامت سے تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا اور فرعون اپنی تمام تر قوت وحشمت اور اقتدار وطاقت کے باوجود محض اپنے کفر وجحود اور ناشکری کے باعث تاریخ میں عبرت کا نشان بن گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بظاہر اپنے مقصد کو نہ پاسکے لیکن اپنے ایثار وقربانی اور جاں فروشی وجاں سپاری سے ایک ایسا منارۂ نور بن گئے کہ مہ وسال کی گردشوں کے ساتھ ساتھ ان سے فیض پانے والوں کا سلسلہ دراز تر ہوتا گیا۔ اسی طرح قرآن کریم جب اخلاقی اقدار کو بیان کرتا ہے تو اس کے ساتھ عملی بینات کو بھی پیش کرتا ہے۔ راہِ حق میں استقامت اور قربانی کی

Marfat.com

ترغیب دیتا ہے تو حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کی قربانیوں کو بطور شواہد پیش کرتا ہے اللہ کے دین کی سربلندی اور نشرواشاعت کا جب حوالہ آتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بھراس راہ میں صحرانوردی' بادیہ پیمائی' مختلف ممالک کا سفر'اس راہ میں پیش آنے والے مصائب' گھر' وطن' اعزہ واقربا کی مفارقت ومہاجرت اور پھراس راستے میں جسم وجان کی آزمائشیں' سب کو نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے غرضیکہ حضرت نوح علیہ السلام کا جوش تبلیغ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خلق وخالق کے لیے بے پناہ محبت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مسکینی وغربت اور راہِ حق میں سرفروشی حضرت ایوب علیہ السلام کی محض اپنے مالک وآقا سے محبت وخلت اور اس راستے میں ایثار وقربانی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خودسپردگی اور تسلیم ورضا یہ سب ہدایت کے بینات ہیں جنہیں قرآن پیش کرتا ہے۔

الفرقان

اس کتاب کی ایک اور صفت اور خصوصیت اس کا ''الفرقان'' ہونا ہے۔یعنی یہ کتاب حق کی علامت اور شناخت ہے۔جس طرح نور کے آجانے سے تاریکی کافور ہوجاتی ہے یہ ممکن نہیں کہ طلوعِ آفتاب کے بعد اندھیرے کا وجود باقی رہے۔اسی طرح قرآن حکیم ایک نور بلکہ منارۂ نور ہے۔یہ کتاب منیر ہے،یہ روشن آفتاب ہے،اس کی ہر بات واضح اس کا ہر حرف حرفِ آخر اور اس کا ہر قول قول فیصل ہے۔پروردگار ارشاد فرماتا ہے:

تَبٰرَکَ الَّذِی نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ

(بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا)

فرقان ہونے کا معنی کیا ہے؟ارشاد فرمایا: اِنَّـهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ''یہ قول فیصل ہے کوئی مذاق نہیں۔''اس کی ہر بات اپنی صحت،حفاظت،حقانیت اور قابلِ عمل ہونے میں ہر شک وشبہ سے بالا ہے۔مزید یہ کہ یہی حق کی کسوٹی اور پہچان ہے یہ نہ خود کسی ملاوٹ کو برداشت کرتی ہے اور نہ باطل اس کو برداشت کرتا ہے۔اس کا رویہ اکھل کھرا اور اس کی ہدایت بالکل واضح ہے۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِيْـنِ اس کا مزاج ہے۔ہوا کے رخ پر اڑنا،پانی کے بہاؤ کے سہارے بہنا،اس کے مزاج کے خلاف ہے۔یہ کمپرومائز کرنا نہیں جانتا۔جس طرح نور وظلمت اکھٹے نہیں ہوسکتے،آگ اور پانی بہم نہیں رہ سکتے،ندی کے دو کنارے آپس میں نہیں مل سکتے،تاریخ کے دو باب اکھٹے نہیں ہوسکتے،اسی طرح قرآن کا پیش کردہ حق کسی باطل کے ساتھ مفاہمت نہیں کرسکتا۔جس طرح ہمارا پروردگار وحدہٗ لاشریک ہے،اسی طرح اس کے احکام،اس کی شریعت،اس کی ہدایت بھی لاشریک ہے۔اس کے مقابل اور متصادم ہر چیز باطل ہے۔حق وباطل میں اشتراک مفاہمت یا اخذ وردکا رویہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے توحید وشرک میں اشتراک اور مفاہمت۔

اقبال نے ٹھیک کہا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

شاید اسی الفرقان ہونے کی وجہ سے ہم قرآن کریم کی یہ خصوصیت دیکھتے ہیں کہ وہ حق وباطل،سچ اور جھوٹ،صحیح اور غلط،کامیابی ونامرادی جیسے حقائق کو پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کرتا ہے۔فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو،نمرود کے

Marfat.com

بالمقابل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو، حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ قوم عاد کو ضرور ذکر کرتا ہے۔ جنت اور جہنم کا ذکر آپ ساتھ ساتھ دیکھیں گے۔ رحمت اور عذاب کی آیات یکے بعد دیگرے آئیں گی۔ اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کا رویہ بھی ایک ساتھ بیان ہوگا۔ کفر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کردار اور اسلام کے نتیجے میں تیار ہونے والے کردار آپ کو ایک ساتھ نظر آئیں گے۔ سورۃ الفرقان اور المومنون اس کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ انداز قرآن کریم کے الفرقان یعنی حق و باطل میں کسوٹی اور امتیاز ہونے کا مظہر ہے۔

رمضان سے متعلق چند مسائل

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ : شَهِدَ، شهود سے ہے۔ جس کے معنی ''حاضر اور موجود'' ہونے کے ہیں۔ اور الشَّهْر ''مہینہ'' کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد رمضان کا مہینہ ہے۔ اس جملے کا معنی یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص رمضان میں حاضر ہو تو اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے۔ اس سے کئی مسائل کی طرف اشارات ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ جو آدمی اپنی زندگی میں اس حال میں رمضان کو پائے کہ وہ مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم ہو اور تمام ایسے موانع سے پاک ہو جن کی وجہ سے روزہ فرض نہیں رہتا تو ایسے آدمی پر پورے مہینے کے روزے فرض ہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص رمضان کو اس حال میں پائے کہ وہ کافر ہو یا نابالغ یا مجنون تو یہ لوگ اس حکم کے مخاطب ہی نہیں۔ البتہ اگر کافر مسلمان ہو جائے نابالغ بالغ ہو جائے اور مجنون مسلمان ہے اور اس کو ہوش آ جائے تو پھر جتنے رمضان کے روزے باقی ہوں وہ ان پر فرض ہوں گے اور مجنون کو تو گذشتہ روزے بھی قضا کرنا ہوں گے۔ رہے وہ لوگ کہ جن میں ذاتی صلاحیت تو روزے کی فرضیت کی موجود ہے لیکن کسی عذر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے جیسے حیض و نفاس والی عورت، یا مریض اور مسافر، تو انہوں نے ایک حیثیت سے ماہِ رمضان اس حالت میں پایا کہ روزہ ان پر فرض ہونا چاہیے لیکن وقتی عذر کے باعث وہ روزہ رکھ نہیں سکتے تو روزہ نہ رکھنے کا انہیں گناہ نہیں ہوگا البتہ بعد میں قضا کرنا ضروری ہے۔

دوسری بات یہ کہ رمضان کا پانا تین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی خود رمضان کا چاند دیکھے اور دوسرا یہ کہ کسی معتبر شہادت سے چاند کی رویت ثابت ہو جائے۔ ان دونوں صورتوں میں رمضان کے روزے رکھنا فرض ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو پھر شعبان کے تیس دن پورے کرنے کے بعد رمضان کا مہینہ شروع ہوگا اور اگر شعبان کی انتیسویں شب کو موسم خراب ہونے کے باعث چاند نظر نہ آئے تو ایسی صورت میں دونوں احتمال ہیں کہ چاند طلوع ہوا ہو لیکن نظر نہ آئے یا سرے سے چاند طلوع ہی نہیں ہوا۔ شک کی اس فضا میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں بلکہ ایسی صورت میں روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے تاکہ فرض اور نفل میں اختلاط اور التباس پیدا نہ ہو۔

شهودِ رمضان کی تیسری صورت یہ ہے کہ گنتی کے اعتبار سے رمضان کا مہینہ گنا جا سکے لیکن رات دن کے کئی کئی مہینوں تک طویل ہو جانے کے باعث رات اور دن کی تعیین میں مشکل پیش آئے۔ ایسی صورت میں اہلِ علم میں اختلاف ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ

> ''جن ملکوں میں رات دن کئی کئی مہینوں کے طویل ہوتے ہیں وہاں شہودِ شہر یعنی رمضان کا پالینا بظاہر صادق نہیں آتا۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ ان پر روزے فرض ہی نہ ہوں فقہا حنفیہ میں سے حلوانی اور بقالی وغیرہ نے نماز کے متعلق تو اسی پر فتویٰ

Marfat.com

دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار سے نماز کا حکم عائد ہوگا مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد صبح صادق ہو جاتی ہے وہاں نمازِ عشاء فرض ہی نہیں (شامی)۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن ہے وہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گی اور رمضان وہاں آئے گا ہی نہیں۔ اس لیے روزے بھی فرض نہ ہوں گے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی نے امداد الفتاویٰ میں روزے کے متعلق اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔"

بعض جدید محققین کا خیال یہ ہے کہ قطبین کے قریب جہاں رات اور دن کئی کئی مہینوں کے ہوتے ہیں یہ سمجھنا کہ وہاں نہ تو رمضان کا تحقق ہو سکتا ہے اور نہ اوقات کی تعیین ممکن ہے۔ یہ خیال سراسر علمِ جغرافیہ کی سرسری واقفیت کا نتیجہ ہے۔ حقیقت میں نہ وہاں چھ مہینوں کی رات اس معنی میں ہوتی ہے اور نہ چھ مہینوں کا دن جس معنی میں ہم خطِ استوا کے آس پاس رہنے والے لوگ دن اور رات کے لفظ بولتے ہیں۔ خواہ رات وقت ہو یا دن کا بہرحال صبح وشام کے آثار وہاں پوری باقاعدگی کے ساتھ افق پر نمایاں ہوتے ہیں اور انہیں کے لحاظ سے وہاں کے لوگ ہماری طرح اپنے سونے، جاگنے، کام کرنے اور تفریح کرنے کے اوقات مقرر کرتے ہیں۔ جب گھڑیوں کا رواج عام نہ تھا تب بھی فن لینڈ، ناروے اور گرین لینڈ وغیرہ ملکوں کے لوگ اپنے اوقات معلوم کرتے ہی تھے اور اس کا ذریعہ یہی افق کے آثار تھے۔ لہٰذا جس طرح دوسرے تمام معاملات میں یہ آثار ان کے لیے تعیین اوقات کا کام دیتے ہیں اسی طرح نماز اور سحر و افطار کے معاملے میں بھی دے سکتے ہیں۔

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ یہ جملہ اس سے پہلی آیت میں بھی گزر چکا۔ اسے دوبارہ لانا شائد اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ جس طرح پہلی آیت میں روزہ کی بجائے فدیہ دینے کا اختیار دیا گیا تھا وہ اس آیت سے منسوخ کر دیا گیا۔ اسی طرح کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مریض اور مسافر کو جو روزہ چھوڑنے کی اجازت دی گئی تھی وہ بھی شائد منسوخ ہوگئی۔ چنانچہ اس شبہ کو ختم کرنے کے لیے دوبارہ اس جملے کو لایا گیا اور مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی منظور ہے تنگی اور دشواری نہیں۔ اس لیے اس حقیقی اور فطری سہولت کو کس طرح واپس لیا جا سکتا تھا؟

اس آیت کریمہ کے آخر میں روزے کی حکمتوں اور مقاصد کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ہم نے تقویٰ کے ساتھ انہیں بھی ایک ترتیب ملحوظ رکھتے ہوئے شروع ہی میں ذکر کر دیا ہے، اگر دوبارہ اس پر نظر ڈال لی جائے تو بہتر ہوگا۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ○

(اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں (تو انہیں بتایئے) کہ میں قریب ہوں میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہیے کہ وہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں) (البقرۃ:۱۸۶)

آیت کے پس منظر پر ایک نظر

اس آیت کریمہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس رکوع کی اس سے پہلے کی آیات کو پیشِ نظر رکھیں۔ اس رکوع میں رمضان میں روزے کی فرضیت کا ذکر فرمایا پھر اس کی اہمیت اور عظمت کو نمایاں کرنے کے لیے یہ فرمایا کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآنِ کریم نازل

Marfat.com

کیا گیا اور قرآنِ کریم اللہ کی ایسی بیش بہا نعمت ہے کہ جہاں جہاں بھی اس کی نسبت ہوگئی ہے وہیں وہیں عظمتیں اور برکتیں بہار بن کر چھا گئی ہیں۔ اسی قرآنِ کریم نے رمضان المبارک کو خیر الشھور بنایا، اسی قرآن کی وجہ سے یہ امت خیر الامم کہلائی اور اسی قرآنِ کریم کے باعث حرمین کو عظمتیں ملیں۔ دیگر اسباب سمیت یہی قرآن کا نزول ہے جس کی وجہ سے سرکارِ دو عالم ﷺ سید الرسل قرار پائے۔ اسی قرآنِ کریم کو نوعِ انسانی کے لیے ہدایت نامہ، ضابطۂ حیات، اور زندگی کا دستور بنا کر نازل کیا گیا۔ اس کتاب سے وابستگی اور اس کے واسطے سے اللہ کے قرب کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ آدمی صرف اس بات پر کفایت نہ کرے کہ میں احکامِ شریعت پر عمل کرتے ہوئے ان باتوں سے پرہیز کروں جن باتوں سے شریعت نے روکا ہے بلکہ وہ رمضان کے ایک مہینے کے لیے طلوعِ سحر سے لے کر غروبِ آفتاب تک ان جائز چیزوں سے بھی ہاتھ کھینچ لے اور تمام نعمتوں سے منہ پھیر لے جنہیں اللہ تعالیٰ نے عام دنوں میں حلال ٹھہرایا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے اپنے جذبات وخواہشات پر قابو پانے کی قوت وصلاحیت حاصل ہو جائے گی وہ بندۂ نفس اور خواہشات کا غلام نہیں ہوگا بلکہ اللہ کی غلامی کے سوا باقی ہر چیز پر وہ حکمرانی کرے گا۔ اس کی خودی ہر قوت پر اور ہر جذبے پر غالب آجائے گی البتہ اس کی خودی اللہ کی بندگی اور چاکری میں اس طرح جھکتی چلی جائے گی کہ ایک وقت آئیگا جب اللہ کی عظمت وجلالت اور اس کی بزرگی اور کبریائی کا احساس اس کے رگ وریشے میں سما جائے گا اسے ہر طرف اللہ کی کبریائی کے جلوے نظر آئیں گے۔ اس کی عظمت وجلالت اس کے دل میں خشیت بن کر مچلنے لگے گی اور یہی خشیت اللہ کی چاہت میں ڈوب کر محبت کی شکل اختیار کرلے گی۔ اسکی زبان اس کے شکر میں زمزمہ سنج رہے گی اور اس کے دل ودماغ میں ہر وقت اپنے محبوب کا تصور اور اپنے محبوب کی طلب اس طرح اپنی جگہ بنالے گی کہ دنیا کی ہر خواہش اور دنیا کی ہر تمنا اس کے دل سے نکل جائے گی۔ وہ اس کی ہر نعمت کے مقابلے میں شکر کی تصویر بنے اپنا فرض ادا کرنے کی فکر میں رہے گا۔

عبادت گزار بندے کے احساسات

چنانچہ تیس دن کے روزے اور تیس راتوں کا قیام اور شب وروز اللہ کی کتاب سے وابستگی اور اعتکاف کی تنہائیوں میں اللہ کی ذات، اس کے رسول اور اس کی کتاب سے محبت کی تڑپ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ پھر یہ بندہ ہر وقت اپنے اللہ کے خیال میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کے جی میں کبھی کبھی خیال آتا ہے، کاش! میں اپنے محبوب کو دیکھ سکتا، کاش! میں اس سے باتیں کر سکتا اور اگر یہ نہیں تو کاش! وہ میری مناجات سنتا، کاش! وہ میرے احساسات سے واقف ہوتا کیونکہ ایک عاشقِ ناشاد کی سب سے بڑی طلب، سب سے بڑی چاہت اور سب سے بڑی منزل اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے محبوب کو اپنے قریب محسوس کرے۔ معلوم ہوتا ہے ایسے ہی احساسات سے بہرہ ور ہو کر کسی نہ کسی نے آنحضرت ﷺ سے ایسی ہی کسی تمنا کا اظہار کیا ہوگا۔ یہ اگرچہ بڑی جسارت ہے جس کی صحابہ کرام سے امید نہیں کی جاسکتی لیکن اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ ان کے دل میں تو ہر وقت اسی طرح کے جذبات مچلتے ہوں گے۔ پروردگار تو جذبات کی زبان کو بھی سمجھتے ہیں، جذبات کے محرکات کو بھی جانتے ہیں۔ اس لیے آپ نے خود انہیں زبان دی اور یہ آیتِ کریمہ اتاری کہ اے میرے پیغمبر! اگر میرے بندے میرے بارے میں آپ سے پوچھیں اور وہ اپنی محبت کے جذبات سے مجبور ہو کر میرے بارے میں کچھ جاننے کی فکر کریں تو انہیں بتایئے کہ تم مجھے دیکھ تو نہیں سکتے ہو اس لیے کہ تم میں مجھے دیکھنے کی ہمت نہیں۔ مخلوق اپنے خالق کا سامنا نہیں کرسکتی تم سورج کی شعاؤں کی تاب نہیں لاسکتے، تیز روشنی تمہاری آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے، انوار کی بارش کا تحمل کرنا تمہارے بس سے باہر ہے، اللہ کے دیدار سے تم کیسے بہرہ ور ہوسکتے ہو؟ اسی طرح ان ناسوتی کانوں کے ساتھ تم اس کی آواز کے بھی متحمل نہیں ہوسکتے، تمہاری یہ کمزوری ہے جس نے تمہیں اللہ کو دیکھنے اور اس سے

Marfat.com

باتیں کرنے سے محروم رکھا ہے۔لیکن ایک وقت آئیگا جب قیامت میں تم اس نعمت سے بہرہ یاب کیے جاؤ گے۔تم اپنی کمزوریوں کے باعث اگر چہ اپنے حواس میں اسے سمونہیں سکتے،اپنی عقل کی گرفت میں نہیں لاسکتے،لیکن اس کے باوجود تم اگر دلِ بیدار رکھتے ہو تو تم اسے محسوس ضرور کرسکتے ہو۔اس لیے پروردگار نے فرمایا کہ میرے بندوں کو بتادو کہ میں ان سے قریب ہوں۔قرب،وصال کا ہم معنی لفظ ہے۔ایک عاشقِ صادق کی سب سے بڑی آرزو اپنے محبوب سے وصال حاصل کرنا ہے۔وہ اپنی اس آرزو سے کبھی دستبردار نہیں ہوتا وہ اگر یہ جان بھی لے کہ مجھے وصل سے کبھی نوازا نہیں جائے گا لیکن وصل کی تمنا کو وہ چھوڑنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگا۔غالب نے ٹھیک کہا ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
کچھ اور جیتے ہوتے یہی انتظار ہوتا

محبت کی دنیا عجیب ہے۔جس طرح محبوب کو دیکھنا،اس سے باتیں کرنا،عاشق کی جنت ہے۔اسی طرح محبوب کے تصور میں کھوئے رہنا یہ بھی ایک عاشق کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔اس لیے جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ اپنے محبوب کے تصور میں ڈوب جانا چاہتا ہے اور اگر حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تو وہ حسرت کے انداز میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ ؎

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اس آیتِ کریمہ میں بھی یہی فرمایا جارہا ہے کہ وصل تو اس عالم ناسوت میں ممکن نہیں البتہ وصل سے ملتی جلتی چیز محبوب کا قرب ہے۔تو یقین جانو کہ اللہ تمہارے قریب ہے اور اس قرب کو جاننا چاہو تو تھوڑی سی کوشش کرو تو جان سکتے ہو۔کسی چیز کا قرب دو چیزوں سے محسوس ہوتا ہے ایک یہ کہ آدمی اپنے محبوب کے نقوشِ قدم اس کی علامتوں اور اس کی یادوں میں محبوب کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے عربی شاعری اس تصور سے بھری ہوئی ہے۔وہ جب بھی کسی ایسی جگہ سے گزرتے جن سے کبھی ان کے محبوب کا تعلق رہا تھا تو اس کے ایک ایک ذرے میں انہیں اپنے محبوب کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔یہ اگر واقعی حقیقت ہے تو ہم تو اپنے پروردگار کے حصار میں اس قدر محصور ہیں کہ اس سے باہر ہمیں کوئی چیز دکھائی ہی نہیں دیتی۔وہ ہمارا خالق ہے تو ہمارا اپنا وجود،ہمارا انگ انگ،ہمارا ایک ایک عضو،ہماری ایک ایک صلاحیت،ہمارا ایک ایک احساس وخیال اگر اپنے خالق کی یاد نہیں دلاتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم درحقیقت احساس کی قوت سے محروم ہیں،ہمارے اندر عقل نام کی کوئی چیز نہیں،اسی طرح ہمارا پروردگار ہمارا رب ہے اس کی ربوبیت کے خزانے ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔بہتا ہوا پانی،چھوکر گزرنے والی ہوا،خوشبو دیتے ہوئے پھول۔ لہلہاتی فصلیں،چمکتی ہوئی دھوپ،چھائے ہوئے بادل،تلی ہوئی گھٹا،ابلتے ہوئے چشمے،گرتی ہوئی آبشاریں،کڑکتے ہوئے بادل،جھنڈوں کی طرح تنے ہوئے درخت،زمین پر مخملی گھاس کا بچھا ہوا فرش،پھلوں سے لدے ہوئے درخت،زمین پر پھیلی ہوئی سبزیوں کی بیلیں،کتنی بے شمار نعمتیں ہیں جو ہمارے قریب وبعید پھیلی ہوئی ہیں۔اور جن سے ہمارا ہر وقت کا واسطہ ہے،یہ آخر کس کی یاد دلاتی ہیں۔اور کس کے تصور کو تازہ کرتی ہیں۔اس لحاظ سے گھاس کی ایک ایک پتی اور پھول کی ایک ایک پنکھڑی اور درخت کی ایک ایک ٹہنی آدمی کو یہ کہنے پر مجبور کردیتی ہے کہ

ہر کہ دیدم در جہاں غیرے تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

Marfat.com

یاد دلانے والی دوسری چیز محبوب کی یاد ہے۔لیکن اس کا تعلق محبوب سے نہیں عاشقِ ناشاد سے ہے۔اگر اس کے اندر ایک بیدار دل پایا جاتا ہے جو ہر وقت محبوب کی محبت میں سلگتا، اس کی مہک سے مہکتا، اس کے ذکر سے ہمکتا اور اس کے تصور سے چھکتا ہے۔ تو اندازہ کیجیے اس کا محبوب اس کے قریب ہے یا اس سے دور ہے۔وہ جب بھی اپنے محبوب کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے اس کے سوا کچھ نہیں کرنا پڑتا کہ وہ سر جھکا کر اپنے دل کو دیکھے۔کسی شاعر نے ٹھیک کہا تھا

دل کے آئینہ میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

لیکن اس کے لیے کچھ محنت کرنا پڑتی ہے۔سب سے پہلی محنت تو یہ کرنا ہوتی ہے کہ آدمی کا اپنے دل سے براہِ راست تعلق پیدا ہو جائے۔ وہ اپنے دل کی بات سن سکے اور اسے سنا سکے اس کے احساسات کو سمجھ سکے اور اس میں تبدیلی کرنے کی بھی ہمت رکھتا ہو۔دوسری یہ محنت کہ اس کے دل میں سوائے اپنے محبوب کے کسی اور کی یاد نہ ہو۔کسی اور صنم کے لیے دل میں جگہ نہ ہو، وہ ایک ایک محبت کے آستانے کو حقیقی محبت کے گرز سے توڑ چکا ہو۔جن جن چیزوں کی محبت اللہ کی محبت کو نقصان پہنچاتی ہے ان میں سے ایک ایک چیز اس کے دل سے نکل چکی ہو بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر میں یہ عرض کروں گا کہ صرف چیزیں ہی نہ نکلی ہوں ان کی آرزو اور تمنا بھی نکل چکی ہو۔چیزوں سے لاتعلق ہو جانا اور استغنا کی زندگی اختیار کرنا ایک بہت بڑی دولت ہے اور یہ ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔بڑے حوصلہ مند لوگ اس گھاٹی کو سر کرتے ہیں۔لیکن اللہ جیسے محبوب کو اپنے دل میں بلانے کے لیے اس سے بھی اگلی منزل طے کرنا پڑتی ہے۔وہ یہ کہ صرف اشیاء ہی دل سے نہ نکلیں بلکہ ان کی طلب ،ان کی چاہت، ان کی تمنا اور آرزو بھی دل سے نکل جائے۔قصرِ اقتدار سے رخ پھیر لینا، دولت کی ہوس کو شکست دے دینا، عہدہ و منصب سے لاتعلق ہو جانا، شہرت اور نام و نمود سے قطع تعلق کر لینا بڑی عظمت کا کام ہے۔لیکن یہ حقیقی منزل نہیں، حقیقی منزل یہ ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کی تمنا بھی ختم ہو جائے۔رسول اللہ ﷺ کے فیضِ صحبت نے صحابہ کرام کو اسی حقیقی منزل سے آشنا کیا اور اللہ والوں نے ہمیشہ اسی منزل کی طلب میں زندگی گزاری۔جب کوئی شخص یہ منزل پالیتا ہے تو اسے بجا طور پر یہ کہنے کا حق ہے

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

فَاِنِّیْ قَرِیْب

اس آیتِ کریمہ میں انہیں باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اے پیغمبر! انہیں بتا دیجیے، میں قریب ہوں کہیں دور نہیں۔اب یہ تمہاری کوشش ہے کہ تم مجھے تلاش کرتے ہو یا نہیں میرے فیضان کا عالم تو یہ ہے کہ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے یہ لفظ نہایت قابلِ توجہ ہے۔اس کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ جب وہ مجھے پکارتا ہے بلکہ اس کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ جب وہ مجھے ہی پکارتا ہے کیونکہ احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے اور اس میں وہ کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔حالات کتنے بھی بے قابو ہو جائیں اس کا یقین اسے ہمیشہ اطمینان دلاتا ہے کہ اللہ ہر طرح کے حالات پر قابو پا سکتا ہے، اس کی ذات سب سے عظیم ہے۔اس لیے اگر کوئی اس سے برہنہ تلوار ہاتھ میں لے کر پوچھتا ہے کہ بتا تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ تو وہ نہایت اطمینان سے جواب دیتا ہے: اللہ! اور اللہ اسے بچا لیتا ہے۔اس لیے

Marfat.com

آگے فرمایا کہ یہ لوگ اگر میری محبت کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ میری بات سنیں، میرے ہی احکام کی اطاعت کریں، میرے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنالیں، میرے رسول کی سنت کو دستور العمل ٹھہرالیں۔ دوسری یہ بات کہ مجھ پر یقین رکھیں کہ میں نے ان کو جو ہدایت عطا فرمائی ہے اسی میں ان کے لیے کامیابی ہے، میرے رسول کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے ہی میں ان کے لیے فلاح ہے اور مجھ پر سہارا اور مجھ پر توکل بگڑے ہوئے حالات میں بھی ان کے لیے سپر اور ڈھال ہے اور مجھ سے ہی مدد طلب کرنا ان کی سب سے بڑی قوت ہے۔ اگر وہ ان باتوں پر یقین رکھیں تو پھر امید کی جاسکتی ہے کہ یہ راہِ راست سے کبھی نہیں بھٹکیں گے، انہیں رشد نصیب ہوگا، الجھے ہوئے معاملات اور لاینحل مسائل میں اللہ تعالیٰ ان کو رہنمائی عطا فرمائے گا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ میں قریب ہوں جب کوئی مجھے پکارنے والا پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا ہوں اور اس کا جواب دیتا ہوں۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم تو بارہا اپنے اللہ سے دعائیں کرتے ہیں لیکن ہماری دعائیں تو کبھی نہیں سنی جاتیں۔ ہم پکارتے رہتے ہیں لیکن ہماری پکار رائیگاں جاتی ہے۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کے بارے میں تفصیلی بحث تو کسی اور موقعہ پر آئے گی لیکن چند بنیادی باتیں ہیں جن کا دعا کے سلسلے میں ذہن میں رہنا ضروری ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کی کمائی حلال نہ ہو اور وہ رزقِ حلال کی پابندی نہ کرتا ہو، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ حضرت سعد ابن وقاص ؓ نے آنحضرت سے درخواست کی آپ میرے لیے دعا فرما دیجیے کہ میں مستجاب الدعوات ہو جاؤں۔ جو دعا کیا کروں قبول ہوا کرے۔ آپ نے فرمایا: اے سعد! اپنا کھانا حلال اور پاک بنالو۔ مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے، بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لیے تو جہنم کی آگ ہی لائق ہے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: حرام مال کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ بہت سے آدمی عبادت کی مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور یارب یارب پکارتے ہیں مگر ان کا کھانا بھی حرام کا، پینا بھی حرام کا اور لباس بھی حرام کا، ان کی دعا کہاں قبول ہوسکتی ہے۔ دوسری یہ بات ہے کہ دعا کی قبولیت کے لیے رزقِ حلال کی پابندی کے ساتھ ساتھ مانگنے کا طریقہ بھی صحیح ہونا چاہیے۔ اخلاص اور تضرع سے پکارا جائے اور اسی چیز کی دعا کی جائے جس کے لیے دعا کرنا جائز قرار دیا گیا ہے اور اس طریقے سے مانگا جائے جس طرح مانگنا اللہ کے دربار کے لیے زیبا ہے۔ اگر ان احتیاطوں کے ساتھ مانگا جائے تو دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ مانگنے والا یہ چاہتا ہے کہ میری دعا اسی وقت قبول ہو جائے اور جو چیز میں چاہتا ہوں وہ مجھے مل جائے۔ لیکن پروردگار جانتے ہیں کہ اس وقت اس کے لیے اس چیز کا ملنا خود اس کے لیے نقصان دہ ہوگا اس لیے وہ اسے روک لیتے ہیں اور اسے اس وقت عطا فرماتے ہیں جب وہ چیز اس کے لیے مفید ہوتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہوتی ہے اس دعا کو روک کر اس کے بدلے میں اس مصیبت کو ٹال دیا جاتا ہے۔ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے بدلے میں کتنی بڑی مصیبت اس کے سر سے ٹل گئی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز مانگی جاتی ہے وہ اس لیے نہیں دی جاتی کہ وہ چیز اس کی عاقبت کے لیے نقصان دہ ہوسکتی تھی۔ وہ عہدہ و منصب مانگتا ہے یا دولت کے لیے دعائیں کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ

Marfat.com

اس کا ظرف ان چیزوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ اقتدار پا کر یا جاہ ومنصب کے مل جانے کے بعد اپنی حدود سے نکل جائے گا اور ایسے ایسے کام کرے گا جس سے اسکی عاقبت تباہ ہوجائے گی۔ اس کے بدلے میں اسے وہ نعمت عطا کی جاتی ہے جو اس کی دنیا اور عاقبت کے لیے بہتر ہوسکتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا میں مانگی ہوئی دعائیں بظاہر قبول نہیں کی جاتیں لیکن قیامت کے دن انہیں محرومیوں کو اس کی نیکیاں بنا کر اس کے نامۂ اعمال میں شامل کردیا جائے گا اور جب اس کے اعمال تلیں گے تو یہی اس کی محرومیاں اس کی نجات کا سبب بن جائیں گی۔

فَاِنِّیْ قَرِیْب سے اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ کو پورے آداب کے ساتھ اور نہائت عاجزی اور خاموشی سے پکارو کیونکہ چیخ چیخ کر اسے پکارا جاتا ہے جو دور ہو اور جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہو وہ دل کی بات جانتا اور سرگوشیوں کو سنتا ہے۔ اس لیے ادب کا تقاضا یہ ہے:

اُدْعُوْا رَبَّـكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً "اپنے رب کو پکارو تضرع سے اور خاموشی سے"

روزے کی فرضیت اور اس کے مقاصد کو بیان کرنے کے بعد درمیان میں اس آیتِ کریمہ کے ذریعے بنیادی حقائق کا علم دیا گیا، اساسی تعلیمات سے بہرہ ور فرمایا گیا اور اس خزانے کی خبر دی گئی جس سے امتِ مسلمہ کو زندگی کے لیے انمول ہیرے مل سکتے ہیں۔ اس کے بعد اگلی آیتِ کریمہ میں پھر روزوں سے متعلق احکام کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔

اُحِلَّ لَـكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّـكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّـكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَـكُمْ ۚ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَـكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۚ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○

(حلال کردیا گیا تمہارے لیے روزہ کی رات میں اپنی عورتوں سے بے حجاب ہونا۔ وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی تم سے۔ پس اب اپنی عورتوں سے مباشرت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اور کھاؤ اور پیو تا آنکہ صاف نظر آئے تم کو صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے پھر رات تک روزہ پورا کرو اور اپنی عورتوں سے مباشرت نہ کرو جب تک تم مسجدوں میں اعتکاف کرو یہ اللہ کی حدود ہیں پس ان کے قریب مت جاؤ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں تا کہ وہ بچتے رہیں) (البقرة:١٨٧)

روزے کے احکام وآداب سے متعلق جو سوالات مسلمانوں کے ذہنوں میں پیدا ہوئے ممکن ہے ان میں سے کوئی سوال آنحضرت سے پوچھا بھی گیا ہو۔ صحابہ کا عام معمول کم سے کم سوال کرنے کا تھا۔ وہ قرآن کو آنحضرت کی تعلیمات کی روشنی میں اس طرح سراپا گوش ہو کر سنتے اور اس طرح دل و جان سے سمجھنے کی کوشش کرتے کہ عموماً ان کو سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پورے قرآنِ پاک میں صحابہ کے کل چودہ (14) سوالوں

Marfat.com

کا ذکر کیا گیا ہے۔ البتہ! یہ ضرور ہوا ہے کہ اگر کوئی سوال کیا گیا ہے تو پروردگار نے صرف اسی کا جواب ارشاد نہیں فرمایا بلکہ جب اس کا ابرِ کرم برساہے تو ہر خشک وتر کو سیراب کر گیا ہے۔ ان سوالات کے بھی جواب دے دیئے گئے جو دلوں میں پیدا ہوئے یا ہو سکتے تھے ۔ یہاں بھی ایسے ہی سوالوں کے جوابات دیئے جارہے ہیں۔

آیت کے پس منظر سے متعلق تین باتیں

الرَّفَثُ ''شہوانی باتوں'' کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد الی کے صلے نے اسے مباشرت کے معنوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس بارے میں تین باتیں پس منظر کے طور پر مفسرین کی جانب سے کہی گئی ہیں۔ جو بظاہر تھوڑا سا اختلاف رکھتی ہیں لیکن انجام کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں۔

۱:۔ پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ اُحِلَّ لَکُمْ کا معنی ہے ''تمہارے لیے حلال کر دیا گیا''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز اس آیت کے ذریعے حلال کی گئی ہے وہ اس سے پہلے حرام تھی۔ احادیث سے اس پر استدلال کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت براؓ ابن عازب سے روایت کیا گیا ہے کہ ابتدا میں جب رمضان کے روزے فرض کیے گئے تو افطار کے بعد کھانے پینے اور عورتوں سے تعلق پیدا کرنے کی صرف اس وقت تک اجازت تھی جب تک آدمی سو نہ جائے۔ سو جانے کے بعد یہ سب چیزیں حرام ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ اس کی وجہ سے بہت سی مشکلات پیش آئیں۔

قیس بن صرمہ انصاری دن بھر مزدوری کر کے افطار کے وقت پہنچے تو گھر میں افطار کے لیے کچھ نہ تھا۔ بیوی نے کہا کہ میں کہیں سے کچھ انتظام کر کے لاتی ہوں جب وہ واپس آئیں تو دن بھر کی تکان کی وجہ سے حضرت قیس سو چکے تھے۔ بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہو چکا تھا اب سحری تو کھا نہیں سکتے تھے افطاری مل نہ سکی اگلے دن کا روزہ اسی طرح رکھا دوپہر کو شدت پیاس اور کمزوری کی وجہ سے بیہوش ہو گئے (ابن کثیر)

اسی طرح بعض صحابہ سونے کے بعد نفس کی اکساہٹ کے باعث اپنی بیبیوں سے اختلاط کر بیٹھے اور پھر یہ سوچ کر پریشان ہوئے کہ ہم نے ایک ایسا کام کیا جس کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ اسی سلسلے میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔

۲:۔ بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے سونے کے بعد ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے یہود کو دیکھتے ہوئے کہ وہ افطار کے بعد دوسرے روزے کی نیت کر لیتے ہیں خود یہ سمجھ لیا کہ سونے کے بعد کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط حرام ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے بیویوں کے ساتھ ان کے اختلاط کو حرام فعل کا ارتکاب قرار نہیں دیا بلکہ یہ فرمایا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے۔ خیانت واضح حکم کی نافرمانی کو نہیں کہتے بلکہ غیر واضح معاملہ میں کسی مشتبہ پہلو کا اختیار کرنا اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرنا ہے۔ انہوں نے چونکہ اسے اپنے لیے غلط فہمی سے حرام قرار دے دیا تھا ان سے فرمایا جارہا ہے کہ تمہارے لیے اسے حلال کر دیا گیا ہے۔

۳:۔ تیسرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ اگر کسی معاملے میں اللہ کی طرف سے واضح رہنمائی نازل نہیں ہوتی تھی تو حضور عام طور پر تورات کے احکام کی پابندی کرتے تھے۔ اور میرا گمان یہ ہے کہ سورۃ الانعام میں متعدد انبیائے کرام کے ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے: اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی آپ

Marfat.com

ان کی پیروی کیجیے۔'' چنانچہ نزول وحی سے پہلے آپ اسی حکم پر عمل کرتے ہوئے تورات کے بعض احکام کی پیروی کرتے تھے۔ پھر جب وحی الٰہی کے ذریعے نیا حکم نازل ہو جاتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ پروردگار نے تورات کے پرانے حکم کی جگہ نیا حکم دے دیا ہے۔ اس طرح سے پرانا حکم منسوخ ہو گیا اور اگر اسے ہی باقی رکھنا ہوتا تو وہی حکم نئی شکل میں قرآنِ کریم میں نازل ہو جاتا تھا یا حدیث کی شکل میں آپ پر نازل کر دیا جاتا تھا۔ یہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہود چونکہ افطار کے ساتھ ہی دوسرے روزے کا آغاز کر دیتے تھے مسلمانوں نے ان کی پیروی کی اور آنحضرت ﷺ نے نزول وحی تک اسے باقی رکھا۔ پیشِ نظر آیت کریمہ نے اس ممانعت کو منسوخ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لیے رمضان کی راتوں میں کھانا پینا، بیوی سے تعلق قائم کرنا جائز قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ طلوعِ سحر تک تمہیں آزادی ہے کہ ان حلال اور طیب چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ۔

رات کو دن کی طرح پابندی کیوں نہیں لگائی گئی

طلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور میاں بیوی کے تعلق پر اس لیے پابندی لگائی گئی ہے تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو اور تم میں اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا ہو۔ لیکن ایک ٹریننگ کو ٹریننگ ہی رہنا چاہیے اسے سزا نہیں بنا دینا چاہیے اور طبیعتوں کے لیے اسے اس حد تک ناقابلِ قبول نہیں بنا دینا چاہیے کہ طبیعتیں اس سے بغاوت پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ انسانی فطرت جن چیزوں کا تقاضا کرتی ہے کسی خاص مقصد کے لیے ایک حد تک ان پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسی پابندی جو فطرت سے جنگ لڑنے کے مترادف ہو وہ کبھی اچھے نتائج پیدا نہیں کرتی چنانچہ جسم کے لیے غذا کی طلب ایک فطری تقاضا ہے، اسے حدود میں رکھنے کے لیے دن بھر کی محنت کافی ہے۔ اسی طرح میاں بیوی کا جنسی مطالبہ بھی ایک فطری مطالبہ ہے اس کے لیے بھی دن بھر کی پابندی کافی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر رات کو ان فطری تقاضوں پر پابندی لگا دینا فطرت کو توڑ دینے کی ایک کوشش ہے جو خالقِ فطرت کبھی پسند نہیں کرتے۔ کھانے پینے کے معاملے میں تو اس معاملے کو سمجھنا بہت آسان ہے لیکن میاں بیوی کے معاملے میں بعض تشدد پسند طبیعتوں کو سمجھنے میں غلطی لگ سکتی ہے۔ اس لیے اس کا ذکر بطورِ خاص فرمایا۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ''وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو''

لباس کا مفہوم

یہ تشبیہ میاں بیوی کے ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی گہرے تعلق کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے بتلانا یہ مقصود ہے کہ میاں بیوی ایسے فطری تقاضوں میں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں کہ کسی صورت بھی ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں رکھے جا سکتے۔ ان کے اس تعلق پر اسی حد تک پابندی لگائی جا سکتی ہے جس حد تک فطرت اجازت دے اور اس کے لیے دن کا روزہ کافی ہے اور وہی تربیتِ نفس کے لیے کفایت کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر پابندی فطرت کی حدود میں مداخلت سے کم نہیں۔

اس تشبیہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے وہ یہ ہے کہ لباس ہر آدمی کے جسم کے لیے ساتر ہے اس سے اس کے عیوب برہنگی کو پردہ پوشی نصیب ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص میں لباس کا فطری تقاضا کمزور پڑ جائے تو آہستہ آہستہ وہ کتے بلیوں کی سطح پر آ جاتا ہے کیونکہ انسان کے اندر اظہار کی خواہش اس کی جبلت میں داخل ہے اور جنسی ضرورت اور جنسی کشش اس کی طبیعت کا لازمی حصہ ہیں۔ جب لباس کی فطری خواہش کمزور پڑتی

Marfat.com

ہے تو اظہار کی قوت اپنا زور لگاتی ہے اور جنسی طلب اپنے لیے غلط راستے نکالتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخلاق کا دیوالیہ نکل جاتا ہے۔ نگاہیں آوارہ ہو جاتی ہیں، دل سفلی جذبات کے مسکن بن جاتے ہیں اور شیطانی قوتیں اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کو ہوا دیتی چلی جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح میاں بیوی کا تعلق بھی لباس کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے ہر جبلت اور ہر قوت کو اصلی جگہ رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ اللہ نے انسان میں جو ایک حیا کی قوت رکھی ہے وہ خود ایک باطنی لباس ہے۔ ظاہری لباس جب اس کا ساتھ دیتا ہے تو دونوں مل کر اخلاق کا تانا بانا تیار کرتے ہیں اور اسی سے میاں بیوی کا نازک تعلق پروان چڑھتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ لباس انسان کے لیے صرف ساتر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ سردی اور گرمی کی شدت سے بھی انسان کو محفوظ رکھتا ہے۔ اور موسمی لحاظ سے باہر سے ہونے والا ہر حملہ پہلے لباس ہی پر ہوتا ہے اور وہی اس کو جسم تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ قرآن کریم نے زرہ بکتر کو بھی لباس ہی قرار دیا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ کہ جس طرح زرہ بکتر آدمی کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح میاں اور بیوی زرہ اور بکتر کی طرح شیطان کے حملوں سے ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ والے ہمیشہ اپنے مریدوں کو اپنی بیویوں کو ساتھ رکھنے کا حکم دیتے تھے تاکہ باہر سے ہر طرح کے بداخلاقی کے حملوں سے محفوظ رہیں اور جہاں تک عورت کا تعلق ہے وہ چاہے کچھ بھی بن جائے اس کی عزت و حرمت کا محافظ مرد کے سوا کوئی نہیں۔ اس طرح لباس سے تشبیہ دے کر ان تمام باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ آیت کے اس حصے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ سونے کے بعد ازدواجی تعلقات ناجائز ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود تم میں سے بعض لوگوں نے نفس کی اکساہٹ پر ازدواجی تعلقات قائم کیے اس طرح سے تم نے اپنے نفسوں سے خیانت کی۔ اب پروردگار نے رات کو کھانا پینا اور ازدواجی تعلقات تمہارے لیے حلال کر دیئے ہیں اس سے پہلے تمہاری طرف سے جذبات کے اسیر ہو کر اگر ایسی غلطی ہو چکی ہے اللہ اسے خوب جانتے ہیں کہ تمہیں اس کا شدید رنج ہے اور تم اس پر ندامت محسوس کرتے ہو۔ اس لیے اللہ نے مہربانی فرمائی کہ تمہاری اس غلطی سے درگزر فرمائی بلکہ اسے معاف بھی فرما دیا۔ اب تمہیں اس بات کی اجازت ہے کہ تم اگر چاہو تو اپنی بیویوں سے مل سکتے ہو۔ اس کے بعد ازدواجی زندگی کے اصل مقصد کو واضح فرمایا:

ازدواجی زندگی کا اصل مقصد

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ''اور اللہ نے جو تمہارے لیے مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو''۔ یہ ایک بہت بڑی اصلاح ہے انسان ہر دور میں یہ سمجھتا رہا اور آج بھی یہی سمجھتا ہے کہ نکاح کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے لطف و لذت کا حصول۔ جوانی جنسی آوارگی کے مواقع چاہتی ہے، انسان اپنی قوت کو اسی عیش و عشرت میں ڈبو دینا چاہتا ہے۔ ہر دور کے سماج یا مذہب نے نکاح کی پابندی لگا کر اس کے اس جذبے کو ایک راستے پر لگایا۔ لیکن مقصدِ نکاح کو متعین نہ کرنے کے باعث اس میں وہ پاکیزگی پیدا نہ ہو سکی جو ایک پاکیزہ معاشرے کے لیے ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان کی اس ضرورت کو تسلیم کیا اور چار بیویوں تک کی اجازت دی۔ لیکن اسے ضرورت تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ مقصد بنانے سے روکا۔ کہ تمہارا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا اس لیے نہیں ہے کہ تمہیں ایک عشرت کدہ میسر آ گیا ہے کیونکہ اگر اس تصور کو قبول کر لیا جائے تو پھر نئے سے نئے لطف و لذت کے لیے کندھے بدلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ذمہ دار لوگوں کی بجائے بھنورا صفت لوگ پیدا ہوں گے جو ہر پھول کا مزہ چکھنا چاہیں گے اس لیے قرآنِ کریم نے اس ضرورت کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ یہ فرمایا کہ تمہارے

Marfat.com

ازدواجی تعلق کا مقصد یہ ہے کہ تم اولاد پیدا کرو۔لیکن یہ یاد رکھو اولاد کا پیدا ہونا تمام تر تقدیرِ الٰہی پر منحصر ہے۔اس کا ہر طرح کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔میاں بیوی کا تعلق اس کا ذریعہ ہے لیکن اس ذریعہ کو مثمر کرنا اور بار آور کرنا یہ سراسر اللہ کی قدرت میں ہے۔

اس کے بعد روزے کے آغاز اور انتہا کی حدود مقرر فرمائی اور اس کے لیے ایک ایسا پیمانہ مقرر کیا جس کو ہر آدمی ہر دور میں سمجھ سکتا ہے۔سمندروں میں سفر کرنے والے،صحرا میں رہنے والے، دیہات کے ان پڑھ لوگ،سب جانتے ہیں کہ پو کس طرح پھٹتی ہے۔طلوعِ فجر کس طرح ہوتی ہے،مشرق کے افق پر پھیلی ہوئی سیاہی سے ایک سفید دھاری پھوٹتی ہے جو بلند ہوتی جاتی ہے۔اسی کو پو پھٹنا کہتے ہیں،اسی کو طلوعِ فجر سے تعبیر کیا جاتا ہے،اسی کو یہاں رات کے سیاہ دھاگے سے صبح کے سفید دھاگے کے واضح ہو جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔آنحضرت کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی صدیوں تک مسلمان اسی فطری اور طبعی طریقے سے سحری کا تعین کرتے تھے۔تو اس میں یقیناً دو چار منٹ کی گنجائش رہتی تھی کیونکہ ایک دھاری پھوٹنے اور اس کے بلند ہونے میں وقت لگتا ہے لیکن جدید آلات کی مدد نے اب وقت کے تعین میں آسانی پیدا کر دی ہے اور اسی ٹھیک وقت پر عموماً اذانیں کہی جاتی ہیں۔اس لیے اب یہ کہنا مشکل ہے کہ اب بھی چند منٹ کی گنجائش ہوتی ہے بہتر ہے اب احتیاط سے کام لیا جائے اور اذان کے ساتھ ہی کھانا پینا چھوڑ دیا جائے۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ''اور بیویوں سے مباشرت نہ کرو جب تک تم مساجد میں اعتکاف میں ہو''

اعتکاف کی حقیقت

عَـکَفَ کا اصل معنیٰ ''اپنے آپ کو کسی چیز سے روک لینے یا کسی چیز پر جما دینے'' کے ہیں۔لیکن قرآن وسنت کی اصطلاح میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام ''اعتکاف'' ہے۔ فِي الْمَسٰجِدِ کے لفظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اعتکاف صرف مسجدوں میں ہو سکتا ہے۔البتہ! عورتیں اپنے گھروں میں ایک مخصوص جگہ میں اعتکاف کر سکتی ہیں۔رمضان کے روزوں کا چونکہ اصل مقصد اللہ سے لو لگانا اور اس کا قرب حاصل کرنا ہے۔اس کے لیے جہاں دن بھر حاجاتِ دنیوی سے لاتعلق رہنا اور رات کو عبادت اور قرآن خوانی میں مصروف رہنا ضروری ہوا،اسی طرح اس کیفیت کی تکمیل کے لیے اعتکاف کو بھی آنحضرت نے اپنی سنت بنایا تاکہ لوگ دس روز تک تنہائی میں اللہ کی یاد میں ڈوب کر اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کریں،اپنی کمزوریوں کو تلاش کریں پھر اللہ سے اس کے ازالے کی توفیق مانگیں،دس دن اسی کے آستانے پر اس طرح ڈھیر رہیں کہ اللہ کی یاد اور اس کی عبادت اور اس کی مناجاتیں اور اسی سے دعاؤں کے سوا کسی اور بات سے دلچسپی نہ رہے۔اس سے دل و دماغ کی تطہیر کے ساتھ ساتھ ایک خاص ذوق اور ایک مزاج وجود میں آتا ہے جس سے دنیا کے رشتے ماند پڑ جاتے ہیں اور اللہ کا رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے اور آدمی کے نہاں خانے میں خیر و شر کی تمیز کا ایک ایسا شعور ابھرتا ہے جس سے وہ صراطِ مستقیم پر چلنا آسان محسوس کرتا ہے۔آنحضرت ﷺ نے ہر سال دس روز کے لیے مسجد میں اعتکاف فرمایا اور مسلمانوں کے لیے اسے سنتِ کفایہ بنا دیا۔اب ہر آبادی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنی اپنی مساجد میں چند افراد کو اعتکاف میں بٹھائیں تاکہ اللہ کا گھر ہر وقت اس کے ذکر سے معمور رہے اور ان کی روحانی کیفیت باقی نمازیوں پر بھی اثر انداز ہو اور ان کے واسطے سے پوری آبادی دینی بیداری کے احساس سے بہرہ ور ہو جائے۔

اعتکاف کے مسائل

اعتکاف چونکہ شب و روز کی عبادت ہے اس کے لیے اس کی پابندیاں روزے کی نسبت کچھ زیادہ ہیں۔روزے دار کی طرح دن

Marfat.com

میں ایک معتکف کو بھی روزے سے رہنا پڑتا ہے لیکن رات کو کھانے پینے کی تو آزادی ہوتی ہے کیونکہ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے پورا کیے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن معتکف کے لیے بیوی سے کسی طرح کا تعلق پیدا کرنا جائز نہیں۔ یہ تعلق اعتکاف کی روح کے بھی خلاف ہے اور مسجد کے ادب کے بھی خلاف۔ اعتکاف میں چونکہ آدمی اللہ ہی کے آستانے پر آپڑتا ہے اس لیے بغیر کسی شرعی ضرورت کے مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر سحری اور افطاری کی ضرورت مسجد کے اندر پورا ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو پھر تو باہر نکلنا بالکل جائز نہیں۔ لیکن اگر مسجد کے اندر اس کا کوئی انتظام نہ ہو تو پھر کسی قریب ترین جگہ سے کھانے کے لیے جانے کی اجازت ہے۔ لیکن کسی اور مصروفیت میں وقت لگانے کی بالکل اجازت نہیں۔ اسی طرح اعتکاف کی حالت میں نہانے پر کوئی پابندی نہیں نہانا شرعی ضرورت سے ہو تو باہر نکل کر بھی نہایا جاسکتا ہے۔ لیکن محض طبیعت کی تازگی کے لیے نہانا یا عادت پورا کرنے کے لیے تو اس کے جواز کی ایک ہی صورت ہے کہ مسجد کے اندر نہانے کا اس طرح اہتمام کیا جائے کہ اس کا پانی مسجد کے اندر نہ گرنے پائے۔ مسجد کے فرش کے اوپر ایک مصنوعی فرش لگایا جائے اور پانی اس کا باہر نکال دیا جائے۔ اس صورت میں نہایا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر ایسا انتظام نہ ہو تو پھر اعتکاف کے دنوں میں نہانے سے صبر کرنا چاہیے۔ ویسے بھی اعتکاف کے مقاصد میں سے یہ بھی ایک مقصد ہے کہ آدمی اپنی عادات کی غلامی سے نکلے نہانا بہت اچھی بات ہے لیکن اسے عادت بنا لینا کہ اس کے بغیر چند دن نہ گزر سکیں یہ بجائے خود توجہ طلب بات ہے۔ اسی طرح اعتکاف میں یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی اپنی دوسری ضرورتوں پر بھی کسی قدر قدغن عائد کرے۔ سونا، کھانا، بولنا، ملنا، انسانی ضرورتیں بھی ہیں اور انسانی معاشرت کے تقاضے بھی۔ روزہ اور اعتکاف ان میں اصلاح اور تہذیب کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ان ضرورتوں کو اس سطح پر لایا جائے جس سے یہ انسانیت کے جلا پانے میں مدومعاون ثابت ہوں۔ روزے میں جس طرح کم کھانے کی عادت ڈالی جاتی ہے اسی طرح اعتکاف میں کم سونے، کم بولنے، اور کم ملاقاتیں کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اسی لیے اس کا مرکز مسجد رکھا ہے تاکہ لوگ اللہ کے گھر میں زیادہ احتیاط سے اس عبادت میں مصروف رہیں۔ فقہا نے لکھا ہے کہ اعتکاف صرف اس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں پنج وقتہ جماعت ہوتی ہو۔ جس میں جماعت کا اہتمام نہ ہو محض لوگ انفرادی نماز پڑھتے ہوں اسے مسجد کہنا ہی مشکل ہے اس لیے وہاں اعتکاف نہیں ہوتا۔ البتہ! وہاں اگر جمعہ نہ ہوتا ہو تو جمعہ کے لیے جامع مسجد جانے کی اجازت ہے۔ اعتکاف کے مزید مسائل کے سلسلے میں علما سے رجوع کرنا چاہیے۔

آیت کے آخر میں فرمایا تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ''یہ اللہ کی حدود ہیں ان کے قریب نہ جاؤ''۔ حدود سے مراد وہ تمام پابندیاں ہیں جو روزے اور اعتکاف کی حالت میں ایک روزہ دار اور معتکف پر عائد ہوتی ہیں۔ یہاں صرف یہ حکم نہیں دیا کہ ان پابندیوں کی خلاف ورزی نہ کرو بلکہ یہ حکم دیا کہ ان کے قریب بھی نہ جاؤ کیونکہ جو شخص صرف ضابطے کی خانہ پری کرنا چاہتا ہے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو الاؤنس دیتا جائے اور جب تک فقہی قوانین اس کا راستہ بالکل نہ بند کر دیں وہ آگے بڑھنے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ ہر جائز چیز سے آخری حد تک استفادہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی طبیعتیں بالعموم اللہ کے خوف اور تقویٰ سے بے گانہ ہو جاتی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ گناہ کی حدود میں داخل ہونے سے بھی انہیں باک نہیں رہتا۔ اس لیے نفسیاتی اور تربیتی نقطۂ نگاہ سے یہ بات از بس ضروری ہے کہ آدمی آخری حد کا انتظار نہ کرے بلکہ معصیت کی حدود سے دور ہی اپنے رہوارِ نفس کی باگ کھینچ لے۔ اسی بات کو آنحضرت ﷺ نے ایک مثال دے کر سمجھایا آپ نے فرمایا ہر بادشاہ کی ایک شاہی چراگاہ ہوتی ہے جس میں پبلک کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔ اس چراگاہ کے گرد ایک باڑھ

Marfat.com

لگادی جاتی ہے اور لوگوں کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ اس باڑھ کے قریب نہ آنا۔ اگر تم اپنے جانوروں کو اس باڑھ کے قریب چراؤ گے تو ممکن ہے کسی وقت تمہارے جانور کود کر چراگاہ کے اندر داخل ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی حرام کردہ چیزیں اللہ کی چراگاہ ہیں۔ ان کے گرد مشتبہ چیزوں کی باڑھ لگائی گئی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا راہو نفس اس چراگاہ کے اندر نہ جانے پائے تو اسے اس باڑھ کے قریب نہ آنے دو تا کہ وہ اللہ کی حدود کو پامال نہ کر دے۔ اسی حکمت کے باعث آنحضرت ﷺ نے بعض احتیاطوں کا حکم دیا ہے۔ مثلاً روزہ کی حالت میں کلی کرنے کی تو اجازت دی لیکن اس میں مبالغہ کرنا مکروہ ٹھہرایا تا کہ پانی حلق کے اندر جانے کا خطرہ نہ ہو۔ منہ کے اندر کسی دوا کا استعمال مکروہ قرار دیا۔ بیوی سے بوس و کنار کرنے سے روکا تا کہ ضبطِ نفس کی حدود ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا نہ ہو۔ اسی طرح سحری کھانے میں طلوعِ فجر سے دو چار منٹ پہلے ہاتھ کھینچ لینا اور افطار میں دو تین منٹ تاخیر کر لینا پسندیدہ ٹھہرایا گیا۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے اور تم جانتے ہو) (البقرۃ:۱۸۸)

روزوں کی فرضیت کا اصل مقصد انسان کے اندر سے حرص، طمع، بخل، لالچ اور اس طرح کے دوسری صفاتِ قبیحہ کو نکالنا یا ان پر قابو پانے کی تربیت دینا ہے۔ اسی سے انسان کے اندر وہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو اسے اللہ سے ڈرنا سکھاتا ہے، بندوں کے معاملات میں عدل پسند اور محتاط بناتا ہے اور حلال و حرام کی تمیز اس کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔

اسلام کے نظامِ معاش کی اساس حلال و حرام کی پابندی پر ہے

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ کہا جا رہا ہے کہ روزے سے تمہارے اندر جو صفات پیدا کی گئی ہیں اس کا اصل امتحان اس وقت ہوگا جب تم رمضان کے بعد اپنی عملی زندگی میں ہر طرح کے معاملات میں شریک ہو کر اپنا فرض انجام دینے کی کوشش کرو گے۔ تب اندازہ ہوگا کہ تم نے تمام قبیح صفات پر کہاں تک قابو پایا ہے؟ تم نے کہاں تک حلال و حرام کی پابندی کا خود کو خوگر بنایا ہے؟ اگر تم اس امتحان میں پورا اترنا چاہتے ہو تو دیکھنا باہمی ایک دوسرے کے مال کو حرام طریقے سے مت کھانا اور نہ اپنے مال کو حکام رسی کا ذریعہ بنانا اور نہ اسے رشوت کے طور پر خرچ کر کے دوسروں کے حقوق تلف کرنے کی کوشش کرنا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں محض اجمالی ہدایت نہیں دی بلکہ ایک مکمل شریعت عطا فرمائی جس میں حلال و حرام کی پوری تفصیلات موجود ہیں۔

"وہ ایک ایسا معقول فطری اور جامع قانون ہے جو ہر قوم و ملت اور ہر ملک و وطن میں چل سکتا ہے اور امنِ عامہ کا ضامن ہو سکتا ہے کیونکہ اس قانونِ الٰہی میں قابلِ اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا گیا ہے۔ جس میں تمام انسان مساوی حق رکھتے ہیں جیسے ہوا، پانی، خودرو گھاس، آگ کی حرارت اور غیر مملوک جنگلات اور غیر آباد پہاڑی جنگلات کی پیداوار وغیرہ کہ ان میں سب انسانوں کا مشترک حق ہے، کسی کو ان پر مالکانہ قبضہ جائز نہیں اور جن چیزوں کے اشتراک

Marfat.com

میں انسانی معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے یا نزاع وجدال کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں ان میں انفرادی ملکیت کا قانون جاری فرمایا گیا کسی زمین یا اس کی پیداوار پر ابتدائی ملکیت کا قانون جدا ہے اور پھر انتقالِ ملکیت کا جدا اس قانون کی ہر دفعہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی انسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، بشرطیکہ وہ اپنی جدوجہد ان کی تحصیل میں خرچ کرے اور کوئی انسان دوسروں کے حقوق غصب کر کے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو محدود افراد میں مقید نہ کر دے، انتقالِ ملکیت خواہ بعد الموت وراثت کے قانونِ الٰہی کے مطابق ہو یا پھر بیع وشراء وغیرہ کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے ہو، مزدوری ہو یا کسی مال کا معاوضہ دونوں میں اس کو ضروری قرار دیا گیا ہے کہ معاملہ میں کوئی دھوکہ ،فریب، یا تلبیس نہ ہو اور کوئی ایسا ابہام اور اجمال نہ رہے جس کی وجہ سے باہمی منازعات کی نوبت آئے۔

نیز اس کی بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ فریقین جو رضامندی دے رہے ہیں وہ حقیقی رضامندی ہو کسی انسان پر دباؤ ڈال کر کوئی رضامندی نہ لی گئی ہو، شریعتِ اسلام میں جتنے معاملات باطل یا فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں ان سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان میں وجوہِ مذکور میں سے کسی وجہ سے خلل ہوتا ہے۔ کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے، کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہنچا کر اپنا نفع کمایا جاتا ہے، کہیں حقوق عامہ میں ناجائز تصرف ہوتا ہے۔ سود، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوقِ عامہ کے لیے مضر ہیں، ان کے نتیجہ میں چند افراد پلتے بڑھتے ہیں اور پوری ملت مفلس ہوتی ہے۔ ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لیے حلال نہیں کہ وہ پوری ملت کے خلاف ایک جرم ہے۔ آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر حاوی ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ''نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر''۔ اس میں ایک بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں اَمْوَالَكُمْ آیا ہے۔ جس کے اصل معنی ہیں ''اپنے اموال''۔ جس میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ تم جو کسی دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور کرو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت اور تعلق ہوگا جیسا تمہیں اپنے مال سے ہے۔ اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچتا اس کا اس وقت بھی ایسا ہی احساس کرو کہ گویا وہ تمہارا مال ہے۔

اس کے علاوہ اشارہ اس طرف بھی ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں کوئی ناجائز تصرف کرتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہ رسم چل پڑی تو دوسرے اس کے مال میں ایسا ہی تصرف کریں گے۔ اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف درحقیقت اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے۔ غور کیجیے! اشیائے ضرورت میں ملاوٹ کی رسم چل جائے، کوئی گھی میں تیل یا چربی ملا کر زائد پیسے حاصل کرے تو اس کو جب دودھ خریدنے کی ضرورت پڑے گی، دودھ والا اس میں پانی ملا کر دے گا۔ مسالہ کی ضرورت ہوگی اس میں ملاوٹ ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی اس میں بھی یہی منظر سامنے آئے گا۔ تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاوٹ کر کے زائد حاصل کیے، دوسرا آدمی وہ پیسے اس کی جیب سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح دوسرے کے پیسے تیسرا نکال لیتا ہے۔ بیوقوف اپنی جگہ پیسوں کی زیادتی

Marfat.com

شمار کر کے خوش ہوتا ہے مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا تو جو کوئی دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے، درحقیقت وہ اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ اس ارشادِ خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریق سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کر لینا بھی داخل ہے، چوری اور ڈاکہ بھی، جن میں دوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے اور سود، قمار، رشوت اور تمام بیوع فاسدہ اور معاملاتِ فاسدہ بھی جواز روئے شرع جائز نہیں۔ اگرچہ فریقین کی رضامندی بھی متحقق ہو۔ جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کر لینا یا ایسی کمائی جس کو شریعتِ اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے اگرچہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ کھانے کی ممانعت مذکور ہے لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہے، خواہ کھا پی کر یا پہن کر یا دوسرے طریقہ کے استعمال سے۔ مگر محاورات میں ان سب قسم کے استعمالوں کو کھالینا ہی بولا جاتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں مال کھا گیا اگرچہ وہ مال کھانے پینے کے لائق نہ ہو۔'' (معارف القرآن)

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

(اور اپنے مال کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ تاکہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے ہڑپ کر سکو در آں حالیکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو)

رشوت معاشرے کے لیے تباہ کن ہے

آیتِ کریمہ کے اس حصے سے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ کہ تُدْلُوْا کا مصدر ادلاء ہے۔ اس کے معنی ''کنویں میں ڈول ڈالنے'' کے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کے اندر رسائی اور قربت حاصل کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جس طرح رسی کے ذریعے ڈول پانی تک پہنچتا ہے، اسی طرح مال کے ذریعے لوگ حکام تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور پھر انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس آیتِ کریمہ میں تمام حرام ذرائع سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح رشوت کے ذریعے بھی کسی کا مال ہڑپ کرنے اور کسی کے حق پر قبضہ کرنے سے بھی روکا گیا ہے بلکہ اس کو الگ ذکر کر کے شائد یہ بتانا مقصود ہے کہ رشوت کے ذریعے دوسروں کے حقوق پر قبضہ کرنا یا ناجائز مفادات حاصل کرنا بجائے خود نہایت خطرناک عمل ہے۔ جس سے معاشرے کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ رشوت کے تباہ کن نتائج اور اس کی خطرناکی کا اندازہ خود تمہیں بھی ہے کیونکہ دنیا کا کوئی سماج، کوئی معاشرہ اور اس کا کوئی معروف ایسا نہیں ہے جس میں رشوت کی مذمت نہ کی گئی ہو۔ عقل بھی اس کے گناہ ہونے پر یکسو ہے کیونکہ رشوت ایسا خطرناک مرض ہے جس سے کئی خطرناک امراض پیدا ہوتے ہیں مثلاً جس معاشرے میں رشوت کا کاروبار چل نکلتا ہے اس معاشرے کے لوگ حق و ناحق کا فرق بھول جاتے ہیں۔ ایسے معاشرے کا ہر دولت مند آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے جائز و ناجائز کی کوئی تقسیم نہیں میں ہر اس حق کو اپنا حق سمجھتا ہوں جس کو پیسے کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقوق بکاؤ مال بن جاتے ہیں۔
رشوت کی دوسری بڑی برائی یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کی ترقی کا دارومدار قانون کی بالادستی اور حکام کے ذریعے قانون کے تحفظ پر ہے۔ لیکن جب رشوت کا کاروبار چل نکلتا ہے تو حکام قانون کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ اب ان سے کام لینے کا ذریعہ قانون نہیں ہوتا

Marfat.com

بلکہ رشوت ہوتی ہے اور جیسے جیسے یہ خون حکام اور عمال کے منہ کو لگتا جاتا ہے ویسے ویسے جائز حق کا حاصل ہونا مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اگر ایک طرف جائز اور ناجائز کا فرق ختم ہو جاتا ہے تو دوسری طرف یہ دودھاری تلوار کی طرح معاشرے کو زخمی کر کے رکھ دیتا ہے کہ ایک دفعہ اگر رشوت دینے والا کسی دوسرے کے حق پر قبضہ کرتا ہے تو دوسری دفعہ دوسرا آدمی رشوت کا موقع پا کر اس کے حق پر قبضہ جمالیتا ہے کیونکہ حکام جب رشوت ہی کی زبان سمجھتے ہیں تو انہیں جو بھی رشوت دے گا وہ اس کے لیے اور اس کے حق میں کام کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ رشوت کے مفاسد کی کوئی انتہا نہیں اس لیے آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں کو جہنمی فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: الراشی والمرتشی کلاھما فی النار ''رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے''۔ آپ نے اس کا راستہ روکنے کے لیے حکام کو تحائف لینے پر بھی پابندی لگا دی۔ حدیث شریف میں آتا ہے: ایک شخص کو آپ نے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے عامل بنا کر بھیجا۔ وہ جب زکوٰۃ وصول کر کے واپس آیا تو اس نے مالِ زکوٰۃ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کچھ ایسی چیزیں بھی پیش کیں جس کے بارے میں اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ مجھے لوگوں نے تحفے کے طور پر دی ہیں اس لیے یہ میرا حق ہے۔ آپ نے برہم ہو کر خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ ایک شخص کو میں عاملِ زکوٰۃ بنا کر بھیجتا ہوں اور وہ واپس آ کر کہتا ہے کہ یہ مالِ زکوٰۃ ہے اور یہ وہ تحائف ہیں جو مجھے دیے گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر اس شخص کو اگر میں عامل نہ بناتا اور یہ اپنی ماں کے گھٹنے کے ساتھ لگا بیٹھا رہتا تو کیا پھر بھی اس کو یہ تحائف ملتے؟ مطلب یہ ہے کہ جو تحائف کسی کو حاکم ہونے کی وجہ سے ملتے ہیں وہ دراصل بالواسطہ رشوت ہوتے ہیں صرف نام بدل دیا جاتا ہے۔ اس لیے آنحضرت نے ایسے تحائف کو بھی رشوت ہی کی طرح حرام ٹھہرایا۔

مختصر یہ کہ اسلام نے حلال پر پابندی اور حرام سے بچنے کی بے حد تاکید فرمائی ہے۔ قرآن وسنت ایسے تاکیدی احکام سے معمور ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبان مسلم نہ ہو جائے اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں اور جب تک کوئی بندہ مالِ حرام کھاتا ہے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لیے اس کا توشہ ہوتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ بری چیز سے برے عمل کو نہیں دھوتے۔ ہاں! اچھے عمل سے برے عمل کو دھو دیتے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک مرتبہ خطبہ دیا جس میں فرمایا: اے جماعتِ مہاجرین! پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں۔ ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلتی ہے تو ان پر طاعون اور وبائیں اور ایسے نئے نئے امراض مسلط کر دیے جاتے ہیں جو ان کے آباؤ اجداد نے سنے بھی نہ تھے اور دوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہو جائے تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت اور محنت اور حکام کے مظالم مسلط کر دیے جاتے ہیں اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش بند کر دی جاتی ہے اور چوتھے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ ان پر اجنبی دشمن مسلط فرما دیتے ہیں جو ان کے مال بغیر کسی حق کے چھین لیتا ہے اور پانچویں یہ کہ جب کسی قوم کے اربابِ اقتدار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام ان کے دل کو نہ لگیں تو اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دیتے ہیں۔ (ابنِ ماجہ، بیہقی)

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کیلئے جھک جائیں

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(جلد اول)

سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ ...... ۱ تا ۱۸۸

مؤلف

مولانا ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

ایم اے، پی ایچ ڈی

Marfat.com